

نجوم الفرقان

من تفسیر آیات القرآن

از رشحات قلم

حضرت علامہ مولانا

عبد الرزاق بھٹو
طاب ثوابہ

ناشر

ضیاء العلوم پبلی کیشنز
لاہور پاکستان

کتاب لاریب کی توضیحات و تشریحات، علوم عقلیہ و نقلیہ کی روشنی میں
علمی و تحقیقی ذوق رکھنے والوں کے لئے قدیم و جدید احکامات و مسائل پر ابحاث کا حسین مرقع
تفسیر القرآن بالقرآن، ارشادات نبویہ، اقوال صحابہ، تحقیقات اسلاف اور روایات صحیحہ پر مشتمل تفسیر

نجوم الفرقان

من تفسیر آیات القرآن

جلد سوم

سورة البقرہ آیات 47 تا 141

از رشحات قلم

محقق و مفسر
استاذ العلماء حضرت علامہ مولانا
عبدالرزاق
بھٹو الہی طاروی
مدظلہ العالی

ناشر ضیاء العلوم پبلی کیشنز
راولپنڈی
پاکستان

اشاعتی
ضابطہ

جملہ حقوق کمپوزنگ محفوظ ہیں

نام کتاب: نجوم الفرقان من تفسیر آیات القرآن

تصنیف: علامہ مولانا عبد الرزاق چشتی بھڑالوی

کمپوزنگ: ضیاء علوم کمپوزنگ سنٹر راولپنڈی سیٹلائٹ ٹاؤن

کمپیوٹر گرافکس: قاضی محمد یعقوب چشتی، اظہر اقبال اعوان

ضخامت: $\frac{20 \times 30}{8}$ 936 صفحات

بار طبع: اول دسمبر 2004ء

قیمت: روپے

ناشر: سید شہاب الدین شاہ

ضیاء علوم پبلی کیشنز راولپنڈی پاکستان

0333- 5166587 - Fax 051-4580404
Email: ziauloom@isb.paknet.com.pk

رابطہ:

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
42	اعتراض ، جواب	25	يٰۤاَيُّهَا اِسْرَآئِيْلُ اذْكُرُوْا.....الخ
43	جواب دوم، وضاحت حدیث	26	بنی اسرائیل کو فضیلت کیا دی گئی؟
44	شفاعت کی پانچ قسمیں	27	وَ اَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلٰی الْعٰلَمِيْنَ
45	فائدہ	28	تنبیہ
46	تنبیہ	29	وَ اتَّقُوا يَوْمًا لَا تَجْزٰى.....الخ
46	وضاحت حدیث	29	سزائے چھڑانے کے چار طریقوں کی نفی
47	فائدہ	30	دینی طلباء کرام کی توجہ کیلئے
49	فَرْط	30	لَا تَجْزٰى نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا
49	شفاعت عامہ	30	فائدہ:
50	نکتہ	31	تنبیہ
	شفاعت سے کسی کو کم اور کسی کو زیادہ	32	مقام توجہ
51	فائدہ کیوں؟	33	وَلَا يَقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ
51	تنبیہ	33	وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ
52	شفاعت میں معتزلہ کا مذہب	34	وَلَا هُمْ يَنْصُرُوْنَ
53	معتزلہ کی دلیل نمبر 1	34	نصرت اور معونت میں فرق
53	الزامی، تحقیقی جواب	34	شفاعت کی بحث
53	نتیجہ یہی نکلا	35	تنبیہ
54	معتزلہ کی دلیل نمبر 2	36	تراجم کو دیکھئے
54	جواب نمبر ۲	36	شفاعت کا ثبوت قرآن پاک سے
55	تیسرا جواب	39	شفاعت کا ثبوت احادیث مبارکہ سے
55	معتزلہ کی دلیل نمبر 2	40	وضاحت حدیث
56	دینی طلباء کی دلچسپی کیلئے		

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
58	معتزلہ کا استدلال احادیث سے	72	بنی اسرائیل کے بیٹوں کو ذبح کیوں کرایا گیا؟
59	جواب نمبر 1		بیٹوں کو ذبح کرنے اور بیٹیوں کو زندہ
59	تحقیقی جواب نمبر 2	73	چھوڑنے کی وجہ کیا تھی؟
60	الزامی جواب	75	تنبیہ
60	تحقیقی جواب نمبر 2	75	وَفِي ذٰلِكُمْ بَلَاءٌ مِّن رَّبِّكُمْ عَظِيمٌ
61	مشکل الفاظ کے معانی	76	رب تعالیٰ کی عظمت
62	اس حدیث سے معتزلہ کا استدلال	76	تنبیہ
63	اس حدیث سے معتزلہ کا استدلال	77	وَإِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ..... الْخ الْآيَةِ
64	معتزلہ کی اور دلیل	79	فرعون اور اسکی قوم کی ہلاکت کی طرف رواغی
65	وَإِذْ نَجَّيْنَكُمْ مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ الْخ	79	موسیٰ علیہ السلام کو دریا میں عصا مارنے کا حکم
66	قاعدہ اکثر یہ	80	وَإِذْ فَرَقْنَا بِكُمْ
66	آل فرعون سے مراد	81	البحر
67	فائدہ	82	فانجینکم ، تنبیہ
67	قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا	83	وَإِذْ فَرَقْنَا آلَ فِرْعَوْنَ
68	تمام اقوال میں حقیقتاً کوئی اختلاف نہیں	84	وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ
69	فرعون	84	یہ دریا کون سا تھا؟
69	دینی طلباء کرام کے لئے	84	یہ واقعہ دینی اور دنیاوی نعمتوں کا پتہ دیتا ہے
69	فرعون کا غربت سے بادشاہت تک پہنچنا	87	امت مصطفیٰ ﷺ کو حاصل ہونے والے فوائد
70	یسو مونکم ، سوء العذاب	88	مومن کی کیا خوب شان
70	کیا بنی اسرائیل کو سخت عذاب دیا گیا؟	88	موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کی نجات کا دن
71	نکتہ	89	اعتراض

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
107	پہلا احتمال	90	جواب، ایک غلط فہمی کا ازالہ
107	دوسرا احتمال	92	نبی کریم ﷺ کا اپنی ولادت کے دن اظہارِ شکر
108	تیسرا احتمال	93	وَإِذْ وَعَدْنَا مُوسَىٰ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً الْخ
108	تنبیہ	94	بچھڑے کے ڈکارنے کی وجہ
109	وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ يَنْقُومُ الْخ	96	اعترض، جواب
110	عجیب نکتہ	96	راتوں کا ذکر کیوں؟
110	نبی کریم ﷺ کی امت پر عظیم احسان	97	فائدہ
	اس واقعہ سے نبی کریم ﷺ کی امت کو	97	دینی طلباء کیلئے
111	توبہ کی رغبت دلائی گئی	98	ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعَجَل
111	يَقُومُ انْكُمْ ظَلَمْتُمْ انْفُسَكُمْ	99	من بعده ، وانتم ظلمون
112	اعترض، جواب		اس آیت سے بھی امت مصطفیٰ ﷺ
113	ایک دوسرے کو قتل کرنے سے کیا مراد ہے؟	100	کو یہ فائدے حاصل ہوئے
113	ان کیلئے قتل کرنا کیسے ممکن ہوا؟	101	ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ الْخ الْآيَةِ
114	ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ	101	مختصر مطلب
114	تنبیہ	101	تفصیلی وضاحت
115	وَإِذْ قُلْتُمْ يٰمُوسَىٰ لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ	102	اعترض، جواب
116	قدرے مزید تفصیل	102	لعلکم تشکرون
116	اعترض، جواب	103	فائدہ
119	حتیٰ نری اللہ جہرۃ	103	شکر کیا ہے؟
120	ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ	104	شکر کی تین قسمیں ہیں
120	تنبیہ	106	وَإِذْ آتَيْنَا مُوسَىٰ الْكِتَابَ الْخ الْآيَةِ
		106	موسیٰ علیہ السلام

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
149	اعتراض ، جواب	120	قابل توجہ
150	حضرت محی الدین ابن عربی فرماتے ہیں	121	وَزَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ الْخ
151	وَإِذِ اسْتَسْقَى مُوسَى لِقَوْمِهِ الْخ	122	بنی اسرائیل سرکشی کے باوجود انعامات
151	مختصر وضاحت	124	سلوی کیا ہے؟
152	قدرے تفصیل	124	ایک حدیث کا مطلب
153	فَقُلْنَا اضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ	124	کماؤ کو من کہنے کی وجہ
155	قد علم کل اناس	125	بنی اسرائیل کی ذخیرہ اندوزی
155	کلوا واشربوا من رزق الله	126	ذخیرہ اندوزی کی مذمت احادیث سے
155	ولا تعثوا فی الارض مفسدین	126	تنبیہ
156	معجزات کا انکار جہالت ہے	129	تنبیہ
156	تنبیہ	130	كلو من طيب ما رزقنكم
157	دھریوں	130	نبی کریم ﷺ کے معجزات کی ایک جھلک
157	طبیعیوں	133	حدیث پاک کی وضاحت
158	الاهیوں	135	تنبیہ
158	سید الانبیاء کی انگلیوں سے نکلا ہوا پانی	136	وَإِذْ قُلْنَا ادْخُلُوا هَذِهِ الْقَرْيَةَ الْخ
158	زمزم اور کوثر سے افضل ہے	136	وہ بستی کون سی تھی؟
159	وضاحت حدیث	138	وقولوا حطة
159	زمزم سے بھی افضل پانی	139	فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي الْخ
160	تنبیہ ، فائدہ	140	رجز سے مراد کون سا عذاب ہے؟
161	مسئلہ استسقاء		الفاظ کے تبدیل کرنے کے متعلق
162	استسقاء کے تین طریقے	145	مسئلہ عظیمہ

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
181	مسئلہ ، اعتراض ، جواب	162	بارش طلب کرنے کے تین طریقے ہیں
182	پیاز لہسن کھا کر مسجد میں آنے کی ممانعت	163	دوران خطبہ نبی کریم ﷺ کا دعاء کرنا
183	نبی کریم ﷺ کا پکے لہسن سے پرہیز کرنا	164	توضیح
184	وضاحت حدیث	166	نماز استسقاء
186	مسور کا ذکر	166	ایک غلط فہمی کا ازالہ
186	وفومہا	167	نماز استسقاء کے بعد دعاء
187	قال اتستبدلون الذی ہو ادنی	167	غلط فہمی کا ازالہ
188	من اور سلوی کی فوقیت	169	بادلوں کو دیکھ کر دعا کرنا
189	مسئلہ ،	171	وَإِذْ قُلْتُمْ يٰمُوسٰی لَنْ نُّصْبِرَ الْخ
189	اھبطوا مصرأ فان لکم ما سألتم	172	مختصر مطلب ، تفصیلی وضاحت
190	ذلت سے مراد	173	علی طعام واحد
191	مسکنت سے مراد	173	فائدہ
191	فائدہ جلیلہ	174	فادع لنا ربک
192	یہود کی ذلت پر علامہ کاظمی کا شاندار بیان	175	عظیم ہستی کا دعاء کی درخواست کرنا
194	وَبَاءٌ وَابْغَضِبْ مِّنَ اللّٰهِ	175	ایک عجیب حکمت
194	تنبیہ	176	گذشتہ سے پیوستہ
195	ذلک بانھم کانوا یکفرون بایت اللہ	177	وضاحت حدیث
196	انبیاء کرام کو شہید کرنے کی وجہ	178	یخرج لنا مما تنبت الارض
197	اعتراض ، جواب	179	من بقلھا
198	انبیاء کرام کو شہید کرنا یہود کی زبانی	180	وفومہا ، وعدسھا ، وبصلھا
199	انبیاء کرام کو جیل میں بھیجنا یہود کی زبانی	180	فوائد

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
217	مقام توجہ	199	لفظ نبی کے متعلق
217	گذشتہ سے پیوستہ	199	اعتراض
218	حکمت	200	جواب
218	جواب	201	إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا الخ
219	وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ	201	شان نزول
219	مختصر وضاحت	202	حضرت سلمان فارسی
220	تنبیہ	205	قرآن تیری عظمت پر قربان
220	قدرے تفصیلی وضاحت	207	فائدہ
221	ورفعنا فوقکم الطور	208	یہود کو یہود کہنے کی وجہ
222	تنبیہ	208	نصاری کو نصاری کہنے کی وجہ
222	علامہ رازی نے کیا خوب بیان کیا	209	تنبیہ
223	طور کو اٹھانے کا انکار کرنے والے کون؟	209	والصّٰبِیْن
223	اعتراض ، جواب	210	صّٰبِیْن کی قسمیں
224	خذوا ما آتیناکم بقوة		آیت کریمہ میں صّٰبِیْن کی کون سی
227	لعلکم تتقون	212	قسم معتبر ہے؟
228	ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ بَعْدِ ذَلِكَ الخ الآية	213	راقم کا موقف
228	مختصر وضاحت	213	من آمن بالله واليوم الآخر
228	قدرے تفصیلی وضاحت	213	اعتراض
229	فلو لا فضل الله علیکم	214	جواب ، تنبیہ
231	وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِينَ اعْتَدَوْا مِنكُمْ الخ	215	وعمل صالحاً فلهم اجرهم
233	نیک لوگوں نے مجرمین سے کنارہ کشی کر لی	216	تنبیہ
		217	ولا خوف علیهم ولا هم يحزنون

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
245	تباہ ہو جاتے ہیں	233	مختصر لفظی بحث
245	نا جائز کاموں کے لئے حیلہ کرنا حرام ہے	234	یہود نے ہر موقع پر نبی کی مخالفت کی
246	جائز کاموں کے لئے حیلہ جائز	235	ہفتہ کے دن مچھلیوں کے زیادہ آنے کی وجہ
246	تنبیہ	235	فائدہ عظیمہ
247	فَجَعَلْنَاهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا الْخ	236	حدیث پاک سے حاصل ہوا
248	تنبیہ	237	اس واقعہ کے ذکر کرنے کا مقصد
248	لما بین یدیہا وما خلفہا	238	اعتراض، جواب
249	دینی مدارس کے طلباء کے لئے	238	کیا وہ حقیقی بندر بن گئے تھے یا تشبیہ ہے؟
250	وموعظة للمتقين	239	جن کو بندر بنایا گیا کیا ان کی نسل چلی؟
250	نکال اور موعظہ میں فرق	239	مسئلہ کی تفصیل ملاحظہ ہو
251	فائدہ عظیمہ	240	جمہور کے نزدیک نسل نہیں چلی
253	وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ الْخ	240	پہلے قول والوں کے دلائل کے جوابات
254	مزاح اور استہزاء میں فرق	242	تیسری حدیث کا جواب
255	کیا بنی اسرائیل کافر ہوئے	242	دوسرا جواب
256	دینی طلباء کرام کے لئے	242	تیسرا جواب
257	قَالُوا اذْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ الْخ	243	چوتھا جواب
257	سوال	243	پانچواں جواب
257	پہلا جواب		حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی گریہ وزاری
258	دوسرا جواب	243	اور حضرت عکرمہ کا استدلال
258	تیسرا جواب اجمالی	244	تنبیہ
258	تنبیہ		گنہگاروں کے ساتھ نیک لوگ بھی

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
275	فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا الْخ	258	تیسرا جواب تفصیلی
276	فائدہ جلیلہ	260	چوتھا جواب
278	طلباء کرام کی توجہ کے لئے	260	قال انه يقول انها بقرة لا فارض
278	نیک باپ کا بچہ بھی نیک تھا	261	فافعلوا ما تؤمرون
279	اعتراض، جواب	262	سوال ان کیلئے مشکل کا سبب بن گئے
280	مسئلہ	262	مسئلہ
280	مسئلہ قسامت	263	قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا لَوْنُهَا الْخ
282	ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُمْ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ الْخ	264	تنبیہ
283	قساوت کا ذکر کب ہوتا ہے؟	265	فائدہ عظیمہ
284	او اشد قسوة	266	قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا الْخ
285	احمقوں کی جنت میں بسنے والے	267	وانا ان شاء الله لمهتدون
287	آئیے چند مثالوں کی طرف توجہ فرمائیں	268	قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ الْخ
291	فائدہ	269	وہ ذبح کیوں نہیں کرنا چاہتے تھے؟
292	قرآن پاک کی فصاحت کیا خوب ہے		بہت بھاری قیمت سے گائے حاصل
293	تعظیم باری تعالیٰ کا پاس	270	کرنے کی وجہ
294	اَفَتَطْمَعُونَ اَنْ يُؤْمِنُوا لَكُمْ الْخ	271	گائے ذبح کرنے میں حکمت
294	مختصر مطلب	271	فائدہ
294	شان نزول	272	وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَآذًا رَأْتُمْ الْخ
295	افتطمعون	273	والله مخرج ما كنتم تكتمون
295	ان يؤمنوا لكم	274	فائدہ
296	وقد كان فريق منهم يسمعون	274	قابل توجہ

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
316	انہوں نے تبدیل کیا	297	قائدہ
316	وللآخرة خير لك من الاولى	298	اعتراض ، جواب ،
317	نکتہ	298	تنبیہ
318	فائدہ جلیلہ	299	وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا بِخ
	قرآن پاک کا نسخہ بیچنے کے جواز	299	مختصر مطلب
319	پراجماع امت ہے	300	شان نزول
319	تنبیہ	301	وَإِذَا خَلَا بِعَضُهُم إِلَى بَعْضٍ
321	وَقَالُوا لَنْ تَمْسَنَا النَّارُ الْخ	302	لیحاجو کم بہ
321	شان نزول	305	أَفَلَا تَعْقِلُونَ
326	دینی طلباء کرام کے لئے	306	أَوَلَا يَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ
327	تنبیہ ، اعتراض ، جواب	307	وَمِنْهُمْ أُمِّيُونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ الْخ
328	جواب دوم، جواب سوم، جواب چہارم	308	تنبیہ
329	بَلَى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَأَحَاطَتْ بِهِ الْخ	309	وَمِنْهُمْ أُمِّيُونَ
330	یہود دو وجہ سے مذمت کے مستحق ہوئے	309	لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ
330	فصاحت قرآن	310	تنبیہ
332	وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ الْخ	311	تنبیہ
333	نکتہ	312	وَأَن هُمْ لَا يَظُنُونَ
334	فائدہ جلیلہ	312	فائدہ
335	تنبیہ	313	فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ يَكْتُمُونَ الْكِتَابَ الْخ
336	وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَآئِيلَ الْخ	314	ایک لفظ کثیر معانی پر مشتمل ہے
	اللہ تعالیٰ کی عبادت کے بعد والدین	315	تمام معانی کا مطلب ایک ہے

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
	ماں باپ کی وفات کے بعد ان سے	338	سے بھلائی کے ذکر کی وجوہ
351	حسن سلوک کا حکم	340	مسئلہ
352	خدا را انصاف کریں	341	والدین سے احسان کا مطلب
	نبی کریم ﷺ کا دودھ پلانے والی	342	ماں باپ کی فرمانبرداری
353	ماؤں کا احترام	342	ماں کا حق سب سے زیادہ کیوں؟
	نبی کریم ﷺ کا اپنی پرورش کر نیوالی		ماں، باپ سے محبت خیر و برکت
353	کی زیارت کرنا	343	کا ذریعہ ہے
	کسی کے ماں باپ کو گالیاں دینے سے	344	ماں باپ انسان کیلئے جنت و دوزخ ہیں
354	منع کرنے میں حکمت		ماں باپ کو رحمت سے دیکھنا حج
354	فائدہ عظیمہ	344	کا ثواب ہے
356	نکتہ عظیمہ ، فائدہ جلیلہ	245	وضاحت حدیث
357	اہل قرابت کی دو قسمیں	345	ماں باپ کی نافرمانی ناقابل معافی جرم ہے
358	نکتہ، دیگر		ماں باپ کی خدمت جہاد اور ہجرت
359	مسئلہ	346	سے پہلے
360	یتیم کی پرورش مستحسن کام	346	ماں باپ سے احسان کی تین قسمیں
361	والمساکین	348	مسئلہ
362	مساکین پر رحم کرنا		ماں باپ کے ساتھ احسان کرنے
363	تنبیہ	349	کے آداب
364	ایک اور قول		بڑھاپے میں ماں باپ سے زیادہ
366	محاکمہ	350	شفقت و محبت کا حکم دیا گیا
368	تنبیہ	350	وضاحت حدیث

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
404	تاریخ واقعات کو دہرا رہی ہے	369	اعتراض، جواب
405	وَقَالُوا قُلُوبُنَا غُلْفُ الْخ	370	گذشتہ سے پیوستہ
406	قدرے تفصیل	371	وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ الْخ
406	تین معانی واضح ہیں	377	تنبیہ
409	وضاحت حدیث	381	ثُمَّ أَنْتُمْ هَؤُلَاءِ تَقْتُلُونَ أَنْفُسَكُمْ الْخ
410	وضاحت حدیث	383	نکتہ
411	یزید پر لعنت کا حکم	385	اعتراض، جواب
411	قول فیصل	386	حضرت عبداللہ بن سلام کا قول
413	وَلَمَّا جَاءَهُمْ كِتَابٌ مِّنْ عِنْدِ اللَّهِ الْخ		قیدیوں کو چھڑانے کا حکم شریعت
417	وسیلہ کے متعلق ارشادات مصطفوی	388	مصطفوی میں
418	دوسری وجہ شان نزول کی	289	یاد رفتگان
419	تمام معانی ایک جگہ جمع کریں	389	ضمیر شان اور ضمیر مبہم میں فرق
420	اعتراض، جواب	390	فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلُ ذَلِكَ مِنْكُمْ
421	ضیاء النبی سے اقتباسات	391	دنیا میں ان کی ذلت ایسے کو تیسرا
421	حضور ﷺ کا ذکر خیر توراۃ و انجیل میں	392	ایک غلط فہمی کا ازالہ
	نبی کریم ﷺ کو پہچاننے کے باوجود	395	أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرُوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا الْخ
422	انکار کی ایک مثال	396	وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَقَفَّيْنَا الْخ
423	بِسْمَا اشْتَرَوْا بِهِ أَنْفُسَهُم الْخ الآية	400	تنبیہ۔ فائدہ
428	غضب علی غضب کے معانی میں وسعت	401	فائدہ جلیلہ
430	وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا بِمَا آتٰنَا اللَّهُ الْخ	403	کفار کا مطالبہ
433	طلباء کرام توجہ فرمائیں	403	یہود و ہنود کا اشتراک

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
470	تنبیہ	436	نکتہ
474	مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَرُسُلِهِ الْخ	437	وَلَقَدْ جَاءَكُمْ مُوسَىٰ بِالْبَيِّنَاتِ الْخ
475	جبرائیل و میکائیل کو علیحدہ ذکر کرنے کی وجہ	440	عجیب نکتہ
477	وجہ تسمیہ	441	وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا الْخ
478	لفظ جبریل کے متعلق	442	تنبیہ
478	لفظ میکائیل کے متعلق	443	فائدہ عظیمہ
478	جبریل کی افضلیت	447	قُلْ إِنْ كُنْتُمْ لَكُمْ الدَّارُ الْآخِرَةُ الْخ
479	وَلَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ الْخ	447	شان نزول میں چند وجوہ
480	وہ آیات کیا ہیں؟	449	بہت خوبصورت عبارت
481	آیات کی وجہ تسمیہ	450	موت اور شیر خدا
482	اعتراض جواب	451	حضرت عمارؓ اور موت
483	فسق کا لغوی معنی	451	حضرت حذیفہؓ اور موت
483	فسق کے قریب فحور	452	یہود اگر موت کی تمنا کر لیتے
485	أَوْ كَلَّمَا عَلَيْهِمْ وَأَعْلَمُوا الْخ	453	موت کی تمنا اور دعا کا حکم
485	شان نزول میں چند وجوہ	455	رب کی ملاقات کا شوق
488	وَلَمَّا جَاءَهُمْ رَسُولٌ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ الْخ	458	وَلَنْ يَسْمَنُوهُ أَبَدًا الْخ
493	وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيَاطِينُ الْخ	459	تنبیہ
493	فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهِ الْخ	461	نکتہ
495	سحر کا اصطلاح شرح میں معنی	462	وَلَتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلَىٰ حَيَاةِ الْخ
495	سحر قولی	466	قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلْجَبْرِيلِ..... الْخ
495	سحر عملی، سحر اعتقادی	466	شان نزول

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
511	ضابطہ	496	سحر اور معجزہ اور کرامت میں فرق
	سلیمان علیہ السلام کو انہوں نے	498	سحر کے اثرات
512	جادو گر کیوں کہا؟	499	ساحر کا حکم
515	ہاروت و ماروت کی وجہ تسمیہ	500	جادو کی اقسام
516	فائدہ	501	نمرودی جادو کی مثالیں
	ہاروت اور ماروت کے متعلق	503	دوسری قسم
522	اسرائیلی روایات	503	تیسری قسم
524	اسرائیلی روایات کون سی ہیں؟	504	چوتھی قسم
524	اسرائیلی روایات کا مفسرین کرام نے رد کیا	504	پانچویں قسم
525	تنبیہ	505	چھٹی قسم
527	ہاروت اور ماروت کے آنے کی فقط یہ وجہ	505	ساتویں قسم
527	ایک سوال اور اس کا حل	506	آٹھویں قسم
528	نبی کریم ﷺ پر جادو	506	آخری تین قسموں کا حکم
529	وضاحت	506	جادو کی پہلی قسم کا دفاع
531	وَلَوْ أَنَّهُمْ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَمَثُوبَةٌ إِلَيْهِمْ بِمَا فِيهَا	506	دوسری قسم کا دفاع
532	الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا إِلَيْهِمْ	507	تیسری قسم کا دفاع
532	شان نزول	507	چوتھی قسم کا دفاع
534	ایک عظیم نکتہ	508	پانچویں قسم کا دفاع
537	مقام توجہ	508	تعویذات کا حکم
	گناہوں کے اسباب سے بچنا بھی	509	فائدہ جلیلہ
538	ضروری ہے	510	مسئلہ

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
565	بحیثیت نفع مند ہونے کے نسخ کی تین قسمیں	541	مَا يَوْذُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ
568	منکرین نسخ کے دلائل	541	شان نزول
570	نسخ کے جواز پر دلائل	542	شان نزول کی ایک اور وجہ
572	أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ	543	مقام توجہ
574	ولی اور نصیر میں فرق	545	ایک عظیم نکتہ
575	أَمْ تَوَيْلُونَ أَنْ تَسْأَلُوا رَسُولَكُمْ الْخ	546	مقام توجہ
575	پہلا احتمال	547	مَا نَسَخَ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا الْخ
577	تنبیہ	547	شان نزول
580	دوسرا احتمال	547	نسخ کے معانی
581	تیسرا احتمال	548	نسخ اور متقدمین و متاخرین علماء کرام
581	تمام احتمالات اجتماعی طور پر مراد ہیں	548	اس پر مفتی محمد شفیع صاحب نے یوں تبصرہ کیا
583	وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ الْخ	550	نسخ کا علم عظیم ہے
583	شان نزول	551	نسخ کی حقیقت کو سمجھیں
584	شان نزول کی اور وجہ	552	نسخ حکمت باری تعالیٰ کا ایک کرشمہ ہے
	عبداللہ بن ابی کا حسد کرنا اور نبی کریم ﷺ		
587	کا معاف کرنا	552	قرآن پاک میں کوئی اختلاف نہیں
589	حسد کے متعلق علامہ رازی کا تفصیلی بیان	553	نسخ کی بحیثیت حکم و تلاوت تین قسمیں
590	حسد کی مذمت میں احادیث	556	نسخ بحیثیت نسخ کے چار قسم ہے
592	حسد کی مذمت میں آثار	557	وضاحت حدیث
593	حسد کیا ہے؟	558	تنبیہ
595	منافسہ اور غبطہ کا حکم	561	نسخ الکتاب بالسنتہ میں امام شافعی کا موقف

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
626	تیسرا، چوتھا مسئلہ	595	حاصل کلام
626	معاصی	595	منافسہ کے جواز پر دلائل
627	طاعات	596	منافسہ محضہ
628	مباحات	597	منافسہ مستلزم حسد یہ ہے
630	وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصْرَى الْخ	597	حسد سے نکلنا قوت ارادیہ پر مبنی ہے
630	مختصر مطلب	597	حسد کے مراتب
631	کچھ تفصیل	598	حسد کے اسباب
634	وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَنَعَ مَسْجِدَ اللَّهِ الْخ	602	حسد کے اسباب سے سمجھ آیا
634	شان نزول	603	حسد سے بچنے کا ذریعہ
635	تنبیہ		جس سے حسد کیا جائے اس کا دین
637	اعتراض، جواب	604	اور دنیا میں کوئی نقصان نہیں
643	عمارة المسجد ؟	606	عمل سے حسد کا زوال
645	مسجد کے فضائل و آداب	606	آیہ کریمہ سے حاصل ہونیوالے مسائل
646	تعمیر مسجد ذریعہ جنت	607	اعتراض، جواب
646	مساجد اللہ کی پسندیدہ جگہیں ہیں	608	وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ الْخ
647	اللہ تعالیٰ کو بازار کیوں ناپسند ہیں؟	610	تنبیہ، حکمت
	مسجد میں آمد و رفت سے جنت	613	وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ الْخ
648	میں مہمان نوازی	613	شان نزول
	مسجد میں دور سے چل کر آنا زیادہ	617	اعتراض، جواب
649	ثواب کا سبب ہے	619	بَلَى مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ الْخ
	مسجد سے دل لگانے والا اللہ کی	624	فائدہ جلیلہ، مسئلہ
		625	دوسرا مسئلہ

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
664	ایک غلط فہمی کا ازالہ	650	رحمت کے سایہ میں
666	راقم کا موقف	651	تحیۃ المسجد
666	مساجد میں شور و غوغا، قیامت کی نشانی	651	تحیۃ المسجد کا بدل
667	مسجد تا قیامت مسجد ہے	653	مسجد میں داخل ہونے کی دعا
669	وقف کرنے کیساتھ ہی مالک کی ملکیت ختم	653	مسجد سے باہر نکلنے کی دعا
670	مسجد کو شہید کر کے نئی مسجد بنانے کا حکم	653	دونوں دعاؤں میں وجہ فرق
670	کشادگئی مسجد	654	فائدہ جلیلہ
671	الٹی چال	654	مسجد سے نکلتے ہوئے یہ بھی پڑھے
	مسجد کی توسیع کیلئے ساتھ والی زمین		مسجد میں سوال کرنا اور مسائل کو عطا
671	قاضی جبرائیل	655	کرنے کا حکم
	مسجد تعمیر ہو جانے کے بعد نیچے	655	محاکمہ
672	یا اوپر دکانیں بنانا منع ہے	657	بدبودار چیز کھا کر مسجد میں نہ جائے
673	عارضی مسجد حکم مسجد میں نہیں	657	مسجد میں خوشبو لگانا مستحب ہے
	مرض موت میں اپنے مکان کو مسجد	659	مسجد میں سونے کا حکم
673	بنانے کا حکم	661	مسجد میں سونے کی دوسری خرابی
674	مسجد کی جگہ کو بیچنا جائز نہیں		مسجد میں خرید و فروخت اور گرم شدہ
674	امام اور مؤذن کی رہائش کا حکم	661	چیز کا اعلان منع ہے
675	مسجد سے گزرنے کا حکم	663	فائدہ عظیمہ
675	مسجد کی زمین کو فروخت کرنا جائز نہیں	663	حضرت عمرؓ کا محبت بھرا ارشاد
676	مسجد کی زمین کو کسی اور تصرف میں لانا منع ہے		نبی کریم ﷺ کے قرب کی وجہ سے
676	بوقت مشکل مسجد کا مال بطور قرض لینا	664	افضلیت کیوں؟

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
695	ممکن لذاتہ کیوں؟	676	مسجد کے مال کو کیسے خرچ کیا جائے؟
696	رب تعالیٰ کی اولاد ماننا اسے گالی دینا ہے	677	مسجد کو برباد کرنے والے ظالم ہیں
698	سوال، جواب	678	مسجد کو برباد کرنے کی دو قسمیں ہیں
699	رب تعالیٰ کی اولاد ماننے کا وبال دنیا میں	679	مقام حیرت!
700	اعتراض، جواب	679	اعتراض
700	نکتہ، مقام توجہ	680	مغصوبہ زمین پر بنائی گئی مسجد میں اعتکاف
701	خلاصہ کلام	681	وَاللّٰهُ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ الْخ الْآیۃ
702	بَدِيعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْخ	681	شان نزول
702	مختصر مطلب	683	نجاشی کا جنازہ پڑھانے کی حکمت
702	قدرے تفصیل	684	فائدہ
703	ان اصطلاحات میں فرق	685	دلیل، اعتراض، جواب
704	طلباء کرام توجہ فرمائیں	687	قبلہ کے متعلق مسائل
705	علامہ قرطبیؒ کی وضاحت	689	مسئلہ
706	بدعت قبیحہ کیا ہے؟	690	سمت قبلہ کے معلوم کرنے کا طریقہ
706	بدعت کی دو قسموں کا ثبوت حدیث پاک سے	691	فائدہ جلیلہ
707	اقسام بدعات	692	مسئلہ
707	واجب، حرام، مستحب	693	وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَہُ الْخ
707	مکروہ، مباح۔	693	شان نزول
708	قضاء کے مختلف معانی استعمال ہیں	694	ان کا قول اولاد کے متعلق کیسے تھا؟
	قرآن پاک میں ”امر“ کئی معانی	694	اولاد کے تقاضا کرنے والے اسباب
709	میں استعمال ہوا ہے	695	مخلوق اولاد نہیں ہو سکتی
710	عقیدہ، اعتراض، جواب		واجب لذاتہ کے بغیر تمام چیزیں

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
731	مسک اوّل کے شواہد	711	ایک اشکال کا حل
734	اس پر اہل علم کے بہت دلائل ہیں	713	وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ الْخ
735	”آرز“ حضرت ابراہیم کا چچا تھا!	713	مختصر مطلب
740	تیسرا، چوتھا مسک	713	ما قبل سے تعلق
741	اعتراض، جواب	714	شان نزول
742	آیت کریمہ کا شان نزول، (سند صحیح سے)	717	ان کی نادانی پر تعجب
743	اعتراض، جواب	717	نکتہ
744	معمر کی روایت کی مؤید روایات	718	روشن نشانیوں کا انکار
746	نکتہ	720	إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا الْخ
747	مسلم کی روایت میں غلطی کی وجوہ!	720	شان نزول
747	پہلی وجہ، دوسری وجہ	722	حق سے مراد
747	حدیث بالمعنی کی اور مثال	722	تنبیہ
748	تیسری وجہ	723	شان نزول میں ایک ضعیف روایت
749	چوتھی وجہ	726	افضل الانبیاء بزبان افضل الانبیاء
751	پانچویں وجہ	727	تنبیہ
752	متنا مضطرب کی ایک مثال	278	قول صحابی
753	فقہ اکبر میں راقم کا موقف	728	مقام یوسف بزبان سید الانبیاء
754	معاملہ قسمت کا	729	خاندانی عیب (گھٹیا کفو)
	میت کو تکلیف دینا ایسا ہی ہے جیسے زندہ	730	ایمان والدین کریمین کے متعلق مسالک
755	کو تکلیف دینا!	730	اہل علم کا پہلا مسک
756	رسول اللہ ﷺ کو ایذا پہنچانا	730	دوسرا مسک
756	اولیاء اللہ کو ایذا پہنچانا	731	تیسرا، چوتھا مسک

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
779	حضرت ابراہیم کا نسب	757	رسول اللہ ﷺ کو ایذا دینا باعث کفر ہے
780	امتحان مطابق شان	757	مومنوں کو ایذا دینا
780	کلمات سے مراد ستارے، چاند اور سورج	758	نتیجہ
782	کلمات سے مراد ذبح و لد		قبور کو مسمار کرنے سے مسلمانوں کی
782	کلمات سے مراد آگ	758	دل آزاری ہوتی ہے!
783	کلمات سے مراد ہجرت	759	وَلَنْ تَرْضَى عَنْكَ الْيَهُودُ الْخ
784	کلمات سے مراد شرائع اسلام	759	شان نزول
784	ان میں سے دس کا ذکر سورۃ براءۃ میں ہے	760	فائدہ، اعتراض، جواب
784	اور دس کا ذکر احزاب میں ہے	761	ملت کیا ہے؟
	اور دس کا ذکر سورۃ مومنون اور	763	انتباہ
785	معارض میں ہے	764	یوں بھی کہا جاسکتا ہے
785	کلمات سے مراد مناسک حج	765	الَّذِينَ اتَيْنَهُمُ الْكِتَابَ يَتْلُونَهُ الْخ
786	کلمات سے مراد دس سنن	766	فائدہ
786	تنبیہ	768	وَمَنْ يَكْفُرْ بِهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُونَ
787	شاندار تحقیق	769	تنبیہ
787	تنبیہ ضروری	770	يٰۤاَيُّهَا اِسْرٰٓئِیْلُ اذْكُرُوْا الْخ
788	ابراہیم سے تمام امتحان لئے گئے	770	وَاتَّقُوا يَوْمًا لَا تَجْزِی الْخ
	ابراہیم کے امتحانات قبل از نبوت ہوئے	771	مکرر ذکر کیوں؟
788	یا بعد از نبوت؟	771	چند الفاظ مبارکہ میں فرق
789	شاندار محاکمہ	773	خلاصہ کلام
789	راقم کا موقف	774	وَإِذْ ابْتَلٰٓ اِبْرٰٓهٖمَ رَبُّہٗ بِکَلِمٰتٍ الْخ
790	امام لغوی معنی کے لحاظ سے عام ہے	777	تنبیہ

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
808	دونوں حدیثوں میں تطبیق	792	زیر بحث آیت میں امام سے مراد کیا؟
809	بغلوں کے بال دور کرنا	792	ابراہیم کی امامت عامہ کا تقاضہ نبوت
809	استنجاء کرنا	793	نبی کا معصوم ہونا ضروری ہے
809	ناخن کاٹنا	794	نکتہ، فائدہ جلیلہ
810	حل اللغات، ہراجم، لثالثہ، تسننوا	795	شیعہ اور امامت
811	کلی کرنا	795	شیعہ حضرات کی طرف سے اعتراض
811	ناک میں پانی ڈالنا	796	جواب
811	مسواک کرنا	797	امام ابوحنیفہ کا مسلک
811	مسواک کے اوقات مستحبہ	798	اس مسئلہ پر ائمہ اور علماء کا اتفاق ہے
812	مسواک کیسی ہو	798	آیت کریمہ سے عصمت انبیاء ثابت ہے
812	مونچھوں کا کاٹنا	799	فائدہ عظیمہ
812	فائدہ	800	ایک اور وجہ دیکھیں
813	مقام توجہ	801	اسی مسئلہ پر اور دلیل
814	مونچھیں کٹائیں، منڈائیں نہیں	801	اسی مسئلہ کو اس طرح سمجھیں
	ناخن اور بال وغیرہ کتنی مدت	802	اسی مسئلہ پر توجہ فرمائیں
815	میں کاٹے جائیں؟	803	اے اللہ تو کریم ہے ہم عاجز بندے
816	راقم کا موقف	804	سنن ابراہیمی پر قدرے تفصیل
817	مانگ نکالنا	804	مسئلہ
817	ابراہیم کے بالوں کا سفید ہونا	805	فائدہ جلیلہ
818	مسئلہ	806	اعتراض، جواب
819	مسئلہ خضاب	807	بالغ ہونے کے بعد اسلام قبول کرنے کیلئے
820	سیاہ خضاب کے متعلق	808	زیر ناف بال مونڈنا

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
850	وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَذَا بَلَدًا آخِ	822	راقم کا موقف
852	تنبیہ	823	وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمَّا الْخ
854	اعتراض، جواب	826	اعتراض، جواب
856	نبوت اور رزق دنیا میں فرق	827	مسئلہ
857	قلیل نفع کا مطلب	827	کیا خواب امن
861	فائدہ جلیلہ	828	مسئلہ
962	وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ الْخ	830	مقام ابراہیم کیا ہے؟
863	علمی نکتہ	838	حجر اسود اور مقام ابراہیم جنتی یا قوت ہیں
864	کعبہ شریف کی تعمیر	838	تعمیر کعبہ
865	فائدہ جلیلہ	838	آدم علیہ السلام کی تعمیر
865	غزالی دوراں علامہ کاظمی کی تفسیر سے اقتباس	840	ابراہیم علیہ السلام کی تعمیر
866	آپ کی عمر کتنی تھی؟	841	ابراہیم علیہ السلام کی تعمیر کے بعد
867	راقم کا موقف	841	قریش کی تعمیر
869	اس دعا میں ایک لطیف اشارہ	842	حضرت عبداللہ بن زبیر کی تعمیر
870	اعتراض، جواب	842	کعبہ کی موجودہ تعمیر
871	رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمِينَ لَكَ الْخ	843	تنبیہ
872	بعض اولاد کیلئے دعاء کیوں؟	845	اعتراض، جواب
876	اسی بحث سے گمراہوں کا رد ہو گیا	846	مسئلہ
877	رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ الْخ	847	فائدہ
879	حدیث اور اس کی وضاحت	848	طواف کی اقسام
880	ایک شبہ کا ازالہ	849	مسئلہ
881	عجیب حکمت	850	رمل کے سنت ہونے کی وجہ

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
910	شان نزول	883	تلاوت چند وجہ سے مطلوب ہے
911	عقیدہ	885	حکمت کیا ہے؟
914	وضاحت حدیث	888	پاکیزہ کرنے کی دعاء میں حکمت
915	تراجم کافرق	888	نبی کریم ﷺ کا پاکیزہ کرنا
916	فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ الخ	889	فائدہ
916	مختصر مفہوم	890	وَمَنْ يَرْغَبُ عَنْ مِلَّةِ إِبْرَاهِيمَ الخ
917	اعتراض، جواب	890	شان نزول
920	تسکین الجنان سے اقتباس	893	تراجم کا تقابلی جائزہ
921	وهو السميع العليم	894	تنبیہ
922	حضرت عثمان غنیؓ کے خون کا پہلا قطرہ	895	إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمُ الخ
922	حق گوئی کی درخشاں مثال	896	وَوَصَّى بِهَا إِبْرَاهِيمُ بَنِيهِ وَيَعْقُوبُ الخ
923	صِبْغَةَ اللَّهِ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ صِبْغَةً الخ	898	تنبیہ ، فائدہ
923	شان نزول	900	أَمْ كُنْتُمْ شُهَدَاءَ إِذْ حَضَرَ الخ
924	فائدہ جلیلہ	900	شان نزول
926	قُلْ أَتَحَاجُّونَنَا فِي اللَّهِ الخ	803	اعتراض، جواب
926	شان نزول	903	آیہ کریمہ سے حاصل ہونیوالے مسائل
930	عظمت قرآن	904	تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ الخ
931	أَمْ تَقُولُونَ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ الخ	905	شان نزول
931	شان نزول	907	وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَى الخ
932	استفہام انکاری سے غرض زجروتو بیج ہے	907	شان نزول
934	تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ الخ	909	تنبیہ ، فائدہ
936	تنبیہ	910	قُولُوا آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ الخ

يٰۤاَيُّهَا اِسْرَآئِيْلُ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ
وَ اِنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ عَلٰی الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱﴾

☆ ”اے اولاد یعقوب یاد کرو میرا وہ احسان جو میں نے تم پر کیا اور یہ کہ اس سارے
زمانہ پر تمہیں بڑائی دی۔“

☆ ”اے اولاد یعقوب یاد کرو میری نعمتوں کو جو میں نے انعام کی ہیں تم پر۔ اور بیشک
میں نے تمہیں فضیلت دی اس زمانے والوں پر۔“

يٰۤاَيُّهَا اِسْرَآئِيْلُ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ:

اس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ پھر دوبارہ ذکر کیا گیا ہے اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی ایک وجہ یہ ہے:

”انما اعاد هذا الكلام مرة اخرى تو كيدا للحجة عليهم وتحذيرا من

(خازن)

ترك اتباع محمد ﷺ“

اس کلام کو دوبارہ اس لئے ذکر کیا گیا تاکہ ان پر حجت قائم کرنے میں دوبارہ تاکید قائم

کی جاسکے اور ان کو نبی کریم ﷺ کی اتباع کے چھوڑنے سے ڈرایا جاسکے۔

اور وجہ یہ تھی کہ بنی اسرائیل کو دوبارہ نعمتیں یاد دلانے میں جہاں ایک حکم کو زیادہ تاکید سے ذکر کرنا
مقصود تھا۔ وہاں یہ بتانا بھی ضروری سمجھا گیا کہ یہ لوگ اتنے غافل ہیں کہ ایک مرتبہ ان کو یاد دلایا جائے تو یہ
یاد نہیں کر سکتے اس لئے ان کو بار بار یاد دلانا ان کی غفلت کو واضح کر دیا گیا۔

پہلے صرف نعمتوں کا ذکر کیا گیا۔ اب نعمتوں کے ذکر کے ساتھ ساتھ رب تعالیٰ کے عذاب اور اس

کی گرفت کا ذکر بھی کیا جا رہا ہے تاکہ ترغیب اور ترہیب دونوں کا ذکر ہو جائے، گویا کہ ان کو یوں کہا گیا ہے۔

اے بنی اسرائیل ”ان لم تطيعوني فاطيعوني للخوف من لواحق عقابي“

اگر تم میری اطاعت میری نعمتوں کی وجہ سے نہیں کرتے جن نعمتوں کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے تو میرا عذاب جو

تمہیں لاحق ہونے والا ہے اس کے خوف سے میری اطاعت کرو۔

(روح المعانی)

یا یوں کہا جائے کہ گویا رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿اِنْ لَّمْ تَطِيعُوْنِيْ لَاجِلْ سَوَآلِیْ نِعْمَتِيْ

علیکم فاطیعونی للخوف من عقابی فی المستقبل ﴿

اگر تم ماضی کی میری نعمتوں کو یاد کر کے میری اطاعت نہیں کرتے تو مستقبل کے میرے عذاب سے ڈر کر میری اطاعت کرو۔

(کبیر)

﴿وَأَنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ﴾ : ”اور بیشک میں نے تمہیں فضیلت دی“ فضیلت بھی نعمت ہے جب پہلے تمام نعمتوں کا ذکر کر دیا گیا تو فضیلت کو علیحدہ ذکر کیوں کیا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں قاعدہ ”تخصیص بعد از تعمیم“ پایا گیا ہے کیونکہ ”التفضیل هو اجل النعم“ بنی اسرائیل کو فضیلت دیا جانا تمام نعمتوں سے عظیم نعمت تھی، اس لئے عام نعمتوں کے بعد اس کی خصوصیت کے پیش نظر اسے علیحدہ ذکر کر دیا گیا۔

(از روح المعانی)

بنی اسرائیل کو فضیلت کیادی گئی؟

یہاں بھی خطاب اگرچہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے بنی اسرائیل کو ہے، لیکن انہیں وہ نعمتیں اور وہ فضیلت یاد دلانی جارہی جو ان کے آباؤ اجداد کو حاصل تھیں۔

اور یہ بھی خیال رہے کہ اس فضیلت سے مراد ان اسلاف یعنی آباؤ اجداد کی وہ فضیلت معتبر ہے جو موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بعد انہوں نے جب تک دین کو نہیں بدلا تھا۔ جب انہوں نے دین کو بدل دیا تو وہ رب تعالیٰ کی رحمت سے دور ہو گئے، اور اس کے غضب کے مستحق ہو گئے۔ ان کی فضیلت کو علامہ مظہری رحمہ اللہ نے ان الفاظ سے ذکر فرمایا:

”فضلهم الله بما منح عليهم من النبوة والكتاب والايمان والعلم

والاعمال الصالحة والملك والعدالة ومناصرة الانبياء“ (مظہری)

اللہ تعالیٰ نے ان کو نبوت عطا کر کے فضیلت دی۔ یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام کے

بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک آنے والے تمام انبیاء کرام بنی اسرائیل سے ہی ہوئے

اور کتاب (توراة، زبور، انجیل) ان کو عطا ہوئی، ایمان ان کو نصیب ہوا، علم ان کو دیا

گیا۔ نیک اعمال کی توفیق ان کو بخشی گئی، بادشاہت ان کو حاصل رہی، عدالت ان کو

حاصل ہوئی، اور انبیاء کرام کی امداد کی توفیق انہیں عطا ہوئی۔

جب ان کے آباؤ اجداد کو ان چیزوں سے فضیلت دی گئی تو یقیناً ان کے لئے بھی وہ نعمت اور فضیلت پائی گئی، اس لئے کہ ”فضل الآباء یوجب شرفاً فی الابداء“ آباء کی فضیلت کا شرف ان کی اولاد کو بھی حاصل ہوتا ہے۔ مقصد نعمتوں اور فضیلت کے ذکر کا یہ تھا کہ جب تمہیں معلوم ہے کہ انبیاء کرام کو وحی اور کتاب کے ذریعے رب تعالیٰ نے فضیلت سے نوازا اور تمہارے آباء پر نازل ہونے والی الہامی کتب میں نبی کریم ﷺ کے اوصاف کا ذکر ہے تو جب تک تم نبی کریم ﷺ پر ایمان نہیں لاؤ گے تمہارا اپنی کتابوں پر ایمان ہو ہی نہیں سکتا۔

(از مظہری)

وَإِنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ : یہاں بظاہر یہ سمجھ آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو تمام جہان والوں پر فضیلت دی۔ اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے:

”وهو انه يلزم ان يكونوا افضل من محمد ﷺ وذلك باطل بالاتفاق“

کہ اس سے تو یہ لازم آئے گا کہ وہ نبی کریم ﷺ سے بھی افضل ہوں، حالانکہ یہ تو بالاتفاق باطل ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ تمام مخلوق سے افضل ہیں۔

بلکہ بنی اسرائیل تو نبی کریم ﷺ کی امت سے بھی افضل نہیں ہو سکتے۔ اس لئے کہ نبی کریم ﷺ کی امت کا تمام امتوں سے افضل ہونا رب تعالیٰ نے بیان فرمایا ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ اس کا جواب یہ دیا گیا ”(على العالمين) ای عالمی زمانہم“ بنی اسرائیل کو ان کے زمانے میں دوسرے لوگوں پر فضیلت دی گئی اس سے مراد ان کے آباء ہیں جب تک انہوں نے دین کو نہیں بدلاتھا۔

(از کبیر، بیضاوی، شیخ زادہ)

جلالین اور مظہری میں بھی یہی الفاظ ہیں ”ای عالم زمانہم“ ان کو اپنے زمانہ کے لوگوں پر فضیلت دی گئی تھی۔ صاوی میں ”عالمی زمانہم“ سے تفسیر جلالین میں مذکور ہونے کی وجہ بیان کی گئی ہے:

” (عالمی زمانہم) دفع بذلك ما يقال ان المراد بالعالمين ما سوى

الله فيقتضى ان بني اسرائيل افضل مما سواهم من الاولين والآخرين

فاجاب بان المراد بالعالمين عالمو زمانهم“ (صاوی)

”على العالمين“ سے بظاہر یہ پتہ چلتا تھا کہ ”عالم“ تو اللہ تعالیٰ کے ماسوا تمام مخلوق کو کہا جاتا ہے۔ اس سے تو یہ لازم آئے گا کہ بنی اسرائیل کو تمام پہلے اور بعد میں آنے والے لوگوں پر فضیلت دی

گئی تھی حالانکہ یہ تو درست نہیں کہ ان کو نبی کریم ﷺ اور آپ کی امت پر فضیلت حاصل ہو۔ تو اس کا جواب یہ دیا گیا کہ ”علی العلمین“ سے مراد ”علی عالمی زمانہم“ ہے یعنی ان کو اپنے زمانہ میں دوسرے لوگوں پر فضیلت حاصل تھی۔ کمالین میں اس طرح ذکر کیا گیا:

”یعنی لیس المراد بالعالم جمیع ما سوی اللہ لیلزم تفضیلہم علی
ہذہ الامۃ امۃ محمد ﷺ بل المراد بالعالم کل موجود سواہ فی
ذلک الوقت“

یعنی عالم سے مراد اللہ تعالیٰ کے بغیر جمیع اشیاء نہیں تاکہ بنی اسرائیل کی فضیلت نبی کریم ﷺ کی
امت پر لازم نہ آئے، بلکہ عالم سے مراد اس وقت ان کے بغیر جو بھی تھے ان پر انہیں فضیلت
دی گئی۔

تفاسیر سے جو وضاحت ذکر کی گئی ہے اس کو بھی سامنے رکھیں اور تراجم کو بھی دیکھیں تو انشاء اللہ
اعلیٰ حضرت کا ترجمہ بہت ہی خوب نظر آئے گا:

﴿وَإِنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ﴾

”اور اس کو کہ میں نے تم کو بڑائی دی تمام عالم پر“ (محمود الحسن صاحب)

”تمہیں دنیا کی ساری قوموں پر فضیلت دی تھی“ (سودودی صاحب)

”اور یہ کہ میں نے تم کو جہان کے لوگوں پر فضیلت بخشی تھی“ (فتح محمد صاحب)

”اور وہ جو میں نے تم کو بڑا کیا جہان کے لوگوں سے“ (شاہ عبدالقادر صاحب)

”اور تحقیق میں نے بزرگی دی تم کو اوپر عالموں کے“ (شاہ رفیع الدین صاحب)

”کہ میں نے تم کو تمام دنیا جہان والوں پر فوقیت دی تھی“ (اشرف علی صاحب)

”اور یہ کہ اس سارے زمانہ میں تمہیں بڑائی دی“ (اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی)

تنبیہ: اسی آیت سے بعض لوگوں نے مطلقاً فرشتوں پر انسانوں کی فضیلت ثابت کی کہ

﴿عَلَى الْعَالَمِينَ﴾ میں فرشتے بھی آتے ہیں۔ جب بنی اسرائیل کو تمام جہان والوں پر فضیلت

حاصل ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر انسان کو ہر فرشتے پر فضیلت حاصل ہے۔ یہ قول ان لوگوں کا

باطل ہے اس لئے کہ ﴿عَلَى الْعَالَمِينَ﴾ سے مراد تمام جہان والے ہیں ہی نہیں، بلکہ صرف

بنی اسرائیل کے زمانہ کے لوگ ہیں اسی لئے علامہ بیضاوی نے فرمایا ”واستدل به علی تفضیل البشر علی الملک وهو ضعیف“ اس آیت سے یہ دلیل پکڑنا کہ ہر انسان ہر فرشتے سے افضل ہے درست نہیں۔ یہ دلیل کمزور ہے وجہ وہی ہے جس کا تفصیلی طور پر بیان کیا جا چکا ہے۔

﴿وَاتَّقُوا يَوْمًا لَا تَجْزِي نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ﴾

(۱) ”اور ڈرو اس دن سے جس دن کوئی جان دوسرے کا بدلہ نہ ہو سکے گی، اور نہ کافر کے لئے کوئی سفارش مانی جائے اور نہ کچھ لے کر اس کی جان چھوڑی جائے اور نہ ان کی مدد ہو۔“
(۲) ”اور ڈرو اس دن سے جس دن نہیں بدلہ دے گا کوئی نفس کسی نفس کی طرف سے کچھ (بھی)۔ اور نہیں قبول کی جائے کسی کافر کے لئے کوئی شفاعت۔ اور نہیں لیا جائے گا اس سے کوئی فدیہ اور نہ ہی ان کی مدد کی جائے گی“

بنی اسرائیل کو نعمتیں یاد دلانے کا اصل مقصد یہی تھا کہ وہ نبی کریم ﷺ پر ایمان لائیں پہلے نعمتوں کا ذکر کر کے ان کو ایمان لانے کا حکم دیا گیا۔ اب وعید ذکر کر کے یعنی ڈرا کر ان کو ایمان لانے کے متعلق کہا جا رہا ہے کہ اگر تم نے نبی کریم ﷺ پر ایمان نہ لایا تو رب تعالیٰ کی گرفت میں آ جاؤ گے، پھر تمہیں اس سے چھڑانے والا کوئی نہیں ہوگا۔

سزا سے چھڑانے کے چار طریقوں کی نفی:

کوئی شخص کسی دوسرے کو عذاب سے یا تو قہر و دبدبہ سے چھڑاتا ہے یا اس کے بغیر۔ پہلی صورت یعنی کسی کو زبردستی چھڑالینا نصرت ہے، اس کی نفی بھی کر دی۔ دوسری صورت یعنی زبردستی کسی کو نہ چھڑایا جائے بلکہ سفارش کے ذریعے مفت ہی چھڑالیا جائے اس کی نفی بھی کر دی۔ دوسری صورت یعنی زبردستی کسی کو نہ چھڑایا جائے۔ بلکہ سفارش کے ذریعے مفت ہی چھڑالیا جائے اس کی نفی بھی کر دی۔ تیسری صورت یہ ہے کہ کسی کو چھڑایا جائے لیکن اس کے ذمہ جو حقوق ہیں وہ ادا کر دیئے جائیں اس کی بھی نفی کر

دی چوتھی صورت یہ ہے کہ مال بطور فدیہ دے کر کسی کو چھڑا لیا جائے، اس کی بھی نفی کر دی۔ (بیضاوی)
﴿وَاتَّقُوا﴾: وقی سے ماخوذ ہے جس کا معنی بچنا۔ اصل مطلب ہے بچ جاؤ پھر تقریباً مراد یہی ہے کہ ڈر جاؤ۔

﴿يَوْمًا﴾: ”ای مافیہ من الحساب والعذاب“ یعنی اس دن سے ڈرو جس دن حساب و کتاب ہونا ہے۔ اور اس دن سے ڈرو جس دن کفار کے لئے عذاب ہوتا ہے۔

دینی طلباء کرام کی توجہ کے لئے:

”یوما“ کو ”اتقوا“ کی طرف ظرف نہیں بنایا جاسکتا۔ کیونکہ ڈرنا تو دنیا میں ہے قیامت میں ڈرنا کوئی نفع نہیں دے گا۔ اور ”یوما“ کو مفعول بہ بھی نہیں بنایا جاسکتا کیونکہ دن سے ڈرنا مقصود نہیں، بلکہ مقصود اس دن کے عذاب اور حساب سے ہے۔ اس لئے حذف مضاف ہے یعنی مقصد اس طرح مکمل ہوگا جب کہ عبارت یوں ہوگی:

﴿وَاتَّقُوا عَذَابَ يَوْمٍ وَحِسَابِ يَوْمٍ﴾ اس دن کے حساب اور عذاب سے ڈرو۔

(از شیخ زادہ)

لَا تَجْزِي نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا:

”ای لا تقضی عن غیرھا ولا تؤدی شیاً من الحقوق الفاتئة علی ذلک الغیر“

کوئی نفس کسی دوسرے نفس کے فوت ہونے والے حقوق کو اس کی طرف سے ادا نہیں کر سکے گا۔

فائدہ: جزى عنه کا معنی ہے ”قضی عنه“ اس کی طرف سے ادا کر دیا۔ جیسا کہ حضرت ابو بردہ بن نیار کی حدیث میں مذکور ہے ”تجزی عنک ولا تجزی عن احد بعدک“ یہ چھ ماہ کا بکری کا بچہ تمہاری قربانی کو ادا کر دے گا، لیکن تمہارے بعد کسی اور کی قربانی کو ادا نہیں کرے گا۔ بخاری میں حدیث مذکور ہے:

”ان ابا بردة قال يا رسول الله انى نسكت شاتى قبل الصلوة وعرفت

ان اليوم يوم اكل وشرب واحببت ان تكون شاتي اول ما يذبح في بيتي فزبحتها وتغديت بها قبل ان آتي الصلوة فقال رسول الله ﷺ "شأتك شاة لحم، قال يا رسول الله فان عندنا عناقا جزعة هي احب

الي من شاتين افتجزى عني قال نعم ولا تجزى عن احد بعدك"

حضرت ابو بزرہ نے کہا یا رسول اللہ بیشک میں نے نماز سے پہلے اپنی بکری کو بطور قربانی ذبح کر دیا، کیونکہ میں نے یہی سمجھا کہ یہ کھانے پینے کا دن ہے، اس لئے میں نے یہ پسند کیا کہ میرے گھر میں سب سے پہلے بکری ذبح ہو۔ میں نے بکری کو ذبح کر لیا اور نماز میں آنے سے پہلے صبح صبح کھانا بھی کھا آیا، نبی کریم ﷺ نے فرمایا تمہاری یہ بکری تو گوشت ہی بنی (قربانی تو نماز سے پہلے ادا نہیں ہوتی) انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ میرے پاس چھ ماہ کا ایک بکری کا بچہ ہے جو مجھے دو بکریوں سے بھی زیادہ پسند ہے، کیا وہ میری قربانی ادا کر دے گا۔ آپ نے فرمایا ہاں (تمہاری قربانی تو ادا کر دے گا) لیکن تمہارے بعد کسی ایک کی قربانی ادا نہیں کرے گا۔

اس حدیث پاک کو بیان کرنے سے صرف لفظی تحقیق مراد ہے کہ "لا تجزى" کا معنی

(از شیخ زادہ)

"لا تقضى" ہے۔

ہاں البتہ یہ خیال رہے کہ نبی کریم ﷺ کو رب تعالیٰ نے امور شرعیہ میں مختار بنایا۔ اسی لئے ایک حکم کو ایک صحابی کے لئے جائز رکھا، لیکن دوسروں کے لئے جائز نہیں۔ "لا تجزى" اگر جزاء سے ہو "یا" صرف رسم الخط کے طور پر ہوا صل میں ہمزہ ہو (چونکہ بعض قراءتوں میں ہمزہ سے بھی استعمال ہے) تو معنی یہ ہو گا:

"لو تو اخذ نفس بذنب اخرى ولا تدفع عنها شياً"

"کسی نفس کو دوسرے نفس کے بدلے میں پکڑا نہیں جائے گا کہ ایک نفس دوسرے نفس

کی جگہ عذاب میں مبتلا ہو کر اسے عذاب سے چھڑا لے ایسا نہیں ہو سکے گا۔

تنبیہ: ایسا تو نہیں ہو سکے گا کہ بندہ خود کہے کہ میں کسی کے حقوق ادا کر دیتا ہوں یا یہ کہے کہ

مجھے اس کی جگہ پکڑ لیا جائے اور اسے چھوڑ دیا جائے۔ لیکن یہ ہو سکے گا کہ اللہ تعالیٰ خود کسی کی گرفت کرے اور

بطور سزا اس کے اعمال لے کر دوسرے کے دے دیئے جائیں جیسا کہ حدیث شریف میں ہے:

☆ ”عن ابی ہریرۃ ان رسول اللہ ﷺ قال من كانت عنده مظلمة لأخيه من عرضه او شئ فليتحلله منه اليوم قبل الا يكون دينار ولا درهم ان كان له عمل صالح اخذ منه بقدر مظلمته وان لم يكن له حسنات اخذ من سيئات صاحبه فحمل عليه“.....خرجه البخاری .

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی شخص پر اپنے دوسرے (مومن) بھائی کے حقوق ہوں۔ اس نے کچھ مظالم کئے ہوئے ہوں تو ان حقوق کو ادا کر دے ان مظالم کو معاف کرا لے اس دن سے پہلے جس دن کوئی دینار اور کوئی درهم اس کے پاس نہیں ہوں گے، اس لئے جتنے حقوق اس کے ذمہ ہوں گے ان کے بدلے اس کے نیک اعمال لے کر اس دوسرے شخص کو دے دیئے جائیں گے۔ اگر اس کے نیک اعمال نہ ہوئے تو دوسرے شخص کے گناہ اس کے کھاتہ میں ڈال دیئے جائیں گے۔

(از قرطبی)

☆ ”عن ابی ہریرۃ ان رسول اللہ ﷺ قال اتدرون ما المفلس قالوا المفلس فينا من لادرهم له ولا متاع فقال ان المفلس من امتي من ياتي يوم القيامة بصلوة وصيام وزكاة وياتي قد شتم هذا وقذف هذا واكل مال هذا وسفك دم هذا وضرب هذا فيعطى هذا من حسناته وهذا من حسناته فان فنيت حسناته قبل ان يقضى ما عليه اخذ من خطاياهم فطرحت عليه ثم طرح في النار“

(مسلم ج ۲ باب تحريم الظلم ص ۳۲۸)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا کیا تم جانتے ہو غریب کون ہے؟ صحابہ کرام نے عرض کیا ہم میں غریب وہ ہوتا ہے جس کے پاس مال و متاع نہ ہو، تو آپ نے فرمایا میری امت میں سے غریب وہ ہوگا جس شخص کے پاس قیامت کے دن نمازیں، روزے اور زکوٰۃ (جیسے نیک اعمال) ہوں گے، لیکن اس نے کسی کو گالی دی ہوں گی، کسی کو تہمت لگائی ہوگی کسی کا مال کھایا ہوگا، کسی کا خون بہایا ہوگا، کسی کو مارا ہوگا، تو اس کی نیکیاں ایک کو دی جائیں گی اور دوسرے کو دی جائیں گی اگر اس کے ذمہ جو حقوق تھے وہ ان نیکیوں سے ادا نہ ہوئے تو ان لوگوں کے گناہ اس پر ڈال دیئے جائیں گے اور اسے آگ میں ڈال دیا جائے گا۔

مقام توجہ: علامہ نووی رحمہ اللہ نے اسی حدیث کی شرح میں بیان فرمایا ہے کہ بعض مبتدع فرقہ نے یہ کہا ہے کہ یہ حدیث اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی:

﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَى﴾ ”کوئی نفس کسی نفس کا بوجھ نہیں اٹھائے گا“ کے منافی ہے لیکن ان کا یہ کہنا غلط اور باطل ہے کیونکہ آیت کریمہ اور حدیث پاک میں وجوہ مختلف ہیں۔

حدیث شریف میں ذکر ہے کہ لوگوں کے حقوق اپنے ذمہ لے کر مرنے والے کو اس کے فعل، اس کے اپنے بوجھ، اس کے ظلم کی وجہ سے عذاب دیا جائے گا، اسی عذاب کا یہ حصہ بھی ہوگا کہ لوگوں کے حقوق اس کی طرف متوجہ ہوں گے، اس کی نیکیاں ان کو دے دی جائیں گی۔ جب اس کی نیکیاں ختم ہو جائیں گی اور ابھی لوگوں کے حقوق ختم نہیں ہوں گے تو اللہ تعالیٰ اپنے حکمت کے تقاضا کے پیش نظر اور اپنی مخلوق میں عدل کرنے کی وجہ سے ان کے گناہ اس کے ذمہ لگا دے گا، اور اسے آگ کا عذاب دیا جائے گا۔

”فحقیقة العقوبة انما هی بسبب ظلمه ولم یعاقب بغير جنایة و ظلم منه

وهذا کله مذهب اهل السنة“

اس کو عذاب اس کے ظلم کی وجہ سے ہوگا ایسا نہیں کہ اس کو بغیر کسی جرم اور بغیر کسی ظلم کے عذاب دے دیا جائے یہ سب اہل سنت و جماعت کا مذہب ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اب واضح ہو گیا کہ آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ بغیر جنابت اور بغیر ظلم کے کسی کا بوجھ کسی دوسرے کے سر نہیں ڈالا جائے گا، اور نہ ہی اپنی خوشی سے کسی کا بوجھ کوئی دوسرا اٹھائے گا۔

﴿وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ﴾ : ”اور کسی کافر کی سفارش قبول نہیں کی جائے گی۔“

”الشفاعة ماخوذة من الشفع وهما الاثنان“ شفاعت ماخوذة ہے شفع سے جس کا معنی ہے دو اس کا مقابل لفظ وتر ہے جب کسی کی سفارش کی جاتی ہے تو یقینی بات ہے کہ وہ پہلے ایک ہوتا ہے، اور پھر وہ دو ہو جاتے ہیں۔

زمین پر شفعہ کرنے کا بھی یہی مطلب ہے کہ وہ شفعہ کے ذریعے اپنی زمین سے دوسرے کی زمین کو ملا لیتا ہے یہاں مطلقاً شفاعت کے نہ قبول کا ذکر نہیں بلکہ اس سے مراد کفار ہیں کہ ان کے لئے شفاعت قبول نہیں۔

(از قرطبی)

شفاعت کا تفصیلی ذکر انشاء اللہ آیت کریمہ کی لفظی بحث کے بعد کیا جا رہا ہے۔

﴿وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ﴾ : اور کسی نفس کا فدیہ نہیں لیا جائے گا۔ العدل (بفتح العين)

فداء، و بکسرھا المثل۔ عدل کو جب عین کے فتح سے پڑھا جائے تو اس کا معنی فدیہ، اور جب عین کے کسرہ سے پڑھا جائے تو اس کا معنی ہے مثل، یہاں پہلا معنی ہی معتبر ہے۔

﴿يَوْمَ لَا هُمْ يَنْصُرُونَ﴾: ای یعانون، والنصر، العون، والانصار، الاعوان

اور ان کی مدد نہیں کی جائے گی، نصر کا معنی ہے مدد کرنا، اور انصار کا معنی مددگار۔ (از قرطبی)

نصرت اور معونت میں فرق:

”والنصر اخص من المعونة لاختصاصه بالضر والشدائد

بخلاف المعونة فانها قد تكون لاقامة الصنائع والاعمال“

(بیضاوی مع شیخ زادہ)

نصرت نسبت معونت کے خاص ہے کیونکہ نصرت اسی امداد سے خاص ہے جس کی وجہ سے مشکلات کو دور کیا جائے۔ لیکن معونت عام ہے اس لئے کہ معونت میں وہ معنی بھی پایا جاتا ہے جو نصرت میں پایا جاتا ہے لیکن اس میں یہ معنی بھی پایا جاتا ہے کہ کسی کی صنعت اور عمل میں امداد کی جائے۔

لیکن یہ بھی خیال رہے کہ یہ فرق تو حقیقی معنی کے لحاظ پر ہے مجازی معنی کے لحاظ پر نصرت بھی عام معنی میں استعمال ہوتا رہتا ہے، یعنی مطلقاً امداد کرنا نصرت کہلاتا ہے خواہ مشکلات کے دور کرنے میں امداد کی جائے، خواہ کسی کے کام میں اس کی امداد کی جائے۔

شفاعت کی بحث: شفاعت کا لغوی معنی پہلے عرض کر دیا گیا ہے شفاعت کا اصطلاحی معنی یہ ہے:

”الشفاعة ان يستوهب احد لا حد شياً ويطلب له حاجة“

شفاعت کا مطلب یہ ہے کوئی شخص دوسرے کے لئے بخشش کا مطالبہ کرے اور اس کے لئے حاجت طلب کرے۔

اس آیت کریمہ میں شفاعت کی نفی کفار کے لئے ہے:

﴿وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ﴾ ای النفس المؤمنة لا تقبل شفاعتها في النفس الكافرة“

یعنی کسی مومن کی طرف سے کافر کے حق میں کوئی شفاعت قبول نہیں کی جائے گی۔

اسی سے یہ واضح ہو گیا کہ کافر کے لئے جب مومن شفاعت نہیں کر سکے گا تو کافر کے لئے کافر کی

شفاعت کرنا تو عقلاً محال ہے۔

تنبیہ: ”لم يؤذن لها في اصل الشفاعة حتى يتسبب عنها القبول وليس

المراد انها تشفع ولكن لا يقبل منها تلك الشفاعة لقوله تعالى فما لنا من شافعين“

مومنوں کو یہ حق ہی نہیں دیا جائے گا کہ وہ کافروں کے لئے شفاعت کریں۔ جب ان کو یہ حق ہی حاصل نہیں ہوگا تو یقیناً قبول کرنے کی کوئی صورت ہی نہیں ہوگی۔ آیت کریمہ کا یہ مطلب نہیں کہ مومن حضرات کافروں کے لئے شفاعت کریں گے اور ان کی شفاعت کو قبول نہیں کیا جائے گا، بلکہ انہوں نے شفاعت کرنی ہی نہیں۔ (از صاوی)

﴿وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ﴾ یعنی من الکافرین کما قال فما تنفعهم شفاعۃ الشافعين“

اس آیت کریمہ اور دوسری آیت کریمہ ﴿فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِينَ﴾ کا مفہوم ایک ہی

ہے کہ کافروں کے لئے کوئی شفاعت نفع مند نہیں ہوگی۔ (از ابن کثیر)

”اريد بالآية نفى ان يدفع العذاب عن احد من الكفار احد بوجه من

الوجود فانه اما ان يكون قهرا فهو النصرۃ او بلا قهر مجانا وهو

الشفاعة او باداء ما كان عليه وهو ان يجزى عنه او بغيره وهو ان

يعطى عنه عدلا“ (مظہری)

آیت کریمہ میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ کافروں سے عذاب کو کسی طرح بھی دور نہیں کیا

جاسکے گا، نہ قہر سے کسی کی نصرت (امداد) ہوگی۔ اور نہ ہی بغیر قہر کے مفت کسی کی

شفاعت کو قبول کیا جاسکے گا اور نہ ہی کوئی کسی کے حقوق ادا کر سکے گا اور نہ ہی کوئی کسی کے

بدلے میں اپنے آپ کو عذاب میں گرفتار کرے گا اور نہ ہی کوئی کسی کا فدیہ دے سکے گا۔

اس سے واضح ہوا کہ اس آیت میں ذکر ہی کفار کا ہے اور کفار کے لئے ہی شفاعت کے نہ قبول

کرنے کا ذکر ہے:

”والمعنى لا تقبل الشفاعة اذا كانت النفس كافرة“

(خازن)

مطلب یہی ہے کہ کافر کے لئے شفاعت قبول نہیں کی جائیگی۔

”ای لا تقبل الشفاعة اذا كانت النفس كافرة“

(مدارک)

مطلب یہی ہے کہ کافر کے لئے شفاعت قبول نہیں کی جائیگی۔

تقریباً جمیع مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ آیہ کریمہ میں شفاعت کی نفی کافروں کے لئے یہ مطلب ہی نہیں کہ کسی کی شفاعت کسی کے لئے بھی قبول نہیں۔

تراجم کو دیکھئے: ابھی تک جو مختصر بحث کی ہے اسی سے تراجم میں فرق سمجھنا آسان ہو گیا، اگرچہ تفصیلی بحث ابھی ان شاء اللہ متصل ہی بیان ہو رہی ہے۔

﴿وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ﴾

(محمود الحسن صاحب، شاہ عبدالقادر صاحب)

”اور قبول نہ اس کی طرف سے سفارش“

(مودودی صاحب)

”نہ کسی کی طرف سے سفارش قبول ہوگی“

(فتح محمد صاحب)

”اور نہ کسی کی سفارش منظور کی جائے گی“

(شاہ رفیع الدین صاحب)

”اور ان قبول کی جائے اس سے سفارش“

(اشرف علی صاحب)

”اور نہ کسی شخص کی طرف سے کوئی سفارش قبول ہو سکتی ہے“

(عبدالماجد صاحب)

”اور نہ کسی کے حق میں سفارش قبول ہوگی“

(اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی)

”اور نہ کافر کے لئے کوئی سفارش مانی جائے“

تراجم سے دیکھنے سے واضح ہوا کہ اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ کا ترجمہ مفسرین کرام کی طویل بحثوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ اور دوسرے تراجم شکوک و شبہات تو پیدا کر رہے ہیں لیکن اصل مسئلہ سمجھانے سے قاصر ہیں کیونکہ دوسرے تراجم سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کسی کی سفارش کسی کے لئے قبول نہیں۔ حالانکہ یہ غلط ہے کیونکہ انبیاء کرام اور صلحاء کی شفاعت قبول ہوگی۔ لیکن اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے واضح ہو رہا ہے کہ یہاں شفاعت کی نفی کافروں کے حق میں ہے کہ کافر کے لئے سفارش قبول نہیں ہوگی۔

شفاعت کا ثبوت قرآن پاک سے:

﴿وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ جَاءُوكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللَّهَ

وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُولُ لَوَجَدُوا اللَّهَ تَوَّابًا رَحِيمًا﴾ (پ ۵ ع ۶)

”اور اگر وہ اپنی جانوں پر ظلم کریں تو اے محبوب تمہارے حضور حاضر ہوں اور پھر اللہ سے معافی چاہیں

اور رسول ان کی شفاعت فرمائے تو ضرور اللہ کو بہت توبہ قبول کرنے والا مہربان پائیں۔

اس آیت کریمہ میں رسول اللہ ﷺ کو گناہگار لوگوں کی شفاعت کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ آپ کی شفاعت کو رب تعالیٰ قبول فرما کر ان کی توبہ قبول کرے گا اور ان پر رحم فرمائے گا۔

﴿عَسَىٰ أَنْ يَبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُودًا﴾ (پ ۱۵)

”قریب ہے کہ تمہیں تمہارا رب ایسی جگہ کھڑا کرے جہاں سب تمہاری حمد کریں۔“

مقام محمود مقام شفاعت ہے کہ اس میں اولین و آخرین حضور کی حمد کریں گے، اسی پر جمہور ہیں۔

(خزانة العرفان)

﴿وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ﴾ (پ ۲۰)

”اور بیشک قریب ہے کہ تمہارا رب تمہیں اتنا دے گا کہ تم راضی ہو جاؤ گے۔“

اور یہ آیت آخرت کی عزت و تکریم کو بھی شامل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو شفاعت عامہ و خاصہ اور مقام محمود و غیرہ جلیل نعمتیں عطا فرمائیں۔ مسلم شریف کی حدیث شریف میں ہے نبی کریم ﷺ

نے دونوں ہاتھ مبارک اٹھا کر امت کے حق میں رو کر دعا فرمائی اور عرض کیا ”اللھم امتی امتی“ اللہ تعالیٰ نے جبرائیل کو حکم دیا کہ محمد مصطفیٰ ﷺ کی خدمت میں جا کر دریافت کرو روئے کا کیا سبب ہے باوجودیکہ اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے، جبرائیل نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق آ کر دریافت کیا، نبی کریم ﷺ نے انہیں تمام حال بیان کیا اور امت کے غم کے متعلق بیان فرمایا، جبرائیل امین نے رب کے حضور عرض کیا کہ تیرے محبوب یہ بتاتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جبرائیل کو حکم دیا کہ جاؤ اور میرے حبیب ﷺ سے کہو کہ ہم آپ کو آپ کی امت کے بارے میں عنقریب راضی کریں گے۔ اور آپ کو گراں خاطر (بوجھل دل) نہ ہونے دیں گے۔

حدیث شریف میں ہے جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ جب تک میرا ایک امتی بھی دوزخ میں رہے میں راضی نہیں ہوں گا۔ آیت کریمہ کی وضاحت حدیث پاک سے جو بیان کی گئی اس سے واضح ہو گیا کہ حضور ﷺ کو اپنی امت کی شفاعت کا حق دیا گیا۔

(از خزانہ)

﴿وَاسْتَغْفِرْ لَذَنبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَلِلْمُؤْمِنَاتِ﴾ (پ ۲۶)

”اور اے محبوب اپنے خاصوں اور عام مسلمانوں مردوں اور عورتوں کے گناہوں کی معافی مانگو۔“

اس آیت کریمہ میں بھی واضح طور پر رب تعالیٰ نے اپنے حبیب پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اپنی امت کے خاص اور عام مردوں اور عورتوں کے لئے شفاعت کا حکم دیا۔

﴿مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ﴾ (پ ۳)

”وہ کون ہے جو اس کے ہاں سفارش کرے بغیر اس کی اجازت کے“

اس آیت میں کفار کا رد ہے کیونکہ وہ کہتے تھے کہ ہمارے بت ہماری شفاعت کریں گے لیکن رب تعالیٰ نے ان کا رد فرماتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا ﴿مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ﴾ جس سے واضح ہو رہا ہے کہ رب تعالیٰ کے ہاں اس کی اجازت کے بغیر کسی کو شفاعت کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہوگا ہاں البتہ انبیاء کرام، ملائکہ، شہداء، علماء کو رب تعالیٰ کی طرف سے شفاعت کرنے کا اذن حاصل ہوگا۔

﴿لَا يَمْلِكُونَ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمَنِ عَهْدًا﴾ (پ ۱۶)

”لوگ شفاعت کے مالک نہیں مگر وہی جنہوں نے رحمن کے پاس قرار رکھا ہے

یعنی رب تعالیٰ کے ہاں شفاعت کرنے کا کسی کو حق حاصل نہیں ہوگا، سوائے ان کے جن کا رب کے پاس عہد ہے مراد یہی ہے کہ جن کو رب تعالیٰ کی طرف سے اجازت ہوگی وہی شفاعت کے مالک ہوں گے۔

﴿يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ﴾ ☆ ﴿إِلَّا مَنْ أَتَى اللَّهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ﴾

”جس دن نہ مال کام آئے گا نہ بیٹے مگر وہ جو اللہ کے حضور حاضر ہو اسلامت دل لے کر“

سلامت دل لے کر کا یہ مطلب ہے کہ شرک اور کفر سے پاک ہو کر رب تعالیٰ کے ہاں جو حاضر ہوں گے ان کو مال بھی نفع دے گا جو راہ خدا میں خرچ کیا ہو، اور اولاد بھی صالح ہو جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ جب آدمی مرتا ہے اس کے عمل منقطع ہو جاتے ہیں سوا تین کے ایک صدقہ جاریہ، دوسرا وہ مال جس سے وہ لوگ نفع اٹھائیں تیسری نیک اولاد جو اس کے لئے دعاء کرے۔

﴿خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا وَصَلْ عَلَيْهِمْ﴾

﴿إِنَّ صَلَاتَكَ سَكَنٌ لَهُمْ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ﴾ (پ ۱۱)

”اے محبوب ان کے مال میں سے زکوٰۃ حاصل کرو، جس سے تم انہیں ستھرا اور پاکیزہ کر دو اور ان کے حق

میں دعاء خیر کرو، بیشک تمہاری دعا ان کے دلوں کا چین ہے اور اللہ سنے والا، جاننے والا ہے۔

اس آیت کریمہ میں بھی رب تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو ان لوگوں کے لئے دعاء کرنے کا حکم دیا جن سے آپ زکوٰۃ حاصل کریں اور ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ آپ کی دعا ان کے دلوں کا چین ہے۔ سبحان اللہ اگر شفاعت قبول ہی نہ ہو تو آپ کو دعاء کرنے اور شفاعت کرنے کا حکم دینے کا کیا فائدہ ہے۔

جن آیات کریمہ کا ذکر کیا گیا ہے ان تمام سے واضح طور پر سمجھ آ رہا ہے کہ شفاعت کرنے کا ان بزرگ ہستیوں کو حق حاصل ہے جن کو رب تعالیٰ نے اجازت دے رکھی ہے۔

شفاعت کا ثبوت احادیث مبارکہ سے:

”عن ابی ہریرۃ عن النبی ﷺ قال اسعد الناس بشفاعتی یوم القیامۃ من

قال لا الہ الا اللہ خالصا من قلبہ او نفسہ“ (رواہ البخاری، مشکوٰۃ باب الشفاعۃ)

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن لوگوں

میں سے وہ شخص نیک بخت ہوگا جس کو میری شفاعت حاصل ہوگئی، میری شفاعت

اسے ہی حاصل ہوگی جس نے خلوص قلب و خلوص نفس سے لا الہ الا اللہ کہا۔

اس حدیث پاک سے پتہ چلا کہ جو شخص مومن ہو یعنی اس نے ”لا الہ الا اللہ“ پڑھا لیکن

اس میں کوئی منافقت نہیں تھی اور شرک اور ریا اور لوگوں کو سنانا، اپنا چرچا کرنا مقصود نہیں تھا تو

اسے نبی کریم ﷺ کی شفاعت حاصل ہوگی۔ اور آپ کی شفاعت سے اسے سعادت حاصل ہوگی۔

☆ ”وعن عبد اللہ بن عمرو بن العاص ان النبی ﷺ تلا قول اللہ تعالیٰ فی ابراہیم رب

انہن اضللن کثیرا من الناس فمن تبعنی فانہ منی وقال عیسیٰ ان تعذبہم فانہم عبادک

فرفع یدہ فقال اللہم امتی و بکی فقال اللہ تعالیٰ یا جبریل اذهب الی محمد و ربک

اعلم فسلہ ما یشیک فاتاہ جبریل فسالہ فاخبرہ رسول اللہ ﷺ بما قال فقال اللہ تعالیٰ

لجبریل اذهب الی محمد فقل انا سزضیک فی امتک ولا نسوؤک“

(رواہ مسلم مشکوٰۃ باب الشفاعۃ)

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کا ارشاد جواب ابراہیم

علیہ السلام کے حق میں نازل ہوا ﴿رَبِّ اِنَّہُنَّ اَضَلُّنَّ کَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ فَمَنْ تَبِعْنِیْ فَاِنَّہٗ مِنْیْ﴾

اور عیسیٰ علیہ السلام کے قول کی جو رب تعالیٰ نے حکایت بیان فرمائی ﴿إِنْ تُعَذِّبُهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ﴾ اسے تلاوت فرمایا پھر آپ نے اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھایا تو کہا ”اللہم امتی امتی“ اور آپ رونے لگ گئے۔ رب تعالیٰ نے فرمایا اے جبریل جاؤ محمد ﷺ کے پاس حالانکہ آپ کا رب خوب جانتا ہے پھر بھی ان سے سوال کرو تمہیں کس چیز نے رلایا۔ آپ کے پاس جبریل آئے انہوں نے آپ سے پوچھا رسول اللہ ﷺ نے اسے خبر دی۔ جبریل نے رب تعالیٰ کو بتایا جو نبی کریم ﷺ نے بتایا رب تعالیٰ نے جبریل کو کہا جاؤ محمد (ﷺ) کے پاس ان کو کہو ہم تمہیں تمہاری امت کے بارے میں راضی کریں گے پریشان نہیں کریں گے۔

وضاحت حدیث:

رسول اللہ ﷺ نے جب اس آیت کریمہ کا یہ حصہ تلاوت فرمایا ﴿رَبِّ إِنَّهُمْ أَضَلُّنَ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ فَمَنْ تَبِعْنِي فَإِنَّهُ مِنِّي﴾ جس کا بعد والا حصہ یہ ہے ﴿وَمَنْ عَصَانِي فَإِنَّكَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ مکمل آیت کا ترجمہ اور مقصد یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا اے میرے رب بیشک ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا۔ یعنی یہ لوگوں کی گمراہی کا سبب ہیں۔ پس جس شخص نے میری تابعداری کی تو حید اور اخلاص اور توکل میں بیشک وہ میرے متبعین ہیں اور میرا گروہ ہیں اور جس نے میری نافرمانی کی بیشک تو بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

عیسیٰ علیہ السلام نے رب کے حضور جو عرض کیا اسے قرآن پاک نے پیش کیا، نبی کریم ﷺ نے اس کی تلاوت فرمائی ﴿إِنْ تُعَذِّبُهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ﴾ اور اس نے آ کے ہے ﴿وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ ان تمام الفاظ مبارکہ کا ترجمہ اور مطلب یہ ہے کہ اے اللہ تو ان کو عذاب دے تو بیشک وہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو ان کی مغفرت کر دے تو بیشک تو غالب اور حکمت والا ہے یعنی تجھ پر کوئی غالب نہیں آ سکتا بیشک تو قوی اور قادر ہے اور تو جو چاہے حکم فرمائے، تو ایسا حاکم ہے کہ تیرے حکم کی مخالفت کی کسی کو طاقت نہیں تیرا ہر کام حکمت کے مطابق ہے۔

☆ وعن عمران بن حصین قال قال رسول الله ﷺ يخرج قوم من النار بشفاعتي

محمد یدخلون الجنة یسمون الجهمیین رواه البخاری ، وفی رواية یدخرج قوم من امتی من النار بشفاعتی یسمون الجهنمیین

عمران بن حصین کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، محمد کی شفاعت سے ایک قوم کو آگ سے نکالا جائے گا اور جنت میں داخل کر دیا جائے گا، ان کا نام ہی جہنمی لوگ ہوگا۔

خیال رہے ایک روایت میں ”یخرج اقوام“ کئی قوموں کو جہنم کی آگ سے نکال کر جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ حضور نے فرمایا میری امت میں سے ایک قوم کو میری شفاعت کی وجہ سے جہنم کی آگ سے نکالا جائے گا اور ان کا نام ہی جہنمی ہوگا۔

”قال الطیبی رحمہ اللہ لیست التسمیة بها تنقیصا لہم بل استد کارا

لیزدا دوا فرحا الی فرح وابتہاجا الی ابتہاج ولیکون ذلک علما

(مرقاۃ ج ۱۰ ص ۳۰۱)

لکونہم عتقاء اللہ تعالیٰ“

علامہ طیبی رحمہ اللہ نے فرمایا ان کا نام جہنمی ان کی توہین، ان کی حقارت کیلئے نہیں رکھا جائے گا بلکہ ان کو یہ یاد دلانے کیلئے کہ وہ جہنم سے نکالے گئے ہیں تاکہ وہ اسے یاد کر کے زیادہ سے زیادہ خوش ہوں، اور زیادہ سے زیادہ ان کے چہروں پر مسرت کے آثار ظاہر ہوں۔ اور سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کو یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مہربانی اور نبی کریم ﷺ کی شفاعت سے ان کو جہنم سے نکالا ہے۔

☆ ”وعن انس قال سألت النبی ﷺ ان یشفع لی یوم القیامة فقال انا فاعل قلت یا رسول اللہ فاین اطلبک قال اطلبنی اول ما تطلبنی علی الصراط قلت فان لم الفک علی الصراط قال فاطلبنی عند المیزان قلت فان لم الفک عند المیزان قال فاطلبنی عند الحوض فانی لا اخطئ ہذہ الثلاث المواطن رواہ الترمذی وقال ہذا حدیث غریب“

حضرت انس کہتے ہیں میں نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کیا آپ قیامت کے دن میری شفاعت فرمائیں گے؟ آپ نے فرمایا ہاں میں شفاعت کروں گا یہ کہتے ہیں میں نے پوچھا یا رسول اللہ میں آپ کو کہاں تلاش کروں؟ آپ نے فرمایا مجھے سب سے پہلے صراط پر تلاش کرنا، میں نے کہا یا رسول اللہ اگر میں صراط پر آپ کو نہ پاسکوں تو؟ آپ نے فرمایا پھر مجھے یہاں پر تلاش کرنا، میں نے کہا یا رسول اللہ

اگر میری ملاقات میزان پر آپ سے نہ ہو سکے تو؟ آپ نے فرمایا پھر مجھے حوض کے پاس تلاش کرنا، میں ان تین جگہ سے ہٹ کر کہیں اور نہیں ہوں گا۔

خیال رہے حضرت انس رضی اللہ عنہ نے جس شفاعت کے متعلق سوال کیا تھا وہ ”الشفاعة الخاصة من بين هذه الامة دون الشفاعة العامة“ شفاعت خاصہ مراد ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو حاصل ہونی۔ اس سے مراد شفاعت عامہ نہیں جو تمام امتوں کو حساب کے شروع کرنے کے لئے حاصل ہونی ہے۔

اعتراض: اس حدیث سے سمجھ آ رہا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان تینوں مقامات میں شفاعت کریں گے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت انس رضی اللہ عنہ نے پوچھا ہی اس لئے تھا کہ میں آپ کو کہاں تلاش کروں تا کہ آپ کی خدمت میں شفاعت کرنے کی درخواست کروں۔ لیکن مشکوٰۃ باب الحساب فصل ثانی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”تین مقامات میں کوئی ایک دوسرے کو یاد نہیں کرے گا“ وہ تین مقام آپ نے میزان، کتاب اور صراط ذکر فرمائے ہیں۔

اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ آپ ان مقامات میں کسی کو یاد نہیں فرمائیں گے اور نہ ہی کسی کی شفاعت فرمائیں گے ان دونوں احادیث میں کس طرح تطبیق دی جاسکتی ہے؟

جواب اول:

”جوابہ لعائشة بذلك لئلا تتكل على كونها حرم رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم

(مرقاۃ ج ۱۰ ص ۳۰۶)

و جوابہ لانس کیلا بیاس“

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر شخص سے اس کے حال کے مطابق کلام فرماتے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو فرمایا تین وقتوں میں کوئی کسی کو یاد نہیں کرے گا اس کا مطلب یہ تھا کہ صرف یہ ہی خیال نہ کرنا کہ میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ ہوں آپ میری شفاعت کریں گے۔ اسی پر توکل نہ کر لینا بلکہ عمل بھی کرنا۔ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کو جواب دیا (کہ آپ مجھے تین مقامات میں تلاش کرنا، میں ان مقامات میں سے ہی کسی ایک مقام میں ہوں گا اور تمہاری شفاعت کروں گا) تا کہ آپ مایوس نہ ہوں۔

”ان الحديث الاول (حديث عائشة) محمول على الغائبين فلا احد يذكر احدا من اهل الغيب والحديث الثاني (حديث انس) محمول على من حضره من امته“
(مرقاۃ ج ۱۰ ص ۳۰۲)
حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کا تعلق ان مقامات میں موجود نہ ہونے والے لوگوں سے ہے یعنی آپ نے فرمایا جب کسی کے اہل و عیال ان مقامات میں موجود نہیں ہوں گے ان کو کوئی یاد نہیں کرے گا۔

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ ان تین مقامات میں آجائیں گے ان کی میں شفاعت کروں گا۔ گویا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو یہ فرمایا کہ صرف یہ ہی خیال نہ کرتے رہنا کہ میں نبی کریم ﷺ کی زوجہ ہوں آپ خود ہی میری شفاعت فرمائیں گے نہیں ایسا نہیں ہوگا بلکہ مجھے تلاش کرنا، مجھے ان مقامات میں طلب کرنا، پھر میری شفاعت حاصل ہوگی۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث کا یہ مطلب واضح ہے پتہ چلا دونوں حدیثوں کا مفہوم ایک ہی ہے۔

☆ ”عن انس ان النبی ﷺ قال شفاعتی لاهل الكبائر من امتی“

(رواہ الترمذی و ابوداؤد رواہ ابن ماجہ عن جابر مشکوٰۃ باب الشفاعۃ)

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا بیشک نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی یہ ہے کہ میری امت کے کبیرہ گناہ کرنے والوں کو میری شفاعت حاصل ہوگی۔

وضاحت حدیث:

”یعنی شفاعتی فی العفو عن الكبائر من امتی خاصة دون غیرهم من الامم“
یعنی کبیرہ گناہوں کی معافی کا فائدہ میری شفاعت سے میری امت کو ہی خاص کر کے ہوگا دوسری امتوں کو فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔

”وقال الطیبی رحمہ اللہ ای شفاعتی التي تنجی الهالکین مختصہ باهل الكبائر“
علامہ طیبی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے کہ میری وہ شفاعت جو ہلاک ہونے والوں کو ہلاکت سے نجات دے گی وہ کبیرہ گناہوں والوں کے ساتھ خاص ہوگی۔

شرح مسلم علامہ نووی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں اہل سنت کا مذہب یہ ہے کہ شفاعت کا جواز عقلاً بھی ثابت ہے اور قرآن و احادیث سے بھی اس کا ثبوت بہت واضح ہے۔ قرآن پاک کی یہ آیت اس مضمون کو بہت واضح طور پر ثابت کر رہی ہے:

﴿يَوْمَئِذٍ لَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَنُ وَرَضِيَ لَهُ قَوْلًا﴾

یعنی قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر تو کسی کو شفاعت نفع نہیں دے گی۔ لیکن رب تعالیٰ جسے شفاعت کی اجازت دے گا اور اس کی بات کو پسند کرے گا یقینی طور پر اس کی شفاعت نفع مند ہوگی۔

”وقد جاءت الآثار الذي بلغت بمجموعها التواتر لصحة الشفاعة في

الآخرة واجمع السلف الصالحون ومن بعدهم من اهل السنة عليها“

شفاعت کے موضوع پر احادیث مجموعی طور پر تواتر کے درجہ تک پہنچی ہوئی ہیں۔ جن سے انکار ممکن نہیں۔ اسی مسئلہ میں اہل سنت کے تمام علماء کا اجماع ہے خواہ وہ پہلے گزرے ہوئے نیک حضرات ہوں، یا ان کے بعد والے ارباب علم ہوں۔

اسی مسئلہ میں اختلاف معتزلہ اور خوارج کا ہے جس کا انشاء اللہ تفصیلی طور پر ذکر کیا جائے گا۔

(مرقاۃ ج ۱۰ ص ۳۰۹)

شفاعت کی پانچ قسمیں:

(۱) ”اولها مختصة بنبيينا ﷺ وهي الراحة من هول الموقف وتعجيل الحساب“

ان میں پہلی قسم وہ ہے جسے شفاعت عامہ کہا جاتا ہے وہ ہمارے نبی کریم ﷺ کے ساتھ ہی خاص ہے وہ شفاعت ہولناک مقام میں ٹھہرنے سے آرام پہنچانے اور جلدی حساب شروع کرنے کیلئے ہوگی۔

(۲) ”الثانية في ادخال قوم الجنة بغير حساب وهذه ايضا وردت في نبينا ﷺ“

شفاعت کی دوسری قسم یہ ہے کہ شفاعت کے ذریعے کئی لوگ بغیر حساب کے جنت میں چلے جائیں گے یہ شفاعت بھی صرف ہمارے نبی کریم ﷺ ہی فرمائیں گے۔

(۳) ”الثالثة الشفاعة لقوم استوجبوا النار فيشفع فيهم نبينا ﷺ ومن شاء الله تعالى“

شفاعت کی تیسری قسم ان لوگوں کے لئے ہوگی جو جہنم کی آگ میں داخل ہونے کے مستحق تو ہو جائیں گے لیکن شفاعت کی وجہ سے ان کو جہنم میں داخل ہونے سے بچا لیا جائے گا۔ یہ شفاعت بھی نبی کریم ﷺ بھی فرمائیں گے اور بھی وہ لوگ یہ شفاعت فرمائیں گے جن کو رب تعالیٰ کی طرف سے اجازت دی جائے گی۔

(۴) ”الرابعة فيمن دخل النار من المذنبين فقد جاءت الاحاديث باخراجهم من النار بشفاعه نبينا والملائكة واخوانهم من المؤمنين ثم يخرج الله تعالى كل من قال لا اله الا الله“ شفاعت کی چوتھی قسم یہ ہے کہ جب گنہگار لوگوں کو جہنم کی آگ میں داخل کر دیا جائے گا۔ تو ان کو شفاعت کی وجہ سے آگ سے نکال لیا جائے گا۔ اس مسئلہ میں کئی احادیث وارد ہیں۔ یہ شفاعت نبی کریم ﷺ کریں گے اور فرشتے اور ان گنہگار لوگوں کے دوسرے نیک مومن بھائی ان کے لئے شفاعت کریں گی آخر میں ان لوگوں کو آگ سے نکال لیا جائے گا جنہوں نے ”لا اله الا الله“ پڑھا۔

(۵) ”الخامسة الشفاعة في زيادة الدرجات في الجنة لاهلها وهذه لا نكرها ايضا“ پانچویں قسم شفاعت کی یہ ہے کہ جنت میں جو لوگ ہوں گے شفاعت کے ذریعے ان کے درجات کو بلند کر دیا جائے گا اس شفاعت کا انکار کسی نے بھی نہیں کیا۔ یعنی اس شفاعت کو معتزلا بھی جانتے ہیں۔

☆ ”عن عثمان بن عفان قال قال رسول الله ﷺ يشفع يوم القيامة ثلاثة الانبياء ثم العلماء ثم الشهداء“ (رواه ابن ماجه ، مشكوة باب الشفاعة)

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے فرمایا قیامت کے دن تین قسم کے حضرات شفاعت فرمائیں گے۔ پہلے انبیاء کرام پھر علماء، پھر شہداء۔

فائدہ: علماء سے مراد عالمین ہیں یعنی جو علم کے مطابق عمل بھی کرتے ہیں۔ اور شہداء سے مراد مخلصین ہیں ”وفى العطفه بثم دلالة صريحة على تفضيل العلماء على الشهداء“ نبی کریم ﷺ نے انبیاء کرام کے بعد علماء کا ذکر کیا پھر لفظ ”ثم“ ذکر فرمایا جو تراخی پر دلالت کرتا ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ علماء عالمین کو شہداء مخلصین پر فضیلت حاصل ہے۔

اس مسئلہ پر ایک حدیث شریف واضح طور پر دلالت کر رہی ہے جو شیرازی نے حضرت انس سے اور ابن عبد البر نے ابوالدرداء سے اور ابن جوزی نے علل میں نعمان بن بشیر سے مرفوع حدیث بیان کی ہے:

”یوزن یوم القيامة مداد العلماء ودم الشهيد فيرجح مداد العلماء على دم الشهيد“

قیامت کے دن علماء کی سیاہی اور شہید کے خون کا وزن کیا جائے گا تو علماء کی سیاہی کو شہید کے خون پر ترجیح حاصل ہوگی۔
(مرقاۃ ج ۱۰ ص ۳۱۱)

تنبیہ: حدیث شریف میں تین قسم کے حضرات کا ذکر یا تو ان کے درمیان ترتیب کو ذکر کرنا مقصود ہے یا یہ قید اتفاقی ہے ورنہ ملائکہ، صلحاء چھوٹے بچوں کی شفاعت کا واضح طور پر ذکر موجود ہے۔

☆ ”وعن انس قال قال رسول الله ﷺ يصف اهل النار فيمر بهم الرجل من اهل الجنة فيقول الرجل منهم يا فلان اما تعرفني انا الذي سقيتك شربة وقال بعضهم انا الذي وهبت لك وضوا فيشفع له فيدخله الجنة“ (رواه ابن ماجه مشكوة باب الشفاعة)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جہنم والے لوگ صف بنائے ہوں گے ان کے قریب سے جنت والے شخص کا گزر ہوگا، ایک شخص اس سے کہے گا کیا تو مجھے پہچانتا نہیں میں نے تمہیں پلایا تھا، دوسرا کہے گا کیا تمہیں معلوم نہیں میں نے تمہیں وضوء کے لئے پانی دیا تھا، وہ ان کے لئے شفاعت کرے گا تو اللہ تعالیٰ ان کو جنت میں داخل کر دے گا۔

وضاحت حدیث:

یصف (بضم وفتح وتشدید) صف بنانا۔

” (یصف اهل النار) من عصاة المؤمنين والفجار في طريق اهل الجنة من العلماء الاخيار والصلحاء الابرار على هيئة المساكين السائلين في طريق الاغنياء في هذه الدار“

یعنی گنہگار مومنین، فساق و فجار جنت والے نیک علماء اور دوسرے نیک صالحین حضرات کے راستے میں اس طرح کھڑے ہوں گے جس طرح دنیا میں غنی لوگوں کے راستے میں سوال کرنے والے فقیر لوگ کھڑے ہوتے ہیں۔

جب کسی نیک شخص کا وہاں سے گزر ہوگا تو گنہگاروں میں سے کوئی کہے گا۔ اے شخص کیا تو مجھے

نہیں پہچانتا میں نے تمہیں فلاں وقت میں پینے کے لئے پانی یاد دودھ وغیرہ دیا تھا، آج تم میری شفاعت ہی کرو کہ اللہ تعالیٰ مجھے بخش دے۔ اسی طرح ایک اور شخص شفاعت کی درخواست کرتے ہوئے کہے گا اے فلاں شخص کیا تم مجھے نہیں پہچانے میں نے فلاں وقت تمہیں وضوء کے لئے پانی عطاء کیا تھا، وہ نیک بزرگ عالم شخص ان کے حق میں شفاعت کریں گے تو ان گنہگاروں کو جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔

فائدہ: "قال المظہر فیہ تحریض علی الاحسان الی المسلمین لاسیما مع

الصلحاء والمجالسة معهم ومحبتهم فان محبتهم زین فی الدنیا ونور فی العقبیٰ"
(مرقاۃ ج ۱۰ ص ۳۱۲)

اس حدیث پاک سے یہ واضح ہوا کہ مسلمانوں کو اپنے دوسرے مسلمان بھائیوں پر رحم کرنے پر براہِ نیحت کیا گیا ہے خصوصاً نیک لوگوں پر احسان کرنا، ان کی محافل میں بیٹھنا اور ان سے محبت کرنے کی رغبت دلائی گئی ہے کیونکہ نیک لوگوں سے محبت دنیا میں زینت اور آخر میں نور ہوگا۔

☆ "وعن عوف بن مالک قال قال رسول اللہ ﷺ اتانی آت من عند ربی فخیرنی بین ان یدخل نصف امتی الجنة و بین الشفاعۃ واخترت الشفاعۃ وہی لمن مات لا یشرک باللہ شیاً"
(رواہ الترمذی وابن ماجہ مشکوٰۃ باب الشفاعۃ)

عوف بن مالک کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرے رب کی طرف سے آنے والا میرے پاس آیا مجھے اختیار دیا کہ میں نصف امت کو جنت میں داخل کیا جانا پسند کر لوں یا شفاعت کو پسند کر لوں۔ میں نے شفاعت کو اختیار کیا ہے۔ اور یہ شفاعت ہر اس شخص کیلئے ہوگی جسکی موت حالت شرک پر نہ آئے

حدیث کا مطلب بہت واضح ہے کہ نبی کریم ﷺ نے شفاعت کو ترجیح دی کیونکہ آپ یہی چاہتے تھے کہ شفاعت کے ذریعے میری امت کے ایماندار لوگ تمام ہی نفع حاصل کریں۔ اس میں گنہگار بھی آگئے اور نیک کار بھی البتہ مشرک نہ ہوں کیونکہ مشرکوں کو شفاعت خاصہ سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔

☆ "وعن عبد اللہ بن ابی الجداء قال سمعت رسول اللہ ﷺ یقول یدخل الجنة

بشفاعة رجل من امتی اکثر من بن تمیم" (رواہ الترمذی والدارمی وابن ماجہ، مشکوٰۃ باب الشفاعۃ)

عبد اللہ بن ابی جدعاء فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ میری امت کے ایک عظیم شخص کی شفاعت سے بنو تمیم سے بھی زیادہ لوگ جنت میں داخل ہوں گے۔

”رجل“ پر تنوین تعظیم کی ہے مراد اس سے ”رجل جلیل“ ہے یعنی عظیم کی شفاعت سے۔ وہ عظیم اور جلیل القدر شخص کون ہوگا بعض حضرات نے کہا حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ہوں گے اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ وہ حضرت اویس قرنی ہوں گے وغیرہ۔

”وعن ابی سعید ان رسول اللہ ﷺ قال ان من امتی من یشفع للفقراء ومنهم من یشفع للقبلة ومنهم من یشفع للعصبة ومنهم من یشفع للرجل حتی یدخلوا الجنة“

(رواہ الترمذی مشکوٰۃ باب الجماعة)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بیشک میری امت سے بعض لوگ ایک جماعت کی شفاعت کریں گے۔ اور بعض لوگ ایک قبیلہ کی شفاعت کریں گے اور بعض لوگ ایک خاندان (دس سے لے کر چالیس تک تعداد) کی شفاعت کریں گے۔ اور بعض ایک شخص کی شفاعت کریں گے وہ اس شفاعت کی وجہ سے جنت میں داخل ہوں گے۔

اس حدیث پاک سے بھی نبی کریم ﷺ کی امت کے نیک لوگوں کا شفاعت کرنا ثابت ہے۔

☆ ”عن عبد اللہ بن مسعود قال قال رسول اللہ ﷺ من قدم ثلاثة لم یبلغوا الجنة كانوا له حصنا حصینا قال ابوذر قدمت اثنين قال واثنين فقال ابی بن کعب سید القراء قدمت واحدا قال واحدا ولكن انما ذلك عند الصدمة الاولى“ (ترمذی ابواب الجنان)

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے تین نابالغ بچے آگے بھیجے (یعنی جس شخص کی اولاد سے تین نابالغ بچے فوت ہو گئے) تو وہ اس کو آگ سے بچانے کے لئے مضبوط قلعہ ہوں گے۔ حضرت ابوذر نے کہا میں نے دو آگے بھیجے، آپ نے فرمایا دو ہی (قلعہ کی حیثیت ہوں گے) سید القراء حضرت ابی بن کعب نے عرض کیا میں نے ایک آگے بھیجا ہے آپ نے فرمایا ایک ہی (کافی ہوگا) البتہ جب اس شخص نے ابتدائی صدمہ کے وقت صبر کیا ہوگا۔

☆ ”عن ابن عباس انه سمع رسول اللہ ﷺ یقول من كان له فرطان من امتی ادخله الله بهما الجنة فقالت له عائشة فمن كان له فرط من امتک قال ومن كان له فرط یا موفقة قالت فمن لم یکن له فرط من امتک قال فانا فرط من امتی لن یصابوا بمثلی“

(ترمذی ابواب الجنان)

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ جس شخص کے میری امت میں سے دو بچے فوت ہو گئے اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل کریگا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا آپ کی امت میں سے جس کا ایک بچہ فوت ہوا؟ آپ نے فرمایا جس کا ایک بچہ فوت ہوا وہ بھی جنت میں داخل ہوگا اے توفیق دی ہوئی، پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا جس کا ایک بچہ بھی نہ فوت ہوا؟ آپ نے فرمایا ان کا میں آگے جا کر انتظام کروں، میرا جیسا کسی کو نہیں ملے گا۔ خیال رہے حدیث شریف میں استعمال ہے ”یا موفقة“ اس کا یہ معنی بیان کیا گیا ہے:

”یا موفقة بالخیرات والاسوة الواقعة موقعها شفقة علی الامة“ (مرفاۃ)

اے بھلائی کی توفیق دی گئے کیونکہ تمہارے سوالات موقع کے مطابق ہوتے ہیں جن سوالات اور جوابات سے امت کے لئے شفقت کا دروازہ کھل جاتا ہے۔

﴿فَرَطٌ﴾: (بالتحریک) قافلے سے آگے جا کر قافلہ والوں کی ضروریات کا انتظام کرنے والوں کو ”فرط“ کہا جاتا ہے چھوٹا نابالغ بچہ جو فوت ہو جائے وہ بھی آگے جا کر والدین کے لئے جنت میں مکان تیار کرتا ہے۔ یعنی اس کی وفات پر والدین کو صبر کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ جنت میں داخل کرتا ہے اس لئے اسے بھی فرط کہا گیا ہے۔

حدیث پاک سے اور فائدہ یہ حاصل ہوا کہ جس کا اور کوئی نہیں، اس کے میرے پیارے مصطفیٰ ﷺ ہیں۔ مسئلہ بہت واضح ہو گیا کہ نبی کریم ﷺ کی امت کے مومن لوگوں کے بچے فوت ہونے والے بھی اپنے والدین کے لئے شفاعت کریں گے۔

شفاعت عامہ: جب تک حساب و کتاب شروع نہیں ہوگا، لوگ بہت پریشان ہوں گے کیونکہ جس شدید ہوگا، سخت گرمی کی وجہ سے لوگ کسی شفیع کو تلاش کریں گے کہ کسی کی شفاعت سے اس حال سے نجات مل جائے اسی حال میں حضرت آدم علیہ السلام، حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس شفاعت کی درخواست کریں گے، سب کی طرف سے یہ جواب حاصل ہوگا ”لست لها“ میں شفاعت نہیں کر سکتا۔ لیکن جب مصطفیٰ کریم ﷺ کے پاس آئیں گے تو آپ ”انسا لها“ فرمائیں گے ہاں شفاعت کا حق مجھے ہی دیا گیا ہے۔ آپ

شفاعت فرمائیں گے تو آپ کی شفاعت کو شرف قبولیت عطاء کیا جائے گا۔

نکتہ : شیخ محی الدین رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کے دلوں میں ڈالے گا کہ پہلے آدم علیہ السلام کے پاس جاؤ وہاں سے مایوس ہونے پر ان کے دل میں یہ آئے گا کہ اب نوح علیہ السلام کے پاس جانا چاہئے۔ اس طرح دوسرے انبیاء کرام کے پاس جائیں گے سب سے پہلے ان کے دل میں یہ کیوں نہیں ڈال دیا جائے گا کہ نبی کریم ﷺ کے پاس چلے جاؤ اس کی وجہ یہ ہے ”فانہم لو سألوا ابتداء لکان یحتمل ان غیرہ یقدر“ کہ اگر وہ پہلے نبی کریم ﷺ کے پاس آ جائیں تو ان کے دل میں یہ خیال آئے گا کہ اگر کسی اور کے پاس جاتے تو وہ بھی شفاعت فرماتے۔ لیکن جب سب سے مایوس ہوں گے تو پتہ چلے گا کہ یہ منصب کسی اور کو حاصل نہیں۔ اعلیٰ حضرت بریلوی فرماتے ہیں۔

خلیل ونجی کلیم وسیح سبھی سے کہی کہیں نہ بنی
یہ بے خبری کہ خلق پھری کہاں سے کہاں تمہارے لئے

مولنا حسن رضا بریلوی فرماتے ہیں:

فقط اتنا سبب ہے انعقاد بزم محشر میں

کہ ان کی شان محبوبی دکھائی جانے والی ہے

حاجی امداد اللہ مہاجر کی فرماتے ہیں:

جہاز امت کا حق نے کر دیا ہے آپ کے ہاتھوں

تم اب چاہو ڈباؤ یا تراؤ یا رسول اللہ

شفیع عاصیاں ہو تم ، وسیلہ بیکساں ہو تم

تمہیں چھوڑ اب کہاں جاؤں بتاؤ یا رسول اللہ

شفاعت سے کسی کو کم اور کسی کو زیادہ فائدہ کیوں؟

اس پر ایک حدیث پاک کو دیکھئے اسی سے مسئلہ شفاعت کو بھی سمجھنے کی کوشش کریں تو سمجھنا کوئی مشکل نہیں رہے گا:

”عن ابی موسیٰ عبد اللہ بن قیس الاشعریؓ قال قال رسول اللہ ﷺ
ان مثل ما بعنى الله به من الهدى والعلم كمثل غيث اصاب ارضا
فكانت منها طائفة طيبة قبلت الماء فانبت الكلاء والعشب الكثير،
وكان منها اجادب امسكت الماء فنفع الله تعالى بها الناس فشربوا
منها وسقوا وزرعوا واصاب طائفة منها اخرى انما هي قيعان لا
تمسك ماء ولا تنبت كالأ فذلك مثل من فقه في دين الله ونفعه ما
بعثنى الله تعالى به فعلم وعلم ومثل من لم يرفع بذلك رأسا ولم يقبل
هدى الله الذي ارسلت به“

(جواہر طنطاوی ج ۱ ص ۶۵) (مسلم ح ۲ ص ۲۵۵)

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ فرماتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بیشک مجھے
اللہ تعالیٰ نے ہدایت اور علم عطا کر کے مبعوث فرمایا اس کی مثال بارش کی ہے۔ جب
بارش اچھی زرخیز زمین پر برتی ہے تو اس زمین میں گھاس اور کثیر مقدار نباتات پیدا
ہوتے ہیں۔ وہی بارش جب خشک قدرے سخت زمین پر برتی ہے جو پانی کو روک لیتی
ہے (یعنی وہ پانی جلدی اس میں جذب نہیں ہو جاتا) اور وہ زمین حوض نما ہوتی ہے تو
اس سے بھی لوگوں کو نفع حاصل ہوتا ہے کہ وہ پانی پیتے ہیں، اور اسی پانی سے اپنی کھیتی
باڑی کو سیراب بھی کر لیتے ہیں، اور وہی بارش کبھی چنیل میدان اور لڑھکنے والے مقام
پر برتی ہے تو وہ نہ ہی پانی کو اپنے اوپر روک کر رکھتی ہے (کہ لوگ اس سے فائدہ
حاصل کریں) اور نہ ہی اس میں گھاس وغیرہ پیدا ہوتے ہیں۔ یہی مثال جو شخص دین کا
علم حاصل کرتا ہے اسے میرے مبعوث ہونے کا نفع حاصل ہوتا ہے وہ علم حاصل کرتا
ہے اور پڑھاتا بھی ہے اور جو شخص اس کی طرف (جو مجھے دے کر مبعوث کیا گیا ہے)
سر نہیں اٹھاتا وہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت قبول نہیں کرتا جو ہدایت دے کر مجھے بھیجا گیا ہے۔

تنبیہ: خط کشیدہ لفظ جواہر طنطاوی اور بخاری میں ”وزرعوا“ ہے جس کا معنی ہے کھیتی

باڑی کرنا۔ اور مسلم شریف میں ”ورعوا“ جو ”الرعی“ سے لیا گیا ہے جس کا معنی ہے چرانا۔ تقریباً مفہوم ایک ہی ہے کہ اس پانی کے ذریعے اگنے والا گھاس وغیرہ جانوروں کو چراتے ہیں۔ (از نووی)

اب اسی حدیث سے مسئلہ شفاعت کو سمجھئے کہ بارش کا نفع ایک جیسا ہے لیکن زمین کے مختلف حصے علیحدہ علیحدہ حیثیت رکھتے ہیں انکے مطابق ہی زمین میں مختلف قسم کے منافع ہیں۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ کی شفاعت تو نفع مند ہی نفع مند ہے لیکن لوگ مختلف قسم کے ہوں گے۔ کسی کو نفع صرف یہ ہوگا کہ حساب و کتاب شروع ہو جائے گا۔ اور کوئی جہنم کا مستحق ہونے کے باوجود جہنم سے بچ جائے گا اور کوئی جہنم میں داخل ہو چکا ہوگا اسے جہنم سے نکال لیا جائے گا اور کوئی پہلے سے جنت میں ہوگا لیکن اس کے مدارج کو بلند کر دیا جائے گا۔

شفاعت میں معتزلہ کا مذہب:

”فذهبت المعتزلة على انها للمستحقين للثواب وتأثير الشفاعة في

ان تحصل زيادة من المنافع على قدر ما استحقوه“

معتزلہ کا مذہب یہ ہے کہ شفاعت صرف ان لوگوں کو فائدہ دے گی جو ثواب کے مستحق ہوں گے، جنت میں داخل ہونے کے قابل ہوں گے اور شفاعت کا ان کو فائدہ ہوگا کہ وہ جس سے ثواب کے مستحق تھے اس سے بڑھ کر ان کو ثواب دے دیا جائے گا اور جنت میں بلند درجہ دے دیا جائے گا حالانکہ وہ اپنے اعمال کے لحاظ پر اس کے مستحق نہیں تھے۔

”وقال اصحابنا تأثيرها في اسقاط العذاب عن المسحقين للعقاب اما بان

يشفع لهم في عرصة القيامة حتى لا يدخلوا النار وان دخلوا النار فيشفع

لهم حتى يخرجوا منها ويدخلوا الجنة واتفقوا على انها ليست لكفار“

اہل سنت کا مذہب یہ ہے کہ شفاعت کا فائدہ ان لوگوں کو بھی ہوگا جو عذاب کے مستحق ہوں گے شفاعت کے ذریعے ان سے عذاب ساقط ہوگا۔ نبی کریم ﷺ میدان قیامت میں شفاعت فرمائیں گے تو وہ مستحقین عذاب جہنم میں داخل ہونے سے بچ جائیں گے۔ کئی لوگ جہنم میں داخل ہو چکے ہوں گے ان کو آپ کی شفاعت سے جہنم سے نکال کر داخل کر دیا جائے گا۔ ہاں البتہ اس پر اہل سنت کا اتفاق ہے کہ نبی کریم ﷺ کافر کے عذاب کی تخفیف کے لئے شفاعت نہیں فرمائیں گے۔

معتزلہ کی دلیل مبر 1: آیہ کریمہ میں ﴿وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ﴾ کہا گیا ہے شفاعت نکرہ ہے قانون یہ ہے کہ نکرہ جب نفی کے تحت آجائے تو عموم کا فائدہ دیتا ہے۔ اس سے پتہ چلا کہ شفاعت کی مطلقاً نفی کر دی گئی ہے، کہ کسی کو کسی شخص کی شفاعت کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہوگا۔ تو کبیرہ گناہوں والوں کے لئے شفاعت ثابت کرنا اس آیہ کے مخالف ہے۔

الزامی جواب: یہ تمہارا اعتراض تو تمہارے مذہب کے مخالف ہے۔ کیونکہ اعتراض میں تم یہ ثابت کر رہے ہو کہ ہر قسم کی کوئی شفاعت بھی قبول نہیں ہوگی۔ اور تمہارا مذہب یہ ہے کہ شفاعت عظمیٰ (شفاعت عامہ) ہوگی۔ اور جو لوگ ثواب کے مستحق ہوں گے ان کیلئے بھی شفاعت ہوگی کہ ان کا ثواب بڑھا دیا جائے گا۔ اس شفاعت کو ثابت کرنے کے لئے اپنے ہی اعتراض سے جو جواب تم دو گے وہی جواب ہماری طرف سے بھی سمجھ لینا۔

تحقیقی جواب: شفاعت کی دو قسمیں ہیں ایک یہ ہے کہ جس کی وجہ سے زیادہ منافع حاصل ہوتے ہیں۔ اور دوسری قسم یہ ہے جو لوگ ہمیشہ کے لئے عذاب سے مستحق ہیں۔ ان سے عذاب کو ہٹا دیا جائے۔ آیہ کریمہ میں نفی دوسری قسم کی شفاعت کی ہے جس میں ہمیشہ کے لئے عذاب کے مستحق کافر لوگوں سے شفاعت کی نفی کی گئی۔

مسلمانوں کے لئے جو بھی شفاعت ہوگی وہ درحقیقت ان کو نفع پہنچانے کے لئے ہوگی۔ جب تک یہ فرق نہ کیا جائے اس وقت تک ان آیات اور احادیث کا کوئی مطلب نہیں ثابت کیا جاسکتا جن کو بیان کیا جا چکا ہے۔

نتیجہ یہی نکلا:

”ان المقصود من الآية نفى تأثير الشفاعة فى اسقاط العقاب لانفى

تأثيرها فى زيادة المنافع“

کہ مقصد آیہ کریمہ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ کافروں سے عذاب کو ختم کرنے کے لئے کوئی شفاعت کام نہیں آئے گی لیکن منافع کی زیادتی کے لئے شفاعت کام آئے گی۔

خیال رہے کہ عقاب کہتے ہی اسے ہیں جو کافروں کو عذاب ہوگا اسی لئے رام نے ”اسقاط العقاب“ کا ترجمہ کیا ہے ”کافروں سے عذاب کو ساقط کرنا“

معترکہ کی دلیل نمبر 2: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿مَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ حَمِيمٍ وَلَا شَفِيعٍ يُطَاعُ﴾

”اور ظالموں کا نہ کوئی دوست ہوگا اور نہ کوئی سفارشی جس کا کہا مانا جائیگا“

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ظالموں کا ذکر فرمایا ہے ظالم عام ہیں خواہ کافر ہوں یا مسلمان ہوں لہذا معلوم ہوا کہ کسی ظالم کے لئے کسی کی شفاعت قبول نہیں کی جائے گی۔ ظالم وہی ہوگا جو گھنکار ہوگا۔

جواب نمبر 1: اس آیت کریمہ میں نفی شفاعت کی نہیں بلکہ ”یطاع“ کی ہے:

”لأنه لا يكون في الآخرة شفيع يطاع لأن المطاع يكون فوق المطيع

وليس فوقه تعالى احد يطيعه الله تعالى“

یعنی کوئی یہ سمجھے کہ رب تعالیٰ میری اطاعت کرے گا تو اس کا یہ خیال باطل ہے کیونکہ جس کی اطاعت کی جائے وہ بلند شان والا ہوتا ہے، اور جو اطاعت کرے وہ اس سے کم شان رکھتا ہے، جب اللہ تعالیٰ سے کوئی بلند شان والا نہیں تو یہ گمان بھی باطل ہوگا کہ میری بات کو ضرور مانا جائے گا کیونکہ رب تعالیٰ مطیع ہے اور میں مطاع ہوں۔ (معاذ اللہ)

دوسرا جواب: جب یہ تسلیم کر لیا جائے کہ یہاں نفی شفاعت کی ہے تو پھر بھی مطلقاً شفاعت کی نفی نہیں بلکہ اس شفاعت کی نفی ہے جو اطاعت سے مقید ہے۔

”انه تعالى نفى شفيعا يطاع والشفيع لا يكون الا دون المشفوع اليه

لان من فوقه يكون امراله وحاكما عليه ومثله لا يسمى شفيعا“

بیشک اللہ تعالیٰ نے اس سفارشی کی نفی کی جس کی اطاعت کی جائے، اصل میں حقیقت یہ ہے کہ سفارش کرنے والا کم درجہ رکھتا ہے اس سے جس سے سفارش کر رہا ہے، کیونکہ اگر اوپر درجہ رکھے تو آمر اور حاکم کہلائے گا اس قسم کے شخص کو شفاعت کرنے والا نہیں کہا جاتا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اگر شفاعت کرنے والا یہ سمجھے کہ میری اطاعت کی جائے گی میری شفاعت

ضرور تسلیم ہوگی تو وہ اپنے آپ کو حاکم سمجھ رہا ہے اس کی شفاعت قبول نہیں ہوگی۔

اگر شفاعت کرنے والا اس خیال سے شفاعت کرے کہ وہ اللہ تعالیٰ حاکم مطلق، بے نیاز ہے میں اس کے حضور شفاعت کر دیتا ہوں آگے قبول کرنا اس کی مرضی ہے، اس عاجزی کی وجہ سے رب تعالیٰ اپنے وعدہ کے مطابق شفاعت کو قبول فرمائے گا مطلب یہ ہے کہ رب تعالیٰ کو بندے کا عجز پسند ہے تکبر اور بڑائی پسند نہیں۔

تیسرا جواب: دوسری آیات اور احادیث جن میں شفاعت کے قبول ہونے کا ذکر ہے ان میں اور اس میں تطبیق دینے کے لئے کئی مفسرین کرام نے ”ظالمین“ کا معنی ”کافرین“ کیا ہے کیونکہ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ﴾ ”بیشک شرک ظلم عظیم ہے“

واضح ہوا کہ اس آیت کا معنی بھی یہ ثابت ہے کہ کافروں کے لئے شفاعت نہیں مانی جائے گی۔

معزلہ کی دلیل نمبر 2: اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی:

﴿مَنْ قَبْلَ أَنْ يَأْتِيَ يَوْمَ لَا بَيْعَ فِيهِ وَلَا خُلَّةَ وَلَا شَفَاعَةَ﴾

اس آیت کریمہ میں شفاعت کی مطلقاً نفی ہو رہی ہے:

﴿وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ﴾ ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہوگا

اس آیت سے بھی شفاعت کی نفی ہو رہی ہے:

﴿فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِينَ﴾ شفاعت کرنے والوں کی شفاعت ان کو نفع نہیں دے گی۔

اس آیت سے بھی پتہ چلتا ہے کہ شفاعت کا نفع نہیں ہوگا۔

جواب: ان تمام آیات میں کافروں کے لئے شفاعت کی نفی ہو رہی ہے اور اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر شفاعت کی نفی ہو رہی ہے، کیونکہ دوسری آیات سے واضح ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اجازت سے شفاعت نفع مند ہوگی۔ رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿مَا مِنْ شَفِيعٍ إِلَّا مِنْ بَعْدِ إِذْنِهِ﴾ اس کی اجازت کے بغیر کوئی شفاعت نہیں کر سکے گا۔

﴿مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ﴾

اس کی اجازت کے بغیر اس کے پاس کون شفاعت کرے گا

﴿لَا يَتَكَلَّمُونَ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَنُ وَقَالَ صَوَابًا﴾

کوئی اس سے کلام نہیں کر سکیں گے سوائے ان کے جن کو رحمن نے اجازت دی اور درست بات کہی۔

ان تمام آیات سے واضح ہوا کہ رب تعالیٰ کی اجازت کے بغیر شفاعت نہیں ہوگی رب تعالیٰ کی اجازت سے شفاعت ہو سکے گی۔ اور نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد اس مسئلہ کو اور زیادہ واضح کر دیتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

”(عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ) لكل نبی دعوة مستجابة

فتعجل كل نبی دعوتہ وانی اختبأت دعوتی شفاعة لامتی يوم القيامة

فہی نائلة ان شاء اللہ من مات من امتی لا یشرك باللہ شینا“

(رواہ مسلم، کبیر، ج ۲ ص ۲۳)

ہر نبی کو ایک دعاء حاصل ہوئی جس کی قبولیت یقینی تھی۔ لیکن ہر نبی نے وہ دعاء (دنیا

میں ہی) جلدی استعمال کر لی۔ میں نے اپنی دعاء کو محفوظ کر کے رکھ لیا ہے وہ قیامت

کے دن میری ہر امت کو انشاء اللہ پہنچے گی جس کو موت شرک کے بغیر آئی۔

دینی طلباء کی دلچسپی کے لئے:

”(ولا یقبل منها شفاعة) ان تخصیص مثل هذا العام بذلك السبب

المخصوص یکفی فیہ ادنی دلیل، فاذا قامت الدلائل الدالة علی

وجود الشفاعة وجب المصیر الی تخصیصها“

”ولا یقبل منها شفاعة“ میں نکرہ تحت النفی ہونے کی وجہ سے عموم پایا گیا ہے لیکن

عام کو مخصوص البعض بنانے کے لئے ادنی دلیل کافی ہے جب شفاعت کے ثبوت پر کثیر

دلائل موجود ہیں تو خود بخود سمجھ آ گیا کہ یہاں عام مخصوص البعض ہے کہ کفار کے لئے

شفاعت قبول نہیں ہوگی۔

☆ ﴿مَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ حَمِيمٍ وَلَا شَفِيعٌ يُطَاعُ﴾ یہ الفاظ گرامیہ نقیض ہیں ”للظالمین

حمیم وشفیع“ اور یہ الفاظ قضیہ موجبہ کلیہ ہیں۔ اور قانون یہ ہے کہ موجبہ کلیہ کی نقیض سالبہ جزئیہ ہوتی ہے

سالیہ جزیہ کے سچے آنے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ بعض افراد سے نفی پائے جائے۔ جمیع افراد کی نفی سالیہ جزیہ میں نہیں ہوتی۔ اب واضح ہوا کہ اگر ”ظالمین“ سے مراد عام ظالم لوگ لئے جائیں جو مومنوں اور کافروں کو شامل ہو تو پھر بھی جب نفی کا معنی بحیثیت سالیہ جزیہ کیا جائے گا تو اس وقت معنی یہ ہوگا ”کہ بعض ظالم کا کوئی دوست نہیں ہوگا اور نہ کسی کی سفارش مانی جائے گی“

اس معنی کے لحاظ پر خود واضح ہو جاتا ہے کہ بعض ظالموں سے مراد ہیں ہی کفار، مومن اس نفی کے معنی میں آتے ہی نہیں۔

☆ ﴿وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ﴾ یہ نفیض ہے ”للظالمین انصار“ کی یہ موجبہ کلیہ ہے۔ اس کی نفیض سالیہ جزیہ ہے اور سالیہ جزیہ کا مدلول سلب العموم ہے اور سلب العموم سے عموم السلب حاصل نہیں۔ سلب العموم یعنی مجموع من حیث المجموع کی نفی جو بعض کی نفی کو مستلزم ہوتا ہے اور عموم السلب کا مطلب ہے ہر فرد کی نفی کرنا، وہ اس میں پایا نہیں گیا۔

ان دونوں آیتوں پر علامہ رازی رحمہ اللہ کی عبارات کو بھی طلباء نگاہ میں رکھیں وہ عبارات یہ ہیں:

”ان قوله (ما للظالمین من حمیم ولا شفیع) نفیض لقولنا للظالمین حمیم وشفیع، لكن قولنا للظالمین حمیم وشفیع موجبة كلية ونفیض الموجبة الكلية سالبة جزئية والسالبة الجزئية يكفى في صدقها تحقق ذلك السلب في بعض الصور، ولا يحتاج فيه الى تحقق ذلك السلب في جميع الصور وعلى هذا فنحن نقول بموجبه لان عندنا انه ليس بعض الظالمین حمیم ولا شفیع یجاب وهم الكفار فاما ان یحكم على كل واحد منهم بسلب الحیم والشفیع فلا“

”وقوله (وما للظالمین من انصار) فالجواب عنه انه نفیض لقولنا“

للظالمین انصار“ وهذه موجبة كلية فقوله ”وما للظالمین من انصار“

سالبة جزئية فيكون مدلوله سلب العموم وسلب العموم لا يفيد عموم

السلب“

(کیرج ۲ ص ۶۵)

معتزلہ کا استدلال احادیث سے:

”عن ابی ہریرۃ انه علیہا لصلوة والسلام دخل المقبرة فقال السلام علیکم دار قوم مؤمنین وانا ان شاء اللہ بکم لا حقون ، وددت انی قد رأیت اخواننا ، قالوا یا رسول اللہ السنا اخوانک قال بل انتم اصحابی ، و اخواننا الذین لم یأتوا بعد قالوا یا رسول اللہ کیف تعرف من یتاتی بعدک من امتک ؟ قال ارأیت ان کان لرجل خیل غرمحجلة فی خیل دهم فهل لا یعرف خیلہ ؟ قالوا بلی یا رسول اللہ قال فانہم یأتون یوم القيامة غرا محجلین من الوضوء وانا فرطہم علی الحوض ، الا فلیزادن رجال عن حوضی کما یزاد البعیر الضال انا دیہم الالہم الالہم فیقال انہم قد بدلوا بعدک فاقول فسحقا فسحقا“

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ قبرستان میں داخل ہوئے تو آپ نے کہا ”السلام علیکم قوم مؤمنین وانا ان شاء اللہ بکم لا حقون“ میں پسند کرتا ہوں کہ بیشک میں اپنے بھائیوں کو دیکھ لوں۔ صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا ہم آپ کے بھائی نہیں، کہا بلکہ تم تو میرے صحابہ ہو ہمارے بھائی تو ابھی نہیں آئے۔ صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ کی امت کے جو لوگ ابھی تک نہیں آئے آپ ان کو کیسے پہچانیں گے؟ آپ نے فرمایا تمہارا اس میں کیا خیال ہے کہ اگر کسی شخص کا سفید پیشانی والا گھوڑا سیاہ گھوڑوں میں ہو تو کیا وہ شخص اسے نہیں پہچانے گا؟ صحابہ کرام نے عرض کیا کیوں نہیں (یعنی وہ یقیناً پہچان لے گا) آپ نے فرمایا وہ لوگ وضوء کرنے کی وجہ سے چمکدار چہروں والے ہوں گے۔ اور میں حوض پر آگے جا کر ان کا منتظم ہوں گا۔ خبردار کچھ لوگوں کو میرے حوض سے اس طرح ہٹا دیا جائے گا جس طرح اجنبی اونٹ کو ہٹا دیا جاتا ہے، میں ان کو ندادوں گا خبردار ادھر آ جاؤ خبردار ادھر آ جاؤ۔ تو کہا جائے گا انہوں نے تمہارے بعد (دین کو) تبدیل کر دیا تھا۔ تو اس وقت میں کہوں گا پھر تو ٹھیک ہے انہوں نے رب کی رحمت سے دور ہونا ہی ہے ہاں انہوں نے دور ہی ہونا ہے۔

اس حدیث پاک سے معتزلہ نے دلیل یہ پکڑی کی جب نبی کریم ﷺ ان کو حوض سے نہیں پلا سکیں

گے تو ان کی شفاعت کر کے عذاب سے کیسے بچا سکیں گے۔

جواب نمبر 1: اگر ان کی دین میں تبدیلی حالت ارتداد تک پہنچی ہوئی ہو۔ تو واضح بات ہے کہ مرقد کافر ہوتا ہے کافر کو نہ حوض سے پانی پلایا جائیگا اور نہ ہی اسکی شفاعت کی جائیگی کہ وہ عذاب سے بچ جائیگا۔
” لان ظاهر هذا الحديث ان جميع الامة يشرب الا من ارتد وصار كافرا “

(نووی شرح مسلم ج ۲ ص ۲۵۷)

تحقیقی جواب نمبر 2: دین میں ان کی تبدیلیاں حالت ارتداد تک تو نہیں پہنچی ہوں گی لیکن ان کی رخنہ اندازی کی وجہ سے رب تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے ناراض ہوں گے جب حضور ناراض ہوئے تو حوض سے پانی پلانے کا مقصد ہی ختم ہو جائے گا۔ علامہ نووی رحمہ اللہ کے ان الفاظ کو پڑھ کر سمجھئے:

” وقيل لا يشرب منه الا من قد له السلامة من النار “ (نووی شرح مسلم ج ۲ ص ۲۵۷)

بیان کیا گیا ہے کہ حوض سے پانی ان کو ہی پینا نصیب ہوگا جن کی قسمت میں آگ سے سلامتی مقدر ہوگی۔

اب مسئلہ کو سمجھئے کہ ان لوگوں کو حوض کا پانی نہیں پلایا جائے گا کیونکہ انہوں نے آگ میں داخل ہونا ہے۔ لیکن یہ کیسے ثابت ہو سکتا ہے کہ جو آگ میں داخل ہوں گے ان کی شفاعت نہیں ہوگی۔ جبکہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ شفاعت کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ جو لوگ جہنم کی آگ میں گناہوں کی وجہ سے داخل کر دیئے جائیں گے ان کو شفاعت کی وجہ سے آگ سے نکال دیا جائے گا۔ یعنی حوض کا پانی تو نہیں پلایا جائے گا لیکن جہنم میں داخل کرنے کے بعد شفاعت کی وجہ سے ان کو جہنم سے نکال دیا جائیگا۔

معتزلہ کا یہ کہا کہ ”جسے حوض سے پانی نہیں پلایا جائے گا اس کی شفاعت بھی نہیں ہوگی“ باطل اور لغو قول ہے۔

☆ ” عن جابر بن عبد الله ان النبي ﷺ قال لكعب بن عجرة يا كعب بن عجرة اعيذك بالله من اماراة السفهاء انه سيكون امراء من دخل عليهم فاعانهم على ظلمهم وصدقهم بكذبهم فليس مني ولست منه ولن يرد على الحوض ومن لم يدخل عليهم ولا يعنهم على ظلمهم ولم يصدقهم بكذبهم فهو مني وانا منه وسيرد على الحوض يا كعب بن عجرة لا يدخل الجنة لحم نبت من سحت “

حضرت جابر بن عبد اللہ کہتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے کعب بن عجرۃ کو کہا اے کعب میں تمہارے لئے بے وقوفوں کے حاکمیت سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں بیشک ایسے امراء ہوں گے کہ جو ان کے پاس گیا اور ان کے ظلم پر ان کی امداد کی اور ان کے جھوٹ کو سچا کہا اس شخص کا تعلق مجھ سے نہیں اور میرا تعلق اس سے نہیں اور جو ان کے پاس نہ گیا اور کے ظلم پر ان کی امداد نہ کی، اور ان کے جھوٹ کو سچ نہ کہا اس کا تعلق مجھ سے ہوگا اور میرا تعلق اس سے ہوگا۔ اور وہ حوض پر وارد ہوگا (اسے حوض کوثر کا پانی ملے گا) اے کعب بن عجرہ نماز رب تعالیٰ کی قربت کا ذریعہ ہے، روزہ (گناہوں اور شہوات سے بچانے کے لئے) ڈھال ہے اور صدقہ گناہوں کو ایسے مٹا دیتا ہے جیسے پانی آگ کو، اے کعب بن عجرہ وہ شخص جنت میں نہیں داخل ہوگا جس کی پرورش حرام مال سے ہوگی۔

اس حدیث پر معتزلہ نے کہا:

”ان قوله لا یدخل الجنة لحم نبت سحت، صریح فی انه لا اثر

الشفاعة فی حق صاحب الكبيرة“

بیشک نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد کہ جس شخص کی پرورش حرام مال سے ہوئی وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا واضح طور پر دلالت کر رہا ہے کہ گناہ کبیرہ کے حق میں شفاعت کا اثر نہیں ہوگا۔

الزامی جواب: ”لا یدخل الجنة“ میں کسی زمانہ کی کوئی قید نہیں اگر اس کو مطلق رکھا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ وہ کبھی بھی جنت میں داخل نہیں ہوگا حالانکہ ہمیشہ جہنم میں رہنا اور جنت میں کبھی نہ داخل ہونا صرف کافر کے لئے ہوگا۔ مومن نے آخر کار جنت میں داخل ہونا ہی ہے۔

تحقیقی جواب: حدیث شریف میں ”لا یدخل الجنة“ کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس شخص پر اللہ تعالیٰ نے مہربانی نہ فرمائی تو وہ ابتدائی طور پر جنت میں نہیں داخل ہوگا، بلکہ اس کو ابتدائی طور پر جہنم میں بھیج دیا جائیگا۔ اسکے بعد وہ سزا ختم کر لے تو اسے جہنم سے نکال کر جنت میں داخل کر دیا جائے۔ یا اسکے حق میں شفاعت کر دی جائے اور اسکے حق میں شفاعت کو قبول کر کے اسے جنت میں داخل کر دیا جائے۔

خیال رہے کہ ”اول مرتبہ جنت میں داخل نہ ہونے کی قید بہت جگہ پر لگانے کی ضرورت درپیش آتی ہے“ جیسا کہ: ”من قال لا اله الا الله دخل الجنة“ (جس نے لا الہ الا اللہ کہا وہ جنت میں

داخل ہوگا) میں یہ قید لگانے کی ضرورت ہوتی ہے کہ آخر کار وہ جنت میں داخل ہوگا۔

☆ "عن ابی ہریرۃ قال قام فینا رسول اللہ ﷺ ذات یوم فذکر الغلول فعظمہ وعظم امرہ ثم قال لا الفین احدکم یجئنی یوم القیامۃ علی رقبته بعیر لہ رغاء یقول یا رسول اللہ اغثنی فاقول لا املک لک شیاً قد ابلغتک لا الفین احدکم یجئنی یوم القیامۃ علی رقبته فرس لہ حمحمة فیقول یا رسول اللہ اغثنی فاقول لا املک لک شیاً قد ابلغتک ، لا الفین احدکم یجئنی یوم القیامۃ علی رقبته شاة لها ثغاء یقول یا رسول اللہ اغثنی فاقول لا املک لک شیاً قد ابلغتک ، لا الفین احدکم یجئنی یوم القیامۃ علی رقبته نفس لها صیاح فیقول یا رسول اللہ اغثنی فاقول لا املک لک شیاً قد ابلغتک لا الفین احدکم یجئنی یوم القیامۃ علی رقبته رقاع تخفق فیقول یا رسول اللہ اغثنی فاقول لا املک لک شیاً قد ابلغتک ، لا الفین احدکم یجئنی یوم القیامۃ علی رقبته صامت فیقول یا رسول اللہ اغثنی فاقول لا املک لک شیاً قد ابلغتک" (رواہ مسلم باب غلط تحریم الغلول)

مشکل الفاظ کے معانی: غلول، امانت میں خیانت کرنا۔ الفین، ہمزہ پر ضم، فاء کے نیچے کسرہ لا الفین ای لا اجدن احدکم علی هذه الصفة، میں نہ پاؤں تم میں سے کسی ایک کو اس صفت پر رغاء، اونٹ کی آواز۔ حمحمة، گھوڑے کی آواز۔ ثغاء، بکری کی آواز۔ صیاح، چلانا، زور زور سے آواز دینا۔ رقاع، کپڑوں کے ٹکڑے۔ تخفق، حرکت کرنا۔ صامت، خاموش رہنا، لیکن یہاں مراد سونا اور چاندی ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ ہمارے درمیان تشریف فرما تھے آپ نے مال غنیمت میں خیانت کا ذکر فرمایا اس کے عظیم جرم ہونے اور اس پر عظیم سزا کے مستحق ہونے کا ذکر فرمایا پھر آپ نے فرمایا میں تم میں سے کسی ایک کو ہرگز نہ پاؤں ایسے حال میں کہ وہ قیامت کے دن آئے اس کی گردن پر (غنیمت میں خیانت کردہ) اونٹ ہو جو آواز دے رہا ہو۔ وہ شخص کہے گا یا رسول اللہ میری فریاد کو پہنچیں میں کہوں گا میں تمہارے لئے کسی چیز کی ملکیت نہیں رکھتا، میں نے تمہیں (اللہ کے احکام) پہنچا دیئے تھے۔

میں تم میں سے کسی ایک کو ایسے حال میں ہرگز نہ پاؤں کہ وہ قیامت کے دن آئے اس کی گردن پر گھوڑا ہو جو اپنی آواز دے رہا ہو، وہ شخص کہے گا یا رسول اللہ میری فریاد کو پہنچو میں کہوں گا میں تمہارے

لئے کسی چیز کا مالک نہیں میں نے تمہیں احکام پہنچادیئے تھے۔

میں تم میں سے کسی ایک کو ایسے حال میں ہرگز نہ پاؤں کہ وہ قیامت کے دن آئے اس کی گردن پر بکری ہو جو آواز دے رہی ہو، وہ شخص کہے گا یا رسول اللہ میری فریاد کو پہنچو، میں کہوں گا میں تمہارے لئے کسی چیز کا مالک نہیں میں نے احکام پہنچادیئے تھے۔

میں تم میں سے کسی ایک کو ایسے حال میں ہرگز نہ پاؤں کہ وہ قیامت کے دن آئے اس کی گردن پر کوئی انسان چلا رہا ہو (یعنی جس انسان کا حق اس نے دبایا ہوا تھا) وہ کہے گا یا رسول اللہ میری فریاد کو پہنچو میں کہوں گا میں تمہارے لئے کسی چیز کا مالک نہیں میں نے تمہیں احکام پہنچادیئے تھے۔

میں تم میں سے کسی شخص کو ہرگز ایسے حال میں نہ پاؤں کہ وہ قیامت کے دن آئے اس کی گردن پر کپڑے حرکت کر رہے ہوں، وہ کہے گا یا رسول اللہ میری فریاد کو پہنچو میں کہوں گا میں تمہارے لئے کسی چیز کا مالک نہیں میں نے تمہیں احکام پہنچادیئے تھے۔

میں تم میں سے کسی کو ہرگز اس حال میں نہ پاؤں کہ وہ قیامت کے دن آئے تو اس کی گردن پر سونا اور چاندی ہو وہ کہے گا یا رسول اللہ میری فریاد کو پہنچو میں کہوں گا میں تمہارے لئے کسی چیز کا مالک نہیں میں نے تمہیں احکام پہنچادیئے تھے۔

نبی کریم ﷺ کی اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ خیانت کرنا عظیم جرم ہے۔ جس چیز کی خیانت کرے گا اسی کا بوجھ قیامت کے دن اس کی گردن پر ہوگا۔ جس سے نجات حاصل کرنے کے لئے نبی کریم ﷺ سے فریاد طلب کر رہا ہوگا لیکن آپ امداد کرنے سے انکار فرمادیں گے۔

اس حدیث سے معزز لہ کا استدلال:

”هذا صريح في المطلوب لانه اذا لم يملك له من الله شيا فليس له

في الشفاعة نصيب“

معزز لہ کہتے ہیں کہ اس حدیث سے ہمارا موقف بہت واضح طور پر ثابت ہے کہ جب نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی چیز کے مالک نہیں ہوں گے تو آپ کو شفاعت کا بھی کوئی حق حاصل نہیں ہوگا۔

جواب: ”قال القاضي معناه من المغفرة والشفاعة الا باذن الله تعالى قال ويكون ذلك اولاً

غضباً عليه لمخالفته ثم يشفع في جميع الموحدين بعد ذلك“ (نوی شرح مسلم ج ۲ ص ۱۳۱)

قاضی عیاض رحمہ اللہ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ کے ارشاد کا مطلب (کہ میں تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی چیز کا مالک نہیں) یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی اجازت سے شفاعت کرتا ہوں ابھی تمہارے لئے مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت حاصل نہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ آپ ان لوگوں پر ناراضگی کا اظہار فرمائیں گے جنہوں نے مال غنیمت میں خیانت کی ہوگی کیونکہ آپ نے اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچا دیئے تھے تو ان پر عمل کرنا چاہئے تھا ان پر عمل کو چھوڑ کر انہوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کو ناراض کیا۔

ہاں البتہ پھر جب آپ تمام کلمہ توحید پر ایمان لانے والوں کی شفاعت کریں گے تو ان کی بھی شفاعت کریں گے۔ گویا کہ یہاں بھی ان کے جہنم میں داخل ہونے کے بعد ان کو شفاعت کے ذریعے نکال کر جنت میں داخل کیا جائے گا۔

راقم کے خیال میں یہاں ایک اور بھی احتمال ہے کہ اگر مال غنیمت کی تقسیم کے بعد کسی کا حق دبا لیا، تو اس صورت میں نبی کریم ﷺ نے شفاعت کرنی ہی نہیں کیونکہ حقوق العباد ادا ایگی حقوق کے بغیر معاف نہیں ہوں گے۔ ان کی ادائیگی کا ذکر پچھلے اوراق میں کیا جا چکا ہے۔

☆ "قال عليه الصلوة والسلام ثلاثة انا خصيمهم يوم القيامة ومن كنت خصيمه خصمته ، رجل اعطى بي ثم غدر ، ورجل باع حرا فاكل ثمنه ، ورجل استأجر اجيرا فاستوفى منه ولم يوفه اجرته "

نبی کریم ﷺ نے فرمایا تین شخصوں سے قیامت کے دن میرا جھگڑا ہوگا، جس سے میرا جھگڑا ہوگا اسی سے میری ناراضگی ہوگی۔ ایک وہ شخص ہے جس نے میرے ساتھ معاہدہ کیا پھر اس میں دھوکہ بازی کی، دوسرا وہ شخص ہے جس نے آزاد شخص کو بیچ کر اس کا بدل مال کھالیا۔ تیسرا وہ شخص ہے جس نے کسی شخص کو اجرت پر کام میں لگایا، اس سے کام پورا لیا، لیکن اسے اجرت مکمل نہ دی۔

اس حدیث سے معتزلہ کا استدلال:

"انه عليه الصلوة والسلام لما كان خصيما لهؤلاء فاستحال ان يكون شفيعالهم "

بیشک نبی کریم ﷺ جب ان لوگوں سے جھگڑا کرنے والے ہوں گے کہ تم نے یہ جرم کیوں کئے تو محال ہے کہ آپ ان کی شفاعت فرمائیں۔ اس سے واضح ہوا کہ آپ کبیرہ گناہ کرنے والوں کی

شفاعت نہیں فرمائیں گے۔

جواب: اس حدیث پاک کا بھی وہی مطلب ہے جو پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ پہلے آپ ناراضگی کا اظہار فرمائیں گے یعنی ان کو ڈانٹ دیں گے۔ اس طرح ان لوگوں کو جہنم میں داخل کر دیا جائے گا۔ پھر آپ شفاعت فرمائیں گے تو آپ کی شفاعت سے ان کو جہنم میں نکال کر جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔

معتزلہ کی اور دلیل: اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَلَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنْ ارْتَضَىٰ﴾ فاسق تو مرتضیٰ (پسندیدہ) نہیں لہذا فاسق کی جب فرشتے شفاعت نہیں کریں گے تو یقیناً نبی کریم ﷺ بھی شفاعت نہیں فرمائیں گے۔

جواب: آیہ کریمہ کا مطلب یہ نہیں جو تم نے بیان کیا ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ شفاعت کرنے کا حق ان کو ہوگا جن کو اللہ تعالیٰ نے پسند کیا ہوگا، یعنی جن کو اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہوگی اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے:

﴿وَلَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنْ ارْتَضَاهُ اللَّهُ﴾

کہ شفاعت نہیں کریں گے سوائے اس شخص کے جس کے لئے شفاعت کو رب تعالیٰ نے پسند کیا ہوگا۔ تو اس سے بھی اتنا ہی ثابت ہوگا کہ جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف اجازت نہیں دی جائے گی تو اس شخص کے لئے کوئی شفاعت نہیں کرے گا اور اگر اجازت ہوئی تو شفاعت کی جائے گی۔

معتزلہ اصل میں شفاعت کی پانچ قسموں کو سمجھنے سے قاصر رہے، انہیں یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ابتدائی طور پر شفاعت نہ کرنا اور جہنم میں جانے کے بعد شفاعت کرنا بھی شفاعت ہی ہے۔ بلکہ ساتھ تنبیہ بھی ہوگی اور ان پر مہربانی بھی ہوگی۔ پھر شفاعت نہ کرنا اور چیز ہے، شفاعت کا مستحق نہ ہونا اور چیز ہے معتزلہ یہ فرق نہ سمجھ سکے۔

(شفاعت میں معتزلہ کئے دلائل کی بحث ماخوذ از کبیر بتصرف)

☆☆☆☆☆

﴿وَإِذْ نَجَّيْنَاكُمْ مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمْ سُوءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُونَ أَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَكُمْ وَفِي ذَلِكُمْ بَلَاءٌ مِّنْ رَبِّكُمْ عَظِيمٌ﴾

(۱) ”(اور یاد کرو) جب ہم نے تم کو فرعون والوں سے نجات بخشی کہ تم پر برا عذاب کرتے تھے تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتے اور تمہاری بیٹیوں کو زندہ رکھتے اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے بڑی بلا تھی یا بڑا انعام۔“

(۲) ”اور یاد کرو جب ہم نے نجات دی تمہیں فرعون والوں سے، پہنچاتے تھے تمہیں بدترین تکلیفیں، ذبح کرتے تمہارے بیٹوں کو، اور زندہ چھوڑتے تمہاری بیٹیوں کو، اور اس میں تمہارے لئے آزمائش تھی تمہارے رب کی طرف سے بہت بڑی۔“

بنی اسرائیل کو رب تعالیٰ نے پہلے حکم دیا کہ میری نعمتوں کو یاد کرو، اب انہیں اپنی نعمتوں کی تفصیل بتائی جا رہی ہے۔ کہ تم یاد کرو اس نعمت کو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں فرعون والوں سے نجات دی کیونکہ وہ تمہیں طرح طرح کی شدید تکلیفیں پہنچاتے تھے اور سب سے بہت بڑا اور بہت برا عذاب انہوں نے تمہیں یہ دیا کہ تمہارے بیٹوں کو قتل کر دیا اور تمہاری بیٹیوں کو زندہ چھوڑا، یہ تمہارے لئے بہت بڑی آزمائش تھی۔ خیال رہے کہ یہ خطاب بھی نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے یہود کو ہے لیکن چونکہ یہ انعام ان کے آباؤ اجداد پر تھا اس لئے گویا کہ ان پر بھی یہ انعام تھا۔

﴿وَإِذْ نَجَّيْنَاكُمْ مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ﴾ : ”اور جب ہم نے تمہیں نجات دی فرعون والوں سے“

”اذ فی موضع النصب عطف علی (اذکروا نعمتی) وهذا وما بعده

تذکر بعض الی کانت علیہم“

لفظ ”اذ“ محل نصب میں ہے اس کا عطف ”اذکروا“ پر ہے اس آیت کریمہ اور بعد میں آنے والی آیات میں بعض نعمتوں کی یاد دلائی جا رہی ہے۔ جو نعمتیں ان پر تھیں ان میں سے ہی یہ نعمت بھی

ہے کہ ان کو فرعون والوں سے نجات دی۔

﴿آل﴾: اصل میں اہل ہے کیونکہ اس کی تصغیر ”اہیل“ آتی ہے بعض حضرات نے کہا یہ اصل میں ”اول“ (واؤ کے سکون سے) ہے۔

قاعدہ اکثر یہ: آل اور اہل کا اگرچہ ایک معنی ہے لیکن ان کے استعمال میں فرق کیا جاتا ہے آل اور اہل میں دلالت کرنے والا قاعدہ اکثر یہ یہ پایا گیا ہے کہ ”آل“ کا مضاف الیہ ذو خطر (سردار شخص) ہو۔ جانے خواہ اسے منصب دینی طور پر حاصل ہو یا دنیاوی طور۔ آل رسول اور آل فرعون تو کہا جاسکتا ہے کیونکہ اللہ کے رسول کو ایک دینی منصب یعنی منصب نبوت حاصل ہے۔ اور فرعون کو دنیاوی طور پر بابت شہادت کی وجہ سے ایک منصب حاصل تھا۔

اسی وجہ سے ”آل حجام“ نہیں کہہ سکتے کیونکہ حجام (خون نکالنے والے) کا پیشہ گھٹیا سمجھا جاتا ہے اور ”اہل حجام“ کہا جاسکتا ہے۔ اور فرق یہ ہے کہ آل کا مضاف الیہ ذوی العقول سے ہونا چاہئے لہذا آل کو فہ نہیں کہا جاسکتا البتہ اہل کو فہ کہا جاسکتا ہے۔ اور فرق یہ کہ آل کا مضاف الیہ مذکر ہونا چاہئے اسی لئے آل فاطمہ نہیں کہا جاتا بلکہ اہل فاطمہ کہا جاتا ہے۔

لیکن یہ خیال رہے کہ یہ قاعدہ اکثر یہ ہے کلیہ نہیں یہی وجہ ہے کہ اس قاعدہ کے خلاف بھی استعمال ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے، آل عوج (عوج گھوڑے کا نام) اور کہا جاتا ہے، آل مدینہ، اور کہا جاتا ہے، آل نعم اور کہا جاتا ہے، آل صلیب، اور کہا جاتا ہے، آلک، اور کبھی آل بغیر مضاف الیہ کے بھی استعمال ہوتا ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے ”ہم خیر آل“ (روح المعانی)

آل فرعون سے مراد:

”آل فرعون ای قومہ واتباعہ واہل دینہ“

آل فرعون سے مراد فرعون کی قوم اور اس کی تابعداری کرنے والے، اور اس کے دین پر چلنے والے۔

”اذلم یکن لہ ابن ولا بنت ولا اب ولا عم ولا اخ ولا عصبہ“

فرعون کی آل سے مراد اس کے دین کے پیروکار ہی لینا بہتر ہے کیونکہ ”اغرقنا آل فرعون“ میں آل سے مراد فرعون کی قوم بھی نہیں ہو سکتی کیونکہ اس وقت فرعون کا نہ کوئی بیٹا تھا اور نہ بیٹی،

اور نہ باپ تھا اور نہ چچا، اور نہ بھائی تھا اور نہ بی خاندان کا کوئی اور فرد تھا۔ (از قرطبی)

”والآل خاصة الرجل من جهة قرابة او صحبة وحكى عن ابی عبیدة انه سمع فصيحاً يقول اهل مكة آل الله“

کسی شخص کے قرابت یا صحبت کے لحاظ پر خاص حضرات کو آل کہا جاتا ہے ابو عبیدہ نے فصیح شخص کو کہتے ہوئے سنا ”اہل مکہ آل اللہ“ مکہ والے اللہ تعالیٰ کی آل ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ سے مکہ والے قرب رکھنے والے ہیں اس لحاظ پر ”آل اللہ“ کہنا صحیح ہوا (از کبیر)

فائدہ: نبی کریم ﷺ کی آل سے مراد کون حضرات ہیں؟ علامہ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”واختلف العلماء فی آل النبی ﷺ علی اقوال اظهرها وهو اختيار الازهری وغيره من المحققين انهم جميع الامة والثاني بنو هاشم وبنو المطلب والثالث اهل بيته ﷺ وذريته والله اعلم“

(مسلم باب الصلوة علی النبی ص ۹۸)

نبی کریم ﷺ کی آل میں علماء کا اختلاف ہے اس میں مختلف قول ہیں ان میں ظاہر قول یہ ہے جو علامہ ازہری رحمہ اللہ اور دوسرے محققین حضرات کا ہے کہ بیشک اس سے مراد آپ کی تمام امت ہے لیکن خیال رہے کہ امت میں نیک اور متقی حضرات مراد ہیں فساق و فجار مراد نہیں، اس لئے کئی مصنفین حضرات نے اس مسئلہ کے اوپر بطور دلیل ایک حدیث پیش فرمائی کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ”کل نقی نقی فهو آلی (او کما قال ﷺ)“ کہ ہر پاک و صاف میری امت کا شخص میری آل ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ آپ کی آل سے مراد بنی ہاشم اور بنی مطلب میں سے ایمان لانے والے حضرات ہیں۔ تیسرا قول یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی آل کا اطلاق آپ کی ازواج مطہرات پر اور آپ کی اولاد پر ہوتا ہے۔

قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا:

”آل الرسول من هو علی دینہ و ملتہ فی عصرہ و سائر الاعصار سواء کان نسباً له او لم یکن“

رسول اللہ ﷺ کے آل وہ ہے جو آپ کے دین اور آپ کی ملت پر ہے خواہ وہ آپ کے زمانہ میں تھے یا بعد میں کسی زمانہ میں بھی ہوں خواہ آپ کے نسب سے ہوں یا نہ ہوں۔

”ومن لم یکن علی دینہ وملتہ فلیس من آلہ ولا اہلہ وان کان نسبہ او قریبہ“

جو شخص نبی کریم ﷺ کے دین اور ملت پر نہیں وہ آپ کی اہل سے نہیں اگرچہ آپ کے نسب سے اس کا تعلق ہو، یا آپ کا قریبی رشتہ دار ہو۔

یہی وجہ ہے کہ ابولہب اور ابوجہل آپ کے خاندان سے متعلق ہونے کے باوجود آپ کی اہل سے نہیں۔ اسی سے پتہ چل گیا کہ صرف یہ کہنا کہ ہم سادات ہیں کافی نہیں ایمان پہلے ہے سید ہونے کا نفع بعد میں ہے نبی کریم ﷺ کا گستاخ یا صحابہ کرام سے بغض رکھنے والا اپنے آپ کو حضور کی آل کہے یہ اس کی جہالت ہے۔

بعض حضرات نے کہا کہ آل نبی صرف آپ کی ازواج اور آپ کی اولاد ہے کیونکہ حضرت ابو حمید ساعدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم آپ پر کیسے درود بھیجیں تو آپ نے فرمایا تم کہو۔

”اللہم صل علی محمد وعلی ازواجہ وذریئہ کما صلیت علی آل ابراہیم وبارک علی محمد وعلی ازواجہ وذریئہ کما بارکت علی آل ابراہیم انک حمید مجید“
(رواہ مسلم)

یعنی اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تم یہ کہو ”اے اللہ تو درود بھیج محمد (ﷺ) پر، اور آپ کی ازواج پر اور آپ کی اولاد پر۔

اس نے واضح ہوا کہ آپ کی آل آپ کی ازواج مطہرات ہیں اور آپ کی اولاد ہے۔

تمام اقوال میں حقیقتاً کوئی اختلاف نہیں:

راقم کے نزدیک تین اقوال جو ذکر کئے ہیں اور چوتھا قول جو درسیات کے حواشی پر ملتا ہے کہ آپ کی آل کا اطلاق آپ کے صحابہ کرام پر ہے سب ہی درست ہیں عبارت کے ماقبل اور مابعد کو دیکھا جائے کہ یہاں آل کا معنی ازواج مطہرات لینا صحیح ہے تو اس وقت اس سے مراد ازواج مطہرات ہی ہوں گی۔ اسی طرح اگر اولاد مراد لینا مناسب تو وہ معنی مراد لیا جائے، اگر صحابہ کرام معنی لینا زیادہ مناسب نظر آئے تو وہ معنی کیا جائے۔ اگر بنو ہاشم یا بنو عبدالمطلب مراد لینا بہتر ہو تو وہی مراد لی جائے،

اور اگر آپ کی امت کے تمام نیک متقی حضرات مراد لینا بہتر سمجھ آئے تو وہی مراد ہوگا۔

فرعون: مصر کے بادشاہوں کا لقب فرعون ہوا کرتا تھا۔ روم کے بادشاہوں کا قیصر، فارس کے بادشاہوں کا کسری، یمن کے بادشاہوں کا تبع، ترک بادشاہوں کا خاقان، اور حبشہ کے بادشاہوں کا لقب نجاشی تھا۔

”ولم یکن من الفراعنة احد اشد غلظة ولا اقسى قلبا منه“

مصر کے جتنے بادشاہ بھی گزرے ہیں کوئی بھی موسیٰ علیہ السلام کے زمانے کے فرعون سے زیادہ بدخلق، سخت دل اور ظالم نہیں تھا۔

یوسف علیہ السلام کے زمانے کا فرعون کا نام ریان بن ولید تھا جس نے ایمان قبول کر لیا تھا موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں پائے جانے والے فرعون کا نام ”ولید ابن مصعب“ یا مصعب ریان تھا بعض نے اس کا نام قابوس بھی تحریر کیا ہے، قبیلہ قبط سے تھا۔ یوسف علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں پائے جانے والے فرعونوں کے درمیان چار سو سال سے زائد عرصہ تھا۔

دینی طلباء کرام کے لئے: فرعون غیر منصرف ہے کیونکہ اس میں ایک سبب علمیت ہے اور دوسرا سبب عجمہ ہے اگرچہ فرعون عجمی لفظ ہے عربی نہیں، لیکن فرعون کے ظالمانہ طریقہ کو دیکھ کر اور اس کی سرکشی کو دیکھ کر اس کو عربی حضرات نے استعمال کیا ہے:

”فقیل تفرعن الرجل اذا تجبر وعتا“ جب کوئی شخص ظلم اور سرکشی کرے تو کہا جاتا ہے ”تفرعن الرجل“

(ماخوذ از کبیر)

فرعون کا غربت سے بادشاہت تک پہنچنا:

فرعون بہت غریب شخص تھا اس پر بہت زیادہ قرض ہو گیا تھا یہ مصر میں آیا اس نے دیکھا کہ دیہات سے خر بوزوں کی گٹھڑی ایک درہم کی ملتی ہے اور شہر میں ایک خر بوزہ ایک درہم کا فروخت ہوتا ہے اس نے سوچا یہ بڑی کامیاب تجارت ہے اس سے قرضہ اتارنا آسان ہوگا۔ اس نے ایک درہم سے خر بوزوں کی ایک گٹھڑی خرید لی، شہر میں لایا تو اس سے ٹیکس وصول کرنے والے بد معاشوں نے مختلف جگہ پر بطور ٹیکس خر بوزے بنور نے شروع کر دیئے۔ سب خر بوزے جگا ٹیکس کی نظر ہو گئے صرف ایک خر بوزہ باقی بچا جو اس نے شہر میں ایک درہم سے بیچ کر اپنا مول کھڑا کیا۔

اس نے سوچا اس ملک میں کوئی قانون نہیں جس کی لاکھی اس کی بھینس والا ضابطہ ہے یہاں بد معاش ہو کر مال بٹورنا آسان ہے قانون پر عمل کرنا جرم ہے۔

شہر میں وباء پڑ گئی لوگ بہت تعداد میں مرنے لگے، یہ قبرستان میں جا کر بیٹھ گیا کہ جو پانچ درہم دے گا اس کے مردہ کو یہاں دفن کرنے دیا جائے گا میں یہاں کا منتظم ہوں جو بھی آتے اسے پانچ درہم دیئے جاتے کسی نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ البتہ ایک خاندان والوں نے اسے پانچ درہم دینے سے انکار کر دیا اسے پکڑ کر حاکم وقت کے پاس لے گئے۔

اس نے پوچھا تمہیں کس نے قبرستان میں منتظم بنایا، تم کیوں ٹیکس لے رہے ہو اس نے بتایا مجھے کسی نے مقرر تو نہیں کیا تھا البتہ میں نے یہ حیلہ اس لئے کیا تھا کہ تمہارے پاس کسی طرح پہنچا دیا جاؤں میں نے تمہیں بتانا یہ تھا کہ تمہارے ملک میں کوئی قانون نہیں ہر شخص ٹیکس وصول کر رہا ہے ان کو کوئی پوچھنے والا نہیں۔ اسلئے کچھ کام میرے سپرد کرو تا کہ میں درست انتظام کر لوں بادشاہ نے اسے اپنی حکومت میں انتظامی امور سپرد کر دیئے اس نے مناسب تدبیر سے لوگوں میں اپنا مقام بنالیا آخر کار بادشاہ بن گیا۔

(ابو السعد)

﴿يَسْأَلُكُمْ﴾: ”يَذِيقُونَكُمْ وَيَلْزَمُونَكُمْ اياه“ وہ تمہیں چکھاتے تھے، تم پر لازم کرتے، ”وقيل يذيمون تعذيبكم“ بعض حضرات نے کہا اس کا معنی ہے ہمیشہ تمہیں عذاب پہنچاتے تھے۔

﴿سُوءَ الْعَذَابِ﴾: ”معناه اشد العذاب“ اس کا معنی ہے سخت عذاب، یعنی وہ فرعون والے تمہیں سخت عذاب پہنچاتے، تاہم اگر ظاہری معنی مراد لیا جائے کہ وہ ”برا عذاب تمہیں پہنچاتے تھے“ تو پھر بھی ٹھیک ہے۔

(از قرطبی)

کیسا بنی اسرائیل کو سخت عذاب دیا گیا؟

بنی اسرائیل کی حالت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے یہ تھی کہ فرعونوں کے یہ لوگ خادم تھے ان کو مختلف قسم کے کاموں پر مقرر کیا ہوا تھا۔ کچھ لوگوں کو تعمیر کے کاموں پر لگایا ہوا تھا، اور کچھ لوگوں سے

ہل چلانے کا کام لیا جاتا، اور کچھ لوگوں سے کھیتی باڑی کے مختلف کام لئے جاتے، فصل کی کاشت اور کٹائی وغیرہ کے کاموں پر مقرر تھے، گندے کاموں پر بھی انہیں ہی لگایا جاتا، بیت الحناء کی صفائی ان لوگوں کے ذمہ ہی تھی، کیچڑ وغیرہ کے کاموں پر ان کو ہی مقرر کیا جاتا۔ پتھر تراشنا اور پتھروں کو اٹھا اٹھار لانا ان کے ذمہ ہی تھا۔ اینٹیں بنانا اور پھر ان کو پکوانے کا کام ان سے ہی لیا جاتا تھا۔ جو لوگ یہ کام نہیں کر سکتے تھے ان پر ٹیکس مقرر کر دیا جاتا تھا۔ اور جو شخص سورج کے غروب ہونے سے پہلے ٹیکس ادا نہ کرے اس کے ہاتھ اس کی گردن سے باندھ دیئے جاتے اور ایک مہینہ تک اس کے ہاتھ اسی طرح بندھے رہتے۔

اور بنی اسرائیل کی عورتوں سے بھی اسی طرح کام لئے جاتے جیسے لونڈیوں سے کام لئے جاتے یعنی گھریلو تمام کام ان کے سپرد ہوتے، اور سوت کا تار اور سلائی، بنائی وغیرہ کے کام ان کی عورتوں سے ہی لئے جاتے تھے۔

(ماخوذ از کبیر، روح المعانی، خازن)

﴿يُذَبِّحُونَ أَبْنَاءَ كُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَ كُمْ﴾

ابناء کم، تمہارے بیٹے۔ نساء کم، تمہاری بیٹیاں۔ یذبحون، تشدید سے مبالغہ کے معنی میں استعمال ہے، یعنی تمہارے بیٹوں کو کثیر تعداد میں انہوں نے ذبح کیا تھا۔ یہ معنی اس وقت ہوگا جب کہ کیت (تعداد) میں مبالغہ ثابت کیا جائے، لیکن مبالغہ اگر کیفیت میں ثابت کیا جائے تو معنی یہ ہوگا کہ وہ تمہارے بیٹوں کو بے دردی سے ذبح کرتے تھے۔

نکتہ: اس آیت میں یذبحون بغیر واؤ کے استعمال ہے، اور سورۃ ابراہیم میں ”ویذبحون“ واؤ کے ساتھ استعمال ہوا ہے وجہ فرق کیا ہے؟ وجہ فرق یہ ہے کہ یہاں بغیر واؤ کے استعمال ہوا ہے، اس لئے کہ یہ ﴿يَسُومُونَكُم سُوءَ الْعَذَابِ﴾ کا بیان ہے کہ وہ تمہیں برا عذاب پہنچاتے، وہ برا عذاب کیا تھا؟ وہ برا عذاب یہ بھی تھا کہ فرعون والے بنی اسرائیل کے بیٹوں کو ذبح کرتے اور بیٹیوں کو زندہ رہنے دیتے۔

اور سورۃ ابراہیم میں ”واؤ“ سے ذکر کر کے مغایرت ثابت کی گئی کہ وہ برا عذاب پہنچاتے تھے اور اس سے بڑھ کر ان کے بیٹوں کو ذبح کرتے اور ان کی بیٹیوں کو زندہ رہنے دیتے۔ سبحان اللہ قرآن پاک کی کیا عظمت ہے کہ ایک ہی مسئلہ کو دو مختلف انداز سے بیان کر کے اس طرح ثابت کر دیا کہ فرعونوں کا بنی اسرائیل کو برا عذاب پہنچانا یہ بھی تھا کہ ان کے بیٹوں کو ذبح کرتے اور بیٹیوں کو

زندہ چھوڑتے۔ اور وہ مختلف طریقوں سے بنی اسرائیل کو برا عذاب پہنچاتے اور صرف اسی پر اکتفاء نہیں کرتے تھے بلکہ اس سے بڑھ کر ان کے بیٹوں کو ذبح کرتے اور ان کی بیٹیوں کو زندہ چھوڑتے۔ یہ عظمت صرف قرآن پاک کو ہی حاصل ہے۔

بنی اسرائیل کے بیٹوں کو ذبح کیوں کرایا گیا؟

فرعون نے ایک خواب دیکھا کہ بیت المقدس کی جانب سے ایک آگ نکلی ہے جس نے مصر کا احاطہ کر لیا اور تمام قبیلوں کو جلا دیا، لیکن بنی اسرائیل کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا اس خواب سے فرعون بہت پریشان تھا، اس نے خواب کی تعبیر بیان کرنے کے ماہرین سے پوچھا کہ اس خواب کی تعبیر کیا ہو سکتی ہے؟ انہوں نے بتایا کہ اس خواب سے تو یہی سمجھ آتا ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک بچہ پیدا ہوگا جو تمہاری بادشاہی کے زوال کا سبب بنے گا۔ یہ سن کر فرعون نے حکم دیا کہ بنی اسرائیل میں جو بچہ بھی پیدا ہو اسے ذبح کر دیا جائے اس طرح اس کے حکم سے ہزاروں کی تعداد میں ان کے بچے ذبح کر دیئے گئے، وہ جو ذبح کئے گئے ان کی تعداد بارہ ہزار تھی یا ستر ہزار تھی، اتنی بات واضح ہے کہ ہزاروں کی تعداد میں تھے۔

(جلالین، جمل)

فرعون کے اسی خواب کو مختصر الفاظ میں پیر محمد کرم شاہ رحمہ اللہ نے ذکر کرنے کے بعد فرمایا اس وقت کی توہم پرست مصری ذہنیت سے یہ کچھ بعید بھی نہ تھا۔ لیکن شیخ محمد عبدہ نے ایک اور وجہ بیان کی ہے وہ کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل کی نسل اس تیزی اور کثرت سے بڑھنے لگی تھی کہ فرعون کو یہ اندیشہ لاحق ہو گیا کہ اگر ان کی پیدائش کی رفتار یہی رہی تو بنی اسرائیل کی اقلیت اکثریت میں تبدیل ہو جائے گی اور اپنی غالب اکثریت کی بناء پر یہ کوئی انقلاب برپا کر دیں گے، اس خدشہ کے پیش نظر اس نے بنی اسرائیل کی نسل کشی کا یہ ظالمانہ حکم دیا۔

(ضیاء القرآن)

علامہ رازی رحمہ اللہ نے فرعون کے خواب دیکھنے کا واقعہ بھی بیان کیا لیکن اس سے پہلے ایک اور وجہ کو ذکر کیا وہ یہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ فرعون اور اس کے تبعین (تابعین) نے والوں کو جب یہ علم حاصل ہوا: "کان اللہ وعد ابراہیم ان يجعل فی ذریئہ انبیاء وملوکا فخافوا ذلک" کہ اللہ تعالیٰ کا ابراہیم علیہ السلام سے وعدہ ہے کہ تمہاری اولاد سے انبیاء

اور بادشاہ بناؤں گا تو اس سے فرعون اور فرعون والے لوگ ڈرے کہ یہ کہیں بادشاہ بن کر ہماری بادشاہت کو ختم نہ کر دیں تو انہوں نے سوچا کہ بڑی عمر کے لوگ خود مر جائیں گے، بچوں کو قتل کرانا شروع کر دیتا کہ بنی اسرائیل نہ بڑھیں اور نہ ہی ہمارے ساتھ مقابلہ کرنے کی ان کو طاقت ہو۔

ایک اور وجہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ ہو سکتا ہے فرعون کو خواب تو نہ آیا ہو البتہ نجومیوں نے اسے بتایا ہو کہ بنی اسرائیل میں ایک بچہ پیدا ہوگا جو تمہاری بادشاہت کے زوال کا سبب بنے گا، تو اس نے بچوں کو ذبح کرانا شروع کر دیا ہو۔

علامہ رازی رحمہ اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کو ترجیح دیتے ہوئے کہا:

”والاقرب هو الاول لان الذي يستفاد من علم التعبير وعلم النجوم

لا يكون امرا مفصلا“

زیادہ مناسب پہلا قول ہی ہے کیونکہ خواب کی تعبیر یا نجومیوں کی بات پر اعتبار کر لینا غیر یقینی ہے اس پر علامہ رازی اعتراض کرتے ہیں کہ اگر کوئی یہ کہے کہ فرعون تو اللہ تعالیٰ اور اس کے انبیاء کرام پر ایمان ہی نہیں رکھتا تھا تو اس نے کیسے اعتبار کر لیا کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام سے یہ وعدہ کیا ہے۔ اس کا جواب دیتے ہوئے بیان فرماتے ہیں:

”قلنا لعل فرعون كان عارفا بالله ويصدق الانبياء الا انه كان كافرا

كفر الجحود والعناد“

کہ ہو سکتا ہے فرعون رب تعالیٰ کو پہچانتا ہو، اور انبیاء کرام کی صداقت کا بھی اسے پتہ ہو لیکن ضد اور سرکشی کی وجہ سے انکار کرتا ہو، تقریباً تمام مشرکین کا یہی حال تھا وہ رب تعالیٰ اور اس کے انبیاء کو جانتے تھے مانتے نہیں تھے۔ (از کبیر)

بیٹوں کو ذبح کرنے اور بیٹیوں کو زندہ چھوڑنے کی وجہ کیا تھی؟

اس میں چند وجوہ بہت واضح طور پر نظر آتی ہیں:

- (۱) بیٹوں کو ذبح کرنے سے مردوں کو فنا کرنا مقصود تھا، تاکہ اس کے ذریعے نسل ختم ہو جائے، کیونکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ جب عورتیں اکیلی رہ جائیں گے تو ان سے نسل کا سلسلہ آگے نہیں چلے گا، اس طرح خود ہی مرد اور عورتیں سب تباہ ہو جائیں گے۔

(۲) مردوں کو ختم ہو جانے سے عورتوں کی زندگی برباد ہو کر رہ جاتی ہے ان کو ذریعہ معاش کا حصول اور معیشت کو سہارا دینا مشکل ہوتا ہے۔ اس طرح کی زندگی عورت کے لئے بہت بڑی محنت اور مشقت کا ذریعہ ہوتی ہے اس سے نجات دینا بھی اسی طرح عظیم نعمت ہوگی۔

(۳) بیٹوں کو قتل کرنے میں ان کے والدین پر کتنا غم آتا ہے یہ ان کو ہی پتہ ہوتا ہے خصوصاً والدہ جب ایک طویل وقت تک حمل کی مشکلات کو برداشت کرتی ہے، اور بچے کی پیدائش پر عظیم مسرت اور عظیم نفع کی انتظار میں ہوتی ہے، جب پیدائش کے ساتھ ہی بچے کو بے دردی سے قتل کر دیا جائے اور وہ بھی ماں کے سامنے تو اس کی حالت زار اس سے پوچھے کہ اس کے لئے یہ کتنا عظیم عذاب ہے۔

اور یہ بھی واضح ہے کہ اگر بچہ بڑا ہو جائے، طبعی زندگی گزار کر فوت ہو تو اس پر اتنا افسوس نہیں ہوتا جتنا کہ پیدا ہوتے ہی اسے قتل کر دیا جائے پھر موت پر بھی افسوس اتنا نہیں جتنا قتل پر ہوتا ہے۔

(۴) بیٹوں کو والدین پسند کرتے تھے بنسبت بیٹیوں کے۔ اسی وجہ سے اکثر لوگ بیٹیوں کو بوجھ سمجھتے تھے اور ان کو ناپسند کرتے تھے خواہ ان کے بیٹے زیادہ تعداد میں بھی ہوتے، اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق یہ ارشاد فرمایا:

﴿وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُم بِالْأُنْثَىٰ ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ
يَتَوَارَىٰ مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوءِ مَا بُشِّرَ بِهِ﴾ (پ ۱۴)

اور جب ان میں سے کسی کو بیٹی ہونے کی خوشخبری دی جاتی ہے تو دن بھر اس کا منہ کالا رہتا ہے اور وہ غصہ میں ہو جاتا ہے لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے اس بشارت کی برائی کی وجہ سے۔ اسی وجہ سے کئی لوگ اپنی بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے رب تعالیٰ نے ان کو اس سے منع فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ﴾ اور تم اپنی اولاد کو بھوک کے ڈر کی وجہ سے قتل نہ کرو۔ اولاد سے مراد بیٹیاں ہی ہیں کیونکہ یہ بات واضح ہے کہ وہ بیٹیوں کو ہی زندہ دفن کرتے تھے بیٹوں کو نہیں۔

(۵) مرد جب نہ رہیں صرف عورتیں رہ جائیں تو بعض اوقات وہ دشمنوں کے قبضہ میں آ جاتی ہیں اور وہ ان کو اپنے نکاح میں لے آتے جو بہت زیادہ ذلت کا سبب بنتا ہے۔

یہی وجہ تھیں جن کو مد نظر رکھتے ہوئے ان لوگوں نے بنی اسرائیل کے بیٹوں کو ذبح کرنے کا پروگرام بنایا۔

(از کبیر)

تنبیہ: بعض حضرات نے ”وِیَسْتَحِیُّونَ نِسَاءَ کُمْ“ کا معنی یہ بیان کیا ہے:

”بفتشون فی حیائھن سظرون هل بہن حمل و الحیاء فرح“

کہ وہ عورتوں کی فرجوں کو دیکھتے اور تنقیش کرتے تھے کہ یہ حاملہ ہیں یا نہیں۔

لیکن اس معنی کو علامہ رازی رحمہ اللہ نے رد کیا ہے۔ (از روح المعانی و کبیر)

﴿وَفِیْ ذٰلِکُمْ بَلَاءٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ عَظِیْمٌ﴾

”اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے آزمائش تھی بہت بڑی“

”بلاء“ کا معنی ہے اختبار، آزمائش کرنا۔ پھر اس کی تین قسمیں ہیں ”وہو تارة یكون بالمسار لیشکروا“ ایک قسم یہ ہے کہ نعمتیں عطا کر کے آزمایا جائے کہ یہ اس آزمائش میں پورے اتر کر شکر یہ ادا کریں۔ ”وتارة بالمضار لیصبروا“ اور آزمائش کبھی تکلیف پہنچا کر کی جاتی ہے کہ یہ صبر کرتے ہیں یا نہیں یعنی مقصد یہ ہوتا ہے کہ آزمائش میں پورے اتر کر صبر کریں ”وتارة بہما لیرغبوا ویرهبوا“ اور کبھی دونوں چیزوں سے آزمایا جاتا ہے، یعنی نعمت عطا کر کے اور ساتھ ہی مصیبت بھی پہنچا کر آزمایا جاتا ہے تاکہ یہ آزمائش میں پورے اتر کے رب تعالیٰ کی طرف رغبت بھی کریں اور رب تعالیٰ سے ڈریں بھی۔

اگر ”ذلکم“ کا اشارہ فرعون والے لوگوں کے عذاب پہنچانے اور انکے بیٹوں کو ذبح کرنے، اور ان کی بیٹیوں کو زندہ چھوڑنے کی طرف ہو تو ”بلاء“ کا معنی ہوگا کہ یہ مصیبتیں تمہارے لئے بہت بڑی آزمائش تھیں۔

اور اگر ”ذلکم“ کا اشارہ ”انجاء“ (اللہ تعالیٰ کے نجات دینے) کی طرف ہو تو ”بلاء“ کا معنی نعمت سے آزمانا ہوگا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہیں فرعونوں کے طرح طرح کے عذاب سے نجات دے کر آزمایا، یہ آزمائش تمہارے لئے بہت بڑی تھی، کہ تم شکر کرتے ہو یا نہیں۔

اور اگر ”ذلکم“ کا اشارہ تمام چیزوں کی طرف بیک وقت کیا جائے تو اب ”بلاء“ کا معنی

یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں مصیبتیں پہنچا کر اور نعمتیں عطاء کر کے آزمایا یہ آزمائش تمہارے لئے بہت بڑی آزمائش تھی ”ویرجع الاول التبادر“ پہلا معنی فوراً ذہن میں آنے کی وجہ سے رائج نظر آتا ہے کہ مصائب کے ذریعے آزمایا گیا۔

”والثانی انہ فی معرض الامتحان“ اور دوسرا معنی اس لئے زیادہ رائج نظر آتا ہے کہ یہاں نعمتوں کا ذکر ہو رہا ہے اور ان نعمتوں کی یاد ہی دلائی جا رہی ہے۔ اس لئے یہ معنی کرنا کہ رب تعالیٰ نے تمہیں نعمتوں سے آزمایا موقع محل کے زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔

”والثالث لطف جمع الترغیب والترہیب“ تیسرا معنی مراد لینا زیادہ پر لطف ہے کیونکہ اس میں مصائب کا ذکر بھی آ جاتا ہے اور نعمتوں کا ذکر بھی اور اس پر رب تعالیٰ کی رغبت کا ذکر بھی آ گیا اور رب تعالیٰ سے ڈرنے کا ذکر بھی آ گیا۔

(از روح المعانی)

روح المعانی کی اس باکمال بحث کے بعد اعلیٰ حضرت کا باکمال ترجمہ دیکھیں ”اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے بڑی بلا تھی یا بڑا انعام“

تاہم راقم نے بھی ترجمہ وہی کیا ہے جو ان سب صورتوں کو شامل ہو جائے، لیکن اہل علم حضرات کو اس پر خود بھی سوچنا پڑے گا اور اعلیٰ حضرت کا ترجمہ بہت بڑی تفسیر کو دو لفظوں سے حاوی ہو گیا۔

رب تعالیٰ کی عظمت:

”والعظم بالنسبة للمخاطب والسماع لا بالنسبة الیہ تعالیٰ لانه العظیم الذی لا یستعظم شیاً“

یہاں آزمائش کو جو عظیم کہا گیا ہے وہ نسبت مخاطبین کے اور سننے والے حضرات کے، یعنی اے بنی اسرائیل تم اس آزمائش کو عظیم سمجھتے ہو اور سننے والو تم بھی عظیم سمجھتے ہو۔

لیکن اللہ تعالیٰ خود بھی عظیم ہے اس لئے وہ کسی اور چیز کو عظیم نہیں سمجھتا۔ لہذا رب تعالیٰ کی نسبت عظیم کا ذکر نہیں کیا گیا۔

تنبیہ: ”عظیم صفة بلاء وتنکیرهما للتفخیم“ عظیم بلاء کی صفت ہے دونوں کو نکرہ ذکر کیا گیا ہے جن کی تنوین عظمت پر دلالت کر رہی ہے اسی لئے ترجمہ میں ”بہت بڑی آزمائش“ ذکر کیا گیا ہے۔

(از روح المعانی)

﴿وَإِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَأَنْجَيْنَاكُمْ وَأَغْرَقْنَا آلَ فِرْعَوْنَ
وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ﴾

(۱) ”اور جب ہم نے تمہارے لئے دریا پھاڑ دیا تو تمہیں بچا لیا اور فرعون والوں کو تمہاری آنکھوں کے سامنے ڈبو دیا۔“

(۲) ”اور یاد کرو اس وقت کو جب ہم نے پھاڑ دیا تمہارے لئے دریا کو تو ہم نے نجات دی تمہیں، اور غرق کیا ہم نے فرعون والوں کو، ایسے حال میں کہ تم دیکھ رہے تھے۔“

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ایک اور نعمت یاد دلائی کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں نجات دی، اور فرعون کو تمہارے سامنے غرق کیا موسیٰ علیہ السلام کو رب تعالیٰ نے حکم دیا کہ بنی اسرائیل کو رات میں مصر سے نکال کر لے جاؤ۔ یعنی اب بنی اسرائیل کی نجات اور فرعون اور اس کی قوم کی تباہی کا وقت آچکا ہے۔

رات کو نکالنے کا حکم دیا تاکہ بنی اسرائیل کا اجتماع دشمن کے سامنے نہ ہو اور وہ ان کی ترمیم میں مانع نہ بنے اور رات کو نکالنے کی وجہ یہ بھی تھی کہ فرعون اور اس کا لشکر ان کا پیچھا کر کے ان کو روک نہ سکے اور فرعون کے عظیم لشکر کو دیکھ کر بنی اسرائیل خوف نہ کریں۔

چاندنی رات میں موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو ساتھ لے کر چلے، بنی اسرائیل کے پاس کافی مقدار میں ہونے اور چاندی کے زیورات بھی تھے، جو انہوں نے قبیلوں (فرعونیوں) سے مانگ کر لئے ہوئے تھے کہ ہم انہیں اپنی عید میں استعمال کریں گی وہ پہلے بھی ان سے زیورات لیتے رہتے تھے۔

یوسف علیہ السلام نے وصیت فرمائی تھی کہ جب تم مصر سے نکلو تو میرا تابوت بھی ساتھ لے کر جانا تو موسیٰ علیہ السلام نے آپ کی وصیت کے مطابق ایک بوڑھی عورت کی نشاندہی پر وہ تابوت نکال کر خود بنفس نفیس اٹھایا۔

ابن ابی حاتم حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں نقل فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ایک

یہانی کے پاس ایک مرتبہ ٹھہرے۔ اس نے حضور کی مہمان نوازی کی اور بہت عظیم و تکریم کی۔

آپ نے فرمایا کہ تم بھی ہمارے پاس بھی آنا، تو وہ دیہاتی ایک مرتبہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا: بتاؤ تمہیں کس چیز کی ضرورت ہے کہ میں تمہیں عطا کروں اس نے کہا ایک اونٹنی جس پر کجاوہ پڑا ہوا ہو، اور ایک دوہا سینے والی بکری جس کا دودھ میرے گھر والے پیئیں۔

حضور ﷺ نے فرمایا تو تو بنی اسرائیل کی بوڑھی عورت سے بھی گیا گزرا ہوا ہے (اس نے تو جنت سب کی تھی) صحابہ کرام نے پوچھا یا رسول اللہ بنی اسرائیل کی بوڑھی عورت کا کیا واقعہ ہے؟

آپ نے فرمایا جب موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو ساتھ لے کر چلے تو راستہ بھول گئے اس پر حیرانگی سے ایک دوسرے سے پوچھنے لگے یہ کیا ہوا؟ کچھ لوگوں کو حضرت یوسف علیہ السلام کی وصیت کا علم تھا تو انہوں نے کہا کہ یوسف علیہ السلام نے اپنی وفات کے وقت ہمارے آباء و اجداد سے پختہ وعدہ لیا تھا کہ مصر سے نکلتے وقت میرا تابوت ضرور ساتھ لے جانا، ہمارے بھولنے کی یہی وجہ ہو سکتی ہے۔

موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تم میں سے کون ہے جو یوسف علیہ السلام کی قبر کو جانتا ہے؟ انہوں نے بتایا کہ ہم میں سے ایک بوڑھی عورت کے بغیر کوئی بھی نہیں جانتا کہ یوسف علیہ السلام کی قبر کس جگہ واقع ہے، تو موسیٰ علیہ السلام نے اس عورت کو بلا کر کہا کہ تم بتاؤ کہ یوسف علیہ السلام کی قبر کہاں ہے؟ اس نے کہا میں اس وقت تک نہیں بتاؤں گی جب تک تم میری ایک شرط پوری نہ کرو آپ نے پوچھا وہ کیا ہے؟ اس نے کہا میری صرف یہ خواہش ہے کہ میں جنت میں آپ کے ساتھ رہوں۔

موسیٰ علیہ السلام کچھ سوچ میں پڑے، تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی مازل کی کہ اے موسیٰ اس سے وعدہ کر لو آپ لے لبا بھیک ہے تمہاری درخواست منظور ہے موسیٰ علیہ السلام جب اس عورت کے ساتھ چلے تو اس نے قبر کی نشاندہی کی۔ جب یوسف علیہ السلام کے تابوت کو نکالا گیا تو اندھیری رات روشن ہو گئی، اس طرح انہیں راستہ مل گیا، (یہ حدیث غریب ہے، قریب ہے کہ صحابی تک موقوف ہو) راقم کے نزدیک ظاہر طور پر مرفوع ہے، اگر موقوف بھی ہو تو قیاس کے مخالف ہے اس لئے حکم مرفوع میں ہے۔

(ماخوذ از کسر اس کثیر ذیل آیت ولقد اوحینا موسیٰ الخ پ ۱۶ ع ۱۳)

فرعون اور اس کی قوم کی ہلاکت کی طرف روانگی:

فرعون نے جب صبح دیکھا کہ بنی اسرائیل موجود نہیں ہیں تو بہت غصہ میں ہوا۔ اس نے ہر طرف کارندے دوڑا کر اپنی فوجوں، لشکروں اور اپنے تمام حامیوں کو جمع کر لیا اور کہنے لگا کہ بنی اسرائیل ہمارے مقابلہ میں ایک چھوٹی سی جماعت ہے وہ ہمیشہ ہمارے غیظ و غضب کو بھڑکاتے رہتے ہیں میں چاہتا ہوں ان کو مکمل تباہ و برباد کر دیا جائے۔

اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کی قوم کو برباد کرنے کے لئے ان کے دلوں میں یہ بات ثابت کر دی کہ سب لوگ بنی اسرائیل کا پیچھا کر کے ان کا مکمل صفایا کر دو، اس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کاملہ سے ان تمام فرعونوں کو برباد کر کے اپنا وعدہ پورا فرما دیا۔

فرعون کو ماننے والے تمام اس کے کہنے پر اپنی نعمتوں، اپنے اعلیٰ قسم کے مکانات اور پھلدار درختوں کے باغات اور اپنے سامان تعیش یعنی اپنی عیش و عشرت کے سامان کو چھوڑ کر بظاہر بنی اسرائیل کو تباہ کرنے کے لئے چلے جو درحقیقت اپنی ہی بربادی کی طرف چل رہے تھے، فرعون کے کہنے پر سب لوگ جمع ہو کر بنی اسرائیل کے تعاقب میں چل پڑے، دریا کے کنارے پر ان کے سامنے پہنچ گئے۔

بنی اسرائیل نے جب دیکھا تو کہنے لگے کہ اب تو ہم پکڑ لئے جائیں گے، ان کے دلوں میں پہلے ہی فرعون کا رعب چھایا ہوا تھا اور وہ تعداد میں بھی فرعونوں سے بہت کم تھے، اور کسی قسم کا ان کے پاس کوئی اسلحہ بھی نہیں تھا اس لئے ان پر بہت زیادہ خوف طاری ہوا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ میرا رب میرے ساتھ ہے وہ ابھی میری راہنمائی فرمائے گا۔

موسیٰ علیہ السلام کو دریا میں عصا مارنے کا حکم:

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ آپ اپنا عصا دریا پر مارو، آپ نے جب اپنا عصا دریا پر مارا تو دریا پھٹ گیا، اس نے راستہ چھوڑ دیا، درمیان میں خشک راستہ اور ادھر ادھر پانی کی بلندی اتنی عظیم جیسے بڑے بڑے پہاڑ ہوں۔

بنی اسرائیل چونکہ بارہ قبائل تھے ایک ہی راستہ میں ایک دوسرے کے ساتھ چلنا مناسب نہیں سمجھتے تھے اس لئے ہر قبیلہ کے لئے علیحدہ علیحدہ راستہ بنایا گیا یعنی دریا میں بارہ راستے بنائے گئے، ہر راستہ کے دائیں بائیں پانی کی بلندی عظیم پہاڑوں جیسی تھی وہ کہنے لگے کہ ہمیں کیا معلوم ہے کہ ہمارے دوسرے بھائی زندہ ہیں یا پانی کی طغیانی میں غرق ہو چکے ہیں تو درمیان سے روشن دانوں کی طرح پانی کو ہٹا دیا گیا، وہ ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے دریا عبور کر گئے۔

فرعون اور اس کے لشکر نے بھی دریا میں راستہ دیکھ کر اپنے گھوڑے دوڑا دیئے، لیکن وہ بنی اسرائیل کو نہ پاسکے۔ حضرت سائب سے مروی ہے کہ فرعونیوں اور بنی اسرائیل کے درمیان جبرائیل تھے بنی اسرائیل کے پیچھے لوگوں کے دلوں میں یہ بات ڈال رہے تھے کہ جلدی چلو اگلے لوگوں سے مل جاؤ، اور فرعونیوں کے دلوں میں یہ بات ڈال رہے تھے کہ آہستہ چلو پیچھے لوگوں کو ساتھ ملنے دو، بنی اسرائیل جب دریا عبور کر چکے اور فرعونی ابھی درمیان میں ہی پہنچے تھے تو پانی آپس میں مل گیا اس طرح فرعون اور اس کی قوم کے تمام لوگ ایک روایت کے مطابق یہ چھ لاکھ کی تعداد میں تھے سب غرق ہو گئے بنی اسرائیل یہ تمام ماجرا آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

(ماخوذ از کبیر پ ۱۹ ع ۸)

﴿وَإِذْ فَرَقْنَا﴾ : ”اذ فی موضع النصب ، وفرقنا ، فلقنا“

یعنی اذ مقام نصب میں ہے، اذ کرو مقدر ہے مطلب یہ ہوا کہ یاد کرو اس وقت کو۔

”فرق“ کا لغوی معنی ہے جدا کرنا۔ اسی لئے بالوں میں مانگ نکالنے کو بھی فرق کہا گیا ہے کہ بال ایک حصہ کے ایک طرف اور دوسرے حصہ کے دوسری طرف ایک دوسرے سے جدا ہیں۔

”فرقان“ جو حق و باطل کے درمیان فرق کرے ”فالفارقات فرقا“ قسم ہے فرق کرنے والی جماعتوں کی، اس سے مراد فرشتے ہیں جو حق و باطل کے درمیان فرق کرنے کے لئے نازل ہوتے ہیں۔ ”یوم الفرقان“ بدر کے دن کو کہا جاتا ہے کیونکہ وہ بھی حق و باطل کے درمیان فرق کرنے کا دن تھا۔

﴿بِكُمْ﴾ : ”ای بکم ، فالباء بمنی اللام۔ یعنی ”بکم“ میں باء بمعنی لام ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے دریا تمہارے لئے پھاڑا۔ بعض حضرات نے کہا باء بمعنی سبیت کے ہے۔ تمہاری وجہ سے

دریا کو بچاڑا، یعنی اصل سبب تم ہی تھے کیونکہ تمہیں نجات دینا مقصود تھا اگرچہ ظاہر کی سبب موکی مایہ السلام کا عصا مارنا تھا۔

﴿الْبَحْرُ﴾: اصل معنی اس کا ہے ”وسعت رکھنا“ دریا میں بھی چونکہ وسعت ہوتی ہے اس لئے اس کو بحر کہتے ہیں کہا جاتا ہے ”فرس بحر“ تیز چلنے والا گھوڑا۔ یعنی تیز چلنے والے گھوڑے کی چال میں بھی وسعت پائی جاتی ہے لہذا اسے بھی بحر کہہ لیا جاتا ہے۔ حدیث شریف میں بھی حضرت ابو طلحہ کے گھوڑے کے لئے الفاظ استعمال ہیں ”وان وجدناه البحر“ (ابو طلحہ)

فائدہ کے لئے حدیث پاک کو بھی دیکھتے چلیں تاکہ ذوق ایمان میں اضافہ ہو اور مقام مصطفیٰ پر کی ایک جھلک نظر آئے:

”عن انس بن مالک قال کان رسول اللہ ﷺ احسن الناس وکان اجود الناس وکان اشجع الناس ولقد فزع اهل المدينة ذات ليلة فانطلق ناس قبل الصوت فتلقاهم رسول اللہ ﷺ راجعا وقد سبقهم الى الصوت وهو على فرس لابی طلحة عری فی عنقه السیف وهو يقول لم تراعوا لم تراعوا قال وجدناه بحرا او انه لبحر قال وکان فرسا بیطا“

(مسلم ج ثانی ص ۲۶۰ باب شجاعہ صلی اللہ علیہ وسلم)

حضرت انس بن مالک فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ تمام لوگوں سے زیادہ حسین تھے تمام لوگوں سے زیادہ شجاعت والے تھے تمام لوگوں سے زیادہ بہادر تھے، ایک رات مدینہ طیبہ کے لوگ (کسی بیہوش آواز سے) گھبراہٹ میں بٹلا ہو گئے لوگ اس آواز کی طرف چلے، نبی کریم ﷺ ان کو ملے آپ لوٹ کر آ رہے تھے، آپ ان لوگوں سے پہلے اس آواز کی طرف تشریف لے گئے تھے، آپ ابو طلحہ کے گھوڑے کی نعلی پیٹھ پر سوار تھے آپ کے گلے میں تلوار تھی، آپ فرما رہے تھے کوئی ذرا فکر کی ضرورت نہیں کوئی ذرا فکر کی ضرورت نہیں، حضرت انس فرماتے ہیں ہم نے اس گھوڑے کو تیز رفتار پایا حالانکہ وہی پہلے بہت سست رفتار تھا۔

”وفیه بیان عظیم برکتہ ومعجزہ فی انقلاب الفرس سربعا بعد ان کان بیطا“

اس حدیث پاک سے نبی کریم ﷺ کی عظیم شان سمجھ آئی کہ آپ کی برکت اور آپ کے

معجزہ کی وجہ سے ست رفتار گھوڑا تیز رفتار ہو گیا۔

اور یہ بھی ثابت ہو گیا کہ نبی کریم ﷺ تمام سے زیادہ بہادر تھے سب سے پہلے اور اکیلے ہی رات کو دشمن کا پتہ چلانے تشریف لے گئے۔ اور یہ بھی خیال رہے کہ حضرت ابو طلحہ کے اس گھوڑے کا نام مندوب تھا۔
(نوی)

﴿فَأَنْجَيْنَاكُمْ﴾: ای من الغرق او من ادراك فرعون وآله لكم او مما تكرهون .

(تو ہم نے تمہیں نجات دی) قرآن پاک میں تھوڑے الفاظ کثیر معانی پر مشتمل ہیں، کیونکہ اس میں کئی احتمال ہیں بلکہ وہ تمام احوال مجموعی طور پر ان الفاظ مبارکہ سے سمجھ آ رہے ہیں۔ مطلب یوں ہوا۔ ہم نے تمہیں نجات دی غرق سے، یعنی فرعون اور اس کے لشکر کو غرق کر دیا تمہیں غرق سے بچالیا۔

اور یہ بھی مطلب حاصل ہو سکتا ہے کہ ہم نے تمہیں فرعون اور اس کے لشکر کو پالینے سے نجات دی حالانکہ انہوں نے تمہیں ہلاک کر دینے کی غرض سے تمہارا پیچھا کیا تھا لیکن رب تعالیٰ نے انہیں ہلاک کر دیا اور تمہیں ان لوگوں سے بچالیا کہ وہ تمہیں پاہی نہ سکے ہلاک کیسے کرتے۔

اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں فرعون اور اس کے متعلقین و تبعین کی طرف سے جو شدید تکالیف پہنچائی جاتی تھیں ان سے بچالیا۔ بلکہ یہ تینوں معانی ایک ساتھ ہی لینے میں کمال ہے اور عظمت قرآن اس سے واضح ہے، یعنی مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں غرق ہونے، فرعون کو پالینے اور فرعونوں کی شدید تکالیف سے نجات دی۔
(از روح المعانی)

تنبیہ: اب اس تفصیل کے بعد دیکھیں تو مودودی صاحب کا ان الفاظ مبارکہ کا ترجمہ ادھر نظر آئے گا: مودودی صاحب کا ترجمہ یہ ہے:

”پھر اس میں سے تمہیں بخیریت گزر وادیا“

پھر اس ترجمہ پر اور تعجب یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے کسی کی مدد سے ان کو گزر وادیا، خود گزرا یا کسی اور نے؟ مودودی صاحب نے اس سے پہلے (رکوع کی پہلی آیت میں) ﴿وَلَا هُمْ يَنْصُرُونَ﴾ کا ترجمہ کیا ہے ”اور نہ مجرموں کو کہیں سے مدد مل سکے گی“ ذکر کافروں کا ہے نہ کہ صرف مجرموں

(گنہگاروں) کا۔ پھر اس کی تفسیر میں بھی کافروں کا ذکر نہ کر کے انبیاء، صلحاء، زہاد، اولیاء کی شفاعت کو قبول نہ کرنے کی ناکام کوشش کی گئی ہے، جناب کے تفسیری الفاظ کو دیکھئے اور راقم کی شفاعت کی بحث کو بھی دیکھئے تو فرق خود سمجھ آ جائے گا۔

مودودی صاحب کی تفسیر یہ ہے۔ بنی اسرائیل کی بگاڑ کی ایک بہت بڑی وجہ یہ تھی کہ آخرت کے متعلق ان کے عقیدے میں خرابی آ گئی تھی وہ اس قسم کی خیالات خام میں مبتلا ہو گئے تھے کہ ہم جلیل القدر انبیاء کی اولاد ہیں بڑی بڑے اولیاء، صلحاء، اور زہاد سے نسبت رکھتے ہیں، ہماری بخشش تو انہیں بزرگوں کے صدقے میں ہو جائے گی، ان کا دامن گرفتہ ہو کر بھلا کوئی سزا کیسے پاسکتا ہے۔ انہیں جھوٹے بھروسوں نے ان کو دین سے غافل اور گناہوں کے چکر میں مبتلا کر دیا تھا، اس لئے نعمت یاد دلانے کے بعد فوراً ہی ان کی ان غلط فہمیوں کو دور کیا گیا ہے۔ (تفہیم القرآن)

﴿وَأَغْرَقْنَا آلَ فِرْعَوْنَ﴾: اس مقام میں اگرچہ فرعون کا بظاہر ذکر نہیں لیکن اصل میں قرآن پاک کی فصاحت و بلاغت کا عظیم مقام ہے جو دوسری کسی کتاب کو حاصل نہیں۔ علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے کیا خوب بیان فرمایا:

” (وَأَغْرَقْنَا آلَ فِرْعَوْنَ) ارادہ فرعون و قومہ و اقتصر علی ذکرہم

بأنہ کان اولی بہ، وقیل شخصہ کما روی ان الحسن ؑ کان یقول

اللہم صل علی آل محمد ای شخصہ واستغنی بذكره عن ذکر اتباعه“

(بیضاوی)

یہاں سے مراد فرعون اور اس کے متعلقین تمام ہی ہیں۔ یعنی مطلب یہ ہے کہ ”ہم نے غرق کیا فرعون اور فرعون والوں کو“ کیونکہ جب اس کی قوم کا ذکر کر دیا گیا تو خود بخود معلوم ہو گیا کہ وہ بھی ساتھ تھا اس کا غرق ہونا تو بطریق اولیٰ (بہتر طریقہ سے) ثابت ہو جائے گا (پھر یہ بھی خیال رہے کہ فرعون کا واضح طور پر غرق ہونے کا ذکر نوں پارہ میں موجود ہے) اور یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ ”آل فرعون“ سے مراد خود فرعون کی ذات ہو اور اس کی قوم اس کے تابع ہونے کی وجہ سے مراد ہو، اس پر دلیل یہ ہے کہ روایت ہے حضرت حسن بصری ؒ درود پاک پڑھتے ہوئے یہ کہتے ”اللہم صل آل محمد“ وہ

آل محمد سے مراد نبی کریم ﷺ کی ذات لیتے۔

﴿وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ﴾: یہ جملہ حالیہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ”ایسے حال میں کہ تم دیکھ رہے تھے“ یعنی پہلے تم نے دریا کو چلتے ہوئے دیکھا، پھر دریا کو پھٹتے ہوئے، کشک راستے بنے ہوئے بھی تم دیکھ رہے تھے۔ پھر فرعونوں کو آتے ہوئے، دریا میں گھستے ہوئے، پھر ان پر دریا کو ملتے ہوئے، پھر ان کو غرق ہوتے ہوئے بھی تم دیکھ رہے تھے، پھر دریائے ان کی لاشوں کو باہر پھینک دیا تو تم ان کو مردہ حال میں بھی دیکھ رہے تھے یہ سارا منظر تمہاری آنکھوں کے سامنے تھا۔
(از بیضاوی)

بنی اسرائیل اور فرعونوں کی تعداد برابر تھی: عجیب اتفاق یہ تھا کہ بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے تھے۔ بدلہ میں پچاس پچاس ہزار آدمی تھے اس طرح کل تعداد چھ لاکھ تھی، فرعون کی قوم کے لوگ بھی چھ لاکھ کی تعداد میں تھے۔
(از خازن)

یہ دریا کون سا تھا؟ اس دریا کو ”بحر قلزم“ کہا جاتا ہے جس کی چوڑائی چار فرسخ تھی، یہ بحر فارس کے ایک طرف واقع ہے، اور بعض حضرات نے کہا مصر کے پیچھے ایک دریا ہے جسے ”اساف“ کہا جاتا ہے یہ وہی ہے۔
(از خازن)

مشتی احمد یار خان اور حضرت پیر محمد کرم شاہ رحمہما اللہ نے بحر قلزم کا ذکر کیا ہے۔ تاہم روح المعانی میں علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے ایک قول بحر قلزم کے متعلق ذکر کیا اور دوسرا دریائے نیل کے متعلق:
”واختلفوا فی هذا البحر فقيل القلزم وكان بين طرفيه اربعة فراسخ وقيل النيل“
(روح المعانی)

یہ واقعہ دینی اور دنیاوی نعمتوں کا پتہ دیتا ہے:

اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو دنیاوی اور دینی کثیر نعمتیں حاصل ہوئیں۔ دنیاوی نعمتیں حاصل ہونے کی چند وجوہ:

(۱) جب موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل ایسے مقام پر پہنچ گئے جہاں آگے دریا اور پیچھے دشمن ہر قسم کے ہتھیار لے کر پہنچ گیا ہے، ذرا رکتے ہیں تو دشمن آ کر تباہ و برباد کر دے اور آگے چلتے ہیں تو دریا میں غرق

ہوتے ہیں یہ کتنا پر خوف اور ہولناک منظر ہے۔ جب دریا پھٹ گیا، دریا نے راستہ دے دیا اور ان کو نجات حاصل ہو گئی تو یہ کتنی بڑی خوشی کا مقام ہوگا، اس سے بڑھ کر دنیا میں اور کون سی عظیم نعمت ہو سکتی ہے۔

(۲) اس واقعہ سے موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ ظاہر ہوا کہ آپ کے عصا مارنے کی وجہ سے دریا نواہد تعالیٰ نے پھاڑ دیا۔ اور اس سے بنی اسرائیل کا اس وقت رب تعالیٰ کا تکریم ہونا بھی ثابت ہوتا ہے اور ان پر عظیم نعمت بھی ثابت ہو رہی ہے۔ خیال رہے بنی اسرائیل جب تک ایماندار اور اللہ تعالیٰ کے نبی سے محبت کرنے والے، احکام شرع پر پابندی کرنے والے تھے تکریم تھے جب نبی کریم ﷺ پر ایمان لانے سے منہ موڑ دیا تو زلیل و خوار ہو گئے۔ اب یہودیوں اور نصرائیوں سے محبت کرنے والے شریعت مصطفیٰ ﷺ کے باغی ہیں اور دین اسلام کے دشمن ہیں۔

(۳) جب انہوں نے مشاہدہ کر لیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دشمن کو ہلاک کر دیا ہے تو انہیں معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں عظیم نعمت سے نوازا ہے کہ ہمیں بہت بڑی مصیبت سے نجات حاصل ہو گئی۔ خاص کر کے ان کو تکریم بھی حاصل ہو گئی اور دشمن کے ہلاک ہونے کا مشاہدہ بھی کر لیا۔ (یہ کہیے سے نقل کیا جا رہا ہے)

اس پر علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے کیا خوب الفاظ تحریر فرمائے:

”ان هلاک العدو ونعمة ومشاهدته نعمة اخرى“

بیشک دشمن کا ہلاک ہو جانا ایک نعمت ہے اور اس کی ہلاکت کا مشاہدہ کرنا دوسری نعمت ہے۔

خیال رہے کہ دین اسلام کے باغی دشمن خدا کی موت پر خوشی منانا سنت حبیب کبریا، علیہ التحیۃ

والثناء ہے:

”عن سعد ان النبی ﷺ جمع له ابویہ یوم احد قال کان رجل من

المشرکین قد احرق المسلمین فقال له النبی ﷺ ارم فداک ابی وامی

قال فنزعتم له بسنہم لیس فیہ نصل فاصبت جبہ فسقط وانکشفت

عورتہ فضحک رسول اللہ ﷺ حتی نظرت الی بواجدہ“

ترجمہ: حضرت سعد بن ابی وقاص فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے میرے باپ اور

میں کو آگ لگا دی تو میں نے کہا اے نبی کریم ﷺ میرے باپ اور

میں کو آگ لگا دی تو میں نے کہا اے نبی کریم ﷺ میرے باپ اور

مسلمانوں کو بہت تنگ کیا ہوا تھا۔ مجھے نبی کریم ﷺ نے فرمایا میرے ماں باپ تم پر فرمان اس کو تیر مارو، آپ فرماتے ہیں میں نے اسے تیر مار دیا حالانکہ اس میں لوہے کی نوک نہیں تھی وہ تیر میں نے اس کے پہلو پر گاڑ دیا، وہ گر گیا، اس کا تنگیز کھل گیا (ننگا ہو گیا) نبی کریم ﷺ ہنسے یہاں تک کہ میں نے آپ کی داڑھوں کو دیکھ لیا۔

اس حدیث کی شرح میں علامہ نووی رحمہ اللہ نے فرمایا ”فضحک فرحاً بقتله عدوہ لانکشافہ“ کہ کوئی شخص یہ گمان نہ کرے کہ نبی کریم ﷺ اس کے ننگے ہونے پر ہنسے، نہیں نہیں نبی کی شان کے یہ لائق ہی نہیں کہ کسی کے تنگیز کے کھل جانے پر ہنسے۔ آپ کی ہنسنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ حضرت سعد نے ایک دشمن کو قتل کر دیا تھا اس پر نبی کریم ﷺ نے خوشی کا اظہار فرمایا۔

حدیث شریف میں ”قد احرق المسلمین“ (تحقیق اس نے مسلمانوں کو جلایا ہوا تھا، یعنی مسلمانوں کو تنگ کر رکھا تھا) کے الفاظ واضح طور پر دلالت کر رہے ہیں کہ وہ مسلمانوں کا دشمن تھا، جس کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کا دشمن تھا۔ اس کی موت پر نبی کریم ﷺ نے خوشی کا اظہار فرما کر اس فعل کو سنت بنا دیا۔

(۴) اللہ تعالیٰ نے فرعونوں کو غرق کر کے ان کی زمین، ان کے شہر اور گھر، اور ان کی نعمتیں اور ان کے مال بنی اسرائیل کو دے دیئے واضح ہوا کہ یہ واقعہ بنی اسرائیل کے لئے بہت بڑی نعمت کا سبب بنا۔

(۵) اللہ تعالیٰ نے فرعونوں کو غرق کر کے بنی اسرائیل کو ان سے نجات دے کر انہیں عظیم نعمت سے نوازا، اور ان کے دلوں سے مکمل طور پر فرعون اور اس کی قوم کا خوف زائل کر دیا۔ اگر بنی اسرائیل کو دریا سے پار کر دیا جاتا لیکن فرعون اور اس کی قوم کو غرق نہ کیا جاتا تو بنی اسرائیل ان سے ڈرتے ہی رہتے کہ اگر انہوں نے ہم کو پکڑ لیا، یا کہیں ہمیں ایک جگہ جمع ہونا پڑا تو وہ ہمیں شدید عذاب دیں گے۔ فرعونوں کا صفایا کر کے بنی اسرائیل کو اس شدید خوف سے نجات دے دی جو یقیناً ان کے لئے بہت بڑی نعمت تھی۔

(۶) بنی اسرائیل کے سامنے فرعون اور اس کی قوم کا ہلاک ہو جانا بھی عظیم نعمت تھا اس لئے کہ اگر ان کو ہلاک کر دیا جاتا لیکن ان کی ہلاکت کو بنی اسرائیل نے نہ دیکھا ہوتا تو ان پر ان کا خوف جاری رہتا، کیونکہ یہ

فرعون کی چاکری میں ایک عرصہ گزار چکے تھے، اس لئے ان کے دلوں پر ان کا رعب چھایا ہوا تھا۔

اس واقعہ سے موسیٰ علیہ السلام کو دینی فوائد حاصل میں چند وجوہ پائی جاتی ہیں:

(۱) جب موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے آپ کے معجزہ کو واضح طور پر دیکھ لیا تو ان کے شکوک و شبہات زائل ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ جو صانع و حکیم ہے اس پر ان کا ایمان پختہ ہو گیا۔ اور موسیٰ علیہ السلام کی نبی ہونے کی تصدیق بھی ان کی زیادہ پختہ ہو گئی، اس طرح ان کو بدیہی علم حاصل ہو گیا، نظر دقیق کے بوجھ اٹھانے اور مشقت آمیز دلائل کے حصول کی محتاجی نہ رہی۔

(۲) جب ان لوگوں نے موسیٰ علیہ السلام کے اس معجزہ کو ظاہر طور پر دیکھ لیا تو جس طرح ان کے لئے سبب بنا کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کریں اسی طرح قبیلہ لوگ جنہوں نے موسیٰ علیہ السلام کا پیچھا نہیں کیا تھا ان کے لئے بھی سبب بنا کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کو سچا نبی مانیں اور فرعون کو جھوٹا خدا سمجھیں۔

(۳) نبی اسرائیل کو یہ معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر نہ کوئی عزیز ہے اور نہ ہی کوئی طاقت ور ہے:

”ثم ان الله تعالى في لحظة واحدة جعل العزيز ذليلاً الذليل عزيزاً“

پھر انہیں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ بیشک اللہ تعالیٰ ایک لمحہ میں عزیز کو ذلیل بنا دیتا ہے اور

ذلیل کو عزیز بنا دیتا ہے۔

فرعون جو اپنے آپ کو عزیز سمجھتا تھا اسے غرق کر کے ذلیل کر دیا۔ بنی اسرائیل کو فرعونوں نے اپنا غلام بنا کر ذلیل سمجھا ہوا تھا رب تعالیٰ نے ان کو نجات دے کر عزت عطا فرمادی۔ اور اسی چیز کو سمجھتے ہوئے ان کا دل دنیا کی مشکلات سے چھٹکارا پا گیا اور رب تعالیٰ پر اس وقت ان کو توکل کا حصول ہوا۔

امت مصطفیٰ ﷺ کو حاصل ہونے والے فوائد:

اسی واقعہ سے نبی کریم ﷺ کی امت کو کثیر فوائد حاصل ہوئے:

(۱) اہل کتاب کو یہ معلوم تھا کہ نبی کریم ﷺ نے کسی استاذ سے پڑھا نہیں۔ کسی استاذ سے لکھنا نہیں سیکھا اور نہ ہی آپ کبھی اہل کتاب کی محفلوں میں بیٹھے۔ جب آپ نے موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کے واقعات کو تفصیلی طور پر بیان فرمایا۔ اتنا علم تو خود اہل کتاب کو بھی حاصل نہیں تھا، ہاں البتہ ان کے علماء اپنی

اب کا علم رکھتے تھے۔ تو اس سے نبی کریم ﷺ کی صداقت اور آپ پر وقی کا آئان لوگوں پر واضح ہو گیا یہ
متحدہ بات ہے کہ ہوائے چند حضرات کے ان کو ایمان لانا نصیب نہ ہوا۔

اس طرح یہ واقعہ نبی کریم ﷺ کا ان پر بیان کرنا ان کے خلاف دلیل بن گیا اور مومنوں کے حق
میں جہت بن گیا کہ وہ نبی کریم ﷺ کی تصدیق میں اور زیادہ ایمان کی پختگی ثابت کریں۔
(۲) نبی کریم ﷺ کی امت کے لوگ جب یہ تصور کریں کہ فرعون اور اس کی قوم غرق ہوئی، اور بنی
اسرائیل نجات حاصل کر گئے، یعنی رب تعالیٰ کے منکر غرق ہو گئے اور رب کو ماننے والوں کو نجات حاصل
ہو گئی، تو ان کو یہ پتہ چل جائے گا۔

”من خالف الله شقى في الدنيا والاخرة ومن اطاعه فقد سعد في الدنيا والاخرة“
جس شخص نے اللہ تعالیٰ کی مخالفت کی وہ دنیا اور آخرت میں بد بخت ہوا، اور جس نے
اطاعت کی وہ دنیا اور آخرت میں نیک بخت ہوا۔

(۳) موسیٰ علیہ السلام کی امت ظاہر معجزات کو دیکھنے کے باوجود پچھڑے کی پجاری بن گئی۔ لیکن نبی
کریم ﷺ کی امت نے ان کی طرح اس طرح کے ظاہر معجزات نہیں دیکھے لیکن پھر بھی نبی کریم ﷺ کے
مطیع رہے اور آپ کی مخالفت نہیں کی اور نہ ہی معاذ اللہ گمراہ ہوئے۔

”وهذا يدل على ان امة محمد ﷺ افضل من امة موسى عليه السلام“
اسی سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ نبی کریم ﷺ کی امت موسیٰ علیہ السلام کی امت سے
افضل ہے۔
(ماہود اور کبر)

مومن کی کیا خوب شان:

دریا میں غرق ہونا فرعونوں کے لئے عذاب ہے لیکن مومن کا غرق ہونا شہادت کا سبب ہے یعنی
شہادت کا درجہ اور ثواب حاصل ہوتا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کی نجات کا دن:

”روى مسلم عن ابن عباس ان رسول الله ﷺ قدم المدينة فوجد
اليهود صياما يوم عاشوراء فقال لهم رسول الله ﷺ ما هذا اليوم الذي

تصومونه فقالوا هذا يوم عظيم انجى الله فيه موسى وقومه وغرق فرعون وقومه فصامه موسى شكرا فحن نصومنه فقال رسول الله ﷺ "فحن احق واولى بموسى منكم" فصامه رسول الله ﷺ وامر بصيامه واخرجه البخارى ايضا عن ابن عباس وان النبى ﷺ قال لاصحابه انتم احق بموسى منهم فصوموا" (فرطى)

مسلم شریف میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت مذکور ہے بیشک رسول اللہ ﷺ نے طیبہ میں تشریف لائے تو آپ نے یہود و عاشوراء کے دن روزہ رکھتے ہوئے پایادہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں کہا تم اس دن روزہ کیوں رکھتے ہو انہوں نے کہا یہ بہت عظیم دن ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو اس دن نجات دی اور فرعون اور اس کی قوم کو غرق کیا۔ تو موسیٰ علیہ السلام نے اس دن رب تعالیٰ کا شکر یہ ادا کرنے کے لئے روزہ رکھا اس لئے ہم بھی روزہ رکھتے ہیں، نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہم نسبت تمہارے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ زیادہ حق رکھتے ہیں اور انہیں زیادہ قرب حاصل ہے۔ تو نبی کریم ﷺ نے روزہ رکھا اور (اپنی امت کو بھی) روزہ رکھنے کا حکم فرمایا۔ بخاری نے بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس روایت کو نقل فرمایا کہ بیشک نبی کریم ﷺ نے اپنے صحابہ کو فرمایا تم یہودیوں سے زیادہ موسیٰ علیہ السلام سے حق رکھتے ہو، اس لئے تم روزہ رکھا کرو۔

اعتراض: اس روایت سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے عاشوراء کے دن روزہ رکھا اور روزہ رکھنے کا حکم دیا جب کہ یہود نے آپ کو خبر دی۔

حالانکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے پتہ چلتا ہے کہ قریش زمانہ جاہلیت میں عاشوراء کے دن روزہ رکھتے تھے اور نبی کریم ﷺ بھی اعلان نبوت سے پہلے روزہ رکھتے تھے۔ آپ جب مدینہ طیبہ میں آئے تو آپ نے عاشوراء کا روزہ رکھا اور روزہ رکھنے کا حکم دیا (یہ حکم بطور فرض تھا) جب رمضان شریف کے روزے فرض ہوئے تو عاشوراء کے دن روزہ رکھنے کا اختیار دے دیا گیا جو چاہے روزہ رکھے اور جو چاہے روزہ نہ رکھے۔ (بخاری و مسلم)

ان دونوں حدیثوں میں کیسے تطبیق دی جائے کہ ان میں تعارض نہ آئے۔

جواب: قریش اس لئے روزہ رکھتے تھے کہ وہ یہود کو روزہ رکھتے ہوئے دیکھتے تھے چونکہ قریش کے نزدیک یہود اہل علم سمجھے جاتے تھے نبی کریم ﷺ بھی قریش کے ساتھ ہی روزہ رکھتے تھے۔ لیکن مدینہ طیبہ میں آکر دوبارہ تاکید کی طور پر حکم دیا اور اپنے صحابہ کو کہا تم یہود کی بنسبت موسیٰ علیہ السلام کے زیادہ قریب ہو اس لئے تم بھی روزہ رکھو۔

ایک غلطی فہمی کا ازالہ: حکم بن اعرج کہتے ہیں میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس پہنچا آپ زمزم کے پاس اپنی چادر کو تکیہ بنا کر تشریف فرما تھے میں نے ان کو کہا:

”اخبرنی عن صوم عاشوراء فقال اذا رأيت هلال المحرم فاعد واصبح يوم التاسع صائما ، قلت هكذا كان محمد ﷺ يصومه قال نعم اخرجه مسلم“

مجھے یہ بتاؤ کہ عاشوراء کا روزہ کس دن رکھا جاتا ہے آپ نے فرمایا جب محرم کا چاند دیکھو تو شمار کرو جب نو تاریخ ہو تو روزہ رکھو میں نے کہا کیا اسی طرح (یعنی اسی دن) نبی کریم ﷺ روزہ رکھا کرتے تھے انہوں نے کہا ہاں۔

دوسری روایت میں حضرت حسن بصری حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا:

”امر رسول اللہ ﷺ بصوم يوم عاشوراء يوم العاشر“
نبی کریم ﷺ نے عاشوراء کا روزہ دس محرم کو رکھنے کا حکم فرمایا:

اس حدیث کو ترمذی نے حسن صحیح کہا، ان دونوں حدیثوں میں تعارض نظر آتا ہے اور غلط فہمی ہوتی ہے کہ روزہ نو محرم کو رکھا جائے یا دس محرم کو۔

صحیح یہ ہے کہ دونوں دن روزہ رکھا جائے تیسری حدیث سے دونوں دن روزہ رکھنے کا واضح ثبوت موجود ہے:

”قال الترمذی وروی عن ابن عباس انه قال صوموا التاسع والعاشر
وخالقوا اليهود“

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نو محرم اور دس محرم (دونوں دن) روزہ رکھو

یہود کی مخالفت کرو۔ کیونکہ یہود صرف دس محرم کو روزہ رکھتے تھے۔ (از قرطبی)

فائدہ: موسیٰ علیہ السلام نے عاشوراء کا روزہ رکھا اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکریہ ادا کرنے کے لئے نبی کریم ﷺ نے بھی اس نعمت کی یاد روزہ رکھ کر کی، بلکہ صحابہ کرام نے دو روزے رکھ کر موسیٰ علیہ السلام کی نسبت عبادت میں زیادتی کی۔ اسی سے ایک تو واضح ہو گیا کہ عبادت میں زیادتی جائز ہے جب کہ نفلی درجہ کی ہو، البتہ فرائض میں زیادتی جائز نہیں۔

اور یہ واضح ہوا کہ نعمت کے حصول پر ہر سال اسے یاد کرنا اور اس پر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا سنت انبیاء ہے یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے رب تعالیٰ کے انعام و اکرام کو لوگوں کے سامنے ذکر فرمایا:

”عن ابی سعید قال قال رسول اللہ ﷺ انا سید ولد آدم یوم القیامۃ ولا فخر و بیدی لواء الحمد ولا فخر و ما من نبی یومئذ آدم فمن سواہ الا تحت لوائی“
(مشکوٰۃ باب فضائل سید المرسلین)

حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا میں تمام انسانوں کا قیامت کے دن سردار ہوں گا اس پر کوئی فخر نہیں میرے ہاتھ میں لواء الحمد ہوگا اس پر کوئی فخر نہیں اس دن تمام بنی آدم علیہ السلام اور ان کے سوا میرے جھنڈے کے نیچے ہوں گے۔

”ولا فخر“ کی وضاحت بیان کرتے ہوئے علامہ علی قاری رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں کہ آپ کا مقصد یہ تھا:

”ای ولا اقلولہ تفاخرا بل اعتدادا بفضلہ وتحدثا بنعمتہ وتبلیغا لما امرت بہ“

یعنی میں یہ فخر کے طور پر نہیں بیان کر رہا بلکہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور نعمت کو بیان کرنے کے لئے ذکر کر رہا ہوں اور جس چیز کا مجھے حکم دیا گیا ہے میں وہ امت کو پہنچانے کے لئے ذکر کر رہا ہوں۔

یعنی نبی کریم ﷺ نے اپنی سیادت کو دو وجہ کے پیش نظر بیان کیا ان میں سے پہلی وجہ یہ ہے کہ آپ پر اپنے مراتب بیان کرنے ضروری ہوتے ہیں تاکہ آپ کی امت آپ کو پہچان لے اور آپ پر اعتقاد رکھے اور آپ کی عزت و تکریم کرنے کا جس طرح اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا اسی طرح اس پر عمل کر سکے

اور دوسری وجہ بیان کرتے ہوئے علامہ نووی رحمہ اللہ نے فرمایا ”امتثالاً لامر اللہ تعالیٰ واما بنعمة ربك فحدث“ آپ نے اپنے مراتب اللہ تعالیٰ کے حکم کی تابعداری کرتے ہوئے بیان فرمائے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ واما بنعمة ربك فحدث ﴾ اپنے رب کی نعمتوں کو خوب بیان کرو۔
نبی کریم ﷺ کا اپنی ولادت کے دن اظہار تشکر:

”وان كان النبی ﷺ لم یزد فیہ علی غیرہ من الشہور شیاً من العبادات وما ذاک الا لرحمته ﷺ بامته ورفقہ بہم لانه علیہ الصلوۃ والسلام كان یترك العمل خشية ان یفرض علی امتہ رحمة منه بہم لكن اشار علیہ السلام الی فضیلة هذا الشهر العظیم بقولہ للسان اللہ الذی“
(الحاوی للفتاویٰ ج ۱ ص ۱۹۳)

اگرچہ نبی کریم ﷺ نے اس ماہ میں نسبت اور مہینوں کے زیادہ عبادات نہیں کیں صرف اپنی امت پر رحمت اور مہربانی کرتے ہوئے کیونکہ نبی کریم ﷺ امت پر رحمت فرماتے ہوئے ان پر قرض ہو جانے کے ڈر سے کئی اعمال ترک فرمادیتے تھے لیکن آپ نے اس ماہ کی فضیلت کی طرف اشارہ فرمادیا جب آپ سے ایک شخص نے سوال کیا کہ آپ پیر کو روزہ کیوں رکھتے ہیں تو آپ نے فرمایا کہ یہ میری پیدائش کا دن ہے، یعنی آپ نے پیر کو اپنی پیدائش کا شکر یہ ادا کرنے کے لئے روزہ رکھا اور اس طرح اظہار مسرت کیا۔

نبی کریم ﷺ کی ولادت باسعادت پر خوشی منانے کی تفصیلی بحث اگر کوئی دیکھنا چاہے تو راقم کی کتاب ”شمع ہدایت“ کا مطالعہ کرے۔

☆☆☆☆☆

﴿وَإِذْ وَعَدْنَا مُوسَىٰ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهِ وَأَنْتُمْ ظَالِمُونَ﴾

(۱) ”اور جب ہم نے موسیٰ سے چالیس رات کا وعدہ فرمایا پھر اس کے پیچھے تم نے بچھڑے کی پوجا شروع کر دی اور تم ظالم تھے“

(۲) ”اور یاد کرو اس وقت کو جب ہم نے وعدہ کیا موسیٰ سے چالیس راتوں کا پھر تم نے بنا لیا بچھڑے کو معبود اس کے بعد، اور تم ظلم کرنے والے ہوئے“

ابوبکر بن ابی شیبہ نے قیس بن عباد سے روایت کیا کہ فرعون کے غرق ہو جانے کے باوجود بنی اسرائیل کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ مر چکا ہے، تو اللہ تعالیٰ نے اسے اور اس کی قوم کو باہر کنارے پر پھینک دیا تو ان کو یقین ہوا۔

بنی اسرائیل جب دریا سے نکل گئے، حق تو یہ تھا کہ ان کا ایمان اور پختہ ہوتا کیونکہ وہ اپنی آنکھوں سے دریا کو پھٹتے ہوئے دیکھ چکے تھے اور خود نجات حاصل کر چکے تھے، اور فرعون اور اس کی قوم کو غرق ہوتے ہوئے اور پھر دریا کا ان کو مردہ حالت میں کنارے پر پھینکا دیکھ چکے تھے۔ لیکن بنی اسرائیل نے راستے میں جب بت پرست قوم کو دیکھا تو کہنے لگے:

﴿يَا مُوسَىٰ اجْعَلْ لَنَا إِلَهًا كَمَا لَهُمْ آلِهَةٌ﴾

اے موسیٰ ہمارے لئے ایسا خدا بنا دو جیسے ان لوگوں کے خدا ہیں۔

موسیٰ علیہ السلام نے ان کو زجر کرتے ہوئے کہا:

﴿أَغْيِرَ اللَّهُ أْبْعِيَكُمْ إِلَهًا وَهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ﴾

کیا اللہ تعالیٰ کے بغیر تمہارے لئے میں اور خدا تلاش کروں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں فضیلت دی ہے اپنے زمانے میں جہاں والوں پر۔

پھر موسیٰ علیہ السلام نے ان کو ارض مقدسہ میں جانے کا حکم دیا کیونکہ وہ ان کے آباء و اجداد کا مقام

تھا، مقصد یہ تھا کہ یہ لوگ فرعون کی زمین سے بھی نجات حاصل کر لیں۔ اس ارض مقدسہ میں جابر لوگوں کا قبضہ تھا، موسیٰ علیہ السلام نے ان کو کہا کہ تم ان سے جہاد کر کے اپنے آباء و اجداد کی زمین کو ان سے آزاد کرو، لیکن یہ کہنے لگے کہ اے موسیٰ تم چاہتے ہو کہ ہم کافروں کے لئے گوشت کا ٹکڑا بن جائیں اس سے تو بہتر تھا کہ تم ہمیں فرعون کے پاس ہی رہنے دیتے۔

اس طرح یہ چالیس سال تک میدان تیر میں رہے۔ وہاں ان پر من و سلوی نازل ہوا (جس کا ذکر انشاء اللہ آگے آ رہا ہے) پھر موسیٰ علیہ السلام طور سیناء پر تشریف لے گئے تاکہ تورات لائیں۔ لیکن انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کے طور پر جانے کے بعد گائے کے بچھڑے کو اپنا معبود بنالیا۔ (از قرطبی)

موسیٰ علیہ السلام جب اپنی قوم کے ستر سر کردہ افراد کو ساتھ لے کر طور پر کتاب لینے کے لئے گئے قوم سے چالیس دنوں کا وعدہ کر کے گئے۔ آپ اپنی قوم کے ان افراد سے ذرا جلدی ہی آگے طور پر پہنچ گئے، رب تعالیٰ نے پوچھا تم اپنی قوم کے افراد سے پہلے کیوں آگئے ہو، تو آپ نے عرض کیا اے مولائے کائنات وہ بھی میرے پیچھے آ ہی رہے ہیں، میں صرف تیری خوشنودی حاصل کرنے کے لئے جلدی آ گیا طور پر ہی اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ خبر دے دی تھی کہ تمہاری قوم گمراہ ہو چکی ہے۔

آپ کو گئے ہوئے جب بیس دن مکمل ہو گئے تو سامری نے کہا موسیٰ علیہ السلام کو گئے بیس دن اور بیس راتیں ہو چکی ہیں چالیس کی تکمیل ہو گئی ہے۔ آپ واپس نہیں لوٹے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ تمہارے پاس فرعونوں کے زیورات ہیں وہ تم پر حرام ہیں، اس لئے وہ زیورات تم لوگ مجھے دے دو کہ میں ایک خدا بنا دوں۔ کیونکہ یہ پہلے دیکھ چکا تھا کہ قوم ایسا خدا چاہتی ہے جو انہیں نظر آئے یہ خود بھی گائے کی پرستش کرتا تھا، اس لئے اس نے تمام زیورات جمع کر کے انہیں ایک بچھڑا بنا دیا۔

بچھڑے کے ڈکارنے کی وجہ:

چونکہ فرعون کے لشکر نے اپنے گھوڑوں کو دریا میں ڈالنے سے سوچ و بچار شروع کر دی تھی تو جبرائیل ایک گھوڑی پر سوار ہو کر آئے وہ جہاں قدم رکھتی تھی وہاں سبز گھاس پیدا ہو جاتی۔ سامری نے یہ ماجرا دیکھ لیا تھا اس لئے اس نے گھوڑی کے پاؤں کے نیچے سے مٹی اٹھا کر محفوظ کر لی تھی، وہی مٹی

پھڑے کے ڈھانچے میں ڈال دی تھی جس کی وجہ سے اس میں اثر حیات پیدا ہو گیا اور وہ گائے کی طرح
ڈکارنے لگا۔

سامری سے جب موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا ”فما خطبک یا سامری“
﴿قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوا بِهِ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ أَثَرِ الرَّسُولِ
فَنَبَذْتُهَا وَكَذَلِكَ سَوَّلْتُ لِي نَفْسِي﴾ (پ ۱۶ ع ۱۴)

سامری تو نے ایسا کیوں کیا؟ اس نے کہا میں نے وہ دیکھا جو لوگوں نے نہ دیکھا۔ تو ایک مٹھی
بھری فرشتے کے نشان سے پھر اسے ڈال دیا اور میرے جی کو یہی بھلا لگا۔

یہی آیت جس کا ابھی ترجمہ نقل کیا ہے اسی کی تفسیر میں علامہ قرطبی نے بھی بیان کیا کہ
سامری نے جبرائیل کی گھوڑی کے قدموں کے نشان کی جگہ سے ایک مٹھی بھر مٹی لے کر پھڑے کے
ڈھانچے میں ڈالی۔ (قرطبی)

جس آیت کی وضاحت کی جارہی ہے اس کے تحت ہی مفتی محمد شفیع صاحب نے معارف القرآن
میں بھی ذکر کیا۔ معتبر تفاسیر خازن وغیرہ میں بھی یہی ہے۔ غرضیکہ سلف صالحین کی تفاسیر میں پھڑے کے
ڈکارنے کی وجہ یہی تحریر ہے کہ جبرائیل کے گھوڑی کے پاؤں کے نیچے سے لی ہوئی مٹی کا اثر تھا۔

خیال رہے کہ سب سے پہلے اس قول (گھوڑی کے قدموں کے نشان سے مٹی لینا) کو ابو مسلم
اصفہانی نے تسلیم نہیں کیا جو بہت بڑا معتزلی تھا، پھر اسی قول کا سہارا لیتے ہوئے مودودی صاحب نے
تفہیم القرآن میں بھی یہی تحریر کر دیا کہ سامری نے موسیٰ علیہ السلام سے جھوٹ موٹ کہہ دیا تھا مودودی
صاحب کی یہ سوچ غلط ہے قرآن پاک نے اگرچہ واضح طور پر اس قول کو نقل بھی نہیں کیا لیکن رد بھی نہیں کیا
اسی لئے متقدمین حضرات کی تفاسیر کو چھوڑ کر ایک معتزلی کی بات کو تسلیم کرنا بھی کوئی عقل و دانش کا کام نہیں۔

﴿وَإِذْ وَاعَدْنَا مُوسَىٰ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً﴾ بعض قراءتوں میں ”واعدنا“ ہے۔

جب ہم نے وعدہ کیا، لیکن ”واعدنا“ باب مفاعله ہے جو شرکت جانہین کو چاہتا ہے۔ تو اس صورت
میں یا تو یہ جواب دیا جائے گا کہ باب مفاعله میں بھی کبھی شرکت نہیں پائی جاتی لہذا اس مقام میں
”واعدنا“ اور ”واعدنا“ کا ایک ہی معنی ہے۔ اور یا یہ مراد ہے کہ رب تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے

توراة دینے کا وعدہ کیا اور موسیٰ علیہ السلام نے میقات پر آنے کا وعدہ کیا۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ جانہین سے یہ معنی مراد لیا جائے کہ رب تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے وعدہ کیا اور آپ نے وعدہ کو قبول کیا۔ چالیس راتوں سے مراد، ذی قعد کے تیس دن اور دس دن ذی الحج کے۔

اعتراض : سورة اعراف میں ذکر ہے ﴿وَوَاعَدْنَا مُوسَى ثَلَاثِينَ لَيْلَةً وَأَتَمَمْنَاهَا بِعَشْرَةٍ﴾ اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام سے تیس راتوں کا وعدہ کیا گیا۔ ان دونوں آیتوں میں تطبیق کیسے؟

جواب : بعض حضرات نے تو سورة اعراف کے ظاہر کو دیکھ کر یہ جواب دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے موسیٰ علیہ السلام سے تیس راتوں کا وعدہ کیا پھر اسے بڑھا کر چالیس کر دیا۔ لیکن حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا:

”ليس المراد ان وعدہ كان ثلاثين ليلة ثم بعد ذلك وعدہ بعشر
لكنه وعدہ اربعين ليلة جميعا وهو كقوله تعالى ثلاثة ايام في الحج
وسبعة اذا رجعتم تلك عشرة كاملة“

کہ اس سے یہ مراد نہیں کہ پہلے تیس راتوں کا وعدہ کیا گیا پھر اس کے بعد آپ سے دس اور راتوں کا وعدہ کر کے چالیس کو مکمل کیا گیا بلکہ ابتدائی طور پر ہی چالیس کا وعدہ کیا گیا البتہ یہ با محاورہ کلام ہے کہ ذی القعدہ کی تیس راتوں اور ذی الحج کی دس راتوں کا وعدہ کیا گیا۔ اسے تعبیر تیس اور دس سے کیا گیا۔ جس طرح قرآن یا تمتع کرنے والا اگر ہدی نہ دے سکے تو اسے دس روزے رکھنے کا حکم دیا گیا، لیکن تین دن ایام حج میں مکمل کرنے ہیں اور سات دن ان سے فارغ ہونے کے بعد، ان کو بھی تین اور سات سے تعبیر کیا گیا۔ (از کبیر)

اگرچہ راقم نے تذکرۃ الانبیاء میں پہلی وجہ کو مختصر طور پر ذکر کیا تھا لیکن حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کی طرف سے دیا ہوا جواب بہت خوب نظر آیا۔

راتوں کا ذکر کیوں؟

”قرون التاريخ بالليل دون النهار لان الاشهر العربية وضعت على سير

القمر وقيل لان الظلمة اقدم من الضوء (خازن)

یہاں تاریخ کا ذکر کرتے ہوئے راتوں کا اس لئے ذکر کیا ہے کہ عربی مہینوں کا حساب چاند کے لحاظ پر ہوتا ہے اور چاند کی تاریخوں کی ابتداء رات سے ہوتی ہے۔

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ تاریکی نورانیت سے پہلے ہوتی ہے یعنی کفر سے ایمان کی راہنمائی کی جاتی ہے۔ جب ایمان نصیب ہوا تو تاریکی ختم ہو گئی اور ایمان کی وجہ سے نورانیت حاصل ہو گئی۔

فائدہ: موسیٰ علیہ السلام کو چالیس دن، رات کے بعد توراۃ عطا کی گئی کہ آپ چالیس دن دنیا والوں سے الگ تھلگ ہو کر اللہ تعالیٰ کی یاد میں مشغول رہیں، اس طرح اس کے ذکر و فکر سے آپ کے قلب و روح کو ایک خاص قسم کی قوت حاصل ہو جائے جو اس عظیم بوجھ کو اٹھانے کے قابل ہو جائے۔

”ان للاربعةین خصوصية فی اختصاص الکلام للانبیاء کما ان لها اختصاصا صافی ظهور ینابع الحکمة من قلوب الاولیاء کقولہ علیہ السلام من اخلص لله اربعین صباحا ظهرت ینابع الحکمة من قلبه من لسانه“ (روح البیان)

بیشک چالیس کو ایک خصوصیت حاصل ہے اسی وجہ سے انبیاء کرام کو چالیس سال کی عمر میں نبوت کے اعلان کا حکم دیا جاتا رہا۔ ان سے رب تعالیٰ کا کلام بذریعہ وحی اسی عمر میں ہوا۔ پھر اولیاء عظام کا بھی یہی معمول ہے کہ وہ چلہ کشی کرتے ہیں۔ یعنی چالیس روز تک دنیا سے علیحدہ ہو کر فقط رب تعالیٰ کی یاد میں مشغول ہوتے ہیں تو ان کے دلوں پر حکمت کے چشمے پھوٹ پڑتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے جو شخص چالیس صبح خلوص سے اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے اس کے دل سے اس کی زبان پر حکمت کے چشمے نمودار ہو جاتے ہیں۔

کاش کہ لوگوں کو یہ سمجھ آ جائے کہ چالیس دن تک فوت شدہ کے لئے قرآن خوانی کا اہتمام کرتے رہنا پھر چالیس پر اس کے لئے اجتماعی دعاء کتنی مقبولیت کا سبب ہوگی۔ خیر معاملہ قسمت کا ہے جس کی قسمت میں ہو اس کے لئے قرآن پاک پڑھا جائے گا۔

دینی طلباء کے لئے: ”اربعةین لیلة“ میں ”اربعةین“ کی نصی حالت ہے۔ جو مفعول واقع ہو رہا ہے اور اس میں ”واسأل القرية“ کی طرح حذف مضاف ہے۔ لہذا عبارت کا مطلب یہ ہے۔

﴿وَإِذْ وَاعَدْنَا مُوسَىٰ تَمَامَ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً﴾

اور جب ہم نے موسیٰ کے ساتھ چالیس راتیں مکمل کرنے کا وعدہ کیا۔

”والاربعون کلھا داخلۃ فی المیعاد“ اور چالیس تمام کے تمام ہی وعدہ میں داخل ہیں۔

﴿ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ﴾ : الہا (خازن) پھر تم نے بچھڑے کو معبود بنالیا۔ لفظ ”الہا“

مقدر کال کراشارہ یا گیا کہ یہاں ایک مفعول حذف ہے۔ آئیے اسی سے تراجم میں تقابلی جائزہ دیکھیں۔

﴿ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهِ﴾

(شاہ رفیع الدین صاحب)

”پھر پکڑ اتم نے گائے کا بچہ“

(عبد الماجد صاحب)

”پھر تم نے ان کو پیچھے گو سالہ کو اختیار کر لیا“

(اشرف علی صاحب)

”پھر تم لوگوں نے تجویز کر لیا گو سالہ کو موسیٰ کے بعد“

(شاہ عبدالقادر صاحب)

”پھر تم نے بنالیا بچھڑا اس کے پیچھے“

(محمود الحسن صاحب)

”پھر تم نے بنالیا بچھڑا موسیٰ کے بعد“

(اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان)

”پھر اس کے پیچھے تم نے بچھڑے کی پوجا شروع کر دی“

اس مقام پر بعض تراجم میں ایک تو ”موسیٰ“ کسی لفظ کا ترجمہ نہیں بلکہ ضمیر کے مرجع سے سمجھ میں آتا ہے۔ مخالفین کو یہ اعتراض تو کرنا آتا ہے کہ ضمیر کا مرجع، نبی کریم ﷺ ہوں تو ”محبوب“ ترجمہ میں کیوں آتا ہے تو ان کے اپنے ہی بعض تراجم میں ”موسیٰ“ کیوں آیا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ دیگر تراجم سے صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کے طور پر جانے کے بعد ایک بچھڑا بنالیا، یا تجویز کر لیا۔ کیا ان پر ایک دوسرے کو قتل کرنا فقط اس لئے واجب تھا کہ انہوں نے بچھڑا کیوں بنایا۔ یا بچھڑے کو خدا کیوں مانا؟ اور اس کی پوجا کیوں کی؟ اگر صرف بنانا مقصود تھا تو یہ فعل صرف مامری کا تھا تاہم نہیں پھر دوسروں کا مواخذہ کیسے؟ یہاں تو یہ ذکر ہے انہوں نے بچھڑے کو خدا مان کر اس کی پوجا شروع کر دی تھی۔

اس پر اعلیٰ حضرت کا ترجمہ زیادہ واضح ہے باقی تراجم سے مقصد واضح نہیں، اس پر زیادہ تفاسیر کی عبارات نقل کرنے کی ضرورت اس لئے نہیں خود قرآن پاک کے دوسرے مقام پر واضح کیا گیا کہ

انہوں نے پچھڑے کو خدا مانا تھا۔ اس کی عبادت کرتے رہے۔

﴿فَقَالُوا هَذَا إِلَهُكُمْ وَإِلَهُ مُوسَى﴾

”سامری اور اس کے تبعین نے دوسروں کو کہا یہ ہے تمہارا اور موسیٰ کا خدا“

اس سے آگے ان کا جواب حضرت ہارون علیہ السلام سے منع کرنے پر یہ تھا:

﴿قَالُوا لَنْ نَبْرَحَ عَلَيْهِ عَاكِفِينَ حَتَّىٰ يَرْجِعَ إِلَيْنَا مُوسَى﴾

انہوں نے کہا ہم تو موسیٰ (علیہ السلام) کے لوٹنے پر اسی پر (پچھڑے کی پوجا پر) قائم رہیں گے۔

تاہم صرف بیضاوی کی عبارت پر اکتفا کیا جاتا ہے: ”ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهِ“

الہا و معبودا“ یعنی تم نے پچھڑے کو خدا، معبود بنا لیا۔ (تسکین الجنان فی محاسن کثر الايمان ص ۴۳)

﴿مِنْ بَعْدِهِ﴾: (اس کے بعد) اس میں کئی احتمال ہیں جو تقریباً تمام کے تمام مجتمع ہیں۔

(۱) موسیٰ علیہ السلام کے طور پر جانے کے بعد تم نے پچھڑے کو معبود بنا لیا۔

(۲) موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مواعدت کے بعد۔

(۳) جب تم نے دیکھ لیا کہ اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے جو واحد ہے اس کا کوئی شریک نہیں، وہ شرک سے پاک ہے رب نے اپنی توحید پر قائم رہنے کا حکم دیا اور شرک سے روکا ان تمام چیزوں کے بعد تم نے پچھڑے کو معبود بنا لیا۔

﴿وَأَنْتُمْ ظَالِمُونَ﴾ ”اور تم ظلم کرنے والے ہوئے“ ظلم کا معنی شرک بھی ہے اس معنی کے لحاظ پر

مطلب یہ ہو کہ تم مشرک ہو گئے۔ اور ظلم کا معنی یہاں یہ بھی ہے ”وضع العبادۃ فی غیر موضعہا“ عبادت کو غیر محل میں رکھنا، یعنی تم نے اللہ تعالیٰ کی عبادت چھوڑ کر پچھڑے کی عبادت شروع کر دی۔

(روح المعانی)

اور ﴿وَأَنْتُمْ ظَالِمُونَ﴾ کا یہ مطلب بھی ہے:

”وانتم ضارون لانفسکم بالمعصیۃ حیث وضعتم العبادۃ فی غیر موضعہا“

تم نے اللہ تعالیٰ کی عبادت کو چھوڑ کر پچھڑے کی عبادت کر کے منہمک گناہ میں مبتلا ہو کر

(خارن)

اپنے آپ کو نقصان پہنچایا۔

اس آیت سے بھی امت مصطفیٰ ﷺ کو یہ فائدے حاصل ہوئے:

(۱) یہود نے واضح معجزات اور دلائل کو دیکھا لیکن معمولی شبہات ڈالنے سے وہ بھٹک گئے، لیکن نبی کریم ﷺ کی امت کو یہ سمجھنے کے لئے کہ قرآن پاک معجزہ ہے دقیق دلائل سے پتہ چلا لیکن پھر بھی وہ بڑے قوی شبہات سے ڈمگائے نہیں دین حق سے بھٹکے نہیں۔

(۲) نبی کریم ﷺ نے یہ واقعہ ذکر کیا حالانکہ آپ نے کسی سے پڑھا نہیں ”وذلك يدل على انه عليه الصلوة والسلام استفادها من الوحي“ اس سے پتہ چلا کہ آپ کو یہ وحی کے ذریعہ حاصل ہوا۔

(۳) عقائد میں تقلید نہیں ان لوگوں نے فقط سامری کی بات کو مان کر پچھڑے کی پوجا کر کے اپنا ایمان ضائع کر دیا:

”لو انهم عرفوا الله بالدليل معرفة تامة لما وقعوا في شبهة السامري“
اگر وہ اللہ تعالیٰ کو دلائل کے ذریعے پہچانتے تو ان کو معرفت تامہ حاصل ہوتی وہ سامری کے شبہ میں نہ پڑتے۔

(۴) اللہ تعالیٰ نے یہ واقعہ نبی کریم ﷺ پر بیان کر کے گویا کہ آپ کو صبر کرنے کا حکم دیا کیونکہ آپ کافروں کے شرک سے بہت پریشان ہوتے تھے، تو آپ کو گویا کہ اس واقعہ سے تسلی دی گئی کہ موسیٰ علیہ السلام نے بھی اپنی قوم کے شرک سے صبر کیا آپ بھی صبر کریں ان کا حساب رب کے پاس ہوگا۔

(۵) ”ان اشد الناس مجادلة مع الرسول ﷺ وعداوة له هم اليهود فكانه تعالى قال ان هؤلاء انما يفتخرون باسلافهم ثم ان اسلافهم كانوا في البلادة والجهالة والعناد الى هذا الحد فيكف هؤلاء الاخلاف“

رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سب لوگوں سے زیادہ جھگڑا کرنے والے اور سب سے زیادہ دشمنی کرنے والے یہود ہی تھے۔ گویا کہ رب تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا کہ یہ لوگ اپنے اسلاف یعنی اپنے آباء و اجداد پر فخر کرتے ہیں لیکن ان کے آباء و اجداد بہت ہی زیادہ بے وقوف اور جاہل اور عناد کرنے والے تھے اس سے بڑھ کر ان کی جہالت کیا ہو سکتی ہے کہ ایک پچھڑا جوان سے ہی زیور لے کر بنایا گیا اس کی انہوں نے پوجا شروع کر دی اور وہ نبی جس نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے ان کو فرعون اور اس کی قوم کے ظلم سے نجات دی اسی کے شریعت کے باغی ہو کر اس سے عناد کیا۔ جب ان کے اسلاف ایسے تھے تو

﴿ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذَلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ﴾

(۱) ”پھر اس کے بعد ہم نے تمہیں معافی دی کہ کہیں تم احسان مانو“

(۲) ”پھر ہم نے معاف کر دیا تمہیں اس کے بعد، تاکہ تم شکر یہ ادا کرو“

مختصر مطلب: اللہ تعالیٰ نے اور نعمت کی یاد دلائی کی حق تو یہ تھا کہ تم موسیٰ علیہ السلام کے معجزات اور رب تعالیٰ کی مہربانیوں کو دیکھ کر ایمان میں اور زیادہ پختگی اختیار کرتے لیکن تم نے پچھڑے کی پوجا شروع کر دی تم بہت بڑے عذاب کے مستحق ہو چکے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے تمہیں تو یہ توفیق عطا کر کے اس عظیم جرم کے بعد بھی معاف فرمادیا تاکہ تم شکر کرو۔

تفصیلی وضاحت:

﴿ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ﴾ ”عفو“ کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کا مخلوق کو معاف کرنا ”وقد

یکون بعد العقوبة وقبلها“ ”عفو“ عام ہے عذاب کے بعد معاف کرنے کو بھی کہا جاتا ہے اور عذاب کے مستحق کو عذاب سے پہلے معاف کر دینے کو بھی عفو کہا جاتا ہے۔

”بخلاف الغفران فإنه لا يكون معه عقوبة البتة“

لیکن مغفرت کا تعلق عذاب سے ہی ہوتا ہے کہ عذاب دینے کے بعد معاف کر دیا جائے لیکن یہ خیال رہے کہ کبھی مغفرت بھی عفو کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ دعاؤں میں مغفرت عفو کے معنی میں ہی استعمال ہے۔ اس کا یہی مطلب ہوتا ہے کہ اللہ ہمیں عذاب سے پہلے ہی تو معاف فرمادے ”کل من استحق عقوبة فتركه له فقد عفى عنه“ ہر وہ شخص جو عقوبت کا مستحق ہو اسے سزا نہ دینے کو بھی ”عفی عنه“ سے تعبیر کیا جاتا ہے کہ اسے معاف کر دیا گیا۔

عفو کا معنی گناہ مٹا دینا یعنی ”محونا ذنوبکم وتجاوزنا عنکم“ اب مطالب واضح ہوا کہ ﴿ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ پھر ہم نے تمہارے گناہوں کو مٹا دیا، اور تم سے درگزر کیا

”پھر ہم نے معاف کیا تمہیں“ ذرا مختصر الفاظ ہیں جو مکمل معنی کو حاوی ہیں اس لئے مترجمین نے یہی الفاظ اختیار کئے ہیں۔

”عَفُو“ کا لفظ لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہے کہا جاتا ہے ”عَفَت الدار“ گھر مٹ گیا (برباد ہو گیا) اور کہا جاتا ہے ”عَفَت الريح الاثر“ ہوائے نشان مٹا دیا ہے ”عفا الشيء کثر فهُوَ مِنَ الْإِضْدَادِ“ کبھی عفو کا لفظ کثرت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے جب کوئی چیز کثیر مقدار میں ہو جائے تو کہا جاتا ہے ”عفا الشيء“ یعنی مٹا دینا اور بڑھادینا یہ دونوں معانی ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ لیکن عفو میں دونوں پائے جاتے ہیں۔ ماقبل اور مابعد (آگے پیچھے) کو دیکھ کر سمجھ لیا جائے گا کہ یہاں کون سا معنی معتبر ہے۔ قرآن پاک میں ”حتی عفو“ میں کثرت والا معنی ہی مراد ہے۔

(از قوطی بریل)

﴿مَنْ بَعْدَ ذَلِكَ﴾ ”ای من بعد عبادتکم العجل“ یعنی ہم نے تمہیں معاف کیا تمہارے پچھڑے کی پوجا کرنے کے بعد۔

(خازن)

اعتراض: ”ثم“ تراخی پر دلالت کرتا ہے اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ اس کے بعد اور ”من بعد ذلك“ کا مطلب بھی یہی ہے اس طرح تکرار لازم آئے گا جو فصاحت کے خلاف ہے۔

جواب: ”ثم“ لتفاوت ما بین فعلهم التبیح واتخذ تعالیٰ فی شأنهم فلا یكون (من بعد ذاک) تکراراً

اس مقام میں لفظ (ثم) تراشی رتبہ کے لئے ہے۔ تراخی زمانی کے لئے نہیں۔ یعنی (ثم) کے ذریعے یہ بیان کیا گیا ہے کہ اے بنی اسرائیل اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کرو، ذرا ادھر توجہ کرو کہ کہاں تمہارا پچھڑے کی پوجا کرنے کا برا عمل اور کہاں رب تعالیٰ کا معاف کرنے کا عظیم کرم، ان کے مراتب میں کتنا عظیم تفاوت ہے۔

اب واضح ہو گا کہ ”من بعد ذاک“ میں تکرار نہیں بلکہ اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ تم نے پچھڑے کی پوجا کی رب تعالیٰ نے تمہیں توبہ کرنے کا حکم دیا اور توجہ کرنے کی توفیق عطا کی اس کے بعد تمہیں معاف کر دیا۔

﴿لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ﴾ ”ای لکی تشکروا عفو عنکم وحسن صنیع البکم“

تاکہ تم شکر کرو، یعنی اللہ تعالیٰ نے معاف کر کے ان پر احسان کیا۔ اس نعمت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم نے تمہیں اس کے بعد معاف کیا تاکہ میرے معاف کرنے اور میرے تم پر احسان کرنے کے برتاؤ کا تم شکر کرو۔
(حازن)

فائدہ : ”فسر لعل بکی اخذا مما قيل ان لعل في القرآن بمعنى كي غير قوله تعالى في الشعراء لعلكم تخلصون بمعنى كان (مشبه بالفعل) اي كانكم تخلصون“

حازن کی طرح علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے بھی ”لعل“ کی تفسیر ”کسی“ سے کی ہے جس کا معنی ہے تاکہ اس کی وضاحت کرتے ہوئے شیخ زادہ رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ قرآن پاک میں جہاں بھی ”لعل“ استعمال ہے اس کا معنی یہی ہے ”تاکہ“ البتہ سورۃ شعراء میں ”لعلکم تخلصون“ میں ”لعل“ کان حرف مشبہ بالفعل کے معنی میں استعمال ہے جس کا معنی ہوتا ہے ”گویا کہ“ (شیخ زادہ)

شکر کیا ہے؟ شکر کی مشہور تعریف یہ ہے کہ نعمت کے مقابل منعم کی تعریف کی جائے وہ تعریف عام ہے خواہ زبان سے ہو یا دل سے ہو یا ارکان سے ہو۔

تاہم شکر کی تعریف میں اور بھی مختلف اقوال ہیں۔ تمام کو جمع کر کے واضح ہوتا ہے کہ شکر ایک عظیم چیز کا نام ہے شکر کا جو مشہور معنی بیان کیا ہے اسی کے لحاظ سے شکر کی تین قسمیں بیان کی جاتی ہیں۔ شکر اور اس کی قسمیں حازن نے بیان کرتے ہوئے کہا:

”واصل الشکر هو تصور النعمة و اظهارها و يضاد الكفر وهو نسيان النعمة و سترها“

شکر در حقیقت نعمت کا تصور کرنا اور اسے بیان کرنا، اور اس کی ضد کفران ہے یعنی نعمت کو بھول جانا اور اسے چھپانا۔

لیکن یہ خیال رہے کہ نعمت کو صرف اسلئے بیان کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کا مجھ پر یہ انعام ہے تکبر کے طور پر اور ریاء کاری کے طور پر چرچا کرنا رب تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب ہے اس سے اجتناب نہ مرنے۔

”والشکر علی ثلاثة اضرب شکر القلب وهو تصور النعمة وشکر

اللسان وهو الثناء علی النعمة وشکر سائر الجوارح وهو مكافاة

(حازن)

النعمة بقدر استحقاقها“

شکر کی تین قسمیں ہیں:

- (۱) دل سے شکر کرنا یعنی نعمت کا دل میں تصور کرنا۔
- (۲) زبان سے شکر کرنا یعنی نعمت پر زبان سے تعریف کرنا۔
- (۳) ارکان سے شکر ادا کرنا یعنی ظاہری اعضاء کے ذریعے نعمت کے مقابل منعم کی تعریف کرنا۔ (خازن)

”وقال ذوالنون (الشکر) لمن فوقک بالطاعة ولنظیرک

بالمکافات ولمن دونک بالاحسان“ (روح المعانی)

ذوالنون مصری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اپنے سے بلند مرتبہ کا شکر یہ ادا کرنے کا یہ مطلب ہے کہ اس کی طاعت کی جائے اور اپنے برابر کو اس کے احسان کا اسی طرح کا بدلہ دے کر شکر یہ ادا کیا جائے۔ اور اپنے سے کم درجہ کے احسان کا بدلہ زیادہ احسان کر کے شکر یہ ادا کیا جائے۔

”قال سہل بن عبد اللہ الشکر الاجتهاد فی بذل الطاعة مع الاجتناب

للمعصية فی السرو العلانية“

حضرت سہل بن عبد اللہ رحمہ نے فرمایا کہ شکر یہ ہے کہ انسان طاعت کرنے میں بہت زیادہ کوشش کرے اور ظاہری طور پر اور باطنی طور پر معصیت سے اجتناب کرے۔

”وقالت فرقة اخرى الشکر هو الاعتراف فی تقصیر الشکر للمنعم“

بعض اور حضرات نے بیان کیا کہ شکر حقیقت میں اسے کہا جاتا ہے کہ انسان منعم (انعام کرنے والے) کا شکر ادا کرنے میں اپنی کوتاہی کا اعتراف کرے کہ میں نے شکر اس طرح نہیں کیا جیسا شکر کرنے کا حق تھا۔

جب رب تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو شکر کرنے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا ﴿اعْمَلُوا آلَ دَاوُدَ شُكْرًا﴾ تو حضرت داؤد علیہ السلام نے رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا اے میرے رب میں تیرا شکر

کس طرح کروں ”والشکر نعمة منك“ جب کہ شکر بھی تیری طرف سے ایک نعمت ہے پھر اس کا شکر ادا کروں گا تو وہ بھی تیری نعمت ہوگی یہ سلسلہ تو ختم ہونے میں نہیں آئے گا تو رب تعالیٰ نے فرمایا:

”الآن قد عرفتنی وشکرتنی اذ قد عرفت ان الشکر منی نعمة“

”اب تم نے مجھے پہچان لیا اور میرا شکر یہ ادا کر دیا کیونکہ تمہارا یہ پہچان لینا کہ شکر بھی

میری نعمت ہے یہ تمہاری طرف سے شکر ہی ہے“

حضرت داؤد علیہ السلام نے عرض کیا اے میرے رب جو تیرے انعامات مجھ پر مخفی ہیں ان میں سے کسی ایک کا مجھے علم عطاء فرما۔ تو رب تعالیٰ نے کہا ”سانس لیں“ جب آپ نے سانس لیا تو رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿مَنْ يَحْصِيْ هَذِهِ النِّعْمَةَ اللَّيْلُ وَالنَّهَارُ﴾

کون شخص اس نعمت کو شمار کر سکتا ہے جو اسے رات اور دن کو ہر لحظہ میں حاصل ہے۔

موسیٰ علیہ السلام نے رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا اے میرے رب میں تیرا شکر کیسے ادا کروں جب کہ اے اللہ تو کسی نعمت کو چھوٹا سمجھ کر مجھے عطاء کرے گا ”لا یجازی بها عملی کلہ“ تو میری زندگی کے تمام اعمال بھی اس نعمت کا بدل نہیں بن سکتے۔ تو رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿يَا مُوسٰى اِلَّا اَنْ شَكَرْتُنِيْ﴾ اے موسیٰ تم نے رب تیرا شکر یہ ادا کر دیا۔

مطلب واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کو نعمت سمجھنا اور اسے عظیم نعمت سمجھنا ہی درحقیقت شکر ہے۔

(از قرطبی)

”وقال الفضیل شکر کل نعمة ان لا يعصى الله بعدها بتلك النعمة“

فضیل رحمہ اللہ کہتے ہیں ہر نعمت کا شکر یہ ہے کہ اس نعمت کے حاصل ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ کی جائے۔

”قل شکر النعمة ان لا يراها البتة ويرى المنعم“ شکر کا علی درجہ یہ ہے کہ نعمت کو نہ دیکھے بلکہ منعم کو دیکھے اس لئے کہ بعض اوقات صرف نعمتوں کی طرف ہی توجہ کرتے رہنے سے انسان باغی ہو جاتا ہے، لیکن جب اسے یہ معلوم ہوگا کہ یہ نعمتیں اللہ تعالیٰ نے مجھے عطاء کی ہیں تو وہ سراپا عجز بن کر رہے گا۔

(از حارن)

”وقال الشبلی الشکر التواضع والمحافظة على الحسنات الشهوات

وبذل الطاعات“

شبلی رحمہ اللہ نے فرمایا شکر یہ ہے کہ عجز اختیار کیا جائے اور نیکی کے کام پابندی سے کئے جائیں اور خواہشات کی مخالفت کی جائے اور طاعات پر وقت صرف کیا جائے۔

(از قرطبی)

﴿وَإِذْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ﴾

- (۱) ”اور جب ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی اور حق و باطل میں تمیز کر دینا، کہ کہیں تم راہ پر آؤ“
 (۲) ”اور یاد کرو اس وقت کو جب ہم نے عطا کی موسیٰ کو کتاب (اور عطا کیا) حق و باطل میں تمیز کرنا، تاکہ تم ہدایت حاصل کرو“

یہاں سے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو اور نعمت یاد دلائی کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری ہدایت کیلئے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب عطاء کی اور حق و باطل میں فرق کرنے والی چیز عطا کی یہ درحقیقت تم پر بہت بڑا انعام تھا۔
 ﴿وَإِذْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ﴾: ”اذ اسم للوقت الماضي، واذ اسم للوقت المستقبل و آتینا، اعطینا“ (قرطبی)

”اذ“ ماضی کے لئے استعمال ہوتا ہے جبکہ ”اذا“ مستقبل کے لئے اور آتینا کا معنی ہے اعطینا ہم نے عطا کیا۔ (موسیٰ) عجمی نام ہے علمیت اور عجمہ کی وجہ سے غیر منصرف ہے۔ بعض حضرات نے کہا یہ مرکب ہے (مو) اور (شی) سے (مو) کا معنی پانی اور (شی) کا معنی ہے درخت۔ پھر (شی معجمہ) کو (سی مہملہ) سے بدلا گیا ہے۔ چونکہ آپ کا تابوت بھی پانی اور درختوں سے ملا تھا اس لئے آپ کو موسیٰ کہا گیا۔

بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہ ”ماس یمیس“ سے لیا ہوا ہے طوبی کا وزن ہے یا کو واؤ سے تبدیل کیا گیا۔
 (از روح المعانی ج اول ص ۲۵۷)

موسیٰ علیہ السلام: حضرت موسیٰ علیہ السلام کے والد کا نام عمران ہے جو اپنے قبیلہ کے سردار تھے لاوی بن یعقوب علیہ السلام کی اولاد سے تھے۔ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے نام میں اختلاف ہے یارخا، یارخت، نوحانڈ، یوحانڈ، لوحا، مریم، یہ تمام نام ذکر کرنے کے بعد حاشیہ جلالین میں ذکر کیا گیا ہے ”والاصح هو الاول کما فی روح البیان“ صحیح پہلا قول ہی ہے یعنی ”یارخا“ جیسے روح البیان میں ہے۔

(حاشیہ جلالین ص ۳۲۱)

مفتی احمد یار خان رحمہ اللہ نے تفسیر نعیمی میں عائد لکھا ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

سامری کا نام بھی موسیٰ تھا بظاہر ایمان لایا ہوا تھا لیکن حقیقت میں منافق تھا۔ سامری کا تفصیلی ذکر ان شاء اللہ پارہ سولہ میں آئے گا۔

﴿الکِتاب﴾ سے مراد توراۃ ہے۔ اس میں تمام مفسرین کا اتفاق ہے کیونکہ موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہونے والی کتاب توراۃ ہی ہے۔

﴿وَالْفُرْقَان﴾ کا معنی یہ ہے ”الفارق بین الحق والباطل“ حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے والی چیز۔

اس آیت کریمہ میں فرقان سے مراد کیا ہے اس میں تین احتمال پائے گئے ہیں جو تمام کے تمام جمع ہیں ان میں کوئی تعارض نہیں۔ وہ تین احتمال یہ ہیں کہ فرقان سے مراد توراۃ ہو، یا توراۃ کے اندر داخل چیز ہو، یا توراۃ سے خارج ہو۔

پہلا احتمال: فرقان سے مراد توراۃ ہو تو اس صورت میں عطف تفسیری ہوگا، یعنی مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے موسیٰ کو کتاب دی جو حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے والی ہے۔ تاکہ تم اس کتاب کے ذریعے ہدایت حاصل کر سکو۔ فرقان سے مراد توراۃ ہو تو اسے یوں بھی بیان کیا جاسکتا ہے۔

”ان التوراة لها صفتان کونها کتابا منزلا و کونها فرقانا تفرق بین الحق والباطل“

بیشک توراۃ کے دو وصف ہیں ایک یہ کہ وہ کتاب ہے جو اللہ کی طرف سے نازل کی گئی ہے اور دوسرا وصف اس کا یہ ہے کہ وہ فرقان ہے یعنی حق و باطل میں فرق کرنے والی ہے۔

یہاں دونوں وصفوں کو اس طرح ذکر کیا گیا جیسا کسی شخص کی شجاعت اور سخاوت کو ذکر کرنا مقصود ہو تو یوں کہا جائے ”رأیت الغیث واللیث“ (میں نے بارش اور تیر کو دیکھا) یعنی میں نے ایسے شخص کو دیکھا جو سخاوت میں بارش کی طرح ہے اور بہادری میں شیر کی طرح ہے۔

دوسرا احتمال: فرقان سے مراد وہ مسائل جو توراۃ میں بیان کئے گئے ہیں یعنی موسیٰ علیہ السلام کو ہم نے کتاب دی اور اس میں اصول دین اور فروع دین کو ذکر کیا اور موسیٰ علیہ السلام کو ان کے بیان کرنے اور ظاہر کرنے کا حکم دیا تاکہ تم ان اصول دین اور فروع دین پر عمل کر کے ہدایت حاصل کر سکو۔

تیسرا احتمال: توراۃ سے خارج چیزیں مراد ہوں۔ یعنی فرقان سے مراد موسیٰ علیہ السلام کے معجزات ہوں کہ آپ کو ید بیضاء اور عصاء عطا فرمایا اور بھی نشانیاں عطا فرمائیں (جن کا ذکر ہو چکا ہے اور آئندہ آئے گا ان شاء اللہ) وہ حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والی ہیں۔ توراۃ سے خارج ہی فرقان سے مراد نصرت ہے اور کشادگی جو بنی اسرائیل کو عطا کی گئی اسی نصرت والے معنی کے لحاظ سے یوم بدر کو یوم الفرقان کہا گیا ہے جیسے رب تعالیٰ نے ان الفاظ مبارکہ سے بیان فرمایا ہے:

﴿وَمَا أَنْزَلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ التَّقْيِ الْجُمُعَانِ﴾

تنبیہ: بعض حضرات نے یہ بھی بیان فرمایا کہ فرقان سے مراد قرآن پاک ہے اور مفعول حذف ہے یعنی اصل عبارت یہ ہے ”واذ آتینا موسیٰ الكتاب ومحمدا فرقانا“ لیکن اس قول کو تقریباً تمام مفسرین نے ضعیف قرار دیا۔ اس لئے پہلے ہی تمام احتمالات قویٰ ہیں اور راقم کے نزدیک تمام ہی بیک وقت مراد ہیں۔ جس کا مجموعی مفہوم یہ ہے کہ یاد کرو اس وقت کو جب ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی اور وہی کتاب کو حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والی بنا کر عطا کی اور اصول دین اور فروع دین کو بیان کرنے کا حکم دیا تاکہ حق و باطل میں فرق ہو سکے اور آپ کو معجزات عطاء فرمائے تاکہ معجزات کو دیکھ کر حق و باطل میں فرق کیا جاسکے۔ اور آپ کی امداد فرما کر حق و باطل میں فرق کیا گیا ان تمام چیزوں کے عطاء کرنے کی وجہ یہ ہے تاکہ تم ہدایت حاصل کرلو۔

(از کبیر بزیادة)

﴿لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ﴾ ”لکی تہتدوا بالتدبر فیہ والعمل بما یحویہ“ (تفسیر ابی السعود)

تاکہ تم کتاب میں تدبر کر کے اور جن مسائل پر وہ مشتمل ہے ان پر عمل کر کے ہدایت حاصل کرلو۔

”لکی تہتدوا بتدبر الكتاب وتفکر الآیات“ (بیضاوی)

تاکہ تم کتاب میں تدبر کر کے اور آیات میں تفکر کر کے ہدایت حاصل کرلو۔

”(لعلکم تہتدون) لما هو شکر المحق والمبطل“ (تبصیر الرحمن)

تاکہ تمہیں اس ذات کا شکر یہ ادا کرنے کی ہدایت حاصل ہو جو حق راہ اور باطل راہ کا

پیدا کرنے والا ہے اور حق و باطل میں تمیز کرنے والا ہے۔

☆☆☆

﴿وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ يَقَوْمِ إِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ أَنْفُسَكُمْ
بَاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوبُوا إِلَىٰ بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ
ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ إِنَّهُ هُوَ
التَّوَّابُ الرَّحِيمُ﴾

(۱) ”اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم تم نے بچھڑا بنا کر اپنی جانوں پر ظلم کیا تو اپنے پیدا کرنے والے کی طرف رجوع لاؤ تو آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرو تمہارے پیدا کرنے والے کے نزدیک تمہارے لئے بہتر ہے اس نے تمہاری توبہ قبول کی بیشک وہی ہے توبہ قبول کرنے والا مہربان۔“

(۲) ”اور یاد کرو اس وقت کو جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم کو، اے میری قوم بیشک تم نے ظلم کیا ہے اپنی جانوں پر بوجہ بنانے تمہارے بچھڑے کو معبود، تو توبہ کرو اپنے پیدا کرنے والے کی طرف، تو ایک دوسرے کو قتل کرو، یہ بہتر ہے تمہارے پیدا کرنے والے کے ہاں، تو اس نے توبہ قبول کی تمہاری بیشک وہ توبہ قبول کرنے والا، رحم کر نیوالا ہے۔“

یعنی موسیٰ علیہ السلام نے قوم کو حکم دیا کہ تم نے بچھڑے کی پوجا کر کے اپنی جانوں پر ظلم کیا اب تم اپنے رب کی طرف توبہ کرو اور تمہاری توبہ کی صورت یہ ہے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرو، چنانچہ توبہ کرنے والوں نے اس طرح توبہ کی کہ ہر ایک کے ہاتھ میں ایک تلوار تھی بلا امتیاز ہر ایک نے دوسرے کو قتل کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی ہر قتل ہونے والے نے درجہ شہادت پایا۔

﴿وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ﴾ ”اور یاد کرو جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم کو“ یہاں سے بنی اسرائیل کو ایک اور نعمت یاد دلانی جا رہی ہے۔ بظاہر یہ وہم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا کہ ایک دوسرے کو قتل کریں تو اسے نعمت کیسے کہا جائے؟ علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے وضاحت فرمائی کہ یہ نعمت کیسے ہے۔

”نعمۃ اخرویۃ فی حق المقتولین من بنی اسرائیل حیث نالوا درجۃ

الشہداء کما ان العفو نعمۃ دنیویۃ فی حق الباقین“

وہ بنی اسرائیل جن کو توبہ کرتے ہوئے قتل کیا گیا ان کے لئے یہ اخروی نعمت ہے کیونکہ انہوں نے شہداء کا درجہ حاصل کر لیا۔ جو باقی بچ گئے جن کو موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کی دعاء سے معاف کر دیا گیا ان کے حق میں یہ دنیاوی نعمت تھی۔ کیونکہ اتنے عظیم جرم کو معاف کرنا عظیم نعمت ہے۔ (از روح المعانی)

اور اللہ تعالیٰ نے جب ان کو ان کے عظیم گناہ کی خبر دی کہ تمہارا پچھڑے کی عبادت کرنا بہت بڑا جرم ہے اور پھر ان کو اس جرم سے نکلنے کی راہ بتا کر ان پر بہت بڑا دینی انعام کیا۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان پر دنیاوی نعمتوں کا ذکر کیا تو اس دینی نعمت کا ذکر کرنا بھی بہتر ہے۔ (از کبیر)

عجیب نکتہ:

”ثم ان هذه النعمة وهي كيفية هذه التوبة لما لم يكن وصفها الا بمقدمة

ذكر المعصية كان ذكرها ايضا من تمام النعمة“

جب توبہ کو قبول کرنا نعمت ہو تو معصیت کا ذکر بھی نعمت میں داخل ہے کیونکہ معصیت کے بعد ہی توبہ کرنے کی ضرورت درپیش آئی معصیت نہیں ہوتی تو توبہ کی ضرورت نہ ہوتی۔

(از کبیر)

جب اللہ تعالیٰ نے ان کو توبہ کرنے کے لئے قتل کرنے کا حکم دیا لیکن تمام کے فنا ہو جانے سے پہلے حکم کو اٹھا لیا تو یہ باقی بچ جانے والوں کے لئے بہت بڑی نعمت تھی۔ اور خصوصاً نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے بنی اسرائیل کے حق میں نعمت تھی کیونکہ ان کے آباء کو معاف کر بچا نہ لیا جاتا بلکہ سب کو تباہ کر دیا جاتا تو یہ لوگ کس طرح موجود ہوتے۔ گویا کہ حاضرین کے لئے براہ راست بھی نعمت تھی صرف ان کے آباء پر نعمت کا ذکر نہیں۔ (از کبیر)

نبی کریم ﷺ کی امت پر عظیم احسان:

بنی اسرائیل کی توبہ کو قتل سے مکمل کیا گیا۔ لیکن نبی کریم ﷺ نے اپنی امت کو بتایا کہ تمہیں توبہ کرنے کے لئے ایک دوسرے کو قتل کرنے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ گناہوں سے باز آنے کا عزم کر لو، اسی طرح کافر و تمہاری توبہ یہ ہے کہ تم کفر کو چھوڑ دو، ایمان لے آؤ تو اللہ تعالیٰ تم پر انعام عظیم فرماتے ہوئے

(از کبیر)

تمہاری توبہ کو قبول کرے گا۔

اس واقعہ سے نبی کریم ﷺ کی امت کو توبہ کی رغبت دلائی گئی:

”ان فیہ ترغیبا شدیداً لامة محمد صلوات اللہ وسلامہ علیہ فی التوبۃ“

اس واقعہ سے بہت ہی زیادہ رغبت دلائی گئی ہے امت مصطفیٰ ﷺ کو، اس لئے کہ جب موسیٰ علیہ السلام کی امت نے اتنے مشکل طریقہ سے توبہ کی تو بنی کریم ﷺ کی امت میں ہر شخص کو چاہئے کہ وہ توبہ کرنے میں دیر نہ کرے کیونکہ کتنی آسان راہ ان کو بتائی، کہ گناہوں پر نادم ہو جاؤ، آئندہ گناہ نہ کرنے کا مصمم ارادہ کر لو، گناہ کو چھوڑ دو، نیکی کے کام کرو بس یہی تو کامل ترین توبہ ہے۔ اسی سے ایک اور بہت بڑا فائدہ حاصل ہوا:

”ان ترغیب الانسان فیما هو المصلحة المهمة من اعظم النعم“

کسی انسان کو اہم مصلحت کی رغبت دلانا بھی اس پر بہت بڑا انعام ہے۔ (از کبیر)

﴿يَقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ﴾ یا قوم میں میں کا کسرہ اس پر دلالت کر رہا ہے اس سے یائے متکلم محذوف ہے اصل میں ”یا قومی“ ہے (اے میری قوم) بیشک تم نے ظلم کیا اپنے نفسوں پر۔

﴿بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ﴾ سے اس ظلم کی وجہ بیان کی یہاں پر بھی ایک مفعول محذوف ہے ”الہا“ یعنی تم نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا بسبب اس کے کہ تم نے بچھڑے کو معبود بنا لیا۔

﴿فَتُوبُوا اِلٰی بَارِئِكُمْ﴾ ”تو تم توبہ کرو اپنے پیدا کرنے والے کی طرف“ توبہ کا معنی ہے رجوع کرنا، یعنی تم اپنے باری تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کا پختہ ارادہ کر لو، اس لئے کہ توبہ کی تکمیل تو ان کی قتل سے ہونی ہے، صرف رجوع کرنے سے نہیں ”بارئ“ کا معنی بری کرنے والے جس طرح کہا جاتا ہے ”برئ المریض من مرضہ“ مریض اپنی مرض سے بری ہو گیا۔ اور کہا جاتا ہے ”برئ المدیون من دینہ“ مقروض قرض سے بری ہو گیا۔

اور ”بارئ“ کا معنی پیدا کرنے والا جیسا کہ کہا جاتا ہے ”برا اللہ آدم من الطین“ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو کیچڑ سے پیدا کیا۔ اس مقام پر معنی یہ ہوگا۔

”فاعزموا علی التوبۃ والرجوع الی من خلقکم برینا من التفات

وَمُمِيزًا بَعْضُكُمْ عَنْ بَعْضٍ بِصُورٍ وَهَيْئَاتٍ مُخْتَلِفَةٍ

تم توبہ کرنے کا پختہ ارادہ کرلو، اور رجوع کرو اس ذات کی طرف جس نے تمہیں تفاوت
(ایک دوسرے سے مختلف نمونہ ہونا) سے بری پیدا فرمایا، اور جس نے تمہیں بعض کو
بعض سے صورتوں اور مختلف شکلوں سے تمیز دی۔

یعنی وہ ذات باری ہے جس نے تمام انسانوں کو ایک نمونہ بنایا، البتہ مختلف نقوش وغیرہ کے لحاظ
سے ایک دوسرے سے پہچاننے کے لحاظ پر ممتاز کر دیا۔

﴿فَتُوبُوا إِلَىٰ بَارِئِكُمْ﴾ کہہ کر گویا کہ بنی اسرائیل کو یہ کہا گیا ہے کہ وہ ذات جو عالم وحکیم
ہے جس نے اپنی مہربانی اور حکمت سے تمہیں پیدا فرمایا تم میں کوئی تفاوت نہیں رکھا کہ ایک ہاتھ لمبا بنایا
ہو تو دوسرا چھوٹا، اس قسم کے تفاوت سے تمہیں بری بنایا حق تو یہ تھا کہ تمہیں یہ تصور بھی نہ آتا کہ اس
ذات کو بھی ناراض کرنا ہے لیکن افسوس کہ تم نے پچھڑے کی پوجا کر کے اسے ناراض کر دیا۔

پھر وہ ذات جس نے تمہیں مختلف شکلیں عطاء کر کے ایک دوسرے سے ممتاز کیا، حق تو یہ تھا کہ تم
اس کے شکر گزار ہوتے لیکن تم نے رب تعالیٰ کی عظیم نعمتوں کی ناشکری کی اور رب تعالیٰ سے شریک ٹھہرا
کر کفر کیا لیکن رب تعالیٰ پھر بھی تمہیں موقع عطاء کر رہا ہے کہ تم اس کے حضور جھک جاؤ، رجوع کرو، اس
کے حکم کے مطابق توبہ کرو تو وہ تمہاری توبہ قبول فرمائے گا۔
(از بیضاوی و شیخ زادہ)

اعتراض : توبہ جب ہوتی ہی رب تعالیٰ کی طرف ہے تو صرف ”فتوبوا“ کیوں نہیں کہہ دیا
گیا ”الٰہی باریکم“ کیوں کہا گیا ہے۔

جواب : ”المراد عنه النهی عن الرياء فی التوبة كأنه قال لهم لو اظهرتم التوبة
لا عن القلب فانتم ماتبتم“

مراد یہ ہے کہ ان کو توبہ میں ریاء سے منع کیا گیا ہے گویا کہ ان کو کہا گیا ہے کہ اگر تم نے دل سے
توبہ نہ کی تو تمہاری توبہ حقیقت میں توبہ نہیں ہوگی۔

یعنی تم نے اس ذات کی طرف رجوع نہیں کیا جو تمہارے دلوں میں مخفی رازوں کو جانتا ہے، بلکہ تم
نے لوگوں کے لئے توبہ کی جس کا کوئی فائدہ نہیں:

”فانکم اذا اذنبتم الی اللہ و جب ان تتوبوا الی اللہ“

”بیشک جب تم نے رب تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے گناہ کیا تو توبہ بھی اسی ذات کی طرف کرو“

(از کبیر)

﴿فَاقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ﴾ ان الفاظ مبارکہ کا اگر چہ ظاہری معنی تو یہ ہے ”پس قتل کرو اپنی جانوں کو“ لیکن یہ معنی بالاتفاق مراد نہیں کیونکہ ان کو یہ حکم نہیں دیا گیا کہ تم میں سے ہر شخص اپنے آپ کو قتل کر کے توبہ کرے، بلکہ اس کا معنی یہ معتبر ہے کہ تم میں سے بعض بعض کو قتل کریں، یعنی آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرو۔

ایک دوسرے کو قتل کرنے سے کیا مراد ہے؟

”وقیل امروا ان یقتل بعضهم بعضا“ اور بیان کیا گیا ہے کہ اس سے مراد مطلق ہے یعنی تمام ہی پھڑے کی پوجا کرنے والے تھے، ان کو حکم دیا گیا کہ تم ایک جگہ جمع ہو کر ایک دوسرے کو قتل کرو جب تم نے ایسا کر لیا تو تمہاری توبہ قبول کر لی جائے گی۔ ”وقیل امر من لم یبعد العجل ان یقتل العبدۃ“ اور بعض حضرات نے کہا کہ جن لوگوں نے پھڑے کی پوجا نہیں کی تھی ان کو حکم دیا گیا کہ تم ان لوگوں کو قتل کرو جنہوں نے پھڑے کی پوجا کی۔

ان کے لئے قتل کرنا کیسے ممکن ہوا؟

بنی اسرائیل جب سب ہی حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد تھے ایک دوسرے کے قریبی رشتہ دار تھے تو ان کے لئے یہ بہت مشکل کام تھا کہ ایک دوسرے کو قتل کریں، وہ توبہ کرنے پر آمادہ بھی ہو گئے لیکن ان سے یہ کام کرنا جب مشکل ہوا تو ان کے لئے یہ آسانی پیدا کی گئی:

”فارسل اللہ ضبابۃ وسحابۃ سوداء لایتباصرون فاخذوا یقتلون من الغداة الی العشی حتی دعا موسیٰ وهارون فکشفتم السحابۃ ونزلت التوبۃ وکانت القتلی سبعین الفا“

کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے دھند اور سیاہ بادل چھادئے جن سے اندھیرا چھا گیا وہ ایک دوسرے کو نہیں پہچان سکے تھے اور نہ دیکھ سکتے تھے، انہوں نے صبح سے لے کر شام تک ایک دوسرے کو قتل کیا، موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام نے دعا کی اے اللہ اب ان کو معاف کر دے دعاء کرنے کی وجہ یہی تھی کہ اگر ان پر یہی سلسلہ جاری رہا تو بنی اسرائیل کا نام و نشان ہی دنیا سے ختم ہو جائے گا، اللہ تعالیٰ نے ان کی دعاء کو قبول کیا اور معاف فرما دیا لیکن اس وقت تک ستر ہزار کی تعداد میں یہ لوگ قتل ہو چکے تھے۔

(بیضاوی و شیخ زادہ)

﴿ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ﴾: یہاں سے بیان کرنا یہ مقصود ہے کہ اگر تم نے توبہ کر لی اور ایک دوسرے کو قتل کر دیا تو تمہارے گناہ کو معاف کر دیا جائے اخروی ضرر سے تم بچ جاؤ گے اگرچہ دنیاوی ضرر قتل کی وجہ سے تمہیں حاصل ہونا ہے۔ لیکن اگر تم نے توبہ نہ کی تو دنیاوی ضرر تمہیں نہیں پہنچے گا، لیکن اخروی ضرر میں تم نے مبتلاء ہونا ہے، اس لئے تمہارا توبہ کرنا تمہارے پیدا کرنے والے کے نزدیک تمہارے لئے بہتر ہے۔

”واما الخلاص من العقاب والفوز بالثواب فذاک هو الغرض الاعظم“
یعنی عذاب اخروی سے نجات حاصل کرنا اور ثواب میں کامیابی حاصل کرنا ہی بہت بڑا مقصد ہے۔
(از کبیر)

﴿فَتَابَ عَلَیْكُمْ﴾: یہاں دو احتمال ہیں ایک یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے کلام کی حکایت رب تعالیٰ نے بیان فرمائی اس صورت میں مطلب یہ ہوگا ”فان فعلتم فقد تاب علیکم“ اگر تم نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق توبہ کر لی یعنی ایک دوسرے کو قتل کر دیا تو اللہ تعالیٰ تمہاری توبہ یقیناً قبول فرمائے گا۔

اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ نے خود ہی بنی اسرائیل کو التفات کے طور پر فرمایا ہو جس کا مطلب یہ ہو: ﴿فَفَعَلْتُمْ مَا أَمَرُكُمْ بِهِ مُوسَىٰ فَتَابَ عَلَیْكُمْ بَارِئُكُمْ﴾
”موسیٰ علیہ السلام نے تمہیں جو حکم دیا اس پر تم نے عمل کر لیا اس لئے اللہ تعالیٰ نے تمہاری توبہ کو قبول کر لیا۔“
اعلیٰ حضرت نے یہی ترجمہ کیا ہے اور راقم نے بھی اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو ہی نقل کیا ہے۔ تاہم یہ ترجمہ بھی کیا جاسکتا ہے ”وہ تمہاری توبہ قبول کرے گا۔“

تذہیب: یہ موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کا قانون تھا کہ ایک دوسرے کو قتل کرنے سے توبہ قبول ہوتی تھی صرف زبان سے توبہ نہیں کی جاسکتی تھی۔ اسلئے یہ اعتراض نہیں کیا جاسکے گا کہ مرتد کو توبہ کے بعد قتل کرنے کا کیا مطلب؟ مسئلہ یہ واضح ہے کہ ایک شریعت کے احکام کو دوسری شریعت پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ (ماخوذ از حارون)
﴿إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ﴾: ”ای الرجاء بالمغفرة القابل للتوبة الرحيم بخلقه“
یعنی بیشک، وہ مغفرت سے رجوع کرنیوالا اور توبہ قبول کرنیوالا ہے اور اپنی مخلوق پر رحم کرنیوالا ہے۔ (حارون)

﴿وَإِذْ قُلْتُمْ يٰمُوسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرٰى اللّٰهَ جَهْرَةً
فَاَخَذَتْكُمْ الصّٰاعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝ ثُمَّ بَعَثْنَاكُمْ مِنْ
بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝﴾

(۱) ”اور جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم ہرگز تمہارا یقین نہیں لائیں گے جب تک غلامیہ
خدا کو نہ دیکھ لیں تو تمہیں کڑک نے آلیا اور تم دیکھ رہے تھے، پھر مرے پیچھے ہم
نے تمہیں زندہ کیا کہ کہیں تم احسان مانو“

(۲) ”اور یاد کرو اس وقت کو جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم ہرگز یقین نہیں کریں گے تم پر
یہاں تک کہ ہم دیکھ لیں اللہ کو ظاہر طور پر، تو پالیا تمہیں کڑک نے ایسے حال میں کہ
تم دیکھ رہے تھے، پھر زندہ کیا ہم نے تمہیں تمہاری موت کے بعد تاکہ تم شکر کرو“

اس آیت کریمہ میں بنی اسرائیل کی پشیمانی کے بعد کج روی کا ذکر کیا گیا ہے کہ پچھڑے کی پوجا
کرنے اور موسیٰ علیہ السلام کی سرزنش کے بعد وہ لوگ بہت پشیمان ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ
علیہ السلام کو حکم دیا کہ آپ اپنی قوم کے بہترین متر افراد کو ساتھ لے کر طور پر آجائیں تاکہ وہ تمام قوم کی
طرف سے پچھڑے کی پوجا کے جرم کی معافی طلب کریں، آپ ان کو جب ساتھ لے کر گئے تو انہوں
نے کہا اے موسیٰ اپنے رب سے سوال کرو یہاں تک کہ ہم اس کے کلام کو سنیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے رب
کے حضور عرض کیا تو اسے قبول کر لیا گیا۔

جب آپ کے قریب پہنچے تو ستون کی شکل میں بادل نمودار ہوا جس نے تمام پہاڑ کو اپنی لپیٹ
میں لے لیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام اس بادل کے قریب ہوئے یہاں تک کہ اس میں داخل ہو گئے موسیٰ
علیہ السلام نے جب اپنے رب تعالیٰ سے کلام فرمایا تو آپ کی پیشانی سے ایک نور چمکنے لگا، انسانوں میں
سے کوئی اسے دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔

قوم نے اللہ تعالیٰ کے کلام کو سنا جو اس نے موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا، جب کلام کا سلسلہ ختم ہوا تو بادل کو اٹھالیا گیا، قوم نے کہا:

﴿لَنْ نؤمن لك حتى نرى الله جهرة﴾

ہم ہرگز تم پر ایمان نہیں لائیں گے یہاں تک کہ ہم اللہ کو ظاہر دیکھ لیں۔ تو ان کو بجلی کی کڑک نے اپنی گرفت میں لے لیا اور سب مر گئے۔

موسیٰ علیہ السلام کھڑے ہوئے اور آسمانوں کی طرف ہاتھ اٹھا کر دعاء کرنے لگے اور عرض کیا اے اللہ میں بنی اسرائیل کے ستر آدمیوں کو منتخب کر کے لایا تھا تا کہ ان کی توبہ کے قبول ہونے میں میرے گواہ بنیں۔ اب میں ان کی طرف واپس جاؤں گا تو میرے ساتھ جب کوئی ایک بھی نہیں ہوگا تو وہ میرے متعلق کیا خیال کریں گے۔ موسیٰ علیہ السلام دعاء فرماتے رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی روحوں کو لوٹا دیا۔ خیال رہے کہ موسیٰ علیہ السلام جب توراۃ لینے کے لئے طور پر گئے تو اس وقت ستر آدمیوں کو ساتھ لے کر گئے پھر واپس لوٹے پر قوم کے پچھڑے کی پوجا کرنے کے بعد لے کر گئے۔

(از کبیر ۱ ج ۳ ص ۸۲)

رہا یہ امر کہ بعض آیات قرآنیہ کے ظاہر الفاظ سے مفہوم ہوتا ہے کہ موت کے بعد دنیوی حیات حاصل نہیں ہوتی، ان آیات میں اسی قانون عام اور قدرت الہیہ کا بیان ہے۔ لیکن خرق عادت بھی کتاب و سنت سے ثابت ہے اور بعض امور کا قانون خاص کے تحت ہونا قرآن و حدیث سے واضح ہے اس لئے یہاں کوئی اشکال پیدا نہیں ہوتا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جن لوگوں کی دنیوی مدت عمر، علم الہی میں باقی تھی اور بطور سزائے معصیت یا کسی دوسری حکمت کی وجہ سے ان پر موت طاری کی گئی، ان لوگوں کو مرنے کے بعد دنیا میں دوبارہ زندگی عطا کی جاتی ہے اور جن لوگوں کی دنیوی مدت عمر علم الہی میں پوری ہو چکی ان کو دنیا میں دوبارہ زندگی دی جاتی ہے۔

(از نبیان للکاظمی)

قدرے مزید تفصیل: یہاں سے مراد اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک اور نعمت کی یاد دلائی کہ اے بنی اسرائیل تم رب تعالیٰ کی اس نعمت کو یاد کرو جب تم نے موسیٰ علیہ السلام کو یہ کہا کہ ہم ہرگز تمہاری بات پر یقین نہیں کریں گے جب تک اللہ تعالیٰ کو ظاہر نہ دیکھ لیں تو اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایک کڑک کے ذریعے مار کر پھر زندہ کیا:

”لتتوبوا عن بغیکم وتتخلصوا عن العقاب وتفوزوا بالثواب“

تاکہ تم اپنی سرکشی سے توبہ کر لو اور عذاب سے نجات حاصل کر لو، اور ثواب حاصل کر کے رب تعالیٰ کے حضور کامیابی حاصل کر لو۔

☆ اور ان دونوں آیتوں سے نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے بنی اسرائیل کو ڈرایا بھی گیا کہ تمہارے آباء و اجداد جس قسم کی کج رویوں (سڑھی چالوں) کی وجہ سے ایک مرتبہ کڑک کی وجہ سے مار دیئے گئے اگر تم نے بھی وہی طریقہ اختیار کیا تو رب تعالیٰ کی قدرت سے بعید نہیں کہ تمہیں بھی ذلیل کر دے۔

☆ نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے یہود آپ کی نبوت کا انکار کرتے تھے تو ان کی آباء و اجداد کا ذکر کر کے بتایا کہ جب ان کے آباء و اجداد موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کو ظاہر طور پر دیکھ کر نہ مانے تو ان کی اولاد نے وہی کچھ کرنا ہے جو ان کے اسلاف نے کیا ہے جیسے وہ ذلیل ہوتے رہے ایسے ہی یہ بھی ذلیل ہوتے رہیں گے۔

☆ نبی کریم ﷺ پر یہ واقعہ بیان کر کے آپ کو تسلی دی گئی کہ آپ سے پہلے بھی انبیاء کرام کے معجزات کا انکار کر کے اور ان پر ایمان نہ لا کر ان کو اسی طرح ذہنی تکلیف دیتے رہے جیسے آپ کو دے رہے ہیں لیکن اس کے لئے یہی ضروری ہے:

﴿فاصبر کما صبر اولو الذرہ من الرسل﴾

کہ اے محبوب آپ صبر کریں جیسا کہ دوسرے اصحاب عزم رسولوں نے صبر کیا۔

☆ اس واقعہ سے کفار کے اس اعتراض کو رد کیا جو وہ کرتے تھے کہ اگر محمد ﷺ کی نبوت سچی ہوتی تو اہل کتاب ایمان لے آتے کیونکہ وہ علم والے ہیں۔ ان کو یہ بتایا گیا کہ یہ لوگ نبی کریم ﷺ کی حقانیت کو جاننے کے باوجود انکار کر رہے کیونکہ ان کا خاندانی طریقہ ہی یہی ہے ان کے اسلاف بھی ایسا ہی کرتے رہے جیسا یہ کر رہے ہیں۔

☆ ”لما اخبر محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام عن هذه القصص مع انه كان اميا لم

یشغل بالتعلم البتۃ و جب ان یكون ذلک عن الوحی“

جب نبی کریم ﷺ نے یہ واقعات بیان کر کے باوجود اس کے کہ آپ نے کسی مدرسہ میں کسی

استاذ سے نہیں پڑھا تو اسی سے واضح ہو گیا کہ یہ وحی کے ذریعے ہی آپ کو علم حاصل ہوا ہے۔ (بکیر)

﴿وَإِذْ قُلْتُمْ يٰمُوسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ﴾ ”فمعناه لا نصدقك ولا نعرف بسبوتك“

اس کا معنی یہ ہوا ”اور جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم ہرگز تمہاری تصدیق نہیں کریں گے۔ اور یا ”لن نؤمن لك“ کا یہ معنی ہو ہم ہرگز تمہاری نبوت کا اعتراف نہیں کریں گے۔ (بکیر)

اعتراض: یہ کہنا کیسے صحیح ہے کہ انہوں نے کہا ”ہم ہرگز تم پر ایمان نہیں لائیں گے“

”وقد كان هؤلاء مؤمنين من قبل بموسى عليه السلام“

حالانکہ وہ تو موسیٰ علیہ السلام پر پہلے ہی ایمان رکھتے تھے۔

جواب: ”الا انهم نفروا هذا الايمان المعين والاقرار الخاص، وقيل اراد نفى الكمال اى لا يكمل ايماننا لك، كما قيل فى قوله ﷻ، لا يؤمن احدكم حتى يحب لاجيه المؤمن ما يحب لنفسه“

انہوں نے یہ بات بیان کی نفی نہیں کی تھی، بلکہ طور پر موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے جو کلام فرمایا تھا جسے یہ سن رہے تھے اس کی انہوں نے نفی کی تھی کہ ہم اس پر ایمان نہیں لائیں گے یہاں تک کہ اللہ کو ظاہر دیکھ لیں۔

اسی جواب کے مطابق اعلیٰ حضرت کا ترجمہ بہت خوب ہے جس پر اعتراض وارد ہی نہیں ہوتا ”ہرگز تمہارا یقین نہیں لائیں گے“ یعنی ہم تمہاری بات پر یقین نہیں کریں گے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ کہا ہے۔ بلکہ ہم تو تمہاری بات پر اس وقت یقین کریں گے جب ہم اللہ تعالیٰ کو ظاہر دیکھ لیں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ انہوں نے مطلقاً ایمان کی نفی نہیں کی تھی بلکہ کمال ایمان کی نفی کی تھی۔ یعنی ہم تم پر کامل طور پر ایمان نہیں لائیں گے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کو ظاہر دیکھ لیں۔

کبھی بظاہر ایک چیز کی نفی ہوتی ہے لیکن حقیقت میں اس کے کمال کی نفی ہوتی ہے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی ”لا يؤمن“ کے الفاظ استعمال ہیں، لیکن اس میں بھی کمال کی نفی پائی گئی ہے حدیث کا مطلب یہ ہے ”تم میں سے کوئی ایک کامل مومن نہیں ہو سکتا یہاں تک کہ اپنے مومن بھائی کے لئے وہی چیز پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے“ (ار روح المعانی)

﴿ حَتَّىٰ نَرَىٰ لِلَّهِ جَهْرَةً ۖ ﴾: اصل میں ”جہرۃ“ کا معنی ہے بلند آواز سے پر حنا جیسا کہ کہا جاتا ہے ”جہرت بالقراءة“ میں نے بلند آواز سے قراءت کی۔ جس چیز کا ظاہر طور پر کامل طریقہ سے معاینہ پایا جائے اس پر مجازی طور پر ”جہر“ کا لفظ بولتے ہیں۔

”قال الراغب “الجهر“ يقال لظهور الشئ بافراط حاسة البصر او حاسة السمع“

”علامہ راغب اصفہانی فرماتے ہیں ”جہر“ کا لفظ مشترک ہے یعنی دونوں معنی ہی اس کے حقیقی ہیں۔ خواہ واضح طور پر کسی چیز کو دیکھا جائے، یا واضح طور پر کسی کلام کو سنا جائے“

ان لوگوں نے ”نری“ کے ساتھ ”جہرۃ“ ذکر کر کے اپنی بات کو پختہ طور پر پیش کیا کیونکہ صرف رؤیۃ کا تعلق دل سے بھی ہے اور خواب سے بھی ہے ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ ہم تو اللہ تعالیٰ کو ظاہر آنکھوں سے دیکھنا چاہتے ہیں جب ظاہر آنکھوں سے دیکھ لیں گے تو تمہاری بات پر بھی یقین کر لیں گے۔ ہم دل سے دیکھنے یا خواب سے دیکھنے کا مطالبہ نہیں کر رہے۔

﴿ فَأَخَذَتْكُمُ الصَّعِقَةُ ۖ ﴾: ”تو پالیا تمہیں کڑک نے“ اخذ کا مرچہ معنی ہے ”باتھرتے پکڑنا“ یہاں معنی ہے ”استولت علیکم و احاطت بکم“ تم پر کڑک غالب آگئی کڑک نے تمہارا احاطہ کر لیا ”صاعقہ“ کے تین معنی کئے گئے ہیں۔

(۱) آسمانوں سے آگ آئی جس نے ان کو جلا دیا۔ (۲) آسمانی لشکر آیا جس کی حرکت کو سن کر ہی یہ مر گئے۔ (۳) آسمانوں سے ایک کڑک آئی جس سے یہ مر گئے، اور ایک دن اور ایک رات تک مرے رہے۔

﴿ وَانْتُمْ تَنْظُرُونَ ۖ ﴾: ایسے حال میں کہ تم دیکھ رہے تھے یا تو اس سے مراد یہ ہے کہ ان پر صاعقہ کی وجہ سے جو حالت واقع ہوئی اسے وہ دیکھ رہے تھے۔ اور یہ یہ مراد ہے کہ وہ زندہ ہونے کے بعد اپنے جسموں پر آثار موت دیکھ رہے تھے، اور یہ یہ مراد ہے کہ ان کو زندہ کرتے وقت ان کے اعضا کو متحدہ و متحدہ حیات عطاء کی تو وہ اپنے زخم و زبوں کو دیکھ رہے تھے۔ (روح البقارہ)

اسی سے یہ واضح ہو گیا کہ ”صعق“ کا معنی موت بھی آتا ہے لیکن یہاں یہ معنی نہیں بن سکتا کہ

تم کو موت نے گرفت میں لے لیا ایسے حال میں کہ تم دیکھ رہے تھے۔

﴿ثُمَّ بَعَثْنَاكُمْ مِنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ﴾: ”پھر ہم نے تمہیں زندہ کیا تمہاری موت کے بعد“ یعنی اللہ تعالیٰ کو ظاہر دیکھنے کے تمہارے سوال پر اللہ تعالیٰ نے جو کڑک بھیجی اس کی وجہ سے تم پر موت واقع ہوئی اس موت کے بعد موسیٰ علیہ السلام کی دعاء سے تمہیں زندگی عطا کی۔

خیال رہے ”بعث“ جب موت کے بعد ہو تو اس وقت اس کا معنی ہوتا ہے زندہ کرنا جیسا کہ یہاں واقع ہے اور اگر نیند کے ساتھ متعلق ہو تو اس کا معنی ہوتا ہے بیدار کرنا جیسا کہ اصحاب کہف کے واقعہ میں ”ثم بعثناهم“ مذکور ہے وہاں نیند سے بیدار کرنا معنی مراد لیا گیا ہے۔ اور ”بعث“ کا زیادہ استعمال بھیجنے کے معنی میں ہے جیسا کہ ﴿ربنا وابعث فیہم رسولا﴾ میں اسی معنی میں استعمال ہے۔ (از روح المعانی)

﴿لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ﴾: ”تا کہ تم شکر کرو“ یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہیں موت کے بعد زندگی عطاء کی تا کہ تم اس نعمت کا شکر کرو۔ اسی طرح کفر کے بعد تمہیں صرف کڑک کی وجہ سے موت عطا کی گئی، اخروی عذاب سے تمہیں نجات دی گئی، یہ اللہ تعالیٰ کا تم پر عظیم انعام ہے، یہ عظیم انعام اسی لئے کیا تا کہ تم اللہ تعالیٰ کا شکر کرو۔ (از روح المعانی)

تنبیہ: اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی تفصیلی بحث تو انشاء اللہ سورۃ انعام میں آئی ہے تاہم مختصر مسئلہ سمجھ لیا جائے اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ اللہ تعالیٰ کو دیکھنا جائز ہے یا نہیں، اکثر مبتدع اور معتزلہ اس کے جواز کے قائل نہیں ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ کو دنیا میں دیکھنا ناجائز ہے اور آخرت میں بھی اسے نہیں دیکھا جاسکے گا۔

”واہل السنة والسلف علی جوازہما ووقوعہما فی الآخرة“

اہل سنت وجماعت اور سلف صالحین کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو دنیا میں اور آخرت میں دیکھنا جائز ہے۔ البتہ دنیا میں صرف ممکن کی حد تک ہے اور آخرت میں اس کا وقوع ہوگا یعنی حقیقت میں مومنوں کو رب تعالیٰ کا دیدار حاصل ہوگا۔ (از فرطی)

قابل توجہ: نبی کریم ﷺ معراج کی رات اللہ تعالیٰ کے دیدار سے مشرف ہوئے اس کی تفصیلی

بحث روح المعانی میں سورۃ ”والنجم“ میں دیکھی جائے، راقم نے تو ہنوز آغاز سفر کیا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعاء کا اثر: اس سے واضح ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام کی دعاء سے بنی اسرائیل کو حیات مل گئی۔ جب موسیٰ علیہ السلام کی دعاء سے مردوں کو زندگی مل گئی، تو یہ کیوں نہ ہوتا کہ نبی کریم ﷺ کی دعا اور نگاہ سے مردہ دلوں کو حیات جاودانی نہ ملتی کفر و شرک سے نجات دے کر امت مصطفیٰ ﷺ کو حیات ابدیہ اور سرور سرمدیہ سے سرفراز کیا۔

﴿وَضَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَأَنزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّٰ وَالسَّلْوٰ
كُلُوا مِن طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ط وَمَا ظَلَمُونَا وَلٰكِن كَانُوا
أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ﴾

(۱) ”اور ہم نے ابر کو تمہارا سائبان کیا اور تم پر من اور سلوی اتارا، کھاؤ ہماری دی ہوئی ستھری چیزیں اور انہوں نے کچھ ہمارا نہ بگاڑا، ہاں اپنی جانوں کا بگاڑ کرتے تھے۔“

(۲) ”اور ہم نے سایہ کیا تم پر بادلوں کا اور نازل کیا ہم نے تم پر من اور سلوی، کھاؤ پاکیزہ چیزیں جو ہم نے تمہیں عطا کیں اور انہوں نے نہیں ظلم کیا ہم پر اور لیکن وہ اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے۔“

بنی اسرائیل کا اصل وطن ملک شام تھا، یوسف علیہ السلام کے دور میں یہ لوگ مصر آ کر آباد ہو گئے وہاں ان پر مختلف حالات گزرے، فرعون کی غلامی میں رہنا اور اس کے مظالم کو برداشت کرنے کا دور بھی مصر میں ہی ان پر آیا۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے ان کو نجات دی اور فرعون کو غرق کر دیا، اب بظاہر یہ لوگ پریشانیوں سے نکل کر اطمینان میں آ گئے۔ اس دوران ملک شام پر قوم عمالقہ قابض ہو چکی تھی اور انہوں نے وہاں اپنا تسلط قائم کر لیا تھا۔

فرعون کے غرق ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو حکم دیا کہ تم اپنا وطن بنی عمالقہ سے آزاد کراؤ، اور وہاں جا کر مقیم ہو جاؤ، لیکن جب ان کو پتہ چلا کہ بنی عمالقہ تو بہت بڑے جسیم اور طاقتور لوگ ہیں تو انہوں نے ان سے جنگ کرنے اور اپنے وطن کو آزاد کرانے سے انکار کر دیا بلکہ موسیٰ علیہ السلام کو یہ لوگ کہنے لگے۔

﴿ فاذهب است وربک فقاتلا انا ههنا قاعدون ﴾

تم جاؤ اور تمہارا خدا جائے تم ان سے قتال کرو ہم تو یہاں ہی بیٹھتے ہیں۔

جب وہ عمالہ قوم کی طاقت کا حال سن کر ڈر گئے اور جہاد سے منہ موڑ کر واپس لوٹ آئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اس جرم کی سزایوں دی کہ وہ اپنے گھروں تک واپس نہ پہنچ سکے اور چالیس برس تک وادی تہ میں حیران و پریشان گھومتے رہے۔

تہ مصر اور شام کے درمیان ایک وسیع اور کھلا میدان تھا تہ کے معنی ہیں حیرانی و پریشانی کے ہیں بنی اسرائیل اس میدان میں چالیس سال تک انتہائی حیرانی اور پریشانی کے عالم میں سرگرداں رہے اسی لئے اسے وادی تہ کہا جاتا ہے۔ بنی اسرائیل اپنے گھروں تک جانے کی فکر میں دن بھر سفر کرتے رات بسر کرنے کے بعد صبح اپنے آپ کو وہیں پاتے جہاں سے گزشتہ صبح انہوں نے سفر کو شروع کیا ہوتا۔

(ارشیع زادہ و فرطی)

بنی اسرائیل سرکشی کے باوجود انعامات:

یہی آیت کریمہ جس کی وضاحت کی جا رہی ہے اس میں ان نعمتوں کا ذکر ہے جن کا تعلق میدان تہ سے ہے۔ حالانکہ میدان تہ میں ان کو حیران و پریشان کرنے کی وجہ ان کی سرکشی تھی۔ اس وادی میں نہ کوئی سایہ دار درخت تھا اور نہ ہی کوئی مکان، نہ پینے کے لئے پانی تھا اور نہ کھانے کے لئے کوئی چیز وہاں موجود تھی، روشنی وہاں نہیں تھی، اور ضروریات زندگی وہاں حاصل نہیں تھے۔

اس بے سروسامانی اور غریب الوطنی کے حال میں موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے ان کو سب سامان مہیا کر دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے دھوپ سے بچاؤ اور سایہ کے حصول کیلئے بادل بطور سائبان نازل فرما دیا۔ کھانے کیلئے من اور سلوی بھیج دیا، تاریکی دور کرنے کے لئے عمودی شکل میں ایک روشنی ظاہر ہو جاتی تھی۔ لباس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی اعجازی شان اس طرح ظاہر فرمائی کہ نہ ان لوگوں کے سرے میلے نہ راتے اور نہ ہی پھٹتے اور انکے بچوں کے جسم کے ساتھ بچوں کا لباس بھی بڑھتا رہتا۔ موسیٰ علیہ السلام کا پتھر سے پانی نکالنے والا معجزہ بھی اسی میدان میں ظاہر ہوا۔ جس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

(ارشیع زادہ و فرطی)

﴿ وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ ﴾ : ” سخر الله لهم السحاب يظلهم من الشمس حين

كانوا في التية “ (بصاری)

اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے بادل کو مسخر فرمایا جو ان کو سورج کی دھوپ سے بچانے کیلئے سایہ کرنا تھا۔ جب کہ وہ تہ میں تھے راقم نے اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے ” اور ہم نے سایہ کیا تم پر بادلوں کا “ ” ای جعلناہ علیکم کالظلة “ (قرطبی) اعلیٰ حضرت کا ترجمہ قرطبی کے ان الفاظ کا ہی بعینہ ہے ” اور ہم نے ابر (بادل) کو تمہارا سایہ بنایا کیا “

(الغمام) جمع ہے غمامۃ کی۔ جس طرح سحابۃ کی جمع سحاب ہے ہر چیز جو ڈھانپ دینے والی ہو اس پر ” غم “ کا اطلاق ہوتا ہے بادلوں کو غمام کہا گیا ہے کہ وہ آسمانوں کو ڈھانپ لیتے ہیں۔ ” کسل مغطی فهو مغموم “ ہر ڈھانپی ہوئی چیز کو ” مغموم “ کہا جاتا ہے پھر جو شخص غم اور پریشانی میں ہو اسے بھی مغموم کہا جاتا ہے کیونکہ اس کی عقل پر پردہ چھا جاتا ہے۔ ” غم الھلال “ کہا جاتا ہے کہ چاند کو بادل نے ڈھانپ لیا، خیال رہے کہ غمین اور غمیم دونوں کا معنی بادل اور گرد و غبار آتا ہے۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے ” انہ لیغان قلبی “ میرے دل پر جب دنیاوی مشاغل کی وجہ سے رب تعالیٰ کی طرف اتنے لمحات کے لئے توجہ میں کمی کی وجہ سے پردہ آ جاتا ہے تو میں رب تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

علامہ سعدی رحمہ اللہ نے بیان کیا کہ ان پردن کو سفید بلکے بادل چھا جاتے جو دھوپ سے ان کو بچاتے، لیکن رات کو بادل چھٹ جاتے، چاند کی روشنی سے کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی تھی۔ (از قرطبی)

﴿ وَانزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوَى ﴾ : ” اور نازل کیا (اتارا) ہم نے تم پر من اور سلوی “

من کیا چیز ہے؟ اگرچہ اس میں مختلف قول ہیں صحیح قول یہی ہے کہ من سے مراد ترنجبین ہے جو ایک نفیس شیریں ذائقہ دار مادہ تھا جو شبنم کی طرح صبح کے وقت آسمان سے اترتا اور کتبہ مقدسہ میں پڑے چھوٹے درختوں پر منجمد ہو جاتا تھا:

” فلما اكلوا اكله سمنوا من اكله فقالوا لموسى عليه السلام قتلنا هذا المن بحلاوته “

جب وہ کثیر مقدار میں من کھا کھا کر موٹے ہو گئے تو کہنے لگے اے موسیٰ اس من کی منہاس نے تو ہمیں مار کر رکھا دیا ہے موسیٰ علیہ السلام نے رب کے حضور دعاء کی تو رب تعالیٰ نے ان پر سلوی نازل فرمایا۔

سلوی کیا ہے: سلوی کے بارے میں بھی متعدد اقوال ہیں۔ صحیح یہی ہے کہ وہ بٹیر تھا، بعض نے کہا وہ بھنا ہوا اترتا تھا اور بعض کا قول ہے کہ بکثرت زندہ پرندے ان کے پاس جمع ہو جاتے تھے وہ انہیں زندہ پکڑ لیتے اور زنج کرتے تھے۔ الغرض من اور سلوی ان کی میٹھی اور نمکین غذائیں تھیں جنہیں وہ پیٹ بھر کر کھاتے تھے۔ من کو روٹی کے طور پر کھاتے تھے اور سلوی کو سالن کے طور پر کھاتے تھے یہ ان پر کتنا بڑا انعام تھا کہ بغیر مشقت انہیں یہ انعامات میسر تھے۔

ایک حدیث کا مطلب: سعید بن زید بن عمرو بن فضیل فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

الکماء من المن الذى انزل الله على بنى اسرائيل وماؤها شفاء للعين ،

وفى رواية من المن الذى انزل الله على موسى رواه مسلم “

کماء اس من سے ہے جو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر نازل فرمایا اس کا پانی آنکھوں کے لئے شفا ہے اور ایک روایت میں ہے کہ اس من سے ہے جو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر نازل فرمایا (مطلب دونوں روایات کا ایک ہی ہے)

کماء کیا ہے؟ یہ پودا بہار کے موسم میں زمین کے نیچے پایا جاتا ہے یہ اروی کی طرح گول جڑ ہوتی ہے جس کا نہ تنا ہوتا ہے نہ رلیں اس کا رنگ ٹیالا ہوتا ہے (المنجد) تاہم بعض مترجمین نے اس کا معنی گھسی بھی کیا ہے۔

کماء کو من کہنے کی وجہ: اس میں دو قول پائے جاتے ہیں ایک ان میں سے یہ ہے:

” الکماء مما انزل الله على بنى اسرائيل اى مما خلقه الله لهم فى التيه “

کماء کو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے تہ کے میدان میں پیدا کیا۔

دوسرا قول زیادہ معتبر ہے وہ یہ ہے:

” قال ابو عبيد انما شبهها بالمن لانه لا مؤنة فيها ببذر ولا سقى ولا علاج “

ابو عبید رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ کماۃ کو من سے تشبیہ دی گئی ہے یعنی حقیقی طور پر اس کا من ہونا معتبر نہیں بلکہ مجازی طور پر من کے اس طرح مشابہ ہے کہ من بھی قدرتی طور پر بغیر محنت اور مشقت کے حاصل ہوا، اور کماۃ بھی بغیر بیج اور بغیر پانی لگانے اور بغیر کاشت کرنے وغیرہ کی مشقت کے حاصل ہوتی ہے۔

کماۃ کا پانی آنکھوں کے لئے شفاء ہے بعض اہل علم نے بیان فرمایا کہ اس کے پانی میں برودت (ٹھنڈک) کی تاثیر ہے۔ اس لئے اگر اسے استعمال کیا جائے جب کہ آنکھوں، حرارت (گرمی) کی وجہ سے خراب ہوں تو آنکھوں کو شفا حاصل ہوگی۔ البتہ مختلف اوقات میں دواؤں کے ساتھ استعمال آنکھوں کے لئے نفع مند ہے۔

”وذهب ابو هريرة   الى استعمالها بحتا في جميع مرض العين“
اور حضرت ابو ہریرہ   کا یہ موقف تھا کہ کماۃ کا پانی ہر حال میں بغیر کسی دواء کے ملانے کے آنکھ کی تمام مرضوں سے شفا دیتا ہے۔
(از قرطبی)

اصل میں یہ عشق و محبت کی بات ہے کیونکہ حضرت ابو ہریرہ   نے سوچا کہ نبی کریم   نے تو مطلقاً ”ماء ہا“ (اسی کا پانی) فرمایا ہے کہ اس کا پانی آنکھوں کے لئے شفاء ہے آپ نے تو یہ نہیں بیان فرمایا کہ اس کے پانی کے ساتھ دواء بھی ملانا آپ نے تو یہ نہیں بیان فرمایا کہ اس کا پانی بعض مرضوں کیلئے شفا ہے تو ہم کون ہوتے ہیں کہ اس کی قسمیں بناتے پھریں۔ راقم کا موقف بھی یہی ہے۔

بنی اسرائیل کی ذخیرہ اندوزی:

”روى انه كان ينزل عليهم من طلوع الفجر الى طلوع الشمس كالثلج ، فيأخذ الرجل ما يكفيه ليومه ، فان ادخر منه شيأ فسد عليه الا في يوم الجمعة فانهم كانوا يدخرون ليوم السبت فلا يفسد عليهم لان يوم السبت يوم عبادة وما كان ينزل عليهم يوم السبت شئ“
روایت کیا گیا ہے کہ ان پر من طلوع فجر (صبح صادق) سے لے کر طلوع شمس (سورج نکلنے) تک برف کی طرح نازل ہوتا، ہر شخص کو اتنا حاصل ہو جاتا جو تمام دن کے لئے کافی ہوتا، ان کو جمع کرنے کی اجازت نہیں تھی، اگر کوئی جمع کر لیتا تو وہ من بد بودار ہو جاتا، ہاں البتہ ہفتہ کا دن ان کی عبادت کا دن تھا، اس دن من نہیں نازل ہوتا تھا البتہ

جمعہ کے دن زیادہ نازل ہو جاتا تھا، اور ان کو اجازت تھی کہ وہ جمعہ کے دن اتنا جمع کر لیں جو ان کو ہفتہ کے دن بھی کافی ہو سکے۔
(از قرطبی)

رب تعالیٰ کی طرف سے گویا کہ ان کو حکم تھا:

”ولا تدخروا الغد فخالقوا وادخروا قدود وفسد فقطع الله عنهم“ (حازن)

کل کے لئے ذخیرہ بنا کر نہ رکھو، لیکن انہوں نے رب تعالیٰ کے اس حکم کی مخالفت کی اور دوسرے دن کے لئے ذخیرہ بنایا تو اس کھانے میں کیڑے پڑ گئے اور بدبودار ہو گیا اور ذخیرہ اندوزی کرنیوالوں سے وہ کھانا روک لیا گیا۔

☆ ”عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ لو لا بنی اسرائیل لم یخنت الطعام اللحم ولو لا حواء لم تخن انشی زوجها الدھر روای البخاری ومسلم قوله لم یختر اللحم یستن ولم یتغیر“ (حازن)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر بنی اسرائیل طعام میں خیانت نہ کرتے تو گوشت کبھی بھی بدبودار نہ ہوتا، اور حضرت حواء اگر خیانت (حضرت آدم علیہ السلام کو دانہ کھلانے کی) نہ کرتیں تو کبھی بھی کوئی عورت اپنے خاوند کی خیانت نہ کرتی۔ بنی اسرائیل نے من اور سلویٰ کو جب سے جمع کرنا شروع کیا اور اللہ تعالیٰ کی حکم عدولی کی اس وقت سے گوشت خراب ہونا اور بدبودار ہونا شروع ہوا اور نہ پہلے گوشت کتنے دن بھی پڑا رہے کبھی خراب نہیں ہوتا تھا۔
(از حازن)

ذخیرہ اندوزی کی مذمت احادیث سے:

”عن معمر قال قال رسول اللہ ﷺ من احتکر فهو خاطی“

(رواہ مسلم، مشکوٰۃ باب الاحتکار)

حضرت معمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے ذخیرہ اندوزی کی وہ گنہگار ہوا۔

تنبیہ: یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ذخیرہ اندوزی کیا ہے اور کس چیز میں ہے اور کس حال میں منع ہے۔

”الاحتکار المحرم هو فی الاقوات خاصة بان یشتري الطعام فی

وقت الغلاء ولا يبيعه في الحال بل يدخره ليغلو فاما اذا جاء قربة او اشتراه في وقت الرخص وادخره وباعه في وقت الغلاء فليس باحتكار ولا تحريم فيه واما غير الاقوات فلا يحرم الاحتكار فيه بكل

حال طیبی“ (حاشیہ مشکوٰۃ)

ذخیرہ اندوزی کا تعلق صرف انسانوں کی روزی (اور جانوروں کے چارہ وغیرہ سے ہے) جب انسانوں کو طعام وغیرہ کی ضرورت ہو اور جانوروں کے چارہ کی ضرورت ہو طعام اور چارہ وغیرہ کم ہونے کے وجہ سے مہنگے ہو رہے ہوں اس وقت ان چیزوں کو خرید کر جمع کر لینا اور مہنگا ہونے کی انتظار کرنا، لوگ مصیبت میں اپنا وقت گزار رہے ہوں، یہ ذخیرہ اندوزی حرام ہے۔

اگر کسی آدمی نے دیہات سے سستا غلہ خریدا یا شہر سے ہی خریدا یا اس وقت اس کی قیمت کم تھی۔ اس نے وہ غلہ رکھ لیا کہ ابھی کچھ دنوں کے بعد ان چیزوں کی قیمتیں بڑھیں گی، لوگوں کو ان چیزوں کی کمی نہیں وافر مقدار میں مل رہی ہیں، یہ ذخیرہ اندوزی جائز ہے اس میں لوگوں کو مصیبت میں نہیں ڈالا گیا انسانوں یا جانوروں کی روزی کے بغیر باقی چیزوں کی ذخیرہ اندوزی ہر حال میں جائز ہے چونکہ ان چیزوں کے بغیر بھی انسان یا جانور زندہ رہ سکتے ہیں۔

اور یہ بھی خیال رہے کہ اپنی زمین کی پیداوار خواہ اپنی ضرورت سے وافر مقدار میں ہی کیوں نہ ہو اسے جمع کر کے رکھ لینا نہ بیچنا کوئی گناہ نہیں۔ ہاں ضرورت مندوں پر بیچنا، مہنگے ہونے کی انتظار نہ کرنا ثواب ہے لوگوں پر مہربانی ہے اصل میں کسی پر مہربانی کرنا ہی رب تعالیٰ کی مہربانی کا ذریعہ ہے۔

☆ ”عن عمر النبی ﷺ قال الجالب مرزوق والمحتکر ملعون“

(رواہ ابن ماجہ والدارمی مشکوٰۃ باب الاحتکار)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا طعام وغیرہ باہر سے لے کر مناسب قیمت سے بیچنے والے کو رزق دیا جاتا ہے اور ذخیرہ اندوز لعنت کا مستحق ہوتا ہے۔

جالب ضد ہے محتکر کی، یعنی لوگوں کو جب ضرورت ہو غلہ کی اور جانوروں کے چارہ کی تو وہ تاجر جو حاجت مندوں کی ضرورت کو دیکھ کر دیہاتوں اور دوسرے شہروں سے یہ اشیا، خرید کر لانے بہت مناسب نفع لے، لوگوں کی ضرورت سے ناجائز فائدہ نہ اٹھائے بہت مہنگا سودا نہ بیچے بلکہ مناسب قیمت

لے تو اسکے رزق میں برکت ہوگی رب تعالیٰ کی اس پر رحمت ہوگی لوگوں کی دعائیں اسکے ساتھ ہوں گی۔
ذخیرہ اندوز لوگوں کو تکلیف پہنچانے والا، اپنے مال سے ناجائز فائدہ اٹھانے والا، لوگوں کی
ضرورت کو دیکھ کر ان کو اور زیادہ ستانے والا لوگوں کو دعاء سے محروم ہو جاتا ہے رب کی رحمت سے دور ہوتا
ہے اس کے رزق میں بے برکتی آ جاتی ہے۔

☆ ”و عن انس قال غلا السعر على عهد النبي ﷺ فقالوا يا رسول الله سعر لنا فقال
النبي ﷺ ان الله هو المسعر القابض الباسط الرزاق واني لارجو ان القى ربي وليس احد
منكم يطلبني بمظلة بدم ولا مال“ (رواه الترمذی وابن ماجه وابو داؤد والدارمی، مشکوٰۃ باب الاحتكا)
حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ایک مرتبہ چیزیں مہنگی ہو گئیں صحابہ
کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ ہمارے لئے چیزوں کا بھاؤ مقرر فرمادیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا بیشک
اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے بھاؤ مقرر کرنا۔ رزق کو تنگ کرنے والا اور رزق کو کشادہ کرنے والا
وہی ہے، رزق دینے والا وہی ہے، بیشک میں امید کرتا ہوں کہ میری ملاقات جب میرے رب سے ہو
گی تو تم میں سے کوئی ایک بھی مجھ سے ظلم کا مطالبہ نہیں کرے گا کہ میں نے کسی کا ناحق خون بہا کر ظلم کیا
ہو یا کسی کے مال کو نقصان پہنچا کر ظلم کیا ہوا، کہ قیامت کے دن لوگ رب تعالیٰ کو یہ کہہ رہے ہوں کہ ہمیں
اس ظلم کا بدلہ دلا یا جائے۔

”وجه النهی بالتسعير لان التصرف في اموال الناس بغير اذنهم فيكون
ظلمًا وربما يؤدي الى القحط والمراد انه لا يكلف الناس بالتسعير
ولكن يؤمرون بالانصاف والشفقة على الخلق والنصيحة لهم“ (لمعات)
گویا کہ بھاؤ مقرر کرنے سے نبی کریم ﷺ نے لوگوں کو منع کیا ہے خود بھی بھاؤ مقرر نہیں
کیا۔ اسلئے کہ لوگوں کے مالوں میں ان کی اجازت کے بغیر تصرف کرنا ظلم ہے
بسا اوقات یہ قحط تک پہنچاتا ہے۔ مراد اس سے یہی ہے کہ خود (حاکم) بھاؤ مقرر کر کے
لوگوں پر ظلم نہ کریں کیونکہ ان کو بھاؤ مقرر کرنے کا مکلف ہی نہیں بنایا گیا ہاں البتہ لوگوں
کو انصاف کرنے کا حکم دیا جائے اور مخلوق پر شفقت کی جائے اور ان کو نصیحت کی جائے
” (قوله انی لارجو) فيه اشارة الى المانع من التسعير مخافة ان يظلم
في اموالهم“

نبی کریم ﷺ نے خود بھاؤ اسی لئے مقرر نہیں فرمایا کہ کہیں لوگوں کے مالوں میں ناجائز

تنبیہ: پہلے یہ بحث تفصیلی طور پر بیان ہو چکی ہے کہ انبیاء کرام صغیرہ اور کبیرہ گناہوں سے پاک ہیں اسلئے نبی کریم ﷺ کا بھاؤ مقرر نہ کرنا تعلیم امت کے لئے تھا ورنہ آپ سے ظلم ہونا یہ ممکن ہی نہیں۔ بلکہ یوں سمجھیں کہ آپ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ میں بھاؤ اس لئے مقرر نہیں کرتا کہ آج اگر میں نے بھاؤ مقرر کر دیا تو میری امت کے حکام بھی بھاؤ مقرر کریں گے، ان پر مجھے یہ خوف ہے کہ کہیں وہ لوگوں کے مالوں پر ظلم کر کے اپنی عاقبت برباد نہ کر دیں۔

ضمنائے بھی سمجھا دیا کہ اے میری امت لوگوں کے ناحق خون بہا کر اپنے آپ کو جہنم کے عذاب کا مستحق نہ بنانا۔

☆ "عن عمر بن الخطاب قال سمعت رسول الله ﷺ يقول من احتكر على المسلمين طعامهم ضربه الله بالجذام والافلاس"

(رواہ ابن ماجہ والبیہقی فی شعب الایمان وروزین فی کتابہ مشکوٰۃ باب الاحتکار)

حضرت عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا "جو شخص مسلمانوں کے طعام کو ذخیرہ اندوزی کرے گا، اللہ تعالیٰ اس پر کوڑھ اور غربت کو مسلط کرے گا۔ یعنی مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو بدن اور مال کو آزمائش میں مبتلا کرے گا برکت اور خیران سے اٹھ جائیگی۔

☆ "وعن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ من احتكر طعاما اربعين يوما يريده الغلاء فقد برئ من الله وبرئ الله منه"

(رواہ روزین، مشکوٰۃ باب الاحتکار)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ جس شخص نے چالیس دن تک طعام کو روک رکھا اور مہنگا ہونے کا ارادہ کرتا رہا تو وہ اللہ تعالیٰ سے دور ہو گیا۔ اور اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے لحاظ سے اس سے دور ہو گیا۔ یعنی اس شخص نے رب تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کر کے اس کے وعدہ کو توڑ دیا رب تعالیٰ نے بھی اسے جو اپنی امان اور حفاظت کا وعدہ کر رکھا تھا وہ بھی اس شخص نے ختم کرنے کا خود ہی سبب بنالیا۔

☆ "وعن ابی امامۃ ان رسول الله ﷺ قال من احتكر طعاما اربعين يوما"

ثم تصدق به لم يكن له كفارة" (رواہ روزین، مشکوٰۃ کتاب الاحتکار)

حضرت ابو امامہ ؓ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے چالیس دنوں تک طعام کو روک کر رکھا پھر صدقہ (بھی) کرے تو اس کا کفارہ نہیں بن سکتا۔

☆ ”وعن معاذ قال سمعت رسول الله ﷺ يقول بشئس العبد المحتكر ان ارخص الله الاسعار حزن وان اغلاها فرح“

(رواه البيهقي في شعب الایمان ورزین فی کتابہ ، مشکوٰۃ باب الاحتکار)

حضرت معاذ ؓ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ وہ شخص بہت برا ہے جو شخص طعام کو روک کر رکھے جب اللہ تعالیٰ بھاؤ ستے کر دے تو وہ غمناک ہو جائے اور اگر مہنگا کر دے تو وہ خوش ہو جائے۔

﴿كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ﴾ : ”کھاؤ پاکیزہ چیزیں جو ہم نے تمہیں عطا کیں“
یعنی پاکیزہ اور لذت دار من اور سلوی کھاؤ، لیکن ذخیرہ نہ بنانا، اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی تبدیلی نہ طلب کرنا، کیونکہ یہ شکر کے مخالف ہے۔

﴿وَمَا ظَلَمُونَا﴾ : انہوں نے ناشکری کی، ذخیرہ اندوزی کی، اور من و سلوی کے تبدیل کرنے کا مطالبہ کیا ان نافرمانیوں کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کے انعام سے محروم ہو گئے، حالانکہ ان پر جو فیضان تھا اس میں ان کو کوئی مشقت نہیں اٹھانی پڑتی تھی اور نہ ہی اس کھانے کا ان سے کوئی حساب لیا جاتا لیکن انہوں نے ناشکری سے اپنے آپ کو اس نعمت سے محروم کر دیا تو رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَمَا ظَلَمُونَا وَلَكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ﴾
اور انہوں نے نہیں ظلم کیا ہم پر، لیکن وہ اپنی جانوں پر ہی ظلم کرتے تھے۔ (از تبصیر الرحمن)

نبی کریم ﷺ کے معجزات کی ایک جھلک:

”عن جابر ان ام مالک كانت تهدي للنبي ﷺ في عكة لها سمنا فياتها بنوها فيسالون الادم وليس عندهم شئ فتعمد الى الذي كانت تهدي فيه للنبي ﷺ فتجد فيه سمنا فما زال يقيم لها ادم بيتها حتى عصرته فانت النبي ﷺ فقال عصرتيها فقالت نعم قال لو تركتها ما زال قائما“
(مسلم ج ۲ ص ۲۵۳ باب فی معجزات النبی ﷺ)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ام مالک رضی اللہ عنہا نبی کریم ﷺ کو چمڑے کے ایک برتن (کپے) میں گھی بطور ہدیہ دیا کرتی تھیں ان کے بیٹے جب ان کے پاس آ کر مطالبہ کرتے کہ کوئی چیز دیں جس سے روٹی کھائیں اور کوئی چیز نہیں ہوتی تھی تو وہ اس برتن کے پاس آتیں جس میں نبی کریم ﷺ کو گھی ہدیہ دیتی تھیں، اس برتن میں ان کو گھی میسر ہوتا تھا۔ وہی اپنے بچوں کو دیتی تھیں جس سے ملا کر وہ روٹی کھا لیتے تھے یہ سلسلہ کافی دیر تک رہا، ایک مرتبہ انہوں نے برتن کو نچوڑ لیا تو وہ گھی حاصل ہونا بھی ختم ہو گیا۔ وہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو آپ نے فرمایا کیا تم نے اس برتن کو نچوڑ لیا تھا انہوں نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہ تو آپ نے فرمایا اگر تم اسے اسی طرح چھوڑتی (یعنی نہ نچوڑتی) تو ہمیشہ (تمہیں گھی میسر ہونے کا سلسلہ) قائم رہتا۔

☆ "عن جابر ان رجلاً اتى النبی ﷺ يستطعمه فاطعمه شطر وسق شعير فما زال الرجل ياكل منه وامراته وضيئفهما حتى كاله فاتی النبی ﷺ فقال لو لم تكله لا کلتم منه ولقام لکم"

(مسلم شریف ج ۲ ص ۲۵۴ باب المعمرات)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے طعام طلب کیا تو نبی کریم ﷺ نے انہیں نصف وسق (ایک سو بیس کلو تقریباً) جو دیئے۔ وہ شخص اور ان کی زوجہ اور ان دونوں کے مہمان کھاتے رہے، یہاں تک کہ ایک دن انہوں نے ان کو کیل کر لیا (ماپ لیا) وہ صحابی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا اگر تم ان کا (جو کے دانوں کا) کیل نہ کرتے تو وہ ہمیشہ کے لئے قائم رہتے تم کھاتے رہتے (وہ کبھی ختم نہ ہوتے)۔

ان دونوں حدیثوں کے متعلق علامہ نووی رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں:

"ان عصرها وکیلہ مضاد للتسلیم والتوکل علی رزق اللہ تعالیٰ ویتضمن التدبیر والاخذ بالحوال والقوة وتکلف الا حاطة باسرار حکم اللہ تعالیٰ وفضلہ فعوقب فاعله بزواله"

(نووی)

اس عورت کے برتن کو نچوڑنے اور اس شخص کے کیل کرنے سے رب تعالیٰ کے رزق عطا کرنے پر توکل اور تسلیم اٹھ گئے، اپنی تدبیر کو درمیان میں دخل انداز کر دیا گیا تمام امور کو رب تعالیٰ کی طرف سپرد کرنا تھا کہ اسی کی عطا کردہ قوت سے کسی چیز کا حصول ہوتا ہے اور وہی کسی چیز کو دور کرے تو وہ چیز دور ہوتی ہے، لیکن انسان جب اپنے آپ

پر بھروسہ کرے اور یہ کوشش کرے کہ میں اللہ تعالیٰ کے لہل اور اس کے علم کے اسرار کا احاطہ کر سکتا ہوں تو اس شخص کو بطور سزا اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے محروم کر دیتا ہے۔

☆ "عن جابر قال انا يوم الخندق نحضر فعرضت كدية شديدة فجاؤا النبي ﷺ فقالوا هذه كدية عرضت في الخندق فقال انا نازل ثم قام وبطنه معصوب بحجر ولبشنا ثلاثة ايام لا نذوق ذواقا فاخذ النبي ﷺ المعول فضرب كثيبا اهيل فانكفات الى امرأتى فقلت هل عندك شئ فاني رأيت بالنبي ﷺ خمصا شديدا فاخرجت جرابا فيه صاع من شعير ولنا بهمة داجن فذبحتنا وطحننا الشعير حتى جعلنا اللحم في البرمة ثم جئت النبي ﷺ فساررتة فقلت يا رسول الله ذبحنا بهيمة لنا وطحننا صاعا من شعير فتعال انت ونفر معك فصاح النبي ﷺ يا اهل الخندق ان جابرا صنع سورا فحى هلابكم فقال رسول الله ﷺ لا تنزلن برمتك ولا تخزن عجينكم حتى اجنى وجاء فاخرجت له عجينا فبصق فيه وبارك ثم عمد الى برمتنا فبصق وبارك ثم قال ادعى خابزة فلتخبز معك واقدحى من برمتكم ولا تنزلوها وهم الف فاقسم بالله لا كلوا حتى تركوه وانحرفوا وان برمتنا لتغلط كما هي وان عجينا ليتخبز كما هو"

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہم غزوہ خندق کی کھدائی کر رہے تھے ایک شدید چٹان آگئی (جس میں کوئی کدال وغیرہ اثر نہیں کر رہی تھیں) صحابہ کرام نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو خندق میں آنے والی چٹان کا ذکر فرمایا آپ نے فرمایا میں خود اس خندق میں اترتا ہوں۔ آپ جب خندق میں اتر کر کھڑے ہوئے تو آپ کے پیٹ پر پتھر باندھا ہوا تھا، (حضرت جابر کہتے ہیں) ہم نے بھی تین دنوں سے کچھ نہیں کھایا تھا، نبی کریم ﷺ نے کدال کو لیا اور اس چٹان پر مارا، ایک ہی ضرب سے وہ چٹان (سخت پتھر) ریت کی طرح ریزہ ریزہ ہو کر ٹوٹ گیا۔ میں اپنے گھراپنی زوجہ کے پاس آیا، میں نے کہا تمہارے پاس کوئی چیز ہے؟ میں نے نبی کریم ﷺ کو بہت بھوک میں مبتلا دیکھا۔ تو میری زوجہ نے ایک تھیلا نکالا جس میں ایک صاع (چار کلو) جو کے دانے تھے۔ اور ہمارا ایک بکری کا بچہ تھا (جو چھ ماہ سے کم عمر کا تھا) میں نے بکری کے بچے کو ذبح کیا اور میری زوجہ نے جو کا آٹا بنایا۔ یہاں تک کہ ہم نے گوشت کو ہنڈیا میں ڈالا، پھر میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا میں نے آپ سے آہستہ کان میں عرض کیا یا رسول اللہ ہم نے بکری کا ایک بچہ ذبح کیا اور ایک صاع جو کا آٹا تیار کیا آپ بھی آجائیں اور آپ کے ساتھ کچھ اور حضرات بھی (جن کو یہ کھانا پورا ہو سکے) نبی کریم ﷺ نے بلند آواز سے اعلان

فرمایا، اے اہل خندق بیشک جابر نے دعوت کی ہے سب جلدی چلو۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اپنی ہنڈیا کو چولہے سے نہ اتارنا اور اپنے آٹے سے روٹیاں نہ پکانا یہاں تک کہ میں آ جاؤں نبی کریم ﷺ تشریف لے آئے میں نے آپ کے پاس آٹا پیش کیا آپ نے اس میں لعاب ڈالا اور برکت کی دعا کی۔ پھر آپ ہنڈیا کے پاس آئے اس میں لعاب ڈالا اور برکت کی دعا کی۔ پھر آپ نے حضرت جابر کی زوجہ کو فرمایا روٹی پکانے والی کوئی اور بھی بلا لو جو تمہارے ساتھ مل کر روٹی پکائے اور ہنڈیا سے گوشت پیالوں میں ڈالو، لیکن ہنڈیا کو نہ اتارو۔ صحابہ کرام ایک ہزار کی تعداد میں تھے، قسم ہے اللہ تعالیٰ کی تمام سیر ہو کر کھا کر چلے گئے کھانا بقیہ چھوڑ کر چلے گئے بیشک ہماری ہنڈیا اسی طرح جوش مار رہی تھی بیشک ہمارے آٹے سے روٹیاں پک رہی تھیں آٹا اسی طرح موجود تھا۔

حدیث پاک کی وضاحت:

نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام نے بہت مشکلات برداشت کیں تین تین دن تک سیر ہو کر کھانا نہیں کھایا بلکہ مدینہ طیبہ میں تین دن تک دو وقت سیر ہو کر گندم کی روٹی کھانا نبی کریم ﷺ سے ثابت نہیں۔ آج بات بات پر جہلاء جب یہ پوچھتے ہیں کہ یہاں دعاء نبی کریم ﷺ نے کی تھی۔ یہ کام نبی کریم ﷺ نے کیا تھا؟ تو مجھے ان جہلاء کی قسمت پر افسوس ہوتا ہے کہ کتنے بد قسمت ہیں کہ ان کو علم کی ہوا بھی نہیں لگی۔ یہ تو پوچھتے ہیں کہ جنازہ کے بعد نبی کریم ﷺ نے دعاء کی تھی؟ فرض نماز کے بعد دعاء کی تھی؟ تمام نماز کے مکمل ہونے کے بعد اجتماعی دعا کی تھی، لیکن یہ نہیں پوچھتے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک دن میں تین تین وقت کھانا کھایا تھا؟ کیا آپ نے فاخرانہ لباس پہنا تھا، کیا آپ نے گاڑیوں پر سفر کیا تھا کیا آپ نے ہوائی جہاز پر سفر کیا تھا۔ اگر یہ کام نہیں کئے تھے تو ناجائز ہیں۔

یہ سوال نہیں کرتے، یہ کریں بھی تو کیوں کریں ان چیزوں کو تو وہ ختم نہیں کر سکتے، ان کو ختم کرنے سے ان کے نخرے ختم ہو جاتے ہیں، وہ اپنا فاخرانہ انداز ختم کر دیں یہ تو نہیں ہو سکتا۔ بھوکے رہ کر کمزور ہو جائیں، یہ تو نہیں ہو سکتا، سبحان اللہ صرف نیکی کے کاموں سے روکنا ان کا کام ہے سیدھے سادھے عوام کو دھوکا دینا ان کا دطیرہ ہے۔

☆ نبی کریم ﷺ کا عظیم معجزہ ظاہر ہوا کہ تمام صحابہ کرام جس پتھر کو توڑنے سے عاجز آ گئے جس پتھر کو

توڑنے میں کوئی آلہ کام نہیں کر رہا تھا، اس پتھر کو کدال کی ایک ضرب سے ریت کی طرح ریزہ ریزہ کر دینا نبی کریم ﷺ کا عظیم معجزہ ہی تو تھا۔

☆ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو کہتے ہیں ”فسار دتہ“ میں نے آپ سے سرگوشی کی اس سے پتہ چلا کہ بوقت ضرورت جماعت میں سے کسی ایک سے علیحدگی میں گفتگو کرنا جائز ہے۔

☆ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو بتایا کہ ہم نے ایک صاع جو کا آٹا تیار کیا ہے۔ مقصد اس بتانے میں یہ تھا ”ان هذا قدر يسير واصحابك كسير“ بیشک یہ تھوڑی مقدار میں کھانا ہے آپ کے اصحاب بہت تعداد میں ہیں۔ اس لئے آپ اتنے صحابہ کو ساتھ لے کر آئیں جن کو یہ کھانا کفایت کر جائے۔

☆ نبی کریم ﷺ نے جب ایک ہزار کی تعداد صحابہ کرام کو دعوت دے دی تو آپ کو یہ علم حاصل تھا کہ چار کلو جو کا آٹا اور ایک بکری کے بچے کا گوشت ان تمام کو کفایت کر جائے گا۔ کیونکہ اس میں برکت آجائے گی جو قلیل ہونے کے باوجود کثیر کو کفایت کرے گا۔

☆ نبی کریم ﷺ کے لعاب مبارک میں اتنی عظیم برکت تھی کہ تھوڑا آٹا بڑھ گیا اور تھوڑا گوشت بڑھ گیا۔ آج کل کے یہودیوں کے ایجنٹ جو ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ اور یہ ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کر رہے ہیں کہ نبی کریم ﷺ ایک عام انسان ہی تو تھے..... معاذ اللہ۔

ان بیہودہ لوگوں سے میں پوچھتا ہوں تمہارے تھوک میں بھی یہ کمال ہے؟ ذرا کھانے میں تھوک کر تو دیکھو، اس کھانے کو کھانے والے تمہارے منہ پر تھپڑ لگائیں گے کہ تم نے سارا کھانا ہی برباد کر دیا ہے۔ حدیث شریف میں ذکر ہے ”وبارک“ اس کا معنی بیان کرتے ہوئے ملا علی قاری رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں:

”ای ودعا بالبرکۃ فیہ“ آپ نے آٹے اور گوشت میں برکت کی دعا فرمائی۔

سبحان اللہ اسی سے ایک اور مسئلہ حل ہو گیا آج کل ایصال ثواب کے لئے کھانا سامنے رکھ کر دعاء کی جائے تو جہلاء کو یہی کہتے ہوئے سنتے ہیں نبی کریم ﷺ نے یہ نہیں کیا۔ کاش کہ وہ احادیث کا مطالعہ

کریں تو انہیں سمجھ آ جائے کہ نبی کریم ﷺ نے کھانا سامنے رکھ کر اس میں برکت کی دعاء کی اب آپ ہی بتائیں وہ کھانا حرام ہوا تھا یا کہ برکت والا ہوا تھا۔

اس پر جہلاء کی جانب سے ایک اور عجیب سوال ہوتا ہے جو ان کی حماقت پر دلالت کرنے کے ساتھ ساتھ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کی گستاخی پر دلالت کرتا ہے وہ سوال یہ کیا جاتا ہے کہ جس کھانے کو سامنے رکھ کر قرآن پاک پڑھا گیا اس کی ہڈیاں اور چھلکے بھی بابرکت ہو جائیں گے ان کو تم کھاتے کیوں نہیں، ان کو پھینکتے کیوں ہو؟

سبحان اللہ کیسا سوال؟ نبی کریم ﷺ نے کھانے کے پاس آ کر برکت کی دعا بھی کی لیکن ہڈیوں کو پھینکا بھی گیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام بمع ہڈیوں کے کھا گئے تھے تو یہ ان محترم حضرات کی شان میں درحقیقت گستاخی ہوگی۔

☆ صرف کھانے میں برکت نہیں ہوئی بلکہ پکانے والی دونوں عورتوں کو بھی برکت حاصل ہوئی کہ پکانے والی دو عورتیں، ادھر روٹی پکا رہی ہیں ادھر سالن برتنوں میں ڈال رہی ہیں، تھوڑے وقت میں ہزار آدمیوں کی روٹی تیار ہو جائے یہ معمولی کام نہیں۔ یہ صرف نبی کریم ﷺ کی دعاء کی برکت تھی۔

”لتغط“ کا معنی جو پیش کیا گیا ہے اس پر مرقاة کی عبادت مد نظر رہے:

(لتغط) بكسر الغين المعجمة، وتشديد الطاء المهملة ای لتفور

وتغلى ويسمع غليانها“ (ماخوذ از مرقاة ج ۱ ص ۱۶۹ بزيادة)

تنبیہ: نبی کریم ﷺ کے کثیر معجزات میں سے دو تین مثالیں اس لئے پیش کیں تاکہ دینی مدارس کی چھوٹی کلاسوں کے طلباء کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کے ساتھ ساتھ نبی کریم ﷺ کے معجزات بھی ذہن نشین ہوتے چلے جائیں تاکہ عظمت مصطفیٰ ﷺ دلوں میں جاگزین ہو جائے۔

☆☆☆

﴿وَإِذْ قُلْنَا ادْخُلُوا هَذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ
رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَقُولُوا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ
خَطِيئَتَكُمْ وَسَنَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ﴾

(۱) ”اور جب ہم نے فرمایا اس بستی میں جاؤ پھر اس میں جہاں چاہو بے روک ٹوک کھاؤ، اور دروازے میں سجدہ کرتے داخل ہو اور کہو ہمارے گناہ معاف ہوں، ہم تمہاری خطائیں بخش دیں گے اور قریب ہے کی نیکی والوں کو اور زیادہ دیں۔“

(۲) ”اور جب ہم نے کہا داخل ہو جاؤ اس بستی میں، تو کھاؤ اس سے جہاں سے تم چاہو“ بغیر کسی رکاوٹ کے، اور داخل ہو تم دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے، اور کہو ہمارے گناہ معاف فرما ہم بخش دیں گے تمہارے گناہ اور قریب ہے کہ ہم اور زیادہ دیں گے نیکی کرنے والوں کو۔“

اس آیت کریمہ اور آنے والی آیت کریمہ کا مختصر خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں میدان تہ سے نکل کر ایک بستی میں داخل ہونے کا حکم دیا، اور ساتھ ہی یہ بھی حکم دیا کہ جب تم اس میں داخل ہو تو عجز و انکساری سے سجدہ کرتے ہوئے داخل ہونا اور زبان سے ”حطۃ“ (ہمارے گناہ معاف ہوں) کہنا لیکن قوم نے اپنی سابقہ روایات کو برقرار رکھتے ہوئے سرکشی سے سجدہ کرتے ہوئے داخل ہونے کے بجائے اپنی سرینوں کے بل گھسٹتے ہوئے داخل ہونا اختیار کیا اور ”حطۃ“ کہنے کی جگہ ”حنطۃ“ (ہمیں گندم چاہئے) کہا۔ ان کی سرکشی اور حدود سے تجاوز کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے طاعون کا عذاب بھیجا جس سے وہ چوبیس ہزار کی تعداد میں مر گئے۔

وہ بستی کون سی تھی؟ بعض حضرات نے کہا کہ وہ بستی بیت المقدس تھی۔ لیکن قاضی بیضاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بیت المقدس نہیں:

”فانہم لم یدخلوا بیت المقدس فی حیاة موسیٰ علیہ السلام“

کیونکہ بنی اسرائیل موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں بیت المقدس میں داخل نہیں ہوئے۔

اس لئے کہ میدان تہ میں ہی حضرت ہارون علیہ السلام فوت ہوئے۔ اور ایک سال بعد میدان

(بیضاوی، شیخ زادہ)

تہ میں ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام فوت ہوئے۔

بیت المقدس کا قول کرنے والوں کو غلط فہمی اس لئے ہوئی کہ وہاں ایک دروازہ ہے جس میں سے لوگ داخل ہو کر اپنے گناہوں کی معافی طلب کرتے ہیں اس کا نام ”حطۃ“ ہے اسی وجہ سے یہ سمجھ لیا گیا کہ شاید بنی اسرائیل کو اسی دروازہ سے داخل ہونے کا حکم دیا گیا ہے، حالانکہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں بیت المقدس کی تعمیر یا دروازہ کا نام ”حطۃ“ تھا ہی نہیں۔ (از عزیز)

راقم نے تذکرۃ الانبیاء میں تحریر کیا ہے جب موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کا واقعہ مراد لیا جائے تو بستی سے مراد ”اریحا“ ہوگی کیونکہ موسیٰ علیہ السلام بیت المقدس میں داخل نہیں ہوئے اگر بیت المقدس مراد لیا جائے تو یہ واقعہ حضرت ہارون علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے بعد حضرت یوشع کے زمانہ سے متعلق ہوگا۔

مختلف کتب کے مطالعہ سے خصوصاً شیخ زادہ سے شاندار محاکمہ سمجھ میں آتا ہے کہ ”اریحا“ بیت المقدس کے مضافات سے ہے لہذا یہاں جس بستی کا ذکر ہے وہ اور جس کا ”يقوم ادخلوا الارض المقدسة“ میں ذکر ہے ایک ہی ہے۔ اسی طرح اور بات یہ سمجھ آتی ہے کہ انہوں نے مطالبہ تو موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں کیا تھا کہ ہمیں اس میدان تہ سے نکال کر ایسی بستی میں داخل کر دیا جائے جہاں ہم کھیتی باڑی کریں، ان سے وعدہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں کر دیا گیا تاہم ان کو اس بستی میں داخل ہونے کا حکم حضرت یوشع علیہ السلام کے زمانہ میں دیا گیا۔ (واللہ اعلم بالصواب)

حضرت پیر محمد کرم شاہ رحمہ اللہ نے بہت خوب بیان کیا کہ اس تاریخی پہلو میں الجھنے کی ضرورت ہی نہیں بلکہ قرآن پاک کے اصل مقصود کو دیکھا جائے آپ فرماتے ہیں:

”ایک چیز قرآن کا مطالعہ کرتے وقت ہمیشہ پیش نظر رہنی چاہیے وہ یہ ہے کہ قرآن جن واقعات کا ذکر کرتا ہے اس سے مقصود صرف عبرت و موعظت ہوتی ہے، اس سے واقعہ کی تاریخی حیثیت کا بیان مطلوب نہیں ہوتا، اس لئے قرآن ان واقعات کے صرف ان پہلوؤں کو بیان کرتا ہے جن میں درس عبرت ہو۔ عموماً غیر ضروری تفصیلات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے، جو لوگ قرآن حکیم کی اس خصوصیت کو ملحوظ نہیں رکھتے وہ قصص قرآنی میں تاریخی کتب کی طرح تفصیلات کا تسلسل اور زمان و مکان کا تعین نہیں پاتے تو وہ طرح طرح کے شکوک و شبہات میں مبتلا ہو جاتے ہیں“ (ضیاء القرآن)

﴿سُجَّدًا﴾: بعض مفسرین نے یہاں لغوی معنی مراد لیا ہے کہ شہر میں داخل ہونا، جھکتے ہوئے، عاجزی کرتے ہوئے جس طرح رکوع کرنے والے جھکتے ہیں۔ اور بعض حضرات نے سجدہ کا شرعی معنی مراد لیا ہے کہ تم شہر میں داخل ہوتے وقت (پہلے میدان تہ سے نکلنے کی وجہ سے اور تمہاری دعا کے قبول ہونے کی وجہ سے) کہ ہمیں یہاں سے نکال (تمہیں چاہئے کہ) پہلے سجدہ شکر بجالو پھر اس بستی میں داخل ہو۔ خیال رہے قریہ کو قریہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ لوگوں کے جمع ہونے کے جگہ ہے جس طرح کہا جاتا "قریت الماء" میں نے پانی جمع کیا۔ اس لئے قریہ زیادہ طور پر بستی، دیہات پر بولا جاتا ہے، لیکن کبھی صرف لغوی معنی کا اعتبار کرتے ہوئے شہر کو بھی قریہ کہہ لیا جاتا ہے۔

﴿وَقُولُوا حِطَّةٌ﴾: "ای حط عنا خطایانا، امروا بالاستغفار، وقال ابن عباس

قولوا لا اله الا الله لانها تحط الذنوب"

یعنی "حطۃ" کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ ہمارے گناہ معاف فرما، ان کو استغفار کا حکم دیا گیا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں ان کو حکم دیا گیا کہ تم "لا اله الا الله" کہتے ہوئے اس بستی میں داخل ہونا کیونکہ اس کلمہ کے پڑھنے سے گناہ معاف ہوتے ہیں۔ بظاہر وہم ہوتا ہے کہ "حطۃ" کا مطلب تو صرف معاف کرنا ہے۔ گناہوں کا ذکر کیسے ہے تو اس کا جواب دیا گیا کہ ایک وجہ تو یہ ہے کہ جب ان کو حکم دیا گیا تم یہ کہو تو اس سے مطلب ان کی خطائیں اور گناہ ہی ہو سکتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ آگے آنے والے الفاظ گرامی اس پر قرینہ ہیں کہ مراد گناہ ہی ہیں کیونکہ اس کے بعد فرمایا:

"(نغفر لکم خطایا کم) ای نسترها علیکم من الغفر وهو الستر لان

المغفرة تستر الذنوب"

ہم تمہارے گناہوں کی مغفرت کریں گے، یعنی ان کو چھپا کر ان پر قلم غفو پھیر دیں گے کیونکہ غفر کا معنی ہے ڈھانپنا۔

(وسنزید المحسنین) نیکی کرنے والوں کو عنقریب اور زیادہ دیں گے اس سے مراد ثواب ہے۔

عنقریب سے مراد قیامت ہے، کیونکہ نسبت اخروی زندگی کے قیامت قریب ہی ہے۔ (از حازن بعلبقر)

﴿فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ فَأَنْزَلْنَا عَلَى
الَّذِينَ ظَلَمُوا رِجْزًا مِّنَ السَّمَاءِ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ﴾

(۱) ”تو ظالموں نے اور بات بدل دی جو فرمائی گئی تھی اس کے سوا تو ہم نے آسمان سے ان پر عذاب اتار ابدلہ ان کے بے حکمی“

(۲) ”تو تبدیل کر دیا ان لوگوں نے جنہوں نے ظلم کیا قول (بات) کو اس کے غیر سے جو ان کو کہا گیا تھا۔ تو نازل کیا ہم نے ان لوگوں پر جنہوں نے ظلم کیا عذاب آسمانوں سے۔ بوجہ اس کے کہ وہ فسق کرتے تھے۔“

یعنی بنی اسرائیل کو جب یہ کہا گیا کہ تم اس بستی میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو جاؤ اور حطہ (گناہ معاف فرما) کہو لیکن انہوں نے رب تعالیٰ کے ارشاد کو بدل دیا ”حبة من شعيرة“ کہایا کہ ”حنطة“ یعنی انہوں نے گناہوں کی معافی طلب کرنے کے بجائے، گندم کا مطالبہ کیا کہ ہمیں تو دانے چاہیں۔ رب تعالیٰ نے انہیں سجدہ کرتے ہوئے بستی کے دروازے میں داخل ہونے کا حکم دیا، لیکن وہ سرین کے بل گھسٹتے ہوئے داخل ہوئے۔

تو ان کے فسق کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان ظالموں پر عذاب بھیج کر ان کو تباہ و برباد کر دیا۔

﴿فَأَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا رِجْزًا﴾: اس مقام پر ﴿فَأَنْزَلْنَا عَلَيْهِمْ﴾ نہیں کہا (کہ ان پر نازل کیا بلکہ ﴿فَأَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا﴾ کہا اس لئے کہ ان کے معاملات کی زیادہ قباحت بیان کرنا مقصود تھا۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ بتانا مقصود ہے ”ان انزال الرجز علیہم لظلمهم“ کہ بیشک ان پر عذاب کا نازل ہونا ان کے ظلم کی وجہ سے تھا۔

رجز سے مراد کیا ہے؟ ”ان الرجز هو العذاب“ رجز سے مراد عذاب ہے، اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ﴾ ای العقوبة ”جب ان پر عذاب واقع ہوا۔“

اسی طرح اللہ تعالیٰ کے ارشاد ﴿لَسِنُ كَشَفْتُ عَنَّا الرَّجْزَ﴾ میں بھی ”رجز“ عذاب کے معنی میں استعمال ہے:

”وذكر الزجاج ان الرجز والرجس معناهما واحد وهو العذاب“

زجاج نے یہ بیان کیا ہے کہ ”رجز“ اور ”رجس“ دونوں کا معنی ایک ہے اور وہ ہے ”عذاب“ اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿وَيُذْهِبْ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطَانِ﴾ میں ”رجز“ کا معنی شیطان کا وسوسہ اور کفر کی طرف بلانا، وہ بھی عذاب کا ہی سبب ہے۔

رجز سے مراد کون سا عذاب ہے؟ ”لا دلالة في الآية عليه“ آیت کریمہ میں تو یہ ذکر نہیں کیا گیا کہ وہ کون سا عذاب ہے البتہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ارشاد یہ ہے۔

”مات منهم بالفجأة اربعة وعشرون الفافى ساعة واحدة“

ان میں ایک ہی گھڑی میں اچانک چوبیس ہزار لوگ مر گئے۔

”وقال ابن زيع بعث الله عليهم الطاعون حتى مات من الغداة الى

العشي خمس وعشرون الفا ولم يبق منهم احد“

ابن زید رحمہ اللہ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے ان پر طاعون کی مرض کو بھیجا، یہاں تک کہ صبح سے شام تک پچیس ہزار کی تعداد میں مر گئے، اور ان میں سے کوئی ایک بھی نہ بچ سکا۔

ابن زید رحمہ اللہ کے قول کے مطابق یہ بھی واضح ہو رہا ہے کہ ”فبدل الذين ظلموا منهم“ میں ”من“ تبیضیہ ہے یعنی جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد کو بدلا وہ سب عذاب میں گرفتار ہو کر تباہ و برباد ہو گئے۔ البتہ جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کو نہیں بدلا وہ عذاب سے محفوظ رہے۔

﴿بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ﴾ ”بوجہ اس کے کہ وہ فسق کرتے تھے“ ”فالفسق هو الخروج المضمّر“ پوشیدہ چیز کو نکالنا فسق ہے۔ اسی طرح پھل کے چھلکے سے نکلنے کیلئے بھی فسق کا لفظ استعمال کرتے ہیں جیسے کہا جاتا ہے ”فسقت الرطبة“ اور شرع میں فسق کا یہ معنی ہے

”الخروج من طاعة الله الى معصيته“ اللہ تعالیٰ کی طاعت سے معصیت کی طرف نکلنا۔

اس آیت کریمہ میں فسق سے مراد ان کا اپنی جانوں پر ظلم کرنا ہی مراد ہے۔

ابھی جن دو آیتوں کا ذکر ہوا۔ اسی مفہوم کو سورۃ اعراف میں بھی ذکر کیا گیا ہے کچھ

فائدہ :

الفاظ میں فرق ہے۔ سورۃ اعراف میں اس طرح ذکر کیا گیا ہے:

﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ اسْكُنُوا هَذِهِ الْقَرْيَةَ وَكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ وَقُولُوا حِطَّةٌ وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَغْفِرْ لَكُمْ خَطِيئَاتِكُمْ سَنَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ﴾

سوال اول: سورۃ بقرہ میں ذکر ہوا ”واذ قلنا“ اور سورۃ اعراف میں ذکر ہوا ”واذ قيل لهم“ وجہ فرق کیا ہے؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کے اول میں صراحتہ ذکر کیا کہ اس قول کا کہنے والا اللہ تعالیٰ ہے اب بات واضح ہو گئی اس میں کوئی ابہام (پوشیدگی) باقی نہ رہی۔ چونکہ اس سے پہلے رب تعالیٰ نے ذکر فرمایا: ﴿ادْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ﴾

جب رب تعالیٰ نعمتوں کو واضح طور پر اپنی طرف منسوب فرمایا کہ ”یاد کرو میری نعمتوں کو جو میں نے تم پر انعام فرمائی ہیں“ تو ان نعمتوں کی تفصیل ذکر کرتے ہوئے بھی اپنی طرف ہی مناسب تھا لیکن سورۃ اعراف میں کوئی ابہام باقی نہ رہا تھا اس لئے فرمایا ”واذ قيل“ (اور جب ان کو کہا گیا)۔

سوال دوم: سورۃ بقرہ میں ذکر ہوا ”واذ قلنا ادخلوا“ (اور جب ہم نے کہا داخل ہو جاؤ) اور سورۃ اعراف میں ذکر ہوا ”واذ قيل لهم اسكنوا“ (اور جب ان کو کہا گیا ٹھہرو، سکونت اختیار کرو۔ ایک جگہ داخل ہونے کا حکم دیا۔ اور دوسری جگہ رہنے کا حکم دیا ان دونوں میں وجہ فرق کیا ہے؟

جواب: مقصد دونوں چیزوں کا حکم دینا تھا کیونکہ ان کے مطالبہ کو پورا کیا جا رہا تھا اس لئے حکم دیا گیا کہ اس بستی کے دروازہ سے سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو جاؤ اور اسی میں سکونت اختیار کر لو۔ دخول چونکہ سکونت سے پہلے ہوتا ہے اس لئے پہلی سورۃ میں دخول کا حکم دیا، اور بعد میں آنے والی سورۃ میں سکونت کا حکم دیا گیا۔

سوال سوم: سورۃ بقرہ میں ذکر کیا گیا ”فكلوا“ اس میں ”فاء“ ہے اور سورۃ اعراف میں ذکر کیا گیا ”وكلوا“ اس میں ”واو“ ہے یہ فرق کیوں کیا گیا؟

جواب: ہر وہ فعل جس کا عطف کسی چیز پر ہو، وہ فعل شرط کے درجہ میں ہو اور وہ چیز جزاء کے درجہ میں ہو وہاں فاء کا ذکر ہوتا ہے لیکن معطوف اور معطوف علیہ میں اگر شرط اور جزا کا درجہ نہ پایا

جائے تو وہاں فاء کو ذکر نہیں کیا جاتا بلکہ واؤ کو ذکر کیا جاتا ہے۔

سورۃ بقرہ میں ہے: ﴿وَإِذْ قُلْنَا ادْخُلُوا هَذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ

رَغَدًا﴾ اس کو شرط و جزاء کا درجہ حاصل ہے۔ اصل مفہوم یہ ہو گیا ”ان دخلتموها اكلتم منها“ اگر تم اس بستی میں داخل ہو گئے تو اس سے کھانا جو تم چاہو بلا روک ٹوک کے۔

لیکن سورۃ اعراف میں ذکر کیا گیا: ﴿وَإِذْ قِيلَ لَهُمْ اسْكُنُوا هَذِهِ الْقَرْيَةَ وَكُلُوا مِنْهَا

حَيْثُ شِئْتُمْ﴾ اس میں شرط و جزاء کی حیثیت نہیں۔ یہ نہیں کہا گیا کہ تم اس بستی میں رہتے ہوئے ہی

اس کے پھل کھا سکتے ہو۔ بلکہ حکم یہ تھا کہ اس بستی میں رہو، چاہو تو باغات میں جا کر وہاں ہی پھل کر پھر

واپس بستی میں لوٹ آؤ، اور چاہو تو باغات سے پھل توڑ کر بستی میں لے آؤ اور بستی میں رہ کر کھاؤ۔ اس

لئے سورۃ اعراف میں ”واؤ“ سے عطف کیا گیا اور ”فاء“ سے عطف نہیں کیا گیا۔

سوال چہارم: سورۃ بقرہ میں کہا گیا ﴿نَغْفِرْ لَكُمْ خَطَايَاكُمْ﴾ اور سورۃ اعراف میں ذکر ہے

﴿نَغْفِرْ لَكُمْ خَطِيئَاتِكُمْ﴾ اگرچہ دونوں جمع کے صیغے ہیں لیکن علیحدہ علیحدہ جمع کے صیغے ذکر کرنے کا

کیا مطلب؟

جواب: خطایا جمع کثرت ہے اور خطیئات جمع سالم ہے جو بغیر الف لام کے جمع قلت ہے۔ سورۃ بقرہ

میں جب رب تعالیٰ نے صراحۃً اپنی طرف نسبت کی ”وَإِذْ قُلْنَا ادْخُلُوا“ کہا تو یقیناً اپنے جو دو کرم

کے لائق لفظ کو ذکر کیا کہ تم کتنے بھی کثیر گناہ کرو مجھ سے معافی طلب کرو تو میں کثیر گناہوں کو بھی معاف

کر دیتا ہوں اس لئے یہاں جمع کثرت کا صیغہ ذکر کیا گیا۔ اور سورۃ اعراف میں صراحۃً اپنی طرف نسبت

نہیں کی بلکہ کہا ﴿وَإِذْ قِيلَ لَهُمْ﴾ (اور جب ان کو کہا گیا) اس لئے جمع قلت کو ذکر کر دیا گیا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ جب فاعل کا صراحۃً ذکر کیا گیا تو اس کے کرم کے مناسب کثیر خطاؤں کی

مغفرت کا ذکر کر دیا گیا۔ اور جب فاعل کا صراحۃً ذکر نہیں کیا گیا تو جمع قلت کو ذکر کر دیا گیا۔ یا دوسرے

لفظوں میں یوں کہہ دیا جائے کہ ایک جگہ جمع کثرت ذکر کر کے، دوسری جگہ جمع قلت ذکر کر کے یہ بتا دیا

گیا کہ خواہ کثیر گناہوں یا قلیل ہوں سب رب تعالیٰ ہی معاف کرتا ہے اسی کی طرف ہر حال میں رجوع

کیا جائے۔

سوال پنجم: سورۃ بقرہ میں ”رغدا“ ذکر کیا اور سورۃ اعراف میں ”رغدا“ مذکور نہیں فرق کی وجہ کیا ہے؟

جواب: اس کا جواب بھی وہی ہے جو ابھی سوال چہارم کا ذکر کیا کہ رب تعالیٰ نے سورۃ بقرہ اپنی طرف صراحۃً نسبت کی تو عظیم انعام کا ذکر کیا۔ یعنی ”رغدا“ ذکر کر دیا گیا۔ اور سورۃ اعراف میں اپنی طرف صراحۃً نسبت نہیں کی تو ”رغدا“ ذکر نہیں کیا۔

”رغدا“ کا معنی ہے بلا روک ٹوک، با فراغت، عیش و عشرت وغیرہ، یہ انعام کی عظمت پر دلالت کر رہا ہے۔

سوال ششم: سورۃ بقرہ میں ذکر کیا گیا ﴿وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَقُولُوا حِطَّةٌ﴾ اور سورۃ اعراف میں ذکر کیا گیا ﴿وَقُولُوا حِطَّةٌ وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا﴾ اس تقدیم و تاخیر کی وجہ کیا ہے؟
جواب: واو مطلقاً جمع کے لئے آتی ہے ترتیب پر دلالت نہیں کرتی، اس لئے دونوں کا مطلب ایک ہی ہے تاہم حکمت یہ ہو سکتی ہے کہ بنی اسرائیل میں بعض لوگ گنہگار تھے اور بعض لوگ گنہگار نہیں تھے۔ جو لوگ گنہگار نہیں تھے ان کو عبادت کرنے کا پہلے حکم دیا گیا اور فرمایا گیا:

﴿وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا﴾ ”دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو۔“

پھر ان کو کہا گیا:

﴿وَقُولُوا حِطَّةٌ﴾ ”اور تم کہو ہمارے گناہ معاف کر۔“

یہ توبہ کرنے کا ان کو حکم اس لئے دیا گیا کہ ان میں عجز پایا جائے اور اپنے عبادت پر ناز نہ کریں۔ اور جو لوگ گنہگار تھے ان کو توبہ کرنے کا پہلے حکم دیا گیا۔ اور کہا گیا ﴿وَقُولُوا حِطَّةٌ﴾ اور پھر ان کو عبادت کرنے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا گیا:

﴿وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا﴾

سوال ہفتم: سورۃ بقرہ میں ﴿وَسَنَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ﴾ ذکر کیا گیا جس میں ”واو“ ہے اور سورۃ اعراف میں ﴿سَنَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ﴾ مذکور ہے جس میں ”واو“ نہیں وجہ فرق کیا ہے؟

جواب: دونوں سورتوں میں علیحدہ علیحدہ طریقہ اختیار کر کے دو ضابطوں کی طرف اشارہ کر دیا گیا کہ کبھی

دو یا دو سے زیادہ چیزوں کو ذکر کر کے ان کے اوپر اسی طرح دو یا دو سے زیادہ احکام مرتب کر کے مجموع پر مجموع حکم مرتب ہوتا ہے۔ اور کبھی علیحدہ علیحدہ اعتبار کر کے علیحدہ علیحدہ احکام کو مرتب کیا جاتا ہے سورۃ بقرہ میں دو چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے، دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہونے کا حکم، اور گناہوں کی معافی طلب کرنا، ان دونوں چیزوں کے مجموعہ پر دو چیزوں کا مجموعی حکم مرتب کیا، یعنی ہم تمہارے گناہ معاف کریں گے اور نیکی کرنے والوں پر زیادہ احسان کریں گے۔

سورۃ اعراف میں دوسرے ضابطہ کی طرف اشارہ فرمایا، کہ جو توبہ کرے گا، گناہوں کی معافی طلب کرے گا، ہم اس کے گناہ معاف کر دیں گے اور جو سجدہ کرتے ہوئے دروازہ میں داخل ہوں گے ہم ان نیکی کا کام کرنے والوں پر زیادہ احسان کریں گے۔ یعنی سورۃ اعراف میں علیحدہ علیحدہ چیزوں پر علیحدہ علیحدہ احکام مرتب فرمائے حقیقت بات یہ ہے کہ عربی کے تمام قواعد ہی قرآن پاک کو دیکھ کر مرتب ہوئے۔

سوال ہشتم: سورۃ بقرہ میں ذکر کیا گیا ﴿فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا قَوْلًا﴾ اور سورۃ اعراف میں ذکر فرمایا ﴿فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ قَوْلًا﴾ یعنی سورۃ بقرہ میں ”منہم“ نہیں اور سورۃ اعراف میں ”منہم“ ہے وجہ فرق کیا ہے؟

جواب: سورۃ اعراف میں اس واقعہ کی ابتداء لفظ ”من“ سے ہے رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَمِنْ قَوْمِ مُوسَىٰ أُمَّةٌ يَهْدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِ يَعْدِلُونَ﴾

اور موسیٰ کی قوم سے ایک گروہ ہے کہ حق کی راہ بتاتا ہے اور اسی سے انصاف کرتا ہے۔

یعنی اس آیت میں ذکر کیا گیا کہ موسیٰ علیہ السلام کی امت میں سے بعض لوگ یہ کرتے ہیں۔ پھر ان پر انعامات کی مختلف قسموں کا ذکر فرمایا، پھر ان کو جو اوامر دیئے گئے ان کا ذکر کیا گیا۔ اس واقعہ کے آخر میں پھر ”من“ ذکر فرمایا اور ارشاد ہوا: ﴿فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ قَوْلًا﴾ اسی طرح ابتداء اور انتہاء میں مناسبت پائی گئی۔ اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ رب تعالیٰ کے قول کو تبدیل کرنے والے بعض تھے تمام کے تمام بدلنے والے نہیں تھے۔

سورۃ بقرہ میں پہلے بعض کا ذکر نہیں کیا گیا تو ﴿فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا﴾ میں بھی ”منہم“ کو

ذکر نہیں کیا گیا۔ اب وجہ فرق واضح ہوگئی۔

سوال نہم: سورۃ بقرہ میں ذکر کیا گیا ﴿فَأَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا رِجْزًا﴾ اور سورۃ

اعراف میں ذکر فرمایا گیا: ”فارسلنا“ یعنی سورۃ بقرہ میں ”فانزلنا“ اور سورۃ اعراف میں

”فارسلنا“ ذکر کیا گیا وجہ فرق کیا ہے؟

جواب: انزال کا مطلب ہے ابتدائی طور پر نازل کرنا، اور ارسال کا مطلب ہے مسلط کرنا یہاں تک کہ

ان کو مکمل طور پر تباہ کر دینا۔ گویا کہ دونوں آیتوں سے مسئلہ کو واضح طور پر بیان کر دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم

کے خلاف ورزی کرنے والے اور اس کے قول کو بد لئے والے بنی اسرائیل پر رب تعالیٰ نے عذاب

نازل کیا۔ اور اس عذاب کو ان پر مسلط کر کے ان کو مکمل طور پر تباہ و برباد کر دیا گیا۔

سوال دہم: سورۃ بقرہ میں ذکر فرمایا ﴿بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ﴾ اور سورۃ اعراف میں ذکر کیا

گیا ﴿بِمَا كَانُوا يَظْلِمُونَ﴾ ان میں وجہ فرق کیا ہے؟

جواب: سورۃ بقرہ میں ﴿قَبْلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا﴾ سے ان لوگوں کا ظالم ہونا ذکر کیا گیا پھر ان کے

متعلق ہی کہا ﴿بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ﴾ یعنی ان کا ظلم فسق تھا۔ جب سورۃ بقرہ میں ان کا ظالم ہونا اور

فاسق ہونا ذکر کر دیا گیا، تو سورۃ اعراف میں صرف ان کے ظلم کے ذکر پر اکتفاء کر دیا گیا۔

(ماخوذ از کبیر)

الفاظ کے تبدیل کرنے کے متعلق مسئلہ عظیمہ:

علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے اسی آیہ کریمہ کی تفسیر میں اس عظیم بحث کو ذکر فرمایا ہے جس کا ذکر کرنا

طلباء اور عوام کے لئے یکساں مفید ہے۔ علماء کرام یقیناً پہلے سے ہی جانتے ہیں۔

”فان كان التعبد وقع بلفظها فلا يجوز تبديلها“

اگر ایسے کلمات ہوں جن کے معانی اور الفاظ دونوں مقصود ہوں یعنی الفاظ کا ادا کرنا عبادت ہو تو

ان کو تبدیل کرنا جائز نہیں، کیونکہ رب تعالیٰ کے ارشادات کو تبدیل کرنے کی مذمت بیان کی گئی ہے۔ جیسا

کہ قرآن پاک کے الفاظ کو تبدیل کرنا جائز نہیں باوجود اس کے کہ قرآن پاک کے الفاظ کا مفہوم ادا ہو رہا

ہو۔ ہاں البتہ اگر وہ قرآن پاک کا صرف ترجمہ پیش کر رہا ہو۔ تو اس کے متعلق بھی احتیاط یہ ہے کہ یوں

نہ کہے ”اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا“ بلکہ یہ کہے اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی کا ترجمہ یہ ہے۔

اسی طرح اذان کے الفاظ خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے بواسطہ فرشتہ خواب میں صحابہ کرام کو القاء کئے گئے ان میں بھی کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

ایسے ہی نماز میں ثناء کا ادا کرنا، تشہد کا پڑھنا، دعاء قنوت کا پڑھنا بھی صرف ان الفاظ سے ہی ہو سکتا ہے جن کا ذکر احادیث میں ہے، ان کو تبدیل کرنا جائز نہیں۔ تاہم یہ خیال رہے کہ تشہد میں حدیث پاک میں مختلف الفاظ ملتے ہیں جو بھی پڑھے جائز ہے۔ البتہ بہتر وہی ہے جو ہم پڑھتے ہیں۔ یہی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

”وان وقع بمعناها جاز تبدیلیها بما یؤدی الی ذلک المعنی، ولا یجوز تبدیلیها بما یخرج عنہ“

اگر ایسے کلمات ہوں جن میں مقصد معانی ہوں، ان کو ایسے الفاظ سے تبدیل کرنا جائز ہے جن سے معانی مکمل طور پر حاصل ہوں، معانی نہ بدلیں، اگر معنی بدل رہا ہو تو ان الفاظ سے تبدیل کرنا جائز نہیں۔

البتہ امام اعظم ابو حنیفہ، امام مالک اور امام شافعی رحمہم اللہ اور ان کے متبعین تمام حضرات نے یہ شرط لگائی ہے کہ تبدیلی کا حق صرف ایسے عالم کو ہو سکتا ہے جو عربی زبان اور اس کے قواعد سے اچھی طرح باخبر ہو۔ ہاں البتہ یہ بھی ذہن میں رہے کہ بعینہ وہی الفاظ ادا کرنا جو احادیث میں وارد ہوں، بہتر ہے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”من سمع حدیثاً فحدث بہ کما سمع فقد سلم“

جس شخص نے حدیث کو سنا اور اسی طرح بیان کیا جیسا سنا تو وہ یقیناً سلامتی میں رہا۔

”والقول بالجواز هو الصحيح ان شاء اللہ تعالیٰ“

تبدیل کرنے کے جواز کا قول ہی صحیح ہے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

کیونکہ صحابہ کرام سے ایک ہی واقعہ کو مختلف الفاظ سے بیان کرنا عام طور پر ثابت ہے۔

واحد بن اثنع رضی اللہ عنہ کا قول اس پر شاہد ہے آپ فرماتے ہیں:

”لیس کل ما اخبرنا بہ رسول اللہ ﷺ نقلناہ الیکم حسبکم المعنی“

نبی کریم ﷺ کے ارشادات کو ہم نے تمہاری طرف اس طرح نقل نہیں کیا کہ وہ الفاظ مبارکہ آپ کے ہی ہیں البتہ تمہیں معنی کافی ہے۔

یعنی ہم نے بہت جگہ نبی کریم ﷺ کے ارشادات کے مطالب کو بیان کیا۔ الفاظ ہمارے اپنے بھی ہو سکتے ہیں۔ حضرت زرارہ بن اونی کہتے ہیں:

”لَقِيتْ بَعْدَهُ مِنْ أَصْحَابِهِ النَّبِيَّ ﷺ فَاخْتَلَفُوا عَلَيَّ فِي اللَّفْظِ وَاجْتَمَعُوا

فِي الْمَعْنَى“

میں کئی صحابہ کرام کو ملا انہوں نے نبی کریم ﷺ کے ارشادات جو بیان فرمائے ان میں الفاظ اگرچہ مختلف تھے لیکن معانی سب کے ایک تھے۔

”وَكَانَ النَّخَعِيُّ وَالْحَسَنُ رَحِمَهُمُ اللَّهُ يَأْتُونَ بِالْحَدِيثِ عَلَى الْمَعْنَى“
حضرت نخعی حسن بصری اور شعبی رحمہم اللہ حدیث بالمعنی ذکر فرماتے تھے یعنی الفاظ مختلف ہوتے لیکن معانی میں اتفاق ہوتا۔

”وَقَالَ الْحَسَنُ إِذَا صَبَتْ الْمَعْنَى اجْزَأَكَ“ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں جب تمہیں معنی صحیح نظر آئے تو تمہارے لئے کافی ہے۔ یعنی حدیث پاک کے معنی کو مد نظر رکھا جائے، الفاظ بدل جائیں تو کوئی حرج نہیں:

”وَقَالَ وَكَفَى رَحِمَهُ اللَّهُ أَنْ لَمْ يَكُنِ الْمَعْنَى وَاسْعَا فَقَدْ هَلَكَ النَّاسُ“
حضرت وکیع رحمہ اللہ فرماتے ہیں اگر معنی میں وسعت نہ دی جاتی یعنی حدیث بالمعنی کے جواز کا قول اگر نہ پایا جاتا تو لوگ ہلاک ہو جاتے۔

اس لئے کہ بعینہ الفاظ کا یاد رکھنا تو بہت مشکل کام ہے البتہ مفہوم کو نہ بدلنے دیا جائے یہی روایت میں کافی ہے:

”وَاتَّفَقَ الْعُلَمَاءُ عَلَى جَوَازِ نَقْلِ الشَّرْعِ لِلْعَجْمِ بِلِسَانِهِمْ وَتَرْجُمَتِهِ لَهُمْ
وَذَلِكَ هُوَ النُّقْلُ بِالْمَعْنَى“

علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ شرع کو لوگ اپنی اپنی عجمی زبانوں میں بیان کر سکتے ہیں، اور عربی کا ترجمہ کر کے لوگوں کو بیان کر سکتے ہیں۔ جب عربی زبان میں الفاظ ادا کرنے کے بغیر عجمی میں ترجمہ جائز ہے تو یہ نقل بالمعنی ہی تو ہے۔

☆ قرآن پاک میں پہلے لوگوں کے واقعات مختلف الفاظ سے بیان ہیں مفہوم سب کا ایک ہے:
کچھ حضرات نے بیان کیا ہے کہ حدیث کے لفظ کو بدلنا درست نہیں۔ ان حضرات نے اپنے
موقف پر یہ دلائل قائم کئے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی یہ ہے:

”نضر الله امرأ سمع مقالتي فبلغها كما سمعها“

اللہ تعالیٰ اسے خوش رکھے جس نے میرا کلام سنا اور اسی طرح آگے پہنچایا جیسا سنا۔

اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ جو الفاظ حضور ﷺ سے سنے ان کو اسی طرح آگے دوسروں
تک پہنچائے۔ الفاظ کو تبدیل کرنا جائز نہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے ارشاد ”فاداها كما سمعها“ کا مطلب یہ ہے
”حکمها لا لفظها“ کہ جو بات مجھ سے سنے اس کے حکم کو ایسے ہی ادا کرے جیسا کہ مجھ سے سنے۔ اس
میں یہ ذکر ہی نہیں کہ الفاظ کو جیسا سنا بعینہ ایسے ہی ادا کرے۔

☆ ان حضرات کی دوسری دلیل یہ ہے کہ حضرات براء بن عازب کہتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ
نے فرمایا:

”جب تم سونے لگو تو وضو کر لو، جس طرح نماز میں وضو کیا جاتا ہے پھر

دائیں کروٹ پر لیٹ جاؤ، پھر یہ پڑھو“

”اللهم انی سلمت وجهی الیک وفوضت امری الیک ولجات ظہری الیک

رغبة ورهبة الیک لا ملجأ ولا منجا منک الا الیک امنت بکتابک الذی انزلت

ونبیک الذی ارسلت“

تمہارے کلام کے سب سے آخر میں یہی دعا ہو (یعنی دعا کے بعد پھر کوئی اور کلام نہ کرنا) پھر اگر
تمہاری موت اسی رات کو آگئی تو تمہاری موت فطرت (اسلامیہ) پر آئے گی۔

راوی کہتے ہیں میں نے آپ کے دعائیہ کلمات کو لوٹا یا تا کہ مجھے یاد ہو جائیں، تو میں نے دعاء میں یہ پڑھا:

”امنت برسولک الذی ارسلت“

تو آپ نے فرمایا یہ پڑھو ”امنت بنبیک الذی ارسلت“ (مسلم ج ۲ ص ۳۵۶ باب الدعاء عند النوم)

اس حدیث پاک سے دلیل یہ پیش کی گئی کہ حدیث پاک کے الفاظ کو بدلنا جائز ہوتا تو نبی کریم ﷺ اپنے صحابی کو منع نہ فرماتے۔ جب آپ نے وہی الفاظ پڑھنے کا حکم دیا جو آپ نے پڑھائے تھے تو پتہ چلا کہ الفاظ کو تبدیل کرنا مطلقاً جائز نہیں۔

اس کا جواب علامہ نووی رحمہ اللہ کے قول سے ہی دینا زیادہ مناسب رہے گا، آپ فرماتے ہیں: کہ اس میں علماء کے مختلف اقوال ہیں، علامہ مازری وغیرہ نے یہ قول پسند فرمایا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے انکار کا یہ مطلب تھا کہ یہ ذکر اور دعا ہے اسلئے دعائیہ کلمات اور اذکار میں ان الفاظ کو ہی ذکر کیا جائے جو حقیقت میں مذکور ہیں اور خصوصاً دعا پر یا ذکر پر اگر خاص ثواب وغیرہ کا ذکر ہو تو اس کا تعلق ان خاص الفاظ سے ہی ہوتا ہے جن کو ذکر کیا گیا ہو، اگر وہ الفاظ بدل جائیں تو وہ خصوصی حکم ان کے ساتھ متعلق نہیں رہتا۔

(نووی)

☆ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی:

”فرب حامل فقه غیر فقیہ ورب حامل فقه الی من ہو افقہ منہ“
کتنے ہی فقہی مسائل کو دوسروں تک پہنچانے والے خود فقیہ نہیں ہوتے۔ اور کتنے ہی فقہی مسائل کو ان تک پہنچاتے ہیں جو ان سے بھی زیادہ فقیہ ہوتے ہیں۔
”ثم ان هذا الحديث بعينه قد نقل بالفاظ مختلفة والمعنى واحد“

اس حدیث پاک کو مختلف الفاظ سے بیان کیا گیا ہے لیکن معنی سب کا ایک ہے ”وذلك ادل دليل على الجواز“ یہ بہت بڑی دلیل ہے جس سے واضح ہو رہا ہے کہ معنی نہ بدلنے پائے تو الفاظ مختلف پیش کئے جاسکتے ہیں۔

اعتراض: اگر ایک راوی کو الفاظ بدلنے کی اجازت ہو، تو دوسرے اور تیسرے کو بھی اجازت ہوگی اس طرح تو حدیث کا مفہوم ہی بدل جائے گی کیونکہ دقیق اور مخفی فرق کو سمجھنا دشوار ہوتا ہے۔

جواب: ”الجواز مشروط بالمطابقة والمساواة“ الفاظ کو تبدیل کرنے کا جواز اس بات سے مشروط ہے کہ اصل الفاظ اور ان کی جگہ استعمال ہونے والے الفاظ میں مطابقت اور

مساوات پائی جائے۔ اس طرح اگر ایک راوی اور دوسرا اور تیسرا بھی الفاظ بدل دیں تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اگر فرق کر دیا گیا تو یہ جائز ہی نہیں۔

حضرت محی الدین ابن عربی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”الخلاف فی هذه المسئلة انما يتصور بالنظر الى عصر الصحابة
والتابعين للتساويهم في معرفة اللغة الجبلية الذوقية ، واما من بعدهم
فلا نشك في ان ذلك لا يجوز“

اس مسئلہ میں کہ الفاظ کو بدلنا جائز ہے یا جائز نہیں یہ اختلاف صحابہ کرام اور تابعین کے زمانہ تک محدود ہے، کیونکہ وہ لغت جبلیہ (پیدائشی طور پر اپنی عربی زبان میں مہارت) اور ذوقیہ میں سب برابر تھے۔ لیکن بعد کے لوگوں کے لئے جائز نہیں کیونکہ ان کی طبائع مختلف ہیں اور سمجھیں ایک دوسرے سے جدا گانہ ہیں۔

اس قول کے متعلق علامہ قرطبی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں: ”وهذا هو الحق“ یہی حق ہے۔

تاہم بعض علماء نے ہر زمانے میں جواز کا قول کیا ہے کہ جب شرط پائی جائے کہ مفہوم نہ بدلنے پائے تو الفاظ کا بدلنا ہر زمانہ میں جائز ہے۔ ہاں البتہ یہ بھی خیال رہے کہ بہتر یہی ہے کہ اصلی الفاظ ہی بیان کئے جائیں۔ بعض روایات میں صحابہ کرام اسی احتیاط کے پیش نظر دو دو لفظ ذکر کئے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے یہ فرمایا یا دوسرے الفاظ ذکر فرمائے۔

(ماخوذ از قرطبی بزیادہ)



وَإِذِ اسْتَسْقَىٰ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ فَقُلْنَا اضْرِبْ
بِعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا قَدْ
عَلِمَ كُلُّ أَنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ كُلُّوا وَاشْرَبُوا مِن رِّزْقِ اللَّهِ
وَلَا تَعَثَوْا فِي الْأَرْضِ مُمْسِدِينَ ﴿١٠﴾

(۱) ”اور جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لئے پانی طلب کیا تو ہم نے فرمایا اس پتھر پر اپنا عصا مارو، فوراً اس میں سے بارہ چشمے نکلے، ہر گروہ نے اپنا گھاٹ پہچان لیا، کھاؤ اور پیو خدا کا دیا اور زمین میں فساد اٹھاتے نہ پھرو“

(۲) ”اور جب پانی طلب کیا موسیٰ نے اپنی قوم کے لئے، تو ہم نے کہا مارو اپنا عصا پتھر پر، تو جاری ہو گئے اس سے بارہ چشمے، تحقیق جان لیا ہر قبیلہ نے اپنے پینے کی جگہ کو، کھاؤ اور پیو اللہ کے رزق سے اور نہ حد سے بڑھوز میں میں فساد پھیلاتے ہوئے“

مختصر وضاحت:

میدان تہ میں چھ لاکھ کی تعداد میں بارہ میل پر پھیلے ہوئے لشکر کو جب پیاس کی شدت محسوس ہوئی تو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے اپنی بے بسی کا ذکر کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے رب تعالیٰ سے دعاء کی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعاء کو قبول کیا اور حکم دیا کہ اے موسیٰ اپنا عصا پتھر پر مارو، پانی جاری ہو جائے گا۔

آپ نے اپنا عصا پتھر پر مارا تو بارہ چشمے جاری ہو گئے، ہر قبیلہ نے ایک ایک چشمہ اپنے لئے مختص کر لیا، پتھر سے جاری ہونے والا پانی اتنی بڑی تعداد کے لوگوں کے لئے کافی تھا، پتھر مکعب شکل کا تھا، اور ہر طرف سے تین تین چشمے جاری ہوئے یہ پتھر کوئی خاص معین تھا، یا کہ عام پتھر تھا اگرچہ اس میں مختلف اقوال تو ہیں لیکن صحیح یہی ہے کہ قرآن پاک میں کسی پتھر کو مختص جب نہیں کیا گیا تو وہ پتھر عام ہی تھا۔ (ابو سعود)

یہاں سے مراد بنی اسرائیل پر ایک اور نعمت کا ذکر کیا جا رہا ہے یہ دین اور دنیا کی نعمتوں کی جامع نعمت ہے۔ لیکن دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ان کی پانی کی شدید حاجت کو دور فرما کر ان پر انعام کیا ”وَلَوْ لَا لَهْلَكُوا فِي التِّيْهِ“ اور اگر ان کو پانی نہ دیا جاتا تو وہ میدان تہ میں ہلاک ہو جاتے، جیسا کہ ان کو ”من اور سلوی“ عطا کر کے ہلاکت سے بچایا گیا۔ کیونکہ انسان کھانے پینے سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی اس کی وضاحت کر رہا ہے:

﴿وَمَا جَعَلْنَاهُمْ جَسَداً لَّا يَأْكُلُونَ الطَّعَامَ﴾

”اور ہم نے انہیں خالی بدن نہ بنایا کہ کھانا نہ کھائیں“

اور رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ﴾ ”اور ہم نے ہر چیز کو پانی سے زندگی عطا فرمائی“

بلکہ میدان تہ میں ان کو پانی عطاء کرنا، عام عادت کے مطابق پانی عطا کرنے سے عظیم نعمت تھی، اس لئے کہ جب انسان جنگل میں ہو اور اسے پانی کی شدید حاجت ہو اس پر امید کے دروازے بظاہر بند ہوں، کہ وہ ایسی جگہ ہے جہاں پانی اور نباتات جیسی کوئی چیز نہیں، ایسے لوگوں کو جب عصا کے ذریعے پھر سے پانی عطاء کر دیا گیا:

”فَعَلِمَ اَنْ هَذِهِ النِّعْمَةُ لَا يَكَادُ بَعْدُ لَهَا شَيْءٌ مِنَ النِّعَمِ“

تو معلوم ہوا کہ ان کو تمام نعمتوں سے بڑی نعمت یہی نظر آئے گی۔ اور میدان تہ میں ان کو پانی حاصل ہونا دینی نعمت بھی ہے۔

”فَلَا نَهْ مِنْ اَظْهَرِ الدَّلَائِلِ عَلَى وَجُودِ الصَّانِعِ وَقُدْرَتِهِ وَعِلْمِهِ وَمِنْ

اصْدَقِ الدَّلَائِلِ عَلَى صِدْقِ مُوسَى عَلَيْهِ السَّلَامُ“

اس لئے کہ موسیٰ علیہ السلام کے اس معجزہ سے اللہ تعالیٰ جو صانع ذات ہے اس کی قدرت اور عظم پر ظاہر دلائل پائے گئے ہیں اور موسیٰ علیہ السلام کی صداقت پر بہت بڑے سچے دلائل پائے گئے ہیں۔

(از کبیر)

خاص کر کے ایک پتھر کی طرف سے نکلنے والا پانی پچاس ہزار افراد پر مشتمل آدمیوں کو پورا ہو

جائے، اور بارہ طرفوں سے نکلنے والے بارہ چشمے چھ لاکھ لوگوں کو پورے ہو جائیں۔ اس سے بڑھ کر رب تعالیٰ کی قدرت اور نبی کی صداقت پر کوئی اور دلیل طلب کرے تو اس کی حماقت ہوگی۔

﴿وَإِذِ اسْتَسْقَىٰ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ﴾ : استسقاء کا معنی ہے:

”طلب السقيا من المطر على عادة الناس اذا اخطوا“

بارش سے پانی طلب کرنا جب لوگ قحط سالی میں مبتلا ہوں۔

البتہ یہاں مطلقاً پانی طلب کرنے کی دعاء اور التجاء مراد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو ناو طریقہ سے پانی عطاء کر کے اپنی قدرت کاملہ کا اظہار فرمایا، اور اپنے نبی کے معجزہ کو ظاہر کیا۔

﴿فَقُلْنَا اضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ﴾ : ”تو ہم نے کہا مارو اپنا عصا پتھر پر“

موسیٰ علیہ السلام کا عصا کیسا تھا؟ اس میں حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کا قول یہ ہے:

”كانت عصا اخذها من بعض الاشجار“ آپ کا عصا کسی عام درخت کا تھا۔

وقيل كانت من آس الجنة طولها عشرة اذرع على طول موسى ولها

شعبتان تتقدان في الظلمة“

اور بعض حضرات نے کہا آپ کا عصا جنت کے ساگوان کے درخت کا تھا، اس کی لمبائی

دس ذراع (پندرہ فٹ) تھی جو موسیٰ علیہ السلام کے قد کے برابر تھی۔ اور اس عصا کے

آگے سے دو حصے تھے جو اندھیرے میں روشن ہو جاتے تھے۔

علامہ رازی رحمہ نے یہ ذکر کرنے کے بعد فرمایا، کہ قرآن پاک سے اتنا ثابت ہے کہ وہ عصا بڑا تھا، کیونکہ موسیٰ علیہ السلام نے اس عصا کے متعلق رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا ”اتو کا علیہا“ میں اس پر ٹیک لگا لیتا ہوں۔ اور موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ سے وہ عصا بہت بڑا اثر دہا بن گیا۔ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے کہ وہ عصا لمبا ہو اور اس میں موٹائی پائی گئی ہو۔

”وما زاد على ذلك فلا دلالة“

اور اس سے زیادہ کسی چیز کے ثبوت پر قرآن پاک نہیں دلالت کر رہا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(ارکب)

وہ پتھر جس سے پانی موسیٰ علیہ السلام کے عصا مارنے سے نکلا، وہ پتھر معین تھا یا کہ کوئی عام پتھر تھا،

صحیح قول وہی ہے جو کسیر ابی السعد سے پہلے نقل کیا جا چکا ہے کہ وہ عام پتھر تھا، معین نہیں تھا۔

جو حضرات معین پتھر مانتے ہیں وہ کہتے ہیں یہ وہ پتھر تھا جو موسیٰ علیہ السلام کے کپڑے لے کر بھاگا تھا جب آپ نے غسل کرتے وقت اس پر رکھے تھے، یہ وہاں آ کر رکھا تھا جہاں بنی اسرائیل کے کئی لوگ موجود تھے، دراصل موسیٰ علیہ السلام سے اس عیب کو دور کرنا مقصود تھا جو آپ کے علیحدہ غسل کرنے پر بنی اسرائیل آپ پر لگاتے تھے کہ ان کے خصیتین میں ہوا بھری ہوئی ہے اس لئے یہ علیحدہ نہاتے ہیں بنی اسرائیل خود ایک دوسرے کے ساتھ مل کر نہاتے تھے۔

جو لوگ معین پتھر کا قول کرتے ہیں ان کی اور دلیل یہ ہے کہ ”الحجر“ ذکر ہے جس پر الف لام عہد خارجی ہے جو تعین پر دلالت کرتا ہے، لیکن یہ دلیل قوی نہیں کیونکہ ”الف لام“ جنسی بھی ہو سکتا ہے، جو تعین پر دلالت نہیں کرتا۔ علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے فرمایا: ”او للجنس وهذا اظهر في الحجة“ الف لام کا جنسی بنانا دلائل میں زیادہ ظاہر ہے۔

”وكان من الجنة حملهما آدم فتوار ثهما الانبياء عليهم السلام حتى

وصلا الى شعيب فاعطاهما موسى عليه السلام“ (تبصير الرحمن)

موسیٰ علیہ السلام کا عصا اور پتھر دونوں ہی حضرت آدم علیہ السلام نے جنت سے لائے تھے اور انبیاء کرام کی طرف منتقل ہوتے رہے، یہاں تک کہ حضرت شعیب علیہ السلام کے پاس آ گئے اور آپ نے وہ دونوں چیزیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دے دیں..... واللہ اعلم بالصواب۔

ایسے مسائل کی تحقیق اتنی ضروری نہیں اور قرآن پاک کا مقصود بھی نہیں، تاہم اقوال اس لئے نقل کر دیئے ہیں کہ اگر کوئی خطیب کسی ایک قول کو بیان کرے تو دوسرا شخص صرف دوسرے قول کو دیکھ کر اعتراض نہ کرے۔

﴿فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا﴾: ”عطف علی مقدر ای فضرِب فانفلق“

فانفجرت کا عطف مقدر الفاظ پر ہے، حاصل کلام یہ ہے کہ آپ نے عصا کو پتھر پر مارا اور پتھر

پھٹا اور اس سے بارہ چشمے جاری ہو گئی۔ بارہ چشمے جاری کرنے کی وجہ یہ تھی:

”وَكَانَ هَذَا الْعَدَدُ دُونَ غَيْرِهِ لَكُونَهُمْ كَانُوا اثْنِي عَشَرَ سَبْطًا وَكَانَ بَيْنَهُمْ تَضَاغُنٌ وَتَنَافُسٌ فَاجْرَى اللَّهُ تَعَالَى لِكُلِّ سَبْطٍ عَيْنًا يَرُدُّهَا لِأَيُّشَرَكَهَ فِيهَا أَحَدٌ مِنَ السَّبْطِ الْآخَرِ دَفْعًا لَا تَارَةَ الشَّحْنَاءِ وَيُشِيرُ إِلَى حِكْمَةِ الْإِنْقِسَامِ“
(روح المعانی)

کہ وہ بارہ قبیلے تھے، ایک دوسرے سے عداوت رکھتے تھے، ایک ہی جگہ سے ان کا پانی پینا دشوار تھا، اس لئے رب تعالیٰ نے ان کو میدانِ تہ میں پانی دے کر جو عظیم انعام فرمایا، اس سے بڑھ کر اور یہ انعام فرمایا، کہ ان کی عداوت کے پیش نظر ان کو لڑائی جھگڑے سے بچانے کے لئے ان کی تعداد کے مطابق چشمے جاری کر دیئے۔ اور اشارۃً یہ مسئلہ بھی سمجھا دیا کہ جب مشترک چیز میں فساد کا خطرہ ہو تو اسے تقسیم کر لینا، اور فساد سے بچ جانا حکمت کا تقاضا ہے۔

﴿قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ﴾: کل سبط (مشر بہم) عینہم الی یشر بون منہا، یہاں ”اناس“ کا معنی قبیلہ ہے اور ”مشر بہم“ کا معنی وہ چشمہ جس سے وہ پانی پینے لگے، یعنی مطلب یہ ہوا کہ ہر قبیلہ نے اپنے پانی کے پینے کی جگہ کو پہچان لیا کہ یہ ہمارا چشمہ ہے۔

﴿كُلُوا وَاشْرَبُوا مِنْ رِزْقِ اللَّهِ﴾: ”کھاؤ اور پیو اللہ کے رزق سے“ یہاں ”قلنا“ مقرر ہے یعنی مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ ہم نے کہا، جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں رزق عطا فرمایا یعنی من اور سلوی اور چشموں کا پانی، ان کو کھاؤ اور پیو۔ بعض حضرات نے کہا یہاں مراد تو صرف پانی ہے، لیکن کھاؤ اور پیو کا مطلب یہ ہے کہ پانی پیو اور پانی سے پیدا ہونے والے پھل وغیرہ کھاؤ۔

لیکن پہلا قول زیادہ معتبر ہے کیونکہ یہ ارشاد ان کو میدانِ تہ میں فرمایا وہاں نباتات، پھل وغیرہ نہیں تھے۔
(از بیضاوی و شیخ زادہ)

﴿وَلَا تَعْتُوا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ﴾:

”ولا تعتدوا حال افساد کم“ اور تم زمین میں تجاوز نہ کرو فساد پھیلاتے ہوئے۔

بظاہر اس پر یہ وہی ہوتا ہے کہ تجاوز کرنا تو ہے ہی فساد، پھر دوبارہ فساد کے ذکر کرنے کا کیا فائدہ

ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ کبھی تجاوز کرنا فساد نہیں ہوتا۔ جیسا کہ کوئی دوسرا شخص زیادتی کرے، حد سے تجاوز کرے تو اس کے بدلہ میں اس طرح تجاوز کرنا جائز ہے یہ فساد نہیں بلکہ ”ولمن انتصر بعد ظلمه فاولئك ما عليهم من سبيل“ (اور بیشک جس نے اپنی مظلومی پر بدلہ لیا اون پر کچھ مواخذہ کی راہ نہیں) کا مصداق ہے۔

اسی طرح حضرت خضر علیہ السلام کا کشتی کو توڑنا، اور ایک بچے کو قتل کرنا بظاہر حد سے تجاوز تھا، لیکن یہ فساد نہیں تھا بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اصلاح کی غرض تھی۔ (انشاء اللہ اپنے مقام پر اس کی تفصیل آئے گی)۔
﴿وَلَا تَعْثُوا﴾ : میں دو لغتیں ہیں ایک باب علم سے ناقص یائی، عشی یعنی عثیا، اور دوسری لغت باب نصر سے ہے۔ ناقص واوی عثنا یعنی عثوا۔ معنی دونوں کا ایک ہی ہے فساد پھیلانا، فساد کی غرض سے حد سے تجاوز کرنا۔
(از بیضاوی و شیخ زادہ)

معجزات کا انکار جہالت ہے:

”ومن انكر امثال هذه المعجزات فلغاية جهله بالله تعالى وقلة تدبره في عجائب صنعہ“

اس قسم کے (پتھر سے پانی کا نکالنا وغیرہ) معجزات کا انکار کرنا، اللہ تعالیٰ سے بہت ہی زیادہ جاہل ہونے کی وجہ سے ہے اور اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کی صنعت کے عجائب میں تدبر کم کرنے کی وجہ سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بعض پتھروں میں یہ طاقت رکھ دی ہے کہ ان سے بال موٹے جاسکتے ہیں۔ اور بعض وہ پتھر ہیں جن سے سرکہ کو متنفر بنا دیا، جب وہ پتھر سرکہ میں ڈالو تو سرکہ ٹپک کر برتن سے باہر آ جائے گا۔

اور بعض پتھروں کو مقناطیس بنایا جو لوہے کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں، جب اللہ تعالیٰ کی قدرت کے یہ ادنیٰ کرشموں کی مثالیں ہم نے پیش کر دی ہیں، تو اسی سے واضح ہو گیا کہ موسیٰ علیہ السلام کے عصا مارنے سے پتھر سے پانی کا جاری ہونا اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے اور موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ ہے۔

(ماخوذ از بیضاوی)

تنبیہ: معجزات کا انکار کرنے والے وہ لوگ تھے جو خود یہ بحشیش کرنے والے تھے کہ پانی ہوا بن جاتا ہے ہوا پانی بن جاتی ہے، وغیرہ، یعنی فلاسفہ نے معجزات کا انکار کیا۔ البتہ یہ خیال رہے کہ فلاسفہ

کے زیادہ اختلافات کے قطع نظر فلاسفہ کی تین قسمیں ہیں۔

(۱) دھریون (۲) طبعیون (۳) الاهیون۔

دھریون : وہ لوگ تھے جن کا عقیدہ یہ تھا کہ کوئی ذات صانع اور مدبر اور عالم اور قادر نہیں۔ یعنی وہ اللہ تعالیٰ اور اس کی قدرت کو نہیں مانتے تھے بلکہ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ جہاں ہمیشہ سے موجود ہے کسی صانع اور پیدا کرنے والے کا کوئی دخل نہیں۔ بلکہ ایک حیوان کے نطفہ سے دوسرا اور دوسرے کے نطفہ سے تیسرا پیدا ہوا۔ ان کے نزدیک نہ کوئی زندہ کرنے والا ہے اور نہ کوئی مارنے والا یہ نظام عالم اسی طرح چل رہا ہے یہ لوگ زندیق ہیں، یعنی بے دین اور کافر ہیں۔

طبعیون : یہ وہ لوگ ہیں جو اکثر طور پر عالم طبیعیہ اور عجائب حیوانات اور نباتات سے بحث کرتے ہیں، حیوانات کے اعضاء کی تشریح میں زیادہ غور و خوض کرتے ہیں، جب یہ اللہ تعالیٰ کی صنعت کے عجائبات اور اس کی حکمت کے انوکھے انوکھے آثار دیکھتے ہیں تو مجبور ہو جاتے ہیں کہ یہ تسلیم کریں کہ حیوانات کا کوئی خالق ہے اور وہ حکیم ہے تمام امور اور مقاصد پر وہ مطلع ہے اس کی تخلیق عجیب نظام حکمت سے مربوط ہے۔

لیکن یہ تسلیم کرنے کے باوجود حیوانات کے اعضاء میں غور و خوض کرنے کے بعد وہ یہ کہتے ہیں کہ انسان کی قوت عاقلہ اس کے مزاج کے تابع ہے جب مزاج باطل ہو تو قوت عاقلہ بھی باطل ہو جاتی ہے۔ اور جب مزاج معدوم ہو تو قوت عاقلہ بھی معدوم ہو جاتی ہے۔

ان کی سوچ اور تفکر کی آخری حد یہ ہے کہ کوئی نفس جب مر جائے تو پھر وہ زندہ نہیں ہوگا آخرت کا یہ لوگ انکار کرتے ہیں۔ جنت و دوزخ اور قیامت و حساب کو یہ نہیں مانتے، ان کے نزدیک کسی نیکی پر کوئی ثواب مرتب نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی کسی برائی پر کوئی عذاب ہوتا ہے۔

ان کے عقیدہ میں نہ کسی کام کا کرنا واجب ہے اور نہ کسی کام سے رکنا ضروری ہے۔ یہ لوگ بھی صرف خواہشات ہی رکھتے ہیں جیسے جانور خواہشات رکھتے ہیں یہ لوگ بھی زندیق یعنی بے دین اور کافر ہیں کیونکہ مومن تو وہ ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اور اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات پر ایمان رکھتا ہو جب وہ اس ایمان سے خالی ہیں تو یقیناً زندیق ہیں۔

الاهیون : یہ متأخرین فلاسفہ ہیں جیسے ارسطو اور اس کا استاد افلاطون اور اس کا استاد سقراط ان لوگوں نے اگرچہ دھریوں اور طبیعیوں کا رد بھی کیا ہے لیکن یہ خود بھی کفریات سے نہیں نکل سکے اسی وجہ سے اسلامی فلاسفہ نے ان کا بھی رد کیا ہے اور ان کو کافر کہا ہے جیسا کہ ابن سینا اور فارابی نے اس تیسرے فرقہ کا بھی رد کیا ہے۔

واضح ہوا کہ فلاسفہ کے یہ تینوں فرقے کافر ہیں اور متأخرین حضرات ابن سینا اور فارابی وغیرہ مسلمان ہیں۔ پہلے تینوں قسم کے فلاسفہ نے معجزات کا انکار کر کے بزعم خویش علم کے دعویدار ہونے کے باوجود (بقول علامہ بیضاوی) اپنی جہالت کا ثبوت پیش کیا۔ (ماخوذ از شیخ زادہ)

سید الانبیاء کی انگلیوں سے نکلا ہوا پانی زمزم اور کوثر سے افضل ہے:

”عن جابر قال عطش الناس يوم الحديبية ورسول الله ﷺ بين يديه ركوة فتوضأ منها ثم اقبل الناس نحوه قالوا ليس عندنا ماء نتوضأ به ونشرب الا ما في ركوتك فوضع النبي ﷺ يده في الركوة فجعل الماء يفور من بين اصابعه كأمثال العيون فشربنا وتوضأنا قبل لجابر كم كنتم قال لو كنا مائة الف لكفانا كنا خمس عشرة مائة“

(بخاری، مسلم، مشکوٰۃ باب المعجزات)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حدیبیہ کے دن لوگ پیاسے ہو گئے اور رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک برتن میں پانی تھا۔ جس سے آپ نے وضوء فرمایا، پھر لوگوں نے آپ کی طرف توجہ کی اور عرض کیا کہ ہمارے پاس پانی نہیں کہ ہم اس سے وضوء کریں یا پیئیں، سوائے اس کے جو آپ کے برتن میں پانی ہے، نبی کریم ﷺ نے اپنا ہاتھ مبارک اپنے برتن میں رکھا تو آپ کی انگلیوں سے پانی کے فوارے چل پڑے جس طرح چشموں سے پانی نکلتا ہے راوی کہتے ہیں اس سے پیاسا اور وضوء کیا حضرت جابر سے پوچھا گیا کہ اس وقت تمہاری تعداد کتنی تھی؟ آپ نے فرمایا اگر ہم ایک لاکھ کی تعداد میں ہوتے تو پھر بھی ہمیں کفایت کر جاتا البتہ ہم اس وقت پندرہ سو کی تعداد میں تھے۔

ایک دوسری حدیث دیکھیں جس کے وضاحت میں عنوان کے مطابق بحث کی گئی ہے۔

☆ ”عن انس ان رسول الله ﷺ اتاه جبريل وهو يلعب مع الغلمان فاخذ فصرعه فشق

عن قلبه فاستخرج منه علقه فقال هذا حظ الشيطان منك ثم غسله فی طشت من ذهب بماء زمزم ثم لامه واعاده فی مكانه وجاء الغلمان يسعون الی امه یعنی ظنوه فقالوا ان محمدا قد قتل فاستقبلوه وهو منتقع اللون قال انس فكنت اری اثر المحيط فی صدره

(مسلم، مشکوٰۃ باب علامات النبوة)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے بے شک رسول اللہ ﷺ کے پاس جبریل آئے جب کہ آپ بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے انہوں نے آپ کو پکڑ کر لٹایا پھر آپ کے دل کی جگہ (سے سینہ) کو چاک کیا اور اس سے ایک منجمد خون کا ٹوٹھڑا نکلا اور کہا کہ یہ آپ کے جسم میں شیطان کا حصہ تھا پھر ایک سونے کے طشت میں دل کو رکھ کر زمزم کے پانی سے دھویا پھر سینے کو درست کیا (یعنی اسے ٹانگے لگائے) دل کو پانی جگہ پر لوٹا دیا (ساتھ کھیلنے والے) بچے دوڑتے ہوئے آپ کی رضاعی ماں (حلیمہ سعدیہ) کے پاس آئے تو کہنے لگے کہ محمد کو قتل کر دیا گیا۔ جب حلیمہ کے گھر کے افراد آئے تو دیکھا کہ حضور کا رنگ متغیر ہے۔ حضرت انس کہتے ہیں میں حضور کے سینہ مبارک پر سوئی سے لگے ہوئے ٹانگوں کے نشان دیکھتا تھا۔

وضاحت حدیث: سونے کے برتن استعمال کرنا نبی کریم ﷺ کی شریعت میں حرام ہے۔ لیکن جبریل نے سونے کے طشت کو استعمال کیا اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ ابھی آپ کو اعلان نبوت کا حکم نہیں دیا گیا تھا اور نہ ہی آپ کو شریعت عطاء ہوئی تھی۔ اور دوسری وجہ یہ تھی کہ یہ استعمال کرنے والے جبریل تھے اور فرشتے ہمارے افعال کے مکلف نہیں۔

آب زمزم سے دھونے کی وجہ: نبی کریم ﷺ کے دل مبارک کو آب زمزم سے دھویا گیا۔

”استدل به علی انه افضل مياہ العالم حتی ماء الکوثر“

اس کو اس مسئلہ پر دلیل بنایا گیا ہے کہ آب زمزم جہان کے تمام پانیوں سے افضل ہے یہاں تک کہ حوض کوثر اور نہر کوثر کے پانی سے بھی افضل ہے کیونکہ آپ کے دل کو دھونے کے لئے جس پانی کا انتخاب کیا گیا وہ یقیناً تمام پانیوں سے افضل ہی ہونا چاہئے۔

زمزم سے بھی افضل پانی:

”لکن الماۃ الذی نبع من بین اصابعہ ﷺ فلا شک انه افضل المياہ“

علی الاطلاق

لیکن وہ پانی جو حضور ﷺ کی انگلیوں سے جاری ہوا تھا وہ بلا شک تمام پانیوں سے مطلقاً افضل ہے۔

یعنی آب کوثر سے بھی اور آب زمزم سے بھی، چونکہ آب کوثر سے تو آب زمزم بھی اعلیٰ ہے اور آب زمزم سے وہ پانی افضل ہے جو میرے حبیب علیہ السلام کی انگلیوں سے جاری ہوا وہ کیوں افضل ہے؟

”لکونه من اثریده الشریفة وماء زمزم من اثر قدم اسمعیل المنیفة

وبون بین بینہما ولان الاعجاز الکائن فی یدہ ﷺ ابلغ“

اس لئے کہ اس پانی کو تعلق ہے سید الانبیاء کے ہاتھ مبارک سے کہ آپ کی انگلیوں سے جاری ہوا۔ اور آب زمزم کو حضرت اسمعیل علیہ السلام کے قدموں سے تعلق ہے کہ وہ آپ کی ایڑی کی حرکت سے نکلا ہے، تو ان دونوں میں بہت بڑا فرق ہے کیونکہ جب نبی کریم ﷺ تمام نبیوں سے افضل ہیں تو آپ کے ہاتھ مبارک سے ظاہر ہونے والا معجزہ بھی افضل ہے اس کمال سے جو اسمعیل علیہ السلام کی ایڑی کی رگڑ سے ظاہر ہوا۔

نبی کریم ﷺ کے اس معجزہ کو اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ نے کیا خوبصورت انداز میں بیان کیا۔

انگلیاں ہیں فیض پر ٹوٹے ہیں پیاسے جھوم کر ندیاں پنجاب رحمت کی ہیں جاری واہ واہ تنبیہ:

”وهذا الحديث وامثاله مما يجب فيه التسليم ولا يتعرض

له بتاويل من طريق المجاز اذ لا ضرورة في ذلك“

یہ شق صدر (سینہ چاک کرنے) والی حدیث ہو یا اس قسم کی اور احادیث ہوں ان کو تسلیم کرنا واجب ہے۔ اور تاویل کر کے مجازی معنی نہ لیا جائے کیونکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں، اس لئے کہ خبر دینے والے خود نبی کریم ﷺ ہیں، جن سے بڑھ کر کوئی سچا نہیں ہو سکتا، اس لئے خبر سچی ہے اور رب تعالیٰ کی قدرت سے بھی یہ کوئی بعید نہیں۔

فائدہ: نبی کریم ﷺ کے جسم اطہر سے وہ خون کا منجمد ٹکڑا کیوں نکالا گیا؟ اس لئے کہ اَر میں

یہ تاثیر رکھی ہوئی ہے کہ وہ شیطان کے اثر کو قبول کر لیتا ہے، اس کو نکال دیا گیا تا کہ اس کی وجہ سے دل مقدس اور منور ہو جائے اور وحی کو قبول کرنے کی کامل صلاحیت اس میں پیدا ہو جائے، اور نبی کریم ﷺ کو غافل کرنے کی تمام امیدیں منقطع ہو جائیں۔ وہ ٹکڑا آپ کے جسم میں رکھا ہی کیوں تھا، اس کے بغیر ہی آپ کو پیدا فرمایا جاتا اس کی کیا وجہ ہے؟

اصل وجہ یہ ہے کہ ہر انسان کے جسم میں وہ ٹکڑا ہوتا ہے اگر آپ کے جسم میں وہ حصہ شروع ہی میں نہ رکھا جاتا تو جسم میں ایک حصہ کے نہ ہونے کی وجہ سے نقص پیدا ہوتا، آپ کو چونکہ ہر عیب سے پاک پیدا فرمانا تھا، اس لئے پہلے اس حصہ کو جسم میں رکھا گیا تا کہ جسمانی کوئی نقص نہ ہو، پھر اسے نکال دیا گیا، کیونکہ اب آپ کے جسم مبارک میں وہ رہنے کے قابل نہ تھا۔

میرے استاذ مکرم حضرت علامہ ابوالحسنات محمد اشرف سیالوی مدظلہ العالی نے یہی تقریر فرمائی تھی جب آپ یہ حدیث مبارک پڑھا رہے تھے، اس وقت میرے ساتھ پڑھنے والے اور حضرات کے علاوہ یہ چار حضرات قابل ذکر تھے، مولنا شاہ محمد قصوری، مولنا قاری محمد یوسف جہلمی، مولنا عبداللطیف صاحب سرگودھوی اور مولنا ابوالفضل اللہ دتہ صاحب (بھابڑہ ضلع سرگودھا) جن کا ابھی تین ماہ پہلے وصال ہوا اللہ تعالیٰ آپ کے مدارج کو بلند فرمائے، جنت الفردوس عطا فرمائے۔

خیال رہے کہ نبی کریم ﷺ کا شق صدر (سینہ چاک کرنا) کئی مرتبہ ہوا۔ ایک مرتبہ بچپن میں جب آپ حضرت حلیمہ سعدیہ کے پاس تھے اور دوسری مرتبہ جب آپ سے جبریل امین کی غار حرا میں ملاقات ہوئی۔ اور تیسری مرتبہ معراج کی رات کو۔ (از مرقاۃ ج ۱۱ ص ۱۲۳)

مسئلہ استسقاء: اسی آیہ کریمہ کی تفسیر میں علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ جب پانی میسر نہ ہو اور بارش نہ ہو رہی ہو تو انسانوں کو چاہئے کہ وہ اپنی عبودیت کا اظہار کریں، اپنے فقر، مسکینی اور عجز کے ساتھ خلوص دل سے توبہ کرے اور رحمت کی بارش کی دعاء کرے۔

”وقل استسقی نبینا محمد ﷺ فخرج الی المصلی متواضعا متذللا

متخشعا مترسلا متضرعا“

ہمارے نبی کریم محمد مصطفیٰ ﷺ نے عید گاہ کی طرف نکل کر (نماز استسقاء) ادا کر کے اپنے

رب تعالیٰ سے بڑی عاجزی اور انکساری سے دعاء فرمائی۔

”فکیف بنا ولا توبة معنا الا العناد ومخالفة رب العباد فانی نسقی“

جب ہمارے نبی کریم ﷺ نے عاجزی سے دعاء فرمائی تو ہم کیوں نہ دعاء کریں، اور ہم توبہ کیوں نہ کریں جب ہم میں عناد بھی پایا جاتا ہے اور رب تعالیٰ کے احکام کی مخالفت بھی، اگر ہم خلوص دل سے توبہ نہیں کریں گے تو ہمیں رب تعالیٰ کی طرف سے رحمت کی بارش کیسے حاصل ہوگی؟
حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

”ولم یمنعوا زکوة اموالهم الا منعوا القطر من السماء ولو لا البهائم لم یمطروا“

جب لوگ اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کرنا چھوڑ دیتے ہیں تو رب تعالیٰ کی طرف سے بارشوں کو روک لیا جاتا ہے اگر حیوانات نہ ہوتے تو بارش کبھی نہ ہوتی۔

یعنی اللہ تعالیٰ جانوروں پر رحم فرماتا ہے تو اس رحمت سے انسان بھی فائدہ حاصل کر لیتے ہیں۔
ورنہ انسانوں کی بد اعمالیوں سے رحمت کے نزول کا کوئی حق نہیں ہوتا۔ (ماخوذ از قرطبی)

استسقاء کے تین طریقے:

☆ ”الاستسقاء ثلاثة انواع ، احدها الاستسقاء بالدعاء من غیر صلوة“

بارش طلب کرنے کے تین طریقے ہیں۔

(۱) ایک ان میں سے یہ ہے کہ بارش کے لئے بغیر نماز ادا کرنے کے دعاء کرے، یعنی عام اوقات

میں دعاء کرتا رہے یہ انتظار نہ کرے کہ جب نماز ادا کروں گا تو اس کے بعد دعاء کروں گا۔

(۲) ”الثانی الاستسقاء فی خطبة الجمعة او فی اثر صلوة مفروضة وهو افضل من النوع الذی قبله“

(۳) دوسرا طریقہ بارش طلب کرنے کا یہ ہے کہ جمعہ کے خطبہ کے دوران بارش کی دعاء کی جائے، یا

فرض نماز کے ادا کرنے کے بعد دعاء کی جائے، یہ طریقہ پہلے طریقہ سے افضل ہے۔

دوران خطبہ نبی کریم ﷺ کا دعاء کرنا:

”عن انس بن مالک ان رجلا دخل المسجد يوم الجمعة من باب كان نحو دار القضاء ورسول الله ﷺ قائم يخطب فاستقبل رسول الله ﷺ قائما ثم قال يا رسول الله هلكت الاموال وانقطعت السبل فادع الله يغثنا قال فرفع رسول الله ﷺ يديه ثم قال اللهم اغثنا اللهم اغثنا اللهم اغثنا قال انس ولا والله ما ترى في السماء من سحاب ولا قرعة وما بيننا وبين سلع من بيت ولا دار قال فطلعت من وراءه سحابة مثل الترس فلما توسطت السماء انتشرت ثم امطرت قال فلا والله ما رابنا الشمس سبتا قال ثم دخل رجل من ذلك الباب في الجمعة المقبلة ورسول الله ﷺ قائم يخطب فاستقبله قائما فقال يا رسول الله هلكت الاموال وانقطعت السبل فادع الله يمسكها عنا قال فرفع رسول الله ﷺ يديه ثم قال اللهم حولنا ولا علينا اللهم على الآكام والظراب وبطون الاودية ومنابت الشجر فانقلعت وخرجنا نمشي في الشمس،

قال شريك فسألت انس بن مالک اهو الرجل قال لا ادرى“

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک جمعہ کے دن ایک شخص دارالقضاء کے دروازہ کے جانب سے مسجد میں داخل ہوئے رسول اللہ ﷺ کھڑے ہو کر خطبہ دے رہے تھے وہ صحابی کھڑے ہو کر رسول اللہ ﷺ کی طرف توجہ کرتے ہوئے عرض کرنے لگے یا رسول اللہ مال ہلاک ہو رہے ہیں۔ راستے منقطع ہو چکے ہیں آپ اللہ تعالیٰ سے دعاء فرمائیں کہ ہمیں بارش عطا فرمائے۔ حضرت انس کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے اپنے ہاتھوں کو اٹھایا پھر تین مرتبہ کہا اے اللہ ہمیں بارش عطا فرما، حضرت انس کہتے ہیں قسم ہے اللہ تعالیٰ کی ہم آسمانوں میں کوئی بادل نہیں دیکھ رہے تھے، اور نہ ہی کوئی بادل کانٹا نظر آ رہا تھا۔ اور نہ ہی ہمارے درمیان اور سلع پہاڑ کے درمیان کوئی گھراہیا تھا کہ وہاں بادل کے آثار نظر آ رہے ہوں۔ حضرت انس کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ کے پیچھے کی جانب سے بادل نمودار ہوا جو ڈھال کی طرح تھا۔ جب آسمانوں کے درمیان پہنچا تو پھیل گیا، پھر بارش شروع ہو گئی۔ حضرت انس کہتے ہیں قسم ہے اللہ تعالیٰ کی ہمیں سورج کا ذرا بھر بھی کوئی حصہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ آئے واسے اللہ! میں پھر ایک شخص

اسی دروزہ سے داخل ہوئے جب کہ رسول اللہ ﷺ کھڑے خطبہ دے رہے تھے وہ شخص کھڑے ہو کر رسول اللہ ﷺ کی طرف متوجہ ہو کر عرض کرنے لگے یا رسول اللہ مال ہلاک ہو رہے ہیں اور راستے منقطع ہو گئے۔ آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ ہم سے بارش کو روک لے۔ حضرت انس کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے اپنے ہاتھوں کو اٹھایا، پھر عرض کیا، اے اللہ ہمارے ارد گرد بارش ہو، ہم پر نہ ہو، چھوٹے، بڑے ٹیلوں پر، وادیوں میں، درختوں کے پیدا ہونے کے مقامات پر بارش ہوتی رہے۔ حضرت انس کہتے ہیں (نبی کریم ﷺ کی دعا سے) بادل چھٹ گئے ہم دھوپ میں باہر نکلے۔ شریک کہتے ہیں میں نے حضرت انس سے پوچھا کیا دوسرے جمعہ پر عرض کرنے والے وہ پہلے شخص ہی تھے آپ نے فرمایا یہ مجھے معلوم نہیں۔

توضیح: دارالقضاء سے مراد وہ دار ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دار تھا قرض کی ادائیگی میں بیجا گیا

تھا۔ دونوں دفعہ دعاء میں ”ہلکت الاموال وانقطعت السبل“ کے الفاظ استعمال ہیں۔ پہلی مرتبہ عرض کرنے پر مقصد یہ تھا کہ قحط سالی کی وجہ سے مال ہلاک ہو رہے، پیداوار کے راستے بند ہو گئے ہیں۔ دوسری مرتبہ عرض کرنے کا مقصد یہ تھا کہ بارش بہت زیادہ ہو گئی، جس کی وجہ سے مال ہلاک ہو رہے ہیں اور ہر طرف پانی ہی پانی نظر آتا ہے جس کی وجہ سے آمدورفت کے راستے بند ہو گئے ہیں: ”اللهم اغثنا“ اگر لفظ ”اغثنا“ غیث سے لیا ہوا ہو تو معنی یہ ہوگا کہ اے اللہ ہمیں بارش عطا فرما، اور اگر ”غوث“ سے لیا ہوا ہو تو معنی یہ ہوگا ”اے اللہ ہماری فریاد رسی فرما۔

اسی وجہ سے پہلے لفظ میں دو نسخے ہیں ایک میں ہے ”یغثنا“ اور دوسرے میں ہے ”یغثنا“ نبی کریم ﷺ نے تین مرتبہ رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا ”اللهم اغثنا“ ففیہ استحباب تکرار الدعاء ثلاثا، اس سے واضح یہ ہوا کہ دعاء میں تین مرتبہ تکرار مستحب ہے۔ ”واللہ ما رأینا الشمس سبتا“ میں سبتا کا معنی ہے ٹکڑا ”اصل السبت القطع“

”وبهذا الاخبار عن معجزة رسول الله ﷺ وعظيم كرامته على ربه سبحانه وتعالى بانزال المطر سبعة ايام متوالية متصلا بسواله من غير تقديم سحاب ولا قزح ولا سبب آخر لا ظاهر ولا باطن“
اس حدیث پاک سے رسول اللہ ﷺ کا معجزہ اور آپ کا رب تعالیٰ کے ہاں عظیم کرم ہونا

واضح ہو رہا ہے کہ آپ کی دعاء سے سات دن لگاتار بارش جاری رہی جب کہ اس سے پہلے نہ کوئی بادل تھے اور نہ ہی بارش کے کسی قسم کے کوئی آثار تھے۔

”اکام“ بڑے ٹیلے، ”ظراب“ چھوٹے ٹیلے۔

حدیث پاک سے اور فائدہ یہ حاصل ہوا کہ بارش جب مقدار سے زیادہ نقصان دہ ہو جائے تو یہ دعا کرنا جائز ہے کہ اے اللہ تعالیٰ ہمیں اس بارش کے نقصان سے بچا۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے بھی ان مقامات سے بارش کو روک دینے کی درخواست کی جہاں بارش کی وجہ سے نقصان ہو رہا تھا۔ البتہ بارش کے رکنے کی دعاء کے لیے میدان میں جمع ہونا اور نماز ادا کر کے دعاء کرنے کا کوئی ثبوت نہیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے جب یہ پوچھا گیا کہ دوسرے جمعہ دعا کرنے کی عرض کرنے والے پہلے جمعہ والے ہی صحابی تھے یا کوئی اور، تو آپ نے کہا ”لا ادری“ مجھے معلوم نہیں: ”وقد جاء فی البخاری وغیرہ انہ الاول“ لیکن بخاری اور دوسری احادیث کی کتب میں یہ مذکور ہے کہ دوسرے جمعہ میں عرض کرنے والے وہی صحابی تھے جنہوں نے پہلے جمعہ میں عرض کیا تھا۔

اس حدیث پاک سے یہ واضح ہوا کہ بارش طلب کرنے کے لئے نبی کریم ﷺ نے بغیر نماز استسقاء ادا کرنے کے دوران خطبہ دعاء فرمائی:

☆ ”والثالث وهو اكملها ان يكون بصلوة ركعتين وخطبتين ويتأهب قبله بصدقة وصيام وتوبة واقبال على الخير ومجانبة الشر ونحو ذلك من طاعة الله تعالى“

☆ بارش طلب کرنے کا تیسرا طریقہ جو کہ زیادہ کامل ہے وہ یہ کہ نماز استسقاء ادا کرے اور نماز سے پہلے رب تعالیٰ کی راہ میں صدقہ کیا جائے روزے رکھے جائیں، توبہ کی جائے نیکیوں کی طرف توجہ کی جائے اور شر سے اجتناب کیا (بچا) جائے، اور ہر قسم کی اللہ تعالیٰ کی طاعت کی جائے (نماز کا طریقہ انشاء اللہ بعد میں بیان ہوگا۔ اسی میں خطبہ دینے کا حکم بیان ہو جائیگا)۔

☆ ”عن عباد بن تمیم عن عمه قال خرج النبي ﷺ الى المصلى فاستسقى واستقبل القلبة وقلب رداءه و صلى ركعتين“

حضرت عباد بن تمیم اپنے چچا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ عید گاہ کے میدان کی طرف

تشریف لے گئے بارش طلب کرنے کی دعاء کی، قبلہ کی طرف متوجہ رہے، اور اپنی چادر کو پھیرا اور دو رکعتیں پڑھیں۔
(مسلم بمع نووی ج اول کتاب صلوۃ الاستسقاء)

نماز استسقاء: دو رکعت بنیت استسقاء جماعت سے ادا کی جائیں۔ امام ان میں قراءت بلند آواز سے کرے۔ اور بعد میں عید کی طرح دو خطبے دیئے جائیں۔ ایک خطبہ بھی ہو تو کافی ہے کیونکہ عید کے خطبہ کا یہی حکم ہے۔ (راقم کے اس بیان سے خطبہ کا مسئلہ اتفاقی ہو جائے گا)

نماز استسقاء کے بعد امام چادر پھیرے، لوگ اپنی چادروں کو نہ پھیریں، چادر پھیرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس انداز پر چادر کو الٹا کرے کہ نیچے والے کونے اوپر چلے جائیں اور اوپر والے نیچے ہو جائیں۔ دائیاں کونہ بائیں طرف ہو جائے، اور بائیاں کونہ دائیں ہو جائے۔ اسی طرح کپڑے کی اوپر والی سطح نیچے ہو جائے اور نیچے والی سطح اوپر ہو جائے۔

چادر پھیرنے میں نیک تفاولی (نیک شگونی) مقصود ہوتی ہے کہ اے اللہ تعالیٰ جس طرح میں چادر پھیرنے کی طاقت رکھتا ہوں تو چادر کو الٹا پھیر رہا ہوں۔ تو ہی قدرت و طاقت کا مالک ہے اس لئے تو ہمارے حالات پھیر دے، یعنی قحط سالی کو ختم کر کے بارش عطاء فرما کر خوشحالی پیدا فرما دے۔

(از ہدایہ)

ایک غلط فہمی کا ازالہ: امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا:

”لیس فی الاستسقاء صلوۃ مسنونة فی جماعة“

بارش طلب کرنے کے لئے جماعت سے نماز ادا کرنا سنت نہیں۔

اسی طرح فقہاء کرام نے یہ بیان کیا: ”ولا خطبة عند ابی حنیفة لانہا تبع للجماعة ولا جماعة عنده“ اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک استسقاء کے لئے خطبہ بھی نہیں کیونکہ خطبہ جماعت کے تابع ہے جب ان کے نزدیک جماعت مسنون نہیں تو خطبہ بھی نہیں۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے اس قول پر عام طور پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ جب حدیث پاک سے ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے استسقاء کی نماز جماعت سے پڑھائی اور خطبہ بھی دیا تو امام صاحب نے اس کا انکار کیوں کیا۔

اس پر فقہاء کرام نے مختلف بحثیں کی ہیں۔ فتح القدیر میں بسیط بحث ہے، لیکن رالم کا موقف اس میں بہت آسان ہے، حقیقت میں ہے بھی یہی، وہ یہ ہے کہ ہدایہ کی اس عبارت کو بڑے غور سے پڑھا جائے اور سمجھا جائے ”قلنا فعلہ مرة وترکہ اخری فلم یکن سنة“ امام صاحب نے کہا کہ نبی کریم ﷺ نے کبھی بارش طلب کرنے کے لئے نماز پڑھائی اور کبھی نہیں پڑھائی، لہذا نماز باجماعت ادا کرنا سنت نہیں۔

اب ذرا بات کو سمجھیں کہ جب علامہ نووی رحمہ اللہ کی بحث سے یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ بارش طلب کرنے کے تین طریقے ہیں ان میں ایک نماز استسقاء ہے تو اسی سے واضح ہو گیا کہ امام صاحب نے نفی مطلقاً سنت ہونے کی نہیں کی، بلکہ سنت مؤکدہ ہونے کی کی ہے، آپ کا یہ کہنا ہی واضح کر رہا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے کبھی نماز باجماعت سے پڑھائی اور کبھی نماز نہیں پڑھائی۔ کہ آپ سنت غیر مؤکدہ ہونے کے قائل ہیں۔ جب نماز باجماعت ہوگی خطبہ ہوگا اور جب جماعت نہیں ہوگی تو خطبہ بھی نہیں ہوگا، لہذا خطبہ کی نفی بھی سنت مؤکدہ کی نفی ہے۔

نماز استسقاء کے بعد دعا:

”عن انس قال رأیت رسول اللہ ﷺ یرفع یدیه فی الدعاء حتی یری بیاض ابطیه“

(مسلم)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ نے (بارش طلب کرنے کے لئے) دعا میں اتنے بلند ہاتھ اٹھائے کہ آپ کی بغلوں کی سفیدی کو دیکھا جاسکتا۔

☆ ”عن انس ان نبی اللہ ﷺ کان لا یرفع یدیه فی شئی من دعائہ الا

فی الاستسقاء حتی یری بیاض ابطیه“

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ اپنی کسی دعا میں اتنے بلند ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے جتنے بارش طلب کرنے کی دعا میں اٹھاتے یہاں تک کہ آپ کی بغلوں کی سفیدی کو دیکھا جاسکتا تھا۔

غلط فہمی کا ازالہ: عام لوگ جو علم سے کورے ہیں، اور ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کے قائل نہیں، وہ کہتے

ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے سوائے استسقاء کے ہاتھ اٹھائے ہی نہیں۔ یہ ان کی غلطی ہے۔ اس پر علامہ نووی رحمہ اللہ کی بحث کو دیکھیں، اور خاص کر کے یہ سمجھیں کہ علامہ نووی رحمہ اللہ نے آجکل کے اختلافات کو پہلے سے ہی کیسے دور فرما دیا۔

”هذا الحديث يوهم ظاهره انه لم يرفع ﷺ الا في الاستسقاء وليس الامر كذلك بل قد ثبت رفع يديه ﷺ في الدعاء في مواطن غير الاستسقاء وهي اكثر من ان تحصر وقد جمعت منها نحواً من ثلاثين حديثاً من الصحيحين او احدهما“

اس حدیث سے بظاہر یہ وہم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے سوائے استسقاء کے ہاتھ اٹھائے ہی نہیں، حالانکہ اس طرح نہیں۔ بلکہ نبی کریم ﷺ کا استسقاء کے بغیر بیشمار مقامات میں ہاتھ اٹھانا ثابت ہے۔

میں نے صحیحین سے متفق علیہ احادیث یا ان دونوں میں سے کسی ایک یعنی بخاری یا مسلم سے تقریباً تیس احادیث کو جمع کیا ہے جن میں استسقاء کے بغیر ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا ثابت ہے۔ یہ احادیث میں نے شرح مہذب کے باب صفة الصوة میں جمع کی ہیں۔

”ويتأول هذا الحديث على انه لم يرفع الرفع البليغ بحيث يرى بياض ابطيه الا في الاستسقاء“

اس حدیث پاک کا مطلب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے کسی دعا میں بھی ہاتھ بہت زیادہ بلند کر کے نہیں اٹھائے کہ جس سے بغلوں کی سفیدی نظر آ جائے سوائے استسقاء کی دعا کے۔

☆ ”عن انس بن مالك ان النبي ﷺ استسقى فاشار بظهر كفيه الى السماء“ (مسلم)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے بارش طلب کرنے کے لئے دعا فرمائی اپنی ہتھیلیوں کی پیٹھ کو آسمانوں کی طرف کیا۔

”قال جماعة من اصحابنا وغيرهم السنة في كل دعاء لرفع بلاء كالقحط ونحوه ان يرفع يديه ويجعل ظهر كفيه الى السماء واذا دعا لسؤال شئ وتحصيله جعل بطن كفيه الى السماء واحتجوا بهذا“

اہل علم حضرات نے اسی حدیث سے یہ دلیل قائم کی ہے کہ ہر وہ دعاء جو مصیبتوں کے روک کرنے کیلئے ہو جیسے قحط سالی کو دور کرنے کیلئے دُعا تو اس دعاء میں اُلٹے ہاتھوں سے دعاء کرے اور ہر وہ دعاء جو کسی چیز کی طلب کی جائے وہ دعا سیدھے ہاتھوں سے کرے۔

(مسلم ج اول کتاب صلوۃ الاستسقاء مع نووی)

بادلوں کو دیکھ کر دعا کرنا:

”عن عائشة زوج النبی ﷺ انها قالت کان النبی ﷺ اذا عصفت الريح قال اللهم انی اسألك خیرها وخیر ما فیها وخیر ما ارسلت به وأعوذ بک من شرها وشر ما فیها وشر ما ارسلت به قالت واذا تخلیت السماء تغیر لونه وخرج ودخل واقبل وادبر فاذا مطرت سری عنه فعرفت ذلک عائشة فسالتہ فقال لعلہ یا عائشة کما قال قوم عاد فلما رآه عارضا مستقبل اودیتهم قالوا هذا عارض ممطرنا“

(مسلم ج اول کتاب صلوۃ الاستسقاء)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں جب تیز ہوا چلتی تو نبی کریم ﷺ کہتے اے اللہ میں تجھ سے اس کے خیر ہونے اور جو اس میں ہے اس کے خیر ہونے، اور اسے جو عطا کر کے بھیجا گیا ہے اس کے خیر ہونے کا تجھ سے سوال کرتا ہوں۔ اور اے اللہ تیری پناہ اس کے شر سے، اور جو اس میں ہے اس کے شر سے، اور جو اس میں بھیجا گیا ہے اس کے شر سے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں، جب حضور (کڑک، چمک والے) بادل دیکھتے تو آپ (کے چہرے) کا رنگ بدل جاتا، آپ کبھی داخل ہوتے کبھی آگے کی طرف متوجہ ہوتے اور کبھی پیچھے مڑتے (یعنی آپ پر بے قراری طاری رہتی) اور جب بارش ہو جاتی تو آپ کی وہ کیفیت جاتی رہتی (یعنی آپ کو خوشی ہوتی) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ کی یہ کیفیت جب محسوس کی تو آپ سے اس کی وجہ پوچھی تو آپ نے فرمایا قوم عاد نے جب عذاب کو دیکھا بادل کی طرح آسمان کے کنارے میں پھیلا ہوا ان کی وادیوں کی طرف آتا بولے یہ بادل ہے کہ ہم پر برسے گا۔

﴿بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهِ رِيحٌ فِيهَا عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾

یہ تو وہ ہے جس کو تم جلدی چاہتے تھے یہ ایک انداز ہے جس میں عذاب ہے۔ مسلم شریف

کے ہی باب میں دوسری حدیث میں یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا یا رسول اللہ:

” اری الناس اذا رأوا الغیم فرحوا رجاء ان یکون فیہ المطر و اراک اذا رأیتہ عرفت فی وجهک الکراهیة قالت فقال یا عائشة ما یؤمنی ان یکون فیہ عذاب قد عذب قوم بالریح وقد رأى قوم العذاب فقالوا هذا عارض ممطرنا“

میں لوگوں کو دیکھتی ہوں کہ وہ بادلوں کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اس امید سے کہ بارش ہوگی، اور میں آپ کو دیکھتی ہوں کہ آپ بادل کو دیکھ کر پریشان ہوتے ہیں آپ نے فرمایا اے عائشہ میں عذاب سے بے خوف نہیں ہوتا ایک قوم کو ہوا کی وجہ سے عذاب دیا گیا (اور ان کو تباہ و برباد کر دیا گیا) وہ قوم عذاب کو دیکھ کر یہی کہہ رہی تھی یہ بادل ہے ہم پر بر سے گا۔

ان احادیث سے واضح ہوا کہ بارش اور ہوا اعتدال پر رہیں تو رحمت ہیں، خوشحالی کا ذریعہ ہیں اور اگر حد سے تجاوز کر جائیں تباہی کا سبب بن جائیں تو وہی رب تعالیٰ کا عذاب ہے اسلئے بادل کو دیکھ کر اس کے خیر کی دعاء کرے۔



وَإِذْ قُلْتُمْ يَمُوسَى لَنْ نَصْبِرَ عَلَىٰ طَعَامٍ وَاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْبِتُ الْأَرْضُ مِنْ بَقْلِهَا وَقِثَّائِهَا وَفُومِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصِلِهَا قَالَ اتَسْتَبْدِلُونَ الَّذِي هُوَ أَدْنَىٰ بِالَّذِي هُوَ خَيْرٌ، اهْبِطُوا مِصْرًا فَإِنَّ لَكُمْ مَّا سَأَلْتُمْ، وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوا بِغَضَبِ اللَّهِ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ ﴿١﴾

(۱) ”اور جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم سے تو ایک کھانے پر ہرگز صبر نہ ہوگا، تو آپ اپنے رب سے دعاء کیجئے کہ زمین کی اگائی ہوئی چیزیں ہمارے لئے نکالے، کچھ ساگ اور گلڑی اور گیہوں اور مسور اور پیاز فرمایا کیا ادنیٰ چیز کو بہتر کے بدلے مانگتے ہو۔ اچھا مصر یا کسی شہر میں اترو وہاں تمہیں ملے گا جو تم نے مانگا، اور ان پر مقرر کردی گئی خواری اور ناداری اور خدا کے غضب میں لوٹے یہ بدلاتھا اس کا کہ وہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے اور انبیاء کو ناحق شہید کرتے یہ بدلاتھا ان کی نافرمانیوں اور حد سے بڑھنے کا۔“

(۲) ”اور جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم ہرگز صبر نہیں کریں گے ایک کھانے پر، تو دعاء کریں ہمارے لئے اپنے رب سے وہ پیدا کرے ہمارے لئے وہ چیزیں جو زمین اگاتی ہے۔ یعنی بنری اور گلڑی (تر، کھیرا) اور گندم اور مسور اور پیاز، فرمایا کیا تم تبدیل کرنا چاہتے ہو وہ چیز جو گھٹیا ہے اس کے بدلے جو بہتر ہے اتر جاؤ شہر میں، تو بیشک تمہارے لئے وہ ہے جو تم نے مانگا۔ اور ڈال دی گئی ان پر ذلت اور محتاجی، اور وہ لوٹے اللہ کے غضب سے، یہ اس وجہ سے کہ بیشک وہ کفر کرتے تھے اللہ تعالیٰ کی آیتوں سے، اور شہید کرتے تھے انبیاء کو ناحق (اور) یہ اس وجہ سے کہ انہوں نے نافرمانی کی اور حد سے تجاوز کرتے تھے۔“

بنی اسرائیل میدان تہ میں من اور سلوی ہر روز کھانے سے اکتا گئے، تو موسیٰ علیہ السلام کو کہنے لگے کہ ایک ہی قسم کے کھانے پر اب ہم سے صبر نہیں ہو سکتا، آپ رب تعالیٰ سے ہمارے لئے دعاء کرو کہ وہ ہمیں زمین کی پیداوار چیزیں یعنی سبزیاں اور ککڑی، گیہوں، مسوراؤں پیاز عطا کرے۔

موسیٰ علیہ السلام نے انہیں سمجھایا کہ جو چیزیں تم طلب کر رہے ہو وہ گھٹیا ہیں۔ رب تعالیٰ نے جو کھانا تمہیں عطا کر رکھا ہے وہ بہتر ہے، تمہیں بغیر مشقت کے حاصل ہو رہا ہے، لیکن ان کو جب بات نہ سمجھ آئی، وہ زمین کی پیداوار کے حاصل کرنے پر اصرار کرتے رہے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو قریبی شہر میں جانے کی اجازت دے دی کہ وہاں تمہیں تمہاری خواہش کے مطابق اشیاء حاصل ہوں گی۔

ان پر ذلت اور محتاجی کو مسلط کر دیا گیا اور وہ اللہ تعالیٰ کے غضب کے مستحق ہو گئے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیات سے کفر کرتے تھے اور انبیاء کرام کو ناحق شہید کرتے، اور اللہ تعالیٰ کے غضب کے مستحق ہونے کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے بنی موسیٰ علیہ السلام کے نافرمان تھے اور حد سے تجاوز کرنے والے تھے۔

تفصیلی وضاحت:

﴿وَإِذْ قُلْتُمْ يٰمُوسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلَىٰ طَعَامٍ وَاحِدٍ﴾ : ”اور جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم ہرگز صبر نہیں کریں گے ایک کھانے پر“ ”نادوہ باسمہ من قلة ادبہم“ (تیسرا حصہ) بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نام لے کر پکارا جس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے دلوں میں موسیٰ علیہ السلام کا ادب و احترام کم تھا، شاہ عبدالعزیز صاحب نے اس سے زیادہ واضح تحریر فرمایا:

”و دریں ندا کمال بے ادبی کر دید کہ ہمچو پیغمبر اولو العزم را بنام او خواندند و یا رسول اللہ و یا نبی اللہ و امثال ذلک نگفتند“
یاد کرو تم اس وقت کو کہ تم نے کہا ”اے موسیٰ“ اور تم نے موسیٰ علیہ السلام کا نام لے کر جو

پکارا اس میں بہت بڑی بے ادبی تم نے کی، کیونکہ تم نے اللہ تعالیٰ کے ایک عظیم مرتبہ والے نبی کو نام لے کر پکارا، حق یہ تھا کہ تم ”یا رسول اللہ“ ”یا نبی اللہ“ یا اور اس قسم کے ادب والے الفاظ سے پکارتے“

”و مضمون کلام شما نیز کمال بے ادبی بود زیرا کہ گفتید ”لن نصبر“ یعنی ماہرگز صبر نخواہیم کرد، وایں نوع کلام دلالت میکند برآنکہ صبر متیوانم کرد ولیکن باختیار خود نمیکنیم“

”اور تمہارے کلام کا مضمون بھی کامل بے ادبی پر دلالت کر رہا ہے کہ تم نے کہا ”لن نصبر“ (ہم ہرگز صبر نہیں کریں گے) ان کے اس کلام سے یہ سمجھ آ رہا ہے کہ وہ صبر کر سکتے تھے لیکن انہوں نے اپنے اختیار سے صبر نہ کرنے کے متعلق کہا کہ ہم گز صبر نہیں کریں گے۔

(عزیزی)

ان کے ”لن نصبر“ کہنے سے یہ بھی سمجھ آیا کہ وہ میدان تہ میں اترنے والے من اور سلوی کو ناپسند کرتے تھے ”اذ الصبر حبس النفس فی المضیق“ جب کہ صبر کا مطلب ہے مشکل اور تنگی میں اپنے آپ کو اس میں روکنا ان کا مطلب یہ تھا کہ اس مشکل میں ہم اپنے آپ کو کبھی نہیں روکیں گے۔

(از روح المعانی)

﴿عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ﴾: بظاہر وہم یہ ہے کہ میدان تہ میں ان کو دو کھانے حاصل تھے، ایک طعام کا ذکر کیسے کیا گیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان کا مطلب یہ تھا ”انہ لا یختلف ولا یتبدل“ کہ یہ کھانا جو ہمیں عطا کیا جاتا ہے یہ کبھی مختلف نہیں ہوتا، اس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی، یعنی ایک حال پر رہنے کی وجہ سے انہوں نے ایک ہی طعام کہہ دیا۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے:

”طعام مائدة الامیر واحد یریدون انہ لا تتغیر الوانہ“

امیر کے دسترخوان پر ہمیشہ ایک جیسا کھانا ہی رہتا ہے یعنی اس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی، حالانکہ دسترخوان پر کھانے کئی ہوتے ہیں، لیکن ہر روز وہی ہوتے ہیں ان کو ایک طعام کہہ لیا جاتا ہے۔

(از بیضاوی)

فائدہ: طعام (بافتح) کا معنی ہے ”چکھنا“ کہا جاتا ہے ”طعمہ مر“ اس کا ذائقہ کڑوا ہے الطعم (بالضم) کا معنی ہے ”طعام“

”طعام“ کھانے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَإِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوا﴾ اس مقام پر طعام کا معنی ہے ”کھانا“ اور کبھی طعام ”پینے“ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے ”وَمَنْ لَمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي“ (جس نے اس نہر سے نہ پیا وہ میرے ساتھ متعلق ہوگا) یہاں پانی کے معنی میں استعمال ہے۔ اور کبھی ”طعام“ بمعنی عذائیت کے استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ زمزم کے پانی کے متعلق رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

”انھا طعام طعم وشفاء سقم“

زمزم کے پانی میں پینے والے کے لئے عذائیت ہے اور بیمار کے لئے شفا ہے۔

(از قرطبی)

﴿فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ﴾ : ”دعاء کرو ہمارے لئے اپنے رب سے“

”وَأَمَّا سَأَلُوا مِنْ مُوسَىٰ أَنْ يَدْعُو لَهُمْ لَأَنْ دَعَاءَ الْأَنْبِيَاءِ عَلَيْهِمُ الصَّلَاةُ

وَالسَّلَامُ أَقْرَبُ لِلْإِجَابَةِ مِنْ دَعَاءِ غَيْرِهِمْ“

ان لوگوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کہا کہ تم ہمارے لئے دعا کرو خود انہوں نے دعا نہیں کی اس کی وجہ کیا تھی؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ انبیاء کرام کو رب تعالیٰ کے حضور درجہ قبولیت حاصل ہوتا ہے اس لئے ان کی دعا کو جو قبولیت کا مقام حاصل ہوتا ہے وہ دوسرے لوگوں کی دعائوں کو حاصل نہیں ہوتا۔

”عَلَىٰ أَنْ دَعَاءَ الْغَيْرِ لِلْغَيْرِ مُطْلَقًا أَقْرَبُ إِلَيْهَا فَمَا ظَنُّكَ بِدَعَاءِ

الْأَنْبِيَاءِ لَا مَمْنُومٍ“

عام طور پر جب کوئی انسان کسی دوسرے انسان کے لئے دعا کرے تو رب تعالیٰ اسے شرف قبولیت عطا فرماتا ہے تو تمہارا کیا خیال ہے کہ انبیاء کرام جب اپنی امتوں کے حق میں دعا کریں تو ان دعائوں کو کیا مقام حاصل ہوگا یقیناً ان میں عظیم درجہ کی قبولیت حاصل ہوگی۔ اس لئے کہ پاک ہستیوں کی پاک زبانوں سے نکلنے والے الفاظ کبھی رد نہیں ہو سکتے۔

”عَنْ أُمِّ الدَّرْدَاءِ قَالَتْ حَدَّثَنِي سَيْدِي أَنَّهُ سَمِعَ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ مَنْ

دَعَاءَ لِأَخِيهِ بظَهْرِ الْغَيْبِ قَالَ الْمَلِكُ الْمَوْكَلُ بِهِ آمِينَ وَلَكَ بِمِثْلِ“

(مسلم ج ۲ ص ۳۶۰)

حضرت ام الدرداء رضی اللہ عنہا سے مروی ہے میرے خاوند نے مجھے بتایا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے فرماتے ہوئے سنا جو شخص اپنے (مومن) بھائی کی غیر موجودگی میں اس کے لئے دعاء کرتا ہے اس پر ایک فرشتہ آئین کہنے کے لئے مقرر ہوتا ہے وہ دعاء قبول ہوتی ہے۔ دعاء کرنے والے کو ایسا ہی اجر ملتا ہے۔

عظیم ہستی کا دعاء کی درخواست کرنا:

جب یہ واضح ہوا کہ کوئی دوسرا شخص کسی اور کے لئے دعاء کرے تو اس میں قبولیت پائی جاتی ہے اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمرؓ کو فرمایا ”اشرکنا فی دعائک“ اپنی دعاء میں ہمیں بھی شریک کرنا، نبی کریم ﷺ نے اپنے اس ارشاد سے اپنی امت کو تعلیم دی، کہ اے میری امت کے علماء اور صوفیاء حضرات تم اپنے آپ کو بے نیاز نہ سمجھنا، کسی کو اپنے سے کم سمجھ کر دعاء کی درخواست سے اجتناب نہ کرنا، بلکہ دعاء کی درخواست ہر شخص کو کرتے رہنے چاہئے۔

وفی الاثر ”ادعونی بالسنة لم تعصونی فیہا“ رب تعالیٰ کی طرف سے یوں کہا جاتا ہے کہ مجھ سے ان زبانوں سے دعاء کرنا جن زبانوں سے تم نے میری نافرمانی نہیں کی۔

یعنی کوئی شخص بھی رب تعالیٰ کی اپنی زبان سے نافرمانی کرتا ہے۔ تو وہ اپنے حق میں جب دعاء کرے گا تو وہ نافرمان زبان سے دعاء کر رہا ہے۔ لیکن جب دوسرے کے حق میں دعاء کرے گا تو اس کے حق میں اس کی زبان پاک ہوگی، پاک زبان سے جب یہ دعاء کرے گا تو اسے شرف قبولیت حاصل ہوگا۔

لہذا واضح ہوا کہ بنسبت اپنے لئے دعاء کرنے کے دوسروں کے لئے دعاء کرنا زیادہ قبولیت کا سبب ہے۔ لہذا دعاء کرتے وقت اپنی دعاء میں اور مومنوں کے لئے بھی دعاء کرے تاکہ ان کے طفیل اس کے اپنے حق میں بھی دعاء قبول ہو۔

(از روح المعانی)

ایک عجیب حکمت: انہوں نے کہا ”ربک“ یہ نہیں کہا ”ربنا“ یعنی انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو کہا تم اپنے رب سے ہمارے لئے دعاء کرو یہ نہیں کہا کہ ”تم ہمارے رب سے ہمارے لئے دعاء کرو“۔

اس میں حکمت یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو رب تعالیٰ نے خصوصی تقرب عطا فرمایا کہ آپ سے بلا

واسطہ جبرائیل کلام فرمایا، اور آپ کو توراۃ عطا فرمائی، بنی اسرائیل کو معلوم تھا کہ یہ منصب تو ہمیں حاصل نہیں۔ تو گویا کہ انہوں نے کہا:

”ادع لنا المحسن اليك بما لم يحسن به اليك فكلما احسن اليك
من قبل نرجو ان يحسن اليك في اجابة دعائك“
کہ آپ ہمارے لئے اس ذات سے دعاء کریں جس کا آپ پر بہت احسان ہے اس
کے جتنے احسان آپ پر ہیں اتنے ہم پر نہیں۔ اس لئے جب آپ اپنے رب سے
ہمارے لئے دعاء کریں گے تو وہ آپ کی دعاء کو قبول کر کے آپ پر اور احسان فرمائے
گا، کیونکہ اس کے احسان آپ پر پہلے ہی بہت عظیم ہیں۔ (روح المعانی)

گزشتہ سے پیوستہ:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دعاء کی درخواست کرنا اس بات پر دلالت کرتا
ہے کہ آپ کا بھی عقیدہ یہی تھا کہ بزرگ ہستیوں سے دعاء کرانا باعث قبولیت ہے۔

☆ ”عن ابی ہریرۃ قال اتیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم بتمرّات فقلت یا رسول اللہ ادع اللہ فیہن
بالبرکۃ فضمہن ثم دعاء لی فیہن بالبرکۃ قال خذہن فاجعلہن فی مزودک کلما اردت
ان تاخذ منه شیاً فادخل فیہ یدک فخذہ ولا تنثرہ نثرًا فقد حملت من ذلک التمر کذا
وکذا من وسق فی سبیل اللہ فکنا ناکل منه ونطعم وکان لا یفارق حقوی حتی کان یوم
قتل عثمان فانہ انقطع“ (رواہ الترمذی، مشکوٰۃ باب المعجزات)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں چند کھجوریں لایا تو میں نے
عرض کیا یا رسول اللہ آپ اللہ تعالیٰ سے ان میں برکت کی دعاء فرمادو، آپ نے وہ کھجوریں لیں پھر ان
میں برکت کی دعاء کی آپ نے فرمایا یہ لے لو، ان کو اپنے توشہ دان میں ڈال لو، جب ان میں کھجوریں
لینا چاہو، تو اپنا ہاتھ اس میں ڈال کر نکال لیا کرو، لیکن کھجوروں کو باہر نکال کر پھیلانا نہیں، حضرت ابو ہریرہ
فرماتے ہیں ان کھجوروں میں سے ایک وسق تو میں نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کیں۔ ہم خود کھاتے بھی
رہے، کھلاتے بھی رہے، وہ کھجوریں میری کمر سے کبھی جدا نہیں ہوئیں (یعنی میں ان کو اپنی کمر سے
باندھ کر رکھتا تھا) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جس دن شہید ہوئے اس دن وہ کمر سے کھل کر بکھر گئیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے جو کچھ میں لائیں وہ کتنی مقدار میں تھیں؟

”قال الشيخ ابو نصر كانت التمرات احدى وعشرين“

شیخ ابو نصر رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ہے کہ وہ کھجوریں صرف اکیس دانے تھے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاء سے ان میں کتنی عظیم برکت ہوئی، کہ صرف اکیس کھجوریں اتنی زیادہ مقدار میں بڑھتی رہیں کہ ایک وسق تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کیں۔ وسق ساٹھ صاع کا ہوتا ہے، اور صاع تقریباً چار کلو کا ہوتا ہے۔ پھر وہ کھجوریں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور ان کے گھر والے خود بھی کھاتے رہے، اور دوسرے لوگوں کو بھی یعنی آنے والے مہمانوں کو بھی کھلاتے رہے۔

اگر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے وہ کھجوریں گر کر بکھرنے جاتیں تو عمر بھر وہ ان سے نفع حاصل کرتے رہتے، بلکہ نسل بنسل وہ کھجوریں چلتی رہتیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا ایک قول یہ بھی ہے:

”وسقط منی وضاع فخرنت علیہ حزنا شديدا“

اور مجھ سے وہ کھجوریں گر گئیں اور ضائع ہو گئیں تو میں بہت زیادہ غمناک ہو گیا۔

”وفیه ایماء الی ان الفساد اذا شاع ارتفعت البرکة“ یہاں سے ہی ایک اور بات واضح ہو گئی کہ فساد جب پھیل جاتا ہے تو اس کی نحوست سے برکت اٹھ جاتی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ افسردہ حال میں دکھ بھرے لہجہ میں فرماتے تھے۔

لنّاس هم ولی همّان بینهم هم الجراب وهم الشیخ عثمان

لوگوں کا ایک غم حاصل تھا مجھ ان کے درمیان دو غم حاصل تھے ایک تو شہ دان کا غم اور ایک بزرگ شخصیت حضرت عثمان کا یعنی باقی صحابہ کرام کو ایک عظیم غم حاصل تھا، وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا شہید کیا جانا، فتنہ و فساد کا نمودار ہونا، لیکن حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں مجھے دو غم لاحق تھے، ایک تو میرے تو شہ دان کا میری کمر سے کھل جانا، اور کھجوروں کا بکھر جانا، کیونکہ وہی ان کھجوروں کی برکت کا آخری دن تھا۔ اور دوسرا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت اور یہودیوں کی سازش اور باغیوں کی یلغار کی وجہ سے غم میں مبتلا تھا۔

(ازمرآۃ ج ۱ ص ۳۱۷)

☆ "عن عمر بن الخطاب قال انی سمعت رسول الله ﷺ يقول ان خير التابعين رجل يقال له اويس وله والده وكان به بياض فمروه فليستغفر لكم"

(مسلم ج ۲ باب من فضائل اويس القرني)

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا، بیشک تابعین میں سے بہتر وہ شخص ہے جسے اویس کہا جاتا اس کی والدہ ہے (جس کی تیمارداری کی وجہ سے وہ میرے پاس نہ آسکا) اسے برص کی مرض تھی، جب اس پر تمہارا گزر رہو تو اپنے لئے اس سے مغفرت کی دعاء کرانا۔

"فيه استحباب طلب الدعاء والاستغفار من اهل الصلاح وان كان الطالب

افضل منهم"

(نوری)

اس حدیث سے یہ واضح ہوا کہ نیک لوگوں سے دعاء کرائی جائے، ان سے مغفرت طلب کرنے کی درخواست کی جائے، خواہ دعاء کرانے والا افضل ہی کیوں نہ ہو کیونکہ صحابہ کرام کو حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ سے دعاء کرانے کو حکم دیا، جبکہ اویس تابعی تھے، صحابی تابعی سے افضل ہے۔

﴿يُخْرِجُ لَنَا مِمَّا تُنْبِئُ الْأَرْضُ﴾: "پیدا کرے ہمارے لئے وہ چیز جو زمین اگاتی ہے" طلباء حضرات خیال فرمائیں کہ اس مقام پر "يُخْرِجُ" مجزوم ہے کہ "ادع" امر کے جواب میں واقع ہے۔

اگرچہ علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے دو قول اور بھی نقل کئے ہیں لیکن ان میں تکلفات ہیں آسان صورت یہی ہے جو بیان کر دی گئی۔ ﴿يُخْرِجُ لَنَا﴾ کا اگرچہ حقیقی معنی ہے اظہار، یعنی ظاہر کرنا۔ لیکن یہاں مجازی معنی مراد ہے جو حقیقی معنی کو مستلزم ہے: "وهو الاظهار بطريق الایجاد" وہ ظاہر کرنا بطریق ایجاد، یعنی پیدا کرے ہمارے لئے وہ چیزیں جو زمین اگاتی ہے۔ (روح المعانی)

زمین کی طرف اگانے کی نسبت مجازی طور پر ہے، ظاہری طور پر سبب زمین ہے ورنہ حقیقت میں رب تعالیٰ کا فعل ہے۔ (بیضاوی)

بنی اسرائیل نے زمین کی پیداوار کا سوال کیوں کیا تھا؟ اسی کی وجہ یہ تھی "وهم كانوا فلاحه"

فنزعو الی عکرم واشتہوا ما الفوه (بیضاوی) اس لئے کہ وہ کسان تھے، کھیتی باڑی کا کام کرنے والے تھے، لہذا وہ اپنے اصل کی طرف لوٹے، اور جس چیز کی خواہش رکھتے تھے اسی کی انہوں نے تمنا کی۔ کیونکہ انسان کی اصل تربیت میں جس کی طرف رغبت ہو، عادت کے مطابق اسی کی وہ خواہش رکھتا ہے، خواہ وہ گھٹیا ہی کیوں نہ ہو، اور اس کے مقابل دوسری چیز اعلیٰ ہی کیوں نہ ہو۔

اور وجہ یہ تھی کہ وہ میدان تیرہ میں چالیس سال سے من اور سلوی کھا رہے تھے، جس سے وہ اکتا گئے انہوں نے مطالبہ کیا کہ اب ہمارا کھانا بدل دیا جائے۔ اور وجہ یہ تھی کہ انہیں یہ معلوم تھا کہ زمین کی پیداوار میدان تیرہ جیسے چٹیل مقام میں تو حاصل ہونہیں سکتی، یقیناً کہیں زرخیز زمین سے حاصل ہوگی لہذا ان کی تمنا یہ تھی کہ ہمیں میدان تیرہ سے نکال کر کسی شہر میں بھیج دیا جائے جہاں ہم آباد بھی ہو جائیں اور ہماری خواہش کے مطابق ہمیں غذا بھی حاصل ہو جائے۔

اور وجہ یہ تھی کہ انہوں نے طبیب حضرات کے اس قول کا خیال کیا کہ ایک ہی کھانا ہمیشہ کھانے سے شہوت میں نقصان ہوتا ہے، ہضم میں کمی ہو جاتی ہے، رغبت کم ہو جاتی ہے، لیکن مختلف قسم کے کھانے تناول کرنے سے شہوت میں قوت آ جاتی ہے، اور لذت بڑھ جاتی ہے تو انہوں نے اطباء کے ان اقوال کو دیکھتے ہوئے تمنا کی کہ ہمارا کھانا بدل جائے ہمیں زمین کی پیداوار حاصل ہو۔ (از کبیر)

﴿مِنْ بَقْلِهَا﴾: من بیان کے لئے ہے جس کا معنی ہوتا ہے یعنی اور ”بقل“ سے مراد علامہ بیضاوی بیان کرتے ہیں:

”والبقل ما انبتہ الارض من النخضر والمراد به اطایہ التی توکل“
حقیقت میں بقل کا معنی زمین کے اگانے والی ہر قسم کی سبزی، جو گھاس وغیرہ کو بھی شامل ہے لیکن یہاں مراد سبزی سے وہ ترکاری جو کھائی جاتی ہے۔

﴿وَقَنَائِهَا﴾: فارسی زبان میں ”قشَاء“ کا معنی خیار ہے۔ پھر اس کی دو قسمیں ہیں، ایک ”خیار دراز“ جسے کٹڑی کہا جاتا ہے ہماری زبان میں ”تر“ کہتے ہیں اور دوسری قسم ”خیار خرد“ یعنی کھیرا۔ آیہ کریمہ میں مراد عام ہے انہوں نے کٹڑی اور کھیرے دونوں کا ہی مطالبہ کیا تھا۔

(از عزیزی)

﴿ وَفُومِهَا ﴾: "اختلف فی الفوم فقیل هو الثوم لانه المشاکل للبصل ، وقیل الفوم الخنطة روی عن ابن عباس ایضا واكثر المفسرین" (از قرطبی)

”فوم“ کے معنی میں اختلاف ہے بعض نے کہا کہ یوں ”فوم“ سے مراد تھوم (لہسن) ہے کیونکہ یہ پیاز کا ہم شکل ہے اور احکام بھی دنوں کے ایک ہی ہیں، اور بعض حضرات نے کہا آیت کریمہ میں ”فوم“ سے مراد گندم ہے یہی قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے۔ اور یہی قول اکثر مفسرین کرام کا ہے۔ اسی لئے مترجمین نے گندم ہی معنی کیا ہے۔

﴿ وَعَدَسِهَا ﴾: عدس کا معنی مشہور ہے ”مسور“ یعنی عدس سے مراد جب زمین کی پیداوار مراد لیں تو اس وقت معنی فقط ”مسور“ ہی ہوگا۔ تاہم ”عدس“ کے اور معانی بھی آتے ہیں۔ خچر کو زجر کنا، مشقت اٹھانا، شدید پائمال کرنا، چلنا۔ انسان کے جسم پر آبلے بن جائیں تو ان کو ”عدسة“ کہا جاتا ہے۔ (از قرطبی)

﴿ وَبَصْلِهَا ﴾: ”بصل“ کا معنی پیاز، ان چیزوں کا ذکر صرف مثال کے طور پر تھا، کہ ہمیں زمین کی پیداوار عطا ہو۔ یعنی مثال کے طور پر سبزی اور ککڑی اور گندم اور مسور اور پیاز۔ صرف ان چیزوں کا مطالبہ کرنا ان میں انحصار (بند) کرنا مقصود نہیں تھا۔ اگرچہ تفسیر عزیزی، روح المعانی اور شیخ زادہ نے ان چیزوں کے مطالبہ کی حکمتیں بھی بیان کی ہیں۔ لیکن راقم نے ان بحثوں کو غیر ضروری سمجھ کر صرف نظر کر لیا۔

فوائد: البتہ یہاں ایسی بحثوں کا ذکر کیا جا رہا ہے جو قارئین کے لئے زیادہ مفید ہیں۔

☆ ”عن عائشة قالت کانت امی تعالجنی للسمنة ، تريد ان تدخلنی علی رسول الله ﷺ فما استقام لها ذلک حتی اکلت القشاء بالرطب فسمنت کا حسن سمنة“ (رواہ ابن ماجہ وسنادہ صحیح ، قرطبی)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں میری والدہ میرے موٹا ہونے کیلئے علاج کر رہی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ مجھے رسول اللہ ﷺ کے پاس بھیجیں، لیکن ان کو اس پر کامیابی حاصل نہیں ہو رہی تھی۔ یہاں تک کہ میں ککڑی یا کھیرا کھجور سے ملا کر کھانے لگی تو مجھ پر موٹا پا آ گیا۔

مسئلہ : پیاز اور لہسن پکا کر کھائے جائیں جب ان کی بو زائل ہو جائے تو جائز ہے اس میں کوئی

کراہیت نہیں خواہ وہ نماز سے پہلے ہی کیوں نہ کھالے۔ کچے پیاز اور لہسن کو کھانا جب کہ ان میں بو پائی جائے عام اوقات میں جائز ہے البتہ نماز سے پہلے کھانا مکروہ ہے کیونکہ ان کی بو سے دوسرے نمازیوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ اور نماز میں شریک فرشتوں کو بھی تکلیف ہوتی ہے۔

اعتراض : نبی کریم ﷺ کے ارشاد سے تو کچے پیاز اور لہسن کو کھانا مطلقاً منع نظر آتا ہے صرف نماز کے وقت کی قید لگانا تو درست نہیں: ”واحتجوا بان رسول اللہ ﷺ سماھا خبیثۃ“ ان معترضین کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان کو خبیث کہا۔ اور اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کا وصف بیان فرمایا: ”ویحرم علیہم الخبائث“ کہ آپ خبیث چیزوں کو حرام کر نیوالے ہیں۔

تو اس سے پتہ چلا کہ جس چیز کو رسول اللہ ﷺ نے خبیث کہا ہے وہ مطلقاً حرام ہے۔

جواب : دوسری احادیث میں واضح طور پر ذکر ہے کہ ان کو پکا کر ان کی بو کو زائل کر دیا جائے تو ان کا کھانا جائز ہے۔ ان کو نہ پکایا جائے تو کھا کر مسجد میں آنا منع ہے۔ نبی کریم ﷺ نے خود صحابہ کرام کو کچے پیاز کھانے کے لئے دیئے۔ اگر مطلقاً حرام ہوتے تو آپ ان کو نہ دیتے۔ آپ کا ان کو خبیث کہنا بدبودار کے معنی میں ہے۔

یہ بھی خیال رہے کہ خود نبی کریم ﷺ نے احتیاط اور تقویٰ کے طور پر لہسن والا پکا ہوا سالن بھی استعمال نہیں فرمایا لیکن صحابہ کرام کو اس کی اجازت دی۔ آئیے ان مسائل پر احادیث مبارکہ کو دیکھیں۔

☆ ”عن جابر ان النبی ﷺ اتی بیدر فیہ حضرات من بقول فوجد لہا ریحاً ، قال فاخبر بما فیہا من البقول قال قربوها ، الی بعض اصحابہ کان معہ فلما راہ کرہ اکلہا ، قال کل فانی انا جی من لا تناجی“ (اخرجه مسلم وابوداؤد)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک طشت میں کچھ سبزیاں پیش کی گئیں۔ لیکن ان میں بو پائی گئی (جیسا کہ پیاز وغیرہ میں ہوتی ہے) جب آپ کو بتایا گیا تو آپ نے اپنے پاس بیٹھے ہوئے صحابی کے متعلق فرمایا کہ یہ ان کو دے دو، جب نبی کریم ﷺ نے ان کو دیکھا کہ وہ کھانے میں کراہیت محسوس کر رہے ہیں۔ تو آپ نے فرمایا تم کھا لو، بیشک میں اس ذات سے مناجات

”فہذا بین فی الخصوص لہ والاباحۃ لغيرہ“ اس سے واضح طور پر معلوم ہو گیا کہ تمام اوقات میں کچے پیاز اور لہسن کو نبی کریم ﷺ کا استعمال نہ کرنا آپ کی تخصیص تھی دوسرے لوگوں کے لئے جائز ہے۔

پیاز لہسن کھا کر مسجد میں آنے کی ممانعت:

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت میں آتا ہے:

”من کل البصل والثوم والکراث فلا یقربن مسجدنا فان الملائکۃ

تتأذی مما یتأذی مہ بنو آدم“

جس شخص نے پیاز اور لہسن اور کراث (ایک قسم کا ساگ جس میں پیاز اور لہسن کی طرح بو آتی ہے) کھا یا وہ ہماری مسجدوں میں نہ آئے کیونکہ فرشتوں کو اس چیز سے تکلیف ہوتی ہے جس سے انسانوں کو تکلیف ہوتی ہے۔

☆ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی ایک طویل حدیث میں ذکر ہے:

”انکم ایہا الناس تاكلون شجرتین لاراہما لا خبیثین ہذا البصل

والثوم ولقد رأیت رسول اللہ ﷺ اذا وجد ریحہما من الرجل فی

المسجد أمر بہ فإخرج الی البقیع فممن اکلہما فلیمتہما طبخا

..... خرجه مسلم .

بیشک تم اے لوگو یہ دو ہنریاں کھاتے ہو، لیکن میں ان کو خبیث (ناپسند، بدبودار) سمجھتا ہوں۔ وہ پیاز اور لہسن ہیں۔ اور تحقیق میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا جب آپ ان دونوں میں سے کسی کی بو کسی شخص میں مسجد میں پاتے تو آپ اس کو بقیع کی طرف چلے جانے کا حکم عطا فرماتے، (اور فرماتے) جو شخص ان دونوں کو کھانا چاہے تو ان کو پکا کر ان کی بو کو زائل کر دے۔

اس حدیث سے یہ بھی واضح طور پر معلوم ہو گیا کہ پیاز اور لہسن پکا کر کھانا، اور کھا کر مسجد میں آنا

جائز ہے اور کچے پیاز اور لہسن کھا کر مسجد میں آنا منع ہے۔

نبی کریم ﷺ کا یکے ہسن سے پرہیز کرنا:

”عن ابی ایوب ان النبی ﷺ نزل علیہ فنزل النبی ﷺ فی السفل و ابو ایوب فی العلو فانتبه ابو ایوب لیلة فقال نمشی فوق رأس رسول الله ﷺ فتنحنوا فباتوا فی جانب ثم قال للنبی ﷺ فقال النبی ﷺ السفل ارفق فقال لا اعلو سقیفة انت تحتها فتحول النبی ﷺ فی العلو و ابو ایوب فی السفل فكان یصنع للنبی ﷺ طعاما فاذا جی به الیه سأل عن موضع اصابعه فیتبع موضع اصابعه فصنع له طعاما فیہ ثوم فلمارد الیه سأل عن موضع اصابع النبی ﷺ فقیل له لم یاکل ففزع وصعد الیه فقال احرام هو قال النبی ﷺ لا ، ولكن اکرهه قال فانی اکره ما تکره او ما کرهت قال وکان النبی ﷺ یؤتی بالوحی“

(مسلم ج ۲ ص ۱۹۱ باب اباحة اكل الثوم)

حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ (جب ہجرت کر کے مدینہ طیبہ میں آئے) میرے گھرا ترے، آپ نے مکان کے نیچے حصہ میں قیام کیا اور ابو ایوب نے اوپر والے حصہ میں۔ ایک رات حضرت ابو ایوب (اچانک) جاگ پڑے (خیال آگیا) کہا ہم رسول اللہ ﷺ کے سر کے اوپر چل رہے ہیں۔ تمام گھروالوں نے رات مکان کے ایک کونہ میں گزار دی۔ پھر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا (کہ آپ اوپر تشریف لے آئیں) آپ نے فرمایا میرے لئے نیچے والا حصہ میں رہنا آسان ہے حضرت ابو ایوب نے عرض کیا، یا رسول اللہ میں بھی اس چھت پر نہیں رہ سکتا جس کے نیچے آپ تشریف فرما ہوں۔ نبی کریم ﷺ اوپر تشریف لے گئے اور حضرت ابو ایوب نیچے آ گئے۔ وہ نبی کریم ﷺ کے لئے کھانا تیار کرتے تھے۔ جب بچا ہوا کھانا واپس آتا، تو پوچھتے رسول اللہ ﷺ کی انگلیاں کہاں لگی ہیں۔ آپ کی انگلیوں والی جگہ سے حضرت ابو ایوب تناول فرماتے۔ ایک دن انہوں نے کھانا تیار کیا اس میں لہسن ڈالا جب کھانا واپس آیا تو انہوں نے پوچھا رسول اللہ ﷺ کی انگلیاں کہاں لگی ہیں تو ان کو بتایا گیا کہ حضور نے کھانا تناول نہیں فرمایا۔ یہ گھبرا گئے، اور گئے، اور آپ سے پوچھا یا رسول اللہ کیا یہ حرام ہے؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا نہیں۔ لیکن میں اسے ناپسند سمجھتا ہوں۔ حضرت ابو ایوب نے عرض کیا میں بھی اسے ناپسند کرتا ہوں جسے آپ ناپسند سمجھتے ہیں۔

حضرت ابویوب کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے پاس وحی آتی تھی۔

وضاحت حدیث:

نبی کریم ﷺ سے جب حضرت ابویوب رضی اللہ عنہ نے پوچھا ”احرام ہو“ کیا یہ حرام ہے؟ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا ”لا“ نہیں (حرام تو نہیں) ”ہذا تصریح باباحة الثوم وهو مجمع عليه“ یہ تصریح ہے کہ لہسن مباح ہے اسی پر امت کا اجتماع ہے۔

”وكان يترك الثوم دائما لانه يتوقع مجنى الملائكة والوحى كل ساعة“

نبی کریم ﷺ ہمیشہ لہسن کے استعمال کو ترک فرماتے تھے کیونکہ آپ کو ہر وقت فرشتے کے آنے کی توقع رہتی کیونکہ آپ کے پاس وحی ہر وقت آتی رہتی تھی۔ یعنی وحی کا وقت مقرر نہیں تھا۔

حضرت ابویوب رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے جو کھانا بچ کر آتا وہ تناول فرماتے، اس سے یہ پتہ چلا۔

”قال العلماء في هذا انه يستحب للاكل والشارب ان يفضل مما ياكل ويشرب فضله ليواسي بها من بعده لا سيما ان كان ممن يترك بفضله“

علماء کرام نے فرمایا کہ کھانا کھانے والے شخص کو چاہئے کہ وہ اپنے کھانے اور پینے سے کچھ بچا دے تاکہ اس کے کھانے اور پینے سے جو بچ رہے وہ بعد میں دوسروں کے بھی کام آسکے۔ خصوصاً وہ شخص جس کے بچے ہوئے کھانے پینے سے دوسرے حضرات تبرک حاصل کرتے ہوں۔ اسے اپنے طعام اور مشروب سے ضرور بچانا چاہئے۔

”وكذا اذا كان في الطعام قلة ولهم اليه حاجة“

جب کھانا کم ہو گھر والے لوگوں کو اس کی ضرورت ہو تو ایسی صورت میں کھانے کا بچانا ضروری ہے۔

”ويتأكد هذا في حق الضيف لا سيما ان كانت عادة اهل الطعام ان

يخرجوا كل ما عندهم وتنظر عيالهم الفضلة كما يفعل كثير من الناس“

مہمان کے لئے تو بہت ضروری ہے کہ وہ کھانا تھوڑا مناسب مقدار میں کھائے اور بچا کر

واپس دے کیونکہ اکثر لوگوں کی عادت یہ ہے کہ وہ طعام مہمانوں کے آگے رکھ دیتے ہیں، ان کے اہل و عیال اس انتظار میں ہوتے ہیں کہ کھانا بچ کر آئے گا تو کھائیں گے۔ اکثر لوگوں کی یہی عادت، اس لئے ایسے حال میں مہمانوں کا تمام کھانا ہڑپ کر جانا حماقت سے خالی نہیں۔

”ونقلوا ان السلف كانوا يستحبون افضال هذه الفضلة المذكورة وهذا الحديث اصل ذلك كله“

سلف صالحین سے یہی منقول ہے کہ وہ نیک لوگوں کے بچے ہوئے کھانے، پینے کا استعمال مستحب سمجھتے، یہی حدیث ان کی دلیل ہے نبی کریم ﷺ کا پہلے نیچے والے حصہ میں قیام کرنا اپنی اور ملاقات کے لئے آنے والے صحابہ کرام کی آسانی کے لئے تھا۔

”واما كراهة ابي ايوب فمن الادب المحبوب الجميل وفيه اجلال اهل الفضل والمبالغة في الادب معهم“

حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ کا اوپر رہنے کو ناپسند کرنا، بہت ہی ادب کی وجہ سے تھا، اور اس میں اہل فضل کی بزرگی کا پاس کرنا، اور ان کے ساتھ بہت زیادہ ادب میں مبالغہ کرنے کا ثبوت ملتا ہے۔

اس حدیث پاک سے حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی فضیلت کئی وجہ سے ثابت ہو رہی ہے:

(۱) ”نزولہ ﷺ“ نبی کریم ﷺ کا ان کے گھر قیام کرنا وہ بھی اللہ تعالیٰ کے حکم سے۔

(۲) ”ادبہ معہ“ حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ کے دل میں نبی کریم ﷺ کا بہت زیادہ ادب و احترام پایا جانا۔

(۳) ”موافقہ فی ترک الثوم“ نبی کریم ﷺ کے بتانے کے باوجود کوہسن (پکے ہوئے طعام میں کسی حال میں بھی) حرام نہیں، لیکن میں ناپسند کرتا ہوں، جیسا کہ دوسری روایت میں ہے کہ میں اس سے کلام کرتا ہوں جس سے تم کلام نہیں کرتے۔ لیکن حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ کا یہ کہنا ”انسی اکسرہ ما نرکہ“ میں بھی اس چیز کو ناپسند کرتا ہوں جسے آپ ناپسند کرتے ہیں۔ یہ دلالت کرتا ہے کہ آپ کو نبی کریم ﷺ کے افعال کی تابعداری کامل طور پر حاصل تھی، اور آپ کو حضور سے بہت زیادہ محبت تھی۔

”ومن اوصاف المحب الصادق ان يحب ما احب محبوبه ويكره ما كره“

سچے محبت کے اوصاف ہی یہ ہیں کہ وہ محبوب کی پسندیدہ چیزوں سے محبت کرے اور جن چیزوں کو محبوب ناپسند سمجھے ان کو ناپسند سمجھے۔ (نووی) (ماخوذ از قرطبی)

مسور کا ذکر: حضرت علیؓ رسول اللہؐ کا فرمانِ ذیشان بیان فرماتے ہیں:

”علیکم بالعدس فانہ مبارک مقدس وانہ یرق القلب ویکثر الدمعة

فانہ بارک فیہ سبعون نبیا آخرہم عیسیٰ بن مریم“

تم مسور کا استعمال کرو، بیشک یہ مبارک اور مقدس ہے، اس سے دل میں نرمی آتی ہے،

اور آنسو زیادہ آتے ہیں، اس میں ستر انبیاء کرام نے برکت بیان کی ہے، آخر میں

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس میں برکت کا ذکر فرمایا۔ (قالہ الجوہری)

”وکان عمر بن عبد العزیز یا کل یوما خبزاً بزیت ویوما بلحم ویوما

بعدس“

حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ ایک دن روٹی زیتون سے کھاتے، اور ایک دن

گوشت سے اور ایک دن مسور سے۔ (ذکرہ الثعلبی وغیرہ)

”والعدس والزیت طعام الصالحین“ مسور اور زیتون نیک لوگوں کا طعام ہے۔

(قالہ الحلیمی)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دسترخوان پر مسور ضرور ہوتے جب آپ کسی کی مہمان نوازی

کرتے، مسور سے بدن میں خفت (ہلکا پن) آتی ہے، جس کی وجہ سے انسان عبادت میں سستی نہیں کرتا

اور مسور سے شہوات میں زیادتی نہیں ہوتی جیسا کہ گوشت سے شہوات کی زیادتی ہوتی ہے، اور یہ بھی واضح

ہے کہ شہوات کی زیادتی سے گناہوں میں مبتلا ہونے کا خطرہ رہتا ہے۔ (ماخوذ از قرطبی)

﴿وَقَوْمِهَا﴾: ”قوم“ کا اگرچہ معنی لہسن بھی لیا گیا ہے، لیکن آیت کریمہ میں زیادہ

فسرین کرام نے گندم ہی معنی مراد لیا ہے:

”والشعیر قریب منها وکان طعام اہل المدینة“

اور جو بھی گندم کے کچھ قریب ہیں، اور مدینہ طیبہ والے حضرات کا زیادہ طور پر طعام جو

کی روٹی ہی ہوا کرتی تھی۔

”کما کان العدس من طعام قریة ابراہیم علیہ السلام فصار لكل

واحد من الحبیین باحد النبیین علیہما السلام فضیلة“

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شہر میں سور کے زیادہ پائے جانے کی وجہ سے، اور آپ کے دسترخوان میں سور کے استعمال سے سور کو فضیلت حاصل ہوگئی۔

اور نبی کریم ﷺ کے شہر میں جو کے زیادہ استعمال کی وجہ سے، اور خود نبی کریم ﷺ کے جو کی روٹی کے استعمال سے جو کو فضیلت حاصل ہوگئی۔

”وقدوری ان النبی ﷺ لم یسبع هو واهله من خبز بر ثلاثة ايام متتابعة منذ قدم المدينة الى ان توفاه الله عز وجل“

(حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے) روایت بیان کی گئی ہے کہ بیشک نبی کریم ﷺ نے اور آپ کے گھر والوں نے تین دن لگا تار سیر ہو کر گندم کی روٹی نہیں کھائی، جب سے آپ مدینہ طیبہ میں تشریف لائے یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ سنا سے تشریف لے گئے۔

یعنی نبی کریم ﷺ مدینہ طیبہ میں زندگی بھر جو کی روٹی کھاتے رہے وہ بھی پیٹ بھر کر میسر نہیں تھی۔

(از قرطبی)

افسوس صد افسوس جبلاء کی عقل پر ہے جو بات بات پر یہ پوچھتے ہیں، نبی کریم ﷺ نے یہاں دعاء کی تھی یا نہیں۔ کیا یہاں ہاتھ اٹھا کر دعاء کی تھی؟ جن چیزوں کی نفی یا ثبوت کا ظاہر طور پر ذکر نہیں وہ پوچھا جاتا ہے اور جس کا واضح ذکر ہے اس کی طرف توجہ نہیں۔ نبی کریم ﷺ نے تین دن مسلسل گندم کی روٹی سیر ہو کر نہیں کھائی، لیکن لوگ ہر دن تین وقت گندم کی روٹی سیر ہو کر بھی کھا رہے ہیں، پھر دلیلیں بھی یہ دے رہے ہیں یہ کام نبی کریم ﷺ نے نہیں کیا۔

افسوس صرف اس پر ہے کہ پڑھے لکھے ہوئے لوگوں کی عقلوں پر پردہ چھا گیا۔ جس کی وجہ سے وہ احمق ہو گئے۔

﴿قَالَ اتَسْتَبْدِلُونَ الَّذِي هُوَ أَدْنَىٰ بِالَّذِي هُوَ خَيْرٌ﴾: ”کہا کیا تم تبدیلی

چاہتے ہو اس کی جو گھٹیا ہے اس کے بدلے جو بہتر ہے“ ”بنی اسرائیل کے اس مطالبہ پر کہ ہمیں زمین کی پیداوار حاصل ہو“ کے جواب میں یہ کہا گیا کیا تم اعلیٰ چیز کے بدلے گھٹیا چیز حاصل کرنا چاہتے ہو؟ ”الاستبدال وضع الشئ موضع آخر“ ایک چیز کی جگہ دوسری کو رکھنا ”استبدال“ کہلاتا ہے اسی سے ”بدل“ کا بھی استعمال ہے۔

﴿أَدْنَىٰ﴾: زجاج کے نزدیک ”دنو“ سے ماخوذ ہے، یعنی قیمت میں قرب۔ اسی معنی کے اعتبار سے جس کپڑے کی قیمت کم ہو اسے ”ثوب مقارب“ کہا جاتا ہے۔

علی بن سلیمان کا قول یہ ہے کہ ”ادنیٰ“ ماخوذ ہے ”دنسی“ سے جس کا معنی ہے ”گھٹیا ہونا“ بلکہ ”ادنیٰ“ اسے کہا جائے گا جس کا گھٹیا ہونا بہت زیادہ واضح ہو۔ اس قول کے مطابق ہمزہ میں تخفیف کی گئی ہے۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہ ماخوذ ہے ”دون“ سے جس کا معنی ہوتا ”احط“ پست ہونا۔ اصل میں یہ ”ادون“ بروزن الفعل ہوتا ہے۔ پھر قلب کیا گیا، افع کا وزن بنایا گیا یعنی ”ادنو“ ہوا پھر واؤ برطرف ماقبل فتح الف سے بدلا تو ”ادنیٰ“ ہو گیا۔

خیال رہے کہ اصل میں کیا ہے؟ اس میں اگرچہ تین قول ہیں، جن کو نقل کیا گیا ہے، لیکن تینوں کا معنی یہاں ایک ہی ہے یعنی ”گھٹیا“ چیز۔

ومعنی الاية: ”اتستبدلون البقل والقشاء والفوم والعدس والبصل الذی هو ادنیٰ بالمن والسلوی هو خیر“

من اور سلوی کی فوقیت:

من اور سلوی کے بد ملے ان کا زمین کی پیداوار طلب کرنا، اعلیٰ کے بدلے گھٹیا چیز کی طلب تھی، وہ اعلیٰ من اور سلوی تھے، وہ اعلیٰ کیوں تھے؟ اس کی چند وجہ ہیں:

(۱) سبزیوں وغیرہ کو من اور سلوی سے کوئی نسبت ہی حاصل نہیں تھی تو یقیناً من اور سلوی افضل تھے، کہاں ان کی لذت، کہاں ان کے کمالات اور کہاں سبزیوں کی لذت اور ان کے مقابل نہ رکھنا۔

(۲) من اور سلوی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر خصوصی انعام تھا، اور رب تعالیٰ کی طرف سے ہی ان کو کھانے کا حکم ہی تھا، یہ واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم پر قائم رہنا، اور اس کی نعمت کا شکر ادا کرنا ہی باعث اجر ہے اور یہی اجر و ثواب آخرت کا ذخیرہ اور توشہ ہوتا ہے۔ اور جو چیزیں وہ طلب کر رہے تھے وہ اس عظمت سے خالی تھیں، اس لئے ان کو نسبت من اور سلوی کے گھٹیا قرار دیا۔

(۳) جو چیزیں اللہ تعالیٰ نے ان کو بطور احسان عطا فرمائی تھیں، ان میں لذت اور غذاہیت بھی

زیادہ تھیں، کیونکہ وہ لوگ جن چیزوں کا مطالبہ کر رہے تھے وہ ان کی بنسبت کم درجہ تھیں۔

(۴) رب تعالیٰ کی طرف سے جو نعمت ان کو میسر تھی اس میں انہیں کوئی تکلیف نہیں اٹھانی پڑتی

تھی۔ اور نہ ہی اس میں کوئی محنت، مشقت اور تھکاوٹ لازم آتی۔ اسی وجہ سے وہ نعمت

فضیلت رکھتی تھی بنسبت اس کے جس کا وہ مطالبہ کر رہے تھے، کیونکہ اس میں ہل چلانا، فصل

کاشت کرنا، فصل کاٹنا وغیرہ ہر طرح کی محنت ہی محنت تھی۔

(۵) جو نعمت ان کو رب تعالیٰ سے مل رہی تھی اس میں یہ کوئی شک نہیں پایا جاتا تھا کہ وہ نعمت

حاصل ہوگی یا نہیں۔ کوئی چھین تو نہیں لے گا، اس پر کوئی زوال تو نہیں آئے گا۔

لیکن جو نعمت وہ حاصل کرنا چاہتے تھے اس پر ہر طرح کے خطرات تھے، کیونکہ کبھی زمین فروخت

ہوگئی کبھی بیج میسر نہ ہوا، کبھی زمین پر غاصبانہ قبضہ ہو گیا۔ کبھی فصل کاشت کر دیا لیکن بارش نہ ہوئی، کبھی

زالہ باری سے تبارہ ہو گیا وغیرہ، یقیناً اس طرح کے خطرات میں مبتلا ہونے والی اشیاء گھٹیا تھیں۔

(ماخوذ از قرطبی)

مسئلہ: فی هذه الآية دليل على جواز اكل الطيبات والمطاعم المستلذات،

وكان النبي ﷺ يحب الحلوى والعسل ويشرب الماء البارد العذب

اس آیت کریمہ سے یہ مسئلہ سمجھ آ یا کہ پاکیزہ، خلال اور لذت والے طعام کھانے جائز ہیں۔ کیونکہ

نبی کریم ﷺ حلوا اور شہد پسند فرماتے تھے (حلوا سے مراد ہر میٹھی چیز) اور آپ ٹھنڈا، میٹھا پانی پیتے تھے۔

(طریقہ)

﴿ اِهْبِطُوا مِصْرًا فَإِنَّ لَكُمْ مَّا سَأَلْتُمْ ﴾ :

”اتر جاؤ شہر میں بیشک تمہارے لئے وہ ہے جو تم نے سوال کیا“

میدان تہ بندہ پر تھا اور جس شہر میں ان کو اترنے کا حکم دیا وہ پستی پر تھا۔ اس معنی کے لحاظ سے

”ہبوط“ کا معنی حقیقی ہوگا جو ”صعود“ کی ضد ہے، یعنی اترنا۔ لیکن کبھی ”ہبوط“ کا مجازی معنی

مراد لیا جاتا ہے، جس کا مطلب ہوتا ہے، آنا، یعنی شہر میں آ جاؤ۔

﴿مِصْرًا﴾ : سے مراد خاص مشہور شہر مصر ہے، یا کہ مطلقاً اس کا معنی شہر ہے۔ اور پھر یہ منصرف ہے یا غیر منصرف ہے۔ اس میں مختلف قول ہیں۔ کسی ایک کو رائج نہ سمجھتے ہوئے اعلیٰ حضرت نے اپنے ترجمہ میں لکھا ”اچھا مصر میں یا کسی شہر میں اترؤ“

راقم نے مطلقاً ”شہر“ معنی کیا ہے چونکہ کئی مفسرین کرام نے اس معنی کو ترجیح دی ہے۔

”واللہ اعلم بالصواب“

﴿وَضَرَبْتُ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةَ وَالْمَسْكِنَةَ﴾ : ”اور ڈال دی گئی ان پر ذلت اور محتاجی“

”احیطت بہم احاطۃ القبة بمن ضربت علیہ“ خیمہ لگانے کے لئے ”ضرب“ لفظ استعمال ہوتا ہے، مطلب یہ ہوا کہ جس طرح خیمہ احاطہ کرتا ہے، اسی طرح ذلت اور محتاجی نے ان کا احاطہ کر لیا: ”او الصقت بہم من ضرب الطین علی الحائط“ یا معنی یہ ہے کہ ذلت اور محتاجی ان کے ساتھ متصل ہو گئی (چٹ گئی) جس طرح کہا جاتا ہے ”ضرب الطین علی الحائط“ کیچڑ سے دیوار پر لپائی کر دی گئی۔

اور کہا جاتا ہے ”ضرب الحاکم علی الید، ای حمل والزم“ حاکم نے یہ کام لازم کر دیا ہے اور اس کو سرانجام دینے کے لئے رعایا کو اس پر برا بیگختہ کیا ہے۔

اب مطلب یہ ہوگا ”الزموہما وقضی علیہم بہما“ کہ یہود نے ذلت اور محتاجی کو لازم پکڑا، تو رب تعالیٰ نے بھی ان کے حق میں فیصلہ دے دیا۔

ذلت سے مراد:

”قال الحسن اذلہم اللہ فلا منعة لہم وجعلہم تحت اقدام المسلمین

ولقد ادرکتہم هذه الامة“

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ذلت سے یہی مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ذلیل کر دیا، ان کو شوکت اور دبدبہ نہیں دیا، اور ان کو مسلمانوں کے قدموں کے نیچے کر دیا، اور ان کو نبی کریم ﷺ اور آپ کی امت نے ذلیل کر کے جلا وطن کر دیا۔

ایک قول یہ ہے کہ ”ذلت“ سے مراد جزیہ ہے ﴿يُعْطُونَ الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ﴾

میں ان کی ذلت جزیہ کو قرار دیا گیا۔ (از ابن کثیر)

لیکن اس قول کو علامہ رازی رحمہ اللہ نے رد کرتے ہوئے فرمایا:

”قول الجزية بعيد لان الجزية ما كانت مضروبة عليهم من اول الامر“

جزیہ والا قول درست نہیں کیونکہ ابتدائی طور پر ہی ان پر جزیہ مقرر نہیں کیا گیا۔

علامہ رازی رحمہ اللہ کا مختار ہی عظیم ترین قول ہے آپ فرماتے ہیں:

”والاقرب في الذلة ان يكون المراد منها ما يجرى مجرى

الاستحقاق كقوله تعالى فيمن يحارب ويفسد ﴿ذَلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ

فِي الدُّنْيَا﴾

ذلت سے مراد، فہم کے زیادہ قریب معنی یہ ہے کہ ہر وہ کام جو ذلت کا سبب بنے، یعنی

ان کو مستحق ذلت بنا دیا گیا ہے کہ وہ کام ہی ایسے کرتے رہیں گے کہ ان کی وجہ سے

ذلیل ہوتے رہیں گے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے لڑائی اور فساد بھڑکانے والوں کے متعلق

فرمایا ”یہ ان کے لئے رسوائی ہے دنیا میں“ یعنی ان کے کام ہی ان کے لئے دنیا میں

رسوائی کا ذریعہ بن گئے۔ (از کبیر)

مسکنت سے مراد:

”فالمراد به الفقر والفاقة وتشديد المحنة فهذا الجنس يجوز ان

يكون كالعقوبة“

اس سے مراد فقر، فاقہ، شدید محنت ہے، ہو سکتا ہے یہ جنس بھی عقوبت کی طرح ہی ہو،

یعنی ہر قسم کی محتاجی اور سزا کے مستحق ہونے کے ذرائع ان پر مسلط کر دیئے گئے۔

فائدہ جلیلہ:

”ومن العلماء من عد هذا من باب المعجزات لانه عليه السلام اخبر

عن ضرب الذلة والمسكنة عليهم ووقع الامر كذلك فكان هذا

اخبارا عن الغيب فيكون معجزا“ (کبیر)

نبی کریم ﷺ کا یہود کے متعلق خبر دینا کہ ان پر ذلت اور محتاجی ڈال دی گئی، یعنی ذلت محتاجی ان پر

چھا گئی، پھر جیسے نبی کریم ﷺ نے خبر دی، اس طرح واقع ہو جانا، یہ نبی کریم ﷺ کی غیب کی خبر ہے، اور آپ کا معجزہ ہے، سبحان اللہ علامہ رازی رحمہ اللہ نے کیا خوب بیان فرمایا کہ حضور کا علم غیب درحقیقت آپ کا معجزہ ہے، کسی کو سمجھ آ جائے تو بہتر، نہ سمجھ آئے تو اس کی قسمت۔

یہود کی ذلت پر علامہ کاظمی رحمہ اللہ کا شاندار بیان:

قوم یہود پر ذلت و مسکنت کا مسلط ہونا ایسی حقیقت ثابتہ ہے، جس کا انکار واقعات کی روشنی میں کوئی اہل انصاف نہیں کر سکتا۔ قرآن مجید بھی ”علی روس الاشہاد“ (واضح شہادت سے) فرما رہا ہے کہ ذلت و مسکنت اور دنیا و آخرت میں اللہ کا غضب ان کے حق میں مقدر ہو چکا ہے، دنیا جانتی ہے کہ یہود کی تاریخ مسلمانوں اور عیسائیوں دونوں سے بہت پرانی اور قدیم ہے، ابتداء سے لے کر آج تک ان کی تاریخ کو سامنے رکھ لیجئے کوئی دور ان کا ذلت و مسکنت سے آپ کو خالی نظر نہیں آئے گا۔ حالانکہ ایک طبقہ ان کا بہت بڑا سرمایہ دار ہے، لیکن انتہائی بخیل (کنجوس) اور حریص۔

بخیل کتنا ہی مالدار ہو مگر بخل کی وجہ سے وہ ہمیشہ مسکینی کی ہیئت (شکل) پر رہتا ہے، اور حریص کمال حرص کے سبب ہر جائز و ناجائز طریقہ سے مال جمع کرنے کی فکر میں رنج و تعب (مصیبت اور مشقت) میں مبتلا رہتا ہے، پھر یہ کہ سب یہودی مال دار نہیں بلکہ بہت سے یہود فقر و مسکنت کا شکار ہیں۔

حیوانیت و بربریت، ظلم و جور، دکھی انسانیت پر لرزہ خیز مظالم ان کی طبائع میں مرکوز (پختہ موجود) ہیں۔ عہد شکنی، وعدہ خلافی ان کا طرہ امتیاز ہے۔ ان کے ظلم و ستم کے باعث اقوام عالم کی نظروں میں وہ لائق گردن زنی (گردن اڑا دینے کے قابل) رہے ہیں۔ اسی لئے ان کی پوری تاریخ میں ایسا کوئی وقت نہیں آیا کہ ان کے جرائم کی پاداش میں لوگ انہیں قتل کرنے اور سخت تکلیفیں پہنچانے کے درپے نہ رہے ہوں۔ قرآن کے اعلان کے مطابق یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔

جیسا کہ سورۃ الاعراف میں فرمایا:

﴿وَإِذْ قَادَنَّ رَبُّكَ لَیْبَعَثَنَّ عَلَیْهِمْ إِلَى یَوْمِ الْقِیَامَةِ مَنْ یُسْؤِمُهُمْ سُوءَ الْعَذَابِ﴾

”یعنی آپ کے رب نے بتا دیا تھا کہ وہ ان یہود پر قیامت تک ایسے لوگوں کو بھیجتا رہے گا، جو

انہیں بدترین عذاب دیں گے“

☆ اس زمانہ میں بھی جب کہ یہود کی نام نہاد حکومت فلسطین میں قائم ہے، مظلوم فلسطینی ہر وقت ان کی تاک میں رہتے ہیں۔ گویا کہ وہ یہودیوں پر مسلط رہتے ہیں۔ جب بھی انہیں موقع ملتا ہے وہ یہود کو تکلیفیں پہنچانے، قتل کرنے اور قیدی بنانے کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے، اور یقیناً یہ صورت حال قیامت تک جاری رہے گی۔

البتہ ان کے لئے جان و مال کی بے حرمتی سے بچنا اللہ کی رسی کے سہارے ہو سکتا ہے، یا اس کے علاوہ ذلت و خواری سے محض (فقط) بظاہر محفوظ رہنا لوگوں کی رسی کے ذریعے ممکن ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَمَا ثَقِفُوا إِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللَّهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ﴾
 ”یعنی وہ جہاں بھی پائے جائیں ذلت ان پر مسلط کر دی گئی بجز اللہ کی رسی اور لوگوں کی رسی کے“
 اللہ کی رسی سے مراد قرآن اور اسلام ہے (قرآنی اور اسلامی حکم ایک ہے):

﴿وَإِنْ أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ﴾
 یعنی اگر کوئی مشرک تم سے پناہ مانگے تو اسے پناہ دے دو۔

اور ارشاد فرمایا ﴿حَتَّى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ﴾ یعنی (اگر وہ پناہ طلب نہ کریں تو) ان کا مال و جان محفوظ نہیں، یہاں تک کہ وہ ذلیل ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ ادا کریں، اگرچہ پناہ مانگنا اور جزیہ ادا کرنا دونوں باتیں موجب ذلت ہیں، مگر اللہ کے دین میں مستامن (جس نے امن طلب کیا) اور ذمی کا جان و مال بے حرمتی سے محفوظ رہتا ہے۔ اور لوگوں کی رسی سے مراد یہ ہے کہ غیر مسلم لوگ ان سے معاہدہ کر کے ان کی حفاظت کا ذمہ اٹھالیں۔

جیسا کہ آج کل بعض غیر مسلم بڑی طاقتوں نے یہود سے معاہدہ کر کے ان کی حفاظت کا ذمہ اٹھایا ہوا ہے، جس کے بل بوتے پر فلسطین میں یہود کی بے بنیاد حکومت کا ڈھانچہ کھڑا ہے، اگر وہ لوگ آج اپنا معاہدہ ختم کر دیں تو یہ نام نہاد حکومت باقی نہ رہے۔ بعض مفسرین نے لوگوں کی رسی کا مفہوم جزیہ بیان کیا ہے۔ اس صورت میں اللہ کی رسی اور لوگوں کی رسی ایک ہی قرار پائے گی۔ حالانکہ انسب یہ ہے

کہ یہ دونوں علیحدہ ہوں۔ (ملخص البحر المحیط ج ۳ ص ۳۲، ابن کثیر ج ۱ ص ۳۹۶)

غالباً اسی لئے قرآن مجید میں ”وَجِبِلْ مِنَ الْمُسْلِمِينَ“ کی بجائے ﴿وَجِبِلْ مِنَ النَّاسِ﴾ فرمایا گیا ہے ایسی حکومت کا قیام قرآن کی پیشگوئی کے خلاف ہرگز نہیں۔ بلکہ ”جِبِلْ مِنَ النَّاسِ“ کے الفاظ اس مسئلہ میں قرآنی صداقت کا اعلان کر رہے ہیں اور دنیا دیکھ رہی ہے کہ قرآن کے مطابق محض لوگوں کے سہارے فلسطین میں بے بنیاد اسرائیلی حکومت قائم ہے، جو آج بھی حقیقی ذلت و مسکنت اور اللہ کے غضب میں مبتلاء ہیں اور یقیناً آخرت میں بھی اللہ کے غضب میں یہ لوگ مبتلاء ہوں گے۔

(تبیان للکاظمی)

﴿وَبَاءٌ وَابْغَضِبِ مِنَ اللَّهِ﴾ : ”اور وہ لوٹے اللہ کے غضب سے“ ”وباء وا

ای انقلبوا ورجعوا الی الزامهم ذلک“ اور وہ لوٹے اللہ کے غضب سے یعنی انہوں نے اپنے کرتوتوں سے اللہ کے غضب کو اپنے آپ پر لازم قرار دے دیا۔ نبی کریم ﷺ کی ایک دعاء میں بھی یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہے:

”ابوء بنعمتک علی، ای اقربها والزمها نفسی“

اے اللہ تیری نعمتیں جو مجھ پر ہیں میں ان کا اقرار کرتا ہوں، اور اپنے نفس پر ان کو لازم پکڑتا ہوں یعنی تو نے اپنے فضل و کرم سے مجھے ان کا مستحق ہونے کا شرف عطاء فرما دیا ہے۔

اصل لغت میں رجوع (لوٹنے) کے معنی میں ہی استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے ”باء بکذا، ای رجع بہ“ ”فلاں شخص اس طرح کے حالات سے لوٹا“ اور کہا جاتا ہے ”وباء الی المباءة“ وہ اپنی منزل میں لوٹا ”مباءة“ کا معنی ہے لوٹنے کی جگہ۔ (فرطی)

تنبیہ: ”ولا یقال باء الا بشر“ اگرچہ ”باء“ کا معنی مطلقاً لوٹنا بھی آتا ہے، لیکن استعمال میں زیادہ اس کا تعلق شر سے ہو گیا۔ یعنی خیر سے لوٹنے کے لئے ”باء“ کو استعمال نہیں کیا جاتا۔ بلکہ شر سے لوٹنے کے لئے ”باء“ کو استعمال کیا جاتا ہے۔ (کبیر) ”ولا یقال باء الا موصولا اما بخیر واما بشر“ (ابن کثیر) بقاء مطلقاً استعمال نہیں ہوتا بلکہ خیر یا شر کے ساتھ متصل استعمال ہوتا ہے کبیر اور ابن کثیر کے مجموعہ کلام سے یہ مطلب حاصل ہوا کہ ”باء“ کا استعمال شر میں زیادہ

ہے اور خیر میں کم ہے۔

”البوء التسوية ، باء یوؤ بوء“ برابری کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس معنی کے لحاظ سے آیت کریمہ میں معنی ہوگا ”استوی علیہم غضب اللہ“ ان پر اللہ کا غضب برابر ہو گیا (یہ قول زجاج کا ہے) ”وباء وای استحقوا“ اور ”باء وای“ کا معنی ہے مستحق ہونا۔ یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے غضب کے مستحق ہو گئے جیسا کہ اسی معنی میں اس آیت کریمہ میں استعمال ”انسی اریدا ان تبوء بائمی واثمک“ (ہائیل نے قاتیل کو کہا)۔ بیشک میں چاہتا ہوں کہ تو مستحق ہو جائے میرے گناہ کا اور اپنے گناہ کا یعنی دونوں گناہوں کا مستحق تو ہی ہو۔

﴿بِغَضَبٍ﴾: ”واما غضب اللہ فهو ارادة الانتقام“

(کبیر)

اللہ کے غضب سے مراد انتقام کا ارادہ رکھنا۔

خیال رہے ﴿غیر المفضوب علیہم﴾ میں تفصیلی طور پر ”غضب“ کے متعلق بحث گزر چکی ہے۔ غضب سے مراد اس طرح بیان کی جائے، کہ وہ دنیا میں عذاب اور انتقام کے مستحق ہوئے، اور آخرت میں جس عذاب کے حقدار تھے اسکے مستحق ہوئے۔ اسی طرح دنیاوی اور اخروی طور پر ہر ذلت اور غیظ و غضب کے مستحق ہوئے یہاں یہ معنی کرنا زیادہ بہتر ہے ”صاروا احقاء به“ وہ غضب کے مستحق ہو گئے۔ کیونکہ رب تعالیٰ نے صراحتاً یہ نہیں ذکر فرمایا، وہ کہاں سے لوٹے اور کس طرف لوٹے۔

(از روح المعانی)

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ﴾:

”یہ اس وجہ سے کہ بیشک وہ کفر کرتے تھے اللہ کی آیتوں سے“

یہاں سے ان لوگوں پر ذلت و مسکنت کے مسلط ہونے اور غضب کے مستحق ہونے کی وجہ بیان کی جا رہی ہے کہ وہ اس کے مستحق کیوں ہوئے۔

﴿ذٰلِكَ﴾ کا اشاریہ ”ضرب الذلة والمسکنة والبوء بالغضب“ ذلت

و مسکنت کا مسلط ہونا اور غضب کا مستحق ہونا۔ ﴿بِاَنَّهُمْ﴾ میں ”با“ سببیت کے لئے ہے۔ اور

اللہ تعالیٰ کی آیات سے مراد یا تو موسیٰ علیہ السلام کے معجزات ہیں۔ اور یا توراۃ کی بعض آیات ہیں۔

اب مطلب یہ ہوگا کہ ان پر ذلت و محتاجی کا مسلط ہونا اور ان کا غضب کا مستحق ہونا اس وجہ سے تھا کہ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کے معجزات ظاہر دیکھ کر بھی کفر کیا۔ بنی اسرائیل کے لئے دریا کا پھٹ جانا اور فرعون کا غرق ہونا، میدان تہ میں ان پر بادل کا سایہ کرنا، من اور سلویٰ کا ان پر اترنا، اور پتھر سے چشموں کا جاری ہونا۔ یہ تمام معجزات ان کے سامنے ثابت ہوئے لیکن انہوں نے کفر کیا۔

اور پہلی آسمانی کتابوں یعنی توراۃ، انجیل پر انہوں نے کما حقہ (جیسا کہ حق تھا) ایمان نہ لایا، بلکہ کفر کیا۔ آیہ رجم کا انہوں نے انکار کیا۔ اور توراۃ میں نبی کریم ﷺ کے جو اوصاف تھے ان کو چھپانے کی مذموم کوشش انہوں نے کی اور ان سے کفر کیا۔ یہی کفر ان کی ذلت و رسوائی، ان کی محتاجی اور ان کے غضب کے مستحق ہونے کا سبب بنا۔

(بیضاوی)

﴿وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ﴾ : ”اور شہید کرتے تھے انبیاء کو ناحق“ ان پر ذلت اور محتاجی کے مسلط ہونے اور اللہ تعالیٰ کے غضب کے مستحق ہونے کی اور وجہ یہ بیان کی گئی کہ وہ انبیاء کرام کو ناحق شہید کرتے تھے۔

انبیاء کرام کو شہید کرنے کی وجہ:

”واهانتم حملة الشرع وهم الانبياء واتباعهم فانقصوهم الى ان افضى بهم الحال الى ان قتلوهم“

ان کی ذلت کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے حاملین شرع یعنی انبیاء کرام اور ان کے قسبیین کی توہین کی اور ان کے نقص بیان کئے، اسی کی وجہ سے ان کو یہ نحوست حاصل ہوئی کہ وہ اس حال پر پہنچ گئے کہ انہوں نے انبیاء کرام کو شہید کر ڈالا۔

اس سے بڑھ کر اور عظیم کفر کیا ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی آیات سے کفر کیا اور انبیاء کرام کو ناحق شہید کیا۔ (واضح ہوا کہ انبیاء کرام کی توہین کرنا اور نقص بیان کرنا طریقہ یہود ہے)۔

☆ حدیث شریف جس کی صحت پر اتفاق ہے ”ان رسول الله ﷺ قال الكبر بطن الحق و غمط الناس“ بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا، تکبر یہ ہے کہ حق سے اکڑ کر پھر جانا اور لوگوں کو گھٹیا سمجھنا۔

بنی اسرائیل کی گمراہی کا سبب بھی اسی قسم کا تکبر تھا۔

☆ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ کے پاس

مالک بن مرارہ رہاوی تھے، میں نے ان کو یہ کہتے ہوئے پایا:

”یا رسول اللہ قد قسم لی من الجمال ما تری فما احب ان احدا من الناس فضلنی بشراکین فما فوقهما الیس ذلک هو البغی فقال لا یس ذلک من البغی ولكن البغی من بطر اوقال سفه الحق و غمط الناس (یعنی رد الحق وانتقاص الناس والازدراء بهم والتعاضم علیهم)“
یا رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ نے مجھے جمال (خوبصورتی) کا وہ حصہ عطا فرمایا جو آپ دیکھ رہے ہیں مجھے یہ پسند نہیں کہ لوگوں میں سے کوئی شخص مجھ پر (خوبصورتی میں) دو تسموں کے برابر یا ان سے کچھ زائد فضیلت رکھے۔ کیا یہ سرکشی تو نہیں؟ آپ نے فرمایا نہیں، یہ سرکشی نہیں۔ بلکہ سرکشی یہ ہے کہ حق کو رد کر دیا جائے، لوگوں کو گھٹیا سمجھا جائے (یعنی لوگوں پر عیب لگایا جائے اپنے آپ کو بڑا سمجھا جائے)۔ (ابن کثیر)

اعتراض: رب تعالیٰ نے ذکر فرمایا ﴿بَغِیرِ الْحَقِّ﴾ ”ناحق“ انبیاء کرام کو شہید کرنا جب ہمیشہ ناقح ہی ہوتا ہے تو ”بغیر الحق“ کہنے کا کیا فائدہ ہے۔

جواب: بعض اوقات کام باطل ہوتا ہے، ناقح ہوتا ہے لیکن وہ کام کرنے والا شخص اس کام کو حق سمجھتا ہے، لیکن انبیاء کرام کو شہید کرنے والے خود بھی اپنے آپ کو باطل راہ پر سمجھتے تھے، اور اپنے اس فعل کو قبیح (برا) سمجھتے تھے۔ (از کبیر)

اعتراض: ”کیف جاز ان یخلی بین الکافرین و قتل الانبیاء“ کافروں کو انبیاء کرام کے شہید کرنے کی اجازت دینا کس طرح جائز ہے؟ (یہ تو انبیاء کرام کی توہین ہے)۔

جواب:

”ذلک کرامة لهم و زیادة فی منازلهم، کمثل من یقتل فی سبیل اللہ

من المؤمنین و لیس ذلک بخذلان لهم“

انبیاء کرام کی شہادت ان کی کرامت کی زیادتی کا سبب تھی، اور ان کے مدارج اس سے بلند

ہوئے، جیسا کہ مومنین اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہید ہونے والے شہادت سے بلند رتبہ حاصل کر لیتے ہیں یہ ان کی رسوائی نہیں ہوتی۔

”قال ابن عباس والحسن، لم يقتل بنی قبط من الانبياء الا من لم يؤمر بقتال وکل من امر بقتال نصر“

حضرت ابن عباس اور حسن بصری رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے انبیاء کرام میں کسی نبی کو شہید نہیں کیا گیا، سوائے اس کے کہ جن انبیاء کرام کو جہاد کی اجازت نہیں دی گئی، یعنی صرف وہی شہید ہوئے جن کو جہاد کی اجازت نہیں دی گئی۔ البتہ جن کو جہاد کی اجازت دی گئی وہ کامیاب ہوئے کیونکہ ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کافروں کے خلاف امداد دی گئی۔

یہود نے ایک دن میں ستر انبیاء کرام کو شہید کیا۔ جس پر ان کو کوئی غم لاحق نہ ہوا، نہ کوئی پریشانی ہوئی۔ (جل)..... یہود نے جن انبیاء کرام کو شہید کیا ان میں جلیل القدر انبیاء کرام حضرت زکریا، حضرت یحییٰ، حضرت شعیب علیہم السلام تھے۔ (بیضاوی)

انبیاء کرام کو شہید کرنا یہود کی زبانی: تب خدا کی روح..... زکریا پر نازل ہوئی سو وہ لوگوں سے بلند جگہ پر کھڑا ہو کر کہنے لگا..... چونکہ تم نے خدا کو چھوڑا ہے اس نے بھی تم کو چھوڑ دیا۔ تب انہوں نے اس کے خلاف سازش کی اور بادشاہ کے حکم سے خداوند کے گھر کے صحن میں اسے سنگسار کر دیا۔

(۲ نواریخ ۲۳، ۲۴، ۲۵)

☆ اسی طرح مرقس کے باب ۶ کی آیات ۲۹ تا ۳۱ میں حضرت یوحنا (یحییٰ علیہم السلام) کے متعلق مذکور ہے۔ کہ جب آپ نے ہیرودیس بادشاہ کو اس پر ٹوکا کہ اس نے اپنے بھائی فلپس کی بیوی ہیرو دیاس کو اپنے پاس کیوں رکھا ہوا ہے تو بادشاہ نے پہلے انہیں قید کر دیا، بعد میں اپنی داشتہ کی فرمائش پر آپ کا سر کاٹا اور ایک تھال میں رکھ کر اس کی خدمت میں پیش کیا۔ (ضیاء القرآن)

☆ پھر جب یہودیہ کی ریاست میں علانیہ بت پرستی اور بدکاری ہونے لگی اور زکریا نبی نے اس کے خلاف آواز بلند کی تو شاہ یہود اس کے ٹھم سے انہیں عین بیکل سلیمانی میں مقدس اور قربان گاہ کے درمیان سنگسار کر دیا۔

(۲ نواریخ باب ۲۳ آیت ۲۱)

انبیاء گرام کو جیل میں بھیجنا یہود کی زبانی:

ایک اور نبی حضرت میکایہ کو اسی اب نے حق گوئی کے جرم میں جیل بھیجا اور حکم دیا کہ اس شخص کو مصیبت کی روٹی کھلانا اور مصیبت کا پانی پلانا۔ (سلاطین باب ۲۲ آیت ۲۶، ۲۷)

☆ حضرت سلیمان کے بعد جب بنی اسرائیل کی سلطنت تقسیم ہو کر دوریاستوں میں یعنی یروشلم کی دولت یہودیہ اور سامریہ کی دولت اسرائیل میں بٹ گئی تو ان میں باہم لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہوا اور نوبت یہاں تک آئی کہ یہودیہ کی ریاست نے اپنے ہی بھائیوں کے خلاف دمشق کی ارامی سلطنت سے مدد مانگی۔ اس پر خدا کے حکم سے حنانی نبی نے یہودیہ کے فرمانروا آسا کو سخت تنبیہ کی۔ مگر آسانے اس تنبیہ کو قبول کرنے کے بجائے خدا کے پیغمبر کو جیل بھیج دیا۔ (۲۔ تورایخ باب ۱۷۔ آیت ۷، ۱۰)

لفظ نبی کے متعلق: اگرچہ چوتھے رکوع میں عصمت انبیاء کے ذکر میں لفظ نبی کی کافی حد تک بحث ہو چکی ہے۔ تاہم اس مقام پر علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے مزید بحث فرمائی، اس کا خلاصہ یہ ہے۔

”نبی“ مشتق ہے ”نبأ“ سے جس کا معنی ہے خبر دینا۔ نافع رحمہ اللہ نے تمام قرآن پاک میں جہاں بھی ذکر ہے ہمزہ سے پڑھا ہے یعنی ”نبیین“ پڑھا ہے۔ صرف دو مقام پر ”باء“ سے پڑھا ہے۔ ایک ”ان وھبت نفسھا للنبی ان اراد“ میں اور دوسرا ”ولا تدخلوا بیوت النبی“ میں۔ اور ”نبی“ ہمزہ کے بغیر ”نباینبو نبوا“ سے بھی لیا جاتا ہے جس کا معنی ظاہر ہونا۔ اور ”نبوة“ سے مشتق کرتے ہیں جبکہ معنی ہوتا ہے ”ارتفاع“ بلند ہونا۔ اس معنی کے لحاظ سے نبی کو نبی کہنے کی وجہ یہ ہوگی کہ وہ رفیع الشان، بلند مرتبہ ہوتے ہیں۔ اور کبھی ”نبی“ کا معنی راستہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کو نبی اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ مخلوق کو ہدایت کرتے ہیں، جیسا کہ راستہ ہدایت کرتا ہے۔

اعتراض: تم نے بیان کیا ہے کہ ”نبی“ مشتق ہے ”نبأ“ سے، جس میں ہمزہ آتا ہے اور معنی ہوتا ہے ”خبر دینا“ حالانکہ ایک روایت میں آتا ہے کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا ”السلام علیک یا نبی اللہ“ یعنی ہمزہ سے ”نبی“ ذکر کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”لست بنبی اللہ“ وھمز، ولکنی نبی اللہ“ ولم یھمز۔ میں نبی اللہ (ہمزہ سے) نہیں۔ لیکن میں تو ”نبی اللہ“

(بغیر ہمزہ کے) ہوں۔ تو کس طرح یہ ثابت کرنا درست ہے کہ ”نبی“ مشتق ہے ”نبا“ سے۔

جواب: ”قال ابو علی ضعف سند هذا الحديث“ ابو علی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ اس حدیث کی سند کو ضعیف قرار دیا گیا ہے۔ بلکہ اس سے قوی سند والی حدیث سے ثابت ہے ”قد انشده المادح، یا خاتم النبأ“ کہ نبی کریم ﷺ کی مدح کرنے والے نے آپ کے سامنے شعر پڑھا، جس میں ”یا خاتم النبأ“ ذکر فرمایا۔ ”ولم يؤثر في ذلك انكار“ لیکن آپ نے اس میں انکار نہیں فرمایا۔ گویا کہ حدیث تقریری جس کی سند قوی ہے اس پر دلالت کر رہی ہے کہ ”نبی“ مشتق ہے ”نبا“ سے

(از فرطی)

﴿ذَلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ﴾: ”(اور) یہ اس وجہ سے کہ انہوں نے نافرمانی کی اور حد سے تجاوز کرتے تھے“۔ یعنی بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کر کے، اور حد سے تجاوز کر کے اللہ تعالیٰ کی آیات سے کفر کیا اور انبیاء کرام کو شہید کیا، دراصل وجہ یہ ہے کہ:

”ان صغار الذنوب سب يؤدى الى ارتكاب كبارها كما ان صغار

الطاعات اسباب مؤدية الى تحري كبارها“

”بیشک چھوٹے چھوٹے گناہ انسان کو بڑے گناہوں کا مرتکب بنا دیتے ہیں۔ جیسا کہ چھوٹی چھوٹی نیکیاں کرنے والا انسان بڑے بڑے نیکی کے کام شروع کر دیتا ہے۔

اسی طرح بنی اسرائیل بھی اللہ تعالیٰ اور اس کے نبی کے احکام کے نافرمانی کرتے کرتے اتنے بڑے جرائم کے مرتکب ہو گئے کہ اللہ تعالیٰ کی آیات سے کفر کرنے لگے اور انبیاء کرام کو شہید کرنے لگے۔

(از بیضاوی)

☆☆☆

﴿ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَى وَالصَّابِئِينَ
مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ
عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴾

(۱) ”بے شک ایمان والے نیز یہودیوں اور نصرانیوں اور ستارہ پرستوں میں سے وہ کہ سچے دل سے اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائیں اور نیک کام کریں۔ ان کا ثواب ان کے رب کے پاس ہے، اور نہ انہیں کچھ اندیشہ ہو اور نہ کچھ غم“

(۲) ”بیشک وہ لوگ جنہوں نے ایمان لایا، اور وہ لوگ جو یہودی ہوئے، اور نصرانی اور سابی (ان میں سے) جو شخص ایمان لایا اللہ پر اور آخرت کے دن پر اور نیک عمل کئے، تو ان کے لئے ان کا اجر ان کے رب کے ہاں ہے، اور ان پر کوئی خوف نہیں ہوگا اور نہ ان پر ہونے کا۔“

شان نزول:

(۱) جب یہود اور نصاریٰ نے اپنے اپنے دعوے کئے کہ جنت میں صرف ہم ہی داخل ہوں گے، ہمارے بغیر جنت میں کوئی اور نہیں جائے گا، ان کے اس دعویٰ کو قرآن پاک میں ان الفاظ مبارکہ سے پیش کیا گیا:

﴿ وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَى ﴾

”اور انہوں نے کہا جنت میں ہرگز کوئی نہیں داخل ہوگا، سوائے ان کے جو یہودی ہوئے یا نصرانی“
یعنی یہودیوں نے کہا جنت میں صرف یہودی جائیں گے، اور نصاریٰ نے کہا جنت میں صرف نصاریٰ جائیں گے۔ تو ان کے اس کہنے پر اس آیت کریمہ کا نزول ہوا کہ خواہ ایمان والے ہوں یا یہودی ہوں یا نصرانی ہوں یا ستارہ پرست ہوں جنت میں وہی جائیں گے۔ اچھے اجر کے مستحق وہی ہوں گے جن کا اللہ تعالیٰ پر اور آخرت پر ایمان ہوگا۔

یعنی جو لوگ نبی کریم ﷺ اور آپ کی شریعت پر ایمان لائیں گے۔ ان کا ایمان ہی معتبر ہوگا۔ جن لوگوں کا ایمان معتبر ہوگا، جنت کے وہی مستحق ہوں گے، جن کا ایمان ہی معتبر نہ ہو وہ جنت کے حقدار کیسے بن بیٹھے۔
(ماخوذ از ضیاء القرآن و بیان للکاظمی)

(۲) ”نزلت فی اصحاب سلمان الفارسی بینا ہو یحدث النبی ﷺ اذ ذکر اصحابہ فاخبرہ خبرہم فقال کانوا یصلون ویصومون ویؤمنون بک ویشہدون انک ستبعث نبیا فلما فرغ سلمان من ثنائہ علیہم قال لہ نبی اللہ ﷺ یا سلمان ہم من اهل النار فاشتد ذلک علی سلمان فانزل اللہ تعالیٰ هذه الایة“
(ابن کثیر)

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں اپنے یہودی ساتھیوں کی تعریف کرنے لگے، اور ان لوگوں کی خبر بیان کرتے ہوئے عرض کیا کہ وہ لوگ نماز پڑھتے تھے، روزے رکھتے تھے اور آپ پر ایمان رکھتے تھے اور یہ گواہی دیتے تھے کہ آپ ہی آخری نبی مبعوث ہوں گے۔ جب حضرت سلمان ان لوگوں کی تعریف کر کے فارغ ہوئے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے سلمان وہ جہنمی ہیں۔ حضرت سلمان پر یہ ارشاد شاق (تکلیف دہ) گزرا، تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ کو نازل کیا۔

یعنی مقصد بیان واضح ہے کہ نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے ان لوگوں کا ایمان لانا کافی نہیں، بلکہ آپ کے تشریف لانے کے بعد جن لوگوں نے آپ پر ایمان لایا اور خلوص دل سے ایمان قبول کیا اور اس پر قائم رہے ان کا ہی ایمان معتبر ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ جب نبی کریم ﷺ نے فرمایا ”ہم اصحاب النار“ وہ لوگ جہنمی ہیں۔ تو حضرت سلمان کہتے ہیں:

”فاظلمت علی الارض فنزلت ان الذین آمنوا والذین ہادوا..... الخ

فکانما کشف عنی الجبل“

کہ مجھ پر زمین تاریک ہوگئی (اور آپ کا ارشاد پہاڑ بن کر گرا) جب یہ آیت نازل

(درمنشور)

ہوئی تو گویا کہ وہ پہاڑ مجھ سے ہٹ گیا۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ: اسی مقام پر علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ہے کہ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ، نیشاپور کے علاقہ کے رہنے والے تھے۔ آپ اس علاقہ کے اشراف سے تھے۔ بادشاہ کا بیٹا آپ کا

دوست تھا، یہ اکثر اوقات ایک ساتھ ہی رہتے تھے، ایک دن یہ دونوں شکار کرنے کے لئے گئے تو ان کو ایک خیمہ نظر آیا۔ وہاں یہ گئے تو دیکھا کہ ایک شخص خیمہ کے اندر ایک کتاب پڑھ رہا ہے۔ اور ساتھ ساتھ رو رہا ہے۔ انہوں نے اس سے پوچھا یہ کیسی کتاب ہے۔ اس شخص نے کہا خیمہ سے باہر کھڑے کھڑے سوال کا کیا مطلب ہے، اگر تم کچھ علم حاصل کرنا چاہتے ہو تو اندر آ جاؤ، یہ دونوں اندر چلے گئے۔

اس شخص نے ان کو بتایا یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اس میں رب تعالیٰ کی طاعت کا حکم دیا گیا ہے، اور اس کی معصیت سے منع کیا گیا ہے۔ یعنی چوری کرنے، زنا کرنے، لوگوں کا مال ناحق طور پر لینے سے منع کیا گیا ہے۔

اس کتاب کے اور بھی کئی احکام اس نے ان کو بتائے۔ وہ کتاب انجیل تھی جو اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام پر نازل فرمائی تھی (خیال رہے آج کل انجیل اصلی حال میں نہیں ملتی، بلکہ عیسائیوں کی من گھڑت کتاب کا نام آج کل انجیل ہے) ان کے دلوں پر بہت اثر ہوا، انہوں نے توبہ کی، اور انجیل پر ایمان لایا۔ اس شخص (راہب) نے ان دونوں کو بتایا کہ تمہاری قوم کافر ہے ان کے ذبح کئے ہوئے جانوروں کا گوشت نہ کھانا۔

یہ دونوں حضرات اس راہب کے پاس زیادہ وقت گزارتے، اور اس سے انجیل کا علم حاصل کرتے، عید کے دن بادشاہ نے اپنے دسترخوان پر مختلف قسم کے کھانے تیار کرنے کا حکم دیا، اور بڑے بڑے سرکردہ لوگوں کو دعوت دی۔ اپنے بیٹے کو بھی اس دعوت میں شرکت کے لئے بلایا، لیکن اس نے انکار کر دیا کہ میں تمہاری دعوت میں شریک نہیں ہو سکتا، تم اور تمہارے احباب ہی وہ کھانا کھا لو۔

کئی آدمی بلانے کے لئے گئے، وہ ناکام ہو کر لوٹ آئے، آخر کار بادشاہ نے زبردستی اپنے بیٹے کو اپنے دربار میں حاضر کرادیا۔ اور پوچھا کہ تم ہماری دعوت میں کیوں شریک نہیں ہو رہے؟ اس لڑکے نے بتایا کہ تم لوگ کافر ہو، تمہارے ہاتھوں سے ذبح کئے ہوئے جانور حرام ہیں۔ میں حرام گوشت نہیں کھاتا۔ بادشاہ نے اس سے پوچھا تمہیں کس نے بتایا ہے؟ لڑکے نے جواب دیا مجھے راہب نے بتایا ہے۔ راہب کو بلایا گیا اور بادشاہ نے پوچھا میرا بیٹا کیا کہتا ہے؟ اس نے کہا تمہارا بیٹا ٹھیک کہتا ہے۔ یعنی میں نے ہی اسے یہ تعلیم دی ہے۔ بادشاہ نے کہا اگر قتل کرنا ہمارے نزدیک عظیم جرم نہ ہوتا، تو میں تمہیں قتل کر دیتا لیکن تم ہماری زمین سے نکل جاؤ تمہیں جلا وطن کیا جاتا ہے۔

سلمان کہتے ہیں ہم نے راہب کے اس حال پر رونا شروع کیا، اس نے کہا اگر تم سچے ہو تو موصل کے عبادت خانہ میں آ جانا وہاں ساٹھ حضرات ہیں جو اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہیں۔ راہب چلا گیا سلمان اور بادشاہ کا بیٹا وہیں رہ گئے۔ سلمان بادشاہ کے بیٹے کو کہتے ”چلو“ ہمیں چلنا چاہئے وہ بھی کہتا ٹھیک ہے۔ لیکن اس کے سامان وغیرہ بیچنے اور تیاری کرنے میں دیر ہو گئی۔ سلمان اکیلے ہی چلے گئے، عبادت خانہ میں ان لوگوں کے پاس پہنچ گئے، اس عبادت خانہ کا منتظم راہب حضرات سے بھی بلند مرتبہ رکھتا تھا۔ سلمان بھی عبادت کرنے میں مکمل ریاضت اور مشقت اٹھاتے رہے۔

ایک دن سلمان نے اس شخص کو کہا تم مجھے کیا حکم کرتے ہو کہ میں کوئی افضل کام کروں، یعنی مجھے اس میں تم کوئی مشورہ دو۔ اس شخص نے کہا کہ میں اس عبادت خانہ کا منتظم ہوں۔ کسی کو نکالنا چاہوں تو نکال بھی سکتا ہوں، لیکن میں اپنی عبادت کو کم سمجھتے ہوئے یہاں سے ایک اور عبادت خانہ میں جا رہا ہوں۔ تم یہاں رہنا چاہو تو یہاں ہی رہو، اور میرے ساتھ دوسرے عبادت خانہ میں منتقل ہونا چاہو تو منتقل ہو جاؤ سلمان نے اس سے پوچھا کہ کس عبادت خانہ میں عبادت کرنے والے افضلیت رکھتے ہیں۔ اس نے کہا یہاں کے لوگ افضل ہیں۔ سلمان نے کہا میں پھر یہیں رہوں گا۔ سلمان وہاں ہی رہے، اسی عبادت خانہ میں لوگوں سے مل کر عبادت میں مشغول رہے۔

پھر وہ شیخ عالم بیت المقدس میں جانے لگے، تو انہوں نے سلمان کو کہا اگر تم میرے ساتھ بیت المقدس چلنا چاہتے ہو تو چلو، اور اگر تم یہاں رہنا چاہتے ہو تو یہاں ہی رہو۔ سلمان نے ان سے پوچھا افضل کیا ہے، یہاں رہنا، یا بیت المقدس میں جانا؟ انہوں نے کہا بیت المقدس میں جانا بہتر ہے۔ پھر دونوں بیت المقدس آ گئے، ایک دن شیخ نے سلمان کو کہا اس مسجد میں بہت علماء حضرات تشریف لاتے ہیں تم ان کے پاس جا کر علم حاصل کرو۔ سلمان جاتے ان سے علم حاصل کرتے۔

ایک دن سلمان بڑے غمناک حال میں واپس لوٹے، شیخ نے پوچھا، غمزدہ ہونے کی کیا وجہ ہے؟ انہوں نے کہا خیر کا زمانہ تو ہم سے پہلے گزر گیا، کیونکہ انبیاء کرام اور ان کی زیارت کرنے والے ہم سے پہلے گزر گئے۔ شیخ نے کہا:

” لا تحزن فانه بقى نبى ليس من نبى بافضل منه “

غم نہ کرو ابھی ایک نبی تشریف لانے والے ہیں جن سے کوئی نبی افضل نہیں۔

یہی وہ زمانہ ہے جس میں آپ نے تشریف لانا ہے میں تو ہو سکتا ہے ان کو نہ پاسکوں، لیکن تم جوان ہو، تم ان کو پالو گے، وہ عرب کی زمین میں تشریف لائیں گے ” فان ادر کتبہ فآمن بہ واتبعہ“ اگر تم ان کو پالو تو ان پر ایمان لانا اور ان کی تابعداری کرنا، سلمان نے کہا مجھے ان کی علامات بتائیں۔ انہوں نے فرمایا ان کی علامات یہ ہوں گی:

”وہو مختوم فی ظہرہ بخاتم النبوة وهو یا کل الهدیة ولا یا کل الصدقة“

ان کی پیٹھ پر مہر نبوت ہوگی وہ ہدیہ کھائیں گے، لیکن صدقہ نہیں کھائیں گے۔

سلمان کو بنی کلب کے دو آدمی ملے، انہوں نے ان سے پوچھا، انہوں نے بتایا کہ ہمارے علاقہ میں ایک شخص ہے جو نبوت کا دعویٰ کرتا ہے۔ سلمان آئے ان کی نبی کریم ﷺ سے ملاقات ہوئی انہوں نے آپ کی مہر نبوت دیکھ کر اور یہ دیکھ کر کہ واقعی آپ صدقہ نہیں کھاتے، بلکہ صرف ہدیہ کے طور پر دیا ہوا مال کھا لیتے ہیں تو انہوں نے ایمان قبول کر لیا۔ اسی دوران اپنے یہود ساتھیوں کی تعریف کی جس پر نبی کریم ﷺ نے ان کو جہنمی کہا، جوان پر شاق گزرا تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ (مختصر از در منشور)

قرآن تیری عظمت پر قربان:

بظاہر تو یہ وہم ہوتا ہے کہ ﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا﴾ کے بعد ﴿مَنْ آمَنَ مِنْهُمْ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ
الْآخِرِ﴾ کا کیا مطلب ہے؟ بیشک وہ لوگ جو ایمان لائے (ان میں سے) جنہوں نے اللہ تعالیٰ اور
آخرت کے دن پر ایمان لایا، اس کا کیا مطلب ہو سکتا ہے، بظاہر تو تکرار نظر آتا ہے۔

لیکن مفسرین کرام کے وضاحتی بیان سے پتہ چلا کہ ایک چھوٹے سے جملہ میں کتنے معانی رکھ دیئے
گئے، تو بے ساختہ ذہن و ضمیر نے کہا ”قرآن تیری عظمت پر قربان“ آئیے اس کے مطالب دیکھئے:

(۱) ﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا﴾ سے مراد وہ لوگ ہیں جو نبی کریم ﷺ کی بعثت (اعلان نبوت) سے
پہلے یہود کے باطل نظریات و عقائد کو چھوڑ کر عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے تھے، جیسے قیس بن ساعدہ
اور بحیری راہب اور حبیب نجار اور زید بن عمرو بن نفیل اور ورقہ ابن نوفل اور سلمان فارسی اور ابوذر غفاری
اور وفد نجاشی۔

گویا کہ رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی کا یہ مطلب ہوا:

”ان الذین آمنوا قبل مبعث محمد والذین کانوا علی الدین الباطل الذی للیہود والذین کانوا علی الدین الباطل الذی للنصارى کل من آمن منهم بعد مبعث محمد ﷺ باللہ والیوم الآخر وبمحمد فلهم اجرهم عند ربهم“

بیشک وہ لوگ جنہوں نے نبی کریم ﷺ کی بعثت سے پہلے ایمان لایا، خواہ وہ یہودیت کے باطل عقائد کو چھوڑ کر ایمان لائے تھے، یا نصرانیت کے باطل عقائد کو چھوڑ کر نصرانیت کے صحیح عقائد پر ایمان لائے تھے، اب نبی کریم ﷺ کی بعثت کے بعد اسی کا ایمان معتبر ہوگا جس نے اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر اور نبی کریم ﷺ پر ایمان لایا ان لوگوں کے لئے ہی ان کے رب کے ہاں اجر ہے۔

(۲) رب تعالیٰ نے اس سورۃ کی ابتداء میں منافقین کا ذکر فرمایا پھر یہود کا ذکر کیا، اب اس آیت کریمہ میں ﴿ان الذین آمنوا﴾ سے مراد منافقین بھی ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ بیشک وہ لوگ جو زبان سے ایمان لائے اور یہودی اور نصرانی اور صابی جو اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان لائے ان کا ہی ایمان معتبر ہے:

”فکانہ تعالیٰ قال هؤلاء المبطلون کل من اتی منهم بالایمان الحقیقی صار من المؤمنین عند اللہ تعالیٰ“

گویا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا اے باطل راہ پر چلنے والے منافقو، یہودیو، نصرانیو، صابیو، اگر تم رب تعالیٰ کے ہاں اجر چاہتے ہو تو دل سے اور حقیقی طور پر نبی کریم ﷺ پر ایمان لے آؤ۔

(۳) ﴿ان الذین آمنوا﴾ سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے ماضی میں نبی کریم ﷺ پر ایمان لایا اور ”من آمن باللہ“ کا تعلق مستقبل سے ہے۔

”فالمراد الذین آمنوا فی الماضی وثبتوا علی ذلک واستمروا علیہ فی المستقبل“

اس صورت میں مطلب یہ ہوا کہ بیشک وہ لوگ جو نبی کریم ﷺ پر حقیقی طور پر اور خلوص قلب سے ماضی میں ایمان لائے ہیں۔ ان کا ایمان اسی وقت معتبر ہوگا، اور وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اجر کے مستحق اسی وقت ہونگے جب اس ایمان پر ثابت قدم رہے اور مستقبل میں بھی اس ایمان پر قائم رہے۔ (ماخوذ از کبیر)

یہ تینوں معانی بیک وقت مراد لیں تو واضح ہو جائے گا کہ قرآن پاک کے صحیح الفاظ مبارکہ نے بڑے معانی پر مشتمل ہیں۔ خود بخود عظمت قرآن سمجھ آئے گی۔

﴿وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَى﴾: (اور جو لوگ یہودی ہوئے اور نصرانی ہوئے) جن لوگوں نے توراۃ پر عمل کیا موسیٰ علیہ السلام کی سنت پر عمل کیا۔ لیکن جب عیسیٰ علیہ السلام تشریف لے آئے۔ اس کے بعد بھی جو لوگ توراۃ پر عمل کرتے رہے اور موسیٰ علیہ السلام کی سنت پر عمل کرتے رہے انہوں نے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیا، برباد کر دیا، کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام کے آنے کے بعد موسیٰ علیہ السلام کی شریعت منسوخ ہو چکی تھی۔

اسی طرح جن لوگوں نے عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لایا، انجیل پر عمل کرتے رہے، نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری کے بعد بھی وہ اس پر قائم رہے تو انہوں نے بھی اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیا۔ نبی کریم ﷺ کے تشریف لانے پر یعنی جب سے آپ نے اعلان نبوت فرمایا۔ اسی وقت سے پہلے تمام دین منسوخ ہو گئے، اس کے بعد پہلے کسی دین پر قائم رہنا ایمان نہیں تھا۔

اب آیہ کریمہ کا مفہوم واضح ہو گیا کی بیشک وہ لوگ جو یہودی ہیں یا نصرانی ان کا اپنے اپنے دینوں پر قائم رہنا ایمان نہیں۔ بلکہ ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر اور آخرت پر ایمان لائیں اور نبی کریم ﷺ کے دین پر ایمان لائیں تو ان کا ایمان معتبر ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کیلئے اجر ہوگا۔

فائدہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اس آیہ کریمہ ﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا.....﴾ الخ کے بعد یہ آیہ نازل ہوئی:

﴿وَمَنْ يَتَّبِعْ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ، وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ﴾
”اور جس نے اسلام کے بغیر اور دین تلاش کیا وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں سے ہوگا۔“

اس سے یہ مسئلہ واضح ہو گیا:

”لا يقبل من احد طريقة ولا عملا الا ما كان موافقا لشریعة محمد ﷺ

بعد ان بعثه بما بعثه به فاما قبل ذلك فكل من اتبع الرسول في زمانه

(صابونی)

فهو على هدى وسبيل ونجاة“

کسی ایک کا کوئی طریقہ اور کوئی عمل قابل قبول نہیں ہوگا جب تک کہ اس کا ایمان ہی کریم ﷺ اور آپ کی شریعت پر نہ ہوا، لیکن یہ آپ کی بعثت کے بعد کا مسئلہ ہے۔ البتہ آپ کی بعثت سے پہلے جن لوگوں نے اپنے اپنے رسولوں پر ان کے زمانہ میں ایمان لایا، اور ان کی تابعداری کی وہ ہدایت پر تھے، اور وہی راہ ان کیلئے نجات کا ذریعہ تھی۔

یہود کو یہود کہنے کی وجہ:

- (۱) ایک وجہ یہ ہے کہ انہوں نے پچھڑے کی عبادت کرنے کے بعد توبہ کر لی تھی اس لئے ان کو یہود کہا گیا جیسا کہ رب تعالیٰ نے ان کے قبول کو ذکر فرمایا ﴿إِنَّا هَدَيْنَا إِلَيْكَ﴾ ای تبنا ورجعنا“ بیشک ہم نے (اے اللہ) تیری طرف توبہ کی۔
- (۲) حضرت یعقوب علیہ السلام کے بڑے بیٹے کا نام ”یہودا“ (ذال معجمہ کے ساتھ) تھا، پھر جب عربی میں اس کا استعمال ہوا تو دال مہملہ کے ساتھ استعمال ہوا یعنی یہودا کہا گیا، اسی کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے اس کی اولاد کو بھی یہود کہا گیا۔
- (۳) ان کو یہود اس لئے کہا گیا ”لأنهم يتهودون ای يتحركون عند قراءة التوراة“ کہ وہ توراة پڑھتے ہوئے حرکت کرتے تھے، کیونکہ ایک معنی یہود کا حرکت کرنا ہے۔ (از کبیر)
- (۴) ”وقرئ (هادوا) بفتح الدال ای مال بعضهم الی بعض“ ایک قراءت میں ”هادوا“ دال کے فتح (زبر) سے بھی پڑھا گیا ہے۔ اس معنی کے لحاظ پر ان کو ”هادوا“ اس لئے کہا گیا ہے کہ ان میں سے بعض بعض کی طرف مائل ہوئے۔ (روح المعانی)
- (۵) ”والیهود من الهوادة وهی المودة فكانهم سموا بذلك لمودتهم“ یہود مشتق ہے ”هوادة“ سے جس کا معنی محبت کرنا، وہ آپس میں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے اسلئے ان کو یہود کہا گیا۔ (از صابونی)

نصاری کو نصاریٰ کہنے کی وجہ:

- (۱) ایک بستی تھی جس کا نام ناصرہ تھا، اس میں عیسیٰ علیہ السلام تشریف لے جاتے تھے، وہاں کے لوگ اس بستی کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے ”نصاردا“ کہلائے۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے متبعین ایک دوسرے کی امداد کرتے تھے، اسی وجہ سے ان کا نام نصاریٰ رکھ لیا گیا۔

(۳) عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریوں کو کہا ”من انصاری الی اللہ“ اللہ کے دین میں میرا مددگار کون ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا ﴿نَحْنُ أَنْصَارُ اللَّهِ﴾ اللہ کے دین کے ہم مددگار ہیں تو اسی وجہ سے ان کو نصاریٰ کہا گیا۔

یہاں یہ بھی خیال رہے کہ صاحب کشف نے کہا ہے ”نصاری“ جمع ہے ”نصران“ کی کہا جاتا ہے ”رجل نصران“ (مددگار) اور کہا جاتا ہے ”امراة نصرانة“ (عورت مددگار) نصرانی میں یاء مبالغہ کے لئے ہے جیسا کہ ”احمری“ میں۔ ان کو عیسیٰ علیہ السلام کے مددگار ہونے کی وجہ سے نصاریٰ کہا گیا۔ (از کبیر)

تنبیہ: کبیر سے جو وجوہ بیان کی گئی ہیں۔ ان میں سے پہلی وجہ کی علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے مزید وضاحت کی کہ عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت قدس کے مقام پر بیت اللحم میں ہوئی، پھر آپ کی والدہ آپ کو مصر میں لے آئیں۔ پھر آپ جب بارہ سال کے ہوئے تو آپ کی والدہ آپ کو ملک شام میں لے آئیں اور ناصرہ بستی میں مقیم ہوئیں۔ اس وجہ سے ان لوگوں کو نصاریٰ کہا گیا۔ (روح المعانی)

تاہم علامہ رازی رحمہ اللہ نے ناصرہ بستی کے متعلق عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر کرتے ہوئے ”وکان یزلیھا“ کے الفاظ ذکر فرمائے، میں نے اس کا ترجمہ آسان با محاورہ لکھا تشریف لے جاتے تھے۔

﴿وَالصَّابِئِينَ﴾: بعض حضرات کے قول کے مطابق یہ لفظ عجمی ہے۔ اور بعض حضرات نے کہا یہ عربی لفظ ہے زیادہ معتبر یہی قول ہے۔ جب لفظ عربی ہو تو اس کا اصل کیا ہے، ایک قول یہ ہے کہ یہ مہوز اللام ہے ”صبا بالهمز اذا خرج“ صبا کے آخر میں ہمزہ ہے، اس کا معنی ہے نکل جانا، اس معنی کے لحاظ پر ان کو صابی کہنے کی وجہ یہ ہے ”لنخروجهم عن الدين الحق“ وہ دین حق سے نکلے ہوئے تھے۔

ایک اور قول یہ ہے کہ یہ ناقص (معتل اللام) ہے یعنی ”صبا یصبوا صبوا“ سے لیا ہوا ہے ”صبا بمعنی بال“ صبا کا معنی ہے میلان کرنا۔ اس معنی کے لحاظ پر ”صابی“ یاء سے پڑھا جائے گا۔ اور انکو صابی کہنے کی وجہ یہ ہوگی ”لمیلهم الی الباطل“ ان کا میلان باطل عقیدہ کی طرف تھا، اس

صابین کی قسمیں:

مختلف فرقوں کو صابی کہا گیا وجہ سب کی یہی تھی کہ وہ دین حق سے نکل کر باطل دین کی طرف مائل ہوئے لہذا ان کو صابی کہا گیا۔

(۱) صابی کی ایک قسم یہ ہے ”قوم بین النصاری والمجوس“ صابی وہ قوم تھی جو نصاریٰ اور

مجوس کے درمیان تھی، یعنی ان کے عقائد ان دونوں سے ملتے جلتے تھے۔ (بیساری)

(۲) ”والصابین ان عبدوا الکواکب“

صابین سے مراد ستاروں کی عبادت کرنے والے ہیں۔ (تبصیر الرحمن)

علامہ رازی رحمہ اللہ کا مختار مذہب بھی یہی ہے:

”ان الصابین قوم یعبدون الکواکب بمعنی ان الله جعلها قبلة للعباد

والدعاء او بمعنی ان الله فوض تدبیر امر هذا العالم“ (صابونی)

کہ بیشک صابین وہ لوگ ہیں جو ستاروں کی عبادت کرتے تھے، اس لحاظ پر کہ

اللہ تعالیٰ نے ان کو دعاء کا قبلہ بنایا ہے، اور بندوں کی عبادت کا بھی یہی قبلہ ہیں۔ اور

وہ ستاروں کی عبادت اس لئے بھی کرتے تھے کہ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ ستاروں کو

اللہ تعالیٰ نے تمام جہان کی تدبیر سپرد کر دی۔

تقریباً یہ وہی عقیدہ ہے جو فلاسفہ میں ان لوگوں کا ہے جو عقول عشرہ کے قائل ہیں۔ علامہ صابونی

نے صابین کا معنی ستارہ پرست کرنے کے متعلق فرمایا ”واختار الرازی..... واطهر الاقوال“

(۳) ”قوم بین المجوس والیہود والنصاری لیس لهم دین“ صابی وہ لوگ تھے جن کا

کوئی دین نہیں تھا بلکہ وہ یہود اور نصاریٰ اور مجوسیوں کے درمیان درمیان تھے، یہ ان کا اپنا کوئی مستقل

دین نہیں تھا جس کی وہ تابعداری کرتے بلکہ اپنی مرضی کے مطابق جو پسند آیا اسی پر عمل کر لیا، کوئی عقائد

یہودیوں کے حاصل کر لئے اور کوئی نصرانیوں کے اور کوئی مجوسیوں کے۔ (از صابونی)

آج کل ہمارے ملک میں بھی نکھو، الو اور گدھوں کی جماعت ان ہی نظریات کی مالک ہے۔

اللہ تعالیٰ ان کے ترسے ملک کو محفوظ رکھے، یہ لوگ علماء کو فرقہ واریت کا ذمہ دار ٹھہرا کر خود ہی مل کر رہے ہیں حالانکہ بعض کمینے لوگوں کو پیسے دے کر لڑانے والے بھی یہی ہیں انہوں نے ”مولوی مکاؤ“ پروگرام شروع کیا ہوا ہے۔

(۳) ”قال قتادة هم قوم يعبدون الملائكة ويصلون الى الشمس كل يوم خمس صلوات“
قنادہ کہتے ہیں، صابین وہ لوگ تھے جو فرشتوں کی عبادت کرتے تھے، البتہ سورج کی طرف منہ کر کے ہر روز پانچ نمازیں ادا کرتے تھے۔

”وقال ايضا الاديان خمسة منها للشيطان اربعة و واحد للرحمن ،
الصابئون وهم يعبدون الملائكة والمجوس وهم يعبدون النار ،
والذين اشركوا يعبدون الاوثان ، واليهود ، والنصارى“

اور قنادہ نے وضاحت کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ دین پانچ قسم ہیں۔ چار شیطانی ہیں، اور ایک رحمانی ہے نبی کریم ﷺ کی بعثت کے بعد رحمانی دین صرف ایک ہی ہے کہ نبی کریم ﷺ شریعت پر ایمان لائے۔ شیطانی دینوں میں ہی، صابی ہونا بھی ہے، صابی وہ ہیں جو فرشتوں کی عبادت کرتے ہیں۔ اور شیطانی دین والے مجوسی ہیں جو آگ کی پوجا کرتے ہیں، اور شیطانی دین والے مشرک ہیں جو بتوں کی عبادت کرتے ہیں، اور شیطانی دین والے یہود و نصاریٰ بھی ہیں کیونکہ انہوں نے آسمانی کتب میں تحریف کر دی تھی، باطل نظریات اور باطل عقائد کو حاصل کر لیا، اور نبی کریم ﷺ پر ایمان بھی نہیں لائے۔
(از کبیر)

(۵) ”هم قوم يشبه دينهم دين النصارى الا ان قبلتهم نحو مهب الجنوب يزعمون انهم على دين نوح عليه السلام“
(صابونی)

صابین وہ لوگ تھے جن کا دین نصاریٰ کے دین کے مشابہ تھا، لیکن ان کا قبلہ جنوبی جانب سے چلنے والی ہوا کے رخ پر تھا، اور یہ اپنے گمان کے مطابق اپنے آپ کو نوح علیہ السلام کے دین پر سمجھتے تھے۔

(۶) ”ان الصابئين قوم يعبدون الملائكة ويقرءون الزبور ويصلون للقبلة“ (صابونی)
بیشک صابین اس قوم کو کہا جاتا ہے جو فرشتوں کی عبادت کرتے ہیں، اور زبور پڑھتے ہیں اور قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے ہیں۔

اس قول کے مطابق ان کا زبور پر ایمان ثابت نہیں۔ اگر ان کا زبور پر ایمان ہوتا تو وہ فرشتوں کی عبادت نہ کرتے۔

(۷) ”سئل وہب بن منبہ عن الصابین فقال الذی يعرف اللہ وحدہ لیستہ شریعة یعمل بہا، ولم یحدث کفرا“ (صابونی)

وہب بن منبہ سے سوال کیا گیا صابین کے متعلق کہ وہ کون لوگ ہیں؟ تو انہوں نے فرمایا، یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ وحدہ کو پہچانتے ہیں، اور ان کی کوئی شریعت نہیں جس پر وہ عمل کریں اور کفر کو وہ اختیار نہیں کرتے۔

(۸) ”قال عبد الرحمن بن زید الصابون اهل دين من الأديان كانوا بجزيرة الموصل يقولون لا اله الا الله وليس لهم عمل ولا كتاب ولا نبي الا قول لا اله الا الله“ (صابونی)

عبد الرحمن بن زید نے بیان کیا ہے کہ صابون اپنے آپ کو دیندار کہتے ہیں، موصل کے علاقہ کے ایک جزیرہ میں پائے جاتے ہیں۔ وہ لا اله الا الله کہتے ہیں۔ لیکن نہ ہی ان کا کوئی عمل ہے اور نہ کتاب، اور نہ ہی کسی نبی پر وہ ایمان رکھتے ہیں سوائے ”لا اله الا الله“ کے ان کے پاس کوئی عمل نہیں، جس کی وجہ سے ان کو مومن کہا جاسکے۔

(۹) ”قال ابو العالیہ والضحاك الصابون فرقة من اهل الكتاب یقرأون الزبور ولهذا قال ابو حنفیة واسحاق لا باس بذبائهم ومناکحتهم“ (صابونی)

ابو العالیہ اور ضحاك نے کہا صابین اہل کتاب میں سے ایک فرقہ کو کہا جاتا ہے وہ زبور پڑھتے ہیں ان کا حکم وہی ہے جو اہل کتاب کا ہے۔ صابین کی تمام قسموں میں سے صرف یہ قسم ہے جن سے نکاح کرنا جائز ہے اور ان کا ذبیحہ جائز ہے۔ حضرت امام ابو حنیفہ اور اسحاق رحمہما اللہ نے ان کے ساتھ ہی نکاح کرنا اور ان کے ذبیحہ کے جائز ہونے کا قول کیا ہے۔

آیت کریمہ میں صابین کی کون سی قسم معتبر ہے؟

اگرچہ پہلے بیان کر دیا گیا ہے کہ علامہ رازی رحمہ اللہ نے ستارہ پرست ہونے کے قول کو ہی مختار کہا ہے اور یہ کہا ہے کہ یہ ظاہر قول ہے۔ اور بھی کئی مفسرین کرام نے اسی قول کو رائج قرار دیا، اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان رحمہ اللہ نے بھی اپنے ترجمہ میں ”ستارہ پرست“ ذکر فرمایا۔

راقم کا موقف: اس مقام پر راقم کا موقف وہی ہے جو تدریس کے بادشاہ راقم کے استاذ محترم نے جلالین پڑھاتے ہوئے بیان فرمایا تھا کہ یہاں صابین کی تمام قسمیں ہی معتبر ہیں۔ اس طرح قرآن پاک کا وسیع بیان واضح ہوگا، اور عظمت قرآن کا پتہ چلے گا۔

یعنی مطلب یہ ہوا کہ صابین کے تمام گروہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس وقت تک اجر حاصل نہیں کر سکیں گے جب تک ان کا اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان نہ ہوا۔

آئیے اسی موقف کو علامہ رازی رحمہ اللہ کی اس عبارت سے سمجھیں، پھر اندازہ کریں کہ راقم کے استاذ محترم کا علمی کمال کیا ہے یقیناً آپ عمدۃ الازکیاء اور رازی دوران ہیں۔ اس سے میری مراد حضرت علامہ مولانا محمد اشرف سیالوی ہیں۔

”ثم انه سبحانه بين في هذه الفرق الاربعة انهم اذا آمنوا بالله فلهم الثواب في الآخرة ليعرف ان جميع ارباب الضلال اذا رجعوا عن ضلالهم وآمنوا بالدين الحق فان الله سبحانه وتعالى يقبل ايمانهم طاعتهم ولا يردهم عن حضرته البتة“ (کبير)

اللہ تعالیٰ نے اگرچہ بظاہر چار فرقوں کا ذکر فرمایا کہ وہ جب اللہ تعالیٰ پر ایمان لائیں تو ان کو ثواب حاصل ہوگا آخرت میں، لیکن اسی سے یہ معلوم ہو گیا کہ بیشک تمام گمراہ لوگ جب اپنی گمراہی کو چھوڑ کر، دین حق پر ایمان لے آئیں تو اللہ تعالیٰ ان کے ایمان کو قبول کرتا ہے، اور ان کی طاعت کو قبول فرماتا، اور ان کو یقیناً اپنے حضور سے دور نہیں فرماتا۔

واضح ہوا کہ تمام باطل فرقے مراد ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ اور آخرت اور نبی کریم ﷺ پر ایمان لائیں تو ان کا اجر ان کے رب کے ہاں ہوگا۔

﴿مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ﴾: ”جو شخص ایمان لایا اللہ پر اور آخرت کے دن پر“
اعتراض: آیہ کریمہ میں صرف اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لانے کا ذکر ہے حالانکہ آسمانی کتب اور اللہ تعالیٰ کے تمام انبیاء کرام اور فرشتوں پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ ان کا ذکر کیوں نہیں کیا؟

جواب : ” (من آمن) منهم مخلصا (بالله واليوم الآخر) الذي لا يتم الايمان بالله بدون اذبه الايمان بدوام ربوبيته لهم وعموم قدرته وحكمته وعبدله واما الايمان بالكتب والرسول والملائكة فلازم للايمانين اذ لا يعرفان الا بهذه الامور فلم يصرح به لقوة دلالة الايمانين عليه“
(تبصير الرحمن)

جس نے ان میں سے اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر خلوص سے ایمان لایا۔ آخرت کے دن پر ایمان لانے کا ذکر فرما کر واضح کر دیا کہ جب تک انسان کا آخرت پر ایمان نہیں ہوگا اس وقت تک اللہ تعالیٰ پر بھی ایمان نہیں ہوگا۔ کیونکہ آخرت کے دن پر ایمان کے بغیر اللہ تعالیٰ کی دائمی ربوبیت اور اس کی قدرت کے عموم، اور اس کی حکمت اور اس کے عدل پر ایمان نہیں ہو سکتا۔

آسمانی کتب اور رسولوں اور فرشتوں پر ایمان لانے کا اگرچہ بظاہر ذکر نہیں لیکن اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان ان تمام پر ایمان لانے کے بغیر ممکن نہیں۔ لہذا واضح ہوا کہ دو ایمانوں کا ذکر تمام ایمانوں کو مستلزم ہے۔

” (من آمن) منهم (بالله واليوم الآخر) مع محمد ﷺ بالقلب واللسان“

(مظہری)

جو شخص ان میں سے اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان لایا، ساتھ ساتھ اور دل اور زبان سے محمد ﷺ پر بھی ایمان لایا۔ یعنی اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان اسی وقت معتبر ہوگا، جب کہ نبی کریم ﷺ پر زبان اور دل سے خلوص کے ساتھ ایمان لائے گا۔

تنبیہ : ﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا﴾ سے مراد جب حقیقی طور پر نبی کریم ﷺ پر ایمان لانے والے مراد ہوں تو ”مَنْ آمَنَ“ سے مراد یہ بھی ہو سکتا ہے:

”ويمكن ان يكون من آمن اشارة الى الذين كمل ايمانهم بتصفية

القلب وتزكية النفس والقلب“

کہ جو کامل طور پر صفائی قلب (خالص دل) اور پاکیزگی نفس اور پاکیزگی بدن سے ایمان لائیں، یعنی ظاہر و باطن سے کامل اور خالص ایمان لانیوالے ہی اللہ کے ہاں اجر پائیں گے۔

کمال ایمان کا ذکر نبی کریم اکے اس ارشاد میں پایا گیا ہے:

”لا يؤمن احدكم حتى اكون احب اليه من والده وولده والناس

اجمعین“ (بخاری، مسلم، مسند احمد، نسائی، ابن ماجہ انس مرفوعاً)

تم میں سے کوئی ایک کامل مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اس کے والد (والدین) اور اولاد اور تمام لوگوں سے محبوب نہ ہوں۔

☆ اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی:

”لا يؤمن احدكم حتى يحب لاخيه ما يحب لنفسه“

(بخاری، مسلم، مسند احمد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ عن انس مرفوعاً)

تم میں سے کوئی ایک کامل مومن نہیں ہو سکتا یہاں تک کہ اپنے بھائی کے لئے وہی پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

☆ اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی:

”لا يبلغ العبد حقيقة الايمان حتى يحزن من لسانه“ (رواه الطبرانی واصله)

بندہ اس وقت تک کامل ایمان نہیں حاصل کر سکتا جب تک اپنی زبان سے نہ غم کھائے۔ (از مظہری) یعنی ڈرتا رہے کہ زبان کہیں لغزش نہ کر لے، زبان کی لغزش پر بہت ہی فساد مرتب ہوتے ہیں۔ ﴿وَعَمِلْ صَالِحًا﴾ (اور اچھے عمل کئے) (و عمل صالحاً) علی حسب امر اللہ تعالیٰ

(مظہری)

وہی اعمال صالحہ ہو سکتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے امر کے مطابق ہوں۔ اگر کوئی شخص اپنے خیال کے مطابق اچھے عمل کر رہا ہے لیکن وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق نہیں، تو وہ حقیقت میں اچھے عمل نہیں۔ ”(و عمل صالحاً) ولا بدفيه من الاخذ بالناسخ وترك المنسوخ“ (تبصیر الرحمن) جب تک انسان منسوخ کو چھوڑ کر ناسخ پر عمل نہیں کرے گا اس وقت تک اعمال صالحہ نہیں بن سکتے۔

اسی سے واضح ہو گیا کہ نبی کریم ﷺ کی بعثت کے بعد یہود و نصاریٰ کے اعمال اسی وقت اچھے اور صالح ہو سکتے تھے جب وہ نبی کریم ﷺ کی شریعت پر عمل کرتے۔ واضح ہوا کہ یہود و نصاریٰ کا اپنے اپنے حق دینوں میں قائم رہنا بھی باطل تھا، ان کا کوئی عمل بھی صالح نہیں کہلا سکتا تھا۔ باطل دینوں پر قائم رہ کر وہ کیسے اعمال صالحہ کر سکتے تھے۔

﴿فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾: ”تو ان کے لئے ان کا اجر ان کے رب کے ہاں ہے“ یعنی

اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ فرمایا ہے مومنوں کے لئے جنت کا، وہ تمام مومنوں کو حاصل ہوگی، البتہ قرب کے مراتب اور ستھری شراب جس پر کستوری کی مہر لگی ہوگی اور خاص چشمے صرف مقربین کو حاصل ہوں گے، رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿عَيْنَا يَشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُونَ﴾ وہ ایسے چشمے ہوں گے جن سے مقربین پئیں گے۔

(از مظہری)

﴿فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ﴾ کا اور مطلب یہ ہے کہ اگر وہ ایمان پر ہمیشہ کے لئے قائم رہے اور نیک عمل کرتے رہے تو ان کے لئے کامل اجر ہے ﴿عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ کہہ کر اشارہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ مربی ہے اس لئے یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کوئی بعید نہیں کہ ان کے ایمان اور اعمال کو تھوڑے دنوں میں اتنا مال عطاء فرمادے جو ان کو مکمل عمر میں حاصل ہوتا۔

تنبیہ: ﴿فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ کی تفسیر میں علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا: ”الذی وعدہم علی ایمانہم وعملہم“ ان کے لئے وہ اجر ان کے رب کے ہاں ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے ان سے ان کے ایمان لانے اور نیک عمل کرنے پر کیا ہوا ہے۔

علامہ بیضاوی کی اس عبارت سے شیخ زادہ نے یہ مسئلہ بیان فرمایا ہے:

”الذی وعدہم الخ اشارۃ الی ان استحقاقہم للاجر بسبب الایمان والعمل انما ہو بحسب الفضل والاحسان علی طریق وفاء الکریم بما وعدہ لاعلیٰ طریق الوجوب العقلی کما زعمہ المعتزلۃ فلذلک عدل من تعبیر صاحب الکشاف وهو قوله فلهم اجرهم الذی يستوجبونه بایمانهم وعملهم فانه مبنی علی مذهبہ“

علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے ”الذی وعدہم“ سے تفسیر فرما کر یہ مسئلہ واضح کیا ہے کہ ان کو اجر ان کے ایمان اور نیک اعمال کی وجہ سے صرف اس لئے حاصل ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فضل و احسان ہے اور اس نے وعدہ فرمایا ہے کریم جب وعدہ فرماتا ہے اسے پورا کرتا ہے ان کو یہ اجر حاصل ہونا عقلاً واجب نہیں۔ کہ انہوں نے ایمان لایا اور نیک عمل کئے تو رب تعالیٰ پر واجب ہو جائے کہ ان کو اچھا اجر عطا فرمائے۔ اس نے تو پہلے ہی ان گنت نعمتیں عطا کر رکھی ہیں، انسان ان کا شکر یہ بھی ادا نہیں کر سکتا، تو اور اجر

کا لزومی طور پر حقدار ہونے کا دعویٰ کیسے کر سکتا ہے۔

اسی سے یہ واضح ہو گیا کہ صاحب کشف کی تفسیر اس کے مذہب کے مطابق ہے کیونکہ زمخشری معتزلی ہے لہذا اس کا یہ ذکر کرنا ”الذی یستوجبونہ بایمانہم و عملہم“ (وہ اجر جس کے وہ جوبی طور پر اپنے ایمان اور نیک اعمال کی وجہ سے مستحق ہیں) باطل ہے۔ (از بیضاوی و شیخ زادہ)

﴿وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾: ”اور ان پر کوئی خوف نہیں ہوگا اور نہ ان پر کوئی غم“، یعنی جب کفار عذاب سے ڈر رہے ہوں گے تو ایمان والے اور نیک اعمال والے لوگوں کو کوئی خوف اور ڈر نہیں ہوگا۔ اسی طرح جب اپنے اعمال میں کوتاہی کرنے والے اپنی عمر کے ضائع ہونے اور ثواب کے فوت ہونے پر غم کر رہے ہوں گے، تو ایمان والے اور نیک اعمال والے لوگوں کو کوئی غم نہیں ہوگا۔

مقام توجہ: ﴿عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ کا یہ مفہوم نہیں کہ ان لوگوں کا اجر رب کے پاس کسی مکان میں ہے رب تعالیٰ مکان سے پاک ہے، اسلئے مکانیت کی نسبت رب تعالیٰ کی طرف محال ہے، اور یہ معنی لینا بھی ممکن نہیں کہ رب تعالیٰ ان کے اجر کی ایسے حفاظت کر رہا ہے جیسے امانت کی حفاظت کی جاتی ہے۔ بلکہ یہاں یہ مطلب ہے کہ ان لوگوں کو اجر یقینی طور پر حاصل ہونا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان سے وعدہ فرما رکھا ہے اس نے اپنے فضل و کرم سے اپنے وعدہ کو پورا کرنا ہی ہے، اور اجر عطا کرنا ہے تو گویا کہ اس اجر کو اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل ہوگا، اور جسے وہ اجر حاصل ہوگا وہ بھی اللہ تعالیٰ کا مقرب ہوگا۔ (از کبیر)

گزشتہ سے پیوستہ: صابی کا معنی بیان کیا جا چکا ہے کہ ایک دین سے دوسرے دین کی طرف میلان کرنا اور ایک دین کو چھوڑ کر دوسرے دین کو اختیار کر لینا:

”وَلِذَلِكَ كَانَتْ الْعَرَبُ يَسْمُونَ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ صَابِيًا لِأَنَّهُ عَلَيْهِ

السلام اظهر دينا خلاف ادیانهم و مال اليه“ (شیخ زادہ)

یہی وجہ ہے کہ مشرکین نبی کریم ﷺ کو صابی کہتے تھے کیونکہ آپ نے ان کے دینوں کے خلاف دین حق پیش فرمایا اور اسی کی طرف آپ کا میلان تھا۔

مسلم شریف جزء ثانی میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے کے متعلق ایک طویل حدیث میں یہ ذکر ہے کہ حضرت ابوذر جب مکہ مکرمہ میں پہنچے تو آپ نے نبی کریم ﷺ کے متعلق یہی پوچھا کہ صابی کہاں ہے۔ مقصد یہ تھا کہ وہ شخص جن کو تم صابی کہتے ہو وہ کہاں ہیں؟ اور ان لوگوں کو جب

یہ پتہ چلا کہ ابو ذر ایمان لائے تھے ہیں تو انہوں نے حضرت ابو ذر کو بھی صابی کہا۔

حکمت: ابھی جس آیت کریمہ کی وضاحت کی جا رہی ہے وہ یوں ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَى وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ
وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ
وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾

سورۃ مائدہ میں ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّابِئُونَ وَالنَّصَارَى مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ
وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾

اور سورۃ حج میں ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّابِئِينَ وَالنَّصَارَى وَالْمَجُوسَ وَالَّذِينَ
أَسْرَكُوا إِنَّ اللَّهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ﴾

سورۃ بقرہ میں نصاریٰ کا ذکر پہلے ہے اور سورۃ مائدہ میں اور سورۃ حج میں صابین کا ذکر پہلے کیا گیا ہے اس کی وجہ کیا ہے؟ اور سورۃ مائدہ میں الصابیون مرفوع ہے۔ باقی دونوں جگہ میں منصوب اس کی وجہ کیا ہے؟

جواب: علامہ رازی رحمہ اللہ نے دونوں مسکوں پر سورۃ مائدہ اور حج میں فرق کی وجہ کو ذکر کیا ہے یہاں مختصر اور عجیب حکمت پر مبنی ارشاد فرمایا:

”والجواب لما كان المتكلم احكم الحاكمين فلا بد لهذه التغيرات من

حكم وفوائد، فان ادركنا تلك الحكم فقد فزنا بالكمال وان عجزنا

احلنا القصور على عقولنا لا على كلام الحكيم والله اعلم“ (کبیر)

جواب یہ ہے کہ جب کلام کرنے والا اللہ تعالیٰ احکم الحاکمین ہے تو ضروری طور پر ان

تبدیلیوں میں حکمتیں اور فوائد پائے گئے ہیں۔ اگر ہم ان حکمتوں کو سمجھ سکیں تو ہماری

بہت بڑی کامیابی ہے اور اگر ہم عاجز آجائیں تو یہ ہماری عقلوں کا قصور ہوگا، اللہ تعالیٰ

کے کلام میں کوئی کمی نہیں ہو سکتی۔ (واللہ اعلم)

تاہم تفصیلی جواب انشاء اللہ سورۃ مائدہ میں ہی آئے گا۔

﴿وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ وَاذْكُرُوا مَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾

- (۱) ”اور جب ہم نے تم سے عہد لیا اور تم پر طور کو اونچا کیا تو جو کچھ ہم تم کو دیتے ہیں زور سے، اور اس کے مضمون یاد کرو اس امید پر کہ تمہیں پرہیزگاری ملے۔“
- (۲) ”اور جب ہم نے لیا عہد تم سے اور اٹھایا اوپر تمہارے طور کو لے لو جو دیا ہم نے تمہیں، (وہ) مضبوطی سے، اور یاد کرو جو اس میں ہے، تاکہ تم پرہیزگار ہو جاؤ۔“

”اعلم ان هذا هو الانعام العاشر وذلك لانه تعالى انما اخذ ميثاقهم لمصلحتهم فصار ذلك من انعامه“

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو اپنی نعمتوں کی یاد دلائی وہ نعمتیں جن کا اس مقام پر ذکر کیا جا رہا ہے ان میں یہ دسویں نعمت ہے۔ کیونکہ ان سے وعدہ لینا کہ تورات پر عمل کرو گے یہ ان کی مصلحت کے لئے تھا یقینی بات ہے جو کام مصلحت کے لئے ہو وہ نعمت ہی ہوا کرتا ہے۔ (از کبیر)

تاہم بنی اسرائیل کی کجروی کا ذکر بھی واضح ہے جیسا کہ پہلی نعمتوں میں بھی ان کی کجرویوں کا (نیزھی چال) ذکر کر دیا گیا ہے یہاں بھی اس کا ذکر موجود ہے۔

مختصر وضاحت:

موسیٰ علیہ السلام پر جب تورات کا نزول ہوا تو آپ نے بنی اسرائیل کو تورات کے احکام بتائے لیکن انہوں نے احکام کو مشکل سمجھ کر ماننے سے انکار کر دیا، تو اللہ تعالیٰ نے جبرائیل کو حکم دیا کہ انہوں نے طور پہاڑ کو اٹھا کر ان کے سروں پر کر دیا، انہوں نے اسے تسلیم کر لیا۔

رب تعالیٰ نے ان کو تورات کے مضامین یاد کرنے اور ان پر عمل کرنے کا حکم جو دیا انہیں ان کا ہی فائدہ تھا رب تعالیٰ غنی ہے، اسے کوئی پرواہ نہیں، ان کا فائدہ یہی تھا کہ وہ نیک، پرہیزگار بن جائیں۔

قدرے تفصیلی وضاحت:

﴿وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ﴾: ”اور جب لیا ہم نے وعدہ تم سے“

” (مِثَاقُكُمْ) ای عہد کم الوثیق “ یعنی میثاق سے مراد پختہ وعدہ ہے مطلب یہ ہوا کہ ہم نے تم سے توراۃ کے مشکل احکام پر عمل کرنے اور ان کو تسلیم کرنے کا تم سے پختہ وعدہ لیا۔ (بصیر الرحمن) ایسے امور جن کی اطاعت اور فرمانبرداری واجب ہوتی ہے ان کے کرنے کا حکم دینا اور ان کا وعدہ لینا میثاق کہلاتا ہے۔

وعدہ لینے سے مراد کیا ہے؟ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو عقلیں عطاء کیں، جن سے ان دلائل کو حاصل کیا جاتا جو صانع کے وجود اور اس کی حکمت پر دلالت کرتے، اور پھر ان کو وہ دلائل بھی عطاء کئے جو اللہ تعالیٰ کے انبیاء کرام اور اس کے رسولوں کی صداقت پر دلالت کرتے۔

یہ مواثیق (وعدوں) کی قسموں میں سے بہت قوی میثاق ہے اس میں کسی قسم کی تبدیلی ممکن نہیں۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام جب اللہ تعالیٰ سے توراۃ کی الواح (تختیاں) لے کر آئے تو قوم کو بتایا کہ اسمیں توراۃ اللہ کی کتاب ہے۔ انہوں نے کہا ہم تمہارے قول کو اس وقت تک ہرگز تسلیم نہیں کریں گے جب تک کہ اللہ تعالیٰ کو ظاہر طور پر نہ دیکھ لیں۔

آپ ان کو فرما رہے تھے ”ہذا کتابی فخذوہ“ یہ میری کتاب ہے اس پر عمل کرو، لیکن وہ مسلسل انکار کئے جا رہے تھے ”فاخذتہم الصاعقة فماتوا ثم احیاءم“ تو ان کو بجلی کی کڑک نے اپنی گرفت میں لے لیا تو وہ مر گئے پھر ان کو زندہ کیا۔ پھر ان کو کہا اللہ کی کتاب کو تسلیم کرو، انہوں نے پھر انکار کیا۔

”فرفع فوقہم الطور“ تو طور کو اٹھا کر ان کے سروں پر بلند کر دیا، پھر ان کو کہا گیا کتاب کو تسلیم کرو ورنہ طور کو تمہارے اوپر پھینک دیا جائے گا ”فاخذوہ فرفع الطور ہو الميثاق“ تو انہوں نے اسے تسلیم کر لیا طور کو ان کے سروں سے ہٹالیا گیا یہی وہ میثاق ہے۔

تنبیہ: بظاہر عقل کا تقاضا یہ تھا کہ ”مواثیقکم“ کہا جاتا کہ تم میں سے ہر ایک سے وعدہ

لیا گیا تمام سے ایک میثاق لینے کا کیا مطلب۔ اس کی دو وجہ ہیں۔ ایک یہ ہے کہ اگرچہ ذکر واحد کا ہے لیکن مراد ہر ہر فرد سے وعدہ لینا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا﴾ پھر تم میں سے ہر ایک کو طفولیت کی حالت میں نکالا۔ دوسری وجہ یہ ہے ”انہ کان شیئا واحدا اخذ من کل واحد منهم“ ہر ایک سے ایک قسم کا ہی وعدہ لیا گیا ”فلا جرم کان کله میثاقا واحدا“ تو یقیناً ایک ہی میثاق مراد ہوا۔ اگر ”مواثیق“ کہا جاتا تو وہم ہوتا کہ شاید ان لوگوں سے علیحدہ علیحدہ وعدے لئے گئے۔

(از کبیر)

﴿وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمْ الطُّورَ﴾ : ”اور اٹھایا ہم نے تمہارے اوپر طور“

”عن ابی حاتم عن ابن عباس ان موسیٰ علیہ السلام لما جاءهم بالتوراة وما فیها من التکالیف الشاقة کبرت علیهم وابتوا قبولها فامر جبریل بقلع الطور فظله فوقهم حتی قبلوا“ (روح المعانی)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ بیشک موسیٰ علیہ السلام جب ان کے پاس توراة کو لائے تو اس میں مشکل مشکل احکام تھے، انہوں نے ان کو قبول کرنے سے انکار کر دیا، تو اللہ تعالیٰ نے جبرائیل کو حکم دیا، انہوں کو اٹھا کر ان کے سروں پر سائبان کی طرح کر دیا، تو انہوں نے توراة کے احکام شاقہ کو قبول کر لیا۔

سورة اعراف میں فرمایا:

﴿وَإِذْ نَقَّضْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَأَنَّهُ ظُلَّةٌ وَظَنُّوا أَنَّهُ وَاقِعٌ بِهِمْ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ وَاذْكُرُوا مَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾

اور جب ہم نے پہاڑ کو اپنی جگہ سے ہٹا کر ان کے سروں پر سائبان کی طرح کر دیا۔ انہوں نے گمان کیا بیشک وہ ان پر گرنے والا ہے (ہم نے ان کو کہا) پکڑو (عمل کرو اس پر) جو ہم نے تمہیں عطا کیا مضبوطی سے (اس پر عمل کرو) اور یاد کرو اس میں جو ہے تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔

”﴿وَإِذْ نَقَّضْنَا﴾، قلع من اصله“ یعنی ﴿نَقَّضْنَا﴾ کا معنی یہ ہے کہ ہم نے پہاڑ کو جڑوں سے

اکھین کر ان کے سروں پر سائبان کی طرح کر دیا ”قال ابو عبیدہ، زعزعاہ فاستخرجنا من مکانہ“ ابو عبیدہ نے کہا ﴿نَقَّضْنَا﴾ کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اسے حرکت دی، جھنجھوڑا اور اپنی جگہ سے ہٹا دیا۔

ہر وہ چیز جس کو اکھیڑ کر پھینک دیا جائے اس کے لئے لفظ ”نشق“ بولتے ہیں۔

”قال ابن الاعرابی ، النائق الرافع“ ابن اعرابی نے کہا نائق کا معنی اٹھا کر بلند کرنا۔

(از قرطبی)

علامہ رازی رحمہ اللہ نے کیا خوب بیان کیا:

”ان رفع الطور آية باهرة عجيبة تبهر العقول وترد المكذب الى التصديق والشاك الى اليقين فلما رأوا ذلك وعرفوا انه من قبله تعالى علما لموسى عليه السلام علما مضافا الى سائر الآيات اقرءوا بالصدق فيما جاء به واظهروا التوبة واعطوا العهد والميثاق ان لا يعودوا الى ما كان منهم من عبادة العجل وان يقوموا بالتوراة فكان هذا عهدا موثقا جعلوه لله على انفسهم“

پہاڑ کو اٹھا کر ان کے سروں پر کرنے میں بہت روشن دلیل ہے، اور عقول کو حیران کرنے والی ہے جھٹلانے والے کو تصدیق کی طرف لانے والی دلیل ہے، اور شک کرنے والے کو یقین دلانے والی ہے جب بنی اسرائیل نے طور کو اپنے سروں پر دیکھا تو وہ سمجھ گئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور ان کو موسیٰ علیہ السلام کے سچے نبی ہونے کا علم حاصل ہو گیا بلکہ تمام معجزات تمام نشانیوں اور تمام دلائل پر وہ یقین کرنے لگے اور انہوں نے توبہ کی اور پختہ وعدہ کیا کہ آئندہ چھڑے کی پوجا کرنے جیسے عمل کو نہیں دہرائیں گے۔ اور توراۃ پر عمل کریں گے گویا کہ یہ ان کی طرف سے جو پختہ وعدہ کیا گیا اسی کو اللہ تعالیٰ نے ان سے طلب کیا تھا۔

(کبیر)

تنبیہ: اللہ تعالیٰ کے حکم سے جبرائیل نے طور کو اٹھا کر بنی اسرائیل کے سروں پر سائبان کی طرح کیا اس میں تقریباً تمام سلف صالحین کا اتفاق ہے متقدمین کی تمام تفاسیر اس پر شاہد ہیں۔ لہذا مودودی صاحب کی یہ تفسیر بے حقیقت ہو کر رہ گئی اس کی تفصیلی کیفیت معلوم کرنا مشکل ہے، بس مجملاتیوں سمجھنا چاہئے کہ پہاڑ کے دامن میں ميثاق لیتے وقت ایسی خوفناک صورت حال پیدا کر دی گئی تھی کہ ان کو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا پہاڑ ان پر آ پڑے گا، ایسا ہی کچھ نقشہ سورۃ اعراف آیہ ۱۷۱ میں کھینچا گیا ہے۔

(تفہیم القرآن)

سورۃ اعراف کی وضاحت قرطبی کے حوالہ سے بیان کر دی گئی، جس میں مطلب ہی یہ ہے کہ پہاڑ کو اٹھا کر بلند کیا۔

طور کو اٹھانے کا انکار کرنے والے کون؟

”من الملاحدة من انكر امكان وقوف الثقل في الهواء بلا عماد واما الارض فقالوا انما وقفت لانها بطبعها طالبة للمركز فلا جرم وقفت في المركز ودليلنا على فساد قولهم انه سبحانه قادر على كل الممكنات ووقوف الثقل في الهواء من الممكنات فوجب ان يكون الله قادرا عليه“

(کبر)

بعض ملحدین (بے دینوں) نے انکار کیا ہے کہ طور کو اٹھا کر فضا میں روکے رکھنا ممکن نہیں۔ کیونکہ ثقل (بھاری) چیز کا ہوا (فضاء) میں بغیر کسی ستون کے ٹھہرنا ممکن نہیں۔ لیکن زمین کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ وہ طبعی طور پر مرکز کو طلب کرتی ہے اس لئے اس کا مرکز میں کھڑا ہونا ممکن ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ان کا مذہب باطل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ تمام ممکنات پر قادر ہے، اس لئے ثقل چیز کو فضاء میں معلق رکھنا اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کوئی بعید نہیں۔

اعتراض: ”اظلال الجبل غیر جائز لان ذلك لو وقع لكان يجرى مجرى الا لجاء الى الایمان وهو ينافی التكلیف“

طور کو اٹھا کر ان کے سروں پر سائبان کی طرح معلق رکھنا شرعاً بھی ناجائز ہے کیونکہ اس سے تو ایمان پر جبر (زبردستی حکم منوانا) ثابت ہوگا، یہ انسان کو مکلف بنانے کے منافی ہے کیونکہ کسی کو حکم اسی وقت دیا جاسکتا ہے جب کہ اس کا اختیار باقی ہو، خصوصاً رب تعالیٰ کا ارشاد اس پر دلالت کر رہا ہے:

﴿لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ﴾ دین میں جبر نہیں۔

جواب: اجاب القاضی بانہ لا یلجئ لان اکثر ما فيه خوف السقوط عليهم فاذا استمر في مكانه مدة وقد شاهدوا السموات مرفوعة فوقهم بلا عماد جاز ههنا ان يزول عنهم الخوف فيزول الا لجاء ويبقى التكليف“

قاضی عیاض رحمہ اللہ نے اس کا جواب یہ دیا کہ ان سے جبراً ایمان لانے کا مطالبہ نہیں تھا۔ جب

ان پر پہاڑ کواٹھا کر بلند کیا تو ابتدائی طور پر انکو خوف ہوا، لیکن جب پہاڑ زیادہ دیر فضاء میں معلق رہا تو ان کو سمجھ آ گیا کہ پہاڑ ہم پر نہیں گرے گا، کیونکہ یہ تو آسمانوں کی طرح ہم پر بلند ہوا ہے جس طرح آسمان ہم پر نہیں گرتے ایسے ہی طور بھی نہیں گرے گا، البتہ ان کو اللہ تعالیٰ کی قدرت اور موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ کا علم حاصل ہو گیا۔ ان سے خوف جاتا رہا انہوں نے ایمان اپنے اختیار سے قول کیا۔ (از کبیر)

﴿ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ ﴾: ”جو ہم نے تمہیں دیا اسے مضبوطی سے پکڑو“

﴿ بِقُوَّةٍ ﴾ ای بجد و عزیمت کاملہ و عدول عن التغافل والتکاسل
یعنی بڑی کوشش اور پختہ اور کامل ارادہ سے اس پر عمل کرو اسے تسلیم کرو جو ہم نے تمہیں عطا کیا ہے اس میں کسی قسم کی غفلت اور سستی کا مظاہرہ نہ کرو۔ (کبیر)

﴿ بِقُوَّةٍ ﴾ وقیل بنية و اخلاص ”جو ہم نے تمہیں عطا کیا ہے وہ خالص نیت سے حاصل کرلو۔
﴿ بِقُوَّةٍ ﴾ القوة العمل بما فيه ”جو ہم نے تمہیں عطا کیا ہے اس پر مضبوطی سے عمل کرو۔
”وقیل بقوة بکثرة درس“ جو ہم نے تمہیں (کتاب) عطا کی ہے اسے زیادہ سے زیادہ

پڑھو تا کہ زیادہ پڑھنے سے تمہارے دلوں پر زیادہ اثر انداز ہو۔ (از قرطبی)

﴿ وَاذْكُرُوا مَا فِيهِ ﴾: (اور یاد کرو جو اس میں ہے) ای تدبر وہ واحفظوا
او امرہ ووعیدہ ولا تنسوه ولا تضعوه ”یعنی یاد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جو کتاب میں ہے
اس میں تدبر کرو اس کے اوامر (احکام) اور وعید (یعنی عذاب کا خوف دلانا) کو یاد کرو، ان کو نہ بھولو، اور
ان پر عمل کرو ان کو ضائع نہ کرو۔ (از قرطبی)

”قلت هذا هو المقصود من الكتب العمل بمقتضاها لا تلاوتها باللسان
وترتيلها“

کتب پر عمل کرنا ہی مقصد عظیم، صرف تلاوت کرنا، خوبصورت انداز پر ٹھہرا ٹھہرا کر پڑھنا مقصود
نہیں۔ اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے یہود کی مذمت فرمائی جب انہوں نے کتب پر عمل چھوڑ دیا، رب تعالیٰ
نے فرمایا:

﴿ نَبَذَ فَرِيقٌ مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ ﴾

اہل کتاب میں سے ایک فریق نے کتاب کو پس پشت ڈال دیا۔

☆ نسائی نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”ان من شر الناس رجلا فاسقا يقرأ القرآن لا يرعوى الى شئ منه“
 بیشک لوگوں میں سے شر وہ فاسق شخص ہے جو قرآن پڑھتا ہو لیکن اس پر عمل نہ کرتا ہو
 ﴿لغوى ترجمہ﴾ اس کی کسی چیز کی حفاظت نہ کرتا ہو

”فبين ان المقصود العمل كما بينا“ واضح ہوا کہ بیشک مقصد عمل کرنا ہی جیسا کہ ہم نے بیان کر دیا ہے۔

☆ ”وقال مالك قد يقرأ القرآن من لا خير فيه“ امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں بعض اوقات قرآن وہ شخص بھی پڑھتا ہے جس میں کوئی بھلائی کا کام نہیں ہوتا۔

عقل کا تقاضا بھی یہی ہے کہ جب ہم سے پہلے لوگوں یعنی یہود و نصاریٰ کو حکم دیا گیا ہے کہ تم قرآن پاک پر عمل کرو تمہارے دین اب منسوخ ہو چکے ہیں لہذا اپنے اپنے دین چھوڑ دو تو یقیناً ہمارے لئے بھی ضروری ہے کہ ہم قرآن پاک کے مطابق عمل کریں۔

”قال الله تعالى ﴿وَاتَّبِعُوا أَحْسَنَ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ﴾ فامرنا
 باتباع كتابه ولا عمل بمقتضاه لكن تركنا ذلك كما تركت اليهود
 والنصارى“

رب تعالیٰ نے قرآن پاک کی تابعداری کا حکم دیا اور قرآن پاک کے تقاضا کے مطابق عمل کرنے کا حکم دیا۔ لیکن ہم نے اسے اس طرح چھوڑ دیا جیسا کہ یہود و نصاریٰ نے چھوڑ دیا۔

اب کتب پڑھنے والے، قرآن پڑھنے والے بہت افراد ملیں گے لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ ان پر جہالت کا غلبہ ہے وہ ریاست کے طلبگار ہیں اور خواہشات کو چاہنے والے ہیں۔

☆ ترمذی نے جبیر بن نفیر سے روایت کیا اور انہوں نے ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے وہ فرماتے ہیں:

”كنا مع النبي ﷺ فشرح ببصره الى السماء ثم قال هذا اوان
 يختلس فيه العلم من الناس حتى لا يقدر وامنه على شئ ، فقال زياد
 بن ليلى الانصارى ، كيف يختلس منا وقد قرأنا القرآن ، فوالله لنقرانه
 ولنقرانه نساءنا وابناءنا فقال ثقلتكم امك يا زياد ان كنت لا

عدک من فقهاء المدينة هذه التوراة والانجيل عند اليهود والنصارى

فما ذا تغنى عنهم

ایک مرتبہ ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ تھے، آپ نے اپنی نظر کو آسمانوں پر نکایا، پھر فرمایا یہ وقت (جو میں دیکھ رہا ہوں، ایسا وقت ہوگا) جس میں لوگوں سے علم چھین لیا جائے گا یہاں تک کہ وہ اس پر قادر نہیں ہوں گے، تو زیاد بن لبید انصاری نے کہا، ہم سے کیسے علم کو چھین لیا جائے گا، حالانکہ ہم نے قرآن پڑھا ہے، قسم ہے اللہ تعالیٰ کی ہم ضرور بر ضرور قرآن پڑھتے رہیں گے۔ اور ضرور بر ضرور اپنی بیبیوں اور اپنی اولاد کو قرآن پڑھاتے رہیں گے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا اے زیاد تمہاری ماں تمہیں پیٹے میں تو تمہیں مدینہ طیبہ کے فقہاء میں سے سمجھتا تھا، (کیا تمہیں معلوم نہیں) یہ توراة اور انجیل یہود و نصاریٰ کے پاس ہیں (وہ پڑھ بھی رہے ہیں) لیکن انہیں ان سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو رہا۔

حدیث پاک کا مطلب واضح ہے کہ نبی کریم ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ قرآن پاک پڑھنے والے لوگ تو ہوں گے اس پر عمل کرنے والے کم ہوں گے، گویا کہ علم اٹھ جائے گا، جس طرح یہود و نصاریٰ میں توراة و انجیل پڑھنے والے تو بہت ہیں، لیکن اس پر عمل کرنے والے نہیں، تو وہ جاہل ہی ہیں ان کو اصحاب علم نہیں کہا جاسکتا، یقینی بات ہے کہ اگر وہ اپنی کتب پر عمل کرتے تو نبی کریم ﷺ پر ایمان بھی لاتے۔

☆ ”وفى الموطأ عن محمد بن مسعود قال لانسان انك فى زمان كثير فقهاؤه ، قليل قراؤه ، تحفظ فيه حدود القرآن وتضع حروفه ، قليل من يسأل ، كثير من يعطى ، يطيلون الصلوة ويقصرون فيه الخطبة ، يبدءون فيه اعمالهم قبل احوالهم ، وسيأتى على الناس زمان قليل فقهاؤه ، كثير قراؤه ، تحفظ فيه القرآن ، وتضع حدوده ، كثير من يسأل ، قليل من يعطى ، يطيلون فيه الخطبة ، ويقصرون الصلوة ، يبدءون فيه احوالهم قبل اعمالهم“

موطا میں حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت مذکور ہے، آپ نے ایک شخص کو فرمایا بیشک تم ایسے زمانہ میں موجود ہو جس میں فقہاء کثیر تعداد میں ہیں۔ قراء (قرآن کو سنوار سنوار کر پڑھنے والے)

قلیل تعداد میں ہیں۔ اس دور میں قرآن پاک کی حدود کی حفاظت کی جاتی ہے (یعنی قرآن پاک کے مطابق عمل ہو رہا ہے) اور حروف ضائع ہو رہے ہیں۔ (یعنی قرآن پاک کم پڑھا جاتا ہے، اور تجوید کا لحاظ بھی کم کیا جاتا ہے) سوال کرنے والے قلیل ہیں اور دینے والے کثیر ہیں۔ نمازیں لمبی پڑھنے والے موجود ہیں، اور تقریریں چھوٹی کرتے ہیں۔ وہ اعمال کا لحاظ پہلے کرتے ہیں، خواہشات کا لحاظ بعد میں۔ لوگوں پر ایک زمانہ آنے والا ہے، جس میں فقہاء (دین کو سمجھنے والے) کم ہو جائیں گے، اور قراء کثیر ہو جائیں گے (یعنی خوش آوازی سے طرز لگا کر قرآن پڑھنے والے بہت مل جائیں گے) قرآن کی حفاظت کی جائے گی (یعنی پڑھنے کی کثرت اور لفاظی کی طرف توجہ زیادہ ہوگی) لیکن قرآن پاک کی حدود کو ضائع کر دیا جائے گا (یعنی عمل اٹھ جائے گا) سوال کرنے والے کثیر ہوں گے، دینے والے کم ہوں گے، تقریریں لمبی ہوں گی، نمازیں چھوٹی ہوں گے۔ اپنی خواہشات کو وہ اپنے اعمال پر مقدم کریں گے۔ ایک روایت میں ہے:

”يَتَغَوَّنَ أَهْوَانُهُمْ وَيَتْرَكُونَ الْعَمَلَ بِالذِّي افْتَرَضَ عَلَيْهِمْ“

وہ اپنی خواہشات کی تابعداری کریں گے اور فرض اعمال کو چھوڑ دیں گے۔ (قرطبی)

﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾ : (تا کہ تم پرہیزگار ہو جاؤ) تقریباً مفہوم واضح ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو ہم نے تمہیں عطا کیا اسے مضبوطی سے پکڑو، یعنی اس پر کامل طور پر عمل کرو، اور جو اس میں ہے اسے یاد کرو، یعنی اسے پڑھو، اس میں تدبر کرو اور اس پر عمل کرو، ان تمام ہدایات کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس میں تمہارا ہی بھلا ہے، یعنی وجہ یہ ہے کہ تم پرہیزگار ہو جاؤ۔

☆☆☆☆☆

﴿ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ بَعْدِ ذَلِكَ فَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ
وَرَحْمَتُهُ لَكُنْتُمْ مِنَ الْخَسِرِينَ﴾

(۱) ”پھر اس کے بعد تم پھر گئے، تو اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت تم پر نہ ہوتی تو تم ٹوٹے والوں
میں ہو جاتے“

(۲) ”پھر تم پھر گئے اس کے بعد، تو اگر نہ ہوتا اللہ تعالیٰ کا فضل تم پر، اور اسی کی رحمت، تم ہو جاتے
خسارہ پانے والوں میں سے“

مختصر وضاحت: بنی اسرائیل نے اس وعدہ کو بھی توڑ دیا تھا اسی لئے رب تعالیٰ نے فرمایا تم
اس کے بعد پھر گئے لیکن اللہ تعالیٰ نے پھر ان کو اپنے فضل و کرم اور اپنی رحمت سے توبہ کی توفیق دی، اسی لئے
رب تعالیٰ نے فرمایا، اگر تم پر اللہ تعالیٰ کا فضل اور رحمت نہ ہوتی تو تم نقصان اٹھانے والوں میں ہوتے۔
قدرے وضاحت:

﴿ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ بَعْدِ ذَلِكَ﴾: اعرضتم عن الوفاء بالميثاق بعد اخذه “ (بیضاری)
یعنی وعدہ کرنے کے بعد تم اس کی وفانہ کر سکے، بلکہ تم نے اس سے اعراض کیا۔

﴿تَوَلَّيْتُمْ﴾ ماخوذ ہے ”التولی“ سے جس کا معنی ہے اجسام کا کسی چیز سے پیٹھ پھیرنا، پھر
مجازی طور پر افعال اور اعتقادات سے اعراض کرنے پر بھی ”التولی“ کا اطلاق پایا جاتا ہے۔ بیشک
ہم اجماعی طور پر جانتے ہیں کہ بنی اسرائیل نے توراۃ کو طور کے اٹھائے جانے کے بعد قبول کر کے اس پر
عمل کرنے سے اعراض کر لیا۔ بلکہ توراۃ میں تحریف کر دی، انبیاء کرام کو شہید کیا، اور انبیاء کرام کا انکار کر
کے کفر کیا، اور میدان تیہ میں موسیٰ علیہ السلام کے عجیب معجزات دیکھنے کے باوجود انکی مخالفت کرتے رہے۔
اور ہر اذیت والا کام کرتے رہے، اپنے لشکر میں کھلے اور واضح گناہ کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ:

”حتی خسف ببعضهم و احرق النار بعضهم وعوقبوا بالطاعون“
بعض لوگوں کو ان میں سے زمین پر دھنسا دیا گیا اور بعض کو آگ نے جلادیا، اور بعض کو

طاغون کی مرض سے عذاب دیا گیا۔

قرآن پاک میں ان کے اعراض کرنے کی اگرچہ تفصیل مذکور نہیں، لیکن جو وجوہ ہم نے ذکر کی ہیں وہ تواریخ میں موجود ہیں۔ (بلکہ زیادہ ان میں سے قرآن پاک میں مذکور ہیں اگرچہ واضح طور پر یہ نہیں بیان کیا گیا کہ یہ وجوہ ہیں ان کے اعراض کرنے کے)۔
(از شیخ زادہ)

﴿ فَلَوْ لَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَكُنْتُمْ مِنَ الْخَسِرِينَ ﴾

”الفضل التوفيق للتوبة والرحمة قبولها“

فضل کا مطلب ہے توبہ کی توفیق دینا، اور رحمت کا مطلب ہے اس کی عطا کردہ توبہ کی توفیق کو قبول کرنا، اسی معنی کے لحاظ پر مطلب یہ ہو گیا کہ اگر اللہ تعالیٰ تمہیں توبہ کی توفیق نہ عطا کرتا اور اس توبہ کے قبول کرنے کی رحمت تم پر نہ فرماتا تو نقصان اٹھانے والوں میں ہوتے۔ لیکن اس نے اپنے فضل اور رحمت کے ذریعے تمہیں اس نقصان سے بچالیا۔

”او الفضل والرحمة بعثة رسول الله ﷺ وادراكهم لمدته“

یا فضل اور رحمت سے مراد نبی کریم ﷺ کی بعثت اور بنی اسرائیل کا آپ کے زمانہ کو پالینا۔

یعنی خطاب نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے لوگوں کو ہے اب مطلب یہ ہو گا کہ اگر اللہ تعالیٰ اپنے محبوب ﷺ کو نہ مبعوث کرنا اور تمہیں ان کا زمانہ عطا نہ فرماتا تو تم خسارہ اٹھانے والوں میں ہوتے۔ لیکن اس نے اپنے محبوب ﷺ کو تم میں مبعوث کر کے اور تمہیں ان کا زمانہ عطا کر کے نقصان سے بچالیا۔

(روح المعانی)

نبی کریم ﷺ کی وجہ سے ان کو نقصان سے کیسے بچالیا گیا؟

”ويمكن ان يروا ﴿لَوْ لَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ﴾ بعثة محمد ﷺ حيث جعله

رحمة للعالمين فبوجوده ﷺ امهل الكفار واجر عنهم العذاب ورفع عنهم

الخنسف والمسخ“

یعنی اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو مبعوث فرمایا، آپ کو رحمت للعالمین بنایا، اور آپ کے وجود

مسعود سے کفار کو مہلت دی، اور ان سے عذاب کو مؤخر کر دیا، اور ان کو زمین میں دھنسا

دینے والے عذاب اور ان کی شکلیں بگاڑ دینے والے عذاب سے بچالیا۔

اب مفہوم واضح ہو گیا کہ اگر اللہ تعالیٰ نبی کریم ﷺ کو سب جہانوں کے لئے رحمت بنا کر مبعوث نہ فرماتا، اور کفار میں ان کو موجود نہ فرماتا تو وہ بہت سخت عذاب میں مبتلا ہو کر تباہ و برباد ہو جاتے۔

(از مظہری)

﴿خُسْرَانٌ﴾ کا معنی رأس المال (اصل سرمایہ پونجی) کا ضائع ہو جانا یا اس میں کمی آ جانا۔

”والمراءد لکنتم مغبونین ہالکین بالانہماک فی المعاصی“

مراد اس سے یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم گناہوں میں مکمل طور پر پھنس کر برباد ہو جاتے۔

”او بالخط فی مہاوی الضلال عند الفترۃ“ یا مراد یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کا فضل تم پر نہ

ہوتا اور اس کی رحمت تم پر نہ ہوتی تو تم ابتدائی فترت میں ہی گمراہی کے گڑھے میں گر کر تباہ و برباد ہو جاتے۔

(از روح المعانی)

﴿لَکُنْتُمْ مِنَ الْخُسْرٰیْنَ﴾ المغبونین المعذبین فی الحال کما کنتم معذبین ہالکین
بوقوع الطور لو لم تقبلوا حکم اللہ حینئذ

اگر تم پر اللہ تعالیٰ کا فضل اور رحمت نہ ہوتی تو تم عذاب میں ایسے مبتلاء ہوتے اور عذاب کی وجہ سے برباد ہو جاتے جیسا کہ تم طور پر جا کر ہلاک ہو گئے تھے، اگر اللہ تعالیٰ اس وقت تم پر رحم نہ فرماتا تو تم برباد ہی رہتے۔

(از مظہری)



﴿وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِينَ اعْتَدُوا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا

لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ﴾

(۱) ”اور بے شک ضرور تمہیں معلوم ہے تم میں کے جنہوں نے ہفتہ میں سرکشی کی، تو ہم نے ان سے فرمایا ہو جاؤ بندر دھتکارے ہوئے“

(۲) ”اور تحقیق تم جانتے ہو ان لوگوں کو جنہوں نے تجاوز کیا ہے تم میں سے ہفتہ کے دن میں تو ہم نے کہا انہیں ہو جاؤ بندر ذلیل و خوار“

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی کہ یہ واقعہ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں درپیش ہوا۔ یہ لوگ مدینہ طیبہ اور شام کے درمیان دریا کے کنارے پر واقع بستی ایلہ میں مقیم تھے۔ یہود کو ہفتہ کے دن شکار سے منع کیا گیا تھا، کیونکہ ہفتہ کا دن ان کے لئے معظم تھا۔ جیسا کہ عیسائیوں کے لئے اتوار کا دن اور مسلمانوں کے لئے جمعہ کا دن معظم ہے۔

سال کے ایک مہینہ میں اس دریا میں اتنی مچھلیاں ہوتیں کہ پانی کی اوپر کی سطح مچھلیوں سے ڈھانپ دی جاتی یہود کی آزمائش کے لئے ہفتہ کے دن بھی اتنی مچھلیاں ہی دریا میں جمع ہو جاتیں۔ لیکن آگے پیچھے اور دنوں میں مچھلیاں بہت ہی کم مقدار میں ہوتیں۔ زیادہ پانی کی گہرائی میں چلی جاتیں۔ سورۃ اعراف میں اسی واقعہ کو ان الفاظ مبارکہ سے ذکر فرمایا:

﴿وَاسْأَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِي كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ إِذْ يَعْدُونَ فِي السَّبْتِ إِذْ تَأْتِيهِمْ حِيتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَيَوْمَ لَا يَسْبِتُونَ لَا تَأْتِيهِمْ كَذَلِكَ نَبْلُوهُمْ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ﴾

”اور ان سے حال پوچھو اس بستی کا کہ دریا کے کنارے تھے جب وہ ہفتہ کے دن کے بارے میں حد سے تجاوز کرنے لگے جب ہفتہ کے دن ان کے سامنے مچھلیاں پانی پر تیرتیں ان کے سامنے آتیں اور جو دن ہفتے کا نہ ہوتا نہ آتیں اس طرح ہم انہیں آزماتے تھے اس وجہ سے کہ وہ فسق کرتے تھے“

جب ہفتہ کے دن ان کے سامنے مچھلیاں آتیں اور اپنی اپنی دم کو پانی سے باہر نکالتیں تو ان کے دل للچانے لگے کہ ہم کس طرح شکار کریں ادھر ہفتہ کا دن، رب تعالیٰ کی طرف سے شکار کی ممانعت، اور

ادھر صرف ہفتہ کے دن ہی مچھلیوں کی کثرت اور ان کا پانی کی سطح پر آنا۔ ابھی یہ لوگ شکار کرنے کو لپکا رہے تھے کہ شیطان نے ان کی راہنمائی کی:

”ثم ان الشيطان وسوس اليهم وقال انما نهيتهم عن اخذها يوم السبت ولم تنهوا عن اخذها في غيره“

یعنی شیطان نے ان کے دلوں میں وسوسہ ڈالا، اور کہا بیشک تمہیں مچھلیوں کے پکڑنے سے منع کیا گیا ہے، لیکن ان کو کسی حیلہ سے پھنسانے سے تو منع نہیں کیا گیا، تو انہوں نے دریا کے کنارے ارد گرد بڑے بڑے حوض بنائے اور نالیوں کے ذریعے ان میں ہفتہ کے دن مچھلیوں کو حوضوں میں بند کر لیتے اور اتوار کو اسی طرح بعد کے دنوں میں ضرورت کے مطابق پکڑتے رہتے۔

”وقيل انهم كانوا ينصبون الشخوص والحبائل يوم الجمعة ويخرجونها يوم الاحد“

اور ایک قول یہ ہے (راقم کے نزدیک بعض لوگ یہ حیلہ کرتے تھے اور بعض پہلے والا) کہ وہ لوگ جمعہ کے دن اپنی کنڈیاں اور جال دریا میں ڈال دیتے اور ان کو باہر رسیوں، دھاگوں سے باندھ دیتے، ہفتہ کے دن مچھلیاں ان میں پھنس جاتیں اور اتوار کو وہ نکال لیتے۔

کچھ وقت تک تو یہی طریقہ اختیار کئے رہے، اور عذاب ان پر نازل نہ ہوا تو ان کو جرأت حاصل ہو گئی کہ وہ ہفتہ کے دن بھی شکار کرنے لگ گئے۔ مچھلیاں پکڑنا، اور بھوننا اور خرید و فروخت کرنا ان کا مشغلہ بن گیا۔ اب ان میں تین گروہ بن گئے اس بستی میں رہنے والے ستر ہزار کی تعداد میں تھے۔

”صنف امسك عن الصيد ونهى عن الاصطياد“ ایک قسم کے وہ لوگ تھے جو خود بھی شکار نہیں کرتے تھے اور شکار کرنے والوں کو بھی منع کرتے تھے ان کی تعداد بارہ ہزار تھی۔

”وصنف امسك ولم ينه“ اور ایک قسم کے وہ لوگ تھے جو خود تو شکار نہیں کرتے تھے لیکن شکار کرنے والوں کو روکتے نہیں تھے کہ تمام شکار نہ کرو۔

”وصنف انهمكوا في الذنب وحتكوا الحرمة“ اور قسم کے لوگ وہ تھے جو گناہوں میں منہمک تھے اور انہوں نے حرمت کے قانون کو توڑ دیا تھا۔

نیک لوگوں نے بحرین سے کنارہ کشی کر لی:

جو لوگ خود شکار نہیں کر رہے تھے اور شکار کرنے والوں کو منع کر رہے تھے بحرین نے جب ان نیک لوگوں کی نصیحت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا، تو انہوں نے کہا ”واللہ لا نساکنکم فی قریة واحدة فقسّموا القریة بینہم بجدار“ قسم ہے اللہ تعالیٰ کی ہم تمہارے ساتھ ایک بستی میں نہیں ٹھہریں گے انہوں نے اپنے گھروں کو درمیان میں ایک دیوار بنا کر علیحدہ کر لیا۔

اس طرح گویا کہ دو بستیاں بن گئیں ایک بحرین کی اور ایک نیک لوگوں کی اسی حال میں کچھ عرصہ گزر گیا: ”ثم لعنہم داؤد وغضب اللہ علیہم لا صرارہم علی المعصیة“ پھر ان پر داؤد علیہ السلام نے بھی لعنت بھیجی اور اللہ تعالیٰ کا بھی غضب ان پر آ گیا کیونکہ وہ اپنی معصیت پر مصر رہے یعنی اپنے گناہوں پر ڈٹے رہے۔ تو رب تعالیٰ کا عذاب ان پر مسلط ہو گیا۔

جو لوگ ان کو شکار کرنے سے منع کرتے تھے ایک دن جب انہوں نے دیکھا کہ شکار کرنے والے گھروں سے نہیں نکل رہے، اپنی بستی کی دیوار کا انہوں نے دروازہ نہیں کھولا۔ تو ان لوگوں نے دیوار کو پھاند کر جب دیکھا تو یہ بندر بنے ہوئے تھے اپنے دم ہلا رہے تھے۔ (ازخازن)

”وقیل صار الشباب قردة والشیوخ خنازیر فمکثوا ثلاثة ایام ثم ہلکوا“ بعض حضرات نے کہا ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے رب تعالیٰ کے حکم کے خلاف ورزی کی ان میں جوانوں کو بندر بنا دیا گیا۔ اور بوڑھوں کو خنزیر، وہ تین دن تک اسی حال میں رہے پھر ہلاک ہو گئے۔ (خازن)

مختصر لفظی بحث: ﴿السَّبْتُ﴾ معروف دن یعنی ہفتہ کا دن۔

”وهو ماخوذ من السبت الذی هو القطع لانه سبت فیہ خلق کل شئی وعملہ“

یہ ماخوذ ہے اس ”سبت“ سے جس کا معنی ہے قطع کرنا، چونکہ اس دن میں ہر چیز اور اس کے عمل کو پیدا کرنے سے منقطع کیا گیا ہے اس لئے اسے ”السَّبْتُ“ کہا گیا ہے۔

”وقیل من السبوت وهو الراحة والدعة“ اور بعض حضرات نے کہا کہ یہ سبوت سے

ماخوذ ہے جس کا معنی ہے آرام و سکون۔ جب ”السبت“ سے مراد ہفتہ کا دن ہو تو حذف مضاف ہوگا، تقدیر عبارت کی یہ ہوگی ”اعتدوا منکم فی حکم السبت“ یعنی مراد ہفتہ کے دن کے حکم میں تجاوز کرنا ہے ”لان الاعتداء والتجاوز لم يقع فی الیوم بل وقع فی حکمہ“ اس لئے کہ تجاوز دن میں، زمان میں نہیں ہوتا بلکہ تجاوز دن کے احکام میں ہوتا۔ (از روح المعانی)

”والسبت مصدر قولک سبت الیہود اذا عظمت یوم السبت“

ایک مطلب یہ ہے کہ ”السبت“ مصدر ہے اس میں مراد وہ معنی ہے جو ”سبت الیہود“ سے لیا ہوا ہے یہ جملہ اس وقت استعمال ہوتا ہے جب یہود ہفتہ کے دن کی تعظیم کریں۔ اب اسی معنی کے لحاظ پر معنی یہ ہوگا اور تحقیق تمہیں علم ہے ان لوگوں کا جنہوں نے ہفتہ کے دن کی تعظیم کرنے میں تجاوز کیا۔ اس معنی کے لحاظ پر کوئی حذف مضاف نہیں۔

مطلب یہ ہے کہ ان پر ہفتہ کے دن کی تعظیم کو واجب قرار دیا گیا تھا کہ وہ اس دن میں اپنی عادات کو چھوڑ دیں۔ اور عبادت میں مشغول رہیں، اور اس دن کی عظمت کا لحاظ رکھیں، جب اس دن کی تعظیم ان پر واجب ہے تو یقیناً اس دن میں تجاوز کرنا اور جرائم ان پر حرام ہیں۔ (از بیضاوی و شیخ زادہ)

یہود نے ہر موقع پر نبی کی مخالفت کی: موسیٰ علیہ السلام کے دل میں خواہش تھی کہ عبادت کا دن جمعہ کا منتخب ہو لیکن یہود نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مخالفت کی وہ کہنے لگے کہ نہیں ہفتہ کا دن ہونا چاہئے۔ انہوں نے کہا:

”فانه تعالى ابتدا خلق العالم فی يوم الاحد واتمه يوم الجمعة فلم یکن يوم

(شیخ زادہ)

السبت يوم العمل فتمحض فیہ العبادة“

کہ اللہ تعالیٰ نے جہان کے پیدا کرنے کی ابتداء اتوار کے دن کی اور جمعہ کے دن اسے مکمل کر دیا ہفتہ کے دن کوئی عمل نہیں پایا گیا (عمل اور تخلیق سے منقطع ہونے کی وجہ سے ہی وہ سبت بنا) اسلئے وہ ہی عبادت کا دن ہونا چاہئے۔

موسیٰ علیہ السلام نے ان کی خواہش کے مطابق ہی دعا کر دی رب تعالیٰ نے ان کے لئے ہفتہ کا دن ہی معظم قرار دے دیا۔

راقم کے نزدیک ان کو اللہ کے نبی کی مخالفت کی وجہ سے شیطان کے جال میں پھنسا پڑا، اسی کے وسوسہ سے انہوں نے شکار کرنے کے لئے مکرو فریب کے حیلے تراشے، آخر کار بندر بنا دیئے گئے۔ سبحان اللہ نبی کی تعظیم کرنے والے بھی معظم بن گئے، قوم کے امام بن گئے، حیات جاوادی حاصل کر گئے لیکن نبی کے گستاخ بندر اور خنزیر بنا دیئے گئے۔

﴿قِرْدَةٌ﴾: جمع قرد، جس کا معنی مشہور و معروف ہے یعنی ”بندر“، خاسئین، الخسو، الصغار والذلة“ یعنی خاسئین کا معنی ذلیل و حقیر ہونا یہ لازم بھی استعمال ہوتا ہے اور متعدی بھی ”وبعضہم ذکر الطرد عند تفسیر الخسو کالابعاد“ اور بعض حضرات نے اس کا معنی ہانکنا، دھتکارنا کیا ہے یعنی جس طرح کسی کو اپنے آپ سے دور کر دیا جائے۔

خیال رہے کہ ”خاسئی“ کا ظاہر طور پر معنی فاعل والا ہے، لیکن یہاں مراد مفعول والا معنی ہے، ”الخاسئی الصاغر المبعد المطرود“ اس لئے خاسئی کا معنی ذلیل، دور کیا ہوا اور دھتکارا ہوا۔ اعلیٰ حضرت اور علامہ کاظمی رحمہ اللہ نے ”دھتکارے ہوئے“ ترجمہ کیا ہے اور حضرت پیر محمد کرم شاہ رحمہ اللہ نے پھٹکارے ہوئے ترجمہ کیا ہے۔ راقم نے طلباء کے فائدہ کے لئے کہ ان کو دوسرا معنی بھی ذہن نشین ہو جائے ترجمہ کیا ہے ”ذلیل و خوار“

ہفتہ کے دن مچھلیوں کے زیادہ آنے کی وجہ:

یعنی اللہ تعالیٰ نے جب ان کو ہفتہ کی تعظیم کرنے کا حکم دیا اور شکار کرنے سے منع کیا تو ہفتہ کے دن مچھلیوں کے دریا میں زیادہ بھیجنے میں حکمت کیا تھی ”وہل هذا الاشارة الفتنه وادانة الاضلال“ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ان کو آزمانا مقصود تھی کیونکہ سورۃ اعراف میں رب تعالیٰ نے واضح طور پر بیان فرمایا: ﴿كَذَلِكَ نَبْلُوهُمْ﴾ ہم اسی طرح ان کو آزماتے ہیں، جب وہ آزمائش میں ناکام ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو فتنہ میں مبتلا کر دیا اور گمراہ کر دیا۔

فائدہ عظیمہ: یہود امتحان میں ناکام ہو کر ذلیل و خوار ہوئے لیکن مصطفیٰ کریم ﷺ کے صحابہ کرام کی عظمت تو دیکھو کہ وہ آزمائش میں کس طرح کامیابی سے ہمکنار ہوتے ہیں۔

☆ "عن ابی قتادۃ انه خرج مع رسول اللہ ﷺ فتخلف مع بعض اصحابہ وهم محرمون وهو غیر محرم فأوا حمارا وحشیا قبل ان یراہ فلما رأوه تركوه حتی رآه ابو قتادۃ فركب فرساله فسألهم ان یناولوه سوطه فابوا فتناوله فحمل علیه فعقره ثم اكل فاكلوا فندموا فلما ادرک رسول اللہ ﷺ سألوه قال هل معکم منه شئی قالوا معنا رجله فاخذها النبی ﷺ فاكلها (متفق علیه) وفی رواية لهما فلما اتوا رسول اللہ ﷺ قال امنکم احد امره ان یحمل علیها او اشار الیها قالوا لا قال فكلوا ما بقی من لحمها"

(مشکوۃ باب المحرم یحب الصيد)

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں وہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ (سفر میں) نکلے کچھ ساتھیوں کے ساتھ آپ سے پیچھے رہ گئے دوسرے ساتھی ان کے محرم (احرام میں) تھے اور ان کا احرام نہیں تھا۔ ان کے دیکھنے سے پہلے دوسرے احرام والے ساتھیوں نے حمار وحشی کو دیکھا۔ (لیکن وہ احرام میں تھے، ان پر خشکی کے جانوروں کا شکار منع قرار دیا گیا تھا اس لئے) انہوں نے شکار کو دیکھا (اس کے درپے نہ ہوئے) اسے چھوڑ دیا۔ ابو قتادہ (چونکہ احرام میں نہیں تھے) نے جب اسے دیکھا تو وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہوئے دوسرے صحابہ کرام کو کہا کہ مجھے کوڑا پکڑا دیں لیکن انہوں نے ان کو کوڑا دینے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے خود ہی کوڑا پکڑا اور حمار وحشی پر حملہ کیا اس کی کوچیں کاٹ دیں پھر انہوں نے (اس کا گوشت) کھایا اور دوسرے صحابہ کرام نے بھی کھایا (وہ کھانے پر) نادم ہو گئے۔ جب وہ نبی کریم ﷺ کو ملے، تو آپ سے صحابہ کرام نے پوچھا، آپ نے فرمایا کیا تمہارے پاس اس گوشت میں سے کچھ ہے؟ انہوں نے عرض کیا ہاں ٹانگ کا کچھ حصہ ہے نبی کریم ﷺ نے وہ گوشت لیا اور کھایا۔

(بخاری و مسلم)

بخاری اور مسلم کی ہی ایک روایت یہ ہے کہ جب صحابہ کرام نبی کریم ﷺ کے پاس آئے (ان کے پوچھنے پر) آپ نے فرمایا کیا تم میں سے کسی ایک نے ابو قتادہ کو حمار وحشی پر حملہ کرنے کا حکم دیا تھا یا اس کی طرف اشارہ کیا تھا؟ انہوں نے عرض کیا نہیں، تو آپ نے فرمایا جو گوشت تمہارے پاس بچا ہوا وہ بھی کھاؤ۔

حدیث پاک سے حاصل ہوا: صحابہ کرام کو احرام کی حالت میں خشکی کے جانوروں کو شکار کرنے سے منع کیا گیا تھا، یہ منع کرنا ان کی آزمائش تھی، لیکن وہ اس میں پورے اترے، شکار ان کے

سامنے تھا، وہ شکار کر سکتے تھے، لیکن انہوں نے نہ شکار کیا، نہ ہی ان کا دل لچایا، نہ ہی انہوں نے شکار کرنے کے لئے کوئی فریب اور دھوکا کا حیلہ کیا۔ بلکہ ابوقحادہ جو احرام میں نہیں تھے ان کو شکار کرنے کے لئے کوڑا بھی نہیں پکڑایا۔ وہ خود ہی سواری سے اترے اور انہوں نے کوڑا پکڑا اور شکار کیا۔

صحابہ کرام نے اپنے ذہنوں سے سوچتے ہوئے کہ یہ شکار اس شخص نے کیا ہے جس کا احرام نہیں۔ لہذا ہمیں گوشت کھالینا جائز ہے۔ لیکن گوشت کھانے کے بعد پھر پشمانی ہوئی کہ ہمیں پہلے نبی کریم ﷺ سے پوچھنا چاہئے تھا۔ نبی کریم ﷺ نے بھی ان سے پوچھ لیا کیا تم نے شکار کرنے کو کہا تو نہیں تھا، کیا تم نے شکار کی طرف اشارہ تو نہیں کیا تھا؟ جب صحابہ کرام نے عرض کیا نہیں یا رسول اللہ، تو آپ نے ان کو بقیہ گوشت بھی کھانے کی اجازت دی، اور ساتھ ہی ان سے گوشت لے کر خود بھی کھایا۔ تاکہ صحابہ کرام کامل طور پر مطمئن ہو جائیں کہ انہوں نے گوشت کھا کر کوئی غلطی نہیں کی۔

سبحان اللہ کیا ہی خوب شان ہے نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام کی جو آزمائش میں پورے اترے، اور اپنے عمل سے امت مصطفیٰ ﷺ کی برتری پر روز روشن کی طرح دلیل قائم کر دی۔

اس واقعہ کے ذکر کرنے کا مقصد: بنی اسرائیل کا اللہ تعالیٰ کے حکم سے عدول کرنا اور بند رہنے کے واقعہ کو ذکر کرنے میں دو مقصد ہیں۔ ایک یہ کہ نبی کریم ﷺ کے معجزہ کو ظاہر کرنا مقصود تھا، کیونکہ جب آپ نے اپنے زمانہ کے یہود کو خطاب کرتے ہوئے رب تعالیٰ کا ارشاد سنایا:

﴿وَلَقَدْ عَلِمْتُمْ﴾ ”تحقیق تمہیں علم ہے“

اسی سے آپ کے سچے نبی ہونے کا پتہ چل گیا، کہ وحی کے بغیر آپ کو یہ کہنا ممکن ہی نہیں تھا کیونکہ اس وقت کے تمام یہود و نصاریٰ اور مشرکین جانتے تھے کہ آپ نے کسی استاذ سے کچھ نہیں پڑھا، آپ نے کبھی لکھنا سیکھا نہیں۔ آپ کبھی لوگوں کی مجلسوں میں شریک نہیں ہوئے، پھر بنی اسرائیل کے واقعات کو تفصیل سے بیان کرنا صرف اسی وقت ممکن تھا جب آپ کو نبوت حاصل ہوا اور آپ کی طرف وحی آتی ہو۔

اس واقعہ کو بیان کرنے میں دوسرا مقصد یہ تھا کہ آپ نے اپنے زمانہ کے یہود کو اس پر متنبہ کیا کہ جب تمہارے آباء و اجداد کو ہفتہ کے دن کی بے حرمتی اور رب تعالیٰ کی حکم سے عدولی کی وجہ سے بندر

”اما تخافون ان ينزل عليكم بسبب تمردكم ما نزل عليهم من العذاب فلا

تغفروا بالامهال المدود لكم“

تو تم کیوں نہیں ڈرتے کہ تمہاری سرکشی کی وجہ سے تم پر بھی عذاب نازل ہو جائے، تمہیں جو زیادہ دیر کیلئے مہلت دی جاتی ہے اس سے تم اس دھوکہ میں مبتلا نہ ہو کہ تمہیں عذاب دیا ہی نہیں جاتا۔

اسی پر رب تعالیٰ کا ایک اور ارشاد گرامی واضح طور پر دلالت کر رہا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا الْكِتَابَ آمِنُوا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ نَطْمِسَ وُجُوهًا فَنَرُدَّهَا عَلَىٰ أَدْبَارِهَا أَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّا أَصْحَابَ السَّبْتِ وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ مَفْعُولًا﴾

اے کتاب والو! ایمان لاؤ اس پر جو ہم نے اتارا تمہارے ساتھ والی کتاب کی تصدیق فرماتا قبل اس کے کہ ہم بگاڑیں کچھ چہروں کو تو انہیں پھیر دیں ان کی پیٹھ کی طرف یا انہیں لعنت کریں جیسی لعنت کی ہفتہ والوں پر، اور خدا کا حکم ہو کر رہے گا۔

اعتراض: ان کو بندر بن جانے کا حکم کیسے دیا گیا ﴿كُونُوا قِرَدَةً﴾ ”تم بند بن جاؤ“، فانهم ما كانوا قادرين على ان يقبلوا انفسهم على صورة القردة “ وہ تو اس پر قادر ہی نہیں تھے کہ اپنے آپ کو بندر بنالیں۔

جواب: ”ان المراد منه سرعة التكوين كقوله تعالى (انما امرنا لثني اذا اردناه ان نقول له كن فيكون)۔“

اس سے مراد امر دینا مقصود نہیں بلکہ ان کا جلدی ہی بندر بنادینے کا ذکر ہے۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا جب ہم کسی چیز کا ارادہ کرتے ہیں کہتے ہیں ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی کو عذاب دینا چاہے تو کوئی اس کے عذاب کو روک نہیں سکتا۔ اور نہ ہی اسے کوئی عاجز کر سکتا ہے بلکہ جسے عذاب دینا مقصود ہوتا ہے وہ خود ہی عذاب کو قبول کر لیتا ہے۔

(از کبیر)

کیا وہ حقیقی بندر بن گئے تھے یا تشبیہ ہے؟ اگرچہ بعض حضرات نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ وہ حقیقی بندر نہیں بنائے گئے تھے بلکہ ان کے دلوں پر مہر لگا کر ان کو بندروں کی طرح کر دیا گیا تھا لیکن یہ

قول صحیح نہیں کیونکہ صرف مجاہد کی تفسیر ہے:

”مسخت قلوبہم فقط وردت افہامہم کافہام القردة ولم یقلہ غیرہ من

(قرطبی)

المفسرین فیما اعلم واللہ اعلم“

کہ ان کے دل مسخ کئے فقط اور ان کی سمجھیں بندروں کی سمجھوں کی طرح ہو گئیں۔ میرے علم کے مطابق اور کسی مفسر نے یہ نہیں کہا۔

”وظاہر القرآن انہم مسخوا قردة علی الحقیقة وعلی ذلک جمہور

المفسرین وهو الصحیح“

قرآن پاک سے ظاہر طور پر یہی ثابت ہے کہ وہ حقیقی طور پر بندر بنادیئے گئے تھے اسی پر

جمہور مفسرین کرام ہیں اور یہی صحیح قول ہے اور یہی معتبر ہے۔ (از روح المعانی)

جن کو بندر بنایا گیا ان کی نسل چلی؟ اس میں ایک قول یہ ہے کہ ان کی نسل چلی، لہذا یہ بندران کی نسل سے ہی ہیں۔ اسی طرح مسخ ہونے والی قوموں نسل میں خنازیر، گوہ، چوہے وغیرہ آرہے ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ان کی نسل نہیں چلی بلکہ وہ تین دنوں کے بعد مر گئے یہی قول صحیح ہے۔

مسئلہ کی تفصیل ملاحظہ ہو: جن حضرات نے یہ کہا کہ یہ بندران کی نسل سے ہیں، وہ دلیل کے طور پر تین حدیثوں کو پیش کرتے ہیں۔

(۱) ”عن ابی ہریرۃ قال النبی ﷺ فقدت امة من بنی اسرائیل لا یدری ما فعلت ولا اراھا الا الفار الا ترونها اذا وضع لها البان الابل لم تشربہ واذا وضع لها البان الشاء شربته“..... اخرجه مسلم.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بنی اسرائیل کی ایک جماعت گم ہو گئی ان کے متعلق معلوم نہیں کہ ان سے کیا کیا گیا میں نہیں خیال کرتا سوائے اس کے کہ چوہے وہی ہیں کیا تم دیکھتے نہیں کہ جب ان کے سامنے اونٹوں کا دودھ رکھا جائے تو وہ نہیں پیتے، اور جب ان کے سامنے بکریوں کا دودھ رکھا جائے تو وہ پی لیتے ہیں۔

(۲) ”عن ابی سعید وجابر قال جابر اتی النبی ﷺ بضب فابی ان یا کل منه وقال لا ادری لعلہ من القرون التی مسخت“..... اخرجه مسلم.

حضرت ابوسعید اور حضرت جابر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے حضرت جابر کہتے ہیں (الفاظ آپ کی روایت کے ہیں) نبی کریم ﷺ کے پاس گواہ لائے گئی، آپ نے اس کے کھانے سے انکار کر دیا اور فرمایا میں نہیں جانتا شاید یہ ان قوموں سے ہو جن کو مسخ کر دیا گیا۔

(۳) ”قال عمرو بن ميمون الاودي رأيت في الجاهلية قردة قد زنت فرجموها فرجمتها معهم“ (رواه البخاری)

حضرت عمرو بن ميمون اودی رحمہ اللہ نے فرمایا، میں نے زمانہ جاہلیت میں دیکھا کہ ایک بندر اور بندر یا نے زنا کیا تو دوسرے بندروں نے انہیں سنگسار کیا تو میں نے بھی ان کو سنگسار کیا۔ ان احادیث سے ان حضرات نے یہ دلیل پیش کی کہ جن قوموں کو مسخ کیا گیا ان کی نسل سے ہی چوہے اور گواہ اور بندر پائے جاتے ہیں۔

جمہور کے نزدیک نسل نہیں چلی:

”وقال الجمهور الممسوخ لا ينسل وان القردة والخنازير وغيرهما كانت قبل ذلك والذين مسخهم الله قد هلكوا ولم يبق لهم نسل لانه قد اصابهم السخط والعذاب فلم يكن لهم قرار في الدنيا بعد ثلاثة ايام“

جمہور حضرات کا یہی قول ہے کہ جن قوموں کو مسخ کیا گیا ان کی نسل نہیں چلی، بیشک بندر اور خنزیر اور ان کے علاوہ دوسرے جانور پہلے سے چلے آ رہے ہیں، جن کو مسخ کیا گیا وہ ہلاک کئے ان کی کوئی نسل باقی نہیں رہی، بیشک ان کو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور عذاب حاصل ہوا ان کو تین دنوں سے زیادہ دنیا میں قرار حاصل نہیں ہوا۔

یہی قول معتبر اور صحیح ہے معتبر تفاسیر میں جمہور مفسرین کرام نے یہی قول کیا ہے اور اسی کو صحیح قرار دیا گیا ہے۔

پہلے قول والوں کے دلائل کے جوابات:

پہلی جو دو حدیثیں بیان کی گئی ہیں (کہ بنی اسرائیل کی ایک جماعت گم ہو گئی ان کے متعلق معلوم نہیں وہ کہاں ہیں میرا خیال ہے کہ یہ چوہے وہی ہیں۔ اور آپ نے فرمایا مجھے معلوم نہیں ہو سکتا ہے یہ

(گوہ) ان قوموں سے ہو جن کو مسخ کر دیا گیا۔

”فانما كان ظنا وخوفا لان يكون الضب والفار وغيرهما مما مسخ و كان

هذا حد سامنه قبل ان يوحى اليه ان الله لم يجعل للمسوخ نسلا“

ان میں نبی کریم ﷺ نے خوف اور اندیشہ سے کلام فرمایا یعنی وہ کلام اس وحی سے پہلے فرمایا جس میں آپ کو اللہ تعالیٰ نے مطلع فرمادیا مسخ ہونے والے جانوروں کی نسل نہیں چلی۔

بات بہت واضح ہے کہ نبی کریم ﷺ نے شدید خوف الہی کے وقت اچانک کلام فرمایا جس میں توجہ صرف رب تعالیٰ کی طرف تھی، اسی لئے رب تعالیٰ نے آپ کو اس حقیقت حال کی طرف متوجہ فرمایا جس کا ذکر آپ نے فرمایا۔

☆ ”قال رجل يا رسول الله القردة والخنازير هي مما مسخ فقال النبي ﷺ ان الله عز وجل لم يهلك قوما او يعذب قوما فيجعل لهم نسلا وان القردة والخنازير كانوا قبل ذلك..... رواه مسلم كتاب القدر“

ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا یا رسول اللہ کیا یہ بندر اور خنزیر وہی ہیں جن قوموں کو مسخ کر کے بندر اور خنزیر بنائے گئے تھے؟ آپ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ نے کسی قوم کو اس لئے ہلاک نہیں کیا اس لئے عذاب نہیں دیا کہ ان کی نسل چلائی جائے بندر اور خنزیر پہلے بھی موجود تھے۔

☆ ”قال ابن عباس لم يعش مسخ قط فوق ثلاثة ايام ولم ياكل ولم يشرب ولم ينسل“ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں جن قوموں کو مسخ کیا وہ تین دنوں سے زیادہ بالکل زندہ نہیں رہے اور نہ ہی انہوں نے کھایا اور نہ ہی پیا اور نہ ہی ان کی نسل چلی۔

☆ ”قال ابن عطية وروى عن النبي ﷺ وثبت ان الممسوخ لا ينسل ولا ياكل ولا يشرب ولا يعيش اكثر من ثلاثة ايام“

ابن عطیہ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی یہ ہے کہ یہ ثابت شدہ بات ہے کہ جن قوموں کو مسخ کیا گیا ان کی نسل نہیں چلی، اور نہ انہوں نے کچھ کھایا اور نہ پیا اور نہ ہی تینوں دنوں سے وہ زیادہ زندہ رہے۔

تیسری حدیث کا جواب:

”کذا حکى ابو مسعود ولم يذكر فى اى موضع اخرجه البخارى من

كتابه فبحثنا عن ذلك فوجدنا فى بعض النسخ لا فى كلها“

اسی طرح ابو مسعود نے حکایت بیان کی لیکن یہ نہیں ذکر کیا کہ بخاری نے کس مقام میں اپنی کتاب میں اس حدیث کو بیان کیا ہے جب ہم چھانٹ بیٹھ کی تو بخاری کے بعض نسخوں میں یہ حدیث ملی، تمام نسخوں میں یہ حدیث نہ مل سکی۔

واضح ہوا کہ یہ حدیث قابل حجت نہیں، اس لئے کہ جب بخاری کے تمام نسخوں میں اتفاقی طور پر حدیث نہیں تو جن نسخوں میں ہے ان میں غلطی کا بھی احتمال ہو سکتا ہے۔

دوسرا جواب:

”فذكر فى كتاب ايام الجاهلية يعنى ان عمرو بن ميمون قد ادرك

الجاهلية ولم ينال بظنه الذى ظنه فى الجاهلية“

عمرو بن ميمون نے زمانہ جاہلیت کا ذکر کیا اور انہوں نے زمانہ جاہلیت میں اپنے گمان کا ذکر کیا زمانہ جاہلیت میں گمان کا کوئی اعتبار نہیں کہ اس سے احکام ثابت کئے جائیں۔

بخاری کے بعض نسخوں میں بھی اسے نقل کیا گیا ہے اس سے احکام ثابت نہیں کئے۔ خیال رہے کہ زمانہ جاہلیت سے مراد نبی کریم ﷺ کی بعثت سے پہلے کا زمانہ اس حدیث میں مراد نہیں کیونکہ عمرو بن ميمون تابعی ہیں اس سے مراد ان کے ایمان لانے سے پہلے کا وقت ہے۔

تیسرا جواب:

”والذى قال البخارى فى التاريخ الكبير عن عمرو بن ميمون قال

رايت فى الجاهلية قردة اجتمع عليها فرود فرجموها فرجمتها معهم وليس

فيه ، قد زنت“

بخاری نے تاریخ کبیر میں عمرو بن ميمون کی حدیث میں ”قد زنت“ (زنا کرنے کا) ذکر نہیں کیا بلکہ صرف اتنا ہی ذکر ہے عمرو بن ميمون کہتے ہیں میں نے جاہلیت میں دیکھا کہ

ایک بندر کو دوسرے بندر پتھر مار رہے ہیں میں نے بھی اسے پتھر مارے۔

چوتھا جواب:

”وجماعة اهل العلم منكر اضافة الزنى الى غير مكلف واقامة الحدود فى البهائم“

اہل علم حضرات نے انکار کیا ہے کہ زنا کی نسبت غیر مکلف جانوروں کی طرف کی جائے اور ان پر حد قائم کی جائے۔

پانچواں جواب:

”ولو صح لكانوا من الجن لان العبادات فى الانس والجن دون غيرهما“

اگر یہ ثابت ہو جائے کہ حدیث میں ”قد زنت“ کے الفاظ بھی ہیں۔ اور حدیث بخاری کے صحیح نسخوں میں ہے اور بندر کو زنا کی وجہ سے ہی دوسرے بندر سنگسار کر رہے تھے، تو یہ کہنا پڑے گا کہ وہ جن تھے جو بندروں کی شکل میں تھے کیونکہ مختلف شکلیں بنا لیتے ہیں۔ چونکہ عبادت صرف انسانوں اور جنوں پر لازم ہے تو یقیناً حدود بھی انسانوں اور جنوں پر ہی نافذ ہو سکتی ہیں۔ (از قرطبی)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی گریہ وزاری اور حضرت عکرمہ کا استدلال:

ایک دن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سورۃ اعراف میں اس واقعہ کو پڑھ کر رو رہے تھے لوگ آپ کے سامنے حیران ہو کر بیٹھے تھے، اور آپ کے رونے پر تعجب کر رہے تھے (آپ سے وجہ پوچھنے کی کوئی جرات نہیں کر رہا تھا) اتنے میں حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ آگئے جو آپ کے خاص مقربین شاگردوں میں سے تھے۔ انہوں نے عرض کیا حضرت آپ کے رونے کی کیا وجہ ہے؟ آپ نے فرمایا کہ جن لوگوں کو بندر بنادیا گیا ان کے واقعہ میں غور و فکر کر رہا تھا کہ وہ لوگ جنہوں نے شکار کیا تھا وہ عذاب الہی میں مبتلاء ہوئے اور بندر بن گئے۔ اور جن لوگوں نے شکار نہیں کیا اور ان کو منع کیا تھا کہ تم شکار نہ کرو وہ نجات حاصل کر گئے۔

لیکن تیسرا فرقہ جنہوں نے شکار تو اگرچہ نہیں کیا تھا لیکن شکار کرنے والوں کو منع نہیں کیا تھا، ان کا

حال معلوم نہیں ہو رہا، جب میں نے یہ خیال کیا کہ ہو سکتا ہے ان کو بھی ﴿امر بالمعروف نہی عن المنکر﴾ ”اچھے کام کا حکم دینا اور برے کام سے روکنا“ نہ کرنے کی وجہ سے عذاب میں مبتلا کر دیا گیا ہو۔ یہ خیال کر کے مجھے شدید خوف لاحق ہوا کہ ﴿امر بالمعروف نہی عن المنکر﴾ کے معاملہ میں ہم میں سے بھی کئی لوگوں سے کوتاہی ہوتی رہتی ہے کہیں وہ بھی رب تعالیٰ کی گرفت میں نہ آ جائیں۔

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا، خاموش رہنے والے، ان کو نہ منع کرنے والے نجات حاصل کر گئے اور ان کو روکنے والوں کے ساتھ ان کو کر دیا گیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا تم اپنے دعویٰ پر دلیل پیش کرو۔ انہوں نے عرض کیا ہم نے آپ سے ہی کئی بار سنا اور حقیقت میں مسئلہ بھی یہی ہے ”امر بالمعروف ونہی عن المنکر فرض کفایہ است“ کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرض کفایہ ہے۔

فرض کفایہ کا حکم واضح ہے کہ اگر بعض لوگ اس پر عمل کر لیں تو گنہگار کوئی بھی نہیں ہوتا۔ اگرچہ ثواب عمل کرنے والوں کو ہی ملتا ہے۔ اسلئے ثواب اور بلند درجہ تو شکار کرنے والوں کو روکنے والوں کو ہی حاصل ہوا لیکن خاموش رہنے والے بھی رب تعالیٰ کے عذاب سے بچ گئے۔

”حضرت ابن عباس رابشنیدن این کلام نہایت بہجت و سرور و دوا و برخسات و پیشانی عکرمہ رابوسہ دادند و اورا دربر گرفتند“

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کی دلیل کو سن کر بہت ہی زیادہ خوشی حاصل ہوئی اور آپ اٹھے حضرت عکرمہ کی پیشانی پر بوسہ دیا اور ان سے بغل گیر ہو گئے۔

(از عزیزی)

تنبیہ: جب لوگ بہت زیادہ جرائم میں مبتلا ہو جائیں تو نیک لوگوں کو چاہئے کہ ان سے دور چلے جائیں جیسا کہ بنی اسرائیل کے نیک لوگ ان سے جدا ہو گئے تھے، ان کے درمیان اور اپنے درمیان دیوار حائل کر دی تھی جب بحرین کے جرائم حد سے بڑھ جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کو تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَإِذَا أَرَدْنَا أَنْ نُهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا فِيهَا فَحَقَّ الْقَوْلُ فَنَدَمْنَاهَا نَدَمِيرًا﴾

”اور جب ہم ارادہ کرتے ہیں کسی بستی کو ہلاک کرنے کا تو اس کے رئیسوں کو حکم کرتے ہیں وہ اس میں فسق کرتے ہیں اس پر قول (عذاب کا) ثابت ہو جاتا ہے ہم اس بستی کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں“

یعنی اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء کرام کے ذریعے اپنے احکام لوگوں تک پہنچاتا ہے جب خوشحال اور رئیس لوگ اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کے مطابق اس تمام بستی کو تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ خیال رہے غریب لوگ اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی بہت کم ہی کرتے ہیں۔ زیادہ طور پر امیر لوگ رب تعالیٰ کے نافرمان ہوتے ہیں۔

گنہگاروں کے ساتھ نیک لوگ بھی تباہ ہو جاتے ہیں:

”عن عبد الله بن عمر قال سمعت رسول الله ﷺ يقول اذا اراد الله بقوم

عذابا اصاب العذاب من كان فيهم ثم بعثوا على اعمالهم“

(مسلم ج ۲ ص ۳۹۵ باب اثبات العذاب)

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ رب تعالیٰ جب کسی قوم کو عذاب دینا چاہے تو جتنے لوگ وہاں ہوتے ہیں سب کو عذاب پہنچتا ہے پھر اپنے اپنے اعمال کے مطابق اٹھائے جائیں گے۔

ایک روایت میں آتا ہے ”یبعثهم الله على نياتهم“ اللہ تعالیٰ ان کو انکی نیتوں کے مطابق اٹھائے گا۔ یعنی دنیا میں عذاب اگر چہ آنا تو مجرمین کی وجہ سے ہے لیکن اس تباہی میں نیک لوگ بھی مبتلاء ہو جاتے ہیں، البتہ جب ان کو قیامت میں اٹھایا جائے گا تو اپنے اپنے اعمال کے مطابق سب کو اٹھایا جائے گا مجرمین اللہ تعالیٰ کے احکام کے نافرمان اور باغی قیامت کے دن بھی عذاب کے مستحق ہوں گے۔ اور نیک لوگ اس آرام اور چین میں ہوں گے بلکہ دنیا میں ہلاکت کے باعث ان کے درجات اور زیادہ بلند ہوں گے۔

ناجائز کاموں کے لئے حیلہ کرنا حرام ہے:

﴿وَاسْتَدِلْ بِهَذِهِ الْآيَةِ عَلَى تَحْرِيمِ الْحِيلِ فِي الْأُمُورِ الَّتِي لَمْ تُشْرَعْ كَالرِّبَا﴾

اسی آیہ سے اس مسئلہ پر دلیل حاصل کی گئی کہ جو کام ناجائز ہیں ان کو جائز کرنے کے لئے حیلہ کرنا حرام ہے جیسا کہ سود حرام ہے اسے جائز کرنے کے لئے حیلہ کیا جائے۔ (روح المعانی)

ہاں البتہ سود سے بچنے کے لئے حیلہ خود نبی کریم ﷺ نے بیان فرمایا کہ ردی کھجوریں دو صاع فروخت کر کے ایک صاع عمدہ کھجوریں خرید لو۔ ایسے ہی ایک شخص صاحب نصاب ہو، سال مکمل ہونے کے قریب ہو، تو یہ اس مال سے گائے وغیرہ خرید لے جو نصاب تک نہ پہنچیں تو یہ زکوٰۃ دینے سے توجہ کیا لیکن اس نے نیک کام سے دور رہنے کے لئے حیلہ کیا ہے جو ناپسندیدہ فعل ہے ایسے حیلے شریعت میں پسند نہیں کئے گئے۔

ایک شخص صاحب نصاب ہو قربانی اس پر واجب ہو وہ قربانی کے دنوں میں اپنے گھر سے ساڑھے بانوے کلومیٹر ارادۂ دور چلا جائے مسافر ہو گیا، قربانی واجب نہیں رہی، حیلہ تو کر لیا لیکن یہ حیلہ ایک نیک کام سے بچنے کے لئے کیا گیا ہے جو شریعت میں پسند نہیں۔

جائز کاموں کے لئے حیلہ جائز:

”قال الكواشي وجوزها اكثرهم مالم يكن فيها ابطال حق او احقاق باطل“

کواشی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ اکثر اہل علم نے فرمایا ہے کہ جس کام میں حق کو باطل کرنا

لازم نہ آئے اور باطل کو حق کرنا لازم نہ آئے اس میں حیلہ کرنا جائز ہے۔

تنبیہ: حیلہ کی مکمل بحث اور حیلہ اسقاط پر بحث انشاء اللہ ﴿وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا﴾ کے ضمن میں آئے گی۔

☆☆☆

﴿فَجَعَلْنَاهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا

وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ﴾ (آیت ۶۶)

(۱) ”تو ہم نے (اس بستی کا) یہ واقعہ اس کے آگے اور پیچھے والوں کے لئے عبرت کر دیا اور پرہیزگاروں کے لئے نصیحت بنادیا۔“

(۲) ”بنادیا ہم نے اسے عبرت ان کے لئے جو اس وقت موجود تھے اور جو پیچھے آئیوالے تھے اور نصیحت بنادیا پرہیزگاروں کے لئے“

﴿فَجَعَلْنَاهَا﴾ : ”ہا“ ضمیر جو مفعول واقع ہو رہی ہے اس کا مرجع یا تو ”عقوبہ“ ہے یعنی مطلب یہ ہوا کہ گویا رب تعالیٰ نے فرمایا:

”عاقبتناہم بتحویل صورتہم الی صورة القردة“

ہم نے ان کو سزا دی کہ ان کی صورتیں بدل کر بندر کی شکل میں بنادیئے گئے۔

”فانہ عقوبہ لہم علی اصرارہم علی المخالفة والعصیان“ یہ سزا ان کو اس لئے دی گئی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی مخالفت اور نافرمانی میں لگا تار عمل کرتے رہے۔ اب مطلب یہ ہوا کہ ہم نے سزا کو عبرت بنایا۔ اور یا ”ہا“ کا ضمیر کا مرجع ”مسخہ“ ہے:

”قوله فقلنا لہم کونوا قردة خاسنین فی معنا مسخناہم“

اب اس صورت میں مطلب یہ ہوگا گویا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہم نے ان کی شکلیں بدل کر بندر بنایا، اور ان کی شکلوں کو بدل کر عبرت کا ذریعہ بنایا۔

﴿نَكَالًا﴾ : اصل میں ”نکال“ اس سزا کو کہتے ہیں جو مجرم کو دی جائے کہ اسے دیکھ کر دوسرے لوگ ان جرائم سے باز آجائیں کہ کہیں ہمیں بھی وہی سزا نہ دی جائے جو فلاں مجرم کو دی گئی۔ علامہ راغب اصفہانی بیان کرتے ہیں:

”النکال العقوبة الرادعة للجانی عن المعاودة الی الجنایة ولغیر الجانی

عن اتیان مثلها

نکال اس سزا کو کہتے ہیں جو مجرم کو آئندہ جرم سے روک دے اور جو مجرم نہیں اس کو ایسے جرم سے منع رکھے جو مجرمین کے جرائم ہیں۔

کہا جاتا ہے ”نکل فلان عن العدد“ فلاں شخص دشمن سے بزدلی کی وجہ سے رک گیا اسی طرح کہا جاتا ہے ”نکل فلان عن الیمین“ فلاں شخص قسم اٹھانے سے رک گیا۔ لباب (لغت کی کتاب) میں ذکر کیا گیا ہے ”نکال“ کا معنی منع کرنا۔ اور عذاب کو نکال اس لئے کہا جاتا ہے کہ جسے عذاب نہیں دیا جا رہا اس کو منع کرنے کا ذریعہ بنتا ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ مجھے وہ کام نہیں کرنا چاہئے جو دوسرے کے لئے عذاب کا ذریعہ بنا ہے۔

”تنک یل“ کا معنی ہے غیر کو عذاب دینا دوسروں کو روکنے کے لئے اسی طرح بیڑی لگانے کو ”نکل“ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ چلنے سے روکتی ہے۔ (نکالا) عبرة تنکل المعتبر بها ای تمنعه ”نکال“ کا مجازی طور پر معنی عبرت ہے، کیونکہ جو شخص عبرت حاصل کرنے کی کوشش کرے عذاب اسے برائیوں سے منع کر کے عبرت سکھاتا ہے، جب عذاب سبب ہے عبرت کا۔ تو ذکر سبب کا اور مراد مسبب ہے۔

(از بیضاوی و شیخ زادہ)

تنبیہ: کوئی شخص علامہ آلوسی رحمہ اللہ کی اس عبارت سے غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو ”النکال بمعنی العقوبة لا العبرة“ (روح المعانی) نکال کا معنی عقوبت ہے عبرت نہیں۔ علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے حقیقی معنی کے لحاظ پر کہا ہے کہ ”نکال“ کا معنی عبرت نہیں بلکہ عقوبت ہے۔ اور علامہ بیضاوی نے مجازی طور پر عبرت معنی بیان کیا ہے۔

﴿لِمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا﴾

”لما قبلها وما بعدها من الامم اذ ذكرت حالهم في زبر الاولين

واشتهرت قصتهم في الآخرين“

یعنی ایک مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے نافرمان لوگوں کو سزا دینے اور ان کو مسخ کرنے میں پہلی اور بعد میں آنے والی امتوں کے لئے عبرت ہے کیونکہ ان کا حال پہلے صحیفوں میں ذکر ہو چکا تھا، اس لئے پہلی امتوں کو صحیفے پڑھنے سے عبرت حاصل ہوئی۔ اور ان کا واقعہ بعد میں آنیوالے پر مشہور

ہو گیا۔ اس وجہ سے بعد میں آنیوالے لوگوں کے لئے عبرت کا ذریعہ بن گیا۔

”او لمعاصر بہم وما بعدہم“ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کو عقوبت دے کر اور ان کی شکلوں کو بدل کر ان کے زمانے کے لوگوں اور بعد میں آنے والے کے لئے عبرت بنایا۔

”اولما بحضرتہا من القرۃ وما تباعد عنہا“ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کو عقوبت دے کر اور مسخ کر کے اس بستی کے قریب دوسرے لوگوں کے لئے اور دور والی بستیوں کے لوگوں کے لئے عبرت بنایا۔

”اولا ہل تلک القرۃ وما حوالیہا“ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کی عقوبت اور مسخ کو اس بستی والوں اور اس کے ارد گرد لوگوں کے لئے عبرت بنایا۔

”اولا جل ما تقدم علیہا من ذنوبہم وما تاخر منہا“ اب مطلب یہ ہوگا کہ ان کو مسخ کر کے ان کو عذاب ان کے اگلے اور پچھلے گناہوں کی وجہ سے دے کر ان کے لئے عبرت بنایا۔

(از بیضاوی)

دینی مدارس کے طلباء کے لئے:

﴿وَمَا يَذِّهَهَا وَمَا خَلَفَهَا﴾ میں ”من“ نہیں ذکر کیا جو ذوی العقول کے لئے آتا ہے ”ما“ کو ذکر کرنے کی کیا وجہ جو غیر ذوی العقول کے لئے آتا ہے۔ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ اس سے پہلے اس کی مراد میں کئی وجہ ذکر کی جا چکی ہیں آخری وجہ ”ما تقدم من ذنوبہم وما تاخر“ کے لحاظ سے تو ہونا ہی ”ما“ چاہئے۔

تاہم پہلی وجہ کے لحاظ سے جب مراد لوگ لئے جائیں تو مجازی طور پر ”ما“ کو ذکر کیا گیا ہے۔ کیونکہ مجازاً ”من“ غیر ذوی العقول کے لئے اور ”ما“ ذوی العقول کے لئے استعمال ہوتا رہتا ہے۔ اور وجہ یہ بیان کی گئی:

”تحقیر الشانہم فکانہم غیر عقلاء بالنسبۃ الی المتکلم العلی شانہ
الباہر سلطانہ“
(شیخ زادہ)

کہ رب تعالیٰ جس طرح چاہے اپنی مخلوق کا ذکر اسی طرح فرمادے وہ قادر مختار ہے۔ چونکہ یہاں بنی اسرائیل کے مجرمین کا بھی ذکر ہے اور غیر مجرمین کا بھی، اس لئے رب تعالیٰ جو بلند شان کا مالک ہے، جسے غالب سلطنت حاصل ہے اس نے وہ لوگ جو عاصی تھے ان کی حقارت شان کے لحاظ سے ”ما“ ذکر کیا کہ یہ لوگ جانوروں سے بھی گھٹیا ہیں۔

☆ ﴿كُونُوا قِرْدَةً خَاسِئِينَ﴾ میں بھی بظاہر اعتراض ہوتا ہے کہ ”قِرْدَة“ غیر ذوی العقول کی جمع ہے اسکی صفت ”خاسئین“ کیسے آگئی؟ جمع مذکر سالم تو ذوی العقول کے لئے آتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس مقام میں ”خاسئین“ صفت نہیں بلکہ حال ہے معنوی لحاظ پر تقدیر عبارت کی یوں ہوگی۔

”کونوا قردة حال کونکم خاسئین فی هذا المسخ والتبدیل“ (از عزیزی)

﴿وَمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِينَ﴾: اور نصیحت بنایا پرہیزگاروں کے لئے، یعنی بنی اسرائیل کے نافرمان لوگوں کو عذاب دے کر اور ان کی شکلوں کو مسخ کر کے پرہیزگاروں کے لئے نصیحت بنایا کہ وہ اپنے نیک اعمال پر ثابت رہیں۔ اور ہمیشہ نیک عمل کرتے رہیں۔

(موعظة) وزنها مفعلة من الاتعاض والانزجار والوعظ والتخويف ”موعظة کا وزن مفعلة ہے اس کا معنی نصیحت قبول کرنا اور زجر حاصل ہونا اور نصیحت دینا اور خوف دلانا۔

”قال الخليل الوعظ التذكير بالخير فيما يرق له القلب“ خلیل نے کہا ”وعظ“ کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو اچھے کاموں کی نصیحت کرنا جس سے اس کا دل نرم ہو جائے اور اچھے کام کرنا شروع کر دے۔

نکال اور موعظة میں فرق: نکال اصل میں عذاب ہے یعنی عذاب دے کر نصیحت کرنا اور باعث عبرت بنانا، یعنی عملی طور پر ڈنڈے سے نصیحت کرنا نکال ہے۔ جب نافرمان لوگوں کے عذاب اور ان کو نصیحت کرنے کا ذکر کیا تو ”نکال“ کہا کہ وہ اسی نصیحت کے قابل تھے۔ اور جب متقین کو نصیحت کرنے کا ذکر کیا تو ”موعظة“ ذکر فرمایا کیونکہ زبان سے نصیحت کرنا پیار و محبت سے نصیحت کرنا اور اچھے اعمال

کی نصیحت کرنا کہ ان کے دل نرم ہوں موعظہ کہلاتا ہے۔

مومن اور پرہیزگاروں کی بلند شان کی طرف واضح طور پر اشارہ فرمادیا کہ وہ پیار سے نصیحت کرنے کے قابل ہیں۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے ”العبد یقرع بالعصا والحر تکفیه الملامۃ“ غلام پر ڈنڈا چلایا جاتا ہے اور آزاد کو ملامت کافی ہے یا یوں کہیں ذلیل کو ڈنڈے سے سمجھایا شریف کو زبان سے۔

(از عزیزی)

☆ متقین کا ذکر کیا حالانکہ نصیحت تو سب لوگوں کے لئے تھی اس کی وجہ یہ تھی ”لتفردہم بہا عن الکافرین المعاندین“ کہ نیک لوگوں کی بلندی شان کو ظاہر کرنے کے لئے متقین کی نصیحت کو علیحدہ ذکر کیا تاکہ ان کا ذکر بھی سرکش کفار سے علیحدہ ہو جائے۔

”قال ابن عطیۃ واللفظ یعم کل متق من کل امة“

ابن عطیہ نے کہا کہ یوں جن متقین کا ذکر کیا گیا ہے وہ عام ہیں۔ ہر امت کے متقین مراد ہیں یعنی تمام متقین کے لئے نصیحت ہے۔

”وقال الزجاج ﴿وَمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِیْنَ﴾ لامة محمد ﷺ ان ینتکھوا من حرم اللہ عزوجل ما نہاہم عنہ“

زجاج نے بیان کیا ہے کہ اس آیت میں متقین سے مراد نبی کریم ﷺ کی امت مراد ہے کہ ان کو نصیحت دی گئی کہ وہ ان کاموں سے دور رہیں بازرہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے۔

ایسا نہ ہو کہ اے میرے محبوب کی امت تم بھی نافرمانیوں کی وجہ سے ہفتہ کے دن والے لوگوں کی طرح رب تعالیٰ کی گرفت میں نہ آ جاؤ۔

(از فرطی)

فائدہ عظیمہ : اسی واقعہ سے یہ فائدہ بھی حاصل ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو عبادت کے لئے پیدا کیا ہے اگر ان کو کھلی آزادی دے جاتی کہ وہ اپنی طبیعتوں کے مطابق جو چاہیں عمل کرتے رہیں تو یقیناً وہ لذات جسمانیہ میں مبتلا ہو جاتے۔ اور تاریکیوں کے پردے ان پر چھا جاتے ان کی عادات بچوں والی ہو جاتیں۔

والنفس كالطفل ان تهمله شب علی حب الرضاع وان تطفمه ینفطم
نفس بچے کی طرح ہے اگر تم اس کو کھلی چھٹی دے دو تو وہ بڑھاپے تک ماں کے دودھ سے
محبت رکھے اگر دودھ چھڑا دیں تو چھوڑ دیتا ہے۔

اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے بندوں پر عبادات کو مقرر فرمایا اور مقررہ اوقات میں عبادات کا تکرار ان پر مقرر فرمایا تاکہ ان کی طبیعتوں سے ان اوقات میں غفلت دور ہو سکے اور خواہشات میں مبتلا ہونے کی وجہ سے ان کے دلوں پر جو تاریکیاں چھا جاتی ہیں ان سے انہیں نجات حاصل ہو سکے۔

اسی وجہ سے ہفتہ میں ایک دن کو اجتماعی عبادت کے لئے خاص کر دیا گیا اور اسے دوسرے دنوں پر فوقیت دے دی گئی تاکہ ان سے علیحدہ علیحدہ رہنے کی وجہ سے جو وحشت طاری ہوتی ہے اسے دور کیا جاسکے، اور امور دنیاویہ میں مشغولیت کی وجہ سے چھا جانے والی تاریکی کو دور کیا جاسکے، اور اس دن کی برکتوں کی وجہ سے ان کی دعاؤں میں خصوصی قبولیت آ سکے۔

جن لوگوں نے اپنی ذاتی طبیعت کے مطابق، اپنی عادت کے مطابق کام کئے رب تعالیٰ کے احکام کی پرواہ نہ کی وہ برباد ہو گئے یوں سمجھیں کہ وہ ایسی مرض میں مبتلا ہو گئے جو متعدی تھی لیکن وہ اس کا علاج نہ کر سکے مرض بڑھتے بڑھتے لا علاج ہو گئی اور تباہی کا سامنا کرنا پڑا۔

اور جن لوگوں نے اپنی انسانیت کو بچانے کی کوشش کی شریعت کے مطابق چلنے میں اپنی پوری طاقت کو صرف کیا یوں سمجھیں شرعی دواؤں سے اپنی صحت کی حفاظت کی تدبیر کی اور حکمت بھرے کلمات سے اپنا علاج کیا ایک دوسرے کو وعدہ و وعید سے نصیحت کی وہی کامیاب ہوئے۔

وان تبعث نحوا لفضائل تلہج

ہی النفس ان تہمل تلازم خساسة

اور اگر اس کو فضائل پر لگا تو اس میں کوشش کرے گا

اس نفس کو اگر ہر کام کی کھلی اجازت دے دو تو یہ خسیس ہو جائیگا

☆☆☆☆☆

﴿وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذْبَحُوا بَقْرَةً
قَالُوا اتَّخِذْنَا هُزُوءًا قَالِ اعُوذُ بِاللَّهِ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ﴾

(۱) ”اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے فرمایا خدا تمہیں حکم دیتا ہے کہ ایک گائے ذبح کرو بولے کہ آپ ہمیں مسخرہ بناتے ہیں فرمایا خدا کی پناہ میں جاہلوں سے ہوں“ (آیت نمبر ۶۷)

(۲) ”اور جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم کو بیشک اللہ حکم دیتا تمہیں کہ ذبح کرو ایک گائے، انہوں نے کہا کیا تم اڑاتے ہو ہمارا مزاج، آپ نے کہا اللہ کی پناہ کہ میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں“

یہاں سے ایک اور نعمت کا ذکر ہے اور ساتھ ساتھ بنی اسرائیل کی کجروی (ٹیزھی چال کا بھی ذکر ہے) ان کو گائے کے ذبح کرنے کا حکم دینا ان کے لئے دنیاوی نعمت بھی تھا کیونکہ اس سے ان کے درمیان واقع ہونے والے اختلاف کو اٹھانا مقصود تھا۔ اور اخروی نعمت بھی تھا کیونکہ اس میں موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ پایا گیا اور بنی اسرائیل کا بار بار سوال کرنا (جس کا ذکر انشاء اللہ قریب ہی آ رہا ہے) ان کی پرانی روش (چال) پر دلالت کر رہا ہے۔ (روح المعانی)

بنی اسرائیل میں سے ایک شخص نے اپنے ایک رشتہ دار کو قتل کر دیا تا کہ اس کا وارث بن جائے قتل کر کے اس کی لاش کو چوراہے میں پھینک دیا پھر موسیٰ علیہ السلام کے پاس شکایت لے کر آ گیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کوشش کی قاتل کا پتہ لگانے کی لیکن پتہ نہ چل سکا۔ وہ لوگ کہنے لگے اپنے رب سے دعاء کیجئے تا کہ وہ بتائے کہ اس کا قاتل کون ہے؟ آپ نے اپنے رب سے دعاء کی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو وحی کی۔

آپ نے اپنی قوم کو بتایا کہ اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ گائے ذبح کر کے اس کا گوشت مردہ کو مارو وہ زندہ ہو کر بتائے گا کہ میرا قاتل کون ہے؟ انہوں نے تعجب کیا کہ ذبح شدہ جانور کا گوشت مردہ کو کیسے زندہ کرے گا یہ تو ایک مزاح نظر آ رہا ہے۔ آپ نے فرمایا اللہ کی پناہ میں جاہلوں سے ہو جاؤں۔

”ان الاشتغال بالاستهزاء لا يكون الا بسبب الجهل ومنصب النبوة لا

يحتمل الاقدام على الاستهزاء“

یعنی کسی سے مزاح اڑانا کسی کو حقیر اور گھٹیا سمجھنا صرف جہالت کی وجہ سے ہوتا ہے منصب

نبوت کے یہ لائق ہی نہیں وہ حقارت آمیز توہین آمیز مزاح کسی سے اڑائے۔
خیال رہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے مزاح اڑانے سے پناہ نہیں مانگی بلکہ جہالت سے پناہ مانگی اس لئے کہ مزاح اڑانا جہالت کا سبب ہے، اور سبب کا ذکر کر کے مراد سبب لینا مجاز میں زیادہ قوی ہے۔ اور موسیٰ علیہ السلام کا پناہ پکڑنا اس وجہ سے تھا کہ وہ لوگ آپ سے دین کے معاملہ میں راہنمائی حاصل کر رہے تھے اور دعاء کر رہے تھے:

”والاستهزاء فی امر الدین من العقاب الشدید والوعید العظیم“

اور دین کے معاملہ میں مزاح اڑانا شدید عذاب کا ذریعہ ہے اور عظیم وعید کا ذریعہ ہے۔

”وقال بعضهم ان النفس الهزاء قد یسمى جهلا و جهالة“

بعض لوگوں نے کہا کہ بیشک استهزاء یعنی مزاح اڑانا ہی جہالت ہے یعنی جہالت کا سبب نہیں بلکہ عین جہالت ہے۔
(از کبیر)

مزاح اور استهزاء میں فرق: استهزاء اللہ تعالیٰ کے دین سے مزاح اڑانا مسلمانوں سے حقارت آمیز مزاح اڑانا اور جن چیزوں کی تعظیم ضروری ہے ان کی توہین کرتے ہوئے مزاح اڑانا ہے یہ ناجائز اور حرام اور باعث کفر ہے۔ لیکن مزاح کرنا یعنی خوش طبعی کرنا اور کسی سے حقارت آمیز اور توہین آمیز سلوک نہ کرنا جائز ہے نبی کریم ﷺ اور ائمہ کرام نے مزاح کیا ہے جو یقیناً جائز ہے۔

ابن خوز منداد کہتے ہیں ہمیں یہ خبر ملی ہے کہ ایک شخص کوفہ کے قاضی عبید اللہ بن حسن کے پاس آیا انہوں نے مزاح کے طور پر اس شخص سے سوال کیا ”جبتک هذه من صوف نعجة او صوف كبش“ یہ تمہارا جبہ بھیڑ کی اون کا ہے یا کہ دنبے کی اون کا۔ وہ شخص کہنے لگا ”لا تجہل ایہا القاضی“ اے قاضی جاہل نہ بنو۔ قاضی نے اس شخص سے سوال کیا کہ مزاح کرنا جہالت کیسے ہے تو اس نے یہی آیت بطور دلیل پیش کی۔ عبید اللہ نے اس سے اعراض کیا ”لانه راہ جاہلا لا یعرف المزاح من الاستهزاء“ کہ یہ شخص جاہل ہے اسے استهزاء اور مزاح میں فرق کا ہی پتہ نہیں حالانکہ استهزاء اور چیز ہے اور مزاح اور چیز ہے۔
(فرطی)

کیا بنی اسرائیل کافر ہوئے: جن لوگوں نے موسیٰ علیہ السلام کو کہا ﴿اَتَّخِذْنَا هُزُؤًا﴾
”کیا تم ہمارے ساتھ مزاح اڑا رہے ہو“ کیا یہ کہنے سے وہ کافر ہو گئے تھے یا نہیں؟

اگرچہ بعض حضرات نے کہا ہے کہ وہ کافر ہو گئے تھے کیونکہ موسیٰ علیہ السلام نے جب یہ کہا کہ
بیشک اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے گائے ذبح کرنے کا، پھر ان کا یہ کہنا ﴿اَتَّخِذْنَا هُزُؤًا﴾ یہ اللہ تعالیٰ کی
قدرت میں شک کرنا لازم آیا۔ اور اگر انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کے متعلق یہ سوچا کہ پتہ نہیں یہ سچ ہے یا
نہیں اس سے یہ لازم آیا کہ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کے احکام بیان کرنے میں خیانت
کرنے والا سمجھا یہ دونوں صورتیں کفر ہیں۔ اور جن اہل علم نے ان کو کافر نہیں کہا، انہوں نے یہ دلیلیں
قائم کی ہیں۔

” (الاول) ان اللاعة على الانبياء جائزة فلعلهم ظنوا به عليهم السلام انه
يلعب ملاعبة حقة وذلك لا يوجب الكفر “

ان میں سے پہلی دلیل یہ ہے کہ خوشی طبعی کا کلام انبیاء کرام بھی فرماتے رہے اور ان کی امت
کے لوگ بھی، یہ مزاح جائز ہے ان لوگوں نے بھی یہ سمجھا کہ موسیٰ علیہ السلام شاید ہمارے ساتھ خوش طبعی کر
رہے ہیں۔ اس سے کفر لازم نہیں آتا۔ ہاں اس دلیل پر اس طرح اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے
”مزاح“ کیوں نہیں ذکر کیا ”ہزؤا“ کیوں کہا؟ اس کا جواب واضح ہے کہ بعض اوقات مجازی طور پر
ایک لفظ دوسرے کی جگہ استعمال ہوتا رہتا ہے مناسبت بھی دونوں میں موجود ہے۔

” (الثانی) ان معنی قوله تعالى ﴿اَتَّخِذْنَا هُزُؤًا﴾ ای ما اعجب هذا

الجواب كانك تستهزئ بنا انهم حققوا على موسى الاستهزاء
دوسری دلیل یہ ہے کہ ان کا ﴿اَتَّخِذْنَا هُزُؤًا﴾ کہنا تعجب کے طور پر تھا کہ یہ کیسے ہوگا کہ
مردہ کو مردہ کا گوشت زندہ کر دے یہ تو گویا کہ موسیٰ علیہ السلام ہمارے ساتھ مزاح اڑا رہے
ہیں۔ انہوں نے حقیقی طور پر موسیٰ علیہ السلام کو مزاح اڑانے والا نہیں کہا کہ کفر لازم آتا۔

(از کبیر)

راقم کو یہی دلائل قوی نظر آئے کیونکہ ان کا بار بار سوال کرنا کہ ”اللہ تعالیٰ سے دعاء کرو“ پھر ان کا

”ان شاء اللہ“ کہنا پھر ان کا اس پر عمل کرنا یہ تمام ان کے ایمان پر دلالت کرنے والی اشیاء ہیں۔

(واللہ اعلم بالصواب)

دینی طلباء کرام کے لئے:

”قوله تعالى ﴿هَـزُوا﴾ مفعول ثانٍ ويجوز تخفيف الهمزة تجعلها بين الواو والهمزة“

(تتخذ) کا پہلا مفعول ضمیر منصوب متصل ہے اور دوسرا ”هَـزُوا“ اور اس میں ہمزہ کی تخفیف یعنی واو اور ہمزہ کے درمیان پڑھنا بھی جائز ہے جسے علم صرف میں ”بین بین“ اور یا ”تخفیف“ کہتے ہیں۔

”وجعلها حفص واوا مفتوحة لانها همزة مفتوحة قبلها ضمة“

اور حفص نے ہمزہ مفتوحہ اور اس سے پہلے ضمہ ہونے کی وجہ سے واو مفتوحہ سے بدل کر پڑھا ہے۔

”هَـزُوا“ کی زاء کو ساکن پڑھنا بھی جائز ہے جیسا کہ ”عضد“ کے ضاد مضموم کو ساکن پڑھنا جائز ہے۔ یعنی اصل میں ”هَـزُوا“ ہمزہ سے ہے جیسا کہ ﴿وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ﴾ میں ”كُفُوًا“ اصل میں ہمزہ سے ہے پھر اسے واو مفتوحہ سے بدلا گیا۔ (از قرطبی)

(هَـزُوا) مہزوا بنا حیث تجینا بمثل ذلک ”(جلالین)“ ”هَـزُوا“ مصدر ہے مفعول والا معنی ہے اسی وجہ سے اعلیٰ حضرت نے اس کا ترجمہ ”مسخرہ“ کیا ہے یعنی مزاح اڑایا ہوا۔ مصدر کو مبالغہ کے طور پر اپنے معنی میں رکھنا بھی جائز ہے اور حذف مضاف ہو ”ذوی ہزء“ ہو پھر بھی درست ہے۔ (حاشیہ جلالین)



﴿ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ
لَّا فَارِضٌ وَلَا بِكْرٌ عَوَانٌ بَيْنَ ذَلِكَ فافْعَلُوا مَا تُؤْمَرُونَ ﴾

- (۱) ”بولے اپنے رب سے دعا کیجئے کہ وہ ہمیں بتا دے گائے کیسی کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک گائے ہے نہ بوڑھی اور نہ اوسر بلکہ ان دونوں کے بیچ میں تو کرو جس کا تمہیں حکم ہوتا ہے“
- (۲) ”انہوں نے کہا دعاء کرو ہمارے لئے اپنے رب سے بیان کرے ہمارے لئے وہ گائے کیسی ہو کہا بیشک وہ فرماتا ہے کہ تحقیق وہ ایسی گائے ہو کہ نہ بوڑھی ہو اور نہ چھڑی اس کے درمیان ہو تو کرو تم جس کا تمہیں حکم دیا جاتا ہے“ (آیت نمبر ۶۸)

﴿ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ ﴾ : ”انہوں نے کہا دعاء کرو ہمارے لئے اپنے رب سے، بیان کرے ہمارے لئے وہ گائے کیسی ہو“ (ماہی) ای ماسنہا (غازن) ”ماہی“ سے ان کے سوال کا مطلب یہ تھا کہ اس گائے کی عمر کیا ہو۔

سوال : ”ما“ استفہامیہ جو سوال کے لئے آتا ہے اور ”ہی“ اشارہ ہے حقیقت کی طرف لہذا ”ماہی“ سے سوال حقیقت کے متعلق ہے یعنی ان کے پوچھنے کا مطلب یہ تھا کہ گائے کی حقیقت کیا ہے اس کی جنس کیا ہے یعنی گائے کسے کہا جاتا ہے۔

ان کے سوال کا جواب گائے کی عمر بیان کر کے کیسے دیا گیا حقیقت کے متعلق جب سوال کیا جائے تو اس کا جواب اس کے اجزاء اور مقدمات بیان کرنے سے آتا ہے نہ کہ صفات خارجیہ کو بیان کرنے سے، عمر کا بیان اسی کی صفات خارجیہ سے ہے۔

پہلا جواب : اگرچہ ہے تو اسی طرح جیسا کہ معترض نے اپنے اعتراض میں ذکر کیا ہے لیکن یہاں قرینہ حالیہ دلالت کر رہا ہے کہ ان کا مقصد حقیقت اور ماہیت کے متعلق پوچھنا نہیں تھا، کیونکہ یہ تو وہ جانتے ہی تھے۔

”بل کان مقصودہم طلب الصفات التي بسببها يتميز بعض البقر عن“

بعض فلہذا حسن ذکر الصفات الخارجیۃ جواباً عن هذا السؤال “
بلکہ ان کا مقصد ہی صفات کا سوال تھا کہ ایسی صفات کو بیان کیا جائے جن سے یہ گائے جس
کے ذبح کا حکم دیا جا رہا ہے وہ دوسری گائیوں سے ممتاز ہو جائے۔ اسلئے صفات خارجیہ کو
بیان کر کے جواب دینا ہی اچھا تھا تا کہ جواب سوال کے مطابق ہو جائے۔ (از کبیر)

دوسرا جواب : ان کا سوال گائے کی حقیقت اور ماہیت کے متعلق ہی تھا، البتہ ان کو

صفات بیان کر کے جواب دیا گیا کہ تمہیں یہ سوال کرنا چاہئے تھا۔ ان کے سوال کرنے کی وجہ یہ تھی کہ
انہوں نے دیکھا کہ ایک گائے تو عام ہے جو پائی جاتی ہے۔ اور دوسری وحشی گائے ہے جسے نیل گائے کہا
جاتا ہے اور تیسری پہاڑی گائے ہے جسے سور گائے کہا جاتا ہے اور چوتھی دریائی گائے ہے ان میں تو یہ
تاثیر نہیں پائی جاتی کہ ان کے گوشت سے مردہ شخص زندہ ہو جائے۔ لہذا وہ گائے یقیناً کسی اور نسل سے
ہوگی اس لئے ان کا سوال گائے کی حقیقت کے متعلق تھا۔ البتہ جواب ان کو گائے کی عمر بیان کر کے دیا
گیا کہ گائے تو وہی ہے البتہ تمہارے سوال پر جواب صفات بیان کر کے دے دیا جاتا ہے۔ (از عزیز)

تیسرا جواب اجمالی : ”لما رآدا ظهور القتل بذبح ای فرد من جنس البقرة مستبعدا
وزعموا انها بائنة عن سائر البقرات بونا بعيدا حتی یکون کانه جنس آخر اجر وہ معجری
لا يعرفون حقیقتہ“ (مظہری)

جن لوگوں نے دیکھا کہ گائے کے گوشت سے کسی مردہ شخص کو زندہ کرنا بہت بعید ہے تو
انہوں نے گمان کیا گویا کہ وہ گائے دوسری عام گائے سے علیحدہ ہوگی ان کی ذاتیں مختلف
ہوں گی اس لحاظ پر انہوں نے سوال کیا گویا کہ وہ حقیقت کو ہی نہیں جانتے۔

تنبیہ : دوسرے جواب میں یہ بتایا گیا کہ ان کا سوال واقعی گائے کی حقیقت کی متعلق تھا، اور

تیسرے جواب میں ذکر کیا گیا ہے کہ گویا کہ ان کا سوال حقیقت کے متعلق تھا۔

تیسرا جواب تفصیلی (دینی طلباء کے لئے) : اگرچہ مشہور قاعدہ یہ ہے کہ ”ما

استفہامیہ“ کے ذریعے جب سوال کسی چیز کی ماہیت اور جنس کے لئے ہو اور وہ افراد خارجیہ پر منطبق
ہو تو اس وقت ”ما استفہامیہ“ کو ”ما حقیقیہ“ کہا جاتا ہے اور اس کا درجہ ”ہل بسیطہ“ سے
بعد ہوگا۔

”وہی التي يطلب بها وجود الشئ في نفسه“ کیونکہ جب کسی چیز کے ”موجود فی نفسہ“ کے متعلق سوال کرنا مقصود ہو تو ”ہل بسیطہ“ کے ذریعے سوال کیا جاتا ہے۔

ماہیقیہ کی مثال: ما الانسان؟ اس مثال میں حقیقت انسان کے متعلق سوال کیا گیا جواب وہی دیا جائے گا جو انسان کے افراد خارجیہ پر منطبق ہوگا یعنی حیوان ناطق سے جواب دیا جائے گا اسی طرح ”ما الحركة“ (حرکت کیا ہے؟) میں بھی ماہیقیہ ہے۔ اور ”ما استفہامیہ“ کے ذریعے جب سوال کرنے کا مقصد یہ ہو کہ جواب میں اس چیز کی وضاحت اس طرح ہو کہ یہ پتہ چل جائے کہ اس کا نام کس پر دلالت کر رہا ہے۔ یعنی اجمالی طور پر یہ ذکر ہوگا اسے ”ما شارحہ“ کہا جاتا ہے۔

یہ ہل بسیطہ سے مقدم ہوتا ہے۔ کیونکہ ”ہل بسیطہ“ کے ذریعے ایک چیز کے وجود فی نفسہ کے متعلق سوال ہوتا ہے اور ”ما شارحہ“ کے ذریعے اس کے نام کی دلالت کی وضاحت طلب ہوتی ہے جس میں افراد خارجیہ پر منطبق ہونا ضروری نہیں ہوتا لہذا ”ما شارحہ“ کے ذریعے موجود اور معدوم دونوں کے متعلق سوال ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ کہا جائے ”ما العنقاء“ تو اس سوال کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ ماہیت موجودہ کے متعلق سوال کر رہا ہے، لیکن اسے اس کے وجود کا علم نہیں۔

اور یہی سوال ”ماہیت معدومہ“ کے متعلق بھی ہو سکتا ہے۔ اسی وجہ سے ”ہل بسیطہ“ مقدم ہوتا ہے ”وكونها للسؤال عن وصف المسمى نادر قليل“ ”ما استفہامیہ“ کے ذریعے کسی چیز کے وصف کے متعلق سوال قلیل ہی پایا جاتا ہے لہذا ”ما زید“ کہہ کر زید کی صحت اور حالت کے متعلق سوال نہیں ہوتا۔ ہاں اگر یہی سوال کرنا مقصود ہو تو ”کیف زید“ کہا جائے گا۔

اگرچہ بظاہر عقل کا تقاضا یہاں بھی یہی تھا کہ ”کیف ہسی“ کہا جاتا، یا اور کوئی لفظ ذکر کیا جاتا جو کیفیت اور حالت پر دلالت کرتا: ”الا انه قيمت كلمة ما مقام ما يسأل به عن تعيين الشخص“ لیکن انہوں نے ”ما استفہامیہ“ کے ذریعے سوال کیا جو شخص اور جنس کی تعین پر دلالت کرتا ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ ذبح کی ہوئی گائے کے گوشت سے مردہ کو زندہ کرنا عقل سے دور ہے:

”فسألوا عنه بما يسأل به عن الحقيقة مع ان الظاهر ان يسألوا بما يسأل

به عن الوصف فسألوا أولا عن سنه ثم لونها فاجيبو بيانهما ثم طلبوا

تمام الكشف بیان اوصافها الزائدة علی ما ذکر

تو انہوں نے ”ما“ سے سوال کیا جس سے حقیقت کے متعلق سوال کیا جاتا ہے یہ سوال صرف عقل سے بعید سمجھنے کی وجہ سے ”ما“ کے ذریعے کر دیا گیا ورنہ حقیقت میں ان کا پہلا سوال ہی عمر کے متعلق تھا اور جواب بھی عمر کے متعلق ہی دیا گیا اور دوسرا سوال ہی رنگ کے متعلق جواب رنگ کے متعلق ہے اور تیسرا سوال ہی اس کے اور مزید اوصاف کے متعلق تھا جس سے زیادہ وضاحت ہو جائے اور جواب بھی اسی سوال کے مطابق ہی دیا گیا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ انہوں نے جب تعجب کیا کہ ذبح کی ہوئی گائے سے مردہ کیسے زندہ ہوگا تو انہوں نے یہ سمجھا کہ گویا کہ وہ گائے کوئی خاص صفات ہی رکھتی ہوگی سوال صفات کے متعلق ہی تھا لیکن خصوصی صفات رکھنے کی وجہ سے گویا کہ انہوں نے اس کی حقیقت کو ہی مختلف سمجھ لیا اور سوال ”ماہی“ کیا سے جو جنس اور حقیقت و ماہیت کے متعلق سوال کے لئے آتا ہے۔ (ماخوذ از شیخ زادہ)

چوتھا جواب: یہ قاعدہ اکثر یہ ہے کلیہ نہیں کہ ”ما“ سے سوال حقیقت و جنس کے متعلق ہوتا ہے لیکن صفات کے متعلق سوال نہیں ہوتا۔ ان لوگوں نے سوال ہی صفات کے متعلق کیا تھا کیونکہ وہ حقیقت کو تو جانتے تھے کہ گائے کون سی جنس ہے۔

”لان ما وان كانت سؤ الا عن الجنس وكيف عن الوصف ولكن قد تقع ما موقع كيف“

”ما“ سے انہوں نے صفات کا سوال کیا کیونکہ ”ما“ اگرچہ جنس کے متعلق سوال کے لئے آتا ہے اور ”کیف“ صفات کے متعلق آتا ہے لیکن ”ما“ کبھی ”کیف“ کی جگہ بھی استعمال ہوتا رہتا ہے۔ البتہ صفات کے متعلق ان کا سوال تعجب کی وجہ سے ہی تھا کہ وہ گائے خاص صفات والی ہی ہونی چاہئے جس کے گوشت سے مردہ زندہ ہوگا۔ (از مدارک)

﴿ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَا فَارِضٌ وَلَا بِكْرٌ عَوَانٌ بَيْنَ ذَلِكَ ﴾

”موسیٰ علیہ السلام نے کہا بیشک وہ رب تعالیٰ کہتا ہے کہ تحقیق وہ گائے نہ بوڑھی ہو نہ چھڑی، اس کے درمیان ہو“

﴿ لَا فَارِضٌ ﴾ اسم للمسننة التي انقطعت ولادتها من الكبر

وہ مؤنث جس کی ولادت بڑی عمر ہو جانے کی وجہ سے منقطع ہو جائے اسے فارض کہتے ہیں۔

وكان المسنة سميت فارضا لانها فرضت سنھا او قطعتها وبلغت آخرھا

بوڑھی گائے وغیرہ کو اس لئے بھی فارض کہا جاتا ہے کہ اس کے دانت قطع ہو جاتے (گر جاتے ہیں) یعنی فرض کا معنی منقطع ہونا، گرنا۔

﴿وَالْبُكَرُ﴾ اسم للصغيرة، چھوٹی عمر ہو تو اسے بکر (باء کے کسرہ سے) کہا جاتا ہے۔ گائے کی چھوٹی بچھڑی کو بکر کہا جاتا ہے۔ (یہاں یہی معنی مراد ہے) اگرچہ صغریٰ وجہ سے جس کی اولاد نہ ہو اسے بھی بکر کہا جاتا ہے یہ معنی پہلے معنی کے قریب ہی ہے۔ اور اولاد میں سے پہلے ولد کو بھی بکر کہا جاتا ہے۔ (یہاں یہ مراد نہیں) خیال رہے پہلی حاجت کو بھی بکر کہا جاتا ہے۔

جوان اونٹ کو بکر (باء کے فتح سے) کہا جاتا ہے اور جوان اونٹنی کو بکرة کہا جاتا ہے صبح کے وقت کو بکرة (باء کے ضمہ سے) کہا جاتا ہے اور پہلے پہلے پھل کو باکورہ کہا جاتا ہے۔

﴿عَوَانٌ﴾ متوسط السن، درمیانی عمر والی گائے ہونہ بوڑھی اور نہ بچھڑی۔ (از روح المعانی) ﴿بَيْنَ ذَلِكَ﴾ پر بظاہر دو وجہ سے اعتراض ہوتا ہے کہ ”بین“ کی اضافت متعدد کی طرف ہوتی ہے یہاں ”ذلک“ کی طرف کیسے درست ہے؟ پھر دوسرا اعتراض یہ ہے کہ ”ذلک“ کا اشارہ ”فارض“ اور ”بکر“ کی طرف ہے وہ دونوں مؤنث ہیں تو ”ذلک“ مذکر واحد کا اشارہ کیسے صحیح ہے؟

ان دونوں کا جواب یہ ہے کہ یہ ”ما ذکر“ کی تاویل میں ہے مذکور دو چیزیں ہیں فارض اور بکر۔ پہلے سوال کا جواب آگیا اور مذکور مذکر ہے اس لئے دوسرے سوال کا جواب آگیا۔ (از کبیر)

﴿فَاعْمَلُوا مَا تُؤْمَرُونَ﴾: ”تو کرو جس چیز کا تمہیں حکم دیا جاتا ہے۔“

”ای من ذبح البقرة ولا تکروا ال سوال ولا تفتوا“

یعنی گائے ذبح کرنے کا تمہیں حکم دیا گیا ہے تم اس پر عمل کرو بار بار رسول نہ کرو اور سرکشی نہ کرو۔

اس جملہ میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہو اور موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے اعلان کرایا ہو۔ اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو نصیحت کے طور پر فرمایا ہو۔ اور رب تعالیٰ نے ان کے کلام کی حکایت بیان فرمائی ہو۔

سوال ان کے لئے مشکل کا سبب بن گئے: ابن جریری نے صحیح سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے موقوف روایت بیان کی:

”لو ذبحوا ای بقرة اراد والا جزأتهم ولكن شد دوا علی انفسهم فشد
الله تعالیٰ علیهم“

وہ کوئی گائے بھی ذبح کر لیتے جو چاہتے، تو ان کو کفایت کر جاتی، لیکن انہوں نے اپنے نفسوں پر شدت کی تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان پر شدت کر دی۔

☆ سعید ابن منصور نے اپنی سنن میں حضرت عکرمہ سے مرفوع اور مرسل یہی حدیث بیان کی ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ابن جریر نے بیان کی ہے۔

”وبانه لو كانت معينة لما عنفهم على التماذى وزجرهم عن المراجعة الى
السؤال“

اور عقل سے بھی یہ بات واضح طور پر ثابت ہے کہ اگر گائے معین ہوتی جس کے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا ہے تو ان کو دیر کرنے پر اور بار بار سوال کرنے پر زجر (ڈانٹ ڈپٹ) نہ کی جاتی۔

(از روح المعانی)

مسئلہ: بعض محققین نے اس مقام پر ایک مسئلہ کی تحقیق کی ہے کہ جب ان کو مطلق گائے کے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا لیکن انہوں نے خود اپنے آپ پر سوال کر کے حکم کو سخت کر دیا وہی حکم جو پہلے مطلق تھا اب مقید ہو گیا۔ اسی سے یہ مسئلہ ثابت ہو گیا۔

”النسخ جائز قبل وقت الفعل لانه لما امر بقرة اقتضى ای بقرة كانت
فلما زاد فی الصفة نسخ الحكم الاول بغيره لان شرط النسخ التمكن من
الاعتقاد وهو حاصل بلاریب“

(فرطی، روح المعانی)

فعل کے وقت سے پہلے نسخ جائز ہے اس لئے کہ جب ان کو حکم دیا گیا کہ کوئی گائے ذبح کر دو انہوں نے جب بار بار سوال کئے تو صفات زائد کر کے حکم کو مقید کر کے پہلے مطلق حکم کو منسوخ کر دیا گیا نسخ کے لئے اعتقاد رکھنا ضروری ہے وہ ان کو حاصل تھا نسخ کے لئے یہ ضروری ہی نہیں کہ ایک مرتبہ عمل کر لیا جائے تو پھر منسوخ ہو۔ اس پر واضح دلیل یہ ہے کہ معراج کی رات کو پچاس نمازیں فرض کر دی گئیں لیکن ان پر عمل سے پہلے ہی ان کو منسوخ کر دیا گیا۔

﴿ قَالُوا ادْع لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا لُونُهَا قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ
إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَوْنُهَا تَسُرُّ النََّاظِرِينَ ﴾ (آیت ۶۹)

(۱) ”بولے اپنے رب سے دعا کیجئے ہمیں بتادے اس کا رنگ کیا ہے کہا وہ فرماتا ہے وہ ایک
پیلی گائے ہے جس کی رنگت ڈھڈھاتی دیکھنے والوں کو خوشی دیتی۔“

(۲) ”انہوں نے کہا دعاء کرو ہمارے لئے اپنے رب سے بیان کرے ہمارے لئے اس کا رنگ
کیسا ہو، کہا بیشک وہ کہتا ہے تحقیق وہ گائے زرد (رنگ کی) ہو خالص شوخ زرد رنگ ہو اس کا
خوش کرے دیکھنے والوں کو۔“

﴿ مَا لُونُهَا ﴾ ما استفہامیہ ہے مبتداء واقع ہے اور لونہا خبر ہے (رنگ کیسا ہو) ”لون“ واحد
ہے اور جمع اس کی ”الوان“ ہے ”اللون“، وهو هيئة كالسواد والبياض والحمرة ”سیاہ
ہونا، سفید ہونا اور سرخ ہونا وغیرہ سے جو کیفیت، ہیئت حاصل ہوتی ہے اسے ”لون“ کہا جاتا ہے۔
یعنی ”لون“ نوع ہے اور سواد و بیاض وغیرہ اس کے افراد ہیں۔ اور کہا جاتا ہے ”فلان متلون“
(فلان رنگ بدلتا رہتا ہے) اس کا مطلب یہ ہوتا ”لا یثبت علی خلق واحد وحال واحد“
کہ وہ ایک عادت اور ایک حال پر قائم نہیں رہتا۔

﴿ صَفْرَاءُ ﴾: زرد رنگ کی ہو۔ صفراء مؤنث ہے اور اصفرد مذکر ہے اور جمع دونوں کی صفر
(صاد کے ضمہ سے) ہے ”قال مکی عن بعضهم حتی القرن والظلف“ مکی نے بعض حضرات
سے نقل کیا ہے کہ زرد رنگ کا جو حکم دیا گیا تھا اس سے مراد یہ تھا کہ اس گائے کے سینگ اور پاؤں کی ہڈی
(کھر) بھی زرد رنگ کے ہوں۔ (قرطبی)

﴿ فَاقِعٌ لَوْنُهَا ﴾ الفقوع اشد ما یکون من لاصفرة وانصعه ”زرد رنگ جب بہت
شدید زرد رنگ ہو اور اس میں چمک پائی جائے تو اس وقت فاقع کہا جاتا ہے۔“

”یرید خالصا لونہا لا لونہا فیہا سوی لون جلدہا“ اس وقت ”فاقع لونہا“ کہا

جاتا ہے جب کہ اس کا زرد رنگ خالص ہو اور دوسرا رنگ اس میں نہ ہو صرف اس کے چمڑے کا ایک ہی رنگ زرد ہو۔

تنبیہ : مجازی طور پر اصفر کا معنی سیاہ بھی آتا رہتا ہے، جیسا کہ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: ﴿كَأَنَّهُ جِمَالَةٌ صُفْرٌ﴾ اس مقام پر بعض مفسرین کرام نے بیان فرمایا کہ جہنم کی چنگاریوں کو سیاہ اونٹوں سے تشبیہ دی گئی ہے یعنی ”صفر“ کا معنی مجازی طور پر ”سیاہ“ لیا گیا ہے۔ لیکن جب ”فاقع“ ساتھ ذکر ہو تو حقیقی معنی ”زرد“ لینا ضروری ہو جاتا ہے مجازی معنی لینا درست نہیں ہوتا۔

مقام توجہ: جب بہت سیاہ، خالص سیاہ کہنا مقصود ہو تو کہا جائے گا ”اسود حالک و حلکوک“ (حاء اور لام پر فتح) و حلکوک (حاء پر ضمہ اور لام ساکن) و دجوجی و غریب (نین کے نیچے کسرہ) سخت سرخ، خالص سرخ کو ”احمر قانی“ اور خالص سفید کو کہا جاتا ہے ”ابیض ناصع، ولہق (لام پر فتح اور ہاء کے نیچے کسرہ) ولہاق (لام کے نیچے کسرہ) ویقق (یاء پر فتح اور قاف کے نیچے کسرہ) اور خالص سبز کہنا ہو تو کہا جائے گا ”اخضر ناضر“ اور خالص زرد کہنا ہو تو کہا جائے گا ”اصفر فاقع“

خیال رہے: چند اور معانی کی طرف بھی توجہ کی ضرورت ہے، الافقاع، سوء الحال، یعنی افقاع بد حالی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ فواقع الدھر، بوائقہ، زمانے کے مصائب کو فواقع الدھر کہتے ہیں۔ فقع باصابعہ، اذا صوت، انگلیوں سے پٹانے نکالنے کے لئے ”فقع باصابعہ“ بولتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں آتا ہے ”نہی عن التفقیع فی الصلوۃ“ نماز میں انگلیوں سے پٹانے نکالنے سے منع کیا گیا ہے۔ (از فرطی)

﴿تَسْرُّ النَّاطِرِينَ﴾: تسرؤنٹ کا صیغہ ہے ضمیر بقرۃ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ یعنی وہ گائے خوش کرے دیکھنے والوں کو:

”السرور اصلہ لئلا فی القلب عند حصول نفع او توقعہ او رؤیہ

امر معجب رائق“

سرور کا معنی یہ ہے کہ دل کو لذت حاصل ہو نفع کے حاصل ہونے کی وجہ سے یا نفع کی توقع کی وجہ سے یا عجیب اور عمدہ چیز کو دیکھنے کی وجہ سے۔ اسی طرح باطنی طور پر انشراح صدر (خوشی سے سینہ کا کھل

جانا) کو بھی سرور کہا جاتا ہے۔

خیال رہے ”سرور“ اور ”حبور“ اور ”فرح“ معنوی لحاظ پر قریب قریب ہیں: ”سرور“ خالص پوشیدہ طور پر حاصل ہونے والی خوشی کو کہا جاتا ہے اس کا نام اسرار کی مناسبت سے رکھا گیا ہے اور ”حبور“ اس خوشی کو کہتے ہیں جس کے اثرات چمڑے وغیرہ پر ظاہر ہوں سرور اور حبور دونوں مقام مدح میں استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن ”فرح“ کا استعمال اس خوشی کے لئے ہوتا ہے جس پر اترایا جائے اکثر پائی جائے اسی وجہ سے اس کا استعمال اکثر طور پر مقام مذمت میں ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِينَ﴾

بیشک اللہ تعالیٰ خوش ہونیوالوں (خوشی پر اترانے والوں) کو پسند نہیں فرماتا۔

(از روح المعانی)

﴿تَسْرُ النَّاطِرِينَ﴾ قال وهب كأن شعاع الشمس يخرج من جلدها “ وہب نے بیان کیا ہے کہ اس گائے کا رنگ گویا کہ یہ بتایا گیا ہے کہ وہ خالص شوخ زرد رنگ ایسے جیسے کہ سورج کی شعاعیں اس کے چمڑے سے نکل رہی ہوں یعنی بہت چمکدار ہو، ایسے رنگ والی گائے دیکھنے والوں کو خوش کرے۔ (قرطبی)

فائدہ عظیمہ: ”قال ابن عباس الصفرة تسر النفس وحض على لباس النعال الصفرة“

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ زرد رنگ سے نفس کو سرور حاصل ہوتا ہے اسی لئے آپ زرد رنگ کے جوتے پہننا پسند فرماتے ہوئے دوسروں کو بھی اسی پر براہیختہ فرماتے تھے یہ نقاش نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے۔

”وقال علي بن ابي طالب ؓ من لبس نعلي جلد اصفر قل همه لان الله

تعالیٰ يقول ﴿صَفَرَاءُ فَاقِعٌ لَوْنُهَا تَسْرُ النَّاطِرِينَ﴾

ثعالبی نے حضرت علی ؓ سے نقل کیا کہ آپ فرماتے ہیں جس شخص نے زرد رنگ کے چمڑے کے جوتے پہنے اسے غم لاحق ہوں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے گائے کا زرد رنگ ذکر فرمایا کہ وہ دیکھنے والوں کو خوش کرے۔

☆ ”ونہی ابن الزبیر و محمد ابن کثیر عن عباس النعال السود لانها تهم“

ابن زبیر اور محمد بن کثیر سیاہ جوتے پہننے سے منع فرماتے تھے کہ سیاہ جوتے پہننے سے غم لاحق ہوتا ہے۔

(قرطبی و ہکذا فی روح المعانی)

﴿ قَالُوا ادْعْ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ إِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهُ
عَلَيْنَا وَإِنَّا إِن شَاءَ اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ ﴾

(آیت ۷۰)

(۱) ”بولے اپنے رب سے دعا کیجئے کہ ہمارے لئے صاف بیان کر دے وہ گائے کیسی ہے بیشک گائیوں میں ہم کوشبہ پڑ گیا اور اللہ چاہے تو ہم راہ پا جائیں گے۔“

(۲) انہوں نے کہا دعا کریں ہمارے لئے اپنے رب سے کہ واضح طور پر بیان کرے ہمارے لئے کیسی ہو وہ گائے؟ بیشک گائے مشتبہ ہو گئی ہم پر، اور بیشک ہم ”اگر اللہ نے چاہا“ تو ہدایت پا جائیں گے۔“

سب سے پہلا سوال بھی ان کا ”ماہی“ سے جس سے مراد ان کی گائے کے حال اور وصف کے متعلق سوال تھا اب پھر ”ماہی“ سے سوال کیا جا رہا ہے کیا انہوں نے پہلے جواب کو رد کر دیا اور دوبارہ سوال کیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ انہوں نے سوال کو لوٹایا حال اور وصف کے متعلق سوال کیا پہلے جواب کو رد نہیں کیا۔

”بل لطلب الكشف الزائد على ما حصل و اظهار انه لم يحصل
البيان التام“

بلکہ انہوں نے پہلے جواب سے جو مطلب حاصل ہوا تھا اس کی مزید وضاحت طلب کی اور ظاہر کیا کہ ابھی تک ہمیں ہماری منشاء کے مطابق کامل جواب حاصل نہیں ہوا۔ (روح المعانی)

علامہ آلوسی کی وضاحت کے بعد اعلیٰ حضرت کا ترجمہ خوب سمجھ آیا ”ہمارے لئے صاف بیان کر دے“ ”قال قطرب جمع البقرة باقر و باقور و بقر“ قطرب نے بیان کیا ہے کہ بقرة کی جمع باقر اور باقور اور بقر ہے یعنی ”ان البقر“ میں بقر جمع ہے۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی قول کے مطابق ہے ”بیشک گائیوں میں ہم کوشبہ پڑ گیا“۔ ”قال الزجاج، المعنى ان جنس البقر“ زجاج نے کہا ہے یہ جنس ہے، اس قول کے مطابق یہ ترجمہ بھی درست ہے ”بیشک گائے ہم پر مشتبہ ہو گئی“۔ (از فرطی)

﴿ إِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهُ عَلَيْنَا ﴾: اعتذار عنہ ای ان البقر الموصوف بالتعویین

والصفرة كثير فاشتبه علينا“ (بیضاوی)

انہوں نے عذر پیش کرتے ہوئے سوال کیا کہ بیشک گائے جس کے اوصاف بیان کر دیئے گئے کہ وہ ادھیڑ عمر ہو اور زرد رنگ کی ہو، اس قسم کی گائے بھی کثیر ہیں، اس لئے گائے ہم پر مشتبہ ہو گئی۔

﴿وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ﴾: جب انہوں نے ”ان شاء اللہ“ کہا تو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ان کو توفیق حاصل ہو گئی کہ انہوں نے عمل کر لیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”لو لم يستثنوا لما تبينت لهم آخر الابد“

اگر وہ ان شاء اللہ نہ کہتے تو ہمیشہ کے لئے ان پر واضح نہ ہوتا۔ (از روح المعانی)

یعنی وہ سوال کرتے رہتے ان کو جواب دیئے جاتے رہتے، مسئلہ نہ ان پر واضح ہوتا اور نہ ہی وہ عمل کرتے۔

”وفيه استعانة بالله وتفويض الأمر اليه والاعتراف بقدرته ونفاذ مشيئته“

ان شاء اللہ کہنے میں اللہ تعالیٰ کی امداد حاصل ہوتی ہے، اور تمام امور اللہ تعالیٰ کی طرف سپرد کر دیئے جاتے ہیں۔

اور رب تعالیٰ کی قدرت کا اعتراف پایا جاتا ہے اور اس کی مشیت کو جاری کیا جاتا ہے۔ (کبیر)

﴿إِنْ شَاءَ اللَّهُ، الْمُهْتَدُونَ﴾ میں چند احتمال ہیں:

(۱) بیشک ہم اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہدایت پا جائیں گے یعنی ہمیں تمام اوصاف والی گائے مل جائے گی جو دوسری گائیوں سے ممتاز ہے تو ہم ذبح کر لیں گے۔

(۲) ہم بار بار جو سوال کر رہے ہیں ان شاء اللہ ہم اس پر ہدایت حاصل کریں گے ہمارا بار بار سوال کرنا کوئی گمراہی کے لئے نہیں۔

(۳) ان شاء اللہ گائے کے اوصاف بیان کرنے سے ہمیں قاتل کی راہنمائی مل جائے گی کیونکہ وہ گائے حاصل کر کے ذبح کر لیں گے۔

(اس تمام وضاحت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایمان پر قائم تھے کافر نہیں ہوئے تھے)۔

(ماخوذ از کبیر)

☆☆☆☆☆

﴿ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَا ذَلُولَ تُثِيرُ الْأَرْضَ وَلَا
تُسْقِي الْحَرَّتَ مُسَلَّمَةً لَا شَيْءَ فِيهَا قَالُوا الْآنَ جِئْتَ
بِالْحَقِّ فَذَبْحُوهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ ﴾ (آیت ۷۱)

(۱) ”کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک گائے ہے جس سے خدمت نہیں لی جاتی کہ زمین جوتے اور نہ
کھیتی کو پانی دے بے عیب ہے جس میں کوئی داغ نہیں۔ بولے اب آپ ٹھیک بات لائے تو
اسے ذبح کیا اور ذبح کرتے معلوم نہ ہوتے تھے۔“

(۲) ”کہا بیشک وہ فرماتا ہے تحقیق وہ گائے ہے، نہیں اس سے کام لیا گیا کہ وہ ہل چلاتی ہے
زمین میں۔ اور نہ ہی سیراب کرتی ہے کھیتی کو، سلامتی میں ہے۔ نہیں کوئی داغ اس میں انہوں
نے کہا اب لائے ہو تم واضح بیان۔ تو ذبح کیا انہوں نے اسے اور وہ قریب نہیں تھے کرنے کے۔“

﴿ لَا ذَلُولَ ﴾ : ”و معنی لا ذلول لم یذلّلھا العمل“ مطلب یہ ہے کہ وہ گائے
ایسی ہو کہ اس سے کام لے کر اسے ذلیل نہ کیا گیا ہو مختصر مفہوم یہ ہے کہ اس سے کام نہ لیا گیا ہو۔
(فرطی)

﴿ تُثِيرُ الْأَرْضَ ﴾ : یہ جملہ صفت ہے ”ذلول“ کی ”ثیر الارض ای تقلبھا للزراعة“
زمین میں ہل چلانے کے لئے گائے کو جوتا زمین کی مٹی کو ہل چلا کر الٹ پلٹ کرنا ”اثارة الارض“ کہا
جاتا ہے۔ جب ”لا ذلول“ کی صفت ہو تو معنی ہو گیا۔ اس گائے سے کوئی کام بھی نہ لیا گیا اور نہ ہی
اسے ہل جوتا گیا ہو۔

﴿ وَلَا تُسْقِي الْحَرَّتَ ﴾ : اور کھیتی کو پانی نہ دیا ہوا، مطلب یہ ہے کہ وہ گائے کنواں نہ چلی ہو۔
﴿ مُسَلَّمَةً ﴾ : ”سلمھا اللہ تعالیٰ من العیوب او اھلھا من العمل او اخلص لونها من
سلم لہ کذا اذا اخلص“

اللہ تعالیٰ نے اسے عیوب سے سلامتی میں رکھا ہو۔ اور اسی طرح اس کے مالکوں نے اسے کام

سے سلامتی میں رکھا ہو، یعنی اس سے کام نہ لیا ہو۔ اور اس کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ اس کا رنگ خالص ہو وہ رنگ عیب سے سلامتی ہو۔ اس لئے کہ ”مسلم لہ کذا، خالص لہ“ (خالص ہونے) کے معنی میں بھی استعمال ہوتا رہتا ہے۔
(از بیضاری)

﴿لَا شَيْءَ فِيهَا﴾: یہ مصدر ہے یعنی ”وَشَيْءٌ يَشِي وَيَشِي شَيْءٌ“ استعمال ہوتا ہے۔ اس کا اصل لغوی معنی ”اذا خلط بلونه لونا آخر“ جب ایک رنگ سے دوسرا رنگ ملا دیا جائے۔ اس لحاظ پر لغوی معنی یہ ہوگا کہ اس کے زرد رنگ میں کوئی اور رنگ نہ ملا ہوا ہو۔ مراد یہی ہے کہ اس میں کوئی داغ دھبہ نہ ہو۔

﴿قَالُوا الْآنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ﴾: انہوں نے کہا اب تم لائے ہو واضح بیان (بالحق) ای بالبيان التام الذي لا اشكال، (خازن) یعنی اب تم نے بہت مکمل اور واضح بیان لایا ہے جس کی وجہ سے ہمیں سمجھنا مشکل نہیں رہا۔ خیال رہے حق یہاں باطل کا مقابل نہیں ورنہ ان کا یہ کہنا کفر ہوتا کہ پہلے تم باطل لاتے رہے اب حق لائے۔

﴿فَذَبْحُوهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ﴾: تو انہوں نے اسے ذبح کیا وہ قریب نہیں تھے کرنے کے خیال رہے کہ نحو یوں کا لفظ ”کاد“ میں کلام ہے لیکن مشہور قول یہ ہے کہ یہ عام فعلوں کی طرح ہی مثبت ہوتا ہے جب اس پر حرف نفی نہ ہو۔ اور اگر اس پر حرف نفی ہو تو منفی ہوگا خواہ ماضی ہو یا مضارع۔ اسی مشہور قول کے مطابق ترجمہ کیا گیا ہے اور یہی صحیح بھی ہے۔

وہ ذبح کیوں نہیں کرنا چاہتے تھے؟

اس کی چند وجوہ تھیں جن کے پیش نظر وہ ذبح کرنا تو نہیں چاہتے تھے لیکن اب ان کو اس کام کے نہ کرنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا لہذا انہیں ذبح کرنا پڑا۔

(۱) ”لخوف الفضيحة“ ایک وجہ یہ تھی کہ ان کو خوف لاحق تھا کہ اگر ہم نے ذبح کر دیا اور اس کا گوشت مقتول شخص کو مار دیا تو وہ زندہ ہو جائے گا اور پتہ چل جائے گا کہ قاتل کون ہے قاتل تو وہ خود ہی تھے اس لئے وہ رسوائی کے ڈر سے ذبح نہیں کرنا چاہتے تھے۔

(۲) ”لعزہ وجودہا بہذہ الاوصاف جمیعاً“ اور وجہ یہ تھی کہ وہ اس لئے ذبح نہیں کرنا

چاہتے تھے کہ وہ سمجھ رہے تھے کہ ان تمام اوصاف والی گائے کا ملنا تو مشکل ہے۔

(۳) ”لغلاء ثمنہا“ اور وجہ یہ تھی کہ وہ اس لئے ذبح نہیں کرنا چاہتے تھے کہ وہ کہہ رہے تھے کہ

اس کی بہت قیمت ہے کیونکہ اس وقت عام گائے کی قیمت تین دینار تھی لیکن یہ گائے ان کو گائے کا چمڑا بھر کر اس کے برابر سونا وغیرہ ادا کرنے کی قیمت سے مل رہی تھی۔

(از خازن)

بہت بھاری قیمت سے گائے حاصل کرنے کی وجہ:

اس وقت عام طور پر گائے کی قیمت تین دینار تک ہوتی تھی لیکن انہوں نے سوال کر کے اپنے لئے مشکل پیدا کر لی۔ تمام اوصاف کسی گائے میں بیک وقت پائے جانے دشوار نظر آئے۔ آخر کار تلاش کرتے کرتے انہیں ایک بیوہ اور اس کے یتیم بچے کے پاس ایسی گائے نظر آئی جس میں بیان کردہ جمیع اوصاف موجود تھے بوڑھی نہیں تھی اور بچھڑی نہیں تھی بلکہ درمیانی عمر کی تھی۔ زرد تیز رنگ تھا دیکھنے والوں کو خوش کرتا تھا۔ زمین میں اس نے ہل نہیں چلایا تھا اور نہ ہی کھیتی کو سیراب کیا تھا اور اس میں کوئی عیب اور داغ دھبہ نہیں تھا کیونکہ اس یتیم کے بوڑھے نیک پرہیزگار باپ نے اپنی ایک بچھڑی کو جنگل میں چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں دے دیا تھا کہ میرا بچہ کچھ بڑا اور سمجھدار ہو کر اسے لے جائے گا وہ بچہ بھی والدین کا فرمانبردار تھا اپنے باپ کی وفات کے کچھ عرصہ بعد وہ اپنی گائے جنگل سے لے آیا تھا، اسی گائے میں تمام اوصاف موجود تھے موٹی تازی تھی خوبصورت تھی۔

بنی اسرائیل کو اس کے چمڑے میں جتنی مقدار میں سونا آسکے اتنی مقدار سونا بطور قیمت ادا کرنا پڑا سبحان اللہ مالک الملک نے اپنے نیک بندے کی گائے کی جنگل میں حفاظت کی۔ اور اس نیک بندے کی بیوہ اور اس کے یتیم بچے کو کثیر مقدار میں مال و دولت عطا فرمایا۔

نبی اسرائیل اگرچہ گائے کی بھاری قیمت ادا کرنے پر بخوشی رضا مند نہیں تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ اگر ہمارا مقتول زندہ ہو گیا تو ہمارا اپنا ہی عیب ظاہر ہو گا لیکن انہیں پھر بھی گائے مجبوراً ذبح کرنی پڑی کیونکہ اب ان کے پاس کوئی عذر باقی نہیں رہ گیا تھا اگرچہ وہ ذبح کرنا نہیں چاہتے تھے۔

(ماہود از کھر)

گائے ذبح کرنے میں حکمت:

ایک وجہ تو یہی تھی کہ نیک آدمی کے یتیم بچے اور اس شخص کی بیوہ کو کثیر مال عطا کرنا تھا اس لئے گائے ذبح کرنے کا حکم دیا اور بنی اسرائیل کے ذہنوں میں یہ بات ڈال دی کہ وہ سوال کرتے رہیں اس طرح وہ گائے کہیں اور نہ مل سکی۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ گائے کی قربانی کا طریقہ پہلے سے چلا آ رہا تھا اور وہ لوگ گائے کی قربانی کو عظیم سمجھتے تھے اس لئے انہیں گائے ذبح کرنے کا حکم دیا تاکہ ان کے ذہن اسے قبول کر لیں کہ گائے کی قربانی میں یہ اثر ہوگا۔

تیسری وجہ یہ تھی کہ مقتول کو اس عجیب انداز سے زندہ کر کے بتا دیا کہ اللہ تعالیٰ جس طرح چاہے اسی طرح مردوں کو زندہ فرما لیتا ہے۔

چوتھی وجہ یہ تھی کہ موسیٰ علیہ السلام کی برتری ان پر واضح ہو جائے اور آپ کا معجزہ ظاہر ہو جائے۔

پانچویں وجہ یہ تھی کہ گاؤ پرستی ان کے آباء و اجداد نے دیکھ کر پھڑپھڑے کی پوجا شروع کر لی تھی ان کو گائے کے ذبح کرنے کا حکم دے کر تنبیہ کی کہ گائے خدا نہیں ہو سکتی۔ جو خود ذبح ہو جائے وہ خدا کیسے۔

فائدہ: اس واقعہ سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ کسی چیز کے جب اوصاف بیان کر دیئے جائیں تو ایسے پتہ چلتا ہے گویا کہ وہ چیز سامنے آ گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”لا تصف المرأة المرأة لزوجها حتى كأنه ينظر إليها“ (رواہ مسلم)
کوئی عورت اپنے خاوند کے سامنے دوسری عورت کے اوصاف نہ بیان کرے یہ ایسا ہی جیسا کہ وہ شخص اس عورت کو دیکھ رہا ہے۔

”فجعل النبي ﷺ الصفة تقوم مقام الرؤية“
نبی کریم ﷺ نے اوصاف بیان کرنے کو دیکھنے کے قائم مقام قرار دیا۔

(از طوطی)

جب صرف اوصاف بیان کرنے سے منع کیا تو عورتوں کا بے حجاب ہو کر، سر سے ننگے، اور بازو ننگے، گریبان کھول کر سڑکوں اور بازاروں میں گھومنا کہاں جائز ہو گیا۔

﴿وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادًّا رَأْتُمْ فِيهَا وَاللَّهُ مُخْرِجُ مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ﴾

(آیت ۷۲)

- (۱) ”اور جب تم نے ایک خون کیا تو ایک دوسرے پر اس کی تہمت ڈالنے لگے اور اللہ کو ظاہر کرنا جو تم چھپاتے تھے“
- (۲) ”اور جب تم نے قتل کیا ایک شخص کو، تو تم نے جھگڑا کیا اس میں، اور اللہ ظاہر کرنے والا ہے جو تم چھپاتے تھے۔“

اس آیہ کریمہ میں واقعہ کی ابتداء ہے قرآن پاک میں درحقیقت واقعات کو صرف بطور واقعات بیان کرنا مقصود نہیں ہوتا، بلکہ ان واقعات سے تدبر حاصل کرنا، نصیحت پکڑنا، اور قرآن پاک کی فصاحت و بلاغت میں غور و فکر مقصود ہوتا ہے۔ معنوی طور پر یہ آیت ﴿وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادًّا رَأْتُمْ﴾ الخ پہلے ہے اور ﴿وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ﴾ بعد میں ہے۔

اسی طرح ﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَنزَلَ عَلَىٰ عَبْدِهِ الْكِتَابَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَهُ عِوَجًا قِيمًا﴾ میں معنوی لحاظ پر ”الكتاب“ کے بعد ”قیما“ کا درجہ ہے اور ﴿وَلَمْ يَجْعَلْ لَهُ عِوَجًا﴾ کا بعد میں۔ قرآن پاک میں کئی مقامات میں یہی صورت ہے وجہ یہی ہے کہ لوگ قرآن پاک کی فصاحت و بلاغت میں غور و فکر کریں۔

(از قرطبی)

﴿وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا﴾ : لفظ ”نفس“ مؤنث سماعی ہے۔ اسی وجہ سے ”فیہا“ میں ضمیر مؤنث ہے جو لفظ نفس کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اگرچہ معنی یہاں مذکر والا لیا ہوا ہے، یعنی جب تم نے قتل کیا ایک شخص کو۔ خیال رہے معنوی طور پر ”نفس“ مذکر اور مؤنث دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

﴿فَادًّا رَأْتُمْ﴾ : اصل میں ”تدارأتم“ ہے باب تفاعل کے فاء کلمہ میں دال واقع ہوا، تاء کا دال سے تبدیل کرنا جائز ہے۔ پھر واجب ہے کہ دال کو دال میں ادغام کیا جائے۔ ادغام کرنے کی صورت میں ابتداء ساکن لفظ سے لازم آرہی تھی۔ اس لئے ہمزہ کو شروع میں بڑھا دیا ”ادارأتم“ ہو گیا۔

(فاداراتم فیہا) اختصاص فی شأنہا اذ المتخاصان یدفع بعضہا بعضاً
تم نے اس میں جھگڑا کیا جھگڑا کرنے والے بعض، بعض سے مدافعت کرتے ہیں۔

یعنی اصل میں ”تداریسی“ کا معنی ہے ”تدافع“ ہے۔ تدافع کا کنایہ کے طور پر معنی
”اختصاص“ (جھگڑا کرنا) ہے اختصاص ملزوم ہے تدافع کا یعنی ذکر لازم مراد ملزوم ہے۔ یا حقیقی معنی ہی
مراد لے لیا جائے:

”فاداراتم فیہا ای تدافعتن بان طرح قتلہا کل من نفسہ الی صاحبہ“
جب تم نے ایک شخص کو قتل کیا تو ہر ایک تم میں سے ایک دوسرے پر قتل کی تہمت لگا رہا تھا۔

اعلیٰ حضرت نے حقیقی معنی کے مطابق ہی ترجمہ کیا (تو ایک دوسرے پر اس کی تہمت ڈالنے لگے)
لیکن راقم نے مجازی معنی کے مطابق ترجمہ کیا (تو تم نے جھگڑا کیا اس میں)۔ اگرچہ قاضی بیضاوی رحمہ اللہ
نے پہلے مجازی معنی بیان کیا پھر حقیقی معنی بیان کیا۔ اس پر شیخ زادہ رحمہ اللہ نے تحریر فرمایا:

”وقدم الوجه الاول لان کنایۃ ابلغ“

(وجہ اول کو مقدم ذکر کیا کہ کنایہ ابلغ ہے)

لیکن راقم نے مجازی معنی صرف اس لئے تحریر کیا ہے کہ طلباء کرام کے ذہنوں میں مختلف بحثیں آتی ہیں۔

﴿وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ﴾: مظهرہ لا محالہ، اللہ تعالیٰ ظاہر کرنے والا
ہے یقیناً۔ ”اخراج“ کا حقیقی معنی ہے ”نکالنا“ لیکن یہاں معنی ہے ”ظاہر کرنا“ کیونکہ یہ ”کتمان“
(چھپانے) کے مقابل ذکر ہے البتہ علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے ”لا محالہ“ سے تفسیر کی۔ جس کا معنی
ہے ”یقیناً“۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اسم فاعل جب ضمیر سے خالی نہ ہو اور مبتداء کی خبر واقع ہو تو اس میں تسویت کا
معنی پایا جاتا ہے۔ ﴿مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ﴾ ”جو تم چھپاتے تھے“ یعنی قاتل اپنے آپ کو ظاہر نہیں کر رہا
تھا اور ایک دوسرے پر الزام لگا رہے تھے۔

خیال رہے ”مخرج“ مستقبل کی حکایت ہے (اللہ ظاہر کرنے والا ہے) یعنی اگرچہ نبی کریم ﷺ
پر جب آیہ کریمہ کا نزول ہوا تو اس لحاظ پر واقعہ ماضی کا ہے۔ جب بنی اسرائیل سے ارشاد فرمایا گیا اس

وقت کے لحاظ پر مستقبل کر ذکر تھا، اس لئے ترجمہ بھی مستقبل کا کر لیا جاتا ہے۔ (از بیضاوی و شیخ زادہ)

فائدہ: ”تدل الآية على ان ما يسره العبد من خير او شر دام ذلك منه فان الله

سيطهره قال عليه الصلوة والسلام ان عبدا لو اطاع الله من وراء سبعين حجابا لأظهر ذلك على السنة الناس وكذلك المعصية وروى ان الله تعالى اوحى الى موسى عليه السلام قل لنبى اسرائيل يخفون لى اعمالهم وعلى ان اظهرها لهم“ (کبير)

آیہ کریمہ سے یہ مسئلہ ثابت ہو رہا ہے کہ جب کوئی انسان بھی نیکی یا برائی چھپ کر کرے اسی طریقہ پر ہمیشہ سے اس کا عمل ہو، تو اللہ تعالیٰ اسے ظاہر فرما دیتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: بیشک بندہ اگر اللہ تعالیٰ کی اطاعت ستر پردوں کے پیچھے سے کرے اللہ تعالیٰ اسے لوگوں کی زبانوں پر ظاہر فرما دیتا ہے۔ (یعنی لوگ اس نیک آدمی کی نیکیوں کا چرچا کرتے رہتے ہیں کہ فلاں جگہ ایک بزرگ ہستی ہے جو بہت نیک کار ہیں)

اور اسی طرح معصیت کو بھی ظاہر فرماتا ہے روایت میں آتا ہے ”بیشک اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی کی“ اے موسیٰ بنی اسرائیل کو کہہ دو وہ جو عمل (معصیت کے) مخفی طور پر کرتے ہیں میں ان کو ظاہر کر دیتا ہوں۔

قابل توجہ: قرآن پاک کے اکثر مقامات پر ذکر خاص اور مراد عام ہوتا ہے۔ لیکن اس مقام پر ذکر عام ہے جو عام کو بھی اگرچہ شامل ہے ﴿مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ﴾ يتناول كل المكتومات ثم ان الله تعالى اراد هذه الواقعة “یعنی ﴿مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ﴾ میں ہر چھپی ہوئی چیز کا ذکر ہے کہ ”اللہ تعالیٰ ظاہر فرمانے والا جو کچھ بھی تم چھپاتے ہو۔ لیکن پھر اس سے مراد خاص ان کے قتل کا واقعہ لے لیا۔

(از کبیر)

☆☆☆☆☆

﴿فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا كَذَلِكَ يُحْيِي اللَّهُ الْمَوْتَى وَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ﴾
(آیت ۳۲)

(۱) ”تو ہم نے فرمایا اس مقتول کو اس گائے کا ایک ٹکڑا مارو اللہ یوں ہی مردے جلانے کا اور تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے کہ کہیں تمہیں عقل ہو۔“

(۲) ”تو ہم نے کہا مارو اس کو (مقتول کو) اس کا (گائے کا) بعض حصہ۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ مردوں کو زندہ کرے گا اور دکھاتا ہے تمہیں اپنی نشانیاں تاکہ تمہیں عقل آجائے۔“

﴿فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ﴾ : کا عطف ہے ”واذ قتلتم نفسا فادارأتم“ پر اور درمیان میں جملہ معترضہ ہے۔

﴿بِبَعْضِهَا﴾ : سے مراد گائے کا کون سا حصہ ہے؟ اگرچہ اس میں کئی اقوال ہیں لیکن صحیح یہی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے مطلق ذکر کیا ہے تو اس کو اپنے اطلاق پر رہنے دیا جائے۔

مطلب یہ ہوا کہ جب تم نے ایک مقتول کے متعلق جھگڑا کیا کہ اس کا قاتل کون ہے اور ہر ایک دوسرے پر الزام لگانے لگا تو ہم نے کہا اس مقتول کو گائے ذبح کر کے اس کے گوشت کا کوئی ٹکڑا لے کر مقتول کے جسم کے کسی حصہ پر مار دو تو وہ زندہ ہو جائے گا۔

﴿كَذَلِكَ يُحْيِي اللَّهُ الْمَوْتَى﴾ : ”اسی طرح اللہ مردوں کو زندہ کرے گا“ رب تعالیٰ کے حکم کے مطابق جب انہوں نے عمل کر لیا ”فضربوہ فحیی“ کہ انہوں نے گائے ذبح کر کے اس کا گوشت مقتول کو مارا تو وہ زندہ ہو گیا اس نے بتایا مجھے کس نے قتل کیا ہے پھر وہ مردہ حالت میں ہو گیا۔ اس عجیب اور انوکھے انداز سے رب تعالیٰ نے ان کے سامنے اور ان کے فعل سے مردہ کو زندہ کیا جس میں ان کو یہ کہنے کی جرات بھی نہ ہو سکی کہ یہ موسیٰ علیہ السلام کا جادو ہے۔

تو رب تعالیٰ نے اس واقعہ سے ان لوگوں کو اور قیامت تک آنیوالے لوگوں کو اپنی قدرت اور قیامت قائم ہونے کے متعلق بتا دیا ﴿كَذَلِكَ يُحْيِي اللَّهُ الْمَوْتَى﴾ ای جمیعاً یوم القیامة کہ

قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تمام مردوں کو اسی طرح زندہ فرمادے گا جس طرح اس مردہ کو تمہارے سامنے (اے بنی اسرائیل) زندہ کر دیا، اور بعد میں آنے والو جب تمہیں قطعی اور یقینی خبروں سے معلوم ہو جائے گا تو تم بھی سمجھ لو کہ قیامت ضرور آتی ہے۔ اور رب تعالیٰ کی قدرت سے بعید نہیں کہ وہ تمام مردوں کو زندہ کر دے۔
(از شیخ زادہ)

﴿لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ﴾: لکی یکمل عقلکم، تاکہ تمہیں کامل عقل حاصل ہو جائے اس واقعہ کا بھی تمہیں یقین ہو جائے اور قیامت کے قائم ہونے اور تمام مردوں کے زندہ ہونے کا بھی تمہیں پتہ چل جائے۔
(از بیضاوی)

فائدہ جلیلہ: اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے دلوں میں ڈال دیا کہ وہ سوال کرتے رہیں اور ان کو جواب دیئے جاتے رہیں اس طرح ان کے لئے اس قسم کی گائے عام لوگوں سے حاصل ہونی اور عام قیمت پر مشکل ہو گئی۔

☆ اللہ تعالیٰ نے ابتدائی طور پر ہی اسے زندہ نہیں فرمایا تاکہ بہت سے فوائد حاصل ہو جائیں۔
☆ اس واقعہ سے ایک تو یہ حاصل ہوا کہ رب تعالیٰ کی راہ میں قربانی کرنا اللہ تعالیٰ کے تقرب کا ذریعہ ہے اور اس کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے۔

☆ اور واجب کے ادا کرنے کی ترغیب دلائی گئی کہ ان لوگوں کو جو حکم دیا گیا تھا وہ اس پر عمل کریں۔
☆ اگرچہ انہوں نے عمل کرنے میں کچھ دیر کی لیکن آخر کار عمل کر لیا۔

☆ اور اس میں یتیم کا نفع بھی تھا کہ ان لوگوں نے سوال کر کے اپنے لئے مشکل پیدا کر لی۔ بہت بھاری قیمت ادا کر کے وہ گائے حاصل کی، کیونکہ وہ گائے نیک شخص کے یتیم بچے سے ملی اور وہ سارا مالی فائدہ اسے حاصل ہوا۔

☆ اور اس واقعہ سے یہ فائدہ بھی حاصل ہوا کہ اللہ تعالیٰ پر توکل رکھنے میں برکت ہوتی ہے لوگ عام طور پر جانوروں کو اکیلے جنگل میں نہیں چھوڑتے کیونکہ درندوں کا خطرہ ہوتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے نیک بندے نے اسی کی ذات پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنی پھڑی کو جنگل میں چھوڑ دیا رب تعالیٰ نے بھی اسے اپنی حفاظت میں رکھا۔

☆ اور پتہ چلا کہ بزرگوں کا طریقہ چلا آ رہا ہے کہ وہ اپنی اولاد سے شفقت کرتے تھے اپنے بچے پر شفقت کرتے ہوئے تو اس نیک بندے نے اپنی چھڑی کو رب تعالیٰ کی حفاظت میں دے دیا تھا۔

☆ جو شخص اللہ تعالیٰ سے کسی چیز کو طلب کرنا چاہتا ہے تو اسے چاہئے کہ وہ اس واقعہ سے سبق حاصل کرتے ہوئے پہلے قربانی کرے، اور جس جانور کو قربانی کرے وہ اچھا خوبصورت اور قیمتی ہو، حضرت عمرؓ نے بہت خوبصورت، موٹی تازی اونٹنی تین سو دینار سے خریدی اور قربانی کی۔

☆ اسی واقعہ سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ مؤثر حقیقی ممکنات میں صرف اللہ تعالیٰ ہے ظاہری اسباب صرف علامات ہیں ان میں ذاتی طور پر کوئی اثر نہیں۔ ہاں رب تعالیٰ جس چیز میں جو تاثیر رکھ دے وہی اس میں پائی جائے گی۔ بھلا یہ بات کس کے عقل میں آ سکتی ہے کہ مردہ جانور کے گوشت سے مردہ زندہ ہو جائے؟ صرف اور صرف رب تعالیٰ کی قدرت سے اس میں یہ تاثیر پیدا ہوئی۔

☆ اس واقعہ سے اس بات پر متنبہ کیا گیا ہے کہ جو شخص یہ چاہے کہ اسے اپنے سب سے بڑے دشمن یعنی اس کو حقیقی موت دینے والے کا پتہ چل جائے، وہ اس کا دشمن جو اس کے دل کو مردہ کر کے ایمان سے دور کرنے والا اور حق اعتقاد سے دور کرنے والا ہے تو اسے چاہئے کہ وہ اپنے حیوانی نفس جو گائے کی طرح ہے جس کی زندگی خواہشات پر مبنی ہے اسے ریاضت کی چھری سے ذبح کرے۔

وہ نفس حیوانی بچپن کی حرص و خواہشات نہ رکھتا ہو، کیونکہ ان پر مؤاخذہ نہیں اور اس نفس حیوانی میں بڑھا پا بھی نہ ہو کیونکہ بڑھاپے میں خود بخود سستی آ جاتی ہے خواہشات کی شدت ختم ہو جاتی ہے۔ اسے ذبح کرنے کی بھی ضرورت نہیں رہتی، اس لئے ضروری ہے کہ نفس حیوانی کی جوان گائے جس میں ہر طرح کی شوخی پائی جاتی ہے ہر طرح کی خواہشات پائی جاتی ہیں اسے ریاضت کی چھری سے ذبح کر دے۔ اور اس کا اثر جب دل کو پہنچے گا تو وہ زندہ ہو جائے گا خود بتادے گا میرا قاتل شیطان ہے۔ میرا قاتل اسلام سے دور ہے۔ میرا قاتل محبت مصطفیٰ کریم ﷺ سے دور ہوتا ہے۔

(ماہود از بیضاوی و شیخ زیادہ بنصرہ)

تنبیہ: ایک روایت میں ذکر ہے کہ اس آدمی کے قتل اور گائے کے ملنے اور ذبح کرنے اور

مردہ کو زندہ کرنے میں چالیس سال گزر گئے لیکن علامہ رازی رحمہ اللہ نے اسے رد فرمایا:

”ان هذه الرواية على خلاف ظاهر القرآن، لان الفاء في قوله تعالى

”فقلنا اضربوه ببعضها“ للتعقيب“

کہ یہ روایت قرآن پاک کے ظاہر کے خلاف ہے کیونکہ کہیں ”فاء“ جو ”فقلنا“ میں آ رہی ہے وہ تعقیب کے لئے جو زیادہ وقفہ کا تقاضا نہیں کرتی۔ اس لئے ان کے سوالات اور رب تعالیٰ کی طرف سے جوابات اور گائے کو حاصل کر لینے میں زیادہ وقت نہیں گزرا۔ البتہ تین دونوں کا ذکر خازن وغیرہ میں ملتا ہے کہ بچہ گائے کو جنگل سے لارہا تھا تو راستے میں ایک فرشتہ انسانی شکل میں خریدار کی حیثیت سے ملا تو بچے نے کہا میں والدہ کی اجازت کے بغیر نہیں فروخت کر سکتا۔ تین دن تک جنگل میں چرانے کے لئے لے جانے اور واپس لانے کے دوران وہ ملتا رہا، اسی نے بچے کو بتایا کہ اس کی اتنی قیمت وصول کرنا۔ (اللہ اعلم بالصواب)

طلباء کرام کی توجہ کے لئے: ”اضربوه“ میں منصوب متصل کی ضمیر نفس کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اگرچہ وہ مؤنث ہے لیکن وہ ”شخص“ کا معنی دے رہا ہے جو مذکر ہے لہذا مذکر کی ضمیر کا لوٹنا درست ہے۔ ہر وہ لفظ جس میں دو حیثیتیں ہوں اس کا یہی قانون ہے کہ اس پر تذکیر والے احکام جاری کریں یا تانیث والے دونوں ہی جائز ہیں۔ (از کبیر)

نیک باپ کا بچہ بھی نیک تھا: وہ بچہ اپنی ماں کا بڑا فرمانبردار تھا، جب اسے گائے کے بدلہ میں بہت مال و دولت حاصل ہوا تو اس کے باوجود اس کے نیک ہونے میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ رات کا تہائی حصہ نماز اور عبادت میں گزارتا اور رات کا تہائی حصہ سونے میں گزارتا، اور رات کا تہائی حصہ اپنی والدہ کی خدمت گزاری میں رہتا۔

گائے کے فروخت کرنے سے پہلے وہ چھوٹا بچہ ہونے کے باوجود جنگل سے لکڑیاں لا کر بازار میں بیچتا جس کی آمدنی کا تہائی حصہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتا۔ اور تہائی حصہ اپنی والدہ کو عطا کرتا اور

تہائی حصہ اپنے خرچ کے لئے رکھ لیتا۔

ایک دن اس کی والدہ نے اسے بتایا کہ تمہارا باپ جنگل میں ایک مچھڑی چھوڑ آیا تھا اب تو وہ گائے بنی ہوگی اسے تلاش کرو اگر مل جائے تو لے آؤ (باقی واقعہ پہلے لزر گیا)۔ (اربع زادہ)

اعتراض : اس واقعہ میں ایک نشانی پائی گئی ہے کہ مردہ کو زندہ کر دیا گیا۔ لیکن ﴿وَلَا يُرِيكُمْ آيَاتِهِ﴾ میں ”آیات“ کو جمع ذکر کیا گیا ہے یہ کیسے درست ہے؟

جواب : بظاہر یہ ایک نشانی ہے لیکن حقیقت میں کئی نشانیوں کو مستلزم ہے اس لئے کہ اس واقعہ سے یہ سمجھ آیا کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں تمام چیزیں ہیں۔ جس نے اپنی قدرت کاملہ سے مردہ جانور کے گوشت سے مقتول کو زندہ کیا۔ اور یہ ثابت ہوا کہ تمام معلومات اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں، کہ اس نے گائے میں جتنی علامات بیان فرمائیں ان علامات والی گائے مل گئی اور جیسا بتایا کہ اس کے گوشت سے مقتول زندہ ہوگا ایسا ہی ہوا۔ اور پتہ چلا کہ اللہ تعالیٰ کسی چیز کو موجود کرنے اور پیدا کرنے میں مختار ہے۔

اور اسی واقعہ سے موسیٰ علیہ السلام کی صداقت کا پتہ چلا کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کے احکام جو پہنچائے وہ اسی طرح ثابت ہوئے ان میں ذرا بھر بھی فرق نہیں آیا۔ اور جو لوگ قاتل نہیں تھے لیکن ان پر قتل کی تہمت لگائی جا رہی تھی اللہ تعالیٰ نے ان کو بری الذمہ قرار دیا۔ (ارکبیر)

اعتراض : وہ لوگ تو پہلے سے ہی عقل مند تھے اسی لئے تو بار بار سوال کر رہے تھے ان کے سوالات ان کی عقل مندی پر دلالت کر رہے ہیں وہ دیوانے پاگل نہیں تھے کسی عاقل کو تو یہ نہیں کہا جاسکتا:

”اننى عرضت عليك الآية الفلانية لكى تصير عاقلا“

بیشک میں تم پر یہ نشانی پیش کر رہا ہوں تاکہ تم عاقل ہو جاؤ۔

﴿وَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾

”وہ تمہیں دکھاتا ہے اپنی نشانیاں تاکہ تم عقل حاصل کرو“ کا کیا مطلب ہے؟

جواب : یہ الفاظ ظاہر پر مبنی نہیں بلکہ ان کی تاویل کی گئی ہے ایک یہ ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے

”لعلکم تعملون علی قضیۃ عقولکم“ تاکہ تمہیں تمہاری عقلوں کے فیصلہ کے مطابق علم حاصل ہو جائے کہ وہ ذات جسے ایک مردہ کو زندہ کرنے کی قدرت حاصل ہے اسے تمام مردوں کو زندہ کرنے کی قدرت حاصل ہے جب تمہیں یہ علم حاصل ہوگا تو تمہیں قیامت کا یقین بھی حاصل ہوگا۔ (کبیر)

علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے کمال عقل سے تفسیر کی۔ اسکی وجہ بھی اس اعتراض کو دور کرنا مقصود تھا کہ ان کو اگرچہ عقل حاصل تھی لیکن کامل عقل حاصل نہیں تھی۔ راقم کے نزدیک یہ الفاظ اپنے ظاہر پر ہیں گویا کہ بنی اسرائیل کو ان کی کج رویوں (ٹیزھی چالوں) کی وجہ سے جانوروں کی طرح بے عقل کہا گیا کہ تم ہو تو بے عقل لیکن اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تمہیں عقل آجائے۔

مسئلہ: ہماری شریعت میں جب کوئی شخص اپنے موروث لہ (جس کا اس نے وارث بننا ہے) کو قتل کر دے تو وہ اس کا وارث نہیں بن سکتا۔ بنی اسرائیل میں جس شخص نے قتل کیا تھا کیا وہ وراثت کا حقدار تھا یا نہیں؟ اور اس قاتل کو وراثت دی گئی یا نہیں۔

صحیح یہ ہے کہ وہ وراثت کا حقدار تو تھا اسی لئے اس نے اپنے موروث لہ کو قتل کیا تھا۔ لیکن اس کا وراثت سے محروم ہونا صراحۃً کہیں ذکر نہیں۔ اور یہ بھی واضح ہے کہ ایک شریعت کا مسئلہ دوسری شریعت میں ثابت کرنا مشکل کام ہے۔ (از کبیر)

مسئلہ قسامت: ہماری شریعت میں قانون یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مقتول کسی محلہ کی گلی وغیرہ میں پایا جائے لاش اس کی کسی گھر میں نہ ہو اس کے قاتل کا پتہ نہ چل رہا ہو۔ تو محلہ کے پچاس آدمیوں سے قسم لی جائے۔ ان پچاس آدمیوں سے قسم لی جائے گی جن کو مقتول کا ولی منتخب کرے گا۔ وہ قسم اٹھائیں:

”باللہ ما قتلناہ ولا علمناہ قاتلا“

قسم ہے اللہ تعالیٰ کی نہ ہم نے اس شخص کو قتل کیا اور نہ ہی ہمیں علم ہے کہ اس کا قاتل کون ہے

جب پچاس آدمی قسم اٹھالیں تو تمام اہل محلہ کے عاقلہ (ان کے پدری رشتہ دار اور ان کے ہر شعبہ کے ساتھی) پر دیت لازم آجائے گی۔

سعید ابن مسیب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے یہود کے پچاس آدمیوں سے قسم لی تھی جب

مقتول ان کے محلہ میں پایا گیا تھا ان کے قسم اٹھالینے کے بعد ان تمام پر دیت مقرر فرمادی۔

(روہ مسند بزار)

خیال رہے کہ مقتول کے ولی سے قسم طلب نہیں کی جائے گی، کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے جو آپ نے دوران خطبہ فرمایا:

”البينة على المدعى واليمين على المدعى عليه“ (رواہ الترمذی)

مدعی پر گواہ لازم ہیں اور مدعی علیہ پر قسم۔

اور یہ بھی خیال رہے کہ جن پچاس آدمیوں کو قسم کے لئے ولی نے منتخب کیا تھا۔ اگر ان میں سے کوئی ایک قسم اٹھانے سے انکار کر دے تو اسے قید کر لیا جائے جب تک وہ قسم نہ اٹھائے اسے نہ چھوڑا جائے۔ اور یہ بھی خیال رکھیں کہ اگر محلہ کی آبادی کم ہو۔ پچاس مرد پورے نہیں ہو رہے، بلکہ تھوڑے ہیں تو ان سے قسم اتنی مرتبہ لیں کہ اس سے قسم کی تعداد پچاس مرتبہ مکمل کر لی جائے۔ کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ قسم لی لیکن آدمی انچاس تھے، تو آپ نے ایک شخص سے دو مرتبہ قسم لے لی تھی، اس طرح تعداد پچاس ہو گئی تھی۔

اور یہ بھی خیال رہے قسم صرف عقل مند مردوں سے لی جائے گی، مجنونوں (پاگلوں) سے نہیں لی جائے گی اور عورتوں اور بچوں سے بھی قسم نہیں لی جائے گی۔

(از ہدایہ)

مختصر اور ضرورت کے مطابق مسئلہ بیان کر دیا ہے زیادہ تفصیل فقہ کی کتب میں دیکھی جائے۔



﴿ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُمْ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ
أَوْ أَشَدَّ قَسْوَةً وَإِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْأَنْهَارُ
وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاءُ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا
يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ﴾ (آیت ۷۴)

(۱) ”پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے تو وہ پتھروں کی مثل ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ
کرے۔ اور پتھروں میں تو کچھ وہ ہیں جن سے ندیاں بہہ نکلتی ہیں۔ اور کچھ وہ ہیں جو پھٹ
جاتے ہیں تو ان سے پانی نکلتا ہے اور کچھ وہ ہیں جو اللہ کے ڈر سے گر پڑتے ہیں اور اللہ
تمہارے کو تکوں سے بے خبر نہیں۔“

(۲) ”پھر سخت ہو گئے دل تمہارے، اس کے بعد، تو وہ پتھروں کی طرح ہیں بلکہ (ان سے) زیادہ
سخت۔ اور بیشک بعض پتھر وہ ہیں کہ جاری ہوتی ہیں ان کی نہریں۔ اور بیشک ان سے بعض وہ
ہیں جو پھٹ پڑتے ہیں تو نکلتا ہے ان سے پانی۔ اور بیشک بعض ان سے وہ ہیں جو گر پڑتے
ہیں اللہ کے ڈر سے، اور نہیں ہے اللہ غافل اس سے جو تم عمل کرتے ہو۔“

﴿ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُمْ﴾ : القسوة کا معنی صلابت (سختی) شدت، خشک ہونا۔ یہاں
مراد یہ ہے کہ تمہارے دل اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے اور اللہ تعالیٰ کی آیات پر یقین رکھنے سے
خالی ہو گئے۔ ﴿قُلُوبُكُمْ﴾ میں خطاب کسے ہے؟ ابوالعالیہ اور قتادہ وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ یہ
خطاب تمام بنی اسرائیل کو ہے کیونکہ سب کا طریقہ یہی تھا آج تو بہ کرنا، کل پھر جانا۔

”وقال ابن عباس المراد قلوب ورثة القتل لانهم حين حيي واخبر

ببقاتله وعاد الى موته انكر واقتله وقالوا كذب“

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہ خطاب مقتول کے ورثاء کو ہے۔

کیونکہ جب وہ زندہ ہوا اور اس نے اپنے قاتل بتائے، پھر وہ فوت ہو گیا، تو وہ کہنے

﴿مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ﴾: یہ واقعہ دیکھنے کے بعد جو اللہ تعالیٰ کی قدرت کی عظیم نشانی تھی پھر ان کا انکار کرنا یقیناً سخت جلی کی وجہ سے تھا، رب تعالیٰ نے فرمایا کہ تمہارے دل تو پتھر کی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت ہو گئے۔ یقیناً ان سے بڑھ کر کوئی دل کا اندھا نہیں ہو سکتا۔ ان سے بڑھ کر اپنے برے اعمال کی وجہ نبی کی تکذیب کرنے والا کوئی نہیں ہو سکتا۔

فائدہ:

”عن عبد الله بن عمر قال قال رسول الله ﷺ لا تكثروا الكلام بغير ذكر الله فان كثرة الكلام بغير ذكر الله قسوة للقلب وان ابعد الناس من الله القلب القاسي“

(رواہ الترمذی)

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کے ذکر کے بغیر زیادہ کلام نہ کرو، کیونکہ اللہ کے ذکر کے بغیر زیادہ کلام کرنا دل کو سخت کرنا ہے اور سب لوگوں سے اللہ تعالیٰ سے دور ہونے والا وہی شخص ہے جس کا دل سخت ہو۔

☆ ”عن انس قال قال رسول الله ﷺ اربعة من الشقاء جمود العين وقساء القلب وطول الأمل والحرص على الدنيا“

(مسند بزار)

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا چار چیزیں بدبختی کا ذریعہ ہیں آنکھوں کا خشک ہو جانا (اللہ کے ڈر سے کبھی آنسو نہ آئیں) اور دل کا سخت ہونا اور لمبی امیدیں رکھنا، اور دنیا پر حرص رکھنا۔

(ترمذی)

﴿فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ﴾: ”تو وہ پتھروں کی طرح ہیں“ ان کے دلوں کو پتھروں سے تشبیہ دی گئی ہے لوہے سے تشبیہ نہیں دی اس لئے کہ لوہا پکھل جاتا ہے اس میں کچھ نرمی ہوتی ہے۔ لیکن ان کے دل تو مکمل طور پر نرمی سے خالی تھے۔

(تفسیر الرحمن)

قساوة کا ذکر کب ہوتا ہے؟ یہ وہ چیز جو اصل کے لحاظ سے کسی چیز کے اثر کو قبول کرے اسے ”قابل“ کہا جاتا ہے کہ یہ اثر کو قبول کرنے والی چیز ہے۔ جب کوئی چیز اسے عارض ہو جائے، جس

کی وجہ سے اس میں اثر کے قبول کرنے کی صلاحیت ختم ہو جائے تو اس کو ”قاسی“ کہا جاتا ہے: ”انہ صار صلبا غلیظا قاسیا“ کہ بیشک یہ بہت سخت ہو گیا۔ اب یہ ”قابل“ نہیں رہا بلکہ اس میں صلابت اور غلظت اور قساوت آ گئی۔

جسم بحیثیت جسم غیر کے اثر کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن جب اس کو صفت حجریہ (پتھر ہونے کی صفت) عارض آ جائے۔ تو حجر کا جسم قابل نہیں رہتا قاسی (سخت) ہو جاتا ہے۔

اسی طرح دل کی شان یہ ہے کہ وہ دلائل اور آیات اور عبرت آموز نصائح کے اثر کو قبول کرتا ہے جس کی وجہ سے وہ سرکشی، نافرمانی، تکبر کو چھوڑ دیتا ہے اور طاعت کو ظاہر کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے حضور جھک جاتا ہے اور اللہ کا خوف اسے لاحق ہوتا ہے۔

”فاذا عرض للقلب عارض اخرجه عن هذه الصفة صار في عدم التأثير

شبيها بالحجر فيقال قسا القلب وغلظ“

لیکن دل کو بھی جو عوارضات لاحق ہو جاتے ہیں تو اسے اپنی اصلی صفات سے نکال

دیتے ہیں تو وہ دل تاثیر کو نہ قبول کرنے کی وجہ سے ”قساوت اور غلظت“ سے متصف ہو

جاتا ہے یعنی اس وقت کہا جاتا ہے کہ فلاں کا دل بہت سخت ہو گیا۔

”قساوة“ کا مقابل ”رقة“ (نرم ہونا) ہے۔ اسی لئے رب تعالیٰ نے مومنوں کی شان بیان

کرتے ہوئے فرمایا:

﴿اللَّهُ نَزَلَ أَحْسَنَ الْحَدِيثِ كِتَابًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُودُ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِينُ جُلُودُهُمْ وَقُلُوبُهُمْ إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ﴾ (پ ۲۳ ع ۱۶)

”اللہ نے اتاری سب سے اچھی کتاب کہ اول سے آخر تک ایک سی ہے دوہرے بیان والی اس سے بال کھڑے ہوتے ہیں ان کے بدن پر جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں پھر ان کی کھالیں اور دل نرم پڑتے ہیں یاد خدا کی طرف رغبت کرتے ہیں۔“

﴿أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً﴾: ”بلکہ ان سے زیادہ سخت (یعنی تمہارے دل پتھروں کی طرح سخت ہو گئے بلکہ پتھروں سے بھی زیادہ سخت ہو گئے کیونکہ پتھروں سے تو نہریں جاری ہوتی ہیں پتھروں سے تو جھٹے جاری

ہوتی ہیں۔ پھر تو اللہ تعالیٰ کی خشیت سے نیچے گر پڑتے ہیں لیکن تمہارے دلوں پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

﴿اَوْ﴾: عام طور پر شک کے لئے آتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کا کلام شک سے پاک ہے اس لئے

یہاں شک کا معنی نہیں۔ اس لئے یہاں کئی احتمال ہیں کہ ”او“ کا معنی کون سا لیا جائے۔

(۱) اس میں ایک وجہ یہ ہے کہ (او) بمعنی (واو) کے عام طور پر آتا رہتا ہے۔ قرآن پاک میں کئی

جگہ یہی معنی مراد لیا گیا ہے: ﴿اِلٰی مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيدُوْنَ﴾ میں اور ﴿وَلَا يُسِدُّنَ زِينَتَهُنَّ اِلَّا

لِبَعُولَتِهِنَّ اَوْ اَبَائِهِنَّ﴾ میں اور ﴿اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْ بُيُوْتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَبَائِكُمْ﴾ میں اور

﴿لَعَلَّهُ يَتَذَكَّرَ اَوْ يَخْشٰى﴾ میں اور ﴿فَالْمُلْقِيَاتِ ذِكْرًا عُدْرًا اَوْ نَذْرًا﴾ میں ”او“ واو کے

معنی میں استعمال ہے۔ اس لحاظ پر معنی یہ ہوگا پھر سخت ہو گئے تمہارے دل اس کے بعد، تو وہ پھر کی طرح

ہیں اور اس سے بھی سخت۔

احقوں کی جنت میں بسنے والے: راقم نے اپنے ایک رسالہ (ایصال ثواب مستحب ہے) میں

مستحب کی تعریف میں ایک جگہ درمختار اور شامی کی عبارت میں ”او“ کا معنی اور کیا ہے، تو ایک سر پھر شخص

مجھے کہنا لگا تم نے ”او“ کا معنی ”یا“ نہیں کیا ”اور“ کیا ہے جو غلط ہے غلط معنی کر کے تم نے اپنا مطلب

نکال لیا ہے۔ میں نے کہا جس کو پتہ ہی نہ ہو ”واو“ کے کون کون سے معانی ہیں اور اسے یہ پتہ نہ ہو کہ

”او“ کے کون کون سے معانی ہیں اسے دین کا کیا پتہ ”واو“ کا معنی صرف ”اور“ اور ”او“ کا معنی صرف

”یا“ یاد کرنے سے علامہ بن بیٹھے۔

(۲) کبھی کسی چیز کو معین کرنا مقصود نہ ہو بلکہ مقصد فعل کا بیان ہو تو وہاں ”او“ ذکر کرتے ہیں۔ جیسے

کوئی کہے ”اکلت خبزا او تمرا“ میں نے روٹی کھائی یا کھجور۔ مقصد یہ ہے کہ میں نے کچھ نہ کچھ

کھایا ہوا ہے مجھے کھانے کی حاجت نہیں یہ بیان کرنا مقصود نہیں کہ میں نے کیا کھایا ہے۔ اس صورت

میں ”او“ کا معنی ”یا“ ہوگا لیکن وہ شک پر دلالت نہیں کرے گا۔

(۳) تیسرا احتمال یہ ہے کہ ”او“ تنويع پر دلالت کر رہا ہے۔ مطلب اس کا یہ ہے تمہارے دل پھر کی

طرح ہیں بعض ان میں سے اور ہی زیادہ سخت ہیں۔ یہاں ”او“ کا معنی ”یا“ نہیں کیا جائے گا بلکہ معنی

ہوگا اور ”ان سے بعض“۔

(۴) اس کلام کی نسبت بندوں کی طرف ہے یعنی جب وہ ان کے دلوں کے حال کی طرف توجہ کریں گے اور اس پر مطلع ہوں گے تو کہیں گے ”تمہارے دل تو پتھروں کی طرح ہیں یا اس سے بھی سخت“ یہاں ”او“ کا معنی ”یا“ ہوگا شک والا معنی بھی ممکن ہوگا۔ کیونکہ لوگوں کا شک کرنا منع نہیں۔

(۵) جس طرح کہا جاتا ہے ”لا اکل الا حلوا او حامضا“ میں نہیں کھاتا سوائے میٹھے یا ترش کے مطلب اس کا یہ ہوتا ہے کہ میرا طعام صرف دو ہی قسم کا ہے میٹھا یا ترش۔ اسی طرح یہاں مطلب یہ ہو گا کہ تمہارے دل کی قساوت (سختی) ان دو قسموں سے باہر نہیں وہ یہ کہ تمہارے دلوں کی سختی پتھروں کی طرح ہے یا اس سے بھی زیادہ۔ اگرچہ یہاں ”او“ کا معنی ”یا“ کرنا صحیح ہے لیکن شک والا معنی نہیں۔

(۶) کبھی ”او“ اباحت کے لئے آتا ہے جیسا کہ کہا جائے ”جالس الحسن او ابن سیرین“ حسن کے ساتھ بیٹھو یا ابن سیرین کے ساتھ بیٹھو۔ یادو نوں کے ساتھ بیٹھو درست ہے تمہیں اجازت ہے۔ اس صورت کے لحاظ پر مطلب یہ ہوگا کہ تمہارے دل پتھروں کی طرح سخت ہیں۔ یا ان سے بھی زیادہ سخت مطلب یہ ہے کہ تشبیہ دینے والے کو اختیار ہے چاہے تو تمہارے دلوں کو پتھروں سے تشبیہ دے چاہے تو اس سے زیادہ سخت چیز سے تشبیہ دے چاہے تو دونوں سے تشبیہ دے۔

(۷) ان کلمۃ ”او“ بمعنی بل۔ اور اس میں یہ صورت پائی جاتی ہے کہ ”او“ بل کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جس کا معنی ہوتا ہے ”بلکہ“

اعلیٰ حضرت نے یہی معنی کیا ہے یہی سب سے زیادہ آسان اور معتبر ہے راقم نے بھی وہی نقل کیا ہے۔

﴿وَإِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ أَلُنْهَارُ﴾ : اور بیشک بعض پتھر وہ ہیں جن سے نہریں جاری ہوتی ہیں ”التفجر التفتح بالسعة والكثرة“ کسی چیز کا وسعت اور کثرت سے کھل جانا ”تفجر“ کہلاتا ہے۔ یعنی بعض پتھر کثیر مقدار میں پھٹ جاتے ہیں ان سے کثیر پانی نہروں کی صورت میں نکلتا ہے۔

﴿وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقُّ فَيُخْرِجُ مِنْهُ الْمَاءُ﴾ : ”اور بیشک بعض ان سے پھٹ

جاتے ہیں تو ان سے پانی نکلتا ہے۔ مراد اس سے یہ ہے ”فیخرج منه الماء فيكون عينا لانهر جاريا“ کہ بعض پتھر پھٹ جاتے ہیں ان سے پانی اگرچہ نہر کی صورت میں تو نہیں نکلتا لیکن چشمہ کی صورت میں نکلتا ہے۔

﴿وَإِنَّ مِنْهَا لَمَّا يَغْطِي مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ﴾: ”اور بیشک بعض ان سے وہ ہیں جو گر پڑتے ہیں اللہ تعالیٰ کے ڈر کی وجہ سے۔“

پتھر کیسے ڈرتے ہیں؟ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ پتھروں میں نہ حیات ہے نہ ادراک ہے اور نہ ہی عقل ہے تو ان کا ڈرنا کیسے ثابت ہے معتزلہ کا مذہب بھی یہی ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے۔
”ان الله تعالى خلق فيه الحياة والعقل والادراك وهذا غير مستبعد في قدرة الله“

بیشک پتھروں میں، اسی طرح اور کئی چیزوں میں حیات اور عقل بظاہر نہیں ہوتی، لیکن اللہ تعالیٰ ان میں حیات اور ادراک اور عقل پیدا کر دیتا ہے اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کوئی چیز بعید نہیں۔

آئیے چند مثالوں کی طرف توجہ فرمائیں: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَقَالُوا لَجُلُودُهُمْ لَمْ شَهِدْتُمْ عَلَيْنَا قَالُوا أَنْطَقْنَا اللَّهُ الَّذِي أَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ﴾
”اور وہ اپنے چمڑوں سے کہیں گے تم نے ہم پر کیوں گواہی دی وہ کہیں گے ہمیں اللہ نے بلوایا جس نے ہر چیز کو بولنے کی قوت عطا کی۔“

قیامت کے دن انسانوں کے چمڑے ان کے خلاف گواہی دیں گے۔ گواہی تب ہی دیں گے جب ان کو عقل اور بولنے کی طاقت حاصل ہوگی۔ اور وہ کلام کو سن کر جواب دیں گے۔ یہ سب طاقتیں ان کو رب تعالیٰ کی طرف سے حاصل ہوں گی۔

☆ اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَوْ أَنْزَلْنَا هَذَا الْقُرْآنَ عَلَى جَبَلٍ لَرَأَيْنَاهُ خَاشِعًا مُتَصَدِّعًا مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ﴾
”اگر ہم یہ قرآن کسی پہاڑ پر اتارتے تو ضرور اسے جھکا ہوا دیکھتا، پاش پاش ہوتا اللہ کے خوف سے۔“

مراد یہ ہے کہ اگر قرآن پاک پہاڑ پر اتارا جاتا تو اسے عقل، فہم اور شعور بھی دیا جاتا وہ عظمت قرآن کے سامنے جھک جاتا، خشوع کرتا اور خوف الہی سے پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا۔

☆ ”وروی عن النبی ﷺ انه لما اتاه الوحي في اول المبعث وانصرف النبی ﷺ الى منزله سلمت عليه الاحجار والاشجار فكلها كانت تقول السلام عليك يا رسول الله“

نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ جب سب سے پہلے بعثت (نبوت کے اعلان کے ارشاد) کے وقت وحی آئی تو آپ جب اپنے گھر تشریف لا رہے تھے تو آپ کو پتھر اور درخت سلام کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے ”السلام عليك يا رسول الله“

اے انسان ذرا غور تو کر، کیا تجھے پتھروں جیسا عقل و شعور بھی حاصل نہیں، وہ تو اپنے پیارے نبی کریم ﷺ پر سلام بھیجیں اور ”السلام عليك يا رسول الله“ کہیں اور تو محروم ہی رہے تو بد قسمت ہی رہے اور دوسروں کو بد قسمت بنانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگائے۔

”قالوا فغير ممتنع ان يخلق في بعض الاحجار عقل وفهم حتى

تحصل الخشية فيه وانكرت المعتزلة“

جو علماء اہل سنت جو محققین اور راہنما فی العلم (علم میں پختگی رکھنے والے) ہیں وہ فرماتے ہیں کہ اس میں کوئی ممانعت نہیں کہ اللہ تعالیٰ بعض پتھروں میں عقلا و فہم پیدا فرمادے اور ان کو رب تعالیٰ کی خشیت حاصل ہو جائے البتہ معتزلہ کا انکار کرتے ہیں۔

(ماخوذ از کبیر)

خیال رہے بدیہی اور قطعی چیزوں کا انکار کرنا معتزلہ اور ان کے یاروں کا کام ہے بہت سے مسائل میں معتزلہ کے ساتھ ملنے والے آج کل بھی ان کے یار موجود ہیں۔

☆ ”وفي صحيح مسلم اني لا عرف حجرا بمكة يسلم علي قبل ان ابعث اني لا عرفه الآن“

مسلم شریف میں ہے بیشک میں پہچانتا ہوں اس پتھر کو جو مکہ میں مجھے سلام کرتا تھا میری بعثت سے پہلے بیشک میں اب بھی اسے پہچانتا ہوں۔

(ابن کثیر)

☆ ”قال البغوي روى ان النبی ﷺ كان على ثبير والكفار يطلبونه فقال النجل انزل عني فاني اخاف ان تؤخذ علي فبعاقبني الله تعالى بذلك وقال له جبل حراء الى الى يا رسول الله“

علامہ بغوی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا بیشک نبی کریم ﷺ شیر پہاڑ پر تھے، کافر آپ کو تلاش کر رہے تھے، تو پہاڑ نے عرض کیا آپ مجھ سے اتر جائیں، بیشک میں ڈرتا ہوں کہیں میرا مؤاخذہ (پکڑ) نہ ہو جائے مجھے اللہ تعالیٰ اس کی سزا نہ دے حراء پہاڑ نے عرض کیا یا رسول اللہ میری طرف تشریف لے آئیں یا رسول اللہ میری طرف تشریف لے آئیں۔

☆ ”وصح عن انس ان رسول الله ﷺ طلع له احد فقال هذا جبل يحبنا ونحبه“

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے صحیح حدیث مروی ہے بیشک رسول اللہ ﷺ نے احد پہاڑ کو دیکھ کر فرمایا یہ پہاڑ ہمارے ساتھ محبت کرتا ہے ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔

☆ ”وصح عن ابی ہریرۃ قال کان رسول الله ﷺ علی حراء وابوبکر وعمر وعثمان وعلی وطلحۃ والزبیر فتحرکت الصخرۃ فقال النبی ﷺ اهدأ فما علیک الا نبی او صدیق او شهید اخرجه مسلم“

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے صحیح حدیث مروی ہے بیشک رسول اللہ ﷺ اور ابو بکر اور عمر اور عثمان اور علی اور طلحہ اور زبیر حراء پہاڑ پر تھے پہاڑ نے (خوشی سے) حرکت کی تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا ٹھہر جا تجھ پر نہیں سوائے نبی اور صدیق اور شہید کے۔

سبحان اللہ اس حدیث پاک سے جہاں یہ ثابت ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حراء پہاڑ کو عقل و شعور عطا کیا وہاں یہ ثابت ہو رہا ہے کہ علم غیب نبی کریم ﷺ کا معجزہ ہے کیونکہ آپ نے حضرت عمر، اور حضرت عثمان اور حضرت علی اور حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہم کے متعلق فرمایا کہ یہ شہید ہیں تو جیسا آپ نے فرمایا ایسا ہی سب کو شہادت نصیب ہوئی۔

معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ کو اپنی امت کی وفات کا علم دیا گیا اور آپ کو ان کے اس دنیا سے رخصت ہونے کی وجوہ کا علم بھی دیا گیا کہ کسی نے دنیا سے کیسے جانا ہے۔

☆ ”وروی بسندہ عن علی قال کنا مع رسول الله ﷺ بمکۃ فرحنا فی نواحیہا خارجا من مکۃ بین الجبال والشجر فلم نمر بشجرۃ ولا جبل الا قال السلام علیک یا رسول الله“

حضرت علیؓ سے سند صحیح سے مروی ہے کہ ہم ایک مرتبہ رسول اللہؐ کے ساتھ مکہ شریف کے اطراف میں درختوں اور پہاڑوں میں سیر کی غرض سے نکلے، ہم کسی درخت اور پہاڑ سے بھی نہیں گزرتے تھے مگر یہ کہ وہ درخت اور پہاڑ حضور کی خدمت میں عرض کرتے..... السلام علیک یا رسول

انسان کو جھنجھوڑتے ہوئے اگریوں کہا جائے کہ ”پتھروں نے تو رسول اللہؐ کو کہا ”السلام علیک یا رسول اللہ“ اے پتھرا تو بھی عرض کر ”السلام علیک یا رسول اللہ“ اے پتھرا“ کو ذرا سمجھنا) تو راقم کے خیال میں یہ جملہ بہت خوب رہے گا اگر پتھر سے گھٹیا انسان نہ سمجھے تو اس کی اپنی بد قسمتی۔

☆ ”روی بسندہ عن جابر بن عبد اللہ یقول کان النبی ﷺ استند الی جذع نخلة من سواری المسجد فلما صنع له المنبر فاستوی علیہ اضطربت تلک الساریة نحن کحنین الناقة حتی سمعنا اهل المسجد حتی نزل رسول اللہ ﷺ فاعتنقها فسکنت“

حضرت جابر بن عبد اللہؓ سے مروی ہے نبی کریم ﷺ مسجد کے ستونوں میں سے ایک ستون سے سہارا لگاتے تھے (جب آپ خطبہ دیتے) جو کہ کھجور کے تنے کا تھا۔ جب نبی کریم ﷺ نے منبر بنوالیا اور آپ نے اس پر (خطبہ کے لئے) بیٹھنا شروع فرمایا تو وہ ستون بہت پریشان ہو گیا تو اس نے ایسا رونا شروع کر دیا جیسا کہ اونٹنی کی آواز ہوتی ہے۔ تمام مسجد والوں نے اس کی آواز کو سنا۔ نبی کریم ﷺ نے منبر سے اتر کر اسے گلے لگایا تو اسے سکون حاصل ہوا۔

☆ ”عن ابی ہریرۃ قال صلی بنا رسول اللہ ﷺ الصبح ثم اقبل علی الناس بوجہہ فقال بینا رجل یسوق بقرة اذ عیی فرکبها فضر بها فقالت انا لم نخلق لهذا انما خلقنا لحرارة الارض فقال الناس سبحان اللہ بقرة تتکلم فقال رسول اللہ ﷺ فانی او من به وابوبکر وعمر وما هما ثم“

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں ہمیں رسول اللہؐ نے صبح کی نماز پڑھائی۔ پھر آپ لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے آپ نے فرمایا ایک وقت میں ایک شخص گائے کو چلا رہا تھا جب وہ شخص تھک گیا تو گائے پر سوار ہو گیا جب اس نے گائے کو (چلانے کے لئے) مارا تو گائے نے کہا ہمیں اس کے لئے نہیں پیدا کیا گیا ہمیں تو اہل چلانے کے لئے پیدا کیا گیا ہے لوگوں نے (تعجب کرتے ہوئے) کہا ”سبحان اللہ“ گائے بھی کلام کرتی ہے تو رسول اللہؐ نے فرمایا کہ بیشک میں اور ابو بکر اور عمر اس پر

ایمان رکھتے ہیں حالانکہ وہ دونوں حضرات وہاں موجود نہیں تھے۔ (ماخوذ از مظہری)

اس حدیث پاک سے جہاں گائے کا کلام کرنا، شعور رکھنا ثابت رہور ہا ہے وہاں حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی فضیلت بھی ثابت ہو رہی ہے کہ ان کی غیر موجودگی میں نبی کریم ﷺ نے ان پر کامل اعتماد کرتے ہوئے فرمایا کہ میں اس پر ایمان رکھتا ہوں تو یہ ہو نہیں سکتا جس کو میں تسلیم کروں اس کو میرے دونوں یا تسلیم نہ کریں ”سبحان اللہ“ کیا ہی دونوں کا عظیم مقام ہے۔

”قال مجاهد لا ينزل الحجر من اعلى الى اسفل الا من خشية

الله تعالى“

(مظہری)

حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ جو پتھر بھی اوپر سے نیچے گرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے ہی نیچے گرتا ہے۔

راقم کو بھی یہی قول پسند ہے کہ جو پتھر بھی اوپر سے نیچے گرے اس میں ظاہری سبب کوئی بھی ہو لیکن حقیقی سبب اس میں اللہ تعالیٰ کے خشیت ہی پائی جاتی ہے۔ اسلئے موجودہ زمانہ کے بعض مفسرین کے اس قول سے اتفاق نہیں کہ بعض پتھر تو رب تعالیٰ کی خشیت سے گرتے ہیں۔ اور بعض کے گرنے کی اور وجوہ ہوتی ہیں۔

فائدہ : آیہ کریمہ میں پتھر کی چار قسموں کا ذکر کیا ایک وہ جو سخت ہوتے ہیں جو بظاہر کوئی اثر قبول نہیں کرتے۔ دوسرے وہ جن سے نہریں جاری ہوتی ہیں۔ تیسرے وہ جن سے چشمے جاری ہوتے ہیں۔ اور چوتھے وہ جو اللہ تعالیٰ کی خشیت سے گر پڑتے ہیں۔

انسانوں کے دل کی بھی چار قسمیں ہیں۔ ایک قسم کے وہ دل ہیں جو نور الہی میں مستغرق ہو کر فنا کے درجہ میں پہنچ جاتے ہیں۔ وہ علم کے سمندر میں غرق ہو جاتے ہیں اور فانی ہو جاتے ہیں۔ جب وہ نور الہی اور علم میں مستغرق ہو کر فنا ہوتے ہیں تو ان سے معرفت کی نہریں جاری ہوتی ہیں اور سیدھی راہ کے طلب کرنے والے اور فیضان حاصل کرنے کی تمنا کرنے والوں کے قلوب کے لئے حیات کا ذریعہ بنتے ہیں۔ یہ قلوب اہل اللہ اور سابقین کے ہوتے ہیں۔ ان کے مناسب یہ ارشاد ہے ﴿وَإِنَّ مِنْ الْجِبَارَةِ لِمَا يُتَفَجَّرُ مِنْهُ الْأَنْهَارُ﴾ تقریباً ان میں مشابہت آگئی۔

دوسرا درجہ قلوب کا یہ ہے کہ وہ علم کے دریا سے سیر ہوتے ہیں اور مخلوق کے نفع کا سبب بنتے ہیں یہ علماء راسخین کے قلوب ہیں۔ ان کو وہ درجہ حاصل ہے کہ ان کے قلوب سے پانی کے چشمے پھوٹ پڑتے ہیں۔ ان کے قلوب کے مناسب رب تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے ﴿وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشْفُقُ فَيُخْرِجُ مِنْهُ الْمَاءَ﴾۔

تیسرا درجہ قلوب کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کریں اس کے احکام کو تسلیم کریں اور رب تعالیٰ کا خوف ان میں پایا جائے اس خوف سے رب کے حضور وہ سجدہ ریز ہو جائیں۔ اس کے مناسب رب تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے ﴿وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ﴾۔

چوتھا درجہ قلوب کا یہ ہے کہ سرکش اور متکبر لوگوں کے قلوب پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ منکر ہی رہتے ہیں ان میں کسی قسم کا خوف نہیں پایا جاتا۔ ان کے قلوب کے مناسب رب تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی ہے ﴿ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُمْ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ﴾ بہت ہی خوب مناسبت اور مشابہت پائی گئی۔

(ماخوذ از عزیزی)

قرآن پاک کی فصاحت کیا خوب ہے: افسی (اسم تفضیل) کا معنی بہت سخت ہے اور ﴿أَشَدُّ قَسْوَةً﴾ کا معنی بھی بہت سخت ہے لیکن ان میں فرق یہ ہے کہ ﴿أَفْسَى﴾ عام ہے مقدار اور کیفیت کے لحاظ پر سختی پر بولا جاتا ہے لیکن ﴿أَشَدُّ قَسْوَةً﴾ کیفیت کے لحاظ پر سختی پر بولا جاتا ہے یہاں یہ ہی مراد ہے اسی لئے اسے ذکر کیا۔

(از عزیزی)

﴿وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ﴾: ”اور نہ ہی اللہ غافل ہے اس چیز سے جو تم عمل کرتے ہو“ یہاں سے ان لوگوں کو ہی خطاب ہے جن کا پہلے ذکر آ رہا ہے اور ان کو ہی دھمکی دی جا رہی ہے کہ تمہارے دل پتھروں سے بھی زیادہ سخت ہو گئے رب تعالیٰ کے احکام سے عدولی کئے جا رہے ہو یہ جان لو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں سے غافل نہیں۔

علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے ان الفاظ سے تفسیر فرمائی:

”وعبد علی ما ذکر کانه قبل ان الله تعالى بالمرصاد هؤلاء القاسية

قلوبهم حافظ لا عمالهم محص لها، فهو مجاز بهم في الدنيا والآخرة“

ان کی بد اعمالیوں کا جو ذکر کیا گیا اسی پر یہ ان کو وعید کی جا رہی ہے ان کو بتایا گیا کہ

بیشک اللہ تعالیٰ سے یہ سخت دل والے لوگ چھپ کر نہیں رہ سکتے، اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو نگاہ میں رکھے ہوئے ہے اور ان کے اعمال اس کے شمار میں ہیں وہ ان کو دنیا اور آخرت میں اس کا بدلہ دے گا۔

رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی یہی مضمون وضاحت سے ثابت کر رہا ہے:

﴿وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا﴾ اور آپ کا رب بھولنے والا نہیں۔ (روح المعانی و کبیر)

تعظیم باری تعالیٰ کا پاس: قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں ﴿وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ﴾ میں تاویل کی ضرورت ہے ”لا یصح لانه یوهم جواز الغفلة علیه“ اس لئے کہ بغیر تاویل کے اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ کہنا کہ وہ غافل نہیں۔ اس سے وہم پڑتا ہے کہ شاید اس میں غفلت آسکتی ہے اور اس کی نفی کی گئی ہے۔ اگرچہ اس قول کو علامہ رازی رحمہ اللہ نے رد کیا ہے۔ تاہم اس قول سے اتنی بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ علماء صالحین نے رب تعالیٰ کی تعظیم کا کتنا لحاظ کیا ہے کہ جہاں ذرا بھر بھی اشتباہ ہو اوہاں کچھ نہ کچھ سوچنے کی کوشش کی کہ رب تعالیٰ کی شان کے لائق یہ الفاظ ظاہری طور پر مراد لئے جاسکتے ہیں یا ان کی تاویل کر کے وہ معنی مراد لیا جائے جو اس کی عظمت کے لائق ہو۔ تاہم علامہ رازی رحمہ اللہ نے بہت خوب بیان فرمایا:

”ولیس الامر كذلك لان نفی الصفة عن الشئ لا يستلزم ثبوت صحتها علیه، بدلیل قوله تعالیٰ ﴿لَا تَأْخُذْهُ سِنَّةٌ وَلَا نَوْمٌ، وَهُوَ يُطْعَمُ وَلَا يُطْعَمُ﴾ واللہ اعلم“

اس طرح مسئلہ نہیں جس طرح قاضی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کیونکہ کسی چیز کی نفی سے یہ لازم نہیں آتا کہ پہلے اس کا ثبوت ہو۔ اس پر واضح دلیل ہے کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿لَا تَأْخُذْهُ سِنَّةٌ وَلَا نَوْمٌ﴾ یہاں اونگھ اور نیند کی نفی کی گئی ہے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ پہلے اس کے لئے اونگھ اور نیند کا ثبوت بھی ہو۔ اسی طرح رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَهُوَ يُعْطَمُ وَلَا يُطْعَمُ﴾ وہ کھلاتا ہے اسے کھلایا نہیں جاتا۔ اسی میں نفی تو پائی گئی ہے کہ وہ کھانے سے بے نیاز ہے اسے کوئی کھلاتا نہیں۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کے لئے کھلانے کے ثبوت کا وہم آسکے۔

(از کبیر)

﴿اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِیْقٌ مِنْهُمْ یَسْمَعُوْنَ
كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ یَحْرِفُوْنَہٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ﴾

(۱) ”تو اے مسلمانو! کیا تمہیں یہ طمع ہے کہ یہودی تمہارا یقین لائیں گے اور ان میں کا تو ایک گروہ وہ تھا کہ اللہ کا کلام سنتے پھر سمجھنے کے بعد اسے دانستہ بدل دیتے۔“

(۲) ”کیا تم طمع رکھتے ہو (اے مسلمانو) کہ وہ ایمان لے آئیں گے تمہاری وجہ سے۔ حالانکہ ان میں سے تو ایک گروہ وہ ہے جو سنتے ہیں اللہ کے کلام کو پھر اس میں تبدیلی کر دیتے ہیں سمجھنے کے بعد، حالانکہ وہ جانتے ہیں (کہ ہم غلط کر رہے ہیں)۔“ (آیت نمبر ۷)

مختصر مطلب: اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو خطاب کیا کہ تم تو طمع رکھتے ہو کہ یہود ایمان لے آئیں۔ لیکن تمہیں ان کے ایمان پر طمع نہیں رکھنا چاہیے کیونکہ ان میں سے ایک فریق وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے کلام کو سنتا ہے اس میں نبی کریم ﷺ کے اوصاف کو جاننے اور سمجھنے کے باوجود پھر اس میں تحریف کر دیتے ہیں، حالانکہ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ہم باطل کر رہے ہیں لیکن حق سے پھر بھی روگردانی کرتے ہیں۔

اس آیت کریمہ کا ماقبل سے تعلق واضح ہے کہ پہلی آیات میں گزرے ہوئے یہود کے قبیح افعال کا ذکر کیا گیا۔ اور اس آیت کریمہ میں نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے یہود کے قبیح افعال کا ذکر کیا جا رہا ہے جو توراۃ کی تحریف کر کے نبی کریم ﷺ کے اوصاف کو چھپاتے تھے۔ (از کبیر)

اس مقام پر پیر صاحب نے کیا خوب بیان فرمایا:

”اس سے معلوم ہوا کہ حق پوشی اور سید عالم ﷺ کے اوصاف کو چھپانا اور آپ کے کلمات کا انکار کرنا یہود کا شیوہ تھا۔ اسلام کا دعویٰ کرنے والوں کو زیب نہیں دیتا کہ اپنے محبوب اور کریم رسول کے کمالات کو بیان کرنے سے ان کی زبان میں لکنت ہو اور فضائل سننے سے دل میں ٹھٹھن ہو۔ رفعت شان مصطفیٰ حبیب خدا علیہ وعلیٰ آلہ اطیب التحیۃ واحسن الثناء کسی کے ٹھٹھانے سے نہ گھٹے گی۔“ (ضیاء القرآن)

شان نزول: انصار صحابہ کرام کے یہود حلیف بھی تھے اور پڑوسی بھی اس لئے ان کی بہت تمنا ہوتی

کہ یہود اسلام کے ایں نو گویا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا تم تو تمنا کرتے ہو لیکن وہ ایمان لانے والے نہیں۔ اس لحاظ پر واضح ہوا کہ ﴿اَفْتَطْمَعُوْنَ﴾ میں خطاب صحابہ کرام کو ہے۔

ایک احتمال یہ بھی ہے کہ خطاب نبی کریم ﷺ کو ہو البتہ جمع کا صیغہ تعظیم کے لئے ذکر کیا گیا ہو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے:

”لا تحزن علی تکذیبہم ایاک واخبر انہم من اهل السوء الذین آمنوا“

کہ نبی کریم ﷺ کو فرمایا ”یہود جو آپ کی تکذیب کرتے ہیں اس پر غم نہ کریں۔ اور ساتھ ہی خبر دے دی گئی کہ یہ لوگ اپنے آباء و اجداد سے ہی بد عقیدہ اور بد اعمال چلے آ رہے ہیں۔ لہذا انہوں نے بھی ایسا ہی ہونا ہے۔“ (از قرطبی بنصرف، روح السعاسی)

﴿اَفْتَطْمَعُوْنَ﴾ : طمع (سمع پر زیادہ آتا ہے، البتہ فتح پر بھی آتا رہتا ہے) یہ تعجب کے وقت استعمال ہوتا ہے اور اس کا معنی تمنا کرنا، حرص کرنا، طمع کرنا۔ اور باب کرم پر جب آئے تو مبالغہ کا معنی پایا جاتا ہے یعنی بہت زیادہ طمع کرنے والا۔ اور طمع لشکر کے رزق کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے ”امر لہم الامیر باطماعہم“ امیر نے لشکر والوں کے لئے رزق دینے کا حکم دیا۔

خیال رہے کہ ﴿اَفْتَطْمَعُوْنَ﴾ میں ہمزہ استفہام انکاری کے لئے ہے:

”کانہ ایاسہم من ایمان هذه الفرقة من اليهود“

گویا کہ یہود کے اس فرقہ سے ایمان کے طمع کرنے سے مکمل طور پر ناامید کیا گیا ہے کہ ان کے ایمان کے لئے رزق کی طمع نہ کی جائے۔ (از قرطبی)

﴿اَنْ يُّؤْمِنُوا لَكُمْ﴾ : ”ای یصدقوا مستجبین لکم فالایمان بالمعنی اللغوی

والتعدیۃ باللام للتضمنین کما فی قوله تعالیٰ فآمن له لوط“

﴿اَنْ يُّؤْمِنُوا لَكُمْ﴾ کا ایک معنی یہ ہے (کیا تم طمع کرتے ہو) کہ وہ تمہاری بات کو قبول کرتے ہوئے اس کی تصدیق کریں گے اس صورت میں ایمان کا لغوی معنی ہوگا ”مان لینا“ اور لام سے متعدی کیا گیا ہے اس میں تضمین کا قاعدہ جاری ہے ﴿فآمن له لوط﴾ میں بھی ایمان کا لغوی معنی ہی معتبر ہے۔ خیال رہے اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی تفسیر کے مطابق ہے (تو اے مسلمانو کیا تمہیں یہ

طمع ہے کہ یہودی تمہارا یقین لائیں گے۔ اور دوسرا معنی یہ کیا گیا ہے۔

”﴿أَنْ يُؤْمِنُوا لَكُمْ﴾ ای ان یؤمنوا لا جل دعوتکم لهم ، فالفعل منزل

منزلة اللازم والمراد بالایمان المعنی الشرعی واللام لام الاجل“

یعنی لام سببیہ ہے۔ اور فعل بمنزل لازم کے ہے، اور ایمان کا معنی شرعی ہے اور معنی یہ ہوگا (کیا تم طمع کرتے ہو) کہ وہ تمہاری دعوت پر ایمان لے آئیں گے۔

راقم نے اس تفسیر کے مطابق ترجمہ کیا ہے ”کیا تم طمع رکھتے ہو (اے مسلمانو) کہ وہ ایمان لے آئیں گے تمہاری وجہ سے۔“

(از روح المعانی)

﴿وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِنْهُمْ يَسْمَعُونَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ يُحَرِّفُونَهُ﴾

”فریق سے مراد ان یہود کے گزرے ہوئے علماء اور پادریوں کی ایک جماعت ہے“

﴿يَسْمَعُونَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ يُحَرِّفُونَهُ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ وہ توراۃ کو سنتے اور اس میں اپنی اغراض (غرضوں) کے مطابق تبدیلی کر لیتے تھے یہی قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے۔

اور جمہور کا قول بھی اسی کے قریب ہے کہ وہ اپنی طرف سے اللہ کی کتاب توراۃ میں تبدیلی کر لیتے تھے نبی کریم ﷺ کے اوصاف کو انہوں نے تبدیل کر کے پیش کیا آپ کے درمیانہ قد کو لمبے قد سے تبدیل کر دیا۔ اور آپ کے رنگ سفید گندم گوں کو کہیں خالص سفید، کہیں سیاہی مائل کہہ دیا۔ اور ایہ رجم کو (یعنی جس میں زنا کی سزا سنگسار کرنے کا ذکر تھا) انہوں نے تبدیل کر دیا۔ اور اس میں تحریر کر دیا کہ اس کے چہرہ پر خاکستر لگا کر سیاہ کر دیا جائے۔

اسی طرح موسیٰ علیہ السلام ستر آدمیوں کو کوہ طور پر لے گئے تھے وہ کہنے لگے ہم بھی اللہ تعالیٰ کا کلام سنیں گے آپ نے ان کو فرمایا کہ غسل کر لو صاف لباس پہن لو۔ جب انہوں نے ایسا کر لیا۔ ﴿فَاسْمِعْهُمْ اللَّهُ كَلَامَهُ﴾ تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنا کلام سنایا ﴿ثُمَّ قَالُوا سَمِعْنَا﴾ پھر انہوں نے کہا ہم نے سنا پہلے یہ کہا لیکن پھر اسے بدل کر کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ حکم دیا ہے۔

﴿إِنْ اسْتَطَعْتُمْ أَنْ تَفْعَلُوا هَذِهِ الْأَشْيَاءَ فَافْعَلُوا وَإِنْ شِئْتُمْ فَلَا تَفْعَلُوا﴾

کہ توراۃ میں جتنے بھی احکام ہیں ان پر اگر تم عمل کر سکتے ہو تو کر لو اگر تم ان پر عمل نہیں کرنا چاہتے تو نہ کرو۔

فائدہ: ان سے ایمان لانا بعید قرار دیا ان کے ایمان پر طمع کرنے سے بھی کر دی گئی تو اسی سے پتہ چلا:

”افتطمعون ان يؤمنوا لكم ويظهروا التصديق ومن علم منهم الحق لم يعترف بذلك بل غيره وبدله“

کیا تم ان پر طمع رکھتے ہو کہ وہ تمہاری دعوت پر تمہاری وجہ سے ایمان لے آئیں گے تمہاری تصدیق کریں گے ایسا نہیں ہو سکتا، ان پر طمع کا کیا فائدہ جنہوں نے حق کو پہچان کر، جاننے کے باوجود اس پر ایمان نہیں لایا بلکہ اس میں تغیر و تبدل کر دیا۔

ان کے ایمان پر طمع نہ کرنے کی ایک اور عجیب وجہ بھی علامہ رازی رحمہ اللہ نے بیان فرمائی:

”افتطمعون ان يؤمنوا لكم مع انهم ما آمنوا بموسى عليه السلام وكان هو السبب في ان الله خلصهم من الذل وفضلهم على الكل ومع ظهور المعجزات المتوالية على يده وظهور انواع العذاب على المتمردين“

کیا تم طمع رکھتے ہو کہ وہ تمہاری وجہ سے ایمان لے آئیں گے یہ تو اس نسل سے ہیں ان لوگوں کی اولاد ہیں جنہوں نے موسیٰ علیہ السلام کے ارشادات کو تسلیم نہیں کیا حالانکہ انہوں نے ان کو ذلت سے نکالا یعنی فرعون اور اس کی قوم سے تمہیں چھڑایا جو تم سے ذلت آمیز کام لیتے تھے اور تمہیں ان کے دروژناک عذاب سے نجات دلائی جو تمہیں طرح طرح کی تکالیف پہنچاتے تھے۔ وہ موسیٰ علیہ السلام جنہوں نے ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ سے اس وقت کے تمام لوگوں پر فضیلت دلائی ان کے فرمان کو یہ لوگ ٹھکراتے رہے۔

پھر عجیب بات یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے کثیر معجزات کو انہوں نے دیکھا اور موسیٰ علیہ السلام کا ہی یہ معجزہ تھا کہ فرعون اور اس کی قوم کے لوگ جو بہت بڑے سرکش تھے ان کو بنی اسرائیل کے سامنے ہلاک کیا اور ان کو نجات دی لیکن یہ پھر بھی بار بار موسیٰ علیہ السلام کے حکم کو ٹالتے رہے تو ان سے ایمان کی توقع کیسے کی جاسکتی ہے لہذا ان سے ایمان کی طمع کا کوئی فائدہ نہیں۔

اور اے مومنو تم تو ان کو عقل مند سمجھ رہے ہو لیکن یہ تو عقل سے بہت دور ہیں۔

”افتطمعون ان يؤمنوا لكم هؤلاء من طريق النظر والاستدلال وكيف وقد كان فريق من اسلافهم يسمعون كلام الله ويعلمون انه حق ثم يعاندوه“

کیا تم سمجھ رہے ہو کہ یہ لوگ نظر و فکر کریں گے دلائل کے ذریعے تمہاری باتوں کو سمجھ لیں گے ایمان لے آئیں گے حالانکہ ان کے آباء و اجداد میں سے ایک فریق ایسا تھا جو اللہ کا کلام سنتے اور جانتے کہ یہ حق ہے لیکن پھر بھی اس سے عناد کرتے اور ایمان نہ لاتے۔

(از کبیر)

اعتراض : جب تحریف کرنے والا ایک فریق تھا تو یہ کیسے لازم آیا کہ تمام لوگ ہی ایمان نہیں لائیں گے: ”فان عناد البعض لا ینافی اقرار الباقین“ بیشک بعض لوگوں کا عناد باقی لوگوں کے اقرار کے مخالف نہیں۔

جواب : تحریف کرنے والے وہ لوگ تھے جن پر یہود کے علم کی دار و مدار تھی وہ ان کے علماء تھے جو کتاب کا علم رکھتے تھے عوام تو علم سے ہی خالی تھے ”العوام کالانعام“ (عوام چوپایوں کی طرح ہیں) جملہ شائدان کے لئے ہی وضع کیا گیا تھا۔

اسلئے تمام یہود ہی اپنے راہنماؤں کے جال میں پھنسے ہوئے تھے جو حسد اور عناد کی وجہ سے تحریف کر رہے تھے یا اپنے تحائف وغیرہ آمدنی کے ذرائع کے بند ہونے کے خطرہ سے تحریف کر رہے تھے اور ان کے متبعین ان کی تحریف شدہ عبارات کو صحیح تسلیم کر رہے تھے اس پر ان کا ایمان تھا اور اسی پر ان کا عمل تھا۔ اس لئے گویا کہ ان میں سے اکثر ہی تحریف کے مرتکب ہو رہے تھے۔ تو ذکر مطلق فرما دیا آیہ کریمہ کے شان نزول سے بھی واضح ہو رہا ہے کہ مراد وہ لوگ ہیں جو انصار صحابہ کرام کے حلیف اور ان کے قرب و جوار میں رہنے والے تھے۔ یہاں ان لوگوں سے ایمان لانے کے طمع کی نفی کی گئی۔ ورنہ حضرت عبداللہ بن سلام رحمہ اللہ اور ان کے ساتھیوں نے ایمان قبول کیا۔ (ماخوذ از کبیر بتصرف)

تنبیہ : اللہ تعالیٰ کے کلام کو سننے کا مطلب یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جو وحی نازل ہوتی تھی وہ جب ان تک پہنچتی اور وہ سنتے تو اس میں تحریف کر دیتے تھے۔ علامہ آلوسی رحمہ اللہ کا مختار تو یہ ہے کہ ستر آدمی جو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کوہ طور پر گئے تھے انہوں نے بھی رب تعالیٰ کا کلام براہ راست نہیں سنا، بلکہ موسیٰ علیہ السلام کے واسطے سے سنا۔ واللہ اعلم

﴿مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوهُ﴾ : ”ای فہموہ بعقولہم ولم یبق لہم فیہ ریبہ“ یعنی انہوں نے تحریف کی جب کہ انہوں نے اپنی عقلوں سے بھی سمجھ لیا تھا کہ یہ اللہ کا کلام ہے کسی بندے کا کلام نہیں

انکو اس میں ذرا بھی شک نہیں تھا۔

﴿وَهُمْ يَعْلَمُونَ﴾ : ”انہم مفتر و مبطون“ وہ یہ جانتے ہوئے تحریف کرتے تھے کہ ہمارا تحریف کرنا باطل ہے۔ اور رب تعالیٰ پر افتراء ہے کہ ہم اپنے کلام کو رب تعالیٰ کی طرف منسوب کر رہے ہیں۔ (از بیضاوی)

علامہ بیضاوی رحمہ اللہ کی تفسیر کے بعد اعلیٰ حضرت کا ترجمہ مختصر اور تمام تفسیر کو حاوی نظر آئے گا۔ ”اللہ کا کلام سنتے پھر سمجھنے کے بعد اسے داسنتہ بدل دیتے“ البتہ راقم نے لفظی ترجمہ پیش کرنے کی کوشش کی تاکہ دونوں ترجمے ملا کر طلباء کرام زیادہ فائدہ حاصل کر لیں۔

جو سنتے ہیں اللہ کے کلام کو پھر اس میں تبدیلی کر دیتے ہیں سمجھے کے بعد، حالانکہ وہ جانتے ہیں (کہ ہم غلط کر رہے ہیں)۔

﴿وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَا بِعُضُخُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ قَالُوا اتَّخَذُوا لَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَاجُّوكُمْ بِهِ عِنْدَ رَبِّكُمْ أَفَلَا تَعْقِلُونَ﴾ (آیت ۷۶)

(۱) ”اور جب مسلمانوں سے ملیں تو کہیں گے ہم ایمان لائے اور جب آپس میں اکیلے ہوں تو کہیں وہ علم جو اللہ نے تم پر کھول رکھا مسلمانوں سے بیان کئے دیتے ہو کہ اس سے تمہارے رب کے یہاں تمہیں پر حجت لائیں گے تمہیں عقل نہیں۔“

(۲) ”اور جب وہ ملتے ہیں ایمان والوں سے کہتے ہیں ہم ایمان لائے اور جب آپس میں اکیلے ہوں تو کہیں وہ علم جو اللہ نے تم پر کھول رکھا مسلمانوں سے بیان کئے دیتے ہو کہ اس سے تمہارے رب کے یہاں تمہیں پر حجت لائیں گے کیا تمہیں عقل نہیں۔“

مختصر مطلب : منافقین جب ایمان والوں سے ملتے تھے تو ان کو یہ کہتے تھے کہ ہم ایمان لائے ہیں

اور تمہیں حق سمجھتے ہیں اور جب علیحدگی میں وہ اپنے ہی دوسرے لوگوں کو ملتے تھے تو وہ ان کو کہتے کہ توراۃ میں جو اس نبی کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں۔ تم وہ اوصاف مومنوں کو کیوں بتاتے ہو وہ تو اللہ کے ہاں وہی حجت تم پر پیش کریں گے کہ یہ لوگ تو خود ہمیں ہمارے نبی کریم ﷺ کے اوصاف بتاتے تھے لیکن انہوں نے خلوص سے ایمان خلوص سے ایمان نہیں لایا۔ اس طرح تو تمہیں رب کے ہاں بہت بڑی ناکامی کا سامنا کرنا پڑے، تم عقل کیوں نہیں رکھتے، ایسا کیوں کرتے ہو، عقل مندی تو یہ ہے کہ ان کے اوصاف کو چھپا کر رکھو۔

نبی کریم ﷺ کے یہودی کی ایک قباحت کو پہلے ذکر کیا کہ ان پر ایمان لانے کی طمع نہ کرو وہ ایمان لانے والے نہیں اب ان کی دوسری قباحت کو ذکر کیا جا رہا ہے کہ وہ منافق ہیں۔
(۱) شان نزول: چند واقعات کے درپیش آنے کے بعد اس آیت کریمہ کا نزول ہوا۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ بیشک اہل کتاب میں سے منافقین جب نبی کریم ﷺ کے اصحاب کو ملتے تھے:

﴿قَالُوا آمَنَّا بِالَّذِي آمَنْتُمْ بِهِ وَنَشْهَدُ أَنَّ صَاحِبَكُمْ صَادِقٌ وَأَنَّ قَوْلَهُ حَقٌّ وَنَجِدُهُ وَصِفَتَهُ فِي كِتَابِنَا﴾

”تو کہتے تھے کہ ہم بھی اس ذات پر ایمان لائے ہیں جس پر تم نے ایمان لایا ہے۔ اور ہم گواہی دیتے ہیں کہ تمہارے صاحب (تمہارے نبی) سچے ہیں۔ اور بیشک ان کے ارشادات حق ہیں اور ہم ان کی نعتوں اور صفات کو اپنی کتاب میں پاتے ہیں۔“

اور وہ جب اپنے رئیسوں اور اپنے علماء کو علیحدگی میں ملتے تھے تو وہ ان کو نصیحت کرتے تھے کہ رب تعالیٰ نے توراۃ میں محمد (ﷺ) کی جو صفات واضح طور پر بیان کر دی ہیں تم ان صفات کا ذکر مومنوں سے کیوں کرتے ہو وہ تمہاری گواہی کو تمہارے ہی خلاف بطور حجت پیش کریں گے۔ تو ان کو بتا کر بے عقلی کا کام کر رہے ہو۔

”فان المخالف اذا اعترف بصحة التوراة واعترف بشهادة التوراة على نبوة محمد ﷺ فلا حجة اقوى من ذلك“

اس لئے کہ جب مخالفین نے یہ اعتراف کیا کہ توراۃ اللہ کی سچی کتاب ہے اور انہوں نے یہ بھی اعتراف کیا کہ توراۃ محمد ﷺ کی نبوت کی شہادت دے رہی ہے تو اس سے بڑھ کر نبی کریم ﷺ کی حقانیت پر کیا دلیل ہو سکتی۔

یہ دیکھ کر ان کو ان کے رئیسوں نے منع کیا، تو اس آیہ کریمہ کا نزول ہوا۔ (ازبیر)
(۲) اور شان نزول کی یہ وجہ ذکر کی گئی ہے: ابن جریج مجاہد سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بنی قریظہ کی طرف بھیجا انہوں نے نبی کریم ﷺ کو گالیاں دیں۔ آپ کی شان میں اذیت پہنچانے والے نازیبا الفاظ استعمال کئے۔ حالانکہ ان لوگوں کا نبی کریم ﷺ سے معاہدہ بھی تھا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب نبی کریم ﷺ کو بتایا تو آپ نے فرمایا اگر میں ان کی طرف گیا تو وہ خاموش ہو جائیں گے آپ ان کی طرف گئے اور ارشاد فرمایا:

”انقضم العهد یا اخوان القرۃ والخنازیر یا عبد الطاغوت
اخزاکم اللہ وانزل بکم نعمتہ“

اے بندرو اور خنزیر کے بھائیو! اے شیطان کے عبادت گزارو کیا تم نے وعدہ توڑ دیا
اللہ تعالیٰ تمہیں رسوا کرے گا اور تمہیں عذاب دے گا۔

چونکہ وہ جانتے تھے کہ نبی کریم ﷺ نے کسی مدرسہ میں نہیں پڑھا پھر ان کے آباء و اجداد کا بندر اور خنزیر بن جانا انہیں کیسے پتہ چلا۔

”فقالوا من اخبر بهذا الامر محمد اما خرج بهذا القول الامنکم“
وہ کہنے لگے محمد کو یہ کس نے بتایا؟ پھر خود ہی اپنے منافق ساتھیوں کو کہنے لگے یہ تم نے
ہی بتایا ہے تم کیوں بتاتے ہو وہ مسلمان تمہاری شہادت اور تمہارے بتانے کو ہی
تمہارے خلاف بطور حجت پیش کریں گے۔ (ماخوذ از قرطبی وابن کثیر)

﴿وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا﴾: ﴿لَقُوا﴾ اصل میں ”لقوا“ ہے
اس میں ضمیر یہود کی طرف لوٹ رہی ہے یعنی یہود جب ایمان والوں سے ملتے تھے تو کہتے ہم ایمان لائے
ہیں اس پر کہ بیشک تم حق پر ہو بیشک تمہارے رسول (ﷺ) کی بشارت توراۃ میں دی گئی ہے۔ (بیضاوی)
﴿وَإِذَا خَلَا بِعُضُومِهِمُ إِلَى بَعْضٍ﴾: ”ای اذا انفرد بعض المذكورین“ یعنی

جب بعض خلوت (علیحدگی) میں اپنے بعض رئیسوں کو ملتے یعنی کعب بن اشرف اور وہب بن یحیٰ ودا اور دوسرے سرکردہ رئیس علم والوں کو ملتے۔
(روح المعانی، مظہری)

﴿قَالُوا اتَّخَذُوا لَهُمْ سُلْطَانًا لِّمَا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ﴾: ﴿قَالُوا﴾ کی ضمیر ان یہود کی طرف لوٹ رہی ہے جو منافق نہیں تھے بلکہ خالص یہود تھے منافقین جب ان کے پاس جاتے تھے اور اپنے کارنامے بتاتے تو وہ ان کو بڑے پیارے اور میٹھے انداز پر ڈالتے تھے۔

﴿فَتَحَ﴾ کا معنی ہے ”ایذان بانہ سرمکتوم و باب مغلق“ پوشیدہ راز کو ظاہر کرنا اور بند دروازہ کو کھولنا ”فتح“ کا معنی ہے یہاں مراد ہے واضح طور پر کھول کر بیان کرنا۔

﴿اتَّخَذُوا لَهُمْ سُلْطَانًا لِّمَا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ﴾ کا مطلب علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے ان لفاظ سے بیان کیا:

”تخبرون المؤمنین بما بينہ الله تعالى لكم خاصة من نعت نبيه محمد ﷺ

او من اخذ العهد على انبياءكم بتصديقه ﷺ ونصرته“

کیا تم مومنوں کو خبر دیتے ہو جو اللہ تعالیٰ نے خاص کر کے تمہیں بتایا کہ یہ اوصاف ہیں

اس کے نبی محمد ﷺ کے اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں یہ بتایا کہ انبیاء کرام سے اس نے وعدہ لیا

ہے کہ جب میرے آخر الزمان نبی محمد ﷺ تشریف لائیں تو تم ان پر ایمان لان اور ان

کی امداد کرنا۔

”والاستفهام انکار“ ہمراہ برائے استفہام انکاری کے استعمال ہے یعنی تمہیں نہیں بتانا چاہئے۔

﴿لِيَحْجُوكُمْ بِهِ﴾: ”والمراد ليحتجوا به عليكم“ مراد اس کی یہ ہے کہ وہ تم پر تمہاری شہادت اور تمہارے اقوال کو حجت کے طور پر پیش کریں گے یعنی ان کے لئے یہ پختہ دلیل ہوگی۔

(از روح المعانی)

﴿عِنْدَ رَبِّكُمْ﴾: ”تمہارے رب کے ہاں“ یہ مختصر الفاظ گرامی کثیر معانی پر مشتمل ہیں:

(۱) ”انہم جعلوا محاجتہم به وقوله هو فی کتابکم“ وہ تمہارے اقوال کو حجت بنائیں

گے کہ یہ ارشادات تو تمہاری کتاب میں موجود ہیں۔

یعنی یہ کہنا ”ہو فی کتاب اللہ ہکذا“ یہ مسئلہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں اس طرح ہے یا یوں

کہا جائے ”وہو عند اللہ کذا بمعنی واحد“ یہ مسئلہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس طرح ہے ان دونوں قولوں کا مطلب ایک ہی ہے۔ لہذا ﴿عِنْدَ رَبِّكُمْ﴾ کہنے کا ان کا مطلب بھی یہی ہے کہ مسلمان حجت پیش کریں گے کہ یہ تو تمہاری کتاب میں موجود ہے جو اللہ کی کتاب ہے۔

(۲) رب تعالیٰ نے جن چیزوں کو لازم کیا کہ تم رسولوں کی اتباع کرو، ان میں حجت پیش کرنے کے متعلق ”تصح ان توصف بانھا محاجة فیہ لانھا محاجة فی دینہ“ یہ کہنا صحیح ہے کہ وہ رب تعالیٰ میں حجت پیش کر رہے ہیں۔ کیونکہ یہ حجت رب تعالیٰ کے دین میں ہے۔ اب ﴿عِنْدَ رَبِّكُمْ﴾ کا مطلب ”فی ربکم“ ہو گیا کہ وہ تمہارے رب کے بارے میں یعنی اس کے دین میں حجت پیش کریں گے۔

(۳) ”المراد بحاجوکم یوم القیامة“ یعنی اور مطلب ﴿عِنْدَ رَبِّكُمْ﴾ کا یہ ہے کہ وہ قیامت کے دن تم پر رب تعالیٰ کے ہاں حجت پیش کریں گے اس لئے کہ جب سوال کیا جائے گا کہ تم ایمان کیوں نہیں لائے تو تم نے اگر یہ کہا کہ ہمیں تو علم نہیں تھا تو یہ مسلمان کہیں گے کہ یہ تو ہمیں بھی بتاتے تھے کہ وہ سچے نبی ہیں۔ تو اس پر تمہیں زیادہ توبیخ (ڈانٹ ڈپٹ) کی جائے گی اور مخلوق کے سامنے تمہاری بہت زیادہ رسوائی ہوگی۔ حق کا اعتراف کر کے اسے چھپانا تو ایسا ہی ہے جیسا کہ انکار پر قائم رہنا ہے اس طرح تمام لوگ تمہاری منافقت کو اس وقت جان لیں گے جو تمہاری ذلت کا سبب بنے گا۔

اس تیسری صورت کے متعلق اگرچہ علامہ بیضاوری رحمہ اللہ نے یہ بیان کیا ”وفیہ نظر اذ الاخفاء لا یدفعھا“ شیخ زیادہ نے اس کی وضاحت کی ہے۔ جس کا مختصر خلاصہ یہ ہے کہ منافقین کو ان کے رئیس لوگ منع کرتے تھے کہ تم مسلمانوں کو اپنی کتاب کے بیانات سے مطلع نہ کیا کرو کہ وہ تم پر حجت پیش کریں گے اس حجت سے مراد دنیا کی خجست ہی ہو سکتی ہے کیونکہ وہ نصیحت کرنے والے علم والے حضرات تھے۔ ان کو یہ معلوم تھا کہ قیامت کے دن تو مسلمانوں نے ہمارے خلاف حجت پیش کرنی ہی کرنی ہے اس لئے مسائل کو چھپانے کا قیامت میں فائدہ نہیں ہوگا۔ لہذا اس سے مراد دنیا میں فائدہ ہی لیا جاسکتا ہے، اس لئے یہ وجہ ضعیف ہے۔

لیکن اس پر قاضی مظہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ بات قابل تسلیم ہے کہ وہ علم والے لوگ تھے

وہ یہ کیسے ان کو نصیحت کر سکتے تھے کہ مسلمانوں سے مخفی رکھوتا کہ قیامت کے دن رب کے حضور وہ تم پر حجت نہ پیش کریں جب ان کا مخفی رکھنا قیامت میں نفع مند نہیں ہو سکتا تھا تو ان کے رئیسوں نے ان کو یہ نصیحت بھی نہیں دی۔

اگرچہ بظاہر تو یہ سمجھ میں آتا ہے لیکن جب ان کی حماقت کو دیکھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ ضد اور حسد ان کو جہالت کے درجہ میں پہنچا دیتے تھے۔

”قالوا ما انزل الله على بشر من شئ“

انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ نے بشر پر کسی چیز کو نازل نہیں کیا۔

”مع ادعائهم بانزال التوراة على موسى“

باوجود اس کے کہ ان کا یہ بھی دعویٰ تھا توراة موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی۔

اس سے ہر شخص خود اندازہ کر سکتا ہے کہ وہ کتنے احمق تھے۔ اور غور کیا جائے تو واضح ہو جائے گا کہ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کے واضح معجزات کو دیکھنے کے بعد ایسے کام کئے اور ایسی باتیں کیں ”ما لا یقولہا الا مجنون“ جو سوائے پاگل کے کوئی نہیں کر سکتا۔

اسلئے واضح ہوا کہ وہ اگرچہ اصحاب علم تھے لیکن نبی کریم ﷺ کی مخالفت ضد اور آپ کے ساتھ حسد کرنے میں درجہ حماقت میں پہنچے ہوئے تھے یہی وجہ تھی کہ ان کا کلام ان کی جہالت پر دلالت کر رہا تھا۔
(از مظہری)

(۴) حجت پیش کرنے والے مختلف قسم کے ہوتے ہیں، بعض لوگوں کی غرض حجت پیش کرنے سے یہ ہوتی ہے کہ وہ مقابل شخص پر غلبہ حاصل کریں اور اس سے انہیں سرور حاصل ہو۔ اور بعض لوگوں کا حجت پیش کرنے کا مقصد دینی خدمت اور اچھی نصیحت کرنا ہوتا ہے۔ ان کا نقطہ نظر یہ ہوتا ہے کہ مقابل شخص کا عذر ختم ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کی حجت (دلیل) کو ہی وہ غالب سمجھے۔

یہود کے منافقین کو ان کے اصحاب علم علیحدگی میں کہتے کہ تم توراة کے مسائل مسلمانوں کو بتا دیتے ہو تو مسلمان ان کو ہی بطور دلیل تم پر پیش کریں گے اور تمہیں نصیحت کریں گے کہ تم تو ہمیں خود بتاتے تھے لہذا تمہیں ایمان لانا چاہیے۔ نصیحت کے طور پر حجت پیش کرنے والا یہ کہتا ہے۔

”قد ارجئت علیک عند الله واقمت علیک الحجة بین و بین ربی“

فان قبلت احسنت الی نفسک وان جحدت کنت الخاسر الخائب
تحقیق میں نے تم پر اللہ کے ہاں حکم ثابت کر دیا ہے۔ میں نے اپنے اور اپنے رب کے
درمیان (جو معاہدہ تھا نصیحت کرنے اور حجت پیش کرنے کا وہ) حجت تم پر پیش کر دی
اگر تم نے قبول کر لیا تو تمہارا اپنا بھلا اور اگر تم نے انکار دیا تو تمہارا اپنا نقصان۔

(۵) ﴿عِنْدَ رَبِّکُمْ﴾ کا مطلب ہے ”عند حکم ربکم وقضائکم“ وہ تم پر رب تعالیٰ
کے حکم اور قضاء (فیصلہ) کے مطابق حجت پیش کریں گے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا:
﴿فَاِذْ لَمْ یَأْتُوا بِالشَّہْدَاءِ فَاُولٰٓئِکَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْکَاذِبُوْنَ﴾
”(اس پر چار گواہ کیوں نہیں لائے) تو جب گواہ نہ لائے تو وہی اللہ کے نزدیک جھوٹے ہیں“
یہاں بھی یہ بیان کیا گیا ہے:

”فی حکم اللہ وقضائه لان القاذف اذا لم یات بالشہود لزمہ حکم
الکاذبین وان کان فی نفسه صادقا“

یعنی ”عند اللہ“ کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کے فیصلہ کے مطابق جھوٹے
ہیں کیونکہ تہمت لگانے والا شخص جب چار گواہ نہ پیش کر سکے تو اس پر جھوٹا ہونے کا حکم لگا دیا جاتا ہے
ہو سکتا ہے واقع میں وہ سچا ہی ہو۔
(ماخوذ از کبیر ہزبادة)

﴿اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾: ”تم عقل کیوں نہیں رکھتے“ یہ خطاب منافقین یہود کو ان کے رئیس علماء کی
طرف سے ہی ہے کہ وہ تم پر تمہارے رب کے ہاں حجت پیش کریں گے ”اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ اِنْ ذٰلِکَ لَا
یَلِیْقُ بِمَا اَنْتُمْ عَلَیْہِ“ تم عقل کیوں نہیں رکھتے، بیشک تم جو طریقہ اختیار کئے ہو وہ تمہارے لائق نہیں۔
اسی معنی کو علامہ رازی رحمہ اللہ نے بہتر قرار دیتے ہوئے یوں ذکر فرمایا:

”وهذا الوجه اظهر لانه من تمام الحکایة عنهم فلا وجه لصر فہ عنهم
الی غیرہم“

یہی معنی مراد لینا زیادہ واضح ہے کیونکہ اس سے پہلے ذکر کئے گئے واقعہ کی تکمیل ہو رہی ہے
لہذا جن لوگوں کا پہلے ذکر آ رہا ہے ان سے ہٹا کر اور طرف پھیرنا صحیح نہیں۔

واضح ہوا کہ ﴿اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ سے مراد مومن لینا اور یہ معنی کرنا کہ تم ان یہود کے ایمان پر
طمع کیوں کرتے ہو کیا تم عقل نہیں رکھتے واضح نہیں بلکہ سیاق و سباق سے ہٹ جاتا ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿أَوَلَا يَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ﴾ (۷۷)

(۱) ”کیا نہیں جانتے کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں۔“

(۲) ”کیا وہ نہیں جانتے کہ بیشک اللہ جانتا ہے جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں۔“

بیان قرآن کیا ہی ذیشان ہے: مختصر ذکر میں کتنی وسعت ایک ہی مضمون مختلف معانی پر مشتمل

ہے اس آیت کریمہ میں علماء یہود کا اس طرح ذکر ہے:

”ان اليهود كانوا يعرفون الله ويعرفون انه تعالى يعلم السرو العلانية

فخوفهم الله به“

کہ وہ تو اللہ تعالیٰ کی معرفت رکھتے تھے انہیں یہ معلوم تھا کہ اللہ تعالیٰ ہر ظاہر و باطن کو جانتا ہے۔

ان کو اللہ تعالیٰ نے خوف دلایا کہ تم جانتے ہوئے پھر یہ کیوں کہتے ہو کہ مسلمانوں کے سامنے نبی کریم ﷺ

کی جوشان بیان ہے اسے نہ بیان کرو تا کہ وہ تم پر رب کے ہاں حجت پیش نہ کریں۔ کیا رب خود نہیں جانتا

تم نبی کریم ﷺ کی شان میں صفات کو چھپانے کا مشورہ دے کر اپنی حماقت کا ثبوت پیش کر رہے ہو۔

اور اگر اس آیت کریمہ میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو رب تعالیٰ کی معرفت نہیں رکھتے تھے عزیر علیہ

السلام کو خدا کا بیٹا مانتے تھے تو اب مطلب یہ ہوگا:

”فرغهم بهذا القول في ان يتفكروا فيعرفوا ان لهم ربا يعلم سرهم

وعلايتهم وانهم لا يامنون حلول العقاب بسبب نفاقهم“

کہ ان کو رغبت دلائی گئی کیا وہ نہیں جانتے؟ انہیں جاننا چاہئے ان کو چاہئے کہ وہ تفکر کریں

اور پہچانیں کہ رب تعالیٰ ہر ظاہر اور باطن کو جانتا ہے۔ وہ منافقت کر کے رب تعالیٰ کے

عذاب سے اگر بچنا چاہیں تو بچ نہیں سکیں گے ان پر عذاب آ کر رہے گا۔ (از کبیر)

﴿إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ﴾

”یعنی ما اسروا من کفرهم بمحمد ﷺ وتکذیبهم به وهم یجدونه

مکتوبا عندهم“

یعنی وہ جو نبی کریم ﷺ سے کفر کرنے کو چھپا کر رکھتے ہیں اور نبی کریم ﷺ کی تکذیب کو

چھپا کر لکھتے ہیں حالانکہ وہ توراۃ میں پائے گئے ہیں ان کو چھپانے کا کیا فائدہ جب

رب تعالیٰ جانتا ہے۔

(ابن کثیر)

یعنی اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو وہ بعض کفریات کو پوشیدہ رکھتے، اور بعض کو ظاہر کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو وہ نبی کریم ﷺ کے اوصاف کو چھپاتے ہیں اور کلمات کی تحریف کو ظاہر کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے غضب اور عذاب کے جتنے اسباب ان کی طرف سے پائے جاتے ہیں خواہ وہ پوشیدہ رکھیں یا ظاہر کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کو جانتا ہے۔

(از مظہری)

مقصود واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ ان کے ظاہر اقوال و افعال کو جانتا ہے ان کے باطنی اقوال و افعال کو جانتا ہے تو ان کا چھپانا ان کو رب تعالیٰ کے عذاب سے نہیں بچا سکے گا۔

﴿وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلَّا أَمَانِيٍّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ﴾

(آیت نمبر ۷۸)

(۱) ”اور ان میں کچھ ان پڑھ ہیں کہ جو کتاب کو نہیں جانتے مگر زبانی پڑھ لینا یا کچھ اپنی من گھڑت اور وہ نرے گمان میں ہیں۔“

(۲) ”اور ان میں سے کچھ ان پڑھ ہیں جو نہیں جانتے کتاب کو مگر زبانی پڑھ لینا یا اپنی آرزو میں نہیں ہیں وہ مگر گمان میں۔“

اللہ تعالیٰ نے یہود کے عناد کا ذکر فرمایا اور ان کے ایمان لانے کی طمع نہ کرنے کو بیان فرمایا اور یہود کے چار فرقوں کا ذکر فرمایا:

”الفرقة الاولى هي الفرقة الضالة المضلة وهم الذين يحرفون الكلم عن مواضعه“

پہلا فرقہ جس کا ذکر فرمایا وہ ہے جو خود بھی گمراہ تھے دوسروں کو بھی گمراہ کرتے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ کی کتاب توراۃ میں اپنی مرضی سے تبدیلی کر لیتے تھے۔

”والفرقة الثانية المنافقون“ دوسرا فرقہ منافقین کا تھا جو ایمان والوں سے مل کر کہتے ہم ایمان لے آئے ہیں۔ اور کافروں سے مل کر کہتے ہم تمہارے ساتھ ہیں۔

”والفرقة الثالثة الذين يجادلون المنافقين“ اور تیسرا فرقہ ان میں سے وہ تھا جو منافقین کو یہ کہتے کہ تم توراۃ کے بیانات مسلمانوں پر کیوں واضح کرتے ہو۔

”والفرقة الرابعة هم المذكورون في هذه الآية“ اور چوتھا فرقہ وہ ہے جن کا ذکر اس آیت کریمہ میں ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جو جاہل تھے لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے کتاب یعنی توراۃ کو سمجھنے کی ان میں صلاحیت نہیں تھی وہ صرف کتاب کے الفاظ کو پڑھنا جانتے تھے معانی نہیں سمجھ سکتے تھے اور اپنی من گھڑت آرزوئیں رکھتے تھے وہ یقینی علم تو رکھتے نہیں تھے البتہ وہ صرف اپنا گمان رکھتے تھے جو غلط ہی ہوتا تھا۔

(از کبیر)

لیکن یہ بھی خیال رہے کہ یہود کا ایک فرقہ خوش قسمت لوگوں کا بھی تھا جو علم والے لوگ تھے کتاب کو پڑھنا بھی جانتے تھے اور سمجھتے بھی تھے، یہ حضرت عبداللہ بن سلام ؓ جو یہود کے بہت بڑے عالم تھے یہ اور ان کے ساتھی دولت ایمان سے مالا مال ہو گئے۔ علامہ رازی رحمہ اللہ نے چار باطل فرقوں کا ذکر فرمایا۔

تنبیہ: جو شخص اس آیت اور پہلی آیات میں غور و فکر کرے اور اسے پتہ چل جائے کہ یہود کے اتنے فرقے ہیں اور ان کی یہ یہ صفات ہیں پھر اس امت کی طرف توجہ کرے تو اسے وہی صفات ان میں بھی نظر آئیں گی۔

”فان فيهم من يعاند الحق ويسعى في اضلال الغير“

بیشک ان میں بھی کئی لوگ وہ ہیں جو خود بھی دین حق سے عناد رکھتے ہیں اور غیروں کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

”وفيه من يكون متوسطا“ کئی لوگ وہ ہیں جو متوسط ہوتے ہیں یعنی دین حق کے باغیوں سے جب ملتے ہیں تو ان کے ساتھ ہوتے ہیں اور کبھی علم والے اور حق والوں کے ساتھ ہوتے ہیں یہی سب سے زیادہ ملک و ملت کے لئے نقصان دہ ہوتے ہیں کیونکہ یہ نظر تو ”علم والے“ آتے ہیں لیکن ہوتے بکا و مال ہیں اور جی حضوری ہوتے ہیں۔ ان کا کام حاکموں کی خوشامد کے بغیر کچھ نہیں ہوتا۔ جو بھی حاکم آئے خواہ کتنا بڑا ظالم ہو خواہ بہت بڑا بے دین ہو۔ خواہ دین اسلام کو مٹانے کے درپے ہو خواہ

علماء کو دہشت گرد کہنے والا ہو، خواہ علماء کو صفحہ ہستی سے مٹانے کی تمنا رکھنے والا ہو، خواہ وہ یہودیوں اور عیسائیوں کا یار ہو یہ گروہ جی حضور یوں کا اسی کی تعریف کرے گا۔ یہ سب لوگ مل کر ”ہندو، مسلمان اور عیسائی“ ہیں سب بھائی بھائی، کے مصداق یک جہتی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

”و فیہم من یکون عامیا محضا مقلدا“ اور اس امت میں کئی لوگ عوام ہوتے ہیں جو مسائل سے مکمل طور پر بے خبر ہوتے ہیں وہ سنی سنائی باتوں پر کان دھرتے ہیں جیسا کسی نے کہا وہی مان لیا۔ کوئی اللہ والا مل گیا تو یہ بھی نیک ہو گیا اور کوئی گمراہ کرنے والا مل گیا تو یہ بھی گمراہ ہو گیا۔

اور اس امت میں جھوٹ بولنے والے، وعدہ کی مخالفت کرنے والے، امانت میں خیانت کرنے والے، اور غدر کرنے والے منافقوں کی علامت رکھنے والوں کی بھی کوئی کمی نہیں۔ (از کبیر بربادہ)

﴿وَمِنْهُمْ أُمِّيُونَ﴾: من تبعضیہ ہے ان میں سے بعض ان پڑھ ہیں چونکہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ یہود کے کئی فرقے تھے ان میں سے ایک فرقہ یہ تھا یہ مسئلہ ”من“ سے واضح ہوا۔

﴿أُمِّيُونَ﴾ جمع ہے ”امی“ کی۔ ”امی“ کا ایک معنی یہ ہے ”ہو من لا یقر بکتاب ولا رسول“ ”امی“ اسے کہتے ہیں جو کتاب اور رسول کا اقرار نہ کرے۔ دوسرا معنی یہ ہے ”من لا یحسن الکتابۃ والقراءۃ“ جو اچھے طریقہ سے لکھنا، پڑھنا نہ جانے۔

آیہ کریمہ میں یہی معنی معتبر ہے کہ وہ ”ان پڑھ“ تھے کیونکہ وہ اپنی کتاب اور اپنے رسول کا اقرار کرتے تھے اگرچہ ان کا اپنی کتاب پر ایمان نہیں، ایمان ہوتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لاتے۔ اسی دوسرے معنی پر ﴿لَا یَعْلَمُونَ الْکِتَابَ﴾ ”وہ کتاب کا علم نہیں رکھتے“ بھی دلالت کر رہا ہے۔

﴿لَا یَعْلَمُونَ الْکِتَابَ إِلَّا أَمَانًی﴾: ”امانی“ جمع ہے ”امنیۃ“ کی جو اصل میں ”امسنونۃ“ (افعولۃ) تھا۔ اصل میں اس کا ایک ہی معنی ہے اسے آگے کئی معانی لئے گئے۔ وہ اصل واحد یہ ہے ”ما تخیلہ الانسان فیقدر فی نفسہ وقوعہ“ انسان کسی چیز کے واقع ہونے کا خیال کرے کہ ایسا ہوگا تو اسے ”امنیہ“ کہا جاتا ہے۔

پھر اس کی دو صورتیں ہیں کبھی مطلب آرزو دلانا، یعنی دوسرے کو بتانا کہ میں اس کام کی توقع رکھتا ہوں۔ وہ آرزو رکھے کہ فلاں شخص نے یہ کام کرنا ہے۔ اسی معنی میں ”یعدہم و یمینہم“ استعمال

ہے۔ اور کبھی اس کا معنی ہوتا ہے آرزو رکھنا جیسا کہ ﴿تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ﴾ (یہ ان کی آرزوئیں ہیں) میں یہی معنی لیا گیا ہے۔ اسی اصل معنی کا اعتبار کرتے ہوئے ”امنیۃ“ کا معنی ”جھوٹ“ بھی لیا جاتا ہے کہ وہ بھی انسان اپنے نفس میں رکھتا ہے کہ میں یہ کہوں گا پھر وہ جھوٹ بولتا ہے۔

”والمروی عن ابن عباس ومجاهد ان الامانی هنا الا کاذیب ای
الا کاذیب اخذوها تقلیداً من شیاطین المحرفین“

حضرت ابن عباس اور حضرت مجاہد ؓ سے مروی ہے کہ اس آیت کریمہ میں جو ”امانی“ کا ذکر ہے اس کا معنی ہے ”ان کے جھوٹ“ اب مکمل مفہوم یہ ہو گیا کہ وہ کتاب کو نہیں جانتے سوائے جھوٹی باتوں کے جو انہوں نے اپنے تحریف کرنے والے شیطانوں سے حاصل کی ہیں۔

اور اسی اصل معنی کا اعتبار کرتے ہوئے یہ معنی لیا گیا ہے ”الاما یقرءون قراءۃ غاریۃ عن معرفۃ المعنی وتدبرہ“ یعنی وہ کتاب کو نہیں جانتے سوائے پڑھنے کے جو معنی سمجھنے اور اس میں تدبر سے خالی ہونے کے۔ آسان مطلب یہ تھا کہ وہ پڑھنا جانتے تھے لیکن سمجھنا نہیں جانتے تھے۔

صاحب کشف نے یہ بیان کیا ہے کہ یہ معنی بھی اصل معنی سے ہی ماخوذ ہے کہ جس طرح کوئی شخص کسی چیز کو دل میں رکھے اور تمنا کرے کہ یہ اس طرح حاصل ہو جائے ”وکذا لک القارئی یقدر ان کلمۃ کذا بعد کذا“ اسی طرح قاری جو کتاب کو سمجھنے سے قاصر ہو وہ بھی صاف یہی سوچتا رہتا ہے کہ یہ کلمہ ایسا ادا کرنا ہے اور اس کے بعد کلمہ ایسے ادا کرنا ہے۔

آجکل کے بیکار قاری صرف اچھی آواز سے قرآن پاک کے الفاظ کو سریلی آواز اور طرز و ادا سے پڑھنے والے جو معانی سے بے خبر ہوتے ہیں وقف کرنے کا پتہ نہیں ہوتا کہ کہاں مضمون ختم ہو رہا ہے وقف کرنا چاہئے اور کہاں وقف نہیں کرنا چاہئے ان کے لئے یہ لمحہ فکر ہے جو چیز قابل تعریف نہیں وہ اس پر ناز کر کے علماء کرام پر اعتراض کرتے رہتے ہیں یہ تو قرآن پڑھنا نہیں جانتے کاش ان جاہلوں کو کچھ سمجھ آئے۔

تنبیہ: جب ”امانی“ کا معنی آرزوئیں کیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ ”وہ کتاب کا علم نہیں رکھتے سوائے اپنی من گھڑت آرزوؤں کے“ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان کے من گھڑت اقوال کیا تھے۔

(۱) وہ یہ کہتے تھے کہ باقی انسانوں سے رب تعالیٰ کا تعلق یہ ہے کہ وہ اس کی مخلوق ہیں۔ اور اس کے عبادت گزار ہیں۔ رب تعالیٰ ان کا خالق اور معبود ہے:

”ما محبوب وپسر خواندہ ایم پس بر گناہی کہ از ما سرزد شود حق

تعالی بسبب فرط محبت از ما در گزر فرماید“

لیکن ہم تو اللہ تعالیٰ کے محبوب ہیں اور ہم اس کی اولاد سمجھے جاتے ہیں۔ لہذا ہم سے کوئی گناہ بھی سرزد ہوا تو اللہ تعالیٰ ہمیں بے پناہ محبت کی وجہ سے معاف کر دے گا۔

(۲) ہمارے آباء و اجداد عالی قدر انبیاء کرام تھے، ان کا رب تعالیٰ کے ہاں خصوصی مرتبہ ہے وہ اس کی مرضی کو تبدیل کر سکتے ہیں اگر بالفرض اللہ تعالیٰ نے ہمیں عذاب دینے کا ارادہ فرمایا:

”پدران ما را بجدو کد خلاص خوا بند کنانید“

تو ہمارے آباء و اجداد اپنی کوشش اور محنت سے ہمیں چھڑالیں گے۔

تنبیہ: اہل سنت مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ انبیاء کرام شفاعت فرمائیں گے رب تعالیٰ کے ہاں اپنے عجز کا اظہار کریں گے اور رب تعالیٰ ان پر اپنی خصوصی مہربانی فرماتے ہوئے ان کی سفارش کو قبول فرمائے گا۔ اور یہود کا عقیدہ یہ ہے کہ انبیاء کرام اپنی وجاہت سے رب تعالیٰ کو مرضی تبدیل کرنے پر مجبور کر دیں گے، یہ فرق واضح رہے کہ کوئی گستاخ انبیاء کرام ان کی شفاعت کو اور اہل سنت کے عقیدہ کو یہود کے عقیدہ سے تشبیہ نہ دے۔

(۳) وہ کہتے تھے بیشک یہود کا فر بھی کیوں نہ ہو جائیں رب تعالیٰ ان کو چالیس دنوں سے زیادہ عذاب نہیں دے گا وہ چالیس دن بھی اس لئے کہ ہمارے آباء و اجداد نے چالیس دن بچھڑے کی پوجا کی تھی۔

(۴) یہود کی شریعت قیامت تک واجب العمل ہے یہ کبھی منسوخ نہیں ہو سکتی۔ یہ ان کا صریح جھوٹ تھا کہ ان کی اپنی کتاب نبی کریم ﷺ کی شریعت کو ناسخ کہتی تھی۔

(۵) اور وہ یہ کہتے تھے کہ نبوت کی استعداد بنی اسرائیل میں سے صرف حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد میں پائی جاتی ہے۔ کسی اور خاندان میں نبوت کی استعداد ہی نہیں۔

یہ ان کی من گھڑت آرزوئیں اور خیالات باطلہ، اور جھوٹے اقوال تھے، بس یہی ان کے علم کے

محور تھا تورات کے حقیقی علم سے خالی تھے البتہ پڑھنا جانتے سمجھتے نہیں تھے اور من گھڑت احوال کو جانتے۔

(ماخوذ از کبیر، عزیزی، روح المعانی، کشاف)

اس وضاحت کے بعد اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی طرف غور کریں آپ نے دونوں معنی تحریر کر کے تفاسیر کا نچوڑ پیش کر دیا (جو کتاب کو نہیں جانتے مگر زبانی پڑھ لینا یا کچھ اپنی من گھڑت) راقم نے بھی اسی معنی کو نقل کیا ہے۔

﴿وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ﴾: ”نہیں ہیں وہ مگر گمان میں“ یعنی ان کو یقینی علم حاصل نہیں تھا بلکہ ان کا علم ظنی تھا جن کا علم قطعی اور یقینی نہ ہو ان کو ایمان کیسے حاصل ہوتا ایمان کی دار و مدار تو علم یقینی پر ہے۔

فائدہ: آیہ کریمہ سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ معارف (علمی مسائل) تمام کبھی ہیں۔ ضروری (بدیہی) نہیں۔ اسی لئے علم نہ حاصل کرنے والے صرف گمان سے بیان کرنے والے کی مذمت کی گئی۔

☆ اور یہ فائدہ حاصل ہوا ”بطلان التقليد مطلقاً وهو مشكل لان التقليد في الفروع جائز عندنا“ اگرچہ بظاہر مطلقاً تقلید کا باطل ہونا سمجھ میں آ رہا ہے حالانکہ یہ کہنا خود باطل ہے کیونکہ تقلید اصول میں (یعنی اعتقادات میں) منع ہے فروع میں جائز ہے یہی ہمارا مذہب ہے۔

خیال رہے یہود جو کہ جاہل تھے اور علماء کی تقلید کرتے تھے ان کی مذمت صرف اسی وجہ سے کی گئی کہ وہ باطل عقائد ان سے حاصل کر کے گمراہ ہو گئے۔

☆ اور فائدہ یہ حاصل ہوا کہ گمراہ کرنے والا اگرچہ برا انسان ہے۔ لیکن گمراہ کرنے والے کے جال میں پھنس کر گمراہ ہونے والا صحیح عقائد بیان کرنے والے کی بات کو نہ تسلیم کرنے والا بھی برا انسان ہے۔ اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے گمراہ کرنے والے اور گمراہ ہونے والے دونوں کی ہی مذمت بیان کی۔

☆ اور فائدہ یہ حاصل ہوا ”ان الاكتفاء بالظن في اصول الدين غير جائز“ اصول دین میں یعنی اعتقادات میں صرف ظن (گمان) پر اکتفاء کرنا جائز نہیں بلکہ یقینی علم حاصل ہونا چاہئے۔

(از کبیر)

﴿فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَذَا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا فَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا يَكْسِبُونَ﴾

(آیت ۷۹)

(۱) ”تو خرابی ہے ان کے لئے جو کتاب اپنے ہاتھ سے لکھیں پھر کہہ دیں یہ خدا کے پاس سے ہے کہ اس کے عوض تھوڑے دام حاصل کریں تو خرابی ہے ان کے لئے ان کے ہاتھوں کے لکھے سے اور خرابی ان کے لئے اس کمائی سے۔“

(۲) ”تو ہلاکت ہے ان لوگوں کے لئے جو لکھتے ہیں کتاب اپنے ہاتھوں سے، پھر کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ حاصل کریں اس کے بدلے تھوڑا مال تو ہلاکت ہے ان کے لئے اس سے جو ان کے ہاتھوں نے لکھا، اور ہلاکت ہے ان کے لئے اس سے جو وہ کسب کرتے ہیں۔“ اس آیت کریمہ میں یہود کی ایک اور قسم کا ذکر کیا جا رہا ہے جو دوسرے لوگوں کو گمراہی کی دعوت دیتے تھے، اور جھوٹ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرتے، اور لوگوں کا مال باطل طریقہ سے کھاتے ہیں۔

(ابن کثیر)

یہ لوگ توراۃ کی تحریف کر کے نبی کریم ﷺ کے اوصاف کو بدل کر اور توراۃ کے احکام کو بدل کر اپنی طرف سے اپنے ہی ہاتھوں سے لکھ کر یہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہی ارشاد فرمایا ہے ان کی تحریف کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس کے بدلے دنیاوی نفع کچھ حاصل کر لیتے تھے تو رب تعالیٰ نے ان کے اس فعل اور ان کی لکھی ہوئی کتاب اور ان کی کمائی کے لئے لفظ ویل ذکر کیا جس کی تفصیل تو ان شاء اللہ قریب ہی آرہی ہے مختصر مطلب یہ ہے کہ ان کے لئے خرابی ان کے لئے بربادی ہے ان کے لئے ہلاکت ہے۔

﴿فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ﴾

”والویل الہلاک والدمار وہی کلمۃ مشہورۃ فی اللغۃ“

”ویل“ کالغت میں مشہور معنی ”ہلاک ہو جانا، برباد ہو جانا۔“

ایک لفظ کثیر معانی پر مشتمل ہے:

☆ "عن ابی عیاض ویل صدید فی اصل جہنم" ابو عیاض فرماتے ہیں جہنم کی گہرائی اور اس کی تہ میں پیپ کی ایک وادی ہے جسے ویل کہا جاتا ہے۔ (ابن کثیر)

☆ "وقال عطاء بن یسار الویل واد فی جہنم لو ارسلت فیہ الجبال لذابت من حرة" (شیخ زادہ)

عطاء بن یسار کہتے ہیں ویل جہنم میں ایک وادی کا نام ہے اگر اس میں پہاڑوں کو ڈال دیا جائے تو وہ بھی اس کی گرمی کی وجہ سے پگھل جائیں۔

☆ "وروی عن ابی سعید الخدری ان النبی ﷺ قال ویل واد فی جہنم یھوی فیہ الکافر اربعین خریفا قبل ان یبلغ قعرہ"

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا ویل جہنم میں ایک وادی کا نام ہے (وہ اتنی زیادہ گہری ہے کہ) اس میں کافر کو جب پھینکا جائے گا تو وہ اس کی تہ میں چالیس سال تک پہنچے گا۔ (از شیخ زادہ)

علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے ان معانی کے بغیر اور مزید معانی بیان کئے ہیں۔

☆ "وعن ابن عباس الویل المشقة من العذاب"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ عذاب سے جو مشقت برداشت کرنی پڑتی ہے اسے ویل کہا جاتا ہے۔

☆ "وقال الخلیل الویل شدة الشر" خیل کہتے ہیں شر کی شدت کو بھی ویل کہا جاتا ہے۔

☆ "قال الاصمعی الویل تفجع" اصمعی نے کہا جزع فزع کو ویل کہا جاتا ہے۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ نے کچھ اور معانی بھی تحریر فرمائے ہیں۔

☆ ابن جریر نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے نقل فرمایا کہ جہنم میں آگ کا ایک پہاڑ ہے اسے "ویل" کہا جاتا ہے۔ یہ وہی پہاڑ ہے جس پر ان یہود کو رکھا جائے گا جنہوں نے اللہ تعالیٰ

کی کتاب میں تحریف کی۔

☆ بزار وابن مردویہ نے سعد بن ابی وقاص سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جہنم میں آگ کا ایک بہت بڑا پتھر ہے جس کو ”ویل“ کہا گیا ہے اس پر بے دین چوہدریوں اور بے ایمان جماعت کے لیڈروں کو کبھی اوپر چڑھایا جائے گا اور کبھی نیچے اتارا جائے گا۔ (از عزیز)

تمام معانی کا مطلب ایک ہے: ”ویل“ جہنم میں ایک وادی کا بھی نام ہے جس کی گہرائی تک پہنچنے میں چالیس سال درکار ہوں گے۔ اس وادی میں جہنم والے لوگوں کی پیپ ہوگی، اس وادی میں اتنی شدید حرارت ہوگی کہ اس میں پہاڑ بھی پگھل جائیں گے۔

اور جہنم کے شعلے مارنے والی آگ کی بلندی ایک پہاڑ اور ایک بڑے پتھر یعنی چٹان کی طرح نظر آئے گی۔ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں تحریف کرنے والوں کو کبھی بلندی تک پہنچایا جائے گا اور کبھی نیچے پھینکا جائے گا اس عذاب کی وجہ سے انہیں شدید مشقت اٹھانی پڑے گی۔ یہ عذاب ان کے لئے شدید شر کا سبب ہوگا۔ یہ ان کے لئے غم بڑھانے والا ہوگا، جس میں وہ جزع و فزع کریں گے۔ یہ شدید عذاب ان کے لئے خرابی اور بربادی کا سبب ہوگا۔

راقم کی اس توجیہ میں تمام معانی سمٹ کر ایک جگہ جمع ہو گئے کسی غیر مسلم، بے دین کو یہ کہنے کی جرات نہیں ہو سکے گی کہ تمہارے قرآن اور تمہاری احادیث میں تعارض پایا جاتا ہے۔ تعارض نہیں صرف جہالت سمجھنے میں رکاوٹ کا سبب ہے۔

﴿ثُمَّ يَقُولُونَ هَذَا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ﴾: ”پھر کہتے یہ اللہ کی طرف سے ہے“ وہ لوگ دو وجہ سے گناہ کے مرتکب ہو رہے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی کتاب اپنی طرف سے اس طرح کی عبارت اس کتاب کی عبارت سے ملا کر لکھنا کہ جس کو عام انسان اللہ تعالیٰ کی کتاب کا حصہ ہی سمجھے یہ بھی حرام اور گناہ کبیرہ کا سبب ہے۔ پھر دوسرا ان کا جھوٹ اور افتراء کہ یہ کلام رب تعالیٰ کا ہے یہ پہلے جرم سے بھی عظیم جرم تھا۔

انہوں نے تبدیل کیا: اگرچہ وہ توراۃ کے کئی احکام کو بھی اپنے مرضی کے مطابق تبدیل کرنے کے مجرم ہوئے تھے لیکن سب سے بڑا ظلم انہوں نے یہ کیا تھا کہ نبی کریم ﷺ کے جو اوصاف توراۃ میں ذکر تھے ان کو انہوں نے تبدیل کر دیا تھا، ان کا خیال تھا کہ ہمارے اس طریقہ سے لوگ کم تعداد میں اسلام قبول کریں گے۔ انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ جسے رب تعالیٰ بڑھانا چاہے اسے دنیا کی کوئی طاقت گھٹا نہیں سکتی۔

آج کل یہ سازش زور و شور سے چل رہی ہے کہ نبی کریم ﷺ کو ایک عام انسان کی حیثیت میں پیش کرو کہ محبت مصطفیٰ ﷺ کی وجہ سے لوگ جوتن، من، دھن کی بازی لگا دیتے ہیں اس میں کمی آجائے یہ غیر مسلموں کو معلوم ہے کہ سچا اور حقیقی مسلمان محبت مصطفیٰ ﷺ کا متوالا ہوتا ہے، وہ آپ کے نام پر جان قربان کرنا ایمان کا حصہ سمجھتا ہے۔

یہود و نصاریٰ اور ان کے ایجنٹ آج کل اس کوشش میں ہیں کہ اس میں کمی ہو جائے وہ بد بخت نہیں سمجھتے کہ رب تعالیٰ نے فرمادیا ہے:

﴿وَلِلْآخِرَةِ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْأُولَىٰ﴾

”اے محبوب آپ کی ہر آنے والی گھڑی پہلی سے بہتر ہے“

جسے رب تعالیٰ نے بڑھانے کا وعدہ فرمادیا اسے یہ گھٹانے کی فکر میں ہیں۔ ان کم بختوں کو یہ بھی معلوم نہیں ہو رہا کہ ہمارا باپ جب پہلے حاکم تھا اس وقت سے وہ کوشش کر رہا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی شان کو نام نہاد مسلمانوں کے ذریعے ہی کم کیا جائے، لیکن ایک دفعہ تو وہ دفعہ ہو گیا شان مصطفیٰ ﷺ بڑھتی چلی گئی، لیکن آج کل اس نے اپنے چیلے اور اپنی ذریت معنوی ماڈرن لوگوں کو بنایا ہوا ہے جن میں زیادہ زندیق، دہریے اور قادیانی ہیں۔ لیکن ایک مرتبہ خود ان بکا و مال لوگوں کا باپ اپنی تباہی کا شکار ہو چکا ہے۔ لیکن اس کی ذریت معنوی اس کی پشت پناہی کر رہی ہے۔

مقام افسوس یہ ہے کہ کافر سارے کے سارے ایک ہیں ”الکفر ملة واحدة“ کا کامل مصداق ہیں، لیکن مسلمان بھی کافروں کا ساتھ دے رہے ہیں اور یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم عالمی برادری

کے ساتھ ہیں ہم یک جہتی کا مظاہرہ کر رہے ہیں خیر اس میں زیادہ تعجب اس لئے نہیں کہ قانون یہ ہے ”کل شئی یرجع الی اصلہ“ ہر چیز اپنے اصل کی طرف لوٹتی ہے۔ اس لئے ذریت معنوی اپنے محسن باپ کی رقوم کا حق ادا نہ کرے تو اور کون کرے گا۔

﴿لِیَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا﴾: ”تا کہ وہ حاصل اس کے بدلے تھوڑا ثمن“ اشتراء کا معنی خریدنا ہے لیکن یہاں اس کا معنی ہے تبدیل کرنا، حاصل کرنا اور ”ثمن“ کسی چیز کی قیمت جو بیچنے اور خریدنے والے کے درمیان طے ہو جائے یہاں مطلقاً اس سے مراد مال ہے۔ یعنی وہ دنیاوی مقاصد کے پیش نظر دنیا کا گھٹیا مال لے کر کتاب کی تحریف کرتے تھے۔

”وہو ان جل اقل قليل بالنسبة الی ما استوجبوه من العذاب الدائم

وحرموه من الثواب المقیم“

ذکر کیا گیا ہے کہ وہ قلیل مال لیتے تھے۔ دنیا کے لحاظ پر اگرچہ زیادہ مال بھی لے لیا

جائے، لیکن وہ نسبت دائمی عذاب کے مستحق ہونے اور ہمیشہ کے ثواب سے محروم

ہونے کے گھٹیا ہی متصور ہوگا۔

(از روح المعانی)

﴿فَوَيْلٌ لَهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ﴾: ”تو خرابی ہے ان کے ہاتھوں کے لکھے سے“

﴿وَوَيْلٌ لَهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُونَ﴾: ”اور خرابی ان کے لئے اس کمائی سے“

”واما معنی فلان العبد انما یستحق الویل والعقاب لا جل فعله

وکسبه وهو الکسب والکسب ههنا لا لاجل ذات المکتوب

والمسکوب“

یعنی وہ خرابی اور ہلاکت کے مستحق اپنے فعل یعنی اللہ کی کتاب میں اپنی طرف سے

عبارات کو لکھنے کی وجہ سے ہوئے اور اسی طرح اپنی طرف سے تحریف کر کے اس پر مال

لینے کی وجہ سے خرابی کے مستحق ہوئے۔

نکتہ: ایک دفعہ ویل ذکر کے صرف معطوف اور معطوف علیہ کی صورت میں باقی جملے ذکر

نہیں فرمائے بلکہ تین مرتبہ علیحدہ علیحدہ ”ویل“ ذکر کر کے اشارہ کیا کہ ان کے تین جرم علیحدہ علیحدہ تھے

ہر جرم بذاتہ خود ہی بہت بڑا جرم تھا تین نے مل کر ان کو ایمان سے کتنا ہی دور کر دیا۔

اللہ تعالیٰ کی کتاب میں اپنی طرف سے ان کا عبارات کو شامل کرنا ایک جرم تھا۔ پھر اس کو رب تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا دوسرا جرم تھا کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ اور پھر اس کے ذریعے رشوت لینا حرام طریقہ سے مال جمع کرنا اور ہی جرم تھا۔

فلذلك ذكر الله تعالى لهم ثلاثة ويلات كل ويل بمقالة ذنب

اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے تین مرتبہ ”ویل“ ذکر فرمایا یعنی ہر گناہ کے مقابلہ میں ”ویل“ ذکر کیا تین گناہ اور تین ”ویل“۔

(از شیخ زادہ)

اب اس شیخ زادہ رحمہ اللہ کی تفسیر کے بعد اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر ایک نظر پھر کریں۔ تینوں کا علیحدہ علیحدہ نمایاں طور پر فرق ترجمہ سے انشاء اللہ نظر آئے گا۔

مسئلہ: قرآن پاک میں بطور تفسیر عربی الفاظ، یا احادیث مبارکہ کو اس طرح لکھنا کہ قرآن پاک اور غیر قرآن کا فرق نظر نہ آئے ناجائز ہے۔ اسی لئے عربی تفاسیر میں قرآن پاک کے الفاظ مبارکہ پر لکیر کھینچ دی جاتی ہے۔ یا ان کو بریکٹ میں لکھ دیا جاتا ہے۔ یا ان کی لکھائی کا رنگ مختلف کر دیا جاتا ہے۔

فائدہ جلیلہ: عبدالرزاق اور ابن ابی داؤد نے عبداللہ بن شقیق عقیلی سے روایت بیان کی:

”كان اصحاب رسول الله ﷺ يشددون في بيع المصاحف ويرونه

عظيما“

رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام قرآن پاک کے نسخوں کو بیچنے سے ممانعت میں شدت اختیار فرماتے تھے اور اسکے بیچنے میں بہت ناپسندیدگی کا اظہار کرتے تھے۔

حضرت امام زین العابدین رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ صحابہ کرام کے زمانہ میں قرآن پاک کے نسخوں کو بیچنے کا رواج نہیں تھا۔ بلکہ طریقہ یہ رائج تھا کہ اگر کسی کو قرآن پاک کے نسخے کی ضرورت درپیش آتی تو وہ لکھنے کا تمام سامان مہیا کر کے مسجد کے منبر کے پاس آ کر بیٹھ جاتا۔ اور دوسرے احباب کو کہتا کہ آپ قرآن پاک کے لکھنے میں میری امداد کریں۔ جو شخص بھی لکھنا جانتا ہوتا وہ اس کے لکھنے میں امداد کرتا

اس طرح بہت سے آدمیوں کے مل کر لکھنے کی وجہ سے قرآن پاک کا نسخہ چند دنوں میں تیار ہو جاتا۔

اول این بدعت در آخر زمان معاویہ بن ابی سفیان رائج شدہ

قرآن پاک کی نسخے لکھ کر بیچنے کی بدعت سب سے پہلے حضرت امیر معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما کے زمانہ میں جاری ہوئی۔

”لیکن این بدعت حسنہ است بدعة سیئہ نیست“

لیکن یہ اچھی بدعت ہے جو جائز ہے بلکہ مستحسن اور مستحب ہے اس بدعت کو ناجائز کہنا جہالت ہوگا۔

بات بات پر بدعت بدعت کہنے والوں کو چاہئے کہ وہ قرآن پاک کے طبع شدہ نسخے خرید کر بدعت کے مرتکب نہ ہوں بلکہ اپنے ہاتھوں سے قرآن پاک لکھ کر پڑھا کریں۔ یہ کون سا طریقہ ہے جو جی میں آئے وہ جائز ہو جائے اور جی میں نہ آئے وہ ناجائز ہے۔

قرآن پاک کا نسخہ بیچنے کے جواز پر اجماع امت ہے:

جب علماء نے غور کیا، تحقیق کی کہ اگر کوئی شخص قرآن پاک لکھ کر وہ نسخہ بیچ دیتا ہے تو اس میں حرام ہونے کی تو کوئی وجہ نہیں۔ ”واجماع بر جواز آن متحقق گشت“ تو اس کے جواز پر اجماع متحقق ہو گیا۔

تنبیہ: زیر بحث آیت کریمہ سے یہ ثابت کرنا ممکن نہیں کہ قرآن پاک کے نسخے تیار کر کے بیچنا یہود کی مشابہت ہے کیونکہ یہود تو اللہ کی کتاب میں اپنی طرف سے عبارات کو شامل کر کے کہتے تھے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے ان کا یہ فعل تو کفر تھا۔

لیکن کوئی مومن نہ اس طرح کی جرات کر سکتا ہے اور نہ ہی اس کے متعلق سوچ سکتا ہے حقیقت تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی حفاظت خود اپنے ذمہ کرم پر کی ہے اس لئے یہود و نصاریٰ کی کوئی کوشش بھی قرآن پاک کو تبدیل کرنے کی تاقیامت کامیاب نہیں ہو سکے گی۔

☆ قرآن پاک کے نسخے تیار کر کے بیچنے کے متعلق ابن ابی داؤد نے روایت کی کہ حضرت ابن عباس

اور محمد بن حنفیہ سے سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا ” لا باس انما یاخذون اجور ایدیہم “ کوئی حرج نہیں وہ اپنے ہاتھوں کی کمائی کی اجرت حاصل کر رہے ہیں۔

☆ ایک اور قول محمد بن حنفیہ نے بیان کیا ہے کہ علماء نے کہا ہے ” لا باس انما بیع الورق وعمل یدیہ “ کہ کوئی حرج نہیں بیشک یہ اوراق کی بیع ہے اور ہاتھوں کی کمائی ہے۔

☆ حضرت امام محمد باقر سے روایت ہے ” لا باس بشراء المصاحف وان يعطى الاجر على كتابتها “ کہ قرآن پاک کے لئے خریدنے اور ان کی کتابت پر اجرت دینے میں کوئی حرج نہیں۔

(از عزیز)

راقم کا موقف اس میں یہ ہے کہ ابتدائی طور پر نبی کریم ﷺ کے زمانہ اور صحابہ کرام کے دور میں تقویٰ کے طور پر قرآن پاک کے نسخے تیار کر کے نہیں بیچے جاتے تھے اسی تقویٰ کے پیش نظر متقدمین میں سے بعض حضرات نے پسند نہیں کیا تھا، لیکن جب یہ دیکھا گیا کہ لوگ اب سست ہوتے جا رہے ہیں قرآن پاک کے نسخے تیار کرنے میں ایک دوسرے کی معاونت نہیں ہو رہی تو بطور محنت و مزدوری کے تیار کرنے میں کوئی وجہ ناجائز نہ ہونے کی پا کر جواز کا قول کیا گیا۔

اس لئے یہ کہنا کہ پہلے بلا تحقیق اور مسئلہ کی طرف توجہ کرنے کے بغیر عدم جواز کا فتویٰ دیا گیا پھر تحقیق کر کے جواز کا فتویٰ دیا گیا یہ کوئی مناسب قول نہیں اور سلف صالحین متقدمین صحابہ کرام اور تابعین کے متعلق یہ کہنا کسی حد تک مناسب نظر نہیں آتا۔

☆☆☆☆☆

﴿ وَقَالُوا لَنْ تَمْسَنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَةً ۖ قُلْ أَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللَّهِ عَهْدًا فَلَنْ يُخْلِفَ اللَّهُ عَهْدَهُ ۚ أَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴾

(آیت ۸۰)

- (۱) ”اور بولے ہمیں تو آگ نہ چھوئے گی مگر گنتی کے دن تم فرما دو کیا خدا سے تم نے کوئی عہد لے رکھا ہے جب تو اللہ ہر گز اپنا عہد کا خلاف نہ کرے گا یا خدا پر وہ بات کہتے ہو جس کا تمہیں علم نہیں۔“
- (۲) اور انہوں نے کہا ہر گز ہمیں نہیں چھوئے گی آگ مگر چند دن فرما دیجئے کیا تم نے لیا ہے اللہ سے عہد پھر تو ہر گز نہیں کرے گا اللہ اپنے عہد کا بلکہ تم کہتے ہو اللہ پر وہ بات جو تم نہیں جانتے۔“

شان نزول: نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے یہود کے مختلف اقوال کے بعد یہ آیت نازل ہوئی ان کے اقوال تمام باطل تھے۔

(۱) ”قال ابن عباس قالت اليهود مدة الدنيا سبعة آلاف سنة وانا نعذب بكل الف سنة يوما ثم ينقطع عنا العذاب بعد سبعة ايام“ (خازن)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں یہود (کبھی تو یہ) کہتے تھے کہ دنیا کی کل مدت سات ہزار سال ہے اور ہمیں ہر ہزار سال کے بدلے ایک دن عذاب دیا جائے گا۔ یعنی ہمیں کل سات دن عذاب دیا جائے گا پھر ہم سے عذاب کو اٹھا لیا جائے گا۔

(۲) ”روى الضحاك عن ابن عباس رضى الله عنهما ان اليهود زعمت انهم وجدوا فى التوراة ان ما بين طرفى جهنم سيرة اربعين سنة الى ان ينتهوا الى شجرة الرقوم وانهم يقطعون فى كل سيرة سنة فيكملونها“ (ابو السعود)

ضحاک حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ بیشک یہود (کبھی یہ) گمان کرتے تھے کہ انہوں نے توراۃ میں یہ پایا ہے کہ جہنم کی دونوں طرفوں میں چالیس سال کی راہ ہے چالیس سال کی مسافت کے بعد جہنم والے تھوہر کے درخت کے پاس پہنچیں گے۔ لیکن ہم وہ چالیس دنوں میں مسافت طے کر لیں گے۔

(۳) ”وقال قتاده وعطاء يعنون اربعين يوما التي عبد فيها آباؤهم العجل“

قتادہ اور عطاء فرماتے ہیں کہ یہود (کبھی تو یہ کہتے تھے) کہ ہم تو سمجھتے ہیں کہ ہمیں صرف چالیس دن عذاب ہوگا وہ بھی اس لئے کہ ہمارے آباء واجداد نے چالیس دن پچھڑے کی پوجا کی تھی۔

(۴) ”وقال الحسن وابو العالیة قالوا ان ربنا عقب علينا في امر فاقسم ليعذبنا اربعين يوما فلن تمسنا النار الا اربعين يوما تحلة القسم“

حضرت حسن اور ابو العالیہ کہتے ہیں بیشک ہمارے رب نے ہم پر کسی معاملہ میں عتاب فرمایا پھر قسم اٹھادی کہ وہ ہمیں چالیس دن عذاب دے گا۔ بس وہی چالیس دن تک رب تعالیٰ ہمیں عذاب صرف اس لئے دی گا تا کہ اس کی قسم پوری ہو جائے۔ (مظہری)

(۵) ”قيل ان النبي ﷺ قال لليهود من اهل النار ، قالوا نحن ثم تخلفونا انتم فقال كذبتهم لقد علمتم انا لا نخلفكم“

ایک قول یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک مرتبہ یہود کو کہا کہ جہنم میں کون جائے گا تو انہوں نے کہا کہ ہم جائیں گے (لیکن ہم تو بہت تھوڑے دن رہیں گے) پھر ہمارے پیچھے تم جہنم میں جاؤ گے (معاذ اللہ) (اور پھر تم جہنم میں ہمیشہ رہو گے) تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا تم جھوٹے ہو، تمہیں علم حاصل ہے کہ ہم تمہارے بعد جہنم میں نہیں جائیں گے۔ (قرطبی)

یہی قول ان کا تفسیر ابن کثیر میں وضاحت سے مذکور ہے:

”عن ابی ہریرۃ قال لما فتحت خیر اھدیت لرسول ﷺ شاة فیھا سم فقال رسول اللہ ﷺ اجمعوا لی من کان من الیھود ہھنا فقال لھم رسول اللہ ﷺ من ابوکم قالوا فلان قال کذبتہم بل ابوکم فلان فقالوا صدقت وبررت ثم قال لھم هل انتم صادقی عن شئی ان سالتکم عنہ قالوا نعم یا ابا القاسم قالوا نعم یا ابا القاسم وان کذبناک عرفت کذبنا کما عرفته فی ابنا فقال لھم رسول اللہ ﷺ من اهل النار فقالوا نکون فیھا یسیرا ثم تخلفونا فیھا فقال لھم رسول اللہ ﷺ اخیسوا واللہ لا نخلفکم فیھا ایدا ثم قال لھم رسول اللہ ﷺ هل انتم صادقی

عن شئی ان سألتکم عنه قالوا نعم یا ابا القاسم قال هل جعلتم فی هذه الشاة سما فقالوا نعم قال فما حملکم علی ذلك فقالوا اردنا ان کنت کاذبا ان نستریح منک وان کنت نبیا لم یضرک

(رواه الامام احمد والبخاری والنسائی من حدیث اللیث بن سعد بحوالہ اب کثیر)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جب خیر فتح ہوا تو رسول اللہ ﷺ کو ایک بکری (کا گوشت) حد یہ کے طور پر دی گئی جس میں زہ ملا دیا گیا تھا۔ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا یہود کو میرے پاس جمع کرو (جب وہ جمع ہو گئے) تو نبی کریم ﷺ نے ان سے پوچھا تمہارا باپ کون ہے؟ انہوں نے کہا فلاں آپ نے فرمایا تم نے جھوٹ بولا ہے تمہارا باپ فلاں ہے انہوں نے کہا تم نے سچ کہا ہے تم نے درست کہا ہے پھر آپ نے ان کو کہا کہ اگر میں تم سے ایک سوال کروں تو کیا تم مجھے سچ بتاؤ گے، انہوں نے کہا اگر ہم نے جھوٹ بولا تو اے ابوالقاسم آپ کو ہمارے جھوٹ کا پتہ چل جائے گا جیسا کہ تمہیں ہمارے باپ کے متعلق پتہ چل گیا ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا (جہنم کی) آگ میں کون جائیں گے وہ کہنے لگے ہم تھوڑی دیر کے لئے جائیں گے پھر تم ہماری جگہ جاؤ گے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا دفعہ ہو جاؤ، قسم ہے اللہ تعالیٰ کی ہم تمہاری جگہ کبھی نہیں جائیں گے پھر آپ نے ان سے پوچھا کہ میں تم سے سوال کروں تو تم کیا اس کا سچا جواب دو گے؟ انہوں نے کہا ہاں اے ابوالقاسم، آپ نے فرمایا کیا تم نے اس بکری (کے گوشت) کو زہرا لود کیا؟ انہوں نے کہا ہاں آپ نے فرمایا ایسا کرنے پر تمہیں کس چیز نے برا بھلا کیا؟ وہ کہنے لگے ہم نے ارادہ کیا کہ اگر تم جھوٹے ہوئے تو ہمیں تم سے راحت حاصل ہو جائے گی اور اگر تم سچے نبی ہوئے تو تمہیں یہ زہر کوئی نقصان نہیں دے گا۔

یہود کے ان تمام لغو، بیہودہ، جھوٹے، باطل اقوال کے بعد اس آیت کریمہ کا نزول ہوا۔ یہاں سے یہود کی ایک اور قباحت کا ذکر کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنی طرف سے یقینی دعویٰ کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں عذاب نہیں دے گا سوائے چند دنوں کے، تو رب تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ کو ارشاد فرمایا کہ آپ ان کو کہہ دیجئے کیا تم نے اللہ تعالیٰ سے کوئی عہد لے رکھا ہے ہاں اگر اس کا تمہارے ساتھ کوئی عہد ہے

کہ وہ تمہیں سوائے چند دنوں کے عذاب نہیں دے گا تو یقیناً ایسا ہی ہونا چاہئے کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا لیکن یہ تمہارا دعویٰ ہی دعویٰ ہے اس پر تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں۔ صرف زبانی طور پر بغیر کسی دلیل کے تمہارے قول کا کوئی اعتبار نہیں وہ تو سراسر جھوٹ ہے۔

بلکہ تم اللہ تعالیٰ کی طرف جھوٹ کی نسبت کر رہے ہو یعنی یہ قول بھی تمہارا من گھڑت اور جھوٹا ہے اور کہتے یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ ہمیں سوائے چند دنوں کے عذاب نہیں دے گا سوائے چند دنوں کے۔ تم صرف اپنے عقل سے یہ کہہ رہے ہو اور منسوب رب تعالیٰ کی طرف کر رہے ہو حقیقت میں تم ایک اور عظیم جرم کے مرتکب ہو رہے ہو۔

﴿وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَةً﴾:

”المس ایصال الشئی بالبشرة بحيث تتأثر الحاسة به واللمس

(بیضاوی)

كالطلب له ولذلك يقال المسه فلا اجده

”مس“ کا معنی یہ ہے کسی چیز کو چمڑے تک پہنچانا اس لحاظ پر کہ وہ حس کو قبول کرے اور اسی حس کی طلب کو ”لمس“ کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے ”المسه فلا اجده“ میں اسے تلاش کر رہا ہوں لیکن پا نہیں رہا۔ اسی وجہ سے کہیں ”مس“ (چھونا) کے پائے جانے کے باوجود ”لمس“ (طلب کرنا) نہیں پایا جاتا۔ ﴿إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَةً﴾ محصورة، یعنی محدودہ کا معنی ہے گنتی کے چند دن۔

طلباء کرام مستثنیٰ مفرغ کو جانتے ہیں یہاں بھی استثناء مفرغ پایا گیا ہے اصل معنوی لحاظ پر عبارت یوں ہوگی:

﴿لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ﴾ ابدا ﴿إِلَّا أَيَّامًا﴾ قلائل

”ہرگز ہمیں آگ مس نہیں کرے گی کبھی بھی سوائے چند دنوں کے“۔

اسلئے کہ ﴿مَّعْدُودَةً﴾ کا لفظ جب مطلق ذکر کیا جائے تو اس سے مراد ”قلیل“ ہی لیا جاتا ہے۔

جیسا کہ رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿در اہم معدودہ﴾ میں بھی قلیل در اہم ہی مراد ہیں۔

(از بیضاوی و شیخ زادہ)

تنبیہ: ﴿مَعْدُودَةٌ﴾ کا معنی قلیل جو ذکر کیا ہے اس سے مراد جمع قلت والا معنی نہیں جو دس

سے زیادہ پر نہ بولا جاسکے۔ بلکہ یہاں بامحاورہ معنی مراد لیا گیا ہے، چند دن۔ رمضان کے تیس روزوں کے لئے بھی ﴿أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ﴾ ذکر کیا گیا ہے جو سال کی نسبت چند دن ہی ہیں۔

طلباء کرام کی توجہ کے لئے: اس مقام پر ﴿أَيَّامًا مَّعْدُودَةٌ﴾ ذکر کیا گیا ہے اور سورۃ آل عمران میں ﴿أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ﴾ ذکر کیا ہے وجہ فرق کیا ہے؟ جبکہ موصوف دونوں میں ایک ﴿أَيَّامًا﴾ ہے۔ تو اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اسم اگر مذکر ہو (غیر ذوی العقول سے ہو) تو اس کی صفت کی جمع ”تات“ سے آتی ہے۔ یعنی واحد مؤنث ہوگی۔ جیسے کوز کی جمع کیزان اور اس کی صفت ”مکسورۃ“ آتی ہے اور اسی طرح ”ثوب“ کی جمع ”ثیاب“ اور اسکی صفت ”مقطوعۃ“ آتی ہے۔

اور جب اسم غیر ذوی العقول واحد مؤنث ہو تو اس کی جمع کی صفت ”الف، تا“ سے آئے گی جیسا کہ ”جرۃ“ کی جمع ”جرار“ آتی ہے اس کی صفت کی جمع ”مکسورات“ الف تا سے آتی ہے۔ لیکن مذکر غیر ذوی العقول جمع کی صفت ”الف تا“ سے آسکتی ہے جیسے ﴿أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ﴾ الشہور الماضیات، لہذا سورۃ بقرہ میں اصل مذکور ہے ﴿أَيَّامًا مَّعْدُودَةٌ﴾ اور سورۃ آل عمران میں فرع ذکر ہے ﴿أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ﴾

﴿قُلْ اتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللَّهِ عَهْدًا فَلَنْ يُخْلِفَ اللَّهُ عَهْدَهُ﴾:

”فرما دیجئے کیا تم نے اللہ سے عہد لیا ہے پھر تو ہرگز اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرے گا“

﴿اتَّخَذْتُمْ﴾ باب افتعال ہے اس میں اصل میں دو ہمزے تھے ایک استفہام کا اور ایک باب افتعال کے باب کا ہمزہ تخفیف کے طور پر حذف کر دیا اور استفہام کا ہمزہ انکار کے لئے ہے۔ یعنی مفہوم یہ ہو گیا کہ آپ فرما دیجئے تم نے اللہ تعالیٰ سے کوئی عہد نہیں لیا کہ وہ وعدہ کے خلاف نہ کرے۔

﴿فَلَنْ يُخْلِفَ اللَّهُ عَهْدَهُ﴾ بدل علی انہ سبحانہ و تعالیٰ منزہ عن

الکذب وعدہ ووعدہ قال اصحابنا لان الکذب صفة نقص والنقص

علی اللہ محال

اللہ تعالیٰ وعدہ کی خلاف ورزی نہیں فرماتا کیونکہ وعدہ کی خلاف ورزی جھوٹ ہے
اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ اور وعید میں جھوٹ سے پاک ہے اور یہی وجہ ہے کہ اہل سنت
و جماعت کا مذہب یہ ہے کہ جھوٹ ایک ایسی صفت ہے کہ جس سے نقص لازم آتا ہے
اللہ تعالیٰ کی طرف نقص کی نسبت محال ہے۔ (از کبیر)

یہاں یہ بھی خیال رہے کہ عہد لینے کا مطلب خبر دینا وعدہ کرنا ہے اصل مطلب یہ ہے کہ کیا تمہیں
اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے یا اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ وعدہ کیا ہے؟

﴿ اَمْ تَقُولُوْنَ عَلٰی اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ ”بلکہ تم کہتے ہو اللہ پر جو تم نہیں جانتے“

دینی طلباء کرام کے لئے: (ام) کی دو قسمیں ہیں: متصلہ اور منقطعہ ”یہاں آیہ
کریمہ میں ایک احتمال یہ ہے (ام) متصلہ ہو یہ دو چیزوں کے درمیان برابری کے لئے آتا ہے اور دونوں
میں ایک چیز کی تعیین چاہتا ہے بظاہر مطلب تو یہ ہے کیا تم نے اللہ تعالیٰ سے وعدہ لیا ہے..... یا تم
اللہ تعالیٰ پر وہ کہتے ہو جو تم نہیں جانتے یعنی سوال کرنے والا دو چیزوں میں سے ایک کی تعیین کا سوال کر رہا
ہوتا ہے۔ اسے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں سے ایک کا وقوع ہوا ہے۔ لیکن (ام) متصلہ لینے کی
صورت میں ایک بات یہ ذہن میں رہے ”فلا یكون الاستفهام علی حقیقۃ“ کہ استفہام حقیقی معنی
میں نہیں۔ سوال کرنا مقصود نہیں۔ اور دوسری یہ بات ذہن میں رہے:

”وخرج ذلک مخرج المتردد فی تعینہ علی سبیل التقرير

لاولئک المخاطبین لعلم المستفہم وهو النبی ﷺ بوقوع احدهما“

کہ یہاں سوال کرنے والے نبی کریم ﷺ ہیں کیونکہ ”قل“ سے خطاب آپ کو ہی ہے اور
آپ کو کوئی تردید نہیں تھا آپ کو تو یقینی طور پر معلوم تھا کہ ”یہ لوگ وہ چیز اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر رہے
جس کا انہیں علم نہیں“ البتہ ان لوگوں کو تردید تھا کہ وہ کیا جواب دیں۔ اور یہاں سے ایک اور مسئلہ سمجھ آ گیا
کہ (ام) متصلہ کے بعد کبھی جملہ بھی آ جاتا ہے کیونکہ کبھی دو حکموں کے درمیان برابری کرنی مقصود ہوتی
ہے ”وبہذا صرح ابن الحاجب فی الابضاح“ علامہ ابن حاجب نے ایضاح میں اس کی

وضاحت کی ہے۔

☆ ”ویحتمل ان تكون منقطعة بمعنى بل ، والتقدير بل تقولون“

اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ (ام) منقطعة ہو بل (بلکہ) یکے معنی میں ہو تقدیر عبارت کی یہ ہو ”بلکہ تم کہتے ہو“ (بل) اضراب کے لئے آتا ہے۔

خیال رہے کہ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ”ام متصلہ“ کے مطابق ہے اور راقم کا ترجمہ ”ام منقطعة“ کے برابر ہے تاہم جب مفسرین کرام کی تفاسیر کو مد نظر رکھ کر وضاحت کی جائے تو دونوں میں نمایاں فرق نظر نہیں آئے گا بلکہ بہت قریب قریب ہوں گے۔ کیا تم نے اللہ تعالیٰ سے وعدہ لے رکھا ہے کہ وہ تمہیں عذاب سوائے چند دنوں کے نہیں دے گا پھر تو وہ یقینی طور پر اپنے وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کرتا، لیکن یہ غلط ہے کہ تم نے وعدہ لے رکھا ہو۔ یا تم اللہ تعالیٰ پر وہ بات کہتے ہو جو تم نہیں جانتے، ہاں ایسا ہی ہے یقیناً تم اللہ تعالیٰ پر وہ بات کہہ رہے ہو جو تم نہیں جانتے۔

دوسرا مطلب کیا تم نے اللہ تعالیٰ سے وعدہ لے رکھا ہے کہ وہ تمہیں عذاب نہیں دے گا پھر تو تمہیں عذاب نہیں دے گا کیونکہ وہ وعدہ کی خلاف ورزی نہیں فرماتا، خبردار تمہیں یہ نہیں کہنا چاہئے کیونکہ تم نے کوئی وعدہ نہیں لے رکھا۔ بلکہ تم تو اللہ تعالیٰ پر وہ بات کہہ رہے ہو جو تم نہیں جانتے۔

تنبیہ: یہاں علامہ رازی رحمہ اللہ نے ایک اعتراض و جواب ذکر فرمایا کہ یہود نے جب اپنے گمان سے بیان کیا کہ ہمیں زیادہ دیر عذاب نہیں ہوگا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کی مذمت کی تو قیاس کیسے صحیح ہے؟ لیکن وہ اعتراض اور اس کے کئی جواب بہت واضح طور پر حکیم الامت علامہ مفتی احمد یار خان رحمہ اللہ نے بیان فرمائے ان کو ذکر کرنا یقیناً بہت ہی مفید ہے۔

اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ قیاس کرنا سخت گناہ بلکہ کفر ہے کیونکہ یہود نے قیاس سے اپنا چند روزہ عذاب مانا اور آیت نے ان کی سخت تردید کی اور حنفی، شافعی وغیرہ تمام مقلدین قیاس کرتے ہیں لہذا وہ سب گمراہ ہیں (معاذ اللہ) (غیر مقلد)۔

جواب اول: یہودیوں نے عقائد میں قیاس کیا تھا یہ واقعی ناجائز ہے مقلدین فروعی اعمال میں

قیاس کرتے ہیں نہ کہ عقائد میں۔

جواب دوم: یہود نے خبر میں قیاس کیا کہ قیامت میں ہماری بخشش ہوگی اور خبر میں قیاس نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے نقل دلیل ضروری ہے ہم لوگ احکام شرعیہ میں قیاس کرتے ہیں۔

جواب سوم: انہوں نے نص کے مقابل قیاس کیا، کیونکہ توراۃ نے کفار کی بخشش کا انکار کیا انہوں نے قیاس سے اس کو ثابت کیا اور نص کے مقابل قیاس کرنا حرام ہے۔ ان کا حال شیطان کے حال کی طرح ہوا، ہم ایسا قیاس نہیں کرتے۔ جہاں نص نہ ہو وہاں قیاس کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

جواب چہارم: ان کا قیاس فلسفی قیاس آرائی تھی یعنی ان کا قیاس من گھڑت بلا دلیل تھا کیونکہ ان کے قیاس میں کسی آیہ کی تائید نہیں تھی۔ ہمارا قیاس شرعی ہوتا ہے جس کی آیہ یا حدیث سے تائید ہوتی ہے۔

جواب پنجم: ان کا قیاس بلا ضرورت تھا۔ اور ہمارا قیاس شرعی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ہوتا ہے تو یقیناً قیاس بھی شرعی کہلاتا ہے لہذا ان کا قیاس بے دینی تھا اور ہمارا قیاس دینی ہے۔ یعنی نبی کریم ﷺ کی شریعت کی چار دلیلیں ہیں: قرآن، حدیث، اجماع اور چوتھی دلیل ہے ہی قیاس۔ کوئی غیر مقلد بغیر قیاس کے زندہ رہ نہیں سکتا فرق اتنا ہے کہ ہم مجتہدین کے قیاس پر عمل کرتے ہیں اور وہ جہلاء اور گمراہوں کے قیاس پر عمل کرتے ہیں گویا ہم اماموں کے مقلد ہیں اور وہ نفس اور شیطان کے۔ (از نعیمی)

☆☆☆

﴿بَلَىٰ مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَأَحَاطَتْ بِهِ خَطِيئَتُهُ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾

(۱) ”ہاں کیوں نہیں جو گناہ کمائے اور اس کی خطا اسے گھیر لے وہ دوزخ والوں میں ہے انہیں ہمیشہ اس میں رہنا۔“

(۲) ”ہاں کیوں نہیں جس نے کسب کیا برائی کا اور احاطہ کر لیں اس کا اس کی خطائیں تو وہ لوگ جہنم والے ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔“

یہود کے دعویٰ کو رد کیا جا رہا ہے جو انہوں نے کہا تھا کہ ہمیں زیادہ دیر عذاب نہیں ہوگا، بلکہ صرف چند دن عذاب ہوگا تو رب تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں ان کا رد فرمایا کہ تمہارا دعویٰ باطل ہے۔ عذاب کیوں نہیں ہوگا جب کہ قانون باری تعالیٰ یہ ہے کہ جب کوئی گناہوں کا عمل کرے اور وہ اس کی غلطیاں اس کا ایسا احاطہ کر لیں کہ اسے ایمان کی دولت سے بھی محروم کر دیں تو وہ لوگ جہنمی ہیں اور جہنم میں ہمیشہ رہیں گے۔

﴿بَلَىٰ﴾ : نفی کے بعد ثبوت کے لئے آتا ہے جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿الْسُّـٰتِ بِرَبِّكُمْ﴾ کیا میں تمہارا رب نہیں؟ ﴿قَالُوا بَلَىٰ﴾ انہوں نے کہا ہاں کیوں نہیں یعنی تو ہمارا رب ہے۔ اسی طرح جب انہوں نے کہا ﴿لَنْ تَمْسَنَا النَّارُ﴾ ”ہمیں ہرگز آگ نہیں چھوئے گی“ تو رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿بَلَىٰ﴾ کیوں نہیں یعنی تمہیں آگ ضرور چھوئے گی کیونکہ تم نے تحریف کی وجہ سے کفر اختیار کر لیا۔

﴿مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً﴾ : والكسب جلب النفع کسب کا اصل میں معنی یہ ہے ”نفع حاصل کرنا“ ”والسینة، الفاحشة الموجهة للنار“ وہ گناہ جو جہنم میں جانے کا ذریعہ ہو اسے ”سینة“ کہا جاتا ہے اسی وجہ سے کبیرہ گناہوں پر ”سینة“ کا اطلاق ہوتا ہے کیونکہ وہ بھی آگ میں جانے کا ذریعہ ہیں۔ ”ای يستحق فاعلها النار ان لم يغفر له“ یعنی اگر گناہ کبیرہ کرنے والے شخص نے توبہ نہ کی یا رب تعالیٰ نے اپنی مہربانی سے اس کی مغفرت نہ کی تو وہ جہنم کا مستحق ہوگا۔

فصاحت لہر آن۔ ”کسب“ کا معنی ہے ”نفع حاصل کرنا“ اس کے بعد ”سینۃ“ کا ذکر کیا جو جہنم میں جانے کا ذریعہ ہے اس سے یہ واضح کیا کہ وہ اپنے کفر یعنی اللہ کی کتاب کی تحریف سے بظاہر دنیا کا گھٹیا مال حاصل کرتے اور وہ سمجھتے کہ ہم نفع حاصل کر رہے ہیں لیکن درحقیقت ان کے لئے خسار کا ہی سبب تھا کیونکہ ان کے اس فعل نے ان کو جہنمی بنا دیا۔

﴿وَإِذَا طُغِيَ بِهِ خَطِيئَتُهُ﴾ احاطہ کا معنی واضح ہے گھیر لینا، غالب آ جانا، ہر طرف سے شامل ہو جانا: ﴿خَطِيئَتُهُ﴾ اصل میں اس غلطی کو کہتے ہیں جو بلا ارادہ سرزد ہو۔ جیسا کہ کسی شکار کی طرف تیر پھینکا لیکن غلطی سے اس کی زد میں کوئی انسان آ جائے، اسی طرح نشہ کی حالت میں کسی کا نقصان کر دیا یہ سب خطیئات کہلائیں گی۔

تاہم خطائیں باوجود احاطہ کر لینے کے قابل توبہ ہیں۔ خواہ کفر اور شرک کی حد تک بھی ہوں۔ کیونکہ کفر اور شرک کو چھوڑ کر تائب ہو کر انسان جب مسلمان ہو جائے تو وہ قابل بخشش ہے، خواہ اس کے بعد وہ کئی گنا ہوں میں مبتلا ہو۔ ہاں البتہ جب کفر اور شرک پر اس کی موت آ گئی توبہ نہ کر سکا تو وہ ہمیشہ کے لئے جہنم میں رہے گا۔

﴿فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾

یہاں اصحاب کی نار کی طرف اضافت تلازم پر دلالت کر رہی ہے کہ جن کا گناہوں نے احاطہ کر لیا اور اسی پر ان کی موت آ گئی آگ ان کو لازم رہے گی۔ وہ آگ میں ہمیشہ رہیں گے یعنی کافر کو کبھی بھی جہنم سے نکال کر جنت میں نہیں پہنچایا جائے گا۔ (ماخوذ از روح المعانی)

یہود و وجہ سے مذمت کے مستحق ہوئے:

یہود کی تحریف اور غلطی کی وجہ کو سمجھنے کے لئے پہلے یہ سمجھا جائے کہ ہر شریعت میں معاصی کے دو مرتبے رہے۔ ایک یہ کہ اعتقاد تو ملے تہ حقہ کے مطابق ہو لیکن عمل مخالفت ہو مثال کے طور پر شراب پینے، زنا کرنے، چوری کرنے، لواطت کرنے، غیر کے مال کو غصب کرنے کو حرام سمجھے، اور ان پر عذاب کے

لاحق ہونے کا خوف بھی رکھے، لیکن بوجہ حجاب طبعی اور غلبہ شہوت کے اس سے یہ افعال سرزد ہوں تو اسے فاسق و فاجر کہا جائے گا۔ فاسق و فاجر کو اگر عذاب دیا گیا تو وہ عذاب ختم بھی ہوگا اور وہ عذاب کے ختم ہونے کے بعد جنت میں آجائیں گے۔

معاصی کا دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ اعتقاد ہی باطل ہو یعنی اللہ تعالیٰ اور انبیاء کرام اور ملائکہ اور آخرت اور آسمانی کتب پر اس کا ایمان نہ ہو۔ اور اسی طرح حرام چیزوں کو حرام ہی نہ سمجھے تو وہ شخص کافر زندیق اور ملحد کہلاتا ہے وہ جہنم میں دائمی عذاب میں ہوگا اس کا عذاب کبھی ختم نہیں ہوگا۔ اس مسئلہ کو مسلمان اہل علم نے اس طرح بیان کیا۔

”الفاسق لا یخلد فی النار والکافر مخلد فی النار“

فاسق آگ میں ہمیشہ نہیں رہے گا اور کافر آگ میں ہمیشہ رہے گا۔

لیکن یہود نے ان دونوں وجہ کی مخالفت کی اور من گھڑت اقوال پیش کئے کیونکہ یہود نے کہا:

﴿لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا﴾ یہود کے بغیر ہرگز کوئی جنت میں داخل نہیں ہوگا۔

یعنی یہود نے مسلمانوں کے جنت میں جانے کی نفی کی، خواہ نیک ہوں یا گنہگار ان کا یہ قول جھوٹ پر مبنی تھا انہوں نے اپنے من گھڑت قول کو رب تعالیٰ کی طرف منسوب کیا۔ اسی طرح دوسرا مرتبہ معاصی کا کفر ہے۔ کافر جہنم سے کبھی باہر نہیں آئے گا۔ ہمیشہ جہنم میں رہے گا یہود اللہ کی کتاب میں تحریف کر کے کافر ہونے کے باوجود کہتے تھے کہ ہم جہنم میں ہمیشہ نہیں رہیں گے بلکہ ہمیں اگر عذاب ہوا تو صرف چند دن ہوگا ان کا یہ قول بھی جھوٹ پر مبنی تھا۔ لہذا ان دو جھوٹے اقوال اور قانون قدرت میں تحریف کی وجہ سے ان کی مذمت کی گئی۔

(از عزیز)

☆☆☆

﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ

الْجَنَّةِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾

(آیت ۸۲)

(۱) ”اور جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے وہ جنت والے ہیں انہیں ہمیشہ اس میں رہنا۔“

(۲) ”اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے عمل کئے اچھے وہ لوگ جنت والے ہیں انہیں

اس میں ہمیشہ رہنا ہے۔“

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں جب آیۃ وعید (عذاب والی آیۃ) کو ذکر کیا، تو ساتھ ہی آیۃ وعد کو ذکر فرمایا اس میں چند فوائد پائے جاتے ہیں۔

ایک فائدہ یہ حاصل ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا نظام عدل واضح ہوتا ہے اس لئے کہ جو لوگ ہمیشہ کفر پر قائم رہنے والے ہیں ان کے لئے جب دائمی عذاب ہے تو یقیناً عدل و انصاف کا تقاضا یہی تھا کہ جو لوگ ہمیشہ ایمان پر ثابت رہنے والے ہیں ان کو قائم و دائم رہنے والی نعمتوں سے نوازا جائے۔

دوسرا فائدہ یہ حاصل ہوا کہ مومن کو چاہئے کہ اللہ تعالیٰ سے خوف بھی رکھے اور اس کی رحمت کی امید بھی رکھے جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ”لو وزن نخوف المؤمن ورجاؤه لا اعتدلا“ اگر مومن کے خوف اور امید کا وزن کیا جائے تو دونوں برابر ہوں۔ یعنی دونوں چیزیں ایک جیسی سمجھے تاہم رب تعالیٰ کی رحمت وسیع ہے اس کی وسعت پر امید رکھنا بھی اس کی شان کریمی کے مطابق ہے۔ مومن کو یہ اعتدال اسی وقت سمجھ آ سکتا ہے جب آیات وعید کے ساتھ آیات وعد کو بھی ذکر کیا جائے۔

تیسرا فائدہ یہ حاصل ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے وعد سے اس کی کامل رحمت کا ظہور ہوتا ہے اور اس کی وعید سے اس کی کامل حکمت کا ظہور ہوتا ہے جس سے انسانوں کو اللہ تعالیٰ کی صفات کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔

(از کبیر)

تنبیہ: ایمان پر قائم رہنا، اور ایمان پر ہی موت کا آنا جنت میں جانے کا ذریعہ ہے اگر العیاذ باللہ مرتد ہو جائے اور اس کی موت حالت ارتداد پر ہی آجائے تو وہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔

☆ حضرت سفیان بن عبد اللہ تقفی نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا:

”یا رسول اللہ قل لی فی الاسلام قولاً لا اسأل عنه احدا بعدک قال

قل آمنت باللہ ثم استقم“ (رواہ مسلم)

یا رسول اللہ ﷺ آپ مجھے اسلام کے متعلق ارشاد فرمائیں کہ مجھے آپ کے بعد کسی سے سوال کرنے کی ضرورت درپیش نہ آئے آپ نے فرمایا تم یہ کہو میں نے اللہ پر ایمان لایا پھر اس پر قائم رہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی بھی اسی پر دلالت کر رہا ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾

”بیشک وہ لوگ جنہوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے پھر وہ اس پر قائم رہے تو انہیں کوئی خوف نہیں

اور نہ وہ غمناک ہوں گے۔“ (از قرطبی)

فائدہ: ایمان کے بعد اعمال صالحہ کا ذکر فرمایا جس سے پتہ چلا کہ ایمان اصل میں تصدیق قلبی

کا نام ہے اعمال صالحہ اس کا جز نہیں کیونکہ جزء کا عطف کل پر نہیں ہوتا۔ اسی سے یہ مسئلہ بھی واضح ہو گیا کہ

گناہ کبیرہ کا مرتکب فاسق و فاجر تو ہوتا ہے لیکن ایمان سے خارج نہیں ہوتا بلکہ مؤمن ہی رہتا ہے:

”لأن الإيمان اشرف من العمل لكونه اساس جميع الحسنات إذ

الاعمال ساقطة عن درجة الاعتبار عند عدمه“

کیونکہ ایمان تمام اعمال سے اشرف ہے اور تمام نیکیوں کی بنیاد ہے کیونکہ ایمان کے علاوہ نیک

اعمال کبھی انسان سے ساقط بھی ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ حالت حیض میں عورت سے نماز ساقط ہو جاتی

ہے اور مرد یا عورت ایک دن ایک رات سے زیادہ بیہوش ہو جائیں تو نماز ساقط ہو جاتی ہے لیکن ایمان

کسی حال میں بھی ساقط نہیں ہوتا۔

نکتہ: ایمان کے ساتھ اعمال صالحہ کے ذکر میں یہ نکتہ پایا گیا ہے:

”وهو ان يكون الإيمان في مقابلة السنية المفسرة بالكفر عند البعض

والعمل الصالح في مقابلة الخطيئة المفسرة بما عداه“

وہ یہ ہے کہ پہلی آیت مبارکہ میں ”سینۃ“ کا ذکر ہی جس سے مراد کفر لیا گیا ہے۔ اس کے مقابل

اس آیت میں ایمان کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور اسی طرح پہلی آیت میں ﴿خَطِيئَةٌ﴾ کا ذکر ہے جس سے مراد کفر کے علاوہ اور گناہ مراد ہیں اس آیت میں اس کے مقابل اعمال صالحہ کا ذکر ہے۔
﴿الَّذِينَ آمَنُوا﴾ سے مراد عام حکم:

”والمراء من ﴿الَّذِينَ آمَنُوا﴾ امة محمد ﷺ ومؤمنوا الأمم قبلهم“

اس آیت کریمہ میں ایمان کا جو ذکر کیا گیا ہے وہ عام ہے نبی کریم ﷺ کی امت کو بھی شامل ہے اور پہلی امتوں کے مؤمنین کو بھی شامل ہے۔

فائدہ جلیلہ :

”ان خلودهم في النار بسبب افعالهم السيئة وعصيانهم وخلودهم في الجنة بمحض لطفه تعالى وكرمه والا فلايمان والعمل الصالح لا يفي بشكر ما حصل للعبد من النعم العاجلة“

بیشک لوگوں کا آگ میں داخل ہونا ان کے برے افعال اور نافرمانی کی وجہ سے ہوگا اور ان کا کفر جہنم میں ہمیشہ رہنے کا ذریعہ ہوگا۔ لیکن جنت میں ہمیشہ رہنے کا انعام صرف اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم سے حاصل ہوگا ورنہ بندے پر اللہ تعالیٰ کے اتنے انعام ہیں جو بندہ حاصل کر چکا ہوتا ہے کہ ان انعامات کو شمار کرنا چاہے تو شمار نہیں کر سکتا تو انسان کا ایمان اور نیک عمل تو ان انعامات کا شکریہ بھی ادا نہیں کر سکتے تو یوں سمجھیں کہ انسان اس مزدور کی طرح ہے جو مزدوری پہلے لے لے کام بعد میں کرے وہ کام ختم کرنے پر مزدوری کا حقدار تو نہیں ہوتا کیونکہ وہ پہلے مزدوری کا حقدار تو نہیں ہوتا کیونکہ وہ پہلے مزدوری حاصل کر چکا ہوتا ہے لیکن مالک اس پر پھر رحم کرے اور انعام سے نواز دے تو اسکی کرم نوازی۔

اسی طرح انسان اللہ تعالیٰ کے عظیم اور ان گنت انعامات پہلے حاصل کر چکا ہے لیکن ایمان اور نیک اعمال کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اپنے لطف و کرم سے مزید انعام سے نوازے گا کہ جنت میں ہمیشہ رہنے اور جنت کی عظیم نعمتوں سے انسان کی پھر تکریم ہوگی۔

اسی سے ایک اور مسئلہ واضح ہو گیا کہ ”ان الوعيد من الكريم مظنة الخلف دون الوعد“ رب تعالیٰ جو کریم ذات ہے اس کی طرف سے وعید اس کی مشیت پر موقوف ہے اگر کفر کی حد تک گناہ نہ

ہوئے تو رب تعالیٰ نے چاہا تو گرفت فرمائے گا، اور اگر معاف کر دے تو اسکی مرضی اور اس کا کرم ہوگا۔

لیکن رب تعالیٰ نے اپنے بندوں سے جو وعدہ فرمایا ہے اگرچہ اس پر کوئی چیز لازم تو نہیں ہوتی لیکن اس نے اپنے کرم سے اپنے آپ پر لازم قرار دے دیا ہے لہذا وعدہ میں ایسا نہیں ہوگا کہ وہ چاہے تو وہ نعمتیں عطا کرے اور چاہے تو نہ عطا کرے۔
(از روح المعانی)

راقم نے جس انداز پر اردو میں مسئلہ سمجھایا ہے اس میں خلف فی الوعد کی کوئی بات نہیں۔

تنبیہ: کوئی شخص اپنی نیکیوں کو عظیم اور کثیر نہ سمجھے اور ان پر اترائے نہیں اور تکبر نہ کرے اور ریاء کاری نہ کرے ورنہ اس کی نیکیاں ضائع ہو جائیں گی۔ یہ بھی خیال رہے کہ رب تعالیٰ کسی کی نیکیوں کو ضائع نہیں کرتا لیکن بندہ خود نیک عمل ریاء کاری کے طور پر کرے تو وہ نیک عمل ضائع ہو جاتا ہے کیونکہ وہ نیک عمل بنتا ہی نہیں اس نیک عمل کو بندے نے خود ہی ضائع کیا ہے۔

اور اسی طرح کوئی شخص اپنے گناہوں کو حقیر اور قلیل نہ سمجھے کیونکہ تھوڑے تھوڑے جمع ہو کر اس کی ہلاکت کا سبب بن جائیں گے

☆ ”وعن عبد الله بن مسعود رضی اللہ عنہ ان رسول الله ﷺ قال ایاکم ومحقرات الذنوب ، فانهم یجتمعن علی الرجل حتی یهلكنه“ (مسند احمد)

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا گناہوں کو حقیر سمجھنے سے اپنے آپ کو بچا کر رکھو، بیشک وہ گناہ جمع ہو کر انسان کی ہلاکت کا سبب بن جاتے ہیں۔ پھر نبی کریم ﷺ نے ایک مثال سے مسئلہ کو سمجھایا کہ جس طرح کوئی قوم جنگل میں اترے قوم کا سردار ان کو لکڑیاں جمع کرنے کا حکم دے تو ایک شخص لکڑیاں لائے پھر دوسرا شخص لائے اس طرح جب کئی آدمی لکڑیاں جمع کریں اور آگ جلائی جائے اب آگ میں جو چیز بھی ڈالو وہ جل جائے گی۔

(از صابونی)

☆☆☆☆☆

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَآئِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ
وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ
وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ ثُمَّ
تَوَلَّيْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْكُمْ وَأَنْتُمْ مُّعْرِضُونَ ﴿٨٣﴾

(آیت ۸۳)

(۱) ”اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ اللہ کے سوا کسی کو نہ پوجو اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرو اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں سے اور لوگوں سے اچھی بات کہو اور نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ دو پھر تم پھر گئے مگر تم میں کے تھوڑے اور تم روگرداں ہو۔“

(۲) ”اور جب لیا ہم نے وعدہ بنی اسرائیل سے کہ عبادت نہ کرنا سوائے اللہ تعالیٰ کے اور والدین سے احسان کرنا اور رشتہ داروں سے اور یتیموں سے اور مسکینوں سے (احسان کرنا) اور کہو لوگوں سے اچھی بات، اور قائم کرو نماز، اور دو زکوٰۃ پھر تم پھر گئے سوائے تھوڑے تم میں سے اور تم ہی اعراض کرنے والے ہو۔“

☆ یہاں سے مراد اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کا ذکر فرمایا کہ ان کو اپنے اوامر میں سے کچھ امر (حکم) دیئے گئے اور ان سے ان پر عمل کرنے کا عہد لیا گیا لیکن وہ تمام سے پھر گئے اور قصد انہوں نے اعراض کیا حالانکہ وہ جانتے بھی تھے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے احکام ہیں۔ اور وہ کام انہوں نے بغیر کسی بھول کے کئے یعنی عہد ان کا اعراض تھا علم نہ ہو، یا بھول ہو جائے تو کسی حد تک وہ قابل معافی جرم ہوتا ہے۔ (از ابن کثیر)

☆ رب تعالیٰ نے جس طرح گزشتہ آیات میں بنی اسرائیل پر اپنی نعمتوں کا ذکر کیا لیکن ساتھ ساتھ بنی اسرائیل کا ان نعمتوں کی قدر نہ کرنا اور اس پر مختلف نافرمانیوں کا ذکر کیا اسی طرح اس آیت میں بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمت کا ذکر فرمایا اور ساتھ ہی یہ ذکر فرمادیا کہ اے بنی اسرائیل تم نے اس سے اعراض کیا یعنی تم اس سے پھر گئے یہ پھر جانا اور اعراض کرنا تمہاری عادت ہے۔

اس آیت میں کیسے نعمت کا ذکر کیا گیا؟ وہ یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے ان کو چند چیزوں کا مکلف بنایا یعنی

ان پر عمل کرنے کا حکم دیا کہ تم صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا۔ اور والدین سے اچھا سلوک کرنا اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں سے بھلائی سے درپیش آنا اور لوگوں سے اچھا کلام کرنا اور نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ دینا۔

”وذلك لان التكليف بهذه الاشياء موصول الى اعظم النعم وهو الجنة والموصول الى النعمة نعمة فهذه التكليف لا محالة من النعم“
یہ اس وجہ سے نعمت ہے کہ ان چیزوں کی تکلیف دینا بہت بڑی نعمت کے حاصل کرنے اور اس تک پہنچنے کا ذریعہ ہے وہ بہت بڑی نعمت جنت ہے جو چیز نعمت تک پہنچائے وہ نعمت ہے تو یقیناً یہ تمام احکام عظیم نعمتیں ہیں۔
(از کبیر)

﴿وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَآئِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ﴾

”اور جب لیا ہم نے عہد بنی اسرائیل کے عبادت نہ کرنا سوائے اللہ کے۔“

﴿لَا تَعْبُدُونَ﴾ میں ایک احتمال یہ ہے کہ یہ خبر ہے لیکن اس میں معنی نہیں والا ہے (تم عبادت نہ کرو سوائے اللہ کے) جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”لا يضار كاتب ولا شهيد“ یہ صیغہ بھی خبر ہیں۔ لیکن ان میں بھی معنی نہیں والا ہے صریح نہیں سے زیادہ بلاغت اس میں پائی جاتی ہے۔

”وبعضده قراءة لا تعبدوا“ ایک قراءت میں ذکر ہی نہیں ہے ﴿لَا تَعْبُدُوا﴾ اس سے اس معنی کو تائید ملتی ہے اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی قول کے مطابق ”اللہ کے سوا کسی کو نہ پوجو“

وقيل تقديره ان لا تعبدوا فلا حذف ان رفع “ اور اس میں ایک قول یہ ہے کہ یہ اصل میں ﴿أَنْ لَا تَعْبُدُوا﴾ تھا لیکن ”ان“ کو حذف کر دیا گیا اور نوین اعرابی جو ”ان“ کی وجہ سے محذوف ہوا تھا وہ ”ان“ کے حذف ہونے کی وجہ سے واپس لوٹ آیا اب ﴿لَا تَعْبُدُونَ﴾ حالت رفعی میں ہے۔

راقم کا ترجمہ اسی تفسیر کے مطابق ہے ”عبادت نہ کرنا سوائے اللہ تعالیٰ کے۔“

”وبدل عليه قراءة ان لا تعبدوا“ اور اس پر وہ قراءت دلالت کر رہی ہے جس میں

خیال رہے کہ میثاق کا معنی یہ ہے ”المیثاق اسم لما توقع به الوثاقۃ“ جس چیز کے ذریعے کسی کو مضبوط بنایا جائے اسے میثاق کہا جاتا ہے گویا کہ مطلب یہ ہوا کہ رب تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے بہت پختہ وعدہ لیا ان احکام پر عمل کرنے کا لیکن وہ اس سے پھر گئے۔ (از شیخ زادہ بتغیر)

﴿وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا﴾: اس میں بھی دو ہی احتمال ہیں ایک احتمال یہ ہے کہ اس میں ﴿أَحْسِنُوا﴾ (امر کا صیغہ) مقدر ہو معنی یہ ہو ”اور ماں باپ سے بھلائی کرو“ اعلیٰ حضرت کا یہی ترجمہ ہے۔ اور دوسرا احتمال یہ ہے ”وتحسنون“ مقدر ہو۔ اصل میں ”ان تحسنوا“ ہو لفظ ”ان“ کو مقدر کر کے ”تحسنون“ رفعی حالت میں کر دیا گیا ہو۔ اس لحاظ پر معنی یہ ہوگا ”اور والدین سے احسان کرنا“ راقم کا یہی ترجمہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کی عبادت کے بعد والدین سے بھلائی کے ذکر کی وجوہ:

(۱) اللہ تعالیٰ کی نعمتیں بندے پر سب نعمتوں سے عظیم نعمتیں ہیں۔ اسی وجہ سے سب نعمتوں کے شکر پر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر شکر بھی مقدم (پہلے) ہوگا۔ پھر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے بعد والدین کی اولاد پر عظیم نعمتیں ہیں، کیونکہ والدین اولاد کے لئے اصل ہیں۔ اور اولاد کے موجود ہونے کا سبب اور ذریعہ ہیں اور والدین اپنی اولاد کی تربیت کرتے ہیں یہ بھی والدین کا اولاد پر احسان عظیم ہے۔

لیکن والدین کے بغیر باقی رشتہ دار اگرچہ بعض اوقات تربیت تو کرتے ہیں لیکن وہ اصل نہیں یعنی وجود کا ذریعہ نہیں لہذا واضح ہوا ”ان انعمائهما اعظم وجوہ الانعام بعد انعام اللہ تعالیٰ“ بیشک والدین کا انعام اللہ تعالیٰ کے انعام کے بعد عظیم ہے کیونکہ اس کی وجوہ عظیم ہیں۔

(۲) اللہ تعالیٰ انسان کے موجود کرنے میں مؤثر حقیقی ہے، اور والدین مجازی طور پر اور ظاہر عرف کے مطابق مؤثر ہیں ”فلما ذکر المؤثر الحقیقی اردفہ بالمؤثر بحسب العرف الظاہر“ جب اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کا ذکر فرمایا جو مؤثر حقیقی ذات ہے تو اس کے بعد والدین سے بھلائی کرنے کا حکم دیا کہ وہ ظاہر عرف کے مطابق مجازی طور پر مؤثر ہیں۔

(۳) اللہ تعالیٰ بندوں پر جو انعام کرتا ہے وہ اس کے بدلہ میں کسی چیز کی طلب نہیں کرتا بلکہ مقصد صرف لوگوں پر بھلائی کرنا، ان کو نعمتیں عطا کرنا۔ رب تعالیٰ دنیاوی نعمتیں ہر نیک اور گنہگار کو عطا کرتا ہے اسی طرح وہ ہر مومن اور کافر کو عطا کرتا ہے۔

اسی طرح والدین بھی اپنی اولاد پر انعام بغیر کسی عوض (بدلہ) کے کرتے ہیں، نہ اس میں کوئی مالی بدلہ ان کے پیش نظر ہوتا ہے، اور نہ ہی وہ ثواب کی غرض سے انعام عطا کرتے ہیں۔ بلکہ فقط ان کا مقصد اولاد پر مہربانی کرنا ہوتا ہے۔ اولاد نیک ہو یا بد مومن ہو یا کافر والدین اس کی تربیت کرتے ہیں، اسے اپنے انعام سے نوازتے ہیں۔

”فمن هذا الوجه اشبه انعامهما انعام الله تعالى“ اسی وجہ سے والدین کا انعام اللہ تعالیٰ کے انعام کے مشابہ ہو گیا لیکن رب تعالیٰ کا انعام حقیقی اور والدین کا رب تعالیٰ کی عطا ہے۔

(۴) اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر انعام کرتا ہے وہ اس سے ملال میں نہیں آتا، بندے عظیم جرم بھی کریں وہ ان سے اپنی نعمتیں چھینتا نہیں، بلکہ اس کی نعمتیں لگا رتا جاری رہتی ہیں۔ اسی طرح والدین کو بھی اپنی اولاد پر انعام کرنے سے ملال نہیں ہوتا اور وہ اولاد کی نافرمانی سے اپنی نعمتیں بھی نہیں چھینتے بلکہ ان پر اپنی نعمتوں کو جاری رکھتے ہیں۔

(۵) والدین اپنی اولاد پر مشقت کرتے ہیں وہ اپنی اولاد کے مال میں نفع طلب کرتے ہیں اور اس کے مال کی زیادتی کے طلب گار ہوتے ہیں۔ اور ان کے مال کو نقصان اور خسارے سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ بندے کو طاعت کا حکم دیتا ہے تاکہ وہ رب کا مطیع بن کر اپنے آپ کو خسارے سے بچالے پھر اللہ تعالیٰ ان کے اعمال جو بظاہر ختم ہو چکے ہوتے ہیں ان کو ہمیشہ کے لئے باقی رکھتا ہے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا:

مَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَتَتْ سَنَابِلَ فِي كُلِّ سُنبُلَةٍ مِائَةُ حَبَّةٍ
 ”ان کی مثال جو اللہ کی راہ میں مال خرچ کرتے ہیں اس دانہ کی طرح ہے جس نے اگائیں سات بالیاں ہر بالی میں سودا نے ہوں۔“

یعنی بظاہر انہوں نے مال خرچ کر دیا لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے ثواب کو ہمیشہ کے لئے باقی رکھ دیا۔

(۶) اللہ تعالیٰ کی نعمتیں عظیم ہونے کے باوجود ”نظری اور استدلالی ہیں“ یعنی دلائل سے ان کا کامل علم حاصل ہوتا ہے اور والدین کی نعمتیں بدیہی ہیں ان میں نظر و استدلال کی ضرورت نہیں۔ لیکن والدین کی نعمتیں بدیہی ہونے کی باوجود قلیل ہیں۔

”والرحمان لنعم الله فلا جرم جعلنا نعم الوالدین كالتالية لنعم الله تعالى“

جب اللہ تعالیٰ کی نعمتیں عظیم ہیں اور کثیر ہیں اور والدین کی نعمتیں حقیر اور قلیل ہیں تو

یقیناً والدین کی نعمتوں کا درجہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے بعد میں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ رب تعالیٰ نے اپنی عبادت کا ذکر پہلے کیا اور والدین سے بھلائی کا ذکر بعد میں کیا۔

(از کبیر)

مسئلہ: اکثر علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ والدین کی تعظیم واجب ہے، اگرچہ اس کے والدین

کافر ہی کیوں نہ ہوں اس پر چند دلائل واضح طور پر موجود ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا﴾ اس میں کوئی قید نہیں کہ والدین

مومن ہوں یا کافر ہوں اس لئے کہ اصول فقہ میں یہ ضابطہ مذکور ہے ”ان الحكم المرتب علی

الوصف مشعر بعلیة الوصف“ جب حکم کسی وصف پر مرتب ہو تو وہ وصف اس کے لئے علت

کی حیثیت ہوتا ہے۔

اس لئے آیت کریمہ سے یہ حکم واضح ہوگا ”ان الامر بتعظیم الوالدین لمحض کونہما

والدین وذلك يقتضی العموم“ کہ اللہ تعالیٰ نے والدین کی تعظیم کا جو حکم دیا ہے اس کا تعلق ان

کے والدین ہونے سے ہے لہذا یہ حکم عام ہے جو والدین مومن ہوں یا کافر ہوں سب کو شامل ہے۔

(۲) رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَلَا تَقُلْ لَهُمَا أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا﴾ ماں باپ کو اف نہ کہو اور ان کو

جھڑ کو نہیں۔ اس آیت کریمہ میں بھی مطلقاً والدین کی تعظیم کے خلاف کام کرنے سے منع کیا گیا۔

(۳) ابراہیم علیہ السلام نے اپنے چچا آزر (جو آپ کی والدہ کا دوسرا خاوند تھا، اور آپ کے باپ کی

طرح تھا) کو کفر سے ایمان لانے کی دعوت بڑی مہربانی اور لطافت سے دی اس میں کوئی سخت کلامی اور

درشتی (سخت انداز سے بولنا) نہیں تھی رب تعالیٰ نے آپ کی دعوت ایمان کا ذکر یوں فرمایا:

﴿يَا أَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِي عَنْكَ شَيْئًا﴾

اے میرے باپ تو یوں عبادت کرتا ہے ان کی جو سنتے نہیں اور دیکھتے نہیں اور نہ کچھ تیرے کام آئیں

”ثم ان كان اباہ كان يؤذیه و یذکر الجواب الغلیظ وهو علیہ السلام

كان یتحمل ذلک“

پھر اگر آپ کا باپ آپ کو تکلیف دیتا اور سخت کلامی سے جواب دیتا تو ابراہیم علیہ

السلام اسے برداشت فرماتے آپ اس قسم کا سخت کلام نہیں فرماتے تھے۔

جب یہ ثابت ہو گیا کہ ابراہیم علیہ السلام کا اپنے باپ (چچا) سے درپیش آنے کا طریقہ کیا تھا تو

ہمیں بھی چاہئے کہ ہم بھی وہی طریقہ اختیار کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ﴿ثُمَّ اَوْحٰیْنَا اِلَیْکَ اَنْ اتَّبِعْ

مِلَّةَ اِبْرٰہِیْمَ حَنِیْفًا﴾ ارشاد فرما کر ہمیں ان کے طریقہ کے مطابق چلنے کا حکم فرمایا۔ (ازکیر)

تنبیہ: حضرت حظلہ ؑ کا باپ ابو عامر سخت کافر تھا انہوں نے نبی کریم ﷺ سے اسے قتل کرنے کی

اجازت طلب کی آپ نے منع فرمایا۔ ہاں اگر ماں باپ یا کوئی رشتہ دار اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ

کے مقابلہ میں آجائیں یعنی بیٹا مسلمانوں کی جانب ہو اور باپ کافروں کی جانب سے میدان جنگ میں

آمنے سامنے آجائیں تو باپ کا لحاظ نہیں کیا جائے گا حضرت ابو عبیدہ بن جراح نے اپنے باپ جراح کو

ہمد میں قتل کیا۔ اور حضرت علی اور حضرت حمزہ اور حضرت ابو عبیدہ ؓ نے بدر میں اپنے قریبی رشتہ

داروں عتبہ، شیبہ اور ولید کو قتل کیا۔

اور حضرت ابو بکر صدیق ؓ نے اپنے بیٹے عبد الرحمن (انہوں نے بعد میں اسلام قبول کیا) سے

مقابلہ کرنے کی اجازت حضور ﷺ سے طلب کی لیکن آپ نے انہیں اپنے پاس ہی رکھنے کی وجہ سے

اجازت عطا نہ فرمائی۔ (از تفسیر عربی، واز حاشیہ جلالین ب ۲۸ زیر آیتان لذین یحادون اللہ)

والدین سے احسان کا مطلب:

”والاحسان الی الوالدین معاشرتهما بالمعروف والتواضع لهما

وامتثال امرهما والدعاء بالمغفرة بعد مماتهما و صلة اهل و دھما“

(قرطبی)

والدین سے احسان کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کی ضروریات کا دنیا کی زندگی میں

اچھی طرح خیال رکھے، اور ان کے سامنے عاجز ہو کر رہے، ان کے حکم کو مانے، اور ان

کی مدت دو سال ہے) اس آیت کریمہ میں رب تعالیٰ نے تین چیزوں سے ماں کا حق مقدم ہونا واضح فرمایا ہے:

- (۱) ماں حمل کی مشقت برداشت کرتی ہے (۲) بچے کو جننے کی تکلیف برداشت کرتی ہے
- (۳) بچے کو دودھ پلانے کی محنت اور رنج اٹھاتی ہے۔

(مرفاق)

ماں، باپ سے محبت خیر و برکت کا ذریعہ ہے:

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

”من احب ان یسط له فی رزقه وینساله فی اثره فلیصل رحمہ“

(بخاری، مسلم، مشکوٰۃ باب البر والصلة)

جو شخص پسند کرتا ہو کہ اس کا رزق کشادہ کر دیا جائے اور اس کی عمر میں برکت ہو تو وہ صلہ جمی کرے۔

یعنی پہلے ماں، باپ پھر اور رشتہ داروں سے اچھا سلوک رکھے احسان کرے ان پر مہربانی کرے نرم طریقے سے درپیش آئے ان کے احوال کی رعایت رکھے یعنی مرض، صحت، خوشحالی اور تنگدستی وغیرہ کے مطابق ان کی حاجت کو پورا کرے۔

سوال: ”ان الآجال والارزاق مقدرۃ ولا تزید ولا تنقص“

موت کا وقت مقرر ہے اور رزق کی مقدار بھی مقرر ہے ان میں نہ کمی ہوتی ہے نہ زیادتی۔ حدیث پاک میں رزق کی کشادگی اور عمر کی زیادتی کا کیا مطلب ہے؟

پہلا جواب: ”ان الزیادۃ بالبرکۃ فی البر“ بیشک عمر کی زیادتی سے مراد عمر میں برکت کا آنا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ اس انسان کو نیکیوں کی توفیق عطا فرما دیتا ہے اور اسے توفیق دیتا ہے کہ وہ ایسے اعمال کرے جو اسے آخرت میں نفع پہنچائیں۔ اپنے اوقات کو نفع میں مصروف رکھے ضائع ہونے سے بچائے، اسی طرح اس کے رزق میں بھی برکت آ جاتی ہے حلال طور پر رزق حاصل کرنے اور حرام سے بچنے کی اسے توفیق دے دی جاتی ہے اور تھوڑے رزق پر بھی اس کے دل کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ ایسا اطمینان حرام رزق سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ وہ تمام اوقات ڈر اور خوف طرح طرح کی تکالیف اور اولاد کے بے راہ روی سے غیر مطمئن ہوتا ہے۔

دوسرا جواب: "انہ بالنسبة الى ما يظهر للملائكة في اللوح المحفوظ" یہ عمر اور رزق کی زیادتی بہت ملائکہ کے لوح محفوظ میں نظر کرنے کے ہے۔

یعنی لوح محفوظ میں مثلاً لکھا ہوا ہی یہ ہوتا ہے کہ اس کی عمر ساٹھ سال ہونی تھی۔ لیکن والدین اور اقرباء کی صلہ رحمی کی وجہ سے اس کی عمر چالیس سال اور کر دی گئی یہی حال رزق کا بھی ہوگا۔ یعنی اگر یہ شخص صلہ رحمی نہ کرتا تو اس کی عمر کم ہوتی اور رزق بھی کم ہوتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی توفیق اور مہربانی سے اس نے صلہ رحمی کرنی ہے تو اس کی عمر اور رزق میں بھی زیادتی یقیناً ہونی ہے۔

تیسرا جواب: "ان المراد بقاء ذكره الجميل بعده فكانه لم يموت" بیشک عمر اور رزق کی زیادتی سے مراد یہ ہے کہ اس کا اچھا ذکر اس کے دنیا سے چلے جانے کے بعد بھی باقی رہے گا گویا کہ وہ فوت نہیں ہوا، جب اس کا نام زندہ ہے تو وہ بھی زندہ ہی ہے۔ (ماخوذ از مرقاة ونووی)

یہ تینوں جواب دراصل مجتمع ہو کر ایک جواب ہیں کیونکہ ان کے اجتماع میں کوئی تعارض نہیں قبلہ استاذی المکرم حضرت مولانا محمد اشرف سیالوی مدظلہ العالی سے یہی سنا۔

ماں باپ انسان کے لئے جنت و دوزخ ہیں: حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ والدین کے ان کی اولاد پر کیا حقوق ہیں؟ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا "ہما جنتک و نارک" وہ دونوں (ماں باپ) تمہارے لئے جنت اور دوزخ ہیں۔ (ابن ماجہ، مشکوٰۃ باب البر والصلة)

سبحان اللہ میرے پیارے مصطفیٰ محمد ﷺ کا کیسا مختصر اور حکمت بھرا جواب ہے (یہ نبی کریم ﷺ کا خصوصی کمال ہے کہ آپ کو جوامع الکلم سے نوازا گیا یعنی بات مختصر اور مطالب بہت) کہ ماں باپ کی فرمانبرداری ان پر احسان کرنا، ان سے حسن سلوک سے درپیش آنا جنت میں جانے کا سبب ہے۔ اور ان کی نافرمانی، سخت کلامی، ان کے حکم کو تسلیم نہ کرنا، ان کی دیکھ بھال نہ کرنا، یعنی ان کو ناراض کرنا جہنم میں جانے کا ذریعہ ہے۔

ماں باپ کو رحمت سے دیکھنا حج کا ثواب ہے: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”ما من ولد بار ينظر الى والديه نظرة رحمة الا كتب الله له بكل نظرة حجة مبرورة قالوا ان نظر كل يوم مائة مرة قال نعم الله اكبر واطيب“

(بیہقی، مشکوٰۃ باب البر والصلة)

کوئی ایسی فرمانبردار اولاد نہیں جو اپنے والدین کو رحمت کی نظر سے دیکھے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کے لئے ہر نظر کے بدلے ایک مقبول حج کا ثواب لکھ دیتا ہے صحابہ کرام نے عرض کیا اگرچہ ہر روز سو مرتبہ بھی دیکھے؟ آپ نے فرمایا ہاں (اگرچہ ہر روز سو مرتبہ بھی دیکھے) اللہ سب سے بڑا اور سب سے پاکیزہ ہے۔

وضاحت حدیث: ماں باپ دونوں زندہ ہوں یا ایک ہو اور اس ایک کو نظر رحمت سے دیکھنے پر بھی یہی ثواب ہے ”نظرة رحمة“ سے مراد شفقت کرنا، مہربانی کرنا، ان کی جائز بات تسلیم کرنا، ان کی ضروریات کا لحاظ کرنا ”حجة مبرورة“ سے مراد نقلی مقبول حج ہے۔ اور یہ بھی خیال رہے کہ یہ ثواب کا حاصل فرضی حج کا بدل نہیں بن سکتا۔

”اللہ اکبر واطیب“ سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بہت بڑا ہے، اس کی عظمت انسان کے تصور سے بالاتر ہے اور اس کے انعامات اور اس کی مہربانیاں اتنی کثیر ہیں جو انسان کے شمار میں نہیں آ سکتیں۔ اور اللہ تعالیٰ بہت پاکیزہ ہے یعنی اس کی قدرت میں کمی کا عیب نہیں لگایا جاسکتا وہ اپنے ارادہ اور مشیت میں نقصان سے پاک ہے۔

(از مرقاة)

نتیجہ واضح ہوا کہ اگر کوئی شخص یہ کہے یہ کیسے ہو سکتا ہے ایک سو حج کا ثواب مل جائے تو وہ شخص در حقیقت اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کی قدرت سے غافل ہے اسے اللہ تعالیٰ کی رحمت کے بے حساب ہونے کا علم نہیں۔

ماں باپ کی نافرمانی ناقابل معافی جرم ہے:

حضرت ابو بکرؓ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”كل الذنوب يغفر الله منها ما شاء الا عقوق الوالدين فانه يعجل

(بیہقی، مشکوٰۃ)

لصاحبه في الحياة قبل الممات“

تمام گناہوں کو اللہ تعالیٰ جتنا چاہے معاف فرما دیتا ہے سوائے ماں باپ کی نافرمانی کے

بیشک اللہ تعالیٰ ماں باپ کے نافرمان کو جلدی ہی اس کی زندگی میں موت سے پہلے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔

یعنی ماں باپ کی نافرمانی کے جرم کو معاف نہیں کیا جائے گا آخری عذاب کے علاوہ اسے دنیا میں بھی پکڑ ہو سکتی ہے یعنی رب تعالیٰ چاہے تو دنیا میں ہی اسے ذلیل و خوار کر دے۔

ماں باپ کی خدمت جہاد اور ہجرت سے پہلے: حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص فرماتے ہیں ایک شخص نبی کریم ﷺ کی طرف متوجہ ہوا اور عرض کیا میں آپ سے جہاد اور ہجرت پر بیعت کرنا چاہتا ہوں تاکہ میں اللہ تعالیٰ سے اس کا اجر حاصل کر سکوں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کیا تمہارے ماں باپ سے کوئی ایک زندہ ہے؟ ہاں، بلکہ دونوں ہی زندہ ہیں تو آپ نے فرمایا:

”فتبتغی الاجر من اللہ قال نعم قال فارجع الی والدیک فاحسن صحبتہما“
(مسلم ج ۲ کتاب البر والصلة والادب)

کیا واقعی تم اللہ تعالیٰ سے اجر حاصل کرنا چاہتے ہو؟ صحابی نے عرض کیا ہاں (یا رسول اللہ) آپ نے فرمایا اپنے والدین کے پاس لوٹ کر چلے جاؤ ان کے پاس رہ کر ان کی خدمت کے آداب اچھے طریقہ سے بجالاؤ۔

اس حدیث پاک سے ماں باپ کی فرمانبرداری کی فضیلت واضح ہوئی۔ ماں باپ کی خدمت کا جہاد سے بھی زیادہ اہم ہونا سمجھ آ یا۔ جب تک جہاد ہر شخص پر فرض عین نہ ہو جائے اس وقت تک ماں باپ کی اجازت کے بغیر جہاد میں شریک ہونا جائز نہیں۔ بشرطیکہ ماں باپ دونوں مسلمان ہوں۔ اگر ایک مسلمان ہو تو اسی سے اجازت طلب کرنا ضروری ہے۔ ہاں اگر ماں باپ کافر و مشرک ہیں تو ان سے جہاد میں شریک ہونے کے لئے اجازت طلب کرنا ضروری نہیں۔

ماں باپ سے احسان کی تین قسمیں:

- (۱) اپنے قول و فعل سے ان کو ایذا نہ پہنچائے۔ (۲) اپنے بدن اور مال سے ان کی خدمت کرے
- (۳) جب وہ بلائیں تو فوراً حاضر ہو جائے۔

پہلی قسم کی اطاعت ہر حال میں واجب ہے کیونکہ ماں باپ کو ایذا دینے والا عاق اور نافرمان

کہلاتا ہے۔ دوسری اطاعت جب واجب ہے کہ ماں باپ حاجت مند ہوں اور اولاد میں اس خدمت کی قدرت ہو اگر انہیں حاجت نہیں یا اولاد میں طاقت نہیں تو اس قسم کی اطاعت واجب نہیں۔ تیسری قسم کی خدمت کی یہ شرط ہے کہ ان کی خدمت میں حاضر ہونے سے کوئی شرعی خرابی پیدا نہ ہو۔ اگر نماز کا وقت جارہا ہو اور ماں باپ بلا رہے ہوں تو ان کے پاس نہ جائے بلکہ پہلے نماز پڑھے۔ (ازغبی)

نفل نماز اور والدین: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص جرجہ اپنے عبادت خانہ میں عبادت میں مشغول تھا۔ حمید بن ہلال کہتے ہیں حضرت ابو ہریرہ نے ہمیں اس کی ماں کے اسے بلانے کی کیفیت بھی بیان کی، یعنی اس کی ماں نے اپنے ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو اپنے ابروؤں پر رکھ کر اوپر اس کے عبادت خانہ کی طرف دیکھ کر اسے بلایا اور کہا ”یا جرجہ ان امک فتکلمنی“ اے جرجہ میں تیری ماں ہوں میرے ساتھ کلام کر۔

لیکن اس نے اسے نماز نوافل جاری رکھے ہوئے پایا۔ جرجہ نے کہا اے اللہ یہ میری ماں ہے اور یہ میری نماز (یعنی اس نے سوچا میں کیا کروں ماں سے کلام کروں یا نوافل ادا کرتا رہوں، آخر کار اس کے دل نے نوافل نماز کو ترجیح دی اور ماں سے کلام نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا) اس نے نماز کو اختیار کیا۔ ماں واپس چلی گئی، پھر دوسرے دن لوٹ کر آئی، پھر اس نے کہا اے جرجہ میں تمہاری ماں ہوں، میرے ساتھ کلام کرو جرجہ نے پھر کہا اے اللہ یہ میری ماں ہے اور یہ میری نماز۔ اس نے نماز کو ترجیح دی۔ اس کی ماں نے کہا:

”اللهم ان هذا جرجہ وهو ابني واني كلمته فابني ان يكلمني اللهم فلا

تمته حتى تربہ المومسات“

اے اللہ بیشک یہ جرجہ ہے اور وہ میرا بیٹا ہے بیشک میں نے اس سے کلام کیا اس نے

میرے ساتھ کلام کرنے سے انکار کر دیا، اے اللہ اس وقت تک موت نہ عطا کر یہاں

تک کہ اسے فاحشہ عورتیں دکھا دے۔

راوی کہتے ہیں اگر اس کی ماں اس کے لئے کسی بڑے فتنہ میں مبتلاء ہونے کی بددعا کرتی تو وہ

بھی قبول ہو جاتی۔ (ماں کی دعاء کی قبولیت کا اندازہ کریں) ایک شخص بھیڑ بکریاں کا چرواہا اس کے عبادت خانہ میں آ کر پناہ پکڑتا تھا ایک دن ایک عورت دیہات سے باہر آئی اس سے چرواہے نے بد فعلی کی وہ حاملہ ہو گئی، یہاں تک کہ اس نے ایک بچہ جنم دیا۔ لوگوں نے اس عورت سے پوچھا یہ بچہ کس کا ہے؟ اس نے کہا اس عبادت خانہ میں ایک شخص ہے اس کا ہے۔ لوگ اپنے زمین کھودنے کے آلات لے کر آ گئے۔ انہوں نے باہر سے (جریج کو) پکارا لیکن اسے نماز پڑھتے ہوئے پایا۔ اس نے لوگوں سے کوئی بات نہ کی۔ ان لوگوں نے اس کے عبادت خانہ کو گرانا شروع کر دیا۔ جب اس نے یہ ماجرا دیکھا تو وہ اپنے عبادت خانہ سے نیچے اترا۔ ان لوگوں نے کہا اس عورت سے پوچھ۔

حضور ﷺ نے فرمایا وہ مسکرایا اس نے بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا تمہارا باپ کون ہے؟ اس نے کہا میرا باپ بھیڑ بکریوں کا چرواہا ہے۔ جب لوگوں نے اس (ننھے معصوم بچے) سے یہ سنا تو (معذرت کے طور) پر کہا کہ ہم نے تمہارا عبادت خانہ جو گرایا ہے اسے سونے اور چاندی سے تعمیر کر دیتے ہیں۔ اس نے کہا نہیں تم مٹی کا ہی بنا دو جیسا وہ پہلے تھا۔ اتنا کہہ کر وہ پھر اپنے عبادت خانہ پر چڑھ گیا۔

(مسلم ج ثانی کتاب البر والصلة والادب)

اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ ماں کو راضی رکھنا نفلی عبادت سے مقدم ہے ماں کی ناراضگی اور بد دعاء دنیا اور آخرت میں عذاب کا سبب ہے۔ ماں باپ کا حکم پہلے مانے اور نفلی نماز بعد میں ادا کرے۔

مسئلہ: اگر نماز نفل جاری ہو تو ماں باپ کے بلانے پر نماز کو مکمل کر کے جائے نماز توڑے نہیں، جریج نے نماز کو نہ توڑنے کا فیصلہ نہیں کیا تھا بلکہ اس نے فیصلہ یہ کیا تھا کہ دو رکعت نفل مکمل کر کے پھر دو رکعت اور کی نیت کر لو، نوافل جاری رکھو، ماں سے بات کر کے وقت ضائع نہ کرو۔ اس کا یہ فیصلہ رب تعالیٰ کو بھی پسند نہ آیا اور ماں کی ناراضگی کا بھی ذریعہ بنا۔

مسئلہ: ماں باپ اگر گنہگار یا بد مذہب ہوں تو ان کی نرمی سے راہ راست پر لانے کی کوشش کرے اور اگر منافق یا کافر ہوں تو ان سے بھی ماں باپ کے ناٹے نرم سلوک رکھے۔ (اس مسئلہ کی تفصیل پہلے بیان ہو چکی ہے)۔

ماں باپ کے ساتھ احسان کرنے کے آداب:

- (۱) ماں باپ سے دلی محبت رکھے۔
- (۲) بات چیت اور اٹھنے بیٹھنے میں ان کے ادب کا لحاظ رکھے راستے میں ان کے آگے نہ چلے اور ان کے نام سے انکو نہ بلائے بلکہ ادب و احترام سے ان کو بلائے۔
- (۳) جتنا ممکن ہو سکے اتنا اپنا مال اور اپنی جان ان پر قربان کرے۔
- (۴) ہر کام اور ہر بات میں ان کی رضا مندی کا خیال رکھے۔
- (۵) ان کی وفات کے بعد ان کی وصیت کو پورا کرے۔
- (۶) ان کے لئے مغفرت کی دعا کرتا رہے۔
- (۷) ان کے لئے جتنا ہو سکے کبھی کبھی صدقہ و خیرات کرتا رہے۔
- (۸) ہر ہفتہ میں ایک مرتبہ قبرستان میں ان کی قبر کی زیارت کے لئے جائے اور اگر ہو سکے تو سورۃ یسین پڑھ کر ان کو ثواب پہنچائے۔
- (۹) ماں باپ کے دوستوں اور قرابت داروں سے محبت رکھے۔ ان کے ساتھ اچھا سلوک کرے نیک بخت اولاد اپنے والدین کے دوستوں کو اپنے والدین کی طرح سمجھتی ہے۔
- (۱۰) جتنا ہو سکے اپنے والدین کے متعلقین کو تحائف، ہدا یا وغیرہ دے یہ علامات محبت ہیں۔

(تفسیر عزیزی)

ایک مرتبہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما مکہ مکرمہ آ رہے تھے دوران سفر آپ نے اپنے ساتھ ایک گدھا بھی رکھا ہوا تھا کہ جب اونٹ کی سواری سے تھکان محسوس ہو تو گدھے پر سوار ہو کر کچھ راحت حاصل کر لیں گے۔ اور ایک گڈری آپ نے اپنے سر سے باندھ رکھی تھی۔

اسی سفر کے دوران ایک دن آپ اپنے گدھے پر سوار تھے، آپ کے قریب سے ایک اعرابی (دیہاتی) کا گزر ہوا آپ نے اس سے پوچھا کیا تم فلاں ابن فلاں نہیں ہو (یعنی اس کے باپ دادا کا نام لے کر اس سے پوچھا) اس نے کہا میں اسی شخص کا بیٹا ہوں۔

آپ نے اپنا گدھا اسے دے دیا کہ تم اس پر سواری کرو اور پگڑی بھی دے دی کہ یہ تم اپنے سر سے باندھ لو، آپ کے بعض ساتھیوں نے آپ کو (بطور تعجب) کہا کہ اس شخص کو آپ نے اپنے آرام کے لئے لیا ہوا گدھا دے دیا اور پگڑی بھی دے دی جو آپ اپنے سر سے باندھتے تھے۔

دوسری روایت میں ہے کہ یہ اعرابی تو تھوڑے مال پر بھی خوش ہو جاتے ہیں آپ نے فرمایا:

”انی سمعت رسول اللہ ﷺ یقول ان من ابر البر صلة الرجل اهل

ودابیه بعد ان یولی وان اباه کان صدیقاً لعمر“

(مسلم ج ۲ باب فضل صلة اصدقاء الاب والام ونحوهما)

بیشک میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ بیشک سب احسانوں سے اچھا احسان (یعنی سب فرمانبردار یوں سے اچھی فرمانبرداری) یہ ہے کہ انسان اپنے ماں باپ کا جانشین بننے کے بعد اپنے (ماں) باپ کے ساتھ تعلق رکھنے والے احباب کے ساتھ احسان سے پیش آئے، بیشک اس کا باپ (میرے باپ حضرت) عمر کا دوست تھا۔

بڑھاپے میں ماں باپ سے زیادہ شفقت و محبت کا حکم دیا گیا:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے آپ نے کہا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”رغم انفه رغم انفه قيل من یا رسول الله ﷺ قال من ادرك

والديه عند الکبر احدهما او کلاهما ثم لم یدخل الجنة“

(مسلم مشکوٰۃ باب البر والصلة)

وضاحت حدیث: رغم انفه کے دو معنی لئے گئے ہیں ایک یہ کہ خبر ہو۔ اس صورت میں معنی

یہ ہوگا کہ اس شخص کا ناک خاک آلود ہو گیا یعنی ذلیل و خوار ہو گیا اور دوسرا معنی یہ ہے (کہ شاید آپ نے

ایسی شخص کے خلاف دعا فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا) کہ وہ شخص ذلیل و خوار ہو جائے۔ اس معنی کے لحاظ

سے سخت الفاظ سے ڈرایا گیا ہے جس کے خلاف نبی کریم ﷺ دعاء فرمادیں وہ کتنا ہی بد بخت ہوگا۔

(مرقاۃ)

اس حدیث پاک سے یہ نتیجہ حاصل ہوا

”ان برهما عند کبرهما وضعفها بالخدمة والنفقة وغير ذلك سبب

لدخول الجنة فمن قصر فی ذلك فانه دخول الجنة“ (نووی)

بیشک ماں باپ سے احسان کرنا ان کے بڑھاپے اور کمزور حال ہوتے وقت جنت میں داخل ہونے کا ذریعہ ہے وہ احسان یہ ہے ان کی خدمت کرنا، انہیں خرچ دینا اور بہ طرح کی ان کی ضروریات کا خیال رکھنا اور جس شخص نے اس حال میں ان پر احسان کرنے میں کوتاہی کی وہ جنت میں داخل ہونے سے محروم ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ ۚ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ۖ إِنَّمَا يُبَلِّغُنَّ عَنْكَ الْكِبَرُ إِذَا هُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُلْ لَهُمَا أُفٌ وَلَا تَنْهَرُهُمَا وَقُلْ لَهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا ۚ وَأَخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذَّلٰلِ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَّانِي صَغِيرًا ۝﴾

(پ ۱۵ سورۃ اسراء)

”اور تمہارے رب نے حکم دیا کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو اگر تیرے سامنے ان میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان سے اف (ہوں) نہ کہنا اور نہ جھڑکنا اور ان سے تعظیم کی بات کہنا۔ اور ان کے لئے عاجزی کا بازو بچھا نرم دلی سے اور عرض کراے میرے رب تو ان دونوں پر رحم کر جیسا کہ ان دونوں نے بچپن میں مجھے پالا“

اس آیت کریمہ کے ترجمہ سے اتنا واضح ہو گیا کہ والدین سے بڑھاپے میں زیادہ شفقت اور محبت کرنے کا حکم دیا گیا آیت کریمہ کی مکمل وضاحت اپنے محل پر ہی انشاء اللہ آئے گی۔

ماں باپ کی وفات کے بعد ان سے حسن سلوک کا حکم:

حضرت ابو ربیعہ ساعدی فرماتے ہیں کہ میں بارگاہ رسالت میں حاضر تھا اسی اثناء میں ایک انصاری حضور اکرم ﷺ کی خدمت اقدس میں آیا اور عرض کی یا رسول اللہ میرے والدین کی وفات کے بعد کیا مجھ پر ان سے حسن سلوک کرنا ضروری ہے؟

”قال نعم خصال اربع الصلوة علیہما والاستغفار وانجاز عہدہما واکرام صدیقہما وصلۃ الرحمۃ الی لارحم لک الا من قیلہما فہو الذی بقی علیک من برہما بعد موتہما“

(ابن ماجہ، صحیح ابن حبان، روح المعانی)

”حضور نے فرمایا چار باتیں تجھ پر ضروری ہیں ان کی نماز جنازہ ادا کرنا، ان کے لئے

دعاء مغفرت کرتے رہنا جو وعدہ انہوں نے کیا تھا اسے پورا کرنا۔ اور ان کے دوستوں کا احترام کرنا اور ان کے رشتہ داروں سے صلہ رحمی کرنا جن سے ان کی وجہ سے رشتہ داری ہو۔ یہ نیکی ایسی ہے جو ان کی وفات کے بعد بھی تم پر لازمی ہے۔ (صبا القرآن)

ابن ابی الدنیا نے محمد بن نعمان سے مرفوع حدیث بیان کی کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

”من زار قبر ابویہ او احدہما فی کل جمعة غفرلہ و کتب براہ“

(بیہقی، روح المعانی)

جس شخص نے ہر جمعہ میں (ہفتہ میں ایک دن) اپنے والدین کی قبر کی زیارت کی یا ان میں ایک کی قبر کی زیارت کی (یعنی ایک کا ہی ابھی انتقال ہوا) اس کی مغفرت کر دی جاتی ہے اور اس کا (گناہوں اور عذاب سے) بری ہونا لکھ دیا جاتا ہے۔

خدا را انصاف کریں: آئیے بد مذہبوں کے نقش قدم پر چلنے والو، یہود و نصاریٰ کے پیروکارو، ذرا ضد اور ہٹ دھرمی کو چھوڑ کر انصاف کا فیصلہ کریں۔ ایسا مقام جو اسلام نے عورت کو بحیثیت ماں ہونے کے اور مرد کو بحیثیت باپ ہونے کے دیا وہ کسی اور مذہب میں ہے؟ انسانی حقوق کے دعویدارو، اسلام کے مخالفین ایسی کوئی مثال نہیں پیش کر سکتے۔

کیا خوب مفکر اسلام مفسر قرآن حضرت پیر محمد کرم شاہ رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ”ان واضح تعلیمات اور روشن ارشادات کے بعد آپ یورپ و امریکہ وغیرہ متمدن ممالک کے حالات کا جائزہ لیجئے وہاں آپ کو ایسی اولاد شاذ و نادر ہی ملے گی جو بوڑھے والدین کی خدمت اپنے لئے سرمایہ سعادت یقین کرتی ہو۔ شادی کے بعد لڑکا اپنے والدین سے الگ ہو جاتا ہے اور اپنے والدین کی خدمت کے لئے اخلاقی یا قانونی ذمہ داری قبول نہیں کرتا۔ اسی لئے تو ان ممالک کی حکومتوں کو ایسی پناہ گاہیں بنانا پڑتی ہیں جہاں بوڑھے اور والدین کو رکھا جائے تاکہ وہ زندگی کے آخری ایام وہاں بسر کر سکیں۔

(صبا القرآن)

افسوس صد افسوس یہ ہے کہ آج کل پاکستان میں بھی اسلامی تعلیمات سے ہٹ کر بوڑھوں کے لئے پناہ گاہیں بنانے کی سوچ تیز ہوتی جا رہی ہے یا دوسرے لفظوں میں یوں کہیں یہودیت و نصرانیت کی تہذیب و تمدن کو حاصل کرنے کی بے چینی لاحق ہو رہی ہے۔

نبی کریم ﷺ کا دودھ پلانے والی ماؤں کا احترام:

حضرت ابو الطفیل غنوی فرماتے ہیں میں نبی کریم ﷺ کے پاس بیٹھا ہوا تھا:

”اذ اقبلت امرأة فبسط النبي ﷺ رداءه حتى قعدت عليه فلما ذهبت

قيل هذه ارضعت النبي ﷺ“ (ابو داؤد، مسکوٰۃ باب المحرمات)

ایک عورت آئی جس کے لئے نبی کریم ﷺ نے اپنی چادر بچھائی وہ اس پر بیٹھی پھر چلی گئی۔ تو (لوگوں کو) بتایا گیا کہ اس نے نبی کریم ﷺ کو دودھ پلایا ہے۔

یہ حضرت حلیمہ سعدیہ تھیں جو حنین کے دن نبی کریم ﷺ کے پاس آئی تھیں: ”فقام اليها وبسط رداءه لها وجلست“ اور آپ ان کے لئے کھڑے ہوئے اور ان کی تعظیم کی اور ان کے ساتھ خوش خلقی سے پیش آنے کے لئے آپ نے چادر بچھائی جس پر وہ بیٹھیں۔ جن لوگوں کو علم نہیں تھا وہ تعجب کر رہے تھے کہ عظیم المرتبت عورت کون ہے۔ لیکن جب علم ہوا تو پتہ چلا کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی دودھ پلانے والی ماں کا کتنا عظیم احترام کیا۔

(مرقاۃ، مواہب اللدنیہ)

نبی کریم ﷺ کا اپنی پرورش کرنے والی کی زیارت کرنا:

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کہا چلو ہم حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا کی زیارت کریں ”کما کان رسول اللہ ﷺ یزورھا“ جس طرح رسول اللہ ﷺ ان کی زیارت کیا کرتے تھے۔ جب ہم ان کے پاس پہنچے تو وہ روئیں۔ حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے انہیں کہا تو کیوں رو رہی ہو حالانکہ نبی کریم ﷺ کا مقام اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت بہتر ہے۔ انہوں نے فرمایا میں اس لئے نہیں رو رہی کہ مجھے یہ علم نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا مقام اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت بلند و بالا ہے۔ میرے رونے کی وجہ یہ ہے کہ آسمانوں سے وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا ہے۔ انہوں نے ان دونوں کو بھی رونے پر برا بیچتہ کر دیا۔ ان دونوں حضرات نے بھی رونا شروع کر دیا۔

(مسلم ج ۲ باب فضائل ام ایمن)

ام ایمن نبی کریم ﷺ کو اپنی گود میں لے کر پرورش کرنے والی ہیں۔ حضور ﷺ ان کی زیارت کے لئے جاتے تھے۔ اس حدیث پاک سے یہ واضح ہوا کہ نیک لوگوں کی زیارت کرنا مستحب ہے خواہ زیارت کرنے والا خود بھی اس سے زیادہ افضل کیوں نہ ہو۔ اپنے متعلقین کے احباب کی زیارت کرنا بھی مستحب ہے۔

کسی کے ماں باپ کو گالیاں دینے سے منع کرنے میں حکمت:

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے کہا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہ بہت بڑا گناہ ہے کہ کوئی شخص اپنے ماں باپ کو گالیاں دے۔ صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ کوئی ایسا شخص بھی ہوگا جو اپنے ماں باپ کو گالیاں دیتا ہوگا۔

”قال نعم يسب ابا الرجل فيسب اياه ويسب امه فيسب امه“

(بخاری، مسلم، مشکوٰۃ باب البر والصلة)

آپ نے فرمایا ہاں جو شخص کسی کے باپ کو گالیاں دیتا ہو وہ اس کے باپ کو گالیاں دے اور یہ کسی کی ماں کو گالیاں دے وہ اس کی ماں کو گالیاں دے۔

یعنی کسی کے ماں باپ کو گالیاں نہ دو ورنہ وہ تمہارے ماں باپ کو گالیاں دے گا۔ اس پر تم خود اپنے ماں باپ کو گالیاں دینے کا سبب بنو گے۔

فائدہ عظیمہ: اسکندر سے کسی نے پوچھا کہ تمہارے والدین کا تم پر احسان زیادہ ہے یا استاذ کا۔ اس نے کہا مجھ پر میرے استاذ کا احسان زیادہ ہے۔

”لانه تحمل انواع الشدائد والمحسن عليه عند تعليمي ارتعنى في

نور العلم“

اس لئے کہ استاذ نے میری تعلیم میں طرح طرح کی مشکلات و تکالیف کو برداشت کر کے مجھے نور علم سے خوشحال کیا۔

لیکن اس کے برخلاف والدین کی اپنی خواہشات کا بھی کچھ دخل تھا جنہوں نے مجھے عالم عدم سے نکال کر عالم کون و فساد کی آفات و بلیات کے حوالے کر دیا۔

کلمات ماثورہ میں ایک مشہور قول یہ ہے ”خير الاءاء من علمك“ بہتر آباء وہ ہیں

جنہوں نے تمہیں علم سکھایا۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

”حق العالم علی الجاہل وحق الاستاذ علی التلمیذ واحد علی السواء وهو ان لا یفتح بالکلام قبلہ ولا یجلس مکانہ وان غاب ولا یرد علی کلامہ ولا یتقدم علی مشیہ“

عالم کا حق جاہل پر اور استاذ کا حق شاگرد پر ایک جیسا ہی ہے وہ یہ کہ ان کے کلام سے پہلے یہ کلام شروع نہ کرے ان کی جگہ نہ بیٹھے بیشک وہ غائب ہی کیوں نہ ہو ان کے کلام کو رد نہ کرے ان کے آگے نہ چلے، استاذ اور عالم کی مسند پر ان کی عدم موجودگی میں بھی نہ بیٹھے اور ان سے اگر اختلاف بھی ہو تو ان کے کلام کو رد کرنے کے بجائے مستحسن انداز پر اس پر دلائل پیش کرے۔

عالمگیری میں ہے:

”ینبغی للرجل ان یراعی حقوق استاذہ و آدابہ ولا یضن بشئی من مالہ“

انسان کو چاہئے کہ وہ اپنے استاذ کے حقوق و آداب کی رعایت کرے اور اس پر اپنا مال خرچ کرنے میں بخل سے کام نہ لے یعنی استاذ اگر مالی طور پر پریشان حالی کا شکار ہو جائے تو شاگردوں کو چاہئے کہ اپنے مال سے استاذ سے تعاون کریں۔

عالمگیری میں تاتارخانیہ کے حوالہ سے نقل کیا گیا ہے:

”بقدم حق معلمہ علی حق ابویہ وسائر المسلمین ویتواضع لمن علمہ خیرا ولو حرفا ولا ینبغی ان یخذلہ ولا یستأثر علیہ احدا فان فعل ذلک فقد قصم عروۃ من عری الاسلام ومن اجلالہ ان لا یقرع بابہ بل ینتظر خروجه“

استاذ کا حق والدین کے حق اور تمام مسلمانوں کے حق سے مقدم ہے جس شخص نے اسے اچھا علم سکھایا ہو خواہ ایک حرف ہی ہو اس سے عاجزی کے ساتھ درپیش آئے۔ استاذ پر کسی اور کو ترجیح نہ دے اگر اس نے ایسا کیا تو اسلام کی رسیوں میں سے ایک رسی کو توڑ دیا استاذ کی بزرگی کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے دروازے کو نہ کھٹکائے بلکہ اس کے باہر آنے کا انتظار کرے۔

طبرانی نے حضرت ابو امامہ سے روایت کی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”من علم عبدا آية من كتاب الله تعالى فهو مولاه“

”جس شخص نے کسی کو قرآن پاک کی ایک آیت بھی سکھادی تو وہ اس کا مولی ہو گیا۔“

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”من علمنی حرفاً فقد صیرنی له عبدا ان شاء باع وان شاء اعتق“

جس شخص نے مجھے ایک حرف بھی سکھادیا بیشک اس نے مجھے اپنا غلام بنالیا، اگر چاہے تو

فروخت کر دے اور اگر چاہے تو آزاد کر دے۔

یعنی اسے مجھ پر اتنا حق حاصل ہو گیا جتنا مالک کو اپنے غلام پر حق حاصل ہوتا ہے۔ یہاں تشبیہ

ہے حقیقی غلامیت مراد نہیں۔ (از شرح الحقوق لطرح العقوق للامام احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ)

نکتہ عظیمہ ، فائدہ جلیلہ : استاذی المکرم حضرت مولنا اشرف سیالوی مدظلہ

العالی جامعہ جماعتیہ مہر العلوم رحیم ٹاؤن شکر یال راولپنڈی (جو راقم کے زیر اہتمام چل رہا ہے) کے جلسہ

دستار فضیلت پر تشریف لائے۔ دوران تقریر آپ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ کو بھائی کہنا جائز نہیں۔ اس

لئے کہ بھائی تو وہ ہو سکتا ہے کہ جن کا باپ ایک ہو۔ رب تعالیٰ کے ارشاد گرامی:

﴿النَّبِيُّ أَوْلَىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنفُسِهِمْ وَأَزْوَاجُهُ أُمَّهَاتُهُمْ﴾

”یہ نبی مومنوں کا ان کی جان سے زیادہ مالک ہے اور اس کی بیبیاں ان کی مائیں ہیں“ سے

واضح ہو رہا ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنی امت کے تمام مومنین کے روحانی باپ ہیں اور آپ کی بیبیاں روحانی

مائیں ہیں اور اس رشتہ سے ”کل مومن اخوة“ تمام مومنین آپس میں ایک دوسرے کے بھائی

بھائی بن گئے۔ اگر نبی کریم ﷺ کو بھی اپنا بھائی مان لیا جائے تو اپنا روحانی باپ کسے مانا جائے گا۔ جس

کی نسبت آپ کو اپنا بھائی کہا جائے۔

اور اگر کوئی یہ کہے کہ سب ہی آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں اس لئے آپ ہمارے بھائی ہیں۔ تو

اس میں مومنین کی تخصیص کیا۔ آدم علیہ السلام کی اولاد میں تو کفار بھی داخل ہیں۔ اس طرح رب تعالیٰ

کے ارشاد گرامی ”کل مومن اخوة“ میں مؤمن کی قید کا کوئی فائدہ ہی باقی نہیں رہتا۔

﴿وَذِي الْقُرْبَىٰ﴾: عطف ہے ”ذی القربی“ کا ”بالوالدین“ پر۔ چونکہ رشتہ داروں

کا حق والدین کے حق کے تابع ہے۔ اور رشتہ داروں پر احسان والدین کے احسان کے واسطے سے ہے

اسی وجہ سے والدین کا دل پہلے کیا کیا اور قرابت داروں کا بعد میں "فلہذا حسن عطف القرابة علی الوالدین" اسی وجہ سے "ذی القربی" کا عطف "بالوالدین" پر بہتر ہے۔ (خازن) ﴿الْقُرْبَى﴾ قرابت کے معنی میں ہے اور وہ مصدر ہے جیسا کہ "رجعی" اور "عقبی" مصدر ہیں۔

"ای امرنا ہم بالاحسان الی القرابات بصلۃ ارحامہم"

یعنی ہم نے ان کو حکم دیا کہ وہ صلہ رحمی کر کے اپنے رشتہ داروں پر احسان کریں۔ (فرضی)

ایک احتمال اس میں یہ بھی ہے کہ "قربی" میں الف تانیث کا ہو اور معنی "رحم اور صلب" کی قرابت ہو۔

روح السعدی

حدیث شریف میں ہے "الرحم شجنة من الرحمن" یعنی قرابت شعبہ ایست از شعبہای ظہور اسم رحمن گویا رحمت الہی دریں پردہ ظہور میکند۔ یعنی حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ "رحم" رحمٰن رب تعالیٰ کے اسم گرامی کے ظہور کے شعبوں میں سے ایک شعبہ ہے گویا کہ رحمت الہی اس پردہ سے ظاہر ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے رب تعالیٰ کی طرف سے رحم کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا "من وصلک وصلته ومن قطعک قطعته" یعنی جس نے صلہ رحمی کی میں اس سے قرب رکھوں گا۔ اور جس نے قطع رحمی کی میں اس سے مقاطعت کروں گا۔

عقلی مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے قریبی رشتہ داروں سے اچھا سلوک رکھے کیونکہ انسان کو شادی وفات اور مشکلات میں بغیر کسی کی مالی معاونت، اور بدنی معاونت وغیرہ کے تمام کام سرانجام دینے ممکن نہیں اور یہ بھی واضح ہے کہ ہر انسان سے اس قسم کے کاموں میں امداد طلب کرنا ممکن نہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ ایسے لوگوں سے امداد طلب کی جائے جن سے طبعی طور پر محبت پائی جاتی ہو۔ اور قریبی رشتہ داری ہو جو اس کے حالات سے باخبر ہوں۔ اس کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھتے ہوں۔ اس طرح رشتہ داروں کا ایک دوسرے سے تعاون کرنا ان کے لئے نفع مند ہوگا اس کے بغیر ان کی زندگی میں دشواریاں ہی دشواریاں ہوں گی۔

اہل قرابت کی دو قسمیں:

(۱) یعنی ان میں سے ایک قسم یہ ہے کہ رشتہ داری کے ساتھ ساتھ محرمیت (محرم ہونا) بھی حاصل ہو جیسا کہ چچا، ماموں، پھوپھی، خالہ، بھائی، بہن، بھائی اور بہن کی اولاد ان لوگوں سے احسان کرنا

فرض ہے اور اس کا تارک گنہگار ہے۔

(۲) دوسری قسم یہ ہے کہ رشتہ داری تو ہو لیکن محرمیت نہ ہو جیسے چچا کی اولاد، ماموں کی اولاد، پھوپھی کی اولاد، خالہ کی اولاد وغیرہا۔ ان کی امداد کرنا سنت مؤکدہ ہے۔ اس امداد سے مراد ہے ان کی مالی طور پر بدنی طور پر معاونت کرنا ان کی تکالیف میں ہاتھ بٹانا۔

”اما احسان بمعنی ترک ایذاء پس نسبت بہمہ اینہا فرض است بلکہ نسبت بسائر مسلمین“

لیکن احسان کا معنی یہ لینا کہ ان کو ایذاء نہ پہنچائی جائے۔ یہ احسان تمام رشتہ داروں پر کرنا فرض ہے بلکہ تمام مسلمانوں سے یہ احسان کرنا فرض ہے۔ اس لئے کہ کسی مسلمان کو بھی ایذاء پہنچانا، نقصان دینا ناجائز ہے حرام سے بچنا مسلمان کے لئے فرض ہے۔

نکتہ : ﴿ذِي الْقُرْبَىٰ﴾ کو واحد ذکر کیا گیا ہے۔ اور یتامی اور مساکین کو جمع ذکر کیا گیا ہے اس کی وجہ کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اس سے یہ سمجھایا گیا ہے کہ تمام رشتہ داروں سے ایک جیسا سلوک رکھے اگر محرم رشتہ دار ہیں تو ان تمام سے ایک جیسا تعلق رکھے تاکہ بعض کی دل شکنی کا سبب نہ بنے اگر رشتہ دار محرم نہیں تو ان تمام سے بھی ایک ہی قسم کا تعلق رکھے۔ لیکن یتیموں اور مسکینوں میں سے ہر ایک سے ایک جیسا سلوک کرنا ضروری نہیں۔

نکتہ ، دیگر : یہاں ﴿وَذِي الْقُرْبَىٰ﴾ میں باء کو نہیں ذکر کیا اور سورۃ نساء میں ﴿وَبِذِي الْقُرْبَىٰ﴾ ذکر کیا جس میں ”باء“ بھی پائی گئی ہے وجہ فرق کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں بنی اسرائیل سے وعدہ لینے کا ذکر ہے جو والدین کے بغیر اور رشتہ داروں کے حقوق کو کوئی حیثیت نہیں دیتے تھے اس لئے ﴿وَبِالْوَالِدَيْنِ﴾ کے تابع رشتہ داروں کا ذکر کیا گیا۔

اور سورۃ نساء میں نبی کریم ﷺ کی امت کو حکم دیا گیا ہے وہ رشتہ داروں کے حقوق کو فطری اور عقلی طور پر سمجھتے تھے ان کو تاکید کے طور پر شرعی حیثیت سے بھی حکم دے دیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے سورۃ نساء میں ”باء“ کا اعادہ کر کے قرابت داروں کے حقوق کو مستقل حیثیت دے دی گئی اور یتامی اور مساکین کے

﴿وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَبِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ﴾

﴿وَالْيَتَامَى﴾: ”یتیموں کے ساتھ بھلائی کرو“ یتامی جمع ہے یتیم کی۔ جیسے ندیم کی جمع ندای آتی ہے۔ اور کبھی یتیم کی جمع ایام بھی آتی ہے ”والیتیم اصل معناه الانفراد“ اور یتیم کا اصل معنی ہے منفرد ہونا۔ اسی لئے کہا جاتا ہے ”درۃ یتیمہ“ یکتا موتی، اور وہ گھر جو دوسرے گھروں سے جدا بنا ہوا ہو اسے ”بیت یتیم“ کہا جاتا ہے۔

آزاد کشمیر اور مری اور ایبٹ آباد وغیرہ کے پہاڑی علاقوں میں اکثر گھریوت یتامی (مرکب توصیفی) ہی ہیں۔ اسی معنی کے لحاظ پر ”یقال صبی یتیم ای منفرد من ابیه“ بچے کو یتیم کہا جاتا ہے کہ یہ اپنے باپ سے منفرد ہے۔

”وقال ثعلب الغفلة“ یتیم کا ایک معنی غفلت بھی ہے۔ یتیم بچہ بھی چونکہ اپنے باپ کی فرمانبرداری سے غافل ہوتا ہے اس لئے اسے یتیم کہا جاتا ہے۔

”وقال ابو عمرو والابطاء“ یتیم کا ایک معنی دیر کرنا بھی آتا ہے چونکہ یتیم بچے کا باپ نہیں ہوتا اس لئے گویا کہ اس سے باپ کی فرمانبرداری میں تاخیر ہوتی ہے لہذا اسے یتیم کہہ لیا جاتا ہے۔

”وهو فی الآدمیین من قبل الآباء ولا یتیم بعد بلوغ وفی البہائم من

قبل الامہات من قبل الامہات وفی الطیور من جہتہما“

انسان وہ یتیم ہے جس کا باپ نہ ہو اور اس وقت تک یتیم ہے جب تک بالغ نہیں ہوتا،

بالغ ہونے کے بعد یتیم نہیں رہتا اور چوپاؤں میں سے وہ یتیم ہے جس کی ماں نہ ہو،

اور پرندوں میں سے وہ یتیم ہے جس کے ماں باپ دونوں ہی نہ ہوں۔ (ازروح المعانی)

مسئلہ: انسان کا نسب باپ کی طرف منسوب ہوتا ہے: ”وانما اضیف الادمی الی

ابیہ تشریفاً له وصیانة له عن الضیاع“ انسان کی نسبت اس کے باپ کی طرف ہوتی ہے اس کی

بزرگی کے پیش نظر اور اس کو ضائع ہونے سے بچانے کی غرض سے۔ کیونکہ وراثت وغیرہ کی دار و مدار اسی

پر ہے کہ اولاد کو باپ کی طرف منسوب کیا جائے۔

”ان الاصل فی الحيوانات اللاحق بالام“ اصل یہ ہے کہ جانوروں کو ان کی ماؤں کی طرف منسوب کیا جائے اسی قانون کے پیش نظر اگر کوئی وحشی جانور باپ ہو اور گھریلو جانور ماں ہو تو ان کی اولاد کو گھریلو سمجھ کر قربانی کے جائز ہونے کا حکم ثابت ہے۔

”ان نزل الذنب علی الشاة یضحی بالولد“ اگر بھیڑیے اور بکری کے ملاپ سے کوئی بچہ پیدا ہو جائے تو اس کی قربانی جائز ہے اسے کھانا جائز ہے۔ اس لئے کہ اس کی ماں بکری ہے جو حلال جانور ہے۔
(شامی ج اول ص ۱۶۵)

یتیم کی پرورش مستحسن کام:

”قال رسول الله ﷺ، کافل الیتیم له او لغيره انا وهو کھاتین فی الجنة
واشار مالک بالسبابة والوسطی“

حدیث پاک کے راویوں میں سے ایک راوی مالک نے اپنی شہادت کی انگلی اور درمیان والی انگلی سے اشارہ کر کے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یتیم وغیرہ کی کفالت کرنے والا اور میں جنت میں اس طرح ہوں گے یعنی آپ نے اپنی انگلیوں سے اشارہ کر کے فرمایا جسے مالک نے اسی طرح بیان فرمایا ”یعنی اسے میرا قرب حاصل ہوگا“۔

☆ ”عن ابن عباس قال قال رسول الله ﷺ من ضم یتیمًا من بین مسلمین الی طعامه وشرابه حتی یغنیه الله عزوجل غفرت له ذنوبه البتة الا ان یعمل عملاً لا یغفر ومن اذهب الله کریمتیه فصبر واحتسب غفرت له ذنوبه قال وما کریمتاه؟ قال عیناه، ومن کان له ثلاث بنات او ثلاث اخوات فانفق علیهن واحسن الیهن حتی ین او یمتن غفرت له ذنوبه البتة الا ان یعمل عملاً لا یغفر، فناداه رجل من الاعراب ممن هاجر فقال یا رسول الله او اثنتین؟ فقال رسول الله ﷺ او اثنتین“

جس شخص نے مسلمانوں میں سے یتیم کو اپنے ساتھ کھانے، پینے میں شریک کیا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اسے بے پرواہ کر دیا (یعنی وہ بالغ ہو گیا) اللہ تعالیٰ (یتیم کو اپنے ساتھ کھانے پینے میں

شریک کرنے والے) اس شخص کے گناہ یقیناً معاف فرما دے گا ہاں البتہ اس نے کوئی ایسا عمل نہ کیا ہو جو قابل مغفرت نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے جس شخص کی دو کریم چیزوں کو لے لیا اور اس نے صبر سے کام لیا اور دین پر قائم رہا تو اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کی مغفرت فرما دے گا۔

صحابہ کرام نے پوچھا یا رسول اللہ ”وہ دو کریم چیزیں کیا ہیں؟“ آپ نے فرمایا اس کی دونوں آنکھیں۔ اور آپ نے فرمایا جس شخص نے اپنی تین بیٹیوں یا تین بہنوں (جو بیوہ ہوں یا مطلقہ) پر اپنا مال خرچ کیا اور ان پر احسان کیا یہاں تک کہ انہوں نے اور نکاح کر لیا یا وہ فوت ہو گئیں۔ تو اس شخص کی رب تعالیٰ یقیناً مغفرت فرمائے گا ہاں البتہ اس کا کوئی ایسا جرم نہ ہو جو قابل معافی جرم نہیں۔

ایک مہاجر اعرابی شخص نے آپ سے سوال کیا، یا رسول اللہ یا دو ہوں (یعنی دو بیٹیوں اور دو بہنوں پر مال خرچ کرنے والے کا کیا حکم ہے؟) نبی کریم ﷺ نے فرمایا خواہ دو ہی ہوں یعنی دو کی ذمہ داری اٹھانے والا بھی قابل مغفرت ہوگا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اس حدیث کو عجیب حوصلہ افزاء مغفرت کا ذریعہ فرماتے تھے۔ حدیث پاک سے یتیم پر احسان کرنا باعث مغفرت ہونا واضح ہو گیا۔

﴿وَالْمَسَاكِينَ﴾: ”اور مسکینوں سے بھلائی کرو“ مسکین ماخوذ ہے سکون سے، چونکہ فقر نے اسے روک رکھا ہوتا ہے اس لئے اسے مسکین کہا جاتا ہے اور یا اسے مسکنت سے لیا ہوا ہے۔ جس کا معنی ہے حقیر اور ذلیل ہونا، یعنی وہ اپنے مال کے کم ہونے کی وجہ سے لوگوں کی نظر میں حقیر اور ذلیل ہوتے ہیں۔ مسکین کا سکون یا مسکنت سے ماخوذ ہونے کا فرق طلباء کرام راقم کے حاشیہ میزان الصرف میں دیکھیں۔

یتامی کے بعد مساکین کا ذکر کیا گیا اس لئے کہ انسان کبھی مساکین پر اس لئے رحم کرتا ہے کہ وہ میری خدمت کریں گے اس طرح انسان کی اپنی ذہنی کیفیت مساکین پر رحم کرنے کی زیادہ ہوتی ہے۔ لہذا رب تعالیٰ نے یتامی کا پہلے ذکر کر کے واضح کر دیا کہ رحم کرنے کے لحاظ پر ان کا حق پہلے ہے۔ اس وجہ سے بھی ان کا حق پہلے ہے کہ وہ نابالغ ہونے کی وجہ سے کوئی ذریعہ معاش حاصل نہیں کر سکتے۔ لیکن مساکین کچھ نہ کچھ محنت و مزدوری کر کے مال حاصل کر سکتے ہیں۔

(از کبیر)

مساکین پر رحم کرنا:

”وهذا يتضمن الحظ على الصدقة والمؤاساة وتفقد احوال المساكين والضعفاء“

مسکینوں پر بھلائی کرنے کا حکم عطا فرما کر مسکین اور ضعیف لوگ جو کمزور حال ہیں ان پر صدقہ کرنے اور ان پر غم کھانے کا حکم دیا گیا۔

☆ ”روی مسلم عن ابی ہریرۃ عن النبی ﷺ قال الساعی علی الارملة والمسکین کالمجاهد فی سبیل اللہ واحسبہ قال وکالقائم لا یفتر وکالصائم لا یفطر“

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیوہ عورت اور مسکین شخص کی امداد کرنے والا اس شخص کی طرح ہے جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے والا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں میرا گمان یہ ہے کہ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ وہ اس شخص کی طرح ہے جو بغیر سستی کے قیام کرنے والا ہے (یعنی رات کو بغیر سستی کے نوافل ادا کرنے والے کی طرح ہے) اور اس روزہ دار کی طرح ہے جو افطار نہ کرتا ہو۔ یعنی سوائے ایام مہینہ (روزہ رکھنا جن دنوں میں منع ہے) کے ہر دن روزہ رکھے۔

☆ ”قال ابن المنذر وکان طاؤس یری السعی علی الاخوات افضل من الجہاد فی سبیل اللہ“

ابن منذر نے کہا طاؤس بہنوں کی امداد کرنے کو اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے افضل سمجھتے تھے۔ لیکن یہ خیال رہے کہ یہ اس وقت ہے جب جہاد فرض نہ ہو جائے فرض عین کے مقابل مستحبات افضل نہیں ہو سکتے۔

﴿وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا﴾: ”اور کہو لوگوں سے اچھی بات“ ای قولاً حسناً سماہ بہ لمبالغۃ ”حسن“ مصدر ہے مبالغہ کے طور پر ذکر ہے کہ تم لوگوں سے بہت ہی اچھی بات کرو۔

مختصر الفاظ لیکن معانی کثیر: یعنی اچھی بات کرنے کے کئی مطالب ہیں۔ بظاہر الفاظ مختصر ہیں لیکن مطالب کثیر ہیں۔

(۱) ”والمراد قولوا لہم القول الطیب وجاوبوہم باحسن ما یحبون“

مراد یہ ہے کہ تم لوگوں سے اچھی بات کرو اور تم ان کو ایسا جواب دو جو وہ پسند کرتے ہوں۔

(۲) ”مروہم بالمعروف وانہوہم عن المنکر“

اور اس سے مراد یہ ہے کہ لوگوں کو اچھے کاموں کا حکم دو اور برے کاموں سے منع کرو۔

(۳) ”قولوا لہم لا الہ الا اللہ مروہم بہا“

لوگوں کے سامنے تم خود بھی ”لا الہ الا اللہ“ کہو اور ان کو بھی حکم دو کہ تم بھی ”لا الہ الا اللہ“ کہو۔

(۴) ”اعلموہم بما فی کتابکم من صفۃ رسول اللہ ﷺ“

جو تمہاری کتاب میں نبی کریم ﷺ کی صفات مذکور ہیں وہ اور لوگوں کو بھی بتاؤ یعنی تمہارا

دوسرے لوگوں کو صاف صاف بتانا اچھی بات ہے۔ (روح المعانی)

(۵) ”قولوا للناس صدقا فی امر محمد ﷺ ولا تغیروا نعتہ“

نبی کریم ﷺ کی صفات کو تبدیل نہ کرو اور آپ کے متعلق لوگوں سے سچ سچ بیان کرو۔

(قرطبی)

یہاں سے پتہ چلا کہ نبی کریم ﷺ کے اوصاف کو چھپانا یہودیوں کا طریقہ تھا آج کل بھی جھگڑا

صرف نبی کریم ﷺ کے اوصاف پر ہے آپ کے فضائل والی احادیث کو ایڑی چوٹی کا زور لگا کر ضعیف کہا

جاتا ہے۔ گستاخان رسول اللہ ﷺ کی تو بات ہی کیا ہے لیکن افسوس کہ سنیت کے لبادہ میں گستاخوں کے

ایجنٹ بھی وہی کام کر رہے ہیں جو ان کے آقاؤں نے کیا۔

مٹ گئے، مٹ جائیں گے سب اعداء تیرے نہ مٹا ہے نہ مٹے گا کبھی چرچا تیرا

تنبیہ: ”والظاہر ان هذا الامر من جملة الميثاق الماخوذ علی بنی اسرائیل“

اس آیت کریمہ سے ظاہر طور پر یہی واضح ہو رہا ہے کہ ﴿وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا﴾ بھی اسی میثاق کا

حصہ ہے جو بنی اسرائیل سے لیا گیا۔ یعنی جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا..... اور ان کو یہ کہہ کر

”کہ لوگوں سے اچھی بات کرو“ بھی عہد لیا۔ (روح المعانی)

اسی قول پر تقریباً قرطبی رحمہ اللہ کی یہ تفسیر بھی دلالت کر رہی ہے:

”وقال طلحة بن عمر قلت لعطاء انک رجل یجتمع عندک ناس ذو

اہواء مختلفہ وانا رجل فی حدة فاقول لهم بعض القول الغلیظ حال لا
تفعل يقول الله تعالى ﴿ وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا ﴾ فدخل فی هذه الآية اليهود
والنصارى فكيف بالحنیفی وفي بعض نسخ الاصل " وفي غیرهما "

طلحہ بن عمر نے کہا، میں نے عطا کو کہا بیشک تو وہ شخص ہے جس کے پاس لوگ جمع ہوتے ہیں جو
مختلف خواہشات اور مختلف طبیعتیں رکھنے والے ہوتے ہیں۔ (لیکن تم ان سے اچھا کلام کرتے ہو)
لیکن میری طبیعت میں تیزی ہے کہ میں بعض لوگوں سے سخت کلام بھی کر لیتا ہوں۔ انہوں نے کہا ایسا نہ
کیا کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿ وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا ﴾ لوگوں سے اچھی بات کہو۔ جب اس
آیت میں یہود اور نصاریٰ داخل ہیں تو ان کے غیر کیوں داخل نہیں ہوں گے۔ یعنی اگرچہ یہ بنی اسرائیل
سے عہد لیا گیا تھا لیکن حکم عام ہے۔ جو نبی کریم ﷺ کی امت کو بھی شامل ہے۔

☆ "وروی عن النبی ﷺ انه قال لعائشة لا تكونی فاحشة فان الفحش لو کان رجلا
لکان رجلا سوء"

نبی کریم ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو فرمایا فحش کلام والی کبھی نہ بننا، اس لئے کہ فحش
کلام کرنے والا شخص برا شخص ہوتا ہے۔

ایک اور قول: ابھی تک جو ذکر کیا اس کا مطلب یہ تھا کہ ﴿ وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا ﴾
بھی بنی اسرائیل سے لئے ہوئے میثاق کا حصہ ہے کہ یہ خطاب بھی بنی اسرائیل کو ہے۔ لیکن ایک قول یہ
ہے "ان المخاطب به الامة" کہ بیشک اس میں خطاب ہے نبی کریم ﷺ کی امت کو پھر اس میں کلام
ہے کہ یہ منسوخ آیات قتال سے یا محکم ہے (یعنی منسوخ نہیں) اسی طرح اسمیں مختلف اقوال ہیں۔ کہ
"للناس" سے مراد نیک مؤمن لوگ ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ نیک مؤمن لوگوں سے اچھی بات کرو، اس
قول کے مطابق کفار اور فساق سے اچھی بات کرنے کا حکم ہمیں نہیں دیا گیا، بلکہ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم
ان پر لعنت کریں ان کی مذمت بیان کریں اور ان سے جنگ کریں۔ اسی طرح رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ لَا يُحِبُّ اللَّهُ الْجَهْرَ بِالسُّوءِ مِنَ الْقَوْلِ إِلَّا مَنْ ظَلَمَ ﴾

"اللہ پسند نہیں کرتا بری بات کا اعلان مگر مظلوم سے۔"

یعنی مظلوم شخص ظالم کے برے اقوال و افعال کو لوگوں اور حکام سے واضح طور پر بیان کرے۔
لیکن ایک اور قول یہ ہے:

”فینبغی للانسان ان یکون قوله للناس لینا ووجهه منبسطا طلقا مع البر والفاجر
والسنی والمبتدع من غیر مدهانة ومن غیر ان یتکلم معه بکلام یظن انه یرضی
منه“

کہ انسان کو چاہئے کہ وہ لوگوں سے نرم کلام کرے اور کشادہ روئی (ہنس مکھ ہو کر) سے کلام
کرے، خواہ نیک لوگوں سے بات کرے یا برے لوگوں سے، سنت کے مطابق چلنے والوں
سے کلام کرے یا بدعت پر عمل کرنے والوں سے کلام کرے، البتہ اس میں چالپوسی نہ پائی
جائے اور یہ محسوس نہ ہو کہ یہ اس کے دین اور اس کے طریقہ کو پسند کرتا ہے۔

ان حضرات کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو فرمایا:
﴿فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لِّیْنَا﴾ ”تم دونوں اس سے نرم بات کرو“ مراد اس سے فرعون ہے یعنی فرعون سے
نرم کلام کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کرام کو دیا ہے۔

”فالقائل لیس بافضل من موسیٰ وھارون والفاجر لیس باخبث من
فرعون“

اللہ تعالیٰ نے جب حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو حکم دیا کہ فرعون کے پاس جا کر
اسے تبلیغ کرو لیکن اس سے بات نرم کرو، تو یہی حکم سب کے لئے ہوگا، کیونکہ کوئی اور شخص بات کرنے والا
ان دونوں نبیوں سے افضل نہیں ہو سکتا اور جس سے بات ہوگی وہ فرعون سے زیادہ خبیث نہیں
ہو سکتا۔ اور رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿أَدْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ﴾

”اپنے رب کی راہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت سے بلاؤ“

اور رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَلَا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَیْرِ عِلْمٍ﴾

”اور انہیں گالی نہ دو جن کو وہ اللہ کی سوا پوجتے ہیں کہ وہ اللہ کی شان میں بے ادبی کریں گے“

زیادتی اور جہالت سے۔“

اس آیت میں کفار کے باطل معبودوں کو گالی دینے سے منع کیا گیا ہے تاکہ وہ اپنی جہالت اور ضد اور عناد کی وجہ سے بے جا زیادتی کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی نہ کریں۔

محاکمہ: جب سخت کلام کرنے اور نرم کلام کرنے کے احکام پائے جاتے ہیں۔ تو یقیناً ان کے علیحدہ علیحدہ مطالب بھی ہیں۔ اس لئے ان کو اس طرح بیان کیا جائے کہ کوئی تعارض نظر نہ آئے اور نہ ہی بیان کرنے والوں کے درمیان کوئی اختلاف نظر آئے اس کی وضاحت یہ ہے:

لوگوں سے کلام یا دینی امور کے متعلق ہوگی یا دنیاوی امور کے متعلق ہوگی۔ اگر دینی امور کے متعلق ہو تو کفار کو دعوت ایمان دینی مقصود ہو، یا فساق کو طاعت کی دعوت دینی مقصود ہو ”فلا بد وان تکون بالقول الحسن“ تو ضروری ہے کہ اچھی بات کے ذریعے ان کو راہ راست پر لانے کی کوشش کرے۔ اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو فرمایا:

﴿فَقُولَا لَهُ لِيْنَا لَعْلَهُ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشَى﴾

”اس سے نرم بات کرو شاید وہ نصیحت حاصل کر لے یا ڈر جائے۔“

اللہ تعالیٰ نے اپنے جلیل القدر انبیاء کرام کو جب فرعون سرکش، کافر، خدائی کے دعویدار سے نرم بات کرنے کا حکم دیا تو پتہ چلا کہ کسی کو بھی دعوت ایمان دینی ہو تو نرم گفتگو کی جائے۔ نبی کریم ﷺ کو بھی خطاب کرتے ہوئے رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

”ولو كنت فظا غليظ القلب لا نفضوا من حولك“

اگر آپ تند مزاج اور سخت دل ہوتے تو وہ ضرور آپ کے گرد سے ہٹ جاتے۔

”واما دعوة الفساق فالقول الحسن فيه معتبر“

فاسق لوگوں کو جب دعوت دی جائے تو اس وقت بھی نرم اور اچھی بات کی جائے۔

اسی وجہ سے رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ﴾

”یعنی حکمت اور اچھے وعظ سے حق راہ کی دعوت کا حکم فرمایا گیا ہے۔“

”واما الامور الدنیویة فمن المعلوم بالضرورة انه اذا امکن التوصل

الی الغرض بالتلطف من القول لم یحسن سواه“

دیناوی معاملات بھی اگر نرم گفتگو سے حاصل ہو جائیں تو نرم گفتگو ہی کرے کسی قسم کی سخت کلامی کرنا منع ہے ہاں اگر بغیر ڈانٹ کے دیناوی معاملہ کا کوئی حل نہ نکلے تو بارعب بات کرنا اگر جدا آواز میں بات کرنا جائز ہے تاکہ وہ معاملہ حل ہو جائے۔

کفار اگر ایمان نہ لائیں، اپنے کفر پر قائم رہیں تو ان سے جنگ کرنا ان پر لعنت بھیجنا ان پر سخت کرنا ہی رب تعالیٰ کو پسند ہے اسی لئے نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کی شان میں فرمایا:

”محمد رسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینہم“

محمد رسول اللہ اور ان کے ساتھ والے کافروں پر سخت ہیں اور آپس میں نرم دل۔

صحابہ کرام کفار پر اس طرح سخت حملہ آور ہوتے جیسے شیر شکار پر حملہ کرتا ہے۔ اور صحابہ کرام کا تشدد کفار کے ساتھ اس حد پر تھا کہ وہ لحاظ رکھتے تھے کہ ان کا بدن کسی کافر کے بدن سے نہ چھو جائے اور ان کے کپڑے سے کسی کافر کا کپڑا نہ لگنے پائے۔ اور آپس میں نرمی کا یہ مقام تھا کہ ایک دوسرے پر اس طرح مہربانی کرتے اور اس طرح محبت سے درپیش آتے جیسے باپ بیٹے میں محبت ہوتی ہے۔ یہ محبت اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ جب ایک دوسرے کو دیکھتے تو شدید محبت کی وجہ سے ایک دوسرے کو گلے لگا لیتے اور مصافحہ کرتے۔ اور رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ﴾

”اے نبی کفار اور منافقین سے جہاد کرو اور ان پر سختی فرماؤ۔“

اس آیت کریمہ میں بھی کفار اور منافقین سے رعب دار کلام کرنے اور جہاد کرنے کا حکم دیا کہ کافروں سے اس طرح کلام نہ کرو کہ تمہاری بزدلی نظر آئے، کفار کی خوشامد نہ کرو ان کے سامنے جی حضوری نہ بن جاؤ۔

یہاں یہ بھی خیال رہے کہ آیت کریمہ میں بظاہر خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے لیکن مراد آپ کی امت ہے۔ اسی لئے راقم نے وضاحت کرتے ہوئے ایسے الفاظ ذکر کئے ہیں جو امت کی طرف منسوب ہیں۔ نبی کریم ﷺ کی طرف ”بزدلی، خوشامد“ جیسے الفاظ استعمال نہیں کئے جاسکتے۔

تنبیہ : کسی کو راہ راست پر لانے کے لئے نرم کلام کرنے کا اور مقصد ہے اور کسی سے ڈر کر، یا کسی کے سامنے خوشامد کے طور پر نرم کلام کرنے کا اور مقصد ہے۔ پہلا انداز قابل تعریف ہے اور دوسرا انداز قابل مذمت ہے اسی طرح سخت کلامی کی بھی دو ہی صورتیں ہیں۔ ایک یہ ہے کہ بارعب، بلند آواز سے کلام کی جائے کسی کے سامنے سر نہ جھکایا جائے۔ اس انداز سے کفار سے کلام کرنا قابل تعریف ہے تاکہ کفار کو معلوم ہو جائے کہ مسلمان جرأت اور بہادری کا مالک ہے۔

دوسرا انداز یہ ہے بیہودہ کلام کرے، گالیاں نکالے، ایسا انداز اختیار کرنا مسلمان کی شان کے لائق نہیں۔ وہ مومن سے کلام کرے یا کافر سے کلام بنجیدہ بیہودہ، بکواس بازی نہ ہو۔ انسانیت کا یہی تقاضا ہے۔

(ماخوذ از قرطبی، روح المعانی، کبیر، خزائن العرفان بزیادہ)

﴿وَأَقِمُْوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ﴾: ”اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو“ یہ خطاب بھی بنی اسرائیل کو ہی ہے نماز اور زکوٰۃ ان پر بھی فرض تھی۔ اگرچہ مقدار وغیرہ میں بھی فرق تھا۔ یہود پر زکوٰۃ مال کا چوتھا حصہ فرض تھی۔ پھر وہ لوگ زکوٰۃ اپنے غریب لوگوں کو دیتے تھے یا کہ ان کی قربانی کی طرح زکوٰۃ کی قبولیت کی بھی علامت یہ تھی کہ آگ آتی اور اس مال کو کھا جاتی۔

علامہ آلوسی نے اس قول کو مطلقاً ذکر کیا۔ لیکن علامہ قرطبی نے ذکر کیا کہ قول یہ نقل کا محتاج ہے نقلی دلیل کا ملنا ضروری ہے جس سے پتہ چل جائے کہ واقعی قدرتی طور پر آگ آتی تھی جو ان کی زکوٰۃ کو کھا جاتی تھی۔ نماز اور زکوٰۃ کا مختصر ذکر رکوع نمبر ۵ میں گزر چکا ہے۔ دوبارہ اعادہ کی ضرورت نہیں۔

تنبیہ : پہلے والدین اور رشتہ داروں پر احسان کرنے کا حکم دیا۔ پھر زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیا جس سے واضح ہوا کہ پہلا حکم صدقات مستحبہ سے ہے۔ اور زکوٰۃ ادا کرنا فرض ہے اسے سے یہ واضح ہو گیا کہ زکوٰۃ والدین یا اولاد کو نہیں دی جائے گی کیونکہ زکوٰۃ اصول (باپ داد، پردادا، دادی، پردادی وغیرہا، ماں، نانی، نانا، پرانا وغیرہ) اور فروع (اولاد اور اولاد کی اولاد نیچے تک) کو نہیں دی جاسکتی۔ اور زوجین بھی ایک دوسرے کو زکوٰۃ نہیں دے سکتے۔ اصول و فروع کی مالی معاونت زکوٰۃ کے مال کے غیر مال سے کی جائے گی زکوٰۃ مستحقین کو ہی دی جائے گی۔

﴿ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْكُمْ وَأَنْتُمْ مُّعْرِضُونَ﴾:

”پھر تم پھر گئے سوائے تھوڑے تم میں سے اور تم ہو ہی اعراض کرنے والے۔“

یہ خطاب نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے یہود کو ہے کہ تم نے نبی کریم ﷺ کے معجزات کو دیکھ کر اعراض کر لیا۔ ہاں البتہ تم میں سے تھوڑے ایمان لائے۔ انہوں نے اعراض نہیں کیا وہ حضرت عبداللہ بن سلام اور کعب بن احبار اور ان کے ساتھی ہیں ﷺ۔

اور ضمناً اس میں ان کے آباء و اجداد کا بھی ذکر ہے کہ تمہارے آباء و اجداد کا بھی یہی طریقہ چلا آ رہا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے وعدہ کر لیتے تھے پھر اعراض کر لیتے تھے۔

اعتراض: ﴿تَوَلَّيْتُمْ﴾ اور ﴿وَأَنْتُمْ مُّعْرِضُونَ﴾ کا ایک ہی مطلب ہے پھر جانا، اعراض کرنا، ایک ہی معنی پر دلالت کرنے والے دو لفظوں کو ایک ہی جگہ ذکر کرنے کا کیا مطلب؟

جواب نمبر ۱: ”التولی بالجسم والاعراض بالقلب“ ﴿ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ تم جسمانی طور پر پھر گئے کہ نبی کریم ﷺ سے دور ہو گئے۔ آپ کے قریب تم نے بیٹھنے سے اعراض کیا۔ اور ﴿وَأَنْتُمْ مُّعْرِضُونَ﴾ سے مراد دل سے پھرنا ہے۔ یعنی تم نبی کریم ﷺ سے حسد اور عناد کرنے لگے جس کی وجہ سے تم نے دل سے ان کو نبی نہیں مانا اور ایمان قبول نہیں کیا۔

جواب نمبر ۲: ﴿وَأَنْتُمْ مُّعْرِضُونَ﴾ حال لان التولی فیہ دلالة علی الاعراض ”یعنی ﴿وَأَنْتُمْ مُّعْرِضُونَ﴾ جملہ حالیہ ہے کیونکہ ﴿تَوَلَّيْتُمْ﴾ اعراض پر دلالت کر رہا ہے اب مفہوم اس طرح ہوگا پھر تم پھر گئے ایسے حال میں کہ تم اعراض کرنے والے ہو۔ اس جواب کو پنجابی کے اس جملہ سے اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے ”منہ ادھر چا کے دفعہ ہو گیا“ یعنی منہ پھیر کر تم ادھر چلے گئے۔ (از قسطی)

جواب نمبر ۳: ﴿وَأَنْتُمْ مُّعْرِضُونَ﴾ ای وانتم قوم عادتکم الاعراض والتولی عن الميثاق ”﴿ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ تم میثاق سے پھر گئے اور ﴿وَأَنْتُمْ مُّعْرِضُونَ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری عادت ہی یہ ہے کہ اعراض کرنا۔

(روح المعانی)

روح المعانی کے جواب کے مطابق اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ہے ”اور تم روگرداں ہو“ راقم نے عوام کے سمجھنے کے لئے ذرا زیادہ واضح کر دیا ”تم ہو ہی اعراض کرنے والے“۔

گذشتہ سے پیوستہ: قول حسن (اچھی بات) کے متعلق علامہ رازی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا:

”ان القول الحسن ليس عبارة عن القول الذي يشتهونه ويحبونه ، بل القول الحسن هو الذي يحصل انتفاعهم به ونحن اذا لعناهم وذممناهم ليرتدعوا به عن الفعل القبيح كان ذلك المعنى نافعاً في حقهم فكان ذلك اللعن قولاً حسناً ونافعاً كما ان تغليظ الوالد في القول قد يكون حسناً ونافعاً من حيث انه يرتدع به عن الفعل القبيح“

(کبیر)

اچھی بات کا صرف یہ ہی مطلب نہیں کہ مخاطب اسے سن کر خوش ہو اور پسند کرے بلکہ اچھی بات وہ ہے جس سے مخاطب کو نفع ہو، لہذا کافروں پر لعنت کرنا، ان کی مذمت بیان کرنا درحقیقت ان کے لئے نفع مند ہے تاکہ وہ کفر سے باز آجائیں اس لحاظ پر ان پر لعنت کرنا اور ان کی مذمت بیان کرنا ان سے اچھی گفتگو ہوگی نہ کہ بری۔ انسان کبھی اپنی اولاد سے بظاہر سخت لہجہ میں بات کرتا ہے لیکن اولاد کی اچھی تربیت کی لئے اور غلط کاموں سے روکنے کے لئے یہ طریقہ استعمال کیا جاتا ہے جو اولاد کے حق میں سخت بات ہونے کے باوجود اچھی بات ہوگی۔

فائدہ: اسی سے یہ فائدہ حاصل ہو گیا کہ استاذ اگر شاگرد کو سبق یاد کرنے کیلئے اس کی اچھی تربیت کیلئے بطور سرزنش کے سخت کلام کرے تو اسے اچھا کہا جائے گا۔ اس بات کو برا نہیں کہا جاسکتا، ہاں البتہ گالیاں دینا، بیہودہ بکواس کرنا، بلاوجہ سرزنش کرنا استاذ کی شان کے لائق نہیں۔ اس سے استاذ کا وقار کم ہوتا ہے، بڑھتا نہیں۔ بعض استاذ اپنا رعب جمائے کی سوچ میں اپنے آپ کو بے وقار بنا لیتے ہیں۔

☆☆☆

﴿وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُونَ دِمَاءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُونَ

أَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ أَقْرَرْتُمْ وَأَنْتُمْ تَسْهَدُونَ﴾ (آیت ۸۴)

(۱) ”اور جب ہم نے تم سے عہد لیا کہ اپنوں کا خون نہ کرنا اور اپنوں کو اپنی بستیوں سے نہ نکالنا پھر تم نے اس کا اقرار کیا اور تم گواہ ہو۔“

(۲) اور جب لیا ہم نے تم سے عہد کہ تم نہ بہانا اپنوں کا خون، اور نہ نکالنا تم اپنوں کو اپنی بستیوں سے پھر تم نے اقرار کر لیا ایسے حال میں کہ تم گواہ تھے۔“

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے یہود پر اپنے ایک اور انعام کا ذکر فرمایا لیکن انہوں نے اپنی عادت کے مطابق اس انعام کی قدر بھی نہ کی اور وعدہ کو توڑ دیا۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے ان سے ایک دوسرے کا خون نہ بہانے اور ایک دوسرے کو اپنی بستیوں سے نہ نکالنے کا وعدہ لیا جو یقیناً ان کے لئے عذاب سے بچنے اور جنت میں جانے کا ذریعہ ہونے کی وجہ سے عظیم انعام تھا لیکن انہوں نے اس وعدہ کو بھی توڑ دیا، عمل نہ کیا، جو ان کے لئے ذلت و رسوائی کا سبب بنا، جس کا ذکر اگلی آیت میں آ رہا ہے۔

شان نزول: اس آیت کریمہ اور آنے والی آیت کریمہ کا ایک ہی مضمون ہے اور ایک ہی شان نزول ہے۔ یہ آیت کریمہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے مدینہ طیبہ میں رہنے والے یہود کے حق میں نازل ہوئی۔ جو اوس اور خزرج کی لڑائیوں میں معاونت کرتے تھے۔

اوس اور خزرج انصار تھے جو زمانہ جاہلیت میں بت پرست تھے، اور ان کے درمیان کثیر لڑائیاں واقع ہوئیں مدینہ طیبہ میں یہود کے تین قبیلے تھے۔ ایک بنو قینقاع اور دوسرا بنو النضیر۔ یہ دونوں خزرج قبیلہ کے حلیف تھے۔ اور تیسرا قبیلہ بنو قریظہ تھا جو اوس کے حلیف تھے۔ جب اوس اور خزرج کی آپس میں لڑائی ہوتی تو خزرج کے حلیف بنو قینقاع اور بنو النضیر ان سے مل جاتے اور بنو قریظہ اپنے حلیف اوس سے مل جاتے۔

جب ان کے درمیان لڑائی ہوتی تو یہودیوں کے ہاتھوں دوسرے یہودی بھی مارے جاتے، اور

لڑائی میں جو قبیلہ غالب آ جاتا وہ دوسرے قبیلہ کو اپنی بستی سے نکال دیتا اور ان کا مال چھین لیتے۔ یہودیوں کے جو لوگ قیدی ہو چکے ہوتے تھے جب لڑائی ختم ہو جاتی تو دوسرا گروہ ان کا فدیہ دے کر چھڑا لیتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں آیتوں میں اس کا ذکر کیا جس کی تفصیل ان شاء اللہ آ رہی ہے۔

(از صابونی)

﴿وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُونَ دِمَاءَكُمْ﴾:

”اور جب لیا ہم نے تم سے عہد کہ نہ بہانا اپنوں کا خون۔“

﴿تَسْفِكُونَ﴾ السفک سے لیا ہوا ہے۔ جس کا معنی ہے:

”السفک فی الدم صبه وکذا فی الجوهر المذاب وفي الدمع“

خون بہانا، آنسو بہانا، کسی دھات یعنی سونے، چاندی وغیرہ کو پگھلانا۔

اعتراض: ﴿لَا تَسْفِكُونَ دِمَاءَكُمْ﴾ کا ظاہر طور پر معنی یہ ہے کہ ”تم اپنے خون نہ بہاؤ“

انسان کی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ موت سے ڈرتا ہے مرنے کو اس کا جی نہیں چاہتا۔ جب کوئی انسان اپنے آپ کو قتل نہیں کرتا، اپنے آپ کو قتل کرنے سے گھبراتا ہے تو نبی (روکنے) کا کیا فائدہ ہے۔

پہلا جواب: کبھی کبھی لوگ موت سے ڈرنے کی باوجود اپنے آپ کو قتل کر لیتے ہیں، اس کی ایک وجہ یہ ہوتی ہے:

”کثیر ممن صعب علیہ الزمان وثقل علیہ امر من الامور فیقتل نفسه“

کہ انسان کثیر مشکلات میں مبتلا ہو جاتا ہے جو اس کی قوت برداشت سے باہر ہو جاتا

ہے تو وہ اپنے آپ کو قتل کر کے ان مصائب سے اپنے آپ کو آزاد کر لیتا ہے۔ (ازکیر)

لیکن اس کا یہ فعل حرام ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے اس سے منع کیا کہ تم اپنے آپ کو مشکلات کی وجہ سے

قتل نہ کرنا مصائب کی وجہ سے صرف موت کی تمنا بھی منع ہے اپنے آپ کو قتل کر دینا تو شدید جرم ہے۔

☆ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”لا یتمنن احدکم الموت من ضرر اصابه“

تم میں سے کوئی شخص بھی مصیبت و ضرر میں موت کی ہرگز تمنا نہ کرے۔

اگر اس کو بہت مجبوری ہو موت کی تمنا وہ ضرور ہی کرنا چاہتا ہے تو اس طرح دعا کرے۔

”اللهم احیننی ما كانت الحیاة خیرا لی وتوفنی اذا كانت الوفاة خیرا لی“

(بخاری، مسلم، مشکوٰۃ باب تمنی الموت و ذکرہ)

یعنی انسان کو کسی قسم کا ضرر بھی پہنچے خواہ مالی ضرر ہو، یا بدنی، اگر وہ اس ضرر و نقصان، مصیبت و الم اور دکھ، درد پر موت کی تمنا کرتا ہے اور یہ کہتا ہے اے اللہ مجھے موت دے دے۔ تو یہ اس کے جزع و فزع پر دلالت کرے گا، اور بے صبری اور بے ثباتی پائے جائے گی لہذا یہ جائز نہیں۔ ہاں اگر انسان موت کی تمنا ضروری ہی کرنا چاہتا ہے صبر کا دامن لبریز ہو چکا ہے مصائب و آلام پر قائم رہنا ناممکن ہو چکا ہے تو پھر بھی یہ نہ کہے کہ اے اللہ مجھے موت عطا کر۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف اپنا معاملہ سپرد کرتے ہوئے یوں عرض کرے اے اللہ اس وقت تک مجھے زندہ رکھ جب تک میرے لئے زندگی بہتر ہے اور اے اللہ مجھے وفات عطا کر دے جب میرے لئے وفات بہتر ہو۔

اس طرح انسان نے گویا کہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر رضا مندی کا اظہار کر دیا ہے اور کامل بے صبری کا مظاہرہ نہیں کیا۔

☆ ”عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ لا یتمنی احدکم الموت اما محسنا فلعلہ ان یزدا خیرا واما مسینا فلعلہ ان یتعطب“ (بخاری مشکوٰۃ باب تمنی الموت و ذکرہ)

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی ایک آدمی بھی موت کی تمنا نہ کرے اگر وہ نیک ہو تو ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی نیکیوں میں اور زیادتی کرے اور اگر وہ گناہگار ہو تو ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ اسے توبہ کی توفیق عطا فرمادے۔

یعنی اگر انسان کو اللہ تعالیٰ عمر زیادہ عطا فرمائے اور ساتھ ساتھ نیکیوں کی توفیق بھی عطا فرمادے تو یہ انسان کے مراتب و مدارج میں بلندی کا ذریعہ ہوگا۔ لیکن اگر کوئی شخص گناہ کی زندگی گزار رہا ہے تو انسان کو بھی موت کی طلب کرنا درست نہیں کیونکہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے موت سے پہلے کسی وقت توبہ کی توفیق عطا فرمادے۔ جس سے اس کے گناہ بخش دیئے جائیں تو اس طرح عمر کی زیادتی اس انسان کے لئے بھی مفید ہوگی۔

فائدہ :

چند مقامات وہ ہیں جہاں موت کی تمنا جائز ہے۔

”وقد افتى النووى انه لا يكره تمنى الموت لخوف فتنة دينية بل قال

(مرقاۃ حوالہ مذکور)

مندوب“

علامہ نووی رحمہ اللہ نے اس پر فتویٰ دیا ہے کہ اگر ایسے فتنے نمودار ہو جائیں جن سے دین میں خلل آ رہا ہو تو ایسی صورت میں موت کی تمنا کرنا مکروہ نہیں۔ بلکہ مستحب ہے کہ وہ موت کی طلب کرے۔ کیونکہ اسے دین میں واقع ہونے والے فتنوں کی پریشانی سے راحت حاصل ہونے کا ذریعہ موت کی تمنا ہے جو یقیناً مستحسن تمنا ہے۔

”وکذا یندب تمنى الشهادة فى سبيل الله لانه صح عن عمر رضی اللہ عنہ وغیره“

(مرقاۃ)

اسی طرح اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہادت حاصل ہونے کی تمنا کرنا مستحب ہے جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ

اور دوسرے صحابہ کرام سے ثابت ہے کہ وہ حصول شہادت کی دعائیں کرتے رہے۔

خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دعا فرماتے رہے کہ اے اللہ مجھے شہید کر دیا جائے پھر زندہ کر دیا جائے پھر شہید کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے جسم اطہر کو ظاہر طور پر تو کافروں سے محفوظ رکھا تا کہ آپ کے جسم اطہر سے توہین آمیز سلوک نہ کر سکیں اور یہ بھی نہ کہہ سکیں کہ ہم نے مسلمانوں کے نبی کو قتل کر دیا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا کو اس طرح قبول کیا کہ خیبر میں ایک یہودیہ نے آپ کو زہر آلود بکری کا گوشت کھلایا۔ اس وقت گوشت نے خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا کہ میں زہر آلود ہوں، لیکن آپ جو ایک دو لقمے لے چکے تھے اس زہر کا اثر آپ کے جسم اطہر میں محفوظ رکھا گیا، پھر زہر کے اثر کو لوٹایا گیا تو آپ کو شہادت کا درجہ بھی عطا کر دیا گیا۔

دوسری وجہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ نے اپنی معروف تصنیف ”سر الشہادتین“

میں بیان کی کہ آپ کی دعا قبول کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے آپ کو دونوں شہادتوں (ظاہری اور سری)

کا درجہ نصیب فرمایا ہے وہ اس طرح کہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سر مبارک سے لے کر

ناف تک آپ کے مشابہ ہیں آپ کو زہر کی وجہ سے شہادت نصیب ہوئی اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ جو ناف

سے لے کر پاؤں تک نبی کریم ﷺ کے مشابہ ہیں آپ کو ظاہری شہادت میدان جنگ میں نصیب ہوئی۔
اس طرح ان دونوں حضرات کی شہادت سے نبی کریم ﷺ کو بھی شہادت کا مرتبہ نصیب فرمادیا۔

مسلم شریف میں ”من طلب الشهادة صادقا اعطيها ولولم تصبه“ جس شخص نے
صدق دل سے شہادت طلب کی اللہ تعالیٰ اسے شہادت کا مرتبہ عطا فرماتا ہے خواہ وہ بظاہر شہید نہ بھی ہو۔

”ويندب ايضا تمنى الموت ببلد شريف لما في البخاري ان عمر

قال اللهم ارزقني شهادة في سبيلك واجعل موتى ببلد رسولك فقالت

بنته حفصة اني يكون هذا فقال ياتي به الله اذا شاء اى وقد فعل فان قاتله

كافر مجوسى“

مدینہ طیبہ میں موت کی تمنا کرنا بھی مستحب ہے بخاری شریف میں ہے بے شک حضرت عمرؓ
دعا کرتے تھے ”اے اللہ مجھے اپنے راستہ میں شہادت نصیب فرما، اور میری موت اپنے رسول کے شہر
میں مجھے نصیب فرما۔ آپ کی بیٹی (ام المؤمنین) حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا یہ کیسے ہوگا (کہ
شہادت بھی ملے اور موت بھی مدینہ طیبہ میں آئے) مدینہ طیبہ میں کس سے جنگ ہوگی اور کیسے شہادت
آئے گی؟ آپ نے بطور تعجب یہ عرض کیا حضرت عمرؓ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ چاہے گا تو ایسے ہی ہوگا
آپ کی دعا کو اللہ تعالیٰ نے اسی طرح قبول فرمایا جیسے آپ نے عرض کیا کہ مدینہ طیبہ میں ہی آپ کو
شہادت نصیب ہوئی کیونکہ آپ کا قاتل کافر، مجوسی تھا۔

سبحان اللہ حضرت عمرؓ نے جس خواہش کا اظہار کیا اور کامل توقع کی اللہ تعالیٰ نے

اسے پورا فرمایا ہے۔ (ماخوذ از مرقاة وسر الشہادتین)

دوسری وجہ اپنے آپ کو قتل کرنے کی یہ ہوتی ہے:

”كما ثبت في اهل الهند انهم يقدرّون في قتل النفس التخلّص من

عالم الفساد واللعوق بعالم النور“

جیسا کہ اہل ہند کے متعلق ثابت ہے وہ اپنے آپ کو اس لئے مار دیتے تھے کہ وہ عالم

فساد سے چھٹکارا حاصل کر کے عالم نور سے مل جائیں۔

یعنی ان کا عقیدہ ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو رب تعالیٰ کی رضا کیلئے بھوکا رکھ کر ماردینا رب تعالیٰ کے قریب کر دیتا ہے اور ظلمت سے نکال کر نورانیت تک پہنچا دیتا ہے۔ یہ ان کا عقیدہ باطل تھا۔ اس لئے کہ رب تعالیٰ کا قرب نبی کریم ﷺ کی شریعت کے مطابق چلنے سے حاصل ہوتا ہے نہ کہ آپ کی شریعت کی مخالفت سے۔ لہذا واضح ہوا کہ خودکشی اور بھوک ہڑتال حرام فعل ہیں۔

☆ ”عن انس قال جاء ثلاثة رهط الى ازواج النبي ﷺ يسألون عن عبادة النبي ﷺ فلما اخبروا بها كانهم تقالوها فقالوا اين نحن من النبي ﷺ وقد غفر الله ما تقدم من ذنبه وما تاخر فقال احدهم اما انا فاصلي الليل ابدا وقال الآخر انا اصوم النهار ابدا ولا افطر وقال الآخر انا اعتزل النساء فلا اتزوج ابدا فجاء النبي ﷺ فقال انتم الذين قلتم كذا وكذا اما والله اني لاخشاكم لله واتقاكم له لكني اصوم وافطر واصلي وارقد واتزوج النساء فمن رغب عن سنتي فليس مني“ (بخاری، مسلم، مشکوٰۃ باب الاعتصام بالكتاب والسنة)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک قبیلہ کے تین شخص آئے نبی کریم ﷺ کی ازواج سے آپ کی عبادت کے متعلق سوال کرنے لگے جب ان کو آپ کی عبادت کے متعلق خبر دی گئی تو انہوں نے اسے کم سمجھا، وہ کہنے لگے ہمیں نبی کریم ﷺ سے کیا نسبت (یعنی کہاں ہم اور کہاں آپ) یقیناً آپ کا مرتبہ بلند ہے آپ کو تھوڑی عبادت کافی ہے ہمیں زیادہ عبادت کرنی چاہیے (اللہ تعالیٰ نے آپ کو تو پہلے اور پچھلے گناہوں سے محفوظ رکھا ہوا ہے تو ان میں سے ایک نے کہا میں ہمیشہ ساری رات نماز پڑھا کروں گا۔ اور دوسری نے کہا میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا، کبھی افطار نہیں کروں گا، ایک اور نے کہا میں ہمیشہ عورتوں سے دور رہوں گا کبھی شادی نہیں کروں گا۔

اتنی دیر میں نبی کریم ﷺ تشریف لے آئے۔ آپ نے فرمایا تم نے اس طرح کہا ہے؟ خبردار قسم ہے اللہ تعالیٰ کی بیشک میں بنسبت تمہارے اللہ تعالیٰ سے زیادہ ڈرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے بنسبت تمہارے تقویٰ بھی زیادہ رکھتا ہوں لیکن میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں۔ اور نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، جس شخص نے میری سنت سے اعراض کیا وہ مجھ سے نہیں۔

خیال رہے کہ تمام رات عبادت کرنا یا ہمیشہ روزہ رکھنا منع تو نہیں، لیکن جب نبی کریم ﷺ کی عبادت کو کم سمجھ کر اس طرح کی عبادت کو اپنے آپ پر لازم کر دیا جائے تو وہ سنت سے اعراض ہے۔ جس کو نبی کریم ﷺ نے پسند نہیں فرمایا۔

تنبیہ: نکاح کے خطبہ میں علماء کرام سے سنتے ہیں کہ وہ اس طرح ایک حدیث پڑھتے ہیں:

”قال رسول الله ﷺ النکاح من سنتی فمن رغب عن سنتی فلیس منی“

یہ مکمل الفاظ راقم کو کہیں نظر نہیں آئے۔ اگر کسی مہربان کی نظر سے یہ مکمل حدیث گزری ہو تو مجھے ضرور مطلع کرے۔ البتہ راقم یوں پڑھ لیتا ہے۔

”النکاح من سنة رسول الله ﷺ قال رسول الله ﷺ فمن رغب عن سنتی فلیس منی“

☆ ”وقد روی ان عثمان بن مظعون بايع في عشرة من اصحاب رسول الله ﷺ فعزموا ان يلبسوا المسوح وان يهيموا في الصحراء ولا يأووا البيوت ولا ياكلوا اللحم ولا يغشوا النساء فبلغ ذلك النبي ﷺ فجاء الى دار عثمان بن مظعون فلم يجده فقال لا مراة ما حديث بلغني عن عثمان؟ وكرهت ان تفشي سر زوجها وان تكذيب رسول الله ﷺ فقالت يا رسول الله ان كان قد بلغك شئ فهو كما بلغك فقال قولي لعثمان اخلاف لسنتي ام على غير ملتي اني اصلي وانا وام صوم وافطر واغشي النساء وآوي البيوت واكل اللحم فمن رغب عن سنتي فليس مني، فرجع عثمان واصحابه عما كانوا عليه“

روایت کیا گیا ہے کہ حضرت عثمان بن مظعون ؓ نے دس صحابہ کرام کے ساتھ مل کر ایک معاہدہ کیا اور سب نے پختہ ارادہ کیا کہ وہ پھٹے پرانے کپڑے پہنیں گے۔ اور جنگل میں پھریں گے (یعنی جنگل میں ہی رہیں گے) گھروں میں کبھی نہیں رہیں گے، اور گوشت نہیں کھائیں گے، اور عورتوں سے جماع نہیں کریں گے۔ نبی کریم ﷺ کو جب یہ خبر ملی تو آپ حضرت عثمان بن مظعون کے گھر تشریف لائے وہ گھر موجود نہیں تھے۔ آپ نے ان کی عورت سے پوچھا، وہ کیا بات ہے جو مجھے عثمان کی جانب سے پہنچی ہے؟ تو اس عورت نے ناپسند سمجھا کہ وہ اپنے خاوند کا راز افشاء (ظاہر) کرے۔ اور یہ بھی ناپسند کیا کہ وہ نبی کریم ﷺ سے جھوٹا کلام کرے (اس نے نہایت حکمت بھرا جواب دیا) اس نے کہا

یا رسول اللہ اگر آپ تک ان کی کوئی بات پہنچی ہے تو اسی طرح ہوگی جس طرح آپ تک پہنچی ہے۔

آپ نے فرمایا عثمان کو کہہ دینا کیا تم میری سنت کا خلاف کر رہے ہو۔ یا میرے دین کو چھوڑ رہے ہو۔ بیشک میں نماز پڑھتا ہوں اور سوتا ہوں، اور روزہ رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، اور اپنی ازواج سے تعلق ازدواجی بھی رکھتا ہوں۔ اور گھروں میں رہتا ہوں اور گوشت بھی کھاتا ہوں۔ جس نے میری سنت سے اعراض کیا وہ مجھ سے نہیں (یعنی اس کا میرے ساتھ تعلق نہیں)۔ حضرت عثمان اور ان کے ساتھ مل کر معاہدہ کرنے والوں نے نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی کے بعد اپنے اپنے ارادہ سے رجوع کر لیا۔

(قرطبی)

دوسرا جواب: اپنے آپ کو قتل کرنے سے منع کرنے کا یہ مطلب ہے:

”المراد لا یقتل بعضکم بعضا وجعل غیر الرجل نفسہ اذا اتصل بہ
نسبا ودینا“

مراد اس سے یہ ہے کہ تم میں سے کوئی ایک دوسرے کو قتل نہ کرے۔ جب کوئی شخص نسبی یا دینی لحاظ سے تعلق رکھنے والا ہو، اسے قتل کرنا اپنے آپ کو ہی قتل کرنا ہے۔

جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے کہ پچھڑے کی پوجا کے بعد بنی اسرائیل کو توبہ کا حکم دیا گیا۔ وہاں بھی رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿فَاقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ﴾ ”تم ایک دوسرے کو قتل کرو“۔ (از کبیر)

”وذلك ان اهل الملة الواحدة بمنزلة النفس الواحدة“

ایک ہی دین پر چلنے والے لوگ تمام ایک ہی نفس شمار ہوتے ہیں کسی کو نقصان پہنچانا اپنے آپ کو نقصان پہنچانا ہے۔

☆ ”كما قال عليه الصلوة والسلام مثل المؤمنين في توادهم وتراحمهم وتواصلهم

بمنزلة الجسد الواحد اذا اشتكى منه عضو تداعى له سائر الجسد بالحمى والسهر“

نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی اس پر دلالت کر رہا ہے مومن لوگ ایک دوسرے کے ساتھ محبت کرنے اور ایک دوسرے پر رحم کرنے اور ایک دوسرے سے تعلق جوڑنے کے لحاظ پر ایسے ہی ہیں، جس طرح ایک

جسم ہوتا ہے جب ایک عضو کو تکلیف ہو تو تمام جسم کو بخار ہوتا ہے اور تمام جسم بے قرار ہوتا ہے۔ (ابن کثیر)

تیسرا جواب: ”انہ اذا قتل غیرہ فکانما قتل نفسہ لانہ یقتص منه“

یعنی مراد یہ ہے کہ تم دوسروں کو نہ قتل کرو کیونکہ تمہارا دوسروں کو قتل کرنا اپنے آپ کو قتل کرنا لازم آئے گا۔ اس لئے کہ تمہیں قصاص کے طور پر قتل کر دیا جائے گا۔

چوتھا جواب: ”لا تعرضوا للمقاتلة من یقتلکم فتکونوا قد قتلتم انفسکم“

تم ایسے لوگوں کے ساتھ قتال کے درپے نہ ہو کہ وہ تمہیں قتل کر دیں۔ اس طرح گویا کہ تم نے خود ہی اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالا حالانکہ تمہیں منع بھی کیا گیا تھا کہ تم اپنے ہی بھائیوں کو نہ قتل کرو، لیکن تم ان کے ساتھ قتال میں مشغول ہو کر اپنے ہی بعض آدمیوں کے ہلاکت کا سبب بنتے ہو۔

پانچواں جواب: ”لا تسفکون دماءکم من قوامکم فی مصالح الدنیا بہم فتکونون مہلکین لانفسکم“

تم صرف دنیاوی مقاصد کے لئے اپنے خون نہ بہاؤ، اس میں تو صرف اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالتا ہے۔ یعنی مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے کافروں کو قتل کرنا اور اپنی جانوں کو قربان کرنا تو ثواب کا ذریعہ ہے لیکن صرف دنیاوی مقاصد کے لئے قتال میں شریک ہونا سوائے اپنے آپ کو ہلاک کرنے کے اور کچھ بھی نہیں۔

(ابن کثیر)

﴿وَلَا تُخْرِجُونَ أَنْفُسَكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ﴾: ”اور نہ نکالنا اپنوں کو اپنی بستیوں سے“

اس میں دو احتمال پائے گئے ہیں ایک یہ ”لا تفعلوا ما تستحقون بسببہ ان تخرجوا من دیارکم“ تم ایسا کوئی کام نہ کرو جس کی وجہ سے تمہیں تمہاری بستیوں سے ہی نکال دیا جائے۔ دوسرا احتمال یہ ہے:

”المراد لانہی عن اخراج بعضہم بعضا من دیارہم لان ذلک یعظم

فیہ المحنة والشدة حتی یقرب من الهلاک“

کہ روکنے کا مطلب یہ ہے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کو ان کے گھروں سے نہ نکالو
اس میں تمہارے لئے عظیم محنت اور شدت پائی جائی گی یہاں تک کہ ہلاکت کے
قریب پہنچ جاؤ گے۔
(از کبیر)

تنبیہ: ﴿لَا تَسْفِكُونَ دِمَاءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُونَ أَنْفُسَكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ﴾ میں جتنے
احتمالات ذکر کئے گئے ہیں وہ تمام کے تمام ہی مراد ہیں یعنی مختصر الفاظ مبارکہ کثیر معانی پر مشتمل ہیں اس کا
یہ مطلب نہیں کہ یوں کہا جائے یا یہ مطلب ہے یا یہ مطلب ہے۔ نہیں اس طرح نہیں بلکہ تمام معانی مجتمع
ہیں ان کے اجتماع میں کوئی تعارض نہیں پایا گیا۔

﴿ثُمَّ أَقَرُّكُمْ﴾: ”ای تم اقرار تم بالمیثاق واعترفتم علی انفسکم بلزومہ“
یعنی پھر تم نے میثاق کا اقرار کر لیا اور اپنے نفسوں پر اس کا لازم ہونے کا اعتراف کر لیا۔ (کبیر)

﴿وَأَنْتُمْ تَشْهَدُونَ﴾: حال مؤکدہ یعنی جملہ حالیہ ہے اور حال مؤکدہ ہے اس صورت میں
مطلب یہ ہوگا۔ پھر تم نے میثاق کا اقرار کر لیا۔ ایسے حال میں کہ تم گواہ تھے۔

(روح المعانی)



﴿ ثُمَّ أَنْتُمْ هَؤُلَاءِ تَقْتُلُونَ أَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُونَ فَرِيقًا
مِّنْكُمْ مِّن دِيَارِهِمْ تَظْهَرُونَ عَلَيْهِم بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ
وَإِنْ يَأْتُواكُمْ أُسْرَىٰ تَفْدُوهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ
إِخْرَاجُهُمْ أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ
فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلُ ذَلِكَ مِنْكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ
الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَىٰ أَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللَّهُ
بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴾

(آیت ۸۵)

(۱) ”پھر یہ جو تم ہو اپنوں کو قتل کرنے لگے، اور اپنے میں سے ایک گروہ کو ان کے وطن سے نکالتے ہو۔ ان پر مدد دیتے ہو (ان کے مخالف کو) گناہ اور زیادتی میں، اگر وہ قیدی ہو کر تمہارے پاس آئیں تو بدلہ دے کر چھڑا لیتے ہو، اور ان کا نکالنا تم پر حرام ہے، تو کیا خدا کے کچھ حکموں پر ایمان لاتے ہو، اور کچھ سے انکار کرتے ہو۔ تو جو تم میں سے ایسا کرے تو اس کا بدلہ کیا ہے مگر یہ کہ دنیا میں رسوا ہو اور قیامت میں سخت تر عذاب کی طرف پھیرے جائیں گے اور اللہ تمہارے کو تکوں سے بے خبر نہیں۔“

(۲) ”پھر تم یہ ہو کہ قتل کرتے ہو اپنوں کو، اور نکالتے ہو تم اپنے ایک فریق کو ان کے گھروں سے امداد کرتے ہو ان کے خلاف گناہ اور ظلم سے، اور اگر آئیں تمہارے پاس قیدی ہو کر تم ان کا فدیہ دیتے ہو، حالانکہ حرام تھا تم پر ان کا نکالنا، کیا تم ایمان رکھتے ہو بعض کتاب سے اور کفر کرتے ہو بعض سے، تو نہیں جزاء جو شخص کرے یہ تم میں سے، سوائے رسوائی کے دنیا کی زندگی میں، اور قیامت کے دن پھیریں جائیں گے سخت عذاب کی طرف اور نہیں اللہ غافل اس سے جو تم عمل کرتے ہو۔“

توراة میں اللہ تعالیٰ نے یہود کو ارشاد فرمایا تم آپس میں ایک دوسرے کو قتل نہ کرنا۔ اور تم ایک دوسرے پر ظلم کر کے ان کو ان کے گھروں اور بستیوں سے نہ نکالنا۔ اور اپنے ہی یہود کے خلاف کسی

دوسرے کی امداد نہ کرنا۔ اور اگر تمہارے یہود کسی کے قیدی ہو جائیں تو فدیہ دے کر ان کو چھڑالینا۔ یہود نے رب تعالیٰ کے تین احکام کو پشت ڈال دیا، ان سے روگردانی کی۔

ایک دوسرے کو اپنے حلیفوں سے مل کر قتل بھی کرتے۔ اور ظلم کر کے ان کو گھروں سے نکال بھی دیتے۔ اپنے ہی یہود کے خلاف اپنے حلیفوں کی امداد کرتے۔ البتہ ایک کام کرتے کہ یہود میں سے کوئی قیدی ہو جاتا تو یہ فدیہ دے کر اسے چھڑا لیتے تھے۔

جب ان سے پوچھا جاتا تم ایسا کیوں کرتے ہو تو یہ کہتے کہ ہمیں توراۃ میں یہ حکم دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ احکام تو دوسرے بھی توراۃ میں ہیں لیکن تم ان پر عمل نہیں کرتے، اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ تم بعض کتاب پر ایمان رکھتے ہو اور بعض کا انکار، تمہارا یہ فعل دنیا میں رسوائی کا سبب ہے اور قیامت کے دن تمہیں سخت عذاب کی طرف لوٹایا جائے گا۔ تم یہ نہ سمجھنا کہ اللہ تعالیٰ تمہارا عملوں سے بے خبر ہے وہ کسی طرح بھی تمہارے عملوں سے غافل نہیں۔

(از خازن)

﴿ثُمَّ أَنْتُمْ هَؤُلَاءِ تَقْتُلُونَ أَنْفُسَكُمْ﴾: ”پھر تم یہ قتل کرتے ہو اپنوں کو“ تم تراخی کے لئے آتا ہے۔ ﴿هَؤُلَاءِ﴾ کا اشارہ ذات کی طرف ہوتا ہے۔ ان کا وعدہ سے پھر جانا اگرچہ اس سے ان کی صفت بدلی لیکن اسے ذات کے بدلنے سے تعبیر فرما دیا۔ یعنی اللہ تعالیٰ سے وعدہ کرنے کے بعد پھر جانے کو اس طرح ذکر فرمایا کہ تم تو یہ ہو جنہوں نے وعدہ کیا تھا کہ ہم اپنوں کا خون نہیں بہائیں گے اور اپنوں کو گھروں سے نہیں نکالیں گے اور اپنوں کے خلاف دوسروں کی امداد نہیں کریں گے جب تم وعدہ سے پھر گئے تو گویا کہ تم وہ رہے ہی نہیں جو وعدہ کرتے وقت تھے۔

(از بیضاوی)

خیال رہے ﴿تَقْتُلُونَ أَنْفُسَكُمْ﴾ میں وہ تمام احتمال پائے جاتی ہیں جو ﴿لَا تَسْفِكُونَ دِمَاءَكُمْ﴾ میں ذکر کئے گئے ہیں۔

اعتراض: انتہم حاضرین کے لئے اور ﴿هَؤُلَاءِ﴾ غائبین کے لئے ہے ایک ہی جملہ میں مخاطبین اور غائبین کا اجتماع کیسے صحیح ہے؟

جواب: ﴿هَؤُلَاءِ﴾ سے ﴿أَنْتُمْ﴾ کی تاکید کی گئی اور خبر ﴿تَقْتُلُونَ﴾ ہے یہ جواب

زیادہ قوی ہے تاہم اس کے اور جواب بھی دیئے گئے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ تقدیر عبارت کی اس طرح ہو ﴿ثُمَّ أَنْتُمْ يَا هَؤُلَاءِ﴾ اسے لوگو پھر تم یہ ہو۔ اس طرح دونوں لفظ خطاب کے لئے ہو گئے۔ ان جوابات میں سے ایک اور جواب یہ ہے کہ تقدیر عبارت کی یہ ہے ”ثُمَّ أَنْتُمْ اعْنَى هَؤُلَاءِ الْحَاضِرِينَ“ پھر تم میری مراد یہ حاضرین ہیں۔ ان جوابات میں سے ایک یہ بھی ہے ”انہ بمعنی الذین وصلته“ کہ ﴿هَؤُلَاءِ﴾ ﴿الَّذِينَ﴾ کے معنی میں ہو یعنی اشارہ موصول کے معنی میں استعمال ہو۔ اور اس کا صلہ ﴿تَقْتُلُونَ﴾ ہو۔

خیال رہے کہ اگرچہ آخری تین جوابات کو علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے ضعیف قرار دیا ہے لیکن راقم کے قول کو اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے تائید حاصل ہو گئی کہ صرف ایک ہی کتاب کو ذہن میں نہ بٹھایا جائے، کیونکہ علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے ﴿هَؤُلَاءِ﴾ کو موصول کے معنی میں لینا کوئی نحو یوں کا ضعیف مذہب قرار دیا ہے لیکن اعلیٰ حضرت نے اسے ضعیف نہیں تسلیم کیا اسی لئے ترجمہ موصول والا کیا ہے ”پھر یہ جو تم ہو“۔

﴿وَتُخْرِجُونَ فَرِيقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ﴾:

”اور تم نکالتے ہو اپنے ہی ایک فریق کو ان کے گھروں سے“

یعنی تم اپنے حلیفوں سے مل کر اپنے ہی خاندان کے یہودیوں کو گھروں سے نکال دیتے ہو۔

نکتہ: پہلی آیت میں ذکر کیا گیا ﴿وَلَا تُخْرِجُونَ أَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ﴾ اور اس آیت میں ذکر کیا گیا ﴿وَتُخْرِجُونَ فَرِيقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ﴾ چونکہ پہلی آیت میں ﴿وَلَا تُخْرِجُونَ أَنْفُسَكُمْ﴾ ذکر فرمایا جس سے یہ مسئلہ بیان کیا گیا کہ تم اپنے ہی رشتہ داروں کو جو ان کے گھروں سے نکالتے ہو وہ درحقیقت تم اپنے آپ کو ہی نکال رہے ہو، کیونکہ اپنے خاندانی اور اپنے دینی بھائیوں کو تکلیف دینا اپنے آپ کو تکلیف دینا ہے۔ اس کے بعد ﴿مِّنْ دِيَارِكُمْ﴾ ذکر کیا۔ جس کا معنی ”اپنے گھروں سے“ اب مکمل مطلب یہ ہو گیا۔ تم اپنے آپ کو اپنے گھروں سے نہ نکالو اگرچہ مراد یہ ہے کہ تم اپنے بھائیوں کو ان کے گھروں سے نہ نکالو۔

دوسری آیت میں چونکہ ﴿فَرِيقٌ﴾ ذکر کیا ہے جو اسم ظاہر ہے درجہ غائب میں ہے تو اس لئے

﴿ مِنْ دِيَارِهِمْ ﴾ میں بھی ضمیر غائب کی ذکر کردی گئی، کہ تم اپنے ہی ایک فریق کو ان کے گھروں سے نکالتے ہو۔
(ماخوذ از روح المعانی)

﴿ تَظَاهَرُونَ عَلَيْهِمْ بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ﴾:
”تم امداد کرتے ہو ان کے خلاف گناہ اور ظلم سے“

﴿ تَظَاهَرُونَ ﴾ کا معنی ہے ”تعاونون“ تم امداد کرتے ہو۔ یہ لفظ ”ظہر“ سے لیا ہوا ہے جس کا معنی ”پیٹھ“ چونکہ کسی کی امداد کرنے سے اس کی پشت پناہی ہوتی ہے اس لئے ﴿ تَظَاهَرُونَ ﴾ کا معنی ہوا تعاون کرنا۔

﴿ عَلَيْهِمْ ﴾ لفظ ”علی“ سے بعض اوقات ضرر کا معنی لیا جاتا ہے اس لئے یہاں مطلب ہو گیا ان کے خلاف یعنی تم اپنے خاندانی اور مذہبی بھائیوں کے خلاف اپنے حلیفوں کی امداد کرتے ہو۔

(از قرطبی)

﴿ بِالْإِثْمِ ﴾ اس کے معانی یہ ہیں ”الاثم الفعل الذی يستحق عليه صاحبه الذم واللعوم“ وہ فعل جس کی وجہ سے فاعل (کام کرنے والے) کی مذمت کی جائے اور اسے ملامت کا مستحق سمجھا جائے اسے ”اثم“ کہا جاتا ہے۔

”وقيل ما تنفر منه النفس ولا يطمئن اليه القلب“

اور جس کام سے نفس نفرت کرے اور دل اس سے مطمئن نہ ہو اسے ”اثم“ کہا جاتا ہے۔

حدیث شریف میں ہے ”الاثم ما حاك في صدرك“ جو تمہارے دل میں کھٹکے (جس کے کرنے سے ملامت کا خطرہ ہو) وہ اثم ہے۔ شراب کو بھی اثم کہا جاتا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا:

شربت الائم حتى ضل عقلي

میں نے شراب پیا جس سے میری عقل زائل ہو گئی اسی طرح گناہوں سے بھی عقل زائل ہوتی ہے

﴿ وَالْعُدْوَانِ ﴾ تجاوز الحد فی الظلم ”ظلم میں حد سے تجاوز کرنا“ عدوان“ کہلاتا ہے۔

(از روح المعانی)

تنبیہ: ”الآية تدل على ان الظلم كما هو محرم فكذا اعانة الظالم على ظلمة محرمة“

(کبر)

اس آیت کریمہ سے یہ واضح ہوا کہ جس طرح ظلم کرنا حرام ہے اسی طرح ظالموں کی امداد کرنا بھی حرام ہے۔ واضح ہوا کہ مسلمانوں کے خلاف یہود و نصاریٰ کی امداد کرنا حرام ہے۔

اعتراض : اللہ تعالیٰ ظالم کو ظلم کی قدرت عطا فرماتا ہے اور ہر قسم کی رکاوٹ اور موانع کو زائل کرتا ہے۔ اور اس پر خواہشات کو مسلط کر دیتا ہے جس کی وجہ سے وہ ظلم کرتا ہے۔

”فلو كانت اعانة الظالم على ظلمه قبيحة لوجب ان لا يوجد ذلك من

الله تعالى“

اگر ظالم کی ظلم پر معاونت برا کام ہوتا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ظالم کی معاونت نہ پائی جاتی۔

جواب : ”انه وان مكن الظالم من ذلك فقد زجره عن الظلم بالتهديد والزجر“

اللہ تعالیٰ نے بیشک انسان کو قدرت دے رکھی ہے اسے مختار بنایا ہے چاہے تو وہ اپنے اختیار سے ظلم ہی کیوں نہ کرتا رہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ظلم پر اپنی گرفت اور عذاب کا ذکر بھی کیا ہے تو واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ظلم پر معاونت نہیں پائی جاتی۔ کسی کو مختار بنانا اور کام کی قدرت دینا اور چیز ہے، اور کسی کی معاونت کرنا اور چیز ہے معاونت میں خوشی اور رغبت پائی جاتی ہے۔

”بخلاف المعين للظالم على ظلمه فانه يرغب فيه ويحسنه في عينه

ويدعوه اليه فظهر الفرق“

ظالم کے ظلم پر معاونت کرنے والا اس کے ظلم کو پسند کرتا ہے۔ اور اس کی آنکھ میں اس کا ظلم حسین نظر آتا ہے اور وہ اسے ظلم کرنے کی دعوت دیتا ہے کہ تم ظلم کو جاری رکھو۔

اب بہت واضح طور پر فرق کا پتہ چل گیا کہ معاونت کیا ہے اور قدرت و اختیار دینا کیا ہے۔

(ارکبو)

تنبیہ : اگرچہ ظلم کرنا بھی حرام ہے اور ظلم کی معاونت بھی حرام ہے لیکن ظلم کرنا عظیم جرم ہے اور ظلم کی معاونت اس سے کچھ کم ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کوئی شخص دوسرے کو ظلم کرنے پر آمادہ کرتا رہے اور اسے امداد کرنے کی پیشکش کرے لیکن وہ ظلم نہ کرے تو اس کی معاونت کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ لیکن ظلم کرنے والا کبھی بغیر کسی معاونت کے ظلم کر لیتا ہے۔

تو اسی سے واضح ہو گیا کہ ظلم بنسبت معاونت ظلم کے عظیم جرم ہے۔ اگرچہ دونوں فعل ہی حرام ہیں۔

(از کبیر)

اللہ تعالیٰ ظالموں کے ظلم سے بچائے اے مولائے کائنات ظلم اور ظلم کی معاونت سے دور رکھ۔

﴿وَإِنْ يَأْتُوكُمْ أُسَارَىٰ تُفَادُّوهُمْ﴾ :

”اور اگر وہ تمہارے پاس قیدی ہو کر آئیں تو تم ان کا فدیہ دے دیتے ہو۔“

یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے اس حکم پر عمل کرتے کہ یہود اپنے دوسرے یہود بھائیوں کو فدیہ دے کر قید سے چھڑا لیتے ”اساری“ جمع ہے اسیر کی۔ اسیر کا لفظ ماخوذ ہے ”اسارۃ“ (بکسر الهمزة) سے ”اسارۃ“ اس رسی کو کہا جاتا ہے جس کے ذریعے اونٹ کی پیٹھ پر پالان باندھتے ہیں۔

چونکہ اس زمانہ میں قیدی کو بھی رسی سے باندھا جاتا تھا اس لئے اسے اسیر کہہ لیا جاتا تھا، بعد میں مطلقاً محبوس کو اسیر کہا جانے لگا خواہ اسے رسی سے باندھا گیا ہو یا نہ باندھا گیا ہو۔ (از شیخ زادہ)

فائدہ : اسی آیت سے ایک اور فائدہ بھی حاصل ہو گیا:

”وقیل معانہ ان یاتوکم اساری فی ایدی الشیاطین تتصدون لا نقاذہم
بالارشاد والوعظ مع تضحیککم کقولہ تعالیٰ اتامرون الناس بالبر
وتنسون انفسکم“

کہ ان کے ایک اور طریقہ کی مذمت کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے کہ اگر ان کے پاس شیطانوں کے ہاتھوں میں کوئی قیدی بن کر آتے یعنی گناہوں میں مبتلا ہوتے تو یہود کے علماء ان کو وعظ و نصیحت کرتے اور ان کی رہنمائی کرتے لیکن خود اس پر عمل نہیں کرتے تھے جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا (ترجمہ) ”کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنی جانوں کو بھولتے ہو۔“

(بیضاوی)

حضرت عبداللہ بن سلام کا قول :

عبد خیر سے مروی ہے کہ ہم نے سلمان بن ربیعہ باہلی کی معیت میں ایک شہر کا محاصرہ کیا ہم نے اس شہر کو فتح کر لیا اور وہاں کے کئی لوگوں کو قید کر لیا۔

حضرت عبداللہ بن سلام نے ایک یہودیہ کو سات سو درہم سے خرید لیا، جب آپ جالوت کی قوم کے ایک سردار کے قریب سے گزرے اس کے پاس سواری سے اتر کر اسے کہا کیا تم اپنے دین پر قائم رہنے والی اس عورت کو خریدنا چاہتے ہو؟ اس نے کہا ہاں میں خرید لیتا ہوں۔ آپ نے اسے بتایا کہ میں نے سات سو درہم سے خریدا ہے اس نے کہا تم مجھ سے سات سو درہم مزید نفع لے لو۔ آپ نے فرمایا میں نے قسم اٹھا رکھی ہے کہ چار ہزار درہم سے کم پر نہیں بیچنا۔ اس نے کہا میں اس قیمت پر نہیں خریدتا۔ آپ نے فرمایا تم ضرور خریدو گے یا اپنے دین کا انکار کرو گے۔

آپ نے اسے کہا ذرا میرے قریب ہو جاؤ، وہ قریب ہوا آپ نے اس کے کان میں کہا تو رات میں یہ ہے:

”انک لا تجد مملوک من بنی اسرائیل الا اشتریتہ فاعتقته وان یاتوکم اساری تفادوہم وھو محرم علیکم اخراجہم“
بیشک تم بنی اسرائیل سے کوئی مملوک نہ پاؤ مگر یہ کہ اسے خرید کر آزاد کر دو اگر تمہارے پاس قیدی آئیں تو ان کا فدیہ دو اور تم پر حرام ہے کہ اپنے ہی یہودیوں کو ان کے گھروں سے نکالو۔

اس نے کہا کیا تم عبداللہ بن سلام ہو؟ آپ نے فرمایا ہاں۔ وہ چار ہزار درہم لے آیا۔ لیکن آپ نے اس سے دو ہزار درہم لئے اور دو ہزار واپس کر دیئے۔ (ابن کثیر)

☆ ”اخبّرنا ابو العالیۃ ان عبد اللہ بن سلام مر علی رأس الجالوت بالکوفۃ وھو یفادی من النساء من لم یقع علیہ العرب ولا یفادی من وقع علیہ العرب فقال عبد اللہ اما انہ مکتوب عندک فی کتابک ان تفادیہن کلھن“ (ابن کثیر)

ابو العالیہ نے بیان کیا بیشک عبداللہ بن سلام جالوت قوم کے ایک سردار کے قریب سے کوفہ میں گزرے وہ ان عورتوں کا فدیہ دے کر چھڑاتا جن سے عرب لوگوں نے جماع نہ کیا ہوتا اور جن سے انہوں نے جماع کر لیا ہوتا ان کا فدیہ نہیں دیتا تھا۔ حضرت عبداللہ بن سلام ﷺ نے فرمایا تمہاری کتاب میں یہ ہے کہ تمام کا فدیہ دے کر ان چھڑاؤ۔

قیدیوں کو چھڑانے کا حکم شریعت مصطفوی میں:

”عن الحکم عن جدہ ان رسول اللہ ﷺ کتب کتابا بین المہاجرین والانصار ان یعقلوا معاقلہم ویفدوا عانیہم بالمعروف والاصلاح بین المسلمین“

حکم اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے مہاجرین اور انصار کے درمیان ایک معاہدہ تحریر فرمایا کہ ایک دوسرے کی دیت ادا کرنا، اور قیدیوں کو اچھی طرح قانون کے مطابق فدیہ دے کر چھڑانا اور مسلمانوں کے درمیان اصلاح کرنا۔

☆ ”عن ابی موسیٰ الاشعری قال قال رسول اللہ ﷺ اطعموا الطعام وافشوا السلام وعودوا المریض وفکوا العانی“

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا طعام کھلاؤ، سلام عام کرو، مریض کی عیادت کرو، اور قیدیوں کو چھڑاؤ۔

”فہذان الخبران یدلان علی فکاک الاسیر لان العانی ہو الاسیر“

یہ دونوں حدیثیں قیدیوں کو چھڑانے پر دلالت کرتی ہیں احادیث میں جو لفظ ”العانی“ استعمال ہوا ہے اس کا معنی قیدی ہے۔

☆ ”وقد روی عمران بن حصین وسلمۃ بن الاکوع ان النبی علیہ السلام فدی اساری من المسلمین بالمشرکین“

حضرت عمران بن حصین اور سلمۃ اکوع رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے مسلمان قیدیوں کا فدیہ مشرک قیدی دیئے۔

واضح ہوا کہ قیدیوں کا بدلہ قیدی دے کر اپنے قیدی چھڑانا بھی شریعت مصطفوی کا قانون ہے۔

☆ ”سئل الحسن بن علی علیہما السلام علی من فدی الاسیر قال علی الارض التی یقاتل عنہا“

بشر بن غالب کہتے ہیں حضرت امام حسین بن علی رضی اللہ عنہما سے سوال کیا گیا کہ قیدی کا فدیہ کون ادا کرے؟ تو آپ نے فرمایا جن لوگوں سے مل کر اس نے قتال کیا ہے وہی فدیہ بھی ادا کریں۔ یعنی

جس زمین اور شہر کے دفاع کے لئے وہ جنگ میں شریک ہونے کی وجہ سے قیدی ہوا ہے ان لوگوں پر ہی فدیہ لازم ہے۔
(احکام القرآن لمصاحف)

یاد رفتگان: جصاص کا حوالہ تحریر کرنے پر اپنے مہربان، مخلص دوست مولنا ابوالفضل اللہ دتہ سیالوی رحمہ اللہ آف بھابڑا ضلع سرگودھا کی یاد آئی۔ جنہوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام علالت میں مجھے جصاص کا مطالعہ کرنے کا مشورہ دیا۔ جب آپ کمپلیس اسلام آباد میں زیر علاج تھے۔ چند ہی روز کے بعد آپ کا وصال ہو گیا اللہ تعالیٰ آپ کی قبر کو کشادہ فرمائے جنت الفردوس عطا فرمائے۔

(آمین ثم آمین)

﴿وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ إِخْرَاجُهُمْ﴾ اس جملہ کا تعلق ماقبل جملہ ﴿وَتُخْرِجُونَ فَرِيقًا مِّنْ دِيَارِهِمْ﴾ سے ہے۔ اور درمیان میں جملہ معترضہ ہے اب معنی یوں ہو گیا ”اور نکالتے ہو تم اپنے ایک فریق کو ان کو بستیوں سے حالانکہ ان کا نکالنا تم پر حرام قرار دیا گیا۔“

دینی طلباء کرام کے لئے: ہضمیر کا مرجع ”اخراج“ ہے جس پر ﴿وَتُخْرِجُونَ﴾ دلالت کر رہا ہے۔ اور بعد میں آنے والا ﴿إِخْرَاجُهُمْ﴾ تاکید ہے ضمیر کے مرجع کی۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ ”ہو“ اوڈ آنے والا جملہ اس کی تفسیر بیان کر رہا ہے۔

تیسرا احتمال یہ کہ ”ہو“ ضمیر مبہم ہو اور آنے والا جملہ اس کی تفسیر ہو۔

ضمیر شان اور ضمیر مبہم میں فرق: اگرچہ دونوں ہی اس کی محتاج ہوتی ہیں کہ آنے والا جملہ ان کی تفسیر بیان کرے، لیکن ان میں فرق یہ ہے۔ کہ ضمیر شان میں مؤول عنہ (جس کے متعلق سوال ہو) کا اجمالی طور پر لحاظ کیا جاتا ہے۔ پھر آنے والے جملہ سے اس کے تعین کو بیان کیا جاتا ہے کہ اس کی شان یہ ہے جس کے متعلق سوال کیا گیا ہے۔

یعنی پہلا جملہ ذکر کیا گیا ﴿وَتُخْرِجُونَ فَرِيقًا مِّنْكُمْ﴾ ”نکالتے ہو تم اپنے ایک فریق کو ان کے گھروں سے“ تو ضمنا سوال ہوا کہ ان کو گھروں سے نکالنے کا حکم کیا ہے؟ تو جواب دیا گیا کہ ہاں اس کی شان یہ ہے یعنی ہاں اس کا حکم یہ ہے ”کہ تم پر ان کا نکالنا حرام کیا گیا۔“

ضمیر مبہم میں ضمنا سوال نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی کسی چیز کی تعین ہوتی ہے۔ بلکہ بیان کرنے والا خود ہی ابہام کو دور کرنے کے لئے ایک جملہ ذکر کر دیتا ہے جس میں تفسیر پائی جاتی ہے۔

(از بیضاوی و شیخ زادہ)

﴿اَفْتُوْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ﴾:

”کیا تم ایمان لاتے ہو بعض کتاب پر اور انکار کرتے ہو بعض کا“۔

یعنی توراۃ میں تمہیں قیدیوں کا فیہ دے کر چھڑانے کا جو حکم دیا گیا ہے اس پر تو تم عمل کرتے ہو گویا کہ اس پر تمہارا ایمان ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے لیکن اسی کتاب میں رب تعالیٰ نے تمہیں یہ حکم بھی دیا ہے کہ اپنے ہی نسبی اور دینی بھائیوں کو قتل نہ کرو، ان کو گھروں سے نہ نکالو، اور ان کے خلاف دوسرے کافروں کی امداد نہ کرو۔ ان تمام احکام پر تمہارا عمل نہیں، گویا کہ تم نے ان احکام کو اللہ تعالیٰ کے احکام ہی تسلیم نہیں کیا۔

رب تعالیٰ کے اس ارشاد سے واضح ہو گیا:

”اگر بیک حکم کتاب خود نگر دید کافر مطلق شدید“

اگر اللہ تعالیٰ کی کتاب کا ایک حکم بھی تسلیم نہ کیا تو مطلقاً کافر ہو جائے گا۔ (از عزیزی)

کیونکہ یہ مسئلہ بھی روز روشن کی طرح واضح ہے کہ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ فلاں شخص آدھا کافر ہے اور فلاں چوتھائی حصہ کافر ہے یقیناً جب کافر ہوگا تو پکا اور مکمل کافر ہوگا۔

﴿فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلُ ذَلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾:

”جو شخص تم میں سے یہ کرے اس کی نہیں جزاء سوائے دنیا کی زندگی میں رسوائی کے“۔

﴿خِزْيٌ﴾ کا معنی ہے ذلت جس سے انسان کو حیاء محسوس ہو۔ اسی وجہ سے ﴿خِزْيٌ﴾ دونوں معنوں میں بیک وقت بھی استعمال ہوتا ہے اور علیحدہ علیحدہ بھی۔ تاہم ذلت کو حیاء لازم ہے۔

”یقال اخزاه الله ای اذله ومقته وابعده“

جس طرح کہا جاتا ہے ”اخزاه الله“ اللہ تعالیٰ اسے ذلیل کرے اور اس سے ناراض ہو اور

حالات سے تمام انبیاء کرام کو خبر دی گئی تھی۔ یہود نے نبی کریم ﷺ کی تکذیب کی۔ اور مصطفیٰ کریم ﷺ کی صفات کو چھپایا تو رب تعالیٰ نے ان کو لعنت کا مستحق قرار دیا۔

(از صابونی)

نکتہ: ﴿خِزْيٌ﴾ کو نکرہ ذکر کر کے اس طرف اشارہ کیا کہ رب تعالیٰ نے ان کو دنیا میں بہت زیادہ ذلت اور رسوائی عطا کی۔

(از روح المعانی)

﴿وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَىٰ أَشَدِّ الْعَذَابِ﴾:

”اور قیامت کے دن پھیریں جائیں گے سخت عذاب کی طرف“

”يردون ای يصيرون اليه فلا يلزم كينونتهم قبل ذلك في اشد

العذاب“

بظاہر ایک وہم پیدا ہوتا تھا کہ ﴿يُرَدُّونَ﴾ کا معنی ہے ”لوٹایا جانا“ یہ اس وقت صادق آتا ہے۔ جب وہ پہلے بھی شدید عذاب میں ہوں اور قیامت کے دن پھر ان کو شدید عذاب کی طرف لوٹایا جائے۔ حالانکہ آیت کا یہ مفہوم نہیں۔ تو اس کے جواب کی طرف اشارہ ہے کہ ﴿يُرَدُّونَ﴾ کا یہاں معنی ”پھیرا جانا“ ہے۔

قیامت کا عذاب زیادہ شدید ہوگا کیونکہ دنیا کی رسوائی ختم ہونے والی ہے لیکن قیامت کا عذاب ختم ہونے والا نہیں، پھر قیامت میں بھی کافروں کو ان کے کفر کے مطابق مختلف درجوں کے عذاب دیئے جائیں گے اگرچہ وہ عذاب ہمیشہ رہنے کے لحاظ پر سب کے لئے برابر ہوگا۔ (از روح المعانی)

ایک غلط فہمی کا ازالہ: علامہ رازی رحمہ اللہ نے ایک سوال و جواب کو بیان فرمایا جس سے غلط فہمی ہوتی ہے لیکن غور کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ آپ نے درست تحریر فرمایا:

”ففيه سوال وهو ان عذاب الدهرية الذين ينكرون الصانع يجب ان

يكون اشد من عذاب اليهود فكيف قال في حق اليهود ﴿يُرَدُّونَ إِلَىٰ أَشَدِّ

العَذَابِ﴾ والجواب المراد منه انه اشد من الخزي الحاصل في الدنيا

فلفظ الاشد وان كان مطلقا الا ان المراد اشد من هذه الجهة“ (كبير)

اس میں سوال یہ ہوتا ہے کہ دھریہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کا کابھی انکار کرتے ہیں کوئی خالق، مٰی

اسے (اپنی رحمت سے) دور کرے۔ (ماضی کے مطابق خبر والا معنی بھی کیا جاسکتا ہے)۔ اور بھی ”اخزاه اللہ“ کا معنی اس طرح کر لیا جاتا ہے ”اوقعه موقعا يستحي منه“ اللہ تعالیٰ اسے ایسی جگہ پر واقع کرے جس سے اسے حیا آئے۔

دنیا میں ان کی ذلت ایسے کو تیسرا: دنیا میں ان کو فضیحت (رسوائی) اور سزا دے کر اور جز یہ مقرر کر کے اور ان کے دشمنوں کو ان کے خلاف غلبہ عطاء کر کے ذلیل کیا گیا تاہم بنی قریظہ اور بنی نضیر کو اسی طرح کی سزا دے کر رسوا کیا گیا جیسا کہ وہ خود کرتے تھے۔

”وقد روی عن ابن عباس رضی اللہ عنہما انه قال کان عادة بنی قریظہ

القتل وعادة بنی النضیر الاخراج فلما غلب رسول اللہ ﷺ اجلی بنی

النضیر وقتل رجال قریظہ واسر نساء ہم واطفالهم“

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ بیشک بنی قریظہ کی عادت تھی کہ وہ

دوسروں کو قتل کرتے تھے اور بنی نضیر کی عادت تھی کہ وہ دوسروں کو جلا وطن کرتے تھے

جب نبی کریم ﷺ یہود پر غالب ہوئے تو آپ نے بنی نضیر کو جلا وطن کر دیا اور بنی قریظہ

کے مردوں کو قتل کر دیا۔ اور ان کی عورتوں اور بچوں کو قید کر لیا۔ (از روح المعانی)

یہود کی اور رسوائی: یہود یہ عقیدہ بھی رکھتے تھے کہ جو کچھ توراۃ میں ہے وہ حق ہے لیکن جاننے،

پچاننے اور اس کے صحیح ہونے کی شہادت دینے کے باوجود اس کی مخالفت کرتے تھے ”فلہذا

لا یؤمنون علی ما فیہا ولا علی نقلہا“ وہ اللہ کی کتاب میں جو کچھ مذکور تھا اس کی مخالفت کر

کے امانت میں خیانت کے مرتکب ہوئے۔ اور اسی طرح اس کے مسائل جو دوسروں پر بیان کرتے تھے

ان میں بھی حق بیان نہیں کرتے تھے، لہذا کتاب میں خلل واقع کرنے کی وجہ سے گویا کہ امانت میں

خیانت کے مرتکب ہو رہے تھے۔

”ولا یصدقون فیما کتموہ من صفة رسول اللہ ﷺ ونعته ومبعثہ

ومخرجه ومہاجرہ وغیر ذلک من شؤنہ التي اخبرت بها الانبیاء قبلہ

علیہم الصلوۃ والسلام والیہود علیہم لعائن اللہ یتکاتمونه بینہم“

نبی کریم ﷺ کی صفات اور آپ کی بعثت (اعلان نبوت) آپ کا مکہ سے نکلنا یعنی ہجرت

کرنا اور آپ کے حالات جو توراۃ میں مذکور تھے یہود نے ان کو چھپایا۔ حالانکہ ان تمام

اور میت نہیں مانتے ان کا عذاب یہود سے شدید ہوگا تو یہود کے متعلق ﴿يُسرَدُونَ﴾ کا معنی اشد العذاب کہنے کا کیا مطلب ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ دنیا میں ان کو جو رسوائی حاصل ہوئی ہے اس کی بنسبت قیامت کے دن ان کو عذاب اشد ہوگا مراد اشد اسم تفصیل سے یہی نسبت ہے اگرچہ ذکر مطلق ہے۔

علامہ رازی کے اس قول سے غلط فہمی اس لئے ہوئی کہ ایک تو ﴿يُسرَدُونَ﴾ کا معنی ﴿يُصِيرُونَ﴾ پھیرا جانا ہے دوسرا یہ کہ جہنم میں مختلف درجات کے کفار کو عذاب ہوں گے۔ اس لئے اس سوال و جواب کی کوئی حیثیت ہی نہیں، لہذا اسے ذکر کرنے کی کوئی خاص وجہ نہیں۔

لیکن راقم کے نزدیک سوال حقیقت پر مبنی ہے کہ جب جہنم میں کفار کو عذاب مختلف درجات کے ہوں گے تو یہود کے عذاب کو دھریہ لوگوں کو عذاب سے اشد کہنا کیسے صحیح؟ اس کے جواب کی ضرورت تھی جو آپ نے ذکر فرمایا کہ یہاں یہود کے اپنے دنیا کے عذاب کی بنسبت اخروی عذاب کو اشد کہا گیا ہے۔

(واللہ اعلم بالصواب)

﴿وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ﴾ : ”اور نہیں اللہ تعالیٰ غافل اس سے جو تم عمل کرتے ہو“

”اعتراض و تذیل لتاکید الوعد المستفاد مما قبلہ ای انہ بالمرصاد“

لا یغفل عما تعملون من القبائح“

یہ جملہ معترضہ ہے (ان کے نزدیک جو آخر میں جملہ معترضہ کے قائل ہیں) اور پہلے جملہ کے ساتھ ہی اسے بطور تاکید ذکر کیا کیونکہ پہلے جملہ سے ان کا وعید کا مستحق ہونا سمجھ میں آ رہا تھا اور اس جملہ میں بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں سب کچھ ہے وہ تمہارے برے اعمال سے غافل نہیں۔ (روح المعانی) خیال رہے کہ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی کے مطابق ہے (اور اللہ تمہارے کوتلوں سے بے خبر نہیں) برے اعمال کو آپ ”کوتلوں“ سے تعبیر فرماتے ہیں۔ لیکن ہمارے آج کل کے محاورہ میں ”کوتلوں“ کا استعمال نہیں۔ اس لئے راقم نے ترجمہ یہ لکھا ”اور نہیں اللہ غافل اس سے جو تم عمل کرتے ہو۔“

تنبیہ: راقم نے شروع شروع تو ترجمہ سلیس اردو میں آسان کرنے کی کوشش کی۔ لفظوں کے مطابق ترجمہ نہیں لیا۔ لیکن اب کوشش یہ کر رہا ہوں۔ کہ پہلے لفظ کا ترجمہ پہلے، دوسرے کا بعد میں ہو سوائے مرکب اضافی کے اس میں جب تک مضاف الیہ کا ترجمہ پہلے نہ ہو تو بات بنتی نہیں کوشش پھر بھی ہے کہ

ترجمہ آسان رہے لیکن لفظوں کی ترتیب کے مطابق ترجمہ سے سلیس اردو نہیں بنتی۔

فائدہ : علامہ رازی رحمہ اللہ نے اس جملہ میں ایک عجیب وسعت کا ذکر کیا۔

﴿وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ﴾ تہدید شدید و زجر عظیم عن المعصية وبشارة عظيمة على الطاعة لان الغفلة اذا كانت ممتعة عليه سبحانه مع انه اقدر القادرين وصلت الحقوق لا محالة الى مستحقها“

اس جملہ میں معصیت سے شدید طور پر ڈرایا گیا ہے اور عظیم زجر کی گئی۔ اور طاعت میں بشارت عظیمہ بھی پائی گئی۔ اس لئے کہ جب یہ معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ غافل نہیں ہو سکتا اور یہ بھی واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ عظیم قدرت کا مالک ہے تو یقیناً مستحقین کو اللہ تعالیٰ نے ان کے حقوق عطا فرمانے ہیں معصیت کا عمل کرنے والوں کو ان کے عمل کے مطابق اور طاعت کا عمل کرنے والوں کو ان کے عمل کے مطابق رب تعالیٰ جزاء دے گا۔ (از کبیر)

☆ ”روی عن عمر رضی اللہ عنہ انه قال ان بنی اسرائیل قد مضوا وانتم تعنون بهذا یا امة محمد وبما یجری مجراه“

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا بنی اسرائیل تو گزر چکے ہیں اب اے امت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت کریمہ سے تم عبرت حاصل کرو کہ اگر تم نے اللہ تعالیٰ کے احکام سے روگردانی کی تو تم رب تعالیٰ کی گرفت میں ہو گے کیونکہ رب تعالیٰ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں۔

(از روح المعانی)

☆☆☆

﴿أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرُوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ فَلَا

يُخَفَّفُ عَنْهُمْ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ﴾ (آیت ۸۶)

(۱) ”یہ ہیں وہ لوگ جنہوں نے آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی مول لی تو ان پر سے عذاب ہلکا ہوگا اور نہ ان کی مدد کی جائے“

(۲) ”یہ لوگ ہیں جنہوں نے حاصل کی دنیا کی زندگی آخرت کے بدلے تو نہیں تخفیف کی جائے گی ان سے عذاب کی اور نہ ان کی مدد کی جائے گی۔“

﴿اشْتَرَاءٌ﴾ کا معنی خریدنا، یہاں مجازی معنی مراد ہے اختیار کرنا، تبدیل کرنا، پسند کرنا، حاصل کرنا وغیرہ۔ یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کر کے آخرت کا اجر و ثواب حاصل کر سکتے تھے لیکن انہوں نے دنیا کی زندگی اور دنیاوی منافع کو ترجیح دے کر رب تعالیٰ کے احکام سے روگردانی کر لی:

﴿فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ الْعَذَابُ﴾ ”تو نہیں تخفیف کی جائے ان سے عذاب کی“

عذاب کی تخفیف کبھی عذاب کو ختم کرنے سے کی جاتی ہے اور کبھی عذاب کو کل وقت یا بعض وقت میں کم کر کے تخفیف کی جاتی ہے۔ جب رب تعالیٰ نے فرمایا کہ ان سے عذاب میں تخفیف نہیں ہوگی، تو واضح ہوا کہ ان کا عذاب نہ ختم ہوگا، نہ کم ہوگا۔

﴿وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ﴾ ”اور ان کی امداد نہیں کی جائے گی“ یعنی دنیا میں ان سے رسوائی ختم کر کے ان کی امداد نہیں کی جائے گی اور ان سے دنیا میں جزیہ ختم کر کے ان کی امداد نہیں کی جائے گی۔ اور آخرت میں ان سے عذاب ختم کر کے ان کو امداد نہیں کی جائے گی۔ اور نہ ہی کوئی شخص ان کی طرف سے فدیہ لے کر ان کو اخروی عذاب سے چھڑا سکے گا۔ اور نہ ہی کوئی ان کو جبراً چھڑا سکے گا۔ طلباء کرام خصوصی طور پر یہ یاد رکھیں کہ یہاں ”ہم“ کو مقدم ”تقویٰ“ کے لئے کیا گیا ہے۔

حصر کے لئے مقدم نہیں ذکر کیا گیا۔ اس لئے ایسا نہیں کہا جاسکتا کہ یہ معنی کیا جائے کہ صرف یہود کی امداد نہیں کی جائے گی اور کافروں کی امداد کی جائے گی۔ نہیں نہیں ایسا نہیں بلکہ مطلب صرف اتنا ہے کہ یہود کی امداد نہیں کی جائے گی۔

(ماخوذ از کبیر، روح المعانی، وتفسیر ابی السعود)

﴿وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَقَفَّيْنَا مِنْ بَعْدِهِ بِالرُّسُلِ
وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ
أَفَكُلَّمَا جَاءَكُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَى أَنْفُسُكُمْ
اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيقًا تَقْتُلُونَ﴾ (آیت ۸۷)

(۱) ”اور بیشک ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی اور اس کے بعد پے درپے رسول بھیجے۔ اور ہم نے عیسیٰ بن مریم کو کھلی نشانیاں عطاء کیں اور پاک روح سے اس کی مدد کی تو کیا تمہارے پاس کوئی رسول وہ لے کر آئے جو تمہارے نفس کی خواہش نہیں تکبر کرتے ہو تو ان (انبیاء) میں ایک گروہ کو تم جھٹلاتے ہو اور ایک گروہ کو شہید کرتے ہو۔“

(۲) ”اور البتہ تحقیق ہم نے عطاء کو موسیٰ کو کتاب اور لگا تار بھیجے ہم نے ان کے پیچھے کئی رسول اور عطاء کیں ہم نے عیسیٰ بن مریم کو واضح نشانیاں، اور قوت دی ہم نے اس کو روح قدس سے کیا جب بھی لایا تمہارے پاس کوئی رسول وہ چیز جسے نہیں پسند کیا تمہارے نفسوں نے (تو) تم نے تکبر کیا تو ایک فریق کو تم جھٹلاتے ہو اور ایک فریق کو تم شہید کرتے ہو۔“

اللہ تعالیٰ نے یہود کو جو نعمتیں عطا کیں ان میں سے اور نعمت کا ذکر کیا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی راہنمائی کے لئے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب یعنی توراۃ عطا کی۔ اور اس کے بعد بھی پے درپے (لگا تار) انبیاء کرام ان کی ہدایت کے لئے رب تعالیٰ بھیجتا ہی رہا، پھر عیسیٰ علیہ السلام کو واضح نشانیاں دے کر بھیجا عیسیٰ علیہ السلام کی روح قدس سے امداد کی۔

لیکن بنی اسرائیل نے اپنی روش (اپنے طریقہ) کو نہ بدلا۔ بلکہ انبیاء کرام نے اگر رب تعالیٰ کی طرف سے ایسے احکام لائے جو ان کی خواہشات کے مطابق نہیں ہوتے تھے تو وہ تکبر، غرور کی وجہ سے ان کا انکار کر دیتے یہاں تک کہ بعض انبیاء کرام کو انہوں نے جھوٹا کہا اور بعض کو شہید کر دیا۔

(از تکبر)

﴿وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ﴾

”اور البتہ تحقیق عطا کی ہم نے موسیٰ کو کتاب“ یہاں کتاب سے مراد توراۃ ہے۔

☆ ”عن ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما ان التوراة نزلت جملة واحدة فامر الله تعالى موسى عليه السلام بحملها فلم يطق فبعث بكل حرف منها ملكا فلم يطيقوا حملها فخففها الله تعالى لموسى عليه السلام فحملها“

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں بیشک توراۃ تمام ایک مرتبہ ہی نازل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو اس کے اٹھانے کا حکم دیا آپ نہ اٹھا سکے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ہر حرف کے بدلے ایک فرشتہ اٹھانے کے لئے بھیجا۔ وہ بھی نہ اٹھا سکے تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے لئے اس کا اٹھانا آسان کر دیا۔ تو آپ نے اسے اٹھا لیا۔
(از روح المعانی)

یعنی نہ تو الفاظ میں کمی ہوئی اور نہ ہی اس کی برکت اور عظمت میں کوئی کمی ہوئی بلکہ رب تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے موسیٰ علیہ السلام کے لئے اس کا بوجھ ہلکا کر دیا۔ جیسا کہ قرآن پاک نبی کریم ﷺ کی امت کے سینوں میں محفوظ ہونا آسان کر دیا۔ حالانکہ یہی قرآن اگر پہاڑ پر نازل ہوتا تو وہ بھی قرآن پاک کی عظمت کی وجہ سے طاری ہونے والی خشیت سے پھٹ جاتا۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿لَوْ أَنزَلْنَاهُ الْقُرْآنَ عَلَىٰ جَبَلٍ لَّرَأَيْنَاهُ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللَّهِ﴾

”اگر ہم یہ قرآن کسی پہاڑ پر اتارتے تو ضرور تو اسے دیکھتا جھکا ہوا پاش پاش ہوتا اللہ کے خوف سے“

﴿وَقَفَّيْنَا مِنْ بَعْدِهِ بِالرُّسُلِ﴾: ”اور لگا تار بھیجے ہم نے اس کے پیچھے کئی رسول“

”وقفینا ای واتبعنا“ ہم نے پیچھے بھیجا ”التففيه الاتباع والارداف“ کہ یہ لفظ ”تففيه“ سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے پیچھے ہونا، کسی کے ساتھ سواری پر اس کے پیچھے سوار ہونا ”قفاء“ گردن کے پچھلے حصہ کو کہتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ ”ہم نے موسیٰ کے بعد کئی رسول پے درپے بھیجے“ دوسرے مقام پر رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ثُمَّ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرًا﴾ پھر ہم نے اپنے رسول لگا تار بھیجے ”(تترا) ای واحدا

بعد واحد“ یعنی تتر کا معنی ہے ایک دوسرے کے بعد بھیجنا۔

موسیٰ علیہ السلام سے لے کر عیسیٰ علیہ السلام تک ہزاروں کی تعداد میں انبیاء کرام تشریف لائے سب کا عمل توراۃ پر ہی رہا۔ شریعت ایک ہی رہی البتہ بعض اوقات شریعت پر عمل چھوڑ دیا گیا شریعت گویا کہ درجہ معدومیت میں پہنچ گئی تو اور رسول مبعوث ہو گئے۔ موسیٰ علیہ السلام کے بعد آنے والے جلیل القدر انبیاء کرام یہ تھے: حضرت یوشع بن نون، حضرت اشمویل، حضرت داؤد، حضرت سلیمان، حضرت ارمیا، حضرت حزقیل، حضرت الیاس، حضرت یونس، حضرت زکریا، حضرت یحییٰ علیہم السلام۔ (از خازن)

یہ بھی خیال رہے کہ زبور میں احکام نہیں تھے صرف اذکار اور ادتھے۔

﴿وَآتَيْنَا عِيسَىٰ بْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ﴾:

”اور ہم نے عطا کیں عیسیٰ بن مریم کو واضح نشانیاں“

﴿الْبَيِّنَاتِ﴾ سے مراد عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات بھی ہیں، مردہ کو زندہ کرنا مادرزاد اندھے کو نظر عطا کرنا، اور برص کی مرض والے کو صحیح کرنا۔ ﴿الْبَيِّنَاتِ﴾ سے مراد انجیل بھی جو واضح احکام و دلائل پر مشتمل تھی۔ ﴿عِيسَى﴾ عبرانی لفظ ہے جس کا معنی ہے ”سردار“ اور ”مبارک“۔ (از روح المعانی)

”ومريم در لغت عبرانی بمعنی خادم است چوما در ایشان را برای

خدمت بیت المقدس نذر کرده بود ایشان را مريم نام گزاشت“

(عزیزی)

مریم کا معنی عبرانی زبان میں ”خادم“ ہے چونکہ آپ کی والدہ نے بیت المقدس کی خدمت کیلئے نذر مانی تھی اس لئے آپ کا نام بھی مریم رکھا۔

﴿وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ﴾: ”اور امداد کی ہم نے اس کی روح قدس سے“

﴿أَيَّدْنَاهُ﴾ قوینا، ہم نے اس کو طاقت دی مراد امداد کی ہاتھ کو ”ید“ کہا جاتا ہے اور اس کی جمع ”ایدی“ آتی ہے چونکہ ہاتھ میں بھی پکڑنے کی قوت پائی جاتی ہے اس لئے ”ید“ کہہ لیا جاتا ہے۔

﴿بِرُوحِ الْقُدُسِ﴾ روح سے مراد وہی روح ہو جس پر حیات کی دار و مدار ہے اور ”قدس“

سے مراد اللہ تعالیٰ ہو اضافۃ تشریفیہ ہے جس طرح عبد اللہ، امۃ اللہ، بیت اللہ، ناقۃ اللہ، میں اضافۃ تشریفیہ پائی گئی ہے۔ تقریباً اسے یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ گویا اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہم نے عیسیٰ کو اپنی طرف سے خصوصی روح عطاء فرمائی وہ روح ہمارے تقرب کی وجہ سے عیسیٰ علیہ السلام کی تقویت کا سبب بنی۔

”وقال ابن عباس هو اسم الله الاعظم الذي كان عيسى يحيى به الموتى“

اسی طرح روح قدس کا اور یہ بھی معنی ہے ”اللہ کا اسم اعظم“ جس کی وجہ سے آپ مردوں کو زندہ فرماتے تھے۔ اب مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے گویا کہ یہ فرمایا ہم نے عیسیٰ کی اپنے اسم اعظم سے امداد فرمائی جس سے آپ کے معجزات کا ظہور ہوتا تھا۔

”وقيل هو الانجيل لانه حياة القلوب سماه روحا كما سمي القرآن روحا“

اسی طرح روح القدس سے مراد ”انجیل“ بھی ہے کیونکہ وہ دلوں کو زندہ کرتی جب تک (اصلی حال میں تھی اور منسوخ نہیں ہوئی تھی) جس طرح قرآن پاک کو روح کہا گیا ہے جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ رُوحًا﴾ بیشک ہم نے آپ کی طرف روح (قرآن پاک) کو نازل فرمایا۔

”وقيل هو جبريل ووصف بالقدس وهو الطهارة لانه لم يقترب ذنبا قط“

اور مطلب یہ ہے کہ روح سے مراد جبریل ہے اور قدس سے مراد پاک ہونا ہے یعنی جبریل نے کبھی گناہ کا ارتکاب نہیں کیا اب مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے جبریل پاک کے ذریعہ آپ کی امداد کی۔

”وقيل القدس هو الله تعالى والروح جبريل كما تقول عبد الله سمي جبريل روحا للطفاته لانه روحاني خلق من النور“

اور مطلب یہ ہے کہ قدس سے مراد اللہ تعالیٰ اور روح سے مراد جبریل، اضافۃ تشریفیہ ہے جیسے کہ عبد اللہ میں ہے، جبریل کو روح اس لئے کہا گیا ہے کہ اس میں لطافت پائی گئی ہے وہ روحانی ہے نور سے پیدا کیا گیا ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا ”ہم نے اپنی نورانی مخلوق جبریل کے ذریعے ان کو طاقت دی (امداد کی)۔“

”وقيل سمي روحا لمكانه من الوحي الذي هو سبب حياة القلوب“

اور وجہ جبریل کو روح کہنے کی یہ ہے کہ جبریل وحی لانے کی وجہ سے دلوں کی زندگی کا سبب ہے جس طرح روح سے ظاہری طور پر حیات حاصل ہوتی ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا ہم نے ان کی امداد کی وحی لانے والے جبریل کے ذریعے۔

تنبیہ: اگرچہ یہ تمام معانی اجتماعی طور پر مراد لئے جاسکتے ہیں لیکن ”و حمل روح القدس ہنا علی جبریل اولیٰ“ یہاں روح القدس مراد جبریل لینا زیادہ بہتر ہے۔ (از خازن)

عیسیٰ علیہ السلام کو جبریل کی تائید اس طرح حاصل تھی کہ آپ جہاں چلتے تھے جہاں جاتے تھے جبریل آپ کے ساتھ ہوتے اور آپ کی معاونت کرتے۔ (از خازن)

فائدہ: نبی کریم ﷺ نے حضرت حسان ؓ کو فرمایا ”اھجھم وروح القدس معک“ ان کافروں کو جھو بیان کر دو روح قدس تمہارے ساتھ ہیں۔ اور ایک مقام پر فرمایا ”اھجھم و جبریل معک“ ان کفار کی جھو بیان کریں جبریل تمہارے ساتھ ہیں۔

اگرچہ نبی کریم ﷺ کے ارشادات گرامیہ سے ظاہر طور پر یہ معنی سمجھ آ رہا ہے کہ تم کفارہ کی جھو بیان کرو تمہارے ساتھ روح قدس جبریل ہیں۔ یعنی ان کی تائید تمہیں حاصل ہے۔ چونکہ حضرت حسان ؓ کے لئے حضور ﷺ نے دعاء فرمائی ”اللھم ایدہ بروح القدس“ اے اللہ انہیں روح قدس کی تائید عطا فرما۔ (از روح المعانی و قرطبی)

لیکن حضرت حسان ؓ نے کمال عقیدت سے یہ بیان کیا کہ میرے امداد کرنے والے جبریل بھی نبی کریم ﷺ ہیں اور روح القدس بھی آپ ہی ہیں۔ سبحان اللہ حضرت حسان ؓ کو یقین تھا کہ نبی کریم ﷺ کو رب تعالیٰ نے گناہوں سے معصوم پیدا کیا اس لئے آپ روح قدس ہیں۔

لیکن افسوس صد افسوس سنیت کے لبادہ میں اغیار آج کل نبی کریم ﷺ کی طرف ذنب بمعنی گناہ لے کر ذنب در ذنب میں مبتلاء ہو رہے ہیں ”اللھم انا نعوذ بک من الجاہلین“ اور حضرت حسان ؓ کو یہ بھی یقین تھا کہ نبی کریم ﷺ نورانی مخلوق تھے کہاں جبریل کی نورانیت جو فرع ہے اور کہاں آپ کی نورانیت جو اصل ہے۔ حضرت حسان ؓ نے کیا خوب بیان فرمایا:

وجبریل رسول اللہ فینا وروح القدس لیس له کفاء

(مسلم ج ۲ باب فضائل حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ)

اللہ کے رسول جبریل ہم میں ہیں اور روح قدس ہیں جن کا کوئی مثل نہیں

خیال رہے کہ بعض شارحین نے اس شعر میں جبریل سے مراد جبریل ہی لیا لیکن راقم کے نزدیک سیاق و سباق کے لحاظ پر یہی معنی زیادہ قریب ہے جو ذکر کر دیا ہے۔

فائدہ جلیلہ: ”عن عائشة قالت کان رسول اللہ ﷺ یضع لِحسان منبراً فی المسجد یقوم علیہ قائماً یفاخر عن رسول اللہ ﷺ او ینافح ویقول رسول اللہ ﷺ ان اللہ یؤید حسان بروح القدس ما نافع او فاجر عن رسول اللہ ﷺ“ (رواہ البخاری، مشکوٰۃ باب البیان والشعر)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے لئے مسجد میں منبر رکھتے اور اس پر حضرت حسان کھڑے ہو کر نبی کریم ﷺ کی مدح کرتے اور کفار کی جھوکی مدافعت کرتے۔ یعنی ان کی جھوکی آپ جواب دیتے رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے۔ بیشک اللہ تعالیٰ حسان کی روح قدس سے تائید عطا فرمائے جب تک یہ اللہ کے رسول (ﷺ) کی طرف سے کفار کی جھوکی مدافعت کرتے رہیں۔

﴿أَفْکَلَمَّا جَاءَ کُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوٰی أَنْفُسُکُمْ اسْتَكْبَرْتُمْ﴾ : ”کیا جب بھی لایا جائے تمہارے پاس کوئی رسول وہ چیز جس کو نہیں پسند کیا تمہارے نفسوں نے (تو) تم نے تکبر کیا۔“

یعنی رب تعالیٰ نے انبیاء کرام کو بنی اسرائیل کی راہنمائی کے لئے بھیجا لیکن جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کے احکام پیش فرمائے تو ان کو پسند نہ آئے تو انہوں نے تکبر کر کے ان سے روگردانی کر لی۔

ان کے تکبر کرنے کی وجہ کیا تھی: یہود کا انبیاء کرام کی تکذیب کرنا اور ان کو شہید کرنا اور ان کے بتائے ہوئے حق راستہ سے روگردانی کرنا اس وجہ سے تھا:

”وانما کانوا کذلک لارادتهم الرفعة فی الدنیا وطلبهم لذاتها والترویس علی عامتهم واخذ اموالهم بغير حق وکانت الرسل تبطل علیهم ذلک فیکذبونهم لاجل ذلک“

کہ یہود کی نظر میں دنیاوی رفعت کی قدر و منزلت تھی دین کے معاملہ میں انہیں کوئی

پرواہ نہیں تھی وہ صرف دنیا کی لذات کو حاصل کرنے کے درپے تھے، وہ عام لوگوں کو ڈراتے رہتے تھے ان کو دھمکیاں دیتے رہتے تھے لوگوں کا مال ناحق جابرانہ اور غاصبانہ طور پر لے لیتے تھے۔

ان کے ان غلط کاموں پر انبیاء کرام انہیں متنبہ کرتے، ان کو بتاتے کہ تم باطل کام کر رہے ہو، انبیاء کرام کے حق راہ بتانے پر اور ان کو غلط کاموں سے روکنے کی وجہ سے انہوں نے انبیاء کرام کی تکذیب شروع کر دی۔

﴿فَفَرِيقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيقًا تَقْتُلُونَ﴾: ایک فریق کی تم تکذیب کرتے ہو یعنی

موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام وغیرہا کی انہوں نے تکذیب کی۔ اور ایک فریق کو تم شہید کرتے ہو۔ یعنی حضرت یحییٰ، حضرت زکریا، حضرت شعبا، وغیرہم علیہم السلام کو انہوں نے شہید کیا۔

”وَيُوهَمُونَ عَمَاهُمْ كَاذِبِينَ وَيَحْتَبُونَ فِي ذٰلِكَ بِالْتَحْرِيفِ
وَسُوءِ التَّوِيلِ“

اور ان کے علماء عوام کے دلوں میں یہ وہم ڈالتے کہ یہ انبیاء (معاذ اللہ) جھوٹے ہیں اور کتب میں تحریف کر کے اور غلط تاویلیں کر کے عوام کو حق سے برگشتہ کرتے۔

”وَمِنْهُمْ مَنْ كَانَ يَسْتَكْبِرُ عَلَى الْاَنْبِيَاءِ اسْتِكْبَارِ ابْلِيسَ عَلَى اٰدَمَ“

ان یہود میں سے کئی لوگ اپنے آپ کو انبیاء کرام سے اعلیٰ سمجھتے ان کا تکبر ایسا تھا جیسا کہ شیطان نے آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ کرنے سے تکبر کیا اور رب تعالیٰ کے حکم کا انکار کیا۔ نبی کریم ﷺ کو شہید کرنے میں بھی یہود نے بہت کوشش کی۔ آپ کو زہر آلود بکری کا گوشت کھلا کر شہید کرنے کی کوشش کی۔ پھر آپ پر جادو کر کے آپ کو شہید کرنے کی کوشش کی لیکن اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو بتا دیا کہ کس نے جادو کیا اور کیسے کیا۔

اس طرح اللہ تعالیٰ نے آپ کو ظاہری شہادت سے تو محفوظ رکھا البتہ اس زہر کا اثر لوٹ آیا تھا جب آپ کا وصال ہوا تو گویا کہ یوں کہا جاسکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی شہادت باطنیہ بھی یہود کے ہاتھوں سے ہوئی۔

یہود و ہنود کا اشتراک: کفار مکہ کو بھی نبی کریم ﷺ سے اسی قسم کی مخالفت تھی جیسے بنی اسرائیل کو انبیاء کرام سے مخالفت رہی۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَإِذَا تُلِيٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا إِنَّا بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَذَا أَوْ بَدَّلَهُ قُلْ مَا يَكُونُ لِيْ أَنْ أَبَدِّلَهُ مِنْ تَلْقَائِيْ نَفْسِيْ إِنْ أَتَّبَعَ إِلَّا مَا يُوْحَىٰ إِلَيَّ﴾ (سورۃ یونس آیہ ۱۵)

”اور جب تلاوت کی جاتی ہیں ان پر ہماری آیات جو واضح ہیں کہتے ہیں وہ لوگ جو نہیں امید کرتے ہماری ملاقات کی کہ لے آؤ قرآن اس کے سوا، یا اسے بدل دو، آپ فرمادیں نہیں ہے (یہ حق) میرے لئے کہ میں اسے تبدیل کر دوں اپنی طرف سے میں نہیں تابعداری کرتا سوائے اس کے جو میری طرف وحی کی جاتی ہے۔“

کفار کا مطالبہ: کفار کی ایک جماعت نبی کریم ﷺ کے پاس آئی وہ کہنے لگے کہ اس قرآن میں ہمارے معبودوں کے خلاف بیان کیا گیا ہے۔ اور ہر قسم کی ہماری عیاشی کے ذرائع شراب نوشی، جو بازی لوٹ کھسوٹ، رشوت، سود خوری کو حرام قرار دے دیا گیا ہے۔ اس لئے ہمارا مطالبہ صرف یہ ہے کہ اس قرآن کے علاوہ کوئی اور قرآن لے آؤ، یا اسی قرآن کو بدل کر اس میں ترمیم کر دو، تاکہ ہم اپنے معبودوں کی عبادت بھی کرتے رہیں۔ اور عیاشی کے تمام ذرائع پر عمل کرتے رہیں اور تمہارا قرآن بھی ان کو جائز قرار دے تو ہمارا اور تمہارا جھگڑا ختم ہو جاتا ہے ہم تم پر ایمان لے آئیں گے۔

نبی کریم ﷺ نے رب تعالیٰ کے حکم سے ان کو دو ٹوک جواب دیا کہ قرآن رب کا کلام ہے رب تعالیٰ کی طرف سے جو وحی آتی ہے میں وہی بیان کرتا ہوں۔ قرآن کو میں بدل دوں یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد پر کفار بت پرست آپ کے مخالف ہو گئے بتوں کا مخالف سمجھنے لگے اپنے باطل دین کا مخالف سمجھنے لگے بلکہ یہوں کہیں کہ غنڈے اور بدمعاش نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کو (معاذ اللہ) دہشت گرد سمجھنے لگے جھوٹے لوگ معاذ اللہ آپ کی تکذیب کرنے لگے۔

آپ کو راستے سے ہٹانے کے مختلف حربے استعمال کرنے لگے لیکن کفار ذلیل ہوئے مصطفیٰ کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ کو رب تعالیٰ نے رفعت و بلندی سے نوازا۔ ایک وقت وہ بھی آیا جب فتح مکہ کے وقت بڑے بڑے جابر کفار حضور ﷺ کے سامنے سر جھکانے لگے۔

تاریخ واقعات کو دہرا رہی ہے: آجکل کفار کے یار، یہود و نصاریٰ کے مددگار، بدکردار لوگ علماء کو دہشت گرد کہہ رہے ہیں وہ بھی چاہتے ہیں کہ جو ہم کہیں علماء اسے جائز قرار دے دیں جب علماء کہتے ہیں کہ حرام کو حلال کہنا ہم سے ممکن نہیں تو وہ کہتے ہیں کہ یہ پاگل ہیں، یہ دہشت گرد ہیں ان کو مٹا دو دینی مدارس کو ختم کر کے ایسے مدارس بناؤ جس سے فارغ ہونے والے نام نہاد مولوی ہماری ہاں میں ہاں ملا دیں۔

یہی ہنود کی پرانی تاریخ آج پھر دوہرائی جا رہی ہے لیکن اپنے آباؤ اجداد، اپنے پیشواؤں کی طرح انشاء اللہ یہ بھی ذلیل ہوں گے۔ اور علماء کرام انشاء اللہ زندہ رہیں گے، ان کے مٹانے سے نہیں مٹیں گے۔ یہ چراغ پھونکو سے نہ بجھایا جائے گا۔

تنبیہ: ﴿لَا تَهْوِی﴾ ماخوذ ”ہوی“ (بالکسر) سے اس کا معنی ہے محبت کرنا ”لا تہوی انفسکم ای لا تحب انفسکم“ جس چیز کو تمہارے نفس پسند نہیں کرتے، اور جب ”ہوی“ (بالفتح) ہو تو اس کا معنی گرنا ہوتا ہے ﴿أَفْکَلَّمَا﴾ میں استفہام تو بیخ کے لئے ہے:

”وقال تو بیخا اکفرتم بہم فکلما جاءکم“

یعنی ان کو ڈانٹے ہوئے، زجر کرتے ہوئے فرمایا کیا تم ان سے کفر کرتے ہو جب وہ احکام لاتے ہیں جو تمہیں پسند نہیں آتے۔ یعنی ان کا انبیاء کرام کے خلاف تکبر کرنا اور انکار کرنا کفر ہے۔

(از مظہری)

☆☆☆☆☆

﴿ وَقَالُوا قُلُوبُنَا غُلْفٌ بَلْ لَعَنَهُمُ اللَّهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيلًا مَّا يُؤْمِنُونَ ﴾

(آیت ۸۸)

- (۱) ”اور یہودی بولے ہمارے دلوں پر پردے پڑے ہیں بلکہ اللہ نے ان پر لعنت کی ان کے کفر کے سبب تو ان میں تھوڑے ایمان لاتے ہیں۔“
- (۲) ”اور انہوں نے کہا ہمارے دلوں پر پردے ہیں بلکہ لعنت ہے ان پر اللہ کی بوجہ ان کے کفر کے تو تھوڑے ہیں جو ایمان لاتے ہیں۔“

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ان پر نعمت عظمیٰ کا ذکر فرمایا اور ساتھ ہی ان کی عادت جو کجروی (میزھی چال) کی تھی اسے بھی ذکر کر دیا۔ نبی کریم ﷺ کا تشریف لانا اور ان کو دعوت اسلام دینا بہت بڑی نعمت تھی، لیکن انہوں نے یہ کہا کہ ہمارے دلوں پر تو پردے چھائے جاتے ہیں جو تم ہمیں دعوت اسلام دیتے ہو وہ ہماری سمجھ میں نہیں آ سکتی تو رب تعالیٰ نے ان کا رد کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ غلط کہتے ہیں ان کے دلوں میں تو سمجھنے کی صلاحیت موجود ہے البتہ ان کے کفر کی وجہ سے ان پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے اسی لئے وہ ایمان سے دور ہیں تھوڑے ہی ہیں جو ایمان لاتے ہیں۔

﴿ وَقَالُوا قُلُوبُنَا غُلْفٌ ﴾ : ”اور انہوں نے کہا ہمارے دلوں پر پردے ہیں“ یہ مختصر سے الفاظ مبارکہ ہیں لیکن کثیر معانی پر مشتمل ہیں:

﴿ وَقَالُوا ﴾ میں ضمیر یہودی کی طرف لوٹ رہی ہے یعنی یہود نے کہا۔

﴿ غُلْفٌ ﴾ جب لام کے سکون سے ہو تو یہ ”اغلف“ کی جمع ہے جس کا معنی ہوتا ہے پیدائشی پردہ جس کی وجہ سے کوئی چیز دل میں محفوظ نہ رہ سکے اور سمجھ میں کچھ نہ آئے۔ اور ﴿ غُلْفٌ ﴾ جب لام کے ضمہ سے ہو تو یہ جمع ہوتی ہے ”غلاف“ کی یہ کسی چیز کو ڈھانپ دینے کو کہا جاتا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ جو چیز دل میں ہے پردہ نے اسے محفوظ کر دیا ہے۔

(مختصر از مظہری)

”عن ابن عباس وقالوا قلوبنا غلف ای فی اکنۃ“
حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ یہودیوں نے کہا ”
ہمارے دل پردہ میں ہیں۔“

”وعن ابن عباس وقالوا قلوبنا غلف ای لا تفقه“
حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں ایک اس کا معنی یہ ہے کہ یہودیوں نے
کہا ”ہمارے دل سمجھتے نہیں۔“

”وعن ابن عباس وقالوا قلوبنا غلف ہی القلوب المطبوع علیہا“
حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں اس کا ایک معنی یہ ہے کہ یہودیوں نے کہا
ہمارے دلوں پر مہر لگا دی گئی ہے۔

اور یہی قول حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کا بھی ہے کیونکہ انہوں نے فرمایا اس کا معنی یہ ”علیہا طابع“
ہمارے دلوں پر مہر ہے۔

”وقال مجاہد وقالوا قلوبنا غلف علیہا غشاوة ، وقال السدی
يقولون علیہا غلاف وهو الغطاء“

مجاہد اور سدی دونوں حضرات کے اقوال کا مطلب تقریباً ایک ہی ہے کہ ان یہودیوں
نے کہا ہمارے دلوں پر پردہ چھا گیا۔

قال مجاہد وقتادہ وقرأ ابن عباس غلف بضم اللام وهو جمع غلاف
ای قلوبنا او عیۃ لكل علم فلانحتاج الی علمک“

مجاہد اور قتادہ نے کہا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی قرأت میں ”غلف“ لام کی پیش
سے بھی پڑھا گیا ہے جو غلاف کی جمع ہے۔ اس لحاظ سے ان کا کہنا یہ تھا کہ ہمارے دلوں
میں جو علم پہلے سے موجود ہے اس پر غلاف چڑھا کر اسے محفوظ کر دیا گیا ہے لہذا ہم
تمہارے علم کے محتاج نہیں۔
(از ابن کثیر)

تین معانی واضح ہیں:

”احدها انه جمع اغلف والا غلف هو ما فی غلاف ای قلوبنا مغشاة
باغطية مانعة من وصول اثر دعوتک الیہا“

ان میں سے ایک معنی یہ ہے کہ غلف جمع ہے اغلف کی اور اغلف اسے کہتے ہیں جو غلاف میں ہو
یعنی ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ ہمارے دلوں پر پردے چھائے ہوئے ہیں جو تمہاری دعوت کو
ہمارے دلوں تک پہنچنے سے مانع ہیں۔

وثانیہا روی الاصل عن بعضهم غلف بالعلم ومملوءة
بالحكمة فلا حاجة معها بهم الى شرع محمد عليه السلام

ان معانی میں دوسرا یہ ہے کہ ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ ان کے دل علم اور حکمت سے بھرے
ہوئے ہیں یعنی ان کے دلوں پر غلاف چڑھا کر علم و حکمت کو محفوظ کر دیا گیا ہے لہذا اس کے ہوتے ہوئے
محمد (ﷺ) کی شریعت کی ضرورت نہیں۔

”وثالثها غلف ای كالغلاف الخالی لا شئی فیہ مما یبدل علی صحة
قولک“

ان معانی میں تیسرا یہ ہے کہ ہمارے دلوں پر تو خالی غلاف ہے ان میں کوئی چیز نہیں جس سے سمجھ
آئے کہ تمہاری بات صحیح ہے یعنی ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ ہمارے دل تو سمجھنے سے خالی ہیں لہذا
تمہارا ہمیں تبلیغ کرنا اس لئے مفید نہیں ہو سکتا کہ ہم میں سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں۔ (از کبیر)
خیال رہے کہ وہ اپنے آپ کو بڑا عقل مند بھی سمجھتے تھے لیکن یہ ان کا کہنا صرف ان کی کجروی
کی وجہ سے تھا۔

﴿بَلْ لَعَنَهُمُ اللَّهُ بِكُفْرِهِمْ﴾: ”بلکہ لعنت ہے ان پر اللہ کی وجہ ان کے کفر کے“
اللہ تعالیٰ نے ان کا رد کیا کہ ان کا یہ کہنا غلط ہے کہ ہمارے دلوں میں تمہاری بات آ نہیں سکتی اللہ تعالیٰ تو
ہر شخص کو سمجھنے کی صلاحیت عطا کر کے پیدا فرماتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”ما من مولود الا یولد علی الفطرة فابواه یهود انه وی نصرانه

ویمجسانه“ (رواہ البخاری ومسلم من حدیث ابی ہریرۃ)

کسی بچے کو نہیں پیدا کیا جاتا سوائے فطرت کے البتہ اس کے ماں باپ اسی یہودی بنا
دیتے ہیں یا نصرانی بنا دیتے ہیں یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔

مطلب واضح ہے کہ ہر بچہ پیدائش کے وقت فطرۃ اسلامیہ پر پیدا ہوتا ہے اس میں اسلام کے سمجھنے کی صلاحیت ہوتی ہے لیکن وہ اپنے والدین کو دیکھ کر ان کا مذہب ہی اختیار کرتا ہے اگر اس کے ماں باپ یہودی ہوئے تو انہوں نے اسے اپنی یہودیہ طرز سے اس سے یہودی بنادیا۔ اور اگر اس کے ماں باپ نصرانی ہوئے تو وہ اسے اپنی نصرانی روش سے نصرانی بنادیتے ہیں۔ اور اگر اس کے والدین مجوسی ہوئے تو وہ اسے اپنے دین کی تربیت کرنے سے اپنے جیسا مجوسی بنادیتے ہیں۔

”رد لما قالو والمعنى انها خلقت على الفطرة والتمكن من قبول الحق ولكن الله خذلهم بكفرهم“

یعنی ان کے اقوال کا رد اس طرح کیا گیا کہ وہ فطرۃ اسلامیہ پر پیدا کئے گئے حق کے قبول کرنے کی انکو طاقت دی گئی لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کے کفر کی وجہ سے رسوا اور ذلیل کیا۔ اور ان کی استعداد کو ان کے کفر نے باطل کیا ان کے کفر نے ان کو توبہ کرنے سے ہی دور کر دیا توبہ کرتے اسلام قبول کرتے تو یقیناً رب تعالیٰ اسے شرف قبولیت عطا فرماتا۔ رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَاصْمُتْهُمْ وَأَعْمِ أَبْصَارَهُمْ﴾ ”(ان کو ان کے کفر نے) بہرا اور اندھا کر دیا ہے۔“

(از مظہری و بیضاوری)

لعنت کیا ہے؟ ”واصل اللعن الطرد والابعاد“ عرب کی کلام میں لعنت کا معنی دور کرنا، ہانکنا چلانا ہے۔ اسی لئے بھیڑیے کو بھی ”ذنب لعین“ کہا جاتا ہے کہ اسے بھی دور بھگایا جاتا ہے۔

”فالمعنى ابعدهم الله من رحمته“ یہاں مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی رحمت سے دور کیا۔

”وقيل من توفيقه وهدايته“ یہاں لعنت کا معنی یہ لیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی توفیق اور ہدایت سے دور کیا۔

”وقيل من كل خير“ اور یہ مطلب بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ہر بھلائی سے دور کر دیا۔

(فرطی)

مسئلہ: جب لعنت کا معنی یہ لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ہر قسم کی رحمت سے دور کرے تو یہ لعنت صرف

کافر کے لئے ہے مومن فاسق کے لئے نہیں۔ اور اس کافر پر شخصی طور پر لعنت بھیجی جاسکتی ہے جس کی کفر پر موت یقینی ہے جیسے ابو جہل، ابولہب، فرعون، نمرود وغیرہا۔ جس شخص کی موت کفر پر یقینی طور پر ثابت نہ ہو اس پر شخصی طور پر لعنت نہیں بھیجی جاسکتی البتہ صرف اتنا کہنا کافی ہے:

﴿لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الْكَافِرِينَ﴾ ”اللہ کی لعنت ہو کافروں پر“

اگر وہ شخص کافر ہو تو اس لعنت میں خود شامل ہو جائے گا اور اگر کافر نہ ہو تو لعنت بھیجنے والا گنہگار نہیں ہوگا۔ لعنت کا جب یہ معنی لیا جائے کہ رب تعالیٰ کی رحمت خاصہ (جو مقررین مومنین کو حاصل ہونی ہے) سے دور ہو تو اس معنی کے لحاظ سے فاسق و فاجر پر لعنت بھیجی جاسکتی ہے لیکن یہ بھی شخصی نہ ہو، اجتماعی ہو اس طرح کہنا جائز ہوگا۔

”لعنة الله على الفاسقين ، لعنة الله على الظالمين ، لعنة الله على الكاذبين“

اسی معنی کے لحاظ پر نبی کریم ﷺ نے بعض عورتوں پر لعنت فرمائی۔

حضرت اسماء بنت ابی بکر نے کہا کہ ایک عورت نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اس نے عرض کیا کہ میری بیٹی کے بال بیماری کی وجہ سے گر گئے ہیں میں نے اس کی شادی کرنی ہے کیا میں اسے دوسری عورتوں کے بال لگا دوں؟ تو آپ نے فرمایا ”لعن الله الواصلة والمستوصلة“ دوسروں کے بال ملانے والیوں اور ملوانے والیوں پر اللہ کی لعنت۔

وضاحت حدیث: انسانی بالوں کی دگ لگانی حرام ہے کیونکہ انسان کے بالوں یا دوسرے اجزاء سے نفع حاصل کرنا حرام ہے ہاں اگر کسی جانور کے بال ہوں ان میں نجاست نہ ہو وہ خاوند کی اجازت سے لگا سکتی ہے۔

(نودی ج ۲ ص ۲۱۲)

اسی طرح پلاسٹک کی دگ جو آج کل استعمال ہوتی ہے وہ بھی جائز ہے۔ البتہ عام طور پر سر کے بالوں کا جوڑا بنا کر سر پر بال فیشن کے طور پر لپیٹے جاتے ہیں جو اونٹ کی کوہان کی طرح نظر آتے ہیں یہ ممنوع ہے تاہم غسل کے بعد بال خشک کرنے کے لئے عارضی طور پر بالوں کا جوڑا بنانا راقم کو ممنوع نظر نہیں آتا۔

”واما تحميم الوجه والخضاب بالسواد فان فعلته بغير اذن الزوج“

لیکن چہرے کا سرخ کرنا یا بالوں کا سیاہ کرنا اگر خاوند کی اجازت کے بغیر ہو تو حرام ہوگا اگر خاوند کی اجازت سے ہو تو صحیح یہ ہی ہے کہ جائز ہے تاہم اس حال میں بے حجاب ہو کر دوسرے نامحرم لوگوں کے سامنے آنا منع ہے۔

فائدہ : حرام کی معاونت بھی حرام ہے انسانی بال دوسری عورت یا مرد کے بالوں سے ملانے والی عورت پر مرد پر بھی اسی طرح لعنت ہوگی۔ جس طرح اس کو کہہ کر اپنے بالوں سے ملوانے والی پر لعنت ہے۔

☆ "عن عبد الله قال لعن الله الواشمات والمستوشمات والنامصات والمتنصات والمتفلجات للحسن المغيرات خلق الله" (مسلم ج ۲ ص ۲۱۳)

حضرت عبداللہ (بن مسعود) رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کی لعنت ہو رنگ بھرنے والی اور بھروانے والی پر، اور بال نوچنے والی اور نچوانے والی پر اور دانتوں کے درمیان حسن کے لئے کشادگی (جھری) بنانے والی پر کیونکہ وہ اللہ کی تخلیق کو بد لئے والی ہیں۔

وضاحت حدیث : "واشمات" وہ عورتیں ہیں جو دوسری عورتوں کے جسم میں سوئی چھو کر خون نکال کر اس میں رنگ بھر دیتی تھیں جس طرح اب بھی لوگ اپنے جسم پر نام لکھواتے ہیں یا پھول بنواتے ہیں یا جانوروں کی تصاویر بنواتے ہیں۔

"مستوشمات" یہ وہ عورتیں ہیں جو اس طرح اپنے جسم میں رنگ بھرواتی ہیں۔ خیال رہے کہ یہ فعل مردوں اور عورتوں کے لئے ایک جیسا ہی حرام ہے لیکن اس وقت عام طور پر یہ فعل صرف عورتوں میں پایا جاتا تھا اس لئے ان کا ہی تذکرہ کیا گیا ہے۔

"نامصات" چہرے کے بال نوچنے والی عورتوں کو کہا جاتا ہے۔

"متنصات" نوچوانے والی عورتوں کو کہا جاتا ہے لیکن یہ ابرؤں کے بال یا چہرے پر کہیں بال ہوں تو ان کا یہ حکم ہے۔ البتہ داڑھی یا مونچھوں پر عورت کے بال آجائیں تو اس کے لئے نوچنا مستحب ہے۔

"متفلجات" ان عورتوں کو کہتے ہیں جو اپنے سامنے والے دانتوں کو ریتی سے رگڑ کر ان کے

ورمیان فرجہ (کشادگی، جھری) بناتی تھیں تاکہ ان کے دانت حسین و جمیل نظر آئیں۔ اس غرض سے ایسا کرنے والی چونکہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق کو بدسنے کی کوشش کرتی ہیں لہذا لعنت کی مستحق ہوتی ہیں ہاں اگر علاج کرنے کی غرض سے یا کسی عیب کو زائل کرنا مقصود ہو تو جائز ہے۔ (نوری شرح مسلم ج ۲ ص ۲۱۳)

یزید پر لعنت کا حکم: اگرچہ علامہ تفتازانی رحمہ اللہ نے شرح عقائد میں بہت سختی کی ہے اور کہا ہے۔

”لعنة الله عليه وعلى انصاره واعوانه“

یزید اور اس کے تمام مددگاروں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو۔

”قال السيوطي لعن الله قاتل الحسين وابن زياد ومعه ويزيد“

(حاشیہ براس ص ۵۵۳)

علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو امام حسین علیہ السلام کے قاتل اور

ابن زیاد اور اس کا ساتھ دینے والے قاتلوں اور یزید پر۔

لیکن کچھ حضرات نے یزید پر شخصی لعنت سے اجتناب بھی کیا ہے۔

”وبهذا ظهر ان استدلالهم على لعن يزياد بالنصوص العامة غير

(براس ص ۵۵۵)

صحیح“

صاحب براس نے اپنے دلائل ذکر کرنے کے بعد کہا ہے کہ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یزید پر لعنت کرنے والے حضرات کے عام نصوص سے استدلال درست نہیں۔

قول فیصل: سب سے بہتر ارشاد سید الاولیاء حضرت پیر مہر علی شاہ رحمہ اللہ کا ہے۔ ایک شخص نے عرض کیا کہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی لعن یزید کے جواز کا فتویٰ دیتے ہیں۔ فرمایا کہ ”شیخ موبہوسفہ محبت بنو فاطمہ ہیں“ پس ان کو ایذا پہنچانے والے کو حق میں پورے طور پر مجوز لعنت ہیں۔ لیکن بعض اہل علم نے اس میں تامل کیا ہے اور کہا ہے کہ آخرت کا حال معلوم نہیں ممکن ہے یزید نے توبہ کی ہو علامہ تفتازانی نے اس کے رد میں خوب فرمایا ہے کہ قتل ذریت طیبہ اور ان کی اہانت بطور یقین اور امر مشہور ہے اور توبہ امر محتمل پس احتمال و ظن یقین سے کیا نسبت رکھتے ہیں اور بہت سے دیگر محققین بھی لعن کا جواز ثابت کرتے ہیں۔

ہمارے مخلصوں میں سے ایک شخص کو دمشق کی سیر و سیاحت کا اتفاق ہوا ہے اس نے بیان کیا ہے

کہ سارے شہر کی آلودگیاں اور خاکروبہ یزید کے قبر کے پاس ڈالتے ہیں وہ جگہ آبادی سے بہت دور ہے ہاں جواز اور لزوم میں فرق ہے لعن کو عادت بنانا ضروری اور لازم نہیں۔ بہتر ہے کہ بحکم فرمودہ حق تعالیٰ ﴿فَلَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الظَّالِمِينَ﴾ پر کفایت کی جائے۔ بجائے لعن کے اللہ اللہ کرنا اولین و آخرین کے حق میں بہتر کام ہے۔ (ملفوظات مہربہ ملفوظ نمبر ۱۶۳، ۱۶۴)

﴿فَقَلِيلًا مَّا يُؤْمِنُونَ﴾: ”تو تھوڑے ہیں جو ایمان لاتے ہیں“ اس کی تفسیر میں تین احتمال ہیں ”احدها ان القليل صفة المؤمن ای لا يؤمن منهم الا القليل“ ایک احتمال یہ ہے کہ قلیل صفت ہے مومن کی معنی یہ ہے کہ ان میں ایمان لانے والے نہیں ہیں سوائے تھوڑوں کے۔

”وثانيها انه صفة الايمان ای لا يؤمنون الا بقليل مما كلفوا به“ دوسرا معنی یہ ہے کہ قلیل صفت ہو ایمان کی۔ اب مطلب یہ ہوگا کہ وہ نہیں ایمان لاتے سوائے تھوڑی چیزوں کے یعنی ان کو جن احکام کا مکلف بنایا ہے بعض پر وہ ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر رب تعالیٰ کو مان لیا انبیاء کرام کا انکار کر دیا۔

”وثالثها معناه لا يؤمنون اصلا لا قليلا ولا كثيرا، كما يقال قليلا ما يفعل بمعنى لا يفعل البتة“

اور تیسرا معنی یہ ہے کہ وہ بالکل ایمان نہیں لاتے نہ قلیل پر نہ کثیر پر، جیسا کہ کہا جاتا ہے ”قليلًا ما فعل“ لیکن اس کا معنی یہ مراد لیا جاتا ہے ”وہ بالکل کام کرتا ہی نہیں“۔

علامہ کسائی رحمہ اللہ نے بھی بیان فرمایا ہے کہ عرب لوگ جب کسی زمین سے گزرتے ہیں تو کہتے ہیں ”قليلًا ما تنبت“ لیکن معنی وہ یہ مراد لیتے ہیں کہ یہ زمین تو کچھ اگاتی ہی نہیں۔ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے پہلا معنی ہی مراد لیا ہے راقم نے بھی وہی نقل کیا ہے علامہ رازی رحمہ اللہ نے بھی اسے ہی ترجیح دی اور فرمایا ”والوجه الاول اولی“ پہلا معنی ہی زیادہ بہتر ہے۔ کیونکہ اسے رب تعالیٰ کے دوسرے ارشاد گرامی سے تائید حاصل ہے۔

﴿بَلْ طَبَعَ اللَّهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُونَ إِلَّا قَلِيلًا﴾
”بلکہ اللہ تعالیٰ نے مہر لگا دی ان (کے دلوں) پر تو نہیں ایمان لاتے مگر تھوڑے“

کیونکہ اس آیت کریمہ میں تھوڑے ایمان لانے والوں کا ہی ذکر ہے۔ (از کبیر)
اور پہلے معنی کو ہی تفسیر کواشی میں بھی ترجیح دی گئی۔

”وفی الکواشی ما زائدة ای وقلیلا یؤمنون لان مؤمنی المشرکین

اکثر من مؤمنی الیہود“ (شیخ زادہ)

تفسیر کواشی میں ذکر کیا گیا ہے ”ما“ زائد ہے یعنی تھوڑے ہی ایمان لاتے ہیں کیونکہ مشرکین سے زیادہ لوگوں نے ایمان قبول کیا اور یہود سے تھوڑے لوگوں نے ایمان قبول کیا۔

﴿وَلَمَّا جَاءَهُمْ كِتَابٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ
وَكَانُوا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا فَلَمَّا
جَاءَهُمْ مَا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهِ فَلَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الْكَافِرِينَ﴾

(۱) ”اور جب ان کے پاس اللہ کی وہ کتاب (قرآن) آئی جو ان کے ساتھ والی کتاب (توراة) کی تصدیق فرماتی ہے اور اس سے پہلے وہ اس نبی کے وسیلہ سے کافروں پر فتح مانگتے تھے تو جب تشریف لایا ان کے پاس وہ جانا پہچانا اس سے منکر ہو بیٹھے تو اللہ کی لعنت منکروں پر۔“

(۲) ”اور جب آئی ان کے پاس کتاب اللہ کی طرف سے جو تصدیق کرتی ہے اس کی جو ان کے پاس ہے اور وہ تھے اس سے پہلے فتح طلب کرتے ان لوگوں پر جو کافر ہوئے۔ تو جب آئے ان کے پاس وہ جن کو پہچانتے تھے کفر کیا انہوں نے ان سے تو لعنت ہے اللہ کی کافروں پر۔“
یہاں سے ایک اور نعمت اور بنی اسرائیل کا اپنی عادت کے مطابق انکار کرنے کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

بنی اسرائیل نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے آپ کے وسیلہ سے جنگ میں دعا کرتے تو اللہ تعالیٰ ان کو فتح عطا فرماتا یہ ان کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عظیم نعمت تھی۔ لیکن جب آپ تشریف لائے تو بنی اسرائیل نے اپنی کتاب میں آپ کے بیان کئے ہوئے اوصاف سے آپ کو پہچان بھی لیا، لیکن پھر بھی آپ کی نبوت کو تسلیم نہ کیا انکار کیا، جس کی وجہ سے وہ کافر ہوئے اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی لعنت کا مستحق قرار دیا۔

﴿وَلَمَّا جَاءَهُمْ كِتَابٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ﴾: ”اور جب آئی ان کے پاس کتاب اللہ کی طرف سے“ اس آیت کا عطف ہے ﴿وَقَالُوا قُلُوبُنَا غُلْفٌ﴾ پر۔ ”کتاب“ سے مراد قرآن پاک ہے اس کی تکمیل یعنی تنوین تعظیم پر دلالت کر رہی ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ جب آئی ان کے پاس عظیم کتاب یقیناً سب سے عظیم کتاب قرآن پاک ہی ہے۔

”ووصفه بما عنده للتشريف والايدان بانه جدير بان يقبل ما فيه ويتبع لانه من خالقهم والههم الناظر في مصالحهم“

پھر کتاب کا وصف یہ ذکر فرمایا کہ وہ اللہ کی طرف سے ہے، اس سے کتاب اور بزرگی، برتری کا ذکر فرمایا اور اسی سے واضح طور پر یہ پتہ چل گیا کہ یہ کتاب جب عظیم کتاب ہے اور رب تعالیٰ کی طرف سے آئی ہے جو ان کا خالق ہے اور ان کا معبود ہے وہ اپنے بندوں کی مصلحتوں کو نظر میں رکھتا ہے تو انہیں بھی چاہئے کہ وہ کتاب کے احکام پر عمل کریں اور اس کے تمام احکام کی حقانیت کو تسلیم کریں۔

﴿مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ﴾ ”تصدیق کرنے والی ہے اس کی جو ان کے پاس ہے“ یہ کتاب کی دوسری صفت ہے۔ البتہ پہلی صفت ﴿مِّنْ عِندِ اللَّهِ﴾ کو پہلے ذکر فرمایا اس لئے کہ کتاب کا اللہ کی طرف سے ہونا اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ صفت پہلے درجہ کی ہے۔ اور دوسری صفت کا درجہ بھی بعد میں ہے کہ رب تعالیٰ نے اس کتاب کو اپنی طرف سے نازل فرمایا اور پہلی کتب کی تصدیق کرنے والی بنایا۔

(از روح المعانی)

﴿لَمَّا مَعَهُمْ﴾ یعنی التوراة والانجیل یخبرهم بما فیہا ”قرآن پاک تصدیق کرنے والا ہے جو ان کے پاس توراة اور انجیل ہیں ان کی۔ یعنی ان کو خبر دیتا ہے کہ جو تمہارے پاس اللہ کی کتابیں ہیں ان میں کیا ہے۔ اس طرح تمہیں قرآن پاک کے ہونے میں بلاشبہ ایمان لانا چاہئے۔“

(از فرطی)

”مصدق لما معهم فی امر يتعلق بتكليفهم بتصديق محمد ﷺ فی النبوة“

نبی کریم ﷺ کے اوصاف اور آپ کی نبوت اور آپ پر ایمان لانے کا ذکر توراة و انجیل میں تھا قرآن پاک نے بھی اس کی تصدیق فرمائی گویا کہ قرآن پاک دلائل نبوت میں ان کی کتب کے موافق

ہے۔ ہاں البتہ خیال یہ ہے ”انہ لیس بموافق لما معهم فی سائر الشرائع“ کہ قرآن پاک پہلی کتب کے تمام احکام شرائع میں ان کے موافق نہیں، بلکہ پہلی کتب کے کئی احکام کو قرآن پاک نے منسوخ فرمایا۔

”والمراد ان موافقته لكتبهم فيما يختص بالنبوة وما يدل عليها من
العلامات والنعوت والصفات“

قرآن پاک پہلی کتب کے ان چیزوں میں موافق ہے جو نبوت کے ساتھ خاص ہیں اور نبوت پر دلالت کرنے والی علامت اور صفات ہیں۔ (از کبیر)

﴿وَكَانُوا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا﴾ ان الفاظ مبارکہ کے نزول میں چند وجہ بیان کی گئی ہیں۔ راقم کے نزدیک وہ تمام ہی معتبر ہیں، ان میں کوئی تعارض نہیں کسی کے انکار کی ضرورت نہیں۔

”احدها ان اليهود من قبل مبعث محمد عليه السلام ونزول القرآن كانوا يستفتحون اى يسألون الفتح والنصرة وكانوا يقولون ، اللهم افتح علينا وانصرنا بالنبي الامى“

ایک وجہ سے شان نزول یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی بعثت (اعلان نبوت) سے پہلے اور قرآن پاک کے نازل ہونے سے پہلے یہود فتح و نصرت نبی کریم ﷺ کے وسیلہ سے طلب کرتے تھے اور یہ دعا کرتے تھے ”اے اللہ ہمیں امی نبی کے وسیلہ سے فتح و نصرت عطا فرما۔“

(از کبیر)

جب یہود اور مشرکین کے درمیان سخت لڑائی ہوتی تو یہود توراۃ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر رب تعالیٰ کے حضور عرض کرتے:

”اللهم انا نسألك بحق نبيك الذي وعدتنا ان تبعثه فى آخر الزمان
ان تنصرنا اليوم على عدونا فينصرون“

اے اللہ بیشک ہم تجھ سے سوال کرتے ہیں تیرے نبی کے واسطے جس کا تو نے ہم سے وعدہ کیا ہے کہ تو ان کو آخر زمانہ میں مبعوث فرمائے گا کہ تو آج ہماری امداد فرما کہ ہم دشمن پر غالب آجائیں تو اللہ ان کی امداد فرماتا۔ (از روح المعانی)

”یعنی طلب فتح و نصرت میکر دند از جناب الہی بنام این پیغمبر
و میدانستند کہ نام او این قدر برکت دارد کہ بسبب ذکر آن
و توسلی بآن فتح و نصرت حاصل میشود“
یعنی یہود نبی کریم ﷺ کا نام رب تعالیٰ کے حضور پیش کرنے فتح و نصرت طلب کرتے تھے
اور وہ جانتے تھے کہ اس نام میں بڑی برکت ہے کہ اس کے ذکر کی وجہ فتح و نصرت حاصل
ہوتی ہے۔

ابو نعیم، بیہقی اور حاکم نے روایت بیان کی کہ وہ یہ دعا کرتے تھے۔

”اللہم ربنا انا نسألك بحق احمد النبی الامی الذی وعدتنا ان
تخرجہ لنا فی آخر الزمان وبکتابک الذی تنزل علیہ آخر ما ینزل ان
تنصرنا علی اعدائنا“

اے اللہ اے ہمارے بیشک ہم تجھ سے نبی امی حضرت محمد ﷺ کے وسیلہ سے سوال
کرتے ہیں جن کو تو نے آخر زمانہ میں مبعوث کرنا ہے اور تیری اس کتاب کے وسیلہ
سے تجھ سے دعا کرتے ہیں جس کتاب کو تو نے آخری نبی پر نازل کرنا ہے کہ تو ہمارے
دشمنوں کے مقابل ہماری امداد فرما۔
(از عزیز)

”یستفتحون ای یستنصرون ، والاستفتاح الاستنصار“ وہ لوگ امداد طلب کرتے
تھے استفتاح کا معنی استنصار (یعنی امداد طلب کرنا) آتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی
ہے کہ یہود کو جب کبھی شکست ہوئی تو انہوں نے رب تعالیٰ کے حضور یہ دعا فرمائی:

”انا نسئلك بحق النبی الامی الذی وعدتنا ان تخرجہ لنا فی آخر
الزمان الا تنصرنا علیہم“

بیشک ہم تجھ سے سوال کرتے ہیں نبی امی کے واسطہ سے جن کو آخر زمانہ میں مبعوث
کرنے کا تو نے ہمارے ساتھ وعدہ کیا ہے کہ تو ہماری امداد فرما۔ (از قرطبی)

علامہ بیضاوی اور مظہری وغیرہا نے بھی یہی معنی درج کیا ہے لیکن افسوس کہ آج کل کے
مفسرین جو رسول اللہ ﷺ کی محبت سے دور ہیں انہوں نے اپنی اردو تفاسیر میں اس معنی کو نقل نہیں کیا۔
اصل ان کو اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی کا پتہ تو نہیں ہے نبی کریم ﷺ کے وسیلہ سے دعا کرنا ان کو پسند
نہیں لیکن نبی کریم ﷺ کی شان چھپانے سے چھپ نہیں سکتی۔

وسیلہ کے متعلق ارشادات مصطفوی:

”کان النبی ﷺ یستفتح بصعالبک المهاجرین ای یستنصر بدعائهم

وصلوتهم“

نبی کریم ﷺ غریب مهاجرین سے امداد طلب کرتے تھے یعنی ان کی دعاؤں اور ان کو نمازوں کے وسیلہ سے رب تعالیٰ کے حضور دعا فرماتے وہ فتح سے نواز دیتا۔

☆ ”روی النسائی عن ابی سعید الخدری ان النبی ﷺ قال انما نصر الله هذه الامة بضعفائها بدعوتهم وصلاتهم واخلاصهم“

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اس امت پر اس کے ضعیف لوگوں کی دعاؤں اور نمازوں اور خلوص سے امداد فرماتا ہے۔

☆ ”وروی النسائی ایضا عن ابی الدرداء قال سمعت رسول الله ﷺ یقول ابغونی الضعیف فانکم انما ترزقون وتنصرون بضعفائکم“

حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا مجھے غریب لوگوں میں تلاش کرو، بیشک تمہیں رزق دیا جاتا ہے اور تمہاری امداد کی جاتی ہے تمہارے غریب لوگوں کے وسیلہ سے ہی۔

☆ عن ابی سعید الخدری عن النبی ﷺ قال یأتی علی الناس زمان یغزو فنام من الناس فیقال لهم فیکم من رای رسول الله ﷺ فیقولون نعم فیفتح لهم ثم یغزو فنام من الناس فیقال لهم هل فیکم من رای من صحب رسول الله ﷺ فیقولون نعم فیفتح لهم ثم یغزو فنام من الناس فیقال لهم فیکم من رای من صحب من صحب رسول الله ﷺ فیقولون نعم فیفتح لهم“

(مسلم ج ۲ ص ۳۱۶ باب فضل الصحابة ثم الذین یلونهم ثم الذین یلونهم)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا کہ (مسلمانوں کا) لشکر جہاد کرے گا تو ان سے پوچھا جائے گا کیا تم میں کوئی صحابی بھی ہے؟ وہ کہیں گے ہاں ہم میں صحابی ہیں تو صحابی کی برکت سے ان کو فتح حاصل ہو جائے گی۔ پھر ایک لشکر جہاد کرے گا تو

ان سے پوچھا جائے گا کیا تم میں کوئی ایسا شخص بھی ہے جس نے رسول اللہ ﷺ کے صحابی کو (حالت ایمان میں) دیکھا ہو؟ وہ کہیں گے ہاں ہم میں ایسا شخص ہے تو ان کو اس تابعی کی برکت سے فتح حاصل ہوگی۔ پھر ایک لشکر جہاد کرے گا ان سے پوچھا جائے گا کیا تم میں سے ایسا شخص ہے جس نے رسول اللہ ﷺ کے صحابی کے صاحب (تابعی) کو دیکھا ہو؟ تو وہ کہیں گے ہاں ہم میں ایسا شخص (تابعی) موجود ہے تو ان کو اس تبع تابعی کے وسیلہ سے فتح حاصل ہوگی۔

دوسری وجہ شان نزول کی:

”نزلت فی بنی قریظۃ والنضیر کانوا یستفتحون علی الاوس

والخزرج برسول اللہ ﷺ قبل المبعث“

یہ آیت بنی قریظہ اور بنی نضیر کے متعلق نازل ہوئی کہ وہ اوس اور خزرج پر رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے آپ کے وسیلہ سے فتح طلب کرتے تھے۔

تیسری وجہ:

”کانوا یقولون لمخالفیہم عند القتال ہذا نبی قد اظل زمانہ ینصرنا

علیکم“

بنی اسرائیل اپنے مخالفین کو لڑائی کے وقت بتاتے تھے کہ اب آخر الزمان نبی کا زمانہ قریب آچکا ہے وہ جب تشریف لے آئیں گے تو تمہارے خلاف ہماری امداد کریں گے۔

چوتھی وجہ:

”کانوا یسألون العرب عن مولدہ ویصفونہ بانہ نبی من صفۃ کذا

وکذا ویفصحون عنہ علی الذین کفروا ای علی مشرکی العرب“

بنی اسرائیل مشرکین عرب سے نبی کریم ﷺ کی ولادت کے متعلق سوال کرتے رہتے تھے کہ وہ

آخر الزمان نبی ان صفات والے ہیں کیا وہ پیدا ہو چکے ہیں؟ (از کبیر بتغیر الترتیب)

تنبیہ: ان میں پہلی دو وجہ میں امداد طلب کرنا، فتح طلب کرنے کا معنی پایا گیا ہے جو زیادہ واضح معنی

وہی ہے اور چوتھی وجہ میں ”یستفتحون“ کا معنی پوچھنا، وضاحت طلب کرنا ہے۔

لیکن دوسری وجہ میں معنی بیان کرنا لیا گیا ہے کہ وہ اپنے مخالفین سے بیان کرتے تھے کہ جب نبی کریم ﷺ تشریف لائیں گے تو وہ تمہارے خلاف ہماری امداد فرمائیں گے۔

﴿يَسْتَفْتِحُونَ﴾ کا یہ معنی کیسے لیا گیا ہے؟ جس میں طلب والا معنی نہیں۔ اس کے متعلق مظہری، روح المعانی، بیضاوی وغیرہ میں بیان کیا گیا ہے جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ کیا مطلب ہے عبارت بیضاوی کی ملاحظہ ہو۔

”او يفتحون عليهم ويعرفونهم ان نبيا يبعث فيهم وقد قرب زمانه

والسين للمبالغة“

﴿يَسْتَفْتِحُونَ﴾ کا معنی یا تو یہ ہے کہ وہ ان پر واضح طور پر کھول کر بیان کرتے اور ان کی پہچان کراتے کہ بیشک آخر الزمان نبی مبعوث ہونے ہی والے ہیں ان کا زمانہ قریب آچکا ہے۔

بظاہر وہم تھا کہ باب استفعال میں ”سین“ طلب کے لئے آتا ہے۔ تو یہاں ”سین“ کا کوئی معنی نہیں تو اس کا جواب دیا گیا کہ اس معنی کے لحاظ سے ”سین“ مبالغہ کے لئے ہے۔ یعنی معنی یہ ہوا کہ وہ بہت واضح طور پر بیان کرتے ہیں اور بہت واضح پہچان کراتے ہیں۔

تمام معانی یک جا جمع کریں: اگر غور و فکر کیا جائے۔ اور تمام معانی کو جمع کر لیا جائے تو قرآن پاک کی عظمت سمجھ میں آئے گی کہ کیسی عظمت والی یہ کتاب ہے جس کے ایک ایک لفظ میں معانی و مطالب کے دریا موجزن ہیں۔ نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے بنی اسرائیل کفار کے مقابل جنگ میں آپ کے وسیلہ سے فتح طلب کرتے تو ان کو فتح دی جاتی اور یہود کے خاص قبائل بنو قریظہ اور بنو نضیر جب اوس اور خزرج کے مقابلہ میں آپ کے وسیلہ سے فتح طلب کرتے تو ان کو فتح دی جاتی۔ آپ کی تشریف آوری سے پہلے وہ آپ کے منتظر رہتے تھے مکہ کے مشرکین سے طلب کرتے رہتے تھے کیا ان صفات کا کوئی بچہ تو پیدا نہیں ہوا۔ اور وہ کفار کو بتاتے رہتے تھے کہ آخر الزمان نبی تشریف لانے والے ہی ہیں جب وہ تشریف لائیں گے تو وہ بھی ہماری امداد فرمائیں گے۔ جب وہ نبی تشریف لائے تو انہوں نے پہچاننے کے باوجود ان کا اقرار کر دیا۔

راقم کی اس وضاحت کے بعد اگر آپ انصاف کی نظر سے دیکھیں گے تو واضح ہو جائے گا کہ نبی کریم ﷺ کے وسیلہ سے فتح طلب کرنے کو نہ ذکر کرنا اور چھپانا بھی بے انصافی ہے۔ اور

”یستفتحون“ کو فتحوں (بیان کرنا) کے معنی میں لینے کو رد کرنا بھی زیادتی ہے۔

﴿ فَلَمَّا جَاءَهُمْ مَا عَرَفُوا ﴾ : ”ما“ موصولہ ہے جاء کا فاعل ہے اور عائد محذوف ہے:

”ای ما عرفوه یعنی محمدا ﷺ عرفوه بنعته فی التوراة“

یعنی انہوں نے اس ذات یعنی محمد ﷺ کو پہچان لیا کیونکہ ان کی صفات توراۃ میں موجود تھیں جو ان لوگوں نے پڑھی ہوئی تھیں اور جانتے تھے۔ (مظہری)

﴿ كَفَرُوا بِهِ ﴾ : ”انہوں نے کفر کیا آپ سے“ یعنی ان کے کفر کی وجہ ان کا حسد اور اپنے مال کی آمد اور ریاست کے زوال کا خطرہ ان کے کفر کا سبب تھا۔ پہچاننے کی باوجود انہوں نے انکار کر دیا۔

﴿ فَلَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الْكَافِرِينَ ﴾ ”تو اللہ کی لعنت ہے کافروں پر“ یعنی ان کا نبی کریم ﷺ کا انکار کرنا ایمان نہ لانا صریح کفر تھا اور کافر لعنت کے مستحق ہوتے ہیں۔

تنبیہ : ”فالمراد الابعاد من خیرات الآخرة لان البعد من خیرات الدنيا لا يكون ملعونا“

کافروں پر لعنت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو آخرت کی مہربانیوں اور بھلائیوں سے در کر دیا اس لئے کہ دنیا کی بھلائی سے دور رہنے والے کو ملعون نہیں کہتے۔ (ازکیر)

بلکہ فقیر و غریب اللہ تعالیٰ کی کامل رحمت کے مستحق ہوتے ہیں اور ان کی برکت سے دوسروں کو بھی رزق ملتا ہے۔

اعتراض : رب تعالیٰ نے جب یہ فرمایا ﴿ وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا ﴾ اور کہو لوگوں سے اچھی بات اور یہاں فرمایا ﴿ فَلَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الْكَافِرِينَ ﴾ اللہ کی لعنت ہو کافروں پر۔ ان دونوں میں تطبیق کیسے ممکن ہے کہ اچھی بات بھی کرو اور ان پر لعنت بھی بھیجو لعنت کیسے اچھی بات ہے؟

جواب : ”ان لعن من يستحق اللعن من القول الحسن“ بیشک وہ شخص جو لعنت کا مستحق ہے اس پر لعنت بھیجنا اس کے حق میں اچھی بات ہی ہے۔ (ازکیر)

اعتراض : آیہ کریمہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہود نبی کریم ﷺ کی نبوت کو پہچانتے تھے کیونکہ توراۃ میں اس کا ذکر تھا۔ اب اس میں دیکھنا یہ ہے کہ توراۃ میں نبی کریم ﷺ کی نبوت کا تفصیلی ذکر تھا۔ یا اجمالی۔

اگر تفصیلی ذکر تھا کہ فلاں شخص فلاں صورت سے متصف ہوں گے ان کی سیرت یہ ہوگی فلاں سال میں تشریف لائیں گے فلاں جگہ پر تشریف لائیں گے تو انکار کی گنجائش باقی نہیں رہتی کیونکہ توراۃ تو اتر سے منقول ہو رہی تھی۔ تو کس طرح ان تمام نے انکار کیا۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ توراۃ میں نبی کریم ﷺ کا اجمالی طور پر ذکر تھا تو یہ کہنا کیسے صحیح ہے کہ انہوں نے آپ کو پہچان لیا۔

جواب: توراۃ میں نبی کریم ﷺ کے اوصاف اجمالی طور پر ذکر تھے اس طرح ان میں تفصیل نہیں تھی کہ آپ کی تعیین ہو جاتی۔ البتہ نبی کریم ﷺ کے معجزات کے ذریعے ان صفات کو تاکید حاصل ہو گئی۔ اب ان کا انکار کرنا گویا کہ کامل پہچاننے کے بعد انکار تھا۔

ضیاء النبی سے اقتباسات: مفسر قرآن مفکر اسلام حضرت پیر محمد کرم شاہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ علامہ ابن جوزی رقم طراز ہیں:

”وقال لهم معاذ بن جبل ولبشر بن البراء اتقوا الله واسلموا قد كنتم

تستفتحون علينا بمحمد ﷺ وانا اهل شرك تخبرونا انه مبعوث

وتصفونه لنا بصفته فقال سلام بن مشكم ما هو بالذي كنا نذكر لكم

ما جاءنا بشئ نعرفه“ (الوفاء ج اول ص ۴۴)

معاذ بن جبل اور بشر بن براء رضی اللہ عنہما نے فرمایا اے گروہ یہود اللہ سے ڈرو اور اسلام

قبول کرو۔ تمہیں وہ بات بھول گئی جب ہم مشرک تھے تو تم حضور ﷺ کے وسیلہ سے ہم پر

فتح حاصل کرتے تھے اور ہمیں بتاتے تھے کہ وہ مبعوث ہونے والے ہیں اور ان کی

صفات کے بارے میں بھی ہمیں بتایا کرتے تھے سلام بن مشکم نے کہا نہیں یہ وہ نہیں ہیں

جن کا ہم ذکر کرتے تھے یہ کوئی ایسی چیز لے کر نہیں آئے جسے ہم جانتے ہوں۔

حقیقت کے اس کھلے انکار کو بجز حسد اور بغض باطنی کے اور کیا کہا جاسکتا ہے۔ (ضیاء النبی ج اول ص ۴۹۵)

حضور ﷺ کا ذکر خیر توراۃ و انجیل میں:

عطاء بن یسار سے مروی ہے آپ کہتے ہیں میری ملاقات حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص

ؓ سے ہوئی میں نے کہا حضور کی جن صفات کا ذکر خیر توراۃ میں آیا ہے ان سے مجھے آگاہ فرمائیے۔

آپ نے کہا بیشک توراۃ میں حضور کی وہی صفات بیان کی گئی ہیں جو قرآن میں بیان ہیں۔ پھر آپ نے

توراة کی مندرجہ ذیل آیت تلاوت کی۔

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا﴾ وحرزا للاميين انت عبدی ورسولی سمیتک المتوکل لست بفظ ولا غلیظ ولا صخاب فی الاسواق ولا تجزی بالسیئة السیئة ولكن تعفو وتغفر ولن یقبضه الله حتی یقیم به الملة العوجاء بان یقولوا لا اله الا الله فیفتح به اعیان عمیا و آذنا صما وقلوبا غلفا (انفرد باخراجہ البخاری)

توراة کی آیت کا ترجمہ: اے نبی، ہم نے بھیجا ہے آپ کو گواہ بنا کر، خوشخبری دینے والا، بروقت ڈرانے والا امیوں کے لئے جائے پناہ، تو میرا بندہ ہے اور میرا رسول ہے میں نے تیرا نام المتوکل رکھا ہے نہ تو درشت خو ہے نہ سخت دل اور نہ بازاروں میں شور مچانے والا ہے تو برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتا بلکہ معاف کر دیتا ہے اور بخش دیتا ہے اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی طرف نہیں بلائے گا یہاں تک ایک ٹیڑھی ملت کو آپ کو ذریعے درست کر دے اور وہ سب کہنے لگیں ”لا اله الا الله“ اللہ تعالیٰ آپ کے ذریعے سے اندھی آنکھوں کو بینا بہرے کانوں کو شنوا (سننے والا) غلافوں میں لپٹے ہوئے دلوں کو نور ہدایت سے منور کر دے۔

(الوفالابن الجوزی جلد اول ص ۳۷، ضیاء النبی جلد اول ص ۳۹۶)

نبی کریم ﷺ کو پہچاننے کے باوجود انکار کے ایک مثال:

علامہ ابن قیم لکھتے ہیں حضرت صفیہ (جن کو بعد میں ام المؤمنین بننے کا شرف حاصل ہوا) یہ جی بن اخطب رئیس یہود کی بیٹی تھیں ان کے چچا کا نام ابویاسر بن اخطب تھا، آپ کہتی ہیں کہ میرے والد اور میرے چچا تمام بچوں سے زیادہ میرے ساتھ محبت کرتے تھے جب بھی میں ان سے ملاقات کرتی تو مجھے اٹھا کر سینے سے لگا لیتے۔ جب اللہ کے پیارے رسول قبا میں تشریف لائے اور بنی عمرو بن عوف کے محلہ میں قیام فرمایا تو میرا والد اور میرا چچا صبح اندھیرے منہ حضور کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے گئے اور سورج غروب ہونے کے بعد واپس لوٹے جب وہ واپس آئے میں نے محسوس کیا وہ تھکے ہوئے ہیں۔ افسردہ خاطر (پریشان دل) ہیں اور بڑی مشکل سے ہولے ہولے چل رہے ہیں میں نے حسب معمول ان کو محبت بھرے کلمات سے مرحبا کہا لیکن ان دونوں میں سے کسی نے میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا میں نے اپنے چچا ابویاسر کو اپنے باپ سے یہ کہتے ہوئے سنا کیا یہ وہی ہیں؟

اس نے کہا بیشک خدا کی قسم، پھر چچا نے پوچھا کیا تم نے ان کو توراة میں بیان کردہ نشانیوں اور

صفات سے پہچان لیا ہے؟ اس نے جواب دیا بیشک خدا کی قسم پھر چچا نے پوچھا بتاؤ اب کیا خیال ہے؟
میرے باپ نے جواب دیا:

”عداوتہ واللہ ما بقیت“ خدا کی قسم جب تک زندہ رہوں گا ان سے عداوت کرتا رہوں گا۔

(ہدایۃ الحباری ابن قیم ص ۳۰ ضیاء النبی جلد اول ص ۳۹ سیرت ابن ہشام ج ۲)

﴿بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهِ أَنْفُسَهُمْ أَنْ يَكْفُرُوا بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ
بَغْيًا أَنْ يَنْزِلَ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ عَلَى مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ
فَبَاءُ وَابْغَضِبْ عَلَى غَضِبٍ وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ مُهِينٌ﴾

(۱) ”کس برے مولوں انہوں نے اپنی جانوں کو خریدا کہ اللہ کے اتارے سے منکر ہوں اس
کی جلن سے کہ اللہ اپنے فضل سے اپنے جس بندے پر چاہے وحی اتارے تو غضب پر
غضب کے سزاوار ہوئے اور کافروں کے لئے ذلت کا عذاب ہے۔“

(۲) ”کتنی ہی بری چیز ہے کہ بیچا انہوں نے اس کے بدلے اپنی جانوں کو کہ وہ ان کا کفر کرنا ہے
اس چیز کے ساتھ جو نازل فرمائی اللہ نے اس حسد سے کہ نازل کرتا ہے اللہ اپنے فضل سے
جس پر چاہے اپنے بندوں سے تو وہ مستحق ہوئے غضب کے ساتھ غضب پر۔ اور
کافروں کے لئے عذاب ہے ذلت کا۔“

نبی کریم ﷺ پر اللہ تعالیٰ کے فضل سے وحی کا نازل ہونا حقیقت میں تمام انسانوں کے لئے نعمت
تھی کہ وہ آپ پر ایمان لا کر ”خیر الامۃ“ (بہتر امت) بن جائیں۔ یہود کے لئے خصوصاً نعمت
تھی کہ وہ تو آپ کی انتظار کر رہے تھے لیکن وہ حسد اور سرکشی کی وجہ سے اس کو برداشت نہ کر سکے، انہوں
نے کفر اختیار کیا اپنی جانوں پر عذاب کی پرواہ نہ کی تو گویا کہ انہوں نے کفر کو حاصل کیا اور اس کے بدلہ
میں اپنی جانوں کو عذاب کے حوالے کر دیا۔

اس طرح انہوں نے پہلے بھی عیسیٰ علیہ السلام سے کفر کیا اب پھر نبی کریم ﷺ سے کفر کیا تو وہ غضب

پر غضب کے مستحق ہوئے۔ اور انہوں نے اپنے آپ کو کفر کی وجہ غضب کا مستحق ٹھہرایا اور پھر نبی کریم ﷺ کے ساتھ حسد کر کے اپنے آپ کو اور زیادہ غضب کا مستحق بنا لیا۔ اس طرح وہ غضب پر غضب کے مستحق ہوئے جس کی وجہ سے وہ ذلت و خواری کے عذاب میں مبتلا ہونے کے لائق ہو گئے۔

﴿بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهِ أَنْفُسَهُمْ﴾: ”کتنی ہی بری چیز ہے کہ بیچا انہوں نے اس کے بدلے اپنی جانوں کو“ ”بئس“ فعل ذم ہے اس میں ضمیر مستتر اس کا فاعل ہے مانکرہ ہے شئی کے معنی میں ہے جو تمیز ہے اور ﴿اشْتَرَوْا﴾ اس کی صفت ہے۔ ﴿اشْتَرَوْا﴾ کے دونوں معنی آتے ہیں بیچنا اور خریدنا زیادہ مفسرین کرام نے بیچنے والا معنی پسند کیا ہے تاہم علامہ رازی رحمہ اللہ نے خریدنے والا معنی رائج قرار دیا۔

﴿أَنْ يَكْفُرُوا بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ﴾: ”وہ ان کا کفر کرنا ہے اس چیز کے ساتھ جو نازل فرمائی اللہ نے“ یہ جملہ مخصوص بالذم ہے جو مبتداء محذوف کی خبر ہے وہ ہے ”ہو“

اب توجہ فرمائیں کہ یہاں تک جو ذکر کئے گئے الفاظ مبارکہ کا مطلب کیا ہے کچھ وضاحت کی جاتی ہے۔ جب ﴿اشْتَرَوْا﴾ کو ”بیع“ (بیچنے) کے معنی میں لیا جائے تو اس کا مطلب سمجھنے کے لئے پہلے یہ سمجھا جائے کہ مکلف کو ایمان لانے کا حکم دیا گیا تا کہ ایمان اسے جنت میں پہنچانے کا ذریعہ بن جائے۔ تو یقیناً کفر اسے آگ تک پہنچائے گا۔

جب انسان کسی ایک کو اختیار کرے گا تو اس کی حیثیت یہ ہوگی ”اختیار تملک سلعة علی سلعة“ سامان کے بدلے سامان کی ملکیت کو اختیار کرنے کی جو حیثیت ہے۔ جب کوئی شخص ایمان حاصل کر کے نجات اور کامیابی حاصل کر لے تو اس وقت کہا جاتا ”نعم ما اشتری“ (اچھی چیز اس نے خریدی) یعنی اچھی چیز کو حاصل کیا۔ اور اگر کوئی شخص کفر کو اختیار کر کے اپنی عاقبت برباد کر دے اور عذاب کا مستحق ہو جائے تو کہا جاتا ہے ﴿بِئْسَمَا اشْتَرَى﴾ اس نے بری چیز خریدی۔

اب واضح ہوا کہ ﴿اشْتَرَوْا﴾ کا معنی جب بیچنے والا لیا جائے تو ﴿بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهِ أَنْفُسَهُمْ﴾ کا معنی یہ ہوگا ”باعوا نفسہم بکفرہم“ بری ہے وہ چیز کہ انہوں نے اپنی جانوں کو کفر

کے بدلے بیچ دیا۔ ان کے اس سودے کو بری چیز کہا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے:

”لَا الَّذِي حَصَلُوهُ عَلَى مَنَافِعِ أَنْفُسِهِمْ لَمَّا كَانَ الْكَفْرَ صَارُوا بِأَنْفُسِهِمْ بِذَلِكَ“

انفسهم بذلك“

کہ انہوں نے اپنے نفسوں کے منافع کے خلاف کفر کو اختیار کیا تو گویا کہ وہ اپنے نفسوں کو کفر کے بدلے بیچنے والے ہوئے۔ یہ سودا ان کا یقیناً نقصان والا سودا تھا کہ منافع کے بدلے عذاب حاصل کیا تو یہ کتنی ہی بری چیز ہے۔

(ارکبیر)

اس معنی کو رائج سمجھتے ہوئے علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا:

”أَيُّ بَاعُوا فَلَا نَفْسَ بِمَنْزِلَةِ الْمُثْمَنِ وَالْكَفْرِ بِمَنْزِلَةِ الثَّمَنِ لَا أَنْفُسَهُمْ

الْخَبِيثَةَ لَا تَشْتَرِي بِلِ تَبَاع“

﴿اَشْتَرَوْ﴾ کا معنی یہ ہے انہوں نے بیچا ان کی جانیں بیچ (جس چیز کو بیچا جائے) کے درجہ میں ہیں۔ اور کفر ثمن (یعنی بطور قیمت طے شدہ مال) کے درجہ میں ہے۔ انہوں نے اپنی جانوں کو کفر کے بدلے بیچ دیا۔ یہ معنی کرنا بہتر کیوں ہے اس لئے کہ خبیث نفس کو خریدا تو نہیں جاسکتا البتہ ان کو بیچا جاسکتا ہے۔

(روح المعانی)

لیکن علامہ رازی رحمہ اللہ خریدنے والے معنی کو رائج سمجھ کر بیان کرتے ہیں کہ اشتراء کا معنی اس مقام پر ”خریدنا“ ”ہو الاصح عندی“ وہ میرے نزدیک زیادہ صحیح ہے اس لئے کہ مکلف جب اللہ تعالیٰ کے عذاب کا اپنے نفس پر خوف رکھتا ہے تو وہ ایسے کام کرتا ہے جو اس کے گمان کے مطابق اسے عذاب سے بچانے کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ اس صورت میں یہ کہا جائے گا ”فكانه اشترى نفسه بثلک الاعمال“ گویا کہ اس نے اپنی جان کو ان اعمال کے ذریعے خریدا لیا۔

”فهللآء الیہود لما اعتقدوا فیما اتوا به انها تخلصهم من العقاب وتوصلهم

الی الثواب فقد ظنوا انهم قد اشتروا انفسهم بها فذمهم اللہ تعالیٰ“

ان یہود کا بھی جب یہ اعتقاد تھا کہ ہم جو کام کر رہے ہیں اس کے ذریعے اپنے آپ کو عذاب سے چھڑا رہے ہیں اور ثواب حاصل کر رہے ہیں۔ تو انہوں نے اپنے گمان کے مطابق اپنے نفسوں کو اپنے اعمال کے بدلے خریدا چونکہ ان کا گمان باطل تھا۔ جس کام کو وہ ثواب کا ذریعہ اور عذاب سے بچنے

کا ذریعہ سمجھ رہے تھے وہ حقیقت میں ان کے لئے عذاب کا ذریعہ تھا۔ اسی لئے رب تعالیٰ نے ان کی مذمت بیان فرمائی۔
(از کبیر)

﴿ اَنْ يَّكْفُرُوا بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ ﴾ سے ماقبل کی وضاحت فرمادی کہ وہ بری چیز کیا ہے وہ اللہ تعالیٰ نے جو نازل فرمایا اس سے کفر کرنا ہے۔

”ولا شبهة ان المراد بذلك كفرهم بالقرآن لان الخطاب في اليهود وکانوا مؤمنين بغيره“

یہود چونکہ اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن اور فرشتوں وغیرہ پر ایمان رکھتے تھے صرف وہ قرآن پاک پر ایمان نہیں رکھتے تھے، اسی لئے یہاں ﴿ اَنْ يَّكْفُرُوا بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ ﴾ ذکر کیا کہ ان کا کفر اس چیز سے تھا جس کو رب تعالیٰ نے اتارا۔ مراد اس سے قرآن پاک ہی ہے۔ (از کبیر)

﴿ بَغِيًّا اَنْ يُنَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهِ عَلٰى مَنْ يَّشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ﴾ :
”اس حسد سے کہ نازل کرتا ہے اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے جس پر چاہے اپنے بندوں میں سے۔“

یہاں سے ان کے کفر کی وجہ بیان کی جا رہی ہے کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والے کلام (قرآن) سے کفر کیوں کرتے تھے؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس پر حسد کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے فضل کر کے اس پر وحی نازل کر دیتا ہے۔

”انهم ظنوا ان هذا الفضل العظيم بالنبوة المنتظرة يحصل في قومهم فلما وجدوه في العرب حملهم ذلك على البغي والحسد“

اصل وجہ ان کے حسد کی یہ تھی کہ وہ اس کے منتظر تھے کہ آخر الزمان نبی ہماری قوم میں آئیں گے۔ جن کی وجہ سے ہمیں رب تعالیٰ کا عظیم فضل حاصل ہوگا۔ لیکن جب نبی کریم ﷺ عرب میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں تشریف لے آئے تو وہ آپ سے حسد کرنے لگے اور حد سے تجاوز کرنے لگے۔

(از کبیر)

﴿ الْبَغْيُ ﴾ کا معنی ظلم اور فساد ہے عرب کہتے ہیں ”بغی الجرح“ زخم فاسد ہو گیا (یعنی زیادہ خراب ہو گیا) ”وقيل اصله الطلب“، ”البغی“ کا حقیقی معنی ”طلب کرنا“ ہے پھر طلب کی

مختلف قسمیں ہیں۔ اگر کسی کی نعمت کے زوال کی طلب پائی جائے تو ”بغی“ کا معنی ”حسد کرنا“ اور اگر کسی پر تجاوز کرنا مطلوب ہو تو ”بغی“ کا معنی ”ظلم کرنا“ اور اگر بدکاری کی طلب ہو تو ”بغی“ کا معنی ”فجور“ ہوگا۔

”والمراء به هنا بمعونة المقام طلب ما ليس لهم فيؤل الى الحسد“

یہاں آیت کریمہ میں ”بغی“ کا مطلب یہ ہے طلب کرنا اس چیز کا جس کے وہ حقدار نہیں تھے وہ ساتھ ساتھ یہ بھی تمنا کر رہے تھے کہ نبی کریم ﷺ پر اللہ تعالیٰ کا جو فیضان ہے وہ زائل ہو جائے۔ اس لئے بغی کا معنی یہاں ”حسد“ لیا گیا ہے۔

﴿وَقِيلَ﴾ ، الظلم ”یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ”بغی“ کا یہاں معنی ”ظلم“ ہے۔ (از روح المعانی)

لیکن راقم کے نزدیک دونوں معانی بیک وقت پائے جاتے ہیں کیونکہ حسد مستلزم ہے ظلم کو۔ **تنبیہ:** اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ”بغیا“ کا ترجمہ ”جلن“ کیا ہے۔ جب کہ مفسرین کرام نے ”حسد“ معنی بیان کیا ہے درحقیقت ”حسد“ بھی مجازی معنی ہے اور جلن بھی مجازی معنی ہے راقم کے خیال میں اعلیٰ حضرت نے اس حدیث کو مد نظر رکھتے ہوئے ترجمہ کیا ہے۔

☆ ”عن ابی ہریرۃ عن النبی ﷺ قال اباکم الحسد فان الحسد یا کل الحسنات کما تاکل النار الحطب“ (رواہ ابو داؤد ، مشکوٰۃ باب ما ینہی عنہ من التہاجر)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے تم اپنے آپ کو حسد سے بچا کر رکھو بیشک حسد نیکیوں کو ایسے کھا جاتا ہے جیسے آگ لکڑیوں کو کھا جاتی ہے۔

اس حدیث شریف میں حسد کو آگ سے تشبیہ دی گئی یعنی کسی کی نعمت کو دیکھ کر دل میں اس طرح جلن پیدا ہوتی ہے جس طرح آگ سے جلن پیدا ہوتی ہے جب وہ دوسرے کی نعمتوں کا زوال طلب کرتا ہے تو وہی جلن اس کی نیکیوں کو جلا کر خاکستر بنا دیتی ہے۔

”واعلم ان هذه الآية تدل على ان الحسد حرام“

”بیشک یہ آیت اس پر دلالت کر رہی ہے کہ حسد حرام ہے۔“ (کبیر)

﴿فَبَاءُوا بِغَضَبٍ عَلَىٰ غَضَبٍ﴾ : ”تو وہ مستحق ہوئے غضب کے ساتھ غضب پر“

”باء وا“ کا حقیقی معنی ہے ”رجعوا“ وہ لوٹے۔ یہی معنی خازن نے بیان کیا ہے۔ لیکن ابن کثیر نے بیان کیا: ”و معنی باء واستوجبوا واستحقوا واستقروا بغضب علی غضب“

”باء وا“ کا معنی یہ ہے وہ لائق ہوئے، وہ مستحق ہوئے، انہوں نے حاصل کیا۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی کے مطابق ہے ”وہ سزاوار ہوئے“ راقم نے بھی اسی کے مطابق تحریر کیا ”وہ مستحق ہوئے“۔ بغضب علی غضب کے معانی میں وسعت: پہلے ”غضب“ اور دوسرے ”غضب“ کے مختلف مطالب ہیں ان میں کئی وجوہ ہیں یعنی ایک جملہ کے کئی مطالب ہیں۔

”وقال ابو العالیة غضب الله عليهم بكفرهم بالانجيل وعيسى ثم غضب الله عليهم بكفرهم بمحمد ﷺ وبالقرآن“

- (۱) یعنی انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام سے کفر کیا تو وہ غضب کے مستحق ہوئے پھر انہوں نے نبی کریم ﷺ سے کفر کیا تو پھر غضب کے مستحق ہوئے۔
- (۲) پہلے انجیل سے کفر کرنے کی وجہ سے غضب کے مستحق ہوئے۔ پھر قرآن پاک سے کفر کی وجہ سے غضب کے مستحق ہوئے۔

(۳) ”قال السدی اما الغضب الاول فهو حين غضب عليهم في العجل واما الغضب الثاني فغضب عليهم حين كفروا بمحمد ﷺ“

جب انہوں نے پچھڑے کی پوجا کی تو اس وقت وہ غضب کے مستحق ہوئے۔ اور پھر جب انہوں نے نبی کریم ﷺ سے کفر کیا تو غضب کے مستحق ہوئے۔ (ابن کثیر)

زیادہ بہتر یہ ہے:

”ليس المراد اثبات غضبين فقط بل المراد اثبات انواع من الغضب مترادفه لاجل امور مترادفه صدرت عنهم نحو قولهم (عزيز ابن الله، يد الله مغلوله، ان الله فقير ونحن اغنياء) وغير ذلك من انواع كفرهم“

یعنی غضب پر غضب سے مراد صرف دو غضب نہیں۔ بلکہ ان کے کفریات بہت تھے، ہر کفر کی وجہ سے وہ غضب کے مستحق ہوئے، لہذا کئی قسم کے کفریات کے وجہ سے کئی قسم کے غضب کے مستحق ٹھہرے۔ ان کے ان گنت کفریات سے تین مثالیں علامہ رازی رحمہ اللہ نے پیش فرمائی ہیں۔

انہوں نے کہا ”عزیر ابن اللہ“ حضرت عزیر علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں۔ رب کی اولاد ماننا کفر ہے۔ اور انہوں نے کہا ”ید اللہ مغلولة“ اللہ کے ہاتھ تنگ ہیں۔ معاذ اللہ رب تعالیٰ کو تنگ دست کہہ کر وہ کفر کے مرتکب ہوئے۔ اور انہوں نے کہا ﴿إِنَّ اللَّهَ فَقِيرٌ وَنَحْنُ أَغْنَاءُ﴾ ”بیشک اللہ تعالیٰ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں۔ اس طرح کے ان کے کثیر کفریات پائے جاتے ہیں یقیناً کثیر غضبوں کے بھی مستحق ہیں۔

(از کبیر)

ایک معنی یہ بھی ہے:

”ان المراد به تأكيد الغضب وتكثيره لاجل ان هذا الكفر وان كان واحدا الا انه عظيم“

بیشک دوسرا غضب پہلے غضب کی تاکید ہے، کثرت اس لحاظ سے ہے کہ اگرچہ ان کا کفر قرآن پاک سے ایک کفر ہے، مگر عظیم کفر ہے، اس لئے وہ بہت بڑے غضب کے مستحق ہوئے۔

(از کبیر)

﴿وَاللَّكَافِرِينَ عَذَابٌ مُّهِينٌ﴾: ”اور کافروں کے لئے عذاب ہے ذلت کا“ جب ان کے کفر کا سبب حسد اور ظلم تھا جس کی اصل وجہ ان کا تکبر تھا۔ تکبر ذلت کا ذریعہ ہے جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ﴾

بیشک وہ لوگ جو میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں وہ جہنم میں داخل ہوں گے ذلیل ہو کر۔

خیال رہے کہ حدیث شریف میں ”عبادتی“ دعا کے معنی میں بھی استعمال ہے۔ اس آیت کریمہ سے واضح ہوا کہ تکبر باعث عذاب اور باعث ذلت ہے خواہ وہ تکبر عبادت سے ہو خواہ دعا سے ہو خواہ ایمان نہ لانے سے ہو۔

☆ ”عن عمرو بن شعيب عن ابيه عن جده عن النبي ﷺ قال يحشر لمتكبرون يوم القيامة امثال الذر في صور الناس يعلوهم كل شئ من المصغار حتى يدخلوا سبحنا في جهنم يقال له بولس تعلوهم نار الانيار يسقون من طينة الخبال عصارة اهل النار“

نبی کریم ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن متکبر لوگ چھوٹی چھوٹی چیونٹیوں کی طرح ہوں گے اگرچہ شکلیں ان کی انسانوں والی ہی ہوں گی۔ ان کی ذلت اور حقارت کی وجہ سے ان پر تمام چیزوں کو بلندی حاصل ہوگی یہاں تک کہ ان کو جہنم کے قید خانہ میں داخل کر دیا جائے گا جس کو ”بولس“ کہا جاتا ہے ان پر

بہت شدید آگ چھا جائے گی ان کو جہنمیوں کا خون اور پیپ پلائے جائیں گے۔ (ابن کثیر)
فائدہ : ”مہین“ ماخوذ ہے ”ہوان“ سے

”وہو ما اقتضى الخلود فى النار دائما بخلاف خلود العصاة من المسلمين فان ذلك تمحيص لهم وتطهير“

جو تقاضا کرتا ہے جہنم میں ہمیشہ رہنے کا، بخلاف نافرمان مسلمانوں کے ان کو عذاب زیادہ دیر تک تو ہو سکتا ہے جس طرح قاتل کو ہونا ہے لیکن ہمیشہ عذاب ہو جہنم سے نہ نکالا جائے ایسا نہیں ہوگا اور مومنین کو عذاب بھی صرف پاک و صاف کرنے کے لئے ہوگا۔ (از قرطبی)

﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمِ امْنُوا بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا نُوْمِنُ بِمَا أَنْزَلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُونَ بِمَا وَرَاءَهُ، وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُونَ أَنْبِيَاءَ اللَّهِ مِنْ قَبْلُ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ﴾ (۹۱)

- (۱) ”اور جب ان سے کہا جائے کہ اللہ کے اتارے پر ایمان لاؤ تو کہتے ہیں وہ جو ہم پر اترا اس پر ایمان لاتے ہیں اور باقی سے منکر ہوتے ہیں۔ حالانکہ وہ حق ہے ان کے پاس والے کی تصدیق فرماتا ہوا تم فرماؤ کہ پھر اگلے انبیاء کو کیوں شہید کیا اگر تمہیں اپنی کتاب پر ایمان تھا۔“
- (۲) ”اور جب ان کو کہا جاتا ایمان لاؤ اس پر جو اللہ نے نازل فرمایا۔ تو وہ کہتے ہیں ہم لاتے ہیں اس پر جو ہم پر اتارا گیا، اور کفر کرتے ہیں اس سے جو اس کے ماسواء ہے حالانکہ وہ حق ہے تصدیق کرنے والا ہے اس کی جو ان کے پاس ہے۔ فرما دیجئے تو کیوں تم شہید کرتے رہے اللہ کے نبیوں کو اس سے پہلے، اگر تم ایمان والے تھے۔“

یہاں سے یہود کی ایک اور قباحت کا ذکر کیا جا رہا ہے کہ جب ان کو کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جو کچھ نازل کیا یعنی قرآن پاک، توراۃ اور انجیل ان تمام پر ایمان لاؤ، تو وہ رب تعالیٰ کے اس ارشاد پر جواب یہ دیتے ہیں کہ ہم تو ایمان صرف اس پر لاتے ہیں جو ہماری طرف نازل ہوا یعنی ہمارا ایمان تو صرف توراۃ پر ہے اور وہ اس کے ماسوا سے کفر کرتے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے کہا کہ وہ توراۃ کے بغیر باقی کتب قرآن اور انجیل کو تسلیم نہیں کرتے حالانکہ وہ حق ہے جس کی حقانیت حقیقت میں بھی ہے۔ اور اس کی حقانیت کو یہ لوگ بھی تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے اس جھوٹے دعویٰ کو کہ ہمارا ایمان توراۃ پر ہے رب تعالیٰ نے رد کرنے کے لئے نبی کریم ﷺ کو فرمایا اے محبوب تم فرما دو کہ اگر تم اپنے اس دعویٰ میں سچے ہو کہ تمہارا ایمان توراۃ پر ہے تو انبیاء کرام کو شہید کیوں کرتے رہے کیا توراۃ میں ناحق قتل کرنے سے منع کیا گیا؟

واضح ہوا کہ تمہارا دعویٰ جھوٹا ہے حقیقت یہ ہے کہ تمہارا ایمان توراۃ پر بھی نہیں۔

﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ﴾

”اور جب ان کو کہا جاتا ایمان لاؤ جو اللہ نے نازل فرمایا“ ﴿لَهُمْ﴾ میں ضمیر یہود کی طرف لوٹ رہی ہے۔ یعنی جب یہود کو کہا جاتا ایمان لے آؤ۔

﴿بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ﴾ سے مراد بعض حضرات نے فقط قرآن پاک لیا ہے کہ یہود کو جب کہا جاتا کہ تم قرآن پر ایمان لاؤ لیکن بعض حضرات نے بیان فرمایا ”ای بکل بما انزل اللہ“ کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر وہ جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا اس پر ایمان لاؤ۔ عموم والا معنی لینا اس لئے زیادہ بہتر ہے کہ ”ما“، الذی کے معنی میں ہے جس میں عموم پایا گیا۔ ان کو جب تمام آسمانی کتب پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا تو انہوں نے بعض پر ایمان کا دعویٰ کیا اور بعض سے کفر کا اقرار کیا تو رب تعالیٰ نے ان کی مذمت بیان کی۔

حقیقت بھی یہی ہے کہ یہود انجیل کو اللہ تعالیٰ کی کتاب نہیں مانتے تھے اور عیسیٰ علیہ السلام کو

اللہ تعالیٰ کا نبی نہیں تسلیم کرتے تھے۔ یہ خطاب چونکہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ کو ہے تو ان کو گویا کہ کہا گیا تم قرآن پاک پر ایمان لاؤ کہ یہ اللہ کی کتاب ہے اور محمد ﷺ کے آخری نبی ہیں۔ اور اب عمل صرف قرآن پاک پر ہی ہو سکتا ہے باقی کتب منسوخ ہو چکی ہیں۔

اور انجیل پر تمہارا یہ ایمان ہونا ضروری ہے کہ وہ اللہ کی کتاب ہے عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی اور وہ اللہ کے نبی ہیں۔ لیکن اب وہ منسوخ ہو گئی اب اس کے احکام پر عمل نہیں ہو سکتا۔

اور توراۃ پر تمہارا ایمان اس طرح ہو کہ توراۃ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اور اللہ کے نبی موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی اس کے جمیع احکام سچے ہیں۔ یہ نہیں کہ جودل نے مان لیا اسے سچا کہہ لیا اور جودل نے نہ مانا اسے بدل ڈالا اور توراۃ کے متعلق بھی تمہارا ایمان یہ ہو کہ یہ منسوخ ہو چکی ہے۔ (از کبیر)

﴿قَالُوا نُوْمِنُ بِمَا اُنْزِلَ عَلَيْنَا﴾ :

”انہوں نے کہا ہم ایمان لاتے ہیں اس چیز پر جو ہم پر نازل فرمائی“۔ یعنی ان کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا ایمان توراۃ پر ہے۔ اور ان صحیفوں پر بھی ہمارا ایمان ہے جو موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کی تائید کرتے ہیں۔ (کبیر)

﴿وَيَكْفُرُونَ بِمَا وَرَاءَ هٗ﴾ : ”اور کفر کرتے ہیں اس کے ماسواء سے“

”ثم اخبر الله تعالى عنهم انهم يكفرون بما وراءه وهو الانجيل

والقرآن واورد هذه الحكاية عنهم على سبيل الذم لهم“

یہود چونکہ خود بھی کہتے تھے کہ ہم تو توراۃ کے بغیر قرآن اور انجیل کو تسلیم نہیں کرتے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی مذمت بیان کرتے ہوئے اور ان کے اقوال کے حکایت بیان کرتے ہوئے بیان فرمایا کہ وہ اس کے ماسواء سے کفر کرتے ہیں۔ (از کبیر)

فائدہ : جب دلائل سے واضح ہو چکا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی تمام کتابیں حق ہیں اور ان کا رب تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونا بھی دلائل سے ثابت ہو چکا تھا تو ان پر ایمان لانا واجب ہو گیا۔

”فثبت ان الايمان ببعض ما انزل الله دون البعض تناقض“

اسی سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کی بعض کتب پر ایمان رکھنا اور بعض کے ساتھ نہ رکھنا معتبر ہی نہیں۔ یعنی یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ قرآن پاک اور انجیل پر وہ ایمان نہ رکھیں اور توراۃ پر ان کا ایمان صحیح ہو کیونکہ توراۃ تو خود حکم دیتی ہے کہ ان کتب کو اللہ تعالیٰ کا کلام سمجھ کر ایمان لاؤ۔ (از کبیر)

﴿وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ﴾:

”اور وہ حق ہے تصدیق کرنے والا ہے اس کو جو ان کے پاس ہے“ ”ہو“ ضمیر ماوراء کی طرف لوٹ رہی ہے یعنی توراۃ کے ماسوا جس کو وہ تسلیم نہیں کرتے حقیقت میں وہ حق ہے تصدیق کرنے والی ہیں جو ان کے پاس ہے یعنی قرآن پاک اور انجیل توراۃ کی تصدیق کرنے والی کتابیں ہیں۔ طلباء کرام توجہ فرمائیں: ﴿وَهُوَ الْحَقُّ﴾ میں حصر حقیقی نہیں، کہ توراۃ کے ماسواء یعنی قرآن اور انجیل ہی فقط حق ہیں۔

”لانه جميع كتب الله حق لا سيما التوراة لان كون القرآن مصدقاً لها

يدل على حقيقتها ايضاً“

اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی تمام کتب ہی حق ہیں۔ خاص کر کے توراۃ بھی حق ہے کیونکہ قرآن پاک جب توراۃ کی تصدیق کرنے والا ہے تو یقینی طور پر توراۃ کا حق ہونا ثابت ہو گیا۔

لہذا ﴿وَهُوَ الْحَقُّ﴾ میں حصر ادعائی ہے کیونکہ وہ ”ماوراء ہ“ کو ہی فقط ناحق سمجھ رہے تھے تو ان کا رد کرتے ہوئے۔ ادعائی طور پر اسی ”ماوراء ہ“ کے حق ہونے کو بطور حصر بیان کر دیا گیا۔

(از شیخ زادہ)

اور یہ بھی خیال رہے ”وراء“ اصل میں مصدر ہے وراہیرہ، قضی یقض کی طرح آتا ہے جس کا معنی ہوتا ہے ”مخفی کرنا“۔ پھر یہ ظرف کے معنی میں غالب استعمال ہوتا ہے۔ اور اکثر طور پر ”خلف“ (پیچھے آنا) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے لیکن بعض اوقات ”قدام“ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسا کہ ”من ورائہم جہنم“ اور ”وکان ورائہم ملک“ میں ”وراء“ سامنے، آگے کے معنی میں استعمال ہے۔

(از شیخ زادہ)

”خلف“ کے معنی کا اعتبار کرتے ہوئے ”وراء“ کا معنی ”سواء“ بھی کر لیا جاتا ہے۔

”اما قوله تعالى ﴿وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ﴾ فهو كالأشارة الى ما

يدل على وجوب الايمان بمحمد ﷺ“

اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ﴾ سے واضح ہو جاتا ہے کہ نبی کریم ﷺ پر ایمان لانا ضروری ہے اس پر دو دلیلیں ہیں۔

پہلی دلیل ﴿وَهُوَ الْحَقُّ﴾ ہے اس لئے کہ جب نبی کریم ﷺ پر معجزات کا ظہور ہوا اور ان کی وجہ سے آپ کی نبوت واضح طور پر ثابت ہو گئی۔ پھر آپ نے خبر دی کہ بیشک یہ قرآن اللہ کی طرف سے نازل ہوا اور مکلفین کو قرآن پر ایمان لانے کا حکم دیا ”وكان الايمان به واجبا لا محالة“ تو یقیناً آپ کے ساتھ ایمان لانا واجب ہو گیا کیونکہ قرآن پاک تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لانے کا حکم دیتا ہے۔

”وعند هذا يظهر ان الايمان ببعض الانبياء وبعض الكتب مع الكفر

ببعض الانبياء وبعض الكتب محال“

یہاں سے ہی یہ بھی واضح ہو گیا کہ بعض انبیاء کرام اور بعض آسمانی کتب پر ایمان لانا، اور بعض انبیاء کرام اور بعض کتب سے کفر کرنا محال ہے۔

دوسری دلیل ﴿مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ﴾ ہے اس کی تقریر دو وجہ سے ہے۔ ایک یہ کہ نبی کریم ﷺ نے کسی سے علم حاصل نہیں کیا آپ نے کسی استاذ سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کیا۔ لیکن آپ نے واقعات جو بیان فرمائے وہ تورات کے موافق تھے ان میں کوئی فرق نہیں تھا۔

”علمنا انه عليه الصلوة والسلام انما استفادها من الوحي والتنزيل“

اسی سے واضح طور پر علم حاصل ہو گیا کہ بیشک نبی کریم ﷺ نے وحی اور قرآن پاک سے فائدہ حاصل کیا۔ اس دلیل کا بیان دوسری وجہ سے اس طرح ہے۔ بیشک قرآن پاک نبی کریم ﷺ کی نبوت پر دلالت کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے یہ بھی بیان فرمایا کہ قرآن پاک تورات کی تصدیق کرتا ہے۔

تو اسی سے واضح ہو جاتا ہے کہ توراۃ کا نبی کریم ﷺ کی نبوت کی خبر پر مشتمل ہونا ضروری ہے۔
ورنہ قرآن پاک توراۃ کی تصدیق کرنے والا نہیں بن سکتا بلکہ تکذیب کرنے والا ہوگا۔

”واذا كانت التوراة مشتملة على نبوة محمد عليه الصلوة والسلام
وهم قد اعترفوا بوجوب الايمان بالتوراة لزمهم من هذه الجهة
وجوب الايمان بالقرآن وبنبوة محمد عليه الصلوة والسلام“
جب توراۃ نبی کریم ﷺ کی نبوت پر مشتمل ہے تو انہوں نے جب جب اعتراف کر لیا
توراۃ پر تو ہمارا ایمان لانا ضروری ہے تو اسی سے ثابت ہو گیا کہ قرآن پاک پر ایمان
لانا ضروری ہے اور حضرت محمد ﷺ کی نبوت پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ (ارکیر)

﴿ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُونَ أَنْبِيَاءَ اللَّهِ مِنْ قَبْلُ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴾

”فرمادیجئے تو کیوں تم شہید کرتے رہے اللہ کے نبیوں کو اس سے پہلے اگر تم ایمان والے تھے“
یہاں سے اللہ تعالیٰ نے ان کے اس دعویٰ کو کہ ہمارا ایمان توراۃ پر ہے رد کیا کہ تمہارا دعویٰ غلط
اور باطل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ توراۃ میں مذکور ہے کہ معجزہ نبی کی صداقت پر دلالت کرتا ہے۔ اور
توراۃ اس پر دلالت کرتی ہے:

”من كان صادقا في ادعاء النبوة فان قتله كفر“

”جو شخص نبوة کے دعویٰ میں سچا ہوا اسے شہید کرنا کفر ہے“

”واذا كان الامر كذلك كان السعي في قتل يحيى وزكريا وعيسى

عليه السلام كفرا فلم سعيتم في ذلك ان صدقتم في ادعائكم كونكم

مؤمنين بالتوراة“

”جب یہ ثابت ہو گیا کہ توراۃ میں انبیاء کرام کو شہید کرنا کفر بیان کیا گیا ہے تو یقیناً

حضرت یحییٰ، حضرت زکریا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو شہید کرنے کی کوشش کفر تھی۔

جب تمہارا دعویٰ بھی یہ ہے کہ ہمارا ایمان توراۃ پر ہے تو پھر تم نے کیوں کوشش کی انبیاء

کرام کو شہید کرنے کی۔“ (ارکیر)

خیال رہے رازی رحمہ اللہ نے ” فلم سعتیم “ ذکر فرمایا ” فلم قتلتم “ نہیں کہا۔ کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام کو اگرچہ انہوں نے شہید کرنے کی کوشش کی لیکن شہید کر نہیں سکے۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ کو شہید کرنے کی بھی انہوں نے کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔

نکتہ: ” وفي اضافة (انبياء) الى الاسم الكريم تشریف عظیم وايد ان بانه كان ينبغي لمن جاء من عند الله تعالى ان يعظم وينصر لا ان يقتل “ (روح المعانی)

لفظ انبیاء کی اضافت لفظ اللہ کی طرف اضافت تشریفہ ہے جس سے یہ واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی عظیم ہستیاں قابل تعظیم ہیں۔ ان کی امداد کی جائے نہ کہ ان کو شہید کیا جائے۔

تنبیہ: خطاب اگرچہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے یہود کو ہے لیکن مراد ان کے اسلاف ہیں جنہوں نے انبیاء کرام کو شہید کیا تھا، البتہ ان کو خطاب کرنے کی وجہ یہ تھی کہ یہ اپنے آباء اجداد کے اس فعل پر رضامند تھے اسی لئے انہوں نے بھی نبی کریم ﷺ کو شہید کرنے کی کوشش کی۔

خیال رہے کہ بظاہر وہم یہ ہوتا ہے کہ مراد جب ان کے آباء اجداد ہیں تو ﴿ تَقْتُلُونَ ﴾ مضارع کا صیغہ حال پر دلالت کرنے والا کیوں ذکر کیا، ماضی کا صیغہ ذکر کیوں نہیں کیا؟ تو اس کا جواب واضح ہے کہ ان کی رضامندی کی وجہ سے مخاطبین یہی تھے کہ تم کیوں قتل کرتے ہو۔ (از کبیر)

☆☆☆☆☆

﴿وَلَقَدْ جَاءَكُمْ مُوسَىٰ بِالْبَيِّنَاتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ

مِنْ بَعْدِهِ وَأَنْتُمْ ظَالِمُونَ﴾

(آیت ۹۲)

(۱) ”اور بے شک تمہارے پاس موسیٰ کھلی نشانیاں لے کر تشریف لایا پھر تم نے اس کے بعد بچھڑے کو معبود بنا لیا اور تم ظالم تھے۔“

(۲) ”اور البتہ تحقیق لائے تمہارے پاس موسیٰ کھلی نشانیاں، پھر بنا لیا تم نے بچھڑے کو معبود ان کے بعد، اور تم ظلم کرنے والے ہوئے۔“

یہ آیت کریمہ پہلے گزر چکی ہے، اس کی وضاحت کچھ ضرورت کے مطابق ذکر کر دی گئی۔ اب دوبارہ زیادہ وضاحت کی ضرورت نہیں رہے گی۔ البتہ مختصر وضاحت انشاء اللہ ذکر ہوگی۔

آیت کریمہ کے تکرار (دوبارہ ذکر کرنے) کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے یہود کے طریقہ کے حکایت بیان فرمائی، اور ان کے عناد اور تکذیب کا ذکر فرمایا، تو ان کے آباؤ اجداد کا بھی ذکر فرمایا کہ وہ انبیاء کرام کو شہید کرتے رہے۔ اسلئے ان کی تکذیب کا ذکر موجود یہود سے زیادہ ضروری تھا۔ اس لئے موسیٰ علیہ السلام اور ان کی نشانیوں کا ذکر لوٹایا گیا کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کے واضح معجزات کو دیکھنے کے باوجود بچھڑے کی پوجا کرنے لگ گئے۔

”وہو مع ذلک صابر ثابت علی الدعاء الی ربہ والتمسک بدینہ
وشرعہ فکذلک القول فی حالی معکم وان بالغتم فی الکتذیب
والانکار“

لیکن موسیٰ علیہ السلام صبر و استقلال سے ان کو رب تعالیٰ کی طرف بلاتے ہی رہے۔ اور فرماتے رہے کہ تم شریعت اور دین پر عمل کرو۔ گویا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا یہی میرا حال ہے تمہارے ساتھ اگرچہ تم میری تکذیب میں مبالغہ کر رہے ہو اور واضح طور پر انکار کر رہے ہو، لیکن میں بھی صبر و استقلال سے تمہیں دعوت ایمان دے رہا ہوں۔

(از کبیر)

﴿وَلَقَدْ جَاءَكُمْ مُوسَىٰ بِالْبَيِّنَاتِ﴾ : ”اور البتہ تحقیق لائے تمہارے پاس موسیٰ کھلی

نشانیاں۔ جب ان کو ایمان لانے کا حکم دیا تو انہوں نے کہا ہم تو توراۃ کے بغیر کسی چیز کو نہیں مانتے تو اللہ تعالیٰ نے ان کا رد کرنا شروع کیا، اسی زجر و توبیخ کا یہ حصہ ہے کہ تمہارے آباؤ اجداد کے پاس موسیٰ علیہ السلام معجزات لائے قطعی دلائل لائے لیکن وہ لوگ پھر پچھڑے کی پوجا کر کے ظالم ہوئے۔

تو گویا کہ ﴿امْنُو﴾ کے تحت داخل کر کے توبیخ کے لئے اس آیت کریمہ کو ذکر کیا۔ اس لحاظ پر صرف لفظی تکرار رہے گا مقاصد علیحدہ علیحدہ ہوں گے۔
(از روح المعانی)

﴿بِالْبَيِّنَاتِ﴾ کا معنی واضح کھلی چیز ہے، یہاں کیا مراد ہے؟ یہاں اس کے مقصد میں وسعت پائی جاتی ہے:

(۱) ”الدلائل الدالة على صدقة عليه السلام في دعوته“، بینات “ کا ایک مطلب یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ایسے دلائل عطاء فرمائے جو آپ کی دعوت الی الحق (حق راہ کی تبلیغ) کی صداقت پر دلالت کرنے والے تھے۔

(۲) ”المعجزات المؤيدة لنبوته كالعصا ولايد وانفلاق البحر“ دوسرا معنی یہ ہے کہ آپ کو معجزات عطاء کئے گئے جو آپ کی نبوت کے لئے تائید تھے جس طرح عصا کا اثر دہا بن جانا، ہاتھ کا سفید ہو کر چمکنا، اور دریا کا پھٹنا وغیرہا۔

(۳) ”وقيل الاظهر ان يراد بها الدلائل الدالة على الوحدانية“ بعض حضرات نے کہا زیادہ ظاہر یہ ہے کہ مراد اس سے وہ دلائل ہیں جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر دلالت کرتے ہیں۔

(روح المعانی)

”﴿بِالْبَيِّنَاتِ﴾ ای بالآیات الواضحات والدلائل القاطعات على انه

رسول الله وانه لا اله الا الله“

بینات کا معنی واضح نشانیاں اور قطعی دلائل جو اس پر دلالت کرتے ہیں کہ بیشک آپ

اللہ کے رسول ہیں اور بیشک اللہ کے بغیر کوئی معبود نہیں۔ (ابن کثیر)

(۴) ”والآيات البينات هي الطوفان والجراد والقمل والضفادع والدم والعصاء واليد

وفرق البحر وتظليلهم بالغمام والمن والسلوى والحجر وغير ذلك من الآيات

شاهدوها“ (ابن کثیر)

واضح نشانیاں جو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو عطا فرمائیں وہ یہ تھیں طوفان، مکڑی، کیڑے،

مینڈک اور خون یہ چیزیں فرعون اور اس کے ساتھ ایمان رکھنے والے لوگوں کے لئے عذاب بنے جن کی تفصیل انشاء اللہ سورۃ اعراف میں آئے گی۔ تفسیر خزائن العرفان کے حوالہ سے راقم نے اپنی تصنیف تذکرۃ الانبیاء میں ان کا ذکر کیا ہے۔

اور واضح نشانیاں، عصا کا اڑد ہا بننا، ید بیضاء، اور دریا کا پھٹنا اور بادل کا سایہ کرنا اور من و سلوی کا نازل ہونا اور پتھر سے پانی کے چشموں کا جاری ہونا، اور ان کے بغیر بھی کئی واضح نشانیاں آپ کو عطا ہوئیں جو تمہارے پاس لائے اور تم ان کا مشاہدہ کر رہے تھے۔

راقم کے نزدیک تمام معانی بیک وقت مراد ہیں علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے بھی اسے ہی اولی (بہتر) قرار دیا: ”وعندی الحمل علی العموم بحیث یשמّل ذلک ایضاً اولی و اظہر“

(روح المعانی)

اور میرے نزدیک عموم پر محمول کرنا ہی زیادہ ظاہر اور زیادہ بہتر ہے تاکہ تمام معانی کو شامل ہو جائے یعنی آپ کو ہر طرح کی واضح نشانیاں عطاء ہوئیں، معجزات عطاء ہوئے، آپ کی نبوت و صداقت پر دلالت کرنے والے دلائل حاصل ہوئے، اور آپ کو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر دلالت کرنے والے دلائل قاطعہ (قطعی دلیلیں) عطاء کی گئیں۔

﴿ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ﴾: ”پھر تم نے بنالیا بچھڑے کو معبود“ اگرچہ ظاہری طور پر صرف اتنا ہی معنی ہے کہ ”پھر تم نے بچھڑا بنالیا“ لیکن بچھڑا بنانا صرف سامری کا فعل تھا تمام کانہیں۔ لہذا یہاں ایک مفعول محذوف ہے علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے کیا خوب تفسیر کی۔

﴿ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ﴾ ای الذی صنعه لكم السامری من حلیکم الہا“

پھر تم نے اس بچھڑے کو معبود بنالیا جو سامری نے تمہارے زیورات سے بنالیا۔

﴿مِنْ بَعْدِهِ﴾: ”ان کے بعد“ یعنی موسیٰ علیہ السلام کے طور پر جانے کے بعد، جب آپ توراۃ لینے کے لئے اللہ تعالیٰ کے حکم سے طور پر گئے تو آپ کی غیر موجودگی میں سامری نے بنی اسرائیل سے زیورات لے کر ایک بچھڑا بنادیا جس کی ان لوگوں نے پوجا شروع کر دی (زیادہ وضاحت چھٹے رکوع میں گزر چکی ہے)۔

عجیب نکتہ: ”ثم“ تراخی پر دلالت کرتا ہے یعنی یہ کام کچھ دیر کے بعد ہوا۔

”یشیر هذا العطف علی انهم فعلوا ذلک بعد مهلة من النظر فی

الآیات وذلک اعظم ذنبا واکثر شفاعۃ لحالهم“

لفظ ”ثم“ سے جو عطف کیا گیا ہے اس سے اس مسئلہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ انہوں نے پچھڑے کی پوجا واضح آیات کو دیکھنے کے بعد کی۔ جو ان کا عظیم گناہ تھا۔ اور بہت ہی زیادہ ان کے حال کے لئے برائی کا سبب تھا۔

﴿وَأَنْتُمْ ظَلُمُونَ﴾: ”اور تم ظلم کرنے والے ہو“ ظلم کا معنی یہ ہے ”وضع الشئی فی غیر محلہ“ ایک چیز کو جہاں رکھنا تھا اس سے ہٹا کر دوسری جگہ رکھ دینا۔ اسی لئے علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے ﴿وَأَنْتُمْ ظَلُمُونَ﴾ کی تفسیر ان الفاظ سے کی ”ای واضعون الشئی فی غیر محلہ اللاتق بہ او مخلون بآیات اللہ تعالیٰ“ تم ظلم کرنے والے ہو یعنی ایک چیز جہاں رکھنے کے قابل تھی وہاں سے ہٹا کر تم دوسری جگہ رکھنے والے ہو اور اللہ تعالیٰ کی آیات میں خلل ڈالنے والے ہو۔

”وفیہا التعریض بانہم صرفوا العبادة عن موضعها الاصلی الی غیر

موضعها“

اور اس میں یہ اشارہ موجود ہے کہ بیشک انہوں نے عبادت کو اپنی اصلی جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ رکھ دیا کیونکہ عبادت تو صرف رب تعالیٰ کی ہو سکتی ہے لیکن انہوں نے پچھڑے کی عبادت شروع کر دی۔ اور مطلق ظلم کر کے یہ واضح کیا کہ انہوں نے پچھڑے کی عبادت کر کے عظیم ظلم کیا۔

”ان عبادة العجل کل الظلم وان من ارتکبها لم یتروک شیاً من الظلم“

اس لئے کہ پچھڑے کی عبادت کرنا تمام کے تمام مظالم کو حاصل کرنا ہے اس لئے جس نے پچھڑے کی عبادت کا ارتکاب کیا اس نے ظلم کی آخری حد کو بھی عبور کر لیا، ظلم کا کوئی حصہ باقی رہنے نہیں دیا۔

نکتہ: جملہ اسمیہ دوام و استمرار پر دلالت کرتا ہے جس سے یہ مسئلہ واضح ہو گیا کہ گویا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کہا: ”وَأَنْتُمْ قَوْمٌ عَادَتُمْ الظلم واستمر منکم ومنہ عبادة العجل“ ظلم کرنا تمہاری عادت ہے اور تم ہمیشہ ظلم کرتے ہی رہتے ہو، تمہارے مظالم میں سے عظیم ظلم پچھڑے کی عبادت کرنا ہے۔

(ماخوذ از روح المعانی)

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ وَاسْمَعُوا قَالُوا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَأَشْرَبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ قُلْ بِسْمَايَأْمُرُكُمْ بِهِ إِيْمَانُكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿٩٣﴾

(آیت ۹۳)

(۱) ”اور یاد کرو جب ہم نے تم سے پیمان لیا اور کوہ طور کو تمہارے سروں پر بلند کیا لو جو ہم تمہیں دیتے ہیں زور سے اور سنو، بولے ہم نے سنا اور نہ مانا اور ان کے دلوں میں پھڑپھڑا رہا تھا ان کے کفر کے سبب تم فرما دو کیا برا حکم دیتا ہے تم کو تمہارا ایمان اگر ایمان رکھتے ہو۔“

(۲) ”اور یاد کرو جب لیا ہم نے تم سے عہد اور بلند کیا ہم نے تمہارے (سروں) اوپر طور لے لو وہ چیز جو دی ہم نے تمہیں، مضبوطی سے، اور سنو، انہوں نے کہا ہم نے سنا، اور نافرمانی کی، اور پلا دی گئی ان کے دلوں میں پھڑپھڑے کی محبت بوجہ ان کے کفر کے۔ آپ فرمادیں بری ہے وہ چیز حکم دیتا ہے تمہیں جس کا تمہارا ایمان اگر ہو تم ایمان والے۔“

یہاں سے یہود کی اور قباحت کا ذکر کیا جا رہا ہے رب تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے ان سے عہد لیا کہ جب ہم تمہیں کتاب عطاء کر دیں تو اس کے احکام پر سختی سے عمل کرنا، لیکن کتاب کے ملنے پر اس کے احکام کو سخت سمجھ کر انہوں نے انکار کر دیا، تو ہم نے جبریل کو حکم دیا جس نے ان کے سروں پر طور پہاڑ کو اٹھا کر لایا، پھر ہم نے ان کو کہا ہمارے حکم کو سنو، یعنی اسے سن کر قبول کرو، انہوں نے کہا ہم نے سنا، لیکن وہ دل میں کہنے لگے ہم نے نافرمانی کی دراصل اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ کافر ہو چکے تھے کیونکہ پھڑپھڑے کو انہوں نے معبود مان لیا تھا اور پھڑپھڑے کی محبت ان کے دلوں میں پلا دی گئی جس کی وجہ سے ان کے دلوں میں پھڑپھڑا رہ گیا تھا۔

رب تعالیٰ نے اپنے محبوب کریم ﷺ کو ارشاد فرمایا کہ آپ ہی ان کو فرمادیں وہ چیز بری ہے جس کا تمہیں تمہارا ایمان حکم دے رہا ہے یعنی پھڑپھڑے کی محبت پر جو تمہارا ایمان ہے (اگرچہ حقیقت میں وہ کفر

ہے) وہ تمہارا ایمان جو تمہیں رب تعالیٰ کے حکم سے پھیر رہا ہے وہ تمہیں بری چیز کا سم دے رہا ہے یعنی تمہیں جہنم کا ایندھن بنا رہا ہے اگر تم مومن ہو یعنی ادھر تمہارا ایمان کا دعویٰ اور ادھر پکھڑے کی پوجا اور رب کے احکام کی نافرمانی یہ تمہارے ایمان میں شک پیدا کرنے کے ذریعے ہیں۔

تَنْبِيهِ: ﴿وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ خُذُوا مَا آتَيْنَكُم بِقُوَّةٍ﴾ تک الفاظ مبارکہ پہلے بھی گزر چکے ہیں تکرار پایا گیا ہے اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ عرب حضرات کا یہ طریقہ ہے کہ وہ جب کسی کلام میں زور دینا چاہیں۔ اس میں تاکید ثابت کرنا چاہیں تو وہ الفاظ کو مکرر (دوبارہ) ذکر کرتے ہیں۔ اس لئے یہاں بھی تاکید کے لئے دوبارہ ذکر کر دیا گیا۔

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ یہاں ﴿وَأَسْمَعُوا﴾ سے لے کر آخر آیت تک زیادتی بھی ہے اس لئے کامل تکرار بھی نہیں۔ (اذکرو) ان کے سروں پر پہاڑ کو اٹھا کر لانا اور ان کا یہ گمان کرنا کہ یہ ہم پر کرنے والا ہے اس کا سورۃ اعراف میں تفصیلی طور پر ذکر ہے۔ انشاء اللہ وہاں ہی ﴿وَإِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَأَنَّهُ ظُلَّةٌ وَظَنُوا أَنَّهُ وَاقِعٌ بِهِمْ﴾ کے مطابق وضاحت کی جائے گی۔

شاہ عبدالعزیز صاحب نے ایک اور وجہ بیان کی کہ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑ کے ان کے سروں پر اٹھانے کو دوبارہ ذکر کیا تو یہ تکرار ہے لیکن حقیقت میں تکرار نہیں، کیونکہ یہاں بعد میں ﴿وَأَسْمَعُوا﴾ ہے جس کا معنی ہے ”سنو“ اور پہلے جو ذکر ہے اس میں بعد میں ہے ﴿وَإِذْ كُرُوا﴾ یاد رکھو۔

گویا کہ یہ آیت واقعہ کی ابتداء ہے اور جو آیت پہلے گزر گئی وہ واقعہ کی انتہاء ہے کیونکہ سننا پہلے ہے اور یاد رکھنا بعد میں ہے۔

(عزیزی)

راقم کو علامہ رازی رحمہ اللہ کا قول ہی تحقیقی نظر آیا کیونکہ ﴿وَأَسْمَعُوا﴾ کا مطلب صرف سننا نہیں بلکہ سن کر قبول کرنا مراد ہے اسی لئے تو ان کے قول ﴿سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا﴾ کی مذمت بیان کی گئی۔ لہذا ﴿وَأَسْمَعُوا﴾ اور ﴿وَإِذْ كُرُوا﴾ کا مفہوم تقریباً ایک ہی ہے کہ رب تعالیٰ کے احکام کو سن کر ہمیشہ کے لئے قبول کر لو یہ مفہوم ہے ﴿وَأَسْمَعُوا﴾ کا اور ان کو یاد رکھو یعنی ان پر ہمیشہ عمل کرو یہ مفہوم ہے ﴿وَإِذْ كُرُوا﴾ کا۔ (واللہ اعلم بالصواب)

﴿وَأَسْمَعُوا﴾ ای استجبوا واطیعوا ای فیما امرتم بہ “ (خازن)

یعنی ﴿وَأَسْمَعُوا﴾ کا مطلب یہ ہے ان احکام کو قبول کرو اور فرمانبرداری کرو یعنی جن چیزوں

کا تمہیں حکم دیا جا رہا ہے ان کو سن کر قبول کرو اور ان پر ہمیشہ کے لئے عمل جاری رکھو۔

﴿قَالُوا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا﴾: ”انہوں نے کہا ہم نے سنا اور نافرمانی کی“

﴿قَالُوا سَمِعْنَا﴾ قولک۔ ﴿وَعَصَيْنَا﴾ امرک۔ (ابو السعود)

انہوں نے کہا ہم نے تمہارے قول کو سنا اور تمہارے احکام کی نافرمانی کی۔ اسی طرح ان کے اس قول کا یہ مطلب بھی تھا:

”قالوا بلسان القول سمعنا و بلسان الحال وعصينا“

انہوں نے زبان سے کہا ہم نے سنا، اور دل میں کہا ہم نے نافرمانی کی۔

ایک قول یہ ہے کہ انہوں نے زبان سے تو کہا تھا ﴿سَمِعْنَا﴾ ہم نے سنا۔ لیکن ﴿وَعَصَيْنَا﴾ کے الفاظ انہوں نے اگرچہ زبان سے یاد دل سے ادا تو نہیں کئے تھے لیکن اللہ تعالیٰ کے احکام پر دیدہ دانستہ عمل نہ کر کے انہوں نے ﴿وَعَصَيْنَا﴾ کا مظاہرہ کیا۔

لیکن اس قول کو علامہ رازی رحمہ اللہ نے رد کیا کہ بلاوجہ ظاہری معنی سے پھیرنا درست نہیں کیونکہ رب تعالیٰ نے ﴿قَالُوا﴾ کے بعد ﴿سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا﴾ کا ذکر فرمایا جو ان کا مقولہ ہی ہو سکتے ہیں اسلئے زبان حال اور زبان مقال کا فرق ہو تو سکتا ہے لیکن مطلقاً قول کی نفی کسی حد تک بھی درست نہیں۔

(ماخوذ از کبیر، روح المعانی، قرطبی)

فائدہ عظیمہ: ان لوگوں کے سروں پر پہاڑ کا اٹھا کر لانا ”انہ من اعظم المخوفات“ بیشک بہت بڑا ڈرانا کا ذریعہ تھا۔ لیکن وہ پھر اپنے کفر پر قائم رہے اور واضح طور پر یہ کہا ﴿سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا﴾ ہم نے سنا اور نافرمانی کی۔

”وهذا يدل على ان التخويف وان عظم لا يوجب الانقياد“

یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ اگرچہ بہت عظیم خوف بھی کیوں نہ دلا دیا جائے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ دل سے مطیع بھی ہو جائے۔

(از کبیر)

اسی سے اساتذہ کو بھی سبق حاصل کرنا چاہئے کہ وہ گالیاں دے کر، ظالمانہ مار سے اپنا رعب جمانے اور طلباء کو اپنا مطیع بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ محنت کر کے اسباق پڑھانے سے ہی، شفقت و محبت سے ہی کسی کے دل میں کوئی آسکتا ہے۔ بیہودہ گالیاں دینے والے استاذ کو ظاہری طور پر ان کے

شاگرد گالیاں دیں یا نہ دیں، دل میں گالیاں ضرور دیتے ہیں۔ میرا سکول کا ایک فلاں فیلو کہتا تھا میرا استاذ جب مجھے ایک مرتبہ گدھا کہتا ہے تو میں دل میں اسے دس مرتبہ گدھا کہتا ہوں تو گدھا، تو گدھا کی دل میں رٹ لگا دیتا ہوں۔

﴿وَأَشْرَبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ﴾: ”ان کے دلوں میں پچھڑے کی محبت پلا دی گئی“ اگرچہ بظاہر معنی یہ ہے کہ ان کے دلوں میں پچھڑا پلا دیا گیا۔ لیکن یہاں مجاز کا استعمال ہے جس میں دو وجہ ہیں اس کی ایک وجہ یہ کہ حذف مضاف پایا گیا ہے یعنی معنی یہ ہے ”وَأَشْرَبُوا فِي قُلُوبِهِمُ حَب الْعِجْلِ“ اور ان کے دلوں میں پچھڑے کی محبت پلا دی گئی۔

”معناه تداخلهم حبه والحرص على عبادته كما يتداخل الصبغ الثواب“

اب اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ ان کے دلوں میں پچھڑے کی محبت اور پچھڑے کی عبادت پر حرص ایسے داخل ہو چکی ہے جیسے کہ رنگ کپڑے میں سرایت کر جاتا ہے۔ اسی صورت کے مطابق اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ہے ”ان کے دلوں میں پچھڑا رچ رہا تھا“۔

راقم کا ترجمہ بھی اسی صورت کے لحاظ پر ہے۔ البتہ راقم نے ابتدائی حذف مضاف کا لحاظ کرتے ہوئے ظاہری الفاظ کے مطابق ترجمہ کیا ہے اور اعلیٰ حضرت نے حاصل ہونے والے نتیجہ کے مطابق ترجمہ کیا ہے۔ دوسری وجہ یہ تھی:

”كما ان الشرب مادة لحياة ما تخرجه الارض فكذا تلك المحبة

كانت مادة الجميع ما صدر عنهم من الافعال“

کہ جس طرح پانی زمین کو پلایا جائے تو اس کے ذریعے زمین سے پودے اگتے ہیں۔ اسی طرح ان لوگوں کے دلوں میں پچھڑے کی جو محبت تھی وہ ان سے افعال کے صادر ہونے کا ذریعہ بنی۔ اس مناسبت کی وجہ سے ان کے دلوں کی محبت کو پانی کے پلائے جانے سے تشبیہ دی گئی۔ (از بحیر)

تنبیہ: بعض حضرات نے ذکر فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام نے پچھڑے کا برادہ بنایا اور اس کو پانی میں بہا دیا۔ پھر بنی اسرائیل کو کہا یہ پانی پیو، تو سب نے پانی پیا۔ جن کے دلوں میں پچھڑے کی محبت تھی ان کے ہونٹ زرد ہو گئے جیسے کہ سونے کا رنگ ہوتا ہے۔

اور ایک قول یہ بھی ہے کہ جن لوگوں کے دلوں میں پچھڑے کی محبت تھی وہ پانی پینے سے مجنوں

ہو گئے۔ یہ ذکر کرنے کے بعد علاقہ قرطبی رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں:

”اما تذریته فی البحر فقد دل علیہ قوله تعالى ثم لنسفنه فی الیم

نسفا، واما شرب الماء وظهور البرادة علی الشفاء فیرده قوله تعالى

﴿واشربوا فی قلوبهم العجل﴾..... واللہ اعلم بالصواب۔“ (قرطبی)

جہاں تک تعلق ہے پچھڑے کے برادہ کو دریا میں بہانے کا وہ تو درست ہے کیونکہ اس پر تو قرآن پاک کے یہ الفاظ مبارکہ دلالت کر رہے ہیں ﴿ثم لنسفنه فی الیم نسفا﴾ پھر ہم ریزہ ریزہ کر کے دریا میں بہائیں گے۔ لیکن پانی کا پینا اور ان کے ہونٹوں پر برادہ کا زرد رنگ کا ظاہر ہونا درست نظر نہیں آتا کیونکہ پچھڑے کا پانی پینا قرآن پاک میں مذکور نہیں، بلکہ ان کے دلوں میں پچھڑے کا پلایا جانا مذکور ہے۔ ﴿بِکُفْرِهِمْ﴾: ”بوجہ ان کے کفر کے“

”بسبب کفرہم وذلك لانهم كانوا مجسمة او حلولية ولم یروا

جسما اعجب منه فتمكن فی قلوبهم ما سول لهم السامری“

بنی اسرائیل نے پچھڑے کا جسم عجیب و غریب دیکھ کر اس کی عبادت شروع کر دی اور ان کے دلوں میں وہ جا گزیں ہو گیا (جگہ پکڑ گیا) جیسا کہ مجسمہ فرقہ کا طریقہ ہے کہ جو پتھر خوبصورت دیکھا اسی کو خدا مان لیا اگر کوئی دوسرا پتھر خوبصورت نظر آ گیا تو اسے خدا بنا لیا پہلے خدا صاحب کو پھینک دیا۔ اسی وجہ سے وہ خدا تعالیٰ کا بھی جسم مانتے ہیں۔ یا حلولیہ فرقہ کی طرح انہوں نے پچھڑے کی پوجا اس لئے شروع کر دی تھی کہ اس میں خدا حلول کر گیا یہی ان کے کفر کی وجہ تھیں۔ (از بیضاوی)

﴿قُلْ بِئْسَمَا یَأْمُرُکُمْ بِہٖ اِیْمَانُکُمْ﴾: ”فرما دیجئے بری ہے وہ چیز حکم دیتا ہے

تمہیں جس کا تمہارا ایمان“ بظاہر یہاں وہم ہوتا ہے کہ ابھی پہلے ذکر کیا کہ ان کا کفر سبب ہے ان کے پچھڑے سے محبت کرنے کا۔ اب یہ فرمایا گیا کہ پچھڑے کی عبادت بری چیز ہے تمہارے ایمان نے تمہیں پچھڑے کی عبادت کا حکم دے کر بری چیز کا حکم دیا۔ ان دونوں میں مطابقت کیسے کہ ایک ہی چیز کا سبب ایمان بھی ہو اور کفر بھی ہو۔ تو اس کا جواب یہ دیا گیا۔

﴿اِیْمَانُکُمْ﴾ ای ایمانکم الذی زعمتم فی قولکم ”نؤمن بما انزل علینا“

کہ یہاں ایمان لے مراد وہ ایمان ہے جس کا یہود دعویٰ کرتے تھے کہ ہمارا ایمان توراۃ پر ہے۔ ان کا یہ دعویٰ باطل تھا کیونکہ ان کا انجیل اور قرآن پاک اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور نبی کریم ﷺ سے

ایمان نہ لانا کفر ہی تھا۔

اب واضح ہوا کہ حقیقی سبب کفر ہی تھا ان کا ایمان کا دعویٰ بھی درحقیقت کفر ہی تھا۔

(از قوطی)

اعتراض : ایمان تو عرض ہے اس سے امر اور نہی متصور ہی نہیں تو کس طرح یہ کہا گیا ”کہ وہ چیز بری ہے جس کا تمہارا ایمان تمہیں حکم دیتا ہے۔“

جواب : ”الداعی الی الفعل قد يشبه بالامر“ کام کا سبب کبھی امر کے مشابہ ہوتا ہے۔ جس طرح رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿صلو تک تأمرک﴾ کیا تمہاری نماز تمہیں حکم دیتی ہے۔ اور ارشاد گرامی ہے:

﴿ان الصلوة تنهى عن الفحشاء والمنکر﴾

بے شک نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے۔

﴿ان کنتم مؤمنین﴾: ”اگر تم ہو ایمان والے“ ان الفاظ مبارکہ سے ان کے دعویٰ ایمان کو غلط قرار دیا جا رہا ہے تقدیر عبارت کی اس طرح ہوگی:

﴿ان کنتم مؤمنین﴾ بھا ما امرکم بهذه القبائح ورخص لم ایمانکم بھا“

اگر تم واقعی مومن ہو تو کس چیز نے تمہیں ان قبیح کاموں کا حکم دیا ہے۔ کیا یہ بھی ممکن ہے کہ ایمان قبیح کاموں کی رخصت دے۔ واضح ہوا کہ ایمان کے منافی کام اور دعویٰ ایمان ان میں تناقض ہے لہذا تمہارا دعویٰ ایمان جھوٹا اور باطل ہے۔ اور تقدیر عبارت کی اس طرح بھی ہے۔

”ان کنتم مؤمنین﴾ بھا فیس ما امرکم به ایمانکم بھا لان

المؤمن ينبغي ان لا يتعاطى الا ما يقتضيه ايمانه لكن الايمان بھا لا

یأمر به فاذن لستم بمؤمنین“

اگر تمہارا ایمان کا دعویٰ ہے کہ تم مومن ہو تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ تمہارا ایمان تمہیں برائی کا حکم دیتا ہے کیونکہ مومن تو وہی کام کرتا ہے جو اس کا ایمان تقاضا کرتا ہے لیکن ایمان تو قبیح کاموں کا حکم نہیں دیتا تو اس سے پتہ چلا کہ تم مومن ہی نہیں ہو۔

(از بیضاوی)

﴿ قُلْ إِنْ كَانَتْ لَكُمْ الدَّارُ الْآخِرَةُ عِنْدَ اللَّهِ خَالِصَةً مِّنْ دُونِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴾ (آیت ۸۴)

(۱) ”تم فرماؤ اگر پچھلا گھر اللہ کے نزدیک خالص تمہارے لئے ہونہ اوروں کے لئے تو بھلا موت کی آرزو تو کرو اگر سچے ہو۔“

(۲) ”آپ فرمادیں، اگر ہے تمہارے لئے دار آخرت اللہ کے نزدیک خالص سوائے اور لوگوں کے، تو تمنا کرو تم موت کی اگر تم سچے ہو۔“

جس طرح پہلے یہود کے غلط دعوے اور قبیح باتیں اور قبیح اعمال کا ذکر ہو رہا ہے اس آیت کریمہ میں بھی ان کے غلط دعویٰ کا رد کیا جا رہا ہے۔

شان نزول میں چند وجوہ:

(۱) یہود کے مختلف دعوؤں کا رب تعالیٰ نے ذکر فرمایا ان کے رد میں ہی یہ آیت نازل ہوئی ان کا دعویٰ یہ تھا: ﴿ لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ الْآمِنُ هُوَ أَوْ نَصَارَى ﴾ ہر گز جنت میں کوئی داخل نہیں ہوگا سوائے یہود اور نصاریٰ کے۔

یعنی یہودی کہتے تھے جنت میں ہمارے بغیر کوئی اور نہیں جائے گا، نصرانی کہتے تھے ہمارے بغیر جنت میں کوئی اور نہیں جائے گا اور ان کا دعویٰ یہ تھا ﴿ نَحْنُ ابْنَاءُ اللَّهِ وَاحِبَاؤُهُ ﴾ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں۔ اسی طرح وہ اور یہ کہتے تھے ﴿ لَنْ تَمْسَنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَةً ﴾ ہمیں آگ ہر گز نہیں مس کرے گی سوائے چند دنوں کے۔ ان کے ان دعویٰ باطلہ کے بعد یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

(۲) اور ان کا عقیدہ یہ تھا کہ ہم حق پر ہیں کیونکہ نسخ ہماری شریعت میں جائز نہیں باقی سب فرقے باطل پر ہیں۔ ان کے اس دعویٰ کے رد میں اس آیت کریمہ کا نزول ہوا۔

(۳) وہ اپنے آپ کو اکابر انبیاء کرام کی اولاد سے ہونے کی وجہ سے یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ ہمارے آباء واجداد حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہم السلام ہمیں رب تعالیٰ سے ضرور چھڑا

لیں گے، کیونکہ ان کا زور چلتا ہے اور ہمیں ثواب تک پہنچا دیں گے اسی وجہ سے وہ اپنے آپ کو تمام عرب لوگوں پر برتر سمجھتے تھے اور نبی کریم ﷺ کے تشریف لانے سے پہلے کہتے وہ ہمارے ہی خاندان سے تشریف لائیں گے لیکن آپ جب حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے آئے تو وہ لوگوں کے دلوں میں یہ شک ڈالنے لگے کہ یہ آخری نبی نہیں کیونکہ پہلے سارے انبیاء کرام حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد سے آئے یہ بھی اگر نبی ہوتے تو ان کی اولاد سے ہی تشریف لاتے۔

ان کے اس دعویٰ کے بعد کہ ہم اکابر انبیاء کرام کی اولاد ہونے کی وجہ سے جنت کی نعمتیں حاصل کریں گے اس آیت کریمہ کا نزول ہوا۔ مسئلہ واضح ہے کہ ان تمام وجوہ کے بعد آیت کریمہ کا نزول ہوا۔ تمام وجوہ ہی اس کا شان نزول ہیں۔

﴿قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ الدَّارَ الْآخِرَةَ عِنْدَ اللَّهِ خَالِصَةً مِنْ دُونِ النَّاسِ فَتَمَنَّوْا الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ﴾

”رب تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو حکم دیا کہ آپ ان سے فرمادیں کہ اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو کہ تم اللہ تعالیٰ کے محبوب ہو اور جنت صرف تمہارے لئے ہے اور جنت کی نعمتیں صرف تمہارے لئے ہیں اور یہ کسی کو حاصل نہیں ہوئیں تو تم موت کے تمنا کرو اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو۔“

وجہ اس کی یہ ہے کہ کوئی انسان اپنے گھر منتقل ہونے کو ناپسند نہیں کرتا۔ اور نہ ہی کوئی انسان باغ میں جانے اور اس کی سیر کو مکروہ سمجھتا ہے بلکہ ہر شخص اپنے گھر میں آنے اور باغ میں جانے کی تمنا کرتا ہے۔ اسی طرح وہ انسان جس کو یہ معلوم ہو کہ رب تعالیٰ کے پاس جا کر ہمیں کرامات اور درجات حاصل ہونے ہیں اور ہمیں عطیات اور ہدیے وصول ہونے ہیں تو وہ تمنا کرکھے گا کہ جلدی میں اللہ تعالیٰ کے حضور پہنچ کر یہ انعامات حاصل کر لوں۔

اگر تم بھی اپنے دعویٰ میں سچے ہو کہ تم اللہ کے محبوب ہو تو موت کی تمنا کرو تا کہ تم دنیا کے غموں سے نجات حاصل کر لو، اور مصائب برداشت کرنے سے چھٹکارا حاصل کر لو اور دائمی نعمتوں کو حاصل کر لو۔

اعتراض : یہود الزامی طور پر یوں کہہ سکتے ہیں کہ تمہارا دعویٰ بھی یہ ہے کہ جنت مومنین کے لئے ہے تو تم ہی موت کی تمنا کر لو تا کہ جنت میں جلدی پہنچ جاؤ۔ تم ایسا کیوں نہیں کرتے۔

پہلا جواب: یہود کا دعویٰ یہ تھا کہ ہمارے بغیر دوسرا کوئی جنت میں جائے گا ہی نہیں۔ نبی کریم ﷺ کی امت کے مؤمنین کا یہ کوئی دعویٰ نہیں۔ بلکہ ہمارا ایمان یہ ہے کہ آدم علیہ السلام سے لے کر قیامت تک جو بھی ایمان والے ہوں گے وہ جنت میں جائیں گے۔ اور انبیاء کا یہ دعویٰ بھی نہیں کہ ہمیں عذاب ہونا ہی نہیں۔

”بل المؤمن وان جل قدره غیر الانبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام فانہ لا

یزول عنہ خوف الخاتمة“

بلکہ مؤمن کتنی بڑی شان والا ہی کیوں نہ ہو وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرتا ہے اس کے دل سے خاتمہ کا خوف نہیں نکلتا کہ پتہ نہیں میرا انجام کیا ہوگا۔

ہاں صرف انبیاء کرام کو اپنے خاتمہ بالخیر کا یقین ہوتا ہے البتہ تعلیم امت کے لئے وہ بھی اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہتے ہیں۔ جب مؤمنین کو اللہ تعالیٰ کا خوف حاصل رہتا ہے تو وہ موت کی تمنا اس لئے نہیں کرتے کہ ہمیں رب کے حضور جانے سے ڈر لگتا ہے ہو سکتا ہے ہم عذاب میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ لیکن یہود تو خوف رکھتے ہی نہیں اس لئے ان کو موت کی تمنا کرنے کے متعلق کہا گیا کہ تم بلا خوف جنت میں پہنچ جاؤ۔ دوسرا جواب: یہود کا تو یہ دعویٰ تھا کہ ہم اللہ کے حبیب ہیں اور اللہ کے بیٹے ہیں اس لئے ان کو کہا گیا کہ تم موت کی تمنا کرو کیونکہ موت تمہیں تمہارے دعویٰ کے مطابق باپ اور محبت تک پہنچائے گی۔ ”ولا احد یرغب ولا ینفر عن الحبیب والاب“ کوئی ایک اپنے حبیب اور اپنے باپ سے اعراض نہیں کرتا اور نفرت نہیں کرتا۔ جب تم تمنا نہیں کر رہے تو تم دعویٰ میں جھوٹے ہو۔

مؤمنین کا ایسا کوئی دعویٰ نہیں تھا بلکہ وہ تو اللہ تعالیٰ کے خوف سے لمبی حیات کو چاہتے تھے اور وہ یہ بھی ایمان رکھتے تھے کہ موت کا وقت مقرر ہے لہذا پہلے موت کی طلب مؤمنین سے ہو ہی نہیں سکتی۔

(ابو شیخ زادہ)

بہت خوبصورت عبارت:

”ان کنتم احباء اللہ فالمحبة داعیۃ الی الشوق ، والشوق داع الی محبة لقاء المحبوب ومحبة لقائه داعیۃ الی تمنی سہولۃ السبیل الیہ ولا سبیل الی سہولۃ السبیل الیہ الا بالموت فیجب ان یکون الموت متمنی فترکہم تمنی ذلک دلالة علی ان لا محبة منکم لہ“

(ابو شیخ زادہ)

اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو کہ تم اللہ کے محبوب ہو تو پھر تمہیں یہ خیال کرنا چاہئے کہ محبت شوق کی دعوت دیتی ہے اور شوق محبوب کی ملاقات کی محبت کی دعوت دیتا ہے اور محبوب کی ملاقات کی محبت و تمنا اس چیز کی تمنا کی دعوت دیتی ہے جس سے ملاقات کی آسانی سے راہ نکل آئے۔ تمہارے دعویٰ کے مطابق جو تمہارا محبوب اور محبت ہے یعنی اللہ تعالیٰ اس کی ملاقات کی آسان راہ سوائے موت کے نہیں، تو ضروری ہے کہ موت کی تمنا کرو اگر تم نے موت کی تمنا نہ کی تو تم جھوٹے ہو تمہیں کوئی محبت نہیں۔

فائدہ جلیلہ: "لان من ایقن انه من اهل الجنة اشتاقها واحب التخلص اليها من الدار ذات الشوائب"

ہاں جن کو یقین ہوتا ہے کہ وہ جنتی ہیں (وہ اللہ تعالیٰ کا خوف رکھتے ہیں) لیکن جنت کے حصول کے مشتاق ہوتے ہیں جنت سے ان کو محبت ہوتی ہے وہ تو بار بار اسے طلب کرتے ہیں۔

شربت الحب کا سا بعد کاس و ما نفذ الشراب ولا رویت

میں نے محبت کا ایک پیالہ پیا پھر دوسرا پیا (پیتا ہی رہا) نہ شراب محبت ختم ہوا نہ میں سیراب ہوا

محبت کی زیادتی تو چاہتی ہے کہ انسان اس کی طرح دیوانہ وار لپکے پیچھے ہٹ جائے تو محبت کیسا؟ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے "حبک الشنی یعمی ویصم" کسی چیز کی محبت تمہیں اندھا اور بہرا کر دیتی ہے۔

(رواہ احمد و ابوداؤد و عن ابی الدرداء رضی اللہ عنہما ص ۸۹)

موت اور شیر خدا:

حضرت علی رضی اللہ عنہ صفین (بکسر الصاد و تشدید الفاء و کسر ہا، فرات کے کنارے ایک مقام) کے میدان میں ادھر ادھر گھوم رہے تھے ایک طرف آپ کے موافقین کی جماعت ہے اور دوسری طرف آپ کے مخالفین کی جماعت ہے۔ آپ نے ایک کرتی پہنی ہوئی ہے بلا خوف و خطر ادھر ادھر گھوم رہے ہیں آپ کے بیٹے حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے عرض کیا "ما هذا بزی المحاربین" کیا جنگ کرنے والے ایسا ہی لباس پہنتے ہیں آپ زرع اور خود (لوہے کی ٹوپی) کا استعمال کریں۔

"فقال یا بنی لایبالی ابو ک أعلی الموت سقط اما علیہ سقط الموت"

تو آپ نے فرمایا اے میرے پیارے بیٹے تیرے باپ کو کوئی پرواہ نہیں کہ موت پر گر

موت کا انسان پر گرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ انسان کے غالب گمان میں موت کے خطرات سامنے موت کے اسباب موجود ہیں۔ دشمن کی یلغار ہو میدان کارزار ہو جنگ کا گرم بازار ہو اس کے ہاتھ میں تلوار ہو۔ بے خوف و خطر وہ دیوانہ وار جنگ کرتے ہوئے شہید ہو گیا تو یہ سمجھیں کہ وہ موت پر گر گیا کہ اس نے موت کو دبوچ لیا، موت کو جان چھڑانے نہیں دی، موت نکل کر جاتی کہاں اس کو تو بہادر مسلمان سے واسطہ پڑا ہوا تھا کسی کافر سے واسطہ ہوتا تو شاید موت اس سے بچ کر نکل جاتی۔ موت کا انسان پر گرنے کا یہ مطلب ہے کہ موت اس پر اچانک آ جائے وہ موت سے غافل تھا یا وہ موت سے بھاگ رہا تھا لیکن موت نے اسے دبوچ لیا۔

حضرت عمار رضی اللہ عنہ اور موت:

صفین کے میدان میں حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ دیوانہ وار یہ کہہ رہے تھے:

الآن القی الاحبة
محمد اثم حزبه

اب میں اپنے محبوبوں سے ملاقات کروں گا وہ میرے محبوب محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب ہیں

کیا خوب تمنا تھی کہ موت جب احباء سے ملاقات کا ذریعہ ہے تو موت سے ڈر کیا؟ موت کی تو مجھے تمنا ہے کہ حبیب پاک اور یاران مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات ہوگی۔ سبحان اللہ کیا خوب عقیدہ تھا صحابہ کرام کا کہ موت کے بعد حیات ہے اگر حیات (زندگی) نہیں تو ملاقات کا کیا مطلب؟

معلوم ہوا کہ صحابہ کرام کا یہ عقیدہ تھا موت مٹنے کا نام نہیں۔ موت تباہ و برباد ہونے کا نام نہیں۔ موت خاک کا ڈھیر بن جانے کا نام نہیں۔ موت کے بعد وہ زندگی حاصل ہوتی ہے جس میں پہلے تشریف لے جانے والے محبوبوں سے ملاقات ہوتی ہے۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ اور موت:

جب حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ پر موت کا وقت آیا آپ فرما رہے تھے:

جاء حبیب علی فاقہ ، فلا افلح الیوم من قد ندّم

حبیب سے مراد موت ہے ”علی فاقہ“ میں دو ترکیبیں ہیں یا تو حال ہے اس صورت میں معنی یہ ہوگا ”جاءنی حبیب حال کوئی محتاجا الیہ ومشتاقا“ میرے پاس میری محبوبہ موت آگئی ایسے حال میں جب اس میں کا محتاج اور مشتاق ہوں۔

دوسری ترکیب کہ حذف مضاف ہو عبارت یوں ہو جائے ”جاء علی ذی فاقہ وحاجة الیہ“ معنی اس صورت میں بھی پہلے معنی کے قریب ہی ہوگا۔ دوسرا مصرع ”فلا افلح الیوم من قد ندم“ ماضی پر ”لا“ داخل ہے نفس پر بد دعا کا احتمال بھی ہے اور شعر کے تسلسل کو قائم رکھنے کے لئے ”لا“ کو ”ما“ کی جگہ لایا گیا ہو اور خبر ہو یہ بھی احتمال ہے۔

اب شعر کا معنی واضح ہو گیا میرے پاس میرا حبیب (موت) آ گیا جب کہ میں اس کا محتاج اور مشتاق ہوں آج جو شخص نادم ہو گیا وہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ یا یہ کہا جائے اگر میں موت کو دیکھ کر آج نادم ہو جاؤں تو مجھے کامیابی حاصل نہ ہو۔

(از بیضاوی و شیخ زادہ)

نتیجہ واضح ہوا کہ مومن موت سے ڈرتا ہی نہیں بلکہ خوشی سے موت کو گلے لگاتا ہے کافر بڑے دعوے کرتے ہیں بڑی بڑھکیں مارتے ہیں لیکن موت سے ایسے ڈرتے ہیں جیسے کو ا غلیل سے ڈرتا ہے۔

یہود اگر موت کی تمنا کر لیتے:

”روی ابن عباس عن النبی ﷺ انه قال لو تمنوا الموت لغص کل انسان بریقه وما بقی علی وجه الارض یہودی الامات“

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ بیشک نبی کریم ﷺ نے فرمایا اگر وہ موت کی تمنا کر لیتے تو ان میں سے ہر شخص اپنی تھوک میں غوطے کھانے لگتا یعنی ہر ایک تباہ و برباد ہوتا، روئے زمین پر کوئی یہودی باقی نہ رہتا یہاں تک کہ وہ موت کی گرفت میں آ جاتا۔

(از خازن)

فائدہ: ”نقل عن المعشرۃ المبشرین بالجنة ان کل واحد منهم یجب الموت ویحن الیہ“

وہ دس صحابہ کرام جن کے نام لے کر نبی کریم ﷺ نے ان کو جنت کی بشارت دی یعنی عشرہ مبشرہ میں سے ہر ایک موت سے محبت رکھتا تھا اور ہر کوئی موت کا مشتاق تھا۔

(مدارک)

فوائد عظیمہ: ”اخرج ابن المبارک فی الزهد والیہقی عن ابن عمر قال قال

رسول اللہ ﷺ تحفة المؤمن الموت“

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مومن کا تحفہ موت ہے

☆ ”وعن الحسین بن علی مرفوعاً مثله بلفظ الموت ریحانة المؤمن“

حضرت امام حسین بن علی رضی اللہ عنہما سے مرفوع حدیث مروی ہے کہ موت مؤمن کے لئے گل ریحانہ ہے (پھول کا نام ریحانہ)۔

☆ ”وقال حبان بن الاسود الموت جسر یوصل الحبيب الی الحبيب“

حضرت حبان بن اسود فرماتے ہیں موت ایک پل ہے جو دوست کو دوست تک پہنچاتا ہے۔

☆ ”ان القبر اول منزل من منازل الآخرة“ (رواہ الترمذی وابن ماجہ عن عثمان مرفوعاً)

یہی آیت جوزیر بحث ہے اور جن احادیث کو ذکر کیا گیا ہے ان سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ قبر آخرت کی منازل میں سے پہلی منزل ہے۔ اسی پر ایک حدیث جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مرفوع طور پر مروی ہے صراحتاً دلالت کر رہی ہے۔ (از مظہری)

موت کی تمنا اور دعا کا حکم: قاضی محمد ثناء اللہ مظہری رحمہ اللہ نے اس مسئلہ کو اسی آیت کریمہ کی تفسیر میں واضح طور پر ذکر کیا ہے اس کو ذکر کرنے میں کچھ تکرار بھی ہو جائے گا لیکن وضاحت کے لئے تکرار عذر کی حیثیت رکھتا ہے۔

سوال: کیا موت کی تمنا کرنا اور موت کے لئے دعا کرنا جائز ہے؟

جواب: اگر مال میں نقصان ہو جانے کی تکلیف کو برداشت نہ کر سکنے کی وجہ سے یا جسمانی تکلیف کی وجہ سے موت کے لئے دعا کرے تو جائز نہیں۔ اسی طرح اہل و عیال کی تکالیف کو دیکھ کر یا اہل و عیال کی طرف سے حاصل ہونے والی تکالیف کے پیش نظر موت کی دعا کرے تو جائز نہیں۔

☆ ”عن انس قال قال رسول اللہ ﷺ لا یتمنین احدکم الموت لضر نزل بہ فان کان ولا بد متمنيا فلیقل اللهم احینی ما کانت الحیوة خیر الی وتوفنی اذا کانت الوفاة خیر الی“ (بخاری، مسلم)

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے تم میں سے کوئی شخص بھی تکلیف آ جانے کی وجہ سے موت کی ہرگز تمنا نہ کرے۔ اگر موت کی تمنا اس کے لئے ضروری ہے تو وہ یہ دعا کرے اے اللہ جب تک میرے لئے زندگی بہتر ہے اس وقت تک مجھے زندہ رکھ اور جب میرے لئے موت بہتر ہو تو مجھے موت عطا کر دے۔

☆ "وفی رواية لهما " اذا مات احدكم انقطع عمله وانه لا يزيد عمره الا خيرا "

بخاری و مسلم کی ایک روایت میں یہ ہے کہ جب تم میں سے کوئی ایک فوت ہو جائے تو اس کے عمل ختم ہو جاتے ہیں بیشک اس کی عمر کی زیادتی نہیں زیادہ کرتی کسی چیز کو سوائے اس کی بھلائی کے۔

اس حدیث سے بھی واضح ہوا کہ عمر کا زیادہ ہونا اس کی نیکیوں کے زیادہ ہونے کا سبب ہے۔

☆ "وعن ابی ہریرۃ مرفوعا لا یتمنن احدکم الموت اما محسنا فلعل ان یزداد واما مسیئا فلعل ان یتعذب" (رواہ البخاری)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث مروی ہے کہ تم میں سے ہرگز کوئی ایک موت کی تمنا نہ کرے اگر وہ نیک ہو تو ہو سکتا ہے (اس کو نیکی کے کام کرنے کی توفیق ہو جائے تو) اس کی نیکیاں بڑھ جائیں۔ اور اگر وہ گنہگار ہو تو ہو سکتا ہے رب تعالیٰ کو راضی کر لے یعنی توبہ کر لے۔

☆ "وعن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ لا یتمنی احدکم الموت ولا یدع بہ من قبل ان یاتیہ انہ اذا مات انقطع عمله وانه لا یزید المؤمن عمرا الا خیرا" (رواہ مسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی ایک تم میں سے موت کی تمنا نہ کرے اور نہ ہی موت کے لئے دعا کرے موت کے آنے سے پہلے اس لئے کہ جب کوئی فوت ہو جاتا ہے اس کے عمل ختم ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ مؤمن کی عمر کی زیادتی مؤمن کے لئے بہتر ہی ہوتی ہے۔

تنبیہ: موت کی تمنا زبان سے کرنا اور موت کا سوال منع ہے۔ تکالیف کے پیش نظر بھی موت کا خیال دل میں آ جانا دل میں موت کی رغبت کا آ جانا منع نہیں۔ کیونکہ یہ انسان کی قدرت سے باہر ہے۔

"واما ان کان التمنی لخوف الفتنۃ فی الدین فلا بأس بہ"

اگر دین میں فتنہ سے بچنے کے لئے موت کی تمنا کی جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

☆ "واخرج مالک والبخاری عن ثوبان فی دعائه ﷺ واذا اردت بالناس فتنۃ فاقبضنی

ایک غیر مفتون

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا فرماتے تھے (اے اللہ) جب تو لوگوں کو فتنہ میں مبتلا کرنے کا ارادہ فرمائے تو میری روح کو قبض کر لینا تاکہ بغیر فتنہ میں مبتلاء ہونے کے میں تیرے حضور پہنچ جاؤں۔

☆ "اخرج الطبرانی عن عمرو بن عبسۃ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لا یتمنی احدکم الموت الا ان لا یثق بعمله فان رأیت فی الاسلام ست خصال فتمنوا الموت وان کانت نفسک فی یدک فارسلها اضاعة الدم وامارة الصبیان وکثرة الشرط وامارة السفهاء وبيع الحکم ونشؤ یتخذ القرآن مزامیر"

حضرت عمرو بن عبسہ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں سے کوئی ایک موت کی تمنا نہیں کرتا سوائے اس کے کہ اسے اپنے اعمال پر بھروسہ نہ ہو۔ اگر تم اسلام میں چھ چیزیں دیکھ لو تو پھر موت کی تمنا کر لو، اگرچہ تمہارا نفس تمہارے ہاتھ میں بھی ہو تو اسے چھوڑ دو،

(وہ چھ چیزیں یہ ہیں) ناحق مؤمنوں کا خون بہانا، اور چھو کروں (کم عمر لوگ) کی حکومت کا قائم کرنا، اور کثیر شرطیں لگانا، اور بے وقوفوں کا حاکم بن جانا، اور عدالتی فیصلوں کو بیچنا اور ایسی جماعت کا پیدا ہو جانا جو قرآن پاک گانے کی طرز پر پڑھیں۔

خیال رہے ایک اور حدیث پاک میں قطع رحم کا بھی ذکر ملتا ہے اس طرح گویا کہ سات چیزوں کا ذکر ہو گیا۔

رب کی ملاقات کا شوق: "واما ان کان التمنی شوقا الی لقاء اللہ تعالیٰ فذلک محمود"

اللہ تعالیٰ کی ملاقات کے شوق کی وجہ سے موت کی تمنا کرنا اچھا فعل، قابل تعریف عمل ہے۔

☆ "عن عائشة قالت کنت اسمع نہ لا یموت بنی حتی یخیر بین الدنیا والآخرة قالت اصاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شديدة فی مرضه فسمعتہ یقول مع الذین انعم اللہ علیہم من النبین والصديقین والشهداء والصالحین وحسن اولنک رفیقاً ، فظننت انه خیر"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں میں (اکثر اوقات حضور سے) سنا کرتی تھی کہ بیشک کوئی نبی

فوت نہیں ہوتے یہاں تک کہ ان کو اختیار دے دیا جاتا ہے دنیا میں رہیں یا آخرت کو پسند کریں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں نبی کریم ﷺ جب شدید مرض میں تھے تو میں نے آپ کو یہ پڑھتے ہوئے سنا: ”مع الذین انعم اللہ علیہم من النبیین والصدیقین والشہداء والصلحین وحسن اولئک رفیقاً“ تو میں نے سمجھ لیا کہ آپ کو بھی دنیا و آخرت کا اختیار دے دیا گیا (آپ نے آخرت کو پسند کر لیا)۔

☆ وروی النسائی عنہا قالت اغمی رسول اللہ ﷺ وهو فی حجری فجعلت امسحہ وادعولہ بالشفاء بہذہ الکلمات اذهب الباس رب الناس فافاق فانزع یدہ من یدی فقال بل اسئل اللہ الرفیق الاعلیٰ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ پر (آخری ایام مرض میں) بے ہوشی طاری ہو گئی، آپ کا سر مبارک میری گود میں تھا۔ میں نے آپ کے جسم پر پھر ہاتھ پھیر کر آپ کے لئے شفاء حاصل ہونے کی غرض سے دعا کرنے لگی ”اے لوگوں کے رب آپ کی تکلیف کو دور فرما“ آپ کو افاقہ ہوا تو آپ نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ سے کھینچ لیا اور آپ فرمانے لگے بلکہ میں سوال کرتا ہوں اللہ تعالیٰ سے رفیق اعلیٰ کا، یعنی آپ اللہ تعالیٰ سے ہی ملاقات کرنے کے لئے بے تاب تھے، رفیق اعلیٰ سے مراد بھی رب تعالیٰ ہے آخری وصال کے وقت آپ کی بے قراری کی بھی یہی وجہ تھی۔

ان دونوں احادیث سے بھی واضح ہوا کہ رسول اللہ ﷺ وفات کی دعا فرما رہے تھے۔

☆ ”واخرج الطبرانی ان ملک الموت جاء الی ابراهیم ليقبض روحہ فقال ابراهیم یا ملک الموت هل رأیت خلیلاً یقبض روح خلیلہ ، فخرج ملک الموت الی ربہ فقال قل لہ هل رأیت خلیلاً یکرہ لقاء خلیلہ فرجع فقال اقبض روحی الساعة“

ملک الموت (عزرائیل) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آیا تا کہ آپ کی روح کو قبض کرے تو ابراہیم علیہ السلام نے کہا اے ملک الموت کیا تم نے دیکھا ہے کہ دوست اپنے دوست کی روح کو قبض کرتا ہو۔ تو ملک الموت اپنے رب کے حضور حاضر ہوا (ابراہیم علیہ السلام کا پیغام پہنچایا) تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا، جاؤ میرے خلیل کو کہو کیا تم نے دیکھا ہے کہ کوئی دوست اپنے دوست سے ملنا ناپسند کرتا ہو، تو عزرائیل لوٹ کر ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئے (اور اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچایا) تو ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا ابھی میری روح قبض کر لو۔

اعتراض: "روی احمد عن ابی امامة قال جلسنا الی رسول الله ﷺ فذكرنا ورقنا فبكى سعد بن ابی وقاص فاکثر البكاء فقال یا لیتنی مت فقال النبی ﷺ یا سعد عندی تتمنی الموت فردد فذلک ثلاث مرات ثم قال یا سعد ان كنت خلقت للجنة فما طال عمرک وحسن عملک فهو خیر لک"

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے آپ نے ہمیں رقت آمیز نصیحت فرمائی، تو حضرت سعد بن ابی وقاص بہت زیادہ روئے تو آپ نے کہا کاش کہ میں مرجاتا، تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا اے سعد کیا میرے پاس تم موت کی تمنا کرتے ہو آپ نے ان الفاظ کو تین مرتبہ لوٹایا، پھر فرمایا اے سعد اگر تم جنت کے لئے پیدا کئے گئے تو تمہاری لمبی عمر اور تمہارے اچھے عمل تمہارے لئے بہتر ہیں۔

اس حدیث پاک کو بیان کرنے کے بعد اعتراض کی دار و مدار اس پر ہے کہ حضرت سعد موت کی تمنا اپنے مال یا اپنے جسمانی نقصان کی وجہ سے نہیں کر رہے تھے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کے خوف سے موت کی تمنا کر رہے تھے لیکن نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا پتہ چلا کہ عذاب کے ڈر سے بھی موت کی تمنا جائز نہیں۔

جواب: منع اس لئے کیا گیا تھا کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے خیال کیا تھا کہ شاید موت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچنا ممکن ہے۔ لیکن نبی کریم ﷺ کے منع کرنے کی وجہ یہ تھی:

"لكن الموت لا يغني من عذاب الله شيئا بل لابد لذلك من الاستغفار

والمبادرة في الاعمال الصالحة والاجتناب عن المعاصي"

لیکن موت اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نہیں بچا سکتی، بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ استغفار کی جائے اور نیک اعمال کی طرف جلدی کی جائے اور گناہوں سے اجتناب کیا جائے۔

یعنی واضح ہوا کہ اگر معصیت کے ڈر سے موت طلب کی جائے کہ اللہ تعالیٰ مجھے موت عطا کر کے گناہوں سے بچالے تو یہ یقینی طور پر جائز ہے۔ لیکن اگر موت اس لئے طلب کی جائے کہ موت کی وجہ سے عذاب سے بچ جاؤ تو اس کا فائدہ نہیں۔ کیونکہ گناہ تو بہ سے معاف ہوتے ہیں موت سے معاف نہیں ہوتے۔

(ماخوذ از مظہری)

﴿ وَلَنْ يَتَمَنَّوْهُ أَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ﴾
(آیت ۹۵)

(۱) ”اور ہرگز کبھی اس کی آرزو نہ کریں گے ان بد اعمالیوں کے سبب جو آگے کر چکے ہیں اور اللہ خوب جانتا ہے ظالموں کو“۔

(۲) ”اور ہرگز وہ نہیں تمنا کریں گے اس کی کبھی، بوجہ اس کے جو (برے اعمال) وہ پہلے کر چکے ہیں اور اللہ خوب جانتا ہے ظالموں کو“۔

یعنی یہود اگرچہ دعویٰ تو کرتے ہیں کہ جنت صرف ہمارے لئے ہے لیکن وہ اپنی بد اعمالیوں کو جانتے ہوئے کبھی بھی موت کی تمنا نہیں کریں گے۔ یعنی حقیقت میں وہ خود بھی سمجھتے ہیں کہ جنت تو نیک لوگوں کے لئے ہے برے لوگوں کے لئے نہیں لہذا ان کا دعویٰ باطل ہے اور وہ ظالم ہیں ظالموں کو اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے۔

﴿ وَلَنْ يَتَمَنَّوْهُ أَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ ﴾: ”اور ہرگز وہ نہیں تمنا کریں گی اس کی کبھی“۔ ضمیر منصوب کی موت کی طرف لوٹ رہی ہے اور ﴿ أَبَدًا ﴾ نفی کی تاکید کے لئے ہے زیادہ طور پر مثبت میں اس کا معنی ہوتا ہے ”ہمیشہ“ اور نفی میں ”کبھی بھی“۔ ”وہذه الجملة اخبار بالغیب“ یہ جملہ یعنی ﴿ وَلَنْ يَتَمَنَّوْهُ أَبَدًا ﴾ غیبی خبر ہے:

”فان عدم تمنیہم الموت فی المستقبل وهو غیب لا یعلم بالحس

ولا ببديهة العقل ولم ينصب عليه دليل ايضا فكانت الآية من

المعجزات الدالة على حقية رسالة نبينا عليه الصلوة والسلام“

بیشک ان کا موت کی تمنا نہ کرنا مستقبل سے تعلق رکھتا ہے اور یہ غیب کا علم ہے نہ تو اس کا علم حواس سے حاصل ہوتا ہے اور نہ ہی بد اہت عقل سے اور نہ ہی اس پر کوئی دلیل قائم ہے۔ اور یہ آیت نبی کریم ﷺ کے معجزات سے ہے جو آپ کی رسالت کی حقانیت پر دلالت کرتی ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے جو خبر دی وہی ہوا کیونکہ یہود تو آپ کی تکذیب کرنا غنیمت سمجھتے۔ اگر کوئی ان سے موت کی تمنا کرتا تو وہ کہتا کہ میں

موت کی تمنا کر رہا ہوں تو ضرور یہ بات مشہور ہوتی۔

لیکن وہ تو نبی کریم ﷺ کی اس خبر سے ایسے مبہوت ہوئے کہ انہیں معلوم تھا کہ نبی کریم ﷺ نے جو خبر دی وہ ہو کر رہے گی۔ ان کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ نبی کریم ﷺ فرما چکے ہیں کہ اگر کسی یہودی نے موت کی تمنا کی تو سب کے سب مرجائیں گے۔

اس واضح ارشاد کے بعد یہود سے موت کی تمنا ممکن ہی نہیں تھی۔ (ار بیضاوی و تبحر زادہ)

تنبیہ: اس خبر کا تعلق نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے یہود سے ہے، ہر زمانہ کے یہود سے نہیں۔ علامہ آلوسی رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں:

”والمراد لن يتمنوه ما عاشوا، وهذا خاص بالمعاصرين له ﷺ على ما روى عن نافع ﷺ قال خاصمنا اليهودي وقال ان في كتابكم ﷻ فتمنوا الموت ﷻ الخ، فانا اتمنى الموت، فمالى لا اموت، فسمع ابن عمر رضى الله عنهما فغضب فدخل بيته وسل سيفه وخرج، فلما رآه اليهودي فر منه، وقال ابن عمر اما والله لو ادر كنه لضربت عنقه“

رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿وَلَنْ يَتَمَنَّوْهُ اَبَدًا﴾ ہرگز وہ موت کی تمنا بھی نہیں کریں گے، اس کا یہ مطلب ہے جب تک وہ زندہ رہیں گے یہ حکم نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے یہود سے خاص ہے۔

اس پر دلیل وہ روایت جو حضرت نافع سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ یہودی نے ہمارے ساتھ جھگڑا کیا اور کہا بیشک تمہاری کتاب میں ﴿فَتَمَنَّوْا الْمَوْتَ﴾ مذکور ہے میں تو موت کی تمنا کر رہا ہوں مجھے موت کیوں نہیں آتی، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے جب سنا تو آپ غصہ میں آ گئے، آپ اپنے گھر تشریف لے گئے تلوار سنت (تان) کر باہر تشریف لائے، یہودی کو جب پتہ چلا تو وہ بھاگ گیا، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا خبردار قسم ہے اللہ تعالیٰ کی اگر میں اسے پالیتا تو اس کی گردن اڑا دیتا۔ اس کے بعد حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

”توهم هذا الكلب اللعين الجاهل ان هذا لكل يهودي او لليهود في كل وقت لا انما هو لاولئك الذين كانوا يعاندون ويجحدون نبوة النبي ﷺ بعد ان عرفوا“

کہ اس جاہل لعنتی کتے کو یہ غلط وہم ہوا کہ یہ حکم ہر زمانے کے ہر یہودی کے لئے ہے حالانکہ ایسا نہیں، بلکہ یہ ان یہود کے لئے جو نبی کریم ﷺ کی نبوت کو پہچان لینے کے باوجود انکار کرنے لگے اور آپ سے عناد رکھنے لگے۔

خیال رہے کہ ابتدائی طور پر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کو شدید غصہ آیا حالانکہ آپ دھیمے مزاج کے تھے، اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنی ناتجہی سے قرآن پاک پر غلط اعتراض کر رہا تھا۔ آپ سے یہ برداشت نہ ہوا تو آپ نے تلوار لے لی، لیکن بعد میں آپ نے ان کو کلام کے ذریعے سمجھایا کہ قرآن پاک کی آیہ کریمہ کا اصل مطلب کیا ہے۔ علامہ آلوسی فرماتے ہیں ”وكانت المحاجة معهم باللسان دون السيف“ یہ حجت آپ نے ان پر زبان سے پیش فرمائی تلوار سے نہیں۔ (از روح المعانی)

اعتراض: یہ کیسے کہا گیا ہے کہ وہ ہرگز تمنا نہیں کریں گے حالانکہ تمنا تو دل کا کام ہے دل پر کوئی مطلع نہیں۔
جواب: ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ تمنا یہاں دل کا فعل مراد ہے، بلکہ ہم کہتے ہیں زبان سے ان کا کہنا مراد ہے ”لیت کذا“ کاش کہ ایسا ہوتا۔ اگر تسلیم کر بھی لیا جائے کہ امر قلبی ہے تو پھر بھی ظاہر ہو جاتا کیونکہ وہ نبی کریم ﷺ سے مخالفت رکھتے تھے تو یقیناً وہ بتاتے کہ ہم تو تمنا کر رہے ہیں ہم پر موت کیوں نہیں آتی یہ مشہور ہو جاتا۔ (از روح المعانی)

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ نبی کریم ﷺ کا معجزہ ہے رب تعالیٰ نے آپ کو بتایا کہ وہ موت کی ہرگز تمنا نہیں کریں گے۔ جب رب تعالیٰ نے آپ کو ان کے دل کی تمنا پر مطلع کر دیا تو اب یہ کہنا ممکن ہی نہیں کہ حضور کو ان کے دلوں پر اطلاع حاصل نہیں تھی۔

﴿بِمَا قَدَّمْتُمْ أَيْدِيَهُمْ﴾: کا حقیقی معنی یہ ہے بسبب اس کے جو ان کے ہاتھوں نے پہلے کیا۔ یہاں اگرچہ حقیقی معنی بھی مراد لیا جاسکتا ہے کہ وہ موت کی تمنا ہرگز بھی نہیں کریں گے بوجہ توراۃ کی تحریف کرنے کے کیونکہ وہ جانتے ہیں جو اپنے ہاتھوں سے کسب کر چکے ہیں۔

تاہم یہاں مجازی معنی لینا بہتر ہے کیونکہ وہ عام ہے جس میں حقیقی معنی بھی ”عموم الجاز“ کے ضابطہ کے مطابق داخل ہے ”ید“ کا مجازی معنی ”شخص“ آتا رہتا ہے اور ”ید“ کا معنی ”قدرت“ بھی لیا جاتا ہے۔ یہاں مراد یہ ہے کہ جو ان کے نفسوں نے پہلے کیا۔

﴿ بِمَا قَدَّمْتُ أَيْدِيَهُمْ ﴾ ای بسبب ما عملوا من المعاصی الموحبة

لنار کالکفر بمحمد ﷺ والقرآن و قتل الانبیاء

یعنی وہ ہرگز موت کی تمنا نہیں کریں گی کبھی، بوجہ اس کے کہ جو انہوں نے گناہوں کا ارتکاب کیا ایسے گناہ جو جہنم میں لے جانے کا ذریعہ ہیں جیسا کہ نبی کریم ﷺ اور قرآن پاک سے کفر اور انبیاء کرام کو شہید کرنا ان کے لئے جہنم کے اسباب تھے۔

(از روح المعانی)

﴿ وَاللَّهُ عَلَيْهِم بِالظَّالِمِينَ ﴾: ”اور اللہ خوب جانتا ہے ظالموں کو“ ان کو جو یہ دعویٰ تھا کہ جنت تو صرف ہمارے لئے ہے کسی اور کے لئے نہیں یہ ظلم تھا کیونکہ وہ جنت کے مستحق نہیں اور مومن مستحق تھے انہوں نے الٹ بیان کیا۔ اور ان الفاظ مبارکہ میں ان کو دھمکی بھی دے دی گئی کہ اللہ تعالیٰ جب ظالموں کے ظلم اور ان کے برے اعمال کو جانتا ہے تو وہ رب تعالیٰ کی گرفت سے کیسے بچ سکیں گے۔ دوسری آیت میں اسی مفہوم کو واضح طور پر بیان کر دیا گیا:

﴿ وَلَا تَحْسِبَنَّ اللَّهُ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظَّالِمُونَ ﴾

”اور ہرگز گمان نہ کرو کہ اللہ غافل ہے اس چیز سے جو ظالم کرتے ہیں“

(از بیضاوی و شرح زادہ)

نکتہ: یہاں ذکر فرمایا ﴿ وَلَنْ يَتَمَنَّوْهُ أَبَدًا ﴾ لفظ ”لن“ سے نفی کی تاکید کی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس مقام پر ان کا دعویٰ بہت بڑا تھا کہ دار آخرت صرف ہمارے لئے خاص ہے باقی لوگوں کو آخری نعمت اور جنت حاصل نہیں ہوگی۔ تو ان کے اس عظیم دعویٰ کو سخت تاکید سے رد کیا گیا اس لئے لفظ ”لن“ ذکر فرمایا کہ وہ ہرگز موت کی تمنا نہیں کریں گے پتہ چلا کہ وہ اپنے دعویٰ میں سراسر جھوٹے ہیں۔

لیکن سورۃ جمعہ میں بیان کیا گیا ﴿ وَلَا يَتَمَنَّوْهُ أَبَدًا ﴾ یہاں لفظ ”لا“ ذکر کیا جو نفی تو کرتا ہے لیکن تاکید نہیں کرتا کیونکہ اس مقام پر ان کا دعویٰ تھا ﴿ انهم اولياء الله من دون الناس ﴾ بیشک وہ اللہ کے دوست ہیں اور وہ لوگ اللہ کے دوست نہیں۔

اگرچہ دعویٰ ولایت بھی اعلیٰ درجہ کا دعویٰ تھا لیکن یہ جنت میں جانے کا ذریعہ ہے اس لئے یہ دعویٰ پہلے دعویٰ سے کم درجہ ہے لہذا یہاں نفی ”لا“ کے ذریعے کر دی جس میں نسبت ”لن“ کے کم قوت پائی گئی۔

(ماہودار کبیر)

﴿وَلَتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلَى حَيٰوةٍ وَمِنَ الَّذِينَ
أَشْرَكُوا يُوَدُّ أَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ أَلْفَ سَنَةٍ وَمَا هُوَ بِمُزَحِّزِهِ
مِنَ الْعَذَابِ أَنْ يُعَمَّرَ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ﴾ (آیت ۹۶)

(۱) ”اور بیشک تم ضرور انہیں پاؤ گے کہ سب لوگوں سے زیادہ جینے کی ہوس رکھتے ہیں اور مشرکوں سے ایک کو تمنا ہے کہ کہیں ہزار برس جئے اور وہ اسے عذاب سے دور نہیں کرے گا اتنی عمر دیا جانا اور اللہ ان کے کو تک دیکھ رہا ہے۔“

(۲) ”اور البتہ تم ضرور بر ضرور پاؤ گے ان کو لوگوں سے زیادہ حریص زندگی پر اور مشرکوں سے (زیادہ حریص) پسند کرتا ہے ان میں سے ہر ایک کاش عمر دی جاتی اسے ہزار سال، حالانکہ وہ اسے عذاب سے دور نہیں کرے گا عمر کا دیا جانا، اور اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے جو وہ عمل کرتے ہیں۔“

یہود چونکہ اپنے کفر اور برے اعمال سے اچھی طرح باخبر ہیں انہیں معلوم ہے کہ ان کا مقام جہنم ہے وہ تو صرف ظاہری ظاہری اپنے آپ کو ہی جنت کا مستحق مانتے ہیں۔ اسی لئے نبی کریم ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ ضرور بر ضرور ان کو دوسرے لوگوں سے زیادہ دنیا کی زندگی پر حریص پائیں گے بلکہ مشرک قیامت پر ایمان نہیں رکھتے ان سے بھی ان کو زیادہ حرص ہے زندگی پر تو وہ جنت کے مستحق کیسے ہوئے۔

ان میں سے ہر شخص چاہتا ہے کہ اسے بہت بڑی عمر دے دی جائے، لیکن ان کا بڑی عمر کی تمنا کرنا ان کو عذاب سے نہیں بچا سکے گا جتنی عمر بھی دے دی جائی آخر انہوں نے عذاب میں مبتلاء ہونا ہی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔ ایسا بھی نہیں ہو سکے گا کہ وہ اپنے اعمال کو اللہ تعالیٰ سے مخفی رکھ سکیں۔

﴿وَلَتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلَى حَيَوةٍ﴾

خطاب نبی کریم ﷺ کو یعنی ضمیر خطاب کا مرجع آپ ہیں۔ ”لام“ مؤطہ للقسم ہے اور ﴿تجدن﴾ وجود سے لیا ہوا ہے ”الوجود بالعقل“ کی دو قسمیں ہیں جب ”عرفت“ کے معنی میں ہو تو ایک مفعول کا تقاضا کرے گا۔ اور جب اس کا معنی ”علمت“ کی معنی کے قریب ہو تو دو مفعولوں کا تقاضا کرتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے پہلی آیت میں خبر دی ہے کہ وہ ہرگز موت کی تمنا نہیں کریں گے تو یہاں علمت والا معنی ہو گیا۔ اسی لئے اسکے دو مفعول ہیں ایک ”ہم“ اور دوسرا ﴿أَحْرَصَ النَّاسِ﴾ ﴿حرص﴾ کا معنی شدت طلب، اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ حرص ضد ہے قناعت کی یعنی تھوڑی چیز پر اکتفاء نہ کرنا حرص ہے۔

﴿حَيَوةٍ﴾ کو نکرہ ذکر کیا جس سے مراد حیات کے افراد سے ایک فرد یعنی حیات متطاوہ (بسی زندگی) ہے اس لحاظ پر تنوین تعظیم کے لئے ہے۔ اگر تنوین تحقیر کے لئے ہو تو اس سے یہ مسئلہ ثابت ہوگا کہ وہ دنیا کی بسی زندگی طلب کرتے ہیں لیکن وہ حقیر ہے یعنی اصل زندگی اخروی زندگی ہے رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ﴾ اسی پر دلالت کر رہا ہے۔ تیسرا احتمال یہ بھی ہے کہ تنوین ابہام کے لئے ہے مطلب یہ ہوگا کہ وہ مبہم زندگی کی حرص رکھتے ہیں۔ بعد میں ﴿إِنَّ الْفَرْسَ﴾ سے بسی زندگی کا ذکر کر دیا۔
(از بیضاوی و شیخ زادہ، روح المعانی)

﴿وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا﴾ : اس میں اگرچہ ترکیب کے لحاظ پر تین احتمال ہیں البتہ آسان اور مشہور قول کو ہی نقل کرنے پر اکتفاء کر رہا ہوں۔ واؤ عطف کے لئے ہے معنوی صورت یہ ہو جائے گی ”ان اليهود احرص الناس على حياة واحرص من الذين اشركوا“ کہ یہود دنیا کی زندگی پر لوگوں سے زیادہ حریص ہیں اور مشرکوں سے بھی زیادہ حریص ہیں۔ جس طرح یہ جملہ ذکر کیا جاتا ہے ”هو اسخى الناس ومن حاتم“ وہ شخص لوگوں سے زیادہ سخی ہے اور حاتم سے بھی زیادہ سخی ہے۔

البتہ یہ خیال کیا جائے کہ مشرکین اگرچہ ﴿النَّاسِ﴾ ”لوگوں“ میں داخل ہیں لیکن ان کو علیحدہ ذکر کیا اس لئے کہ ان کو شدید حرص حاصل ہے اور یہود کی زیادہ تو بیخ پائی گئی ہے کیونکہ مشرکین کا تو قیامت پر ایمان ہی نہیں۔ وہ تو دنیا کی زندگی کے بغیر کوئی اور زندگی جانتے ہی نہیں ان کا دنیا کی زندگی پر زیادہ حرص کرنا اس لئے ہے کہ وہ دنیا کو ہی اپنے لئے جنت سمجھتے ہیں۔ لیکن اہل کتاب جب قیامت کو بھی مانتے ہیں۔ اور یہ بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ جنت کے حقدار صرف ہم ہی ہیں پھر ان کا مشرکوں سے بھی دنیا کی زندگی پر زیادہ حرص کرنا باعث مذمت اور باعث تو بیخ ہے۔ یہود کی مشرکین پر دنیا کی زندگی میں زیادہ حرص کی وجہ یہ تھی:

”انہم علموا انہم صائرون الی النار لا محالة والمشرکون لا یعلمون ذلک“

کہ وہ جانتے تھے کہ جو ہمارے عمل ہیں ان کی وجہ سے یقیناً ہم نے جہنم کی آگ میں ہی جانا ہے اس لئے وہ یہ تمنا کرتے تھے کہ اے اللہ ہمیں دنیا کی زندگی میں ہی رکھتا کہ ہم عذاب سے بچ سکیں۔ لیکن مشرکین کو تو جہنم کی آگ کا کوئی علم ہی نہیں تھا لہذا ان کا دنیا کی زندگی کو صرف منافع کیے لئے پسند کرنا تھا نہ کہ کسی ڈر کی وجہ سے۔

﴿یَوَدُّ أَحَدُهُمْ لَوْ یُعَمَّرُ أَلْفَ سَنَةٍ﴾:

اگر ”لو“ ان مصدر یہ کے معنی میں ہو تو اس صورت میں مطلب ہوگا پسند کرتا ہے ہر ایک ان میں سے ہزار سال عمر دیا جانا۔ اور اگر ”لو“ بمعنی ”لیت“ کے ہو یعنی تمہنی کیے لئے تو معنی ہوگا، پسند کرتا ہے ہر ایک ان میں سے کاش کہ اسے عمر دی جاتی ہزار سال۔ (از جلالین، بیضاوی)

یعنی یہود مشرکوں سے بھی دنیا کی زندگی پر حریص تھے ان کی تمنا بھی ان کی طرح ہی تھی ﴿مِنَ الَّذِینَ أَشْرَکُوا﴾ میں کئی احتمال ہیں ایک یہ ہے اس سے مراد مجوس (آگ پرست) ہوں کیونکہ وہ اپنے بادشاہ کو کہتے تھے ”عش الف نیروز“ تم ہزار نوروز زندہ رہو۔ اور اسی طرح کبھی کہتے ”عش الف مہرجان“ تم ہزار مہرجان زندہ رہو۔ چونکہ نوروز اور مہرجان سال میں ایک ایک مرتبہ آتے ہیں

اس لئے ان کا مطلب یہ ہوتا ”تم ہزار سال زندہ رہو“۔

اسی طرح عجمی مشرکین مراد ہوں کیونکہ وہ کہتے تھے ”زی ہزار سال“ ہزار سال زندہ رہو۔ اور اس سے مراد مشرکین عرب بھی لئے گئے ہیں اور اس سے مراد مطلقاً مشرکین بھی لئے گئے ہیں۔ اور یہ بھی خیال رہے کہ زیادہ مناسب قول یہ ہے کہ مشرکین سے مراد عام مشرک ہی ہوں۔ اور ”المراد بالالف التکثیر وهو معروف فی کلام العرب“ ہزار سال سے مراد خاص ہزار سال معین نہیں بلکہ مراد بہت سال اس طرح عرب میں زیادہ استعمال ہے۔

﴿وَمَا هُوَ بِمُزْحَضٍ مِنَ الْعَذَابِ أَنْ يُعْمَرَ﴾:

ضمیر غائب یعنی ”ہو“ کا مرجع ”احدهم“ ہے۔

”الزحزة، التباعد والانحاء“ یعنی ”مزحزع“ کا معنی دور کرنا، اور کنارہ پر کرنا۔ یعنی ان میں سے جو کوئی بھی چاہتا ہے کہ اسے لمبی عمر عطاء کی جائے اسے لمبی عمر کا عطا کیا جانا عذاب سے دور نہیں کر سکتا۔ یعنی کتنی بھی عمر اسے دے دی جائے اسے عذاب حاصل ہونا ہی ہے۔

﴿وَاللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ﴾:

”اور اللہ دیکھ رہا ہے جو وہ عمل کرتے ہیں“۔ یا یہ معنی کیا جائے ”اور اللہ جانتا ہے جو وہ عمل کرتے ہیں“۔ مطلب واضح ہے کہ ان کے کفریات رب کے علم میں ہیں تو ان کو لمبی عمر اس کے عذاب سے کیسے بچائے گی۔

☆☆☆☆☆

﴿ قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلٰی قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَبُشْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ ﴾

(۱) ”تم فرمادو جو کوئی جبریل کا دشمن ہو تو اس (جبریل) نے تو تمہارے دل پر اللہ کے حکم سے یہ قرآن اتارا اگلی کتابوں کی تصدیق فرماتا اور ہدایت و بشارت مسلمانوں کو۔“

(۲) ”آپ فرمادیں جو شخص دشمن ہے جبریل کا تو بیشک اس نے اتارا ہے وہ (قرآن) تمہارے دل پر اللہ کے حکم سے، وہ تصدیق کرنے والا ہے اس چیز کی جو ان کے پاس ہے اور ہدایت اور بشارت ہے مومنوں کے لئے۔“

(آیت نمبر ۹۷)

اس آیت کریمہ میں یہود کی ایک اور کجروی کا ذکر ہے کہ ایمان نہ لانے کے لئے انہوں نے جھوٹے بہانے بنانے شروع کئے۔

شان نزول: اس آیت کریمہ میں شان نزول کی چند وجوہ ہیں۔ یعنی چند واقعات کے درپیش آنے کے بعد یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

(۱) ”اخرج البخاری عن انس بن مالک قال سمع (عبد اللہ بن سلام) بمقدم رسول اللہ ﷺ وهو فی ارض یختر فاتی النبی ﷺ فقال انی سائلک عن ثلاث لا یعلمھن الا نبی ما اول اشراط الساعة ، وما اول طعام اهل الجنة ، وما یزرع الولد الی ابیہ او الی امہ ؟ قال اخبرنی بہذہ جبریل آنفا ، قال جبریل ؟ قال نعم ، قال ذاک عدو الیہود من الملائکۃ فقرأ ہذہ الایۃ ﴿ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِجِبْرِیلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلٰی قَلْبِكَ ﴾ واما اول اشراط الساعة فصار تحشر الناس من المشرق الی المغرب واما اول طعام یاکلہ اهل الجنة فزیادۃ کبد الحوت ، واذا سبق ماء الرجل ماء المرأة نزع الولد واذا سبق ماء المرأة نزع ، قال اشہد ان لا الہ الا اللہ وانک رسول اللہ ، یا رسول ان الیہود قوم بہت وانہم ان یعلموا باسلامی قبل ان تسألہم یتہونی ، فجاءت الیہود فقال الیہود فقال لہم رسول اللہ ﷺ ای رجل عبد اللہ ابن سلام فیکم ؟ قالوا خیرنا وابن خیرنا وسیدنا وابن سیدنا ، قال ارأیتم ان اسلم ؟ قالوا اعادہ اللہ من ذلک ، فخرج عبد اللہ فقال اشہد ان لا الہ الا اللہ واشہد ان

محمد رسول اللہ فقالوا هو شرنا وابن شرنا وانتقصوه فقال هذا الذی كنت اخاف یا رسول اللہ

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک شخص (عبداللہ بن سلام) نے سنا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم (یہاں) تشریف لائے ہیں وہ اپنے باغ میں پھل چن رہا تھا تو وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو کہا بیشک میں آپ سے تین چیزوں کے متعلق سوال کرتا ہوں۔ جن کو نبی کے بغیر کوئی نہیں جانتا۔

(وہ پہلا سوال یہ ہے) قیامت کی نشانیوں میں پہلی نشانی کون سی ہوگی۔

(دوسرا سوال یہ ہے) کہ جنت والوں کا پہلا طعام کون سا ہوگا۔

(تیسرا سوال یہ ہے) کہ بچہ کبھی باپ کی شکل میں ہوتا ہے اور کبھی ماں کی شکل میں اسکی کیا وجہ ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان چیزوں کے متعلق ابھی مجھے جبریل نے آ کر بتایا ہے تو اس شخص نے کہا جبریل نے بتایا ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں جبریل نے بتایا ہے وہ کہنے لگا فرشتوں میں سے جبریل تو یہود کا دشمن ہے۔ (اس وقت اس آیت کا نزول ہوا) تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ﴿مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلْجَبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَى قَلْبِكَ﴾ اس آیت کو مکمل طور پر پڑھا۔ (پھر آپ نے سوالات کے جوابات دیئے) (آپ نے فرمایا پہلے سوال کا جواب یہ ہے) قیامت کی نشانیوں میں سے پہلی نشانی یہ ہے کہ آگ آئے گی جو لوگوں کو مشرق سے مغرب کی طرف جمع کر دے گی۔

(دوسرے سوال کا جواب یہ ہے) جنت والوں کو کھانے کے لئے سب سے پہلا طعام مچھلی کے جگر کا ایک حصہ دیا جائے گا۔ (تیسرے سوال کا جواب یہ ہے) جب مرد کا پانی (نطفہ) سبقت (پہل) کر جائے تو مرد بچے کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے (یعنی اس کا ہم شکل ہوتا ہے) اور جب عورت کا پانی سبقت کر جائے تو وہ اپنی طرف کھینچ لیتی ہے (یعنی بچہ اس کا ہم شکل ہوتا ہے)

تو اس شخص نے کہا ”اشھد ان لا الہ الا اللہ وانک رسول اللہ“ (یہ تھے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ) وہ کہنے لگے یا رسول اللہ بیشک یہود بہتان لگانے والی قوم ہے۔ اگر ان کو میرے ان سوالات کرنے سے پہلے اسلام قبول کرنے کا پتہ چلتا تو وہ مجھ پر بہتان لگاتے۔

تو (اتنی دیر میں) کچھ اور یہودی آگئے نبی کریم ﷺ نے ان کو کہا عبد اللہ بن سلام تم میں کیسا شخص ہے؟ وہ کہنے لگے کہ وہ تو ہم سے بہتر شخص ہے اور ہمارے بہتر شخص کا بیٹا ہے۔ وہ تو ہمارا سردار ہے اور ہمارے سردار کا بیٹا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تمہاری کیا رائے ہے اگر وہ اسلام لے آئیں وہ کہنے لگے اللہ تعالیٰ اس کو اس (اسلام) سے اپنی پناہ میں رکھے۔ تو حضرت عبد اللہ بن سلام باغ سے باہر تشریف لے آئے، اور یہ پڑھنے لگے ”اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمدا رسول اللہ“ تو وہ یہودی کہنے لگے یہ ہم میں بہت برا شخص ہے اور ہم میں بہت برے شخص کا بیٹا ہے۔ اور عبد اللہ بن سلام کی تنقیص بیان کرنے لگے (عیب لگانے شروع کر دیئے) تو حضرت عبد اللہ بن سلام نے حضور کی خدمت میں عرض کیا یا رسول اللہ میں اسی (ان کی بہتان بازی) کا خوف رکھتا تھا۔

(۲) شان نزول کی دوسری وجہ یہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا یہود رسول اللہ ﷺ کے پاس آ کر کہنے لگے اے ابوالقاسم آپ ہمیں پانچ چیزوں کے متعلق خبر دیں۔

”فان انباتنا بہن عرضنا انک بنی واتبعناک“

اگر آپ نے ان کی خبر دے دی تو ہم پہچان لیں گے کہ آپ نبی ہیں اور ہم آپ کی تابعداری کریں گے۔

نبی کریم ﷺ نے ان سے وعدہ لیا جیسا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں سے (مصر کی روانگی پر) وعدہ لیا اور کہا ”واللہ علی ما نقول وکیل“ جو ہم کہتے ہیں اللہ اس پر کارساز ہے۔ پھر آپ نے فرمایا وہ لاؤ (یعنی جن چیزوں کے متعلق پوچھنا چاہو پوچھ لو) انہوں نے کہا آپ ہمیں نبی کی علامات کے متعلق خبر دیں آپ نے فرمایا ”تنام عیناہ ولا ینام قلبہ“ نبی کی آنکھیں سوتی ہیں اور دل نہیں سوتا۔

پھر انہوں نے کہا آپ ہمیں بتائیں ”کیف تؤنث المرأة کیف تذکر“ عورت کیسے کبھی مؤنث نہا بچہ جنتی ہے اور کبھی مذکر نہا، تو آپ نے ارشاد فرمایا:

”یلنقی الماء ان فاذا علا ماء الرجل ماء المرأة اذکرت واذا علا ماء

المرأة ماء الرجل انثت“

دو پانی (مرد اور عورت کے) ملتے ہیں جب مرد کا پانی عورت کے پانی پر غالب

آجائے تو عورت مذکر نما پچھنتی ہے اور جب عورت کا پانی مرد کے پانی پر غالب آجائے تو عورت کا بچہ مؤنث نما ہوتا ہے۔

پھر انہوں نے کہا آپ ہمیں بتائیں حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے آپ پر کیا چیز حرام کی آپ نے فرمایا:

”کان یشتکی عرق النساء فلم یجد شیاً یلائمه الا البان کذا، قال احمد قال بعضهم یعنی الابل فحرم لحومها“

کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو عرق النساء کا درد لاحق تھا، کوئی چیز اس کے موافق نہ پائی سوائے اونٹوں کے دودھ کے، تو آپ نے اونٹوں کا گوشت اپنے آپ پر حرام کر لیا۔ یہود نے کہا آپ نے سچ کہا۔

پھر انہوں نے سوال کیا کہ آپ ہمیں بتائیں کہ رعد (بجلی کی کڑک) کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا:

”ملک من ملائکة الله عز وجل موکل بالسحاب بیدیه اوفی یدیه مخراق من نار یزجر به السحاب یسوقه حیث امره الله تعالیٰ“

وہ اللہ تعالیٰ کے فرشتوں میں سے ایک فرشتہ ہے جو بادلوں پر مقرر ہے اس کے ہاتھ میں لوہے کی گرز ہوتی ہے جس کے ذریعے وہ بادلوں کو چلاتا ہے جہاں اللہ تعالیٰ اسے حکم دیتا ہے۔ پھر انہوں نے پوچھا، بجلی میں آواز کیا ہوتی ہے؟ آپ نے فرمایا ”صوتہ“ وہ فرشتے کی ہی آواز ہوتی ہے جو بادلوں کو چلاتے وقت وہ نکالتا ہے انہوں نے کہا آپ نے سچ فرمایا۔

پھر یہود نے کہا ایک سوال باقی رہ گیا ہے اس کا اگر آپ نے جواب دیا تو ہم آپ کی تابعداری کر لیں گے۔ (وہ سوال یہ ہے) کہ ہرنی کے پاس ایک فرشتہ خبریں لاتا رہا آپ ہمیں بتائیں آپ کے پاس کون سا فرشتہ وحی لاتا ہے۔

”قال جبریل علیہ السلام“ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جبریل علیہ السلام (وحی لاتے ہیں)۔

”قالوا جبریل الذی ینزل بالحرب والقتال والعذاب عدونا لو

قلت میکانیل الذی ینزل بالرحمة والقطر والنبات لکان“

وہ کہنے لگے جبریل تو جنگوں اور قتال کے احکام لاتا ہے اور عذاب مسلط کرتا ہے وہ ہمارا دشمن ہے اگر تم میکائیل کا نام لیتے تو پھر ہم ایمان لے آتے کیونکہ وہ رحمت اور بارش اور نباتات اگانے کے

احکام نازل کرتا ہے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے اس آیہ کریمہ کا نزول فرمایا۔ (روح احمد والترمذی والنسائی)
تنبیہ: بعض مفسرین نے اسی روایت کو ذکر کیا ہے جس میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ سوال کرنے والا ابن
 صوریاتھار تم کے نزدیک کوئی تعارض نہیں۔ کیونکہ یہود کی ایک جماعت حاضر ہوئی سوال ابن صوریانے
 کئے تصدیق کرنے والے دوسرے بھی تھے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

(۳) شان نزول کی تیسری وجہ یہ تھی کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اور یہود کے درمیان ایک مناظرہ
 ہوا۔ یہ آیہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تائید میں نازل ہوئی۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ
 میں یہود کے مدرسہ میں حاضر ہوتا رہتا تھا وجہ اس کی یہ تھی:

”فاعجب من التوراة كيف تصدق القرآن ومن القرآن كيف يصدق
 التوراة“

کہ میں توراة کو سن کر تعجب کرتا تھا کہ توراة کیسے قرآن پاک کی تصدیق کرتی ہے اور
 قرآن پاک توراة کی کیسے تصدیق کرتا ہے۔

ایک دن یہود مجھے کہنے لگے اے ابن خطاب تمہارے تمام ساتھیوں سے تم ہمیں زیادہ اچھے
 لگتے ہو اور ہم تم سے محبت کرتے ہیں میں نے پوچھا اس کی وجہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ تم ہماری محافل
 میں آتے ہو۔ تو میں نے کہا بیشک میں تمہارے پاس صرف اس لئے آتا ہوں کہ میں تعجب کرتا ہوں کہ
 قرآن پاک کس طرح توراة کی تصدیق کرتا ہے اور توراة قرآن پاک کی کیسے تصدیق کرتی ہے۔

اتنے میں رسول اللہ ﷺ وہاں سے گزرے وہ کہنے لگے اے ابن خطاب وہ تمہارے صاحب
 ہیں ان سے جا کر ملو۔ آپ فرماتے ہیں میں نے انہیں کہا میں تمہیں اللہ تعالیٰ جس کے بغیر کوئی معبود نہیں
 کی قسم دلا کر کہتا ہوں میں تم سے نبی کریم ﷺ کے حقوق کی حفاظت کر مطالبہ نہیں کرتا۔ اور نہ ہی یہ کہتا ہوں
 کہ تم ان کی کتاب کو امانت کی طرح محفوظ رکھو۔ (پھر آپ نے کہا) کیا تم جانتے ہو کہ بیشک وہ اللہ تعالیٰ
 کے رسول ہیں؟ وہ خاموش رہے۔ ان کے بڑے عالم نے انہیں کہا اس شخص نے تمہارے ساتھ بہت
 سخت وعدہ لے کر کلام کیا ہے تم اسے جواب دو ”قالوا فانت عالمنا وکبرنا فاجبه انت“ ان
 سب نے کہا تم ہمارے عالم ہو تم ہمارے بڑے ہو تم ہی اسے جواب دے دو۔

”قال اما اذا تشدتنا بما تشدتنا فاننا نعلم انه رسول الله“

اس عالم نے کہا جب تم نے ہم سے اللہ تعالیٰ کی قسم دلا کر سوال کیا تو (اس کا جواب یہ ہے) کہ

بیشک ہم یقیناً جانتے ہیں کہ تحقیق وہ اللہ کے رسول ہیں۔ حضرت عمر ؓ فرماتے ہیں میں نے انہیں کہا ”تم برباد ہو جاؤ گے“ (یعنی آپ کی رسالت کا یقینی علم جب تمہیں حاصل ہو پھر ایمان نہ لانا دین و دنیا میں ہلاکت کا نے کہا ہم ہلاک نہیں ہوں گے۔ میں نے کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم ہلاک نہ ہو جب تم جانتے بھی ہو کہ بیشک وہ اللہ کے رسول ہیں پھر تم ان کی تابعداری نہیں کرتے اور ان کی تصدیق نہیں کرتے۔ انہوں نے کہا فرشتوں میں ایک ہمارا دشمن ہے اور ایک ہمارا دوست ہے اور ان کی نبوت کا ساتھی یعنی ان کے پاس وحی لانے والا ہمارا دشمن ہے۔

”قلت ومن عدوكم ومن سلمكم؟ قالوا عدونا جبریل وسلمنا میکائیل“

حضرت عمر فرماتے ہیں میں نے کہا تمہارا دشمن کون ہے اور دوست کون؟ انہوں نے کہا ہمارا دشمن جبریل ہے اور ہمارا دوست میکائیل ہے کیونکہ جبریل سخت طبیعت کا مالک ہے مشکلات اور سخت عذاب اور ہر قسم کی سختی کی وجوہ کو وہی لاتا ہے لیکن میکائیل رحمت اور مہربانی والا فرشتہ ہے۔

”قال قلت وما منزلتهما من ربهما عز وجل؟ قالوا احدهما عن یمنہ

والآخر عن یسارہ“

آپ فرماتے ہیں میں نے کہا ان دونوں کا اپنے رب تعالیٰ کے حضور کیا مقام ہے انہوں نے کہا ایک اس کے دائیں طرف ہوتا ہے اور دوسرا دوسری طرف ہوتا ہے۔ تو میں نے کہا قسم ہے اس ذات کی جس کے بغیر کوئی معبود نہیں جب ان دونوں کا یہ مقام ہے تو جو دشمن ہے وہ ان دونوں کا دشمن ہوگا اور جو دوست ہے دونوں کا دوست ہے۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ جبریل میکائیل کے دشمن کا دوست ہو اور یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ میکائیل دوست ہو جبریل کے دشمن کا۔

آپ فرماتے ہیں پھر میں کھڑا ہوا نبی کریم ﷺ کے پیچھے چلا، آپ ایک قبیلہ کے خونہ (چھوٹا دروازہ) سے نکل رہے تھے۔ تو آپ نے فرمایا اے ابن خطاب کیا میں تمہیں وہ آیات نہ سناؤں جو ابھی تھوڑی دیر پہلے نازل ہوئیں۔ پھر آپ نے ﴿مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجَبْرِیْلَ﴾ سے لے کر دونوں آیتوں کے آخر تک پڑھا۔ تو میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان میں اسی ارادہ سے آیا تھا کہ آپ کو خبر دوں لیکن رب تعالیٰ لطیف وخبیر نے مجھ سے پہلے ہی آپ کو خبر دے دی۔

(ماخوذ از صلیبی)

﴿فَانْزَلْهُ عَلٰی قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾:

پہلی ضمیر ”فانہ“ میں جبریل کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور دوسری ضمیر ”نزلہ“ میں قرآن پاک کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اس لحاظ پر معنی ہوگا بیشک جبریل قرآن نازل کرتا ہے آپ کے دل پر اللہ کے حکم سے۔ ایک اور احتمال یہ ہے کہ پہلی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹے اور دوسری جبریل کی طرف اس صورت میں معنی گا:

”فَإِنَّ اللَّهَ نَزَلَ جِبْرِيلَ بِالْقُرْآنِ عَلَى قَلْبِكَ“

بیشک اللہ تعالیٰ نے جبریل کے واسطے سے آپ کے دل پر قرآن نازل کیا اپنے ہی حکم سے۔

﴿عَلٰی قَلْبِكَ﴾ فرمایا ”علیک“ نہیں فرمایا اس لئے کہ یا تو ”قلب“ سے مراد روح ہے یعنی اس نے وحی نازل کی آپ کی روح پر، اور اگر ”قلب“ سے مراد خاص عضو ہو تو مراد محل فہم اور محل حفظ ہوگا کیونکہ باقی حواس باطنہ مراد نہیں ہوں گے۔ مطلب یہ ہوگا کہ آپ کے دل پر قرآن نازل کیا تا کہ آپ سمجھ سکیں اور یاد کر سکیں۔

”وقيل كنى بالقلب عن الجملة الانسانية كما يكنى ببعض الشئى عنه كله“

اور ایک مطلب یہ بھی ہے کہ ذکر قلب کا ہے اور مراد اس سے تمام انسانیت ہے جیسا کہ ذکر بعض اور مراد کل بطور مجاز مرسل آتا رہتا ہے۔ اب اس صورت میں مطلب ہوگا ”بیشک اس نے آپ پر نازل کیا۔“

”وقيل معنى ﴿نَزَّلَهُ عَلٰی قَلْبِكَ﴾ جعل ﴿قَلْبِكَ﴾ متصفا باخلاق

القرآن ومتادبا بآدابه كما فى حديث عائشة رضى الله عنها كان خلقه

القرآن يرضى لرضاه ويغضب لغضبه“

اور اس کا یہ مطلب ہے کہ آپ کے دل پر قرآن نازل کیا کہ آپ کا دل قرآن پاک کے اخلاق سے متصف ہو گیا اور قرآن پاک کے آداب سے متصف ہو گیا۔ جس طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث پاک میں ہے کہ نبی کریم ﷺ کا خلق قرآن پاک ہے جن چیزوں کو قرآن پاک نے پسند فرمایا وہی نبی کریم ﷺ کو پسند تھیں۔ اور جن چیزوں کو قرآن پاک میں ناپسندیدہ قرار دیا گیا وہ آپ کو ناپسند تھیں۔ یعنی پسند یا ناپسند قدرتی طور پر قرآن پاک کے مطابق تھیں۔ ان میں تکلف کی ضرورت نہیں تھی۔

تنبیہ: آیہ کریمہ کی ابتداء ”قل“ سے ہے اے محبوب آپ فرمادیں اس کے مطابق عقل کا تقاضا

یہ ہے کہ ”علی قلبی“ ہونا چاہئے تھا لیکن نبی کریم ﷺ نے رب تعالیٰ کے قول کی حکایت بیان کی اور اشارہ فرمایا کہ قائل سفیر محض (فقط بیان کرنے والا) ہے۔

﴿بِإِذْنِ اللَّهِ﴾: اذن کا معنی بتانا، اجازت دینا، رخصت دینا یہاں اجازت دینا مراد ہو ”اللہ کی اجازت سے“ تو پھر بھی درست ہے۔ اور مجازی معنی لیا جائے ”اللہ کے حکم سے“ یا مجازی معنی یہ لیا جائے اللہ تعالیٰ کی طرف سے طاقت دینے سے۔ یا یہ معنی ہو ”اللہ تعالیٰ کے اختیار دینے سے“ سب معانی درست ہیں۔

﴿مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ﴾: لفظی معنی اس طرح ہے ”تصدیق کرنے والا ہے اس چیز کی جو ان کے ہاتھوں کے درمیان ہے“ مرادی معنی یہ ہے ”تصدیق کرنے والا ہے اس چیز کی جو ان کے سامنے ہے“۔

﴿مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ﴾ من الكتب الالهية التي معظمها التوراة
قرآن پاک تمام کتب الہیہ کی تصدیق کرنے والا ہے ان تمام میں سے معظم توراة ہے۔
یہاں توراة ہی مراد لینا بہتر ہے کیونکہ خطاب یہود کو ہو رہا ہے۔

﴿وَهُدًى وَبُشْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ﴾: ”اور ہدایت اور بشارت ہے مومنوں کے لئے“
قرآن پاک اگرچہ تمام لوگوں کے لئے ہدایت ہے لیکن اس ہدایت کو قبول مومنوں نے کیا لہذا مومنین کا خصوصی ذکر فرمایا اور بشارت بھی یقیناً مومنوں کے لئے ہی ہے جنہوں نے ایمان لایا ہدایت کو قبول کیا وہی جنت اور جنت کی نعمتوں کی بشارت کے مستحق ہیں۔

آیت کریمہ سے حاصل ہوا: حضرت جبریل علیہ السلام کی شان بلند ہے آپ رفیع القدر اسلئے کہ اللہ تعالیٰ اور اشرف المخلوق حضرت محمد ﷺ کے درمیان واسطہ ہیں۔ اور اس کتاب کو نازل کرنے والے ہیں جو صفات عظیمہ والی ہے۔ جن میں سے کچھ کا ذکر اس آیت میں ہی کر دیا گیا اور اسی آیت کریمہ سے یہود کا باعث مذمت ہونا واضح ہو گیا:

”حيث ابغضوا من كان بهذه المنزلة العظيمة الرفيعة عند الله تعالى“

کیونکہ انہوں نے اس ذات سے بغض کیا جس کا مقام رب تعالیٰ کے ہاں بہت ہی بلند و بالا ہے۔

﴿مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَرُسُلِهِ وَجِبْرِيلَ وَمِيكَالَ

(آیت ۹۸)

فَإِنَّ اللَّهَ عَدُوٌّ لِلْكَافِرِينَ﴾

(۱) ”جو کوئی دشمن ہو اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں اور جبریل اور میکائیل کا تو اللہ دشمن ہے کافروں کا۔“

(۲) ”جو شخص ہے دشمن اللہ کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کے رسولوں کا اور جبریل کا اور میکائیل کا تو بیشک اللہ دشمن ہے کافروں کا۔“

اس آیت میں یہود کا رد کیا گیا ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں اور جبریل اور میکائیل کا دشمن ہے وہ کافر ہے، اللہ تعالیٰ کافروں کا دشمن ہے یعنی ان کو دائمی عذاب میں مبتلا فرمائے گا ان کا ٹھکانا جہنم ہوگا۔

اعتراض: ”العداوة للشئ طلب الاضرار به بغضاله“

کسی کے ساتھ بغض رکھنے کی وجہ سے اسے نقصان پہنچانے کی طلب کرنا عداوت کہلاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو نقصان پہنچانا جب ممکن نہیں۔ کسی کو اس کی طاقت حاصل نہیں تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ دشمنی کرنے کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟

پہلا جواب: اللہ کے ساتھ عداوت رکھنے کا مجازی معنی معتبر ہے کہ عناد کی وجہ سے رب تعالیٰ کے احکام کی مخالفت کرنا اور رب تعالیٰ کی طاعت کو ناپسند سمجھنا گویا کہ عداوت ہی ہے۔ کیونکہ دشمن بھی اپنے دشمن کے احکام کو پرواہ میں نہیں لاتا اور اپنے دشمن کی فرمانبرداری نہیں کرتا۔

دوسرا جواب: اصل میں مقصد تو رب تعالیٰ کے مقربین کی عداوت کا ذکر کرنا تھا۔

”الا انه افتتح الكلام بذكر عداوة الله تعالى تمهيدا لذكرهم وتعظيما

لهم وبياننا لفضل منزلتهم“

لیکن ابتداء کلام میں اللہ تعالیٰ کی عداوت کا ذکر درحقیقت ان کے ذکر کے لئے تمہید ہے۔ اور ان

کی عظمت کے ذکر اور ان کی فضیلت مراتب کا ذکر ہے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا:
﴿وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَإِنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُ وَلِلرَّسُولِ﴾ - الخ
اس میں مال غنیمت کے مصارف کا ذکر کیا گیا:

”فصدر مصارف خمس الغنیمۃ بذکرہ تعالیٰ تعظیما لہم لا لبيان انہ
تعالیٰ من جملة المصارف“

اور غنیمت کے خمس کے مصارف کو اللہ تعالیٰ کے ذکر سے شروع فرمایا صرف ان
مصارف کی تعظیم کے لئے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کوئی مصرف نہیں۔

تیسرا جواب: اللہ تعالیٰ کی عداوت سے مراد درحقیقت اللہ کے بندوں کی عداوت ہے جس کا بعد
میں بیان آ رہا ہے کہ وہ اللہ کے بندے کون ہیں۔ اللہ کے فرشتے اور اس کے رسول اور جبریل میکائیل
ہیں۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ان الذین یحاربون اللہ ورسولہ﴾ اور ارشاد گرامی: ﴿ان
الذین یؤذون اللہ ورسولہ﴾ بیشک مراد ان دونوں آیتوں میں:

”بیان حکم محاربة عباد اللہ وایذائہم دونہ لا استحالة المحاربة والاذیة
علیہ تعالیٰ“

پہلی آیت میں ذکر ہے (بیشک وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے ہیں) اور
دوسری آیت میں ذکر ہے ”بیشک وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول کو ایذا دیتے ہیں“ (تکلیف پہنچاتے
ہیں) ان دونوں آیتوں میں بھی ذکر تو اللہ تعالیٰ کا ہے لیکن مراد اس کے بندے ہیں۔ کیونکہ اللہ سے
جنگ کرنا اور اللہ تعالیٰ کو ایذا دینا محال ہے کسی انسان کو طاقت ہی نہیں۔
(از شیخ زادہ)

جبریل و میکائیل کو علیحدہ ذکر کرنے کی وجہ:

ملائکہ کا ذکر جب پہلے ہو گیا تو اسی میں جبریل اور میکائیل کا ذکر بھی ہو گیا ان کو دوبارہ ذکر کرنے
کی وجہ کیا ہے؟ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ان دونوں کی فضیلت کو ذکر کرنا مقصود تھا کہ یہ دونوں اپنی رفعت
شان کے لحاظ پر گویا کہ ملائکہ سے علیحدہ جنس ہیں:

”فان التغایر فی الوصف قد ینزل منزلة التغایر فی الذات“

بیشک تغایر وصفی کو کبھی تغایر ذاتی کے درجہ میں سمجھ لیا جاتا ہے۔ جیسا کہ ابو الطیب نے کہا:

فان تفق الانام وانت منهم ، فان المسك بعض دم الغزال

اگر چہ لوگ تمام ایک جیسے ہیں اور تم بھی ان میں سے ہو بیشک کستوری بھی ہرن کے خون کا حصہ ہی ہے

یعنی جس طرح کستوری ہرن کے خون کا حصہ ہونے کے باوجود علیحدہ حیثیت رکھتی۔ اسی طرح ابو الطیب نے اپنے مدوح کو کہا تم اگر چہ لوگوں میں سے ہی ہو لیکن بلند شان رکھنے کی وجہ سے گویا کہ تمہاری حیثیت دوسرے لوگوں سے علیحدہ ہے۔

دوسری وجہ ان دونوں فرشتوں کو علیحدہ ذکر کرنے کی یہ ہے کہ یہ بتانا مقصود ہے:

”من عادى احدهم فكانما عادى الجميع فى انه كافر“

کہ جس نے اللہ تعالیٰ کے رسولوں میں سے کسی ایک کے ساتھ دشمنی کی اس نے تمام سے ہی دشمنی کی ایک سے دشمنی کرنا بھی کفر ہے اور سب سے دشمنی کرنا بھی کفر ہے۔

خیال رہے کہ یہاں ”رسل“ سے مراد عام ہے جو پیغمبروں اور رسولوں سب کو شامل ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿الله يصطفى من الملائكة رسلا ومن الناس﴾

”اللہ تعالیٰ نے ملائکہ اور لوگوں سے رسولوں کو برگزیدہ بنایا۔“

جب کہ ملائکہ کا ذکر رسل میں آ سکتا تھا تو علیحدہ ذکر کیا کیونکہ یہود کا رد اس بات کا کرنا مقصود تھا (کہ جبریل ہمارا دشمن ہے)۔

کسی ایک سے دشمنی پر وعید نبی کریم ﷺ کے ارشاد سے ثابت ہے۔ بخاری نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا:

”قال رسول الله ﷺ من عادى لى وليا فقد بارزنى بالحرب“

”رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (جس نے میرے ولی سے دشمنی کی تحقیق وہ میرے مقابل جنگ کے لئے آ گیا“

(حدیث قدسی)

نتیجہ واضح ہوا:

”ان من عادى وليا لله فقد عادى الله ومن عادى الله فان الله عدوله ومن

كان الله عدوه فقد خسر الدنيا والآخرة“

بیشک جس نے اللہ کے ولی سے دشمنی کی تحقیق اس نے اللہ سے دشمنی کی جس نے اللہ سے دشمنی کی بیشک اللہ اس کا دشمن ہوا۔ جس کا اللہ دشمن ہوا وہ دنیا اور آخرت میں خسارے میں رہا۔

تیسری وجہ ان دونوں فرشتوں کو علیحدہ ذکر کرنے کی یہ تھی:

”ان المسحاجة التي وقعت بين اليهود ورسول الله ﷺ كانت فيهما والآية انما نزلت بسببهما فلا جرم نص على اسميهما“

یہود اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان جو بحث ہوئی۔ اس میں یہود نے ان دونوں فرشتوں کا ہی ذکر کیا کہ جبریل ہمارا دشمن ہے اور میکائیل ہمارا دوست ہے آیت کریمہ کا جب شان نزول ہی یہ ہے تو اسی وجہ سے ان دو کا صراحتہ ذکر کیا گیا۔

”فاعلمهم الله تعالى ان من عادى واحدا منهما فقد عادى الآخر وعادى الله ايضا“

تو اللہ تعالیٰ نے ان کو بتایا کہ جو شخص ایک کا دشمن ہوگا وہ حقیقت میں دونوں کا ہی دشمن ہوگا، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کا بھی دشمن ہوگا۔ لہذا تمہارا یہ کہنا باطل ہے کہ ایک دشمن ہے اور دوسرا دوست ہے۔

(ماخوذ از شیخ زادہ وصابونی و ابن کثیر)

وجہ تسمیہ: ”قال المادردی ان جبریل ومیکائیل اسمان احدهما عبد الله والآخر عبید الله لان ایل هو الله تعالى وجبر هو عبد ومیکا هو عبید فكان جبریل عبد الله ومیکائیل عبید الله“

”ایل“ اللہ تعالیٰ کا اسم گرامی ہے۔ یعنی ”ایل“ کا معنی ”اللہ“ اور ”جبر“ کا معنی ”عبد“ اور ”میکا“ کا معنی ”عبید“ ہے۔ اس طرح جبریل کا معنی ”عبد اللہ“ اور میکائیل کا معنی ”عبید اللہ“۔ اور بعض حضرات نے اسرافیل کا معنی ”عبد الرحمن“ بیان کیا۔

☆ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ یہ پڑھتے تھے:

”اللهم رب جبریل ومیکائیل واسرافیل اعوذ بك من حر النار وعذاب القبر“

(از قرطبی)

اور حدیث شریف میں یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ رات کو قیام فرماتے اور یہ دعا پڑھتے:

”اللهم رب جبرائیل ومیکائیل واسرافیل فاطر السموات والارض عالم الغیب والشهادة انت تحکم بین عبادک فیما کانوا فیہ

یختلفون اهدنی لما اختلف فيه من الحق باذنك انك تهدي من
تشاء الى صراط مستقيم“ (ابن کثیر)

لفظ جبریل کے متعلق: اس لفظ میں آٹھ لغات پائی گئی ہیں تاہم چار زیادہ مشہور ہیں:

- (۱) جبریل (بکسر الجیم) یہ لغت ہے بنی حجاز کی۔ (۲) جبریل (بفتح الجیم) یہ حسن اور ابن کثیر کی قراءۃ ہے۔ (۳) جبرئیل (بروزن سلسبیل) یہ اہل کوفہ کی قراءت ہے۔ (۴) جبرائیل (بکسر الجیم، والهمزة بعد الالف)۔

لفظ میکائیل کے متعلق: اس لفظ میں چھ لغات ہیں تین ان میں سے زیادہ مشہور ہیں:

- (۱) میکال، یہ بنی حجاز کی لغت، اسی لغت کے مطابق قرآن پاک میں پڑھا جا رہا ہے۔
- (۲) میکائیل (الف کے بعد دو یا ہیں یہ نافع کی قراءت ہے)۔
- (۳) میکائیل (الف کے بعد ہمزہ اور یا ہے) یہ ہمزہ کی قراءت ہے۔ (ماخوذ از قرطبی)

جبریل کی افضلیت: حضرت جبریل علیہ السلام کی افضلیت پر ایک دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا ذکر پہلے کیا ہے اور میکائیل علیہ السلام کا بعد میں۔ ان کا پہلے ذکر کیا جانا ان کی افضلیت پر دلالت کرتا ہے کیونکہ اکثر طور پر افضل کا ذکر پہلے کیا جاتا ہے اگرچہ کبھی اس کے خلاف بھی واقع ہو جاتا ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ جبریل قرآن پاک نازل کرتے رہے وحی لاتے رہے اور علم ان کے واسطے سے ہی نبی کریم ﷺ کی امت کو دیا گیا ”وہو مادة بقاء الارواح“ علم رُوحوں کی بقاء کا مادہ ہے۔ اور اسرافیل خوشحالی اور بارشیں لاتے ہیں یہ بدنوں (جسموں) کی بقاء کا مادہ ہے۔

”ولما كان العلم اشرف من الاغذية وجب ان يكون جبريل افضل
من ميكائيل“

جب علم غذاؤں سے اشرف ہے تو ضروری ہے کہ جبریل افضل ہوں میکائیل سے۔
تیسری دلیل یہ ہے کہ جبریل کا وصف رب تعالیٰ نے بیان فرمایا ﴿مطاع ثم امين﴾ مطلقاً جب جبریل کو مطاع کہا گیا کہ ان کی طاعت فرشتے کرتے ہیں تو پتہ چلا کہ تمام فرشتے آپ کی طاعت کرنے والے ہیں:
”وظاهره يقتضى كونه مطاعاً بالنسبة الى ميكائيل فوجب ان يكون افضل منه“

اسی سے یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ آپ کی طاعت کرنے والے میکائیل بھی ہیں۔ لہذا میکائیل سے جبریل کا افضل ہونا واضح طور پر ثابت ہو گیا۔ خیال رہے کہ راقم نے اس مقام پر روح المعانی کو بھی دیکھا تاہم کبیر کی بحث کو مفید پا کر ذکر کیا گیا۔

﴿وَلَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ وَمَا يَكْفُرُ بِهَا إِلَّا الْفَاسِقُونَ﴾

(آیت ۹۹)

(۱) ”اور بیشک ہم نے تمہاری طرف روشن آیتیں اتاریں اور انکے منکر نہ ہوں گے مگر فاسق لوگ۔“
(۲) ”اور البتہ تحقیق نازل کیں ہم نے تمہاری طرف واضح آیات، اور نہیں کفر کرتے ان کے ساتھ مگر فاسق لوگ۔“

”اعلم ان هذا نوع آخر من قبائحهم وفضائحهم“ اس آیت کریمہ میں یہود کے اور قبیح اقوال اور ان کے لئے رسوا کن عذاب کا ذکر ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی واضح آیات کا انکار کر کے کافر ہو گئے اور دائمی عذاب کے مستحق ہو گئے۔

شان نزول کی دو وجہ:

(۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے یہود اوس اور خزرج پر رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے آپ کے وسیلہ سے فتح طلب کرتے تھے آپ جب عرب میں مبعوث ہوئے تو انہوں نے آپ کا انکار کیا اور کفر میں مبتلا ہو گئے تو حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے فرمایا اے یہود کے قبیلہ اللہ سے ڈرو اور اسلام لے آؤ۔

”فقد كنتم تستفتحون علينا بمحمد ونحن اهل الشرك وتخبرونا انه

مبعوث وتصفون لنا صفته“

تم تو ہم پر محمد (ﷺ) کے وسیلہ سے فتح طلب کرتے تھے اور ہم مشرک تھے تم ہمیں خبر دیتے تھے کہ وہ مبعوث ہونے والے ہیں تم ان کی صفات ہمارے سامنے بیان کرتے تھے۔

”فقال بعضهم ما جاءنا بشئ من البينات وما هو بالذي كنا نذكر

لكم فانزل الله تعالى هذه الآية“

ان میں سے کسی نے کہا یہ شخص ہمارے پاس کوئی واضح نشانیاں نہیں لایا۔ یہ وہ شخص نہیں جس کا ہم تمہارے سامنے ذکر کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیہ کریمہ کو نازل فرمایا۔

(از کبیر)

(۲) شان نزول کی دوسری وجہ یعنی ان دو واقعات کے بعد اس آیہ کا نزول ہوا یہ بھی خیال رہے کہ یہ دونوں قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے ہیں۔ اس آیہ کریمہ کے نازل ہونے کا سبب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ مروی ہے کہ ابن صوریابی کریم ﷺ کی خدمت میں آیا:

”وقال الرسول الله ﷺ ما جئنا بشئ نعرفه وما انزل عليك من آيات فتبعك“

اور آپ کو کہنے لگا تم ہمارے پاس کوئی نشانی نہیں لائے کہ ہم تمہیں پہچان لیں اور تم پر کوئی آیات نازل نہیں ہوئیں کہ ہم تمہیں تابعداری کریں۔ اس وقت اس آیہ کا نزول ہوا۔ (از روح المعانی)

﴿وَلَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ﴾

”ای انزلنا الیک یا محمد علامات واضحات دالات علی نبوتک“

نبی کریم ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے رب تعالیٰ نے فرمایا ”البتہ تحقیق ہم نے نازل کیں آپ کی طرف واضح نشانیاں جو آپ کی نبوت پر دلالت کرتی ہیں۔

وہ آیات کیا ہیں؟ وہ آیات یہ ہیں جن پر کتاب اللہ (قرآن پاک) مشتمل ہے یعنی یہود کے علوم کی مخفی باتیں، اور ان کی خبروں کے چھپے ہوئے راز، پہلے بنی اسرائیل (یعنی گزرے ہوئے) کی خبریں۔ اور ان کی کتابوں میں جو کچھ تھا ان کی خبریں قرآن پاک نے دیں حالانکہ تمام یہود بھی وہ نہیں جانتے تھے صرف ان کے علماء اور پادری جانتے تھے۔ بنی اسرائیل کے پہلے لوگوں نے جو تحریف کی قرآن پاک نے اس کا بھی بتایا۔ اور ان کے بعد میں آنے والوں نے جو تحریف کی اس کے متعلق بھی بتایا۔ پھر جو احکام انہوں نے بدلے رب تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ پر کتاب نازل کر کے انکو اطلاع دی۔

﴿فَكَانَ فِي ذَلِكَ مِنْ أَمْرِه الْآيَاتُ الْبَيِّنَاتُ لِمَنْ أَنْصَفَ مِنْ نَفْسِهِ﴾

اگر کوئی اپنے آپ پر انصاف کرتے ہوئے حق گوئی سے کام لے تو وہ یقیناً یہ کہے گا کہ اللہ تعالیٰ

(از صابونی)

نے نبی کریم ﷺ پر واضح آیات کو نازل فرمایا۔

آیات سے مراد قرآن پاک کی آیات ہوں کیونکہ ظاہر یہی ہے۔ لیکن اگر اس کے ساتھ باقی تمام دلائل بھی مراد ہو جائیں تو زیادہ بہتر ہے۔

”وقال بعضهم لا يمتنع ان يكون المراد من الآيات البينات القرآن مع سائر الدلائل نحو ام تناعهم من المباهلة ومن تمنى الموت وسائر المعجزات نحو اشباع الخلق الكثير من الطعام القليل ونوع الماء من بين اصابعه وانشقاق القمر“

بعض حضرات نے یہ بیان کیا ہے کہ اس میں کوئی وجہ امتناع کی نہیں کہ قرآن پاک کی آیات بینات کے ساتھ دوسرے تمام دلائل بھی مراد لئے جائیں۔ ان لوگوں کا مباہلہ کے لئے سامنے نہ آنا۔ اور موت کی تمنا نہ کرنا۔ اور تمام معجزات بھی ساتھ ہی مراد ہوں جس طرح کثیر مخلوق کو تھوڑے طعام سے سیر کر دینا۔ انگلیوں سے پانی کے چشمے جاری کر دینا اور چاند کے دو ٹکڑے کر دینا۔ (ازکیہ)

اگرچہ بعض حضرات نے صرف قرآن پاک کی آیات سے خاص کیا ہے ان کا کہنا ہے کہ انزال یا تنزیل کا تعلق آیات قرآنیہ سے ہی ہوتا ہے لیکن علامہ آلوسی رحمہ اللہ روح المعانی میں بیان فرماتے ہیں:

”(والآيات) القرآن والمعجزات والاخبار عما خفي واخفى في الكتب السابقة او الشرائع والفرائض او مجموع ما تقدم كله والظاهر الاطلاق“

آیات سے مراد قرآن پاک کی آیات اور معجزات اور مخفی چیزوں کی خبر دینا اور پہلی کتب میں جن چیزوں کو مخفی رکھا گیا ان کی خبر دینا۔ یا آیات سے مراد شرعی احکام اور فرائض یا مراد یہ تمام چیزیں ہوں جن کا ذکر کیا گیا۔ اسی آخری قول کو پسند کرتے ہوئے کہا گیا کہ ظاہر یہی ہے کہ مطلقاً عموم ذکر ہو۔ ابھی تک مفسرین کرام کے اقوال جو ذکر کئے گئے ان سے یہ واضح ہو رہا ہے کہ اگر کوئی یہ ایمان رکھتا ہو کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ پر آیات بینات کو نازل فرمایا تو اسے نبی کریم ﷺ کا علم غیب ماننا پڑے گا۔ کیونکہ مخفی چیزوں کی خبر علم غیب ہی تو ہے۔

آیات کی وجہ تسمیہ: آیات کو آیات کہنے کی کئی وجوہ ہیں۔ مقصد سب کا ایک ہی ہے کیونکہ

”آیہ“ اصل مطلب یہ ہے ”ان الآیۃ ہی الدالۃ“ بیشک آیہ کا معنی ہے دلالت کرنی والی۔

(۱) آیہ کو آیہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ قرآن پاک کی ہر آیہ اپنی فصاحت و بلاغت کے لحاظ پر صدق مدعی پر دلالت کرتی ہے۔ لہذا اس دلالت کے لحاظ پر آیہ کہہ دیا گیا۔

(۲) دوسری وجہ ”ان منها ما یدل علی الاخبار عن الغیوب فہی دالۃ علی تلک الغیوب“ بیشک بعض آیات غیبی خبریں دیتی ہیں۔ ان کا غیبی خبروں پر دلالت کرنے کی وجہ سے نام آیات رکھا لیا کیا خوب بات سمجھ میں آئی کی نبی کریم ﷺ پر جب قرآن کے نازل ہونے کو تسلیم کر لیا جائے اور یہ بھی مان لیا جائے کہ قرآنی آیات غیبی علوم، غیبی خبروں پر مشتمل ہیں لیکن یہ نہ مانا جائے کہ نبی کریم ﷺ کو علم غیب حاصل ہے کون سا انصاف ہے۔

(۳) چونکہ قرآن پاک کی آیات توحید، نبوت اور شرعی احکام پر دلالت کرتی ہیں اس لئے ان کو آیات کہا گیا ہے۔

اعتراض: جب آیہ کا معنی دلیل کر لیا گیا ہے تو آیات کے ساتھ ﴿بینات﴾ کے ذکر کا کیا فائدہ ہے؟ کیونکہ ”الدلیل لا یکون الا بینا“ دلیل تو ہوتی ہی وہ ہے جو بین ہو۔

جواب: دلیل سے علم حاصل کرنے کے طریقہ میں تفاوت پایا جاتا ہے کیونکہ بعض دلیلیں وہ ہوتی ہیں جن کے مقدمات زیادہ ہوتے ہیں ان کے ذریعے مطلب تک پہنچنا مشکل ہوتا ہے۔ اور بعض دلیلوں کے مقدمات تھوڑے ہوتے ہیں ان کے ذریعے مقاصد کا حاصل کرنا آسان ہوتا ہے ایسی دلیلوں کو بینات کہا گیا ہے۔

(از کبیر)

اعتراض: ”الانزال عبارة عن تحریک الشئی من الاعلی الی الاسفل و ذاک لا یتحقق الا فی الجسمی فہو علی هذا الکلام محال“

﴿انزل﴾ ”اتارنا“ کا مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کو بلند مقام سے پست مقام کی طرف حرکت دینا۔ یہ صرف جسموں میں متحقق ہے آیات جب اجسام نہیں تو آیات کے اتارنے کا کیا مطلب؟

جواب: ”ان جبریل لما نزل من الاعلی الی الاسفل واخبر به سمی ذلک انزالہ“

جبریل جب بلندی سے پستی کی طرف تشریف لاتے اور آیات نبی کریم ﷺ پر پیش کرتے تو

اس کو انزال کہہ دیا گیا۔

(از کبیر)

﴿وَمَا يَكْفُرُ بِهَا إِلَّا الْفٰسِقُونَ﴾ :

”اور نہیں کفر کرتے ان کے ساتھ مگر فاسق“۔

آیات سے کفر و طرح ہے۔ دونوں ہی یہاں مراد ہیں۔ ایک یہ ہے کہ آیات کے صحیح ہونے کا علم حاصل ہو پھر ان کا انکار کر دیا جائے۔ اور دوسرا یہ ہے کہ آیات سے جاہل رہنے اور ان میں غور و فکر نہ کرنے، تدبر نہ کرنے اور ان کے دلائل سے اعراض کرنے کی وجہ سے انکار پایا جائے۔ انکار کسی طرح بھی پایا جائے کفر ہے لہذا آیہ کریمہ میں حکم عام ہے جو دونوں قسموں کو شامل ہے۔

فسق کا لغوی معنی: ”الفسق فی اللغة خروج الانسان عما حدله“

انسان کا حد سے نکل جانا فسق ہے جیسا کہ رب تعالیٰ نے ابلیس کے متعلق فرمایا:

﴿ففسق عن امر ربہ﴾ اس نے اپنے رب کے حکم سے تجاوز کیا۔

اسی خروج کے معنی کا اعتبار کرتے ہوئے عرب کہتے ہیں ”فسقت النواة“ گٹھلی کھجور سے نکل گئی۔ فسق کے قریب فجور: اس لئے کہ فجور کا معنی ماخوذ ہے۔

”فجور السد الذی یمنع الماء“ یعنی وہ رکاوٹ اور بند جو پانی کو روکے اس کا کھل جانا، شگاف پڑ جانا ”فجور“ کہلاتا ہے۔ چونکہ پانی کے بند کے پھٹ جانے سے فساد پھیلتا ہے پانی ہر طرف تباہی پھیلا دیتا ہے۔ اسی معنی کو مد نظر رکھتے ہوئے اس انسان کو بھی فاجر کہہ لیا جاتا ہے جو حد سے تجاوز کر جائے۔ اس کے گناہ بھی چونکہ فساد کا ذریعہ بنتے ہیں۔

اعتراض: صغیرہ گناہ کے مرتکب کو فاجر نہیں کہا جاتا حالانکہ حد سے تجاوز وہ بھی کرتا ہے۔ اسے حد سے تجاوز کے باوجود فاجر نہ کہنے کی کیا وجہ ہے؟

جواب: جس طرح بند سے معمولی پانی کے نکلنے کو فجور نہیں کہتے، بلکہ جب زیادہ پانی نکلے، فساد پھیلائے اس وقت فجور کے لفظ کا استعمال ہوتا ہے اسی طرح جب گناہوں میں بھی زیادہ حد سے

تجاوز ہو جو فساد کا ذریعہ بنے اس وقت اس شخص کو فاجر کہا جائے گا۔

”و کذا لک الفسق انما یقال اذا عظم التعدی“

اسی طرح فسق کا استعمال بھی اس وقت ہوگا جب وہ زیادہ تجاوز کرے اور حد سے زیادہ بڑھ جائے۔

(از کبر)

﴿الفاسقون﴾ المتمردون فی الکفر الخارجون عن الحدود فان من

لیس علی تلک الصفات من الکفرة لا یجترئ علی الکفر بمثل

هاتیک البینات“

فاسقوں کا معنی ہے کفر میں سرکشی کرنے والے، حد سے تجاوز کرنے والے اس لئے کہ یہاں ان

لوگوں کا ذکر ہے جو واضح آیات کا انکار کرنے والے ہیں، یہ وہی ہو سکتے ہیں جو کفر میں حد سے بڑھے

ہوئے ہیں۔ کیونکہ ان کے بغیر کوئی جرات نہیں کر سکتا کہ آیات بینات کا انکار کرے۔

یعنی یہاں معنی تقریباً یہ ہو گیا ”وما یکفر بها الا الکافرون المتمردون“ آیات بینات

سے کفر نہیں کرتے سوائے سرکش کافروں کے۔

”قال الحسن اذا استعمل الفسق فی نوع من المعاصی وقع علی

اعظم افراد ذلک النوع من کفر او غیره“

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جب فسق کا استعمال کسی گناہ سے ہو تو اس

سے مراد عظیم گناہ ہوگا خواہ کفر ہو یا غیر کفر ہو۔

”فاذا قیل هو فاسق فی الشرب فمعناه هو اکثر ارتکابا له“

جب یہ کہا جائے کہ فلاں شراب کی وجہ سے فاسق ہے تو اس کا معنی ہوتا ہے وہ بہت زیادہ شراب

پیتا ہے اور جب کہا جائے ”هو فاسق فی الزنا یكون معناه هو اشد ارتکابا له“ کہ وہ زنا

کی وجہ سے فاسق ہے تو مطلب یہ ہوگا کہ وہ بہت زیادہ زنا کا مرتکب ہے۔

(از روح المعانی و کبر)

﴿ أَوْ كَلَّمَا عَاهِدُوا عَهْدًا نَّبَذَهُ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴾
(آیت ۱۰۰)

(۱) ”اور کیا جب کوئی عہد کرتے ہیں ان میں کا ایک فریق اسے پھینک دیتا ہے بلکہ ان میں بہتروں کو ایمان نہیں۔“

(۲) ”اور کیا جب کوئی عہد کیا انہوں نے پختہ عہد، توڑ دیا اسے ایک فریق نے ان سے بلکہ اکثر ان کے ایمان نہیں رکھتے۔“

یہاں سے یہودی اور قباحت اور کجروی کا ذکر کیا جا رہا ہے کہ ان کا طریقہ یہ ہے کہ وعدہ کر لیں اور توڑ دینا۔

شان نزول میں چند وجوہ: یعنی چند وجہ کے درپیش آنے کے بعد آیہ کریمہ کا نزول ہوا۔
(۱) مالک بن صفیہ یہودی نے جب یہ کہا:

”والله ما اخذ علينا عهد في كتابنا ان نؤمن بمحمد ﷺ ولا ميثاق“
قسم ہے اللہ تعالیٰ کی کہ رب تعالیٰ نے ہم سے کوئی ایسا وعدہ نہیں لیا جو ہماری کتاب میں ہو کہ ہم محمد ﷺ پر ایمان لائیں۔ (تو آیہ کریمہ نازل ہوئی)

(۲) ”وقيل في اليهود عاهدوا ان خرج لنؤمنن به ولنكونن معه على مشركي العرب فلما بعث كفروا به“

دوسری وجہ شان نزول کی یہ ہے کہ یہود نے وعدہ کیا کہ جب آخر الزمان بنی تشریف لائیں گے تو ہم ان پر ایمان لائیں گے اور ہم مشرکوں کے خلاف نبی کا ساتھ دیں گے۔ لیکن جب نبی کریم ﷺ تشریف لائے تو انہوں نے وعدہ کو توڑ دیا اور کفر کیا۔

(۳) تیسری وجہ شان نزول کی یہ ہے:

”وقال عطاء في اليهود عاهدوا رسول الله ﷺ بعهد ففوضوها كفعل قريظة والنضير“

کہ عطاء لے کہا یہود کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی۔ جب کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے وعدہ کیا کہ وہ آپ کے خلاف مشرکین کا ساتھ نہیں دیں گے لیکن پھر جنگ احزاب (خندق کے موقع پر) میں بنی قریظہ اور بنی نضیر نے مکہ کے مشرکوں کا ساتھ دیا۔ بلکہ مشرکین کو جنگ کے لئے آمادہ کرنے والے ہی یہود تھے۔

(۴) اللہ تعالیٰ نے جب وہ دلائل ظاہر فرمائے جو رسول اللہ ﷺ کی نبوت پر دلالت کرنے والے تھے اور آپ کی شریعت کے صحیح ہونے پر دلالت کرتے تھے۔

”کان ذلک کالعہد منہ سبحانہ وقبولہم لتلک الدلائل کالمعاہدہ منہم للہ سبحانہ وتعالیٰ“

اور ان دلائل کو قبول کرنا ان کی طرف سے رب تعالیٰ سے وعدہ کرنا تھا اور پھر ان سے روگردانی کرنا وعدہ کو توڑنا تھا۔

(۵) ”انہم کانوا یعاہدون اللہ کثیرا وینقضونہ“ یہود کے وعدہ کو توڑنے کا ذکر عام ہے وہ اکثر اوقات اللہ تعالیٰ سے وعدہ کرتے تھے اور پھر اسے توڑ دیتے تھے۔

﴿أَوْ كَلَّمَا عٰہِدُوْا عٰہِدًا﴾ ہمزہ استفہام انکاری کے لئے ہے یعنی مفہوم یہ ہوگا اور کیا جب انہوں نے وعدہ کیا توڑ دیا ایک فریق نے ان میں سے، حالانکہ ان کو یہ وعدہ نہیں توڑنا چاہئے تھا۔ اور ساتھ ساتھ ہی ہمزہ سے یہ سمجھا دیا گیا ”واعظام ما یقدمون علیہ“ کہ وہ جو کام کرتے تھے ان کے بڑے جرائم تھے۔

﴿عٰہِدًا﴾ مصدر ہے مفعول مطلق تاکید کے لئے استعمال ہے جب بھی انہوں نے وعدہ کیا وعدہ کرنا، اس تاکید والے معنی سے پختگی سمجھ میں آتی ہے راقم نے اپنے ترجمہ میں ”پختہ عہد“ ذکر کیا۔
﴿أَوْ كَلَّمَا عٰہِدُوْا﴾ علی عہد بعد عہد نقضوہ ونبذوہ

یہاں ﴿كَلَّمَا﴾ سے واضح ہوا کہ انہوں نے کئی مرتبہ عہد کیا اور کئی مرتبہ توڑا اور پھینکا (پست پشت ڈالا) اسی سے یہ سمجھ آ گیا کہ بار بار وعدہ کرنا اور توڑنا ان کی عادت بن چکا تھا۔ ضمنا اس میں نبی کریم ﷺ کو تسلی بھی دی گئی کہ آپ دل تنگ نہ ہونا کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی آیت سے کفر کرتے ہیں۔

یہ کوئی نئی بات نہیں ”بل هو سجتہم وعاداتہم وعادۃ سلفہم“ بلکہ ہمیشہ وعدہ کو توڑنا، قبیح اقوال و افعال نے ان کو گھیرے میں لے رکھا ہے اور ان کی یہ عادت بن چکی ہے اور ان سے پہلے گزرے ہوئے ان کے آباء و اجداد کی بھی یہی عادت تھی۔
(از کبیر)

﴿نَبَذَهُ فَرِیقٌ مِّنْهُمْ﴾ : ”ای نقصہ فریق منہم“ منصوب ضمیر عہد کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور ”نبد“ کا مرادی معنی ”توڑنا“ ہے یعنی ایک فریق نے ان میں سے وعدہ کو توڑ دیا یا رقم نے یہی ترجمہ کیا ہے۔ (توڑ دیا اسے ایک فریق نے ان سے)۔

وقال ابن جریر ”اصل النبد الطرح واللقاء“ ابن جریر نے بیان کیا ہے کہ ”نبد“ کا حقیقی معنی پھینکنا اور ڈال دینا اسی وجہ سے پھینکے ہوئے بچے کو لپیٹ بھی کہا جاتا ہے اور منبوذ بھی۔ اسی طرح تمر (خشک کھجور) اور زبیب (کشمش) کو جب پانی میں ڈالا جائے تو اسے نبذ کہا جاتا ہے۔

(از صابونی)

اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی حقیقی معنی کے مطابق ہے (ان میں کا ایک فریق اسے پھینک دیتا ہے) تفسیر کبیر میں ہے ”نقضوه ونبذوه“ انہوں نے توڑ دیا اور پھینک دیا۔ حضرت پیر محمد کرم شاہ رحمہ اللہ نے اسی کے مطابق ترجمہ کیا ”توڑ پھینکا“۔

﴿بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ﴾ : اس کے دو مقصد ہیں ایک یہ کہ ان فاسقوں میں سے اکثر آپ کی تصدیق نہیں کریں گے کبھی بھی، کیونکہ ان کو آپ سے حسد اور عناد ہے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی کتابوں کی تصدیق نہیں کرتے بلکہ وہ منافقوں کی طرح ہیں، لوگوں کے سامنے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ہمارا اپنی کتابوں اور نبیوں سے ایمان ہے۔ لیکن نبی کریم ﷺ پر ایمان نہ لاکر وہ اس بات کا ثبوت پیش کرتے ہیں کہ ان کا ایمان اپنی کتب اور انبیاء سے نہیں۔

(از کبیر)



﴿وَلَمَّا جَاءَهُمْ رَسُولٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ
نَبَذَ فَرِيقٌ مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ كِتَابَ اللَّهِ وَرَاءَ
ظُهُورِهِمْ كَانَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ﴾ (آیت ۱۰۱)

(۱) ”اور جب ان کے پاس تشریف لایا اللہ کے یہاں سے ایک رسول ان کی کتابوں کی تصدیق فرماتا ہے تو کتاب والوں سے ایک گروہ نے اللہ کی کتاب اپنے پیٹھے پیچھے پھینک دی گویا وہ کچھ علم ہی نہیں رکھتے۔“

(۲) ”اور جب تشریف لایا ان کے پاس رسول اللہ کی طرف سے تصدیق کرنے والا اس چیز کی جو ان کے پاس ہے پھینک دیا ایک فریق نے ان لوگوں سے جن کو کتاب دی گئی، اللہ کی کتاب کو پیچھے اپنی پیٹھوں کے گویا کہ وہ نہیں جانتے۔“

اس آیت کریمہ میں بھی یہود کی قباحت کجروی کا ذکر ہے کہ ان کے پاس جب بھی کوئی رسول تشریف لائے جو ان کی کتاب، ان کے نبی اور ان کے دین کی تصدیق کرنے والے، حق تو یہ تھا کہ یہ لوگ نبی پر ایمان لائے نبی کی صداقت کو اپنی کتاب سے ہی سمجھتے لیکن انہوں نے علم رکھنے کے باوجود جاہلانہ طریقہ سے اللہ کی کتب سے ہی اعراض کرلیا۔

﴿وَلَمَّا جَاءَهُمْ رَسُولٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ﴾ : یہاں رسول سے مراد کون سے رسول ہیں؟ تفسیر خازن اور مدارک ان مذکورہ الفاظ مبارکہ کی تفسیر کی گئی ”یعنی محمد ﷺ“ سے کہ یہاں رسول سے مراد نبی کریم حضرت محمد ﷺ ہیں۔

اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی کے مطابق ہے ”جب ان کے پاس تشریف لایا اللہ کے یہاں سے ایک رسول“ ”ایک رسول“ ذکر فرما کر اعلیٰ حضرت نے تخصیص کی طرف اشارہ کر دیا۔ لیکن بیضاوی اور مظہری نے تعمیم کو پسند کیا: ﴿وَلَمَّا جَاءَهُمْ رَسُولٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ﴾ کہ عیسیٰ و محمد علیہا السلام جب ان کے پاس تشریف لایا رسول، یعنی یہاں رسول سے مراد عیسیٰ علیہ السلام

راقم نے اسی قول کے مطابق ترجمہ کیا ہے ”ایک رسول“ ترجمہ نہیں کیا بلکہ ”رسول“ ذکر کیا جو عموم پر دلالت کر رہا ہے۔

﴿مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ﴾: ”(وہ رسول) تصدیق کرنے والے اس چیز کی جو ان کے پاس تھی۔“ یعنی ان کے اعتقاد کی تصدیق رسول نے کی وہ اعتقاد جو ان کا موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے متعلق تھا اور اسی طرح توراۃ کی صحت کی تصدیق کی۔

”فان كل واحد من عيسى ومحمد عليهما الصلوة والسلام كان معترفا بذلك ومصداق له وان كل واحد منهما كان مصدقا معهم من الكتاب في وجوب التوحيد والايمان واصول الشرائع“

بیشک ہر ایک رسول یعنی عیسیٰ علیہ السلام اور نبی کریم ﷺ اعتراف کرتے کہ موسیٰ علیہ السلام سچے نبی ہیں، توراۃ سچی کتاب ہے اور اس کی تصدیق بھی فرماتے تھے۔ اور دونوں رسولوں میں سے ہر ایک نے ان کی کتاب میں جو توحید، ایمان اور اصول شرائع مذکور تھے ان کی تصدیق فرمائی۔

اور یہ بھی خیال رہے کہ نبی کریم ﷺ کا فقط تشریف لانا ہی توراۃ کی تصدیق تھی کیونکہ توراۃ میں نبی کریم ﷺ کے تشریف لانے کی بشارت دی گئی اور آپ کے اوصاف بیان کئے گئے۔ ان اوصاف کے مطابق ہی جب آپ تشریف لائے تو توراۃ کی تصدیق ہو گئی۔

(از شیخ زادہ)

عیسیٰ علیہ السلام نے جب نبی کریم ﷺ کے تشریف لانے کی بشارت دی اور توراۃ میں بھی بشارت دی گئی تھی تو یقیناً حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی توراۃ کی تصدیق کر دی۔

﴿نَبَذَ فَرِيقٌ مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ كِتَابَ اللَّهِ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ﴾:

”یعنی اہل کتاب میں سے ایک فریق نے اللہ کی کتاب کو اپنی پیٹھوں کے پیچھے پھینک دیا۔“

﴿وراء ظهورهم﴾ مثل لا عرضهم عنه رأسا بالاعراض عما یرمی بہ

وراء الظهر لعدم الالتفات الیه

پیٹھوں کے پیچھے کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے اللہ کی کتاب سے اس طرح مکمل طور پر اعراض کر لیا، جس طرح کسی چیز کو پیٹھ کے پیچھے پھینک دیا جائے اور اس کی طرف توجہ نہ کی جائے۔

﴿کتاب اللہ﴾ سے مراد کون سی کتاب ہے جس سے انہوں نے اعراض کیا؟ اس کے متعلق بعض حضرات نے بیان کیا ”ما مع الرسول ﷺ وهو القرآن“ کہ (کتاب اللہ) سے مراد وہ کتاب ہے جو رسول اللہ ﷺ کے پاس تھی یعنی قرآن پاک۔ مطلب یہ ہوا کہ انہوں نے قرآن پاک سے مکمل اعراض کیا۔ تاہم (کتاب اللہ) سے مراد ”توراة“ لینے کو علامہ رازی رحمہ نے راجح قرار دیا۔ اس پر مندرجہ ذیل دلائل پیش کئے گئے ہیں۔

(۱) ”ان النبذ لا یعقل الا فیما تمسکوا به اولا واما اذا لم یلتفتوا الیه لا یقال انهم نبذوه“

رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿نبذوه﴾ انہوں نے پھینک دیا۔ یہ اس وقت ہو سکتا ہے جب پہلے ایک چیز کو حاصل کیا جائے پکڑا جائے، پھر پھینک دیا جائے توراة میں تو یہ ممکن ہے کیونکہ وہ نبی کریم ﷺ کہ آمد سے پہلے آپ کی اوصاف بھی بیان کرتے رہے۔ آپ کے وسیلہ سے جنگوں میں فتح بھی حاصل کرتے رہے لیکن آپ کے تشریف لانے کے بعد انہوں نے توراة کے ان مسائل سے اعراض کر دیا۔ لیکن قرآن پاک پر نہ انہوں نے عمل کیا اور نہ ہی ﴿نبذ﴾ ”پھینکنے“ کا معنی پایا جاسکتا ہے۔

(۲) دوسری دلیل یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے ذکر فرمایا:

﴿نَبَذَ فَرِیقٌ مِّنَ الَّذِیْنَ اُوتُوا الْكِتَابَ﴾ ”اہل کتاب سے ایک فریق نے پھینک دیا“

”ولو كان المراد به القرآن لم یكن لتخصیص الفریق معنى لان

جميعهم لا یصدقون بالقرآن“

اگر یہ مراد ہوتا کہ اہل کتاب نے قرآن پاک کو پس پشت ڈال دیا تو ایک فریق کا ذکر نہ کیا جاتا، کیونکہ قرآن پاک کی تصدیق تو تمام نے ہی نہیں کی۔

(۳) ”وان المعرفة اذا اعيدت معرفة كان الثانی عین الاول“

قانون یہ ہے کہ معرفہ کو جب معرفہ کر کے لوٹایا جائے تو ثانی عین اول ہوتا ہے جب پہلے

﴿اُوتُوا الْكِتَابَ﴾ میں الکتاب معرفہ ہے جس سے مراد توراة ہے تو ثانی ﴿كِتَابَ اللّٰهِ﴾ جو معرفہ

ہے اس سے مراد بھی توراة ہی ہوگی۔

(۴) ”وان مذمتهم فی انهم نبذوا الكتاب الذی اوتوه واعترفوا بحقیقته اشد“

ان کی شدید مذمت ہی اس لئے کی گئی کہ انہوں نے اسی کتاب کو پس پشت ڈال دیا جو ان کو عطا کی گئی اور انہوں نے اس کے حق ہونے کا بہت زیادہ اعتراف کیا تھا۔ ان کا اس کے بعد انکار کرنا مکابرہ اور عناد تھا۔ اس سے بھی پتہ چلا کہ ﴿کَتَبَ اللّٰهُ﴾ سے مراد توراۃ ہی ہے۔

(۵) ”لما روى عن السدى قال لما جاءهم محمد صلى الله تعالى عارضوه بالتوراة فاتفقت التوراة والفرقان فنبذوا التوراة واخذوا الكتاب آصف وسحر هاروت وماروت فلم توافق القرآن“

سدی سے مروی ہے جب نبی کریم تشریف لائے اور قرآن پاک پیش فرمایا تو انہوں نے قرآن پاک کو توراۃ سے مطابقت دی تو انہوں نے توراۃ کو قرآن پاک کے موافق پایا۔ تو انہوں نے توراۃ کو پس پشت ڈال دیا اور انہوں نے آصف کی کتاب پر عمل شروع کر دیا اور ہاروت اور ماروت کے جادو پر عمل شروع کیا کیونکہ ان کو انہوں نے آصف کی کتاب پر عمل شروع کر دیا اور ہاروت اور ماروت کے جادو پر عمل شروع کیا کیونکہ ان کو انہوں نے قرآن کے موافق نہیں پایا۔ (ماخوذ از کبیر و روح المعانی) ان تمام دلائل سے یہ پتہ چلا کہ ﴿کَتَبَ اللّٰهُ﴾ سے مراد توراۃ ہی ہے۔

راقم کا موقف یہ ہے کہ تعلیم ہی بہتر ہے جو تمام اقوال کو شامل ہے کہ انہوں نے توراۃ سے بھی اعراض کیا اور قرآن پاک سے بھی اعراض کیا کیونکہ ﴿نَبَذَ﴾ کا جب مجازی معنی اعراض کرنا لے لیا تو اب یہ ضرورت نہیں کہ یہ کہا جائے کہ ﴿نَبَذَ﴾ کا معنی ہے حاصل کر کے پھینکنا۔ جہاں تک معتبر دلیل معرفہ والی ہے اس کے متعلق بھی نور الانوار پڑھے ہوئے طلباء جانتے ہیں کہ کبھی کبھی اس کے خلاف بھی واقع ہو جاتا ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

﴿كَانَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ﴾ : ”گویا کہ وہ نہیں جانتے“

”انہ کتاب اللہ یعنی ان علمہم بہ رصین یقین ولكن يتجاهلون عنادا“
یعنی ان کو یقین تھا کہ توراۃ اللہ کی کتاب ہے قرآن پاک اللہ کی کتاب ہے لیکن وہ عناد کی وجہ سے جاہل بنے رہے ایسے جیسا کہ وہ جانتے ہی نہیں کہ یہ اللہ کی کتاب ہے۔

(از بیضاوی)

فائدہ : ابھی جن دو آیات کا ذکر ہوا ہے ان سے یہ واضح ہوا کہ یہود کے بڑے بڑے چار فرقے تھے:

ایک فرقہ وہ جنہوں نے توراۃ پر ایمان لایا اس کے حقوق کا پاس کیا۔ توراۃ کے حکم کے مطابق ہی انہوں نے نبی کریم ﷺ پر ایمان لایا اور قرآن پاک کو اللہ تعالیٰ کا سچا کلام تسلیم کیا۔ یہ ﴿بل اکثرہم لا یؤمنون﴾ سے سمجھ آیا۔ کہ ان سے اکثر نے ایمان قبول نہیں کیا تو پتہ چلا کہ بعض نے ایمان قبول کیا یہ ایمان لانے والے والے حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی تھے۔

دوسرا فرقہ وہ تھا جنہوں نے ظاہر اُتو احکام توراۃ کو نہیں توڑا لیکن جہالت کی وجہ سے ایمان بھی قبول نہیں کیا کیونکہ یہ لوگ خود تو جانتے نہیں تھے جیسا ان کو علماء نے کہہ دیا وہ تسلیم کر لیا چونکہ یہود کے علماء تو بنی کریم ﷺ کے اوصاف چھپاتے تھے اس لئے جاہل لوگ کثیر تعداد میں ایمان قبول نہ کر سکے۔ اس فرقہ کا بھی رب تعالیٰ کے ان الفاظ مبارکہ ﴿بل اکثرہم لا یؤمنون﴾ سے ہی علم حاصل ہوا۔

تیسرا فرقہ وہ تھا جنہوں نے علم رکھنے کے باوجود ظاہر اللہ تعالیٰ کے وعدوں کو توڑا، حدود سے تجاوز کیا سرکشی اور فسق کی وجہ سے ”وہم المغیون بقولہ نبذہ فریق منہم“ یہ وہ لوگ ہیں جن کو حدود سے تجاوز کرنے کی وجہ سے ”مغیون“ کہا جاتا ہے اس فرقہ کا رب تعالیٰ کے اس ارشاد سے پتہ چلا ﴿نبذ فریق منہم﴾۔

چوتھا فرقہ وہ تھا جو ظاہری طور پر توراۃ پر عمل کر رہے تھے لیکن مخفی طور پر توراۃ کے احکام کو پس پشت ڈال دیا یہ لوگ عالم تھے لیکن سرکشی اور عناد کی وجہ سے جاہل بن بیٹھے۔ اس فرقہ کا رب تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی ﴿کَانَتْهُمْ لَا یَعْلَمُونَ﴾ سے پتہ چلا۔

(ماخوذ از بیضاوی)

﴿وَاتَّبِعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيَاطِينُ عَلَىٰ مُلْكٍ سُلَيْمَانَ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ وَلَٰكِنَّ الشَّيَاطِينُ كَفَرُوا يُعَلِّمُونَ النَّاسَ السِّحْرَ وَمَا أُنْزِلَ عَلَى الْمَلَائِكِينَ بِبَابِلَ هَارُوتَ وَمَارُوتَ وَمَا يُعَلِّمُونَ مِنْ أَحَدٍ حَتَّى يَقُولَا إِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ﴾ [☆] فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ وَمَا هُمْ بِضَارِّينَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَلَقَدْ عَلِمُوا لَمَنِ اشْتَرَاهُ مَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَقٍ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهِ أَنْفُسَهُمْ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿١٠٢﴾

(آیت ۱۰۲)

(۱) ”اور اس کے پیرو ہوئے جو شیطان پڑھا کرتے تھے سلطنت سلیمان کے زمانہ میں۔ اور سلیمان نے کفر نہیں کیا ہاں شیطان کافر ہوئے لوگوں کو جادو سکھاتے ہیں۔ اور وہ جادو جو بابل میں دو فرشتوں ہاروت و ماروت پر اترا اور وہ دونوں کسی کو کچھ نہ سکھاتے جب تک یہ نہ کہہ لیتے کہ ہم تو نری آزمائشیں ہیں۔ تو اپنا ایمان نہ رکھو۔ تو ان سے سیکھتے وہ جس سے جدائی ڈالیں مرد اور اس کی عورت میں اور اس سے ضرر نہیں پہنچا سکتے کسی کو مگر خدا کے حکم سے اور وہ سیکھتے ہیں جو انہیں نقصان دے گا اور نفع نہ دے گا اور بیشک ضرر انہیں معلوم ہے کہ جس نے یہ سودا لیا آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں اور بیشک کیا بری چیز ہے وہ جس کے بدلے انہوں نے اپنی جانیں بچیں کسی طرح انہیں علم ہوتا۔“

(۲) ”اور انہوں نے تابعداری کی جو پڑھتے تھے شیطان سلیمان کی سلطنت کے زمانہ میں اور انہیں کفر کیا سلیمان نے اور لیکن شیطانوں نے کفر کیا، سکھاتے لوگوں کو جادو۔ اور جو الہام کیا گیا دو فرشتوں پر

بابل میں یعنی ہاروت اور ماروت پر۔ اور وہ دونوں نہیں سکھاتے تھے کسی ایک کو یہاں تک کہ وہ کہتے ہم تو صرف آزمائش ہیں۔ تو تم کفر نہ کرو۔ تو وہ سیکھتے تھے ان دونوں سے، وہ کہ تفریق ڈالتے جس کے ذریعے مرد اور اس کی زوجہ کے درمیان۔ اور وہ نہیں ضرر پہنچا سکتے اس کے ذریعے کسی ایک کو سوائے اللہ تعالیٰ کے ارادہ کے اور وہ سیکھتے جو نقصان دیتا ان کو اور نفع نہیں دیتا ان کو اور تحقیق جان لیا انہوں نے جس نے حاصل کیا یہ نہیں اس کا آخرت میں کوئی حصہ اور برا ہے جس کے بدلے انہوں نے اپنی جانوں کا سودا کیا کسی طرح وہ جان لیتے۔“

یہاں سے یہود کے اور قبیح افعال کا ذکر کیا جا رہا ہے کہ وہ جادوگری میں مشغول رہتے۔ خود بھی جادو کرتے اور جادو سیکھتے اور دوسروں کو بھی جادوگری کی طرف بلاتے۔

شان نزول: یہود حضرت سلیمان علیہ السلام کو نبی نہیں تسلیم کرتے تھے۔ بلکہ ان کو جادوگر اور بادشاہ مانتے تھے وہ کہتے تھے کہ ہو پر سوار ہوا کر سفر کرنے والا جادوگر ہی ہو سکتا ہے۔ نبی نہیں ہو سکتا نبی کریم ﷺ نے جب حضرت سلیمان علیہ السلام کی نبوت کا ذکر فرمایا تو یہود نے جو کہا اسے شہر بن حوشب بیان فرماتے ہیں:

”قال اليهود انظروا الى محمد يخلط الحق بالباطل يذكر سليمان مع

الانبياء وانما كان ساحرا يركب الريح“

یہود نے کہا محمد کو دیکھو وہ حق کو باطل سے ملا رہا ہے۔ سلیمان کو انبیاء کے ساتھ ذکر کر رہا

ہے حالانکہ سلیمان تو جادوگر تھا کیونکہ وہ ہو پر سوار ہوتا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی مذمت میں اس آیت کریمہ کو نازل کیا اور ضمناً یہ بیان کر دیا کہ سحر کفر ہے۔

کیونکہ جب یہ فرمایا:

﴿وَلَكِنَّ الشَّيَاطِينَ كَفَرُوا يُعَلِّمُونَ النَّاسَ السِّحْرَ﴾

”لیکن شیطانوں نے کفر کیا جو لوگوں کو جادو سکھاتے۔“

تو اسی سے اشارہ فرما دیا کہ جادو کفر ہے۔

سحر کا لغوی معنی: ”واصل السحر صرف الشئ عن حقیقته الى غیره فكان الساحر لما

اری الباطل فی صورة الحق وخیل الشئ علی غیر حقیقته فقد سحرا لشی عن

(تاج العروس)

وجهه ای صرفه“

سحر کا حقیقت میں معنی یہ ہے کہ ایک چیز کی حقیقت کو بدل دینا۔ گویا کہ جادو کر جب باطل چیز کو حق کی صورت میں دکھاتا ہے۔ اور وہ چیز اپنی حقیقت کے علاوہ دوسری حقیقت میں نظر آتی ہے۔ تو یہی سمجھ آتا ہے کہ اس نے ایک چیز کو اس کی حقیقت سے بدل دیا ہے۔

سحر کا اصطلاح شرع میں معنی: ”السحر يستعمل بما لطف وخفی سببه ويستعان فی تحصيله بالتقرب الی الشیطان بارتکاب القبائح“

سحر کا استعمال وہاں ہوتا ہے جہاں اس کے اسباب مخفی ہوں اور اس کے حاصل کرنے میں شیطان کا تقرب حاصل کیا جائے اور قبیح کاموں کا ارتکاب کیا جائے۔
پھر اس کی تین قسمیں ہیں: قولی، عملی اور اعتقادی۔

سحر قولی: ”کالرقی التی فیہا الفاظ الشرک ومدح الشیطان وتسخیرہ“

ایسے منتر جنتر سے جادو کیا جائے جس میں شرک والے الفاظ ہوں اور شیطان کی مدح پائی جائے اور شیطان کو مسخر کر کے اپنا مددگار بنایا جائے۔

سحر عملی: ”کعبادة الکواکب والتزام الجنایة وسائر الفسوق“

جیسا کہ ستاروں کی عبادت کرنا، اور جنایت کو لازم پکڑنا، اور ہر قسم کے کبائر گناہوں کا ارتکاب کرنا اور ان کے ذریعے شیطان سے امداد طلب کرنا۔

سحر اعتقادی: ”کاستحسان ما یوجب التقرب الیہ ومحبتہ ایاہ وذلك لا یستتب الا بمن یناسبہ فی الشرارة وخبث النفس فان التناسب شرط التضام والتعاون“

شیطان کے قریب جو چیز کرے اسے اچھا سمجھنا، شیطان سے محبت کرنا یہ اس وقت تک ٹھیک حاصل نہیں ہوگا جب تک شرارت میں اس کے مناسب نہ ہو اور اس جیسی خباثت نہ پائی جائے۔ کیونکہ ایک دوسرے سے ملنے اور تعاون کے لئے مناسبت ضروری ہے۔

یعنی شیطان سے امداد طلب کرنا اور اعتقاد رکھنا کہ یہ امداد کرے گا جس سے سحر حاصل ہو جائے گا

یہ اسی وقت ہوگا جب جادو کرنے والا بھی شیطان کی طرح شریر اور خبیث النفس ہوگا۔ (از روح المعانی)
فائدہ : جواہر مکلفہ کی دو قسمیں ہیں ایک قسم جسمانی محسوس، دوسری قسم روحانی معقول پھر ہر ایک کی تین تین قسمیں ہیں۔ خیر اور شر اور خیر و شر کے درمیان ہونا۔

”فالخییر من الروحانی الارواح المقدسة وهی الملائكة“

روحانی خیر ارواح مقدسہ ہیں اور یہ ملائکہ ہیں۔

”والشریر شیاطین الدجن“ اور روحانی شر ارواح خبیثہ یہ شیاطین جن ہیں۔

”والمتموسط مؤمنوا الدجن“ اور متوسط مؤمن جن ہیں جن کا ذکر سورہ جن میں ہے۔

ملائکہ صرف بہتر لوگوں سے ملتے ہیں اور ان سے تعاون کرتے ہیں کیونکہ نیک لوگ اپنے اقوال افعال کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے میں اور عبادت میں ہمیشگی کرنے کی وجہ سے ملائکہ کے مشابہ ہیں۔

اسی طرح شیاطین صرف شریر لوگوں سے ملتے ہیں اور ان سے تعاون کرتے ہیں یعنی مشرک، خبیث، شیطان کی عبادت کرنے والے اور رب تعالیٰ سے عناد رکھنے والے شیطان کے مشابہ ہوتے ہیں اس لئے شیطان ان کی امداد کرتا ہے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿هل اوفى بکم علی س تنزل الشیاطین تنزل علی کل افاک اثیم﴾
 ”کیا میں تمہیں خبر دوں کس پر اترتے ہیں شیطان، اترتے ہیں ہر بڑے بہتان والے گنہگار پر“

اور ارشاد فرمایا:

﴿ومن یعش عن ذکر الرحمن نقیض له شیطانا فهو له قرین﴾

”اور جو اعراض کرے رب تعالیٰ کے ذکر سے ہم اس پر شیطان کو مسلط کر دیتے ہیں تو وہ اس کا ساتھی ہوتا ہے۔“

(ماخوذ از شیخ زادہ)

سحر اور معجزہ اور کرامت میں فرق:

جادو میں بھی رب تعالیٰ نے بندوں کی آزمائش کے لئے اثرات رکھ دیئے ہیں بظاہر یہ ہی سمجھ

آتا ہے کہ یہ کام خرق عادت ہے لیکن جب جادو کی تعریف کے بعد یہ بیان کیا گیا ہے:

”ذلک لا یتستب الا لمن یناسبہ فی الشرارة وخبث النفس فان

التناسب شرط فی التضام والتعاون“

سحر (جادو) اس وقت تک نہیں پایا جاسکتا جب تک وہ اپنے مناسب سے امداد طلب نہ کرے اور وہ اس کا مناسب شرارت اور خباثت نفس میں ہو مناسب شرط ہے ان کے آپس میں ملنے اور تعاون کے لئے۔

”وبهذا تمیز الساحر عن النبی والولی“ اسی سے واضح ہو گیا کہ ساحر (جادوگر) نبی اور ولی سے دور ہے نبی کا معجزہ خرق عادت کام ہوتا ہے۔ معجزہ میں دعوت نبوت ضروری ہے نبی کا معجزہ اس کے دعویٰ کے مطابق ہوتا ہے۔ جیسا کہ ایک اعرابی نے نبی کریم ﷺ کو کہا کہ آپ مجھے کوئی ”نشانی“ (معجزہ) دکھائیں میں اسے دیکھ کر یقین کر لوں کہ آپ اللہ کے نبی ہیں تاکہ میں ایمان لاؤں تو آپ نے فرمایا جاؤ اس درخت کو کہو تمہیں اللہ کا نبی بلارہا ہے۔

جب اس اعرابی نے درخت کو نبی کریم ﷺ کا پیغام پہنچایا تو اس نے ادھر ادھر جھک کر اپنی جڑوں کو زمین سے اکھیڑا اور نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر سلام عرض کیا پھر آپ کے حکم سے اپنی جگہ واپس چلا گیا۔

جھوٹا مدعی نبوت اپنے دعویٰ کے مطابق کوئی کام خرق عادت نہیں کر سکتا جیسا کہ مسلمہ کذاب کو لوگوں نے کہا کہ محمد مصطفیٰ ﷺ تو معجزات دکھاتے ہیں تم بھی کوئی معجزہ دکھاؤ تو اس نے کہا کہ ایک آنکھ جس کی ضائع ہو اسے میرے پاس لایا جائے کہ میں اس کی ضائع آنکھ پر ہاتھ پھیر کر اسے درست کر دوں۔ ایک آنکھ والے شخص کو لایا گیا مسلمہ نے اس کی آنکھ پر ہاتھ پھیرا تو رب تعالیٰ نے اس کی دوسری آنکھ کو بھی ضائع کر دیا۔

اور ولی کی کرامت بھی خرق عادت کام کا نام ہی ہے لیکن اس میں دعویٰ نبوت نہیں ہوتا۔ اور کرامت دکھانے کا دعویٰ اور چیلنج بھی نہیں پایا جاتا۔ اب کافی حد تک جادو اور معجزہ اور کرامت میں فرق تو واضح ہو گیا۔ لیکن زیادہ وضاحت کے لئے شیخ زادہ کی مندرجہ ذیل عبارت کو دیکھئے:

”ان السحر لا یثبت الا من کل مشرک خبیث فی نفسه شریر فی طبعه متدنس فی بدنه فلذلک قیل اکثر من یمثل السحرهم الیہود وعبدة الاصنام و حیض النساء وانهم لا یعلمونه الا فی الامکنة القذرة علی الهیات القبیحة وان سحرهم متی قوبل بالاستعاذة باللہ تعالیٰ وبذکرہ بطل سلطانه“

جادو صرف مشرک، خبیث النفس اور شریر طبیعت والے اور جسمانی طور پر گندے شخص سے ہی ہو سکتا ہے اکثر طور پر جادوگر یہود اور بت پرست ہوتے ہیں اور حیض والی عورتیں جادو کرتی ہیں جادو کرنے والے ناپاک جگہ میں اور قبیح حالت میں (نگے ہو کر) جادو کرتے ہیں یعنی ان کے جادو کے اثر انداز ہونے کے لئے خباثت، ناپاکی اور رب سے دور ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اسی لئے وہ اپنے جادو میں اگر ”اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم“ پڑھ لیں۔ اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کسی طرح بھی کر لیں تو ان کا جادو بے اثر ہو کر رہ جاتا ہے۔

”واما ما کان من الانبیاء والاولیاء فلا یكون الامن یؤمن مخلص فی ایمانه مقدس فی نفسه نیر فی طبعه طاهر فی بدنه ویزداد ما کان منهم باز دیاد تقر بهم الی اللہ تعالیٰ“

انبیاء کرام اور اولیاء کرام اپنے ایمان میں کامل اور مخلص ہوتے ہیں ان کے نفوس پاکیزہ ہوتے ہیں ان کی طبیعتوں میں خیر اور بھلائی ہوتی ہے ان کے بدن پاکیزہ ہوتے ہیں ان کو اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔

ان پاک ہستیوں کے خرق عادت کام معجزات ہوں گے جب انبیاء کرام سے ثابت ہوں۔ اور اولیاء کرام کے خرق عادت کام کرامات ہوں گی۔ اولیاء عظام کو جتنا اللہ تعالیٰ سے تقرب زیادہ ہوتا چلا جائے گا اتنی ہی ان کی کرامات میں زیادتی ہوتی چلی جائے گی۔ (ماخوذ از شیخ زادہ بزیدادہ)

سحر کے اثرات: معتزلہ سحر کے اثرات یعنی حقائق کے بدلنے کو تسلیم نہیں کرتے ان کے نزدیک صرف ملمع سازی اور ظاہری بناوٹ ہوتی ہے۔

”وجوز اهل السنة ان یقدر الساحر علی ان یطیر فی الهواء ویقلب الحمار انسانا والانسان حمارا الا انهم قالوا ان اللہ تعالیٰ هو الخالق

لهذه الأشياء عند ما يقرأ الساحر في خصوصها كلمات معينة فاما ان يكون المؤثر فيها هو الفلك والنجوم فلا

اہل سنت وجماعت کے نزدیک ساحر کو یہ قدرت حاصل ہوتی ہے کہ وہ ہوا میں اڑے اسی طرح گدھے کو انسان بنادے یا انسان کو گدھا بنادے۔ لیکن جادوگر کو ذاتی طور پر یہ قدرت حاصل نہیں ہوتی بلکہ جادوگر اپنے خاص کلمات سحریہ جب پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ ان میں تاثیر پیدا کر دیتا ہے جس کی وجہ سے اشیاء کی حقیقتیں بدل جاتی ہیں۔ درحقیقت ہر چیز کا خالق اللہ تعالیٰ ہے اللہ تعالیٰ جادو میں یہ اثر اس لئے پیدا فرماتا ہے کہ لوگوں کی آزمائش کی جاسکے۔ کون جادو کے اثرات دیکھ کر گمراہ ہوتے ہیں اور کون ایمان پر قائم کرتے ہیں۔

خیال رہے کہ اہل سنت جادو میں فلك اور ستاروں کو مؤثر نہیں مانتے جیسا کہ ستارہ پرست ستاروں کو مؤثر بناتے ہیں۔
(از شیخ زادہ)
ساحر کا حکم:

”قال الشيخ ابو منصور الماتريدي رحمه الله القول بان السحر على الاطلاق كفر خطأ بل يجب البحث عن حقيقته فان كان ذلك رد مالزم في شرط الايمان فهو كفر والا فلا ثم السحر الذي هو كفر يقتل عليه الذكور لا الاناث“ وما ليس بكفر وفيه اهلاک النفس ففيه حکم قطاع الطريق ويستوى فيه المذکر والمؤنث وتقبل توبته اذا تاب ومن قال لا تقبل فقد غلط فان سحرة فرعون قبلت توبتهم

(مدارک)

حضرت شیخ ابو منصور ماتریدی رحمہ اللہ نے سحر کو مطلقاً کفر قرار دیا کہ ہر ساحر کافر ہے لیکن یہ قول درست نہیں بلکہ صحیح قول یہ ہے کہ ایسا سحر جس میں یہ شرط پائی جائے کہ ایسے الفاظ ذکر کئے جائیں جو ایمان کے زوال کا سبب ہوں تو وہ سحر یقیناً کفر ہے جس میں ایسے الفاظ کا استعمال نہ ہو جو ایمان کے زوال کا سبب بنیں وہ کفر نہیں۔ وہ جادو جو کفر ہے اس کا مرتکب جادوگر جب مذکر ہو تو اسے قتل کر دیا جائے گا لیکن مؤنث کو قتل تو نہیں کیا جائے گا البتہ اسے قید کر لیا جائے گا تا کہ وہ توبہ کر لے۔

یعنی جادوگر جب اپنے جادو میں کلمات کفریہ بولے تو وہ مرتد ہے۔ مرد ہو تو اسے تین دنوں کی مہلت دی جائے توبہ کر لے تو ٹھیک ورنہ تین دنوں کے بعد اسے قتل کر دیا جائے گا اور اگر عورت ہو تو اسے توبہ کرنے تک قید میں رکھا جائے گا۔ وہ جادو جس میں کلمات کفریہ تو نہیں لیکن اس جادو کے ذریعے کسی نفس کو قتل کر دیا جائے تو وہ قطاع الطریق (ڈاکوؤں) کے حکم میں ہوگا۔ ایسا جادو کرنے والا خواہ مذکر ہو یا مؤنث ہو واجب القتل ہوگا۔

بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ جادوگر کی توبہ قبول نہیں لیکن قول درست نہیں اس لئے کہ فرعون نے جو جادوگر موسیٰ علیہ السلام کے مقابل بلائے تھے انہوں نے توبہ کر لی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ کو قبول فرمالیا۔

تذکرہ: جو جادو کفر نہیں وہ حقیقت میں اصطلاح شرح میں جادو ہی نہیں، کیونکہ جادو میں شیطان سے امداد طلب کرنا ضروری ہے ہاں البتہ بعض کام حیرت انگیز ہوتے ہیں جو بظاہر جادو نظر آتے ہیں لیکن حقیقت میں وہ جادو نہیں ہوتے کیونکہ ان میں شیطان سے امداد طلب نہیں کی جاتی اور کلمات کفریہ نہیں پائے جاتے۔

راقم کے نزدیک شیخ ابو منصور ماتریدی رحمہ اللہ کا قول بھی درست ہے کیونکہ انہوں نے اس سحر کو مطلقاً کفر قرار دیا جو اصطلاح شرع میں سحر ہے۔ وہ یقیناً کفر ہی کفر ہے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ کی وضاحت بھی درست ہے کیونکہ عوام تو ہر کام جو عام عادت کے خلاف ہو نبی اور ولی سے سرزد نہ ہو اسے سحر کہہ لیتے ہیں۔ اس لئے اس وضاحت کی ضرورت تھی کہ بعض سحر کفر ہیں اور بعض کفر نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اس آیت کریمہ کی تفسیر میں علامہ رازی رحمہ اللہ نے کبیر میں اور شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ نے عزیزی میں جادو کی آٹھ قسمیں بیان کی ہیں تاکہ اصطلاح شرع میں جادو اور عوام کے نزدیک جادو میں فرق بھی ہو جائے۔ اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ کون سا جادو کفر ہے اور کون سا کفر نہیں۔

جادو کی اقسام:

جادو کی آٹھ قسمیں بعض ان میں سے کفر ہیں اور بعض کفر نہیں۔

پہلا قسم : کلدانیین اور بابل والے لوگوں کا سحر ہے یہ لوگ پہلے زمانہ میں پائے گئے جو عام طور پر جادو کیا کرتے تھے۔

”وہم قوم یعبدون الکواکب ویزعمون انهاہی المدبرۃ لهذا العالم“

یہ وہ لوگ تھے جو ستاروں کی عبادت کرتے تھے اور گمان یہ کرتے تھے کہ یہ ستارے ہی اس جہان کے مدبر ہیں۔ من ستاروں سے ہی خیر و شر حاصل ہوتے ہیں اور ان ستاروں سے ہی نیک بختی اور بد بختی حاصل ہوتی ہے یعنی تمام نظام کائنات میں مؤثر حقیقی وہ لوگ ستاروں کو مانتے۔

”وہم الذین بعث اللہ تعالیٰ ابراہیم علیہ السلام مبطلا لمقالتہم وردا علیہم فی مذاہبہم“

یہ وہ لوگ ہیں جن کا رد کرنے کے لئے اور ان کے اقوال کو باطل ثابت کرنے کے لئے اور ان کے مذہب کو جھوٹا ثابت کرنے کے لئے رب تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مبعوث فرمایا۔

(ارکب)

یہ قسم جادو کی کفر ہے جیسا کہ تعریف سے واضح ہے۔

نمردوی جادو کی مثالیں :

اسی پہلی قسم کو بیان کرتے ہوئے شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ معتبر تواریخ سے یہ حاصل ہوا کہ نمرد نے جادو سے حیرت انگیز چیزوں کو ایجاد کر رکھا تھا جن کی تعداد چھ تھی:

(۱) اس نے تانبے سے ایک بطن بنا رکھی تھی جب کوئی جاسوس یا چور شہر میں آتا اس بطن سے آواز آتی۔

تمام شہر والے اس کی آواز سنتے اور سمجھ جاتے کہ اس کا مقصد کیا ہے وہ جاسوس اور چور کو پکڑ لیتے تھے۔

(۲) ایک طبل اس نے بنوا رکھی تھی۔ جب کوئی چیز کسی شخص کہ گم ہو جاتی تو وہ اس طبل کے پاس آ کر

نقارہ کی چوب سے اسے کوٹتا تو طبل سے آواز آتی کی تمہاری چیز فلاں جگہ پر ہے اس کے وہ

شخص اپنی چیز کو وہاں سے ہی تلاش کرتا جو اسے مل جاتی۔

(۳) اس نے ایک آئینہ ایجاد کروایا۔ جس سے غائب کے حال کا پتہ چلایا جاتا تھا۔ جب بھی

صاحب عرض (سامان کا مالک) اس آئینہ میں نگاہ کرتا اور اس غائب کا تصور کرے آئینہ کو

دیکھتا تو وہ غائب آئینہ میں نمودار ہو جاتا۔ خواہ وہ غائب شہر میں ہوتا یا جھنڈ میں، سستی میں ہوتا یا پہاڑ پر، جس حال میں وہ ہوتا اسی حال میں نظر آتا۔ بیمار ہوتا یا تندرست، فقیر ہوتا یا مالدار، زخمی ہوتا یا مقتول جس حال میں ہوتا اسی طرح نظر آتا۔

(۴) ایک حوض اسے نے بنوا رکھا تھا۔ جس کے پاس سال کے بعد ایک مرتبہ بڑے بڑے لوگ آتے تھے وہ اپنی کھانے پینے کی اشیاء لاتے تھے اور حوض میں ڈال دیتے تھے۔ لوگ اس کے ارد گرد کھڑے ہو جاتے پانی پلانے والے حوض کے کنارے پر بیٹھ جاتے۔ جس شخص کے لئے جو ڈول نکالتے اس میں کھانے کی وہی چیز آتی جو اس نے ڈالی ہوتی۔

(۵) ایک تالاب اس نے جھگڑے مٹانے اور مقدمات کے فیصلے کرنے کے لئے بنوایا ہوا تھا۔ جب دو شخصوں کے درمیان جھگڑا ہوتا حق و باطل کے درمیان تمیز نہ ہو سکتی تو وہ دونوں اس تالاب کے پاس آ کر اس میں چھلانگ لگاتے۔ جو شخص حق پر ہوتا اس کے ناف کے نیچے کنارے تک پانی پہنچتا۔ اور جو شخص باطل پر ہوتا اس کے سر سے پانی گزر جاتا اگر وہ توبہ کر لیتا تو بچ جاتا اور اگر توبہ نہ کرتا تو غرق ہو جاتا۔

(۶) نمرود کی سرائے کے دروازے کے باہر ایک درخت تھا جس کے سایہ میں اس کے درباری لوگ بیٹھتے تھے۔ جتنے لوگ زیادہ ہوتے جاتے اتنا ہی سایہ بڑھتا رہتا۔ لیکن ایک لاکھ کی تعداد کو تو یہ سایہ کفایت کرتا ایک لاکھ سے اگر ایک شخص بھی بڑھ جاتا تو سایہ مکمل ختم ہو جاتا سب دھوپ پر بیٹھتے۔

”نمرود کہ بادشاہ آنها بود نیز دریں باب تو غل بسیار داشت“

جب جادوگروں نے ان چیزوں کو ایجاد کیا تو ان کو ہی دیکھ کر نمرود نے خدائی کا دعویٰ کر دیا کہ جبکہ میری رعایا کے جادوگر اس قسم کے کام کر سکتے تو خود بادشاہ کا کتنا ہی بلند مقام ہوگا۔ لہذا میں خدا ہی ہو سکتا ہوں خدا سے کم مرتبہ کے دعویٰ کا کیا فائدہ۔

(از عزیز)

یقین جانئے آج کل کے بادشاہ فرعون اور نمرود سے عملی طور پر کوئی کم نہیں۔ آئے دن قانون بدلتے رہتے ہیں اپنی مرضی کے قوانین بنانا۔ اپنی مرضی کے لوگوں کو فائدہ پہنچانے کے لئے قوانین بنانا اور اپنے مخالفین کو نقصان پہنچانے کے لئے قوانین بنانا اور بی حضوری قاضیوں سے من مانے فیصلے کرانا

کیا فرعون اور نمرود کامل نہیں۔ میرا تو گمان یہی ہے کہ اگر علماء اور عوام کا ان کو ڈرنہ ہو تو یہ خدائی کا دعویٰ کرنے میں کوئی دیر نہ کریں۔

دوسرا قسم : جنوں اور شیطانوں کو اپنے تابع کیا جاتا ہے یہ عمل آسان ہے اور زیادہ رواج بھی اس کا ہے۔ بڑے بڑے جنوں کو مسخر کر لیا جاتا ہے لیکن اس میں بتوں کو معبود سمجھا جاتا ہے ان کا واسطہ پیش کیا جاتا ہے۔ ان بتوں کے نام پر نذر مانی جاتی ہے جانوروں کو ذبح کیا جاتا ہے اور ان بتوں کے پاس اچھے اچھے عطریات پیش کئے جاتے ہیں (کفر صریح لازم می آید) اس سے صریح کفر لازم آتا ہے۔ اس کا سمجھنا کوئی مشکل بھی نہیں کیونکہ بتوں سے امداد طلب کرنا اور ان کے واسطہ سے کوئی کام کرنا یقینی طور پر کفر ہے۔

خیال رہے کہ اسی تسخیر کو ”الاستعانة بالارواح الارضية“ (زمین روحوں سے امداد طلب کرنا) سے بھی تعبیر کر دیا جاتا ہے اور اسی کا نام ”عزائم“ اور اسی کا نام ”تسخیر الجن“ (جنوں کو تابع کرنا) بھی ہے۔

خیال رہے کہ کبھی امداد ارواح فلکیہ سے بھی طلب کی جاتی ہے لیکن وہ عبادت میں اعلیٰ مقام پیدا کرنے اور رب تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کے بعد اسے کرامت کہا جائے گا وہ سحر حقیقی بھی نہیں اور مجازی بھی نہیں۔

تیسرا قسم : فوت شدہ آدمیوں کی روحوں کو مسخر کرنا (اپنے تابع کرنا) لیکن ان روحوں کو تابع کرنے میں بھی بڑے بڑے شیطین کے ناموں کا وسیلہ پیش کیا جاتا ہے بہت بڑی تعظیم ان شیطین کی کی جاتی ہے اور ان کے ناموں کی نذر مانی جاتی ہے۔ اس طرح روحوں کو اس طرح اپنے تابع کر لیا جاتا ہے۔ جس طرح نوکر کو تابع کیا جاتا ہے ان روحوں کو بلا کر ان سے کام کرائے جاتے جو خرق عادت ہوتے ہیں۔ زیادہ طور پر ان روحوں کی مدد سے شہوت اور غضب پر مبنی کام کرائے جاتے ہیں۔ اس قسم کا جادو عام طور پر ہندو لوگ اور فساق لوگ کرتے ہیں۔

”ایں ہم یا مستلزم کفر است یا قریب بسر حد کفر میر ساند“

جادو کی یہ قسم یا تو مستلزم کفر ہے اور یا کفر کے قریب ہے۔

چوتھا قسم : یہ ہے کہ کسی کے خیالات کو فاسد کر دیا جائے، اس میں بعض جنوں کی روحوں کا وسیلہ پکڑا جاتا ہے۔ اور کسی کے خیال میں تصرف کیا جاتا ہے تاکہ جو چیز موجود نہیں اسے نظر آئے یا ہولناک صورتیں کسی کی نظر میں اس جادو سے آ جاتی ہیں جن سے وہ دوڑتا ہے یا حرکات غیر واقعہ کو واقعہ سمجھتا ہے۔

اس قسم کو نظر بندی اور خیال بندی کہا جاتا ہے فرعون کے جادو گروں نے جو اپنا کرتب دکھایا اس کا ذکر رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَإِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيَّهُمْ يَخِيلُ إِلَيْهِمْ سَحَرَهُمْ أَنَّهُ تَسْعَىٰ﴾ (طہ ۶۶)

تو ان کی رسیاں اور لاٹھیاں ان کے جادو کے زور سے ان کے خیال میں دوڑتی معلوم ہوئیں۔

یہ جادو بذاتہ (ذاتی طور پر) کفر نہیں۔ ہاں اگر کوئی یہ جادو کرتے وقت یعنی کسی کی نظر بندی میں جنوں کی ارواح سے التجاء کرے اور بڑے جنات اور شیطین کا واسطہ ڈالے اور ان کی حد سے زیادہ تعظیم کرے تو اس صورت میں یہ کفر ہوگا۔ یہی جادو اگر اولیاء کرام کے مقابل کیا جائے کہ انسان ان کا اس جادو کے ذریعے مقابلہ کرے تو حرام ہے۔ اور اسی جادو کے ذریعے اگر کسی شخص کو دھوکہ دینا مقصود ہو کہ اس کا مال ہڑپ کر لیں گے تو یہ بھی گناہ کبیرہ ہوگا اور حرام کا ارتکاب لازم آئے گا۔

اگر اسی جادو کے ذریعے انبیاء کرام سے مقابلہ کیا جائے تو کفر ہوگا کیونکہ انبیاء کرام سے مقابلہ کفر ہے اسی لئے موسیٰ علیہ السلام کے مقابل جادو گروں نے توبہ کے وقت کہا ﴿أَمَّا بَرَبُّ هَارُونَ وَمُوسَىٰ﴾ ہم ایمان لائے ہارون اور موسیٰ کے ایمان پر۔

پانچویں قسم : یہ اصحاب اوہام کا سحر ہے (یعنی وہم سے جادو کیا جاتا ہے) اس جادو کا پہلے ہندوؤں میں بہت رواج تھا لیکن اب اس کا نام و نشان نہیں۔ اس جادو کو ”تعليق الوهم“ بھی کہا جاتا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ جو صورت واقعہ میں مطلوب ہو تصور کرنے والا اسے اپنی نظر کے سامنے لاتا ہے پھر اس کو حاصل کرنے کے لئے وہم کو اس کے ساتھ متعلق کرتا ہے تو وہ مطلوبہ صورت حاصل ہو جاتی ہے۔

لیکن اس کے لئے شرط یہ ہے کہ غذا کم کھائے، اور لوگوں سے کنارہ کش ہو جائے جس طرح

ہندوؤں کے جوگی کرتے ہیں۔ اس قسم کے جادو کا حکم یہ ہے کہ اگر غرض مباح ہو تو یہ جادو بھی مباح ہوگا جیسا کہ دودکاروں کے درمیان تفریق کرنی مقصود ہو یا کسی ظالم اور کافر کو ہلاک کرنا مقصود ہو تو یہ جائز ہے۔ اگر کسی ممنوع غرض کے لئے یہ جادو کرے تو حرام ہوگا جیسا کہ میاں بیوی کے درمیان جدائی ڈالنے کے لئے یا کسی معصوم کو ہلاک کرنے کے لئے جادو کیا جائے تو ناجائز ہوگا۔

”بالجملہ حکم مباشرت فعل دارد وفي نفسه قبيح نیست“

حاصل کلام یہ ہے کہ جادو کی یہ قسم ذاتی طور پر قبیح (بری) نہیں البتہ اغراض فاسدہ کے ملنے سے اس میں قباحت (برائی) آ جاتی ہے۔

پہلا قسم : یہ ہے کہ بعض دواؤں کے ذریعے عجیب اثر دکھایا جائے۔ جب کہ دوسرے شخص کو معلوم نہ ہو کہ اس دوا میں یہ اثر ہے تو حیرت انگیز اثر اس کو دکھائی دے گا اس کا نام سحر نیرنج ہے۔ جیسا کہ چونہ کو سرکہ میں تر کر کے سمندر جھاگ اس میں ملا لے اور اس کا لیپ انگلیوں پر کرے اس کے اوپر مٹی کا تیل لگا کر آگ لگائے تو انگلیاں چراغ کا کام دیں گی لیکن جلیں گی نہیں۔

البتہ ان کے نہ جلنے کی ایک مختصر میعاد ہوگی۔ کوئی تجربہ کرتے کرتے انگلیاں نہ جلا بیٹھے۔ اسی طرح طعام میں ایسی دوا کا استعمال کرنا جو عقل کو زائل کر کے بے وقوف بنا دے یا نشہ آور دھواں دماغ تک پہنچے تو دماغ کام نہ کرے۔

”نحو دماغ الحمار اذا تناوله الانسان تبلد عقله وقت فطنته“

اسی طرح جب کوئی انسان گدھے کا دماغ کھالے تو وہ بد دماغ ہو جاتا ہے اس کی سمجھ کم ہو جاتی ہے اسی وجہ سے بعض لوگوں کو ”خر دماغ“ کہا جاتا ہے۔

ساتویں قسم : جسے سحر الحیل کہتے ہیں اس میں عجیب آلات کے ذریعے حیرت انگیز کام کرنا لازم آتا ہے۔ سائنسی ایجادات تمام اسی میں آتی ہیں جیسے ٹیلی فون، ٹیلی ویژن، ریڈیو وغیرہ۔ لیکن خیال رہے کہ اب ہماری اصطلاح میں ان ایجادات کا نام سحر سرے سے ہے ہی نہیں۔ یہ جائز ہے لیکن شرط اس میں بھی یہ ہے کہ کسی کو نقصان پہنچانے کی غرض نہ ہو۔

سنا ہے ایڈز کی مرض یہودی اور عیسائیوں نے جراثیم کو ایجاد کر کے مسلمانوں میں پھیلانے کی

غرض سے ایجاد کی لیکن مسلم ممالک تو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ابھی تک کافی حد تک محفوظ ہیں البتہ وہ لوگ خود اس کی زد میں ہیں۔

آٹھویں قسم : شعبہ بازی اور ہاتھ کی صفائی ہے یہ عام طور پر مردوں اور عورتوں کو تعجب میں ڈالنے کے لئے لوگ کرتے ہیں۔ اس میں صرف چالاک کی کو دخل ہوتا ہے۔ کسی چیز کو بیگ وغیرہ میں چھپا لیا، عام لوگوں کو دکھایا کہ دیکھ لو بیگ خالی ہے اس میں کوئی چیز نہیں، پھر وہاں سے کوئی چیز نکال دیں یا ہاتھ وغیرہ میں وہ چیز رکھ لی تھی پھر جلدی سے اس میں ڈال دی۔ اس طرح کے کام بظاہر حیرت انگیز ہوتے ہیں لیکن ان میں چالاک اور پھر تیلاپن کا دخل ہوتا ہے۔

آخری تین قسموں کا حکم:

”ایس ہر سہ قسم سحر نہ کفر است ونہ حرام مگر آنکہ غرضی

فاسد قصد کنند پس بآن قصد حرمت متحقق گردد“

آخر میں جن تین قسموں کو ذکر کیا گیا ہے یہ حقیقت میں جادو ہیں ہی نہیں۔ ان میں کوئی شیطانوں سے امداد نہیں لی جاتی۔ لہذا یہ قسمیں نہ کفر ہیں اور نہ حرام ہیں ہاں البتہ کسی غلط ارادہ سے یہ کام کریں اور کسی کو نقصان دینے کا ارادہ ہو تو اس غلط مقصد کی وجہ سے یہ کام حرام ہو جائیں گے۔ لیکن ذاتی طور پر ان میں کوئی گناہ نہیں۔

(ماخوذ از کبیر و عزیز)

جادو کی پہلی قسم کا دفاع:

اللہ تعالیٰ کے اسماء گرامی اور آیات قرآنی کے ذریعے اور عبادات میں خلوص پیدا کر کے فرشتوں کے ذریعے اس جادو کو توڑا جاتا ہے جو شیطان کی امداد سے کیا جاتا ہے۔ یہ وہی لوگ کرتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے عملیات میں خصوصی مقام دے رکھا ہوتا ہے۔

دوسری قسم کا دفاع:

یعنی وہ جادو جو کہ موکلات ارضیہ اور جنوں کو مسخر کر کے کیا جاتا ہے اس کا زوال بھی اللہ تعالیٰ کے نیک بندے اللہ تعالیٰ کے اسماء اور قرآن پاک کی آیات کے ذریعے ہی کرتے ہیں۔ جادو کے دفاع کے لئے پھر

جادو کروں کے جال میں پھنسا ”جو کفر و شرک اور شیطانوں سے امداد طلب کرنے میں مبتلاء ہیں“ حماقت ہے۔

تیسری قسم کا دفاع:

یعنی شیطانوں کے واسطہ سے روحوں سے جو امداد لے کر لوگوں کو نقصان پہنچایا جاتا ہے اس کا زوال اللہ تعالیٰ کے نیک بندے اس طرح کرتے ہیں کہ:

”تحصیل ربط بارواح طیبہ صلحاء و اولیاء است کہ اکثر اویسی مشربان بعمل می آرند و در حوائج خود و دیگر خلق بآن منتفع میشوند و در طریق تحصیل آن نیز طہارت و تلاوت و ارسال ثواب صدقات برائے آن ارواح منظوری دارند“

کہ اپنے آپ کو پاکیزہ رکھ کر، تلاوت قرآن پاک کر کے اور صدقات کا ثواب نیک لوگوں، اولیاء کرام کی روحوں کی روحوں کو پہنچا کر ان بزرگوں کی روحوں سے رابطہ کر کے ان سے اپنی حاجات کے مندفع کرنے کے لئے اور دوسرے لوگوں کو نفع پہنچانے کے لئے امداد طلب کرتے ہیں۔ یعنی ارواح صلحاء و اولیاء ان کی امداد کرتی ہیں جس کی وجہ سے بد روحوں کی وجہ سے کیا ہوا سحر زائل ہوتا ہے۔ یہ عمل اویسی حضرات زیادہ کرتے ہیں۔

چوتھی قسم کا دفاع:

”اصلاح قسم پنجم عقد ہمت ست کہ از مشائخ کبار و اولیای ابرار برائے حل مشکلات بوقوع آمدہ“

پانچویں قسم کی اصطلاح اور اس کا دفاع بھی بڑے بڑے مشائخ اور اولیاء کرام کی ہمت سے ہی ہو سکتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو مشکلات کے حل کی ہمت دے رکھی ہے۔ اولیاء کرام اللہ تعالیٰ کے اسماء گرامیہ کے ذکر میں مستغرق ہونے کی وجہ سے رب تعالیٰ کے فضل سے روح کی ترقی کے منازل طے کر لیتے ہیں جن کو درجات رفیعہ حاصل ہو جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے اسماء اور قرآن پاک کی آیات میں تفکر کرنا اور ان کو پڑھتے رہنا اور اپنے احوال کی اصلاح کرنا اس قسم کے ازالہ کے لئے مفید ہے۔
(ماخوذ از عزیزی)

تعویذات کا حکم:

ولا بأس بالمعاذات اذا كتب فيها القرآن او اسماء الله تعالى

جو تعویذ قرآن پاک کے الفاظ مبارکہ سے لکھے جائیں، یا اللہ تعالیٰ کے اسماء گرامی لکھے ہوں اسی طرح جن دعاؤں کا احادیث میں ذکر ہے ان میں بھی اللہ تعالیٰ کا ہی ذکر ہے۔ ان میں کوئی حرج نہیں وہ تعویذ لکھنے لکھوانے استعمال کرنے جائز ہیں۔

”ويقال رقاہ الراقی رقیاً ورقیہ اذا عودہ ونفث فی عودتہ“

اسی طرح قرآن و احادیث اللہ تعالیٰ کے ذکر اللہ تعالیٰ کے اسماء گرامی رسول اللہ ﷺ کے اسماء گرامی کو پڑھ کر تکلیف کی جگہ پھونکنا یعنی دم کرنا بھی جائز ہے۔

”وانما نكره العودۃ اذا كانت بغير لسان العرب ولا يدري ما هو

ولعله يدخله سحر او كفر او غير ذلك واما ما كان من القرآن او

شئ من الدعوات فلا بأس به“

دم اور تعویذ ایسی زبان میں ہوں جن کے معانی کا پتہ نہ ہو تو وہ جائز نہیں کیونکہ ہو سکتا ہے وہ سحر ہو کفر یہ کلمات ہوں یا حرام کی طرف لے جانے والے الفاظ ہوں۔ لیکن قرآن پاک اور دعائیہ کلمات سے دم اور تعویذ جائز ہیں۔

”والخيط كان يربط في العنق او في اليد في الجاهلية لدفع

المضرة عن انفسهم على زعمهم وهو منهي عنه وذكر في حدود

الايمان انه كفر“

زمانہ جاہلیت میں گردن یا ہاتھ میں ایک دھاگہ باندھا جاتا تھا کہ لاحق ہونے والے نقصانات

اور ضرر دینے والی اشیاء اس سے دور ہو جاتی ہیں۔ یہ ناجائز ہے اگر اس دھاگہ کو مستقل طور پر دافع ضرر، دافع بلاء سمجھے اللہ تعالیٰ کو تسلیم نہ کرے تو یہ کفر ہے۔

تنبیہ : کسی دواء، کسی دم، کسی تعویذ اور کسی جنتر منتر (ٹونہ) کو اگر مستقل طور پر باعث شفاء دافع بلاء سمجھا جائے اور تصور یہ کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کو اس میں کوئی دخل نہیں تو شرک لازم آئے گا۔

فائدہ : ”وفی المجتبى اختلاف فی الاستشفاء بالقرآن بان یقرأ علی المریض او المملوغ الفاتحة او یکتب فی ورق ویعلق علیہ اوفی طست ویغسل ویسقی“

سورۃ فاتحہ سے شفاء حاصل کرنا احادیث سے ثابت ہے بالاتفاق جائز ہے البتہ اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ فاتحہ کے ذریعے شفاء حاصل کرنے کا طریقہ بہتر کون سا ہے بعض حضرات نے کہا مریض اور سانپ، بچھو وغیرہ سے ڈسے ہوئے شخص پر فاتحہ کا پڑھ کر پھونکنا بہتر ہے اور بعض حضرات نے کہا کاغذ پر لکھ کر گلے میں ڈالنا بہتر ہے۔ اور بعض حضرات نے کہا کسی طشت، پلیٹ وغیرہ پر لکھ کر پھر دھو کر وہ پانی پلانا بہتر ہے۔

راقم کے نزدیک تینوں طریقوں میں سے جس پر بھی عمل کرے وہ ہی مستحسن طریقہ ہے۔

فائدہ جلیلہ : ”وعن النبی ﷺ انه کان یعود نفسہ قال ﷻ وعلی الجواز عمل الناس الیوم وبہ وردت الآثار“

نبی کریم ﷺ خود اپنے آپ کو دم کرتے تھے دم کرنے کے جواز پر آج تک لوگ عمل کر رہے ہیں اور اس کا جواز احادیث مبارکہ سے ثابت ہے۔

مسئلہ : ”ولا بأس بان یشد الجنب والحائض التعاویذ علی العضد اذا کانت ملفوفة“

اجنبی شخص یا حیض والی عورت اپنے بازو پر تعویذ باندھیں جو تعویذ کسی چیز میں بند لپٹا ہوا ہو تو جائز ہے۔ اسی سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ جیب وغیرہ میں رکھا ہوا تعویذ، یا قرآن کی آیۃ کو جیب میں ڈالا ہوا ہو تو بیت الخلاء وغیرہ میں جانا جائز ہے۔

مسئلہ : ”وفی الخانیۃ بساط او مصلی کتب علیہ فی النسخ“ الملک للہ
یکرہ استعمالہ وبسطہ والقعود علیہ“

فتاویٰ قاضی خان میں ہے کہ اگر کوئی چٹائی یا مصلیٰ ایسا ہو جس کو بنتے وقت اس کی بنائی میں ”الملک للہ“ لکھ دیا گیا اس کا استعمال کرنا، اسے بچھانا اور اس پر بیٹھنا مکروہ ہے۔

خیال رہے تمام متبرک الفاظ کا یہی حکم ہے خواہ وہ بنائی میں لکھے جائیں یا بعد میں اوپر لکھ دیا جائے ان کا ادب کیا جائے تو ہین نہ کی جائے۔ عام طور پر مصلیٰ میں کعبہ شریف اور نبی کریم ﷺ کے روضہ منورہ کی تصاویر بنی ہوتی ہیں۔ راقم نے ایسے مصلیٰ کو کبھی استعمال نہیں کیا۔ راقم کے نزدیک ان تصاویر پر بیٹھنا ادب کے خلاف ہے اس مسئلہ میں اہل علم کی تحقیق کیا ہے مجھے اس کا کوئی علم نہیں تاہم میں نے اپنی عقیدت و محبت کا ذکر کر دیا ہے۔

مسئلہ : کسی قسم کا تعویذ دوسرے لوگوں کو نقصان پہنچانے کے لئے لکھنا اور لکھوانا حرام ہے کوئی عمل کسی قسم کا بھی ہو، جس سے کسی کو نقصان پہنچانا، تکلیف دینا مقصود ہو وہی حرام ہے۔ علماء کرام کو مساجد سے نکالنے کے لئے منافقانہ طرز رکھنے والے نمازی بھی اسی قسم کے حرام کے مرتکب ہوتے ہیں۔

مسئلہ : ”لا بأس بوضع الجماجم فی الزرع والمبطخة لدفع ضرر العين حق تصيب المال والادمي والحيوان ويظهر اثره في ذلك عرف بالآثار فاذا نظر الناظر الى الزرع يقع نظره اولا على الجماجم لارتفعها فتطره بعد ذلك الى الحرث لا يضره“

کھیتی میں اور زربوزوں وغیرہ کی بیلوں میں کھوپریوں کا لٹکانا نظر لگنے سے بچاؤ کے لئے جائز ہے۔ کیونکہ نظر کا لگ جانا حق ہے کبھی مال کو نظر لگ گئی کبھی انسانوں کو اور کبھی حیوانوں کو۔ نظر کے اثرات کا ثبوت احادیث مبارکہ میں موجود ہے۔ اس لئے جب کھیتی پر نظر ڈالنے والا پہلے کھوپریوں کو دیکھے گا اس کے بعد وہ کھیتی کو دیکھے گا تو اس کی نظر سے کوئی نقصان نہیں ہوگا۔

لیکن خیال رہے کہ یہ صرف سبب سمجھے۔ حقیقی طور پر یہی سمجھے کہ اللہ تعالیٰ ہی مؤثر حقیقی ہے۔

”روی ان امرأة جاءت الى النبي ﷺ وقالت نحن من اهل الحرث

وانا نخاف عليه العين فامر النبي ﷺ ان يجعل فيه الجماجم“

روایت کیا گیا ہے کہ بیشک ایک عورت نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کرنے لگی کہ ہم کھیتی باڑی کرتے ہیں ہمیں نظر لگنے کا ڈر رہتا ہے تو نبی کریم ﷺ نے

کھیت میں کھوپریوں کے رکھنے کا حکم دیا۔ (ماہرذائق شامی ج ۵ ص ۲۵۶ کتاب العطر والاباحۃ)

عام طور پر لوگ نئے مکانوں پر ہنڈیا رکھ دیتے ہیں اس کا جواز بھی اسی حدیث سے واضح طور پر سمجھ آتا ہے۔ ہر کام کو شرک سے تعبیر کرنا، مسلمانوں کو شرک بناتے رہنا جہلاء کا کام ہے، اہل علم کا یہ طریقہ نہیں۔ راقم نے جز اول میں بھی اس مسئلہ کو بیان کیا ہے یہاں کچھ مختلف انداز پر بیان کیا تا کہ جادو اور تعویذات میں فرق سمجھ آ سکے۔

﴿وَاتَّبِعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيْطَانُ عَلَىٰ مُلْكٍ سُلَيْمٍ﴾:

”اور انہوں نے تابعداری کی جو پڑھتے تھے شیطان سلیمان کی سلطنت کے زمانہ میں“۔ ﴿وَاتَّبِعُوا﴾ کا عطف ہے ”نبذ“ پر یعنی یہود نے اللہ تعالیٰ کے وعدہ کو اور اللہ تعالیٰ کی کتاب کو پس پشت ڈال دیا اور جادو کی کتابوں کی تابعداری کرنے لگ گئے۔

﴿تَتْلُوا﴾ اگرچہ مستقبل کا صیغہ ہے لیکن ان لوگوں کی ماضی کی حالت کو مستقبل سے تعبیر کر دیا گیا اسی وجہ سے ترجمہ ماضی کا کیا گیا۔

ضابطہ: ”والعرب يستعمل الماضي موضع المستقبل وبالعكس مجازاً“ عرب حضرات ماضی کو کبھی مجازی طور پر مستقبل کے معنی میں اور کبھی مستقبل کو مجازاً ماضی کے معنی میں استعمال کرتے رہتے ہیں۔

”تتلوا ما مشتق من التلاوة بمعنى القراءة او من التلو بمعنى التبعية“

یالفظ ﴿تَتْلُوا﴾ مشتق ہے تلاوة سے جس کا معنی ہے پڑھنا، اس صورت میں وہی معنی ہوگا جو ذکر کر دیا گیا اور اگر مشتق ہو ”تلو“ سے تو معنی ہوتا ہے تابعداری کرنا۔ اب اس صورت میں معنی یہ ہوگا ”اور انہوں نے (یہود نے) تابعداری کی جس کی تابعداری کی شیاطین نے سلیمان کی سلطنت کے زمانہ میں“ (لیکن راقم کو اس معنی میں تکلف نظر آتا ہے۔

﴿عَلَىٰ مُلْكٍ سُلَيْمٍ﴾ متعلق بتتلوا علی تضمین الافتراء ای تتلوا

الشیاطین مفترین علی ملک سلیمان قائلین بان ملکہ کان بہ

یعنی ﴿عَلَىٰ مُلْكٍ سُلَيْمٍ﴾ جار مجرور کا تعلق ﴿تَتْلُوا﴾ سے ہے قاعدہ تضمین جاری

کیا گیا یعنی افتراء کے معنی کو متضمن ہے تاکہ ﴿علی﴾ کا استعمال صحیح ہو سکے۔ پہلے دونوں معانی کے لحاظ پر ﴿علی﴾ بمعنی ”فی“ استعمال ہے۔ اس ترکیب کے لحاظ پر معنی بہت خوبصورت سمجھ کے قریب ہے۔ اور تابعداری کی انہوں نے جو افتراء باندھتے تھے شیاطین سلیمان کی سلطنت پر (کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی بادشاہت جادو کی وجہ سے قائم تھی)۔

سلیمان علیہ السلام کو انہوں نے جادوگر کیوں کہا؟

بغوی نے بیان کیا کہ سدی نے کہا شیاطین آسمانوں کی طرف چڑھتے (کیونکہ آسمان دنیا پر ان کو چڑھنے کی اجازت تھی) تو فرشتوں کے کلام کو سنتے، خاص کر کے مستقبل کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو جو علم عطا کیا ہوتا ہے اس کے متعلق سن کر ”کہ فلاں شخص کی موت فلاں جگہ آئے گی اور یہ یہ کام فلاں لوگوں نے فلاں دنوں میں کرنے ہیں“۔ وہ کاہنوں کے پاس آ کر بتاتے لیکن اس میں وہ اپنی طرف سے بھی کثیر جھوٹوں کی آمیزش کر دیتے۔

بعض روایات میں ستر جھوٹ اور بعض میں ننانوے جھوٹ ملانے کا ذکر ملتا ہے لیکن مراد اس سے تقریباً کثرت ہی ہے یعنی وہ کثیر جھوٹ ملا کر فرشتوں کا کلام کاہنوں تک پہنچاتے لوگ سمجھتے کہ کاہنوں کو علم غیب حاصل ہے لوگوں نے وہ لکھ لیا۔ اور اسی طرح بنی اسرائیل میں یہ مشہور ہو گیا کہ جن غیب کا علم رکھتے ہیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے کچھ حضرات کو بھیج کر وہ جادو کی تمام کتابیں جمع کرا لیں اور ایک صندوق میں بند کر کے اپنی کرسی کے نیچے دفن کرادیا۔

”وقال لا اسمع احدا يقول ان الشيطان يعلم الغيب الا ضربت عنقه“

اور آپ نے فرمایا کہ میں کسی کو یہ کہتے ہوئے نہ سنوں گی ”شیطان غیب جانتا ہے اگر میں نے کسی سے یہ سنا تو میں اس کی گردن اڑا دوں گا“۔ جب سلیمان علیہ السلام کا وصال ہو گیا اور وہ علماء کرام بھی دنیا سے رخصت ہو گئے جو یہ جانتے تھے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے جادو کی کتابوں کو دفن کیا۔ تو ان کے بعد جب دوسرے لوگوں کا زمانہ آ گیا جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے جادو کی کتب کو دفن کرنے

کی وجہ نہیں جانتے تھے تو ان کے پاس شیطان انسانی شکل میں آیا۔ بنی اسرائیل کے چند لوگوں کو جمع کر کے کہنے لگا کیا میں تمہیں ایک خزانہ پر مطلع نہ کروں؟ انہوں نے کہا ہاں تم ہمیں بتاؤ۔

شیطان نے کہا کرسی کے نیچے سے جگہ کو کھودو، ان کو وہ جگہ تو دکھا رہا تھا لیکن خود ایک کنارے پر کھڑا تھا: ”وذاک انہ لم یکن یدنو شیطان من الکرسی الا احترق“ اس کی وجہ یہ تھی کہ اگر شیطان خود کرسی کے قریب آتا تو وہ ضرور جل جاتا۔ انہوں نے جگہ کو کھودا اور جادو کی کتابوں کو نکال دیا۔

”قال الشیطان ان سلیمان کان یضبط الجن والانس والشیاطین والطیر بہذہ“

شیطان نے کہا بیشک سلیمان اسی جادو کی وجہ سے جنات اور انسانوں اور شیاطین اور پرندوں پر حکومت کرتے تھے۔ ”وفشا فی الناس ان سلیمان کان ساحرا“ لوگوں میں یہ مشہور ہو گیا کہ سلیمان جادو کرتے تھے۔

دوسری وجہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو جادو گر کہنے کی یہ تھی کہ آصف نے حضرت سلیمان علیہ السلام سے تعلیم حاصل کی شیطانوں نے خود جادو کی کتابیں لکھ کر آصف کی طرف منسوب کر دیں اور یہ آپ کے مصلیٰ کے نیچے دفن کر دیں۔ آپ کے وصال کے بعد ان کتابوں کو شیطانوں نے نکال کر یہ کہا کہ یہی علم آصف نے سلیمان سے حاصل کیا تھا ”وانما ملککم سلیمان بہذا“ اور تم پر حضرت سلیمان علیہ السلام نے اسی جادو کی وجہ سے بادشاہت کی۔

”فاما علماء بنی اسرائیل و صلحاؤہم فقالوا معاذ اللہ ان یكون

ہذا من علم سلیمان“

بنی اسرائیل کے علماء اور صلحاء نے تو شیطانوں کے اس افشاء پر ”کہ سلیمان جادو کرتے

”کہا کہ اللہ کی پناہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا یہ علم ہو اور آپ نے

اس کے ذریعے حکومت کی ہو۔

”واما السفلة فقالوا ہذا علم سلیمان واقبلوا علی تعلمہ ورفضوا

کتب انبیائہم“

لیکن جاہل گھٹیا، کمینے لوگ یہ کہنے لگے کہ سلیمان کا یہی علم تھا وہ لوگ اسکے سیکھنے کی طرف متوجہ ہو

گئے اور انہوں نے انبیاء کرام کی کتب کو چھوڑ دیا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کو جادو گر کہنا شروع کر دیا۔
﴿وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَنُ﴾: یعنی ما سحر سلیمان فیکفر عبر عن السحر بالكفر لبدل
علی ان السحر كفر وان من كان نبيا كان معصوما عنه“

(اور نہیں کفر کیا سلیمان نے) اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے کوئی سحر نہیں کیا
کہ کفر لازم آتا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے سحر نہ کرنے کو کفر نہ کرنے سے تعبیر فرمایا۔ تاکہ معلوم ہو جائے کہ وہ
سحر جس کو اصطلاح شرع میں سحر کہا گیا ہے وہ کفر ہے بیشک نبی کا سحر سے معصوم ہونا ضروری ہے۔
فائدہ: ”فلما جاء محمد ﷺ برأ الله تعالى سليمان من ذلك“

حضرت سلیمان علیہ السلام پر بنی اسرائیل نے جو جادو گر ہونے کا عیب لگایا تھا۔ اس عیب سے
اللہ تعالیٰ ان کو اس وقت بری فرمایا جب نبی کریم محمد مصطفیٰ ﷺ تشریف لائے۔
اسی سے یہ واضح ہوا کہ نبی کریم ﷺ کے انبیاء کرام پر بھی احسانات عظیمہ ہیں۔

(ماخوذ از مظہری)

﴿وَلَكِنَّ الشَّيْطَانَ كَفَرُوا وَيَعْلَمُونَ النَّاسَ السِّحْرَ﴾ ”اور لیکن شیطانوں نے
کفر کیا سکھاتے لوگوں کو جادو“ اس سے پہلے جو بحث ذکر کی گئی اسی سے واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت سلیمان
علیہ السلام کی طرف جادو کو منسوب کرنے والے شیاطین تھے اور وہ خود ہی لوگوں کو جادو سکھاتے تھے تو رب
تعالیٰ نے ان کا رد فرمایا کہ سلیمان نے تو جادو نہیں کیا کہ کفر لازم آتا ہاں البتہ وہ جادو کرنے والے اور
دوسرے لوگوں کو سکھانے والے، اس طرح جادو کے ارتکاب سے کفر کرنے والے شیاطین ہی تھے جو جھوٹ
کی وجہ سے حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف جادو کی نسبت کر کے اور ہی جرم کے مرتکب ہوئے۔

﴿وَمَا أُنْزِلَ عَلَى الْمَلَائِكِ بْنِ هَارُوتَ وَمَارُوتَ وَمَا يُعَلِّمَنِ مِنْ
أَحَدٍ حَتَّى يَقُولَا إِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ﴾:

”اور جو الہام کیا گیا دو فرشتوں پر بابل میں یعنی ہاروت اور ماروت پر اور وہ دونوں نہیں سکھاتے تھے کسی
ایک کو یہاں تک کہ وہ کہتے ہم تو صرف آزمائش ہیں تو تم کفر نہ کرو“۔

﴿وَمَا أُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ﴾ ای الہماہ من السحر“ اس مقام پر انزال کا معنی الہام لیا گیا ہے یعنی جو جادو الہام کیا گیا دو فرشتوں پر۔ ”ببابل، بلد فی سواد العراق“ بابل عراق کے علاقہ میں شہر کا نام ہے۔ ﴿هَارُوتَ وَمَارُوتَ﴾ ترکیبی لحاظ پر یہ بدل ہے ﴿مَلَكَيْنِ﴾ کا یا عطف بیان ہے اسی لئے راقم نے اپنے ترجمہ میں ”یعنی“ کا لفظ بڑھایا ہے۔ (ماخوذ از جلالین)

ہاروت و ماروت کی وجہ تسمیہ:

بعض حضرات نے تو یہ کہا ہے کہ یہ عجبی لفظ ہیں۔ عجمہ اور علیست کی وجہ سے غیر منصرف ہیں ”وقیل عربیان من الہرت والمرت بمعنی الکسر“ بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہ دونوں لفظ عربی ہیں ”ہرت اور مرت“ سے ماخوذ ہیں جس کا معنی ٹوٹنا۔ (از روح المعانی)

ممکن ہے کہ ان کو منکسر المزاج ہونے کی وجہ سے، یعنی نرمی سے دوسروں کو نصیحت کرنے کی وجہ سے ہاروت اور ماروت کہہ دیا گیا ہو آیہ کریمہ کا مفہوم تقریباً واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی آزمائش کے لئے دو فرشتوں ہاروت اور ماروت کو جادو کا الہام کر کے بابل شہر میں اتارا کہ تم وہاں جا کر لوگوں کو جادو سکھاؤ۔

جو ان کے پاس جادو سیکھنے کے لئے آتا وہ فرشتے پہلے اسے نصیحت کرتے کہ ہم تو رب تعالیٰ کی طرف سے آزمائش بنا کر بھیجے گئے ہیں جو جادو سیکھے گا وہ کافر ہو جائے گا اس لئے تم جادو سیکھ کر کافر نہ بنو۔ البتہ جو شخص جادو سیکھنے سے بچ گیا وہ کفر سے بھی بچ جائے گا۔ اگر کوئی شخص ان کی نصیحت پر عمل کر لیتا تو ٹھیک ورنہ وہ اسے جادو سیکھا دیتے۔

تنبیہ: علامہ آلوسی رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں کہ تعجب ہے جو قرطبی نے بیان کیا ہے کہ ”ہاروت و ماروت“ بدل ہے شیاطین سے اور ﴿وَمَا أُنْزِلَ﴾ میں ”ما“ نافیہ ہے۔ اور ملکین سے مراد جبرائیل اور میکائیل ہیں۔ اس لئے کہ یہود نے گمان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں یعنی جبرائیل اور میکائیل پر جادو اتارا۔ اور امام قرطبی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ کلام میں تقدیم و تاخیر ہے تقدیر عبارت کی یہ ہے:

”﴿وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَنُ﴾ ﴿وَمَا أُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ﴾ ﴿وَلَكِنَّ الشَّيَاطِينَ﴾ ﴿هَارُوتَ وَمَارُوتَ﴾ ﴿كَفَرُوا يَعْلَمُونَ النَّاسَ السَّحَرَ﴾ ﴿بِبَابِلَ﴾“

اس کا رد علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے ان الفاظ سے کیا:

”ولا يخفى لدى كل منصف انه لا ينبغي لمؤمن حمل كلام الله تعالى وهو في اعلى مراتب البلاغة والفصاحة على ما هو ادنى من ذلك وما هو الا مسخ لكتاب الله تعالى عز شأنه واهباط له على شاواه ومفاسد قلة البضاعة لا تحصى“

کسی انصاف کرنے والے سے یہ مخفی نہیں کہ کسی مؤمن کی شان کے لائق ہو کہ اللہ تعالیٰ کا کلام جو فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ مراتب پر ہے اسے ادنیٰ پر محمول کیا جائے اس سے تو اللہ تعالیٰ کے کلام کا مسخ لازم آئے گا۔ اور اس کو اپنے اعلیٰ مقام سے گرانے کے مترادف ہے اور اس کے قیمتی سرمایہ فصاحت و بلاغت کو کم کرنے کے بے شمار مفاسد لازم آئیں گے۔

(از روح المعانی)

خیال رہے کہ راقم کا یہ انداز تحریر نہیں کہ مفسرین کرام کے اختلاف کو ذکر کیا جائے۔ لیکن طلباء کرام کے فائدہ کے لئے اس بحث کو ذکر کر دیا ہے۔

فائدہ: ”وقال قتادة كان اخذ عليهما ان لا يعلما احد احتى يقولوا انما نحن فتنة“

قائدہ فرماتے ہیں کہ ان دونوں فرشتوں سے رب تعالیٰ نے وعدہ لیا کہ جب بھی کوئی تمہارے پاس جادو سیکھنے کے لئے آئے تو اسے بتانا کہ ہم تو آزمائش ہیں۔ یعنی یہ بتانے کے بغیر ہرگز کسی کو جادو نہ سکھانا۔

”فتنة“ سے مراد کیا ہے؟ ”واما الفتنة فهي المحنة والاختبار“ فتنة سے مراد محنت، آزمائش۔

”وقال ابن جريج في هذه الآية لا يجترئ على السحر الا كافر“

ابن جریج نے کہا اس آیت سے، یہ واضح ہوا کہ جادو کی جرات سوائے کافر کے اور کوئی نہیں کر سکتا۔

حدیث صحیح میں مذکور ہے۔

”من اتى كاهنا او ساجرا فصدقه بما يقول فقد كفر بما انزل الله“

علی محمد ؑ

جو شخص کسی کاہن اور ساحر کے پاس آیا اور اس نے جو کہا اس شخص نے اس کی تصدیق کر دی تو

(از صابونی)

کافر ہو جائے گا۔ مسئلہ واضح ہے کہ کفر کو صحیح تسلیم کرنا بھی کفر ہے۔

﴿فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ﴾

”تو وہ سیکھتے تھے ان دونوں سے وہ کہ تفریق ڈالتے جس کے ذریعے مرد اور اس کی زوجہ کے درمیان“

﴿مِنْهُمَا﴾ میں ضمیر ”ہاروت وماروت“ کی طرف لوٹ رہی ہے ”ما“ سے مراد سحر ہے یعنی لوگ آتے اور ہاروت اور ماروت سے جادو سیکھتے۔ جس کے ذریعے وہ افعال مذمومہ (برے کام) میں تصرف کر لیتے۔ ان افعال مذمومہ میں سب سے زیادہ قبیح یہ تھا کہ وہ سحر کے ذریعے زوجین (میاں بیوی) کے درمیان تفریق ڈال دیتے حالانکہ پہلے ان دونوں کے درمیان بہت بڑا میل جول اور بہت بڑی محبت پائی جاتی۔ زوجین کے درمیان تفریق ڈالنا شیطانوں کا کام ہے۔ جیسا کہ مسلم نے اپنی صحیح میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ذکر فرمایا:

”ان الشیطان لیضع عرشه علی الماء ثم یبعث سرایاه فی الناس فأقر بهم عنده منزلة اعظم عنده فتنة“، یجنی احدثهم فیقول ما زلت بفلان حتی ترکته وهو یقول کذا وکذا فیقول ابلیس لا والله ما صنعت شیاً ویجنی احدثهم فیقول ما ترکته حتی فرقت بینہ و بین اہله قال فیکربہ ویدنیہ ویلتزمہ ویقول نعم انت“

بیشک شیطان اپنا تخت پانی پر رکھتا ہے پھر وہ اپنے لشکر لوگوں میں بھیجتا ہے اس کے زیادہ قریب مرتبہ کے لحاظ پر وہ ہوتا ہے جو اس کے نزدیک بڑا فتنہ برپا کر کے آتا ہے۔ ان میں سے کوئی ایک آتا ہے تو وہ کہتا ہے میں فلاں سے اس وقت تک نہیں ہٹا جب تک اسے ایسے ایسے کہتے ہوئے نہیں چھوڑا۔ ابلیس کہتا ہے قسم ہے اللہ تعالیٰ کی تو نے کچھ نہیں کیا۔ ان میں سے ایک اور آتا ہے وہ کہتا ہے میں نے نہیں چھوڑا اسے یہاں تک کہ میں نے اس کے اور اس کی زوجہ کے درمیان جدائی کرادی تو وہ اسے اپنے قریب کرتا ہے گلے لگاتا ہے اپنا مقرب بنا لیتا ہے اور کہتا ہے تو بہت اچھا ہے۔

یعنی مرد اور عورت کے درمیان جدائی پیدا کرنا بہت بڑا فتنہ ہے کیونکہ اس کے اوپر کئی اور فتنے بدکاریاں مرتب ہوتی ہیں۔

(از صابونی)

﴿وَمَا هُمْ بِضَارِّينَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ﴾:

”اور وہ نہیں ضرر (نقصان) پہنچا سکتے اس کے ذریعے کسی ایک کو سوائے اللہ کے حکم سے۔“

﴿هُمْ﴾ ضمیر کا مرجع ہے ”سحر“ یا ”یہود“ یا ”شیاطین“ ہیں ﴿بِهِ﴾ ضمیر کا مرجع ”السحر“ ہے ﴿مِنْ أَحَدٍ﴾ میں من زائد ہے ﴿إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ﴾ ای بارادتہ وقضائہ، یعنی اذن کا معنی ارادہ اور قضا ہے۔ جن حضرات نے ”بِأَمْرِ اللَّهِ“ معنی کیا ہے اس کا مطلب بھی ارادہ اور قضا ہی ہے ”امر“ کا معنی اگر چہ اردو میں ”حکم“ کیا جاتا ہے لیکن حکم سے مراد بھی ”ارادہ وقضا“ ہی ہے۔

اب معنی واضح ہو گیا اور وہ جادو گر، اور یہود اور شیاطین جادو کے ذریعے کسی ایک کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتے سوائے اللہ تعالیٰ کے ارادہ اور اس کی قضا کے۔ خیال رہے کہ ”اذن“ کا معنی ”امر“ کر کے اسے حقیقی معنی میں اس لئے نہیں لیا جاسکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ﴾

”بیشک اللہ تعالیٰ نہیں حکم دیتا بے حیائی اور برے کاموں کا“

اس بحث سے یہ سمجھ لیا جائے کہ ”اذن“ کا معنی ”امر“ مفسرین کرام نے کیا ہے اردو تراجم میں ”حکم“ معنی کیا گیا ہے۔ اعلیٰ حضرت نے بھی یہ معنی کیا ہے لیکن ”امر“ اور حکم کا مجازی معنی ارادہ اور قضا ہی ہے۔

(ماخوذ از قرطبی و بیضاوی و شیخ زادہ)

﴿وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ﴾:

”اور وہ سیکھتے ہیں جو ان کو ضرر دیتا اور نفع نہ دیتا“ یعنی ان کا جادو سیکھنا ان کے لئے ضرر نقصان کا سبب تھا ”والعمل بالسحر كفر يتضرر به المرء في الآخرة“ کیونکہ جادو کا عمل کفر ہے اور کفر سے انسان کو آخرت میں نقصان ہوتا ہے یعنی اس کی وجہ سے عذاب دے کر اسے ضرر پہنچایا جائے گا۔ اور جادو سیکھنے میں انہیں کوئی نفع نہیں۔ بعض چیزوں میں کچھ نفع اور کچھ نقصان ہوتا ہے۔ لیکن جادو میں صرف ضرر ہی ضرر ہے۔

”وما يكون ضررا محضا يكون في غاية الرداءة“

اور جس چیز میں صرف نقصان ہی پایا جائے وہ بہت گھٹیا چیز ہوتی ہے۔

بظاہر اس میں وہم یہ ہوتا ہے کہ جادو کا علم حاصل کرنا بذات خود نفع مند ہے کیونکہ یہ علم ہے اور علم نفع دینے والی چیز کا نام ہے تو اس کا جواب یہ دیا گیا۔

﴿وَلَا يَنْفَعُهُمْ﴾ اذ مجرد العلم به غير مقصود ولا نافع الدارين

کہ علم حاصل کرنے کا اصل مقصد اس پر عمل کرنا اور دنیا و آخرت میں اس عمل کے ذریعے نفع حاصل کرنا ہے فقط علم کوئی نفع مند نہیں۔ جب جادو کا علم حاصل کرنا ہی ان کے لئے آزمائش کا سبب تھا، اور اس پر عمل کرنا ناجائز تھا، تو یقیناً اس میں ان کو کوئی نفع نہیں تھا بلکہ ان لوگوں کے لئے جادو سے اجتناب کرنا ضروری تھا۔

(ماخوذ از بیضاوی و شیخ زادہ)

﴿وَلَقَدْ عَلِمُوا لَمَنِ اشْتَرَاهُ مَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَقٍ﴾

”اور تحقیق جان لیا انہوں نے جس نے حاصل کیا یہ نہیں ہے اس کا آخرت میں کوئی حصہ“۔ یہود نے اللہ کی کتاب اور انبیاء کرام کی تعلیمات کو چھوڑ کر جادو پر عمل شروع کر دیا۔ ان کا اللہ کی کتاب اور اللہ کے رسولوں کو چھوڑ کر جادو کا عمل کرنا ان کیلئے آخرت میں کسی طرح بھی نفع مند نہیں تھا اور اس کا انہیں بھی علم تھا۔

﴿خَلَقٍ﴾ کا معنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ”نصیب“ بیان فرمایا۔

مطلب واضح ہے کہ یہود کو یقینی طور پر علم تھا کہ وہ جو سودا کر رہے ہیں کہ دین چھوڑ کر جادو حاصل کر رہے ہیں اس کا آخرت میں انہیں کوئی حصہ یعنی کسی قسم کا اجر و ثواب حاصل نہیں ہوگا۔ (از بیضاوی)

اس میں یہود کی زیادہ مذمت پائی گئی ہے کہ انہوں نے قباحت کا علم رکھنے کے باوجود اس کا ارتکاب کیا۔

﴿وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهِ أَنْفُسَهُمْ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ﴾

”اور برا ہے جس کے بدلے انہوں نے اپنی جانوں کا سودا کیا کسی طرح وہ جان لیتے۔“

﴿وَلَبِئْسَ﴾ البديل ما استبدلوا به من السحر عوضا عن الايمان

ومتابعة الرسول

مطلب یہ ہے کہ انہوں نے جادو کو حاصل کر کے ایمان اور رسول کی متابعت کو ترک کر دیا جو ان

کی جانوں کے لئے نقصان دہ تھا۔ تو گویا کہ انہوں نے جادو کے عوض اپنی جانوں کو عذاب کے حوالے کرنے کا سودا کر لیا۔
(از صابونی)

قاضی مظہری رحمہ اللہ نے حذف مصاف کا قانون بیان فرمایا ﴿وَلَبِئْسَ مَا شَرُّوا بِهِ﴾
یعنی باعوا بہ حظوظ ﴿أَنفُسَهُمْ﴾ اور برا ہے جس کے بدلے انہوں نے اپنی جانوں کے حصوں
(منافع، اجر و ثواب) کو بیچ دیا۔
(مظہری)

﴿لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ﴾ ”کسی طرح ان کو علم ہوتا“ اس پر بظاہر اعتراض یہ ہوتا ہے کہ پہلے ذکر
فرمایا ﴿وَلَقَدْ عَلِمُوا﴾ تحقیق انہوں نے جان لیا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں معلوم تھا کہ ان کا سودا
خسارے کا ہے لیکن ﴿لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ﴾ سے پتہ چلتا ہے ان کو علم نہیں تھا ان دونوں میں تطبیق کیسے؟
اس کا ایک جواب یہ ہے ”معناہ انہم لما لم يعملوا بها علموا فکانہم ما علموا“
کہ وہ جانتے تو تھے اور یقینی طور پر جانتے تھے یہ مفہوم ہے ﴿وَلَقَدْ عَلِمُوا﴾ کا۔ لیکن وہ اپنے علم کے
مطابق نہیں کرتے تھے اس لئے گویا کہ وہ نہیں جانتے تھے یہ مفہوم ہے ﴿لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ﴾ کا۔
اس کا دوسرا جواب ہے:

”وقيل المثبت العقل الغریزی والعلم الاجمالی بقبح الفعل وترتب

العقاب والمنفی العلم بحقیقة ما يلحقه من العذاب“

جہاں علم کا ثبوت اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں عقل دے رکھی ہے اور ان کو اجمالی طور
پر اتنا علم حاصل ہے کہ یہ کام برا ہے اس پر عذاب مرتب ہونا ہے تاہم ان کو تفصیلی علم حاصل نہیں۔ جہاں علم
کی نفی کی گئی ہے اس سے مراد یہ ہے کہ ان کو اس حقیقت کا علم نہیں کہ ان کو کتنا عذاب ہونا ہے کیسا عذاب ہونا
ہے یعنی وہ اتنا علم رکھتے تھے کہ ان کو عذاب ہوگا وہ اس عذاب کی تفصیل کو نہیں جانتے تھے۔

اس کا تیسرا جواب جس کو قاضی مظہری رحمہ اللہ نے ”والنحار عندی“ (اور میرا مختار یہ ہے) سے تعبیر
فرمایا یہ ہے:

”ان العلم علماں علم يتعلق بظاہر القلب وذا لا يستطيع العمل“

یشک علم کی دو قسمیں ہیں ان میں سے ایک قسم یہ ہے جس کا تعلق دل کے ظاہری حصہ سے ہوتا

ہے وہ دل کے اندر اثر انداز نہیں ہوتا اس علم سے عمل حاصل نہیں ہوتا۔ یہود کو یہی علم حاصل تھا رب تعالیٰ نے فرمایا: ﴿يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ ابْنَاءَهُمْ﴾ وہ آپ کو پہچانتے ہیں جیسا کہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں لیکن اس علم اور معرفت نے بھی ان کو کوئی نفع نہ دیا۔ اور رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿مِثْلَهُمْ كَمِثْلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَارًا﴾

”(ان کی مثال) گدھے کی مثال ہے جو پیٹھ پر کتابیں اٹھائے“

یہ علم یہود کو حاصل تھا جس کا ذکر ﴿وَلَقَدْ عَلِمُوا﴾ میں ہے لیکن اس علم نے ان کو کوئی نفع نہ دیا۔

”وَعِلْمٌ وَهَبِي يَتَخَلَصُ إِلَى صَمِيمِ الْقَلْبِ بَعْدَ انْجِلَاثِهِ وَالْيَ نَفْسِ بَعْدَ

اطمینانہ“

علم کی دوسری قسم ”علم دہی“ ہے یہ دل کی کدورت کے زوال اور اسے جلاء حاصل ہونے کے بعد حاصل ہوتا۔ جو دل کی گہرائیوں کے ساتھ خالص اثر انداز ہوتا ہے جس سے صمیم قلب ہو جاتا ہے۔ یہ علم انسان کو عمل کے اعلیٰ مقام تک پہنچا دیتا ہے۔

اور یہی علم نفس کے ساتھ خالص متعلق ہو جاتا ہے جب نفس کو اطمینان حاصل ہو جائے۔ یہی علم وہ ہے جس میں کمال ہے اور یہ علم یہود کو حاصل نہیں تھا اسی لئے فرمایا ﴿لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ﴾ ”کسی طرح وہ جانتے“۔ علم وہی کا ثبوت قرآن وحدیث سے رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ﴾ بیشک اللہ سے ڈرنے والے اللہ کے بندوں سے علماء ہی ہیں۔ یہ علم وہی ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے علماء کو رب تعالیٰ کا کامل خوف حاصل ہوتا ہے۔

☆ ”وَقَوْلُهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ الْعُلَمَاءُ وَرِثَةُ الْأَنْبِيَاءِ يُحِبُّهُمْ أَهْلُ السَّمَاءِ وَيَسْتَغْفِرُ لَهُمْ

الْحَيَاتَانِ فِي الْبَحْرِ إِذَا مَاتُوا إِلَى يَوْمِ الْقِيَمَةِ“

اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا علماء انبیاء کے وارث ہیں ان سے آسمان والے محبت کرتے ہیں اور جب یہ فوت ہو جائیں تو ان کے لئے دریاؤں میں مچھلیاں قیامت تک بخشش طلب کرتی رہیں گی۔

(رواہ ابن الجار عن انس)

☆ ”خَيْرُ الْخِيَارِ خِيَارُ الْعُلَمَاءِ وَشَرُّ الشَّرَارِ شَرَارُ الْعُلَمَاءِ“

سب سے بہتر لوگوں میں بہتر وہ علماء ہیں جو بہتر ہوں اور سب شر لوگوں میں زیادہ شر وہ علماء ہیں

جو شر ہوں۔ اس حدیث پاک میں دونوں علموں کا ذکر کیا گیا علم وہی اور وہ علم جو قلب (دل) کے ظاہر سے متعلق ہو۔
(رواہ الدارمی من حدیث الاحوص بن حکیم)

☆ ”وعن الحسن قال العلم علما نفعلم فی القلب فذلک العلم النافع وعلم علی اللسان فذلک حجة الله علی ابن آدم“

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں علم کی دو قسمیں ہیں ایک علم وہ جو دل میں ہوتا ہے یہ علم نفع مند ہے۔ اور دوسرا علم جو زبان پر ہوتا ہے یہ اللہ تعالیٰ کی ابن آدم پر حجت ہے (کہ اے انسان تو جاننے کے باوجود بیان کرنے کے باوجود اس پر عمل کیوں نہیں کر سکے گا۔)
(رواہ الدارمی)

ہاروت اور ماروت کے متعلق اسرائیلی روایات:

اس واقعہ میں اسرائیلی روایات میں سے تجاوز کر جاتی ہیں۔ ایک روایت کے ذکر کرنے کے بعد علامہ آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

”الی غیر ذلک من الآثار التي بلغت طرقها نیفا وعشرین“

اسی طرح اور روایات سے بھی ثابت ہے جو تیس سے اسیس تک ہیں۔ (روح المعانی)

مختلف اسناد اور مختلف الفاظ سے ثابت ہونے والی روایات کا مفہوم تقریباً ایک ہی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

ہاروت اور ماروت کا واقعہ یہ ہے کہ جب انسانوں کے گناہ فرشتے آسمانوں کی طرف لے جاتے تو وہ کہتے کہ ان کو شرم آنی چاہئے کہ یہ کتنے گناہ کرتے ہیں۔ رب تعالیٰ نے فرمایا اگر میں تمہیں زمین پر بھیجوں اور تم میں وہی چیزیں (شہوات) رکھ دوں جو ان میں رکھی ہیں تو تم بھی ان ہی کاموں کے مرتکب ہو جاؤ جن کے انسان مرتکب ہو رہے ہیں۔

﴿فقالوا سبحانک مالنا ان نعصیک﴾

”تو فرشتوں نے کہا اے اللہ تیری ذات پاک ہے ہم تیری نافرمانی نہیں کریں گے“

رب تعالیٰ نے فرمایا تم دو کا انتخاب کر لو جن کو تم بہتر سمجھتے ہو، ہاروت اور ماروت کا انتخاب کر لیا

گیا۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی طرح خواہشات نفسانیہ عطا کر دیں۔ اور زمین پر بیج دیا اور ان کو حکم دیا کہ لوگوں میں انصاف سے فیصلے کرنا اور ان کو شرک سے منع کرنا، اور ناحق قتل سے روکنا اور زنا سے منع کرنا اور شراب پینے سے لوگوں کو منع کرنا۔

یہ ہر روز زمین پر آتے رب تعالیٰ کے حکم کے مطابق فیصلے کرتے لوگوں کو بتاتے کہ ہم تمہارے لئے آزمائش ہیں۔ جادو نہ سیکھو، اگر کوئی ان کے روکنے کے باوجود سیکھتا تو اسے سکھا دیتے۔ ہر شام کو یہ اللہ تعالیٰ کے اسم اعظم کو پڑھتے اسی کے ذریعے آسمانوں پر چڑھ جاتے ایک ماہ تک یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا۔ اس کے بعد دونوں فرشتے ایک زہرہ نامی عورت کے عشق میں مبتلا ہو گئے جب اس نے انہوں نے اپنی حاجت طلب کرنے کے متعلق کہا تو اس نے کہا تم شراب پیو اور میرے خاوند کو قتل کرو تو میں تمہاری حاجت کو پورا کروں گی۔ انہوں نے شراب پی لیا اسی نشہ کی حالت میں اس عورت سے زنا کے مرتکب بھی ہو گئے۔ جب ایک شخص (عورت کے خاوند) کو آتے ہوئے دیکھا تو اسے قتل بھی کر دیا۔

ان جرائم کے بعد وہ اسم اعظم پڑھ کر آسمان کی طرف جانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ناکام ہو جاتے ہیں ان کے پروں میں طاقت ہی نہیں رہتی وہ عورت اسم اعظم پڑھ کر آسمانوں پر چلی گئی اسے ستارہ بنا دیا گیا زہرہ ستارہ وہی ہے۔

ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

”لعن اللہ الزہرۃ فانما ہی التی فتن الملکین ہاروت وماروت“
اللہ تعالیٰ زہرہ پر لعنت کرے کہ اس نے دو فرشتوں کو فتنہ میں ڈال کر برباد کر دیا۔

وہ دونوں فرشتے جب آسمانوں پر چڑھنے میں ناکام ہو گئے تو اس وقت کے نبی حضرت ادریس علیہ السلام کے پاس آئے۔ اور ان سے عرض کیا کہ ہماری شفاعت کریں۔ ان کی شفاعت پر اللہ تعالیٰ نے ان کو اختیار دے دیا کہ چاہیں تو دنیا کا عذاب پسند کر لیں اور چاہیں تو آخرت کا عذاب پسند کر لیں انہوں نے دنیا کا عذاب پسند کیا۔ ان کو بابل کے ایک کنوئیں میں ان کے بالوں سے لٹکا دیا گیا وہ کنواں آگ سے بھرا ہوا ہے یہ عذاب ان کو اس وقت ہوتا رہے گا جب تک دنیا قائم ہے۔

(ماخوذ از مطہری)

اسرائیلی روایات کون سی ہیں؟

کعب بن احبار رضی اللہ عنہ جو پہلے یہودیوں کے عالم تھے وہ ایمان لے آئے یہ تابعی تھے صحابی نہیں تھے۔ حضرت کعب بن احبار اکثر طور پر صحابہ کرام اور تابعین کو یہود کے واقعات اور ان کے اقوال سناتے رہتے تھے آپ کے سنانے کی وجہ یہ ہوتی تھی کہ لوگ ان کے غلط اقوال سے اجتناب کریں عبرت پکڑیں اور قرآن پاک، دین اسلام اور یہودیت میں فرق کریں۔

حضرت کعب بن احبار رضی اللہ عنہ کے بیان کردہ واقعات کو صحیح اسناد سے آگے بیان بھی کر دیا گیا۔ اس لحاظ پر اس واقعہ سے متعلق صحیح اسناد سے بیس روایات سے زائد مروی ہیں۔ اگر ان کا وہی مطلب لیا جائے جو حضرت کعب کے بیان کا ہوتا تھا کہ یہود ہاروت اور ماروت کا واقعہ اس طرح بیان کرتے تھے تو درست ہوگا۔ اگر ان واقعات کا مطلب اس طرح بیان کیا جائے کہ یہ مطلب قرآن و حدیث کے مطابق ہے تو غلط ہوگا۔
(ماخوذ از النیان للکاظمی)

اسرائیلی روایات کا مفسرین کرام نے رد کیا:

”فقد انکرہ جماعة منهم القاضي عیاض و ذکر ان ما ذکرہ اهل

الاخبار و نقلہ المفسرون فی قصة هاروت و ماروت لم یرد منه شئی لا

سقیم ولا صحیح عن رسول اللہ ﷺ و لیس هو شیاً یؤخذ بالقیاس“

ان اسرائیلی روایات کا علماء کی جماعت نے انکار کیا ہے جن میں قاضی عیاض رحمہ اللہ بھی ہیں جو واقعات اہل اخبار نے بیان کئے ہیں۔ اور مفسرین کرام نے ہاروت اور ماروت کے متعلق جن روایات کو نقل کیا ہے ان میں سے کوئی روایت بھی صحیح یا ضعیف رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں۔ اور یہ مسئلہ قیاس سے ثابت ہونے والا نہیں کہ قیاس کیا جائے۔

☆ ”و ذکر فی البحر ان جمیع ذلک لا یصح منه شئی“

بحر میں ذکر کیا گیا ہے کہ تمام روایات اس واقعہ میں بیان ہونے والی صحیح نہیں۔ یعنی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات ہیں۔

☆ ”ولم یصح ان رسول اللہ ﷺ کان یلعن الزہرة“

نبی کریم ﷺ کی طرف منسوب ہونے والا قول کہ آپ زہرہ پر لعنت کرتے تھے صحیح نہیں یعنی آپ کا یہ ارشاد ہی نہیں۔ اور یہ روایت حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کی جاتی ہے لیکن ان سے بھی اس روایت کا صحیح ثبوت نہیں۔

☆ اور امام رازی رحمہ اللہ نے بھی اس روایت کو ذکر کرنے کے بعد فرمایا: ”ان هذه الرواية فاسدة مردودة غير مقبولة“ بیشک یہ روایت فاسد ہے مردود ہے، مقبول نہیں۔

☆ شہاب عراقی رحمہ اللہ نے واضح طور پر ذکر فرمایا کہ جو شخص ہاروت اور ماروت کے متعلق یہ عقیدہ رکھے:

”انهما ملكان يعذبان على خطيئتهما مع الزهرة فهو كافر بالله تعالى العظیم“

کہ وہ دونوں فرشتے زہرہ کے ساتھ گناہ میں مبتلاء ہونے کی وجہ سے عذاب دیئے جا رہے ہیں وہ شخص اللہ تعالیٰ کا منکر ہے، کافر ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ فرشتے معصوم ہیں رب تعالیٰ نے ان کی عصمت کو بیان فرمایا:

﴿لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ﴾ ☆ لَا يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِهِ وَلَا يَسْتَحْسِرُونَ ☆ يَسْبَحُونَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُونَ ﴿﴾

”وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے وہی کرتے ہیں جس کا ان کو حکم دیا جاتا ہے اور یہ ارشاد فرمایا وہ اللہ کی عبادت سے تکبر نہیں کرتے اور تھکتے نہیں اور یہ ارشاد فرمایا وہ دن رات اللہ کی تسبیح کرتے ہیں سستی نہیں کرتے۔“

☆ ”والزهرة كانت يوم خلق الله تعالى السماوات والارض والقول بانها تمثل لهما فكان ما كان وردت الى مكانها غير معقول ولا مقبول“

یہ کہنا کہ وہ زہرہ نامی عورت ستاہ بن گئی اور وہاں پہنچ گئی جہاں زہرہ ستارہ کی جگہ تھی یہ عقل کے خلاف ہے اور مقبول بھی نہیں کیونکہ زہرہ ستارہ کو تو اسی دن پیدا کر دیا گیا جس دن اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان پیدا فرمائے۔

تنبیہ: بعض لوگوں نے ہاروت اور ماروت کے اس واقعہ کا مطلقاً انکار کر دیا تھا کہ اس کا کوئی ثبوت

ہی نہیں۔ ان پر علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے اعتراض کیا کہ نفس واقعہ کا انکار کرنا صحیح نہیں کیونکہ اسے امام احمد، ابن حبان، اور بیہقی وغیرہ نے بیان کیا ہے کوئی روایت مرفوع اور کوئی حضرت علی اور حضرت ابن عباس اور ابن عمر اور ابن مسعودؓ پر موقوف ہیں اس میں متعدد صحیح روایات ثابت ہیں جو ان روایات پر واقف ہیں وہ ان کی صحت پر یقین رکھتے ہیں اور ان کی کثرت اور قوت مخرج کے لحاظ پر بھی ان پر کامل وثوق کیا جاسکتا ہے۔

”وذهب بعض المحققين ان ماروی مروی حکایة لما قاله اليهود
وهو باطل فی نفسه وبطلانه فی نفسه لا ینافی صحة الروایة ولا یرد ما
قاله الامام السيوطی علیه انما یرد علی المنکرین بالکلیة“

محققین علماء کرام نے بیان فرمایا ہے کہ یہود نے جو بیان کیا ہے وہ باطل ہے لیکن ان کے باطل اقوال کو جو بیان کیا گیا ہے اس میں روایات صحیحہ کثیر تعداد میں موجود ہیں واقعہ کا باطل ہونا صحت روایات کے منافی نہیں۔

لہذا واضح ہوا کہ علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے جو بیان فرمایا ہے وہ ان لوگوں کا رد فرمایا جو یہ کہتے تھے کہ یہ واقعہ کسی روایت سے ثابت نہیں علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے ان کا رد کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ واقعہ تو صحیح اسناد سے متعدد روایات سے ثابت ہے۔ لیکن آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ واقعہ باطل نہیں کہ آپ کا رد کیا جائے۔

(ماخوذ از روح المعانی)
تنبیہ: حضرت کعب بن احبار کی تمام روایات کو اسرائیلی روایات کہنا بھی بے دانشی (نا سمجھی) ہے صرف وہی روایات اسرائیلی ہوں گے جن کو جلیل القدر مفسرین کرام نے اسرائیلی کہا ہے آج کل کے معاندین کے اقوال باطلہ کا کوئی اعتبار نہیں۔

گزشتہ سے پیوستہ: کیا جادو گر سے سوال کیا جاسکتا ہے کہ وہ جادو کو کھول دے؟ حضرت سعید ابن مسیب نے اس کی اجازت دی ان کا قول امام بخاری نے نقل فرمایا ”وقال الشعبي لا بأس بالنشرة“ اور شعبی نے بھی یہ کہا ہے کہ جادو کھلوانے میں کوئی حرج نہیں۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے اسے مکروہ بیان فرمایا ہے کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے

مروی ہے آپ نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا:

”یا رسول اللہ ہلا تنشرت فقال اما اللہ فقد شفانی وخشیت ان

افتح علی الناس شرا“

یا رسول اللہ آپ جادو کو (کسی جادوگر سے) کھلاتے کیوں نہیں؟ آپ نے فرمایا مجھے اللہ تعالیٰ نے شفاء عطا فرمادی ہے مجھے ڈر ہے کہ میرے اس فعل سے (جادوگروں سے جادو اگر کھلواؤں) تو لوگوں پر شر کا دروازہ نہ کھل جائے یعنی ایسا نہ ہو کہ لوگ جادوگروں کے پاس جا کر جادو کا عمل عام نہ شروع کر دیں۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے وہب سے نقل کیا کہ بیری کے سات پتے لئے جائیں پھر ان کو دو پتھروں کے درمیان کوٹ لیا جائے پھر ان کو پانی میں حل کر دیا جائے ان پر آیۃ الکرسی پڑھی جائے جادو کئے ہوئے شخص کو تین سانسوں میں پلا دیا جائے اور باقی سے وہ غسل کر لے تو اسے شفاء حاصل ہو جائے گی۔

علامہ صابونی رحمہ اللہ فرماتے ہیں زیادہ بہتر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جادو کے زوال کے لئے سورۃ الفلق اور سورۃ الناس کو نازل فرمایا ان کو ہی پڑھ کر دم کیا جائے۔ چونکہ حدیث شریف میں بھی رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے ”لم يتعوذ المتعوذ بمثلها“ ان دو سورتوں جیسی کوئی اور چیز نہیں جس سے پناہ پکڑنے والا پناہ پکڑے۔

”و كذلك قراءة آية الكرسي فانها مطردة للشيطان“

اسی طرح آیۃ الکرسی کا پڑھنا بھی شیطان کو بھگاتا ہے۔ (از صابونی)

ہاروت اور ماروت کے آنے کی فقط یہ وجہ:

ان دونوں فرشتوں کو زمین پر بھیجنے کی وجہ یہ تھی کہ یہ لوگوں کو جادو کے متعلق بتائیں کہ جادو سیکھنا جائز ہے اور ان لوگوں کو جادو اور معجزہ میں فرق معلوم ہو جائے۔ اور ان کو یہ پتہ چل جائے کہ اللہ تعالیٰ کی آزمائش میں اسکے حکم کے خلاف کام کرنا باعث کفر ہے۔ اور اس کی منشا کے مطابق کام ذریعہ نجات ہے۔

(از مظہری)

ایک سوال اور اس کا حل اگر یہاں یہ سوال کیا جائے کہ جب یہ کام انبیاء کرام علیہم

الصلوۃ والسلام بھی کر سکتے تھے اس پر فرشتوں کو مامور فرمانے کی کیا حکمت تھی اس کا جواب یہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کا بنیادی کام یہ تھا کہ وہ لوگوں کو کفر و شرک سے بچنے کی تعلیم دیتے تھے اگر وہ

فرشتوں کی طرح لوگوں کو سحر کے اعمال کفریہ و شرکیہ سکھاتے تو یہ ان کے بنیادی کام کے خلاف ہوتا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کام پر فرشتوں کو مامور فرمایا۔
(البيان للكاظمی رحمہ اللہ)

نبی کریم ﷺ پر جادو:

”عن عائشة قالت سحر رسول الله ﷺ يهودى من يهودى بنى زريق يقال له لبید بن الاعصم قالت حتى كان رسول الله ﷺ يخيل اليه انه يفعل الشئ وما يفعله حتى اذا كان ذات يوم او ذات ليلة دعا رسول الله ﷺ ثم دعائهم دعائهم قال يا عائشة اشعرت ان الله افتانى فيما استفتية فيه جاءنى رجلان فقعد احدهما عند رأسى والآخر عند رجلى فقال الذى عند رأسى للذى عند رجلى او الذى عند رجلى للذى عند رأسى ما وجع الرجل قال مطبوب قال من طبه قال لبید بن الاعصم قال فى اى شئى قال فى مشط ومشاطة وجب طلعة ذكر قال فاين هو قال فى بنردى اروان قالت فاتاها رسول الله ﷺ فى اناس من اصحابه ثم قال يا عائشة والله لكان ماءها نقاعة الحناء ولكان نخلها رؤس الشياطين قالت فقلت يا رسول الله افلا احرقته قال لا اما انا فقد عافانى الله وكرهت ان اثير على الناس شرا فامرت بها فدفنت“

(مسلم ج ۲ باب السحر)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ پر بنی زریق کے یہودیوں میں سے ایک یہودی نے جادو کر دیا۔ اس یہودی کا نام لبید بن اعصم تھا۔ آپ فرماتی ہیں اس کا اثر یہاں تک ہو گیا کہ آپ خیال فرماتے تھے کہ یہ کام کر لیا ہے۔ حالانکہ آپ نے وہ کیا نہیں ہوتا تھا۔ ایک روز رسول اللہ ﷺ نے دعا فرمائی، پھر دعا فرمائی، پھر دعا فرمائی۔ پھر آپ نے فرمایا اے عائشہ کیا تمہیں معلوم ہے اللہ تعالیٰ نے مجھے وہ بتا دیا ہے جو میں نے پوچھا۔ میرے پاس دو شخص آئے ایک میرے سر کے پاس بیٹھ گیا اور دوسرا میرے پاؤں کے پاس بیٹھ گیا۔ ان میں سے ایک نے دوسرے سے پوچھا اس شخص کو کیا تکلیف ہے (درد

کس وجہ سے ہیں) دوسرے نے جواب دیا کہ اس پر جادو کر دیا گیا ہے پہلے نے کہا اس پر جادو کس نے کیا دوسرے نے کہا البید بن اعصم نے۔ پہلے نے پھر کہا کس چیز میں جادو کیا ہے؟ دوسرے نے جواب دیا کنگھی اور کنگھی کرتے ہوئے گرنے والے بالوں میں اور مذکر کھجور کے شکوفہ میں۔ پہلے نے پھر کہا انہیں کہا رکھا ہوا ہے اس نے کہا ”بسر ذی اروان“ میں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں نبی کریم ﷺ اپنے صحابہ کرام میں سے چند صحابہ کو ساتھ لے کر اس کنوئیں کے پاس آئے اس کا پانی ایسے سرخ تھا جیسے اس میں مہندی گھول دی گئی ہو۔ اور اس کے (ارد گرد) کھجوروں کے سراپے ہیں جیسے شیاطین کے سر ہوں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں میں نے عرض کیا آپ نے ان کو جلا کیوں نہیں دیا۔ آپ نے فرمایا انہیں جلا یا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے آرام دے دیا۔ اور میں نے ناپسند سمجھا کہ لوگوں پر شر پھیلاؤں میں نے حکم دیا ان چیزوں کو دفن کر دیا گیا۔

وضاحت حدیث:

اس حدیث پاک کی وضاحت میں امام رازی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اہل سنت کے جمہور علماء کا یہ مذہب ہے کہ سحر ثابت ہے اور سحر کی حقیقت ہے۔ معتزلہ نے کہا سحر خیالات باطلہ ہیں لیکن حقیقت میں یہ کہنے والوں کے خیالات باطلہ ہیں۔

”وقد انکر بعض المبتدعة هذا الحديث بسبب آخر فزعم انه يحط منصب النبوة“

بعض مبتدعین نے اس حدیث کا انکار کر دیا کہ اس سے منصب نبوت میں فرق پڑتا ہے لیکن یہ ان کا کہنا باطل، جھوٹ اور من گھڑت قول ہے۔

”لان الدلائل لا قطعية قد قامت على صدقه وصحته وعصمته فيما يتعلق بالتبليغ والمعجزة شاهدة بذلك وتجويز ما قام الدليل بخلافه باطل“

اس لئے کہ دلائل قطعیہ قائم ہیں اس پر کہ حدیث پاک صحیح ہے اور آپ پر جادو کا ہونا سچ ہے۔ البتہ نبی کریم ﷺ کی تبلیغ اور اس کے ساتھ متعلق امور جادو کے دوران بھی جاری رہے بلکہ یہ نبی کریم ﷺ

کا معجزہ ہے کہ جادوئے آپ کی تبلیغ میں کوئی اثر نہ کیا۔ لہذا واضح ہوا کہ جو علم دلائل سے ثابت ہو اس کے خلاف کہنا باطل ہے۔

”قال القاضي عياض وقد جاءت روايات هذا الحديث مبينة ان
السحر انما تسلط على حسده وظواهر جوارحه لا على عقله
وقلبه واعتقاده“

قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس حدیث کی روایات واضح ہیں بیشک جادو کا اثر نبی کریم ﷺ کے جسم پر اور ظاہری اعضاء پر ہوا۔ آپ کی عقل اور دل اور اعتقاد پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اور اس حدیث پاک میں نبی کریم ﷺ کے دعاء کرنے سے یہ ثابت ہوا۔

”هذا دليل لا استحباب الدعاء عند حصول الامور المكروهات
وتكريره وحسن الالتجاء الى الله تعالى“

کہ یہ دلیل ہے کہ مشکل اور تکالیف کے وقت دعاء کرنا مستحب ہے اور دعائیں تکرار یعنی اللہ تعالیٰ سے التجاء کرنے میں دعا بار بار کی جائے تین مرتبہ دعا کرنا مستحب ہے۔

(مشاطہ) بضم المیم کنگھی کرتے ہوئے سر اور داڑھی کے جو بال گریں۔ (مشط)
بضم المیم وبکسرھا، کنگھی۔ (ذی اروان) ایک کنواں ہے جو مدینہ طیبہ میں بنی زریق کے
باغ میں تھا بخاری میں اس کا نام ”ذروان“ ذکر ہے۔

راقم کے خیال میں اصل نام ”ذی اروان“ ہے اور مخفف طور پر بولتے ہیں ”ذروان“ آیا ہوا
ہے اسی لئے علامہ نووی رحمہ اللہ نے دونوں کو صحیح کہا اور پہلے کو اجود (عمدہ) کہا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان
چیزوں کو جلایا نہیں جن پر جادو کیا گیا تھا بلکہ دفن کر دیا۔ اس کی وجہ آپ نے خود ہی بیان فرمادی کہ
اللہ تعالیٰ نے مجھے آرام دے دیا۔ جلانے میں لوگوں میں شرم پھیلتا۔ یعنی جادو کا چرچا ہوتا جادو کے سیکھنے،
سکھانے کا عام چرچا ہوتا جس سے مسلمانوں میں فتنہ پھیلتا۔

(ماخوذ از نووی)

﴿ وَلَوْ أَنَّهُمْ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَمَثُوبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللَّهِ خَيْرٌ لَّوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴾

(آیت ۱۰۳)

(۱) ”اور اگر وہ ایمان لاتے اور پرہیزگاری کرتے تو اللہ کے یہاں کا ثواب بہت اچھا ہے کسی طرح انہیں علم ہوتا۔“

(۲) ”اور اگر وہ ایمان لاتے اور تقویٰ حاصل کرتے البتہ ثواب دیئے جاتے اللہ کی طرف سے (وہ جو) بہت اچھا ہے کسی طرح وہ جانتے۔“

﴿ وَلَوْ أَنَّهُمْ ﴾ : ای الیہود، یعنی ”ہم“ ضمیر یہود کی طرف لوٹ رہی ہے۔

﴿ آمَنُوا ﴾ : بکتابہم وبما امروا بالایمان بہ مما نزل بعدہ “ اور اگر وہ یہود اپنی کتاب (توراة) پر ایمان لاتے اور اس چیز پر ایمان لاتے جو بعد میں نازل ہوئی اور اس پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا۔

(تفسیر الرحمن)

﴿ آمَنُوا ﴾ بالنبی والقرآن “ اور اگر یہود نبی کریم ﷺ پر اور قرآن پاک پر ایمان لاتے۔

(علائین)

﴿ وَاتَّقُوا ﴾ ای المعاصی التی حکیت عنہم “ اور اگر وہ ان گناہوں سے بچ جاتے جو گناہ ان کے بیان کئے جاتے ہیں۔

(روح المعانی)

﴿ وَاتَّقُوا ﴾ عن متابعة المنسوخ بعد نزول الناسخ ومتابعة كتب السحر “ اور اگر وہ منسوخ کتاب و دین کی متابعت سے ناسخ کے نازل ہونے کے بعد بچ جاتے اور جادو کی کتابوں کی متابعداری سے بچ جاتے۔

(تفسیر الرحمن)

﴿ لَمَثُوبَةٌ ﴾ یہ ”لو“ کا جواب ہے اور اصل میں ”لا تیبوا مَثُوبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللَّهِ خَيْرًا“ البتہ ان کو ثواب دیا جاتا اللہ کے ہاں بہتر۔

(بصاوی)

﴿ مِّنْ عِنْدِ اللَّهِ خَيْرٌ ﴾ یعنی اللہ کے ہاں دنیا اور دنیا کی تمام چیزوں سے بہتر ان کو ثواب دیا جاتا چہ جائیکہ کہ وہ رشوت حاصل کریں یعنی ان کو رشوت سے حاصل ہونے والے مال اور جادو سے حاصل ہونے والے مال سے بہتر ثواب دیا جاتا۔

(تفسیر الرحمن)

﴿لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ﴾ ”کسی طرح وہ جانتے“ یعنی اگر وہ جانتے حقائق کو کہ ثواب رشوت وغیرہ سے بہتر ہے لیکن ان کو اس کا پتہ نہ چل سکا کیونکہ انہوں نے دنیاوی منافع کو اخروی سعادت پر ترجیح دی۔
(از تبصیر الرحمن)

مفہوم واضح ہے کہ یہود اگر ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ان کو اللہ کے ہاں بہتر ثواب عطا کیا جاتا کسی طرح وہ حقائق کو جانتے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں علم حق عطا فرمائے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور نبی کریم ﷺ کی محبت پر قائم و دائم رکھے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انْظُرْنَا
وَاسْمَعُوا وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ (آیت ۱۰۴)

(۱) اے ایمان والو! راعنا نہ کہو اور یوں عرض کرو کہ حضور ہم پر نظر رکھیں اور پہلے سے ہی بغور سنو اور کافروں کے لئے دردناک عذاب ہے۔

(۲) اے ایمان والو! نہ کہو راعنا اور کہو نظر کرم فرماؤ ہم پر۔ اور (پہلے سے ہی) بغور سنو۔ اور کافروں کے لئے عذاب ہے دردناک۔

اللہ تعالیٰ نے یہود کے قبیح افعال و اقوال اور اعتقادات کی وضاحت فرمادی، لیکن ان کا تعلق نبی کریم ﷺ کی بعثت سے پہلے سے ہے۔ اب ان کے وہ قبائح (برے افعال و اقوال) بیان کئے جا رہے ہیں جن کا تعلق نبی کریم ﷺ کی بعثت کے بعد سے ہے۔

یہود نے نبی کریم ﷺ کی بعثت کے بعد آپ پر طعن کرنے، آپ کے عیوب نکالنے، اور آپ کے دین میں طعن پیش کرنے کی انتھک کوشش کی، لیکن ان کی کوششیں تمام کی تمام ناکام ثابت ہوئیں۔
شان نزول: نبی کریم ﷺ جب کوئی ارشاد فرماتے، اگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس پر توجہ نہ کرنے کی وجہ سے نہ سمجھ پاتے تو آپ کی خدمت میں عرض کرتے ”راعنا یا رسول اللہ“ آپ ہماری انتظار فرمائیں۔ آپ ہماری رعایت فرمائیں یا رسول اللہ۔ یعنی آپ ذرا ٹھہر ٹھہر کر ارشاد فرمائیں۔ اور یہ ارشاد پھر سے لوٹا دیں تاکہ ہم سمجھ سکیں۔

یہود نے جب سنا کہ نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام ان کی خدمت میں ”راعنا“ کا لفظ بولتے ہیں تو وہ بہت خوش ہوئے کیونکہ یہ کلمہ ان کی زبان میں گالی کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ (جیسا کہ آنے والی وضاحت میں ان شاء اللہ سمجھ آ جائے گا) اس لئے وہ ایک دوسرے کو کہنے لگے ”کنا نسب محمدا سرا فاعلنوا بہ الآن“ کہ ہم محمد کو دل میں گالیاں دیا کرتے تھے، لیکن اب تو اعلانیہ طور پر گالیاں دو۔ یعنی ”راعنا“ کہہ کر گالی دو۔

انہوں نے بھی اسی لفظ کا استعمال کرنا شروع کر دیا۔ جب وہ منافقانہ چال سے ”راعنا یا رسول اللہ“ کہتے تو ”یضحکون فیما بینہم“ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ہنستے، کہ ہم تو گالیاں دے رہے ہیں۔

(نبی کریم ﷺ تو سن کر خاموش رہتے کیونکہ آپ اپنے اخلاق کریمانہ کی وجہ سے ذاتی انتقام نہیں لیتے تھے)

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ یہود کی زبان کو جانتے تھے۔ آپ نے جب ان کو ہنستے ہوئے دیکھا تو سمجھ گئے کہ یہ لوگ تو ”راعنا“ کے لفظ کو غلط طور پر استعمال کر رہے ہیں تو آپ نے یہود کو کہا ”لئن سمعتھا من احد منکم یقولھا لرسول اللہ ﷺ لا ضربن عنقہ“ اگر میں نے تم میں سے کسی ایک کو رسول اللہ ﷺ کے سامنے ”راعنا“ کہتے ہوئے سنا تو میں اس کی گردن اڑا دوں گا۔

وہ کہنے لگے کہ یہ لفظ تو تم خود بھی استعمال کرتے ہو۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ کو نازل فرمایا صحابہ کرام کو بھی ”راعنا“ کہنے سے منع کر دیا۔ اگرچہ صحابہ کرام اس لفظ کا معنی وہ لیتے تھے جو نبی کریم ﷺ کی شان کے مطابق ہوتا تھا۔ لیکن یہود مسلمانوں کے ”راعنا“ کے لفظ کے استعمال سے غلط معنی مراد لیتے تھے تو مسلمانوں کو بھی اس لفظ کے استعمال سے منع کر دیا۔

”لکی لایجد الیہود بذلک سیلا الی شتم رسول اللہ ﷺ“ تاکہ یہود کو نبی کریم ﷺ کو اس لفظ کے ذریعے گالی دینے کا موقع نہ مل سکے۔

(از خازن)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا: (اے ایمان والو) اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی امت کو قرآن پاک میں

اٹھاسی مقامات میں ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا﴾ سے خطاب فرمایا۔

ایک عظیم نکتہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رب تعالیٰ نے توراۃ میں یہود کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا ”یا ایہا المساکین“ (اے مسکینو) فکأنه سبحانه وتعالى لما خاطبهم أولا بالمساکین اثبت المسکنة لهم آخر ا حيث قال ﴿وَضَرَبْتُ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةَ وَالْمَسْكَنَةَ﴾ رب تعالیٰ نے ابتدائی طور پر ہی جب ان کو مسکین کہہ کر خطاب کیا تو ان پر بعد میں اسی لئے مسکینی کو مسلط کر دیا۔ رب تعالیٰ نے خود فرمایا ”اور ان پر مسلط کر دی گئی ذلت اور مسکینی“ اسی سے یہ ثابت ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے جب نبی کریم ﷺ کی امت کو ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا﴾ کہہ کر پکارا تو ”فانه تعالى يعطيهم الامان من العذاب في النيران يوم القيامة“ اللہ تعالیٰ ان کو قیامت کے دن عذاب سے امان (حفاظت) عطا فرمائے گا۔

اور وجہ یہ ہے کہ ”اسم المؤمن اشرف الاسماء والصفات“ مؤمن بندوں کے ناموں اور صفات میں اعلیٰ اور اشرف نام اور اشرف صفت ہے۔ جب رب تعالیٰ نے دنیا میں ہمیں اشرف اور اعلیٰ قسم کے نام اور صفت سے خطاب فرمایا ”فخرجو من فضله ان يعاملنا في الآخرة باحسن المعاملات“ تو ہم امید کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے آخرت میں بھی ہمارے ساتھ اچھا معاملہ فرمائے گا۔

(از کبیر)

لَا تَقُولُوا رَاعِنَا : (نہ کہو راعنا) ایمان والوں کو راعنا کہنے سے منع فرمادیا۔

اس کی چند وجوہ ہیں۔

(۱) پہلی وجہ تو وہی ہے جس کا ذکر شان نزول میں آچکا ہے، کہ مسلمان ”راعنا“ کا لفظ ذکر کر کے صحیح معنی لیتے کہ آپ ہماری انتظار فرمائیں۔ اور آپ ہماری رعایت فرمائیں۔ لیکن یہود کی زبان میں یہ لفظ بطور گالی کے استعمال ہوتا تھا۔ وہ اس کا معنی لیتے ”اسمع لاسمعت“ سنو نہ سن سکو۔ یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں سننے کی توفیق عطا نہ فرمائے۔ (معاذ اللہ)

اللہ تعالیٰ کا ایک اور ارشاد گرامی اسے زیادہ واضح کر رہا ہے۔

﴿مِنَ الَّذِينَ هَادُوا يُخَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهِ وَيَقُولُونَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمِعْ غَيْرَ

بعض یہودی کلاموں کو ان کی جگہ سے پھرتے ہیں اور کہتے ہیں ہم نے سنا اور نہ مانا۔ (اور نبی کریم ﷺ کو کہتے) اور آپ سنیں، نہ سنائے جائیں۔ اور راعنا کہتے زبانیں پھیر کر دین میں طعنہ کیلئے۔

(۲) قطرب نے کہا اگرچہ یہ لفظ صحیح معنی رکھتا ہے۔ یعنی صحابہ کرام اس کا صحیح معنی ہی مراد لیتے تھے لیکن اہل حجاز ”ما كانوا يقولونها الا عند الهزؤ والسخرية فلا جرم نہی اللہ عنہا“ اس لفظ کو مزاح اور ٹھٹھا کے وقت استعمال کرتے تھے اس لئے یقیناً اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا۔ تاکہ نبی کریم ﷺ کے حضور ایسا کوئی لفظ استعمال نہ ہو۔ جس میں ٹھٹھا، مزاح کا پہلو نکلتے، جس سے ان کے اعمال برباد نہ ہو جائیں۔

(۳) یہود اس لفظ ”راعنا“ کو پھیر کر، لمبا کر کے، یوں پڑھتے ”راعینا“ اور اس کا معنی یہ مراد لیتے ”انت راعینا غنمنا“ تم ہماری بھیڑ بکریوں کو چرانے والے ہو۔ رب تعالیٰ نے مومنوں کو بھی اس سے منع فرمادیا کہ تم بھی ”راعنا“ نہ کہو، تاکہ یہود غلط معنی مراد نہ لے سکیں۔

(۴) ”راعنا“ باب مفاعلہ سے جو شرکت جانہین کو چاہتا ہے۔ اس لحاظ پر معنی یہ ہوگا کہ تم ہماری رعایت کرو ہم تمہاری رعایت کریں گے۔ تم ہماری انتظار کرو ہم تمہاری انتظار کریں گے۔ ”فنها هم الله تعالى عنه وبين ان لابد من تعظيم الرسول عليه السلام في المخاطبة على ما قال ﴿لَا تَجْعَلُوا دُعَاءَ الرَّسُولِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا﴾

تو رب تعالیٰ نے اس لفظ کے استعمال سے ہی منع کر دیا۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ کی تعظیم ضروری ہے۔ اس لئے کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ”تم رسول اللہ کو ایسے نہ پکارو جیسے آپس میں ایک دوسرے کو پکارتے ہو“۔

(۵) ”راعنا“ میں خطاب کرنے والا اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے۔ اگرچہ صحابہ کرام اس معنی کو مراد نہیں لیتے تھے لیکن لفظ کا تقاضا یہ تھا کہ اس کا معنی یہ ہو ”راع کلامی ولا تغفل عنه ولا تشتغل بغيره“ میرے کلام کی رعایت کرو، انتظار کرو، غافل نہ ہو۔ کسی اور طرف مشغول نہ ہو۔

یہ معنی یقیناً نبی کریم ﷺ کی شان کے لائق نہ تھا۔ اس لئے وہ لفظ ہی استعمال کرنے سے منع کر دیا، جس لفظ میں بے ادبی کا پہلو پایا جائے۔

لیکن ”انظرنا“ کہنے والا اپنے آپ کو بڑا نہیں سمجھتا بلکہ عاجزانہ طور پر کہتا ہے، میرے سوال کی انتظار کریں، اپنے کلام میں توقف کریں، اپنا بیان ٹھہرا کر کریں تاکہ میں سمجھ سکوں۔ اسی لئے ”انظرنا“ کہنے کا حکم دیا۔

(۶) ”راعنا“ رعونۃ سے مشتق ہو تو اس کا معنی ہوتا ہے ”حماقت“ یہود چونکہ اس معنی میں بھی استعمال کرتے تھے۔ لہذا رب تعالیٰ نے ایمان والوں کو منع کیا کہ تمہارے صحیح استعمال کے باوجود یہود چونکہ نبی کریم ﷺ کو (معاذ اللہ) احمق کہہ رہے ہیں۔ لہذا تم یہ لفظ ہی استعمال کرنا چھوڑ دو۔

یہ تمام وجوہ ہی سبب ہیں مومنوں کو ”راعنا“ کے لفظ کے استعمال کرنے سے منع کرنے کی۔

وَقُولُوا انْظُرْنَا : اور کہو ہماری طرف نظر کرم فرماؤ۔

یہاں بھی مختلف وجوہ ہیں۔ ان میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ کبھی ذکر کیا جاتا ہے ”نظرہ“ اس کا معنی مراد لیا جاتا ہے ”انظرہ“ اس نے فلاں کی انتظار کی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ﴿انْظُرُونَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُورِكُمْ﴾ میں ”انظرونا“ انتظار کے معنی میں استعمال ہے۔

اب معنی یہ ہوگا ”اور کہو ہماری انتظار فرمائیں۔“

اور وجہ یہ ہے کہ کبھی کہا جاتا ہے ”انظرنا“ تو معنی اس کا یہ لیا جاتا ہے ”انظر الینا“ ہماری طرف نظر رحمت فرمائیں۔

اور وجہ یہ ہے کہ ”انظرنا“ ماخوذ ہے ”النظرۃ“ سے جس کا معنی ہے مہلت دینا۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا ”ہمیں مہلت دیں۔“

وَاسْمَعُوا : میں تین مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ پہلے ہی کامل توجہ سے سنو۔ ادھر ادھر توجہ نہ کرو تا

کہ نبی کریم ﷺ سے لوٹانے کا تمہیں مطالبہ ہی نہ کرنا پڑے۔

اور مطلب یہ ہے کہ یہود کو اشارۃً سمجھانا مقصود تھا کہ انہوں نے کہا تھا ﴿سَمِعْنَا وَغَضِبْنَا﴾ ہم نے سنا اور نافرمانی کی۔ مسلمانوں کو حکم دیا ﴿وَأَسْمَعُوا﴾ تم سن کر قبول کرلو۔ اگرچہ صحابہ کرام نے سن کر قبول کیا ہوا تھا لیکن مقصد یہود کو سنانا تھا کہ تم بھی سن کر قبول کرلو۔ سن کر نافرمانی نہ کرو۔ اور مطلب یہ تھا کہ جو تمہیں ”راعنا“ کہنے سے منع کیا گیا ہے۔ اسے سنو۔ پھر اس کلمہ کو نہ لوٹانا۔

وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ : اور کافروں کے لئے دردناک عذاب ہے۔

”اذا لم يسلکوا مع الرسول هذه الطريقة من الاعظام والتبجيل“ یعنی نبی کریم ﷺ کی عظمت نہ بیان کرنا، آپ کی بزرگی کا لحاظ نہ کرنا دردناک عذاب کا سبب ہے۔ (ماخوذ از کبیر)

”وضع المظهر موضع المضممر ایذاً بان التهاون برسول الله ﷺ کفر یوجب الیم العذاب“

”وللکافرین“ اسم ظاہر کو ذکر کیا، ضمیر کو نہیں لایا گیا یہ بتانے کے لئے کہ نبی کریم ﷺ کی شان میں گستاخی کرنا، نازیبا الفاظ استعمال کرنا کفر ہے اور باعث عذاب ہے اور وہ عذاب بھی دردناک ہونا ہے۔ (روح المعانی)

تنبیه : ان الله تعالى نهی المؤمنین عن مشابهة الکافرین قولاً وفعلاً ”بے شک

اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو کافروں کی مشابہت سے منع فرمایا ہے کہ قول و فعل میں کفار کی مشابہت نہ کی جائے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے ”من تشبه بقوم فهو منهم“ جس شخص نے کسی قوم سے

مشابہت کی وہ ان سے ہی ہے۔ یہود جب مسلمانوں کو سلام کہتے تو ”السلام علیکم“ کہتے۔

السلام کا معنی موت ہے لیکن ہمیں یہ حکم ہے کہ ہم ان کے جواب میں سلام نہ کہیں بلکہ صرف ”وعلیکم“

کہہ کر جواب دیں۔

اسی آیت سے یہ پتہ چلا کہ مسلمانوں کو کفار کی مشابہت سے منع کیا گیا ہے یہ ان کے اقوال،

افعال، لباس اور ان کی عادات بلکہ ان کی عبادات میں بھی ان کی مشابہت نہ کریں۔ (از صابونی)

مقام توجہ : ”فی هذه الآية دلالة على تجنب الالفاظ المحتملة التي فيها التعريض

للتنقیص والغض

اسی آیہ کریمہ سے یہ مسئلہ بھی سمجھ آ گیا کہ ایسے الفاظ جن کے معانی میں احتمال ہو کہ تعریضاً یہ نبی کریم ﷺ کی تنقیص (شان کی کمی) اور آپ کی شان کو چھپانے والے معانی ہیں تو ان الفاظ سے اجتناب ضروری ہے۔

گناہوں کے اسباب سے بچنا بھی ضروری ہے:

”اس آیہ کریمہ میں مسلمانوں کو ”راعنا“ کہنے سے منع کیا، اس لئے کہ اسی لفظ کو یہود غلط معنی میں لیتے تھے جو باعث کفر تھا، لہذا اس لفظ کا استعمال ہی منع کر دیا گیا۔

☆ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ ط﴾
(الانعام آیت ۱۰۸)

اور انہیں گالی نہ دو جن کو وہ اللہ کے سوا پوجتے ہیں کہ وہ اللہ کی شان میں بے ادبی کریں گے زیادتی اور جہالت سے۔

چونکہ بتوں کی مذمت بیان کرنا، ان کو گالی دینا سبب بنتا ہے اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی کرنے کا، کیونکہ کفار جوابی طور پر اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی کرتے ہیں، اس لئے معبودانِ باطلہ کو گالی دینے سے منع کر دیا گیا۔

☆ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ام حبیبہ اور ام سلمہ رضی اللہ عنہما نے حبشہ میں ایک گرجا دیکھا جس میں تصاویر تھیں۔ ان دونوں نے ان تصاویر کا ذکر رسول اللہ ﷺ سے کیا۔

”فقال رسول الله ﷺ ان اولنک اذا کان فیہم الرجل الصالح فمات بنوا علی قبرہ مسجداً وصوراً فیہ تلک الصور اولنک شرار الخلق عند الله“ (اخرجه البخاری ومسلم)

تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بے شک ان لوگوں میں جب کوئی نیک آدمی فوت ہو جاتا تو اس کی قبر کے پاس وہ مسجد بنا لیتے پھر اس مسجد میں اس نیک آدمی اور دوسرے نیک آدمیوں کی تصویریں رکھ لیتے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں وہی بری مخلوق ہے۔

یعنی وہ لوگ نیک آدمیوں کی تصویریں بنا کر مسجد میں رکھ لیتے، تاکہ ان کے ذریعے اپنے دل کو تسلی دیں، اور ان نیک لوگوں کے احوال کو یاد کر کے ان جیسے اعمال کو بجالا سکیں۔ ان قبروں کے پاس وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے۔ اس طرح کچھ وقت گزر گیا۔ ان کے بعد آنے والے لوگ اصلی حالات سے جاہل تھے۔ شیطان نے ان کے دلوں میں وسوسہ ڈالا کہ تمہارے آباء و اجداد تو ان بزرگوں کی عبادت کرتے تھے۔ تو ان لوگوں نے ان تصویروں کی عبادت شروع کر دی۔ آہستہ آہستہ ان تصویروں کے بت بنائے۔ اس طرح بت پرستی شروع ہو گئی۔

”فحذر النبی ﷺ عن مثل ذلک“ نبی کریم ﷺ نے اس قسم کی چیزوں سے ڈرایا۔

یعنی ذی روح چیزوں کی تصویریں بنانا۔ پھر بزرگوں کی تصویروں کو بطور تعظیم گھروں میں رکھنا، اور مساجد میں ذی روح چیزوں کی تصویروں کو رکھنا، اور ان کے سامنے نماز ادا کرنا حرام قرار دیا۔ وجہ اس کی یہی تھی کہ بت پرستی کے اسباب کو بھی حرام قرار دے دیا، تاکہ بت پرستی سے اجتناب ہو سکے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”اشتد غضب اللہ علی قوم اتخذوا قبور انبیائہم وصالحہم مساجد“ اللہ تعالیٰ کا اس قوم پر غضب بہت سخت ہوتا ہے جو انبیاء کرام اور اولیاء کرام کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا اور ارشاد یہ ہے۔ ”اللہم لاتجعل قبری وثنا یعبد“ اے اللہ میری قبر کو بتوں کی طرح عبادت گاہ نہ بنانا۔ (کہ اسے سجدہ کیا جائے)

☆ ”وروی مسلم عن النعمان بن بشیر قال سمعت رسول اللہ ﷺ یقول الحلال بین والحرام بین و بینہما امور متشابہات فمن اتقی الشبہات استبرأ لدينہ وعرضہ ومن وقع فی الشبہات وقع فی الحرام کالرأعی یرعی حول الحمی یوشک ان یقع فیہ“

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ حلال واضح ہے اور حرام واضح ہے۔ ان کے درمیان ایسے امور ہیں جن کے حلال ہونے اور حرام ہونے میں شبہ پایا جاتا ہے۔ جو شخص شبہ والے امور سے بچ گیا، اس نے اپنے دین اور اپنی عزت کو بچا لیا۔ جو شخص

شبہ والی چیزوں میں واقع ہو گیا وہ حرام میں واقع ہو گیا۔ جیسا کہ چرواہا جو (کھیت کی) حد بندی کے ارد گرد جانوروں کو چرائے ان کے کھیت میں واقع ہونے کا احتمال پایا جاتا ہے۔

واضح ہوا کہ نبی کریم ﷺ نے شبہات سے اس لئے منع کیا تا کہ حرام کاموں کے ارتکاب سے

بچا جاسکے۔

☆ ”وقال رسول الله ﷺ ان من الكبائر شتم الرجل والديه قالوا يا رسول الله وهل

يشتم الرجل والديه؟ قال، نعم يسب ابا الرجل فيسب اياه ويسب امه فيسب امه“

نبی کریم ﷺ نے فرمایا بہت بڑا گناہ ہے کہ کوئی شخص اپنے والدین کو گالی دے۔ صحابہ کرام نے

عرض کیا کوئی شخص اپنے والدین کو بھی گالی دیتا ہے؟ آپ نے فرمایا جو شخص کسی کے باپ کو گالی دے، وہ

اس کے باپ کو گالی دے۔ اور جو شخص کسی کی ماں کو گالی دے وہ اس کے ماں کو گالی دے۔

یعنی کسی کے ماں باپ کو گالی دینے سے منع کیا تا کہ وہ اس کے ماں باپ کو گالی نہ دے۔ گویا کہ

(ماخوذ از قرطبی)

ماں باپ کو گالی دینے کے ذریعہ اور سبب سے بھی منع فرمایا۔

شان نبوت کے مناسب نہیں کہ ایک بات تم بار بار پوچھتے رہو، یہ کمال ادب اور انتہاء تعظیم ہے

جس کی تعلیم عرش و فرش کے مالک نے غلامانِ مصطفیٰ علیہ السلام کو دی۔ اب جو لوگ حضور کریم ﷺ کو

صرف بڑے بھائی کی سی حیثیت دیتے ہیں یا اپنے جیسا بشر ثابت کرنے میں اپنی ساری قابلیتیں صرف

کر دیتے ہیں وہ اپنے انجام پر خود ہی غور کر لیں۔

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر

نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

(ضیاء القرآن)

☆☆☆

﴿ مَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَلَا الْمُشْرِكِينَ أَنْ يُنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِنْ خَيْرٍ مِّنْ رَبِّكُمْ وَاللَّهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ﴾

(آیت ۱۰۵)

- (۱) وہ جو کافر ہیں کتابی یا مشرک وہ نہیں چاہتے کہ تم پر کوئی بھلائی اترے تمہارے رب کے پاس سے، اور اللہ اپنی رحمت سے خاص کرتا ہے جسے چاہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے
- (۲) نہیں پسند کرتے کافر اہل کتاب ہوں یا مشرک کہ نازل کی جائے کوئی بھلائی تمہارے رب کی طرف سے اور اللہ خاص کرتا ہے اپنی رحمت جسے چاہے اور بڑے فضل والا ہے۔

اس سے پہلے یہ ذکر کیا گیا کہ یہود بظاہر نبی کریم ﷺ سے محبت کرتے، اور ظاہری طور پر آپ کے ادب و احترام کا لحاظ کرتے لیکن در پردہ، دل ہی دل میں آپ کو گالیاں دیتے، آپ کی شان میں گستاخی کرتے، اور اس تاک میں رہتے کہ مسلمان کوئی ایسا لفظ نبی کریم ﷺ کے لئے استعمال کریں جو ذومعنی (دو معنوں والا) ہو۔ جس کا ایک معنی اچھا ہو جس میں مسلمان اس لفظ کو استعمال کریں۔ اور ایک معنی سے برائی اور مذمت سمجھ آئے جس میں ہم استعمال کریں تاکہ ہم دل ہی دل میں اپنے غیظ و غضب کی بھڑاس نکال لیں۔

اس آیت کریمہ میں ان کی وہی چال مسلمانوں سے ذکر کی جا رہی ہے۔ کہ وہ مسلمانوں سے بظاہر محبت کا اظہار کرتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ محبت کرتے ہیں، لیکن مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کی کوئی رحمت بھی دل میں پسند نہیں کرتے۔

(از بیضاوی و شیخ زادہ)

شان نزول: کفار نے مسلمانوں سے جب ظاہری طور پر محبت کرنے کا دعویٰ کیا کہ ہم تمہارے ساتھ محبت کرتے ہیں۔

”فان الكفار لما اظهروا مودة المسلمين كان المسلمين يوالونهم ويركنون اليهم“

کفار نے جب مسلمانوں سے محبت کرنے کا ظاہری ظاہری دعویٰ کیا تو مسلمان بھی ان سے محبت کرنے لگے اور ان کی طرف میلان کرنے لگے۔ تو رب تعالیٰ نے اس آیت کریمہ کو نازل کر کے واضح کر دیا کہ کفار خواہ اہل کتاب ہوں یا مشرک ہوں وہ تو نہیں پسند کرتے کہ تم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی بھلائی نازل ہو۔

وہ اپنے دعویٰ میں جھوٹے ہیں۔ ان سے محبت نہ کرو، ان سے دوستی قائم نہ کرو۔ ان کی طرف میلان نہ کرو۔

ایک مقام پر فرمایا: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ ط﴾

(النساء آیت ۱۳۴)

اے ایمان والو! کافروں کو دوست نہ بناؤ مسلمانوں کے سوا۔

یعنی تم صرف آپس میں مسلمان ہی ایک دوسرے سے دوستی قائم کرو۔ کفار سے دوستی قائم نہ کرو

اور ارشاد فرمایا: ﴿وَلَا تَرْكَبُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُم مِّنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ

(ہود، آیت ۱۱۳)

أَوْلِيَاءَ ثُمَّ لَا تُنصِرُونَ ﴿﴾

اور نہ اس کی طرف نہ جھکو کہ تمہیں آگ چھوئے گی اور اللہ کے سوا تمہارا کوئی حمایتی نہیں

پھر مدد نہ پاؤ گے۔

شان نزول کی ایک اور وجہ:

مسلمانوں نے اپنے حلیف یہود کو کہا تم محمد ﷺ پر ایمان لے آؤ، تو وہ کہنے لگے۔ ”وَدِدْنَا

لَوْ كَان خَيْرًا مِّمَّا نَحْنُ عَلَيْهِ فَنَتَّبِعُهُ فَكَذَبَهُمُ اللَّهُ تَعَالَى بِذَلِكَ“ ہم بھی یہی چاہتے ہیں کہ

ایمان لے آئیں، لیکن وہ دین جب ہمارے دین سے بہتر ہو جس کی ہم تابعداری کر رہے ہیں۔

رب تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں یہود کی تکذیب کی کہ وہ اپنے اس دعویٰ میں جھوٹے ہیں وہ تو چاہتے

ہی نہیں کہ نبی کریم ﷺ پر وحی نازل ہو، یا مومنوں کو کوئی بھلائی حاصل ہو۔

وہ غلط کہتے ہیں کہ ہم تو ایمان لانا پسند کرتے ہیں، لیکن تمہارا دین ہمارے دین سے بہتر نہیں۔

ان کے دونوں دعوے جھوٹے ہیں۔ ان کا یہ کہنا کہ ہم پسند کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائیں یہ سراسر غلط ہے، وہ تو ایمان لانا ہی نہیں چاہتے اور ان کا یہ کہنا بھی باطل ہے کہ تمہارا دین ہمارے دین سے اچھا نہیں، یہ تو صرف ان کا زبانی دعویٰ ہے۔ وہ اپنے اس دعویٰ پر کوئی دلیل تو قائم کریں۔

(ماخوذ از شیخ زادہ روح المعانی)

مقام توجہ: پہلی آیت میں یہود کے قبائح کا ذکر کیا جو وہ رسول اللہ ﷺ کی شان میں گستاخی کرتے تھے۔ اور اس آیت میں بھی یہود کے مسلمانوں سے منافقانہ انداز سے پیش آنے کا ذکر کیا ہے، لیکن دونوں میں وجہ بیان مختلف ہے۔ اور علیحدہ علیحدہ غرض پائی گئی ہے۔

”فان الاول لتأديب المؤمنين وهذا للتكذيب اولئك الكافرين“ پہلی آیت میں مومنوں کو ادب سکھانا مقصود ہے کہ تم کوئی ایسا لفظ ذکر ہی نہ کرو جس سے کفار کو نبی کریم ﷺ کی شان میں گستاخی کا موقع مل سکے۔

اور دوسری آیت میں ذکر کیا گیا ہے کہ کفار جھوٹے ہیں۔ ان کی محبت کے دعوے تسلیم نہ کرنا۔

(روح المعانی)

مَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَلَا الْمُشْرِكِينَ :

(نہیں پسند کرتے کافر خواہ اہل کتاب ہوں یا مشرک ہوں)

”ما“ نافیہ ہے۔ اور ”یود“ ماخوذ ہے ”ود“ سے اور ”ود“ کے دو معنی آتے ہیں۔ تاہم مراد دونوں ہی ہوتے ہیں۔ البتہ کبھی ایک قصداً مراد ہوتا ہے۔ اور دوسرا تبعاً اور کبھی دوسرا قصداً مراد ہوتا ہے اور پہلا تبعاً۔ ”الود محبة الشيء و تمنى كونه“ ”ود“ کا ایک معنی ہے کسی چیز سے محبت کرنا، اور دوسرا معنی ہے تمنا کرنا۔ البتہ ان دونوں معنوں کے استعمال میں فرق ہے۔ اگر کسی چیز کی تمنا کرنے والا معنی لیا جائے تو مفعول جملہ ہوگا۔ جیسا کہ ”وددت لو تفعل كذا“ میں تمنا کرتا ہوں کاش تو ایسے کرے۔

اور اگر محبت والا معنی لیا جائے تو مفعول مفرد ہوگا۔ ”وددت الرجل“ میں فلاں شخص سے محبت کرتا ہوں۔

البتہ یہ واضح ہے کہ مراد تمنا والا معنی ہو تو اس میں محبت پائی جائے گی۔ اور اگر مراد محبت والا معنی تو

اس میں تمنا پائی جائے گی۔ اور یہ بھی خیال رہے کہ جب ”ود“ کا ذکر ہوگا تو اسی سے یہ بھی واضح ہوگا کہ وہ اسے ناپسند نہیں کرتا۔

(از روح المعانی)

یعنی اس ایک لفظ ”مایود“ سے وسیع تر معنی حاصل ہو گیا کہ کافر پسند ہی نہیں کرتے (محبت نہیں رکھتے) اور کافر تمنا ہی نہیں رکھتے۔ بلکہ کافر تو ناپسند کرتے ہیں کہ تمہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی بھلائی حاصل ہو جائے۔

”من اهل الكتاب ولا المشركين“ یہاں ”من“ بیان کے لئے ہے۔ جس کا معنی ہوتا ہے یعنی۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ”من“ بیانیہ کے مطابق ہے۔ راقم نے وہی نقل کیا۔ تاہم ”من“ تبعیض کے لئے ہو یہ بھی احتمال ہے۔ اس وقت ”من“ کا معنی ”سے“ ہوتا ہے۔ ضیاء القرآن میں یہی معنی مذکور ہے۔ (”من“ میں دو احتمالات کا ذکر روح المعانی میں ہے۔)

أَنْ يُنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ خَيْرٍ مِّنْ رَبِّكُمْ :

(یہ کہ نازل کی جائے تم پر کوئی بھلائی تمہارے رب کی طرف سے)

یہاں پہلا ”من“ استغراق کے لئے ہے۔ اور دوسرا ”من“ ابتدائیہ ہے۔

”خیر“ سے مراد کیا ہے؟ وفسر الخیر بالوحي والمعنی انهم یحسدونکم بہ وما

یحبون ان ینزل علیکم شیء منہ“

خیر سے مراد وحی ہے، یعنی وہ تم پر حسد کرتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ تم پر رب تعالیٰ کی طرف کچھ نازل ہو۔ یہود کہتے تھے کہ نبوت حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد کا حق ہے۔ جب نبی کریم ﷺ بنی اسماعیل میں تشریف لائے تو وہ حسد کرنے لگے اور آپ پر ایمان نہ لائے، یہود میں سے کئی لوگ منافقانہ طور پر آپ سے محبت کا دم بھی بھرتے تھے لیکن دل میں آپ کو پسند نہیں کرتے تھے اور نہ ہی یہ پسند کرتے کہ آپ پر وحی نازل ہو۔

اسی طرح مشرکین چاہتے تھے کہ مکہ اور طائف میں سے کسی رئیس پر قرآن نازل ہوتا۔ وہ اس لئے حسد کرتے تھے کہ قریش میں بنی عبدالمطلب میں ایک یتیم اور غریب شخص پر قرآن کیوں نازل ہو گیا۔

”وقالوا لولا نزل هذا القرآن على رجل من القريتين عظيم“ اور انہوں (مشرکین) نے کہا یہ قرآن کیوں نازل نہیں کیا گیا دو بستیوں (مکہ اور طائف) کے کسی بڑے شخص پر۔ خیر سے مراد علم بھی لیا گیا ہے۔ کہ وہ نہیں چاہتے کہ تمہیں علم جیسی عظیم اور لازوال نعمت عطاء کی جائے۔ اور خیر سے مراد نصرة (امداد) بھی ہے۔ کہ کفار نہیں چاہتے کہ اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے امداد عطاء کرے۔

”ولعل المراد به ما يعم ذلك“ شاید مراد خیر سے عام ہو۔ ہر قسم کی بھلائی مراد ہو۔ یعنی کفار نہیں چاہتے کہ نبی کریم ﷺ اور مؤمنین کو کسی قسم کی کوئی بھلائی بھی رب تعالیٰ کی طرف سے عطاء ہو کیونکہ وہ حسد کرتے تھے اور انہیں اپنی ریاست (چوہدراہٹ) کے زوال کی فکر رہتی تھی۔
وَاللّٰهُ يُخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَّشَاءُ: ”اور اللہ خاص کرتا ہے اپنی رحمت سے جسے چاہے“
 یہ جملہ ابتدائیہ ہے۔ خیر کے نازل کرنے اور اس میں حکمت کی وضاحت کی جا رہی ہے، کہ کفار باوجود اس کے کہ ناپسند کریں لیکن اللہ تعالیٰ جسے چاہے بھلائی عطاء فرمادے۔
 ”والمراد من الرحمة ذلك الخير الا انه عبر بها اعتناء وتعظيما لشانه“

رحمت سے مراد وہی خیر جس کا ذکر پہلے کیا گیا۔ البتہ عظمت شان کے پیش نظر اور اہتمام شان کے لئے رحمت سے تعبیر کر دیا گیا۔

یعنی اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے جسے چاہے بھلائی عطاء فرمائے، کفار کے ناپسند کرنے سے رب تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو اپنی رحمت اور بھلائی سے محروم نہیں فرماتا۔

ایک عظیم نکتہ:

”وفي اقامة لفظ ”الله“ مقام ضمير ربكم تنبيه على ان تخصيص بعض الناس بالخير دون بعض يلائم الالهية كما ان انزال الخير على العموم يناسب الربوبية“ (روح المعانی)

جب پہلے ”ربکم“ ذکر ہو چکا ہے، تو ضمیر ذکر ہو جاتی جو ”ربکم“ کی طرف لوٹتی، لیکن ظاہر لفظ ”الله“ ذکر کیا گیا اس کی وجہ کیا ہے؟۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ربوبیت کا تقاضا یہ ہے کہ تمام پر

رحمت ہو۔ لیکن اللہ تعالیٰ جسے چاہے اپنی رحمت خاصہ سے نوازتا ہے یہ اس کے مقام الوہیت کا تقاضا ہے کہ وہ معبود ہے۔ اس پر کوئی چیز لازم نہیں کہ وہ ضرور ہی تمام کو اپنی خاص رحمت عطاء کرے۔

البتہ اللہ تعالیٰ رب بھی ہے۔ صفت ربوبیہ چاہتی ہے کہ ہر کسی پر رحمت ہو۔ اس صفت ربوبیہ کی وجہ سے رحمت عامہ ہر کسی کو حاصل ہے۔ جس سے مومن اور کافر تمام ہی نفع حاصل کر رہے ہیں۔

وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ: ”ذو“ کا معنی صاحب، مالک، والا۔ (اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔)

یہاں سے حسد کرنے والے اور مسلمانوں پر رب تعالیٰ کی نعمتوں کو ناپسند کرنے والے لوگوں کو بتانا مقصود ہے، کہ جب رب تعالیٰ کی وسیع نعمتوں سے ہر شخص نفع اٹھا رہا ہے۔ اس کے فضل اور نعمتوں کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر میں ہر شخص مستغرق ہے تو کسی کو بھی حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی دوسرے سے حسد کرے، اور یہ پسند کرے کہ کسی کو نعمت اور رحمت حاصل نہ ہو۔

مقام توجہ: ”وان حرمان بعض عبادہ لیس لضیق فضلہ بل لمشیئہ وما عرف فیہ من حکمتہ“

اللہ تعالیٰ اگر اپنے بعض بندوں کو اپنی رحمت خاصہ سے محروم کرتا ہے تو اس کا یہ مقصد نہیں ہوتا کہ اسکے فضل میں کوئی کمی ہے یا اسکے فضل میں کوئی تنگی ہے۔ اس کا فضل تو وسیع تر ہے۔ البتہ اس کی مشیت کا

تقاضا جہاں پایا جائے اور اسکی حکمت جہاں پائی جائے وہاں اپنی رحمت خاصہ سے وہ نوازتا ہے۔

جہاں اس کی مشیت میں یہ ہو کہ اسے رحمت خاصہ سے دور رکھنا ہے تو اس کو محروم کرنا بھی حکمت کے عین تقاضا کے مطابق ہے۔ اور یہ واضح ہوا کہ ”ان کل خیر نالہ عبادہ فی دینہم و دنیاہم

فانہ منہ ابتداء و تفضلا علیہم من غیر استحقاق احدہم لذلک بل لہ الفضل

والمنة علی خلقہ“

بندوں کو جو بھی بھلائی دین و دنیا میں حاصل ہوتی ہے وہ صرف اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے

حاصل ہوتی ہے۔ یہ وجہ نہیں کہ بندے اس کے مستحق ہوتے ہیں۔ یا اللہ تعالیٰ پر واجب ہوتا ہے کہ وہ

عطاء کرے۔ بندوں پر تو پہلے ہی اللہ تعالیٰ کے ان گنت انعام ہیں ان کا بھی وہ شکر یہ ادا نہیں کر سکتے، چہ

جائیکہ وہ اپنی عبادات وغیرہ کے ذریعے اپنے آپ کو مستحق سمجھیں۔ (ماخوذ از روح المعانی و خازن)

﴿مَنْ نَسَخَ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِنْهَا أَوْ مِثْلَهَا ط

(آیت ۱۰۶)

أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ☆﴾

(۱) جب کوئی آیت ہم منسوخ فرمائیں یا بھلا دیں تو اس سے بہتر یا اس جیسی لے آئیں گے، کیا تجھے خبر نہیں کہ اللہ سب کچھ کر سکتا ہے۔

(۲) جو ہم منسوخ کرتے ہیں کوئی آیت۔ یا بھلا دیتے ہیں کوئی آیت، ہم لے آتے ہیں بہتر اس سے، یا اس کی مثل (اے مخاطب) کیا تو نہیں جانتا بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

شان نزول: یہود کے مختلف قسم کے اعتراضات اور دین میں طعن کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ ان اعتراضات میں سے ان کا اسلام کے خلاف یہ اعتراض تھا۔

”فقالوا لا ترون الى محمد يا امر اصحابه بامر ثم ينهاهم ويامرهم بخلافه ويقول اليوم قولاً وغدا يرجع عنه فنزلت هذه الآية“

کہ وہ کہنے لگے کیا تم محمد کو نہیں دیکھتے کہ وہ اپنے اصحاب کو آج ایک حکم دیتا ہے۔ پھر اس سے منع کر دیتا ہے۔ اور اسکے خلاف حکم دے دیتا ہے۔ اور آج ایک بات کرتا ہے۔ کل اس سے رجوع کر لیتا ہے۔ تو ان کے رد کیلئے اور نسخ کی حکمت بیان کرنے کیلئے یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ (ادکیر)

خصوصاً جب بیت المقدس قبلہ منسوخ کر کے کعبہ شریف کو قبلہ بنا دیا گیا تو وہ زیادہ ہی اعتراض کرنے لگے۔ (خازن)

نسخ کے معانی: نسخ کا معنی زائل کرنا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”فینسخ الله ما يلقى الشيطان“ تو اللہ تعالیٰ زائل کر دیتا ہے (مثلاً دیتا ہے) جو شیطان اس میں ڈال دیتا ہے۔

اور نسخ بمعنی تبدیل کرنا۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ”واذا بدلنا آية مكان آية“ اور جب ہم تبدیل کر دیں ایک آیت کو دوسری آیت کی جگہ۔ (یہ بھی نسخ ہی ہے اگرچہ لفظ ”بدلنا“ استعمال ہوا ہے)

اور نسخ بمعنی تحویل۔ جیسا کہ کہا جاتا "تناسخ الموارث" یعنی وراثت کا ایک سے دوسرے کی طرف منتقل ہونا۔ اور نسخ بمعنی نقل کرنا۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے۔ "نسخت الكتاب" میں نے کتاب کو نقل کیا، یعنی اس کے الفاظ اور خط کو فلاں کتاب یا فلاں جگہ سے نقل کیا۔ (ازالافتان)

نسخ اور متقدمین و متاخرین علماء کرام:

مقدمین علماء کرام نے پانچ صد آیات کو منسوخ مانا ہے۔ اور متاخرین نے ان کی تعداد کو بہت کم مانا ہے۔

اس پر مفتی محمد شفیع صاحب نے یوں تبصرہ کیا: جس طرح ایک حکم کو بالکلیہ منسوخ کر

کے اس کی جگہ دوسرا حکم لانے میں ہے۔ جیسے بیت المقدس کے بجائے بیت اللہ کو قبلہ بنادینا۔ اسی طرح کسی مطلق یا عام حکم میں کسی قید و شرط کو بڑھا دینا بھی ایک قسم کی تبدیلی ہے۔ اسلاف امت نے نسخ کو اسی عام معنی میں استعمال فرمایا ہے۔ جس میں کسی حکم کی پوری تبدیلی بھی داخل ہے اور جزوی تبدیلی قید و شرط یا استثناء وغیرہ کی بھی اس میں شامل ہے۔ اسی لئے مقدمین حضرات کے نزدیک قرآن میں آیات منسوخہ پانچ سو تک شمار کی گئی ہیں۔

حضرت متاخرین نے صرف اس تبدیلی کا نام نسخ رکھا ہے۔ جس کی پہلے حکم کے ساتھ کسی طرح تطبیق نہ ہو سکے، ظاہر ہے کہ اس اصطلاح کے مطابق آیات منسوخہ کی تعداد بہت گھٹ جائے گی۔

اسی کا لازمی اثر یہ تھا کہ مقدمین نے تقریباً پانچ سو آیات قرآنی میں نسخ ثابت کیا تھا۔ جس میں معمولی سی تبدیلی قید و شرط یا استثناء وغیرہ کو بھی شامل کیا تھا اور حضرات متاخرین میں علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے صرف بیس آیتوں کو منسوخ قرار دیا، ان کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے ان میں بھی تطبیق کی صورت پیدا کر کے صرف پانچ آیتوں کو منسوخ فرمایا ہے۔ جن میں کوئی تطبیق بغیر تاویل بعید کے نہیں ہو سکتی، یہ امر اس لحاظ سے مستحسن ہے کہ احکام میں اصل بقاء حکم ہے، نسخ خلاف اصل ہے۔ اس لئے جہاں آیت کے معمول بہا (اس پر عمل کئے جانے) ہونے کی کوئی توجیہ ہو سکتی ہے۔ اس میں بلا ضرورت نسخ ماننا درست نہیں۔ لیکن اس تقلیل کا یہ منشاء ہرگز نہیں ہو سکتا کہ مسئلہ نسخ اسلام یا قرآن پر کوئی عیب تھا

جس کے ازالہ کی کوشش چودہ سو برس تک چلتی رہی، آخر انکشاف حضرت شاہ ولی اللہ کو ہوا، جس میں گھٹتے گھٹتے پانچ رہ گئیں۔ اور اب اس کا انتظار ہے کہ کوئی جدید محقق ان پانچ کا بھی خاتمہ کر کے بالکل صفر تک پہنچادے۔

مسئلہ نسخ کی تحقیق میں ایسا رخ اختیار کرنا نہ اسلام اور قرآن کی کوئی صحیح خدمت ہے۔ اور نہ ایسا کرنے سے صحابہ و تابعین اور پھر چودہ سو برس کے علماء متقدمین و متأخرین کے مقالات و تحقیقات کو دھویا جاسکتا ہے۔ اور نہ مخالفین کی زبان طعن اس سے بند ہو سکتی ہے۔ بلکہ اس زمانے کے ملحدین کے ہاتھ میں یہ ہتھیار دینا ہے کہ یہ بھی ہو سکتا ہے، کہ چودہ سو برس تک علماء کچھ کہتے رہے ہوں اور آخر میں اس کا غلط ہونا ثابت ہو جائے۔ معاذ اللہ! اگر یہ دروازہ کھلے گا تو قرآن اور شریعت سے امن اٹھ جائیگا۔

(معارف القرآن)

راقم نے یہ طویل اقتباس نقل کیا ہے، کیونکہ راقم بھی آخری سطور سے مکمل اتفاق رکھتا ہے۔ اور اسی کے مطابق کامل ذہن میں بات یہی راسخ تھی جسے مفتی صاحب کے تبصرہ سے تائید حاصل ہوئی۔

علامہ کاظمی رحمہ اللہ کا محاکمہ: حضرت علامہ احمد سعید کاظمی رحمہ اللہ نے متقدمین اور متأخرین کے اقوال میں یوں تبصرہ فرمایا؛ متقدمین نے نسخ کو ”ازالہ“ کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ اور انہوں نے کہا ہے کہ کسی چیز کو کسی دوسری چیز سے زائل کر دینا نسخ ہے۔ اور ”ازالہ“ کو انہوں نے عام رکھا کسی آیت کی تلاوت کا ازالہ بھی نسخ ہے اور کسی حکم شرعی کا بدل جانا بھی نسخ ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ کسی حکم شرعی یا آیت کے اوصاف میں سے کسی وصف کے جزوی ازالہ کو بھی اپنی اصطلاح میں وہ نسخ ہی کہتے ہیں۔ مثلاً کسی آیت کا اس کے متبادر معنی سے غیر متبادر معنی کی طرف مصروف ہو جانا، اسی طرح استثناء نیز تخصیص عام، تنقید مطلق یا کسی قید کے اتفاقی ہونے کا بیان وغیر ذلک۔ جس آیت یا حکم شرعی کے کسی وصف میں انہیں ادنیٰ ترین جزوی ازالہ نظر آیا اسی کو انہوں نے نسخ سے تعبیر کر دیا۔ اوصاف آیات کے کسی وصف میں اس نوعیت کا ازالہ بکثرت آیات میں پایا جاتا ہے۔ اس لئے ان کے نزدیک آیات منسوخہ کی تعداد پانچ سو بلکہ اس سے بھی زائد تک پہنچ گئی۔

اور متأخرین نے لفظ نسخ کو صرف ابدال یا تبدیل کے معنی میں استعمال کیا اور مذکورہ بالا نوعیت

کے جزوی ازالہ یا جزوی تبدیلی کو انہوں نے نسخ نہیں کہا، چنانچہ متاخرین اور بعض اصولیین کے نزدیک نسخ کے معنی ہیں:

” بیان انتهاء التعبد بقرائتها او الحکم المستفاد منها “..... او بهما جمیعا“

(از روح المعانی)

یعنی عبادت سمجھ کر کسی آیت کے پڑھنے کی مدت ختم ہو جانے کا بیان۔ یا جو حکم اس آیت سے مستفاد ہوتا ہے بطور عبادت اس پر عمل کرنے کی مدت ختم ہو جانے کا بیان۔ یا دونوں کی انتہاء مدت کا بیان نسخ ہے۔

اس تفصیل سے واضح ہو گیا کہ آیات منسوخہ کی تعداد میں متقدمین اور متاخرین کا اختلاف ان کی اصطلاح پر مبنی ہے۔ جس کی حیثیت نزاع لفظی سے زیادہ کچھ نہیں ” لکل ان یصطلح بما شاء “ ہر طبقہ کے علماء کو اپنی اصطلاحات کے وضع کرنے کا حق حاصل ہے۔ (از التبان مع النیان للکاظمی)

نسخ کا علم عظیم ہے:

” قال الائمة لا يجوز لاحد ان يفسر كتاب الله الا بعد ان يعرف منه النسخ والمنسوخ “ ائمہ کرام نے فرمایا کہ کسی شخص کو قرآن پاک کی تفسیر لکھنے کا حق نہیں پہنچتا جب تک اسے کتاب اللہ میں ناسخ اور منسوخ کا علم نہ ہو۔

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے ایک قاضی سے پوچھا کیا تو ناسخ و منسوخ کا علم رکھتا ہے؟ اس نے کہا مجھے تو اس کا علم نہیں تو آپ نے فرمایا ” ہلکت و اہلکت “ تو خود بھی ہلاک ہو گیا اور دوسروں کو بھی تو نے ہلاکت میں ڈال دیا۔ (الاتقان)

نسخ کا علم رکھنا عظیم فائدہ پر مرتب ہے:

” لا يستغنى عن معرفته العلماء ولا ينكره الا الجهلة الاغبياء “

علماء کرام نسخ کے علم سے مستغنی نہیں ہو سکتے اور نسخ کا انکار صرف جاہل اور کند ذہن لوگ ہی کرتے ہیں۔ کیونکہ قرآن پاک کے نسخ کے علم پر ہی احکام کے علم کی دارومدار ہے۔ اور اسی پر ہی حلالی و حرام کی معرفت کی دارومدار ہے۔

ابو البختری فرماتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک مسجد میں داخل ہوئے، وہاں ایک شخص

لوگوں کو وعظ کر رہا تھا اور خوف دلارہا تھا۔ آپ نے فرمایا یہ کیا ہو رہا ہے۔ لوگوں نے کہا ایک شخص لوگوں کو وعظ کر رہا ہے آپ نے فرمایا:

”لیس برجل یدکر الناس، لکنہ یقول انا فلان ابن فلان فاعرفونی“
”یہ شخص لوگوں کو وعظ نہیں سنا رہا بلکہ اپنا چرچا کر رہا ہے کہ لوگ مجھے پہچان لیں کہ میں فلاں ابن فلاں ہوں“

پھر آپ نے اسے اپنی طرف بلایا، اور اس سے پوچھا ”اتعرف الناس من المنسوخ“ کیا تم ناسخ و منسوخ کو جانتے ہو؟ اس نے کہا میں تو نہیں جانتا۔ تو آپ نے فرمایا ”فاخرج من مسجدنا ولا تذکر فیہ“ پھر تو تم ہماری مسجد سے نکل جاؤ اور یہاں آ کر وعظ نہ کیا کرو۔ (از فرطی) مطلب واضح ہوا کہ ناسخ و منسوخ کا علم عظیم علم ہے۔ اسکے بغیر انسان میں اہلیت نہیں پائی جاتی کہ وہ قرآن پاک کی تفسیر کرے یا لوگوں کو وعظ سنائے۔ اسی سے یہ مسئلہ بھی واضح ہو گیا کہ مبلغ بننے کیلئے علم کا ہونا ضروری ہے بغیر علم کے تبلیغ کرنے سے کسی کو نقصان تو پہنچایا جاسکتا ہے، نفع نہیں پہنچایا جاسکتا۔

نسخ کی حقیقت کو سمجھیں:..... نسخ کا اصطلاح شرع میں معنی یہ ہے:

”رفع التابید المستفاد من اطلاقها ولذا عرفہ بعضهم برفع الحکم الشرعی فہو بیان بالنسبۃ الی الشارع ورفع بالنسبۃ الینا“

بظاہر جو حکم سمجھ آ رہا تھا کہ یہ ہمیشہ کے لئے رہے گا، کیونکہ اس میں ظاہری طور پر کوئی قید نہیں تھی کہ یہ حکم فلاں وقت اٹھالیا جائے، اس حکم کو اٹھالینا نسخ ہے۔ لیکن شارع (رب تعالیٰ جو شریعت کا حکم دینے والا ہے) کے نزدیک پہلے سے ہی اس حکم کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے کہ فلاں وقت اس حکم کو اٹھالیا جائے گا، اگرچہ بظاہر اس کا ذکر نہیں ہوتا۔ جب وہ وقت آتا ہے تو اس حکم کو اٹھالیا جاتا ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ یہ حکم اٹھالیا گیا ہے۔ یعنی نسخ جب ہماری طرف منسوب ہوگا ہم کہیں گے کہ یہ حکم منسوخ ہو گیا، تو ہماری طرف منسوب ہونے کے لحاظ پر مطلب یہ ہوگا کہ یہ حکم اٹھالیا گیا ہے۔ اور رب تعالیٰ کی طرف جب منسوب ہوگا تو مطلب یہ ہوگا کہ اس حکم کی مدت ختم ہو چکی ہے جس مدت کے لئے اسے نافذ کیا گیا تھا۔

(از روح المعانی)

نسخ حکمت باری تعالیٰ کا ایک کرشمہ ہے:

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی مصلحتوں کو جانتا ہے کہ کون سا حکم کس وقت تک مفید ہے اور کون سا حکم کس وقت نافذ کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم اپنی ظاہری زندگی میں اس کا مشاہدہ کر رہے ہیں کہ حکیم اور ڈاکٹر حضرات مریض کی مرض کے مطابق دوا بدلتے رہتے ہیں اور ان کو مختلف اوقات میں مختلف غذائیں کھانے کے لئے مشورہ دیتے ہیں۔ جب اطباء حضرات کا دواؤں اور غذاؤں کو مریضوں کی حالت کے مطابق تبدیل کرتے رہنا حکمت کا تقاضا ہے تو یقیناً رب تعالیٰ جو قادر مطلق ہے اور حکیم مطلق ہے اس کے احکام بھی بندوں کی مصلحتوں کے مطابق ہوتے ہیں۔ حکمت کا یہی تقاضا ہے کہ ایک ضرورت تک ایک حکم نافذ کیا جائے پھر دوسرا۔

خصوصاً عرب لوگ جو کفر و شرک اور عیاشی اور گناہوں میں سر تاپا مبتلاء تھے ان کو راہ راست پر لانا اور ان سے بری رسموں کا چھڑانا یہ تقاضا کرتا تھا کہ ان کو آہستہ آہستہ، تدریجاً تدریجاً سیدھی راہ پر لایا جائے اسی حکمت کے پیش نظر رب تعالیٰ نے احکام کی مدت کی حدود مقرر فرمائیں۔ ان حدود کے آنے پر وہ احکام ختم فرما کر دوسرے احکام نافذ فرمائے۔ جن کو ہم نے سمجھا کہ یہ حکم اٹھالیا گیا ہے۔

(از بیضاوی و روح المعانی)

قرآن پاک میں کوئی اختلاف نہیں:

یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ قرآن مجید میں کوئی اختلاف نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا﴾

”یعنی اگر قرآن مجید غیر اللہ کا کلام ہوتا لوگ اس میں بہت اختلاف پاتے“

یعنی نظم کلام میں بہت تفاوت ہوتا۔ مضامین بھی متناقض (ایک دوسرے سے مختلف) ہوتے۔

کثرت الفاظ اور کثرت معانی کے لحاظ سے ”اختلافاً کثیراً“ فرمایا گیا۔ جب کہ قرآن پاک کے نظم کلام اور اس کے معانی و مضامین میں ایک بھی اختلاف موجود نہیں جو صداقت قرآن کی روشن دلیل ہے۔ اگر کسی نے قرآن میں کہیں اختلاف سمجھا تو یہ اس کے اپنے فہم کی غلطی ہے۔ اللہ تعالیٰ

کا کلام تعارض، تناقض اور اختلاف سے پاک ہے۔ قرآن پاک میں نسخ ضرور پایا گیا۔ مگر اختلاف اور تناقض سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ مظہری میں ہے:

”واما النسخ والمنسوخ فلیس من باب الاختلاف“ (مظہری پ ۵ ج ۲ ص ۱۷۰)

یہود اور مشرکین نے بعض احکام شرع کے منسوخ ہونے پر مذاق اڑایا تھا۔ اور آج تک بعض محدثین بھی یہ اعتراض کرتے ہیں کہ کسی حکم شرعی کے منسوخ ہونے کا قول اس لئے صحیح نہیں کہ اس سے لازم آتا ہے کہ شارع نے جو حکم پہلے دیا تھا وہ قابل عمل نہ تھا جسے منسوخ کرنا پڑا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ نسخ کا قول کسی حکم شرعی کے ناقص ہونے کو ہرگز مستلزم نہیں، نہ اس سے شارع کی لاعلمی ثابت ہوتی ہے۔ نسخ کے معنی پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے آ جاتی ہے کہ اہل حق جن احکام شرع کو منسوخ مانتے ہیں وہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ احکام منسوخہ ایک وقت خاص تک عمل کرنے کے لئے نازل ہوئے تھے۔ جب وہ مدت پوری ہو گئی تو شارع نے اس مدت عمل کی انتہاء اور اختتام کو بیان کر دیا۔ یہی نسخ ہے اور اس سے کسی حکم کا ناقص ہونا یا شارع کا لاعلم ہونا ثابت نہیں ہوتا، بلکہ اس سے شارع کے کمال علم و حکمت کا اثبات ہوتا ہے۔

(از النبیان للکاتمی)

نسخ کی بحیثیت حکم و تلاوت تین قسمیں:

(۱) ”نسخ الحکم دون التلاوة“ حکم منسوخ ہو جائے، تلاوت منسوخ نہ ہو، قرآن پاک میں یہی نسخ زیادہ مشہور ہے۔ اس صورت میں جو آیہ منسوخ ہوگی وہ قرآن پاک میں موجود ہوگی۔ اور جو نسخ ہوگی وہ بھی قرآن پاک میں موجود ہوگی۔ دونوں کی تلاوت ہوگی۔ فرق یہ ہوگا کہ منسوخ آیہ کا حکم جاری نہیں ہوگا۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا وَصِيَّةً لِّأَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ غَيْرِ إِخْرَاجٍ﴾
 ”اور جو تم میں مریں اور بیبیاں چھوڑ جائیں وہ اپنی عورتوں کے لئے وصیت کر جائیں سال بھر تک نان نفقہ دینے کی بے نکالے“

اس آیت کریمہ میں یہ حکم تھا کہ جن عورتوں کے خاوند فوت ہو جائیں ان کی عدت ایک سال ہے۔ اور ان کو ایک سال تک نان فقہ دیا جائے اور ایک سال تک ان کو گھر میں رہنے دیا جائے ان کو نکالا نہ جائے۔ لیکن اس حکم کی انتہاء کا وقت جب آگیا، تو دوسرا حکم نافذ فرما کر اسے منسوخ کر دیا۔ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا﴾

”اور تم میں جو مرے اور بیویاں چھوڑیں وہ چار مہینے دس دن اپنے آپ کو روکے رکھیں“

یعنی جن عورتوں کے خاوند فوت ہو جائیں ان کی عدت ایک سال کو منسوخ کر کے چار مہینے دس دن کر دی گئی تا قیامت اب یہی جاری رہے گی۔

یہ دونوں آیتیں قرآن پاک میں پڑھی جا رہی ہیں۔ لیکن جس آیت کو پہلے ذکر کیا ہے اس کا حکم منسوخ ہے۔

(۲) ”نسخ التلاوة دون الحکم“ تلاوت منسوخ ہو جائے، حکم باقی رہے، جیسا کہ آیت رجم:

”عن ابن عباس قال عمر بن الخطاب وهو جالس على منبر رسول الله ﷺ

ان الله بعث محمدا ﷺ بالحق وانزل عليه الكتاب فكان مما انزل الله

آية الرجم قرأناها ووعينا وعقلناها فرجم رسول الله ﷺ ورجمنا بعده

فاخشى ان طال بالناس زمان ان يقول قائل ما نجد الرجم في كتاب

الله تعالى فيضلوا بترك فريضة انزلها الله وان الرجم في كتاب الله

حق..... الخ“ (مسلم ج ثانی باب حد الزنا)

”حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے منبر

رسول اللہ ﷺ پر بیٹھ کر ارشاد فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو حق سے مبعوث فرمایا

اور آپ پر کتاب کو نازل فرمایا، اور اللہ تعالیٰ نے آپ پر آیت رجم (زانی کو سنگسار کرنا)

کو نازل فرمایا، ہم نے اسے پڑھا، اور یاد کیا اور سمجھا۔ رسول اللہ ﷺ نے رجم کرنے کا

حکم نافذ فرمایا۔ ہم نے آپ کے بعد رجم کا حکم جاری رکھا۔ مجھے ڈر ہے کہ کچھ وقت

جب گزر جائے گا تو کہنے والا کہے گا کہ ہم رجم کا ذکر اللہ کی کتاب (قرآن پاک) میں

نہیں پاتے۔ اللہ تعالیٰ نے جس آیت کو نازل کر کے ایک حکم کو فرض کیا اسے چھوڑنے کی

وجہ سے وہ گمراہ ہو جائیں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔ حالانکہ رجم کا حکم کتاب اللہ میں حق طور پر ثابت ہے۔

آیہ رجم ”الشیخ والشیخۃ اذا زنيا فارجموهما البتۃ“ تلاوت کے لحاظ پر منسوخ ہے۔ لیکن اس کا حکم باقی ہے۔ (سنگسار کرنے کے حکم کو توڑنے والے گمراہ ہیں۔)
”هذا الذی خشية قد وقع من الخوارج ومن وافقهم وهذا من کرامات عمر ويحتمل من ذلک من جهة النبی ﷺ“ (نووی)

حضرت عمر کا یہ فرمانا کہ کچھ وقت گزرنے پر لوگ انکار کریں گے۔ خارجیوں نے اور ان کے یاروں نے اس کا انکار کیا۔ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی کرامت ہے جو واقع ہو چکی ہے۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو نبی کریم ﷺ سے پتہ چلا ہو۔ تو اس صورت میں نبی کریم ﷺ کا علم غیب ثابت ہوگا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی کرامت اور کمال ثابت ہوگا۔

خیال رہے کہ ہمارے ملک پاکستان میں بھی یہود و نصاریٰ کے آلہ کار سرکاری اہم عہدوں پر قائم رہنے والے پڑھے لکھے بے وقوفوں نے ضیاء الحق کے دور حکومت میں رجم کا انکار کیا جس کا کیس عدالت میں چلتا رہا۔ سبحان اللہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول جگمگا رہا ہے۔ گمراہ لوگ آیہ رجم کا انکار کر کے یہود و نصاریٰ کو خوش کر کے ان سے ڈالر بٹور رہے ہیں۔

(۳) ”نسخ الحکم والتلاوة معا“ حکم اور تلاوت دونوں کا منسوخ ہو جانا۔ جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

”کان فیما انزل من القرآن عشر رضعات معلومات یحرمن، ثم

نسخن بخمس معلومات“ (رواہ مسلم)

”کہ قرآن پاک میں نازل کیا گیا کہ دس مرتبہ کسی عورت کا دودھ پینے سے رضاعت

ثابت ہوگی، جس سے حرمت ثابت ہوگی۔ پھر پانچ مرتبہ دودھ پینے کا حکم نازل کر

کے دس مرتبہ والا حکم منسوخ کر دیا گیا“

یہاں یہ خیال رہے کہ دونوں آیتیں دس دفعہ دودھ پینے والی اور پانچ مرتبہ دودھ پینے والی منسوخ ہیں اور دونوں ہی حکم اور تلاوت کے لحاظ پر منسوخ ہیں۔ کیونکہ پانچ مرتبہ والی آیہ ﴿وَأُمَّهَاتُكُمْ﴾

الَّتِي أَرْضَعْنَكُمْ وَأَخَوَاتُكُمْ مِنَ الرِّضَاعَةِ ﴿۱﴾ سے منسوخ ہے۔ اس میں حکم مطلق ہے۔ لہذا اب قلیل دودھ پینے سے یا کثیر پینے سے ہر حالت میں رضاعت ثابت ہو جائے گی۔ (ماخوذ از شیخ زادہ)

نسخ بحیثیت نسخ کے چار قسم ہے:

(۱) نسخ الكتاب بالكتاب..... قرآن پاک کی آیت کو قرآن پاک کی آیت سے منسوخ کیا گیا۔ قرآن پاک میں یہی نسخ باقی قسموں سے زیادہ پایا گیا ہے۔ پہلے دو آیتوں کا ذکر کیا گیا کہ جس میں فوت شدہ آدمی کی عورت کی عدت ایک سال وہ منسوخ ہے چارہ ماہ دس دن والی آیت سے۔ اس میں قرآن پاک کی آیت کو قرآن پاک کی آیت سے ہی منسوخ کیا گیا۔

اسی طرح قتال (جہاد) میں پہلے ایک مسلمان کو دس کافروں کے مقابل قائم رہنے کا حکم تھا، پھر اس میں تخفیف کر کے ایک کو دو کے مقابل قائم رہنے کا حکم دیا گیا۔ لہذا پہلا حکم ﴿إِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ عَشْرُونَ صَابِرُونَ يَغْلِبُوا مِائَتِينَ﴾ اگر تم میں سے بیس صبر کرنے والے ہوں گے دو سو پر غالب ہوں گے۔ منسوخ کر دیا گیا۔ یعنی اس میں تخفیف کر کے یہ حکم نافذ فرمایا ﴿فَإِنْ يَكُنْ مِائَةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُوا مِائَتِينَ﴾ اگر تم میں سے ایک سو صبر کرنے والے ہوئے، تو دو سو پر غالب آئیں گے۔

اس طرح الاتقان میں کئی آیات کو ذکر کیا گیا ہے، جو قرآن پاک کی دوسری آیات سے منسوخ ہیں۔

(۲) ”نسخ الكتاب بالسنة“ قرآن پاک کی کسی آیت کو حدیث پاک سے منسوخ کیا جائے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ﴿لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَاءُ مِنْ بَعْدِ﴾ نبی کریم ﷺ کی زوجیت میں جب بیک وقت نواز واج مطہرات تھیں تو حکم ہوا کہ اس کے بعد (یعنی نواز واج کے بعد) آپ کے لئے عورتیں حلال نہیں۔

اس آیت کو حدیث پاک سے منسوخ کیا گیا ہے وہ حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

”ان النبی ﷺ اخبرها بان الله تعالى اباح له من النساء ما شاء“

”بیشک نبی کریم ﷺ نے انہیں خبر دی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے جائز کر دیا کہ

آپ جتنی عورتوں سے نکاح کرنا چاہیں کر سکتے ہیں“

خیال رہے کہ آپ کے لئے نکاح کرنے کی حد کو اٹھادیا گیا تھا لیکن پھر بھی آپ نے بیک وقت نوعورتوں سے زائد کے ساتھ نکاح نہیں کیا۔

اعتراض: یہ حدیث خبر واحد ہے۔ خبر واحد سے قرآن پاک کی آیہ کو منسوخ نہیں کیا جاسکتا۔ تو یہ مثال کیسے صحیح ہے؟

جواب: احادیث کی یہ اقسام ہمارے لحاظ سے ہیں۔ صحابہ کرام کے لحاظ سے نہیں۔

”فان هذا الخبر عنده ليس خبر الواحد بل هو سمع من في رسول الله ﷺ“

”جس صحابی نے یہ روایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بیان کی انہوں نے خود بھی

نبی کریم ﷺ کے منہ مبارک سے سنی اس لئے ان کے حق میں یہ خبر واحد نہیں“

(۳) نسخ السنة بالكتاب..... حدیث پاک منسوخ ہو قرآن پاک کے ذریعے۔ جیسا کہ بیت المقدس کا قبلہ ہونا حدیث پاک سے ثابت ہے۔ لیکن اس کا منسوخ ہونا قرآن پاک کی آیت ﴿قَوْلٍ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ (مسجد حرام کی طرف اپنے چہرہ کو پھیر لیں) سے ثابت ہے۔

(۴) نسخ السنة بالسنة..... حدیث پاک منسوخ ہو حدیث پاک کے ذریعے۔ جیسا کہ ابن ماجہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ذکر کی:

”قال رسول الله ﷺ كنت نهيتكم عن زيارة القبور فزوروها فانها

تزهد في الدنيا وتذكر الآخرة“

”رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں نے تمہیں قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا، (اب) تم

قبروں کی زیارت کرو کیونکہ اس سے دنیا میں زہد حاصل ہوتا، اور آخرت کی یاد آتی ہے۔“

واضح ہوا کہ قبروں کی زیارت کی ممانعت والی حدیث منسوخ ہو گئی اور اجازت والی ناسخ ہو گئی۔

(ماخوذ از الاتقان ونور الانوار مع قمر الاقمار)

وضاحت حدیث: نبی کریم ﷺ نے پہلے قبروں کی زیارت سے منع فرمایا تھا، کیونکہ زمانہ جاہلیت قریب تھا، لوگ بت پرستی کے عادی تھے، اس لئے منع کیا تا کہ لوگ قبر والوں کو معبود نہ سمجھ لیں، جب صحابہ کرام کے دلوں میں اسلام اور اسلامی طور طریقے راسخ ہو گئے تو آپ نے اجازت فرمادی۔

فائدہ: مرقاة شرح مشکوٰۃ باب زیارة القبور میں ہے:

”اذا تحیرتم فی الامور فاستعینوا باهل القبور“

”جب تمہیں کچھ معاملات میں حیرانی و پریشانی ہو تو قبر والوں سے امداد طلب کرو“

اسی طرح قبروں کی زیارت سے انسان کو آخرت کی یاد حاصل ہوتی ہے۔ وہ اس کی تیاری کرتا ہے، برائیوں کو چھوڑ دیتا ہے اور نیکیاں کرتا ہے، وہ کتنے بے نصیب ہیں جو قبرستان میں بھی فحش مزاح سے باز نہیں آتے۔

تنبیہ: عورتوں کے لئے بھی قبروں کی زیارت کرنا جائز ہے۔ عام طور پر ایک حدیث پاک بطور دلیل پیش کی جاتی ہے کہ عورتوں کی قبروں کی زیارت کرنے پر لعنت ہے۔ لیکن حدیث پاک کی مکمل وضاحت نہیں کی جاتی، جو خود محدثین کرام نے بیان کی ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

”لعن زوارات القبور“ قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر لعنت ہے

(مسند احمد، ترمذی، ابن ماجہ، مشکوٰۃ باب زیارة القبور)

ترمذی نے اس حدیث پاک کو حسن صحیح کہا ہے، اور خود ہی حدیث پاک کی وضاحت ان الفاظ

سے کی ہے۔

”قد رأى بعض اهل العلم ان هذا كان قبل ان يرخص النبي ﷺ فى زیارة القبور فلما رخص دخل فى رخصته الرجال والنساء وقال بعضهم انما كره زیارة القبور للنساء لقلة صبرهن ولشدة جزعهن“

(مشکوٰۃ باب زیارة القبور)

امام ترمذی نے کہا کہ بعض اہل علم نے کہا ہے کہ اس حدیث پاک کے متعلق وضاحت یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے قبروں کی جو رخصت فرمائی ہے، یہ حدیث اس سے پہلے کی ہے۔ کیونکہ پہلے مردوں کو منع کیا گیا تھا اور عورتوں کو بھی منع کیا گیا تھا۔ جب اجازت فرمائی تو مردوں اور عورتوں تمام کے لئے ہی اجازت فرمائی۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اگر عورتیں صبر نہ کریں اور قبروں پر جا کر زور زور سے رونا، پیٹنا، جزع و فزع کرنا شروع کر دیں تو ایسی حالت میں ان کا قبروں پر جانا منع ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قبروں کی زیارت کرنا ان کی زبان سے ہی سنئے۔ آپ فرماتی ہیں۔

”كنت ادخل بيتي الذي فيه رسول الله ﷺ واني واضع وجهي واقول انما هو زوجي وابي فلما دفن عمر معهم فوالله ما دخلته الا وانا مشدودة على ثيابي حياء من عمر“ (مسند احمد، مشكوة باب زيارة القبر)
 ”میں اس حجرہ میں داخل ہوتی جس میں رسول اللہ ﷺ مدفون ہیں تو میں پردے کا زیادہ اہتمام نہ کرتی، کیونکہ میرے خیال میں آتا کہ ایک میرے خاوند ہیں اور دوسرے میرے باپ (ابوبکر صدیق) ہیں۔ لیکن جب حضرت عمر بھی اسی حجرہ میں ان کے ساتھ دفن ہو گئے تو میں نے حضرت عمر سے حیاء کرتے ہوئے پہلے سے زیادہ پردہ کا اہتمام شروع کر دیا“

اس حدیث پاک کی شرح بیان کرتے ہوئے حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

”قولها حياء من عمر اوضح دليل على حياة الميت وعلى انه ينبغي احترام الميت عند زيارته مهما امكن لاسيما الصالحون بان يكون في غايته الحياء والتأدب بظاهره وباطنه فان للصالحين مددا ظاهرا بالغا لزوارهم بحسب ادبهم ونيتهم وقبولهم“ (لمعات حاشية مشكوة)
 ”حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ارشاد ”حياء من عمر“ میت کی حیات پر بڑی واضح دلیل ہے، اور یہ ثابت ہو رہا ہے کہ قبر کی زیارت کے وقت جتنا ممکن ہو سکے صاحب قبر کا اہتمام کیا جائے خصوصاً نیک لوگوں کی قبروں پر جا کر نہایت حیاء کرتے ہوئے ظاہری اور باطنی ادب کا پاس کرے، کیونکہ زیارت کرنے والے جتنا زیادہ ادب کریں گے اور خالص نیت رکھیں گے اور نیک لوگوں کی امداد کو قبول کریں گے اتنی ہی زیادہ ان کی طرف سے ان لوگوں کو کامل امداد حاصل ہوگی۔“

اسی حدیث کی وضاحت میں استاذی المکرم حضرت علامہ مولانا محمد اشرف سیالوی مدظلہ العالی نے جلاء الصدور میں ایک سوال و جواب ذکر فرمایا۔ جو بہت ہی زیادہ مفید ہے۔ اور نبی کریم ﷺ کے حاضر و ناظر ہونے پر بھی عام حلقوں کی جانب سے یہی سوال کیا جاتا ہے۔ جواب سے انشاء اللہ مزاج میں انصاف رکھنے والوں کو اطمینان قلب حاصل ہوگا۔

سوال: جن کی نگاہ کئی من مٹی کے اندر سے باہر دیکھ سکتی ہے، کیا وہ حجاب و ستر کے اندر نہیں

دیکھ سکتی، پھر اس اہتمام کا مقصد کیا ہوگا (یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دُفن کے بعد پردے کا جو اہتمام کیا اس خیال سے کہ وہ مجھے قبر کے اندر سے مٹی کے ڈھیر کے نیچے سے بھی دیکھ رہے ہیں۔ جو اتنی نظر رکھتا ہو اس کی نگاہ میں کپڑے کے پردے کی کیا حیثیت ہوگی)؟

جواب: جتنی قدر بندے کی طاقت میں ہے اس قدر پر اہتمام و انتظام بھی لازم ہے۔ اور شیخ نے ”مہما امکن“ (جتنا ممکن ہو) سے اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ مثلاً خلوت اور تنہائی میں بھی بندہ پر لازم ہے کہ وہ اپنی شرمگاہ کو ڈھانپے۔ انسانوں وغیرہ سے نہ سہی، اللہ رب العزت سے حیاء کرتے ہوئے اس پر ستر (پردہ) لازم ہے۔ لہذا جو جواب اللہ علیم وخبیر کی نسبت سے یہاں دیا جائے گا وہی جواب اہل قبور کی طرف سے بھی سمجھ لیا جائے۔ حدیث پاک ملاحظہ ہو۔

”وعن یعلیٰ قال ان رسول اللہ ﷺ رأى رجلا یغتسل بالبراز فصعد المنبر فحمد اللہ واثنی علیہ ثم قال ان اللہ حی ستر یحب الحیاء والتستر فاذا اغتسل احدکم فلیستر“ (رواہ ابوداؤد و نسائی)

”حضرت یعلیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو کھلی جگہ میں بغیر پردہ کے غسل کرتے دیکھا تو آپ منبر پر جلوہ افروز ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا ”بیشک اللہ تعالیٰ شرمیلا، پردہ پوش، حیاء اور پردہ کو پسند کرنے والا ہے۔ لہذا تم میں سے کوئی شخص جب بھی غسل کرے تو ستر اور پردہ کے اندر کرے“

ملا علی قاری حنفی نے ابن حجر رحمہما اللہ سے نقل کرتے ہوئے فرمایا:

”من ثم قال ائمتنا یحرم کشف العورة فی الخلوة بغیر الحاجة لان فیہ ترک الحیاء من اللہ تعالیٰ“

”اسی وجہ سے ہمارے ائمہ کرام نے فرمایا کہ تنہائی اور علیحدگی میں بھی بلا وجہ ستر و حجاب کا ترک حرام ہے۔ کیونکہ اس میں بارگاہ خداوندی کے لائق شرم و حیاء کو ترک کرنا لازم آتا ہے“

ائمہ کرام کے اس قول پر سوال وارد ہوا کہ جب اللہ تعالیٰ ظاہر اور چھپی ہوئی ہر چیز کو جانتا ہے تو اس سے پردہ کرنا اور لباس پہن کر ہی نماز ادا کرنا خلوت میں کیوں ضروری، اس کا مقصد کیا ہے؟

اس کا جواب یوں دیا گیا:

”وردوہ بانہ تعالیٰ وانه احاطہ علمہ بہما الا انه یری المستور علی“

ائمہ کرام نے اس سوال کو یوں رد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا علم اگرچہ مستور و غیر مستور دونوں کو محیط ہے لیکن شرم و حیاء والے مستور کو ایسی حالت میں دیکھتا ہے جس کا ادب تقاضا کرتا ہے بخلاف غیر مستور کے اور دونوں کے دیکھنے میں بڑا فرق ہے۔

لہذا جس طرح علم باری تعالیٰ کے محیط ہونے کے باوجود ستر کا حکم دیا گیا ہے اور شرم و حیاء والی حالت کو اختیار کرنا لازم کیا گیا ہے۔ اسی طرح ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ نے بھی ادب اور شرم و حیاء والی ہیئت کو اختیار فرمایا اور جس طرح اللہ تعالیٰ مستور کے ساتھ تقاضاء ادب کے مطابق سلوک فرماتا ہے، یہی حالت اہل قبور کو بھی سمجھنی چاہئے۔

نیز اللہ تعالیٰ اپنی حیاء (جو اس کی شان کے لائق ہے) کے مطابق کسی کے مخفی اندام کی طرف توجہ نہ فرمائے باوجود ”علیم وخبیر و بصیر“ ہونے کے اور اسی طرح اپنے مقبول بندے انبیاء کرام، اولیاء عظام کو علم اور نظر عطا فرمانے کے باوجود ان کی توجہ کو اس جانب سے ہٹالے تو کوئی بعید نہیں۔

نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں ”انسی اراکم من خلفی کما اراکم من بین یدی“ (اپنی صفوں کو درست کر کے ایک دوسرے سے مل کر کھڑے ہوا کرو) میں تمہیں پیٹھ کے پیچھے سے اسی طرح دیکھتا ہوں، جس طرح سامنے سے دیکھتا ہوں۔ جب نبی کریم ﷺ پر سامنے اور پیچھے کے حالات ایک جیسے ظاہر ہیں تو یقیناً آپ پر کوئی چیز مخفی تو نہیں، لیکن پھر بھی ادب کا تقاضا یہی ہے کہ لباس پہن کر نماز ادا کی جائے، انسان اپنی طرف سے جتنا ممکن ہو پردہ رکھے۔ اور اسی طرح نبی کریم ﷺ علم و بصارت کے باوجود کسی طرف توجہ نہ فرمائیں جو آپ کی شان کے لائق نہیں تو کوئی بعید نہیں۔ (انتہی)

نسخ الكتاب بالسنة میں امام شافعی رحمہ اللہ کا موقف:

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، قرآن پاک کی کسی آیت کو منسوخ نہیں کیا جاسکتا۔ وہ اپنے اس موقف کو دلائل سے پیش کرتے ہیں۔ ان کے دلائل اور جوابات پر نظر کریں۔

امام شافعی رحمہ اللہ کی ایک دلیل یہ ہے کہ رب تعالیٰ کا ارشاد یہ ہے ﴿نَاتٍ بِخَيْرٍ مِنْهَا أَوْ مِثْلَهَا﴾

ہم اس سے بہتر یا اس کی مثل لے آتے ہیں۔ یعنی جو آیہ منسوخ ہونا اس سے بہتر ہو، یا اس کی مثل ہو۔ حدیث پاک کو ناسخ نہیں مانا جاسکتا کیونکہ حدیث میں الفاظ نبی کریم ﷺ کے ہوتے ہیں۔

اسی طرح بعض لوگوں کا موقف یہ ہے کہ ناسخ میں آسانی ہو، مشکل نہ ہو، اگر ناسخ آسان کی مشکل کے ذریعے ہو جائے تو ناسخ منسوخ سے خیر یا مثل نہیں ہوگا۔

امام شافعی رحمہ اللہ کی پہلی دلیل اور تیسرے درجہ میں بعض لوگوں کا موقف جو بیان کیا ہے کہ ناسخ مشکل نہ ہو منسوخ سے۔ ان کا جواب یہ ہے کہ ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ ناسخ منسوخ سے مشکل نہیں ہو سکتا، کیونکہ احکام کی مشروعیت اور آیات کا نزول بندوں کی مصلحت اور ان کے نفوس کی تکمیل کے لئے ہے جو صرف اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت پر مبنی ہے۔ یہ مصلحت زمانے کے اختلاف سے مختلف ہوگی۔ اور بعض لوگوں کے مطابق ایک چیز بہتر ہوتی ہے، اور بعض کے لحاظ پر دوسری چیز بہتر ہوتی ہے۔

جس طرح معالج ایک دواء ایک شخص کے لئے تجویز کرتا ہے اسے وہ نفع دیتی ہے، لیکن دوسرے شخص کو وہی دواء اسی بیماری کے لئے نفع نہیں دیتی کیونکہ مزاج مختلف ہیں۔

اسی طرح کبھی دوسری دواء پہلی سے زیادہ کڑوی ہوگی اور پہلی سے زیادہ مہنگی ہوگی، لیکن مفید زیادہ ہوگی۔ اسی سے یہ واضح ہوا:

”قد یكون الاثقل اصلح في انتظام المعاش وانظم في اصلاح المعاد والله تعالى لطيف حكيم“ کہ کبھی مشکل کام دنیا کی زندگی کی گزران کے انتظام کے لئے زیادہ مفید ہوتا ہے۔ اور اخروی زندگی کی بہتری کے لئے بھی مشکل کام ہی کبھی زیادہ نفع مند ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ لطیف و حکیم ہے، وہ اپنے بندوں کی مصلحتوں کو جانتا ہے۔ ان مصلحتوں کے مطابق ہی حکم نافذ فرماتا ہے۔ اسی بحث سے امام شافعی رحمہ اللہ کی پہلی دلیل کا جواب بھی آ گیا کہ بہتر ہونا ظاہری طور پر مراد نہیں۔ بلکہ بہتر ہونے یا مثل ہونے سے مراد نفع دینے میں بہتر ہو یا مثل ہو۔ حدیث پاک سے اگر آیہ کو منسوخ کر دیا گیا ہوگا تو وہ بھی نفع میں بہتر یا مثل ہوگا۔

البتہ یہ کہنا کہ قرآن پاک تو اللہ تعالیٰ کا کلام ہے قدیم ہے۔ حدیث پاک حادث ہے۔

قرآن پاک کی نماز میں تلاوت ہوتی ہے۔ اور حدیث پاک کی نہیں ہوتی۔ قرآن پاک کو جبرائیل نے رب تعالیٰ کی طرف سے وحی کی صورت میں پیش کیا، حدیث پاک کو یہ حیثیت حاصل نہیں، لہذا حدیث قرآن پاک کے نہ مثل ہے اور نہ بہتر ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے:

”ولیس المراد بالخیرۃ والمماثلۃ فی اللفظ حتی لا تكون السنۃ

کذلک بل فی النفع والثواب فیجوز ان یکون ما اشتملت علیہ السنۃ

خیرا فی ذلک“

کہ بہتر ہونے یا مثل ہونے سے مراد لفظ میں بہتری یا مثلیت مراد نہیں کہ حدیث پاک کے الفاظ سے بہتر اور مثل نہیں، بلکہ بہتر یا مثل ہونے کا مقصد نفع اور ثواب میں بہتر یا مثل ہونا ہے۔ اس لحاظ پر حدیث پاک میں حکم زیادہ نفع مند یا اس جیسا ہو سکتا ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ کی دوسری دلیل کہ رب تعالیٰ نے ”نأت“ کو اپنی طرف منسوب کیا کہ ہم اس سے بہتر یا اس کی مثل لاتے ہیں حدیث پاک تو نبی کریم ﷺ کی طرف منسوب ہے۔

اس کا جواب بھی پہلے جواب سے ہی سمجھ آ گیا کہ نسخ میں الفاظ مراد ہی نہیں بلکہ مضمون مراد ہے۔ مضمون نبی کریم ﷺ کی احادیث مبارکہ میں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے۔ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی اس میں بہت واضح ہے:

﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۖ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ﴾

”نبی کریم ﷺ اپنی خواہش سے کوئی بات نہیں کرتے بلکہ وہی کرتے ہیں جو آپ کی طرف وحی کی جاتی ہے“

اس سے واضح ہوا کہ احادیث مبارکہ کے مضامین رب تعالیٰ کی طرف ہی منسوب ہیں، اگرچہ الفاظ نبی کریم ﷺ کے ہوتے ہیں۔ لیکن الفاظ جب مقصود ہی نہیں تو حدیث پاک کو ناخ ماننا ”نأت“ کے منافی نہیں۔

(ماخوذ از روح المعانی)

اَوْ نُنْسِهَا: اس میں مشہور قراءت نون کے ضمہ اور سین کے کسرہ سے ہے۔ جس کا ماخذ انشاء یا نسیان ہے۔ جس کا معنی ہے بھلانا، یعنی ہم ان آیات کو لوگوں کے دلوں سے ہی بھلا دیتے ہیں۔ کہ وہ ان کے پڑھنے پر قادر ہی نہیں رہتے۔ جیسا کہ حدیث پاک سے یہ مضمون زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔

ابن شہاب کہتے ہیں مجھے ابو امامہ بن سہل بن حنیف نے سعید بن مسیب (ؓ) کی مجلس میں حدیث بیان کی:

”ان رجلا قام من الليل ليقرا سورة من القرآن فلم يقدر على شيء منها وقام آخر فلم يقدر على شيء منها، وقام آخر فلم يقدر على شيء منها، فغدوا على رسول الله ﷺ فقال احدهم قمت الليلة يا رسول الله لأقرأ سورة من القرآن فلم اقدر على شيء منها فقام الآخر فقال وانا والله كذلك يا رسول الله، فقام الآخر فقال وانا والله كذلك يا رسول الله فقال رسول الله ﷺ انها مما نسخ الله البارحة“
(قرطبی وھکذا فی ابن کثیر)

ایک شخص نے رات کو کھڑے ہوئے ایک سورۃ پڑھنی چاہی وہ اس کے پڑھنے پر قادر نہ ہو سکے، دوسرے صحابی سے بھی یہی صورت درپیش آئی اور تیسرے سے بھی ایسا ہی ہوا۔ صبح نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ آج رات کو میں فلاں سورۃ پڑھنا چاہتا تھا لیکن نہ پڑھ سکا۔ مجھے اس کے پڑھنے کی قدرت ہی حاصل نہ ہو سکی۔ ایک اور صحابی نے عرض کیا یا رسول اللہ قسم ہے اللہ کی میرے ساتھ بھی یہی صورت درپیش آئی۔ اور ایک تیسرے شخص نے کہا اللہ کی قسم یا رسول اللہ مجھے بھی اسی کیفیت کا سامنا کرنا پڑا۔ حضور نے فرمایا وہ سورۃ گزشتہ رات منسوخ ہو گئی۔

اور ایک قراءت میں ”ننساھا“ نون اور سین کے فتح اور اس کے بعد ہمزہ سے پڑھا ہے۔ جس کا معنی ہے تاخیر کرنا اب معنی یہ ہوگا کہ ہم اسے لوح محفوظ میں یا ملائکہ کے پاس ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ اسے کچھ دیر سے نازل کرتے ہیں۔ اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ ہم کسی آیت کو مجمل ذکر کرتے ہیں۔ جب ضرورت درپیش آتی ہے تو ہم اسے بیان کر دیتے ہیں ”ثم ان علينا بيانہ“ اسی مفہوم کو واضح کر رہا ہے۔

”اوننساھا ای تؤخر انزالها الى وقت ثان فئات بدلا منها في الوقت

المتقدم ما يقوم مقامها“

یعنی ”ننساھا“ کی قراءت میں معنی یہ ہوگا کہ کسی آیت کا نزول ہم کچھ وقت تک مؤخر کر دیتے ہیں۔ پھر اس پہلے وقت کے بدل دوسرے وقت میں ہم اسے لے آتے ہیں..... (از شیخ زادہ)

نَاتِ بِخَيْرٍ مِنْهَا أَوْ مِثْلَهَا:

ہم لے آتے ہیں اس سے بہتر یا اس کی مثلاً اس کا مطلب یہ ہے:

”بما هو خير للعباد في النفع والثواب او مثلها في الثواب“

کہ ہم منسوخ آیت کے بدل وہ ناسخ لے آتے ہیں جو بندوں کے نفع اور ثواب میں ان کے لئے بہتر ہو یا ثواب میں اس کی مثل ہو۔

علامہ بیضاوی رحمہ اللہ کی اس تفسیر سے ایک اور مسئلہ واضح ہو گیا کہ آیات کی فضیلت بعض کی بعض پر بحسب الذات اور بحسب الالفاظ نہیں، کیونکہ تمام آیات اللہ تعالیٰ کا کلام ہیں:

”فلا يتفاضل بعضها على بعض في انفسها من حيث انها كلام الله“

روحیه و کتابہ بل التفاضل فیہا انما هو بحسب ما يحصل منها للعباد

فی الآخرة او فی الدنيا او فیہما“

اور اللہ تعالیٰ کے کلام میں بعض آیات بعض سے افضل بحیثیت اللہ کا کلام ہونے کے، بحیثیت وحی کے اور بحیثیت کتاب اللہ ہونے کے تو نہیں ہو سکتیں۔ البتہ بندوں کے لئے آخرت میں نفع مند ہونے کے لحاظ سے یا دنیا میں نفع مند ہونے کے لحاظ سے یا دنیا اور آخرت میں نفع مند ہونے کے لحاظ سے فضیلت حاصل ہو سکتی ہے۔

بحیثیت نفع مند ہونے کے نسخ کی تین قسمیں:

(۱) ناسخ بنسبت منسوخ کے خفیف ہو جس کا دنیا میں فائدہ ہو۔ جیسا کہ فوت شدہ شخص کی زوجہ کی عدت ایک سال سے کم کر کے چار ماہ دس دن کر دی گئی۔ جو دنیا میں نفع مند ہے۔ کیونکہ ایک سال عدت گزارنا مشکل تھا اور چار ماہ دس دن آسان ہے۔

اسی طرح رات کے قیام کی تہجد تک فرضیت کو منسوخ کر دینے سے مشکل کو آسان کر دیا گیا۔ جس کا دنیا میں نفع ہوا۔

(۲) جو آخرت میں نفع مند ہوا اگرچہ دنیا میں وہ زیادہ مشکل نظر آئے۔ جیسا کہ پہلے قتال سے دور

رہنا اور درگزر کرنا اور معاف کرنا ضروری تھا، پھر قتال کا حکم فرض کیا جو بظاہر دنیا کے لحاظ سے مشکل ہے، لیکن اجر و ثواب اور اخروی نفع کے لحاظ سے پر پہلے حکم سے بڑھ کر ہے۔

اسی طرح زناء کی حد پہلے زبان سے سرزنش کرنا۔ پھر ایک سال تک ان کو گھروں میں بند رکھنے کا حکم تھا، پھر اسے منسوخ کر کے سو کوڑے لگانے یا سنگسار کرنے کا حکم نافذ کر دیا۔ جو بظاہر مشکل ہے۔ لیکن نظام کو درست رکھنے اور لوگوں کو غلط کاری سے روکنے کے لئے زیادہ نفع مند ہے۔ جس میں اخروی ثواب بھی زیادہ ہے۔

اسی طرح پہلے عاشورہ کا روزہ فرض ہوا، پھر ایام بیض (چاند کی تیرہ، چودہ اور پندرہ تاریخوں) کے روزے فرض ہوئے، پھر رمضان کا مکمل مہینہ روزے فرض کر دیئے گئے، جو بظاہر مشکل حکم ہے، لیکن آخرت میں زیادہ نفع مند ہے، کیونکہ اس میں اجر و ثواب زیادہ ہے۔

(۳) ناسخ اور منسوخ بظاہر برابر ہوں۔ نہ ایک میں مشقت زیادہ ہو اور نہ دوسرے میں۔ بلکہ تخفیف اور مشقت کے لحاظ پر برابر ہوں۔ جیسا کہ بیت المقدس کا قبلہ ہونا منسوخ کر دیا اور کعبہ شریف کے قبلہ ہونے کا حکم نافذ کر دیا گیا۔ مشقت اور تخفیف کے لحاظ پر دونوں برابر ہیں تاہم راقم کو یہ بات بھی واضح نظر آتی ہے کہ اگرچہ مشقت اور تخفیف کے لحاظ سے دونوں میں مثلیت ہے، لیکن رب تعالیٰ کا منسوخ کرنا جب مصلحت کی وجہ سے ہو تو اس لحاظ سے ناسخ مثل ہونے کے باوجود بھی خیر ہے۔ ابھی جو تین قسمیں بیان کی ہیں ان کو علامہ قرطبی رحمہ اللہ کی تفسیر کے خوبصورت الفاظ میں طلباء کرام دیکھیں:

”والمعنی نأت بما هو انفع لکم ایہا الناس فی عاجل ان کانت

الناسخۃ اخف وفی آجل ان کانت اثقل ومثلها ان کانت مستویۃ“

(ماخوذ از شیخ زادہ و قرطبی)

علامہ رازی نے بیان فرمایا:

(نأت بخیر منها او مثلها) فیہ قولان احدهما انه الاخف والثانی انه

الاصلح لحق کان بها والثانی اولی لانہ تعالیٰ یصرف المکلف عن

مصالحو لا علی ما هو اخف لطباعہ“

”خیر لانے کا ایک مطلب بعض حضرات نے بیان کیا کہ ناسخ خفیف ہونا چاہئے لیکن محققین کا قول یہ ہے کہ ناسخ بندوں کے لئے نفع مند ہونا چاہئے، یہی قول زیادہ بہتر تحقیق پر مبنی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ بندوں کو مصلحت پر مبنی حکم دیتا ہے، صرف تخفیف والا حکم دینا مقصود نہیں ہوتا“

اس پر بظاہر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اگر دوسرا حکم اصلح (زیادہ صلاحیت پر مبنی) ہے۔ تو پہلا حکم غیر اصلح ہوگا۔ تو رب تعالیٰ نے اس کا حکم پہلے کیوں دیا تھا جب کہ رب تعالیٰ بندوں کی مصالح کا لحاظ کرتا ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے۔

”الاول كان اصلح من الثاني بالنسبة الى الوقت الاول والثاني على عكس الاول“
پہلا حکم بھی بہتر تھا لیکن اس کی ایک خاص مدت تھی۔ جب اس کی مدت ختم ہو گئی تو اب دوسرے کی بہتری کا وقت شروع ہو گیا۔ یعنی رب تعالیٰ کا کوئی حکم بھی ایسا نہیں کہ اسے کہا جائے ”یہ بہتر نہیں“ البتہ وقت گزرنے پر جب وہ حکم ہی ختم ہو جائے تو اب یہ کہا جاسکے گا کہ اس پر عمل کرنا اب بہتر نہیں۔ بلکہ دوسرے حکم پر عمل کرنا بہتر ہے۔
(از شیخ زادہ)

﴿ اَلَمْ تَعْلَمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾

”کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے“

خطاب اگرچہ بظاہر نبی کریم ﷺ کو ہے، لیکن مراد اس سے ہر مخاطب ہے، اور ہمزہ استفہام تقریری کے لئے ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ اے سننے والے کیا تمہیں علم نہیں، یعنی تمہیں علم تو حاصل ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ تو اس پر یقین رکھو کہ وہ نسخ پر بھی قادر ہے۔ اور پہلی آیت سے نفع کے لحاظ پر بہتر لانے پر بھی قادر ہے۔ اور پہلی آیت کی مثل نفع والا حکم لانے پر بھی قادر ہے۔ (از بیضاوی)
یعنی جب تم اللہ تعالیٰ کی قدرت کو جانتے ہو تو ناسخ و منسوخ کو نہ تسلیم کرنا تمہاری ضد اور ہٹ دھرمی پر دلالت کرے گا۔

آیت کریمہ سے حاصل ہوا کہ نسخ عقلاً اور نقلاً جائز ہے۔ بلکہ نقلی دلائل یعنی قرآن و حدیث سے

ثابت ہے کہ نسخ واقع ہوا ہے۔ لیکن یہود کہتے ہیں کہ نسخ عقلاً جائز نہیں۔ اور نقلاً بھی جائز نہیں۔ بعض یہود نے کہا کہ عقلاً تو جائز نقلاً ثابت نہیں۔ مسلمانوں کا نسخ کے جواز پر اجماع..... صرف ابو مسلم اصفہانی اور معتزلہ نے جواز کا انکار کیا ہے۔

تنبیہ: عقلاً جواز کا یہ مطلب ہے کہ نسخ کے جواز کو عقل تسلیم کرتی ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ نسخ قیاس سے جائز ہے۔ قیاس سے کسی آیہ اور حدیث کو منسوخ نہیں کیا جاسکتا۔

اور یہ بھی خیال رہے کہ نسخ کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ نسخ اور منسوخ کے متعلق یہ بھی علم ہو کہ پہلی آیت نزول کے لحاظ پر کون سی ہے اور دوسری کون سی۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ کا پہلا ارشاد یا فعل کون سا اور بعد والا کون سا ہے کیونکہ مؤخر مقدم کا نسخ ہو سکتا ہے۔ مقدم مؤخر کا نسخ نہیں ہو سکتا۔

منکرین نسخ کے دلائل:

(۱) اس آیت میں ”ما ننسخ من آية“ سے مراد قرآن پاک کی آیتیں نہیں، بلکہ پہلی آسمانی کتب کے احکام کی منسوخی ہے۔ جیسا کہ ہفتہ کے دن کی تعظیم کو منسوخ کر دیا گیا۔

اسی طرح مشرق اور مغرب کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرنے کو منسوخ کر دیا۔ چونکہ یہود و نصاریٰ کہتے تھے ”ولا تؤمنوا الا لمن تبع دينكم“ تم ایمان نہ لاؤ سوائے اس کے جو تمہارے دین کی تابعداری کرے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس قول کو رد کرنے کے لئے اس آیت کریمہ کو نازل کیا۔

ان کی اس دلیل کا جواب یہ ہے کہ ”آیات“ کو جب مطلق ذکر کیا جائے تو اس سے مراد قرآن پاک کی آیات ہی ہوتی ہیں۔ پہلی شریعتوں کا منسوخ ہونا احادیث صحیحہ سے بہت واضح طور پر ثابت ہے۔

(۲) ان کی اور دلیل یہ ہے کہ اس آیت میں نسخ کا معنی نقل کرنا ہے۔ جس کا مطلب ہے قرآن پاک کی آیات کو لوح محفوظ سے نقل کرنا۔

ان کی اس دلیل کا جواب یہ ہے کہ قرآن پاک تو تمام ہی لوح محفوظ سے نقل کیا گیا ہے۔ اس آیت کریمہ میں تمام قرآن پاک کی منسوحیت کا ذکر نہیں بلکہ بعض آیات کے منسوخ کرنے کا ذکر ہے۔ لہذا لوح محفوظ سے منتقل کرنے والا معنی مراد لینا صحیح نہیں۔ اور وجہ یہ بھی واضح رہے کہ اگر لوح محفوظ سے منتقل کرنے کا

معنی لیا جائے تو بعد والے الفاظ مبارکہ ﴿نَأْتِ بِخَيْرٍ مِنْهَا أَوْ مِثْلِهَا﴾ کا مفہوم باقی نہیں رہتا۔

(۳) ان کی اور دلیل یہ ہے کہ اس آیت کریمہ میں نسخ کا وقوع ذکر نہیں بلکہ امکان ذکر ہے، اس کا مطلب درحقیقت یہ ہے ”لو وقع النسخ لوقع الی خیر منه“ اگر نسخ واقع ہوتا تو ہم اس سے بہتر یا اس کی مثل لے آتے یعنی نسخ واقع ہی نہیں ہوا کہ ہم اس سے بہتر یا اس کی مثل لاتے

اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت کریمہ میں لفظ ”ما“ ذکر ہے جس کے موصولہ ہونے کا بھی احتمال پایا گیا ہے۔ اس کے شرطیہ ہونے کو یقینی نہیں کہا جاسکتا۔ اگر کہا بھی جائے تو یہ کہا جائے گا کہ یہ شرط کے معنی کو متضمن ہے اس لئے ”ما“ کی جگہ ”لو“ ذکر کر کے وقوع کی نفی کرنا باطل ہے۔ کیونکہ ”لو“ عین شرط پر دلالت کرتا ہے اور ”ما“ شرط کے معنی کو متضمن ہے۔ کہاں عین شرط اور کہاں معنی شرط کو متضمن ہونا ”فیہما بون بعید“

(۴) رب تعالیٰ نے فرمایا: ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾

”بیشک ہم نے قرآن نازل کیا، اور بیشک ہم ہی اس کے محافظ ہیں“

اور ارشاد فرمایا ﴿سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسَى﴾ ”ہم آپ کو پڑھائیں گے آپ بھولیں گے نہیں“

ان آیات کے بعد ﴿أَوْ نُنسِهَا﴾ یا ہم بھلا دیں گے کا کیا مطلب ہوگا؟ پتہ چلا نسخ کا وقوع درست نہیں۔ ان کی اس دلیل کا جواب یہ ہے کہ پہلی آیت جو تم نے پیش کی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی اپنی طرف سے قرآن پاک میں تحریف نہیں کر سکے گا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ رب تعالیٰ خود بھی منسوخ نہیں فرمائے گا۔

دوسری آیت جو تم نے پیش کی اس میں آگے ”إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ“ مستثنیٰ بھی موجود ہے۔ جو واضح طور پر دلالت کر رہا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں سے کسی چیز کو بھلانا چاہے تو بھلا دے گا۔ پھر صحابہ کرام کے بھول جانے سے یہ بھی لازم نہیں کہ نبی کریم ﷺ سے بھی ان آیات کو بھلا دیا گیا ہو۔ ہو سکتا ہے آپ کو یاد رہی ہوں آپ نے پڑھی نہ ہوں۔

(۵) اور ان کی دلیل یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿مَا يُبَدِّلُ الْقَوْلَ لَدَيَّ﴾ میرے ہاں بات

بدلتی نہیں۔ اس آیت کریمہ سے پتہ چلا کہ نسخ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ نسخ میں تبدیلی ہے اور رب تعالیٰ نے اپنے قول میں تبدیلی کی نفی فرمائی۔ ان کی اس دلیل کا جواب یہ ہے کہ یہ حکم قیامت میں ہوگا جب گمراہ لوگ کہیں گے کہ ہمیں تو شیطان نے ورغلا یا تھا۔ تو رب تعالیٰ فرمائے گا کہ میرے پاس جھگڑانہ کرو میں تمہیں پہلے ہی عذاب کا ڈر بتا چکا تھا۔ اب میرا حکم بدلتا نہیں بلکہ کافروں کو عذاب ہو کر رہے گا۔

اس آیت کریمہ میں نسخ کی تبدیلی کی نفی کا کوئی ذکر نہیں۔ بلکہ دوسری آیات میں نسخ اور تبدیلی کا واضح طور پر ذکر ہے:

﴿وَإِذَا بَدَّلْنَا آيَةً مَّكَانَ آيَةٍ﴾ اور جب ہم ایک کے بدلے دوسرے آیت کو لے آتے ہیں۔

﴿يَمْحُو اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُثَبِّتُ﴾ اللہ تعالیٰ جسے چاہے مٹا دے، جسے چاہے ثابت رکھے۔

ان آیات سے منسوخ ہونا واضح ہو چکا ہے۔ خیال رہے کہ ہر آیت کی وضاحت اسی کے محل میں ان شاء اللہ ذکر کی جائے گی۔ یہ اجمالی طور پر ذکر ہے۔

نسخ کے جواز پر دلائل:

نسخ کی جو مختلف لحاظ سے اقسام بیان کی ہیں ان میں آیات اور احادیث سے جو مثالیں ذکر کی ہیں، ان تمام سے واضح ہے کہ نسخ واقع ہوا ہے۔ اسی طرح نسخ کے جواز کے جو لوگ قائل نہیں ان کے دلائل کے جو جوابات ذکر کئے ہیں ان سے بھی نسخ کے جواز کا پتہ چل گیا۔ تاہم مختصر طور پر کچھ مزید وضاحت کے لئے چند مثالیں پیش کی جا رہی ہیں۔

(۱) دلائل سے یہ ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ کی نبوت برحق ہے ”وَنُبَوِّهَ لَا تَصِحُّ إِلَّا مَعَ الْقَوْلِ بِنَسْخِ شَرْعٍ مِنْ قَبْلِهِ، فَوَجِبَ الْقَطْعُ بِالنَّسْخِ“ اور آپ کی نبوت کو اس وقت تک ماننا صحیح نہیں ہو سکتا جب تک پہلی شریعتوں کو منسوخ نہ مانا جائے۔ تو یقینی طور پر یہ پتہ چل گیا کہ نسخ کا وقوع صحیح ہے۔

(۲) رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُولَ فَقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوَاكُمْ صَدَقَةٌ﴾

اس آیت کریمہ میں نبی کریم ﷺ سے سرگوشی کرنے سے پہلے صدقہ کرنے کا حکم دیا گیا۔ پھر اسے منسوخ کر دیا گیا۔

خیال رہے کہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے صدقہ کر کے تنہائی میں بات کی یا نہیں کی۔ وہ ذکر اسی آیت کی وضاحت میں ہی انشاء اللہ آئے گا۔ تاہم یہ یاد رہے کہ نسخ کے لئے ایک مرتبہ اس پر عمل کرنا کوئی ضروری نہیں۔ کیونکہ پچاس نمازوں کو منسوخ کر کے پانچ کر دی گئیں۔ پچاس پر کسی نے بھی عمل نہیں کیا، نہ نبی کریم ﷺ نے اور نہ ہی آپ کی امت میں سے کسی ایک نے اس پر عمل کیا۔

(۳) رب تعالیٰ نے نسخ پر اعتراض کرنے والوں کو بے وقوف کہا۔ کیونکہ بیت المقدس کے قبلہ کو منسوخ کر کے کعبہ شریف کو قبلہ بنانے کے حکم پر اعتراضات کرنے والوں کا ذکر رب تعالیٰ نے یوں فرمایا:

﴿سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّيْتُمْ عَنْ قِبَلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا﴾

”اب کہیں گے بیوقوف لوگ کس نے پھیر دیا مسلمانوں کو ان کے اس قبلہ سے جس پر تھے“

(ماخوذ از کبیر بنصرف)

☆☆☆☆☆

﴿ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط وَمَا

لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴾ (آیت ۱۰۷)

(۱) کیا تجھے خبر نہیں کہ اللہ ہی کے لئے ہے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اور اللہ کے سوا تمہارا نہ کوئی حمایتی نہ مددگار۔

(۲) کیا تمہیں علم نہیں بیشک اللہ کے لئے ہی ہے بادشاہی آسمانوں اور زمین کی۔ اور نہیں تمہارے لئے سوائے اللہ کے کوئی حمایت کرنے والا اور نہ کوئی مددگار۔

نسخ کا انکار کرنے والوں کو رب تعالیٰ نے فرمایا کیا تمہیں معلوم نہیں کہ بیشک اسی کے لئے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے، یعنی جس کے قبضہ قدرت میں تمام مخلوق ہے، کیا اس کی قدرت سے بعید ہے کہ وہ نسخ نہ کر سکے، یہ تمہاری سوچ باطل ہے۔ اگر تم اپنی اسی گمراہی پر قائم رہے تو اللہ تعالیٰ کے سوا تمہارا کوئی اور حمایت کرنے والا نہیں ہوگا۔ اور نہ ہی تمہارا کوئی مددگار ہوگا۔

﴿ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾

”کیا تمہیں علم نہیں بیشک اللہ کے لئے ہی ہے بادشاہی آسمانوں اور زمین کی“

یعنی اللہ تعالیٰ ہی آسمانوں اور زمین میں متصرف ہے، آسمانوں اور زمین میں اسی کی سلطنت ہے کسی اور کی نہیں۔ آسمانوں اور زمین کی تمام مخلوق میں اسی کا حکم چلتا ہے، یہ بھی خیال رہے کہ آسمانوں اور زمین کا ذکر کر کے رب تعالیٰ نے اپنی تمام مخلوق کا ذکر کر دیا آسمانوں سے مراد تمام علوی یعنی تمام عالم بالا مراد ہے۔ اور زمین سے مراد تمام سفلی (تمام عالم پست)۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا ہی حکم چلتا ہے تمام کائنات میں۔ وہ جو چاہے امر فرمائے یا نہی وہ جو چاہے منسوخ فرمائے یا تبدیل کرے، کسی کو حق نہیں کہ اس سے سوال کرے۔

(اَلَمْ تَعْلَمْ) ”وان كان خطابا للنبي ﷺ لكن فيه تكذيب لليهود الذين انكروا النسخ ووجدوا نبوة عيسى ومحمد عليهما السلام فاخبرهم الله ان له ملك السموات والارض وان ال خلق كلهم عبده وتحت تصرفه يحكم فيها بما يشاء وعليهم السمع والطاعة“

(اَلَمْ تَعْلَم) میں بظاہر خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے لیکن حقیقت میں یہود کو خطاب ہے، اور ان

یہود کی ہی تکذیب ہے جنہوں نے نسخ کا انکار کیا۔ اور عیسیٰ علیہ السلام اور نبی کریم ﷺ کی نبوت کا انکار کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو خبر دی کہ بیشک اسی کیلئے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے۔ اور بیشک تمام مخلوق اسی کی غلام ہے اور تمام اسی کی بندے ہیں۔ اور اسی کے زیر تصرف ہیں۔ وہ جو چاہے حکم فرماتا ہے۔ اس کے بندوں کو چاہئے اس کے حکم کو قبولیت کے کانوں سے سنیں اور اسی ذات کی طاعت کریں۔

”وَمَا لَكُمْ يٰۤاَۤمۡمُۤرَ الْكُفٰرِ عِنۡدَ نَزۡوَلِ الْعَذَابِ مِّنۡ دُونِ اللّٰهِ اِیۡ مِمَّا سَوٰی اللّٰهِ مِّنۡ وَّلٰیۤ اِیۡ قَرِیۡبٍ وَصَدِیۡقٍ وَّقِیۡلٍ مِّنۡ وَّالٍ وَهُوَ الْمَقِیۡمُ بِالۡاُمُوۡرِ وَّلَا نَصِیۡرُ اِیۡ نَاصِرٍ یَّمْنَعُکُمۡ مِنَ الْعَذَابِ“
یعنی اے کافر و جب اللہ تعالیٰ کا عذاب تم پر نازل ہوا تو کوئی بھی اللہ کا غیر تمہارا قریبی اور دوست اور تمہارے امور کا والی نہیں ہوگا۔ اور نہ ہی تمہارا کوئی مددگار ہوگا جو تم سے عذاب کو روک کر رکھے۔ عذاب قریب نہ آنے دے۔
(حازن)

ابن کثیر فرماتے ہیں: جس طرح اس کی بادشاہی میں کوئی جھگڑا کرنے والا نہیں، اسی طرح وہ جو چاہے حکم فرمائے ﴿اِلَّا لّٰہُ الْخَلۡقِ وَالۡحُکۡمِ﴾ خبردار مخلوق بھی اسی کی ہے اور حکم بھی اس کا ہے۔
سورۃ عمران میں صراحۃً خطاب اہل کتاب کو جس میں نسخ کا وقوع ذکر ہے۔ یعنی اس آیت میں نسخ کے وقوع کا ذکر ہے:

﴿کُلُّ الطَّعَامِ کَانَ حِلًّا لِّبَنۡیِۤیۡ اِسۡرَآئِیۡلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسۡرَآئِیۡلَ عَلٰی نَفْسِہٖ﴾

اس آیت کریمہ میں ذکر ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے آپ پر جس چیز کو (اونٹ کے گوشت کو) حرام کیا وہ بنی اسرائیل پر بھی حرام ہوگئی۔ حالانکہ پہلے وہ ان پر حلال تھی۔
حلت کو ختم کر کے حرمت کا حکم نافذ کرنا ہی نسخ ہے۔ جو خود بنی اسرائیل پر واقع ہو چکا ہے۔
اس کے بعد ابن کثیر فرماتے ہیں:

”وَالْمُسْلِمُونَ کُلُّہُم مُّتَّفِقُونَ عَلٰی جَوَازِ النِّسۡخِ فِیۡ اَحۡکَامِ اللّٰهِ تَعَالٰی لِمَا لَہٗ

فِی ذٰلِکَ مِنَ الْحِکۡمَۃِ الْبَالِغَۃِ وَکُلُّہُم قَالُ بِوُقُوعِہٖ“

”مسلمان تمام نسخ کے جواز پر متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا ہے کہ وہ اپنے احکام کو نسخ فرمائے۔ تمام مسلمان اس پر متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں نسخ واقع ہو چکا ہے۔

(اَلَمْ تَعْلَمْ) کی تفسیر میں ابن کثیر کی اس وضاحت سے بھی بخوبی معلوم ہو گیا کہ یہ خطاب یہود کو ہے، مسلمانوں کو نہیں۔ تاہم خازن نے بھی بعد میں ایک قول نقل کیا ہے کہ بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہ خطاب مسلمانوں کو ہے۔ اور اسی طرح کئی اور مفسرین کرام نے بھی بیان کیا ہے۔

اگر خطاب یہود کو ہو تو وہی تفسیر کامل ہے جو خازن نے ذکر فرمائی۔ اس سے یہ واضح ہے کہ (وَمَا لَكُمْ مِّنْ ذُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَلٰیٍّ وَلَا نَصِيْرٍ) کا کیا مطلب ہے لیکن اگر خطاب مومنوں کو ہو تو تفسیر عزیزی کی اس تفسیر کو ضرور مد نظر رکھا جائے۔

”یعنی و حال آنکہ نیست شمارا سوای خدا کار سازی کہ کار معاش و معاد شمارا اصلاح کند۔ اگر کار سازی دیگر شمارا میبود و گنجانش داشت کہ ایس کار ساز را متلون المزاج و متبدل الحکم فهمید ترک دادہ بآں کار ساز دیگر رجوع می آوردید و چارہ، معاش و معاد خود ازومی جستید“ (عزیزی)

یعنی اللہ تعالیٰ کے بغیر دنیا اور آخرت میں کوئی کار ساز نہیں۔ اگر کوئی اور کار ساز ہو تو وہ اللہ تعالیٰ کا ہی محتاج ہوگا۔ درحقیقت رب تعالیٰ ہی کار ساز ٹھہرے گا۔

اہل سنت و جماعت کا عقیدہ ہی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ حقیقی طور پر مددگار ہے۔ اس کے بندے اسی کی عطاء سے مددگار ہیں۔ اس مسئلہ کو ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ کی وضاحت کرتے ہوئے راقم نے کافی حد تک واضح کر دیا ہے۔

ولی اور نصیر میں فرق: ”ولی“ کا معنی مالک ہے، اور یہ بھی واضح ہے کہ مالک کبھی نصرت پر قادر نہیں ہوتا، اور کبھی قادر تو ہوتا ہے، لیکن امداد نہیں کرتا۔

اور ”نصیر“ کا معنی ہے ”معین“ (مددگار) مدد کرنے والا کبھی مالک ہوتا ہے۔ کبھی مالک نہیں ہوتا بلکہ اجنبی ہوتا ہے۔

خیال رہے کہ روح المعانی کی اس تفسیر سے ہی واضح ہو رہا ہے کہ یہ فرق بندوں کے ولی ہونے اور نصیر ہونے میں ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ کہنا کسی حال میں جائز نہیں ”هو الولی ولا یقدر علی النصرة“ وہ ولی یعنی مالک تو ہے لیکن امداد کرنے پر قادر نہیں۔

﴿ اَمْ تَرِيدُونَ اَنْ تَسْأَلُوا رَسُولَكُمْ كَمَا سَأَلَ مُوسٰى مِنْ قَبْلُ ۚ وَمَنْ يَتَّبِدِلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ ﴾

(۱) کیا یہ چاہتے ہو کہ اپنے رسول سے ایسا سوال کرو جو موسیٰ سے پہلے ہوا تھا۔ اور جو ایمان کے بدلے کفر لے وہ ٹھیک راستہ سے بہک گیا۔

(۲) کیا تم ارادہ کرتے ہو کہ تم سوال کرو اپنے رسول سے جیسا کہ سوال کیا گیا موسیٰ سے (اس سے) پہلے اور جو حاصل کرے کفر ایمان کے بدلے، تو تحقیق وہ بھٹک گیا سیدھی راہ سے۔

(آیت ۱۰۸)

”ام تریدون“ میں خطاب کسے ہے؟ اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے پہلے یہ سمجھا جائے کہ نبی کریم ﷺ تمام لوگوں کے رسول ہیں۔ خواہ مومن ہوں یا کافر یہود ہوں یا نصاریٰ۔ اس طرح تمام لوگ ہی آپ کی امت میں داخل ہیں۔ البتہ فرق یہ ہے کہ جن لوگوں نے آپ پر ایمان لایا وہ امت اجابت کہلاتے ہیں۔ ان کی شان میں ہی رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ ﴾ تم بہتر امت ہو۔

جن لوگوں نے آپ پر ایمان نہیں لایا وہ امت دعوت کہلاتے ہیں۔ کہ نبی کریم ﷺ نے ان کو دعوت ایمان دی لیکن انہوں نے قبول نہیں کیا وہ کفار یہود اور نصاریٰ ہی رہے۔

اب اس تمہید کے بعد یہ سمجھنا آسان ہو گا کہ (ام تریدون) کے خطاب میں تین احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ یہ خطاب مسلمانوں کو ہے۔ دوسرا یہ کہ یہ خطاب مشرکین کو ہے اور تیسرا یہ کہ یہ خطاب یہود کو ہے۔ جب خطاب میں یہ چند احتمال ہیں تو شان نزول میں بھی اسی طرح چند وجوہ ہوں گی۔

پہلا احتمال: جب خطاب مسلمانوں کو ہو، تو اس میں پھر کئی وجوہ سے ان کو کہا گیا کہ کیا تم ارادہ رکھتے ہو کہ اپنے رسول ﷺ سے ایسے سوال کرو جیسے موسیٰ علیہ السلام سے سوال کئے گئے۔ یعنی تمہیں سوال نہیں کرنے چاہیے، اگر تم نے رب تعالیٰ کے احکام کا انکار کیا تو کافر ہو جاؤ گے۔ جو شخص ایمان کے بدلے کفر کو اختیار کرے گا وہ سیدھی راہ سے بھٹک جائے گا۔ اگر آیت کریمہ میں خطاب

مومنوں کو ہو تو اس کا ایک مطلب یہ ہے:

”نهی الله المؤمنين فی هذه الآیة الکریمة عن کثرة سؤال النبی ﷺ عن الاشیاء قبل کونها“

رب تعالیٰ نے اس آیہ کریمہ میں مومنوں کو نبی کریم ﷺ سے کثرت سوال سے منع فرمایا کہ کسی چیز کے واقع ہونے سے پہلے جو سوال تم کرتے ہو وہ درست نہیں ان سے باز آ جاؤ۔

کسی چیز کے واقع ہونے سے پہلے سوال کرنے سے منع کرنے میں حکمت یہ تھی ”ولا تسالوا عن النبی ﷺ قبل کونه فلعلة ان یحرم من اجل تلک المسئلة“ کہ تم نبی کریم ﷺ سے کسی چیز کے واقع ہونے سے پہلے اس لئے سوال نہ کرو کہ کہیں تمہارے سوال کی وجہ سے وہ چیز حرام نہ ہو جائے جو تمہارے لئے باعث مشقت بن جائے۔

☆ ”ولهذا جاء فی الصحیح ان اعظم المسلمین جرما من سأل عن شیء لم یحرم فحرم من اجل مسئلته“

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، بیشک مسلمانوں میں سے عظیم جرم والا وہ شخص ہے جس نے کسی چیز کے بارے میں سوال کیا تو وہ حرام ہوگئی، حالانکہ پہلے حرام نہیں تھی۔

☆ ”ولما سئل رسول الله ﷺ عن الرجل یجد مع امرأته رجلا فان تکلم تکلم بامر عظیم وان سکت سکت علی مثل ذلک فکره رسول الله ﷺ المسائل وعابها ثم انزل الله حکم الملاعة“

نبی کریم ﷺ سے جب یہ سوال کیا گیا کہ ایک شخص اپنی عورت کے ساتھ ایک شخص کو برائی کا ارتکاب کرتے ہوئے پائے تو وہ کیا کرے، اگر کلام کرے تو امر عظیم ہوگا، کیونکہ اس کے پاس گواہ تو ہیں نہیں اور اگر خاموش رہے تو ایسے عظیم جرم پر خاموش کیسے رہے؟ نبی کریم ﷺ نے اس قسم کے سوالات کو ناپسند کیا اور معیوب سمجھا۔ تو لہجان کا حکم نافذ ہوا اور لہجان والی آیت نازل ہوئی (جس کا ذکر سورۃ نور میں ہے)۔

☆ مسلم اور بخاری میں حدیث حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

”ان رسول الله ﷺ کان ینهی عن قیل وقال واضاعة المال وکثرة السؤال“

بیشک رسول اللہ ﷺ قیل وقال (بحث و مباحثہ جو باعث نزاع ہو) سے اور مال کو ضائع کرنے

اور زیادہ سوال کرنے سے منع فرماتے۔

☆ "قال رسول الله ﷺ ان الله كتب عليكم الحج فقال رجل كل عام يا رسول الله فسكت عنه رسول الله ﷺ ثلاثا ثم قال عليه السلام لا ولو قلت نعم لوجبت و لو وجبت لما استطعتم ذروني ما تركتم فانما هلك من كان قبلكم بكثرة سؤالهم واختلافهم على انبيائهم فاذا امرتكم بامر فأتوا منه ما استطعتم وان نهيتكم عن شيء فاجتنبوه"

(رواه مسلم)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ نے تم پر حج فرض فرمایا، ایک شخص نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ کیا ہر سال حج فرض ہے، نبی کریم ﷺ نے تین مرتبہ اپنے ارشاد کو لوٹایا اور صحابی بھی سوال کرتے رہے، آپ خاموش رہے۔ پھر آپ نے فرمایا اگر میں ہاں کہہ دیتا تو ہر سال حج فرض ہو جاتا۔ اگر فرض ہو جاتا تمہیں ادا کرنے کی طاقت نہ ہوتی۔ جب میں تمہیں چھوڑ دوں تو تم بھی چھوڑ دیا کرو بیشک تم سے پہلے لوگ انبیاء کرام سے زیادہ سوال کرنے اور ان سے زیادہ اختلاف کرنے کی وجہ سے ہلاک ہو گئے۔ جب میں تمہیں کوئی حکم دوں تو طاقت کے مطابق اس پر عمل کرو، اور اگر میں تمہیں کسی چیز سے منع کروں تو اس سے رک جاؤ۔

☆ "قال انس بن مالك نهينا ان نسأل رسول الله ﷺ عن شيء فكان يعجبنا ان يأتي الرجل من اهل البادية فيسأله فنسمع"

حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں، جب ہمیں منع کر دیا گیا کہ ہم رسول اللہ ﷺ سے زیادہ سوال نہ کیا کریں۔ تو ہم یہ چاہتے تھے کہ کوئی شخص دیہات سے آئیں جو آپ سے سوال کریں تو ہم بھی ان کے جوابات سن لیں۔

تنبیہ: جن سوالات سے منع کیا گیا یہ وہ سوالات تھے جو بلا وجہ کئے جاتے تھے۔ اور ایسے سوالات سے منع کیا گیا جن کی وجہ سے کسی حکم کے فرض ہو جانے کا خدشہ ہوتا، یا وہ سوالات کسی چیز کو حرام کرنے کا ذریعہ بنتے، لیکن کسی مسئلہ کو سمجھنے کے لئے دین میں سمجھ حاصل کرنے کے لئے سوال کرنا منع نہیں، بلکہ سوال کرنا ضروری ہوتا ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے:

"انما شفاء الغي السؤال" جہالت سے نجات حاصل کرنے کا ذریعہ سوال ہے (ابوداؤد ج ۱ ص ۴۹)

یہ بھی واضح ہوا کہ طلباء کا اساتذہ سے لغو اور بیہودہ سوال کرنا منع ہے۔ مقصودی، تعمیری سوالات کئے جائیں۔ عبداللہ بن ابی کی ذریت معنوی کا طریقہ بیہودہ باتیں اور بیہودہ سوال کرنا ہے۔

☆ "عن ابی العالیۃ فی قوله تعالیٰ (ام تریدون ان تسألوا رسولکم الخ) قال قال رجل یا رسول اللہ لو کانت کفارتنا کفارات بنی اسرائیل فقال النبی ﷺ اللہم لا نبغیہا ثلاثا، ما اعطاکم اللہ خیر مما اعطى بنی اسرائیل، کانت بنو اسرائیل اذا اصاب احدهم الخطیئة وجدها مکتوبة علی بابہ وکفارتها، فان کفرها کانت له خزیا فی الدنیا وان لم یکفرها کانت له خزیا فی الآخرة فما اعطاکم اللہ خیر مما اعطى بنی اسرائیل، قال (ومن یعمل سوءا او یظلم نفسه ثم یتستغفر اللہ یجد اللہ عفورا رحیما) وقال الصلوات الخمس من الجمعة الی الجمعة کفارة لما بینهن وقال من هم بسینة فلم یعملها لم تکتب علیہ وان عملها کتبت سینة واحدة ومن هم بحسنة لم یعملها کتبت له حسنة واحدة وان عملها کتبت له عشر امثالها"

ابوالعالیہ نے اسی آیت کی تفسیر میں ذکر کیا ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ ہمارے اسی طرح گناہوں کے کفارات ہونے چاہئیں جیسے بنی اسرائیل کے لئے تھے۔ تو نبی کریم ﷺ نے تین مرتبہ عرض کیا اے اللہ ہم یہ نہیں چاہتے۔ پھر آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے جو تمہیں عطاء کیا ہے وہ بہتر ہے اس سے جو بنی اسرائیل کو عطاء کیا۔ بنی اسرائیل جب بھی کوئی گناہ کرتے تو ان کے دروازوں پر وہ لکھ دیا جاتا اور ان پر کفارہ لازم آتا۔ اگر وہ کفارہ ادا کرتے تو انہیں دنیا میں رسوائی حاصل ہوتی، اور اگر وہ کفارہ نہ ادا کرتے تو ان کو آخرت میں رسوائی حاصل ہوتی۔ جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں عطاء کیا ہے وہ بہتر ہے اس سے جو بنی اسرائیل کو عطاء کیا۔ پھر آپ نے یہ آیت کریمہ پڑھی:

﴿وَمَنْ یَعْمَلْ سُوءًا اَوْ یَظْلِمْ نَفْسَهُ ثُمَّ یَسْتَغْفِرِ اللّٰہَ یَجِدِ اللّٰہَ غَفُورًا رَّحِیْمًا﴾

”اور جو شخص برائی کا عمل کرے یا اپنے نفس پر ظلم کرے، پھر اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرے، تو اللہ کو بخشنے والا، رحم کرنے والا پائے گا۔“

اور آپ نے فرمایا جمعہ سے جمعہ تک (ہر روز) پانچ نمازیں ادا کرنا ان کے درمیان خطاؤں کا کفارہ ہیں۔ اور آپ نے فرمایا جس شخص نے برائی کا ارادہ کیا لیکن اس پر عمل نہ کیا تو اس پر کوئی گناہ نہیں

لکھا جائے گا۔ اور اگر اس پر عمل کرے گا تو اس پر ایک ہی برائی کو لکھا جائے گا۔ اور اگر نیکی کا ارادہ کیا اور اس پر عمل نہ کیا تو ایک نیکی اس کے لئے لکھ دی جائے گی۔ اور اگر اس پر عمل بھی کر لیا تو اس کے لئے دس نیکیاں لکھ دی جائیں گی۔

☆ نبی کریم ﷺ جب غزوہ خیبر کے لئے تشریف لے گئے تو آپ کے لشکر کا ایک درخت کے قریب سے گزر ہوا جس کی مشرکین عبادت کرتے تھے۔ اور اس کے ساتھ اپنے ہتھیار اور کھانے، پینے کی اشیاء لٹکا دیتے تھے۔ اسے ”ذات انواط“ کہا جاتا، کچھ نو مسلم لوگوں نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا یا رسول اللہ ”اجعل لنا ذات انواط کما لهم ذات انواط“ ہمارے لئے بھی ایسا ہی ذات انواط بنادیں، جس طرح ان کا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا سبحان اللہ ”هذا کما قال قوم موسیٰ اجعل لنا الها کما لهم الهة“ یہ تو ایسا ہی سوال ہے جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے ان سے کہا تھا ہمارے لئے ایسا خدا بنادیں جیسا کہ ان لوگوں کے خدا ہیں۔ (یہ سوال ان کا کچھ لوگوں کو بت پرستی کرتے ہوئے اور کچھ کو گاو پرستی کرتے ہوئے دیکھ کر تھا) اور ساتھ ہی نبی کریم ﷺ نے یہ بھی فرمایا:

”والذی نفسی بیدہ لترکین سنن من قبلکم“

”قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے (سوالات کا اگر یہی سلسلہ رہا) تو تم ضرور بر ضرور پہلے لوگوں کے طریقہ پر چل پڑو گے۔

سبحان اللہ نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد گرامی کتنا ہی روز روشن کی طرح ظاہر و باہر ہے کیونکہ دنیائے عالم کے تمام مسلمان یہود و نصاریٰ کے طریقہ پر عمل کر کے، یہود و نصاریٰ کے ساتھ دوستی قائم کر کے بظاہر خوش ہیں، لیکن درحقیقت رب تعالیٰ کے اس حکم کی کھلی خلاف ورزی ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ﴾

”اے ایمان والو! بناؤ یہود و نصاریٰ کو دوست وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں“

کفار کی دوستی کے نتائج آہستہ آہستہ نکلتے ہیں۔ جب مسلمانوں کو وہ ہر طرح کا نقصان پہنچانے پر حاوی ہو جاتے ہیں تو وہ ایسا نقصان پہنچاتے ہیں جس سے مسلمان برسوں تک کراہتے رہیں۔

جن کے نتائج بعد میں برے نکلنے ہوں ان سے پہلے ہی اجتناب کر لیا جائے تو بہتر ہے ورنہ بربادی ہی بربادی ہوتی ہے۔ جب ہمارے ملک پاکستان میں ۱۹۷۳ء میں لاہور کے مسلمانوں پر گولی چلانے کا حکم دیا تو حبیب جالب نے کہا۔

گولیوں سے محبت ہو رہے ہو اہل وطن کا چہرہ خون سے دھو رہے ہو
تمہیں گماں ہے کہ رتہ کٹ رہا ہے مجھے یقین ہے کہ منزل کھو رہے ہو

حالیہ دور میں جب افغانستان کے مسلمانوں کو شہید کرنے میں نام نہاد مسلمانوں نے اہم کردار ادا کیا، تو راقم نے اسی رباعی کو یوں پڑھا۔

کفار سے محبت کا بیج ہو رہے ہو اہل اسلام کا چہرہ خون سے دھو رہے ہو
تمہیں گماں ہے قرضہ گھٹ رہا ہے مجھے یقین ہے قرضے میں ڈبو رہے ہو

دوسرا احتمال: ”اَمْ تُرِيدُونَ“ کا خطاب مشرکین کو ہو، تو اس میں بھی ان کے چند سوالات کے بعد آیہ کریمہ کا نزول ہوا اس میں ایک وجہ یہ تھی، کہ عبداللہ بن امیہ مخزومی قریش کے چند لوگوں کو ساتھ لایا اور نبی کریم ﷺ کی خدمت حاضر ہو کر

﴿وَقَالُوا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْأَرْضِ يَنْبُوعًا ۚ أَوْ تَكُونَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّحِيلٍ ۚ وَعَنْبٌ فَتُفَجَّرَ الْأَنْهَارُ خِلَالَهَا تَفْجِيرًا ۚ أَوْ تُسْقِطَ السَّمَاءَ كَمَا زَعَمَتْ عَلَيْنَا كِسْفًا أَوْ تَأْتِيَ بِاللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ قَبِيلًا ۚ أَوْ يَكُونَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ أَوْ تَرْقَىٰ فِي السَّمَاءِ ۚ وَلَنْ نُؤْمِنَ لِرُقَيْكِ حَتَّىٰ تَنْزِلَ عَلَيْنَا كِتَابًا نَّقْرُؤُهُ ۚ﴾^ط
(بنی اسرائیل آیات ۹۰ تا ۹۳)

کہنے لگے ہم تم پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے یہاں تک کہ تم ہمارے لئے زمین سے کوئی چشمہ جاری کر دو۔ یا تمہارے لئے کھجوروں اور انگوروں کا کوئی باغ ہو، پھر تم اس کے اندر بہتی نہریں جاری کر دو۔ یا تم ہم پر آسمان ٹکڑے ٹکڑے کر کے گرا دو جیسا تم نے ہم پر گمان کیا (یعنی جیسا تم نے ہمیں کہا ہے) یا اللہ اور فرشتوں کو ضامن لے آؤ۔ یا تمہارے لئے سنہری گھر ہو۔ یا تم آسمان پر چڑھ جاؤ اور ہم تمہارے آسمان پر چڑھ جانے پر بھی ہرگز ایمان نہیں لائیں گے۔ جب تک ہم پر ایک کتاب (خط) نہ اتارو کہ ہم پڑھیں۔

کریمہ کا نزول ہوا۔ اس لئے تمام مل کر شان نزول ہیں۔ اس پر تائید علامہ آلوسی رحمہ اللہ کی تفسیر سے مل گئی، آپ نے شان نزول کی کئی وجوہ ذکر کرنے کے بعد فرمایا ”ولا مانع کما فی البحر من جعل الكل اسبابا“ تمام کو ہی شان نزول کے اسباب بنانے میں کوئی مانع نہیں۔

کَمَا سُئِلَ مُوسَى مِنْ قَبْلُ : (جیسا کہ سوال کیا گیا موسیٰ سے اس سے پہلے)
تقریباً ابھی تک جو ذکر کیا ہے اس سے واضح ہو چکا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام سے رب تعالیٰ کو ظاہر طور پر دیکھنے۔ اور جسم والی کوئی چیز ظاہر طور پر معبود بنا کر دینے کا سوال کیا گیا تھا۔

وَمَنْ يَتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ :

اگر ﴿أَمْ تُرِيدُونَ﴾ میں خطاب مومنوں کو ہو تو ”ومن يتبدل“ کا معنی ”ومن يشتر“ ہوگا۔ یعنی جس نے حاصل کیا کفر کو ایمان کے بدلے تحقیق وہ بھٹک گیا سیدھی راہ سے۔ اور اگر خطاب مشرکین اور یہود کو ہو تو ﴿وَمَنْ يَتَبَدَّلِ﴾ کا معنی ہوگا جس نے کفر کو اختیار کیا ایمان کے بدلے وہ سیدھی راہ سے بھٹکا ہوا ہے۔

تنبیہ : ابھی تک جو بحث ذکر کی اس میں مختلف سوالات ذکر کئے گئے ہیں ان میں سے بعض کفر پر مبنی ہیں اور بعض گناہ پر۔ اور بعض خلاف اولیٰ ہیں۔ اس لئے ضابطہ یہ جاننا ضروری ہے کہ کون سا سوال جو ان کی سرکشی اور حسد پر مبنی تھا وہ باعث کفر تھا۔

”طلب الدلیل علی الشیء لایکون کفراً“ کسی چیز پر دلیل کو طلب کرنا کفر نہیں۔ اسی طرح احکام کے نسخ میں حکمت کا طلب کرنا بھی کفر نہیں کیونکہ ملائکہ نے بھی رب تعالیٰ سے بشر کی تخلیق کی حکمت کا سوال کیا تھا۔

اور ایمان لانے کیلئے معجزات کی طلب بھی کفر نہیں۔ اسی سے معلوم ہو گیا کہ عبد اللہ بن امیہ مخزومی کے سوالات سرکشی اور ہٹ دھرمی پر مبنی تھے جو باعث کفر تھے۔

”فَقَدْ ضَلَّ“ میں ”قد“ تحقیق کے لئے ہے۔ ”سَوَاءَ السَّبِيلِ“ سے مراد سیدھی راہ۔
آیت کریمہ سے واضح ہوا کہ انبیاء کرام کی تصدیق کرنے سے عدول، ان کی اتباع سے روگردانی، ان کے احکام کو تسلیم کرنے سے گریز کرنا گمراہی اور بھٹکنے کا ذریعہ ہے۔

(نعم بحث ماخوذ از ابن کثیر و کبیر و شیخ زادہ و روح المعانی و قرطبی)

کتاب اتارنے سے ان کا مطلب یہ تھا کہ رب تعالیٰ کی طرف سے ہماری طرف ایک خط آئے جس میں یہ لکھا ہوا کہ اے عبداللہ بن امیہ مخزومی ”ان محمد رسول اللہ فاتبعوه“ بے شک محمد اللہ کے رسول ہیں اور ان کی تابعداری کرو۔

دوسرے لوگ کہنے لگے اگر تمہیں یہ طاقت نہیں تو تم قرآن ایک مرتبہ ہی لے آؤ جس میں حلال و حرام اور حدود اور فرائض کا ذکر ہو جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام لائے ایک مرتبہ ہی کتاب کو لائے۔ تو اس وقت ان کو حکم دیا گیا۔ ﴿أَمْ تُرِيدُونَ أَنْ تَسْأَلُوا رَسُولَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوسَىٰ مِنْ قَبْلِ﴾ کیا تم ارادہ کرتے ہو کہ تم اپنے رسول (جو تمہیں ایمان کی دعوت دینے کے لئے آئے ہیں) سے ایسے سوال کرو جیسا کہ موسیٰ سے اس سے پہلے سوال کیا گیا۔

کیونکہ ان کی قوم نے کہا تھا ﴿لَنْ نُؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ نَرَىٰ اللَّهَ جَهْرَةً﴾ ہم ہرگز تم پر ایمان نہیں لائیں گے۔ یہاں تک کہ اللہ کو ظاہر طور پر دیکھ لیں۔ مشرکین کو خطاب کی دوسری وجہ تھی کہ بعض مشرکین نے سوال کیا تھا ﴿أَنْ تَجْعَلَ الصِّفَا لَهُمْ ذَهَبًا فَقَالَ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ سَأَلَكُمْ كَالْمَائِدَةِ لِبَنِي إِسْرَائِيلَ فَابْوَا وَارْجِعُوا﴾

کہ تم ہمارے لئے صفا پہاڑی کو سونا بنا دو، تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تمہارا یہ سوال تو ایسا ہی ہے جیسا کہ بنی اسرائیل نے عیسیٰ علیہ السلام سے آسمانوں سے کھانے کا دسترخوان اتارنے کا سوال کیا تھا۔ آپ کے اس ارشاد پر وہ مشرکین واپس چلے گئے۔ اور ایمان لانے سے انہوں نے انکار کر دیا۔ تیسری وجہ قریش کو خطاب کی یہ تھی کہ بعض قریش نے بھی نبی کریم ﷺ سے سوال کیا تھا ہم اللہ کو ظاہر طور پر دیکھنے کے بغیر ایمان نہیں لائیں گے۔

تیسرا احتمال: ﴿أَمْ تُرِيدُونَ﴾ کے خطاب میں تیسرا احتمال یہ ہے کہ یہ خطاب یہود کو ہو۔ کیونکہ انہوں نے بھی مشرکین کی طرح نبی کریم ﷺ سے سوال کیا تھا کہ تم موسیٰ علیہ السلام کی طرح تمام کتاب ایک مرتبہ ہی لے آؤ۔

علامہ رازی رحمہ اللہ نے اسی قول کو زیادہ پسند کیا ہے کہ پہلے ﴿يَسْأَلُ إِسْرَائِيلَ﴾ سے تمام ذکر بنی اسرائیل کا آ رہا ہے اس لئے یہ خطاب بھی یہود کو ہونا زیادہ صحیح ہے۔

تمام احتمالات اجتماعی طور پر مراد ہیں: راقم کا موقف یہی ہے کہ تمام واقعات کے بعد آیت

﴿وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّنْ بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا ۖ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ أَنْفُسِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾

(آیت ۱۰۹)

- (۱) بہت کتابیوں نے چاہا کاش تمہیں ایمان کے بعد کفر کی طرف پھیر دیں اپنے دلوں کی جلن سے بعد اس کے کہ حق ان پر خوب ظاہر ہو چکا ہے تو تم چھوڑو اور درگزر کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم لائے بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔
- (۲) پسند کرتے ہیں بہت اہل کتاب، کاش پھیر دیں تمہیں بعد تمہارے ایمان کے کفر کی طرف بوجہ حسد رکھنے اپنے نفسوں میں۔ اس کے بعد جب ظاہر ہو گیا ان پر حق تو تم معاف کرو اور درگزر کرو یہاں تک کہ لے آئے اللہ تعالیٰ اپنا حکم بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

شان نزول: فخاص ابن عازوراء اور زید بن قیس اور چند اور یہود نے احد کے واقعہ کے بعد حضرت حذیفہ بن یمان اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کو کہا، کیا تم دیکھتے نہیں کہ احد میں تمہیں مصیبت پہنچی اگر تم حق پر ہوتے تو تمہیں یہ مصیبت نہ پہنچتی۔

”فارجعوا الی دیننا فهو خیر لکم وافضل و نحن اهدی منکم سبیلا“

تم ہمارے دین کی طرف آ جاؤ یہ تمہارے لئے بہتر ہے اور افضل ہے، کیونکہ ہم تم سے زیادہ سیدھی راہ پر قائم ہیں۔

حضرت عمار بن یاسر نے ان سے پوچھا تمہارے دین میں وعدہ کو توڑنے کا کیا حکم ہے؟ انہوں نے کہا وعدہ کو توڑنا بہت شدید جرم ہے، یعنی بہت بڑا گناہ ہے۔

حضرت عمار نے کہا ”انی قد عاهدت انی لا اکفر بمحمد ماعشت“ بے شک میں نے وعدہ کر لیا ہے کہ جب تک زندہ رہوں گا محمد (ﷺ) سے کفر نہیں کروں گا۔ اس لئے میں تمہارے دین میں آ کر وعدہ کو نہیں توڑ سکتا۔

”قالت اليهود اما هذا فقد صبا“ یہودی کہنے لگے یہ شخص دین سے پھر گیا۔ یعنی اس نے بھی، ایمان قبول کر کے اچھا کام نہیں کیا، کیونکہ وہ تو صرف یہودیت کو ہی اپنا دین سمجھتے تھے۔
”وقال حذيفة واما انا فقد رضيت بالله ربا وبالا سلام دينا وبالقرآن اماما وبالكعبة قبله وبالمؤمنين اخوانا“

حضرت حذیفہ (رضی اللہ عنہ) نے کہا میں اللہ کے رب ہونے پر (بعض مفسرین نے ”و بمحمد نبيا“ کے الفاظ بھی ذکر فرمائے۔ کہ محمد (ﷺ) کے نبی ہونے پر) اور اسلام کے دین ہونے پر، اور قرآن کے امام ہونے پر، اور کعبہ کے قبلہ ہونے اور مؤمنوں کے بھائی ہونے پر راضی ہوں۔

اس کے بعد یہ دونوں حضرات نبی کریم (ﷺ) کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہود کے مکر کرنے اور دین سے پھیرنے کی کوشش کرنے اور اپنے اپنے جوابات کو حضور کے سامنے ذکر کیا۔

تو آپ نے فرمایا ”اصبتما خيرا و افلحتما“ تم دونوں نے بھلائی کو پایا اور کامیابی حاصل کر لی۔ تو اس واقعہ کے بعد اس آیت کریمہ کا نزول ہوا کہ بہت سے اہل کتاب یہ چاہتے ہیں کہ تمہیں ایمان سے پھیر کر کافر بنادیں۔ ان کی یہ خواہش حسد کی وجہ سے ہے جو وہ اپنے نفسوں میں رکھتے ہیں۔
حالانکہ ان کے سامنے حق بہت واضح ہے۔
(از کبیر)

یعنی حق کے واضح ہونے کے بعد حق پر قائم لوگوں کو پھیرنے کی کوشش کرنا حماقت ہی حماقت ہے

شان نزول کی اور وجہ:

”روی ان كعب بن اشرف اليهودي كان شاعرا و كان يهجو النبي ﷺ وفيه انزل الله“
اور وجہ یہ بیان کی گئی کہ کعب بن اشرف یہودی اور شاعر تھا۔ نبی کریم (ﷺ) کی شان کے مخالف اپنے اشعار میں آپ کی ہجو کرتا تھا اور چاہتا تھا کہ تمام مسلمان یہودی ہو جائیں، اس کے رد میں اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل کیا۔
(از صابونی)

شان نزول کی اور وجہ:

عام یہودی نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے آپ کے وسیلہ سے جنگ میں فتح حاصل کرتے۔

”فلما جاء النبی ﷺ من ولد اسمعیل عرفوه وکفروا به بعد معرفتهم اياه حسدا“

جب نبی کریم ﷺ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں تشریف لائے تو وہ آپ کو پہچاننے کے باوجود حسد کی وجہ سے آپ سے کفر کرنے لگے، اور اس خیال سے کہ ان کی ریاست نہ چلی جائے اور ان کے متبعین نہ ختم ہو جائیں تو وہ چاہنے لگے کہ کاش مسلمان بھی اپنے دین سے پھر جائیں۔ (ارشاد زادہ)

شان نزول کی اور وجہ:

حیی بن اخطب اور ابویاسر بن اخطب عرب کے یہود میں سے سب سے زیادہ نبی کریم ﷺ سے حسد کرتے اور مؤمنین سے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خصوصی انعامات سے جو ان کو نوازا وہ اس پر حسد کرتے تھے اور کوشش کرتے کہ مؤمنین کو ایمان سے پھیر دیں تو یہ آیہ نازل ہوئی۔ تمام وجوہ پہلے درپیش آئیں اور آیہ کریمہ کا نزول بعد میں ہوا اس لئے تمام وجوہ ہی شان نزول ہیں۔ (ابن کثیر)

”وَدَّ“ کا معنی محبت کرنا، پسند کرنا اور چاہنا ہے۔ مودت اور محبت کا فرق پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔
”کُفَّارًا“ حال ہے ”کم“ ضمیر مخاطب سے، مطلب یہ ہے کہ بہت سے اہل کتاب چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کو العیاذ باللہ مرتد بنادیں۔

حَسَدًا: یا تو مفعول لہ ہے اور علت ہے ”وَدَّ“ کی۔ ”یردونکم“ کی علت نہیں۔ کیونکہ وہ مطلقاً چاہتے تھے کہ مسلمان مرتد ہو جائیں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے مصدر ہو منصوب حال ہونے کی وجہ سے ہو اور ”حسدا“ حاسدین کے معنی میں ہو۔ خیال رہے راقم کا ترجمہ مفعول لہ والا ہے۔

مِنْ عِنْدِ أَنْفُسِهِمْ: سے یہ ثابت کیا ہے کہ حسدان کے نفسوں میں ایسا راسخ ہے جیسا کہ ان کی ذاتیات میں داخل ہے۔

﴿مَنْ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ﴾ (اس کے بعد کہ ان کے لئے حق ظاہر ہو گیا) حق ظاہر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان پر نبی کریم ﷺ کی صفات اور معجزات واضح تھے کیونکہ توراۃ میں ان کا ذکر تھا۔

فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا: العفو ترک عقوبة المذنب والصفح ترک التثريب والتانيب

”عفو“ کا معنی گناہگار کی سزا کو ترک کر دینا، اور صفح کا معنی ہے ملامت کرنا چھوڑ دینا، اور اس کی طرف رجوع کرنا چھوڑ دینا۔

”صفح“ میں بنسبت ”عفو“ کے زیادہ مبالغہ پایا گیا ہے۔ کیونکہ کبھی کوئی شخص دوسرے کو معاف تو کر دیتا ہے۔ لیکن ملامت کرنا نہیں چھوڑتا۔

حتی یأتی اللہ بامرہ: (یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا حکم آجائے) ابتدائی طور پر مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ کفار اگر کچھ زیادتی کریں تو معاف کر دو اور درگزر کر لو، لیکن پھر قتال کا حکم دے دیا۔ اور ارشاد فرمایا۔
”قاتلوا الذین لا یؤمنون باللہ ولا بالیوم الآخر“ ان لوگوں سے قتال کرو (جنگ کرو) جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتے۔

اسی طرح ”امر“ سے مراد قریظہ قتل کرنے اور بنی نصیر کو جلاء وطن کرنے کا حکم آجائے تو پھر اس پر عمل کرنا۔

”امر“ سے مراد قیامت کا دن بھی ہے کہ قیامت کو ان کا فیصلہ ہو جائے گا۔ اور ”امر“ سے مراد قوت رسالت اور کثرت امت بھی مراد ہے۔ یعنی ابھی معاف کر دو اور درگزر کر دو، جب رسول اللہ ﷺ کو اپنی امت کی تعداد زیادہ ہونے پر قوت حاصل ہو جائے گی تو پھر قتال کا حکم نافذ ہو جائے گا۔

حضرت قتادہ، سدی، اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کا قول یہ ہے۔ ”ان الآیة منسوخة بآیة السیف“ بے شک یہ آیت قتال والی آیات سے منسوخ ہے۔

البتہ بعض حضرات نے بیان کیا کہ نسخ کی تعریف جب یہ ہے کہ شارع کی طرف سے ایک حکم کی مدت کی انتہاء ہوتی ہے۔ اور دوسرے حکم کی ابتداء ہوتی ہے۔ وہ پہلا حکم مطلق ہوتا ہے۔ اسکے ساتھ اسکے حکم ختم ہونے کی قید نہیں ہوتی۔ یہاں تو ﴿فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا﴾ کے ساتھ ﴿حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰهُ﴾ کی قید موجود ہے۔ جس سے پہلے ہی پتہ چل رہا ہے کہ اس حکم کو ختم کر دیا جائے گا۔ لہذا یہ حکم ہمارے نزدیک بھی منسوخ نہیں۔

تاہم یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ اختلاف بھی اصطلاحات کا اختلاف ہے۔ بعض حضرات کے نزدیک

منسوخ ہونے کے لئے مطلق ہونا ضروری ہے۔ اور بعض کے نزدیک مقید کو بھی منسوخ کیا جاسکتا ہے۔
 اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ : (بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے)

یعنی کفار سے انتقام لینا، اور مومنوں کی امداد کرنا، اور مومنوں کو کفار پر قدرت دینا اللہ تعالیٰ کی قدرت میں داخل ہے۔ اور یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ جو میں نے تمہیں ابھی تک معاف کرنے اور درگزر کرنے کا حکم دیا ہے اسے قبول کرلو، جس نے اس حکم سے اعراض کیا اور میرے حکم کی مخالفت کی وہ میری گرفت میں ہوگا۔ میں اس کی گرفت پر قادر ہوں۔
 (ماخوذ از روح المعانی)

عبداللہ بن ابی کا حسد کرنا اور نبی کریم ﷺ کا معاف کرنا:

اسی آیہ کے مطابق علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ ایک حدیث پاک کو ذکر فرماتے ہیں۔ جس سے واضح ہے کہ جب تک معاف کرنے کا حکم رہا حضور ﷺ معاف فرماتے رہے۔ خصوصاً منافقین کو اس لئے بھی معاف فرماتے تھے کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ یہ اپنے مسلمان ساتھیوں کو ہی قتل کر دیتے ہیں۔ چونکہ منافقین بظاہر اپنے آپ کو مسلمان کہلاتے تھے۔

”عن اسامة بن زيد اخبره ان النبي ﷺ ركب حمارا عليه اكاف تحته قطيفة فدكية وارف وراءه ابى وفي المجلس عبدالله بن رواحة فلما غشيت المجلس عجاجة الدابة خمر عبدالله بن ابى انفه بردائه ثم قال لاتغبروا علينا فسلم عليهم النبي ﷺ ثم وقف فنزل فدعاهم الى الله وقرأ عليهم القرآن فقال عبدالله بن ابى ايها المرء لا احسن من هذا ان كان ما تقول حقا فلا تؤذنا في مجالسنا وارجع الى رحلك فمن جاءك منا فاقصص عليه فقال عبدالله بن رواحة اغشنا في مجالسنا فانا نحب ذلك قال فاستب المسلمون والمشركون واليهود حتى هموا ان يتواثبوا فلم يزل النبي ﷺ يحفضهم ثم ركب دابته حتى دخل على سعد بن عباد فقال الى سعد الم تسمع الى ما قال ابو حباب يريد عبدالله بن ابى قال كذا كذا قال اعف عنه يا رسول الله واصفح فوالله لقد اعطاك الله الذي اعطاك ولقد اصطلح اهل هذه البحيرة ان يتوجوه فيعصبوه بالعصاة فلما رد الله ذلك بالحق الذي اعطاكه شوق بذلك فذلك فعل به ما رأيت فعفا عنه النبي ﷺ“

(مسلم ج ۲ باب ما لقى النبي ﷺ من اذى المشركين والمنافقين وهكذا في البخاری)

حضرت اسامہ بن زید فرماتے ہیں۔ بے شک نبی کریم ﷺ گدھے پر سوار ہوئے اس پر زین تھی اور اس کے نیچے فذک کی بنی ہوئی ایک چادر تھی آپ نے اپنے پیچھے میرے باپ کو سوار کیا۔ آپ بنی حارث بن خزرج قبیلہ میں سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے۔ یہ واقعہ بدر سے پہلے کا ہے۔ نبی کریم ﷺ ایک مجلس سے گذرے وہاں مسلمان اور مشرکین یعنی بت پرست اور یہود موجود تھے۔ ان میں عبداللہ بن ابی بھی موجود تھا۔ جس مجلس میں عبداللہ بن ابی تھا جب اس میں نبی کریم ﷺ کی سواری کے قدموں سے اٹھنے والی گردوغبار پہنچی تو اس نے اپنے ناک کو اپنی چادر سے ڈھانپ لیا۔ پھر کہنے لگا ہمیں غبار آلود نہ کیا کرو۔ اتنی دیر میں نبی کریم ﷺ نے ان کو سلام کہا پھر آپ ٹھہرے اور سواری سے اتر آئے۔ ان کو اللہ تعالیٰ (کی توحید) کی دعوت دی۔ اور ان پر قرآن پڑھا۔ تو عبداللہ بن ابی نے کہا اے انسان میں اسے اچھا نہیں سمجھتا۔ اگر تم حق کہتے ہو تو ہمیں ہماری مجالس میں آ کر تکلیف نہ پہنچایا کرو۔ تم اپنے گھر لوٹ کر چلے جاؤ۔ جو شخص تمہارے پاس آ جائے اسی پر بیان کیا کرو۔ تو حضرت عبداللہ بن رواحہ نے کہا (یا رسول اللہ) آپ ہماری مجالس میں تشریف لایا کریں ہم اسے پسند کرتے ہیں۔

راوی کہتے ہیں اس پر مسلمانوں، مشرکوں اور یہود کے درمیان گالی گلوچ شروع ہو گئیں، یہاں تک کہ ایک دوسرے پر حملہ کرنے کا انہوں نے ارادہ کر لیا، نبی کریم ﷺ ان کو خاموش کراتے رہے۔ پھر آپ اپنی سواری پر سوار ہوئے یہاں تک کہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لے آئے آپ نے (ان کی عیادت کی اور) ان کو کہا، اے سعد کیا تم نے سنا نہیں جو ابو حباب نے کہا، (ابو حباب سے مراد عبداللہ بن ابی ہے) پھر آپ نے بتایا اس نے اس اس طرح کہا۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ اسے معاف فرمادیں اور درگزر فرمائیں۔ قسم ہے اللہ تعالیٰ کی، تحقیق اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطاء کیا (جو منصب اور رفعت) جو عطاء کیا۔ (اس کی ایک وجہ آپ کے منصب کی بلندی، اور دوسری وجہ یہ تھی) اس شہر (مدینہ طیبہ) کے لوگوں نے اتفاق کر لیا تھا کہ حاکمیت کا تاج عبداللہ بن ابی کو پہنادو، اور اسی پر اتفاق کر لو اور اس کی پشت پناہی کرو۔ جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو حق سے مبعوث فرمایا۔ آپ یہاں تشریف لائے، تو اس کا معاملہ رب تعالیٰ نے درہم برہم کر دیا۔ تو وہ حسد کرنے لگا، اسی وجہ سے اس نے آپ کو یہ کہا، اور آپ سے وہ سلوک کیا جو

آپ نے دیکھا تو نبی کریم ﷺ نے اسے معاف کر دیا۔

خیال رہے کہ ایک حدیث میں یہ ہے۔ ”ذلک قبل ان یسلم عبد اللہ“ یہ عبد اللہ بن ابی کے اسلام لانے سے پہلے کا واقعہ ہے اس اسلام سے مراد اس کا ظاہری اور منافقانہ طور پر اسلام لانا مراد ہے، جو اس نے بدر کے واقعہ کے بعد ظاہری طور پر اسلام لانے کا دعویٰ کیا تھا۔ اگرچہ وہ مرتے دم تک کافر اور منافق ہی رہا۔

ایک اور حدیث میں ہے۔ ”فکان بینہم ضرب بالجرید و بالاید والنعال“ مسلمانوں اور کفار کے درمیان چھڑیاں، ہاتھ اور جوتے چل گئے، یعنی لڑائی شروع ہو گئی۔

دونوں حدیثوں میں اختلاف نہیں، مطلب یہ ہے کہ انہوں نے ایک دوسرے پر حملہ کرنے کا ارادہ کر لیا کہ ایک دوسرے کو قتل کر دیں، تاہم ان کے درمیان چھڑیوں اور مکوں اور جوتوں سے لڑائی شروع ہو گئی تھی۔

خیال رہے کہ اور حدیث شریف میں یہ بھی ہے۔

”قال الیک عنی فواللہ لقد آذانی نتن حمارک قال فقال رجل من الانصار واللہ لحمار رسول اللہ ﷺ اطیب ریحاً منک“

عبد اللہ بن ابی نے کہا تم مجھ سے دور ہٹ جاؤ، مجھے تمہارے گدھے کی بو سے تکلیف پہنچی ہے۔ وہاں ہی ایک انصاری صحابی تھے انہوں نے کہا قسم ہے اللہ تعالیٰ کی رسول اللہ ﷺ کا گدھا تمہاری اعلیٰ قسم کی خوشبو سے بھی زیادہ خوشبودار ہے۔ یعنی کستوری کی خوشبو سے بھی آپ کے گدھے میں زیادہ خوشبو ہے۔

یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ بعض اوقات مختلف احادیث کا مجموعی بیان واقع کی تکمیل کرتا ہے۔ جیسا کہ یہاں تمام احادیث کو جمع کریں تو واقعہ مکمل نظر آئے گا۔

حسد کے متعلق علامہ رازی رحمہ اللہ کا تفصیلی بیان:

اسی آیت کریمہ کی تفسیر میں علامہ رازی رحمہ اللہ نے حسد کی تعریف اور حسد کے اسباب اور حسد کی برائی کو بیان فرمایا ہے۔ جس کا ذکر کرنا یقیناً بہت مفید ہے۔

حسد کی مذمت میں احادیث:

(۱) قال عليه الصلوة والسلام "الحسد يأكل الحسنات كما تأكل النار الحطب"

حسد نیکوئی کو ایسے کھا جاتا ہے جیسے آگ لکڑیوں کو کھا جاتی ہے۔

(۲) حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ ہم ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے نبی کریم ﷺ

نے فرمایا اس راستہ سے ایک شخص آ رہا ہے جو جنتی ہے۔ تو انصار میں سے ایک شخص آ گئے، جن کی داڑھی وضوء کی وجہ سے صاف ستھری تھی، انہوں نے اپنے بائیں ہاتھ میں اپنے جوتے پکڑے ہوئے تھے۔ تو انہوں نے سلام کیا دوسرے دن نبی کریم ﷺ نے وہی کل والا ارشاد فرمایا۔ اور آنے والے بھی وہی شخص تھے۔ اور تیسرے دن بھی آپ نے وہی ارشاد فرمایا اور آنے والے بھی وہی شخص تھے۔

جب نبی کریم ﷺ مجلس سے اٹھ کر تشریف لے گئے۔ تو عبداللہ بن عمرو بن العاص اس شخص کے پیچھے چلے، اور ان کو کہا کہ مجھے اپنے باپ سے کچھ تکلیف پہنچی ہے۔ میں نے قسم اٹھالی کہ ان کے پاس (یعنی اپنے گھر) تین دن داخل نہیں ہوں گا۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ آپ مجھے اپنے گھر تین دن رکھ لیں (تا کہ میری قسم پوری ہو جائے) انہوں نے کہا ٹھیک ہے آ جاؤ۔ (یہ ان کے گھر چلے گئے) تین راتیں ان کے پاس گزاریں۔ عبداللہ بن عمرو بن العاص نے ان کو رات کو اٹھ کر زیادہ عبادت کرتے ہوئے نہ دیکھا سوائے اس کے کہ وہ جب اپنے بستر پر کروٹ بدلتے تو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے۔ وہ رات کو قیام نہیں کرتے تھے۔ نہ دیکھا سوائے اس کے کہ فجر کی نماز کے لئے اٹھتے۔ اور البتہ ان سے خیر کے کلمات کے بغیر کوئی کلمہ نہ سنا گیا۔

جب تین راتیں گزر گئیں۔ تو یہ کہتے ہیں کہ میں نے ان کے عمل کو کم سمجھا۔ تو میں نے کہا اے اللہ کے بندے میرے اور میرے والد کے درمیان کوئی رنجش نہیں تھی۔ لیکن میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ نے (تمہارے متعلق) اس اس طرح فرمایا تو میں نے ارادہ کیا کہ میں تمہارے اعمال کو دیکھوں، لیکن میں نے تمہارے اعمال کو کثیر نہیں پایا، تو وہ کیا وجہ ہے جس کی وجہ سے تم اس مرتبے پر پہنچے ہو، تو انہوں نے کہا میرے عمل تو اور کوئی نہیں سوائے اس کے جو تم نے دیکھ لئے۔

یہ کہتے ہیں جب میں نے پیٹھ پھیر لی۔ یعنی واپس لوٹنے لگا، تو آپ نے مجھے واپس بلایا، اور کہا

”ما هو الا ما رأيت غير اني لم اجد على احد من المسلمين في نفسي عيا ولا حسدا على خير اعطاه الله اياه“

کہ اور تو کوئی عمل نہیں سوائے اس کے جو تم نے دیکھا ہے۔ البتہ مسلمانوں میں سے میں کسی ایک کو عیب نہیں لگاتا۔ اور اللہ تعالیٰ نے کسی کو اگر کوئی بھلائی عطاء کی ہو تو میں اس پر حسد نہیں کرتا۔
”فقال عبد الله هي التي بلغت بك وهي التي لا تنطق“

حضرت عبد اللہ نے کہا یہی وہ چیز ہے جس کی وجہ سے تم اس منصب پر پہنچے ہو، اس کی ہر شخص طاقت نہیں رکھتا۔

(۳) قال عليه الصلوة والسلام رب اليكم داء الامم قبلكم ، الحسد والبغضاء ،
والبغضة هي الحالقة لا اقول حالقة الشعر ولكن حالقة الدين“

نبی کریم ﷺ نے فرمایا پہلی امتوں کی بیماری تمہیں لاحق ہوگئی۔ یعنی حسد اور بغض اور بغض حالقہ ہے، حالقہ کہنے سے میرا یہ مطلب نہیں کہ وہ بالوں کو مونڈنے والی کوئی چیز ہے، بلکہ میرا مقصد تو یہ ہے کہ وہ دین کو برباد کر دینے والی چیز ہے۔

(۴) قال عليه الصلوة والسلام انه سيصيب امتي داء الامم قالوا ماداء الامم قال الاشر والبطر والتكاثر والتنافس في الدنيا والتباعد والتحاسد حتى يكون البغي ثم الهرج“
نبی کریم ﷺ نے فرمایا، بے شک میری امت کو وہی بیماری لگ جائے گی، جو پہلی امتوں کو لگی۔ صحابہ کرام نے پوچھا (یا رسول اللہ) وہ پہلی امتوں کی بیماری کون سی تھی۔ آپ نے فرمایا حرص اور اکڑ (تکبر) اور کثرت مال، اور دنیا کو پسند کرنا، اور ایک دوسرے سے دور رہنا اور حسد کرنا یہاں تک کہ ان میں بغاوت آجائے گی۔ پھر قتل کرنا ایک دوسرے کو ان میں واقع ہو جائے گا۔

(۵) موسى عليه السلام جب رب کے حضور حاضر ہوئے تو عرش کے سائے میں ایک شخص کو دیکھا،
آپ کو اس پر رشک آیا، اور آپ نے کہا یہ شخص رب تعالیٰ کا مکرم ہے۔ اپنے رب سے اس کے نام کے متعلق سوال کیا۔ اس کا نام تو آپ کو نہ بتایا گیا۔ التبتہ رب نے کہا۔

”احدثك من عمله ثلاثا كان لا يحسد الناس على ما آتاهم الله من فضله ، و كان لا يعق

میں تمہیں اس شخص کے تین عمل بتاتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو اپنے فضل سے جو مال وغیرہ عطاء فرمایا یہ ان پر حسد نہیں کرتا تھا۔ اور اپنے والدین کی نافرمانی نہیں کرتا تھا۔ اور چغلی خوری نہیں کرتا تھا۔
(۶) قال عليه الصلوة والسلام ان لنعم الله اعداء قيل وما اولئك قال الذين يחסدون الناس على ما آتاهم الله من فضله“

نبی کریم ﷺ نے بیان فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے دشمن ہیں، آپ سے پوچھا گیا وہ کون لوگ ہیں؟ آپ نے فرمایا جو لوگوں سے حسد کرتے ہیں اس چیز پر جو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے ان کو عطاء کیا ہوتا ہے۔

حسد کی مذمت میں آثار:

عوف بن عبد اللہ گئے فضل ابن مہلب کے پاس جب وہ واسط کے حاکم تھے، تو انہوں نے کہا میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں۔ ”ایساک والکبر“ کہ اپنے آپ کو تکبر سے بچا کر رکھو، کیونکہ یہی سب سے پہلا گناہ ہے جس کی وجہ سے ابلیس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی، پھر آپ نے یہ آیت پڑھی۔
﴿وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ أَبَىٰ وَاسْتَكْبَرَ﴾

اور جب ہم نے کہا فرشتوں کو سجدہ کرو آدم کو تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے اس نے انکار کیا اور تکبر کیا۔

پھر انہوں نے کہا ”ایساک والحرص“ فانہ اخرج آدم من الجنة“ تم اپنے آپ کو حرص سے بچا کر رکھو کیونکہ حرص نے آدم علیہ السلام کو جنت سے نکالا۔ پھر انہوں نے پڑھا۔ ”اهبطا منها“ رب تعالیٰ نے آدم علیہ السلام اور حضرت حوا کو حکم دیا جنت سے اتر جاؤ۔ پھر انہوں نے کہا۔ ”ایساک والחסد فانہ قتل ابن آدم اخاه حين حسده“ اپنے آپ کو حسد سے بچا کر رکھو، بے شک حسد کی وجہ سے آدم علیہ السلام کے ایک بیٹے نے اپنے بھائی کو قتل کر دیا۔

☆ ابن زبیر کہتے ہیں میں نے کسی ایک پر دنیا کی وجہ سے حسد نہیں کیا، اس لئے کہ اگر وہ دنیا دار

جنتی ہے۔ ”فکیف احسده علی الدنیا وہی حقیرة فی الجنة“ تو میں اس پر دنیا کی وجہ سے کیوں حسد کروں جو نسبت جنت کے حقیر ہے اور اگر وہ شخص جہنمی ہے۔ ”فکیف احسده علی امر الدنیا وهو یصیر الی النار“ تو میں اس سے کیسے حسد کروں دنیا کی وجہ سے جو جہنم تک پہنچانے کا ذریعہ ہے۔

☆ قال معاویة کل الناس اقدر علی رضاه الا الحاسد فانه لا یرضیه الا زوال النعمة“ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں تمام لوگوں کو راضی کرنے پر قادر ہوں سوائے حاسد کے، حسد کرنے والے کو سوائے نعمت کے زوال کے کوئی چیز راضی نہیں کر سکتی۔

☆ اور بعض بزرگوں نے کہا ہے حاسد مجالس میں سوائے مذمت اور ذلت کے کچھ حاصل نہیں کر سکتا۔ اور حاسد ملائکہ سے سوائے لعنت اور ان کی ناراضگی کے کچھ حاصل نہیں کر سکتا۔ اور حاسد مخلوق سے سوائے جزع و فزع کے کچھ حاصل نہیں کر سکتا۔ اور حاسد کو جزع و فزع سے زیادہ شدت اور ڈر ہی حاصل ہوتا ہے۔ اور حاسد کو موقف (حساب و کتاب کے لئے قیامت میں ٹھہرنے کے مقام) میں سوائے رسوائی اور عذاب کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

حسد کیا ہے؟ جب اللہ تعالیٰ نے تمہارے بھائی کو نعمت عطاء کی ہو۔ ”فان اردت زوالها فہذا هو الحسد“ اور اس نعمت کے زوال کو تم چاہتے ہو تو یہ حسد ہے۔

خیال رہے کہ حسد میں یہ ضروری نہیں کہ انسان یہ خواہش کرے کہ اس کی نعمت زائل ہو کر مجھے مل جائے۔ کبھی یہ خواہش ہوتی ہے۔ لیکن کبھی دوسرے کی نعمت کا صرف زوال طلب کیا جاتا ہے۔ اس کے حصول کی تمنا نہیں ہوتی، جیسا کہ زیر بحث آیت میں واضح ہے اہل کتاب مؤمنین سے ایمان کا زوال تو چاہتے تھے۔ لیکن اپنے لئے ایمان بھی نہیں چاہتے تھے۔

”وان اشتہیت لنفسک مثلها فہذا هو الغبطة والمنافسة“ اور اگر کسی کی نعمت کے زوال کو تم نہ چاہو صرف یہ تمنا کرو کہ یہ نعمت مجھے بھی مل جائے اسے ”غبطة اور منافسة“ کہا جاتا ہے۔ جسے ہم اپنی زبان میں ”ریشک کرنا“ کہتے ہیں۔ حسد ہر حال میں حرام ہے۔ البتہ اگر نعمت کسی فاجر یا کافر کو حاصل ہو جس کی وجہ سے شر اور فساد پھیل رہا ہو۔

”فلا یضرک محبتک لزوالها“ تو اس شخص کی نعمت کے زوال کی تمنا کرنا ناجائز نہیں۔ اس لئے کہ اس کی نعمت کے زوال کی تمنا مقصود نہیں، بلکہ اس کی نعمت اور مال و دولت کے زوال کی فقط اس لئے تمنا پائی گئی ہے کہ اس کے فساد سے لوگوں کو آرام مل جائے۔ جیسا کہ کوئی غاصب لیرا ملک کا حکمران بن جائے، دین اسلام کا مخالف ہو جائے۔ یہود و نصاریٰ کا یار بن جائے تو اس کی حکمرانی کے زوال کی دعاء کرنا حسد نہیں، گناہ نہیں، بلکہ مستحب ہے۔

حسد کی جو تعریف کی گئی ہے اس پر قرآن پاک شاہد ہے۔ ایک تو یہی آیت جس کی بحث جاری ہے۔ اس میں ذکر ہے۔ ”لو یردونکم من بعد ایمانکم کفاراً حسداً من عند انفسہم“ کثیر اہل کتاب یہ چاہتے ہیں۔ (کاش وہ تمہیں ایمان سے کفر کی طرف پھیر لیں بوجہ اپنے نفسوں میں حسد رکھنے کے) یعنی وہ ایمان والوں کی نعمت ایمان کا زوال چاہتے ہیں ان کا حسد تھا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ﴿وَدُّوا لَوْ تُكْفِرُونَ كَمَا كَفَرُوا فَتَكُونُونَ سَوَاءً﴾ (النساء آیت ۸۹) وہ (منافقین) تو چاہتے ہیں کہ کہیں تم بھی کافر ہو جاؤ جیسے وہ کافر ہوئے تم سب ایک سے ہو جاؤ اس آیت کریمہ سے بھی ثابت ہے کہ منافقین چاہتے تھے کہ مؤمنین سے ایمان جیسی نعمت عظمیٰ زائل ہو جائے۔ اور ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

﴿إِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَإِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَفْرَحُوا بِهَا﴾ اگر تمہیں بھلائی پہنچے تو ان کو (منافقین کو) غمناک کر دیتی ہے۔ اور اگر تمہیں کوئی مصیبت پہنچے تو وہ اس سے خوش ہوتے ہیں۔

”وہذا الفرح شماتۃ والشماتۃ والحسد متلازمان“ کسی کی مصیبت پر خوش ہونا درحقیقت شماتت ہے لیکن شماتت اور حسد ایک دوسرے کو لازم ہیں۔

علامہ رازی رحمہ اللہ نے حسد کی تعریف پر کئی اور آیات کو بھی ذکر کیا ہے۔ لیکن مسئلہ سمجھنے کیلئے میرے خیال میں اتنے دلائل ہی کافی ہیں۔ ہر آیت کی مکمل وضاحت اپنے اپنے محل سے ہی تعلق رکھتی ہے۔

منافسہ اور غبطہ کا حکم: منافسہ کبھی واجب ہوتا ہے، کبھی مستحب اور کبھی مباح۔

منافسہ واجبہ: اگر دوسرے شخص کو دینی نعمت حاصل ہے جیسا کہ ایمان، نماز اور زکوٰۃ، اسکی تمنا کرنا واجب ہے، کیونکہ اگر انکی تمنا نہیں کرے گا تو اسکے خلاف تو معصیت ہے اور معصیت پر راضی ہونا حرام ہے۔

منافسہ مستحبہ: واما ان كانت تلك النعمة من الفضائل المندوبة كالانفاق في سبيل الله والتشجيع لتعليم الناس كانت المنافسة فيها مندوبة

اگر کسی کو مستحب کاموں پر عمل کرنے کی نعمت حاصل ہے تو اس جیسی نعمت کے حصول کی تمنا مستحب ہے۔ جیسا کہ کسی کو رب تعالیٰ نے اپنی راہ میں خرچ کرنے کی توفیق عطاء کر رکھی ہے اور لوگوں کو دین کی تعلیم دینے پر کوئی کمر بستہ ہو تو ان میں منافسہ مستحب ہے۔

منافسہ مباح: اگر کسی کو مباح قسم کی نعمتیں حاصل ہیں تو ان جیسی نعمتوں کی طلب مباح ہوگی۔ جیسا کہ کسی کے کپڑے دیکھ کر، سواری وغیرہ دیکھ کر یہ تمنا کرے مجھے بھی ایسی چیزیں حاصل ہوں۔

تنبیہ: اگر کسی کو نعمت حرام طریقہ سے حاصل ہے تو انسان یہ چاہے کہ مجھے بھی اسی قسم کی نعمت حاصل ہو جائے اور بے شک حرام طریقہ سے ہی حاصل ہو جائے یہ منافسہ حرام ہوگا۔

حاصل کلام: نتیجہ واضح ہوا کہ کسی کی نعمت کے زوال کا مطالبہ حرام ہے، اور کسی کی نعمت کے زوال کی طلب نہ ہو، لیکن اس جیسی نعمت کے حصول کی طلب جائز ہے۔

منافسہ کے جواز پر دلائل: (۱) ﴿وَفِي ذَلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ﴾ اور اسی پر چاہئے کہ للچائیں للچانے والے، اس سے پہلے جنت کی نعمتوں کا ذکر ہے، پھر ان پر رغبت رکھنے اور حاصل کرنے کی تمنا کا حکم دیا۔

پتہ چلا کہ کسی کو حاصل شدہ نعمتوں جیسی نعمتیں حاصل ہونے کی تمنا کرنا جائز ہے بشرطیکہ اس کی نعمت کا زوال نہ طلب کیا جائے۔

(۲) اور رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿سَابِقُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ﴾ اپنے رب کی مغفرت کی طرف سبقت کرو۔ یعنی ایک دوسرے سے آگے بڑھنے اور مغفرت حاصل کرنے کی کوشش کرو۔

کیونکہ سبقت اس وقت کی جاتی ہے جب یہ خوف ہو کہ ہو سکتا ہے میری سستی کی وجہ سے وہ نعمت مجھ سے رہ نہ جائے جس طرح دو غلام ہوں تو ایک دوسرے سے آگے نکل کر اپنے مولیٰ سے انعام حاصل کرنا چاہیں۔

اس آیت سے بھی یہ واضح ہوا کہ کسی نعمت کے حاصل کرنے میں کوشش کرنا کسی سے آگے بڑھنا جائز ہے۔

☆ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ” لا حسد الا فی اثین رجل آتاه الله مالا فانفقہ فی سبیل الله ، ورجل آتاه الله علما فهو یعمل بہ و یعلمہ الناس “

سوائے دو شخصوں کے کسی سے حسد نہ کرے، ایک وہ جسے اللہ تعالیٰ نے مال عطاء کیا ہو اور وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتا ہو اور ایک وہ جس کو اللہ تعالیٰ نے علم عطاء کیا ہو وہ اس پر عمل کرتا ہو اور لوگوں کو بھی تعلیم دیتا ہو۔

” وهذا الحديث يدل على ان لفظ الحسد قد يطلق على المنافسة “

اس حدیث پاک سے واضح ہو رہا ہے کہ کبھی حسد کا مجازی معنی منافسہ لیا جاتا ہے، جیسا اس حدیث میں حسد کا اطلاق منافسہ پر ہے۔

اور یہ بھی خیال رہے کہ حدیث میں ”دو“ کی قید اتفاقی ہے، ہر شخص جو نیکی کا عمل کرے، اس جیسی نیکی کے حاصل کرنے کی تمنا مستحب ہے، خواہ وہ نیکی کوئی بھی ہو۔

تنبیہ: منافسہ کی دو صورتیں ہیں۔ ایک منافسہ محضہ اور دوسرا منافسہ مستلزم حسد، پہلی قسم والا منافسہ جائز ہے۔ دوسرا ناجائز ہے۔

منافسہ محضہ: یہ ہے کہ دوسرے کی نعمت کو دیکھ کر یہ طلب کرے کہ مجھے بھی یہ نعمت مل جائے، نہ تو یہ اس کی نعمت کا زوال طلب کرے، اور نہ ہی اسکی طلب اسکی نعمت کے زوال کو مستلزم ہو، یہ منافسہ جائز ہے۔

منافسہ مستلزم حسد یہ ہے کہ اگرچہ یہ دوسرے کی نعمت کا زوال طلب نہیں کر رہا، لیکن اس کی طلب ایسی ہے جو اس کی نعمت کے زوال کو مستلزم ہے تو یہ حسد ہی ہے جو ناجائز ہے۔ جیسا کہ ایک شخص کسی کے مکان، کسی کی سواری، کسی کے منصب وغیرہ کو دیکھ کر یہ تمنا کرے کہ اس کی یہ چیز مجھے مل جائے۔ اس میں دوسرے کی نعمت کا زوال لازم آتا ہے۔ یہ ناجائز ہے۔ ہاں البتہ یہ خیال کر کے وہ نیچے میں خرید لوں یہ تمنا جائز ہے۔

حسد سے نکلنا قوت ارادہ پر مبنی ہے:

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”ثلاث لا ینفک المؤمن عنہن الحسد والظن والطیرة“
تین چیزیں ایسی ہیں جن سے مؤمن کا چھٹکارا نہیں، وہ یہ ہیں حسد اور ظن (کسی کے خلاف بدگمانی) اور فال پکڑنا۔ اور بعد میں آپ نے یہ ذکر فرمایا ”ولہ منہن مخرج اذا حسدت فلا تبغ“ ان سے نکلنا کا یہ طریقہ ہے کہ جب تمہارے دل میں حسد آئے تو اس پر عمل نہ کرو، یعنی پختہ ارادہ اور ہمت سے اس سے باز آ جاؤ۔ یہی طریقہ دوسری دو چیزوں سے نکلنے کا بھی ہے۔

حسد کے مراتب: علامہ غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ حسد کے چار مراتب ہیں۔

(۱) دوسرے کی نعمت کے زوال کو چاہنا، خواہ اسے وہ نعمت حاصل نہ بھی ہو۔ یہ حسد کا درجہ انتہاء حسد اور مقصود حسد ہے۔

(۲) حسد کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ بظاہر تو یہ دوسرے کی نعمت کا زوال طلب نہیں کر رہا، بلکہ صرف اپنے لئے وہ نعمت طلب کر رہا ہے۔ لیکن جب تک اس کی نعمت زائل نہ ہو اسے مل نہیں سکتی جیسا کہ یہ طلب کرے کہ اس کی خوبصورت زوجہ مجھے مل جائے۔ اسے تب ہی ملے گی جو اس سے اس کی زوجیت کا زوال ہوگا۔ یہ تمنا مستلزم زوال نعمت غیر ہے۔

(۳) تیسرا درجہ حسد کا یہ ہے کہ اس کی تمنا دوسرے شخص سے برابری حاصل کرنے کی ہو۔ پہلی تمنا تو یہ ہو کہ مجھے بھی اس کی نعمت جیسی نعمت مل جائے۔ ہاں اگر مجھے اس جیسی نعمت نہ ملے تو

دوسری تمنا یہ ہے کہ اس کی نعمت بھی زائل ہو جائے تاکہ دونوں میں برابری ہو جائے۔

(۲) چوتھا درجہ جو حقیقتِ حسد نہیں بلکہ منافسہ اور غبطہ ہے، مجازی طور پر اسے حسد کہا جاتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ دوسرے کی نعمت کا زوال طلب نہ کیا جائے، نہ دوسرے کی نعمت کے زوال کو اس کی تمنا مستلزم ہو، اس کی تمنا صرف یہ ہو کہ مجھے اس کی نعمت جیسی مل جائے۔

”وہذا الاخیر هو المعفو عنه ان کان فی الدنیا و المندوب الیہ ان کان فی الدین“

یہ چوتھی قسم اگر دنیا کی طلب ہو تو معاف ہے یعنی اس پر کوئی گناہ بھی نہیں اور ثواب بھی نہیں۔ اگر دین کے کاموں کی طلب ہو تو مستحب ہے جس پر ثواب ہوتا ہے۔

باقی تینوں قسمیں ناجائز ہیں۔ پہلی قسم زیادہ مذموم (بری) ہے۔ دوسری اس سے کچھ کم، اور تیسری اس سے بھی کچھ کم۔

حسد کے اسباب:

(۱) عداوت اور بغضِ حسد کا سبب ہیں۔ جب کوئی شخص کسی کو اذیت پہنچائے، تو جسے تکلیف

پہنچائی جائے اس کے دل میں بغض اور غضب پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ غضب کینہ پیدا کرتا ہے، اور کینہ کی وجہ سے وہ انتقام لینے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر انتقام نہ لے سکے تو پھر یہ چاہتا ہے کہ اسے کوئی مصیبت پہنچے، اگر اسے کوئی مصیبت پہنچے تو وہ خوش ہوتا ہے۔ اور کوئی نعمت حاصل ہو تو یہ غم اور پریشانی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور یہی چاہتا ہے کہ اس کی نعمت کب زائل ہو جائے

اسی سے واضح ہو گیا کہ بغض اور غضب کو حسد لازم ہے۔ کبھی ان سے جدا نہیں ہوتا۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ کبھی وہ اپنی عداوت اور حسد کو ظاہر کرنے کی طاقت نہیں رکھتا، اور دل ہی دل میں جلتا رہتا ہے۔ جب اسے مصیبت پہنچے تو یہ خوش ہوتا ہے۔

حسد کی اسی قسم کا رب تعالیٰ نے ذکر فرمایا:

”واذا لقوكم قالوا امنا واذا خلوا عضوا علیکم الانامل من الغیظ قل موتوا بغيظکم ان اللہ علیم بذات الصدور، ان تمسککم حسنة تسؤہم وان تصبکم سينة یفرحوا بها“

جب وہ (منافقین) آپ سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے ہیں۔ اور جب علیحدہ ہوتے ہیں تو غصے کی وجہ سے تم پر انگلیوں کے پورے کاٹتے ہیں۔ فرما دو اپنے غیظ و غضب کی وجہ سے مر جاؤ، بے شک اللہ تعالیٰ سینوں کی باتوں کو جاننے والا ہے۔ اگر تمہیں کوئی بھلائی پہنچے تو ان کو پریشانی ہوتی ہے۔ اور اگر تمہیں کوئی مصیبت پہنچے تو وہ خوش ہوتے ہیں۔

کبھی کبھی وہ حسد کو اپنے کلام سے ظاہر بھی کرتے رہتے ہیں۔ لیکن دلوں میں اور ہی زیادہ وہ حسد رکھتے ہیں۔

رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَدُّوا مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ﴾

وہ پسند کرتے اسے جو تمہیں مشقت پہنچے، ظاہر ہو گیا ہے بغض ان کے مونہوں سے، اور جو ان کے سینے چھپا کر رکھتے وہ اور ہی بڑا ہے۔

”واعلم ان الحسد ربما افضى الى التنازع والتقاتل“

اس قسم کا حسد جس کا سبب غیظ و غضب اور عداوت ہو وہ بسا اوقات جھگڑے اور فساد اور قتل و غارت تک پہنچا دیتا ہے۔

(۲) حسد کا دوسرا سبب ہے ”تغرز“ اپنے آپ کو بڑی عزت والا سمجھنا، جب کسی ایک کو کوئی منصب حاصل ہو جائے جس کی وجہ سے اسے رفعت (بلندی شان) حاصل ہو جائے، یہ برداشت نہ کر سکے اور یہی چاہے کہ اس کا وہ منصب زائل ہو جائے۔

اس صورت میں یہ ضروری نہیں کہ یہ تمنا کرے کہ مجھے بھی وہ منصب مل جائے۔ بلکہ اس کا مقصد تو یہ ہے کہ وہ مجھ سے اونچا نہ رہے، بلکہ میرے برابر ہو جائے۔ یہ صرف اس کی رفعت اور منصب کا زوال چاہتا ہے۔

(۳) ”الاستخدام من الغير“ تیسرا سبب حسد کا یہ ہے کہ کسی کی طبیعت میں یہ ہو کہ وہ یہ چاہے کہ لوگ میری خدمت گزاری میں رہیں۔ جب کسی اور کو کوئی نعمت مل جائے تو یہ سمجھے کہ جب

کوئی شخص باکمال ہو گیا تو وہ میری خدمت کیسے کرے گا۔ لہذا یہ نعمت اس سے زائل ہو جائے تو پھر ہی وہ مجھے سردار اور چوہدری مانے گا۔

یہی حسد کفار نبی کریم ﷺ سے رکھتے تھے، وہ کہتے تھے۔

”کیف یتقدم علينا غلام یتیم و کیف نطاطی له رؤوسنا“

ایک یتیم کو ہم پر برتری کیسے حاصل ہوگئی، ہم اس کے سامنے سر کیسے جھکائیں۔

رب تعالیٰ نے ذکر فرمایا؛

﴿وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هَذَا الْقُرْآنُ عَلَى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيمٍ﴾

اور انہوں نے کہا قرآن کیوں نازل نہیں ہوا ان دو بستیوں (مکہ اور طائف) کے کسی بڑے شخص پر

یعنی وہ لوگ مال دار، اور سردار اور چوہدری، اور بیجا حکم چلانے والوں کو اپنے زعم باطل میں

بڑا سمجھتے تھے۔

اسی طرح قریش کے قول کو رب تعالیٰ نے ذکر فرمایا۔ ﴿أَهَؤُلَاءِ مَنَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِّنْ بَيْنِنَا﴾

کیا یہی لوگ ہیں جن پر ہمارے درمیان اللہ تعالیٰ نے احسان فرمایا۔ یعنی انہوں نے نبی کریم ﷺ اور

آپ کے خاندان کو حقیر سمجھتے ہوئے (معاذ اللہ) یہ کہا۔

(۴) حسد کا چوتھا سبب ہے ”تعجب“ جس طرح اللہ تعالیٰ نے پہلی امتوں کی خبر دی۔ انہوں نے

انبیاء کرام کو کہا ﴿مَا أَنْتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا﴾ نہیں ہو تم مگر ہمارے جیسے بشر۔

فرعون اور اس کی قوم نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کے متعلق کہا۔

﴿أَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عَابِدُونَ﴾ کیا ہم اپنے جیسے دو بشروں پر ایمان لے آئیں

جن کی قوم کے لوگ ہمارے خدمت گزار ہیں۔

اور انہوں نے تعجب کرتے ہوئے کہا۔ ”ابعث اللہ بشرا رسولا“ کیا اللہ تعالیٰ نے بشر کو

رسول بنا کر بھیجا۔ اور رب تعالیٰ نے ان کے تعجب کو ذکر فرمایا۔

﴿أَوْعَجِبْتُمْ أَنْ جَاءَ كُمْ ذِكْرٌ مِّن رَّبِّكُمْ عَلَى رَجُلٍ مِّنكُمْ لِيُنذِرَكُمْ﴾

کیا تم تعجب کرتے ہو اس پر کہ تمہارے رب کی طرف سے نصیحت آئی تمہارے پاس تم میں سے ہی ایک شخص کے ذریعے جو تمہیں ڈراتا ہے۔

ان تمام آیات سے واضح ہوا کہ ان لوگوں کے ایمان نہ لانا اور انبیاء کرام کی رسالت و نبوت کو نہ تسلیم کرنے، اور اس پر حسد کرنے کا سبب تعجب تھا۔

(۵) حسد کا پانچواں سبب مقاصد کے فوت ہونے کا خوف ہے۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب کئی

لوگ ایک ہی مقصد، ایک منصب، ایک ہی نعمت کے حصول کے لئے ایک دوسرے سے مزاحمت کریں کبھی تو ایک ہی عورت سے شادی کرنے کے لئے کئی آدمی تمنا کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے ہر حربہ استعمال کرتے ہیں۔ اور حسد کرتے ہیں کہ اسے یہ نعمت نہ حاصل ہو۔

اسی طرح کبھی بھائی ایک دوسرے پر حسد کرتے ہیں کہ دوسرے بھائی کو والدین محبوب نہ سمجھیں والدین اسے نہ مال دیں اور نہ اس پر شفقت کریں۔ یہی حسد حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ ان کے بھائیوں کو تھا۔

اسی طرح یہ حسد کبھی واعظین کو حاصل ہوتا ہے، وہ چاہتے ہیں کہ ایک دوسرے سے لوگوں کی مقبولیت میں اور مال کے حاصل کرنے میں بڑھ جائیں۔

اللہ کے فضل و کرم سے راقم اس حسد سے بچا ہوا ہے۔ نہ تو سحر آمیز وعظ آتا ہے، اور نہ ہی مال کی ہوس و تمنا کبھی کی، اور نہ ہی وعظ و خطاب کا شوق دل میں آیا، سیدھے سادے انداز میں لوگوں کو مسائل بتا دیتا ہوں، انداز تکلم کسی کو پسند آئے یا نہ آئے کبھی فکر نہیں ہوتی۔

(۶) حسد کا چھٹا سبب ہے کہ ریاست کو پسند کرے، اور اپنے لئے ایسے مراتب پسند کرے کہ دوسرا اس کے ساتھ اس کے فن میں کوئی شریک نہ ہو، اگر اسے پتہ چل جائے کہ کوئی اور اس جیسا فن رکھتا ہے تو یہ اس کی موت کی تمنا کرے۔ کہ وہ مر جائے تا کہ میرا فن اور میرا منصب یکتا رہے دوسرا اس میں کوئی شریک نہ ہو۔

یا یہ تمنا کرے کہ اس سے وہ نعمت ہی زائل ہو جائے، تا کہ میرا ثانی کوئی نہ رہے۔ راقم کے

خیال میں یہ حسد طبیعوں میں زیادہ پایا جاتا ہے۔ اکثر طور پر وہ نسخے سنبھال کر رکھتے ہیں کسی کو نہیں بتاتے بلکہ یوں کہا جائے کہ وہ اپنے نسخے اپنے ساتھ ہی لے کر مر جاتے ہیں۔

(۷) حسد کا ساتواں سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بندوں پر بھلائی کے کاموں میں بخل کرنا، یعنی جب کوئی شخص سخاوت کرے تو اسے پسند نہ آئے، وجہ اس کی بھی درحقیقت یہ ہوتی ہے کہ سخاوت کی وجہ سے جب کسی کی تعریف کی جائے تو اسے پسند نہ آئے اسی وجہ سے کہا جاتا ہے۔
”البخیل من بخل بمال غیرہ“ کامل بخیل وہ ہے جو غیر کے مال سے بخل کرے۔ یعنی خود سخاوت نہ کرنا تو دور کنار ہے بلکہ دوسرے کی سخاوت پر بھی جلنا اور حسد کرنا۔

جیسا کہ آج کل یہود و نصاریٰ کے یار دینی مدارس کے امداد کرنے والوں پر جل رہے ہیں۔ اور یہ سوچ رہے ہیں کہ ان لوگوں کو تنگ کیا جائے جو امداد کرتے ہیں لیکن ان مکاروں اور منافقوں کو معلوم نہیں کہ نہ رہا ابن زیاد نہ اس کا جو رو جفا رہا تو نام حسین جسے زندہ کرتی ہے کر بلا
”وہذا خبث فی الجبلۃ لاعن سبب عارض فتعسر ازالہ“

یہ حسد نفس کی خباثت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اس میں کوئی اسباب عارض نہیں ہوتے، اسی وجہ سے پلید شیطانوں کا حسد زائل ہونا مشکل ہوتا ہے۔

حسد کے اسباب سے سمجھ آیا:

ابھی تک حسد کے جو اسباب ذکر کئے گئے ہیں ان سے یہ سمجھ آیا کہ ایک ہی منصب اور ایک ہی پیشہ والے ایک دوسرے سے حسد کریں گے۔ دوسرے سے نہیں۔

عالم، عالم سے حسد کرتا ہے عابد سے نہیں، عابد، عابد سے حسد کرتا ہے عالم سے نہیں، تاجر، تاجر سے حسد کرنا ہے۔ جوتا بنانے والا، جوتا بنانے والے سے حسد کرتا ہے کپڑا بیچنے والے سے نہیں۔ ایک شخص اپنے بھائی اور اپنے چچا زاد سے جتنا حسد کرتا ہے اتنا دوسرے لوگوں سے حسد نہیں کرتا۔ عورت اپنی سوکن سے جتنا حسد کرتی ہے اتنا اپنے خاوند کی ماں اور بیٹی سے حسد نہیں کرتی۔

حسد سے بچنے کا ذریعہ:

حسد کو زائل کرنے کی دواء دو چیزیں ہیں۔ ایک علم، دوسرا عمل۔

علم کے پھر دو مقام ہیں۔ اجمال اور تفصیل،

علم اجمالی یہ ہے کہ انسان یہ جانے کہ جس چیز کا تعلق وجود سے ہے خواہ موجود ہے یا موجود ہونا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور قضاء میں داخل ہے۔ جب انسان کو یہ علم حاصل ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کی قضاء اور تقدیر پر راضی ہو جائے۔ تو حسد خود بخود زائل ہو جائے گا، اس لئے کہ انسان اس پر کامل یقین رکھے گا کہ جو مجھے ملا ہے یا ملنا ہے وہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں ہے جو دوسرے کو حاصل ہے وہ بھی اسی کی تقدیر میں ہے۔ میرے حسد کرنے اور جلنے کا کیا فائدہ۔

علم تفصیلی یہ ہے کہ انسان کو یہ علم حاصل ہونا چاہئے کہ حسد کا نقصان مجھے ہی حاصل ہونا ہے دین میں اور دنیا میں بھی۔ میں نے جس سے حسد کیا اس کا نقصان نہ تو دینی ہے اور نہ دنیاوی۔ بلکہ میرے حسد کا اسے نفع ہی نفع ہونا ہے۔ دین میں بھی اور دنیا میں بھی۔ حسد کرنے والے کو دین میں نقصان ہونے کی چند وجوہ ہیں۔

(۱) اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ انسان کو یہ معلوم ہونا چاہیے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے جو تقسیم فرمائی وہ اس کی حکمت کے تقاضا کے مطابق ہے، اگر میں نے اللہ تعالیٰ کی تقسیم کو ناپسند سمجھا اور اس کی تقسیم میں جھگڑا کیا تو یہ اللہ تعالیٰ وحدہ لا شریک پر اعتراض ہوگا۔ جو ایمان سے دور ہونے کا ذریعہ بن جائے گا۔

(۲) انسان کو یہ علم ہونا چاہیے کہ اگر میں نے کسی سے حسد کیا تو مجھے اللہ تعالیٰ کے ولیوں سے دور ہونا پڑے گا اور شیطان کا قرب حاصل ہو جائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اولیاء اللہ اس پر خوش ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو نعمتوں سے نوازا ہے۔ جب کوئی شخص اللہ کے بندوں کی نعمتوں پر حسد کرے اولیاء اللہ اسے اپنے آپ سے دور کر دیتے ہیں۔

لیکن شیطان اور تمام کافر حسد کرنے والے پر خوش ہوتے ہیں۔ لہذا وہ حسد کرنے والے کو اپنا

قریبی دوست بنا لیتے ہیں۔

(۳) ”العقاب العظیم المرتب علیہ فی الآخرة“ حسد کرنے والے کو دینی نقصان کی

تیسری وجہ یہ ہے کہ اسے آخرت میں بہت بڑا عذاب ہوتا ہے۔

حسد کرنے والے کو دنیاوی نقصان یہ ہوتا ہے۔ کہ حسد کی وجہ سے وہ ہمیشہ غم میں ہوتا ہے، اور اس کی طبیعت بگھی بگھی رہتی ہے۔ اور سب سے بڑا نقصان اے حسد کرنے والے تیرا یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ تیرے دشمنوں کو نعمتیں عطاء کرتا ہی رہے گا۔ جب تو نے ہر نعمت کو دیکھ کر جلنا ہے تو تجھے ہر وقت غم میں رہنا پڑے گا۔

اور غم کی وجہ سے تیرے بدن کو مرضی لاحق ہوگی اور صحت تیری زائل ہو جائے گی۔ اور تجھے وسوسہ کی بیماری لاحق ہوگی کھانے پینے میں تجھے کوئی لذت حاصل نہیں ہوگی۔

ابھی تک جو ذکر کیا ہے۔ اس سے بہت واضح ہو گیا ہے کہ حسد کرنے والے کو دین و دنیا میں نقصان ہوتا ہے۔

جس سے حسد کیا جائے اس کا دین اور دنیا میں کوئی نقصان نہیں۔

جب یہ بات واضح ہے کہ کسی کے حسد کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا زوال نہیں ہو سکتا، بلکہ جب تک اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں رہنا ہے اس وقت تک رہنا ہی رہنا ہے۔ کیونکہ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

﴿فَإِنَّ كُلَّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِمِقْدَارٍ﴾ بے شک ہر چیز اس کے ہاں ایک اندازے کے مطابق ہے، یعنی ہر چیز تقدیر کے مطابق ہے۔ اور ارشاد باری تعالیٰ ﴿وَلِكُلِّ أَجَلٍ كِتَابٌ﴾ ہر اجل لوح محفوظ میں ہے۔

جب ہر چیز کا وقت مقرر ہے، ہر چیز رب تعالیٰ کی تقدیر میں ہے تو کسی کے حسد کرنے سے دوسرے کا کیا نقصان ہوتا ہے۔

﴿وَمَهْمَا لَمْ تَزَلِ النِّعْمَةُ بِالْحَسَدِ لَمْ يَكُنْ عَلَى الْمَحْسُودِ ضَرَرٌ فِي الدُّنْيَا وَلَا عَلَيْهِ أَلَمٌ فِي الْآخِرَةِ﴾

جب حسد کی وجہ سے نعمت کا زوال نہیں تو جس سے حسد کیا جائے اس کا دنیا میں کوئی نقصان نہیں اور نہ ہی اسے آخرت میں کوئی گناہ ہونا ہے کہ اس کا اخروی نقصان ہو۔

جس سے حسد کیا جائے اسے دین میں یہ نفع حاصل ہونا ہے۔ کہ وہ مظلوم ہے، حاسد اپنے قول اور فعل سے اسے ایذا پہنچاتا ہے۔ اس کی غیبت کرتا ہے۔ اس پر عیب لگاتا ہے، اس کی پردہ دری کرتا ہے۔ اس کے گناہوں کا ذکر کرتا ہے۔

یہ تمام چیزیں دراصل اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے لئے نعمتیں اور ہدیئے ہیں۔ کیونکہ اگر حسد کرنے والے نے اس سے اپنے ذمہ حقوق کو معاف نہ کرایا تو قیامت کے دن اس کی نیکیاں اسے دے دی جائیں گی، جس سے یہ حسد کرتا رہا۔ جس سے حسد کیا جائے اسے دنیا میں بھی نفع حاصل ہوتا ہے، کیونکہ انسان کی اہم غرض یہ ہوتی ہے کہ وہ دشمنوں کو غم پہنچانا چاہتا ہے، جب حاسد اس کی نعمتوں کو دیکھ کر جلے گا، اور اسے غم لاحق ہوگا تو یہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگا کہ اپنے حاسد دشمن کو جلا رہا ہے۔

”ان العاقل لا یشتہی موت عدوہ بل یرید طول حیاتہ لیکون فی عذاب الحسد“

عقلمند شخص اپنے دشمن کی موت کی تمنا نہیں کرتا۔ بلکہ اس کی لمبی حیاتی کو چاہتا ہے۔ تاکہ وہ حسد کے عذاب میں مبتلا رہے۔

لامات اعداؤک بل خلدوا حتی یروا منک الذی یکمد
لازلت محسودا علی نعمۃ فانما الکامل من یحسد
تمہارے دشمن نہ مریں بلکہ ہمیشہ زندہ رہیں۔ یہاں تک کہ تمہاری نعمتوں کو دیکھ کر ان کی طبیعت میں جمود رہے۔

جس سے حسد کیا جائے ان کی نعمتیں قائم رہیں۔ تاکہ حسد کرنے والوں کا حسد کامل ہوتا رہے

”ان الحاسد یصیر مذموما بین الخلق ملعونا عند الخالق وهذا من اعظم المقاصد للمحسود“

بے شک حسد کرنے والا مخلوق کے ہاں مذموم (قابل مذمت) ہوتا ہے۔ اور خالق کے ہاں لعنت کا مستحق ہوتا ہے۔ لہذا جس سے حسد کیا جائے گا اسے عظیم مقصد حاصل ہو گیا کہ اس کی دشمن مخلوق کے ہاں مذموم اور خالق کے ہاں ملعون ہے۔

عمل سے حسد کا زوال:

ان الحاسد اذا اتى بضد موجبات الحسد على سبيل التكلف يصير ذلك بالآخره طبعاً له
فيزول الحسد عنه“

حسد کرنے والا جب حسد کے اسباب کے خلاف کام شروع کر دے اگرچہ ابتدائی طور پر تکلف سے وہ کام کرے گا لیکن آہستہ آہستہ وہ کام اسکی طبیعت میں راسخ ہو جائیگا۔ اور حسد کا زوال ہو جائیگا۔
واضح ہوا کہ حسد کے موذی مرض کی دواء علم اور عمل ہے۔ پہلے یہ پتہ چلے کہ حسد کے نقصانات کیا ہیں۔
پھر حسد کے اسباب کے خلاف محنت و مشقت کرے تو ان شاء اللہ حسد سے اسے نجات حاصل ہو جائیگی۔

(ماخوذ از کبیر، واحیاء العلوم)

آیہ کریمہ سے حاصل ہونے والے مسائل:

اہل کتاب مؤمنین کو ایمان سے ہٹانے کو پسند کرتے تھے، حالانکہ ان پر یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ ایمان صواب (درست) اور حق ہے۔

اور وہ بھی جانتے تھے کہ جو شخص حق پر ہوا سے حق سے پھیرنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس پر شبہات نہ ڈالیں جائیں۔ ”لان المحق لا يعدل عن الحق الا بشبهة“

شبہ وہ دو قسم کا ڈالتے تھے، ایک تو یہ کہ مسلمانوں کو کہنا تمہیں گھروں سے نکالا گیا ہے۔ تم پر معیشت تنگ ہے۔ یعنی مال و دولت کی تمہارے پاس کمی ہے۔ اور تم پر کفار کی جنگوں کا ہر وقت خوف مسلط رہتا ہے۔ لہذا ”فاتر کوا الایمان الذی ساقکم الی هذه الاشياء“ تم ایمان کو چھوڑ دو جس نے تمہیں ان چیزوں کی طرف پہنچایا ہے۔ اور وہ شبہات اس طرح پیش کرتے کہ نبی کریم ﷺ کے جو اوصاف اور علامات توراۃ میں بیان کئے گئے تھے۔ ان کو بدل دیتے تھے، اور آپ کے معجزات پر شکوک و شبہات پیدا کر کے لوگوں کو ایمان سے پھیرنے کی کوشش کرتے لیکن صحابہ کرام کو ایمان سے پھیرنا ان کی طاقت سے باہر تھا۔

﴿فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا﴾ (معاف کرو اور درگزر کرو) کا یہ مطلب نہیں کہ وہ تمہیں ایمان سے

پھیرنے کی کوشش کریں تو تم ان کے اس عمل کو پسند کر لو اس لئے کہ یہ کفر ہے۔

”ولا يجوز ان يأمرهم تعالى بالعفو والصفح على وجه الرضاء بما فعلوا لان ذلك كفر“

بلکہ اس کا مطلب یہ ہے۔ ”ان المراد ترك المقابلة والاعراض عن الجواب“

کہ تم ان سے مقابلہ کو چھوڑ دو، اور جواب دینے سے اعراض کر لو، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا حکم آ جائے۔

(پہلے وضاحت ذکر کی جا چکی ہے)۔

اعتراض: حسد کرنے والے کے دل میں نفرت پائی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ حسد کرتا ہے۔

جس شخص سے یہ حسد کر رہا ہے جب اس کے خلاف اس کے دل میں نفرت ہے۔ ”فهذا امر غير

داخل في وسعه فكيف يعاقب عليه“ تو اس پر عذاب کیسے ہوگا، دل میں پائی جانے والی چیزوں

پر تو بندے کو اختیار ہی نہیں۔

جواب: اس کی وسعت میں دو چیزیں پائی گئی ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ اس نفرت پر راضی ہے۔ لہذا دل

میں پائی جانے والی نفرت پر راضی ہونا جب اسی کے اختیار میں ہے تو اس وجہ سے یہ عذاب کا مستحق ہوگا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ اس نفرت کا اظہار دوسرے کے عیب بیان کر کے کرتا ہے، اور اس کی

نعمتوں کو زائل کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے، اور اس کی نعمت کے زوال کے اسباب کو پسند کرتا ہے، یہ

سب کچھ اس کے اختیار میں ہے۔ اسی پر عذاب مرتب ہوگا۔

(از کبیر)



﴿وَأَقِمْوَا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَمَا تُقَدِّمُوا لِأَنْفُسِكُمْ

مِنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِنْدَ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ﴾ (۱۱۰)

(۱) اور نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ دو اور اپنی جانوں کے لئے جو بھلائی آگے بھیجو گے اسے

اللہ کے یہاں پاؤ گے، بے شک اللہ تمہارے کام دیکھ رہا ہے۔

(۲) اور قائم رکھو نماز، اور روز کوٰۃ، اور جو آگے بھیجو گے اپنی جانوں کے لئے پالو گے

اسے اللہ کے ہاں، بے شک اللہ تمہارے عملوں کو دیکھنے والا ہے۔

اس سے پہلی آیت میں یہود کو معاف کرنے اور درگزر کرنے کا حکم دیا۔ جس میں غیر کی اصلاح مقصود تھی۔

اب اس آیہ کریمہ میں نماز ادا کرنے اور زکوٰۃ دینے اور ہر قسم کے نیکی کے کام کا حکم دے کر ان کو اپنے نفسوں کی اصلاح کا حکم دیا گیا۔ (از کبیر)

﴿وَأَقِمْوَا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ﴾ کے متعلق پہلے وضاحت ذکر ہو چکی ہے

﴿وَأَقِمْوَا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ﴾ عطف علی (فَاعْفُوا) کأنه تعالیٰ امرهم بالصبر والمخالقة واللجأ الی اللہ تعالیٰ بالعبادة والبر (بصاوی)

﴿وَأَقِمْوَا الصَّلَاةَ﴾ الخ کا عطف ہے (فَاعْفُوا) پر، گویا کہ اللہ تعالیٰ نے پہلی آیہ کریمہ میں ان کو صبر کرنے اور حسن خلق کا حکم دیا، اب اس آیہ کریمہ میں عبادت اور نیکی سے پناہ پکڑنے کا حکم دیا۔

”واقیموا الصلوة..... الخ“ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو عبادت پر براہیختہ کیا تاکہ قیامت کے دن ان کو نفع ہو، دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ کی ان کو امداد حاصل ہو، اور قیامت کے دن بھی رب تعالیٰ کی طرف سے ان کو نصرت حاصل ہو، قیامت کے دن اعمال نے ہی کام آتا ہے۔ اس دن کوئی عذر قبول نہیں ہوگا۔ (از ابن کثیر)

﴿وَمَا تُقَدِّمُوا لِأَنْفُسِكُمْ مِنْ خَيْرٍ﴾

(اور جو آگے بھیجو تم اپنے نفسوں کے لئے بھلائی کے کام)

”فان الخیر یتناول اعمال البر کلھا“ خیر کا لفظ نیکی کے تمام کاموں کو شامل ہے۔ خواہ وہ فرائض ہوں یا نوافل ہوں، نماز ہو یا صدقات ہوں، البتہ نماز اور زکوٰۃ کو علیحدہ ذکر کیا ہے اس پر تنبیہ کرتے ہوئے کہ یہ اللہ کے ہاں عظمت شان اور قدر میں بلندی رکھتی ہیں۔

نماز اللہ تعالیٰ اور اس کے بندے کے درمیان قربت کا ذریعہ ہے، جو تمام نیکی کے افعال کو جامع ہے۔ اور اس میں بہت ہی زیادہ خشوع اور خضوع (عجز و انکسار) پایا جاتا ہے۔ اور نماز میں اللہ تعالیٰ کے حضور قیام اور اس ذات کبریاء سے عاجز بندے کی مناجات پائی جاتی ہے۔ اور اسی نماز میں تمام باطنی اعضاء استعمال ہوتے ہیں۔ کیونکہ دل میں نیت پائی جاتی ہے۔ اور خلوص پایا جاتا ہے۔ اور رب تعالیٰ کا خوف پایا جاتا ہے۔ اور اس کی رضا پائی جاتی ہے۔ اور ذہن عقلی نماز میں رب تعالیٰ کی تعظیم اور تکریم کے لئے حاضر ہوتا ہے تاکہ اللہ کی نعمتوں کا ہر عضو شکر کر سکے۔ جتنی انسان کی وسعت ہوتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی عظمت کو بجالاتا ہے۔

اسی طرح زکوٰۃ قربة مالیہ ہے، اور اغنیاء اللہ تعالیٰ کا شکر یہ ادا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا میں مال عطاء کر کے اور اس کو ضروریات میں خرچ کرنے کی توفیق عطا کر کے اور لذت عیش عطا فرما کر اپنے فضل سے نوازا ہے تو وہ لوگ زکوٰۃ ادا کر کے رب تعالیٰ کا شکر یہ ادا کرتے ہیں۔ رب تعالیٰ کے حکم کو بجالا کر ایک فریضہ کو ادا کرنے کی ذمہ داری پوری کرتے ہیں بالخصوص اللہ تعالیٰ نے جب زمین کو تمام کے لئے مسخر کیا ہے۔ ﴿وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا﴾ اور زمین کی تمام چیزوں کو تمام کے نفع کے لئے بنایا، جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا﴾ پھر بعض لوگوں کو جب زیادہ نعمتیں عطاء ہوں تو ان کا شکر کرنا بھی ضروری ہوتا ہے۔

اور زکوٰۃ ادا کرنے میں تالیف قلوب بھی پائی گئی ہے۔ کیونکہ جس کو زکوٰۃ دی جائے گی اسکے دل میں دینے والے کیلئے الفت پائی جائے گی۔ اسی طرح ایک دوسرے پر اظہار شفقت و رحمت پایا جائیگا۔ اور زکوٰۃ کا ادا کرنا اللہ تعالیٰ کی رحمت کا ذریعہ ہے۔ ”فان الراحمین یرحمہم ارحم الراحمین“ کیونکہ رحم کرنے والوں پر ارحم الراحمین رحم کرتا ہے۔ (ماخوذ از شیخ زادہ)

تنبیہ :

علامہ رازی رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا ہے کہ نماز اور زکوٰۃ احکام فرضیہ ہیں، ان دو کا ذکر

عظمت شان کی وجہ سے کر دیا گیا، اور باقی فرضی عبادات ان کے ضمن میں آگئی ہیں۔ اور ﴿وَمَا تَقْدِمُوا لِأَنفُسِكُمْ مِنْ خَيْرٍ﴾ میں ”خیر“ سے مراد نفلی نمازیں اور نفلی صدقات ہیں۔

راقم کے نزدیک علامہ رازی رحمہ اللہ نے ”من خیر“ سے مراد ”التطوعات من الصلوٰۃ والزکوٰۃ“ جو ذکر کیا ہے اس سے مراد بھی یہ ہے کہ نفلی نمازوں اور صدقات کا ذکر ان کی عظمت شان کے پیش نظر کر دیا گیا باقی ہر قسم کی بھلائیاں ان کے ضمن میں آگئیں۔

راقم کے نزدیک تو یہ عظمت قرآن ہے کہ جب یہ بیان کرو کہ ”من خیر“ سے مراد ہر قسم کی نیکی کا کام ہے خواہ فرض ہو یا نفلی، خواہ نماز و زکوٰۃ ہو یا اس کے علاوہ، البتہ نماز اور زکوٰۃ کا ذکر ان کی عظمت شان اور رفعت قدر کے پیش نظر کر دیا گیا ہے۔

یابیوں بیان کیا جائے کہ نماز اور زکوٰۃ کا ذکر کر کے تمام فرائض کو ذکر کر دیا گیا۔ اور ”من خیر“ سے مراد نفلی نماز اور صدقات ذکر کر کے تمام نفلی نیکیوں کا ذکر کر دیا گیا ہے۔

حکمت : ”والحكمة الكلية في جميع ما انعم الله تعالى به على المكلفين في الدنيا ان يقدموه الى معادهم ويدخروه الى يومهم الآجل“

اللہ تعالیٰ نے مکلفین کو جو نعمتیں عطا کی ہیں ان تمام کا تقاضا یہی ہے کہ ان کو قیامت کے لئے آگے بھیجے، رب تعالیٰ نے پاؤں دیئے ہیں تو نیکی کے کاموں کی طرف ان سے چل کر جائے، غرضیکہ ہر عضو، ہر نعمت کو رب کی راہ میں لگا کر اپنی آخرت کو سنوارنے کا ذریعہ بنائے۔

☆ حدیث پاک میں ہے۔

”ان العبد اذا مات قال الناس ما خلف وقالت الملائكة ما قدم“

انسان جب فوت ہو جاتا ہے تو لوگ کہتے ہیں وہ پیچھے کیا چھوڑ کر گیا، اور فرشتے کہتے ہیں اس نے آگے کیا بھیجا، یعنی مرنے والے کے ورثاء مال کی فکر میں ہوتے ہیں لیکن فرشتے اس کے نیکی کے کاموں کو دیکھتے ہیں، جن پر اسے جزاء و خیر کا مستحق قرار دیا جاتا ہے۔

☆ عن عبد الله قال قال رسول الله ﷺ ”ايكم مال وارثه احب اليه من ماله“ قالوا يا رسول الله ما منا من احد الا ماله احب اليه من مال وارثه قال رسول الله ﷺ ”ليس منكم من احد الا مال وارثه احب اليه من ماله، مالک ما قدمت و مال وارثک ما اخرت“

(نسائی و مکذابی البخاری بالالفاظ المختلفة)

حضرت عبداللہ ﷺ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”تم میں سے کون سا شخص اپنے مال سے زیادہ اپنے وارث کے مال کو محبوب رکھتا ہے؟ صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم میں سے کوئی ایک بھی نہیں جسے اپنے مال سے زیادہ اپنے وارث کے مال سے محبت ہو (یعنی ہر شخص اپنے مال کو ہی پسند کرتا ہے) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں جسے اپنے مال سے زیادہ وارث کے مال سے محبت نہ ہو۔

تمہارا مال تو وہ ہے جو تم نے آگے بھیج دیا۔ اور جو تم نے پیچھے چھوڑا وہ تمہارے وارث کا مال ہے۔

☆ ”وعن عمر بن خطاب ؓ انه مر ببقیع الغرقہ فقال السلام علیکم اهل القبور اخبار ما عندنا ان نساء کم قد تزوجن و دور کم قد سکنت و اموالکم قد قسمت فاجابه هاتف یا ابن الخطاب اخبار ما عندنا ان ما قد مناہ وجدناہ ، و ما انفقنا فقد ربحناہ و ما خلفناہ فقد خسرناہ“

حضرت عمر بن خطاب ؓ جنت البقیع سے گزرے تو آپ نے فرمایا ”السلام علیکم اهل القبور“ اے قبروں والو تم پر سلام ہو۔ ہمارے پاس (تمہاری) خبر یہ ہے، کہ تمہاری بیویوں نے اور شادیاں کر لیں، اور تمہارے گھروں میں تمہارے ورثاء رہ رہے ہیں، اور تمہارے مال تقسیم کر لئے گئے ہیں۔

نبی آواز آپ کے پاس آئی، جس میں یہ جواب دیا گیا اے ابن خطاب ہمارے پاس (ہماری) خبر یہ ہے کہ جو ہم نے آگے بھیجا وہ ہم نے پالیا۔ اور جو ہم نے خرچ کر لیا اس سے ہم نے نفع اٹھالیا۔ اور جو ہم پیچھے چھوڑ آئے اس میں ہمیں خسارہ ہوا۔

قدم لنفسک قبل موتک صالحا . واعمل فلیس الی الخلود سبیل
اپنی موت سے پہلے اپنے لئے نیکی کے عمل کر لے۔ اور عمل کر لے یہاں تو نے ہمیشہ نہیں رہنا۔

قدم لنفسک توبہ مرجوۃ قبل الممات وقبل حبس اللسن

اپنے لئے توبہ کی قبولیت کی امید پر عمل آگے بھیج

موت کے آنے سے پہلے، اور زبان کے بند ہونے سے پہلے

ولدتک اذ ولدتک امک باکیا والقوم حولک یضحکون سرورا

فاعمل لیوم تکنون فیہ اذا بکوا فی یوم موتک ضاحکا مسرورا

جب تیری ماں نے تجھے جنا تو تو رو رہا تھا اور لوگ تیرے ارد گرد خوشی سے ہنس

رہے تھے۔

آج کچھ عمل کر لے کہ تیری موت کے وقت لوگ رورہے ہیں، تو خوشی سے ہنس رہا ہو۔

سابق الی الخیر وبادر به فانما خلفک ما تعلم

وقدم الخیر فکل امرئ علی الذی قدمه يقدم

نیکی کے کاموں میں سبقت کر اور اس کی طرف جلدی کر جو تو نے پیچھے چھوڑ جانا ہے اسے تو جانتا ہی ہے۔

نیکیاں آگے بھیج، ہر انسان نے جو آگے بھیجنا ہے اسی سے اس نے آگے بڑھنا ہے۔

اسعد بملک فی حیاتک انما یبقی وراءک مصلح و مفسد

و اذا ترکک لمفسد لم یبقه و اخوا الصالح قلیله یتزید

وان استطعت فکن لنفسک وارثا ان المورث نفسه لمسد

نیکی کی راہ میں اپنا مال اپنی زندگی میں خرچ کر لو، تمہارے پیچھے باقی رہنے والے کوئی نیک ہوں گے کوئی فسادی۔

جب تم نے اپنا مال فساد پھیلانے والوں کے لئے چھوڑا تو وہ ضائع ہو گیا۔ اور نیک لوگوں کو دیا ہوا قلیل مال بھی بڑھتا رہے گا۔

اگر تم طاقت رکھتے ہو تو اپنا وارث اپنے آپ کو ہی بنالو، جو اپنے آپ کو اپنا وارث بنا لیتا ہے وہ درست راہ پر ہوتا ہے۔

اس تمام بحث سے یہ واضح ہوا کہ اپنے لئے آگے بھیجی ہوئی نیکی نے ہی کام آنا ہے۔ جو مال اللہ

کی راہ میں اپنی زندگی میں خرچ کر لیا اس کا نفع حاصل ہوتا ہے۔ اسی کا خود وارث بنتا ہے۔ (از قرطبی)

”تجدوہ عند اللہ“ (پالو گے اسے اللہ کے ہاں) یعنی جو کام بھی نیکی کا تم نے کیا اس کا ثواب تم

اللہ کے ہاں پالو گے۔

یہاں یہ مطلب نہیں کہ تم وہ اپنے اعمال ہی پالو گے۔ عمل تو باقی نہیں رہتے۔ البتہ ان کا ثواب

(از کبیر)

حاصل ہونا ہے۔

﴿إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ﴾ (بے شک اللہ تمہارے عملوں کو دیکھنے والا ہے) یعنی تمہارے اعمال

کو رب تعالیٰ دیکھ رہا ہے۔ اس لئے تمہارا کوئی عمل ضائع نہیں جائے گا۔ خواہ وہ نیک عمل ہو یا برا۔ ہر عمل

(از کبیر)

﴿وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصْرًا ۚ
تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ ۚ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ﴾

(۱) اور اہل کتاب بولے ہرگز جنت میں نہ جائے گا مگر وہ جو یہودی یا نصرانی ہو یہ ان کی خیال بندیاں ہیں۔ تم فرماؤ لاؤ اپنی دلیل اگر سچے ہو۔

(۲) اور انہوں نے کہا ہرگز داخل نہیں ہوگا جنت میں سوائے اس کے جو یہودی ہو یا نصرانی، یہ رز وئیں ہیں ان کی۔ تم فرماؤ، لے آؤ تم دلیل اگر ہو تم سچے۔ (آیت ۱۱)

اس آیت کریمہ میں یہود و نصاریٰ کے کلام کو خلط ملط کرنے اور مسلمانوں کے دلوں میں شکوک و شبہات ڈالنے کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ کہ وہ کہنے لگے جنت میں تو صرف یہود جائیں گے۔ اور دوسرے فرقے کا دعویٰ تھا جنت میں صرف نصاریٰ جائیں گے۔ ان کا مطلب یہی ہوتا تھا کہ مسلمان اسلام سے پھر جائیں۔

(از کبیر)

شانِ نزول: نجران کے یہود و نصاریٰ کا ایک وفد نبی کریم ﷺ کے پاس آیا۔ وہ ایک دوسرے کی تکذیب کرنے لگے۔ یہود کہنے لگے کہ جنت میں صرف یہود جائیں گے۔ نصاریٰ کہنے لگے جنت میں صرف نصاریٰ جائیں گے۔ اگرچہ مقصد ہر فریق کا مسلمانوں کے دلوں میں مشکوک و شبہات ڈالنا تھا۔ تاہم ضمناً ہر فریق ایک دوسرے کی تکذیب بھی کر رہا تھا۔

﴿وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصْرًا﴾: (اور انہوں نے کہا ہرگز جنت میں نہیں داخل مگر وہ جو یہودی ہو یا نصرانی) یہاں یہ مطلب نہیں کہ یہود و نصاریٰ مجموعی طور پر یہ کہتے تھے کہ جنت میں ہم یہودی اور نصرانی جائیں گے۔ بلکہ یہودی صرف اپنے جنتی ہونے کے دعویدار تھے۔ اور نصرانی صرف اپنے جنتی ہونے کے دعویدار تھے۔

اس پر قریب ہی آنے والی آیت کریمہ شاہد ہے۔ ﴿وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصَارَىٰ عَلَىٰ شَيْءٍ وَقَالَتِ النَّصَارَىٰ لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلَىٰ شَيْءٍ﴾ یہود نے کہا نصاریٰ کسی چیز (کسی

(دین) پر نہیں۔ اور نصرائیوں نے کہا یہود کسی چیز (یعنی کسی دین) پر نہیں۔

اس سے واضح ہوا کہ ہر فریق دوسرے فریق کو بے دین سمجھتا تھا۔ لہذا یہود کا نصرائیوں کو جنتی کہنا کسی طرح بھی ثابت نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح نصاریٰ کا یہود کو جنتی کہنا بھی ثابت نہیں ہو سکتا۔ (از خازن)
(وقالوا) عطف علی (ود) والضمیر لاهل الكتاب من اليهود والنصارى “ (وقالوا) کا عطف ہے (ود) پر اور ضمیر ”اہل کتاب“ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اہل کتاب یہودی بھی ہیں اور نصرائی بھی ہیں۔
”ہودا او نصاری“ لف وشر مرتب ہیں۔ یعنی حاصل کلام یہ ہوا۔ ”وقالت اليهود والنصارى لن يدخل الجنة الا من كان هودا او نصارى“

لف وشر مرتب یہ ہوتا ہے کہ پہلے چند چیزوں کو ایک ساتھ ذکر کر دیا جائے۔ پھر چند چیزیں ذکر ہوں۔ پہلی کا تعلق پہلی سے ہو اور دوسری کا تعلق دوسری سے ہو۔ جیسا کہ یہاں ”وقالوا“ کی ضمیر ”اہل کتاب“ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اس سے مراد ”یہود اور نصاری“ ہیں۔ اب ”ہودا“ کا تعلق یہود سے ہو گیا۔ اور نصاریٰ کا تعلق نصاریٰ سے ہو گیا۔

اب معنوی طور پر مطلب یہ ہو گیا۔ ”وقالت اليهود لن يدخل الجنة الا من كان هودا وقالت النصارى لن يدخل الجنة الا من كان نصارى“ اور یہود نے کہا ہر گز جنت میں کوئی داخل نہیں ہوگا سوائے یہودیوں کے۔ اور نصاریٰ نے کہا ہر گز جنت میں کوئی داخل نہیں ہوگا سوائے نصرائیوں کے۔
(از بیضاوی و شیخ زادہ)

اعتراض: کان میں ضمیر جو اسم ہے وہ واحد ہے۔ اور خبر ”ہودا او نصاری“ جمع ہے۔ ”کان“ کا اسم واحد اور خبر جمع کیسے صحیح ہے؟

جواب: چونکہ لفظ ”من“ کا ذکر ہے۔ جو لفظی طور پر واحد ہے۔ لیکن اس کے معنی میں عموم پایا جاتا ہے، اس لئے معنوی طور پر جمع ہے۔ اسی وجہ سے اس کی دونوں حیثیتوں کا لحاظ کیا گیا ہے۔ (روح المعانی)
”ہودا“ فراء کے نزدیک اصل میں ”یہود“ تھا، یاء کو حذف کر دیا گیا۔ لیکن باقی حضرات کے نزدیک ”ہود“ جمع ہے۔ ”ہاند“ کی، جس کا معنی ”توبہ کرنا“ چونکہ یہود نے پچھڑے کی پوجا کے بعد توبہ کر لی تھی اس لئے ان کو ”ہود“ کہہ لیا گیا۔

”نصاری“ لفظ ماخوذ ہے ”نصرة“ سے جس کا معنی ہے، امداد کرنا۔ نصاری کا نام عیسیٰ علیہ السلام

(از شیخ زادہ و عزیز)

کی امداد کی وجہ سے نصاریٰ رکھ لیا گیا۔

﴿تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ﴾ (یہ ان کی آرزوئیں ہیں) امانی جمع ہے امانیہ کی۔ اصل میں امنویہ ہے

بروزن افعولہ جیسے اضحوکہ اور ”اعجوبة“ استعمال ہوتے ہیں۔ اور یہ لفظ ”التمنی“ سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے آرزو کرنا تمنا کرنا۔ (مدارک)

راقم نے اسی کے مطابق معنی کیا ہے، لیکن ”تِلْكَ الْاِمَانِي الْبَاطِلَةُ“ باطل آرزوئیں مراد ہیں، اسی وجہ سے اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ترجمہ کیا ہے۔ ”یہ ان کی خیال بندیاں ہیں“۔

تنبیہ: ”امنیہ“ کا معنی کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ وہ کلام جو واقع ہونے والی تقریر پر از روئے تمنا کے براہیختہ کرے۔ اور کبھی صرف تقدیر کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ کہا گیا ہے۔

ولا تقولن لشيء سوف افعله حتى تلاقى ما يمني لك الماني

تم ہرگز کسی چیز کے متعلق یہ نہ کہو کہ میں یہ کروں گا۔

یہاں تک تمہاری ملاقات تو اسی سے ہوتی ہے جو تمہاری تقدیر میں ہونا ہے۔

اور کبھی ”امنیہ“ کا معنی صرف تمنا کرنا ہے خواہ حق ہو یا باطل ہو، جس طرح اس آیت میں استعمال ہے

﴿تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ﴾ یہ جملہ معترضہ ہے، لیکن یہاں جملہ معترضہ کا یہ معنی نہیں کہ ایک جملہ نامکمل ہونے کے درمیان یہ واقع ہے، بلکہ یہاں یہ مطلب ہے کہ دو کلام میں جو معنوی طور پر متصل ہیں ان کے درمیان یہ جملہ واقع ہے۔ اور اس کا کوئی محل اعراب نہیں۔

دو کلاموں کے درمیان اتصال کیسے ہے؟ وہ یہ کہ نبی کریم ﷺ کو حکم دیا گیا کہ آپ ان کو فرمائیں

﴿قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ﴾ (تم دلیل لاؤ) دلیل تو دعویٰ پر لائی جاتی ہے۔ ان کا دعویٰ یہ تھا۔

﴿لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصْرِي﴾

اعتراض: جملہ معترضہ تو پہلے جملہ کی تاکید کے لئے آتا ہے۔ اس جملہ میں پہلے جملہ کی تاکید

کیسے پائی گئی۔

جواب: پہلا جملہ ہے ﴿وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصْرِي﴾ یہ ان کے من گھڑت اور باطل دعویٰ کی حکایت ہے۔ اور ”امانی“ کا معنی کبھی یہ بھی ہوتا ہے۔ ”لا ثبوت لہا“ اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ اب پہلے جملہ اور اس جملہ معترضہ کا مجموعی مفہوم یہ ہو گیا۔ ”قول لا دلیل علیہ غیر ثابت“ یہ ان کا ایسا قول ہے کہ جس پر کوئی دلیل نہیں اور نہ ہی یہ ثابت ہے۔ جیسا کہ کسی شاعر نے کہا:

من ادعی شیئا بلا شاهد لابد ان تبطل دعواه
جو شخص بلا دلیل دعویٰ کرے ضروری ہے کہ اس کا دعویٰ باطل ہو۔

(ماخوذ از شیخ زادہ)

قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ: ”فرما دو لے آؤ تم دلیل اگر تم سچے ہو“

”قل“ خطاب ہے نبی کریم ﷺ کو (قل) یعنی یا محمد، اے محمد آپ فرمادیں۔ (خازن)

اعلیٰ حضرت کئی مقام پر ”قل“ کا معنی کرتے ہیں۔ ”اے محبوب“ تو اس سے کئی جہلاء جل کر دھوکا میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ”اے محبوب“ کسی لفظ کا معنی نہیں۔ کاش ان کو پتہ ہوتا کہ یہ ”قل“ میں ضمیر کے مرجع کا ذکر ہے۔ ”ہاتوا“ میں مختلف احتمالات پائے گئے ہیں۔

(۱) ہاتوا اصل میں ”ہاتیوا“ ہے، امر ہے، اس کا فعل ”ہاتی یہاتی“ استعمال ہوتا ہے۔

اس کا معنی حاضر کرو، لاؤ۔ یہ قول ہے ابو حیان کا۔ اسی کو علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے پسند کیا ہے

(۲) دوسرا احتمال یہ ہے کہ ”ہاتوا“ اصل میں ”آتوا“ ہے۔ ہمزہ کو ”ہاء“ سے بدل دیا

گیا ہے۔ تفسیر ابی السعد اور عزیزی میں یہی قول ذکر کیا گیا ہے۔ (معنی وہی ہے حاضر کرو۔ لاؤ)

(از کبیر)

(۳) ”ہات صوت بمنزلة هاء فی معنی احضر“ ”ہات“ صوت ہے ”ہاء“ کی طرح معنی

وہی ہے حاضر کرو لاؤ یہ قول علامہ رازی رحمہ اللہ کا ہے۔

(از کبیر)

(۴) یہ اسم فعل ہے، امر کے معنی میں ہے۔ معنی وہی ہوگا ”لاؤ“ دوسرے اقوال کے ساتھ صاوی

میں یہ قول بھی مذکور ہے۔

راقم کے نزدیک یہ تمام احتمالات دراصل اس لفظ کے استعمال کے مختلف طریقے ہیں۔ یعنی ان تمام طریقوں پر یہ استعمال ہوتا ہے۔ اور ہر طریقہ درست ہے، کسی قول کو غلط کہنا غلط ہے۔
(برہانکم) البرہان الدلیل علی صحة الدعوی "دعویٰ کے صحیح ہونے پر جو دلیل لائی جائے اسے برہان کہا جاتا ہے۔

"برہان" یا تو مشتق ہے۔ "البرہ" سے، اور نون زائد ہے۔ اس صورت میں معنی ہوتا ہے۔ "قطع کرنا" دلیل بھی دعویٰ میں واقع ہونے والے شبہات کو منقطع کر دیتی ہے، اس لئے اسے برہان کہا جاتا ہے۔ اور بعض حضرات نے کہا ہے۔ "برہان" مشتق ہے۔ "البرہنة" سے، اس صورت میں نون اصلی ہوگا۔ معنی یہ ہوگا "بیان کرنا" چونکہ دلیل سے دعویٰ کو بیان کیا جاتا ہے۔ اس لئے اسے برہان کہا جاتا ہے۔

﴿إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ﴾ (اگر تم سچے ہو) جواب شرط محذوف ہے، ماقبل ﴿هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ﴾ اس پر دلالت کر رہا ہے کیونکہ محققین نحو یوں کے نزدیک جزاء شرط مقدم نہیں ہو سکتی شرط سے۔

اب مکمل مفہوم یہ ہو گیا۔ اے محبوب آپ فرما دو کہ اگر تم اپنے اس دعویٰ میں سچے ہو کہ جنت کے مستحق صرف ہم ہی ہیں تو اپنے دعویٰ پر دلیل لاؤ۔
(از روح المعانی)

یعنی اگر تم دلیل نہیں لا سکو گے تو تم اپنے دعویٰ میں جھوٹے ہو گے۔ جب وہ دلیل لانے سے عاجز آ گئے تو ان کا جھوٹا ہونا بھی واضح ہو گیا۔

گزشتہ سے پیوستہ:

اعتراض: ﴿تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ﴾ میں اشارہ ﴿وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ﴾ کی طرف ہے، ان کی یہ ایک آرزو ہے۔ "امانی" جمع کا صیغہ کیوں ذکر کیا گیا۔

پہلا جواب: "تِلْكَ" کا اشارہ صرف ایک چیز کی طرف نہیں بلکہ متعدد چیزوں کی طرف ہے۔ ایک تو ﴿مَا يَوْذُ الَّذِينَ﴾ الخ میں ذکر ہو چکا ہے کہ وہ چاہتے تھے مومنوں پر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت نازل نہ فرمائے۔

دوسری چیز ﴿وَدَّ كَثِيرٌ﴾ الخ، میں گذر چکی ہے کہ وہ چاہتے تھے کہ مومن کافر ہو جائیں۔

اور تیسری چیز اس آیت میں ذکر ہے کہ جنت میں صرف ہم داخل ہوں گے، مومن داخل نہیں ہوں گے۔ ان تمام چیزوں کی طرف اشارہ ہے کہ ان کی یہ تمام خواہشات باطل ہیں۔ (از کبیر)

دوسرا جواب: وہ اپنی ایک ہی آرزو کو بار بار دل میں لوٹاتے تھے۔ اس تکرار کی وجہ سے گویا کہ ان کی کئی آرزوئیں بن گئیں۔

تیسرا جواب: اگرچہ ان کی آرزو ایک ہی کیوں نہ ہو لیکن وہ اپنے باطل ہونے کی وجہ سے اس درجہ پر پہنچی ہوئی تھی کہ اسے جمع کا درجہ حاصل تھا، گویا کہ متعدد افراد اس میں پائے گئے

”وہذا من بدیع الاعجاز ونفائس البیان“ ان دونوں جوابوں سے قرآن پاک کا عمدہ اعجاز اور نفیس بیان سمجھ میں آتا ہے۔

چوتھا جواب: اگر اشارہ ﴿وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ﴾ کی طرف ہو تو پھر بھی بظاہر ایک چیز ہے، لیکن حقیقت میں متعدد چیزیں ہیں۔ ایک چیز یہود کا کہنا جنت میں صرف یہود داخل ہوں گے۔ اور دوسری چیز نصاریٰ کا کہنا جنت میں صرف نصاریٰ داخل ہوں گے، تیسری چیز ان کا کہنا جنت میں اور کوئی داخل نہیں ہوگا۔ یعنی مسلمان جنت میں داخل ہونے سے محروم ہوں گے۔

(از روح المعانی)

☆☆☆

﴿بَلَىٰ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِنْدَ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ (آیت ۱۱۲)

(۱) ہاں کیوں نہیں جس نے اپنا منہ جھکا یا اللہ کے لئے اور وہ نیکو کار ہے تو اس کا نیک بدلہ اس کے رب کے ہاں ہے۔ اور انہیں کچھ اندیشہ ہے اور نہ کچھ غم۔

(۲) ہاں کیوں نہیں جس شخص نے جھکا دیا اپنے آپ کو اللہ کے لئے اور وہ نیکو کار ہے۔ تو اس کے لئے اس کا اجر ہے اس کے رب کے ہاں۔ اور نہ خوف ہوگا ان کو اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں یہود اور نصاریٰ دونوں فریقوں کا رد فرمایا کہ وہ دونوں اپنے دعویٰ میں جھوٹے ہیں۔ ان کا دعویٰ تو یہ ہے کہ جنت میں ہرگز کوئی اور داخل نہیں ہوگا سوائے اس کے جو یہودی ہیں۔ یہ یہود کا قول تھا۔ اور نصاریٰ نے کہا سوائے نصرانیوں کے جنت میں کوئی اور داخل نہیں ہوگا رب تعالیٰ نے فرمایا جنت میں تو صرف وہ لوگ جائیں گے جنہوں نے اپنے آپ کو اللہ کے لئے جھکا دیا۔ اعتقاد اور اعمال اور اقوال ان کے صرف رب تعالیٰ کی رضا کے لئے ہوتے ہیں۔

واضح ہوا کہ پہلی قوموں میں بھی اور رسول اللہ ﷺ کی امت میں بھی وہی جنت کے مستحق ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کے مطیع ہیں۔ صرف زبانی دعویٰ کہ جنت کے مستحق ہم ہی ہیں یہ باطل ہے۔

بَلَىٰ : (ہاں کیوں نہیں) ”بلی“ نفی کے بعد ثبوت کے لئے آتا ہے۔ جیسا کہ یوم میثاق کو تمام اولاد آدم سے رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿الَسْتُ بِرَبِّكُمْ﴾ کیا میں تمہارا رب نہیں۔ تو اس کے جواب میں ﴿قَالُوا بَلَىٰ﴾ سب نے کہا ہاں کیوں نہیں۔ یعنی تو ہمارا رب ہے۔

اسی طرح یہاں بھی یہود و نصاریٰ کا کسی اور کے لئے جنت میں داخل ہونے کی نفی کرنے کو اللہ تعالیٰ نے ”بلی“ کہہ کر رد فرما دیا ہاں کیوں نہیں۔ یعنی جنت میں تو اور لوگ بھی داخل ہوں گے۔ خیال رہے کہ یہ مطلب جو بیان کیا ہے۔ اس میں اس ایک لفظ ”بلی“ سے یہود و نصاریٰ کا

روہو گیا، اب ”بلی“ پر وقف کرنا مستحسن ہوگا۔ اب آنے والا جملہ ﴿مَنْ أَسْلَمَ﴾ الخ علیحدہ ہوگا

ہاں اگر ﴿يَدْخُلَهَا﴾ کو محذوف مانا جائے، اور ﴿مَنْ أَسْلَمَ﴾ کو فاعل مانا جائے تو اس صورت میں ”بلی“ پر وقف درست نہیں ہوگا۔ بلکہ اب تمام کا ایک مفہوم ہوگا۔ جو آیہ کے ترجمہ کے بعد متصل ذکر کیا جا چکا ہے۔

مَنْ : میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ یہ شرطیہ ہو، اس صورت میں ﴿فَلَهُ أَجْرُهُ﴾ الخ ﴿جو اب شرط ہوگا اور فاء جزائیہ کہلائے گی۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ ”مَنْ“ موصولہ ہو۔ لیکن شرط کے معنی کو پھر بھی مستلزم ہے۔ اسی لئے خبر پر فاء آئی ہوئی ہے۔ یہ دراصل قرآن پاک کی عظمت ہے کہ ایک ایک لفظ کتنے کتنے معانی پر مشتمل ہے۔

(از بیضاوی و شیخ زادہ)

أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ : ”و معنی أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ“ ”اخلص فی دینہ للہ“ ایک معنی اس کا یہ ہے کہ جس نے اپنے دین میں اللہ تعالیٰ کے لئے خلوص رکھا۔

اور اس کا معنی یہ ہے۔ ”اخلص عبادتہ للہ“ جس نے اللہ کے لئے اپنی عبادت میں خلوص رکھا

اور اس کا معنی یہ ہے کہ جس نے اپنا منہ اللہ کے لئے جھکایا۔ البتہ ”وجه“ (منہ) کا ذکر کیوں

کیا، اس لئے کہ

”انه اشرف الاعضاء و مجمع المشاعر و موضع السجود و مظهر آثار الخضوع الذی هو من اخص خصائص الاخلاص“

کہ یہ تمام اعضاء سے اشرف ہے۔ اسی میں وہ تمام علامات پائی جاتی ہیں جن سے کسی کی پہچان

ہوتی۔ یہ سجدہ کا مقام ہے۔ اسی پر خشوع و خضوع کے آثار مرتب ہوتے ہیں۔ جو اخلاص میں سب سے

زیادہ مقصود ہے۔ یعنی خضوع سے ہی پتہ چلتا ہے کہ اس میں خلوص پایا گیا ہے۔

”فاذا جاء الانسان بوضع جبهه على الارض فى السجود فقد جاء بجميع اعضائه“

جب انسان اپنے منہ کو یعنی پیشانی کو زمین پر رکھے تو گویا کہ اس نے اپنے تمام اعضاء کو زمین پر

رکھ لیا۔

عمر بن نفیل نے کہا:

له الارض تحمل صخرا ثقلا

واسلمت وجهی لمن اسلمت

له المزن تحمل عذبا زلالا

واسلمت وجهی لمن اسلمت

اور میں نے اپنے منہ کو جھکا لیا اس ذات کے لئے جس کے لئے جھک گئی زمین جس نے بہت بھاری پتھر اٹھا رکھے ہیں۔

اور میں نے اپنے منہ کو جھکا لیا اس ذات کے لئے جس کے لئے بادل جھک گئے جنہوں نے میٹھا اور ٹھنڈا پانی اٹھا رکھا ہے۔

اعلیٰ حضرت نے ﴿اَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ﴾ کا معنی اسی قول کے مطابق کیا ہے۔ ”جس نے اپنا منہ جھکایا“

اس کا اور معنی یہ ہے۔ ”وذكر الوجه و اراد به نفس الشيء“ کبھی وجہ کا ذکر کیا جاتا ہے

لیکن اس سے مراد ذات ہوتی ہے۔ یعنی ”جس نے اپنے آپ کو جھکا لیا۔“

علامہ کاظمی رحمہ اللہ نے یہی ترجمہ کیا ہے۔ راقم نے وہی نقل کیا ہے۔

”اللہ“ ای خالصا للہ تعالیٰ لایشوبہ شرک فلا یکون عابدا مع اللہ غیرہ او معلقا رجاء بغیرہ“

”اللہ کے لئے“ کا مطلب یہ ہے کہ جس نے اپنے آپ کو خالص اللہ تعالیٰ کے لئے جھکایا، اس

میں شرک کا کوئی شائبہ نہ پایا جائے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور عبادت کا مستحق نہ سمجھے۔ اور اپنی امید

رب کے بغیر کسی اور پر اس طرح نہ رکھے کہ رب تعالیٰ کے مقابل ہو کر حقیقی طور پر کوئی اور بھی امداد کر سکتا

ہے۔ ہاں یہ عقیدہ رکھے کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی طاقت سے اسکے بندے بھی امداد کرتے ہیں۔

”وفی ذلک دلالة علی ان المرء لا ینتفع بعمله الا اذا فعله علی وجه العبادۃ فی

الاخلاص والقربة“

اور اسی سے یہ مسئلہ حاصل ہو گیا کہ انسان کو اپنے اعمال سے اس وقت تک فائدہ حاصل نہیں

ہوگا جب تک وہ کام بطور عبادت نہ کرے اور اس میں بھی خلوص پایا جائے اور رب تعالیٰ کے تقرب کا

اسے ذریعہ سمجھے۔

(ماخوذ از خازن و تفسیر ابی السعود و کبر)

اس کا اور معنی یہ ہے ”واما مجاز عن القصد لان القاصد للشیء مواجه له“ کہ وجہ کا

مجازی معنی قصد کرنا، کیونکہ کسی چیز کا ارادہ کرنے والے کو ”مواجهہ لہ“ کہا جاتا ہے۔ (روح المعانی)
قرطبی میں اس معنی کو سب سے زیادہ مختار سمجھا گیا ہے۔ اب مطلب یہ ہوگا۔ جس نے اللہ کی طاعت کا ارادہ کر لیا۔

وَهُوَ مُحْسِنٌ: (اور نیکو کار ہوا) ایک معنی احسان کا وہی ہے جس کا ذکر حدیث پاک میں ہے۔
”ان تعبد الله كأنك تراه فان لم تكن تراه فانه يراك“ کہ تو اللہ کی عبادت کرے گویا کہ تو اسے دیکھ رہا ہے۔ اگر تو اسے نہیں دیکھ رہا تو بے شک وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔ (از روح المعانی)

یہ جملہ حال ہے۔ یعنی معنی یہ ہوگا۔ ”والحال انه محسن في جميع اعماله التي من جملتها الاسلام المذكور و حقيقة الاحسان الاتيان بالعمل على الوجه اللائق وهو حسنه الوصفى التابع لحسنه الذاتى“

حال یہ ہے کہ وہ اپنے تمام اعمال اچھے کرے، ان تمام اعمال میں اپنے آپ کو رب کے حضور جھکانا بھی ہے۔

(بلکہ راقم کے نزدیک اپنے آپ کو رب کے حضور جھکانے سے ہی نیک اعمال اور درست اعتقاد حاصل ہوتے ہیں)

جب انسان اچھے اعمال کرتا ہے تو اسے حسن وصفی حاصل ہوتا ہے۔ یہ حسن وصفی درحقیقت حسن ذاتی کے تابع ہوتا ہے۔ جس کی اصل خلقت اور جبلت میں پاکیزگی ہوگی، اس کی عادات اور اس کے اعمال بھی پاکیزہ ہوں گے۔ پھر اسے وہ منصب حاصل ہوگا جس کا ذکر حدیث پاک میں ہے۔ جس کو اوپر روح المعانی کے حوالہ سے ذکر کیا جا چکا ہے۔ (ابو السعود)

فائدہ: عمل کے مقبول ہونے کی دو شرطیں ہیں۔ ایک یہ ہے کہ وہ عمل خالص اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے کیا جائے اور دوسرا یہ ہے کہ وہ شریعت کے مطابق ہو۔

اگر کوئی شخص عمل تو اللہ تعالیٰ کے لئے کرتا ہے لیکن وہ عمل شریعت کے مطابق نہیں تو وہ مقبول نہیں۔
☆ قال رسول الله ﷺ من عمل عملاً ليس عليه امر فهو رد“ (رواه مسلم من حديث عائشة)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے عمل کیا لیکن وہ ہمارے امر کے خلاف ہو تو وہ مردود ہوگا۔

اسی سے معلوم ہوا کہ اسلام میں ”رہبانیۃ“ نہیں۔ یعنی جوگیوں اور پادریوں کی طرح دنیا والوں سے کنارہ کش ہونا، ہمیشہ جنگل میں رہنا، نماز باجماعت کو ترک کر دینا اور انسانوں سے منہ موڑ لینا جائز نہیں۔ اگرچہ ان کاموں میں بظاہر اللہ تعالیٰ کی رضا مندی مقصود ہوتی ہے۔ لیکن نبی کریم ﷺ کی شریعت کے مخالف ہے۔ آپ کی اتباع کے خلاف ہے۔

آپ کے ارشاد کے خلاف ہے کیونکہ آپ نے فرمایا ”لا رہبانیۃ فی الاسلام“ اسلام میں رہبانیت نہیں۔

دوسری چیز عمل کی مقبولیت کے لئے یہ ہے کہ وہ کام خالص اللہ تعالیٰ کے لئے ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿فَوَيْلٌ لِلْمُصَلِّينَ ۖ الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ ۖ﴾ الَّذِينَ هُمْ يُرَآئُونَ ﴿تو خرابی ہے ان نمازیوں کیلئے جو اپنی نماز سے بھولے بیٹھے ہیں۔ اور وہ جو دکھاوا کرتے ہیں۔

(از اس کثیر)

تنبیہ: شریعت کے مخالف وہ کام ہے جو قرآن اور سنت کے مخالف ہو۔ وہ شریعت کے مخالف کام نہیں جو نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام نے نہیں کئے۔ بلکہ ہر نئے کام کے لئے ضابطہ خود نبی کریم ﷺ نے بیان فرمایا ہے۔

☆ ”قال رسول الله ﷺ من سن في الاسلام سنة حسنة فله اجرها واجر من عمل بها من بعده من غير ان ينقص من اجورهم شيء ومن سن في الاسلام سنة سيئة كان عليه وزرها ووزر من عمل بها من بعده من غير ان ينقص من اوزارهم شيء“ (مشکوٰۃ باب العلم)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جس شخص نے اسلام میں اچھا طریقہ ایجاد کیا اسے اس کا ثواب ملے گا، اور اس کے بعد جتنے لوگ اس پر عمل کریں گے ان کے مطابق بھی اس کو ثواب ملے گا۔ جب کہ ان عمل کرنے والوں کے ثواب میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔ اور جو شخص اسلام میں برا طریقہ رائج کرتا ہے، اس کو برے طریقہ کے رائج دینے کا گناہ ہوگا۔ اور جتنے لوگ اس پر عمل کریں گے ان کے مطابق بھی ایجاد کرنے والے کو گناہ ہوگا۔ جب کہ ان کے گناہوں میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔

اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ اسلام میں اچھا طریقہ ایجاد کرنا ناجائز نہیں۔ بلکہ مستحب ہے کیونکہ نیکوں کا سبب ہے۔ البتہ برا طریقہ رائج کرنا گناہوں کا سبب ہے اس سے بچنا ضروری ہے۔

یہ سوال نہایت لغو اور بے حقیقت ہے کہ اسلام کیا اس وقت مکمل نہیں تھا؟ اسلام مکمل ہی تھا، اسی لئے تو نبی کریم ﷺ نے خود ہی اپنی امت کے لئے ایک قانون اور ضابطہ پیش فرمادیا تا کہ اس قانون پر عمل کرنے والوں کو کوئی شخص غیر اسلامی شعار پر عمل کرنے کا طعنہ نہ دے سکے، بلکہ ایسا اعتراض علم شریعت سے بے خبری کی علامت ہے۔

﴿فَلَهُ أَجْرُهُ عِنْدَ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾

اس کیلئے اجر ہے اسکے رب کے ہاں اور کوئی خوف نہیں ان پر اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے۔

یعنی جن لوگوں نے اپنے آپ کو رب کے لئے جھکا دیا ایسے حال میں کہ وہ نیکو کار ہوئے ان کو ان اعمال کا ثواب حاصل ہوگا۔ اور ان کو آخرت میں کوئی خوف نہیں ہوگا۔ اور ان کے دنیا کے فوت ہونے کا کوئی غم نہیں ہوگا۔
(ازخازن)

فائدہ جلیلہ: ﴿أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ﴾ میں اپنے آپ کو رب تعالیٰ کے لئے جھکانے کا مقصد ہے کہ اخلاص سے اپنے آپ کو رب کے حضور جھکائے، اخلاص کو سمجھنے کے لئے چند مسائل کا سمجھنا ضروری ہے۔

پہلا مسئلہ: نیت کی فضیلت کے بیان میں، نبی کریم ﷺ نے فرمایا ”انما الاعمال بالنیات“ اعمال کا دار و مدار نیت پر ہے۔

اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”ان الله لا ينظر الى صوركم وانما ينظر الى قلوبكم ونياتكم“ بیشک اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں کو نہیں دیکھتا، بیشک وہ تو صرف تمہارے دلوں اور نیتوں کو دیکھتا ہے ان احادیث مبارکہ سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ نیت ایک اعلیٰ عمل کا نام ہے، جس پر تمام اعمال کا دار و مدار ہے۔

دوسرا مسئلہ : انسان کو جب یقین حاصل ہو یا غالب گمان ہو کہ اس کام میں میرا فائدہ ہے یا اس کام کی وجہ سے میری مصیبت ٹل جانی ہے، تو وہ اس کام کو کرنے کی طرف کامل میلان رکھتا ہے، اور چاہتا ہے کہ یہ کام کر لیا جائے۔ وہ شخص اس کام کے عدم سے وجود کو ترجیح دیتا ہے۔ اس کو ارادہ کہا جاتا ہے، اسی ارادہ کا نام نیت ہے۔ اس نیت کی وجہ علم یا غالب گمان یا اعتقاد ہوتے ہیں۔ پھر اس میں چار صورتیں ہیں۔

(۱) اس نیت و ارادہ کا باعث ایک چیز ہو، جس طرح انسان کا سامنا چانک ایک درندے سے ہو جائے، تو انسان درندے کو دیکھ کر اسی جگہ کھڑا ہو جائے۔ اس کھڑے ہونے والے فعل کا سبب صرف اس کا یہ اعتقاد ہے کہ بھاگنے میں کوئی نفع نہیں۔ اور بھاگنے کو چھوڑنے میں کوئی نقصان نہیں۔

اس نیت کا نام ہے خالصہ اور اس نیت کی وجہ سے کئے جانے والے کا نام ہے اخلاص۔

(۲) ایک کام کے کرنے کے دو مستقل سبب ہوں، ہر سبب علیحدہ علیحدہ مستقل طور پر تقاضا کرتا ہو کہ یہ فعل پایا جائے جیسا کہ ایک شخص سے اس کا فقیر دوست سوال کرے، یہ اس کی حاجت کو پورا کرے۔ اس کا رفیق ہونا بھی چاہتا ہے کہ اس کی امداد کی جائے اور اس کا فقیر ہونا بھی تقاضا کرتا ہے کہ اس کی امداد کی جائے۔ اس موافقت کا نام باعث ہے۔

(۳) کسی کام کے دو سبب ہوں لیکن علیحدہ علیحدہ دونوں مستقل نہ ہوں، بلکہ دونوں مل کر ایک سبب کی حیثیت ہوں، جیسا کہ والدین کا خدمت کے مستحق ہونا بوجہ والدین ہونے کے اور ان کے شفیق ہونے کے۔ والدین سے چونکہ شفقت جدا نہیں ہوتی۔ اس لئے یہ مجموعی طور پر سبب ہے کہ اولاد والدین کی خدمت کرے اس سبب کا نام ہے ”مشارکہ“۔

(۴) کسی کام کا ایک سبب ہو اور دوسرا اس کا معاون ہو، جیسے کوئی آدمی کسی نیکی کے کام کے لئے جاتا ہے اور وہاں اس کی ایسے لوگوں سے ملاقات ہو جائے جن کو دیکھنے سے اس پر وہ نیکی کا کام آسان ہو جائے اس سبب کا نام ہے ”معاونۃ“۔

تیسرا مسئلہ: نبی کریم ﷺ نے فرمایا ”نية المؤمن خير من عمله“ مومن کی

نیت اس کے عمل سے بہتر ہے۔ اس کا مطلب کیا ہے۔

اس میں کئی وجوہ بیان کی گئی ہیں۔ لیکن سب سے بہتر اور صحیح وجہ یہ ہے۔ نیت جب تک تمام انواع فتور سے خالی نہ ہو وہ نیت جازمہ (یقینی نیت) نہیں ہو سکتی۔

اور جب تمام قسم کے فتور سے نیت خالی ہوگی تو رکاوٹ اگر درپیش نہ آئے تو اس پر عمل کا پایا جانا ضروری ہوگا۔

”واذا كان كذلك ثبت ان النية لا تنفك البتة عن الفعل“ جب اس طرح ہوا تو ثابت ہو گیا کہ نیت فعل سے جدا نہیں ہوگی۔ ”فبدعى ان هذه النية افضل من ذلك العمل“ بے شک یہ نیت اس عمل سے افضل ہوگی، کیونکہ بغیر نیت کے یہ عمل ممکن ہی نہیں تھا۔

اصل میں مقصد تمام اعمال کا اللہ تعالیٰ کی معرفت سے دل کا منور ہونا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے ماسوا سے دل کا پاک ہونا مقصد عظیم ہے۔ اور یہ بھی واضح ہے کہ نیت دل کی صفت ہے، اور عمل دل کی صفت نہیں لہذا صفت قلب کی تاثیر زیادہ قوی ہے نسبت ظاہری اعضاء کے اعمال کے کیونکہ ان کا دل میں اتنا اثر نہیں جتنا خود دل کی صفات کا دل پر اثر ہے۔

”فلا جرم نية المؤمن خير من عمله“ اس لحاظ پر یقیناً مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہوگی۔

چوتھا مسئلہ: اعمال کی تین قسمیں ہیں۔

(۱) طاعات۔ (۲) معاصی۔ (۳) مباحات۔

معاصی: نیت کی وجہ سے گناہ کے افعال نہیں بدلتے، بلکہ وہ گناہ ہی ہوتے ہیں۔ کوئی جاہل یہ نہ سمجھے کہ نبی کریم ﷺ کے ارشاد ”انما الاعمال بالنيات“ کا مطلب یہ ہے کہ نیت سے معصیت طاعت بن جائے گی۔ نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ اگر کوئی شخص یہ سمجھے کہ غیر کا مال اس کی اجازت کے بغیر کسی فقیر کو دینے سے ثواب حاصل ہوگا۔ یہ غلط ہے۔ ایسا ممکن نہیں۔

کوئی یہ سوچے کہ حرام مال سے مسجد بنانے کا ثواب مل جائے گا۔ یہ باطل ہے۔ اس سے ثواب

طاعات: کا تعلق نیت سے ہے۔ اصل میں بھی اور فضیلت میں بھی۔

اصل میں طاعت کی نیت کا یہ مطلب ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کی نیت کرے اب نیت کا بھی ثواب ہوگا۔ اور اگر ریاء کاری کی نیت کرے تو معصیت ہوگی۔

فضیلت میں نیت کا یہ مطلب ہے کہ کثیر کاموں کی نیت سے نیکیاں زیادہ حاصل ہوں، جن کی وجہ سے فضیلت حاصل ہوگی۔ مثال کے طور پر ایک شخص مسجد میں بیٹھے، اس میں اعتقاد رکھے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا گھر ہے۔ پھر یہ ارادہ رکھے کہ اس میں نیک لوگوں سے ملاقات ہوگی۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

”من قعد فی المسجد فقد زار اللہ وحق علی المزور اکرام زائرہ“

جو شخص مسجد میں بیٹھا تحقیق اس نے اللہ تعالیٰ کی زیارت کی، جس کی زیارت کی جائے اس پر حق ہے کہ وہ زیارت کرنے والے کی عزت کرے۔ گویا کہ مسجد میں بیٹھنے والے کو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے عزت عطا فرماتا ہے۔

اور یہ کہ مسجد میں بیٹھنے والا ایک نماز کے بعد دوسری نماز کی انتظار میں ہوتا ہے۔ ”فیکون حال الانتظار کمن هو فی الصلوٰۃ“ نماز کی انتظار کرنے والا ایسا ہی ہوتا ہے۔ جیسے نماز ادا کرنے والا ہوتا ہے۔

اور یہ کہ مسجد میں بیٹھنے والے کو اعتکاف اور روزے کی حالت حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ کئی مشاغل سے اپنے آپ کو روک کر رکھے ہوئے ہے۔

اور یہ ہے کہ مسجد میں بیٹھے ہوئے شخص کو لوگوں سے گپ شپ، ہنسی مذاق سے اجتناب حاصل ہوتا ہے۔

مسجد میں بیٹھے ہوئے شخص کا کامل طور پر دل اللہ تعالیٰ کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے ماسوا کی طرف اس کی توجہ نہیں ہوتی۔ جو شخص مسجد میں ہوگا۔ یقیناً کسی نہ کسی کو اچھے کام کی نصیحت کرے

گا۔ برے کاموں سے روکے گا، تو اسے تعلیم اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ثواب حاصل ہوگا۔

اور فائدہ اسے یہ حاصل ہوگا کہ وہ دوسرے مسلمان لوگوں سے بھائی چارہ کی فضاء حاصل کرے گا۔ اور اسے یہ فائدہ ہوگا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے حیاء کرتے ہوئے گناہوں کو چھوڑ دے گا۔

یعنی بظاہر وہ صرف مسجد میں بیٹھا ہے، لیکن حقیقت میں وہ کئی نیک کاموں کی نیت سے کثیر فضیلتیں حاصل کر رہا ہے۔

مباحات: سائر المباحات ولا شیء منها الا ویحتمل نية او نيات یصیر بها من محاسن القربات فما اعظم خسران من یغفل عنها ولا یصرفها الی القربات

ہر مباح کام نیکی کی نیت سے مستحب اور قربت کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ جو شخص اس سے غافل رہے اور وہ مباح کام سے ثواب نہ حاصل کر سکے وہ بہت بڑے خسارے میں ہے۔

مثال کے طور پر انسان خوشبو استعمال کرے تو یہ مباح ہے نہ اس میں کوئی ثواب اور نہ گناہ، لیکن اگر خوشبو کو استعمال کرتے ہوئے دنیا کی لذات کو حاصل کرنے کا ارادہ کرے، اور کثرت مالی پر فخر کرے اور مخلوق کو دکھانا چاہے۔ اور یہ ارادہ کرے کہ عورتیں میری طرف میلان کریں تو خوشبو کا استعمال معصیت ہوگا۔

اور اگر یہ ارادہ کرے کہ خوشبو کا لگانا سنت ہے، اور اس سے بوز اکل ہوگی جو اللہ تعالیٰ کے بندوں کی اذیت کا سبب بنتی ہے۔ اور خوشبو لگا کر مسجد کی تعظیم کا ارادہ کرے تو یہ طاعت ہوگی۔

☆ واذا عرفت ذلک فقس علیہ سائر المباحات

جب تو نے اس ایک مثال کو سمجھ لیا تو اسی پر تمام مباحات کو قیاس کر۔

”والضابط ان کل ما فعلته لداعی الحق فهو العمل الحق، وکل ما عملته لغير الله فحلالها حساب وحرماها عذاب“

ضابطہ یہ ہے کہ ہر کام جس میں اللہ تعالیٰ کی رضا کی نیت ہو وہ کام حق ہے۔ اور وہ کام جس میں اللہ تعالیٰ کی رضا کو مد نظر نہیں رکھا گیا لیکن وہ کام گناہ والا نہیں تو حلال ہے، اور اگر گناہ والا ہے تو حرام ہوگا، جس پر عذاب ہوگا۔

پانچواں مسئلہ: صرف زبان سے کہنا کہ میں نیت کر رہا ہوں یا دل میں سوچنا کہ میں

نیت کر رہا ہوں، یہ حقیقت میں نیت نہیں، بلکہ نیت یہ ہے کہ نفس کو کسی کام پر براہیختہ کیا جائے۔

تا کہ اس کا میلان پایا جائے اس کام کی طرف جس کا کرنا مقصود ہو۔

جب تک کسی کام کی خواہش نہ پائی جائے اس وقت تک نیت بھی حقیقتہً نہیں پائی جائے گی۔

ایک آدمی نے سیر ہو کر کھانا کھایا ہوا ہے۔ وہ زبان سے کہے ”نویت ان اشتھی طعاما“ میں

کھانے کی خواہش کی نیت کرتا ہوں۔ یا دل میں یہی نیت کرے اسے نیت نہیں کہا جاسکتا، کیونکہ نیت تو وہ

ہے جو کام کرنے پر براہیختہ کرے۔

اگر نیت کا یہ حقیقی معنی سمجھ آئے تو کوئی جاہل نہیں کہہ سکے گا کہ نیت تو صرف دل سے ہوتی ہے

زبان سے نہیں۔ بہت واضح مسئلہ ہے کہ اگر نیت نے کام پر براہیختہ کیا تو وہ نیت ہے خواہ زبان سے ہو یا

دل سے، اور اگر کام پر براہیختہ نہ کیا تو وہ نیت نہیں خواہ زبان سے ہو یا دل سے ہو۔

چھٹا مسئلہ: لوگ مختلف قسم کی نیت کرنے والے ہیں۔ کوئی نیکی کا کام اس نیت پر کرتے ہیں

کہ جہنم کی آگ سے بچ جائیں۔ اور کوئی عبادت اس نیت سے کرتے ہیں کہ جنت حاصل ہو جائے۔

کامل لوگ۔ وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کی نیت کرتے ہیں۔ جب رب راضی ہوگا تو خود

بخود جنت بھی حاصل ہوگی۔ اور جہنم سے نجات بھی حاصل ہوگی۔ (از کبیر)

ان چھ مسائل کو جب انسان سمجھے گا تو اسی وقت کامل اخلاص سمجھ آئے گا، کہ کامل اخلاص کیا ہے

تنبیہ: پانچواں مسئلہ جو ذکر کیا گیا ہے اس پر تفسیر کبیر کی عبارت بھی مد نظر رہے۔

”اعلم ان الجاهل اذا سمع الوجوه العقلية والنقلية في انه لا بد من النية فيقول في نفسه

عند تدريسہ وتجارتہ نويت ان ادرس لله واتجر لله بظن ان ذلك نية وهيهات فذاک

حديث نفس او حديث لسان والنية بمعزل عن جميع ذلك انما النية انبعث النفس

وسيلها الى ما ظهر لها ان فيه غرضها اما عاجلا واما آجلا والميل اذ لم يحصل لم يقدر

الانسان على اكتسابه وهو كقول الشبان نويت ان اشتھی الطعام“ (کبیر)

مفہوم تقریباً ذکر کر دیا گیا۔ لفظی ترجمہ پیش نہیں کیا جاتا۔ عبارت کو آسان طریقہ سے

سمجھایا جاتا ہے۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصْرَىٰ عَلَىٰ شَيْءٍ ۖ وَقَالَتِ
النَّصْرَىٰ لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلَىٰ شَيْءٍ ۚ وَهُمْ يَتْلُونَ الْكِتَابَ ۚ
كَذَٰلِكَ قَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللَّهُ يَحْكُمُ
بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿١١٣﴾

(۱) اور یہودی بولے نصرانی کچھ نہیں اور نصرانی بولے یہودی کچھ نہیں، حالانکہ وہ کتاب پڑھتے ہیں، اسی طرح جاہلوں نے ان کی سی بات کہی تو اللہ قیامت کے دن میں فیصلہ کر دے گا جس بات میں جھگڑ رہے ہیں۔

(۲) اور کہا یہودیوں نے نہیں ہیں نصرانی کسی چیز (دین) پر۔ اور کہا نصرانیوں نے نہیں ہیں یہودی کسی چیز (دین) پر، حالانکہ وہ کتاب پڑھتے ہیں۔ اسی طرح کہا ان لوگوں نے جو علم نہیں رکھتے، مثل ان کی بات کے۔ تو اللہ فیصلہ فرمائے گا ان کے درمیان قیامت کے دن جس میں وہ اختلاف کر رہے ہیں۔

پہلی آیت میں دونوں یعنی یہود و نصاریٰ کے اقوال جو ایک دوسرے کے خلاف تھے ان کو جمع کر کے ذکر کیا، اس آیت میں ان کے اقوال کی تفصیل بیان کی جا رہی ہے کہ ہر فریق دوسرے کے متعلق کیا کہتا ہے۔ دونوں فریقوں میں سے ہر فریق دوسرے کے دین کا کیسے انکار کرتا ہے۔

مختصر مطلب : یہود اور نصاریٰ دونوں اہل کتاب تھے۔ یہود اپنے آپ کو موسیٰ علیہ السلام کا پیروکار کہتے تھے اور دعویٰ ان کا یہ تھا کہ ہمارا توراۃ پر ایمان ہے۔ اور نصاریٰ کا دعویٰ یہ تھا کہ ہمارا ایمان انجیل پر ہے اور ہم عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کو تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن ہر فریق دوسرے کو جھوٹا کہتا تھا، یہودی کہتے تھے کہ نصرانی کسی دین پر قائم نہیں، اور نصرانی کہتے تھے یہودی کسی دین پر قائم نہیں۔

حالانکہ دونوں فریق اپنے دعویٰ ایمانی میں بھی جھوٹے تھے۔ کیونکہ توراۃ میں انجیل کی تصدیق

پائی جاتی، اور انجیل تصدیق کر رہی تھی توراۃ کی۔ اگر یہود کا توراۃ پر ایمان ہوتا تو وہ انجیل کو بھی اللہ تعالیٰ کی کتاب تسلیم کرتے اور عیسیٰ علیہ السلام کو بھی اللہ تعالیٰ کا نبی مانتے۔ اور اگر نصاریٰ کا انجیل پر ایمان ہوتا تو وہ یقیناً موسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا نبی اور توراۃ کو اللہ کی کتاب مانتے۔

واضح ہوا کہ ہر فریق ان میں سے جھوٹا تھا اور اپنے دین پر بھی قائم نہیں تھا۔

اسی طرح مشرکین و کفار کے بعض گروہ دوسرے گروہ کو بے دین کہتے تھے کہ یہ تو کسی چیز پر قائم نہیں یہ جو دنیا میں اختلاف کر رہے ہیں قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان کے درمیان فیصلہ فرما دے گا۔ وہ فیصلہ یقیناً ہر ایک کے خلاف ہوگا کیونکہ ان تمام فریقوں میں سے کوئی بھی ایمان پر قائم نہیں خواہ یہودی ہو یا نصرانی۔ مشرکین ہوں یا مجوسی وغیرہا۔

کچھ تفصیل: آیہ کریمہ کا شان نزول وہی ہے جو پہلی آیت ﴿وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَن كَانَ هُودًا أَوْ نَصْرًی﴾ میں ذکر کر دیا گیا۔

مدینہ طیبہ کے یہود کے علماء اور نجران کے نصاریٰ کا ایک دوسرے سے مناظرہ ہوا۔ یہ ان کا مناظرہ نبی کریم ﷺ کے پاس تھا۔

”حتی ارتفعت اصواتهم فقال لهم اليهود ما انتم علی شی من الدین و کفروا بعیسی والانجیل وقالت لهم النصاری ما انتم علی شی من الدین و کفروا بموسی والتوراۃ فنزلت“ یہاں تک کہ ان کی آواز ایک دوسرے پر بلند ہونے لگی، یہود نے نجران کے عیسائیوں کو کہا تم کسی دین پر نہیں، اور انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل سے کفر کیا۔ اور نصاریٰ نے ان کو کہا تم کسی دین پر نہیں ہو، انہوں نے موسیٰ علیہ السلام اور توراۃ سے کفر کیا۔ اس وقت یہ آیہ کریمہ نازل ہوئی۔

(از معالم التنزیل)

تنبیہ: ”ولا شک ان المناظرۃ علی هذا الوجه لیست لاطہار الصواب بل

ہی مکابرة محضۃ“ (شیخ زادہ)

جب ایک دوسرے پر الزام تراشی مقصود ہو، ہر ایک فریق کی کوشش ہو کہ میری بات صحیح ہو یا غلط ہو، اسے ہی تسلیم کیا جائے تو اسے مناظرہ نہیں کہا جاتا کیونکہ مناظرہ میں درست راہ کو تلاش کرنا مقصود ہوتا ہے۔

اگر اظہارِ ضوابط مقصود ہی نہ ہو، بلکہ صرف جھگڑا اور شور و غل مقصد ہو تو اسے مجادلہ، اور مکابرہ تو کہا جاسکتا ہے۔ مناظرہ نہیں کہا جاسکتا۔ بات بات پر مناظرہ کا چیلنج کرنے والے درحقیقت جہلاء ہوتے ہیں۔ جو جاہل لوگوں میں سستی شہرت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

”اللہم انا نعوذ بک من المنافقین المجادلین“

علی شئی: کا ایک مطلب تو وہی ہے جو معالم التنزیل میں بیان کیا گیا ہے۔ ”ما انتم علی شئی من الدین“ تم دین کی کسی چیز پر نہیں ہو۔ اس کے مطابق راقم نے ترجمہ کیا ہے تاکہ طلباء کرام کو ایک وجہ یہ بھی سمجھ آ جائے۔

اور دوسرا معنی علامہ آلوسی اور علامہ رازی رحمہما اللہ نے بیان فرمایا ہے کہ اس میں عموم بہتر ہے یعنی مطلقاً ”شئی“ کی نفی پائی گئی ہے۔ ”فاذا نفی مطلقاً کان ذلک مبالغۃ فی عدم الاعتداد بما ہم علیہ و صار کقولہم ”اقل من لاشئی“

جب مطلق شے کی نفی ہوگی تو اس میں زیادہ مبالغہ پایا جائے گا کہ ہر فریق دوسرے کے متعلق کہتا تھا کہ وہ تو کچھ بھی نہیں کہ ان کا کوئی شمار کیا جائے۔ یہ کلام ایسے ہی ہے جیسے کہا جاتا ”اقل من لاشئی“ یہ تو لاشی سے بھی کم ہے۔ (اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی قول کے مطابق ہے) (از روح المعانی)

تنبیہ: اگرچہ یہ بات مدینہ طیبہ کے یہود اور نجران کے نصرانیوں کے درمیان ہوئی، لیکن عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری کے بعد سے ہی یہ اختلافات یہودیوں اور نصرانیوں کے درمیان آرہے تھے۔

كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ: اِیْ طَرَحَ كِهٰ اِنَّ لَوِیْطَیْنِ لَا یَعْلَمُوْنَ
جانتے ان کی بات کی طرح۔ یعنی بے علم لوگوں نے بھی یہود و نصاریٰ کی طرح ہی کہا۔

”الذین لا یعلمون“ سے مراد کون لوگ ہیں اور کن سے ان کی یہود و نصاریٰ کی بات تھی؟

اس میں مختلف وجوہ ہیں، جو تمام ہی مراد ہیں۔ ”یعنی مشرک کی العرب قالوا فی نبیہم محمد ﷺ واصحابہ انہم لیس علی شئی“ اس سے مراد مشرکین عرب ہیں کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کو کہا ”تم کسی معتبر دین پر نہیں۔“

”وقیل امم کانت قبل الیہود والنصاری مثل قوم نوح و ہود و صالح و لوط و شعیب قالوا

فی انبیائہم لیسوا علی شیء

اسی طرح یہود و نصاریٰ سے پہلے والی قوموں نے ایک دوسری قوم اور اس کے نبی کے متعلق کہا کہ یہ تو کسی معتبر دین پر قائم نہیں۔ یعنی نوح علیہ السلام اور ہود علیہ السلام اور صالح علیہ السلام لوط علیہ السلام اور شعیب علیہ السلام کی قوموں نے ایک دوسرے کے متعلق کہا یہ تو کسی چیز پر نہیں۔ (خارن)

اس سے مراد مشرکین عرب اور ان کے بغیر اور بت پرست لوگ ہیں، اور مجوسی، اور اسی طرح پہلے گزرے ہوئے کفار مراد ہیں۔ جب کہ ہر فریق نے دوسرے کی تکذیب کی، خواہ دوسرا فریق حق پر قائم ہی کیوں نہ تھا، یعنی پہلی امتوں میں سے ایمان رکھنے والے لوگوں کی تکذیب کفار ہر زمانہ میں کرتے رہے اور یہی کہتے رہے کہ یہ تو کسی چیز پر نہیں۔ (ار مطہری)

”ای الجہلۃ الذین لا علم عندهم ولا کتاب کعبۃ الاصنام والمعطلۃ قالوا لاهل کل دین لیسوا علی شیء وهذا توبیخ عظیم لہم حیث نظموا انفسہم مع علمہم فی سلک من لا یعلم“

اس سے مراد وہ جاہل لوگ ہیں جن کے پاس نہ علم تھا اور نہ کتاب جیسے بت پرست لوگ اور تعطیلیہ فرقہ، انہوں نے تمام دین والوں کے متعلق کہا یہ کسی معتبر دین پر نہیں۔ اس آیت کریمہ میں یہود و نصاریٰ کو ڈانٹ دی گئی کہ تم نے وہی ایک دوسرے کو کہا جو جاہل لوگ کہتے تھے، لہذا تم اہل علم ہونے کے باوجود جاہل لوگوں کی طرح کلام کر رہے ہو۔ (مدارک)

فَاللّٰهُ یَحْكُمُ بَيْنَهُمْ یَوْمَ الْقِیَمَةِ فِیْمَا كَانُوا فِیْهِ یَخْتَلِفُونَ :

تو اللہ فیصلہ کرے گا ان کے درمیان قیامت کے دن جس میں وہ اختلاف کر رہے ہیں۔ فیصلہ کرنے کا ایک مطلب یہ ہے کہ ہر فریق کی تکذیب فرمائے گا اور ان کو آگ میں داخل کر دے گا۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ تکذیب کرنے والے ظالم سے مظلوم جس کی تکذیب کی گئی ہے، کو انصاف دلائے گا۔ اور تیسرا مطلب یہ ہے کہ جن کو جنت میں داخل کرے گا ان کو بھی دوسرے دیکھ کر حسرت کر رہے ہوں گے۔ اور جن کو جہنم میں داخل کرے گا ان کو جنت والے ظاہر ظاہر دیکھ رہے ہوں گے، اور رب تعالیٰ کا شکر ادا کر رہے ہوں گے کہ ہمیں اس عذاب سے بچا لیا گیا۔

اور چوتھا مطلب یہ ہے کہ حق راہ پر چلنے والے اور باطل راہ پر چلنے والے فریق کے اختلاف میں فیصلہ فرمائے گا۔ (ار کبیر)

﴿وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسْجِدَ اللَّهِ أَنْ يُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ وَسَعَىٰ فِي خَرَابِهَا ۖ أُولَٰئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ أَنْ يَدْخُلُوهَا إِلَّا خَائِفِينَ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾ (آیت ۱۱۳)

(۱) اور اس سے بڑھ کر ظالم کون جو اللہ کی مسجدوں کو روکے ان میں نام خدا لئے جانے سے، اور ان کی ویرانی میں کوشش کرے، ان کو نہ پہنچتا تھا کہ مسجدوں میں جائیں مگر ڈرتے ہوئے ان کیلئے دنیا میں رسوائی ہے۔ اور ان کیلئے آخرت میں بڑا عذاب۔

(۲) اور کون شخص بڑا ظالم ہے اس سے جو منع کرے اللہ کی مسجدوں میں اللہ کا نام ذکر کئے جانے سے۔ اور وہ کوشش کرے ان کی ویرانی میں۔ ان لوگوں کے لائق نہیں کہ وہ داخل ہوں مسجدوں میں مگر ڈرتے ہوئے، ان کے لئے دنیا میں رسوائی ہے۔ اور ان کے لئے آخرت میں بڑا عذاب۔

شان نزول: نبی کریم ﷺ ہجرت کے چھٹے سال تقریباً ڈیڑھ ہزار صحابہ کرام کو ساتھ لے کر مدینہ طیبہ سے مکہ مکرمہ کی طرف عمرہ کرنے کی غرض سے روانہ ہوئے۔ لیکن جب آپ مقام حدیبیہ میں پہنچے تو مشرکین نے آپ کو عمرہ کرنے سے روک دیا۔ حضور ﷺ اور صحابہ کرام عمرہ کرنے کے بغیر ہی واپس آ گئے۔ تو یہ آیت کریمہ مشرکین مکہ کی مذمت میں نازل ہوئی۔

اس آیت کریمہ کے نزول سے پہلے ایک اور صورت بھی درپیش آ چکی تھی۔ وہ یہ ہے کہ جب بیت المقدس سے تبدیل ہو کر قبلہ کعبہ شریف بن گیا۔ تو یہود لوگوں کو کعبہ شریف کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرنے سے منع کرتے تھے۔ اس طرح گویا کہ وہ کعبہ شریف کو ویران کرنے میں کوشش کرتے تھے۔

آیت کریمہ کے نزول کی تو یہ دو ہی وجہ زیادہ واضح ہیں۔ البتہ آیت کریمہ اپنے مضمون کے لحاظ پر اور بھی وجوہ کو شامل ہے۔

”ان مشرکی العرب منعوا الرسول علیہ الصلوٰۃ والسلام عن الدعاء الی اللہ بمکة والحوہ الی الہجرة فصاروا مانعین له ولاصحابہ ان یدکروا اللہ فی المسجد الحرام“

مشرکین عرب نے رسول اللہ ﷺ کو مکہ مکرمہ میں دعوت الی اللہ (اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی طرف دعوت دینے) سے روک دیا تھا، آپ کو اور آپ کے صحابہ کرام کو ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا تھا، تو وہ مسجد حرام میں اللہ تعالیٰ کے ذکر سے روکنے والے تھے، ان کی مذمت بھی اس آیت کریمہ میں موجود ہے۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے گھر کے پاس مسجد بنائی جس سے آپ کو روک دیا گیا۔ آپ کو قریش کے بچے اور عورتیں ایذا پہنچاتے تھے۔ اس آیت کریمہ میں ان لوگوں کی مذمت بھی پائی گئی۔

☆ ”عن عبد اللہ قال بینما رسول اللہ ﷺ ساجد و حولہ ناس من قریش اذ جاءہ عقبہ بن ابی معیط بسلا جزور فقفہ علی ظہر رسول اللہ ﷺ فلم یرفع رأسہ فجاءت فاطمة فاخذتہ عن ظہرہ ودعت علی من صنع ذلک“

حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک وقت رسول اللہ ﷺ سجدہ فرما رہے تھے۔ آپ کے ارد گرد کچھ قریش کے لوگ تھے (سات کی تعداد میں تھے) عقبہ بن ابی معیط (دوسری روایت زیادہ صحیح یہ قرار دیا گیا کہ ولید بن عقبہ آیا) اور اوٹنی کی جیلی لا کر آپ کی پیٹھ پر رکھ دی۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا (جو اس وقت بچی تھیں) نے آ کر آپ کی پیٹھ سے جیلی کو ہٹایا۔ اور ان کے خلاف دعاء کی۔

یہ آیت کریمہ اپنے مضمون کے لحاظ پر اس واقعہ کو بھی شامل ہے کہ مشرکین نبی کریم ﷺ کے نماز پڑھنے میں رکاوٹ ڈالتے تھے۔

تنبیہ: سلا کا معنی او جری عوام میں زیادہ مشہور ہے، کئی مترجمین نے بھی او جری معنی کیا ہے۔ تاہم ”المنجد“ میں معنی جیلی ہی کیا گیا ہے۔ اور ”نوی شرح مسلم ج ۲ باب مالقی النبی ﷺ من اذی المشرکین والمنافقین“ میں مذکور ہے۔

”السلا بفتح السین و تخفیف اللام مقصور و هو اللفافة التي يكون فيها الولد في بطن الناقة وسائر الحيوان و هي من الآدمية مشيمة“

”سلا“ سین پر فتح ہے۔ اور لام مخفف اور مقصور ہے۔ یہ وہ پردہ ہے جس میں بچہ ہوتا ہے۔

اونٹنی اور باقی حیوانات کے پیٹ میں پایا جانے والا یہ پردہ ”سلا“ کہلاتا ہے۔ اور عورتوں کے پیٹ میں بچہ کا یہی لفافہ مشیمہ کہلاتا ہے۔ اردو میں اسے جیلی کہا جاتا ہے۔ اور پنجابی میں ”جیر“

”عن ابی ہریرۃ قال قال ابو جہل هل یعفر محمد وجهہ بین اظہر کم قال فقیل نعم قال واللات والعزی لئن رأیتہ یفعل ذلک لا طأن علی رقبته اولا عفرن وجهہ فی التراب قال فاتی رسول اللہ ﷺ وهو یصلی زعم لیطأ علی رقبته قال فما فجنہم منہ الا وهو ینکص علی عقبیہ ویبقى بیدیہ قال فقیل له ما لک قال ان بنی و بینہ لخنقہ من نار و ہولا واجنحہ فقال رسول اللہ ﷺ لو دنا منی لا ختطفته الملائکۃ عضوا عضوا“

(مسلم ج ۲ باب صفة القيامة والجنة والنار)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ ایک مرتبہ ابو جہل نے کہا کیا محمد تمہارے سامنے اپنے چہرے کو مٹی میں ملتے ہیں۔ (سجدہ کرتے ہیں) دوسرے لوگوں نے کہا ہاں۔ یہ کہنے لگا قسم ہے لات اور عزی کی اگر میں نے اسے ایسے کرتے ہوئے دیکھا تو اس کی گردن دبوچ دوں گا۔ اسی دوران نبی کریم ﷺ تشریف لے آئے اور نماز پڑھنے لگے۔ ابو جہل نے خیال کیا کہ آپ کی گردن دبوچ دے۔ ابھی آگے آیا ہی تھا کہ اچانک اٹنے پاؤں پیچھے بھاگے جا رہا ہے۔ اور اپنے ہاتھ مار مار کر اپنا بچاؤ کر رہا تھا۔ اس سے پوچھا گیا تمہیں کیا ہو گیا۔ وہ کہنے لگا میرے اور اس کے درمیان آگ کی ایک خندق تھی اور بہت بڑی ہولناکی تھی۔ اور کئی پر تھے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا اگر وہ میرے قریب آتا تو فرشتے اس کا ایک ایک عضو اٹھڑ دیتے۔

☆ آیت کریمہ اپنے مضمون کے لحاظ پر اس واقع کو بھی شامل ہے کہ ابو جہل نے نبی کریم ﷺ کو

مسجد حرام میں نماز پڑھنے۔ اور اللہ تعالیٰ کا نام لینے سے روکنے کی ناکام کوشش کی۔

☆ اسی طرح یہ آیت کریمہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اس روایت کو بھی اپنے مضمون کے

لحاظ پر شامل ہے۔ اگرچہ وہ واقعہ وجہ نزول نہیں۔ لیکن بیت المقدس سے لوگوں کو عبادت سے منع

کر کے اسے ویران کیا گیا۔

”وقال ابن عباس ان ملک النصارى غزا بیت المقدس فخر به والقی فیہ الجیف وحاصر

اہلہ و قتلہم و سبى البقية و احرق التوراة و لم یزل بیت المقدس خرابا حتی بناہ اہل الاسلام فی زمن عمرؓ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ نصرانیوں کے بادشاہ طیطوس بن اسیانوس رومی نے جنگ کر کے بیت المقدس کو خراب کر دیا۔ اور اس میں مردہ جانور ڈال دئے۔ اور اس شہر میں رہنے والوں کا محاصرہ کر لیا۔ اور ان کو قتل کر دیا اور کچھ کو قید کر لیا۔ اور توراة کو جلا ڈالا۔ اسی طرح بیت المقدس کی حالت رہی یہاں تک کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اسی علاقہ کو فتح کر کے بیت المقدس کو تعمیر کیا گیا۔

☆ بخت نصر کے زمانہ میں بھی بیت المقدس کو خراب کیا گیا، لوگوں کو اس میں عبادت سے روکا

گیا۔ لہذا یہ آیت کریمہ اپنے مضمون کے لحاظ پر اسے بھی شامل ہے۔ (از کبیر صغیر و نصیر)

اس آیت کریمہ کا قبل سے تعلق بیان کردہ بحث سے واضح ہو گیا۔ کیونکہ پہلی آیت میں یہود اور نصاریٰ اور مشرکین کا ذکر کیا کہ وہ ایک دوسرے کو بے دین کہتے تھے۔ اس آیت کریمہ میں بھی ان کا ہی ذکر ہے کہ وہ مساجد کو ویران کرنے کی کوشش میں رہتے ہیں۔ اور مساجد میں اللہ تعالیٰ کا نام لینے والوں کو روکتے ہیں۔

(از کبیر)

اعتراض: جب شان نزول سے پتہ چلا کہ مشرکین نے مسجد حرام سے اللہ تعالیٰ کا نام لینے سے منع کیا، تو ﴿مَسَاجِدَ اللَّهِ﴾ جمع ذکر کرنے کی کیا وجہ ہے؟

جواب: اگرچہ آیت کریمہ کے شان نزول کے لحاظ پر ایک مسجد حرام ہے ”لکن المراد بہ کل المساجد“ لیکن حکم کے لحاظ پر تمام مساجد کا یہی لحاظ ہے۔

دوسرا جواب: اگر نزول کے لحاظ پر ایک مسجد کا ہی اعتبار کیا جائے تو پھر بھی مسجد حرام کی فضیلت کے پیش نظر جمع ذکر کر دیا گیا۔ جیسا کہ کوئی شخص کسی ایک نیک شخص کو اذیت (تکلیف) پہنچائے تو یہ کہا جائے۔ ﴿وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ آذَى الصَّالِحِينَ﴾ اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے جو نیک لوگوں کو ایذا پہنچاتا ہے۔ لیکن یہ بھی خیال رہے کہ حکم پھر بھی عام رہی رہے گا۔ تمام مساجد میں اللہ تعالیٰ کے ذکر سے منع کرنے کا یہی حکم ہے کہ وہ روکنے والا شخص بہت بڑا ظالم ہوگا۔

وَمَنْ أَظْلَمُ : میں استفہام انکاری پایا گیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی مساجد میں ذکر سے منع کرنے والے سے کوئی بڑا ظالم نہیں ہو سکتا۔

تنبیہ : یہاں مطلقاً ظلم کا ذکر ہے۔ تمام ظلموں سے بڑھ کر ظلم یہی ہو اور کوئی ظلم بڑا نہ ہو یہ مراد نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ﴾ بے شک شرک ظلم عظیم ہے۔ اسی طرح زنا اور کسی نفس کو قتل کرنا بھی بہت بڑا ظلم ہے۔ یا تو یہی کہا جائے کہ یہ کلام بامحاورہ ہے۔ مطلب یہ ہے مساجد سے روکنا بڑا ظلم ہے۔ شرک بڑا ظلم ہے۔ زنا بڑا ظلم ہے۔ کسی نفس کو ناحق قتل کرنا بڑا ظلم ہے۔

یہ کہا جائے۔ ”انہ عام دخله التخصیص فلا یقدح فیہ“ کہ اگرچہ مساجد میں ذکر سے روکنے کو عام کر کے ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن مراد عام مخصوص البعض ہے۔ لہذا شرک اور زنا اور ناحق کسی کو قتل کرنا اس سے بھی بڑا ظلم ہے۔

(از کبیر بزیادہ)

انہ، یَذْکُرُ فِیْہَا اسْمُہُ : ملحوظ رہے کہ یہاں ذکر سے وہی ذکر مراد ہے جس کا تعلق اذان، نماز یا اذکار حسنہ سے ہو۔ جہر شدید کے ساتھ ذکر کرنا جو کسی نمازی یا دوسرے عبادت گزار کے لئے موجب تشویش ہو ہرگز جائز نہیں۔ ایسے جہر شدید سے روکنا ضروری ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے شدت جہر سے صحابہ کرام کو روکا ہے، ارشاد فرمایا

”اربعوا علی انفسکم فانکم لاتدعون اصم ولا غائبا“ (بخاری ص ۴۲۰)

یعنی تم جہر میں اتنی شدت اختیار نہ کرو، اپنی جانوں پر نرمی کرو، کیونکہ تم کسی بہرے یا غائب کو نہیں

(العبان للکاظمی)

پکار رہے۔

خیال رہے کہ مطلقاً بلند آواز سے ذکر منع نہیں۔ اور نماز کے بعد بھی بہت زیادہ بلند آواز سے ذکر کرنا منع ہوگا۔ جبکہ نمازیوں کو تکلیف ہو۔ معمولی آواز سے ذکر کرنا مستحسن ہے۔ راقم کی کتاب ”نماز کے بعد بلند آواز سے ذکر، اور دعاء مستحب ہے۔“ کا مطالعہ کریں۔

مخفی نہ رہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ذکر اللہ تعالیٰ کے ذکر سے جدا نہیں۔ درود شریف، کلمہ شہادت، اذان اور نماز میں اللہ کے ذکر کے ساتھ حضور ﷺ کا ذکر شامل ہے۔ حضور کے ذکر کے بغیر نہ اذان ہوگی، نہ درود، نہ کلمہ شہادت، نہ نماز، اللہ اور رسول دونوں کے ذکر سے مسجدیں آباد ہوتی ہیں، معلوم ہوا کہ ذکر رسول ﷺ سے روکنا بھی مسجدوں کو ویران کرنا ہے۔
(التبیان للکاظمی)

وَسَعَىٰ فِي خَرَابِهَا : (اور کوشش کرتا ہے ان کو ویران کرنے کی)

اس سے مراد صرف مساجد کو شہید کرنا نہیں، بلکہ عام ہے کہ ہر وہ کام، ہر وہ قول، ہر وہ طریقہ جو نمازیوں کو مسجد میں آنے سے روکے وہی مسجد کو ویران کرنے کا سبب ہے۔ لیکن اس سے یہ مراد نہیں کہ امام اگر یہ کہے رشوت حرام ہے۔ شراب حرام ہے۔ جو احرام ہے۔ سود حرام ہے تو لوگ ناراض ہو جائیں، کسی قسم کی حق بات کرنے سے لوگ ناراض ہوتے ہوں تو ہوتے رہیں۔

أُولَٰئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ أَنْ يَدْخُلُوهَا إِلَّا خَائِفِينَ :

اس کلام کے کئی مطالب ہیں۔ یعنی ایک جملہ کئی معانی کو شامل ہے۔

(۱) ظاهر الکلام ان الذین آمنوا وسعوا فی تخریب المسجد هم الذین یحرم علیہم دخوله الا خائفین

بظاہر مطلب یہ ہے کہ بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور کوشش کی مسجد کو ویران کرنے کی، ان لوگوں کو مسجد میں داخل ہونا حرام ہے سوائے اس کے وہ اللہ تعالیٰ کا خوف کرتے ہوئے داخل ہوں۔

(۲) ”ما کان ینبغی لہم ان یدخلوا مساجد اللہ الا خائفین علی حال الہیۃ وارتعاد الفرائض من المؤمنین ان یبطشوا بہم فضلا ان یستولوا علیہا و یمنعوا المؤمنین منها“

اللہ تعالیٰ کی مساجد میں اس کے ذکر سے روکنے والے کفار کے متعلق ہے کہ انہیں حق نہیں پہنچتا کہ وہ اللہ کی مساجد میں داخل ہوں۔ سوائے اس کے کہ ان پر ہیبت طاری ہوگی، مومنوں سے ڈرتے ہوئے ان کے کندھے کانپ رہے ہوں گے کہ یہ ہمیں پکڑ نہ لیں۔ چہ جائیکہ کہ یہ کفار مساجد کے متولی

بن بیٹھیں اور مؤمنوں کو ان مساجد سے روکنا شروع کر دیں۔

مطلب واضح ہوا کہ انہیں حق تو نہیں پہنچتا، اور زیادہ طور پر مسلمان اپنی مساجد کے امور کے خود ہی متولی ہوتے ہیں۔ اور کفار مساجد میں دخل اندازی سے ڈرتے ہیں۔ ہاں کبھی وہ اپنی سرکشی اور وقتی غلبہ کی وجہ سے مساجد میں تسلط جما بیٹھتے ہیں تو مسلمانوں کو مساجد میں اللہ تعالیٰ کے ذکر سے روکتے ہیں۔

(۳) اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں کو اس آیت کریمہ میں بشارت دی گئی ہے کہ عنقریب مسجد حرام اور دوسری مساجد پر مسلمانوں کو ہی غلبہ حاصل ہوگا۔ اور کفار و مشرکین کو ذلت حاصل ہوگی۔ یہاں تک کہ مسجد حرام میں کوئی ایک ان میں سے داخل نہیں ہو سکے گا۔ سوائے اس کے کہ وہ ڈر رہا ہوگا کہ کہیں مجھے پکڑ کر سزا نہ دی جائے، یا یہ کہ اگر میں نے اسلام قبول نہ کیا تو مجھے کہیں قتل ہی نہ کر دیا جائے۔

”وقد انجز الله صدق هذا الوعد فممنعهم من دخول المسجد الحرام و نادى نبيهم عام حج ابو بكر ؓ (الا لا يحجن بعد العام مشرك)

تحقیق اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدہ کو پورا فرما دیا کہ مشرکین کو مسجد حرام میں داخل ہونے سے منع کر دیا گیا اور جس سال حضرت ابو بکر ؓ کی زیر قیادت حج کیا گیا اسی سال اعلان کر دیا گیا خبردار اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کرے گا۔

”وامر النبي ؐ باخراج اليهود من جزيرة العرب“ اور نبی کریم ؐ نے حکم فرمایا یہود کو جزیرہ عرب سے نکال دینے کا، یعنی یہود کو کبھی جزیرہ عرب میں داخل نہ ہونے دینا۔

حضرت ابو بکر ؓ کے زیر قیادت کئے جانے والے حج کے دوسرے سال ہی نبی کریم ؐ کی زیر قیادت اور آپ کی معیت میں حج کیا گیا، اس وقت مسجد حرام اور تمام باقی مساجد پر مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہو گیا۔

”لا يجترئ احد من المشركين ان يحج ويدخل المسجد الحرام“

اس کے بعد کسی مشرک کو جرأت حاصل نہ ہو سکی کہ وہ حج کرے اور مسجد حرام میں داخل ہو۔

(۴) اگرچہ بظاہر یہ کلام خبری ہے لیکن معنی انشاء ہے۔ اس میں نہی پائی گئی ہے۔ ان کو منع کر دیا گیا کہ تم اللہ کی مساجد میں داخل نہ ہونا سوائے خوف رکھنے کے، یعنی اسلام لانے اور اللہ تعالیٰ کا خوف رکھنے کے بعد داخل ہو سکو گے۔

لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ : (ان کو دنیا میں رسوائی ہوگی) اس رسوائی سے مراد یہ ہے کہ ان کو ایسی ذلت حاصل ہوگی جو مساجد میں داخل ہونے سے ان کے لئے مانع ہوگی۔ اور یہ کہ کفار نے اگر مسلمانوں کے ملک میں رہنا ہو تو جزیہ دے کر رہیں۔

یعنی ان پر جزیہ مقرر کیا جانا ان کے لئے باعث ذلت ہوگا۔ اور یہ کہ کفار کو جنگ میں قتل کر دینے کے حکم سے ان کی ذلت ہوگی۔ یعنی ہر قسم کی ذلت کا ان کو سامنا کرنا پڑے گا۔

”ان الخزی لای کون الا ما یجری مجری العقوبة من الهوان والاذلال“ یعنی ہر طرح کی رسوائی اور ذلت کے حاصل ہونے کو ”خزی“ کہا جاتا ہے۔

یعنی ان کو رسوائی عطاء کر کے دراصل اللہ تعالیٰ کی طرف سے کفر پر قائم رہنے سے جھڑکا جاتا ہے کہ ابھی تمہارے لئے سوچنے کا موقع ہے کہ تم ایمان لے آؤ تا کہ اخروی دائمی عذاب سے بچ جاؤ۔

وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ : (اور ان کے لئے آخرت میں بڑا عذاب ہوگا) اللہ تعالیٰ نے جب ان لوگوں کے بڑے ظلم کو ذکر کیا کہ مساجد کو ویران کرنے اور اللہ تعالیٰ کے ذکر سے مساجد میں روکنے کی وجہ سے وہ بڑے ظالم ہیں۔ ”فین انہم یتحقون العقاب العظیم“ تو بیان فرمایا کہ وہ بڑے عذاب کے مستحق ہوں گے۔ (ارکبیر)

فائدہ : ”لایجوز نقض المسجد ولا بیعہ ولا تعطیلہ وان خربت المحلۃ“ کسی مسجد کو گرانا، کسی مسجد کو بیچنا اور کسی مسجد کو معطل چھوڑنا جائز نہیں، اگرچہ محلہ برباد بھی کیوں نہ ہو جائے۔

”ولا يمنع بناء المساجد الا ان يقصدوا الشقاق والخلاف“ مساجد کی تعمیر سے کسی کو نہ منع کیا جائے، ہاں اگر کوئی فتنہ و فساد اور اختلاف پیدا کرنا چاہے تو منع ہوگا ایسی مسجد کو بنانا۔
یعنی اگر ایک مسجد کے متصل ہی دوسری مسجد بنالی جائے۔ مقصد صرف لڑائی جھگڑا ہو۔ تو دوسری مسجد بنانے والے ثواب کے بجائے گناہ حاصل کر رہے ہیں۔
(از قرطبی)

اگر ایک مسجد میں دو امام اس غرض سے مقرر کر دئے جائیں کہ ان کی آپس میں لڑائی ہوتی رہے۔ مسجد کا نظام ایک تماشا دکھائی دے تو دوسرے امام کا مقرر کرنا جائز نہیں ہوگا۔ دوسرا امام درحقیقت امام نہیں ہوگا شیطان ہوگا۔ ہاں اگر ایک امام ہو۔ دوسرا نائب اور معاون ہے بغیر کسی فتنہ و فساد کے نظام چلائے تو درست اقدام ہے۔

مساجد کی انتظامیہ کے لوگ اگرچہ کئی نیک بھی ہوتے ہیں۔ لیکن زیادہ طور پر ائمہ مساجد پر اپنا تسلط قائم رکھنے، ان کو محکوم سمجھنے، کسی اور نمازی کی رائے کو کوئی فوقیت نہ دینے، اپنے فیصلوں کو زبردستی ٹھونسنے کی وجہ سے ثواب سے بھی محروم رہتے ہیں، اور گناہ ہی حاصل کرتے ہیں۔

جب راولپنڈی (پاکستان) میں حکومت کی جانب سے مساجد کو شہید کر کے سڑکوں کو کشادہ کیا جانے لگا، مساجد کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جانے لگا۔ مساجد کی انتظامیہ اور ان کے اماموں سے سودا کیا جانے لگا تو راقم نے ایک رسالہ ”مسجد اور اس کے احکامات“ تحریر کیا فائدہ کے لئے اسے یہاں شامل کیا جا رہا ہے۔

☆☆☆

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ﴿

﴿ مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِينَ أَنْ يَعْمُرُوا مَسْجِدَ اللَّهِ شَاهِدِينَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ أُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ وَفِي النَّارِ هُمْ خَالِدُونَ ﴾ ☆ إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسْجِدَ اللَّهِ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ
وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَلَمْ يَخْشَ إِلَّا اللَّهَ فَعَسَىٰ أُولَٰئِكَ أَنْ يَكُونُوا مِنَ الْمُهْتَدِينَ ﴿

مشرکوں کو نہیں (حق) پہنچتا کہ اللہ کی مسجدیں آباد کریں، خود اپنے کفر کی گواہی دے کر۔ ان کا تو سب کیا دھرا اکارت (ضائع) ہے۔ اور وہ ہمیشہ آگ میں رہیں گے۔ اللہ کی مسجدیں وہی آباد کرتے ہیں جو اللہ اور قیامت پر ایمان لاتے اور نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں۔ اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے تو قریب ہے کہ یہ لوگ ہدایت والوں میں ہوں۔

عمارة المسجد ؟

مسجد کی ”عمارة“ کے دو مطلب ہیں، ایک یہ کہ مسجد میں زیادہ سے زیادہ وقت عبادت کے لئے گزارنا، اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ مسجد کی تعمیر کرنا۔ اگر یہ دوسرا معنی لیا جائے تو آیہ کریمہ کا مطلب یہ ہوگا کہ کافروں کے لئے لائق نہیں کہ وہ مساجد کی تعمیر و مرمت کریں۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔

(۱) کفار و مشرکین کو تعمیر مسجد کا حق اس لئے نہیں پہنچتا کہ مساجد عبادت کے لئے بنائی جاتی ہیں اس لئے ضروری ہے کہ ان کی تعظیم کی جائے لیکن کافر تو مساجد کی بے حرمتی کرتے ہیں ان کی تعظیم نہیں کرتے۔

(۲) اور وجہ یہ ہے کہ کافر ناپاک ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی اس پر واضح طور پر دلالت کر رہا ہے ﴿ إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ ﴾ یقیناً مشرک ناپاک ہیں اور ناپاک لوگوں سے مساجد کو پاک کرنے کا حکم بھی رب تعالیٰ نے خود فرمایا۔ ﴿ أَنْ طَهَّرَ ابْنَتِي لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ ﴾ یہ کہ میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور اعتکاف بیٹھنے والوں اور رکوع

کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لئے پاک رکھو۔

(۳) اور وجہ یہ بھی ہے کہ کافر نجاست سے پرہیز نہیں کرتا؛ اس لئے بسا اوقات کافر کے مسجد میں آنے سے مسجد کو گندگی سے ملوث کرنا لازم آئے گا۔

(۴) اور وجہ یہ ہے کہ کافر مسجد میں آ کر مسلمانوں کی عبادت میں فساد ہی پیدا کرے گا حالانکہ مساجد جائے امن و سکون ہیں۔

(۵) اور یہ بھی وجہ ہے کہ کافر مسجد کو تعمیر کر کے مسلمانوں پر اپنا احسان جتائے گا۔ یہ جائز نہیں کہ مسلمان کافر کے احسان مند رہیں اور وہ اپنا احسان جتلاتا پھرے۔

جب پہلا معنی مراد لیا جائے کہ عمارۃ المسجد کا معنی ”عبادت کے ذریعے مسجد کو آباد کرنا ہے“ تو یہ..... رب کی عبادت کرنا..... کافر سے ویسے ہی ممکن نہیں، اگر کوئی منافقت سے عبادت کے لئے مسجد میں آئے تو اس پر کڑی نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔

مسجد کو آباد کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ پر ایمان ہونا ضروری ہے۔ اس لئے کہ مسجد وہ مقام ہے جہاں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جاتی ہے اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے بغیر ممکن نہیں کہ وہ شخص مسجد تعمیر کرے۔ اسی طرح آخرت کے دن پر ایمان ہونا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ جس شخص کا قیامت پر ایمان ہوگا وہی اللہ تعالیٰ کا عبادت گزار ہوگا۔ اور جو شخص قیامت کا منکر ہوگا وہ اللہ تعالیٰ کا عبادت گزار نہیں ہوگا۔ اور جب تک انسان اللہ تعالیٰ کی عبادت نہیں کرے گا وہ مسجد بھی تعمیر نہیں کرے گا۔

خیال رہے کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان اس وقت تک مکمل نہیں ہوگا جب تک انبیاء کرام اور کتب الہیہ اور ملائکہ پر ایمان نہیں ہوگا۔ اس لئے واضح ہوا کہ مسجد کو وہی شخص عبادت کے ذریعے یا تعمیر کے ذریعے آباد کرے گا جس کا اللہ تعالیٰ، انبیاء کرام، آسمانی کتب، فرشتوں اور قیامت پر ایمان ہوگا۔

اسی طرح وہ شخص جو نماز ادا کرتا ہوگا وہی مسجد کی تعمیر کرے گا کیونکہ مسجد کے تعمیر کرنے میں ”مقصد عظیم“ نماز ادا کرنا ہے۔ انسان جب تک نماز کے وجوب کو ماننے والا نہیں ہوگا وہ مسجد بھی تعمیر نہیں کرے گا۔

علامہ رازی رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول..... ”فالانسان مالم یکن مقرا بوجوب الصلوات امتنع ان یقدم علی بناء المسجد“..... سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ انسان نماز کی فرضیت کو ماننے والا ہو لیکن غفلت والا پرواہی کے باعث نماز ادا نہ کرتا ہو تو وہ بھی بعض اوقات مسجد تعمیر کر دیتا ہے۔

رب تعالیٰ نے مساجد تعمیر کرنے والوں کے اوصاف میں زکوٰۃ ادا کرنے کا ذکر بھی کیا ہے، ایک وجہ تو یہ ہے کہ نماز کے ساتھ کئی مقامات پر زکوٰۃ کا ذکر کیا گیا ہے اس لئے یہاں بھی ذکر کر دیا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس سے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ مسجد تعمیر کرنا مستحب ہے جبکہ زکوٰۃ ادا کرنا فرض ہے۔ اس لئے انسان کو چاہئے کہ فرائض کو ضروری طور پر ادا کرے، پھر بعد میں اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے تو مستحبات پر بھی عمل کرے۔

مسجد کی تعمیر کرنے والے وہ لوگ ہیں جن کے دل میں تقویٰ اور خشیت الہی پائے جائیں۔

مسجد کے فضائل و آداب:

انسان کے لئے ضروری ہے کہ مسجد میں سوائے عبادت اور نیکی کی باتوں کے دنیاوی باتیں نہ کرے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

”یأتی فی آخر الزمان ناس من امتی یأتون المساجد یقعدون فیہا جلقا ذکرہم الدنیا وحب الدنیا لا تجالسوہم ، فلیس للہ بہم حاجة“

آخر زمانہ میں میری امت سے کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو مساجد میں آکر حلقہ بنا کر بیٹھیں گے وہ دنیا کا ذکر کریں گے اور انہیں دنیا سے ہی محبت ہوگی، ان کے ساتھ تم نہ بیٹھنا، ان لوگوں سے اللہ تعالیٰ کو کوئی واسطہ نہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو ان کے دین سے دور رہنے اور دنیا میں مشغول رہنے کی کوئی پرواہ نہیں بلکہ وہ اپنا ہی نقصان کر رہے ہوں گے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

”الحديث فی المسجد یاکل الحسنات کما تاكل البهيمة الحشیش“

مسجد میں کلام نیکیوں کو ایسے کھا جاتی ہے جیسے چوپائے گھاس کو کھاتے ہیں۔

خیال رہے اس کلام سے مراد وہ کلام ہے جس کا تعلق دنیا داری سے ہو۔ لیکن دینی کلام، مسائل پر گفتگو اور ہر وہ کلام جس میں نیک مقصد ہو۔ کسی کی راہنمائی کرنا مقصود ہو، وہ جائز ہے اور اس میں ثواب ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

”من اسرج فی مسجد سراجا لم تنزل الملائكة وحمله العرش يستغفرون له مادام فی المسجد ضوءه“

جس نے مسجد میں چراغ جلایا (یعنی روشنی کی) تو اللہ تعالیٰ کے فرشتے اور حاملین عرش ہمیشہ اس کے لئے بخشش طلب کرتے رہتے ہیں جب تک مسجد میں وہ روشنی رہتی ہے۔

(ماخوذ از تفسیر کبیر ج ۱۶ ص ۱۰۶۸)

تعمیر مسجد ذریعہ جنت:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”من بنی لله مسجدا بنی الله له بیتا فی الجنة“

(بخاری مسلم، مشکوٰۃ باب المساجد)

جس شخص نے اللہ تعالیٰ کے لئے مسجد بنائی اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں گھر بنائے گا۔

یعنی جس شخص نے اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے مسجد کی تعمیر کی اللہ تعالیٰ اسے جنت میں مقام عطا فرمائے گا۔

مساجد اللہ کی پسندیدہ جگہیں ہیں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”احب البلاد الی الله مساجدها و ابغض البلاد الی الله اسواقها“

تمام مقامات سے اللہ تعالیٰ کو مساجد سے زیادہ محبت ہے اور تمام مقامات سے رب تعالیٰ کو زیادہ

(مسلم، مشکوٰۃ، باب المساجد)

نا پسند مقام بازار ہیں۔

مساجد سے محبت کی وجہ یہ ہے کہ مساجد میں انسان اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے جس سے انسان

کو اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اسے اپنی رحمت سے نوازتا ہے۔

”المراد بحب الله المساجد ارادة الخیر لاهلها“

اللہ تعالیٰ کا مساجد سے محبت کرنے کا مطلب بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ مساجد میں عبادت کرنے والوں کو خیر (بھلائی، رحمت) عطا فرماتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

”المساجد مواطن المتقين“ مساجد متقین کے مقامات ہیں۔

اللہ تعالیٰ کو بازار کیوں ناپسند ہیں؟

حضرت ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں:

”والاسواق محل افعال الشياطين من الحرص والطمع والخيانة والغفلة“

(مرقاۃ المفاتیح)

بازار شیطانوں کے مقامات ہیں یہی وجہ ہے کہ بازاروں میں حرص، لالچ، خیانت اور غفلت زیادہ پائی جاتی ہے۔ غفلت سے مراد نمازوں میں کوتاہی کرنا، سچ نہ بولنا، جھوٹ کی پرواہ نہ کرنا، ملاوٹ، دھوکہ بازی جیسے کام ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا بازاروں سے بغض رکھنے کا مطلب یہ ہے..... ”وبالْبغض خلافه“..... کہ مساجد کے برخلاف بازاروں میں رہنے والوں پر اللہ تعالیٰ کی رحمت نہیں ہوتی، وہ اس کی رحمت سے دور ہوتے ہیں۔

تنبیہ: بازار و مسجد کے اس حکم کے متعلق ملا علی قاریؒ وضاحت فرماتے ہیں:

”وهذا بطريق الاغلبية والا فقد يقصد المسجد بقصد نحو الغيبة وقد يدخل السوق لطلب الحلال“

(مرقاۃ المفاتیح)

مساجد اور بازاروں کا یہ حکم اکثری اور غالب طور پر ہے۔ وگرنہ جو لوگ مسجد میں غیبت کرنے، چوری کرنے، فساد و فتنہ پھیلانے، امام کو تنگ کرنے کے لئے آتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور ہی رہیں گے۔ ایسے لوگوں سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے۔

تاہم اگر کوئی شخص بازار میں رزق جلال تلاش کرنے کے لئے جائے، سچ بولے، صاف ستھری تجارت کرے تو وہ یقیناً اللہ تعالیٰ کی رحمت کا مستحق ہوتا ہے۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

”طلب کسب الحلال فريضة بعد الفريضة“

حلال روزی کمانا دوسرے فرائض کو ادا کرنے کے بعد فرض ہے۔ (بیہقی، مشکوٰۃ باب طلب کسب الحلال)

نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا یا رسول اللہ کون سا کسب پاکیزہ اور حلال ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

”عمل الرجل بيده و كل بيع مبرور“

کسی انسان کا اپنے ہاتھوں سے کمانا اور صاف ستھری تجارت کرنا (کسب حلال ہے۔)

(مسند احمد، مشکوٰۃ باب طلب کسب الحلال)

مسجد میں آمد و رفت سے جنت میں مہمان نوازی:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”من غدا الى المسجد اوراح اعد الله نزل من الجنة كلما غدا اوراح“

جو شخص صبح، شام مسجد میں جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں مہمانوں والا کھانا تیار فرماتا

ہے جب بھی صبح جائے یا شام جائے۔ (بخاری، مسلم، مشکوٰۃ باب المساجد)

یعنی عبادت کی غرض سے مسجد میں صبح و شام جانے سے انسان اللہ تعالیٰ کا جنتی مہمان بن جاتا

ہے۔ خیال رہے ”راح“ کا لفظ ظہر سے عشاء تک کے تمام وقت کو شامل ہے۔ مطلب واضح ہوا کہ

پانچ نمازیں ادا کرنا مقصود ہیں اور یہ عمل بھی ہمیشہ جاری رکھے۔

ملا علی قاری شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

”كلما استمر غدوه ورواحه استمر اعداد نزل في الجنة“

جب انسان ہمیشہ کے لئے نماز ادا کرے گا، ہر روز مسجد میں جانے کا معمول بنائے گا تو ہمیشہ

ہمیشہ کے لئے وہ اللہ تعالیٰ کا جنت میں مہمان رہے گا۔ ہر روز اسے بطور مہمان کھانے میسر ہوں گے۔

یہاں سے ہی ایک مسئلہ سمجھ میں آیا جیسے کہا جاتا ہے..... ”الحركة سبب البركة“.....

حرکت برکت کا سبب ہے۔ یعنی انسان ہاتھ پہ ہاتھ دھرے نہ بیٹھا رہے بلکہ اعمال جاری رکھے۔

دوسرا مسئلہ یہ واضح ہوا۔ کہ ”الذهاب الى الطاعة علامة اعداد الله المثوبة“ نیکی کا

کام کرنے کے لئے جانا، اللہ تعالیٰ کے ثواب عطاء کرنے کی علامت ہے۔ یعنی عبادت سے اللہ تعالیٰ کی رضا مندی حاصل ہوتی ہے۔
(از مرقاة)

مسجد میں دور سے چل کر آنا زیادہ ثواب کا سبب ہے:

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ مسجد کے ارد گرد کچھ جگہ خالی تھی، قبیلہ بنو سلمہ نے ارادہ کیا کہ وہ مسجد کے قریب منتقل ہو جائیں، نبی کریم ﷺ کو پتہ چلا تو آپ نے ان سے کہا مجھے یہ خبر ملی ہے کہ تم مسجد کے قریب منتقل ہونے کا ارادہ رکھتے ہو (کیا ایسا ہی ہے؟) انہوں نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہ ﷺ (ہمارا یہی ارادہ ہے) تو آپ ﷺ نے فرمایا اے بنی سلمہ ”دیار کم! تکتب آثار کم، دیار کم! تکتب آثار کم“ تم اپنے گھروں کو لازم پکڑو تمہارے قدموں کے آثار کو لکھا جائیگا۔

(مسلم، مشکوٰۃ باب المساجد)

اگرچہ نبی کریم ﷺ نے دو مرتبہ ”دیار کم تکتب آثار کم“ کے الفاظ مبارکہ ہی ذکر فرمائے ہیں، لیکن یہ تکرار تاکید کے لئے نہیں بلکہ علیحدہ علیحدہ مفہوم ہے۔

ایک مرتبہ آپ کے الفاظ مبارکہ کا مفہوم یہ ہے۔ ”التزموا دیار کم تکتب فی صحف الاعمال ای كثرة الخطا سبب لزيادة الاجر“ اپنے گھروں کو لازم پکڑو یعنی وہیں رہو جتنے زیادہ قدم چلو گے اتنا ہی زیادہ ثواب تمہارے نامہ اعمال میں لکھا جائے گا۔

دوسری مرتبہ بھی آپ نے الفاظ مبارکہ تو وہی ذکر فرمائے لیکن ان کا مطلب یہ ہے۔ ”الزموا دیار کم تکتب فی کتب السیر“ تم اپنے گھروں میں ہی رہو تمہارا ذکر سیرت کی کتابوں میں لکھا جائے گا۔ یعنی تمہارا واقعہ اور تمہارا عبادت میں مشقت برداشت کرنا سلف صالحین کی سیرت کی کتابوں میں لکھا جائے گا؛ تاکہ دوسرے لوگ بھی اسی کی تمنا کریں اور وہ بھی اپنی عبادت میں کوشش کریں اور مشقت برداشت کریں۔

یعنی ان صحابہ کرام کا عمل ایک اور حدیث پاک کا بھی عملی نمونہ تھا۔ وہ حدیث یہ ہے:

”من سن سنة حسنة فله اجرها واجر من عمل بها الى يوم القيامة“

جس شخص نے اچھا عمل رائج کیا اسے اس کا ثواب ملے گا اور جس شخص نے بھی اس پر عمل کیا

اسے بھی ایسا ہی ثواب ملے گا۔

”وفیه تنبیہ ان فی الحدیث معجزۃ لہ علیہ السلام وإشارة الی ان التکرار لیس للتاکید بل بشارۃ الی کتابتین“
(مرقاۃ ج ۲ ص ۱۹۳)

واضح ہوا کہ حدیث پاک سے نبی کریم ﷺ کا معجزہ ثابت ہو رہا ہے کہ آپ نے دو مرتبہ ذکر فرمایا۔ یہ تکرار تاکید کیلئے نہیں بلکہ دو مرتبہ ان کے عمل کو لکھے جانے کا ذکر ہے۔ ایک مرتبہ نامہ اعمال میں اور ایک مرتبہ سیرت کی کتب میں۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد حرف بحرف ثابت ہو چکا ہے کیونکہ حدیث پاک کے شارحین نے اپنی اپنی کتب میں ذکر کیا ہے۔ راقم جیسا سیاہ کار بھی صحابہ کرام کے اس عظیم عمل کو ذکر کر کے اپنی نجات کا ذریعہ بنا رہا ہے۔ (ان شاء اللہ العزیز)

مسجد سے دل لگانے والا اللہ کی رحمت کے سایہ میں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”سبعة یظلہم اللہ فی ظلہ یوم لا ظل الا ظلہ امام عادل وشاب نشأ فی عبادة اللہ ورجل قلبہ معلق بالمسجد اذا خرج منه حتی يعود الیہ ورجلان تحابا فی اللہ اجتماعا علیہ وتفرقا علیہ ورجل ذکر اللہ خالیا ففاضت عیناہ ورجل دعتہ امرأۃ ذات حسب وجمال فقال انی اخاف اللہ ورجل تصدق بصدقة فاخفاها حتی لا تعلم شمالہ ماتنفق یمینہ“

(بخاری، مسلم مشکوٰۃ باب المساجد)

سات قسم کے شخص اس دن اللہ تعالیٰ رحمت کے سایہ میں ہوں گے جس دن اس کی رحمت کے سایہ کے بغیر اور کوئی سایہ نہیں ہوگا۔

(۱) عدل وانصاف کرنے والا حاکم۔

(۲) جوانی میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والا۔

(۳) اور وہ شخص جس کا دل مسجد سے معلق رہے جب مسجد سے نکلے تو پھر مسجد کی طرف لوٹنے کی تمنا رکھے

(۴) اور دو شخص جو آپس میں اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کی خاطر محبت رکھیں جب دونوں جمع ہوں اور

جب دونوں علیحدہ ہوں (یعنی آمنے سامنے بھی محبت رکھیں اور ایک دوسرے کے پیچھے بھی

محبت رکھیں۔ ایسا نہ ہو کہ ان کی محبت منافقت پر مبنی ہو اور وہ کسی ابو جہل کے آلہ کار بنے

ہوئے ہوں)

(۵) اور وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کا ذکر علیحدہ ہو کر کرے اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوں (یعنی لوگوں سے علیحدہ ہو کر، ریاکاری سے ہٹ کر اور معبودان باطلہ سے دور رہ کر صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے، خلوص و محبت سے عبادت کرے اور دل میں خوف الہی ہو جس سے عبادت کرتے ہوئے آنکھیں ڈبڈبائیں)

(۶) اور وہ شخص جسے ایک عورت خوبصورت اور حسب و نسب والی دعوت گناہ دے تو وہ کہے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں (اس طرح وہ اس سے بچ کر رہے)

(۷) اور وہ شخص جو مخفی طور پر صدقہ دے یہاں تک کہ بائیں ہاتھ کو معلوم نہ ہو سکے جو دائیں ہاتھ نے خرچ کیا ہو (اس سے مراد نفلی صدقہ ہے کیونکہ زکوٰۃ ظاہراً دینا بہتر ہے تا کہ یہ خود اس تہمت سے بچ سکے کہ یہ زکوٰۃ ادا نہیں کرتا اور دوسری وجہ یہ ہے کہ دوسرے لوگ بھی اسے دیکھ کر زکوٰۃ ادا کریں)

تحیۃ المسجد :

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”اذا دخل احدکم المسجد فلیرکع رکعتین قبل ان یجلس“

جب تم میں سے کوئی ایک مسجد میں داخل ہو تو وہ بیٹھنے سے پہلے دو رکعت ادا کرے۔

(بخاری، مسلم، مشکوٰۃ، باب المساجد)

ایک روایت میں اس طرح ذکر ہے۔

”اعطوا المساجد حقها، قالوا وما حقها یا رسول اللہ؟ قال ان تصلوا رکعتین قبل ان تجلسوا“

حضور ﷺ نے فرمایا: مساجد کو ان کا حق دو، صحابہ کرام نے پوچھا یا رسول اللہ مساجد کا حق کیا ہے؟

آپ نے فرمایا مساجد میں بیٹھنے سے پہلے دو رکعت (نوافل) ادا کرنا۔ (مرقاۃ ج ۲ ص ۱۹۸)

تحیۃ المسجد کا بدل :

”ومن دخله کراهۃ الصلوۃ او وهو محدث قال اربع سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ“

والله اكبر وزاد بعضهم ولا حول ولا قوة الا بالله العلي العظيم (مرفاۃ ج ۲ ص ۱۹۹)

اگر کوئی شخص مسجد میں ایسے وقت داخل ہو جس میں نوافل ادا کرنے منع ہوں (جیسے صبح صادق سے لے کر طلوع آفتاب تک اور عصر کی نماز ادا کر لینے کے بعد سے مغرب کی نماز ادا کر لینے تک نوافل ادا کرنے منع ہیں۔ اسی طرح طلوع آفتاب اور غروب آفتاب اور ضحوة کبریٰ یعنی عام طور پر جسے زوال کہا جاتا ہے ان اوقات میں بھی نوافل ادا کرنے مکروہ ہیں) یا وہ بے وضو ہو تو دو رکعت نوافل نہ ادا کرے بلکہ چار مرتبہ..... ”سُبْحَانَ اللَّهِ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ وَلَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَاللَّهُ أَكْبَرُ“..... پڑھے۔ بعض حضرات نے فرمایا ان الفاظ کے بعد ”وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ“ بھی پڑھے۔ یعنی تیسرا کلمہ مکمل پڑھے۔ سلف صالحین میں سے بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ چار مرتبہ تیسرا کلمہ پڑھ لینے سے دو رکعت نوافل کا ثواب مل جائے گا۔

اس قول پر امام کبیر تابعی حضرت جابر بن زید کی روایت تائید کر رہی ہے۔ آپؓ نے فرمایا ”اذا دخلت المسجد فصل فيه فان لم تصل فاذا ذكر الله فكانك قد صليت“ جب تم مسجد میں داخل ہو تو دو رکعت نوافل ادا کر لو اگر تم نماز نہ ادا کر سکو تو اللہ تعالیٰ کا ذکر ہی کر لو، اس سے تمہیں ایسا ہی ثواب حاصل ہوگا جیسا کہ تم نے نماز ادا کی۔

”ومن دخل المسجد الحرام واراد الطواف فليبدأ به والا فليصل“

جو شخص مسجد حرام میں داخل ہو وہ اگر طواف کرنے کا ارادہ رکھتا ہو تو وہ پہلے طواف کرے، اگر طواف کا ارادہ نہ ہو تو تحیۃ المسجد ادا کرے۔

”ان الزائر اذا دخل المسجد النبوي يصلي اولاً ثم يزوره تقدیماً لحق الله تعالى وتعظيمه على حق رسول الله وتكريمه“

بے شک رسول اللہ ﷺ کے روضہ مطہرہ کی زیارت کرنے کے ارادہ سے جانے والا شخص جب مسجد نبوی شریف میں داخل ہو تو پہلے تحیۃ المسجد ادا کرے تاکہ اللہ تعالیٰ کے حق اور اللہ تعالیٰ کی تعظیم کو رسول اللہ ﷺ کے حق و تکریم پر مقدم رکھے۔

(مرفاۃ ج ۲ ص ۱۹۹)

”وإداء الفرض بنوب عنها وكل صلوة أداها عند الدخول بلانية التحية لان التحية

لتعظیمہ و حرمتہ وقد حصل ذلک بما صلاہ ولا تقوت بالجلوس عندنا وان کان الافضل فعلها قبلہ“

مسجد میں جاتے ہوئے فرض نماز ادا کرنا یا سنت وغیرہ ادا کرنا ”تحیۃ المسجد“ کے قائم مقام ہوں گے۔ کیونکہ تحیۃ المسجد ادا کرنے کا مقصد مسجد کی تعظیم و تحریم ہے وہ ہر قسم کی نماز سے حاصل ہو جاتی ہے۔ اگرچہ علیحدہ دو رکعت تحیۃ المسجد کے ارادہ سے ہی ادا کرنا افضل ہے۔

(نور الايضاح، مراقی، ذریعۃ السجاح ص ۱۰۰)

حدیث شریف میں جو ذکر ہے کہ بیٹھنے سے پہلے تحیۃ المسجد ادا کرے وہ بیان افضلیت ہے۔ اگر پہلے بیٹھ گیا پھر نماز ادا کی تو تحیۃ المسجد کا مقصد فوت نہیں ہوگا۔
مسجد میں داخل ہونے کی دعا:

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: تم میں سے جب بھی کوئی شخص مسجد میں داخل ہو تو یہ پڑھے۔
”اللّٰهُمَّ افْتَحْ لِيْ اَبْوَابَ رَحْمَتِكَ“

اے اللہ! میرے لئے اپنی رحمت کے دروازے کھول۔

مسجد سے باہر نکلنے کی دعاء:

نبی کریم ﷺ نے فرمایا تم میں سے جب بھی کوئی شخص مسجد سے باہر آئے تو یہ کہے۔
”اللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ“

اے اللہ میں تجھ سے تیرے فضل کا سوال کرتا ہوں۔ (مسلم، مشکوٰۃ باب المساجد)

دونوں دعاؤں میں وجہ فرق:

مسجد میں داخل ہوتے وقت رحمت کی دعا کی جاتی ہے۔ اس لئے کہ انسان جب مسجد میں داخل ہوتا ہے تو عبادت میں مشغول ہوتا ہے۔ جو حصولِ ثواب اور دخولِ جنت کا ذریعہ ہے۔ اس کے مناسب رحمت کی دعا ہی ہے۔ لیکن جب مسجد سے باہر آئے تو رزقِ حلال کی تلاش میں ہوتا ہے۔ اس لئے وہاں مناسب یہی ہے کہ اللہ کے فضل کی طلب کرے؛ کیونکہ رزقِ حلال کو حاصل کرنا رب تعالیٰ کا فضل ہے۔

اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا:

﴿فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللَّهِ﴾ جب نماز جمعہ ادا کرلو..... تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کے فضل کو حاصل کرو، یعنی تجارت کرو اور رزق حلال کو حاصل کرو۔

(مرفاۃ ج ۲ ص ۱۹۸)

فائدہ جلیلہ:

”عن فاطمة الكبرى“ قالت كان رسول الله ﷺ اذا دخل المسجد صلى على محمد و سلم
حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ جب مسجد میں داخل ہوتے تھے تو (اپنے آپ پر درود پاک ان الفاظ میں) پڑھتے تھے۔ ”صلی علی محمد و سلم“

آپ کو اپنے آپ پر ایمان لانا واجب تھا اس وجہ سے آپ اپنے آپ پر درود شریف پڑھتے اور اس میں امت کو تعلیم دینا بھی مقصود تھا تا کہ میری امت بھی جب مسجد میں داخل ہو تو دعا سے پہلے درود شریف پڑھے۔

(حاشیہ ترمذی)

”و فی خبر الحاکم و صححه اذا دخل احدکم المسجد فلیسلم علی النبی ﷺ“

مستدرک حاکم میں صحیح حدیث بیان کی گئی ہے۔ ”جب تم میں سے کوئی ایک مسجد میں داخل ہو تو نبی کریم ﷺ پر درود پڑھے“

(مرفاۃ ج ۲ ص ۱۹۸)

ان روایات اور اقوال ائمہ سے معلوم ہوا کہ مسجد میں داخل ہوتے اور نکلتے وقت رحمت و فضل کی دعاؤں میں ابتداء درود شریف سے کرے؛ تاکہ حصول برکت اور قبولیت دعا کا ذریعہ ہو۔
مسجد سے نکلتے ہوئے یہ بھی پڑھے:

عالمہ ابن سنی رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے کہ جب انسان مسجد سے نکلنے کے ارادہ پر مسجد کے دروازہ پر آ کر کھڑا ہوتا ہے تو شیطانی لشکر اس طرح جمع ہو جاتے ہیں جس طرح شہد کی مکھیاں اپنے چھتے پر جمع ہوتی ہیں۔ اس لئے وہ درج ذیل دعا پڑھے تاکہ ان کے وسوسوں اور ہر قسم کے ان سے واقع ہونے والے خطرات سے محفوظ رہ سکے۔

(وہ دعا یہ ہے) ”اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ إِبْلِيسَ وَجُنُودِهِ“

اے اللہ میں تیری پناہ پکڑتا ہوں شیطان اور اس کے لشکر سے۔ (از مرقاۃ ج ۲ ص ۱۹۸)

مسجد میں سوال کرنا اور سائل کو عطا کرنے کا حکم:

اس مسئلہ میں اگرچہ اہل علم نے اختلاف کیا ہے تاہم علامہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر شائد ارمحا کہ بیان کیا ہے، جس میں تمام اقوال جمع ہو سکتے ہیں۔

کچھ حضرات نے مطلقاً سائل کو عطا کرنے سے منع کیا ہے انہوں نے بطور دلیل یہ کہا ہے کہ بعض روایات میں اس طرح آتا ہے۔

”ینادی یوم القيامة ليقم بغیض اللہ فیقوم سنوال المسجد“

قیامت کے دن جب یہ نداء دی جائے گی کہ اللہ کے غیض سے کوئی شخص کھڑا ہو جائے تو وہی شخص کھڑا ہوگا جو مسجد میں سوال کیا کرتا تھا۔ خیال رہے غیض کا معنی ”کمی، تھوڑی مقدار“ ہے۔ لہذا یہ معنی ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی جس شخص پر کم رحمت ہے وہ کھڑا ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ”غیض“ بمعنی غیظ ہو جائے جس کا معنی ناراضگی ہے۔

کچھ حضرات نے مطلقاً سوال کرنے اور سائل کو عطا کرنے کا جواز تسلیم کیا ہے ان کی دلیل یہ ہے صحیح حدیث میں یہ مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے پوچھا:.....

”هل احدکم منکم اطعم الیوم مسکینا فقال ابو بکر دخلت المسجد فاذا انا بسائل فوجدت کسرة خبز فی ید عبدالرحمن فاخذتها فدفعتها الیه“

..... کیا کسی شخص نے تم میں سے آج سائل کو کھانا کھلایا ہے تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا (ہاں یا رسول اللہ) میں مسجد میں داخل ہوا تو میں نے ایک سائل کو پایا میں نے اپنے بیٹے عبدالرحمن کے ہاتھ میں ایک روٹی کا ٹکڑا پایا، میں نے وہ روٹی کا ٹکڑا اس کے ہاتھ سے لے کر سائل کو دے دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو بکر صدیق کے اس فعل کو جنت میں جانے کا ذریعہ قرار دیا۔

محاکمہ:

بعض حضرات نے تفصیل ذکر کی ہے اور اس مسئلہ کو اس طرح بیان کیا ہے کہ دونوں قسم کی احادیث پر عمل کیا جاسکے اور یہی قول بہتر بھی ہے۔

(۱) "من يؤذى الناس بالمرور ونحوه فيكره اعطاؤه لانه اعانة له على ممنوع"

جو شخص لوگوں کو گذرتے ہوئے تکلیف دے یعنی گردنوں کو پھاند کر آگے صف میں پہنچنے کی کوشش کرے یا اور اسی طرح کسی قسم کی تکلیف کا سبب بنے اسے کچھ نہ دیا جائے کیونکہ دوسروں کو تکلیف دینا منع ہے اور ممنوع چیز پر معاونت بھی ممنوع ہے۔

خیال رہے کہ اسی طرح پیشہ ور بھکاری جھوٹی قسمیں اٹھا کر اپنی حالت زار بیان کرنے والے سائلین کی امداد بھی نہ کی جائے۔ ایسے لوگوں کی امداد کرنا درحقیقت ان کو اس پیشہ پر قائم رکھنا لازم آتا ہے۔ ان کی حوصلہ شکنی ضروری ہے۔

(۲) "ومن لا يؤذى فيسن اعطاؤه لان السئول كانوا يسألون على عهد رسول الله ﷺ في المسجد"

اور جو شخص سوال کرنے میں کسی کو ایذا نہ پہنچاتا ہو ایسے شخص کو عطا کرنا سنت ہے؛ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ اقدس میں سائل لوگ مسجد میں سوال کرتے تھے (اور ان کے سوال کے مطابق ان کی حاجت کو پورا کیا جاتا تھا)۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک سائل کو انگلی عطا کی جب آپ رکوع میں تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی مدح فرمائی اور ارشاد فرمایا:

﴿يُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ﴾

وہ حالت رکوع میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرتے ہیں۔

علامہ ملا علی قاری رحمہ الباری فیصلہ کن بات کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"والظاهر ان الخلاف خلاف عصر وزمان لا اختلاف السائلين والله اعلم"

(ماخوذ از مرقاة ج ۲ ص ۱۹۹، ۲۰۰)

ظاہر بات یہ ہے کہ یہ "اختلاف" زمانہ کے اختلاف اور سائلین کے اختلاف کی وجہ سے ہے۔ جب سائلین کسی کو تنگ کرنے والے نہیں ہوتے تھے۔ پیشہ ور بھکاری نہیں ہوتے تھے، حاجت مند ہوتے تو سوال کرتے اس وقت سوال کرنے والوں کو دینا مطلقاً جائز تھا۔ اب چونکہ اکثر سائلین دوسروں کو ایذا پہنچانے والے ہوتے ہیں۔ پیشہ ور بھکاری ہوتے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ انسان

اپنی بصیرت سے اندازہ لگائے، کوئی شخص ضعیف ہے۔ کوئی حاجت مند نظر آتا ہو تو اسے کچھ دے دیا جائے ورنہ بغیر کسی تنگی، ترش روئی، ڈانٹ ڈپٹ کے خاموشی سے سائل کے قریب سے ہٹ جائے۔ اس لئے کہ رب تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَأَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَوْهُ﴾ اور جو مانگنے آئے اسے نہ جھڑکیں۔

بد بودار چیز کھا کر مسجد میں نہ جائے:

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”مَنْ أَكَلَ مِنْ هَذِهِ الشَّجَرَةِ الْمُنْتَنَةِ فَلَا يَقْرُبَنَّ مَسْجِدَنَا فَإِنَّ الْمَلَائِكَةَ تَتَأَذَى مِمَّا يَتَأَذَى مِنْهُ الْإِنْسُ“

جو شخص اس بد بودار پودے کو کھائے وہ ہماری مساجد کے قریب ہرگز نہ آئے۔ بے شک فرشتوں کو بھی اس چیز سے تکلیف ہوتی ہے جس سے انسانوں کو تکلیف ہوتی ہے۔

(بخاری، مسلم، مشکوٰۃ باب المساجد)

نبی کریم ﷺ نے جس پودے کی طرف اشارہ کیا اس سے مراد ”تھوم“ ہے۔ پیاز کا بھی یہی حکم ہے کیونکہ دوسری حدیث پاک میں صراحۃً تھوم اور پیاز سے ممانعت کا ذکر ہے۔ ہر بد بودار چیز کا حکم بھی یہی ہے۔ مسجد میں انسان نہ ہوں تب بھی یہی حکم ہے؛ کیونکہ فرشتوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ اسی سے واضح ہوا کہ سگریٹ، حقہ پی کر یا سوار کھا کر آنے کا حکم بھی یہی ہے؛ کیونکہ جو انسان سگریٹ یا حقہ نہیں پیتا اور سوار نہیں کھاتا اسے ان چیزوں کی بدبو سے تکلیف محسوس ہوتی ہے۔

مسجد میں خوشبو لگانا مستحب ہے:

”عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ أَمَرَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ بِنَاءَ الْمَسْجِدِ فِي الدَّوْرِ وَأَنْ يَنْظَفَ وَيَطِيبَ“

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے اپنے اپنے محلہ میں مسجد بنانے اور ان کو صاف رکھنے اور ان میں خوشبو لگانے کا حکم فرمایا۔ (ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، مشکوٰۃ باب المساجد)

ہر محلہ میں مسجد بنانے کا حکم اس لئے فرمایا گیا کہ مسجد کے دور ہونے کی وجہ سے بعض اوقات لوگ مسجد میں نماز ادا کرنے کے ثواب سے محروم ہو جاتے ہیں اور جماعت سے نماز ادا نہیں کر سکتے کیونکہ مسجد

دور ہونے کی وجہ سے وہ جانے میں مشقت سمجھتے ہیں۔ اس لئے ہر محلہ میں مسجد بنانے کا حکم دیا تاکہ لوگ آسانی سے بغیر کسی مشقت کے نماز باجماعت ادا کر سکیں۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر فرمایا کہ عطاء کہتے ہیں ”اللہ تعالیٰ حضرت عمرؓ کو جب بھی کسی شہر کی فتح نصیب فرماتا تو.....

”امر المسلمین ببناء المسجد وامرهم ان لا یبنوا مسجدین یصار احدهما الآخر“
..... آپ مسلمانوں کو مساجد کی تعمیر کا حکم دیتے اور یہ فرماتے کہ دو مسجدیں اس طرح نہ بنائی جائیں کہ ایک مسجد سے دوسری کو نقصان ہو۔

”ومن المضارة فعل تفريق الجماعة اذا كان هناك مسجد یسعهم فان ضاق سنّ توسعة او اتخاذ مسجد یسعهم“

ایک مسجد سے دوسری کو نقصان اس وقت ہوتا ہے جب لوگوں کو جماعت سے متفرق کر دیا جائے۔ حالانکہ وہ ایک ہی مسجد سب کے لئے کافی بھی ہو اور بہت زیادہ فاصلہ بھی نہ ہو کہ لوگوں کو آنے جانے میں مشکل درپیش آتی۔

اگر مسجد تنگ ہو جائے تو اسے ہی وسیع کرنا مسنون ہے یا ساتھ ہی نئی مسجد بنالی جائے کہ اس میں تمام نمازی سما سکیں۔ ایسی صورت میں پہلی مسجد کو قرآن پاک پڑھنے، ذکر و اذکار وغیرہ کے لئے مختص کر دیا جائے اور سب لوگ ایک ہی مسجد میں نماز ادا کریں۔ ہاں اگر فاصلہ زیادہ ہو لوگوں کو ایک ہی مسجد میں آنا دشوار ہو تو وہ اپنے قریب مسجد بنالیں تو یہ درست ہے۔

☆ ”یستحب تجمیر المسجد بالبخور“ مسجد میں خوشبو سلگانا مستحب ہے۔ اگر بتی

کا یہی حکم ہے۔ البتہ احتیاط کی ضرورت ہے کہ قالین وغیرہ کو بے احتیاطی سے آگ نہ لگ جائے

☆ ”واستحب بعض السلف تخلیق المسجد بزعفران والطیب“

سلف صالحین نے مسجد کو زعفران سے اور ہر قسم کی خوشبو سے خوشبودار کرنے کو مستحب قرار دیا ہے

البتہ خوشبو کا پاک ہونا ضروری ہے۔

☆ ”وانه یستحب کنس المسجد وتنظیفه“

مسجد میں جھاڑو دینا اور مسجد کی صفائی کرنا مستحب ہے۔

”وقد روی ابن ابی شیبہ انه علیہ السلام کان یتبع غبار المسجد بجریدة“

ابن ابی شیبہ نے روایت ذکر کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ خود مسجد کی صفائی فرماتے تھے۔ مسجد کے گرد و غبار کو کھجور کے جھاڑو سے اپنے ہاتھ مبارک سے صاف فرماتے تھے۔

مسجد میں سونے کا حکم:

”یکره النوم فی المسجد للمقیم عندنا وعند غیرنا ویجوز للمسافر“

مسجد میں مقیم آدمی کے لئے سونا مکروہ ہے۔ البتہ مسافر کے لئے سونا جائز ہے۔

(حاشیہ ترمذی باب النوم فی المسجد)

”قال ابن عباس لا یتخذہ میثا ومقیلا“ وذهب قوم من اهل العلم الی قول ابن عباس

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا مسجد میں رات کو سونے یا دن کو سونے کی عادت بنانا جائز نہیں

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے قول کو ہی اہل علم حضرات نے پسند فرمایا ہے۔ (ترمذی باب النوم فی المسجد)

مسجد میں مقیم آدمی کے سونے کی عادت بنانے میں دو خرابیاں لازم آتی ہیں حالانکہ ان سے

اجتناب ضروری ہے۔

(۱) ”یکره تحریمہ اخراج الریح فی المسجد ولعلہ یستثنیٰ منه المعتکف لکونه معذورا“

مسجد میں ہوا کا خارج کرنا مکروہ تحریمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لیٹ کر سونا یا تکیہ اور دیوار وغیرہ سے

سہارا لگا کر سونا وضوء کو توڑ دیتا ہے۔ وضوء کے ٹوٹنے کی یہی وجہ ہے کہ مفاصل (جوڑوں) کے ڈھیلے

ہونے سے ہوا کے خارج ہونے کا امکان ہوتا ہے۔ مسجد میں سونے کی عادت بنانے میں بھی یقیناً ہوا کا

خارج ہونا لازم آئے گا جو مکروہ تحریمی ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ مسجد میں مقیم شخص سونے کی عادت نہ بنائے۔

اعتراض:

”عن ابن عمر قال کنا ننام علی عهد رسول اللہ ﷺ فی المسجد ونحن شباب“

قال ابو عیسیٰ حدیث ابن عمر حدیث حسن صحیح وقد رخص قوم من اهل العلم فی

النوم فی المسجد.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے آپ فرماتے ہیں ہم رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں مسجد میں سو جاتے تھے جب ہم جوان تھے۔

ابو یسٰیٰ ترمذی نے حضرت ابن عمر کی روایت کردہ حدیث کو حسن صحیح قرار دیا اور ساتھ ہی یہ ذکر کیا ہے کہ اہل علم کی ایک قوم نے مسجد میں سونے کی رخصت دی ہے۔

اس سے تو واضح ہوا کہ مسجد میں سونا جائز ہے۔ نبی کریم ﷺ کا منع نہ فرمانا جواز کے لئے حدیث تقریری ہے لہذا سونے کی عادت بنانے کی ممانعت کیسے ثابت ہوتی ہے؟
جواب:

”اما نوم ابن عمر فكان لانه لم يكن له بيت وكان عزبا وكذلك ثبت النوم عن بعض الصحابة في شرح مسلم للنووي حملوه على حالة العذر“

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ مسجد میں اس لئے سوتے تھے کہ آپ کا اپنا کوئی مکان نہیں تھا، اس لئے بھی کہ آپ جوان تھے لہذا کسی کے گھر سونا ممکن نہیں تھا۔ اسی طرح اور بھی کئی صحابہ کرام اسی عذر کے پیش نظر مسجد میں سو جایا کرتے تھے۔

واضح ہوا کہ بعض صحابہ کرام کا مسجد میں سونا مجبوری کے پیش نظر تھا۔ مسافر کے لئے سونا اب بھی جائز ہے لیکن بغیر مجبوری یا مسافر ہونے کے مسجد میں سونے کی عادت بنانا جائز نہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

”لا يزال احدكم في صلاة مادام ينتظرها ولا تزال الملائكة تصلي على احدكم مادام في المسجد“ اللهم اغفر له اللهم ارحمه“ مالم يحدث فقال رجل من حضرموت وما الحدث يا ابا هريرة؟ فقال فساء او ضراط“

(ترمذی باب ماجاء فی القعود فی المسجد وانتظار الصلوة من الفضل)

تم میں سے جب کوئی شخص نماز کی انتظار میں ہو وہ درحقیقت نماز میں ہی ہوگا۔ اور جب تک کوئی شخص مسجد میں ہو فرشتے اس کے لئے یہ دعا کرتے ہیں۔ اے اللہ اس کی مغفرت فرما، اے اللہ اس پر رحم کر۔ فرشتوں کی یہ دعا اس وقت تک جاری رہتی ہے جب تک اس شخص کو ”حدث“ لاحق نہ ہو۔

”حضرموت“ کے ایک شخص وہاں موجود تھے انہوں نے پوچھا اے ابو ہریرہ ”حدث“ سے مراد کیا ہے۔ تو انہوں نے فرمایا کہ حدث سے مراد آہستہ آواز میں یا بلند آواز میں ہوا کو خارج کرنا ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ مسجد میں ہوا کا خارج کرنا فرشتوں کی رحمت بھری دعا سے محرومیت کا سبب ہے؛ لہذا مسجد میں سونے کی عادت نہ بنائے۔

مسجد میں سونے کی دوسری خرابی

(۲) ”ان الکلام فی المسجد یا کل الحسنات کما یا کل النار الحطب“

بے شک مسجد میں کلام کرنا نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑیوں کو کھا جاتی ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ مقیم شخص اگر مسجد میں سونے کی عادت بنائے گا تو مسجد میں کلام کرنا بھی اس کی مجبوری اور اس کا مقصود ہوگا۔ لہذا ضروری ہے کہ وہ اس سے اجتناب کرے۔ لیکن خیال رہے کلام سے مراد دنیاوی کلام ہے۔ دینی کلام، شرعی مسائل بیان کرنا سنت اور مستحب ہے۔

دنیاوی کلام میں بھی وعید شدید اس صورت میں ہے۔ جس کے متعلق صاحب بحر الرائق نے فرمایا:

”وقال صاحب البحر هذا اذا دخل المسجد لارادة الکلام ولو عرضه فلا“

(ترمذی مع حاشیہ باب النوم فی المسجد)

صاحب بحر الرائق نے یہ بیان کیا ہے کہ دنیاوی کلام نیکیوں کو اس وقت کھا جاتی ہے جب کہ مسجد میں وہ داخل ہی کلام کی غرض سے ہو اور اگر وہ داخل تو عبادت کی غرض سے ہو لیکن بالطبع کوئی کلام بھی کر لے تو اس میں کوئی حرج نہیں اگرچہ بہتر ہے کہ دنیاوی کلام سے جتنا ہو سکے اجتناب کرے۔

مسجد میں خرید و فروخت اور گم شدہ چیز کا اعلان منع ہے:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”من سمع رجلا ینشد ضالة

فی المسجد فلیقل لاردها اللہ علیک فان المساجد لم تبین لهذا“

جو شخص کسی کو مسجد میں گمشدہ چیز کا اعلان کرتے ہوئے سنے وہ کہے اللہ تعالیٰ تمہیں یہ چیز نہ لوٹائے

بے شک مساجد اس لئے نہیں بنائی گئیں۔ (بلکہ اللہ تعالیٰ کے ذکر، قرآن پاک کی تلاوت، وعظ و نصیحت

اور عبادت کے لئے بنائی گئی ہیں)

(رواہ مسلم، مشکوٰۃ باب المساجد)

”واما انشاد الضالۃ فله صورتان احدهما ان ضل شیء فی خارج المسجد وینشده فی المسجد لاجتماع الناس فهو اقبح واشنع واما لو ضل فی المسجد فیجوز الانشاد بلا شغب“

(حاشیہ ترمذی ص ۱۹۵)

گم شدہ اشیاء کے اعلان کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ اگر کوئی چیز مسجد کے باہر گم جائے اور اس کا اعلان مسجد میں آ کر اس لئے کرے کہ یہاں لوگ جمع ہیں تو یہ بہت قبیح و شنیع (بہت بری چیز) ہے لیکن اگر کوئی چیز مسجد میں گم ہو جائے تو اس کا اعلان جائز ہے بشرطیکہ اس میں شور و غوغا نہ پایا جائے۔

وحسن الترمذی خبر ”اذا رأیت من یبیع او یتاع فی المسجد فقلوا : لا اربح اللہ تجارتک“ ترمذی نے حسن حدیث بیان کی ہے کہ جب تم کسی شخص کو مسجد میں خرید و فروخت کرتے ہوئے دیکھو تو کہو اللہ تعالیٰ تمہیں اس تمہاری تجارت میں نفع نہ دے۔

ہاں البتہ یہ خیال رہے کہ اعتکاف بیٹھے ہوئے شخص کے لئے جائز ہے کہ وہ کسی چیز کو خریدے یا بیچے کیونکہ بعض اوقات انسان کو خرید و فروخت کی ضرورت درپیش ہوتی ہے۔ لیکن اس میں شرط یہ ہے کہ جس چیز کی خرید و فروخت کی جارہی ہو اسے مسجد میں نہ لایا جائے۔

”وکذا یندب ان یقال لمن انشد شعرا مذموما ”فض اللہ فاک“ ثلاثا للامر بذلك رواہ ابن السنی“

اسی طرح مستحب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص برے اشعار مسجد میں پڑھے تو سننے والے یہ کہیں کہ اللہ تعالیٰ تمہارے دانت توڑ دے، یہ تین مرتبہ کہا جائے، کیونکہ اسی کا حکم دیا گیا ہے۔ ابن سنی نے یہ روایت بیان کی ہے۔

برے شعر کے ساتھ ”برے“ کی صفت ذکر کرنے سے واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء، نبی کریم ﷺ کی نعت یا ذکر و نصیحت پر مشتمل اشعار کا یہ حکم نہیں، بلکہ ان کا مسجد میں پڑھنا مستحب ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ کے سامنے مسجد میں منبر پر حضرت حسان ﷺ نبی کریم ﷺ کی تعریف میں اشعار پڑھتے تھے اور حضور ان کے لئے دعا فرماتے تھے۔

(ماخوذ از مرقاۃ ج ۲ ص ۱۹۹، حاشیہ ترمذی ص ۱۹۸)

فائدہ عظیمہ:

”عن انس ابن مالک قال قال رسول اللہ ﷺ صلوٰۃ الرجل فی بیتہ بصلوٰۃ و صلوٰتہ فی مسجد القبائل بخمس وعشرين صلوٰۃ و صلوٰتہ فی المسجد الذی یجمع فیہ بخمسائے صلوٰۃ و صلوٰتہ فی المسجد الاقصیٰ بخمسين الف صلوٰۃ و صلوٰتہ فی مسجدی بخمسين الف صلوٰۃ و صلوٰتہ فی المسجد الحرام بمائے الف صلوٰۃ“

(رواہ انس ماحہ . مشکوٰۃ باب المساجد .)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا انسان اپنے گھر نماز ادا کرے تو اسے ایک نماز کا ثواب حاصل ہوگا اپنے محلہ کی مسجد میں (باجماعت) نماز ادا کرے تو اسے پچیس نمازوں کا ثواب حاصل ہوگا، اور اگر جامع مسجد میں نماز باجماعت ادا کرے تو اسے پانچ سو نمازوں کا ثواب حاصل ہوگا، اور مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) میں نماز ادا کرے تو اسے پچاس ہزار نمازوں کا ثواب حاصل ہوگا، اگر میری مسجد (مسجد نبوی) میں نماز ادا کرے تو اسے پچاس ہزار نمازوں کا ثواب ہوگا اور ”مسجد حرام“ میں نماز ادا کرے تو اسے ایک لاکھ نمازوں کا ثواب حاصل ہوگا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا محبت بھرا ارشاد:

”واما مزید المضاعفة فاسباب التفضیل لا تنحصر فی ذلک فالصلوات الخمس بمعنی للمتوجه لعرفة افضل بمسجد مكة وان انتفت عنها المضاعفة اذ فی الاتباع ما یربو علیہا ولذا قال عمر رضی اللہ عنہ بمزید المضاعفة بمسجد مكة مع قوله بتفضیل المدینة“

(ار جواهر المحارح ۴ ص ۱۰)

تعداد کی زیادتی میں فضیلت کا انحصار نہیں، بعض اوقات ایک مقام کو تعداد کی زیادتی حاصل ہوتی اور دوسرے مقام کو تعداد کی زیادتی حاصل نہیں ہوتی لیکن افضلیت اسے حاصل ہوتی ہے۔ جیسے دوران حج مقامات عرفات کی طرف متوجہ ہونے والے شخص کا منیٰ میں نماز ادا کرنا افضل ہے نسبت مسجد حرام میں نماز ادا کرنے کے، حالانکہ تعداد کی زیادتی منیٰ میں حاصل نہیں۔ یعنی وہ نمازیں جو منیٰ میں ادا کرنی ہیں ان کو منیٰ میں ادا کرنے سے ثواب ایک ایک نماز کا حاصل ہوگا اور وہی نمازیں اگر مسجد حرام میں آکر ادا کرے تو ثواب لاکھ لاکھ کا حاصل ہوگا، لیکن منیٰ میں ادا کرنا باوجود ایک نماز کا ثواب حاصل

ہونے کے زیادہ فضیلت رکھتا ہے؛ کیونکہ دراصل رسول اللہ ﷺ کی تابعداری ہی باعث فضیلت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ مسجد حرام میں نماز ادا کرنے سے ایک لاکھ نماز کے ثواب حاصل ہونے کو ماننے کے باوجود فرماتے تھے کہ مسجد نبوی میں نماز ادا کرنا مسجد حرام میں نماز ادا کرنے سے زیادہ فضیلت رکھتا ہے۔

یعنی مسجد نبوی میں نماز ادا کرنے سے ثواب پچاس ہزار کا ملتا ہے لیکن وہ بھاری ہے بنسبت مسجد حرام میں نماز ادا کرنے پر، حالانکہ مسجد حرام میں نماز ادا کرنے سے ثواب ایک لاکھ کا ہی ملتا ہے۔ وجہ اس کی صرف یہ ہے مسجد نبوی میں رسول اللہ ﷺ کا قرب حاصل ہے جو مسجد حرام میں نہیں۔

”کم و کیف“ کا فرق جاننے والے اس بات کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ ایک طرف ”کمیت“ (مقدار عددی) زیادہ ہے جب کہ دوسری طرف ”کیف“ (مرتبہ و کوالٹی) زیادہ ہے

(از جواہر البحار ج ۴ ص ۱۰)

نبی کریم ﷺ کے قرب کی وجہ سے افضلیت کیوں؟

”ونقل القاضی عیاض وغیرہ الاجماع علی تفضیل ما ضم الاعضاء الشریفة حتی علی الکعبة المنیفة ونقل عن ابی عقیل الحنبلی ان تلک البقعة افضل من العرش وصرح الفاکھانی بتفضیلها علی السموات.“ (مرقاۃ ج ۲ ص ۱۹۰ ہکذا قال النووی)

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر فرمایا ہے کہ اس پر اجماع امت ہے کہ وہ مقام یعنی رسول اللہ ﷺ کی قبر شریف کا وہ حصہ جس سے آپ کے جسم مبارک کے اعضاء شریفہ کا تعلق ہے وہ کعبہ مکرمہ سے افضل ہے اور ابو عقیل حنبلی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ وہ حصہ عرش معلیٰ سے بھی افضل ہے اور علامہ فاکھانی رحمۃ اللہ علیہ نے وضاحت فرمائی ہے کہ قبر شریف کا وہ حصہ تمام آسمانوں سے افضل ہے۔

واضح ہوا کہ جب حضور ﷺ کی وجہ سے وہ مقام افضل ہو گیا تو آپ کے قرب کی وجہ سے نماز میں بھی افضلیت کا حاصل ہونا یقینی امر ہے۔

ایک غلطی کا ازالہ:

حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”لا تشدوا الرحال الا الی ثلاثة مساجد مسجد الحرام والمسجد الاقصیٰ ومسجدی هذا“

(بخاری، مسلم، مشکوٰۃ باب المساجد)

سوائے تین مساجد کے سامان سفر نہ باندھو! وہ تین مساجد یہ ہیں مسجد حرام، مسجد اقصیٰ اور میری

یہ مسجد (مسجد نبوی)۔

اس حدیث پاک سے کئی لوگ غلط فہمی کا شکار ہو گئے اور انہوں نے اس حدیث سے یہ ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی کہ مزارات کی زیارت کے لیے جانا حرام ہے۔

علامہ قاریؒ فرماتے ہیں، حدیث پاک کا صحیح مطلب یہ ہے:

”لا تشدوا الی غیرہا لان ما سوی الثلاثة متساو فی الرتبة غیر متفاوت فی الفضیلة وکان الترحل الیہ ضائعا و عبثا“۔

ان تین مساجد کے بغیر اور مساجد کی طرف اس غرض سے سفر نہ کرو کہ ان میں ثواب زیادہ ہے کیونکہ باقی مساجد ثواب میں متساوی ہیں، اس لیے ان کی طرف زیادہ ثواب کی غرض سے جانا بے فائدہ ہے۔

اس حدیث پاک سے نیک لوگوں کی قبور کی زیارت کو کیسے منع کیا جاتا ہے جبکہ اسکا ذرا بھر ذکر نہیں؟
”وما تبین لی ان الامر کذلک بل زیارة مامور بها لخبر، کنت نہیتکم عن زیارة القبور الا فزوروا“

علامہ قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، یہی معنی مراد لیا جاسکتا ہے کہ تین مساجد کے بغیر اور مساجد کی طرف زیادتی ثواب کی غرض سے جانے سے منع کیا گیا۔ قبور کی زیارت کی ممانعت کس طرح ثابت ہو سکتی ہے جبکہ دوسری حدیث شریف میں ہے۔ ”میں نے تمہیں قبور کی زیارت سے منع کیا تھا، خبردار اب زیارت کیا کرو“۔

یعنی ابتدائے اسلام میں قبور کی زیارت سے منع کیا گیا تھا پھر وہ حکم منسوخ ہو گیا اور قبور کی زیارت کی اجازت دے دی گئی۔

”واما المشاهد فلا تساوی بل برکة زیارتها علی قدر درجاتہم عند اللہ“

تین مساجد کے بغیر اور مساجد سے روکنا تو ثابت ہو سکتا ہے کیونکہ وہ متساوی ہیں۔ لیکن مزارات کی زیارت برابر نہیں بلکہ ان کی زیارت میں اسی طرح برکت حاصل ہوگی جس طرح ان کے درجات اللہ تعالیٰ کے ہاں ہوں گے۔

یعنی درجات کے فرق سے زیارت کے حصول میں بھی اسی طرح فرق حاصل رہے گا۔

ثم لم نسمع من يجمع هذا القائل من شد الرحال لقبور الانبياء كابراهيم وموسى ويحيى
وسمع من ذلك في غاية الاحالة واذا جوز ذلك لقبور الانبياء والاولياء في معناهم
فلا يبعد ان يكون ذلك من اغراض الرحلة كما ان زيارة العلماء في الحياة من المقاصد

(مرقاۃ ج ۲ ص ۱۹۰)

علامہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اولیائے کرام کی قبروں کی زیارت سے منع کرنے
والوں کو کاش میرے جیسا علم حاصل ہو جاتا تو انہیں یہ بات سمجھ آتی کہ وہ جلیل القدر انبیائے کرام جیسے
ابراہیم، موسیٰ اور یحییٰ علیہم السلام کی قبور کی زیارت کے لئے جانے سے کیسے منع کر سکیں گے؟ جبکہ ان
کی زیارت سے منع کرنا محال ہے۔ تو واضح ہوا کہ انبیائے کرام کی قبور کی زیارت کے لئے جانا جائز ہے
جب یہ جواز ثابت ہو گیا تو اولیائے کرام کی قبور کی زیارت کرنے کا جواز بھی ثابت ہو جائے گا کیونکہ
انبیائے کرام کو اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہے اور اولیاء عظام بھی رب تعالیٰ کے مقرب ہونے کی وجہ سے
انبیائے کرام کے مقرب ہو گئے۔

مزید فرماتے ہیں: قبور کی زیارت کرنے میں بھی کئی مقاصد ہوتے ہیں جس طرح علماء کرام کی
ظاہری حیات میں ان کی زیارت کرنے میں کئی مقاصد ہوتے ہیں۔

راقم کا موقف:

یہ حدیث زیادہ ثواب یعنی ہزاروں کی تعداد میں ثواب کی غرض سے جانے کے ساتھ مقید ہے
اور ”نہی“ حرمت پر مبنی بھی نہیں۔ کیونکہ پہلے ابن ماجہ سے ایک حدیث ذکر کی جا چکی ہے کہ جامع مسجد
میں نماز ادا کرنا پانچ سو نمازوں کا ثواب حاصل کرنا ہے۔ اس سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ عام مساجد
کی نسبت جامع مسجد میں ثواب کی غرض سے جانا کوئی منع نہیں بلکہ زیادتی ثواب کا سبب ہے۔

خود نبی کریم ﷺ ہر ہفتہ کے دن مسجد قبا کی زیارت کے لئے تشریف لے جاتے تھے۔

مساجد میں شور و غوغا، قیامت کی نشانی:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے ایک حدیث روایت کی جس میں قیامت کی
نشیوں کا بیان ہے اس میں ایک نشانی یہ ہے۔ ”ظہرت الاصوات فی المساجد“ مساجد میں

آوازیں بلند ہوں گی۔

جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ مساجد میں ایک دوسرے کے خلاف سیاسی محاذ آرائی عروج پر ہے۔ مساجد میں نمازی اور کمیٹیوں کے اختلاف درحقیقت سیاسی اختلافات کی وجہ سے پائے جاتے ہیں یا چوہدریہٹ کا جھگڑا ہوتا ہے۔ آئے دن فساد برپا ہوتا رہتا ہے جس سے شرفاء کا ذہنی سکون چھن جاتا ہے۔ مساجد کے امام بھی ان جھگڑوں کی زد میں آنے کی وجہ سے بے چین ہوتے ہیں۔ مساجد کی شان کے لائق یہ ہے کہ عبادت کی جائے، حق بات بیان ہو، لڑائی جھگڑا نہ ہو اور فتنہ و فساد سے مساجد میں اجتناب کیا جائے مسجد تاقیامت مسجد ہے:

”ولو خرب ما حوله واستغنی عنه یبقی مسجدا عند الامام والثانی ابدا الی قیام الساعة وبہ یفتی حاوی القدسی۔ جزم بہ فی الاسعف حیث قال ولو خرب المسجد وما حوله وتفرق الناس عنه لا یعود الی ملک الواقف عند ابی یوسف فیباع نقضہ باذن القاضی ویصرف ثمنہ الی بعض المساجد“ (شامی ج ۳ ص ۵۰۷)

اگر مسجد کا ارد گرد خراب ہو جائے، اس مسجد کی ضرورت نہ رہے تو وہ مسجد تاقیامت مسجد ہی رہے گی۔ (اس سے مسجد کے احکام واپس نہیں لیے جاسکتے) اسی پر فقہائے کرام کا فتویٰ ہے۔ (حاوی القدسی)

”اسعاف“ میں بھی اسی قول پر اعتماد و یقین کیا گیا ہے کہ اگر مسجد اور مسجد کا ارد گرد خراب بھی ہو جائیں، لوگ وہاں سے دوسری جگہ منتقل ہو جائیں پھر بھی مسجد کی جگہ واقف (وقف کرنے والے) کی ملکیت میں نہیں آئے گی۔ ہاں البتہ مسجد کی تعمیر پر لگا ہوا سامان، دروازے کھڑکیاں، چھت، اینٹیں وغیرہ دوسری مسجد پر لگادی جائیں تو یہ جائز ہے۔

فتاویٰ قاضی خان میں ہے:

”وفی الخانیة رباط بعید استغنی عنه المارة وبجنبہ رباط آخر قال السید الامام ابو شجاع تصرف غلة الی الرباط الثانی کالمسجد اذا خرب واستغنی عنه اهل القرية فرفع ذلک الی القاضی فباع الخشب وصرف الثمن الی مسجد آخر جاز۔“ (شامی ج ۳ ص ۵۰۷)

فتاویٰ قاضی خان میں مذکور ہے کہ اگر ایک سرائے راستہ سے دور ہے جو مسافروں کے کام نہیں

آ سکتی اور دوسری سرائے راستہ کے قریب ہے جس میں گزرنے والے سکونت کرتے رہتے ہیں تو اس صورت میں دور والی سرائے کا سامان قریب والی سرائے میں لگا دیا جائے، سید امام شجاع رحمۃ اللہ علیہ کا اسی پر فتویٰ ہے۔

اسی طرح اگر ایک مسجد خراب ہو جائے اور اس بستی والے لوگوں کو اس کی ضرورت نہیں رہی تو قاضی سے اجازت لے کر اس کی لکڑیاں وغیرہ بیچ کر دوسری مسجد پر لگا دی جائیں۔

راقم کے خیال میں قاضی سے اجازت لینے کی قید خورد برد سے بچانے اور نزاع سے بچانے کے لئے ہے۔ اگر ایسے خطرات نہ ہوں تو معاملہ قاضی کے پاس لے جانا ضروری نہیں خاص کر کے آجکل کے قاضی اور آجکل کی عدالتیں۔ الامان الحفیظ۔

”ولا سيما في زماننا فان المسجد او غيره من رباط او حوض اذا لم ينقل يأخذ انقاضه اللصوص والمتغلبون كما هو مشاهد“
(شامی ج ص ۲۰۷)

ایک مسجد، حوض یا سرائے وغیرہ اگر خراب ہو جائے، لوگ وہاں سے منتقل ہو جائیں اور اس کی ضرورت ختم ہو جائے تو زیادہ بہتر یہی ہے کہ اس کا سامان دوسری مسجد، دوسرے حوض یا دوسری سرائے کی طرف منتقل کر دیا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو چور، بد معاش لوگ وہ سامان اٹھا کر لے جائیں گے، خاص کر کے ہمارے زمانہ میں اس طرح کے معاملات واقع ہو رہے ہیں جن کا مشاہدہ کیا جا رہا ہے۔

یہ تو علامہ شامی کے زمانہ کی بات تھی۔ اب ہم اپنے زمانہ کو دیکھیں تو بہت واضح ہے کہ لوگوں کے دلوں سے خوف خدا جاتا رہا، مسجد کے مال کو مال غنیمت سمجھ کر لوگ ہڑپ کر جائیں گے۔ جب آباد مساجد کی گھڑیاں، دریاں، ٹوئیاں، لاؤڈ سپیکر وغیرہ آئے دن چوری ہو رہے ہیں تو غیر آباد مساجد کو مساجد سمجھ کر لوگ کیسے معاف کریں گے؟ یہ کہنا کہ ان کا سامان اپنے تصرف میں کوئی نہیں لائے گا، یہ خوش فہمی باطل ہے۔

وقف کرنے کیساتھ ہی مالک کی ملکیت ختم:

”یزول الملک بالقول عند ابی یوسف رحمہ اللہ وهو قول الانمة الثلاثة وهو قول اکثر اهل العلم وعلى هذا مشائخ بلخ وفى المنية وعليه الفتوى كذا فى فتح القدير وعليه الفتوى كذا فى السراج الوهاج“
(عالمگیری ج ۲ ص ۳۵۲)

زمین کا مالک جب زبان سے ہی وقف کر دے تو اس کا ملک زائل ہو جاتا ہے۔ یہی قول ائمہ ثلاثہ کا ہے۔ اسی پر اکثر اہل علم ہیں اور اسی پر بلخ کے مشائخ ہیں۔ منیہ میں ذکر ہے کہ اسی پر فتویٰ ہے۔ فتح القدير میں بھی یہی ذکر ہے۔

تنبیہ: اگرچہ اس مسئلہ میں ائمہ کرام کا اختلاف ہے لیکن فتویٰ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے قول پر ہی ہے۔ کہ جو نہی واقف (وقف کرنے والے) نے زبان سے وقف کرنے کا قول کیا وہ جائیداد وقف ہو جائے گی اور اس کی ملکیت زائل ہو جائے گی۔ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک زمین کو علیحدہ کر دینا، یہاں تک کہ قبرستان کے لئے زمین ہو تو اس میں کسی ایک کا دفن ہونا، مسجد کے لئے ہو تو کسی ایک کا نماز ادا کر لینا مالک کی ملکیت کو ختم کر دے گا۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک صرف علیحدہ کر دینا زوال ملکیت کے لئے کافی ہے۔ لیکن امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک صرف زبان سے کہہ دینا ہی کافی ہے۔

صاحب درمختار اور علامہ شامی نے فرمایا:

”ویزول ملکہ عن المسجد والمصلی بالفعل والمصلی شمل مصلی الجنازة ومصلی العید بالفعل ای بالصلوة فیہ وبقوله جعلته مسجدا عند الثانی ای عند ابی یوسف یزول بمجرد القول وشرط محمد والامام الصلوة فیہ ای مع الافراز“

(من درمختار و شامی ج ۳ ص ۴۰۴، ۴۰۵)

”واعلم ان الوقف انما احتیج فی لزومه الى القضاء.“ (شامی ج ۳ ص ۴۰۵)

اور ایک قول کے مطابق عند الامام توقف علی القضاء بھی ہے۔

”وقدم فی التنویر والدرر والوقایة وغیرها قول ابی یوسف وعلمت ارجحیتہ فی الوقف والقضاء“
(شامی ج ۳ ص ۴۰۵)

فقہ کی اکثر کتب تنویر الابصار، درر، وقایہ وغیرہ میں امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے قول کو ہی مقدم سمجھا گیا ہے۔ علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ اپنا مختار بھی یہی بیان کرتے ہیں کہ میں نے وقف اور قضاء میں امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے قول کو ہی رائج قرار دیا ہے۔

مسجد کو شہید کر کے نئی مسجد بنانے کا حکم:

اگر کوئی شخص اس محلہ کا نہیں جہاں مسجد واقع ہے اور وہ چاہتا ہے کہ میں اس مسجد کو شہید کر کے اس کی جگہ پختہ نئی مسجد بنا دوں۔ تو اسے یہ حق حاصل نہیں۔ ہاں البتہ اہل محلہ اس پر راضی ہو جائیں تو وہ ایسے کر سکتا ہے۔ یا مسجد کے گرنے کا خطرہ ہو تو اہل محلہ یا قاضی سے پوچھے بغیر وہ نئی مسجد تعمیر کر سکتا ہے۔ اہل محلہ خود پہلی مسجد کو شہید کر کے نئی بنانا چاہتے ہوں تو وہ بنا سکتے ہیں لیکن بشرطیکہ وہ اس پر مال اپنی طرف سے خرچ کریں، مسجد کے وقف شدہ مال سے قاضی کی اجازت کے بغیر خرچ نہ کریں۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

”عند الهندية مسجد مبنی اراد رجل ان ينقضه وبينه احکم ليس له ذلك لانه لا ولاية له ”مضمرات“ الا ان يخاف ان يهدم ان لم يهدم. ”تارخانیہ“ وتاويله ان لم يكن الباني من اهل تلك المحلة واما اهلها فلهم ان يهدموه ويجددوا بناؤه ويفرشوا الحصى ويلقوا القناديل لكن من مالهم لا من مال المسجد الا بامر القاضي ”خلاصہ“.

(شامی ج ۳ ص ۲۰۵)

راقم کے نزدیک تعامل ناس کے پیش نظر قاضی سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔

کشادگی مسجد: فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

”قوم بنوا مسجدا واحتاجوا الى مكان يتسع المسجد واخذوا من الطريق وادخلوا في المسجد ان كان يضر باصحاب الطريق لا يجوز وان كان لا يضر بهم رجوت ان لا يكون به بأس كذا في المضمرات“

(عالمگیری ج ۲ ص ۴۵۱، ۴۵۲)

کچھ حضرات نے مسجد بنائی لیکن بعد میں اس کی توسیع کی ضرورت پیش آئی یعنی نمازیوں پر وہ مسجد تنگ ہو گئی اور ان لوگوں نے راستہ کی کچھ زمین مسجد میں شامل کر لی۔ اگر گزرنے والوں کے لئے تکلیف کا

سبب ہے تو ناجائز ہے یعنی گزرنے والوں کے لئے راستہ کو تنگ کرنا جائز نہیں اور اگر راستہ تنگ نہیں ہوا تو یہ جائز ہے، مضمرات میں اسی طرح مذکور ہے اور یہی قول مختار ہے۔

نیز خزائن المفتیین میں بھی یہی ہے۔

”ان ارادوا ان يجعلوا شيئاً من المسجد طريقاً للمسلمين فقد قيل ليس لهم ذلك وانه صحيح كذا في المحيط“
(عالمگیری ج ۲ ص ۴۵۷)

اگر لوگ یہ چاہیں کہ مسجد کی کچھ جگہ مسلمانوں کے راستہ میں شامل کر لیں تو یہ ان کے لئے جائز نہیں اور یہی صحیح ہے۔ محیط میں بھی یہی مذکور ہے۔

سبحان اللہ! جب مسجد کا کچھ حصہ بھی سڑک میں شامل نہیں کیا جاسکتا تو پوری مسجد کو سڑک میں شامل کرنا کس طرح جائز ہے۔ دراصل جب سے اپنی مرضی کے مطابق دین کو ڈھالنا شروع کر دیا گیا، اس وقت سے دینی مسائل کا حلیہ بگاڑ دیا گیا۔ دو جملے اکثر طور میں پڑھے لکھے بے وقوفوں کی زبان سے سنتا ہوں تو حیران ہوتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ ”کچھ نہیں ہوتا“ دوسرا یہ کہ ”سب ٹھیک ہے“۔ کاش! وہ پیشاب پی کر اور اپنی ماں یا بیٹی سے نکاح کر کے بھی یہی دو جملے استعمال کریں۔

الٹی چال: مسئلہ تو یہ ہے کہ راستہ کی جگہ مسجد میں شامل کرنا جائز ہے بشرطیکہ گزرنے والوں کے لئے راستہ تنگ نہ کر دیا جائے لیکن مسجد کی جگہ کو راستہ میں کسی طرح بھی شامل کرنا جائز نہیں۔

الٹی ہی چال چلتے ہیں چمچگانِ ملوک
خرد کا نام جنوں، جنوں کا نام خرد رکھ دیا

لیکن آج کل اسلامی ملک میں مسلمان حکمران اور ان کے مسلمان چمچگان مساجد کو اس لئے شہید کر رہے ہیں کہ گاڑیوں کی آمد و رفت کے لئے آسانی ہو جبکہ اکثر و بیشتر گاڑیاں حرام کمائی کے مال سے حاصل کی ہوئی ہیں۔

مسجد کی توسیع کیلئے ساتھ والی زمین قاضی جبرائیل لے لے:

”ولو ضاق المسجد على الناس وبجنبه ارض لرجل تؤخذ ارضه بالقيمة كرها كذا في فتاویٰ قاضیخان“
(عالمگیری ج ۲ ص ۴۵۲)

اگر مسجد لوگوں پر تنگ ہو جائے، اس کے اطراف میں کسی شخص کی زمین ہو تو اس زمین کی قیمت ادا کر کے وہ زمین اس شخص سے زبردستی بھی لی جاسکتی ہے۔
فتاویٰ قاضی خان میں بھی یہی مذکور ہے۔

”ارض وقف علی مسجد و الارض بجانب ذلک المسجد و ارادوا ان یزیدوا فی المسجد شیئا من الارض جاز لکن یرفعون الأمر الی القاضی لیأذن لہم“

(عالمگیری ج ۲ ص ۳۵۶)

مسجد کے لئے زمین وقف کی گئی ہو اور اس کے اطراف میں زمین ہو، لوگ چاہتے ہوں کہ اس زمین سے اور بھی ملا کر مسجد کی توسیع کر لی جائے تو یہ ان کے لئے جائز تو ہے لیکن یہ معاملہ قاضی کے پاس لے جائیں تاکہ وہ ان کو اجازت دے۔

وجہ یہ ہی ہے کہ کسی قسم کا نزاع نہ ہو۔ قاضی کے فیصلہ کے بعد ہر شخص مطمئن ہو جائے گا اور معاملہ خوش اسلوبی سے طے پا جائے گا۔ تاہم یہ بھی ضروری ہے کہ صاحب ارض کو قیمت دی جائے تاکہ اس کا بھی نقصان نہ ہو اور اگر مسجد کی زمین کے ساتھ ہی اور وقف شدہ زمین ہو تو مسجد کی ضرورت کے پیش نظر قاضی اس کو مسجد میں ملانے کی اجازت دے سکتا ہے۔

مسجد تعمیر ہو جانے کے بعد نیچے یا اوپر دکانیں بنانا منع ہے:

”اذا اراد انسان ان یتخذ تحت المسجد حوانیت غلة لمرمة المسجد أو فوقه لیس له ذلک کذا فی الذخیرة“

(عالمگیری ج ۲ ص ۳۵۵)

مسجد کے نیچے یا اوپر مسجد کی آمدنی کے لئے دکانیں بنانا منع ہے۔ لیکن خیال رہے کہ یہ حکم مسجد بن جانے کے بعد کا ہے۔

مسجد کی تعمیر سے پہلے نیچے دکانیں بنا کر اوپر مسجد بنانا جائز تو ہے تاہم بہتر پھر بھی نہیں۔

”ولو کان السرداب لمصالح المسجد جاز کما فی مسجد بیت المقدس کذا فی الہدایة“

(عالمگیری ج ۲ ص ۳۵۶)

اگر مسجد کا تہ خانہ مسجد کی ضروریات و مصالح کے لئے بنایا گیا ہو تو جائز ہے جیسا کہ مسجد بیت المقدس میں تہ خانہ مسجد کی ضروریات کے لئے بنایا گیا ہے۔ ہدایہ میں بھی یہ مسئلہ اسی طرح مذکور ہے۔

عارضی مسجد حکم مسجد میں نہیں:

کسی جگہ ضرورت کے پیش نظر نماز پڑھنی شروع کر دی گئی۔ زمین مسجد کے لئے وقف نہیں اور مسجد کا اسے حکم نہیں دیا گیا تو اس پر مسجد والے احکام جاری نہیں کیے جائیں گے۔

”متولی مسجد جعل منزلاً موقوفاً علی المسجد مسجداً و صلی الناس فیہ سنین ثم ترک الناس الصلوة فیہ فاعید منزلاً مستغلاً جاز لانه لم یصح جعل المتولی ایاہ مسجداً کذا فی الوقعات الحسامیة“
(عالمگیری ج ۲ ص ۳۵۶)

مسجد کی آمدنی کے لئے ایک مکان وقف کیا گیا۔ مسجد کے متولی نے اس مکان میں بھی لوگوں کو نماز پڑھنے کی اجازت دے دی، کئی سال اس میں لوگ نماز ادا کرتے رہے، پھر لوگوں نے اس میں نماز ادا کرنی چھوڑ دی تو پھر اسے وہی مکان والی حیثیت حاصل ہوگی، مسجد والا حکم حاصل نہیں ہوگا کیونکہ متولی کی طرف سے اس میں نماز کی اجازت دینے سے وہ مسجد نہیں بن گئی، جب تک وقف کرنے والا اسے مسجد کے لیے وقف نہ کرے وہ وقف ہونے کے باوجود مسجد نہیں۔

مرض موت میں اپنے مکان کو مسجد بنانے کا حکم:

کوئی شخص اپنی جائیداد کے تہائی حصہ سے زائد کی وصیت نہیں کر سکتا۔ اگر تہائی حصہ سے زائد کی وصیت کرے تو وہ بھی تہائی حصہ تک ہی جاری ہوگی، اس سے زائد کی وصیت باطل ہو جائے گی۔

ایک شخص نے اپنی مرض موت میں اپنے مکان کو مسجد بنا دیا لیکن یہ مکان اسکی جائیداد کا تہائی حصہ نہیں بن سکتا بلکہ اس مکان میں بھی ورثاء کا حصہ بنتا ہے تو اس مکان کو مسجد بنانا باطل ہو جائیگا۔ یہ مکان اسکے ورثاء میں تقسیم ہو جائے گا۔ (ہاں اگر مکان کے تہائی حصہ کی قیمت کسی مسجد میں خرچ کرنی پڑے گی)۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

”مریض جعل دارہ مسجداً ومات ولم تخرج من الثلث ولم تجز الورثة صار کله میراثاً وبطل جعله مسجداً لان للورثة فیہ حقاً فلم یکن مقرراً عن حقوق العباد فقد جعل المسجد جزءاً اشائعاً فیبطل“
(عالمگیری ج ۲ ص ۳۵۶)

مسجد کی جگہ کو بیچنا جائز نہیں:

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

”وفی وقف الخصاف اذا جعل ارضه مسجدا و بناه و اشهد ان له ابطاله و بیعه فهو شرط باطل و یكون مسجدا“
(عالمگیری ج ۲ ص ۴۵۷)

امام خصاف نے کتاب الوقف میں ذکر کیا ہے کہ جب کوئی شخص اپنی زمین پر مسجد تعمیر کر لے پھر اس پر گواہ پیش کرے کہ مجھے حق حاصل ہے کہ میں اسے گرا دوں اور اپنی زمین بنالوں یا بیچ دوں تو اس کے اس دعویٰ کو نہیں سنا جائے گا۔ وہ زمین مسجد ہی رہے گی، اس کا یہ شرط لگانا باطل ہو جائے گا۔ مسجد کے لیے جمع ہونے والے مال سے خدام کو تنخواہ دی جاسکتی ہے:-

”وللمتولی ان یستاجر من یخدم المسجد بکنسہ ونحو ذلک بأجر مثله او زیادة یتغابن“
(عالمگیری ج ۲ ص ۴۶۱)

مسجد کے متولی کے لیے یہ جائز ہے کہ مسجد کی صفائی کے لیے تنخواہ پر خدام مقرر کرے۔ مناسب مقدار میں تنخواہ دی جائے جو عام خدام کی ہوتی ہے یا کچھ زائد بھی ہو تو جائز ہے۔ مسجد کی ضروریات کے لیے جمع ہونے والے فنڈ کا بھی یہی حکم ہے۔

امام اور مؤذن کی رہائش کا حکم:

مسجد کی تعمیر کے نام پر حاصل کئے ہوئے مال سے امام اور مؤذن کی رہائش کے لیے مکان تعمیر نہ کیا جائے بلکہ مسجد کی متعلقہ ضروریات کے لیے ہی مال حاصل کیا جائے۔ اگر صرف مسجد کی تعمیر کا نام لے کر مال حاصل کیا گیا تھا تو ایسے تعمیری کاموں میں خرچ کرنے کیلئے مال دینے والے سے اجازت طلب کرنی پڑے گی۔ اگرچہ عام رواج کے مطابق لوگوں کو معلوم تو ہوتا ہے کہ مسجد کی تعمیر سے مراد مسجد کا وضوء خانہ، استنجاء خانہ، امام اور مؤذن کی رہائش گاہیں، مسجد کی ضرورت کا ستور اور مسجد کی آمدنی کا ذریعہ بنانے کے لیے دکانیں بھی ہیں۔ لیکن پھر بھی اعلان اس انداز میں کیا جائے کہ جس میں کسی قسم کے ناجائز ہونے کا شائبہ بھی نہ پایا جائے۔

”متولی المسجد اذا اشتری بالغلة التي اجتمعت عنده من الوقف منزلا ودفع المنزل الى

المؤذن يسكن فيه ان علم المؤذن ذلك كره ان يسكن في ذلك المنزل لان هذا المنزل من مستغلات الوقف ويكره للامام والمؤذن ان يسكن في ذلك المنزل كذا في فتاوى قاضیخان“
(عالمگیری ج ۲ ص ۲۲۲)

مسجد سے گزرنے کا حکم:

بعض اوقات مسجد کے دو دروازے ہوتے ہیں، ایک دروازہ سے داخل ہو کر مسجد کے حصہ سے گزرتے ہوئے دوسرے دروازہ سے گزرا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں بوجہ عذر گزرنا جائز، اور بغیر عذر کے ناجائز ہے۔ مسجد کا ادب واحترام ملحوظ خاطر رکھا جائے۔ عذر سے مراد بارش کا ہونا یا مسجد سے نکلنا ہے۔ مطلقاً شارع عام (گذرگاہ) بنانا جائز نہیں۔

اسی گذرگاہ کے متعلق فرمایا گیا:

”جاز لكل احد ان يمر فيه حتى الكافر الا الجنب والحائض والدواب“ (در مختار، زیلعی)
”وقد قال في البحر وكذا يكره ان يتخذ المسجد طريقا وان يدخله بلا طهارة“

(شامی ج ۳ ص ۲۲۰)

”المشي فيها وقت المطر ونحوه لاجل الصلوة او للخروج من الجمع لا لمرور المارين مطلقا كالطريق العام“

(شامی ج ۳ ص ۲۲۰)

(شامی ج ۳ ص ۲۲۰)

(شامی ج ۳ ص ۲۲۰)

”لا يجوز ان يتخذ المسجد طريقا“

”لو جعل الطريق مسجدا يجوز لا جعل المسجد طريقا“

راستہ کو مسجد بنانا جائز ہے لیکن مسجد کو راستہ بنانا جائز نہیں۔

خیال رہے کہ مندرجہ بالا حکم کا تعلق اس راستہ سے نہیں جو مسجد کے ایک دروازہ سے داخل ہو کر دوسرے دروازہ سے نکل جائے لیکن مسجد کا صحن یا مسجد کا کوئی حصہ اس میں شامل نہ ہو یا مسجد کی حد بندی سے باہر ہو، اسے مسجد والا حکم حاصل نہیں۔

مسجد کی زمین کو فروخت کرنا جائز نہیں:

”في فتاوى الحجة لو صار احد المسجدين قديما وتداعى الى الخراب فاراد اهل السكة بيع القديم وصرفه في المسجد الجديد فانه لا يجوز“ (عالمگیری ج ۲ ص ۲۵۸)

فتاویٰ حجة میں یہ مذکور ہے کہ ایک مسجد قدیم ہے وہ خراب ہو چکی ہے، اس میں لوگ نماز نہیں ادا کرتے۔ دوسری مسجد جدید ہے، اہل محلہ چاہتے ہیں کہ پرانی مسجد کی زمین کو بیچ کر نئی مسجد کی تعمیر پر لگا دیں تو وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ وجہ وہی ہے جس کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ مسجد تا قیامت مسجد ہے۔ مسجد کی زمین کو بیچا نہیں جاسکتا۔

مسجد کی زمین کو کسی اور تصرف میں لانا منع ہے:

”ارض وقف علی مسجد صارت بحال لا تزرع فجعلها رجل حوضاً للعامة لا يجوز للمسلمین انتفاع بماء ذلک الحوض کذا فی القنیة.“ (عالمگیری ج ۳ ص ۴۶۳)

مسجد کے لیے زمین وقف کی گئی وہ کاشت کے قابل نہیں (کہ اس کی پیداوار کو مسجد پر خرچ کیا جائے) کسی شخص نے وہاں عام لوگوں کے نفع کے لیے تالاب بنا دیا تو مسلمانوں کے لئے اس تالاب سے نفع حاصل کرنا جائز نہیں۔

بوقت مشکل مسجد کا مال بطور قرض لینا:

”اما المال الموقوف علی المسجد الجامع ان لم تکن للمسجد حاجة للمال فللقاضی ان یصرف فی ذلک (ای لنائبۃ نابت الاسلام مثل حادثة الروم) لکن علی وجه القرض فیکون دینا فی مال الفی“ (عالمگیری ج ۲ ص ۴۶۳)

جو مال جامع مسجد پر وقف کیا گیا ہے اگر اس مال کی مسجد کو وقتی طور پر ضرورت نہیں تو قاضی کے لیے جائز ہے (کہ اگر اسلام اور مسلمین پر کوئی مشکل وقت آجائے، کفار حملہ آور ہو جائیں، ان کی یلغار کو روکنا ہو) کہ وہ مال بطور قرض لے لے اور مال فی میں سے بعد میں ادا کرے۔

مسجد کے مال کو کیسے خرچ کیا جائے؟

اگر مال دینے والے نے مشروط کیا ہے تعمیر سے تو وہ مال تعمیر پر ہی خرچ کیا جائے۔ اگر مال دینے والے نے بغیر کسی شرط کے مسجد کی ضروریات کے لیے مال دیا ہے تو وہ انتظامیہ جس طرح چاہے خرچ کرے۔

”قالوا ان وسع الواقف ذلك للقيم وقال تفعل ما ترى من مصلحة المسجد كان له ان يشتري للمسجد ما شاء وان لم يوسع ولكنه وقف لبناء المسجد وعمارة المسجد ليس للقيم ان يشتري به دهنًا او حصيرا او حشيشا وغيرها.“ (عالمگیری ج ۲ ص ۲۶۱)

مسجد پر مال وقف کرنے والے شخص نے اگر منتظم مسجد کو اختیار دیا ہو کہ تم جس طرح چاہو خرچ کرو تو منتظم کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جیسے چاہے خرچ کرے اور اگر مال دینے والے نے مال صرف مسجد کی تعمیر کے لیے دیا ہے تو منتظم کے لیے جائز نہیں کہ وہ مال ”تعمیرات“ کے بغیر دوسرے مصارف جہاں جلائے کے لیے تیل، چٹائیاں، چٹائیوں کی جگہ سردیوں میں ڈالے جانے والے گھاس کی خرید پر خرچ کرے۔ اس لیے منتظمین کو چاہیے کہ وہ مطلقاً مسجد کی ضروریات کے لیے چندہ جمع کریں۔ کسی خاص کام کے لیے مختص نہ کریں ورنہ اسی کام پر مال خرچ کرنا پڑے گا۔

”ولو وقف علی عمارتہ یصرف الی بنائہ وتطیینہ دون تزینہ“

(عالمگیری ج ۲ ص ۲۶۱)

اگر کسی شخص نے مال صرف تعمیر کے لیے دیا ہے تو اس کو تعمیر اور لپائی یعنی پلستر پر خرچ کیا جاسکتا ہے۔ وہ مال آرائش اور زیب و زینت پر نہیں خرچ کیا جاسکتا۔
مساجد کو برباد کرنے والے ظالم ہیں:

﴿وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَنَعَ مَسْجِدَ اللَّهِ أَنْ يُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ وَسَعَىٰ فِي خَرَابِهَا﴾

(پ ۱ ع ۱۳)

اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ کی مسجدوں سے رو کے اللہ کا نام لیے جانے سے اور ان کی بربادی میں کوشش کرے۔

آیت کریمہ کا شان نزول خواہ بخت نصر کا بیت المقدس کو برباد کرنا ہو، یا کفار مکہ کا نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کو عمرہ ادا کرنے اور مسجد حرام میں داخل ہونے سے منع کرنا ہو۔ خواہ نصاریٰ کے بادشاہ کا بیت المقدس میں مردہ جانوروں کا پھینکنا اور توراۃ کو جلانا ہو یا مشرکین مکہ کا نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کو مسجد حرام میں داخل ہونے سے منع کرنا اور ہجرت پر مجبور کرنا ہو۔ خواہ تحویل قبلہ کے وقت یہود کا کعبہ شریف کی طرف متوجہ ہو کر نماز ادا کرنے سے منع کرنا ہو۔ بہر حال مراد عام ہے۔ ہر مسجد کا یہی حکم ہے اور ہر شخص جو مساجد میں اللہ کا ذکر کرنے سے منع کرے اور مساجد کو برباد کرے وہ بہت بڑا ظالم ہے۔

علامہ آلوسی اور امام فخر الدین رازی فرماتے ہیں:

”وظاهر الآية العموم فی کل مانع وفی کل مسجد وخصوص السبب لا یمنعه“

(کبیر، روح المعانی)

ظاہر آیت کریمہ سے عموم ہی سمجھ آ رہا ہے، ہر روکنے والا شخص اور مسجد کو برباد کرنے والا شخص مراد ہے اور ہر مسجد مراد ہے۔ خصوص سبب اس سے مانع نہیں۔

مساجد کو برباد کرنے والا بڑا ظالم کیوں؟

”ظلم“ کا معنی ہے کسی چیز کو اپنے محل میں نہ رکھنا۔ یعنی کسی کا حق مارنا۔ حق دنیاوی بھی ہوتا ہے اور دینی بھی۔ پھر لوگوں کا اپنے آپ پر بھی حق ہوتا ہے۔ پھر کعبہ معظمہ، مسجد اور قرآن شریف کا بھی حق ہے کہ انکی تعظیم کی جائے۔ مساجد کو برباد کرنے والا اللہ اور اسکے رسول ﷺ کا حق مارتا ہے، اور مسلمانوں کا حق بھی مارتا ہے۔ خود مسجد کا حق برباد کرتا ہے، یہاں تک کہ اپنے نفس کا حق بھی تباہ کرتا ہے۔

اس شخص کا حق تو یہ تھا کہ وہ مسجد میں حاضر ہو کر عبادت کرتا، اپنے نفس کو عذاب سے بچاتا، خود مسجد میں عبادت نہ کرنے سے اپنے نفس کا حق بھی برباد کر رہا ہے۔ مسجد کا حق چھین کر مسجد کی بے حرمتی کر رہا ہے، اللہ اور اسکے رسول ﷺ کو ناراض کر رہا ہے اور مسلمانوں کیلئے مشکلات پیدا کر کے ان کو نمازوں سے روک رہا ہے۔ یہ شخص بہت بڑا ظالم کیوں نہ ہو جبکہ چور مالی ظلم کرتا ہے، قاتل جانی ظلم کرتا ہے اور یہ شخص ایمانی ظالم ہے۔ لہذا یہ شخص بدترین شخص ہے اور بہت بڑا ظالم ہے۔ (ملخص از تفسیر نعیمی)

مسجد کو برباد کرنے کی دو قسمیں ہیں:

”السعی فی تخریب المسجد قد یكون لوجهین احدهما منع المصلین

والمتعبدین والمتعہدین له من دخوله فیکون ذلک تخریباً والثانی بالهدم والتخریب“

(تفسیر کبیر)

مسجد کو برباد کرنے کی کوشش دو طرح ہے:

(۱) ایک ان میں سے یہ ہے کہ نمازیوں، عبادت گزاروں اور مسجد میں جانے کا عہد کرنے والوں کو مساجد میں داخل ہونے سے روکنا یہ درحقیقت مساجد کے لیے تخریب کاری ہے کیونکہ ایسے افعال سے مساجد برباد ہوتی ہیں۔ چونکہ نمازیوں، عبادت گزار لوگوں سے ہی مساجد آباد ہوتی ہیں، جب ان کو ہی

روک دیا گیا تو مساجد خود بخود دیران ہو جائیں گی۔

(۲) مساجد کی بربادی کی دوسری قسم یہ ہے کہ مساجد کو منہدم کر دیا جائے، یعنی مساجد کو گرا کر شہید کر دیا جائے، ان پر بلڈوزر چلا دیے جائیں، یہ ظلم عظیم ہے، ایسے فعل کے مرتکب لوگ ظالم ہیں جو خدا کی گرفت میں آئیں گے، اس وقت ان کو اپنے کیے ہوئے کاموں کے انجام کا پتہ چلے گا۔

مقام حیرت!

ہندوستان میں غیر مسلم جب بابر کی مسجد کو شہید کریں تو پاکستان کے مسلمان احتجاجی مظاہرے کریں، خطباء مساجد میں اپنے اپنے خطابات میں ان کی پرزور مذمت کریں، آج کے وزیراعظم جناب محمد نواز شریف اس وقت کے بھی وزیراعظم تھے، وہ بھی اپنی زبان ذیشان سے ہندوستان کی شدید مذمت کریں، ہماری نیشنل اسمبلی کے ارکان بھی مذمت کریں لیکن شاہراہوں کو کشادہ کرنے کے لئے مساجد کو شہید کرنا کہاں کا انصاف ہے؟ عوام ٹس سے مس نہیں ہو رہے، خطباء خاموش ہیں۔ ارکان اسمبلی کی زبانیں بند ہیں۔ حکومت خود یہ کام کر رہی ہے۔ یہ ظلم عظیم نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ قہر خداوندی کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ مجھے امید ہے مساجد کو شہید کرانے والے دنیا میں ہی خدا کی گرفت میں آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمارا حامی و ناصر ہو۔

تنبیہ: کسی کی زمین پر بغیر اجازت کے مسجد بنانا جائز نہیں۔ جو مسجد مفسوبہ زمین پر بنائی گئی ہو اس میں نماز ادا کرنا حرام ہے۔ اسلام آباد میں حکومت کی زمین پر ناجائز طور پر جہلاء نے جہاں جہاں مساجد بنائی ہیں۔ ان تمام کا یہی حکم ہے۔ ہاں اگر مسجد تو غاصبانہ طور پر بنائی گئی بھی بعد میں حکومت نے اجازت دے دی تو اجازت کے بعد نمازیں ادا کرنا درست ہوگا۔ اجازت سے پہلے جو نمازیں ادا کی گئی تھیں وہ حرام طور پر ادا ہوئیں۔

صاحب نور الانوار لکھتے ہیں:

”وكذا الصلوة في الارض المغصوبة مشروعة في ذاتها وانما تحرم لاجل مشغل ملك الغير“

(نور الانوار ص ۲۲)

مفسوبہ زمین میں نماز ادا کرنا اگرچہ ذاتی طور پر جائز نظر آتا ہے کہ وہ نماز ادا کر رہا ہے، نیکی کا کام کر رہا ہے لیکن غیر کی ملکیت میں جبراً بے اجازت نماز ادا کرنے کی وجہ سے حرام ہے۔

اعتراض: بعض لوگ ایسے غاصبانہ قبضے پر بھی جواز کا فتویٰ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ علامہ

شامی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔

”وفی شرح المنیۃ للحلبی بنی مسجد فی ارض غصب لاباس بالصلوة فیہ“

(شامی جلد اول ص ۲۸۱)

منیہ کی شرح حلبی میں ذکر ہے کہ مغصوبہ زمین میں مسجد بنائی گئی ہو تو اس میں نماز ادا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

اس سے تو پتہ چلا ہے کہ مغصوبہ زمین میں نماز جائز ہے۔ حرام کہنا کیسے صحیح ہے؟

جواب : جیسا کہ نور الانوار کی عبارت سے واضح ہے کہ مغصوبہ زمین میں نماز ادا کرنا بذاتہ جائز ہے لیکن ملک غیر کی وجہ سے حرام ہے۔ علامہ شامی نے جو عبارت نقل کی ہے۔ اس کا مطلب بھی یہی ہے۔ جیسا کہ میں نے اپنے رسالہ ”اقامت بیٹھ کر سننا مستحب ہے“ میں ذکر کیا ہے کہ علامہ شامی کے لفظ ”لاباس“ سے کئی جہلاء منافقین غلطی کا شکار ہوئے اصل میں لاباس سے مطلقاً جواز کا ذکر نہیں۔ بلکہ فریضہ کی ادائیگی کا ذکر ہے۔ کیونکہ علامہ شامی نے اسی عبارت کیساتھ متصل یہ عبارت ذکر کی ہے۔

”وفی الوقعات بنی مسجد علی سور المدینۃ لا ینبغی ان یصلی فیہ لانہ حق العامة فلم یخلص للہ تعالیٰ کالمبنی فی ارض مغصوبہ“

(شامی جلد اول ص ۲۸۱)

واقعات میں مذکور ہے کہ شہر کی دیوار پر اگر کسی نے مسجد بنائی تو اس میں نماز ادا کرنا درست نہیں کیونکہ وہ خاص اللہ تعالیٰ کا حق نہیں بلکہ اس میں بندوں کا حق ہے جیسا کہ مغصوبہ زمین میں نماز ادا کرنا درست نہیں اب واضح ہوا کہ مغصوبہ زمین میں نماز ادا کرنا جائز نہیں لہذا مغصوبہ زمین میں مساجد بنا کر اپنے آپ کو مبلغ ظاہر کرنے والے درحقیقت لوگوں کی نمازوں کو برباد کرنے والے ہیں اور لوگوں سے اللہ کے نام پر چندہ بنور کر حرام کام پر لگانے والے ہیں۔ ایسے گربہ مسکینوں، تخریب کاروں سے بچنا ضروری ہے۔

مغصوبہ زمین پر بنائی گئی مسجد میں اعتکاف :

نماز کی طرح مغصوبہ زمین پر بنائی گئی مسجد میں اعتکاف خصوصاً رمضان المبارک کے مقدس مہینے میں اعتکاف سنت ادا نہ ہوگا۔ لہذا ایسی مساجد میں اجر و ثواب کی غرض سے اعتکاف بیٹھ کر اپنا وقت ضائع نہ کیا جائے۔

﴿وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَأَيْنَمَا تُولُوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ط

(آیت ۱۱۵)

إِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ﴾

(۱) اور پورب پچھم سب اللہ ہی کا ہے تو تم جدھر منہ کرو ادھر وجہ اللہ (خدا کی رحمت تمہاری طرف متوجہ) ہے بے شک اللہ وسعت والا، علم والا ہے۔

(۲) اور اللہ کے لئے مشرق ہے اور مغرب، تو جدھر تم منہ کرو ادھر ہی اللہ متوجہ ہے، بیشک اللہ وسعت والا علم والا ہے۔

شان نزول: اس آیت کریمہ کے نزول میں چند وجوہ پائی جاتی ہیں۔ یعنی کئی واقعات پہلے رونما ہوئے اور آیت کریمہ کا نزول بعد میں ہوا۔ اس طرح تمام صورتیں نزول کی وجوہ ہیں۔

(۱) نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام جب مکہ مکرمہ میں تھے۔ ”وقد کان رسول اللہ ﷺ یصلی بمکة الی بیت المقدس والکعبة بین یدیه“ تو بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز ادا فرماتے تھے البتہ کعبہ شریف بھی آپ کے سامنے ہوتا، یعنی اس طرح کھڑے ہوتے کہ کعبہ بھی سامنے رہے اور توجہ بیت المقدس کی طرف بھی ہو جائے جب آپ مدینہ طیبہ میں آ گئے تو سولہ سترہ ماہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے رہے۔ یہاں وہ صورت نہیں تھی کہ بیت المقدس کی طرف منہ کرنے سے کعبہ کی طرف بھی منہ ہو جاتا، اس لئے کہ بیت المقدس مدینہ طیبہ سے شمالی جانب ہے اور کعبہ شریف جنوبی جانب ہے۔

حضور کے دل میں خیال آتا رہتا کہ کعبہ شریف ہی قبلہ ہو جائے۔ تو جب تک قبلہ منسوخ نہیں ہوا۔ اس وقت تک آپ کے دل کی تسلی کیلئے یہ آیت نازل ہوئی۔ ﴿وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ﴾ اور اللہ کے لئے ہی ہے مشرق و مغرب۔

مطلب یہ کہ کسی سمت کو بھی کمال حاصل ہوگا تو اس وجہ سے کہ رب تعالیٰ نے اس کی طرف توجہ کرنے کا حکم دیا ہے۔

(۲) ”عن ابن عمر انه كان يصلي حيث توجهت به راحلته ويذكر ان رسول الله ﷺ كان يفعل ذلك ويتناول هذه الآية فايئما تولوا فثم وجه الله“

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اپنی سواری پر نوافل ادا فرماتے رہتے تھے۔ آپ کی سواری جس طرف بھی متوجہ ہوتی رہتی، آپ فرماتے رسول اللہ ﷺ اسی طرح نوافل شہر کے بعد سواری پر ادا فرماتے رہتے۔ تو رب تعالیٰ نے اس آیہ کریمہ کو نازل فرمایا۔ ﴿فایئما تولوا فثم وجه الله﴾

(۳) بخاری میں حضرت نافع سے مروی ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے جب نماز خوف کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے نماز خوف کے متعلق مکمل وضاحت فرمائی۔ پھر فرمایا: ”فان كان خوف اشد من ذلك صلوا رجلا قیاما علی اقدامهم وركبانا مستقبلی القبلة غیر مستقبلیہا، قال نافع ولا اری ابن عمر ذکر ذلك الا عن النبی ﷺ“

کہ اگر خوف بہت ہی زیادہ ہو یعنی ایک امام کے پیچھے دو گروہ بن کر نماز نہ ادا کی جاسکے تو علیحدہ علیحدہ نماز ادا کی جائے جس طرح ممکن ہو۔ سواری پر نماز ادا کریں تو سواری قبلہ کی طرف متوجہ ہو یا قبلہ کی طرف متوجہ نہ ہو۔

حضرت نافع کہتے ہیں حضرت ابن عمر نے یقیناً یہ نبی کریم ﷺ سے سن کر ہی بیان فرمایا ہوگا۔ تو اس سے واضح ہوا کہ اس آیہ کے نزول کا تعلق صلوٰۃ خوف سے بھی ہے۔

(۴) قبلہ کے مشتبہ ہونے کی صورت میں صحابہ کرام نے اپنی اپنی سوچ اور خیال کے مطابق نماز ادا کر لی، تو بعد میں پتہ چلا کہ بعض حضرات کا منہ قبلہ کی طرف نہیں ہو سکا، نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا تو اس آیہ کریمہ کا نزول ہوا۔

خیال رہے کہ قبلہ کے مشتبہ ہونے کے متعلق کئی روایات بیان کی گئی ہیں مقصد سب کا ایک ہی ہے۔

(ماخوذ از فتح القدیر)

قرطبی رحمہ اللہ نے ان وجوہ کے بغیر ایک اور وجہ بھی بیان کی۔

حضرت قتادہ رحمہ اللہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے حضرت نجاشی کی وفات پر لوگوں کو مدینہ طیبہ

کے باہر جمع کر کے نماز جنازہ ادا فرمائی، تو بعض حضرات نے کہا۔ ”کیف نصلى على رجل مات وهو يصلى الى بيت المقدس حتى مات“ ہم اس شخص پر نماز جنازہ کیسے پڑھیں جو بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتا رہا۔ تو اس وقت یہ آیہ نازل ہوئی۔

خیال رہے کہ حضرت نجاشی حبشہ کے والی (حاکم) تھے۔ ان کا نام ”اصمہ“ تھا۔ عربی میں اس کا معنی ہے۔ ”عطیہ“ انہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ صرف اپنے نظام حکومت کی وجہ سے نبی کریم ﷺ کی ملاقات کے لئے حاضر نہیں ہو سکے تھے۔ اس لئے تابعی ہیں۔ صحابی نہیں۔ شاید بعض حضرات کا یہ کہنا بھی عدم علم کی وجہ سے تھا۔

نجاشی کا جنازہ پڑھانے کی حکمت:

”ان الارض دحيت له جنوبا و شمالا حتى رأى نعش النجاشي كما دحيت له شمالا و جنوبا حتى رأى المسجد الاقصى“

بے شک نبی کریم ﷺ کے لئے زمین شمال و جنوب کی طرف وسیع فرمادی، حجاب اٹھ گئے، یہاں تک کہ آپ نجاشی کو دیکھ کر ان کی نماز جنازہ پڑھا رہے تھے۔ جس طرح مسجد اقصیٰ آپ کے سامنے کر دی گئی تھی کہ آپ دیکھ کر مسجد اقصیٰ کی تمام علامات کو بیان فرما رہے تھے۔ جب واقعہ معراج ذکر کرنے کے بعد آپ سے مسجد اقصیٰ کی علامات پوچھی گئیں۔

”فانه اذ رآه فما صلى على غائب وانما صلى على مرئي حاضر والغائب مالا يرى، والله تعالى اعلم“

بے شک جب نبی کریم ﷺ نجاشی کو دیکھ رہے تھے۔ تو یہ غائب شخص کی نماز جنازہ نہیں تھی، بلکہ حاضر جو دیکھا جا رہا تھا۔ اس کی نماز جنازہ تھی۔ کیونکہ غائب تو وہ ہوگا جو دیکھا نہ جائے۔

”قال ابن العربي والذي عندي في صلاة النبي ﷺ على النجاشي انه علم ان النجاشي ومن آمن معه ليس عندهم من سنة الصلوة على الميت اثر، فعلم انهم سيدفونه بغير صلوة فبادر الى الصلوة عليه“

حضرت ابن عربی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ میرے نزدیک ایک اور وجہ بھی ہے کہ نبی کریم ﷺ کو معلوم

تھا کہ نجاشی اور دوسرے لوگ ان کے ساتھ ایمان لانے والوں کو نماز جنازہ کا مسنون طریقہ معلوم نہیں۔
ان تک ابھی یہ احادیث نہیں پہنچیں۔ اسلئے آپ نے نماز جنازہ پڑھائی تاکہ وہ اسی طرح دفن نہ کر دیں۔

(از قرطبی)

اتنا واضح ہو گیا کہ نماز جنازہ غائبانہ کا کوئی وجود نہیں۔ نبی کریم ﷺ نے نجاشی کی نماز جنازہ جو پڑھائی اس میں آپ کی تخصیص تھی۔ اس کو دلیل بنانا کہ غائبانہ جنازہ جائز ہے درست نہیں۔ زیادہ
مباحث کے لئے راقم کی کتاب۔ ”موت کا منظر مع احوال حشر و نشر“ کا مطالعہ کیا جائے۔

وَاللّٰهُ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ : (اور اللہ کے لئے ہے مشرق اور مغرب)

مشرق: طلوع ہونے کی جگہ۔ مغرب: غروب ہونے کی جگہ۔

کبھی ایک سمت کا لحاظ کر کے مفرد ذکر کر دیا جاتا ہے۔ جس طرح یہاں ذکر ہے۔ اور کبھی ہر روز
کی معمولی تبدیلی جو ہوتی رہتی ہے۔ کہ طلوع اور غروب میں تھوڑا تھوڑا فرق آتا رہتا ہے۔ اس کو مد نظر
رکھتے ہوئے جمع ذکر کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ ﴿رَبِّ الْمَشَارِقِ
وَالْمَغَارِبِ﴾ اور کبھی گرمیوں اور سردیوں کے نمایاں فرق کو مد نظر رکھتے ہوئے تثنیہ ذکر کیا جاتا ہے۔
جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَالْمَغْرِبَيْنِ﴾ یہاں مشرق و مغرب کا ذکر کر کے
مراد زمین کے کنارے لئے گئے ہیں اور ثابت یہ کیا گیا ہے۔ ”لہ الارض کلہا لا یختص بہ
مکان دون مکان“ کہ تمام زمین اللہ تعالیٰ کیلئے ہے یہ نہیں کہ کچھ مکان اس کے ہوں کچھ نہ ہوں۔

اسی سے ماقبل آیت سے تعلق بھی واضح ہو گیا۔ ”فان منعم ان تصلوا فی المسجد
الحرام ولا قضی قد جعلت لکم الارض مسجدا“ کہ مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ اگر تمہیں مسجد
حرام یا مسجد اقصیٰ سے نماز ادا کرنے سے منع کر دیا جائے تو تمہارے لئے ساری زمین کو ہی مسجد بنا دیا گیا
ہے۔ تمام زمین ہی اللہ تعالیٰ کی ہے جہاں چاہو نماز ادا کر لو۔ (ماخوذ از قرطبی، بیضاوی، شیخ زادہ)

﴿وَاللّٰهُ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ﴾ میں لام اختصاص کا ہے، معنی یہ ہے ”ہو

خالقہما و مالکہما﴾ کہ اللہ تعالیٰ مشرق و مغرب یعنی تمام زمین کا خالق اور مالک ہے۔ اسی سے پتہ
چل گیا کہ رب تعالیٰ جسمیت سے پاک ہے، اور اللہ تعالیٰ کا جہت اور مکان سے پاک ہونا واضح ہو گیا۔

دلیل:

مشرق اور مغرب دونوں جہتیں اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور مملوک ہیں۔ اور یہ بھی واضح ہے کہ جہت اس امر متد کو کہتے ہیں جو طول اور عرض اور عمق کے لحاظ پر پھیلے۔ ہر وہ چیز جو اسی طرح ہو وہ منقسم ہوتی ہے۔ جو چیز منقسم ہو وہ مؤلف و مرکب ہوتی ہے۔ ہر وہ چیز جو مؤلف و مرکب ہو اس کا خالق اور موجد ہونا ضروری ہے۔

یہ دلیل تمام جہات سے متعلق ہے۔ فوق، تحت وغیرہ تمام جہات کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ یقینی بات ہے کہ خالق مقدم ہے مخلوق پر، جب جہات ہی اور مکانات ہی نہیں تھے۔ خالق کا وجود اس وقت ہے تو رب تعالیٰ کا جہات سے پاک ہونا واضح ہے۔

اسی طرح جہان کی تخلیق کے بعد بھی جہات سے پاک ہونا ضروری ہے، کیونکہ انقلاب حقائق ممکن نہیں۔

اعتراض: جب ساتھ ہی آگے آ رہا ہے ﴿فَإَيْنَمَا تَوَلَّوْا فَشَمُّ وَجْهِ اللَّهِ﴾ جس طرف تم منہ پھرو اسی طرف اللہ تعالیٰ کا منہ ہے۔ تو کیسے کہا جاسکتا ہے کہ وہ جسم اور جہت اور مکان سے پاک ہے۔

جواب: یہاں ”وجہ“ کا حقیقی معنی ”منہ اور چہرہ“ مراد ہی نہیں۔ ورنہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں کذب لازم آئے گا کیونکہ ”منہ“ تو ایک طرف ہوتا ہے۔ مشرق کی طرف تو مغرب اور شمال و جنوب کی طرف نہیں ہوتا۔ اسی طرح اگر کسی دوسری جانب ہو تو اسی جانب ہوگا۔ جب رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿فَإَيْنَمَا تَوَلَّوْا فَشَمُّ وَجْهِ اللَّهِ﴾ تم جدھر منہ پھرو ادھر ہی ﴿وَجْهِ اللَّهِ﴾ ہے۔ تو یقیناً اس کا مجازی معنی معتبر ہے۔ وہ مجازی معنی کیا ہے؟ اس میں کئی احتمال ہیں۔

(۱) وجہ کی اضافت ”اللہ“ کی طرف تشریفی ہے۔ اور معنی اس کا تخلیق اور ایجاد ہے اب مطلب یہ ہوگا۔ ”تم جدھر منہ کرو اسی طرف کو اللہ تعالیٰ نے قبلہ بنایا ہے۔“

(۲) وجہ کا معنی قصد اور نیت ہو، جیسے ﴿إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلدِّينِ﴾ الخ میں یہی معنی معتبر ہے اب مطلب یہ ہوگا۔ ”جدھر تم منہ کرو وہی اللہ تعالیٰ کے ارادہ میں ہے۔“

(۳) وجہ بمعنی ”رضا“ ہو۔ جس طرح ﴿إِنَّمَا نَطْعُمُكُمْ لِرُضَا اللَّهِ﴾ میں یہی معنی معتبر ہے۔

بے شک ہم تمہیں اللہ کی رضا کے لئے کھلاتے ہیں۔ اب اس آیت کا مفہوم ہوگا تم جدھر منہ کرو ادھر ہی اللہ تعالیٰ کی رضا ہے۔

”﴿فَإِنَّ وَجْهَ اللَّهِ﴾ مع انه لا يجوز عليه المكان فلا بد من تأويله بأن المراد فثم قبلته التي يعبد بها او ثم رحمته ونعمته وطريق ثوابه والتماس مرضاته“

جب اللہ تعالیٰ کے لئے مکان اور جہت ثابت کرنا جائز نہیں تو ضروری ہے کہ اس کی تاویل کی جائے یا یہ کہا جائے وہی قبلہ ہے جس کی طرف توجہ کر کے عبادت کی جاتی ہے۔ یا یہ کہا جائے کہ اسی طرف اس کی رحمت اور نعمت ہے (اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی کے مطابق ہے۔ راقم نے بھی وہی نقل کیا صرف مختصر کیا) اور یا یہ کہا جائے اسی طرف ثواب کا طریقہ ہے، اور یا یہ کہا جائے کہ اسی طرف اس کی رضا کو حاصل کرنا ہے۔

(از کبیر)

علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے ان معانی کے علاوہ ذات بھی معنی کیا ہے۔ اس لحاظ پر معنی یہ ہوگا۔ ”تم جدھر منہ کرو اسی طرف اللہ کی ذات ہے۔“

(از روح المعانی)

خیال رہے ”تولوا“ اصل میں ”تولیوا“ ہے۔ ”ولی یولی تولیة“ سے لیا ہوا ہے۔ جو اصل میں متعدی ہے لیکن اس کا استعمال بمنزل لازم کے ہے۔

”ولی اذا قبل وولی اذا ادبر وهو من الاضداد ومعناه ههنا الاقبال“

ولی کا معنی متوجہ ہونا بھی ہے اور پیٹھ پھیرنا بھی ہے۔ یعنی اضداد کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ یہاں معنی متوجہ ہونا۔ یعنی جس طرف تم متوجہ ہو۔

(از کبیر و شیخ زادہ)

إِنَّ اللَّهَ وَاسِعٌ عَلِيمٌ : بے شک اللہ تعالیٰ وسعت والا، علم والا ہے۔

اعترض : ”انه تعالى وصف نفسه بكونه واسعا والسعة من صفة الاجسام“

اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی صفت واسع ہونے سے بیان فرمائی ہے۔ اور ”سعة“ (وسعت) کا تعلق اجسام سے ہے۔ جب اللہ تعالیٰ جسم ہونے سے پاک ہے، تو اس کے ”واسع“ ہونے کا کیا مطلب ہے؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت واسع ہونا بیان فرمائی ہے۔ اس کا حقیقی معنی تو نہیں لیا جاسکتا کیونکہ اس طرح تو رب تعالیٰ کا متجزی ہونا اور متبعض ہونا لازم آئے گا۔ اور کسی اور خالق کا ماننا لازم آئے گا، جو جائز نہیں۔

”بل لابد وان يحمل على السعة في القدرة والملك، او على انه واسع العطاء والرحمة، او على انه واسع الانعام ببيان المصلحة للعبيد لكي يصلوا الى رضوانه“

اس لئے ضروری ہے کہ اس کا معنی یہ لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ وسیع قدرت اور وسیع ملکیت کا مالک ہے۔ یا یہ معنی لیا جائے کہ وہ وسیع عطاء اور وسیع رحمت کا مالک ہے۔ یا یہ معنی لیا جائے کہ وہ وسیع انعام کا مالک ہے کہ اپنے بندوں کی مصلحت کے پیش نظر ان کو انعام سے نوازتا ہے تو وہ بھی اس کی رضا مندی کو حاصل کرتے ہیں۔

عَلِيمٌ: اس مقام پر تہدید کے لئے استعمال ہے کہ نمازی کو جب یہ معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ظاہر و باطن کو جانتا ہے۔ تو وہ نماز کی ادائیگی میں اور نماز کے ارکان وغیرہ میں سستی سے کام نہیں لے گا۔

”ويحتمل ان يكون قوله تعالى (واسع علیم) انه تعالى واسع القدرة في توفية ثواب من يقوم بالصلوة على شرطها و توفية عقاب من يتكاسل عنها“

اور یہ احتمال بھی پایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ وسیع قدرت والا ہے لہذا جو نماز کو شرائط کے مطابق ادا کرے گا اس کو کامل ثواب عطاء فرمائے گا۔ اور جو سستی سے کام لے گا اسے مکمل عذاب عطاء کرے گا۔

مظہری میں بیان کیا گیا ہے بے شک اللہ تعالیٰ اپنے نور کے احاطہ کے ذریعے وسعت والا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے احاطہ کی کیفیت بیان نہیں ہو سکتی، اور اس کی حقیقت کو بیان نہیں کیا جاسکتا۔

”قال المجدد ﷺ في حقيقة الصلوة انها وسعة ذاتية بلا كيف لا تدرك كنهها“

مجدد رحمہ اللہ نے نماز کی حقیقت کے متعلق بیان فرمایا کہ نماز میں وسعت ذاتیہ پائی جاتی ہے۔ لیکن اس کی حقیقت اور کنہ کو بھی نہیں پایا جاسکتا۔

(مظہری)

قبلہ کے متعلق مسائل:

”لما كان المسجود له هو الله تعالى والتوجه الى الكعبة مأمورا به كان السجود لنفس

معبود صرف رب تعالیٰ کی ذات ہے، کعبہ شریف کی طرف صرف توجہ کا حکم ہے۔ اگر کوئی شخص کعبہ کو معبود اور معبود سمجھے گا تو وہ کافر ہو جائے گا۔

اس سے بت پرستوں کا اعتراض مندرج ہو جائے گا کہ وہ کہتے ہیں کہ جس طرح تم کعبہ کو سجدہ کرتے ہو اس طرح ہم بت کو سجدہ کرتے ہیں۔ یہ ان کا قول غلط ہے کیونکہ وہ بتوں کو معبود سمجھتے ہیں۔ رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿اجعل الالهة واحدا، ان هذا لشيء عجاب﴾ کیا اس (محمد) نے بہت معبودوں کا ایک معبود کر دیا، بے شک یہ عجیب بات ہے۔

اس سے واضح ہوا کہ بت پرست اپنے بتوں کو معبود سمجھتے تھے۔ جب نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ ”لا اله الا الله“ (اللہ کے سوا کوئی اور معبود نہیں) تو وہ اس پر تعجب کرنے لگے کہ کیا یہ شخص کئی معبودوں کو ایک معبود بنا رہا ہے۔ یہ تو عجیب بات ہے۔

اور رب تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ ﴿ما نعبدھم الا ليقربونا الى الله زلفی﴾ (وہ کہتے ہیں) ہم تو انہیں صرف اتنی بات کے لئے پوجتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ کے پاس نزدیک کر دیں۔

اس آیت کریمہ سے بھی واضح ہوا کہ بت پرست اپنے بتوں کی پوجا کرتے تھے، ان کو معبود سمجھتے تھے۔

یہاں سے ایک اور ضال و مضل فرقہ کا بھی رد ہو گیا جو یہ کہتے ہیں کہ بت پرستوں نے اپنے بتوں کو رب کے قریب کرنے کا وسیلہ اور ذریعہ بنایا ہوا تھا۔ اور سنیوں نے انبیاء و اولیاء کو وسیلہ بنایا ہوا ہے۔ لہذا یہ بھی بت پرستوں کی طرح مشرک ہیں۔

کاش کہ ان عقل کے اندھوں کو یہ آیات نظر آئیں جن کو ابھی ذکر کیا گیا ہے کہ بت پرست بتوں کو معبود اور معبود سمجھتے تھے۔ اہل سنت و جماعت کے علماء کرام تو کیا بفضلہ تعالیٰ عوام میں سے کوئی جاہل بھی انبیاء کرام اور اولیاء کرام کو معبود نہیں سمجھتا۔ اللہ تعالیٰ کی مخلوق سمجھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا مقرب تسلیم کرتے ہیں۔ اور یہ عقیدہ سچا اور پکارکتے ہیں کہ یہ رب تعالیٰ کے قریب کرنے کا ذریعہ ہیں۔

نتیجہ واضح ہو گیا کہ ایک نظام کو مربوط بنانے کے لئے، ایک ڈسپلن پیدا کرنے کے لئے، ایک ہی طرف تمام متوجہ ہوں، جہاں مسلمانوں کو دیکھ کر ہی ان کی اجتماعیت کا پتہ چل جائے، قبلہ کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا۔

اور روزمرہ انسان نماز پڑھنے سے یہ تجربہ حاصل کر رہا ہے کہ ایک طرف توجہ کرنے سے اور دائیں بائیں، ادھر ادھر نہ دیکھنے سے انسان یکسوئی، کامل توجہ سے نماز ادا کرتا ہے۔ نماز کے ختم ہونے پر، یا نماز سے پہلے جب ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہوتے ہیں تو ذکر اور وظائف کے پڑھنے میں وہ کامل توجہ نہیں ہوتی جو نماز میں ہوتی ہے۔

امید ہے کہ استقبال قبلہ اور بت پرستی، اور اسی طرح بت پرستی اور انبیاء کرام اور اولیاء کو تقرب کا ذریعہ سمجھنے میں طلباء کرام فرق سمجھ چکے ہوں گے۔

مسئلہ : جہاں سے کعبہ شریف نظر آ رہا ہو وہاں تو کعبہ شریف کی طرف اس طرح توجہ کرنا ضروری ہے کہ انسان اور کعبہ شریف تک خط مستقیم جائے۔ اگر کعبہ شریف سے معمولی انحراف بھی ہو تو نماز ادا نہیں ہوگی۔

خیال رہے کہ فقہاء کرام اکثر طور پر یہ مسئلہ تحریر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ ”مکی“ (مکہ میں رہنے والے) کے لئے یہ ضروری ہے۔ درمختار میں اسے واضح کر دیا گیا۔ ”والمراد بقولی فللمکی مکی یعاین التعینۃ“ کہ مکی سے مراد یہ ہے کہ جسے کعبہ شریف نظر آ رہا ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ عین کعبہ کی طرف توجہ کرے۔ جسے نظر نہ آ رہا ہو اسے سمت مقرر کرنا ضروری ہے۔ پہلے چونکہ مکہ مکرمہ میں رہے والوں کو کئی جگہ سے کعبہ شریف نظر آتا تھا۔ اب مسجد حرام کی تین منزلہ تعمیر کی وجہ سے مسجد کے اندر ہی آئیں تو کعبہ شریف نظر آتا ہے۔ یا قرب و جوار کی بلند بلڈنگوں کی چھتوں سے نظر آ سکتا ہے۔

مسئلہ : جن حضرات کو کعبہ شریف نظر نہیں آ رہا وہ نماز کے لئے کعبہ شریف کی سمت، جہت مقرر کریں، قریب رہنے والے کافی حد تک سمت بھی درست مقرر کر سکتے ہیں۔ کہ خط بالکل سیدھا کعبہ شریف سے گزرے۔

دور والے جب جہت مقرر کریں تو ان کے لئے اتنا ہی ضروری ہے کہ کافی حد تک جہت مقرر کرنے میں احتیاط سے کام لیں لیکن دور کی وجہ سے معمولی فرق نماز کے لئے مفسد نہیں۔ ”فعلم ان الانحراف اليسيرة لا يضر“ اسی سے معلوم ہوا کہ معمولی انحراف نماز میں نقصان نہیں دیتا۔

(از شامی)

اگرچہ دور والوں کے لئے زاویہ حادثہ (جو پینتالیس ڈگری سے کم ہو) تک فرق کو جائز رکھا گیا ہے۔ تاہم آجکل سمت مقرر کرنے کے لئے بہتر آلے ایجاد ہو گئے ہیں۔ اس لئے مساجد کا قبلہ مقرر کرنے کے لئے ان سے کام لیا جائے۔

سمت قبلہ کے معلوم کرنے کا طریقہ:

زمین ہموار کر کے بیچ میں ایک کھوٹی بالکل سیدھی گاڑ دیجئے۔ ۲۸ مئی کو گرینچ ٹائم سے صبح کے ۹ بجکر ۱۶، ۱۷ منٹ اور ۱۶ جولائی کو گرینچ ٹائم سے صبح کے ۹ بجکر ۲۵، ۲۶ منٹ یا ۲۹ نومبر کو گرینچ ٹائم سے رات کے ۸ بجکر ۷، ۸ منٹ اور ۱۴ جنوری کو گرینچ ٹائم سے رات کے ۹ بجکر ۲۸، ۲۹ منٹ پر اس کھوٹی کا سایہ سمت قبلہ بتائے گا۔ یعنی اس کھوٹی کے سایہ کے کنارہ پر کھڑے ہو کر کھوٹی کی طرف رخ کر لیجئے مکہ معظمہ آپ کے سامنے ہوگا۔

تنبیہ: چونکہ مغربی پاکستان کا ٹائم گرینچ ٹائم سے پانچ گھنٹے آگے ہے اس لئے گرینچ ٹائم سے نو بجے مغربی پاکستان ٹائم سے دو بجتے ہیں۔ اور ہندوستان کا ٹائم گرینچ ٹائم سے ساڑھے پانچ گھنٹے آگے ہے۔ اس لئے گرینچ ٹائم کے نو بجے ہندوستانی ٹائم اڑھائی بجے ہوگا۔ اور مشرقی پاکستان (جو غداروں نے مل کر بنگلہ دیش بنادیا) کا ٹائم گرینچ ٹائم سے چھ گھنٹے آگے ہے۔ اس لئے گرینچ ٹائم کے نو بجے مشرقی پاکستان میں تین بجے ہوں گے۔

آسان بات: آجکل پاکستان وہی ہے جو پہلے مغربی پاکستان کہلاتا تھا، اس لئے پاکستان میں قبلہ معلوم کرنے کے لئے ۲۸ مئی دن کے دو بجکر سولہ، سترہ منٹ پر کھوٹی زمین میں گاڑ کر دیکھیں جس طرف سایہ جاری ہو، اس طرف کھڑے ہو کر کھونٹے کو اپنی پیشانی کے سامنے رکھیں وہی قبلہ ہے۔

اور ۱۶ جولائی دن کے دو بجکر پچیس، چھبیس منٹ پر یہی عمل کریں، قبلہ کی سمت معلوم ہو جائے گی۔
(از زبدۃ التوقیت) راقم کے نزدیک دن کو ہی عمل کرنا آسان اور بہتر ہے۔ تاہم اگر رات کو عمل کرنا ہو تو
پاکستان میں رات کے دو بجکر سات، آٹھ منٹ پر یہ عمل ۲۹ نومبر کو کرے۔ اور ۱۴ جنوری کو رات کے دو
بجکر اٹھائیس، انتیس منٹ پر یہی عمل کرے۔

مسئلہ: قبلہ زمین سے لے کر عرش تک ہے۔ صرف کعبہ شریف کے مکان کا نام نہیں۔ اسی
لئے بلند پہاڑوں پر نماز ادا کی جائے جہاں توجہ مکان کی طرف نہ ہو۔ مکان نیچے رہ جائے تو نماز درست
ہے۔ اس لئے کہ عرش تک جانے والی سمت اس کے سامنے ہے۔

اگر کعبہ شریف کی عمارت کو اٹھا بھی لیا جائے تو قبلہ وہی زمین اور فضا رہے گی۔ اگر وہی کعبہ کی
دیواروں کے پتھر وغیرہ دوسری جگہ لگا کر عمارت بنالی جائے تو وہ قبلہ نہیں بن جائیگا۔

فائدہ جلیلہ:

”وفی البحر عن عدة الفتاوی الکعبة اذا رفعت عن مکانها لزيارة اصحاب الکرامة ففي
تلک الحالة جازت الصلوة الی ارضها“ (شامی ج اول ص ۳۱۸ باب شروط الصلوة)

کعبہ شریف کا مکان اگر نیک لوگوں کی زیارت کے لئے اٹھا لیا جائے تو پھر بھی نماز اسی سر زمین
کی طرف منہ کر کے ادا کی جائے گی۔ تاہم راقم کا موقف اس پر یہ ہے کہ کعبہ شریف کا نیک لوگوں کی
زیارت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انوار و تجلیات کعبہ بزرگوں کی زیارت کرتی ہیں۔ مکان شریف اپنی
جگہ رہتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

”وما ذکره فی البحر نقله فی التاترخانیة عن الفتاوی العتابیة قال الخیر المرعلی وهذا
صریح فی کرامات الاولیاء“ (شامی حوالہ مذکور)

جواہر الرائق میں ذکر ہے وہ تاترخانیہ نے بھی فتاوی عتابیہ سے نقل کیا ہے۔ الخیر المرعلی نے کہا
ہے کہ یہ بہت واضح ثبوت ہے اولیاء کرام کی کرامات کا۔

یہ بھی خیال رہے کہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے کعبہ شریف کو جب شہید کرایا نئی تعمیر

کے لئے اور اسی طرح جب حجاج بن یوسف نے کعبہ شریف کو تعمیر کرنے کے لئے شہید کرایا لوگ اسی سمت کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے رہے۔

مسئلہ : اگر ایک شخص قبلہ کو جانتا تو ہے کہ قبلہ اس سمت ہے، لیکن قبلہ طرف منہ کرنے پر قادر نہیں کسی مرض کی وجہ سے یا مال کے خوف کی وجہ سے، اسی طرح دشمن وغیرہ کا خطرہ ہو تو وہ جس طرف منہ کرنے پر قادر ہو اسی طرف منہ کر کے نماز ادا کرے، اس کا قبلہ ہی جہت قدرت ہے۔

مسئلہ : اگر ایک شخص کو قبلہ کا علم نہیں تو وہاں دیکھے اگر کوئی شخص اس علاقہ کا قبلہ کو جاننے والا مل جائے تو اس سے پوچھے۔

اگر کوئی شخص تو نظر نہیں آتا لیکن کوئی مسجد نظر آئے تو اس سے قبلہ کی سمت کا تعین کرے۔
اگر قبلہ بتانے والا بھی کوئی شخص نہیں، اور مسجد وغیرہ بھی کوئی نہیں تو تحری کرے یعنی خود اپنی کوشش سے سورج وغیرہ کو دیکھ کر قبلہ کو پہچاننے کی کوشش کرے، جس طرف غالب گمان ہو جائے وہی قبلہ ہوگا۔ اگر نماز تو تحری کر کے شروع کی تھی، نماز کے درمیان کسی شخص نے بتا دیا کہ قبلہ اس طرف نہیں جدھر تمہارا منہ ہے بلکہ فلاں جانب ہے تو نماز کے اندر منہ ادھر پھیر لے جدھر کسی نے بتایا ہے۔
اگر نماز کے بعد کسی نے بتایا کہ تمہارا رخ درست نہیں تھا تو نماز کو لوٹانے کی ضرورت نہیں، بلکہ درست ہو چکی ہے کیونکہ قبلہ ہی وہ سمت تھی جو تحری سے متعین کی تھی۔

مسئلہ : اگر ایک شخص کو قبلہ معلوم نہیں تھا اس نے تحری بھی نہیں کی یعنی قبلہ کو جاننے پہچاننے کی کوئی شش نہیں کی بلکہ اسی طرح ہی ایک جانب منہ کر کے نماز ادا کر لی۔ اگر بعد میں کسی نے بتا دیا کہ قبلہ اسی طرف تھا جس طرف تم نے منہ کیا تو نماز ہو گئی، کیونکہ مقصود قبلہ ہی تھا جسے پایا گیا۔

ہاں اگر اس کا منہ غلط سمت تھا تو نماز نہیں ہوئی، کیونکہ قبلہ بھی نہیں پایا گیا، اور تحری جو فرض تھی وہ بھی نہیں پائی گئی لہذا اس نماز کو لوٹانا ضروری ہے۔

مسئلہ : اگر ایک شخص کو قبلہ کا علم نہیں تھا، لیکن اس نے تحری کر کے نماز کو شروع کیا، دوران نماز ہی رائے بدل گئی تو پھر جائے۔ اگر پھر رائے کسی اور سمت کی طرف بدل جائے پھر بھی پھر جائے۔

یعنی اس شخص کا قبلہ ہی تحری ہے جیسے جیسے تحری بدلے گی، ایسے ایسے اس کا قبلہ بدلتا رہے گا۔

ماخذ از درمختار و شامی

فائدہ: ابھی جو مسائل بیان کئے ہیں ان سے ہی واضح ہو گیا کہ قرآن پاک میں تعارض نہیں، البتہ سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس لئے کہ جب قبلہ معلوم ہو اور قبلہ کی طرف منہ کرنے کی قدرت بھی حاصل ہو تو یہ حکم ہے۔ ﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ کہ اپنے منہ مسجد حرام یعنی عبا کی طرف پھیر لو۔

اور اگر قبلہ معلوم نہیں۔ یا قبلہ کی طرف منہ کرنے کی قدرت نہیں یا سفر کے دوران سواری پر نفل نماز ادا کرنی ہے یا دشمن کے مقابل نماز خوف ادا کرنی ہے تو پھر اس آیت کریمہ کا حکم ثابت ہے۔ ﴿وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهَ اللّٰهِ﴾ اور اللہ کے لئے ہی ہے مشرق اور مغرب تو جس طرف تم منہ پھیرو اسی طرف اللہ کی رحمت متوجہ ہے۔

﴿وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحَنَهُ﴾ ^ط **بَلْ لَّهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلٌّ لَّهٗ قِسْطٌ** ﴿

(آیت ۱۱۶)

(۱) اور بولے خدا نے اپنے لئے اولاد رکھی، پاکی ہے اسے، بلکہ اسی کی ملک ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، سب اس کے حضور گردن ڈالے ہیں۔

(۲) اور انہوں نے کہا، بنائی ہے اللہ نے اپنی اولاد، حالانکہ وہ پاک ذات ہے، بلکہ اسی کی ملک ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں تمام اسی کے فرمانبردار ہیں۔

پہلی آیت ﴿وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصْرٰی عَلٰی شَیْءٍ﴾ الخ میں یہود اور نصاریٰ اور مشرکین کے جھوٹ کو ذکر کیا گیا، اس آیت کریمہ میں بھی ان تینوں فرقوں کی کذب بیانی کا ذکر ہے، اور ان کا رد کیا گیا۔

شان نزول: ﴿وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصْرٰی الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ﴾

یہود نے کہا عزیر اللہ کا بیٹا ہے۔ اور نصاریٰ نے کہا مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔

اور مشرکین نے کہا ملائکہ اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کے رد کے لئے اس آیت کریمہ کو

نازل کیا۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا : اور انہوں نے کہا بنائی ہے اللہ نے اپنی اولاد۔

”اتخاذ“ کبھی بمعنی صنعت اور عمل کے آتا ہے۔ اس وقت اس کا ایک مفعول ہوتا ہے۔ اور کبھی بمعنی ”تصیر“ کے آتا ہے اس وقت اس کے دو مفعول ہوتے ہیں۔ اب معنی یہ ہوگا ”صیر بعض مخلوقاتہ ولدا“ اس نے اپنی مخلوقات میں سے بعض کو اپنی اولاد بنا لیا۔ (ابو السعود)

ان کا قول اولاد کے متعلق کیسے تھا؟

”وہو اتخذ الله ولدا بمعنی ادعی فی حق بعض مخلوقاتہ انه ولده لا انه ولد حقيقة وکما يستحيل عليه تعالى ان يلد حقيقة فكذا يستحيل عليه التبنى واتخاذ الولد“

اولاد بنانے کا مقصد یہ ہے کہ انکے کہنے کا یہ مطلب تھا کہ اللہ تعالیٰ کی حقیقی اولاد تو اگرچہ نہیں لیکن اس نے اپنی بعض مخلوق کے متعلق دعویٰ کیا ہے کہ وہ اس کی اولاد ہے۔ لیکن ان کا یہ کہنا بھی باطل تھا کیونکہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی حقیقی اولاد محال ہے۔ اسی طرح اس کا کسی کو منہ بولی اولاد بنالینا بھی محال ہے۔ (شیخ زادہ)

سُبْحَانَهُ : (وہ پاک ہے) سبحان مصدر ہے بمعنی تنزیہ کے۔ یعنی اللہ تعالیٰ ان اسباب سے ہی پاک ہے جو اولاد کا تقاضا کرتے ہیں۔

اولاد کے تقاضا کرنے والے اسباب :

”وہو احتیاجہ الی من یعینہ فی حیاتہ“ اولاد کا تقاضا کرنے والا ایک سبب یہ ہے کہ

زندگی میں اولاد اس کی معاونت کرے۔

”و یقوم مقامہ بعد مماتہ“ اور موت کے بعد اس کے قائم مقام ہو۔ یعنی اولاد وارث بنے

اور اس کی جانشین بنے۔

”اما الوحشة تلحقه فيحتاج الى من يستأنس به“ یا انسان اکیلے رہنے میں وحشت محسوس کرے تو چاہتا ہے کہ اس کی اولاد ہوتا کہ ان سے انس پکڑے، یعنی اولاد کی محبت اور پیار کی وجہ سے وحشت جاتی رہے۔

”اولدفع عدو يقهره فيحتاج الى من يستنصر فيعينه على قهره“ یا اولاد کی محتاجی انسان کو اس لئے ہوتی ہے کہ اسے دشمن کے قہر اور دبدبہ کا سامنا ہوتا ہے تو وہ چاہتا ہے کہ میری اولاد ہو جو میرے دشمنوں سے مقابلہ کرے اور میری معاونت کر کے ان کے قہر کو منفع کرے۔

”اولشهوات تغلبه وحوائج تمسه فيقضيها به“ یا انسان کو ضروریات زندگی کی محتاجی ہو اور کھانے پینے کی اشیاء اور لباس وغیرہ کی ضرورت ہو تو وہ چاہتا ہے کہ اولاد ہوتا کہ میری کفالت کرے۔

ان تمام اسباب میں محتاجی پائی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ محتاجی سے پاک ہے، لہذا اولاد سے بھی پاک ہے۔ پھر ان میں بعض اسباب موت کا تقاضا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ موت سے پاک ہے کہ اسے جانشین کی ضرورت ہو۔ لہذا وہ اولاد سے پاک ہے۔

پھر اولاد اپنے والدین کے مشابہ ہوتی ہے۔ اور اپنے والدین کی جنس سے ہوتی ہے۔ رب تعالیٰ تشبیہ اور جنسیت سے جب پاک ہے تو اولاد سے بھی پاک ہے۔ (ماخوذ از شیخ زادہ)

مخلوق اولاد نہیں ہو سکتی:

وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ واجب الوجود ہے۔ اس کے بغیر ہر چیز ممکن لذاتہ ہے۔ جو چیز ممکن لذاتہ ہو وہ حادث ہوتی ہے۔ ہر حادث واجب لذاتہ کی مخلوق ہے۔ ”والمخلوق لا يكون ولدا“ اور مخلوق اولاد نہیں ہو سکتی۔

واجب لذاتہ کے بغیر تمام چیزیں ممکن لذاتہ کیوں؟

اسلئے کہ اگر دو چیزیں واجب لذاتہ ہو جائیں تو وہ دونوں واجب الوجود ہوں گے، میں مشترک ہوں گی۔ اور دونوں کے لئے کوئی چیز ایسی نہیں ہوگی جو ان کو ایک دوسرے سے ممتاز کرے۔ کیونکہ جو چیز

دونوں کے لئے وجہ استراک ہو وہ وجہ امتیاز نہیں بن سکتی۔

تو دونوں کا دو دو قیدوں سے مرکب ہونا لازم آئے گا۔ ہر مرکب چیز اپنے اجزاء کی محتاج ہوتی ہے۔ تو گویا کہ مرکب کا غیر چیز کا محتاج ہونا لازم آیا، ”وکل مفتقر الی غیرہ فہو ممکن لذاتہ“ اور یہ وہ جو غیر کا محتاج ہوتا ہے وہ ممکن لذاتہ ہوتا ہے۔

”فکل واحد من الموجودین الواجبین لذاتہما ممکن لذاتہ، هذا خلف“ اس طرح ہر ایک واجب لذاتہ کا ممکن لذاتہ ہونا لازم آئے گا جو خلاف مفروض ہے۔

تو ثابت ہو گیا کہ واجب لذاتہ، واجب الوجود صرف رب تعالیٰ ہے۔ باقی تمام کائنات ممکن لذاتہ، واللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے۔ لہذا مخلوق میں سے کوئی چیز بھی رب تعالیٰ کی اولاد نہیں ہو سکتی۔ (ازبیر) رب تعالیٰ کی اولاد ماننا اسے گالی دینا ہے:

رب تعالیٰ کی اولاد ماننا رب تعالیٰ کی توہین ہے۔ کیونکہ اس کی جنس ماننے سے اس کا محتاج ہونا، اس کا فناء ہو جانا لازم آتا ہے جن سے رب تعالیٰ پاک ہے۔

☆ ”عن ابن عباس عن النبی ﷺ قال قال اللہ تعالیٰ کذبنی ابن آدم ولم یکن لہ ذلک وشتمنی ولم یکن لہ ذلک فاما تکذیبہ ابای فیزعم انی لا اقدر ان اعیدہ کما کان واما شتمہ ابای فقولہ ان لی ولدا فسبحانی ان اتخذ صاحبۃ او ولدا“ انفراد بہ البخاری من هذا الوجه“

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ رب تعالیٰ کہتا ہے۔ بیشک میرے بندے نے میری تکذیب کی حالانکہ اسے یہ حق نہیں پہنچتا تھا۔ اور میرے بندے نے مجھے گالی دی حالانکہ یہ اس کے لائق نہیں تھا۔ اس نے میری تکذیب کی کہ وہ یہ کہ اس نے گمان کیا کہ میں اسے لوٹانے پر قادر نہیں، اور اس کا مجھے گالی دینے کا مطلب یہ کہ وہ میری اولاد مانتا ہے۔ حالانکہ میری ذات زوجہ اور اولاد سے پاک ہے۔

☆ ”وفی الصحیحین عن رسول اللہ ﷺ انه قال لا احد اصبر علی اذی سمعہ من اللہ انہم یجعلون لہ ولدا وھو یرزقھم و یعافیھم“

بخاری اور مسلم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی ایک رب تعالیٰ سے زیادہ صابر نہیں

ہوسکتا کہ وہ اذیت ناک باتیں سنتا ہے کہ لوگ اس کی اولاد مانتے ہیں پھر بھی وہ ان کو رزق دیتا ہے۔ اور معاف کرتا ہے۔ (از ابن کثیر)

بَلْ لَّهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ :

”بلکہ اسی کی ملک ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں“

”بل“ اضراب کے لئے ہے۔ اور ”لہ“ میں ”لام“ تملیک کے لئے ہے۔ یہود و نصاریٰ اور مشرکین نے کہا رب کی اولاد ہے ان کے اس کہنے سے رب تعالیٰ کا مخلوق کے توالد و تناسل میں مشابہ ہونا۔ اپنی اولاد کا مشابہ ہونا اور ہم جنس ہونا۔ اور اولاد کا محتاج ہونا اور فوت ہونا لازم آ رہا تھا۔

”بل“ ذکر کر کے ان کے اس قول کو باطل کر کے یہ ثابت کیا کہ تمہارے اقوال باطل ہیں، ان سے لازم آنے والے عیوب سے وہ پاک ہے، بلکہ تمام آسمانوں اور زمین میں پائی جانی والی مخلوق اس کی ملکیت میں ہے۔ (از روح المعانی)

جب یہ واضح ہو گیا کہ تمام مخلوق اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں ہے تو یہ خود بخود واضح ہو جائے گا کہ مخلوق میں کوئی بھی رب تعالیٰ کی اولاد نہیں ہو سکتی کیونکہ ولد مملوک نہیں ہو سکتا، یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی اولاد میں سے کسی مملوک ولد کو خرید لے تو وہ خود بخود آزاد ہو جائے گا۔

رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿مَا كَانَ اللّٰهُ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ سُبْحٰنَہٗ اِذَا قَضٰی اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَہٗ کُنْ فَيَکُوْنُ﴾ (مریم، آیہ ۳۵) اللہ کو لائق نہیں کسی کو اپنی اولاد ٹھہرائے۔ وہ ذات پاک ہے۔ جب کسی کام کا حکم فرماتا ہے تو یونہی اس سے فرماتا ہے۔ ہو جاوہ فوراً ہو جاتا ہے۔

اس آیت کریمہ سے بھی واضح ہے کہ تمام کائنات رب کی مخلوق ہے جو اس کی ملکیت میں ہے۔ لہذا مخلوق کا اولاد ہونا ممکن نہیں۔ اور رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

﴿وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ۚ لَقَدْ جِئْتُمْ شَیْءًا اَدْبًا ۚ تَكَاذُبُ السَّمٰوٰتِ یَتَفَطَّرُوْنَ مِنْہٗ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًا ۚ اِنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ۚ وَمَا یَنْبَغِیْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ یَّتَّخِذَ وَلَدًا ۚ اِنْ کُلُّ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّا اَتٰی الرَّحْمٰنَ عَبْدًا ۚ﴾ (مریم ۹۸ تا ۹۳)

اور کافر بوجہ رحمن نے اولاد اختیار کی۔ بے شک تم حد سے بھاری بات لائے۔ قریب ہے کہ آسمان اس سے پھٹ پڑیں اور زمین شق ہو جائے۔ اور پہاڑ گر کر پھٹ جائیں۔ اس پر کہ انہوں نے رحمان کے لئے اولاد بتائی۔ اور رحمن کے لائق نہیں کہ اولاد اختیار کرے۔ آسمانوں اور زمین میں جتنے ہیں سب اس کے حضور بندے ہو کر حاضر ہوں گے۔

ان آیات سے واضح ہوا کہ رب تعالیٰ کی اولاد ماننا عظیم جرم ہے۔ اس سے تو رب تعالیٰ کے عذاب کو دعوت دینا ہے۔ یہ بہتان تو زمین و آسمان اور پہاڑوں کے پھٹ جانے کا سبب ہے۔ رب تعالیٰ کی شان کے ہی لائق نہیں کہ اس کی اولاد مانی جائے۔ اس کی وجہ بہت واضح ہے کہ آسمانوں اور زمین میں پائے جانے والے اس کے عبد ہیں۔ اور عبد کا ولد ہونا ممکن نہیں۔

سوال : یہ آیت جو زیر بحث ہے اس میں ﴿لَهُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾ ہے، یعنی اس میں لفظ ”ما“ ذکر ہے اور سورۃ مریم میں ﴿مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾ مذکور ہے۔ جس میں ”من“ آیا ہوا ہے۔ وجہ فرق کیا ہے؟

جواب : ”من“ ذوی العقول کے لئے آتا ہے۔ ذوی العقول کا اطلاق انسانوں، جنوں اور فرشتوں پر ہے۔

چونکہ رب تعالیٰ کی اولاد ماننے والوں نے حضرت عزیر علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور فرشتوں کو اولاد مانا تھا ان کے عقیدہ کا رد کرتے ہوئے سورۃ مریم میں ”من“ ذکر کر دیا کہ جن کو تم نے اولاد مانا ہے وہ تو اس کی مخلوق اور اس کے بندے اور اس کے مملوک ہیں۔

اور اس زیر بحث آیت میں عموم ذکر کر کے مکمل ہی راستہ بند کر دیا، کہ مخلوق میں کسی کو بھی اگر کوئی رب تعالیٰ کی اولاد مانے تو غلط ہوگا۔ ”ما“ چونکہ غیر ذوالعقول کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اور بنسبت ”من“ کے اس میں عموم زیادہ ہوتا ہے۔

اور دوسرا جواب یہ ہے کہ ایک آیت میں ”من“ ذکر کر کے واضح کر دیا کہ کوئی ذوی العقول میں سے رب تعالیٰ کی اولاد نہیں بن سکتا۔ اور دوسری آیت میں ”ما“ ذکر کر کے واضح کر دیا کہ کوئی غیر

والعقول میں سے اس کی اولاد نہیں۔

رب تعالیٰ کی اولاد ماننے کا وبال دنیا میں:

ابن ابی حاتم اور ابن المنذر نے روایت ذکر کی کہ کوئی درخت کانٹے دار نہیں تھا، اور کوئی پھل کڑوا اور بد ذائقہ اور بد بودار نہیں تھا۔ اور پانی کہیں شور (نمکین) نہیں تھا۔

لیکن جب بد بخت لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی اولاد ماننی شروع کی تو اللہ تعالیٰ نے درختوں کو خاردار اور پھلوں کو کڑوا اور بد ذائقہ اور بد بودار بنا دیا۔ اور پانی کو نمکین بنا دیا۔ (از عزیزی)

تنبیہ: مسلمان جب بھی کسی کافر سے سنے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اولاد کہہ رہا ہے۔ تو اسی وقت

(از عزیزی)

سجائے پڑھے کہ اللہ تعالیٰ تو اولاد سے پاک ہے۔

كُلُّ لَهُ قَانِتُونَ : تمام اسی کے فرمانبردار ہیں۔

”قنوت“ کا اصل میں معنی ہے۔ ”دوام“ پھر چار معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

(۱) ایک تو یہی معنی مراد لیا جاتا ہے یعنی دوام۔

(۲) دوسرا معنی ”طاعت“ ہے۔ جس طرح رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔ ”یا مریم اقتنی

لربک“ اے مریم اپنے رب کی عبادت کرو۔

(۳) تیسرا معنی ”طول القیام“ (لمباقیام) جیسا کہ نبی کریم ﷺ سے جب سوال کیا گیا ”ای

الصلوة افضل“ کون سی نماز افضل ہے؟

تو آپ نے فرمایا ”طول القنوت“ جس نماز میں لمبا قیام پایا جائے وہ افضل ہے۔

(۴) چوتھا معنی ہے۔ ”سکوت“ جس طرح زید بن ارقم ؓ کہتے ہیں۔ ”کنا نتکلم فی الصلوة

حتی نزل قوله تعالیٰ ﴿ وَقُومُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ ﴾ فامسکنا عن الکلام“ ہم نماز میں کلام کر لیا

کرتے تھے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد نازل ہوا۔ ﴿ وَقُومُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ ﴾ (اور کھڑے ہو

اللہ تعالیٰ کے لئے خاموش ہو کر) تو ہم نے نماز میں کلام کرنا چھوڑ دیا۔

﴿كُلُّ لَهُ قَانِتُونَ﴾ ای کل ما فی السموات والارض قانتون مطیعون ”تمام

(از کبیر)

چیزیں جو آسمانوں میں ہیں یا زمین میں رب تعالیٰ کی فرمانبرداری ہیں۔

”کل“ پر تنوین عوض مضاف الیہ ہے۔ یا معنی یہ ہے۔ ”کل ما فیہما“ آسمانوں اور زمین میں پائی جانے والے ہر چیز اس کی مطیع ہے۔

اور یا معنی یہ ہو۔ ”کل من جعلوہ ولدا لہ مطیعون مقرون بالعبودية“ وہ تمام لوگ جنہوں نے رب تعالیٰ کی اولاد ٹھہرائی ہے وہ بھی اس کے مطیع ہیں، یعنی اپنی عبودیت کا اقرار وہ بھی کرتے ہیں۔

اعتراض : جب پہلے معنی کے لحاظ پر عموم ہے کہ آسمانوں اور زمین میں پائی جانے والی ہر چیز اس کی مطیع ہے، تو آسمانوں اور زمین میں پائی جانے والی چیزیں غیر ذوی العقول کثیر تعداد میں ہیں۔ تو ”قانتون“ کا ذکر کرنا کیسے صحیح ہے جب کہ واؤ، نون سے جمع ذوی العقول کی آتی ہے۔

جواب : اس جگہ قاعدہ تغلیب استعمال ہوا ہے۔ یعنی ذوی العقول کو مرتبہ اور شرافت کی وجہ سے غیر ذوی العقول پر ترجیح دی گئی ہے۔

(ماخوذ از بیضاوی)

نکتہ : جب قنوت کا اصل معنی دوام ہے۔ تو آیہ کا معنی ہو گیا۔ ممکنات کا دوام اور ان کی بقاء اللہ تعالیٰ کی قدرت کی وجہ سے ہی ہے۔

”وهذا يقتضى ان العالم حال بقاءه واستمراره محتاج اليه سبحانه وتعالى“

اور یہ چاہتا ہے کہ تمام جہان حالت بقاء اور اپنے دوام و قیام میں ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی ذات مقدسہ کا محتاج ہے۔

”ثبت ان الممكن يقتضى ان لا تنقطع حاجته عن المؤثر لاحال حدوثه ولا حال بقاءه“ اسی سے ایک اور مسئلہ حل ہو گیا کہ ممکن ہمیشہ مؤثر حقیقی کا محتاج رہتا ہے۔ اس کی محتاجی اپنے مؤثر حقیقی سے کبھی حالت حدوث یا حالت بقاء میں ختم نہیں ہوگی۔

(از کبیر)

مقام توجہ : مفردات راغب میں ﴿وَقَوْمُوا لِلّٰهِ قَانِتِينَ﴾ کے متعلق بیان کیا گیا ہے۔ کہ ”قنوت“ کا معنی ہے۔ ”طاعة مع الخضوع“ یعنی فرمانبرداری کے ساتھ عجز کا ظہور بھی ہو ”اسی کے مطابق اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اس مقام پر ہے۔ ”سب اس کے حضور گردن ڈالے ہیں۔“

ابن کثیر نے ذکر کیا ہے۔

”عن ابی سعید الخدری عن رسول اللہ ﷺ قال کل حرف من القرآن یدکر فیہ القنوت فهو الطاعة“

حضرت ابوسعید خدری فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قرآن پاک میں جہاں بھی ”قنوت“ استعمال ہوا ہے۔ اس کا معنی طاعت ہے۔ طاعت والا معنی سب کو شامل ہے۔ خواہ دوام ہو یا قیام۔ سکوت ہو یا خضوع۔

فائدہ: ﴿كُلُّ لَهٗ قَانِتُونَ﴾ یعنی لا یمتنعون عن مشیئہ و تکوینہ و کلماتہ ہذا شانہ لا یجانسہ الواجب“ سب اس کے مطیع ہیں۔ یعنی رب تعالیٰ کو اس کی مشیت (چاہنا، ارادہ کرنا) اور اس کی تخلیق و ایجاد سے کوئی روک نہیں سکتا۔ تو واضح ہو گیا کہ جس ذات کی یہ شان ہو اس کا کوئی ہم جنس نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ واجب الوجود ہے۔ کوئی ممکن واجب الوجود کے ہم جنس ہو یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔

”قانتون“ سے ہی ایک اور مسئلہ سمجھ آ گیا۔ ”کلما زعموه الہا من المسیح و عزیر والملائکۃ کلہم لہ قانتون مطیعون مقرون بالعبودیۃ فیکون الزاماً بعد اقامۃ الحجۃ“ جن کو ان لوگوں نے معبود سمجھا ہے، یعنی عیسیٰ علیہ السلام اور عزیر علیہ السلام اور ملائکہ کو، وہ تمام تو خود اللہ تعالیٰ کے مطیع ہیں وہ تمام تو اقرار کرتے ہیں کہ معبود صرف رب تعالیٰ ہے، ہم تو اس کے عبادت گزار ہیں تو یہ لوگ ان کو کیسے معبود تسلیم کر رہے ہیں۔ دلائل کے قائم کرنے کے بعد یہ ان کو الزامی جواب دیا گیا۔ کہ تم جنہیں معبود کہہ رہے ہو وہ تو خود اپنی عبودیت کا اقرار کرتے ہیں۔ (از مظہری)

خلاصہ کلام: ”ان الولد لا بد ان یکون من جنس الوالد واللہ تعالیٰ منزہ عن التشبیہ والنظیر“ بے شک اولاد کے لئے ضروری ہے کہ وہ والد کی جنس ہو۔ اللہ تعالیٰ تو تشبیہ اور نظیر (مثل) سے پاک ہے۔ تو یقیناً اس کی اولاد کا ہونا بھی محال ہے۔

”وان الولد انما یتخذ للحاجۃ الیہ والانتفاع بہ عند عجز الوالد وکبرہ واللہ تعالیٰ منزہ عن ذلک“

اولاد کی ضرورت تو والدین کو اس لئے ہوتی ہے کہ بوقت حاجت ان سے نفع حاصل کر لیا جائے۔ خصوصاً والدین کو عاجز ہونے کے وقت اور بڑھاپے کے وقت اولاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب اللہ تعالیٰ عجز اور بڑھاپے سے پاک ہے، تو یقیناً اولاد سے بھی پاک ہے۔ (از حازن)

﴿بَدِيعَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَإِذَا قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ﴾
(آیت ۱۱۷)

(۱) نیا پیدا کرنے والا آسمان اور زمین کا۔ اور جب کسی بات کا حکم فرمائے تو اس سے یہی فرماتا ہے کہ ہو جاوہ فوراً ہو جاتی ہے۔

(۲) بغیر مثال سابق کے پیدا کرنے والا ہے آسمانوں اور زمین کا۔ اور جب فیصلہ فرما لیتا ہے کسی چیز کا، تو یہی کہتا ہے اسے، ”ہو جا“ وہ فوراً ہو جاتی ہے۔

مختصر مطلب: اللہ تعالیٰ بغیر مثال اور بغیر نمونہ کے تمام آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کرنے والا ہے وہ زمان و مکان سے پاک ہے، کیونکہ زمان اور مکان کا تعلق زمین و آسمان سے ہی ہے۔ اس نے تمام چیزوں کو پیدا فرمایا، کیونکہ اس آیت میں ﴿السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾ سے مراد آسمانوں اور زمینوں کو بمع ان میں پائی جانے والی چیزوں کے پیدا کرنا ہے۔ اور رب تعالیٰ کسی چیز کو پیدا کرنے میں کسی آلہ اور کسی مادہ کا محتاج نہیں۔ وہ صرف یہ فرماتا ہے۔ ”کن“ ہو جا۔ تو وہ چیز فوراً موجود ہو جاتی ہے۔

قدرے تفصیل:

﴿بَدِيعَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾ ”ای مخترعہما و بدعہما لا علی مثال سابق“ (مدارک)
”والابداع اختراع الشئ لا عن مادة ولا فی زمان ویستعمل ذلک فی ایجادہ
تعالیٰ للمبادی“
(روح المعانی)

”ابداع“ کا مطلب ہے کسی چیز کو بنانا، معرض وجود میں لانا، نہ اس کی مثال اور نمونہ پہلے موجود ہو۔ نہ ہی اس کا پہلے کوئی مادہ موجود ہو۔ اور نہ ہی اس پر کوئی زمانہ گزرے۔

یعنی ”ابداع“ کا اطلاق مخلوق کی ان چیزوں پر ہوتا ہے جو بغیر مثال سابق اور بغیر نمونہ کے ابتدائی طور پر تخلیق کی جائیں۔

اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ”نیا پیدا کرانے والا“ بھی یہی ثابت کر رہا ہے کہ ابتدائی طور پر بغیر نمونہ کے

پیدا کرنے والا۔

اور راقم نے جو علامہ کاظمی رحمہ اللہ کا ترجمہ نقل کیا ہے۔ ”پیدا کرنے والا بغیر مثال سابق کے“ مطلب اس کا بھی وہی ہے۔ بنسبت اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کے عام فہم ہے۔

علامہ راغب اصفہانی نے بیان فرمایا: ”وہو غیر الصنع اذہو ترکیب الصورة بالعنصر“

ابداع، صنعت کا غیر ہے۔ کیونکہ صنعت میں کسی چیز کو عناصر سے مرکب ہونا ہوتا ہے جو ابداع میں نہیں

تنبیہ: ﴿بَدِيعُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾ میں وہی معنی معتبر ہے جو ”مدارک“ نے بیان

کیا، یا بیضاوی سے وضاحت ان شاء اللہ قریب ہی ذکر کر دی جائے گی۔ ”روح المعانی“ سے ”ابداع“

کا جو معنی ذکر کیا ہے اس کا مطلب مطلقاً ”ابداع“ کا معنی بیان کرنا مقصود تھا کہ ”ابداع“ کے کون کون

سے معانی پائے جاتے ہیں۔ راقم کے اس بیان سے یہ اعتراض خود بخود مندرفع ہو گیا کہ زمین و آسمان کی

تخلیق کے متعلق تو ﴿فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ﴾ کا ذکر ہے کہ چھ دنوں میں پیدا کیا۔ تو بغیر زمان کے پیدا کرنے

کا کیا مطلب ہوگا؟

تو اس کا جواب واضح ہے کہ اس مقام پر معنی صرف ”بغیر مثال سابق کے پیدا کرنا“ لیا گیا ہے۔

بغیر زمان کے پیدا کرنے والا معنی یہاں مراد نہیں۔

اعتراض: اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں مبدعات بھی، مصنوعات بھی ہیں اور مکونات بھی ہیں۔ تو

کس طرح صحیح ہوگا کہ یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ زمین و آسمان اور ان میں پائی جانے والی تمام چیزوں

کا مبدع ہے۔

جواب: یہاں قاعدہ تغلیب پر عمل کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ محتاج نہیں کہ کسی چیز

کو پیدا کرنے میں مادہ کا محتاج ہو یا زمان کا محتاج ہو، یا مثال یا نمونہ کا محتاج ہو، البتہ وہ اپنی مرضی سے کسی

چیز کو مبدع بنادے یا مصنوع بنادے یا مکون بنادے۔

(از روح المعانی)

ان اصطلاحات میں فرق:

”الابداع وهو اختراع الشئ لا عن شئ ولا فی زمان و يستعمل ذلک فی ایجادہ

کسی چیز کو بغیر مادہ کے، بغیر زمانہ کے اور بغیر نمونہ کے بنانا ”ابداع“ کہلاتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ان موجودات پر بولا جاتا ہے جن کو بغیر نمونہ اور مثال سابق کے ابتدائی طور پر موجود کیا جائے۔ یعنی مبادی مبدعات ہیں۔

”والصنع هو ترکیب صورة مع العنصر و يستعمل فی ایجادہ تعالیٰ الاجسام“

کسی چیز کی صورت کو عناصر سے بنایا جائے اسے ”صنع“ کہا جاتا ہے۔ صنعت کا تعلق اللہ تعالیٰ کی موجودات میں سے اجسام کے ساتھ ہے۔ یعنی اجسام مصنوعات ہیں۔

”والتسخیر هو سوق الشئ الی ما هو الغرض المقصود منه طوعا او قهرا و يستعمل فی القوى التي اوجدها فی السحاب والامطار والاغذية والادوية“

کسی چیز کو غرض مقصود کی طرف چلانا خواہ وہ خوشی سے اسے قبول کرے یا جبر سے، اسے تسخیر کہا جاتا ہے۔ اس کا استعمال ان قوتوں میں سے ہے جو بادل اور بارشوں اور غذاؤں اور دواؤں میں ایجاد کی گئی ہیں۔

”والتکوین الذی یکون بتغییر وفی زمان غالبا“ جس کی ایجاد میں تغیر (تبدیلی) اور زمانہ پایا جائے اسے تکوین کہا جاتا ہے۔ تکوین بھی اگرچہ ایجاد اور انشاء (پیدا کرنے) کے معنی میں استعمال ہے۔ لیکن تکوین میں تدریجاً ایک صورت کو بدل کر دوسری صورت میں لایا جاتا ہے۔ زمین و آسمان کی تخلیق میں جب اس قسم کا تغیر نہیں پایا گیا تو انکی تخلیق کے لئے لفظ تکوین بھی استعمال نہیں ہوا۔

(ماخوذ از بیضاوی و شیخ زادہ)

طلباء کرام توجہ فرمائیں:

بدیع، کی وضاحت میں لفظ ”ابداع“ ذکر کیا گیا ہے۔ جس سے اس مسئلہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ”بدیع“ باب افعال کے اسم فاعل ”مبدع“ (بکسر الدال) کے معنی میں استعمال ہے۔

خیال رہے کہ اگرچہ اصمعی نے کہا ہے کہ فعیل بمعنی مفعول (اسم فاعل) استعمال نہیں ہوتا، لیکن اسکایہ کہنا غلط ہے۔ ابن بری نے بیان کیا ہے کہ بہت سے الفاظ اس میں استعمال ہیں۔ انکار کرنا ممکن نہیں

تحنین بمعنی مسخ، قعید بمعنی مقعد، وصی بمعنی موصی، حکیم بمعنی محکم، بریم بمعنی مبرم، انیق بمعنی موقت

(ار روح المعانی)

اور بھی اس طرح کے کئی الفاظ استعمال ہیں۔

جو شخص کوئی ایسا کام کرے جو پہلے نہ پایا جائے تو اسے کہا جاتا ہے۔ ”ابدعت“ تو نے نیا

کام کیا ہے۔

اسی وجہ سنت اور جماعت کے خلاف کام کرنے والے کو بدعتی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ دین اسلام

میں اس نے صحابہ کرام اور تابعین کے خلاف کام کیا۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ کی وضاحت:

ہر نیا کام جو مخلوق سے صادر ہوا سے دیکھا جائے کہ اس کی اصل شرع میں ہے یا نہیں۔ اگر اس

کی اصل شرع میں ہے تو وہ کام محمود ہوگا۔ اور اگر اس کی اصل شرع میں نہیں تو مذموم ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے جن کاموں کو بہتر قرار دیا ان کے عموم میں وہ آتا ہے یا نبی کریم ﷺ نے جن

کاموں پر برا بیخند کیا ہے وہ نئے کام ان میں سے ہی ہیں۔ ”فہی فی حیز المدح“ تو یہ کام مقام

مدح میں ہیں۔ اگرچہ ان کی مثال موجود نہ ہی ہو۔ لہذا ہر قسم کی سخاوت (سخاوت ہے ہی نیک کاموں میں

مال خرچ کرنا، برائی کی راہ میں مال خرچ کرنا سخاوت نہیں) اور ہر قسم کا نیک کام کرنا ”فہذا فعلہ من

الافعال المحمودۃ“ یہ کام افعال محمودہ سے ہیں۔ اگرچہ کام کرنے والے کو پہلے اس کی مثال نہ ملے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول اسکی تائید کرتا ہے۔ ”نعمت البدعة هذه“ یہ بڑی اچھی بدعت ہے۔

آپ کا یہ ارشاد تراویح کی نماز کو باجماعت ادا کرنے پر تھا۔

”وہی وان کان النبی ﷺ قد صلاھا الا انہ ترکھا ولم یحافظ علیھا، ولا جمع الناس

علیھا، فمحافظة عمر رضی اللہ عنہ علیھا، وجمع الناس لھا، وندبھم الیھا، بدعة لكنها بدعة

محمودة ممدوحة“

اگرچہ تراویح کی نماز نبی کریم ﷺ نے پڑھائی، لیکن پھر آپ نے اسے چھوڑ دیا۔ اور اس پر

محافظة نہیں فرمائی۔ اور لوگوں کو جمع ہونے کا حکم نہیں فرمایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس پر محافظت کرنے کو

جاری فرمایا اور لوگوں کو تراویح کی نماز باجماعت ادا کرنے کا حکم دیا۔ اور لوگوں کو نماز کی طرف بلایا۔ یہ تمام کام بدعت ہیں۔ لیکن قابل تعریف ہیں۔ لہذا یہ بدعت حسنہ ہے۔

بدعت قبیحہ کیا ہے؟

”وان كانت فی خلاف ما امر اللہ بہ ورسولہ فہی فی حیز الذم والانکار“

اگر بدعت ایسی ہو جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کے خلاف ہو تو وہ مقام مذمت اور انکار میں ہے۔ یعنی وہ بدعت سیئہ، مذمومہ، قبیحہ کہلاتی ہے جو ناجائز ہے۔

”وہو معنی قوله ﷺ فی خطبته وشرالامور محدثاتها وکل بدعة ضلالة“

نبی کریم ﷺ جو اپنے خطبہ کے دوران فرمایا ”شر امور وہ ہوں گے جو نئے نئے ہوں گے، اور ہر بدعت گمراہی ہے۔“ اس کا یہی مطلب ہے کہ وہ کام قرآن پاک، حدیث پاک اور صحابہ کرام کے ارشادات کے مخالف ہو۔

بدعت کی دو قسموں کا ثبوت حدیث پاک سے:

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”من سن فی الاسلام سنة حسنة کان له اجرھا واجر من عمل بها من بعده من غیر ان ينقص من اجورھم شیء ومن سن فی الاسلام سنة سيئة کان علیہ وزر من عمل بها من بعده من غیر ان ينقص من اوزارھم شیء“

جس شخص نے اسلام میں اچھا طریقہ جاری کیا، اس شخص کو اچھا طریقہ ایجاد کرنے کا اجر ملے گا۔ اور اس کے بعد جو اس پر عمل کریں گے ان کے عمل کا بھی اسے ثواب حاصل ہوگا۔ جبکہ ان کے ثواب میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔ اور جس شخص نے اسلام میں برا طریقہ جاری کیا۔ اس شخص کو برا طریقہ جاری کرنے کا گناہ حاصل ہوگا۔ اور اس کے بعد جتنے لوگ اس پر عمل کریں گے ان کا گناہ بھی اسے حاصل ہوگا۔ جب کہ ان کے گناہوں میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔

”وهذا اشارة الى ما ابتدع من قبيح و حسن وهو اصل هذا الباب“

اس حدیث سے واضح ہوا کہ کوئی بھی نیا کام ہوگا تو وہ یا تو قبیح ہوگا۔ یا حسن ہوگا۔ یہ حدیث پاک اس مسئلہ میں اصل (قانون اور ضابطہ) ہے۔

”وبالله العصمة والتوفيق لارب غيره“ اللہ تعالیٰ ہی بچانے والا ہے غلو اور تجاوز سے،

ہر نئے کام کو حرام کہنا بھی بے وقوفی ہے اور ہر نئے کام کو مطلقاً جائز کہنا بھی نادانی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہی توفیق عطاء فرمائے کہ صراط مستقیم سمجھ آئے کہ بدعت حسنہ اور سیئہ کا فرق معلوم ہو

جائے۔ رب کائنات سے ہی دعاء ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر کوئی رب حقیقی نہیں۔ (ماخوذ از قرطبی)

علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے بیہقی سے اور واضح الفاظ میں نقل فرمایا:

”المحدثات من الامور ضربان احدهما ما احدث مما يخالف كتابا او سنة او اثرا او

اجماعا فهذه البدعة والثاني ما احدث من الخير لا خلاف فيه لواحد من هذا او هذه

محدثه غير مذمومة“ (الحاوی للفتاویٰ ج ۱ ص ۱۹۲)

نئے امور کی دو قسمیں ہیں ایک ان میں سے وہ ہے جو قرآن پاک یا حدیث پاک یا آثار صحابہ یا

اجماع امت کے مخالف ہو، یہ بدعت گمراہی ہے یعنی ناجائز ہے۔ اس سے اجتناب ضروری ہے۔

دوسری قسم ان میں سے یہ ہے کہ کوئی نیا کام ہو لیکن نیکی کا کام ہو، اس کے جائز ہونے میں سے

کسی کا کوئی اختلاف نہ ہو۔ بلکہ بالاتفاق جائز ہو، وہ کام مستحسن ہوگا۔ اس پر عمل کرنا باعث ثواب ہوگا۔

اور یہ بدعت کسی طرح بھی بری نہیں۔

اقسام بدعات: کچھ تفصیل سے بدعت کی پانچ قسمیں بن جاتی ہیں۔

واجب: جس طرح قرآن پاک اور حدیث پاک کو سمجھنے کے لئے علم نحو کا پڑھنا۔

حرام: اللہ تعالیٰ کا بندوں کی طرح جسم ثابت کرنا، اسی طرح بندے کو پتھر کی طرح غیر مختار

سمجھنا وغیرہ۔

مستحب: دینی مدارس قائم کرنا، سرائے بنانا اور ہر بہتر کام جو نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کے

زمانہ میں نہیں تھا۔

مکروہ: ہر ایسا کام جس کے کرنے سے سنت کا ترک لازم آئے تو اگر سنت غیر مؤکدہ کا

ترک لازم آئے تو مکروہ تنزیہی اور اگر سنت مؤکدہ کا ترک لازم آئے تو مکروہ تحریمی۔

مباح: جیسے صبح کی نماز یا عصر کے بعد مصافحہ کرنا لیکن بغیر سلام کے۔ اگر سلام بھی کرے تو

مستحب ہوگا۔

(از حاشیہ مشکوٰۃ باب الاعتصام بالكتاب والسنة)

وَإِذَا قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ، كُنْ فَيَكُونُ :

اور جب فیصلہ فرمالیتا ہے کسی چیز کا، تو یہی کہتا ہے اسے ”ہو جا“ وہ فوراً ہو جاتی ہے۔

قضاء کے مختلف معانی استعمال ہیں:

- (۱) کبھی خلق (پیدا کرنے) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿فَقَضَاهُنَّ سَبْعَ سَمَوَاتٍ فِي يَوْمَيْنِ﴾ اس نے دو دن میں سات آسمان تخلیق فرمائے۔
- (۲) قضاء بمعنی اعلام (بتانا، علم عطاء کرنا) جس طرح رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَقَضَيْنَا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَآئِيلَ فِي الْكِتَابِ﴾ ہم نے بتایا بنی اسرائیل کو کتاب میں۔
- (۳) قضاء بمعنی امر، جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ﴾ اور آپ کے رب نے حکم دیا کہ تم عبادت نہ کرو سوائے اس کے۔
- (۴) قضاء بمعنی الزام اور احکام جاری کرنا، اسی معنی کے لحاظ سے حاکم قاضی کہا جاتا ہے۔
- (۵) قضاء بمعنی حق کو پورا کرنا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿فَلَمَّا قَضَىٰ مُوسَىٰ لَأَجَلٍ﴾ جب موسیٰ نے حق (وعدہ) پورا کر لیا۔
- (۶) ارادہ کرنا، فیصلہ کرنا، جیسا کہ اسی آیت میں ﴿وَإِذَا قَضَىٰ أَمْرًا﴾ اور جب وہ فیصلہ فرمالیتا ہے۔ اور جب وہ کسی چیز کی تخلیق کا ارادہ فرمالیتا ہے۔
- (۷) قضی بمعنی قدر، اس کی تقدیر میں آ گیا۔ (۸) قضی بمعنی امضی جاری کر دیا۔ خیال رہے آخری دو معنی اگر یہاں مراد ہوں تو اہل سنت کے نزدیک معنی یہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے ازل میں مقدر فرمادیا۔ اور جس چیز کے جاری کرنے کا فیصلہ فرمالیا۔ لیکن معتزلہ کے نزدیک ایجاد اور تخلیق کے وقت ہی تقدیر اور امضاء مراد ہوتے ہیں۔

(از قرطبی)

﴿وَإِذَا قَضَىٰ أَمْرًا﴾ ”ای ارادہ شینا“ اس مقام پر ”امرا“ ”شینا“ کے معنی میں ہے۔ یعنی جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کی تخلیق کا ارادہ فرمالیتا ہے۔ اور فیصلہ فرمالیتا ہے۔ (بیضاوی)

قرآن پاک میں ”امر“ کئی معانی میں استعمال ہوا ہے:

- (۱) امر کا معنی دین، جیسا کہ ”منتی جاء الحق وظهر امر الله“ میں استعمال ہے۔ (یہاں تک کہ حق آگیا اور اللہ کا دین یعنی اسلام غالب ہو گیا)۔
- (۲) امر کا معنی قول۔ جیسا کہ ”فاذا جاء امرنا“ (جب ہمارا قول آگیا)۔
- (۳) امر بمعنی عذاب۔ جیسا کہ ”لما قضی الامر“ جب عذاب کا فیصلہ کر لیا گیا۔
- (۴) مذکر ”امر“ مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ”اذا قضی امرا“ جب عیسیٰ کا فیصلہ کر لیا گیا، یعنی اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ آپ بغیر باپ کے پیدا ہوں گے۔
- (۵) امر سے مراد بدر میں قتل ”فاذا جاء امر الله“ جب اللہ کا امر (یعنی بدر میں کافروں کے قتل کئے جانے کا فیصلہ) آگیا۔
- (۶) فتح مکہ۔ ﴿فَتَرَبَّصُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ﴾ انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ مکہ کو فتح فرمادے۔
- (۷) قریظہ کا قتل کیا جانا اور بنی نضیر کا جلاوطن کیا جانا۔ ﴿فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ﴾ معاف کرو، اور درگزر کرو یہاں تک کہ قریظہ کو قتل کر دیا جائے اور بنی نضیر کو جلاوطن کر دیا جائے۔
- (۸) اَتَى أَمْرَ اللَّهِ (اللہ کا حکم آجائے) یعنی قیامت آجائے۔ اس مقام میں امر بمعنی قیامت استعمال ہے۔
- (۹) امر بمعنی قضاء، ﴿يُدَبِّرُ الْأُمْرَ﴾ یعنی القضاء، وہ قضاء کی تدبیر فرماتا ہے۔
- (۱۰) امر بمعنی وحی، ﴿يُدَبِّرُ الْأُمْرَ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ﴾ یعنی وحی نازل فرماتا ہے آسمان سے زمین کی طرف۔
- (۱۱) امر سے مراد امر الخلق ﴿إِلَّا إِلَى اللَّهِ تَصِيرُ الْأُمُورُ﴾ یعنی امور الخلق، خبردار مخلوق کے امور اللہ کی طرف ہی لوٹتے ہیں۔
- (۱۲) امر سے مراد امداد۔ ﴿يَقُولُونَ هَلْ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ مِنْ شَيْءٍ﴾ وہ کہتے کیا ہمارے لئے امداد آئے گی۔ ﴿قُلْ إِنَّ الْأَمْرَ كُلَّهُ لِلَّهِ﴾ آپ فرمادیں بے شک امداد ساری کی ساری

اللہ کے پاس ہے۔

(۱۳) امر سے مراد گناہ۔ ﴿فَذَاقَتْ وَبَالَ أَمْرِهَا﴾ (نافرمان بستیوں نے) اپنے عذاب کا وبال چکھا۔

(۱۴) امر سے مراد شان اور فعل۔ ﴿وَمَا أَمَرَ فِرْعَوْنَ بِرَشِيدٍ﴾ فرعون کا کوئی کام درست نہیں۔

(از قرطبی)

عقیدہ : مضمون آیت کے بارے میں جو ہمارا اعتقاد ہونا چاہئے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وجود میں آنے والے تمام معلومات کا اللہ تعالیٰ ازل سے آمر ہے۔ مقدورات اور معلومات کے متاخر ہونے کے باوجود وہ ازل سے ہر مقدور کا قادر اور ہر معلوم کا عالم ہے۔ اس آیت سے جو زمانہ استقبال پر دلالت مفہوم ہوتی ہے وہ مامورات کے اعتبار سے ہے، کیونکہ لفظ کن صفت تکوین کا تقاضا کرتا ہے۔ صفت تکوین قدیم ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ قائم ہے۔

مسئلہ : روح المعانی میں ہے محققین سادات حنفیہ اس طرف گئے ہیں کہ یہاں ”کن“ امر کا صیغہ ہے۔ حقیقت پر محمول ہے وہ فرماتے ہیں کہ تکوین اشیاء میں سنت الہیہ اسی طرف جارہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی تکوین کلمہ ”کن“ سے فرماتا ہے۔ اگرچہ اس کلمہ کے بغیر بھی اشیاء کی تکوین ممکن نہیں۔

اور ﴿أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ﴾ سے کلام ازلی مراد ہے، اس لئے کہ کلام لفظی حادث ہے جس کا قیام اللہ تعالیٰ کے ساتھ ممکن نہیں۔

(روح المعانی ص ۲۳۶ ب ۱)

اعتراض : جب امر (کن) سے حقیقت امر مراد ہے تو کن کا مخاطب معدوم کو قرار دیں گے یا موجود کو، معدوم خطاب کا اہل نہیں اور موجود کو خطاب فرمانا ایجاد موجود ہے، جو تحصیل حاصل ہونے کی وجہ سے ممکن نہیں۔

جواب : جس چیز کو اللہ تعالیٰ پیدا فرمانا چاہتا ہے وہ خارج میں موجود نہیں ہوتی۔ لیکن علم الہی میں اس کی صورت موجود ہوتی ہے۔ وہی صورت علمیہ امر کن کا مخاطب ہے۔

علامہ آلوسی نے آگے چل کر فرمایا کہ معتزلہ اور کثیر اہل سنت کا مذہب یہ ہے کہ یہاں ﴿كُنْ فَيَكُونُ﴾ سے حقیقت امر اور اس کا بجالانا مراد نہیں، بلکہ جس چیز کے ساتھ ارادۃ الہیہ متعلق ہو جائے بلا تاخیر اس کے حصول کے لئے بطور تمثیل یہ کلام وارد ہے، کہ جس طرح کوئی مامور اور مطیع اپنے آمر اور

مطاع کا حکم بلا توقف بجالائے اسی طرح مراد الہی بغیر کسی مہلت اور توقف کے حاصل ہو جاتی ہے۔
سوال: اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کے متعلق فرمایا ﴿خَلَقَهُ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ﴾ (کہ اللہ نے آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا۔ پھر ان سے کہا "کن" (ہو جا) "فیکون" تو وہ ہو گئے) جب ہر چیز کی پیدائش امر کن سے ہوتی ہے پھر آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کرنے کے بعد "کن" فرمانا، اور "کن" کے فوراً بعد ان کا ہو جانا کیونکر قابل فہم ہو سکتا ہے؟ جب کہ "کن" بعد میں فرمایا گیا اور وہ پیدا پہلے ہو چکے تھے۔

اس اعتراض کی دار و مدار اس پر ہے کہ "خلق" کا معنی پیدا کرنا ہے۔ اور "ثم" تراخی کے لئے آتا ہے۔ اب مفہوم یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا۔ اور مٹی سے پیدا کرنے کے بعد کہا "کن" ہو جا۔ تو یہ کس طرح درست ہے؟

جواب: اس آیت میں "خلق" بمعنی "قدر" ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کے جسم کو مٹی سے پیدا کرنا مقدر فرمادیا، پھر ان سے "کن" کہا تو وہ ہو گئے۔ (مدارک - ۱ ص ۲۲۵)
 ایک اشکال کا حل: اگر یہ اشکال وارد کیا جائے کہ اجسام اور مادیات کی تکوین بسرعت و سہولت نہیں ہوتی۔ زمین و آسمان کی پیدائش چھ دن میں ہوئی۔ انسانی تخلیق مٹی کے ست (مٹی کی اصل خالص) سے شروع ہو کر ﴿ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ خَلْقًا...﴾ النح ﴿نطفہ، علقہ، مضغہ، عظام، لحم﴾ نطفہ، منجمد خون، لوتھڑا، ہڈیاں، گوشت کے مراحل سے گزرتی ہوئی نو، دس ماہ کی مدت میں مکمل ہوتی ہے۔ تمام حیوانات و نباتات کا یہی حال ہے، کہ عرصہ دراز میں یہ اشیاء معرض وجود میں آتی ہیں۔ تدریج و تاخیر بظاہر ﴿كُنْ فَيَكُونُ﴾ کے خلاف ہے۔ تو اس کا حل یہ ہے کہ مشیت الہیہ کے مطابق اشیاء کا وجود میں آنا "کن فیکون" کے معنی ہیں۔ لہذا جہاں مشیت الہیہ کا تعلق تدریج و تاخیر سے ہو وہاں تدریج و تاخیر ہی ﴿كُنْ فَيَكُونُ﴾ ہے۔

جس درجہ اور لمحہ میں کسی چیز کے وجود میں آنے سے مشیت الہیہ کا تعلق ہو، اگر اس سے ذرا پہلے یا بعد وہ چیز وجود میں آئے تو مشیت الہیہ کے خلاف ہوگا۔ اور یقیناً یہ ﴿كُنْ فَيَكُونُ﴾ کے منافی قرار پائے گا۔ لہذا اسے ﴿كُنْ فَيَكُونُ﴾ کے خلاف سمجھنا درست نہیں۔

علاوہ ازیں یہاں اس حقیقت کو بھی ملحوظ رکھ لیا جائے کہ تاخیر درج کا ہر مرتبہ بیشتر کائنات کا

نتیجہ ہے۔

غور فرمائیے اگر آپ چراغ میں سرشام تیل ڈال کر اسے روشن کر دیں اور اس کی لو کو بغور دیکھتے رہیں۔ وہ آپ کو بالکل متصل ایک حال پر نظر آتی رہے گی۔ جب چراغ بجھنے لگے تو آپ دیکھیں گے کہ تیل کا آخری قطرہ ختم ہوتے ہی چراغ گل ہو جائے گا، دراصل یہ اس بات کا مشاہدہ ہے کہ تیل کا ہر قطرہ جو ہزار ہا اجزاء پر مشتمل ہے نہایت سرعت کے ساتھ چراغ کی لو کی صورت میں آپ کے سامنے موجود ہے، جسے دیکھ کر مارف بے ساختہ بول اٹھتا ہے۔

کشتگان خنجر تسلیم را ہر زمان از غیب جان دیگر است

پس سمجھ لیجئے کہ اسی طرح تدریجی اشیاء کا وجود بھی لا تعداد کائنات پر مشتمل ہے، یہ تدریجی نظام بے شمار حکمتوں پر مبنی ہے۔ جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، مختصراً متاعرض کئے دیتا ہوں کہ اگر عالم مادیات میں یہ تدریجی نظام نہ ہوتا تو اسباب مادیہ بیکار ہو کر رہ جاتے۔ حالانکہ ہمارے رب نے کوئی چیز بیکار نہیں بنائی ﴿رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلًا﴾ (التہان للکافی رحمہ اللہ) یہاں سے ایک اور سوال کا حل بھی سمجھ آ گیا۔ وہ سوال یہ ہے کہ جب یہود و نصاریٰ کے لوگ عقلاء تھے، ان کو معلوم تھا کہ انسان کی پیدائش میں توالد و تناسل کو دخل ہے تو ان کا عزیر علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کو رب تعالیٰ کی اولاد تسلیم کرنے کا کیا مطلب ہے۔

تو اس کا جواب یہ ہے۔ ”وكان السبب في هذه الضلالة انه ورد اطلاق الاب على الله تعالى في الشرائع المتقدمة باعتبار انه السبب الاول وكثر هذا الاطلاق في الانجيل يوحنا ثم ظلت الجبهة ان المراد به معنى الولادة فاعتقدوا ذلك تقليدا وكفروا“ کہ ان کی گمراہی کا سبب اصل میں یہ تھا کہ پہلی شریعتوں میں اللہ تعالیٰ پر ”اب“ کا اطلاق مجازی طور پر جائز تھا، کیونکہ مطلب یہ لیا جاتا تھا کہ وہ تخلیق کا سبب اول ہے۔ (جیسا کہ باپ سبب ثانی ہے) انجیل یوحنا میں اس کا استعمال کثیر طور پر ہوا پھر جاہلوں نے اس کا حقیقی معنی بے کر رب تعالیٰ پر جب ”اب“ بولنا شروع کر لیا تو اس کی اولاد بھی مان لی اس طرح وہ کافر ہو گئے۔ (از روح المعانی)

﴿وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللَّهُ أَوْ تَأْتِينَا آيَةٌ ۚ

كَذَلِكَ قَالَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۖ تَشَابَهَتْ

قُلُوبُهُمْ قَدْ بَيَّنَّا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ﴾ (آیت ۱۱۸)

(۱) اور جاہل بولے اللہ ہم سے کیوں نہیں کلام کرتا، یا ہمیں کوئی نشانی ملے، ان سے اگلوں نے بھی ایسی ہی کہی ان کی سی بات ان کے، ان کے دل ایک سے ہیں، بے شک ہم نے نشانیاں کھول دیں یقین والوں کے لئے۔

(۲) اور کہا ان لوگوں نے جو علم نہیں رکھتے، کیوں نہیں کلام کرتا ہمارے ساتھ اللہ یا آ جاتی ہمارے پاس کوئی نشانی، پہلے تھے ان کے قول کی طرح، مشابہ ہیں ان کے دل تحقیق بیان کیں ہم نے نشانیاں اس قوم کے لئے جو یقین رکھتے ہیں۔

مختصر مطلب: یہود و نصاریٰ اور مشرکین کہنے لگے رب تعالیٰ ہمارے ساتھ کلام کیوں نہیں کرتا، یعنی ان کا مقصد یہ تھا کہ نبی بھیجنے کے بغیر براہ راست ہمیں کہتا یہ کام کرو، یہ نہ کرو، یا ہمارے ساتھ کلام کر کے ہمیں بتاتا، ”محمد“ میرے نبی ہیں، ان پر ایمان لانا۔

یا ہمارے پاس کوئی ایسی نشانی آ جاتی جس سے ہم یقین کر لیتے کہ ہاں واقعی یہ نبی ہیں۔ ہمیں ایمان لانا چاہئے۔ رب تعالیٰ نے ان کے یہودہ سوال کو رد کرتے ہوئے اور نبی کریم ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ ان لوگوں کے اس طرح کے کلام سے آپ دل تنگی محسوس نہ کریں، ان سے پہلے لوگ بھی انبیاء کرام سے ایسے ہی سوال کرتے رہے۔ اور انبیاء کرام صبر سے کام لیتے رہے۔

یہ لوگ اور پہلے لوگ اپنی کج روی اور ایمان نہ لانے اور طرح طرح کے سوال کرنے میں دلوں کے لحاظ پر ایک دوسرے کے مشابہ ہیں۔ اگر یہ یقین لانے کا ارادہ رکھتے تو ہم نے کتنی ہی واضح نشانیاں بیان کر دی ہیں تو یہ تسلیم کر لیتے۔ لیکن انہوں نے جب نہ ماننے کا فیصلہ ہی کر لیا ہے تو اس کا کوئی علاج نہیں۔

ما قبل سے تعلق بھی واضح ہو گیا کہ پہلے انہوں نے توحید باری تعالیٰ کے خلاف رب تعالیٰ کی اولاد

ٹھہرائی، اس کا ذکر کیا گیا، اب اس آیت میں ان کا نبوت کے خلاف عقیدہ رکھنا اور اس پر معترض ہونا کہ ہمیں کیا معلوم ہے یہ نبی ہیں، ان کی اس کج روی کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

شان نزول: اس آیت کریمہ میں شان نزول کی تین وجوہ ہیں۔ یعنی تین فرقوں کے مختلف اوقات میں سوالات کے بعد آیت کریمہ نازل ہوئی۔ جو تمام واقعات مجموعی طور پر اس آیت کریمہ کا شان نزول ہیں۔
(۱) مشرکین نے نبی کریم ﷺ سے کہا ”لن نؤمن لک حتی تفجر لنا من الارض ينبوعا“ ہم ہر گز تم پر ایمان نہیں، یہاں تک تم ہمارے لئے زمین میں چشمے جاری کر دو۔

اسی طرح مشرکین نے ہی کہا ”لو لا انزل علينا الملائكة او نرى ربنا“ ہماری طرف فرشتے کیوں نہیں نازل کئے جاتے یا ہم اپنے رب کو دیکھ لیتے۔

اسی طرح ان مشرکین نے ہی یہ کہا ﴿لَوْ لَا يُكَلِّمُنَا اللَّهُ اَوْ تَاْتِنَا آيَةٌ﴾ ہمارے ساتھ رب کلام کیوں نہیں کرتا یا ہمارے پاس کوئی نشانی آجائے۔

ان مشرکین کے اس قسم کے سوالات اور ایمان نہ لانے کے لئے یہاں تراشنے پر اور ان مطالبات پر آیت کریمہ نازل ہوئی۔

اس قول کو قنادہ، سدی اور حسن بصری اور کئی حضرات نے بیان کیا، زیادہ مفسرین نے بھی یہی بیان کیا۔

(۲) اور اس آیت کریمہ کے نزول کے متعلق یہ قول ہے کہ یہود نے یہ کہا تھا۔ اس پر دلیل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔

”ان رافع بن خزيمة من اليهود قال لرسول الله ﷺ ان كنت رسولا من عند الله تعالى فقل لنا يكلمنا حتى نسمع كلامه“

بے شک رافع بن خزیمہ یہودی نے نبی کریم ﷺ سے کہا ”اگر تم اللہ کی طرف سے رسول ہو، تو اللہ تعالیٰ کو کہو، وہ ہمارے ساتھ کلام کرے ہم اس کے کلام کو سنیں۔“

تو ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے۔ اس کے کہنے پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ یہود بھی اس قسم

کے سوال کرتے رہتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿يَسْأَلُكَ أَهْلُ الْكِتَابِ أَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتَابًا مِّنَ السَّمَاءِ فَقَدْ سَأَلُوا مُوسَىٰ أَكْبَرَ مِنْ ذَٰلِكَ ۖ

آپ سے سوال کرتے ہیں اہل کتاب کہ نازل کی جاتی ان پر کتاب آسمان سے، تحقیق انہوں نے

موسیٰ سے اس سے بھی بڑا سوال کیا تھا۔ یعنی وہ کہتے تھے کہ ہمارے سامنے ایک مرتبہ ہی آسمانوں سے

کتاب نازل ہو تو ہم ایمان لائیں گے۔ رب تعالیٰ نے ان کی مذمت بیان فرمائی کہ ایمان لانا تو ان کا مقصد

ہی نہیں۔ ان کا کام تو صرف بہانے تراشنا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام پر کتاب ایک مرتبہ ہی نازل ہوئی اگر ان

کے آباء واجداد ایمان لانا چاہتے تو ایک مرتبہ ہی تمام کتاب کے نازل ہونے پر ایمان لے آتے، لیکن وہ

کہنے لگے ہم تو اس وقت تک ہرگز ایمان نہیں لائیں گے جب تک رب تعالیٰ کو ظاہر طور نہ دیکھ لیں۔

(۳) حضرت مجاہد کا قول یہ ہے کہ سوال نصاریٰ نے کیا تھا۔ ان کے سوال پر یہ آیت نازل ہوئی۔

(از روح المعانی)

صحیح یہی ہے کہ مشرکین نے سوال کیا اور یہود نے بھی یہی سوال کیا اور نصرا نیوں نے بھی سوال

کیا تو آیہ کریمہ کا نزول ہوا۔ لہذا تمام واقعات مجموعی طور پر اس آیہ کریمہ کا شان نزول ہیں۔

وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ : (اور ان لوگوں نے کہا جو علم نہیں رکھتے) جب اس سے مراد

مشرکین ہوں تو ان کو بے علم، جاہل کہنے کی وجہ حقیقی طور پر پائی گئی ہے۔ ”لانہم لم یکن لہم کتاب

ولاہم اتباع نبوة“ کیونکہ ان کے پاس نہ کتاب تھی اور نہ ہی وہ کسی نبی کے متبعین تھے۔

اور جب اس سے مراد یہود یا نصاریٰ ہوں تو ان کو بے علم اور جاہل کیوں کہا گیا؟ حالانکہ وہ

کتاب کا علم رکھتے تھے اور یہود موسیٰ علیہ السلام اور نصاریٰ عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتے تھے۔

ان کو بے علم کہنے کی وجہ یہ تھی ”لتجاہلہم او لعدم علمہم بمقتضاه“ کہ وہ علم رکھنے کے

باوجود جاہل بنے بیٹھے تھے۔ اور صحیح یہ ہے کہ وہ علم کے تقاضا کے مطابق جب عمل نہیں کر رہے تھے تو وہ

جاہل ہی تھے۔ کیونکہ ان دونوں فرقوں کے علم کے مطابق اور ان کی کتابوں کے تقاضا کے مطابق چاہئے

یہ تھا کہ وہ نبی کریم ﷺ پر ایمان لائیں اور قرآن پاک کو اللہ تعالیٰ کی وحی کتاب تسلیم کریں۔ جب انہوں

نے یہ نہ کیا تو جاہل ہی تھے۔

لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللَّهُ : (ہمارے ساتھ اللہ کلام کیوں نہیں کرتا) یعنی وہ ہمارے ساتھ کلام کیوں نہیں کرتا کہ بے شک تم اس کے رسول ہو۔ یا تو وہ ہمارے ساتھ اس طرح کلام کرے جیسے ملائکہ سے کرنا ہے۔ اور یا وہ ہماری طرف وحی نازل کرے۔

”وہو استکبار منهم يعدّ انفسهم الخبيثة كالملائكة والانباء المقدسين عليهم الصلوة والسلام“

یہ ان کا کلام تکبر پر مبنی تھا کہ وہ اپنے خبیث نفسوں کو فرشتوں اور انبیاء کرام کی مقدس ذاتوں کی طرح سمجھنے لگے یہ بات وہ نہ سمجھ سکے کہ ہم میں یہ اہلیت ہی نہیں کہ رب ہمارے ساتھ کلام کرے۔

(از روح المعانی)

طلباء کرام توجہ فرمائیں: ”لولا“ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ”لولا“ تفضیہ ہے، اور ایک ”لولا“ امتناعیہ ہے۔ ”لولا“ تفضیہ کے بعد فعل ظاہر ہوتا ہے یا مقدر ہوتا ہے۔ اگر ”لولا“ تفضیہ ماضی پر داخل ہو تو شرم دلانی مقصود ہوتی ”لولا فعلت ہکذا“ تم نے ایسے کیوں نہیں کیا؟ اور اگر مضارع پر داخل ہو تو ایک کام پر برا بیچختہ (ابھارنا) کرنا مقصود ہوتا ہے۔ جیسے ”لولا تفعل ہکذا“ تم ایسا کیوں نہیں کرتے۔ یعنی تمہیں اس طرح کرنا چاہئے۔

اور ”لولا“ امتناعیہ کے بعد فعل نہیں ہوتا۔ بلکہ اسم ہوتا ہے۔ اس میں ایک چیز کا وجود دوسرے کے امتناع پر دلالت کرتا ہے۔ جیسا کہ کہا جائے ”لولا زید لہلکت“ اگر زید نہ ہوتا تو میں ہلاک ہو جاتا۔ یعنی وجود زید کی وجہ سے متکلم کی ہلاکت نہیں پائی گئی۔

أَوْتَاتِنَا آيَةً : (یا آ جاتی ہمارے پاس کوئی نشانی) یعنی ہمیں کوئی نشانی مل جاتی جو تمہاری صداقت پر دلالت کرتی۔

خیال رہے ان کا یہ کہنا کہ ”ہمارے ساتھ اللہ کلام کیوں نہیں کرتا“ تکبر کی وجہ سے تھا۔ اور ان کا یہ کہنا کہ ”یا ہمارے پاس کوئی نشانی آ جاتی“ انکار کی وجہ سے تھا۔

انکار کی دو وجہ تھیں۔ ایک تو یہ کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہوئی نشانیوں کو معاذ اللہ

گھٹیا سمجھا۔ اور دوسری وجہ یہ تھی کہ عناد کی وجہ سے انہوں نے نشانیوں کا سرے سے انکار ہی کر دیا کہ نہیں ہمارے پاس تو کوئی نشانی آئی ہی نہیں۔

(بضاوی و شیخ زادہ)

ان کی نادانی پر تعجب:

”والعجب عظموا انفسهم وهي احقر الاشياء واستهانوا بآيات الله وهي اعظمها“

ان لوگوں کی حماقت اور نادانی پر تعجب ہے کہ انہوں نے اپنے نفسوں کو عظیم سمجھا جو حقیقت میں گھٹیا تھے (کیونکہ کفار تو جانوروں سے بھی زیادہ گھٹیا ہیں) اور اللہ تعالیٰ کی نشانیاں جو اصل میں عظمت رکھتی ہیں ان کو انہوں نے گھٹیا سمجھا۔

(شیخ زادہ)

كَذَلِكَ قَالَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِثْلَ قَوْلِهِمْ :

مفہوم یہ ہے کہ ان لوگوں سے پہلے لوگوں نے بھی ان کے قول کی طرح ہی کہا۔

یعنی ان لوگوں نے بھی پہلے لوگوں کی طرح کلام کر کے وہی مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کی جو ان کے مقاصد تھے کیونکہ ان کا اس قسم کا کلام عناد، سرکشی، اپنی دنیاوی خواہشات پر مبنی تھا۔ یہ سیدھی راہ کو حاصل کرنے کا ارادہ ہی نہیں رکھتے تھے۔

(از شیخ زادہ)

تَشَابَهَتْ قُلُوبُهُمْ : (ان کے دل مشابہ ہو گئے) یہ ان لوگوں اور پہلے لوگوں کے دل ایک

دوسرے کے مشابہ ہو گئے۔ وجہ مشابہت کیا ہے؟ ﴿تَشَابَهَتْ قُلُوبُهُمْ﴾ قلوب هؤلاء ومن قبلهم فی العمی والعناد

ان لوگوں اور پہلے لوگوں کے دل اندھا پن اور عناد اور قساوت میں ایک دوسرے کے مشابہ ہو گئے۔
نکتہ: بظاہر عقل کا تقاضا یہ ہے کہ جب ان لوگوں نے پہلے لوگوں کی طرح سوال کیا، ان کی طرح مطالبہ کیا، تو کہنا یہ چاہئے تھا کہ ان کی زبانیں مشابہ ہو گئیں۔ ان کا کلام مشابہ ہو گیا۔ لیکن کہا یہ گیا ہے کہ ان کے دل مشابہ ہو گئے ہیں اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ کیا خوب بیاں کی گئی ہے۔

”فان الالسنه ترجمان القلوب والقلب متی استحکم فیہ الکفر والقسوة والعمی والسفه والعناد لایجرى علی اللسان الا ما یتنی علی التعلل والتباعد عن الایمان“

بے شک ہر س کی زبان اس کے دل کی ترجمان ہے۔ جس شخص کے دل میں کفر مستحکم ہوگا، اور دل میں قساوت پائی جائے گی، اور دل میں اندھا پن پایا جائے گا، اور دل میں بے وقوفی پائی جائے گی، اور دل میں عناد پایا جائے گا تو یقیناً اس کی زبان پر وہی کلمات جاری ہوں گے جو ایمان سے دور کرنے کا ذریعہ ہوں گے۔

(از شیخ زادہ)

قَدْ بَيَّنَّا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ :

تحقیق بیان کیس نشانیاں ہم نے اس قوم کے لئے جو یقین رکھتے ہیں۔
 بظاہر یہاں یہ وہم ہوتا ہے کہ نشانیاں تو اس قوم کے لئے بیان کی جائیں جو یقین نہ رکھتے ہوں۔ جن کو پہلے ہی یقین ہے، ان کے لئے نشانیاں بیان کرنے کی کیا ضرورت ہے؟
 تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں ”یوقنون“ کا یا تو مطلب یہ ہے۔ ”یطلبون الیقین“
 یعنی ہم نے نشانیاں بیان کر دی ہیں اس قوم کے لئے جو یقین کے طلب کرنے والے ہیں۔
 مطلب واضح ہے کہ کسی نشانی کو دیکھ کر وہی ایمان لاتا ہے جو یقین طلب کرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔
 جو شروع سے ہی ذہن میں یہ رکھ لے کہ میں نے ماننا ہی نہیں، اس کے لئے کوئی نشانی نفع مند نہیں۔
 یا ”یوقنون“ کا مطلب یہ ہے ”یوقنون الحقائق لایعتریہم شبهة ولا عناد“
 یعنی ہم نے نشانیاں بیان کر دی ہیں اس قوم کے لئے جو حقائق پر یقین رکھتے ہوں۔ حقائق میں ان کو شبہات لاحق نہ ہوں اور وہ عناد بھی نہ رکھتے ہوں۔ مطلب واضح ہے کہ جو شخص نشانیوں کو دیکھ کر بھی انکار کر دے، ان پر طرح طرح کے شبہات پیش کرے وہ کبھی ایمان نہیں لاسکتا۔ نہ ہی وہ یقین کر سکتا ہے کیونکہ ضد اور عناد کی وجہ سے انکار کرنے اور نہ ماننے کا تو کوئی علاج ہی نہیں۔

روشن نشانیوں کا انکار:

”انه تعالى قد كلمهم واخبرهم بالوحى وهو القرآن انه ارسل رسوله بالهدى ودين الحق ليظهره على الدين كله“

”ان کا یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ کلام کیوں نہیں کرتا؟ وہ ہمیں بتاتا کہ تم سچے رسول ہو۔ تو ہم ایمان لاتے“ ان کا یہ کہنا حماقت پر مبنی تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے کلام فرمایا۔ ان کو وحی کے ذریعے خبر دی۔ کیونکہ قرآن اللہ کا کلام ہی تو ہے۔ اسی کلام الہی نے یہ بیان کیا ”وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا کہ اسے سب دینوں پر غالب کرے۔“

”وأتی رسولہ آیات دالۃ علی رسالۃ کالقرآن وغیرہ من المعجزات کمجی الشجر و کلام الذئب والشاة المشویۃ المسمومۃ واشباع الخلق الكثير من الطعام القلیل وشق القمر“

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو ایسی نشانیاں عطاء فرمائیں جو آپ کی رسالت پر دلالت کر رہی تھیں جیسے قرآن پاک اور آپ کو کتنے ہی معجزات عطاء فرمائے، جن میں سے چند بہت زیادہ مشہور ہیں۔ جیسے درخت کا آپ کے پاس چل کر آنا۔ بھیڑیے کا آپ سے کلام کرنا، زہر آلود بھنی بکری (کے گوشت) کا آپ سے کلام کرنا۔ تھوڑے طعام سے بہت سی مخلوق کو سیر کر دینا۔ اور چاند کے دو ٹکڑے کر دینا۔

یہ ایسی نشانیاں تھیں جن کو مشرکین اور یہود و نصاریٰ سب ہی جانتے تھے، پھر ان کا کہنا کہ ہمارے پاس تو کوئی نشانی نہیں آئی اس کی وجہ صرف یہ تھی۔

”انہم ما قالوا ذلک لخفض فی الآیات او لطلب مزید القین وانما قالوہ عتوا و عنادا“

کہ انہوں نے سرکشی اور عناد کی وجہ سے انکار کیا تھا، یہ وجہ نہیں تھی کہ یہ نشانیاں کوئی مخفی تھیں۔ یا وہ زیادہ یقین حاصل کرنے کے لئے اور نشانیاں طلب کرنا چاہتے تھے۔

(از بیضاوی و شیخ زادہ)



﴿إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَلَا تُسْئَلُ عَنْ

أَصْحَابِ الْجَحِيمِ﴾

(آیت ۱۱۹)

(۱) بے شک ہم نے تمہیں حق کے ساتھ بھیجا خوشخبری دیتا اور ڈر سنا تا اور تم سے دوزخ والوں کا سوال نہ ہوگا۔

(۲) بے شک ہم نے بھیجا تمہیں حق کے ساتھ، خوشخبری دینے والا اور ڈر سنانے والے، اور تم سے نہیں سوال کیا جائے گا جہنم والوں کے متعلق۔

شان نزول: مشرکین اور نصاریٰ اور یہود نے جب عناد پر اصرار کیا، اور باطل عقائد و نظریات پر چمٹے رہے، حق کو تسلیم کرنے کی انہوں نے کوئی کوشش نہ کی، کبھی توحید باری تعالیٰ کے خلاف اور کبھی نبوت کے خلاف کلام پیش کرنا انہوں نے طریقہ بنالیا، تو کئی مرتبہ نبی کریم ﷺ انکے ایمان نہ لانے اور جہنم کا ایندھن بننے کی وجہ سے پریشان ہو جائے، تو رب تعالیٰ نے آپ کی تسلی کیلئے اس آیت کریمہ کو نازل کیا۔

گویا کہ یوں بیان فرمادیا ”انہ لامزید علی ما فعلہ فی مصالح دینہم من اظہار الادلة“ کہ ہم نے ان کو دین کی مصلحت کے لئے دلائل بیان کر دیے کہ وہ ان سے راہنمائی حاصل کر کے راہ راست پر آجائیں، ایمان لے آئیں تاکہ اپنے آپ کو اخروی عذاب سے بچالیں، اس سے زیادہ ہماری کوئی ذمہ داری نہیں۔

”وانہ لامزید علی ما فعلہ الرسول فی باب الابلاغ والتنبيه“

اور اے نبی کریم ﷺ آپ کا کام یہ تھا کہ آپ وہ دلائل ان تک پہنچادیں، ان کو متنبہ کردیں یعنی آپ کے ذمہ صرف اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچانا تھا کہ ان کو بتادیں اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں، اللہ تعالیٰ اولاد اور زوجہ سے پاک ہے۔ اور ان کو ایمان لانے پر اجر عظیم کے حاصل ہونے اور ایمان نہ لانے پر اخروی عذاب حاصل ہونے پر متنبہ کردیں۔

اے نبی کریم آپ نے یہ کام مستحسن طریقہ پر کر دیا ہے۔ آپ نے تبلیغ فرمادی۔ آپ نے ان کو

متنبہ کر دیا، اب وہ ایمان نہ لا کر جہنم کا ایندھن بنتے ہیں تو بنتے رہیں، آپ کو غمزدہ ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ آیہ کریمہ کے شان نزول پر غور کرنے سے رب تعالیٰ کی صفت قہاریت اور جباریت سمجھ آ گئی۔ اور نبی کریم ﷺ کی صفت رحمت نمایاں طور پر جگمگاتی ہوئی نظر آنے لگی۔

بِالْحَقِّ : کا تعلق اگر ارسال سے ہو تو اب مطلب یہ ہوگا۔ ”انا ارسلناک ارسالا بالحق“ بے شک ہم نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا حق کے ساتھ، یعنی ہمارا آپ کو بھیجنا حق کے ساتھ ہے۔

اگر اس کا تعلق ﴿بَشِيرًا وَنَذِيرًا﴾ کے ساتھ ہو تو اب معنی ہوگا۔ ”انت مبشر بالحق و منذر به“ ہم نے آپ کو بھیجا بشیر اور نذیر بنا کر۔ آپ ان کو بشارت دیتے ہیں حق کے ساتھ، اور آپ ان کو ڈراتے ہیں حق کے ساتھ یعنی آپ کا بشارت دینا اور آپ کا ڈرانا حق ہے اس میں باطل کا کوئی تصور بھی نہیں۔

اور تیسرا مطلب یہ ہے کہ ”حق“ سے مراد ”دین اور قرآن ہو“ اب اس صورت میں معنی یہ ہوگا ”انا ارسلناک بالقرآن حال کونه بشیرا لمن اطاع الله بالثواب ونذیرا لمن کفر بالعقاب“ بے شک ہم نے آپ کو قرآن دے کر بھیجا، دراصل حالیکہ (اس حال میں کہ) جو اللہ کی اطاعت کرے اسے آپ ثواب کی بشارت دیں۔ اور جو کفر کرے اسے آپ عذاب سے ڈرائیں۔

اگرچہ یہ تینوں معانی معتبر ہیں، ایک ایک لفظ سے کثیر اور عظیم مطالب کا حاصل ہونا دراصل قرآن پاک کی عظمت پر دلالت کرتا ہے۔ تاہم زیادہ مشہور اور بہتر قول یہ ہے۔ ”بشیر اور نذیر“ صفت ہو رسول کی۔ اور معنی یہ ہو۔

”انا ارسلناک یا محمد بالحق لتکون مبشرا لمن اتبعک واهتدی بدینک ومنذرا لمن کفر بک وضل عن دینک“

اے نبی کریم بے شک ہم نے آپ کو حق سے بھیجا تا کہ جو لوگ آپ کی تابعداری کریں اور آپ کے دین پر چل کر ہدایت حاصل کر لیں ان کو آپ بشارت دیں۔ اور جو لوگ آپ سے کفر کریں، اور آپ کے دین سے گمراہ رہیں، ان کو آپ ڈرائیں۔ (اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی قول کے مطابق ہے، یہی راقم نے بھی نقل کیا)۔

(کبر)

حق سے مراد: یا تو حق سے مراد صدق ہے۔ یعنی ہم نے آپ کو بھیجا صدق سے۔ اور یا ”حق“ سے مراد قرآن ہے یعنی ہم نے آپ کو بھیجا قرآن عطاء کر کے۔ اور یا ”حق“ سے مراد السلام ہے۔ یعنی ہم نے آپ کو بھیجا اسلام کے ساتھ۔ اور بعض حضرات نے یہ معنی بیان کیا ہے ”انما لم نرسلک عبثا بل ارسلناک بالحق“ بے شک ہم نے آپ کو یونہی بے مقصد نہیں بھیجا بلکہ آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے۔

بَشِيرًا: ”ای مبشر اولیائی و اہل طاعتی بالثواب العظیم“ آپ کو بشارت دینے والا بنا کر بھیجا کہ آپ میرے دوستوں اور میری طاعت کرنے والوں کو عظیم ثواب کی خوشخبری دیں۔

وَنَذِيرًا: ”اے منذر و مخوف لاعدائی و اہل معصیتی بالعذاب الالیم“ آپ کو ڈرانے والا، اور خوف دلانے والا بنا کر بھیجا تا کہ آپ میرے دشمنوں اور میری نافرمانی کرنے والوں کو دردناک عذاب کا خوف دلائیں۔

(خازن)

تَنْبِيْه: بشیر اور نذیر ہونے کا ذکر فرمایا کہ آپ اہل طاعت کو خوشخبری دیں، اور اہل معصیت کو ڈرائیں، لیکن آپ پر یہ لازم نہیں کہ آپ ان کو جبری طور پر ایمان لانے پر مجبور کریں۔ وہ اپنے عقائد باطلہ پر اصرار کرتے ہیں تو کرنے دیں، تکبر کرتے ہیں تو کرنے دیں۔ آپ پر کچھ حرج نہیں۔

(روح المعانی)

وَلَا تَسْأَلُ عَنْ أَصْحَابِ الْجَحِيْمِ:

اور آپ سے سوال نہیں کیا جائے گا جہنم والوں کے متعلق

”وَلَا تَسْأَلُ“ میں دو قراءتیں ہیں۔ مشہور قراءت یہی ہے کہ یہ صیغہ نفی مجہول کا ہے (تا پر

ضمہ ہے) اسی قراءت کے مطابق ترجمہ کیا گیا ہے۔ اب اس قراءت کے مطابق چند مطالب ہیں۔

(۱) کافروں کا ٹھکانا جہنم ہے۔ ان کی معصیت آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی، اور ان کے

کفریات اور ایمان نہ لانے کا سوال آپ سے نہیں کیا جائے گا۔ ”فانما علیک البلاغ

وعلینا الحساب“ آپ کا کام ہے تبلیغ فرما دینا، ہمارا کام ہے ان سے حساب لینا۔

(۲) اے نبی کریم آپ کا کام ہے ہدایت دینا۔ اس ہدایت کو کوئی قبول کرے یا نہ کرے آپ

سے کوئی سوال نہیں کیا جائے گا، اس لئے آپ ان کے عذاب اور جہنم، ایمان نہ لانے سے کوئی فکر نہ کریں، آپ کو ان کے متعلق غمزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔

(۳) اے نبی کریم آپ کسی کی طاعت اور نافرمانی کا وقتی طور پر کوئی لحاظ نہ کریں، بلکہ آخرت کا دار و مدار خاتمہ پر ہے خاتمہ ایمان پر ہوا تو نجات ہوگی اور خاتمہ کفر پر ہوا تو عذاب ہوگا۔

فائدہ: ”وفی الآية دلالة علی ان احدا لا یسأل عن ذنب غیره ولا یؤخذ بما اجترمه سواء کان قریبا وبعیدا“

اس آیت کریمہ سے یہ سمجھ آیا کہ کسی شخص سے دوسرے کے گناہوں کے متعلق سوال نہیں کیا جائے گا۔ اور نہ ہی کسی کے جرم کا مؤاخذہ (گرفت، پکڑ) دوسرے کو ہونا ہے خواہ قریبی رشتہ دار ہو، یا دور کا رشتہ دار ہو۔

دوسری قراءت: ولاتسأل (تاء پر فتح اور لام پر ضمہ) یعنی صیغہ نفی معلوم کا ہے لیکن معنی نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ جہنم والوں کے متعلق سوال نہ کریں۔

”انا ارسلناک بالحق بشیرا و نذیرا غیر سائل عنہم“

بے شک ہم نے آپ کو حق کے ساتھ بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے ان کے عذاب کے متعلق متفکر ہو کر سوال کرنے والا آپ کو بنا کر نہیں بھیجا۔

”لان علم اللہ تعالیٰ بکفرہم بعد انذارہم یغنی عن سؤالہ عنہم“

اس لئے اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ آپ نے ان کو ڈرا دیا ہے لیکن وہ پھر بھی اپنے کفر پر قائم رہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا جاننا ان کے بارے میں سوال سے بے پرواہ کر دیتا ہے۔ جب رب تعالیٰ جانتا ہے ان کے کفر کو تو آپ ان کے متعلق سوال نہ کریں۔

(از فرطی)

شان نزول میں ایک ضعیف روایت:

یہی دوسری قراءت جو بیان کی گئی کہ نفی معروف کا صیغہ ہے جو نفی کے معنی میں ہے۔ یا مین نفی ہے جیسا کہ علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا۔

اس قراءت کے مطابق بعض حضرات نے کہا یہ آیہ نبی کریم ﷺ کے اپنے والدین کے متعلق سوال کرنے پر نازل ہوئی۔ اس پر روایت یہ بیان کی جاتی ہے۔

”انہ علیہ الصلوٰۃ والسلام سأل جبریل عن قبریهما فدلہ علیہما فذهب فدعا لہما وتمنی ان یعرف حالہما فی الآخرة، وقال لیت شعری ما فعل ابوای“ فنزلت۔

کہ نبی کریم ﷺ نے جبریل سے اپنے والدین کی قبروں کے متعلق پوچھا، انہوں نے آپ کو ان کی قبروں کی راہنمائی کی، آپ گئے۔ ان کے لئے دعاء کی۔ آپ کو یہ تمنا لاحق ہوئی کہ میں ان کے اخروی حالات کے متعلق علم حاصل کروں۔ تو آپ نے کہا ”کاش مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ میرے ماں باپ سے کیا کیا گیا۔“ تو یہ آیہ نازل ہوئی۔

اس روایت کے مطابق بعض حضرات نے نبی کریم ﷺ کے والدین کا (معاذ اللہ) کفر ثابت کیا ہے۔ کہ ان کے متعلق کہا گیا ہے کہ ”آپ جہنمیوں کے متعلق سوال نہ کریں۔“ لیکن علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ہے:

”لم یرد فی هذا الا اثر معضل ضعيف الاسناد فلا یعول علیہ“

کہ اس مسئلہ کے متعلق کوئی صحیح یا حسن روایت ثابت نہیں، سوائے اس کے کہ معضل اور ضعیف الاسناد روایت ثابت ہے جس اعتبار کرنا ممکن نہیں۔ (از روح المعانی)

خیال رہے کہ ”معضل“ اسے کہا جاتا ہے جس کی سند سے دو یا دو سے زائد راوی ساقط ہوں۔

راقم نے ایک رسالہ لکھا ہے۔ جس کا نام ”تکریم والدین مصطفیٰ ﷺ ہے۔ اس رسالہ میں آپ کے والدین کریمین کے ایمان کے متعلق بحث کی گئی۔ اس رسالہ کو مکمل طور پر یہاں شامل کرنا ضروری ہے۔ تاکہ طلباء کرام اس مقام پر بعض تفاسیر کے مطالعہ سے غلطی کے مرتکب نہ ہو۔

☆☆☆☆☆

﴿بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ﴾

الحمد لله الرزاق الماجد الباسط الراسع القادر . والصلوة على النبي الذي انتقل
من الطاهر الى الطاهر ، وعلى آله واصحابه الذين اطاعوه في الباطن والظاهر . اما بعد !

فَاَعْرُذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ

﴿بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ﴾

﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ مِنْهُمْ مَنْ كَلَّمَ اللَّهُ

(پ ۳ ع ۱)

وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ﴾

یہ رسول ہیں کہ ہم نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر افضل کیا۔ ان میں سے کبھی اللہ تعالیٰ
نے کلام فرمایا، اور کوئی وہ ہے جسے سب پر درجوں بلند کیا۔

(کنز الایمان فی ترجمۃ القرآن - از امام احمد رضا خان محدث دہلوی)

اجمعت الامة على ان بعض الانبياء افضل من بعض وعلى ان محمدا ﷺ افضل من الكل

(تفسیر کبیر ج ۱ ص ۲۰۸ زیر آیت مذکورہ)

اجماع امت اس پر ہے کہ بعض انبیاء کرام بعض پر افضل ہیں اور اس پر بھی اجماع امت ہے
کہ تمام انبیائے کرام علیہم السلام سے افضل ہمارے نبی کریم محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں۔

علامہ رازئی نے نبی کریم ﷺ کی افضلیت پر انیس دلائل قائم کئے۔ راقم نے اس پر ایک کا اضافہ
کر کے اپنی کتاب ”تذکرۃ الانبیاء“ میں مکمل بیس دلائل نقل کئے ہیں۔ یہاں تک کہ صرف ایک کا
تذکرہ کیا جاتا ہے۔

قال الله تعالى: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ﴾ فلما كان رحمة لكل

(تفسیر کبیر جلد ۱ ص ۲۰۸)

العالمين لزم أن يكون افضل من كل العالمين .

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی جب یہ ہے (ترجمہ) ”اور ہم نے تمہیں نہ بھیجا مگر رحمت سارے
جہان کے لئے“ جب آپ کو تمام جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا تو یقیناً آپ تمام جہان والوں
سے افضل بھی ہیں۔ ”عالمین“ میں تمام انبیاء کرام بھی داخل ہیں۔ تو آپ ﷺ کا تمام انبیائے کرام
پر افضل ہونا بھی یقینی ہے۔

افضل الانبياء بزبان افضل الانبياء:

عن ابن عباس قال قال رسول الله ﷺ ... انا اكرم الاولين والآخرين على الله ولا فخر "جزء الحديث" (ترمذی، دارمی، مشکوٰۃ، باب فضائل سید المرسلین ص ۵۱۳)

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں اللہ تعالیٰ کے ہاں تمام اولین و آخرین سے زیادہ مکرم ہوں۔

یہ یقینی امر ہے جو سب سے زیادہ رب تعالیٰ کے نزدیک مکرم ہوگا وہ سب سے زیادہ افضل بھی ہوگا۔
"عن جابر أن النبی ﷺ قال انا قائد المرسلین ولا فخر"

(دارمی، مشکوٰۃ، باب فضائل سید المرسلین ص ۵۱۳)

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "میں تمام رسولوں کا قائد ہوں گا، مجھے اس پر کوئی فخر نہیں" یعنی آخرت میں، میں سب سے مقدم ہوں گا۔

آپ ﷺ کا تمام انبیائے کرام پر مقدم ہونا اور تمام کا قائد ہونا آپ ﷺ کی افضلیت پر واضح طور پر دلالت کر رہا ہے۔ اس سے آپ ﷺ کا افضل الانبیاء ہونا روز روشن سے بھی زیادہ واضح ہو گیا۔

"عن ابی بن کعب عن النبی ﷺ قال اذا كان يوم القيامة كنت امام النبیین وخطیبهم وصاحب شفاعتهم غیر فخر" (ترمذی، مشکوٰۃ ص ۵۱۳)

حضرت ابی ابن کعبؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "میں قیامت کے دن انبیائے کرام کا امام ہوں گا۔ میں ان کا خطیب ہوں گا، میں ان کا شفیع ہوں گا۔ مجھے اس پر کوئی فخر نہیں" "امام ہونا اور قائد ہونا" دونوں کا ایک ہی مقصد ہے، خطیب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ میں اس وقت رب کے حضور کلام کروں گا۔ جب تمام انبیائے کرام خاموش ہوں گے۔ اور میں "مقام محمود" میں سب کی شفاعت کروں گا۔ (مرقاۃ المفاتیح)

سبحان اللہ! میرے پیارے حبیب پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام جب امام الانبیاء ہیں اور شفیع الانبیاء ہیں تو افضل الانبیاء کیوں نہ ہوں؟

"عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ انا سید ولد آدم يوم القيامة"

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن مجھے تمام انسانوں پر سیادت

حاصل ہوگی۔

عروی سراج مسند

”السید“ قال الهروی هو الذی یفوق قومه فی الخیر

علامہ ہروی نے فرمایا: ”سید“ وہ ہوتا ہے جو اپنی قوم پر بہتر ہونے میں فوقیت رکھتا ہو۔

جب میرے حبیب پاک ﷺ تمام انسانوں کے سردار ہیں تو یقیناً تمام سے فوقیت بھی رکھتے ہیں۔ یہی معنی ہے افضل ہونے کا۔

علامہ نووی مزید تفصیل ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

”وقال غیره هو الذی یفزع الیہ فی النوائب والشدائد فبقوم بامرهم ویتحمل

عنه مکارههم ویدفعها عنهم“

علامہ ہروی کے علاوہ دوسرے اہل علم نے ”سید“ کا معنی یہ بیان کیا ہے کہ: ”سید“ وہ ہوتا ہے جس کی طرف لوگ مصائب و آلام میں رجوع کریں اور وہ ان کے مصائب کو دور کرے۔

اس سے پتہ چلا کہ حضور ﷺ تمام لوگوں کے حاجت روا ہیں۔ جن میں انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والتسلیم بھی شامل ہیں۔ یقیناً وہ ذات جو دوسرے حضرات کی حاجت روا ہے وہ ان سے افضل ہے۔ اس طرح افضل الانبیاء ہونا واضح ہوا۔

تنبیہ: ”قوله ﷺ یوم القيامة مع أنه سیاءهم فی الدنيا والآخرة فسبب التفیید ان

عروی

فی یوم القيامة یتظهر سودده لكل احد ولا یبقی منازع ولا معاند“

نبی کریم ﷺ نے اپنی سیادت قیامت کے دن ہونے کا ذکر فرمایا، حالانکہ آپ دنیا میں بھی تمام کے سردار ہیں اور آخرت میں بھی تمام کے سردار ہوں گے۔ قیامت کے ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ قیامت کے دن آپ کی سیادت ہر ایک پر ظاہر ہوگی۔ اس دن کوئی جھگڑا کرنے والا، اور کوئی عناد رکھنے والا نہیں ہوگا۔

فقط اتنا سبب ہے انعقاد بزم محشر کا

کہ ان کی شان محبوبی دکھائی جانیوالی ہے

نبی کریم ﷺ کا ارشاد بھی ایسے ہی ہے جس طرح رب ذوالجلال کا ارشاد گرامی: لمن الملک

الیوم؟ آج کس کی بادشاہی ہے؟ یہ بھی قیامت کے دن ہی ذکر ہوگا، حالانکہ دنیا میں بھی رب ذوالجلال

ہی کی بادشاہی ہے۔ لیکن دنیا میں مختلف خطوں کے مختلف بادشاہ کہلانے والے بھی قیامت کے دن صرف رب تعالیٰ ہی کی بادشاہی کو مانیں گے، ایسے ہی دنیا میں نبی کریم ﷺ کے وسیلہ جلیلہ کے منکرین بھی قیامت کے دن آپ ﷺ کا وسیلہ ڈھونڈ رہے ہوں گے۔ آپ کو حاجت روا ماننے کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں ہوگا۔

قول صحابی:

”عن ابن عباسؓ قال إن الله تعالى فضل محمداً ﷺ على الأنبياء وعلى أهل السماء“

(مشکوٰۃ شریف باب فضائل سید المرسلین ص ۵۱۵)

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو تمام انبیائے کرام پر اور تمام آسمانوں والوں پر فضیلت دی ہے۔

یہاں تک بیان کردہ مختصر مضمون سے واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو ”افضل الانبياء“ کہا؛ کیونکہ مفسرین کرام کا اس پر اجماع ہے کہ ”ورفع بعضهم درجت“ سے مراد حضور نبی کریم ﷺ ہی ہیں۔ اور نبی کریم ﷺ کے اپنے ارشادات گرامی سے بھی واضح ہوا کہ:

”آپ افضل الانبياء، سید الانبياء، امام الانبياء اور اکرم الانبياء ہیں“

اور حضرت ابن عباسؓ کے قول سے بھی پتہ چلا کہ آپ تمام آسمان والوں اور تمام انبیائے کرام سے افضل ہیں۔

مقام یوسف علیہ السلام بزبان سید الانبياء:

”عن ابن عمرؓ قال قال رسول الله ﷺ الكريم ابن الكريم ابن الكريم يوسف بن يعقوب بن اسحاق بن ابراهيم عليهم السلام“

(بخاری شریف، مشکوٰۃ شریف باب المفاخرة والعصية ص ۴۱۷)

حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کریم ابن کریم ابن کریم ابن کریم یوسف ابن یعقوب ابن اسحاق ابن ابراہیم علیہم السلام ہیں۔

اس حدیث پاک سے واضح ہوا کہ یوسف علیہ السلام کو خاندانی منصب کی وجہ سے ہی یہ کمال حاصل ہوا۔ کہ آپ صاحب ایمان اور نبی، آپ کے والد گرامی صاحب ایمان اور نبی، اور آپ کے دادا

صاحب ایمان اور نبی، اور آپ کے پردادا صاحب ایمان اور نبی ہیں۔ لہذا آپ علیہ السلام کو کریم ابن کریم ابن کریم ابن کریم ہونے کا شرف حاصل ہے۔

خاندانی عیب (گھٹیا کفو)

”واما فی العجم فتعتبر حرية واسلاما فمسلم بنفسه او معتق غير كفء لمن ابوها مسلم او حرا او معتق“
(درمختار باب الکفاءة)

عجم میں کفو کا اعتبار حریت اور اسلام میں بھی ہے۔ جو شخص خود تو مسلمان ہے یا آزاد ہے وہ اس شخص کا کفو نہیں بن سکتا جس کا باپ بھی مسلمان ہے یا آزاد ہے خواہ وہ آزاد ہی آ رہا ہے، یا آزاد کیا گیا ہے۔

خیال رہے: اگرچہ عرب میں اسلام کا لحاظ کفو میں نہیں لیکن عجم میں ہے۔ جب نبی کریم ﷺ تمام عرب و عجم کے نبی ہیں تو یقیناً آپ کی شان کو اس طرح ماننا ضروری ہے کہ آپ ﷺ کو نہ عرب گھٹیا کہہ سکیں اور نہ عجم۔

اہل محبت کے لئے تو اتنا ہی لکھنا کافی ہے کہ:

”نبی کریم ﷺ افضل الانبیاء ہیں، اور یوسف علیہ السلام کریم ابن کریم ابن کریم ہیں۔ اور عجم کے نزدیک وہ شخص جس کا باپ کافر ہو وہ گھٹیا خاندان کا مالک ہے“

اگر یہ کہا جائے کہ نبی کریم ﷺ کے باپ..... معاذ اللہ..... کافر تھے تو آپ ﷺ کا یوسف علیہ السلام سے گھٹیا ہونا عجم کے نزدیک لازم آئے گا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی شخص آپ ﷺ کی عیب جوئی کر سکے۔ آپ کو تمام عیوب سے پاک پیدا کیا گیا۔

خلقت مبرا من کل عیب ☆ کانک قد خلقت کما تشاء

اگرچہ نہ ماننے والے کیلئے دلائل کے انبار بھی نا کافی ہیں، تاہم پھر بھی اپنی طرف سے کچھ دلائل پیش کرنے اس لئے ضروری ہیں کہ کم از کم سیدھے سادے، بھولے بھالے مسلمانوں کو منافقانہ چال بازیوں کے ساتھ راہ حق سے بھٹکا یا نہ جاسکے۔

ایمان والدین کریمین کے متعلق مسالک

اہل علم کا پہلا مسلک:

ایک مسلک یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے والدین زمانہ فترت میں تھے۔ اس وقت ”بت پرست نہ ہونا، مشرک نہ ہونا“ ہی نجات کے لئے کافی ہے۔ وہ بت پرست نہ تھے لہذا جنتی ہیں۔

”المسلک الاول: انهما ماتا قبل البعثة ولا تعذیب قبلہا لقولہ تعالیٰ ”وما کنا معذبین حتی نبعث رسولا“

نبی کریم ﷺ کے والدین کریمین آپ کی بعثت سے پہلے فوت ہو گئے اور ”زمانہ فترت“ میں فوت ہونے والوں کو عذاب نہیں ہوگا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (ترجمہ) اور ہم عذاب دینے والے نہیں جب تک ہم رسول نہ بھیج لیں۔

علمائے کلام و علم اصول میں سے اشاعرہ اور فقہائے کرام میں سے شوافع کا اس مسئلہ میں اجماع ہے کہ ”جسے دعوت اسلام نہ ملے وہ فوت ہو جائے تو وہ نجات پائے گا۔ اور دعوت اسلام سے پہلے کسی کو قتل کرنا باعث لزوم دیت و کفارہ ہے۔“

شیخ الاسلام شریف الدین مناوی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے نبی کریم ﷺ کے والد مکرم کے متعلق سوال کیا۔ کیا وہ آگ میں جائیں گے؟ تو آپ نے سائل پر شدید غصہ کا اظہار کیا۔ سائل نے کہا کیا ان کا اسلام ثابت ہے؟ تو انہوں نے فرمایا!

”انہ مات فی الفترۃ ولا تعذیب قبل البعثة“

بیشک وہ زمانہ فترت میں فوت ہوئے اور بعثت سے پہلے فوت ہونے والوں کو عذاب نہیں ہوگا۔ دوسرا مسلک: آپ ﷺ کے والدین کریمین مومن تھے۔ کفر و شرک سے پاک تھے۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو ماننے والے تھے۔ اور دین ابراہیمی پر قائم تھے، اگرچہ تفصیلی طور پر شریعت مصطفیٰ ﷺ کا نزول بعد میں ہوا لیکن اس کے اصول بھی دین ابراہیمی پر قائم ہیں، لہذا دین ابراہیمی پر قائم رہنے کی وجہ سے وہ جنتی ہیں۔ راقم کا بھی یہی مسلک ہے۔

تیسرا مسلک: نبی کریم ﷺ نے اپنے والدین کو زندہ کر کے ایمان کی دولت سے مالا مال کیا۔
چوتھا مسلک: نبی کریم ﷺ کے والدین..... العیاذ باللہ..... کافر و مشرک تھے۔

اس آخری مسلک والے کچھ احادیث کو نہ سمجھنے کی وجہ سے غلطی کا شکار ہوئے، جن کی تفصیل ان شاء اللہ بعد میں ذکر کی جائے گی۔

مسلک اول کے شواہد: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جب زندہ آسمانوں پر اٹھا لیا گیا۔ انجیل میں بھی تحریف کر دی گئی۔ اس وقت سے لیکر نبی کریم ﷺ کی بعثت تک کوئی اور شریعت نہیں آئی۔ اس دوران صرف بت پرستی سے دور رہنا ہی نجات کیلئے کافی تھا۔ یہ درمیانی زمانہ ”فترۃ“ کا زمانہ کہلاتا ہے۔

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہی مضمون دوسری آیات کریمہ سے بھی ثابت ہے۔

☆ ﴿ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَبُّكَ مُهْلِكِ الْقُرَىٰ بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ﴾ (انعام آیت ۱۳۱)

یہ اس لئے کہ تیرا رب بستیوں کو ظلم سے تباہ نہیں کرتا، کہ ان کے لوگ بے خبر ہوں۔

☆ ﴿وَلَوْلَا اَنْ تُصِیْهِمْ مُّصِیْبَةٌ بِمَا قَدَّمْتُ اَیْدِیْهِمْ فَيَقُوْلُوْا رَبَّنَا لَوْلَا اَرْسَلْتَ اِلَیْنَا رَسُوْلًا

فَتُبْعَ اَیْتِكَ وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ﴾؟ (الفصل آیت ۴۷)

اور اگر نہ ہوتا کہ کبھی پہنچتی انہیں کوئی مصیبت اس کے سبب جو ان کے ہاتھوں نے آگے بھیجا تو

کہتے: اے ہمارے رب تو نے کیوں نہ بھیجا ہماری طرف کوئی رسول کہ ہم تیری آیتوں کی پیروی کرتے

اور ایمان لاتے۔

☆ ﴿وَلَوْ اَنَّا اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْلَا اَرْسَلْتَ اِلَیْنَا رَسُوْلًا فَتُبْعَ اَیْتِكَ مِّنْ

قَبْلِ اَنْ نَّذَلَ وَنُخْزٰی﴾ (طہ آیت ۱۳۳)

اور اگر ہم انہیں کسی عذاب سے ہلاک کر دیتے رسول کے آنے سے پہلے، تو ضرور کہتے: اے

ہمارے رب تو نے ہماری طرف کوئی رسول کیوں نہ بھیجا کہ ہم تیری آیتوں پر چلتے قبل اس کے کہ ذلیل و

رُسوا ہوئے۔

☆ ﴿وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكِ الْقُرَىٰ حَتّٰی یُبْعَثَ فِیْ اُمَمٍ رَّسُوْلًا یَّتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِہٖ﴾

ترجمہ: اور تمہارا رب شہروں کو ہلاک نہیں کرتا جب تک ان کے اصل مرجع میں رسول نہ بھیجے، جو ان پر

ہماری آیتیں پڑھے۔ (الفصل آیت ۵۹)

﴿وَهَذَا كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ مُبَارَكٌ فَاتَّبِعُوهُ وَاتَّقُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ﴾ ☆ **انعام آیت ۱۵۵، ۱۵۶**

اور یہ برکت والی کتاب ہم نے اتاری تو اس کی پیروی کرو۔ اور پرہیزگاری کرو کہ تم پر رحم ہو، کبھی کہو (یعنی تاکہ تم یہ نہ کہہ سکو) کہ کتاب تو ہم سے پہلے دو گروہوں پر اتری تھی اور ہمیں اس کے پڑھنے پڑھانے کی کچھ خبر نہ تھی۔

☆ ﴿وَمَا أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ إِلَّا لَهَا مُنْذِرُونَ﴾ ☆ **ذکری سورہ ۲۰۸ / ۲۰۹**

اور ہم نے کوئی بستی ہلاک نہ کی جسے ڈرسانے والے نہ ہوں، نصیحت کیلئے۔ اور ہم ظلم نہیں کرتے۔

☆ ﴿وَهُمْ يَصْطَرِّخُونَ فِيهَا رَبَّنَا أَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ الَّذِي كُنَّا نَعْمَلُ ۖ أَوَلَمْ نُعَمِّرْكُم مَّا يَتَذَكَّرُ فِيهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَاءَكُمُ النَّذِيرُ ۖ فَذُوقُوا فَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ نَصِيرٍ﴾ **فاطر، آیت ۳۷**

وہ اس (جہنم کی آگ) میں چلاتے ہوں گے: اے ہمارے رب ہمیں نکال کہ ہم اچھا کام کریں، اس کے خلاف جو پہلے کرتے تھے۔ (جواب دیا جائے گا) اور کیا ہم نے تمہیں وہ عمر نہ دی تھی جس میں سمجھ لیتا جس نے سمجھنا ہوتا۔ اور ڈرسانے والا تمہارے پاس تشریف لایا تھا۔ تو اب چکھو (جہنم کی آگ کا مزہ) کہ ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔

انبیائے کرام کی بعثت اور دعوت اسلام کے بغیر کسی کو عذاب نہیں دیا جائے گا، اسی مضمون پر علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے سات احادیث پیش کی ہیں ان میں ایک یہ ہے!

☆ "اخرج عبد الرزاق وابن جرير وابن المنذر وابن ابی حاتم عن ابی ہریرۃ قال اذا کان یوم القیامۃ جمع اللہ اهل الفترة والمعنہ والاصم والابکم والشیوخ الذین لم یدرکوا الاسلام ثم ارسل الیہم رسولا ان ادخلوا النار فیقولون کیف لم تأتنا رسل قال وایم اللہ لو دخلوها وکانت علیہم برودا وسلاما ثم یرسل الیہم فیطیعہ من کان یرید ان یطیعہ قال ابو ہریرۃ اقرأوا ان شئتم "وما کنا معذبین حتی نبعث رسولا" اسنادہ صحیح علی شرط الشیخین ومثله لا یقال من قبل الراۓ فله حکم الرفع"

(الحاوی للفتاویٰ ج ۲ ص ۲۰۳)

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اصحاب فترت، نیم پاگل،

گوئے، بہرے اور بوڑھے جنہوں نے اسلام کو نہیں پایا ان لوگوں کے پاس فرشتوں کو بھیجے گا کہ ان کو آگ میں داخل کر دیا جائے۔ تو وہ کہیں گے۔ اے اللہ تعالیٰ کیسے ہمیں آگ میں بھیجا جا رہا ہے۔ ہمارے پاس تو کوئی رسول نہیں آیا تھا۔ راوی کہتے ہیں قسم ہے اللہ تعالیٰ کی اگر ان کو آگ میں بھیج دیا جاتا تو ان پر آگ ٹھنڈی اور سلامتی میں ہو جاتی۔ تو اس وقت ان کے پاس رسول کو بھیجا جائے گا۔ جن کی قسمت میں ہوگا وہ ایمان لے آئیں گے۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے اس پر دلیل پیش کرتے ہوئے کہا کہ اگر تم چاہتے ہو تو ”وما کنا معذبین حتی نبعث رسولا“ کی آیت پڑھو۔ یعنی ہم عذاب دینے والے نہیں جب تک ہم رسول نہ بھیجیں۔

علامہ سیوطیؒ سند پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ اس حدیث کی سند بخاری و مسلم کی شرائط کے مطابق صحیح ہے اور یہ حدیث رائے کے مطابق بھی نہیں اس لئے یہ مرفوع حدیث کے حکم میں ہے۔
(الحاوی للفتاویٰ ج ۲ ص ۲۰۵)

”وقال الامام فخر الدین الرازی فی المحصول شکر المنعم لا یجب عقلا خلافا للمعتزلة“
علامہ فخر الدین رازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنی کتاب محصول میں ذکر کیا ”منعم ذات“ یعنی اللہ تعالیٰ جس کے ان گنت انعام ہیں ان کا شکریہ ادا کرنا عقلاً لازم نہیں (بلکہ بعثت رسول ضروری ہے) قاضی تاج الدین سبکی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح مختصر ابن الحاجب میں مسئلہ شکر منعم کے ضمن میں کہا کہ اس سے یہ مسئلہ بھی ثابت ہوتا ہے!
”من لم تبلغه الدعوة فعندنا یموت ناجیا ولا یقاتل حتی یدعی الی الاسلام وهو مضمون بالکفارة والدية ولا یجب القصاص علی قاتله علی الصحیح“

جس کے پاس دعوت اسلام نہ پہنچے اس کی موت حالت نجات پر ہوگی۔ اسے اس وقت تک قتل نہیں کیا جائے گا جب تک اسے دعوت اسلام نہ پہنچے۔ اگر کسی نے قتل کر دیا تو اس پر دیت و کفارہ کی ذمہ داری لازم ہوگی۔ اگرچہ قصاص لازم نہیں ہوگا۔
(الحاوی للفتاویٰ ج ۲ ص ۲۰۶)

تنبیہ: ”هذا الحکم خاص بمن لم تبلغه دعوة نبی اصلا۔ اما من بلغه منهم دعوة احد من الانبياء السابقين ثم اصر علی کفره فهو فی النار قطعاً وهذا لانراغ فیہ“ (الحاوی للفتاویٰ ج ۲ ص ۲۰۶)

یہ حکم ان لوگوں کے لئے خاص ہے جن کے پاس کسی نبی کی طرف سے کوئی دعوت اسلام نہ پہنچی ہو، لیکن وہ لوگ جن کے پاس دعوت اسلام پہنچی اور انہوں نے اسے نہ قبول کیا بلکہ وہ کفر پر ہی قائم رہے وہ جہنمی ہوں گے اس پر اہل علم کا اتفاق ہے۔

نبی کریم ﷺ کے والدین کریمین کو نہ تو پہلے انبیائے کرام علیہم السلام کی دعوت پہنچی اور نہ ہی حضور نبی کریم ﷺ کی دعوت پہنچی؛ کیونکہ حضرت عیسیٰ اور نبی کریم ﷺ کے درمیان تقریباً چھ سو سال کا زمانہ پایا گیا، اس وقت روئے زمین پر مشرق و مغرب، شمال و جنوب میں جہالت کا دور دورہ تھا۔ صرف چند لوگ اہل کتاب کے اہل علم ملک شام میں تھے۔ ان کو بھی حضور ﷺ کے والدین کریمین نہ پاسکے؛ کیونکہ حضرت عبداللہ جوانی میں ہی تقریباً اٹھارہ سال کی عمر میں وفات پا گئے۔

اور انہوں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا زمانہ بعثت بھی نہ پایا؛ کیونکہ حضرت عبداللہ نبی کریم ﷺ کی ولادت باسعادت سے پہلے ہی فوت ہو گئے۔ اور حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا، نبی کریم ﷺ کی چھ سال کی عمر میں وفات پا گئیں۔

(الحاوی للفتاویٰ ج ۲ ص ۲۰۷)

اہل علم کا دوسرا مسلک: نبی کریم ﷺ کے والدین سے شرک ثابت نہیں بلکہ وہ ابراہیم علیہ السلام کے دین حنیف پر قائم تھے۔ جس طرح عرب کے کئی اور لوگ بھی دین ابراہیمی پر قائم تھے۔ جیسے زید بن عمرو بن نفیل، ورقہ بن نوفل وغیرہ۔ اس مسلک پر بہت سے اہل علم ہیں۔ جن میں علامہ فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں۔ آپ نے اپنی کتاب اسرار التنزیل میں بیان کیا ہے۔

”ان آزر لم یکن والد ابراہیم بل کان عمہ“

بے شک ”آزر“ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا باپ نہیں تھا بلکہ چچا تھا۔

اس پر اہل علم کے بہت دلائل ہیں

”ان آباء الانبیاء ما کانوا کفاراً“

بیشک انبیاء کرام میں سے کسی نبی کے آباء کافر نہیں تھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی! ﴿الَّذِي يَرَاكَ حِينَ تَقُومُ وَتَقْلَبُكَ فِي السُّجُودِ﴾

(سورہ شعراء ۲۱۸، ۲۱۹)

جو تمہیں دیکھتا ہے جب تم کھڑے ہوتے ہو اور دورے کرتے ہوئے سجدہ کرنے والوں میں

”قيل معناه انه كان ينتقل نوره من ساجد الى ساجد وبهذا التقدير فالآية دالة على ان جميع آباء محمد ﷺ كانوا مسلمين وحينئذ يجب القطع بأن والد ابراهيم ما كان من الكافرين انما ذاك عمه“

آیت کریمہ کا معنی یہ ہوگا کہ آپ کا نور سجدہ کرنے والوں سے سجدہ کرنے والوں کی طرف منتقل ہوتا رہا۔ لہذا آیت کریمہ اس پر دلالت کر رہی ہے۔ کہ نبی کریم ﷺ کے آباء واجداد میں کوئی بھی کافر نہ تھا۔ یہاں سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ ابراہیم علیہ السلام کے باپ کافر نہ تھے، اور آزر آپ کا چچا تھا، باپ نہ تھا

(الحاوی للفتاویٰ ج ۲، ص ۲۰۲ تا ۲۱۰)

نبی کریم ﷺ کے آباء واجداد کے مشرک نہ ہونے پر خود نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی !

”ولم ازل انقل من اصحاب الطاهرين الى ارحام الطاهرات وقال تعالى: ﴿انما المشركون نجس﴾ فوجب ان لا يكون احد من اجداده مشركا“

حضور ﷺ نے فرمایا میں ہمیشہ پاک پشتوں سے پاک رحموں میں منتقل ہوتا رہا، مشرک کبھی پاک نہیں ہو سکتے۔ اس لئے کہ ان کو خود رب تعالیٰ نے نجس (ناپاک) کہا ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ نبی کریم ﷺ کے آباء واجداد میں سے کوئی بھی مشرک نہ ہو۔ ورنہ حضور کا اپنا ارشاد گرامی ہی غلط ثابت ہوگا۔

(از الحاوی للفتاویٰ ج ۲، ص ۲۱۰)

اعتراض: حدیث شریف میں طاہر نسلوں سے منتقل ہونے کا مطلب تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کے آباء واجداد بدکاری سے پاک ہوں، اس سے شرک سے پاک ہونا ثابت نہیں ہو سکتا۔

جواب! ”وتخصيص الطهارة بالطهارة من السفاح لا دليل له يعول عليه، والعبرة لعموم اللفظ لا لخصوص السبب“ (روح المعانی زیر آیت واذ قال ابراهيم لبيه آزر الحج ب ۷)

حدیث شریف میں مذکورہ طہارت کو صرف بدکاری سے طاہر ہونے کے ساتھ خاص کرنے پر کوئی دلیل نہیں پائی گئی جس پر اعتبار کیا جاسکے، اعتبار عموم الفاظ کا ہوتا ہے۔ خصوص اسباب کا نہیں۔

”آزر“ حضرت ابراہیم کا چچا تھا!

”ان آزر اسم لعم ابراهيم عليه السلام وجاء اطلاق الاب على العم في“ قوله تعالى:

﴿اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَاءَ اِذْ خَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتُ ۚ اِذْ قَالَ لِبَنِيهِ مَا تَعْبُدُونَ مِنۢ بَعْدِيۙ قَالُوا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اَبَائِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ﴾ وفيه اطلاق الاب على الجد ايضاً .

(روح المعانی زیر آیت مذکورہ بالا)

بے شک ”آزر“ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چچا کا نام ہے۔ لفظ ”اب“ کا اطلاق چچا اور دادا پر اس آیت کریمہ میں آیا ہوا ہے۔ ”ام كنتم شهداء..... الآية“ ترجمہ: کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوب کو موت آئی جب کہ اس نے اپنے بیٹوں سے فرمایا: میرے بعد کس کی عبادت کرو گے؟ بولے: ہم عبادت کریں گے اس کی جو آپ کا خدا ہے اور آپ کے آباء ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق کا، ایک خدا۔ اور ہم اس کے حضور گردن رکھے ہیں۔

اس آیت کریمہ میں لفظ ”آباء“ استعمال ہوا ہے جو ”اب“ کی جمع ہے۔ لفظ ”اب“ کا اطلاق یعقوب کے باپ حضرت اسحاق پر اور آپ کے چچا (تایا) حضرت اسماعیل پر اور آپ کے دادا حضرت ابراہیم پر ہوا۔

واضح ہوا کہ لفظ ”اب“ کا حقیقی معنی باپ ہے لیکن مجازی معنی کے لحاظ سے چچا اور دادا پر بولا جاتا ہے۔ بلکہ ماموں، نانا، سر، استاذ کو بھی مجازاً ”اب“ (باپ) کہا جاسکتا ہے۔

اسی طرح حضور نے اپنے چچا حضرت عباس کے متعلق لفظ ”اب“ استعمال کیا۔ ”ردوا علی ابی عباس“ فرمایا: مجھ پر میرے باپ (چچا) عباس کو لوٹاؤ!

وعن محمد بن كعب القرظی الخال والد والعم والد وتلا هذه الآية ﴿وَإِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمَ لَا بِيْهٖ اٰیة﴾ (روح المعانی ج ۳ جزء ۷ ص ۱۹۵)

محمد بن کعب قرظی نے فرمایا: ماموں کو بھی باپ کہہ لیا جاتا ہے اور چچا کو بھی باپ کہہ لیا جاتا ہے۔ اور یہ آیت کریمہ ﴿وَإِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ لَا بِيْهٖ اٰیة﴾ کی تلاوت کی۔

آزر کو چچا کہنے والوں کی شاندار دلیل:

”اخرجہ ابن المنذر فی تفسیرہ بسند صحیح عن سلیمان بن صرد قال لما ارادوا أن یلقوا ابراهیم علیہ السلام فی النار جعلوا یجمعون الحطب حتی أن كانت

العجوز لتجمع الخطب فلما تحقق ذلك قال "حسبي الله تعالى ونعم الوكيل" فلما القوه قال الله تعالى : ﴿يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلَامًا عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ﴾ فكانت . فقال عمه من اجلى دفع عنه فارسل الله شرارة من النار فوقعت على قدمه فاحرقته "

(روح المعانی جلد ۴ جزء ۱ ص ۱۹۵)

ابن منذرؒ نے اپنی تفسیر میں سند صحیح سے سلیمان بن مرد سے روایت ذکر کی ہے کہ جب کفار نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالنے کا ارادہ کیا تو وہ جلائے کیلئے لکڑیاں جمع کرنے لگے۔ یہاں تک کہ کوئی بڑھیا عورت بھی ہوتی تو وہ بھی لکڑیاں جمع کرتی۔ جب آگ جلائے کا معاملہ مکمل ہو گیا تو ابراہیم علیہ السلام نے پڑھا "حسبی اللہ تعالیٰ ونعم الوکیل" (مجھے اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے) جب انہوں نے آپ کو آگ میں ڈال دیا تو اللہ تعالیٰ نے آگ کو حکم دیا : (ترجمہ) "اے آگ ہو جا ٹھنڈی اور سلامتی والی ابراہیم پر" آگ جب آپ پر ٹھنڈی اور باسلامت ہو گئی تو آپ کے چچا نے کہا: "یہ میری وجہ سے ابراہیم پر ٹھنڈی ہوئی ہے" تو اللہ تعالیٰ نے اس پر آگ کی ایک چنگاری بھیجی جو اس کے قدموں پر گری اور اس نے اسے جلا دیا۔

اس روایت میں واضح طور پر لفظ "عمہ" استعمال ہوا ہے جس کا معنی ہی "اس کا چچا" ہے۔

"اخرج محمد بن كعب وقتادة ومجاهد والحسن وغيرهم ان ابراهيم عليه السلام لم يزل يستغفر لابه حتى مات فلما مات تبين له انه عدو لله فلم يستغفر له ثم هاجر بعد موته وواقعة النار الى الشام ثم دخل مصر واتفق له مع الجبار ما اتفق ثم رجع الى الشام ومعه هاجرة ثم امر الله تعالى ان ينقلها وولدها اسمعيل الى مكة فنقلهما ودعا هناك فقال "ربنا انى اسكنت من ذريتى بواد غير ذى زرع عند بيتك المحرم" (الى قوله) "رب اغفر لى ولوالدى وللمؤمنين يوم يقوم الحساب" (روح المعانى زیر آیت مذکورہ)

محمد بن کعب قتادہ، مجاہد اور حسن وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ بے شک ابراہیم علیہ السلام اپنے "اب" کے لئے استغفار کرتے رہے جب آپ پر اس (آزر) کا کفر ظاہر ہوا۔ یعنی جب آپ نے سمجھ لیا کہ یہ کفر کو چھوڑنے والا نہیں تو آپ نے اس اللہ کے دشمن کے لئے استغفار کرنی چھوڑ دی۔ پھر آپ نے اس کی موت اور آگ کے واقعہ کے بعد شام کی طرف ہجرت کی۔ آپ کے ساتھ آپ کی زوجہ "ہاجرہ" بھی تھیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا کہ ہاجرہ اور اسماعیل کو مکہ میں چھوڑ آؤ۔ آپ نے اپنی

زوجہ اور اپنے بیٹے کو مکہ کی سرزمین میں چھوڑ کر دعاء کی۔

”ربنا انی اسكنت الآية“ اس دعا میں ”ربنا اغفر لی ولوالدی“ بھی کہا

(اے اللہ میری اور میرے والدین کی مغفرت فرما)

”فانه يستنبط من ذلك ان المذكور في القرآن هو عمه حيث صرح في الأثر الأول ان

الذي هلك قبل الهجرة هو عمه ودل الأثر الثاني على ان الاستغفار لوالديه كان بعد

هلاك أبيه بمدة مدیة فلو كان الهالك هو ابوه الحقيقي لم يصح منه عليه السلام هذا

الاستغفار له اصلا“ (روح المعانی زیر آیت مذکورہ)

واضح ہوا کہ آپ کا وہ باپ جس کا قرآن پاک میں کافر ہونا مذکور ہے وہ چچا ہے۔ چچا کو بھی

باپ کہہ لیا جاتا ہے۔ اور وہ بھی آپ کی ہجرت سے پہلے آگ کے واقعہ کے وقت ہلاک ہو گیا۔ اس

وقت ابراہیم علیہ السلام کی عمر تقریباً بیالیس سال تھی۔ یہ بات پہلی حدیث مبارکہ (جو ابن منذر سے

سلیمان بن صرد سے روایت کی ہے) سے سمجھ میں آئی۔ اور دوسری حدیث مبارکہ (محمد بن کعب کی

روایت کردہ) سے واضح ہوا کہ آپ نے جب ہجرت کی تو راستہ میں ظالم بادشاہ کا واقعہ درپیش آیا۔

آپ شام میں گئے پھر فلسطین میں۔ نوے (۹۰) سال کی عمر میں آپ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام

اور حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کو مکہ میں چھوڑا۔ اس وقت آپ نے اپنے والدین کیلئے دعاء کی ”ربنا

اغفر لی ولوالدی“ اے ہمارے رب میری اور میرے والدین کی مغفرت فرما۔

واضح ہوا کہ آپ نے چچا کیلئے دعاء چھوڑ دی تھی اور وہ ہلاک بھی ہو گیا تھا۔ لیکن آپ اپنے والدین کیلئے

بہت عرصہ بعد بھی دعاء کرتے رہے۔

نبی کریم ﷺ والدین کریمین کے ایمان پر دلالت کرنے والی احادیث

”عن ابی ہریرۃ قال ، قال رسول اللہ ﷺ بعثت من خیر قرون بنی آدم فقرنا حتی بعثت

عن القرن الذی كنت فیہ“ (بخاری الحواشی للفتاوی ج ۲ ص ۲۱۰)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں آدم علیہ السلام سے لیکر بہتر

خاندانوں میں منتقل ہوتا آ رہا ہوں یہاں تک اب جس خاندان میں میں ہوں۔

یقینی بات ہے کہ کافر کو ”خیر“ سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا وہ تو ”شر“ کا مصداق ہے۔ جب آپ نے اپنے تمام آباء و اجداد کو خیر کہا ہے تو وہ تمام شرک سے پاک تھے۔

عن انس ان النبی ﷺ قال ” ما افترق الناس فرقتین الا جعلنی اللہ فی خیرهما فاخرجت من بین ابوی فلم یصنئ شی من عہد الجاہلیۃ “ (بیہقی دلائل النبوة، الحاوی للفتاویٰ ج ۲ ص ۲۱۰)

جب بھی لوگوں کے دو فرقے بنے تو اللہ تعالیٰ نے مجھے بہتر فرقہ میں رکھا یہاں تک کہ میں اپنے والدین سے دنیا میں آیا، مجھے زمانہ جاہلیت کی کسی برائی نے مس نہیں کیا (چھو انہیں)۔

حدیث پاک سے واضح ہوا کہ حضور ﷺ ہمیشہ بہتر فرقہ میں تشریف لاتے رہے۔ بہتر فرقہ وہی ہو سکتا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو مانتا ہو۔ کافر کبھی بہتر نہیں ہو سکتے۔ اور جب نبی کریم ﷺ کو زمانہ جاہلیت کی کسی برائی نے بھی نہیں مس کیا تو کفر و شرک کیسے آپ کے والدین میں ثابت کیا جاسکتا ہے۔

”عن ابن عباس قال قال رسول اللہ ﷺ لم یزل اللہ ینقلنی من الاصلاب الطیبة الی الارحام الطاہرة مصفی مہذباً لا تشعب شعبتان الا کنت فی خیرهما“

(ابو نعیم دلائل النبوة، الحاوی للفتاویٰ ج ۲ ص ۲۱۱)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہمیشہ مجھے پاک پشتوں سے پاک رحموں کی طرف منتقل کیا گیا۔ صاف مہذب خاندانوں میں منتقل ہوتا رہا۔ جب بھی دو فرقے بنے مجھے بہتر فرقہ میں رکھا گیا۔

اس حدیث پاک میں طہارت، صفائی، تہذیب، خیر کے الفاظ استعمال ہوئے کافر کبھی ان اوصاف کے مالک نہیں ہو سکتے۔

”عن واثلہ بن الاصقع قال قال رسول اللہ ﷺ ان اللہ اصطفیٰ من ولد ابراہیم اسمعیل واصطفیٰ من ولد اسمعیل بنی کنانہ واصطفیٰ من بنی کنانہ قریشا واصطفیٰ من قریش بنی ہاشم واصطفانی من بنی ہاشم“

(مسلم، الحاوی للفتاویٰ ج ۲ ص ۲۱۱)

واثلہ بن اصقع سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے اسماعیل علیہ السلام کو برگزیدہ بنایا، اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے کنانہ کو برگزیدہ بنایا اور کنانہ کی اولاد سے قریش کو برگزیدہ بنایا اور قریش سے بنو ہاشم کو اور بنو ہاشم سے مجھے۔

واضح ہوا کہ نبی کریم ﷺ کے آباء و اجداد وہی تھے جو رب تعالیٰ کو پسند تھے!

عن ابن عباس قال قال رسول الله ﷺ واللہ ما افترق فرقتان منذ خلق الله آدم الا كنت فی خیرھما“ (طبقات ابن سعد، الحاوی للفتاویٰ ج ۲ ص ۲۱۱)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اللہ تعالیٰ کی آدم علیہ السلام کی پیدائش سے لے کر جب بھی دو فرقے بنے تو میں ان میں سے بہتر میں رہا۔

رسول اللہ ﷺ قسم اٹھا کر ارشاد فرما رہے کہ آدم علیہ السلام سے لیکر میرے والد تک میرے آباء و اجداد میں سے ہر شخص بہتر تھا، اب اس کے بعد بھی کوئی کا فرمانے تو وہ اپنی قسمت پر روئے۔

تیسرا مسلک: نبی کریم ﷺ کے والدین کریمین کے متعلق تیسرا مسلک یہ ہے کہ آپ ﷺ نے والدین کو زندہ کیا۔ اور انہوں نے آپ پر ایمان لایا۔ اگرچہ اس مسلک والوں نے بھی ایک حدیث پیش کی ہے لیکن وہ ضعیف ہے۔ اسی لئے راقم الحروف کے نزدیک دوسرا مسلک ہی قوی ہے۔

”عن عائشة ان رسول الله ﷺ سئل ربہ ان یحیی ابویہ فاحیاهما لہ فآمنابہ ثم اماتھما“ (الحاوی للفتاویٰ ج ۲ ص ۲۳۰)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے: بے شک رسول اللہ ﷺ نے اپنے رب سے سوال کیا کہ میرے والدین کو زندگی عطا فرما! تو اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ کیا اور انہوں نے آپ پر ایمان لایا، پھر ان کو فوت کر دیا گیا۔

چوتھا مسلک: جیسا کہ ابتداء میں ذکر کیا گیا ہے کہ حضور ﷺ کے والدین کے متعلق چوتھا مسلک یہ ہے کہ وہ (اس مسلک کے پیروکار) انہیں (والدین کریمین)..... العیاذ باللہ..... کافر و مشرک مانتے ہیں۔

ان لوگوں کی غلطی کی وجہ کچھ احادیث اور قرآن پاک کی ایک آیت کریمہ ہے۔ دراصل ان کو سمجھنے میں غلطی لگی ہے۔

درج ذیل میں ان لوگوں کے ”مذہب“ کو ”اعتراض“ کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے اور ان کا ”رد“ جواب کی صورت میں۔

﴿والله یهدی من یشاء الی صراط مستقیم﴾

اعتراض: قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَا تُسْئَلُ عَنْ أَصْحَابِ الْجَحِيمِ﴾ جنم والوں کے متعلق آپ سے نہیں پوچھا جائے گا۔
اس آیت کریمہ کا شان نزول یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا: ”لیہ شعری
ما فعل ابواہی“ کاش کہ مجھے معلوم ہوتا کہ میرے والدین سے کیا کیا گیا۔ تو اس وقت یہ آیت
مبارکہ نازل ہوئی۔

جواب: ”لم یخرج فی شیء من کتب الحدیث المعتمدة، وإنما ذکر فی بعض
التفاسیر بسند منقطع لا یحتج بہ ولا یعول علیہ“ (الحاوی للفتاویٰ ج ۲ ص ۲۲۰)

احادیث کی معتبر کتابوں میں اس روایت کا نام و نشان تک نہیں پایا گیا بعض تفاسیر نے منقطع
سند سے بیان کیا ہے، جسے حجت نہیں بنایا جاسکتا اور نہ ہی اس پر کوئی اعتبار ہے۔

علامہ سیوطی فرماتے ہیں اگر اس طرح کی کمزور روایات کو تسلیم کیا جائے تو ہم اس کے جواب
میں ایک کمزور روایت پیش کر دیں گے۔ اس طرح ”معارضۃ الواہی بالواہی“ (کمزور کا معارضہ
کمزور سے) ہو جائے گا۔ وہ کمزور روایت یہ ہے:

”ہبط جبریل علی فقال إن اللہ یقرئک السلام ویقول إنی حرمت النار علی
صلب انزلک و بطن حملک وحجر کفلک“ (الحاوی للفتاویٰ ج ۲ ص ۲۲۲)

حضرت علی سے مرفوع روایت مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میرے پاس جبریل آئے
تو انہوں نے کہا بے شک اللہ تعالیٰ آپ کو سلام کہتا ہے، اور یہ کہہ رہا ہے کہ بے شک میں نے آگ حرام
کر دی ہے ان پشتوں پر جن سے آپ منتقل ہو کر آئے، اور ان رحموں (بچہ رانیوں) پر جن میں آپ
رہے۔ اور ان گودوں پر جن میں آپ نے پرورش پائی۔

علامہ سیوطی اس روایت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: ”إنما لا نری ذلک ولا نحتج
بہ“ بے شک ہم اس قسم کی کمزور روایات کا سہارا نہیں لیتے اور نہ ہی ان کو بطور حجت پیش کرتے ہیں۔
بلکہ بفضلہ تعالیٰ صحیح روایات کو بطور دلیل پیش کیا ہے۔

علامہ سیوطی کی اس بحث سے واضح ہو گیا کی آیت کریمہ کے شان نزول کے لحاظ سے جو
اعتراض کیا گیا وہ ایک ضعیف اور منقطع سند پر موقوف ہے۔ اس قسم کی روایت سے کسی کا گناہگار ہونا بھی
ثابت نہیں کیا جاسکتا تو کفر و شرک کیسے ثابت کیا جاسکتا ہے۔

آیت کریمہ کا شان نزول: (سند صحیح سے)

”اخرج عبد بن حمید والفریابی وابن جریر وابن المنذر فی تفاسیرهم عن مجاهد قال من اول البقرة أربع آیات فی نعت المؤمنین و ثلاث عشرة فی نعت المنافقین ومن أربعین آية إلى عشرين ومائة فی بنی اسرائیل ، اسنادہ صحیح ومما یؤکد ذلك أن السورة مدنیة واكثر ما خوطب فیها الیهود“
(الحاوی للفتاویٰ ج ۲ ص ۲۲۳)

عبد بن حمید اور فریابی اور ابن جریر اور ابن منذر نے اپنی تفاسیر میں مجاہد سے روایت بیان کی ہے کہ سورہ بقرہ کی پہلی چار آیتیں مؤمنین کی شان میں نازل ہوئیں اور تیرہ آیات منافقین کے متعلق نازل ہوئیں۔ اور آیت نمبر چالیس سے لیکر آیت نمبر ایک سو بیس تک بنی اسرائیل کے حق میں نازل ہوئیں اس روایت کی سند صحیح ہے اور خاص کر کے یہ بات بھی واضح ہے کہ یہ سورہ مدنی ہے مدینہ طیبہ میں زیادہ طور پر خطاب یہود کو ہی ہوا۔

آیت کریمہ کا سیاق و سباق (یعنی اس سے پہلے والی آیات اور بعد والی) بھی اسی پر دلالت کر رہا ہے کہ یہ آیت کریمہ بھی بنی اسرائیل کے متعلق ہی ہے۔

واضح ہوا کہ اس آیت کے شان نزول سے نبی کریم ﷺ کے والدین کریمین کا کفر و شرک نہیں ثابت کیا جاسکتا۔

اعترض: مستدرک حاکم میں ایک روایت مذکور ہے جس میں یہ ذکر ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ملکہ کے دو بیٹوں کو کہا ”امکما فی النار“ تمہاری ماں آگ میں ہے جب آپ کا یہ ارشاد ان پر شاق گذر تو آپ نے ان کو بلایا اور ارشاد فرمایا ”ان امی مع امکما فی النار“ بے شک میری ماں بھی تمہاری ماں کے ساتھ آگ میں ہے اس حدیث کی سند کو بھی مستدرک میں صحیح قرار دیا گیا ہے جب اس حدیث سے رسول اللہ ﷺ کی والدہ کا جہنمی ہونا ثابت ہے تو تم کس طرح جنتی ہونا اور حالت ایمان پر ہونا ثابت کرتے ہو؟

جواب: مستدرک میں احادیث کو صحیح کہنے میں بہت جگہ تسابل (آسان طلبی، عدم تحقیق) واقع ہے ”وقد تقرر فی علوم الحدیث إنه لا یقبل تفردہ بالتصحیح“ علوم حدیث میں یہ

بات واضح ہے کہ مستدرک میں جن احادیث کو صحیح کہا گیا ہے اگر ان کی تائید میں اور حدیث سند صحیح سے مل جائے تو اسے صحیح قرار دیا جائے گا ورنہ ان کے صحیح کہنے کو بلاچون و چرا صحیح تسلیم نہیں کیا جائے گا۔

پھر یہی حدیث جب ذہبی رحمہ اللہ نے ”مختصر المستدرک“ میں نقل کی اور حاکم کا قول نقل کیا ”انہ صحیح“ کہ یہ صحیح حدیث ہے تو اس کا ذہبی نے مؤاخذہ کرتے ہوئے یہ کہا ”قلت لا والله فعثمان بن عمیر ضعفه الدار قطنی“ میں کہتا ہوں قسم ہے اللہ تعالیٰ کی اس روایت کی سند میں عثمان بن عمیر کا ذکر ہے جسے دار قطنی نے ضعیف قرار دیا ہے۔

جب بھی ذہبی نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے اور قسم اٹھا کر ضعف ثابت کیا ہے۔ تو اس سے کفر و شرک جیسا عظیم جرم کیسے ثابت کیا جاسکتا ہے۔

اعترض: مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے!

”ان رجلا قال یا رسول اللہ ابن ابی قبال فی النار فلما قفی دعاه فقال ان ابی واباک فی النار“

(مسلم ج اول باب بیان ان من مات علی الکفر فہی فی النار ص ۱۳۴)

ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اس نے عرض کیا یا رسول اللہ میرا باپ کہاں ہے؟ (جنت میں یا دوزخ میں) آپ نے فرمایا آگ میں۔ جب وہ واپس جانے لگا تو آپ نے اسے بلایا اور فرمایا ”بے شک میرا باپ اور تمہارا باپ آگ میں ہیں“۔
ابوداؤد نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث روایت کی ہے۔

”انہ ﷺ استاذن فی الاستغفار لامہ فلم یؤذن له“

بیشک نبی کریم ﷺ نے اپنی ماں کے لئے استغفار کرنے کی اجازت طلب کی تو آپ کو اجازت نہیں دی گئی۔

ان دونوں حدیثوں سے پتہ چلا کہ نبی کریم ﷺ کے والدین (معاذ اللہ) کافر و مشرک تھے، تم کیسے ان کو مسلمان مانتے ہو؟ اور کیسے کہتے ہو وہ مشرک نہیں تھے؟

جواب: مسلم کی یہ حدیث ضعیف ہے۔ ضعیف حدیث سے احکام ثابت نہیں ہوتے۔ چہ

جائیکہ کفر ثابت ہو اور وہ بھی سید الانبیاء محمد مصطفیٰ علیہ النجیۃ والنساء کے والدین کریمین کا کفر ثابت ہو، یہ

”ان هذه اللفظة وهي قوله ”ان ابى و اباك فى النار . لم يتفق على ذكرها الرواة“

(الحاوی للفتاویٰ ج ۲ ص ۲۲۶)

مسلم میں جو یہ لفظ ”ان ابی و اباك فى النار“ آئے ہوئے ہیں ان میں راویوں کا اتفاق نہیں کیونکہ مسلم نے یہ روایت حماد بن سلمہ سے تخریج کی ہے۔ حماد بن سلمہ اور ثابت حضرت انس سے روایت کرتے ہیں، اور اس کے مخالف ”روایت معمر“ ہے۔ حضرت معمر روایت کرتے ہیں ثابت سے اور ثابت انس سے اس روایت میں ”ان ابی و اباك فى النار“ کے الفاظ نہیں بلکہ اس میں یہ الفاظ ہیں ”اذا مررت بقبر کافر فبشره بالنار“ جب تم کسی کافر کی قبر سے گزرو تو اس کو نار کی بشارت دے دو۔ ان الفاظ میں حضور کے والد کا کوئی ذکر نہیں یہ روایت زیادہ صحیح ہے نسبت حماد کی روایت کے!

”فان معمر اثبت من حماد فان حمادا تكلم فى حفظه ووقع فى احاديثه من اكبر“

(الحاوی للفتاویٰ ج ۲ ص ۲۲۳)

بیشک معمر کی حدیث حماد کی حدیث سے زیادہ صحیح ہے کیونکہ حماد کے حافظہ میں کلام ہے اور حماد کی روایت کردہ زیادہ احادیث منکر ہیں جو معروف کے مقابل ہونے کی وجہ سے مردود العمل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام بخاری نے حماد سے روایت نقل نہیں کی۔

”واما معمر فلم يتكلم فى حفظه ولا استنكر شىء من حديثه“

(الحاوی للفتاویٰ ج ۲ ص ۲۲۳)

معمر کی روایت بزار اور طبرانی نے بیان کی۔ لیکن معمر کا حافظہ قوی تھا ان کے حافظہ کے متعلق کوئی کلام نہیں اور نہ ہی ان کی مرویات میں سے کوئی منکر ہے۔

معمر کی روایت کی مؤید روایات:

”عن ابراهيم بن سعد عن الزهرى عن عامر بن سعد عن ابيه ان اعرابيا قال رسول الله ﷺ

این ابی؟ قال فى النار قال فأین ابوک قال حیثما مررت بقبر کافر فبشره بالنار“

(رواه البيهقى)

عامر بن سعد اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک اعرابی نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا میرا باپ کہاں ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا آگ میں، اس نے کہا آپ کے باپ کہاں ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا جب تمہارا گذر کسی کافر کی قبر سے ہو تو اسے آگ کی بشارت دے دیا کرو۔

نبی کریم ﷺ کا یہ جواب نہایت ہی حکیمانہ تھا جس میں آپ نے اس کے سوال کا ایسا جواب دیا جس سے اس کی دل شکنی نہ ہو۔ اگر آپ ﷺ یہ فرماتے کہ میرے والد تو جنت میں ہیں تو یقیناً وہ شخص پریشان ہوتا۔

”وهذا اسناد على شرط الشيخين فتعين الاعتماد على هذا اللفظ وتقديمه على غيره“
(الحاوی للفتاویٰ ج ۲ ص ۲۲۶)

اس روایت کا اسناد شرائط شیخین (بخاری و مسلم) پر ہونے کی وجہ سے صحیح ہے اور اس پر ہی اعتماد ہوگا۔ یہ روایت دوسری روایات سے مقدم ہوگی۔

طبرانی اور بیہقی نے اسی حدیث کے آخر میں ذکر کیا ہے کہ اعرابی نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اور اس نے کہا!

”لقد كلفني رسول الله ﷺ تعباً ما مردت بقبر كافر الا بشرته بالنار“
رسول اللہ ﷺ نے مجھے مشقت میں مبتلا کر دیا ہے کیونکہ میں جس کافر کی قبر سے گذرتا ہوں اسے آگ کی بشارت دیتا ہوں۔

معلوم ہوا کہ وہ اعرابی اپنی عربی زبان سے باخبر تھا، اور نبی کریم ﷺ کے طرز تکلم سے بھی آشنا تھا، جس سے کلام کیا گیا جب اسی نے آپ کے ارشاد کو عام سمجھا تو دوسرے کسی کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ کے والدین کو کافر کہہ کر اپنی عاقبت کو برباد کرے۔

ابن ماجہ نے بھی یہی حدیث ابراہیم بن سعد کی روایت سے ذکر کی ہے، ابراہیم بن سعد نے زہری سے اور زہری نے سالم سے اور سالم نے اپنے باپ (عبد اللہ بن عمر) سے روایت کی ہے۔ انہوں نے کہا!

”جاء اعرابي الى النبي ﷺ فقال يا رسول الله ان ابى كان يصل الرحم فاين هو؟“

قال فی النار قال فكأنه وجد من ذلك فقال يا رسول الله فاین ابوكم؟ قال رسول الله ﷺ حيشما مررت بقبر مشرك فبشره بالنار، قال فاسلم الاعرابی بعد قال لقد كلفني رسول الله ﷺ تعباً ما مررت بقبر كافر الا بشرته بالنار

نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک اعرابی آیا اس نے کہا یا رسول اللہ بیشک میرا باپ صلہ رحمی کرتا تھا وہ کہاں ہے (جنت میں یا دوزخ میں) تو آپ نے فرمایا وہ آگ میں ہے۔ اس نے (یہ جواب سن کر) اپنے دل میں غم پایا پھر کہا۔ یا رسول اللہ آپ کے باپ کہاں ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تمہارا کسی مشرک کی قبر سے گذر ہو تو اسے آگ کی بشارت دے دو، راوی کہتے ہیں اس کے بعد اس اعرابی نے اسلام قبول کر لیا اور وہ کہتے تھے کہ نبی کریم ﷺ نے مجھے مشقت میں مبتلا کر دیا ہے کہ میں جس قبر سے گذرتا ہوں اسے آگ کی بشارت دیتا ہوں۔

نکتہ: اعرابی کا اسلام قبول کرنے سے پہلے ”یا رسول اللہ“ کہنا اس پر دلالت کر رہا ہے کہ اس کے دل میں اسلام راسخ ہو چکا تھا۔

اور ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس اعرابی کا سوال تو اسلام قبول کرنے کے بعد ہو لیکن مندرجہ بالا عبارت کا مفہوم اس طرح بیان کیا جائے کہ وہ اعرابی چونکہ اسلام لائے تھے اس لئے اسلام لانے کے بعد نبی کریم ﷺ کے ارشاد کو تسلیم کرنے کے بغیر کوئی چارہ کار نہ سمجھا۔ (الحاوی للفتاویٰ ج ۲ ص ۲۲۲)

واللہ اعلم بالصواب (راقم)

”فهذه الزيادة اوضحت بلا شك ان هذا اللفظ العام هو الذي صدر منه ﷺ وراه الاعرابی بعد اسلامه امرا مقتضيا للامثال فلم يسعه الا امثاله“ (الحاوی للفتاویٰ ج ۲ ص ۲۲۲، ۲۲۷)

اس زیادتی سے بلا شک یہ واضح ہو گیا کہ نبی کریم ﷺ نے جواب عمومی طور پر دیا اور اعرابی نے بھی اسلام قبول کرنے کے بعد اس امر کی فرمانبرداری کو لازم قرار دیا، اس نے بغیر تسلیم کرنے کے اپنے لئے کوئی چارہ کار نہ سمجھا۔

جو روایت معمر کی ثابت سے اور ثابت کی انس سے مذکور ہے بعینہ ان الفاظ سے ہی سعد ابن ابی وقاص سے بھی روایت ہو اور طبرانی نے بیان کی ہے۔

مسلم کی روایت میں غلطی کی وجوہ!

پہلی وجہ : وہی ہے جس کا ذکر کیا جا چکا ہے کہ حماد کے حافظہ میں کمی تھی اور اس کی روایات ”منکر“ بھی ہیں؛ لہذا حماد کی روایت سے کفر ثابت کرنا ممکن نہیں، ایسی حدیث سے عام حکم ثابت نہیں ہو سکتا تو کفر کیسے ثابت کیا جاسکتا ہے؟

دوسری وجہ :

”فعلم ان هذا اللفظ الاول من تصرف الراوی رواه بالمعنی علی حسب فهمه وقد وقع فی الصحیحین روایات كثيرة من هذا النمط فیها لفظ تصرف فیہ الراوی وغیرہ اثبت منه“
(الحاوی للفتاویٰ ج ۲ ص ۲۲)

معلوم ہوا کہ حماد کی روایت میں الفاظ ”ان ابالك و ابی فی النار“ راوی کا تصرف ہے۔ یعنی روایت بالمعنی ہے روایت بالمعنی کا مطلب یہ ہے کہ ”راوی، حدیث کا مفہوم اپنے الفاظ میں پیش کرے، وہ الفاظ نبی کریم ﷺ کے نہ ہوں“ اس طرح کی روایات میں راویوں سے غلطی ہو جاتی ہے، ایسی روایات بخاری اور مسلم میں کئی ہیں ان روایات کے مقابل جب وہ روایات آجائیں جن کو بالفاظہ روایت کیا جائے تو وہ زیادہ معتبر ہوں گی۔ روایت بالفاظہ کا مطلب یہ ہے کہ حدیث کا راوی نبی کریم ﷺ کے منہ مبارک سے نکلے ہوئے الفاظ کو ہی ادا کرے ان میں کوئی لفظ بھی اپنی طرف سے نہ لائے۔

حدیث بالمعنی کی اور مثال

”عن عائشة ام المؤمنین انها قالت اتی رسول اللہ ﷺ بصبی فبال علی ثوبه فدعا بماء فاتبعه اياه“
(بخاری جلد اول باب بول الصبيان ص ۳۵)

ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک بچہ کولایا گیا اس بچے نے آپ کے کپڑوں پر پیشاب کر دیا آپ نے پانی منگایا اور کپڑے پر بہایا۔

اس روایت کے برعکس دوسری روایت بالمعنی ذکر ہے جس میں غلطی کا احتمال ہے وہ روایت یہ ہے:

عن عبید اللہ بن عتبہ عن ام قیس بنت محض انها اتت باین لها صغیر لم یاکل

الطعام الى رسول الله ﷺ فاجلسه رسول الله ﷺ في حجره فبال على ثوبه فاءبماء
ففضحه ولم يغسله .
(بخاری جلد اول باب بول الصبيان ص ۳۵)

عبداللہ بن عتبہ ام قیس بنت محض سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے چھوٹے بچے کو
رسول اللہ ﷺ کے پاس لایا جو کھانا نہیں کھا سکتا تھا، اس کو آپ نے اپنی گود میں بٹھایا، اس نے آپ کے
کپڑوں پر پیشاپ کر دیا آپ نے پانی طلب کیا وہ کپڑوں پر چھڑکا اور کپڑوں کو دھویا نہیں۔

اسی مضمون کو بعض روایات میں ”فرشہ“ سے بیان کیا گیا۔ اور بعض روایات میں ”نصب“
کے لفظ سے ذکر کیا گیا ہے۔

”نضح“ کا معنی ہے برتن کا رشنا اور پسینہ بہنا۔ اسلئے اس کا ظاہری مفہوم بنے گا ”پانی چھڑکا“
”دش“ کا معنی ہے پانی چھڑکنا، بکھیرنا آسمان کا پھوار برسانا۔ اس کا بھی ظاہری معنی یہ ہی ہوگا
، پانی چھڑکا پھر ”لم يغسله“ کے الفاظ سے مزید غلطی ہوتی ہے کہ آپ نے کپڑوں کو دھویا نہیں جس
سے پتہ چلتا ہے کہ بچے کا پیشاپ ناپاک نہیں اور اس سے کپڑوں کا دھونا لازم نہیں۔ حالانکہ اس طرح
نہیں کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں ہے۔

”بماء فاتبعه“ ای اتبع رسول الله ﷺ البول بماء“ (حاشیہ بخاری)

نبی کریم ﷺ نے پیشاپ کا پانی سے پیچھا کیا یعنی آپ نے پانی بہایا اور کپڑے کو دھویا اس معنی
پر وہ روایت دلالت کرتی ہے جس میں ”نصب“ کا لفظ ہے اور اس کا معنی ہی پانی بہانا اور گرانا ہے

اب تمام روایات کو تطبیق اس طرح دی جا سکے گی ”غسله من غیر فرک وغیر مبالغہ“
آپ نے کپڑے کو دھویا لیکن دھونے میں مبالغہ نہیں کیا اور کھرچہ نہیں اسلئے کہ بچے کے پیشاپ میں
زیادہ بونہیں ہوتی۔ بدبو کے زائل کرنے کے لئے زیادہ مبالغہ کیا جاتا ہے اب واضح ہوا کہ عبید اللہ بن
عتبہ کی روایت بالمعنی ہے اگر اس کی تاویل نہ کی جائے تو معنی باطل ہوتا ہے۔

تیسری وجہ : ”ما خرج مسلم لحماذی الاصول الا من حدیث عن ثابت“

(الحاوی للفتاوی ج ۲ ص ۲۲۳)

مسلم نے حماد کی روایات کو اصول میں ذکر نہیں کیا۔ صرف یہی حدیث ”ثابت“ سے

اصول میں ذکر کی ہے، اور اس میں بھی راتم کے نزدیک سہو ہوا ہے کہ اسے اصول میں نہیں ذکر کرنا چاہئے تھا۔ یعنی مسلم کا طریقہ ہے کہ بعض روایات کو باب (عنوان) کے مطابق بالاصالت ذکر کرتا ہے۔ اور بعض کو بالتبع۔ وہ روایات جو بالتبع ذکر کرتا ہے ان میں ضعیف حدیثوں کو نقل کر لیتا ہے۔ جیسا کہ کتاب الایمان (جمع الیمین) میں ایک حدیث کی سند یہ ہے۔

”حدثنا الصعق یعنی ابن حزن قال حدثنا مطر الوراق عن زهدم“

اس حدیث کی سند پر الدار قطنی نے ان الفاظ سے اعتراض کیا۔

”الصعق ومطر ليسا قويين ولم يسمعه مطر من زهدم وانما رواه عن القاسم عنه“
صعق اور مطر قوی راوی نہیں اور مطر نے زهدم سے سنا بھی نہیں بلکہ اس کی روایت قاسم سے مروی ہے۔

دار قطنی کے اس استدراک پر علامہ نووی نے تحریر کیا!

”وهذا الاستدراك فاسد لان مسلما لم يذكر متصلا وانما ذكره متابعه للطرق الصحيحة السابقة وقد سبق ان المتابعات يحتمل فيها الضعف“

دار قطنی کا یہ استدراک فاسد ہے کیونکہ مسلم نے یہ روایت بالاصالت ذکر نہیں کی بلکہ سابقہ صحیح طرق سے بیان کردہ احادیث کے بالتبع اس روایت کو ذکر کیا ہے۔ اور امام مسلم بالتبع ضعیف روایات بھی نقل کر لیتے ہیں۔

یہاں سے واضح ہوا کہ حماد کی روایت جب مسلم نے سوائے ثابت کی روایت کے بالاصالت ذکر نہیں کی تو اس کی وجہ صرف یہی ہو سکتی ہے کہ مسلم کے نزدیک بھی حماد ضعیف راوی ہے۔ لہذا یہ روایت بالاصالت نقل کرنے میں مسلم سے یقیناً سہو ہوا ہے۔ یہ بھی بالتبع ذکر ہونی چاہئے تھی تاکہ اس کا ضعف بھی واضح ہوتا۔

چوتھی وجہ: مسلم اور بخاری کے راویوں سے بھی کہیں نہ کہیں سہو ہوا ہے۔ مثال کے طور پر ایک حدیث پیش کر رہا ہوں اس کی طرف توجہ کریں۔

”عن عطاء قال حضرنا مع ابن عباس جنازة ميمونة بسرف فقال هذا زوجة

رسول اللہ ﷺ فاذا رفعتم نعشها فلا تزغزوها ولا تنزلوها وارفقوا بها فانه كان عند رسول اللہ ﷺ تسع نسوة كان يقسم منهن لثمان ولا يقسم لواحدة قال عطاء التي كان رسول اللہ ﷺ لا يقسم لها بلغنا انها صفية وكانت آخرهن موتا ماتت بالمدينة (متفق عليه) وقال رزين قال غير عطاء هي سودة وهو اصح وهبت يومها لعائشة (مشکوٰۃ باب القسم)

عطاء سے مروی ہے کہ ہم حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی معیت میں حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے جنازہ میں مقام ”سرف“ میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا: یہ رسول اللہ کی زوجہ ہیں جب تم ان کے جنازہ کو اٹھانا تو اسے نہ حرکت دینا اور نہ جھنجھوڑا دینا، بلکہ آرام اور نرمی سے اٹھانا۔ کیونکہ یہ نبی کریم ﷺ کے پاس رہنے والی نواز و اج مطہرات ہیں سے ہیں۔ جن میں آپ باریوں کو برابر طور پر تقسیم فرماتے تھے وہ آٹھ تھیں ایک کی باری مقرر نہیں تھی۔

عطاء راوی نے کہا کہ وہ زوجہ جس کی باری آپ مقرر نہیں فرماتے تھے وہ حضرت صفیہ تھیں اور وہی مدینہ طیبہ میں سب سے آخر فوت ہوئیں۔

یہ حدیث بخاری اور مسلم دونوں نے ذکر کی ہے۔ لیکن اس کے آخری حصہ میں عطاء راوی سے دو طرح کا سہو واقع ہوا ہے ایک تو وہی جو صاحب مشکوٰۃ نے رزین کے حوالہ سے نقل کر دیا کہ وہ زوجہ جن کی باری مقرر نہیں تھی وہ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا تھیں حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نہیں تھی؛ کیونکہ حضرت سودہ نے خود اپنی باری سے دستبردار ہونے کی درخواست کر دی تھی۔ حضور کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ میں بوڑھی ہو گئی ہوں مجھے عام عورتوں کی سی خواہش نہیں آپ میری باری حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو دے دیں۔

راوی سے دوسرا سہو یہ ہوا ہے کہ راوی نے کہا سب سے آخری مدینہ طیبہ میں فوت ہونے والی یہی ہیں، حالانکہ یہ درست نہیں۔

”لاتها ماتت في رمضان سنة خمسين في زمن معاوية وماتت ميمونة بعد سنة احدى وخمسين وعائشة سنة سبع وخمسين وسودة سنة اربع وخمسين وام سلمة سنة تسع وخمسين“ (از مرقاة المفاتيح)

اس لئے کہ حضرت صفیہ کی وفات پچاس ہجری میں ہوئی اور ان کے بعد چار ازواج مطہرات کی وفات ہوئی کیونکہ حضرت میمونہ کی وفات اکاون ہجری میں اور حضرت عائشہ کی ستاون ہجری میں اور حضرت سودہ کی چون ہجری میں اور حضرت ام سلمہ کی انسٹھ ہجری میں ہوئی۔ اس حدیث اور اس کی شرح سے یہ واضح ہو گیا کہ مسلم اور بخاری کے راوی سے بھی سہو ہو سکتا ہے۔ لہذا یہ روز روشن کی طرح واضح ہو گیا کہ مسلم اور بخاری کے راوی سے جب سہو ہو سکتا ہے تو اس حدیث میں بھی سہو ہوا ہے۔ جس میں رسول اللہ ﷺ کے والد مکرم کی طرف کفر کی نسبت کی گئی ہے۔

پانچویں وجہ :

مسلم کے راویوں سے ایسی احادیث بھی مروی ہیں جو راوی نے اپنے علم کے مطابق بات بیان کی ہے لیکن وہ دوسرے مشہور راویوں کی روایات کے خلاف ہونے کی وجہ سے معتبر نہ رہیں جیسا کہ حضرت نافع سے مروی ہے۔

” ذکر عند ابن عمر عمرة رسول الله من الجعرانة فقال لم يعتمر منها “

(مسلم ج ۲ باب نذر الکافر وما یفعل فیہ اذا اسلم)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نبی کریم ﷺ کے عمرہ کا تذکرہ کیا گیا کہ آپ نے جعرانہ سے عمرہ کا احرام باندھا، تو آپ نے کہا کہ حضور ﷺ نے وہاں سے عمرہ نہیں کیا۔ اس پر بحث کرتے ہوئے علامہ نووی فرماتے ہیں۔

” لم يعتمر منها هذا محمول على نفى علمه اى انه لم يعلم ذلك وقد ثبت ان النبی ﷺ اعتمر من الجعرانة والاثبات مقدم على النفي لما فيه من زيادة العلم وقد ذكر مسلم في كتاب الحج اعتمر النبی ﷺ من الجعرانة عام حنین من رواية انس رضى الله عنه والله اعلم “

حضرت ابن عمر کا یہ کہنا کہ حضور نے جعرانہ سے عمرہ نہیں کیا اسے ان کے علم نہ ہونے پر محمول کیا جائے گا، کہ آپ کو اس کا علم نہ ہو سکا، ورنہ نبی کریم ﷺ کا جعرانہ سے عمرہ کرنا ثابت ہے۔ اثبات والا قول نفی والے قول سے مقدم ہے؛ کیونکہ اثبات میں علم زیادہ پایا گیا ہے۔ اور خود مسلم نے کتاب الحج میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت سے نبی کریم ﷺ کے جعرانہ سے عمرہ کرنے کا ذکر کیا ہے۔

ان مندرجہ بالا وجوہ کے پیش نظر یہ کہنا دشوار نہ رہا کہ مسلم کی حدیث بروایت حماد ضعیف ہے اس سے نبی کریم ﷺ کے والدین کا کفر ثابت نہیں ہو سکتا۔

یہی وجہ ہے کہ مسلم کی اس حدیث کے متعلق رئیس المتقین، استاذ الاساتذہ حضرت علامہ پیر سید حسین الدین شاہ دامت برکاتہ العالیہ مہتمم و شیخ الحدیث جامعہ رضویہ ضیاء العلوم راولپنڈی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث متناً "مضطرب" ہے، لہذا قابل وثوق نہیں۔

متناً مضطرب کی ایک مثال:

فاطمہ بنت قیس سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے زکوٰۃ کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا "ان فی المال لحقاً سوی الزکوٰۃ" بیشک مال میں سوائے زکوٰۃ کے حق ہے۔ اسی حدیث کے الفاظ اور معانی میں اضطراب ہے لہذا یہ حدیث قابل عمل اور قابل اعتبار نہیں، کیونکہ اس کے خلاف ابن ماجہ نے روایت یوں بیان کی ہے "لیس فی المال حق سوی الزکوٰۃ" مال میں سوائے زکوٰۃ کوئی حق نہیں۔ (نزهة النظر علی نخبة الفكر ص ۸۱)

یعنی فرض صرف زکوٰۃ ہے باقی تو صدقات واجبہ ہیں اور کوئی مستحب یہی ابن ماجہ کی جو روایت ہے وہی معتبر ہے پہلی روایت مضطرب ہو جانے کی وجہ سے قابل اعتبار نہیں۔

ابوداؤد کی حدیث "استغفار کی اجارت نہ ملنا" وہ بھی تعارض کی وجہ سے کفر ثابت کرنے میں ناکام ہے؛ کیونکہ دوسری صحیح احادیث سے پاک رحموں اور پاک صلبوں سے منتقل ہونا ثابت ہے والحدیث الصحیح إذا عارضه ادلة اخرى هی ارجح منه وجب تاویلہ و تقدیم تلک الادلة علیہ کما هو مقرر فی الاصول وبهذا الجواب الاخیر یجاب عن حدیث عدم الاذن فی الاستغفار۔ (الحاوی للفتاویٰ ج ۲ ص ۲۲۷)

صحیح حدیث کے مقابل جو دوسری صحیح احادیث آجائیں جو اس سے زیادہ رائج ہوں تو ضروری ہو جاتا ہے کہ صحیح حدیث کی تاویل کی جائے اور اسکے مقابل صحیح اور رائج روایات کو مقدم کیا جائے اصول حدیث میں اس ضابطہ کو واضح طور پر بیان کیا گیا ہے لہذا عدم استغفار والی حدیث قابل تاویل ہے۔

اعتراض: امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ”فقاہ کبر“ میں نبی کریم ﷺ کے والدین کے متعلق ذکر کیا ہے ”ماتا علی الکفر“ وہ دونوں کفر پر فوت ہوئے جب امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ انہیں کافر کہا ہے تو کس طرح ان کو مومن اور جنتی کہا جاسکتا ہے۔

جواب: فقاہ کبر کے نسخوں میں بہت اختلاف ہے بعض میں ہے ”ماتا علی الکفر“ وہ دونوں کفر پر فوت ہوئے بعض میں ہے ”ماماتا علی الکفر“ وہ دونوں کفر پر فوت نہیں ہوئے اور بعض نسخوں میں ”ماتا علی الفترۃ“ وہ دونوں دین فترت پر پیدا ہوئے یعنی توحید پر قائم رہتے ہوئے دنیا سے گئے ہیں اور بعض نسخوں میں یہ مسئلہ بالکل ذکر ہی نہیں۔

مولوی وکیل احمد صاحب سکندر پوری نے فقاہ کبر کا نہایت صحیح نسخہ حیدرآباد سے حاصل کر کے چھپوایا اور ثابت کیا کہ یہ صحیح اور باقی نسخے غلط ہیں اس نسخہ میں اس مسئلہ کا ذکر نہیں۔ اتنے شدید اختلاف کے پیش نظر نبی کریم ﷺ کے والدین کریمین کو کافر و مشرک قرار دینا کہاں کا انصاف و ایمان ہے عقل کا تقاضا یہی ہے کہ ان کو مومن جنتی تسلیم کیا جائے۔

(از تفسیر نعیمی ج ۱ ص ۱۱۰)

فقاہ کبر میں راقم کا موقف:

راقم کے نزدیک صحیح یہ ہے کہ فقاہ کبر کا صحیح نسخہ ”ماماتا علی الکفر“ (وہ دونوں کفر پر نہیں فوت ہوئے) والا ہے کتابت کی غلطی سے لفظ مارہ گیا ہے ایسا اکثر طور پر تساہل ہو جاتا ہے کتابت میں غلطیوں کا وقوع ہوتا رہتا ہے اور جب پروف ریڈنگ میں ذرا بھرتساہل ہو جائے تو مسئلہ الٹ پلٹ ہو کر رہ جاتا ہے راقم کو تصنیفی میدان میں قدم رکھنے سے خاص تجربہ حاصل ہے نورالایضاح کا میں نے عربی حاشیہ ذریعۃ النجاح ترتیب دیا ہے جس کے ص ۴۵ حاشیہ نمبر ۲ پر ماختلفوا کی جگہ اختلفوا تحریر ہو گیا دو تین ایڈیشن اسی طرح چھپ چکے ہیں اسی طرح کی اور بھی کئی اغلاط آ گئی ہیں اسی طرح میری تصنیف ”تذکرۃ الانبیاء“ کے ص ۵۴۰ پر آپ کی دعوت پر پہلے اسلام لانے والے عنوان کے تحت اصل مسودہ میں یہ عبارت ہے ”آزاد کردہ غلاموں میں حضرت زید اور غلاموں میں حضرت بلال“ لیکن پہلے ایڈیشن میں کتابت کی غلطی سے عبارت یہ ہے ”آزاد کردہ غلاموں میں حضرت بلال“ دوسرا ایڈیشن مکتبہ ضیائیہ بوہڑ بازار راولپنڈی نے چھپوایا چھپنے سے پہلے میں نے غلطی لگا کر دی لیکن تصحیح پھر غلط ہی ہوئی اب

عبارت یہ ہے آزاد کردہ غلاموں میں حضرت زید اور حضرت بلالؓ یہ بھی غلط ہے اس طرح کتابت کی غلطیاں اور پروف ریڈنگ میں تساہل ہوتا رہتا ہے۔

نبی کریم ﷺ کے والدین کو کافر کہنا درحقیقت آپ کو ایذا دینا ہے

”قال السهيلي في الروض الانف بعد ايراد حديث مسلم وليس لنا نحن ان نقول ذلك في ابويه ﷺ لقوله ” لا تؤذوا الاحياء بسبب الاموات وقال تعالى ” ان الذين يؤذون الله ورسوله “(الآية) وسئل القاضي ابو بكر بن العربي احدا ائمة المالكية عن رجل قال: ” ان ابا النبي ﷺ في النار “ فاجاب بان من قال ذلك فهو ملعون ؛ لقوله تعالى ﴿ان الذين يؤذون الله ورسوله لعنهم الله في الدنيا والآخرة﴾ قال ولا اذى اعظم من ان يقال عن ابيه انه في النار“

(الحاوی للفتاویٰ ج ۲ ص ۲۳۱)

حضرت امام سہیلی نے الروض الانف میں مسلم کی حدیث ذکر کرنے کے بعد کہا ہے: ہمیں حق نہیں پہنچتا کہ ہم نبی کریم ﷺ کے والدین کے متعلق کفر کا قول کریں؛ کیونکہ خود نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے۔ ”زندہ کو مردہ کی وجہ سے ایذا نہ پہنچاؤ“ اور رب تعالیٰ نے بھی فرمایا (ترجمہ) بیشک وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول کو ایذا پہنچاتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں اللہ کی لعنت ہے۔ قاضی ابوبکر بن عربی سے مالکیہ میں سے کسی ایک شخص کے متعلق پوچھا گیا کہ وہ حضور کے والد کو کافر کہتا ہے (اس کا کیا حکم ہے؟) آپ نے فرمایا وہ ملعون ہے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا جو شخص اللہ اور اس کے رسول کو ایذا پہنچاتا ہے اس پر اللہ کی لعنت ہے دنیا اور آخرت میں۔ اس سے بڑھ کر اور ایذا کیا ہو سکتی ہے کہ وہ آپ کے باپ کو کافر کہے؟

معاملہ قسمت کا:

کسی کی قسمت میں یہ ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ کی عظمت کو بیان کرتا ہے۔ اور کسی کی قسمت میں ہے وہ تنقیص کرتا ہے اللہ تعالیٰ ہمیں نبی کریم ﷺ کی شان بیان کرنے کی توفیق لازوال عطا فرمائے اور تنقیص کرنے سے بچائے۔ آمین

بقول کے! تنقیص نبی پہ جو اڑے ہوتے ہیں
وہ قہر مذلت میں پڑے ہوتے ہیں

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

واما متاخرین پس تحقیق اثبات کردہ اند اسلام و اندین بلکه تمام آباء وامہات

آنحضرت ﷺ را تا آدم علیہ السلام

متاخرین نے تحقیق سے نبی کریم ﷺ کے والدین کے ایمان کو ثابت کیا ہے بلکہ آپ کے تمام

آباء وامہات آدم علیہ السلام تک مومن ہونے کا ثبوت پیش کیا ہے۔

ابن علم گویا مستور بود از متقدمین پس کشف کرد آنرا حق تعالیٰ بر متاخرین

(اشعة اللمعات جلد اول ص ۷۱۸)

”واللہ یختص برحمته من یشاء“

یہ علم (یعنی نبی کریم ﷺ کے والدین کا ایمان پر ہونے کا علم) گویا کہ (بعض) متقدمین پر مستور

تھا اللہ تعالیٰ نے متاخرین پر اسے منکشف کیا اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے جسے چاہے خاص فرماتا ہے۔

واضح ہوا کہ نبی کریم ﷺ کے والدین کریمین کو مومن سمجھنے والوں پر اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت

ہے جو اس رحمت خاصہ سے محروم ہوں گے وہی کافر سمجھیں گے۔

میت کو تکلیف دینا ایسا ہی ہے جیسے زندہ کو تکلیف دینا!

”عن عائشة ان رسول اللہ ﷺ قال کسر عظم الميت ککسره حیا“

(رواہ مالک و ابو داؤد و ابن ماجہ ، مشکوٰۃ باب دفن الميت)

حضرت عائشہ سے مروی ہے بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میت کی ہڈی کو توڑنا ایسا ہی ہے

جیسا زندہ کی ہڈی کو توڑنا ہے

”قال ابن الملک ان الميت یتألم“

ابن ملک نے کہا اس حدیث سے یہ ثابت ہوا میت کو درد ہوتا ہے۔

”قد اخرج ابن ابی شیبہ عن ابن مسعود قال اذی المؤمن فی موته کأذاہ فی حیاته“

ابن ابی شیبہ نے حضرت عبداللہ ابن مسعود سے روایت بیان کی ہے کہ میت کو ایذا دینا ایسے

(مرفاۃ ج ۳ ص ۷۹)

ہی ہے جیسے اس کی زندگی میں ایذا دی گئی ہو

قبروں کو مسمار کرنا ظلم عظیم ہے ایک حدیث جو بیان کی گئی ہے اس سے واضح ہوا کہ حضرت ابن

عباس نے نبی کریم کی زوجہ مطہرہ کی چارپائی کو حرکت دینے سے بھی منع کیا۔ اسکی وجہ صرف ادب

واحترام کا لحاظ تھا۔ کسی مسلمان کی قبر کو مسمار کرنا جرم ہے صحابہ کرام اور حضور کے والدین کی قبر کو مسمار کرنے کی خبر اگر صحیح ہے تو یہ عظیم ظلم کیا گیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کو ایذا پہنچانا

إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا عَظِيمًا ﴿١٣﴾

(ب ۲۲ رکوع ۱۳)

بیشک جو ایذا دیتے ہیں اللہ اور اس کے رسول کو ان پر اللہ کی لعنت دنیا اور آخرت میں اور اللہ نے ان کے لئے ذلت کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

اس آیت کریمہ کی تفسیر میں قاضی مظہری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا!

وَجَازَ أَنْ يَكُونَ مَعْنَى الْآيَةِ الَّذِينَ يُؤْذُونَ رَسُولَ اللَّهِ وَذَكَرَ اللَّهُ لِعَظِيمِ الرَّسُولِ كَانَ مِنْ أَذَى الرَّسُولِ فَقَدْ أَذَى اللَّهِ

ایک معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آیت کریمہ میں مراد صرف رسول اللہ کو ایذا دینا مراد لیا گیا ہو کیونکہ رسول اللہ ﷺ کو ایذا دینا درحقیقت اللہ کو ایذا دینا ہے۔ اس پر ایک حدیث پاک بھی شاہد ہے!

”عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَغْفَلٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ اللَّهُ فِي أَصْحَابِي، اللَّهُ فِي أَصْحَابِي، لَا تَتَّخِذُوهُمْ غُرَضًا مِنْ بَعْدِي فَمِنْ أَحِبِّهِمْ فَبِحَبِي أَحِبُّهُمْ وَمِنْ أَبْغَضِهِمْ فَبِغْضِي أَبْغَضُهُمْ وَمِنْ آذَاهُمْ فَقَدْ آذَانِي وَمِنْ آذَى اللَّهِ فَقَدْ آذَى اللَّهِ فَيُوشِكُ أَنْ يَأْخُذَ“

(رواہ الترمذی مشکوٰۃ مناقب صحابہ)

میرے صحابہ کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہو۔ اللہ سے ڈرتے رہو (دو مرتبہ یہی الفاظ فرمائے) ان کو میرے بعد موردِ طعن و تشنیع نہ بنانا۔ جس نے ان سے محبت کی اس نے میری محبت کی وجہ سے ان سے محبت کی، جس نے ان سے بغض رکھا اس نے میرے بغض کی وجہ سے ان سے بغض رکھا۔ جس نے ان کو ایذا دی اس نے مجھے ایذا دی، جس نے مجھے ایذا دی اس نے اللہ کو ایذا دی، جس نے اللہ تعالیٰ کو ایذا دی قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے اپنی گرفت میں لے لے۔

اولیاء اللہ کو ایذا پہنچانا

بعض حضرات نے کہا ہے ”ان الذین یؤذون اللہ“ کا مفہوم بخذف مضاف بھی ہو سکتا ہے۔ ”ان الذین یؤذون اولیاء اللہ“ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے اولیاء کو ایذا دیتے ہیں وہ

دنیا و آخرت میں لعنت کے مستحق ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کو ایذا دینا باعث کفر ہے

”من اذى رسول الله ﷺ طعن فى شخصه او دينه او نسبه او صفة من صفاته او بوجه من وجوه الشين فيه صراحة او كناية او اشارة كفر ولعنه الله فى الدنيا والآخرة واعد له عذاب جهنم . وهل يقبل توبته ؟ قال ابن همام كل من ابغض رسول الله ﷺ بقلبه كان مرتدا فالسباب بالطريق الاولى ويقتل عندنا حدا فلا تقبل توبته فى اسقاط القتل “
مظہری دربارت مذکورہ

جس شخص نے رسول اللہ ﷺ کو ایذا دی خواہ آپ کی ذات میں طعنہ زنی کی، یا آپ کے دین میں، یا آپ کے نسب میں، یا آپ کی صفات میں سے کسی صفت میں، یا آپ کو کسی طرح بھی عیب لگایا صراحة یا کنایہ یا اشارة وہ کافر ہو جائے گا۔ اور اس پر اللہ تعالیٰ کی دنیا اور آخرت میں لعنت ہوگی اور اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے عذاب جہنم تیار کیا ہے۔ (سوال کیا گیا) کیا ایسے شخص کی توبہ قبول ہوگی؟ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: ہر وہ شخص جس نے (العیاذ باللہ) رسول اللہ ﷺ سے دل سے بغض رکھا وہ مرتد ہو گیا اور گالی نکالنے سے بطریق اولیٰ مرتد ہوگا۔ ہمارے نزدیک اسے بطور حد قتل کیا جائے گا۔ اس کی توبہ قتل کے ساقط کرنے کے لئے قبول نہیں کی جائے گی۔

مومنوں کو ایذا دینا:

﴿وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ بَغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوا فَقَدْ احْتَمَلُوا بُهْتَانًا وَاِثْمًا مُّبِينًا﴾
(پ ۲۲ رکوع ۱۵)

اور جو لوگ ایمان والے مردوں اور عورتوں کو بغیر کوئی کسب کئے ایذا دیتے ہیں انہوں نے بہتان اور کھلا گناہ اپنے سر لیا۔

”قال مقاتل نزلت فى على بن ابي طالب ؑ وقيل نزل فى شان عائشة رضى الله عنها قلت اللفظ عام فى كل من يؤذى مومنا او مومنة باى وجه كان وان كان المراد خاصا عن ابي هريرة قال قال رسول الله ﷺ المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده والمؤمن من امن الناس على دمانهم واموالهم“
(رواه الترمذی والسانی . مظہری)

مقاتل نے کہا یہ آیت حضرت علی ؑ کی شان میں نازل ہوئی (من سب علیا فقد

اذی رسول اللہ (بعض نے کہا یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی شان میں نازل ہوئی (قاضی مظہری کہتے ہیں) میں کہتا ہوں: لفظ عام ہے اگرچہ مورد خاص ہے اسلئے اس سے مراد ہر مومن مرد اور عورت کو ایذا دینا ہے۔ خواہ کسی طرح بھی ایذا دے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کامل مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھوں سے مسلمان سلامتی میں رہیں۔ مومن وہ ہے جس سے مومنوں کے مال اور ان کی جانیں محفوظ رہیں۔

نتیجہ:

- ☆ رسول اللہ ﷺ کو ایذا دینا کفر ہے۔
- ☆ رسول اللہ ﷺ کو ایذا دینے والا واجب القتل ہے توبہ کرنے کے باوجود واجب القتل ہی رہے گا۔
- ☆ رسول اللہ ﷺ کو ایذا دینا رب تعالیٰ کو ایذا دینا ہے۔
- ☆ رسول اللہ ﷺ کو ایذا دینے والا ملعون ہے۔
- ☆ رسول اللہ ﷺ کو ایذا دینے والا رسوا کن عذاب کا مستحق ہے۔
- ☆ اولیاء اللہ کو ایذا دینے والا ملعون ہے۔
- ☆ ایمان والوں کو ایذا دینے والا کامل مومن نہیں ہو سکتا۔
- ☆ قبور کو مسہار کرنے سے مسلمانوں کی دل آزاری ہوتی ہے!

قبور کو مسہار کرنے سے ان کے لواحقین بالخصوص اور دوسرے مسلمان بالعموم قلبی تکلیف محسوس کرتے ہیں ایسا کرنے والے مسلمانوں کو ایذا پہنچا رہے ہیں۔ صحابہ کرام اور نبی کریم ﷺ کے والدین کریمین کی قبور کو مسہار کرنے سے اہل اسلام کو دکھ ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ شعائر اسلامیہ کا پاس ادب کرنے کی توفیق عطا فرمائے، رسول اللہ ﷺ اور آپ کے والدین کریمین، صحابہ کرام اور اہل بیت اطہار کی محبت پر قائم و دائم رکھے! اور مسلمانوں کے درمیان تفرقہ ڈالنے والوں کو ہدایت عطا فرمائے۔

آمین ثم آمین بجاہ سید المرسلین

﴿وَلَنْ تَرْضَىٰ عَنْكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَىٰ حَتَّىٰ تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ۖ

قُلْ إِنْ هَدَىٰ اللَّهُ هُوَ الْهَدَىٰ ۖ وَلَئِنْ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ بَعْدَ الَّذِي

جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۖ مَا لَكَ مِنَ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ ﴿١٢٠﴾

(۱) اور ہرگز تم سے یہود اور نصاریٰ راضی نہ ہوں گے جب تک تم ان کے دین کی پیروی نہ کرو، تم فرما دو، اللہ ہی کی ہدایت، ہدایت ہے۔ (اور اے سننے والے کے باشد) اگر تو ان کی خواہشوں کا پیرو ہو بعد اس کے تجھے علم آچکا تو اللہ سے تیرا کوئی بچانے والا نہ ہوگا اور نہ مددگار۔

(۲) اور ہرگز راضی نہیں ہوں گے تم سے یہود اور نصاریٰ یہاں تک کہ تم تابعداری کرو ان کے دین کی، تم فرما دو، بے شک اللہ کی ہدایت ہی ہدایت ہے۔ اور (اے عام مخاطب) اگر تابعداری کی تم نے ان کی خواہشات کی اس کے بعد کہ آگیا تمہارے پاس علم، تو نہیں ہوگا تمہارے لئے اللہ سے بچانے والا کوئی دوست اور نہ مددگار۔

شانِ نزول: اہل کتاب نبی کریم ﷺ سے مہلت طلب کرتے تھے، اور طمع دلاتے تھے کہ ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے، تو اللہ تعالیٰ نے ان کے رد میں اس آیت کریمہ کو نازل کیا کہ بے شک آپ ان کو مہلت دیں، ان سے پرسکون ماحول قائم کریں وہ آپ سے راضی نہیں ہوں گے سوائے اس کے کہ آپ ان کے دین کی تابعداری کریں۔ یعنی جب وہ چاہتے ہیں کہ تم ان کے دین کو قبول کر لو تو وہ تمہارے دین پر کیسے آئیں گے۔ ان کا ایمان لانے کا طمع دلا تا صرف مال مثول کرنا مقصود ہے۔

دوسری وجہ: مدینہ طیبہ کے یہود اور نجران کے نصاریٰ نبی کریم ﷺ کے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کی وجہ سے امید کر رہے تھے کہ یہ ہمارے دین پر آجائیں گے جب اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس سے کعبہ کو قبلہ بنا دیا تو وہ ناامید ہو گئے کہ یہ لوگ تو ہمارے دین کو قبول نہیں کریں گے۔ تو اس وقت آیت کریمہ کا نزول ہوا۔

اور ساتھ ساتھ ہی نبی کریم ﷺ کو ان کے ایمان سے مکمل طور پر ناامید ہونے کے لئے کہا، کہ ان لوگوں کے ایمان لانے کی آپ ذرا بھر بھی امید نہ رکھیں کیونکہ یہ لوگ تو چاہتے یہی ہیں کہ تم بھی ان کے دین پر آ جاؤ۔ (از حازن)

فائدہ: یہاں یہود و نصاریٰ کا جو ذکر کیا گیا اس سے مراد ان کی قوم ہے، ہر ہر فرد مراد نہیں کہ ان میں سے کوئی ایک بھی ایمان نہیں لائے گا، بلکہ راد یہ ہے کہ تمام یہود اور نصاریٰ ایمان نہیں لائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی یہود میں سے ایمان لے آئے تھے، اور حبشہ وغیرہ کے کئی نصاریٰ بھی ایمان لے آئے تھے۔

اعتراض: اس آیت کریمہ سے یہ حقائق نہ کہ یہود و نصاریٰ مجموعی طور پر کبھی ایمان نہیں لائیں گے، بلکہ وہ تو چاہتے ہیں کہ ایمان والے بھی ایمان چھوڑ کر ان کے دین پر آ جائیں۔

لیکن دوسری آیت میں ذکر ہے۔ ﴿رَأَىٰ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا لِيُؤْمِنُوا بِهِ قَبْلَ مَوْتِهِ﴾ اس آیت سے واضح ہو رہا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام جب دنیا میں تشریف لے آئیں گے۔ تو اہل کتاب میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہوگا۔ جو عیسیٰ علیہ السلام کی وفات سے پہلے ایمان نہ لے آئے۔

یہ بات بھی واضح ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام تو نبی کریم ﷺ کی شریعت کی تبلیغ فرما رہے ہوں گے تو اہل کتاب کا ایمان نبی کریم ﷺ پر اور آپ کی شریعت پر ہوگا۔

ان دونوں آیتوں میں تعارض نظر آتا ہے۔ ان میں تطبیق کیسے دی جائے کہ تعارض نہ رہے۔

جواب: قرآن پاک میں کہیں بھی تعارض نہیں، صرف کسی کو سمجھ نہ آئے تو وہ بظاہر تعارض سمجھ بیٹھتا ہے۔ کیونکہ اس آیت کو اور ﴿وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُمْ مِنْ بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا مِّمَّنْ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ أَنْفُسِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ﴾ (پسند کرتے ہیں بہت سے اہل کتاب کاش کہ وہ تمہیں ایمان کے بعد کفر کی طرف پھیر دیں، اس حسد کی وجہ سے جو اپنے نفسوں میں رکھتے ہیں۔ اس کے بعد جب ان پر حق ظاہر ہو گیا۔)

کو ایک ساتھ سمجھا جائے تو واضح ہو جائے گا کہ ان کے ایمان نہ لانے کی وجہ صرف حسد تھا کہ وہ

نبی کریم ﷺ کی برتری کو پسند نہیں کرتے تھے، اور اپنی چوہدرائٹ اور ریاست کے زوال کی وجہ سے خدا اور عباد کی وجہ سے ایمان نہیں ڈال رہے تھے۔ اس کی یہ وجہ نہیں کہ ان پر حق واضح نہیں تھا۔ بلکہ وہ نبی کریم ﷺ کی حقانیت کو تسلیم کرنے کے باوجود خدا کی وجہ سے ایمان نہ لانے پر ڈٹے ہوئے تھے۔

لیکن عیسیٰ علیہ السلام کے آنے پر جب ان کی ضد اور حسد اور عناد ختم ہو جائے گا تو ایمان لے آئیں گے۔

تنبیہ: ﴿وَلَنْ تَرْضَىٰ عَنْكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَىٰ حَتَّىٰ تَبْعَ مِلَّتَهُمْ﴾ کا یہ مطلب نہیں کہ یہود و نصاریٰ دونوں فریق یہ چاہتے ہیں کہ مسلمان وہ دین قبول کر لیں جو یہودیت اور نصرانیت کا مجموعہ، چونکہ ایسا تو کوئی دین تھا ہی نہیں، بلکہ یہودی نصرانیوں کو بے دین کہتے تھے۔ اور نصرانی یہودیوں کو بے دین کہتے تھے۔

لہذا آیہ کریمہ کا مطلب یہ ہے۔ ﴿وَلَنْ تَرْضَىٰ عَنْكَ الْيَهُودُ﴾ یعنی الا بالیہودیۃ ﴿وَلَا النَّصَارَىٰ﴾ الا بالنصرانیۃ کہ تم سے ہرگز یہود راضی نہیں ہوں گے یہاں تک کہ تم ان کے دین یہودیت کو قبول کر لو، اور نصرانی تم سے ہرگز راضی نہیں ہوں گے یہاں تک کہ تم ان کے دین نصرانیت کو قبول کر لو۔

(خازن)

ملت کیا ہے؟ ﴿حَتَّىٰ تَبْعَ مِلَّتَهُمْ﴾ یعنی دینہم و طریقہم "ملت سے مراد طریقہ اور دین ہے۔

(خازن)

یعنی یہود و نصاریٰ ہرگز تم سے راضی نہیں ہوں گے یہاں تک کہ تم ان کے دین اور طریقہ کو اختیار کر لو۔

البتہ ملت کو دین کیوں کہا گیا؟ اس کی وضاحت میں اگرچہ الفاظ مختلف ہیں تاہم مفہوم کچھ قریب قریب ہی ہے۔ ملت اور شریعت اور دین سب کا مطلب یہ ہے۔ "ما شرعہ اللہ تعالیٰ لعبادہ علی لسان انبیائہ" اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے جو شریعت کے احکام انبیاء کرام کے ذریعے مقرر فرمائے۔

شریعت کو شریعت کہنے کی وجہ علامہ جوہری رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں۔ شرع لہم الی سن ای جعلہ لہم سننا وطریقا والسنة السيرة والطريقة "شریعت کا مطلب ہے کہ ان کے لئے ایک طریقہ رائج کر دیا۔

شریعت، پانی پر وارد ہونے کی جگہ کو بھی کہا جاتا ہے، جس طرح پیاسے لوگ پانی کے حوض وغیرہ پر بیٹھا اور ٹھنڈا پانی حاصل کرنے کے لئے جاتے ہیں، اسی طرح رب تعالیٰ کے تقرب کے پیاسے ثواب اور رحمت کی مٹھاس اور ٹھنڈک حاصل کرنے کے لئے حکام دینیہ کے مورد پر جمع ہوتے ہیں۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا "الشريعة مادعا الله تعالى عباده الى فعله" شریعت اس راہ کو کہا جاتا ہے۔ جس پر عمل کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو بلایا۔

دین کو دین کہنے کی وجہ یہ ہے۔ "والدين باعتبار طاعته واجابة دعائه والانقياد لامره" اللہ تعالیٰ کے حکم کی طاعت کرنے اور اس کے احکام کو بجالانے اور اس کے امر کی فرمانبرداری کرنے کو دین کہا جاتا ہے۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ "والدين مافعله العباد عن امره" اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق بندوں کا عمل کرنا دین ہے۔

ملت کو ملت کہنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے علامہ راغب اصفہانی بیان کرتے ہیں۔ "الملة من املت الكتاب ای املیته" "ملة" کا معنی ماخوذ ہے "املت الكتاب" خط لکھانا۔ یہی معنی "املیته" کا بھی ہے۔

عام طور پر شرعی مسائل جو انبیاء کرام کے ذریعے ملے ان کو حفظ کرنے کی غرض سے لکھ لیا جاتا ہے لہذا شریعت کو ملت بھی کہا جانے لگا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا احکام شرع کی طرف بلانے اور کتب کے نازل کرنے کو بھی ملت کہا گیا ہے مطلب واضح ہو گیا کہ "ملت اور شریعت اور دین" ایک چیز کا نام ہے۔ یہ لحاظ کیا جائے کہ انبیاء کرام نے رب تعالیٰ کے احکام کو ظاہر فرمایا اور لکھوائے تو ملت کہا گیا۔ یہ لحاظ کیا جائے کہ بندے

ان احکام پر عمل کر کے رب تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی طاعت کرتے ہیں تو اسے دین کہا گیا۔ اور یہ لحاظ کیا کہ پیاسے اس کی طرف جاتے ہیں تو شریعت کہا گیا۔ (ماخوذ از شیخ زادہ)

قُلْ اِنَّ هُدٰى اللّٰهٗ هُوَ الْهُدٰى : فرما دو بے شک اللہ کی ہدایت ہی ہدایت ہے

نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم ان کو جواب دو کہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہی اسلام اور وہی حق کی ہدایت ہے، جو تم دعویٰ کرتے ہو وہ تو راہ ہدایت نہیں، بلکہ باطل راہ اور گمراہی ہے۔ (از بیضاوی)

وَلٰٓئِنۡ اَتَّبَعْتَ : میں لام مؤنثہ للقسیم ہے۔ ”اھوائہم“ اھواء جمع ہے ”ھوی“ کی۔ اس کا معنی ہے ان کی ٹیڑھی آراء۔ یعنی ”ھوی“ وہ رائے ہے جو خواہشات پر مبنی ہو۔ خواہشات باطلہ کی وجہ سے جو رائے حاصل ہو وہ گمراہی کی طرف لے جانے والی ہے۔

”وَسُمِّیَ بِذٰلِكَ لِاَنَّهُ یَهْوٰی صَاحِبَهُ فِی الدُّنْیَا اِلٰی کُلِّ دَآهٍ وَفِی الْآخِرَةِ اِلٰی هَآوِیَہ“
یعنی ”ھوی“ کو ھوی اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ انسان کو دنیا میں ہر قسم کی مصیبت میں گرا دیتی ہے۔ اور آخرت میں جہنم کے مقام ھاوِیہ میں گرا دے گی۔

بَعْدَ الَّذِیْ جَآءَکَ مِنَ الْعِلْمِ : (بعد اس کے کہ تمہارے پاس علم آ جائے)
اس علم سے مراد یہ ہے کہ تمہارے پاس بیان آ جائے کہ اللہ کا دین اسلام ہی ہے۔ اور یہ بیان آ جائے کہ قبلہ وہی قبلہ ہے جو ابراہیم علیہ السلام کا تھا وہ کعبہ شریف ہے۔

مَالِکَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ : ولی کا مطلب ہے۔ جو امور کا والی ہو، اور ان کے معاملات کو قائم کرے، رب کی طرف سے تمہارا کوئی ولی نہیں ہوگا۔

وَلَا نَصِیْرٌ : کوئی تمہاری مدد کرنے والا اور کوئی تمہیں اللہ کے عذاب سے بچانے والا نہیں۔

انتباہ : ”وَقِیْلَ فِیْ قَوْلِهِ ﴿وَلٰٓئِنۡ اَتَّبَعْتَ اَهْوَآئَهُمْ﴾ اِنَّہٗ خَطَابٌ لِلنَّبِیِّ ﷺ

والمراد بہ امتہ“ ﴿وَلٰٓئِنۡ اَتَّبَعْتَ﴾ میں بظاہر خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے اور مراد آپ کی امت ہے۔

(خازن)
اس لئے کہ نبی کریم ﷺ سے یہ ممکن ہی نہیں کہ آپ رب تعالیٰ کی طرف سے علم آنے کے بعد یہود و نصاریٰ کی خواہشات کی تابعداری کریں۔

”والمعنى اياكم اخاطب ولكم اؤدب وانهى فقد علمتم ان محمدا ﷺ قد جاءكم بالحق والصدق وقد عصمته فلا تتبعوا اهواء الكافرين ولنن اتبعتم اهوائهم بعد الذى جاءكم من العلم والبيانات مالكم من دون الله من ولى ولا نصير“

آیہ کریمہ میں ﴿ولنن اتبعن﴾ سے لے کر آیہ کے آخر تک کا مفہوم واضح ہو گیا کہ یہ حکم نبی کریم ﷺ کی امت کو ہے۔ گویا کہ رب تعالیٰ نے یہ فرمایا اے امت محمد مصطفیٰ ﷺ میں تمہیں خطاب کر رہا ہوں۔ میں تمہیں ادب سکھا رہا ہوں۔ میں تمہیں غلط راہ سے منع کر رہا ہوں۔

اور یہ بات تمہیں یقینی طور پر معلوم ہے کہ محمد ﷺ تمہارے پاس سچا دین اور حق دین لائے ہیں۔ ان کو تو میں نے کافروں کی خواہشات کی تابعداری کرنے سے بچایا ہوا ہے، لیکن تم کافروں کی خواہشات کی تابعداری نہ کرنا اگر تم نے ان کی خواہشات کی تابعداری کی جب کہ تمہارے پاس علم آ گیا اور واضح دلائل آ گئے تو تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچانے کے لئے تمہارا کوئی یار و مددگار نہیں ہوگا۔

(خازن)

یوں بھی کہا جاسکتا ہے: اگر یہ کہا جائے کہ یہ خطاب تو نبی کریم ﷺ کو ہی ہے، لیکن بالفرض محال کے طور پر تو یہ درست ہے۔ اب مطلب یہ ہوگا کہ اے نبی کریم اگر تم نے بالفرض محال ان کی خواہشات کی تابعداری کی الخ۔ بالفرض محال میں حقیقت معتبر نہیں ہوتی جیسا کہ رب تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔ ﴿قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ﴾ فرمادو اگر رحمن کی اولاد ہوتی تو میں سب سے پہلے اس کی عبادت کرتا۔ یہ کلام بھی بالفرض محال پر مبنی ہے۔

یعنی خطاب نبی کریم ﷺ کو ہو لیکن بالفرض محال کے طور پر، اور امت کو سخت وعید کی گئی ہو۔

(از جلالین)

☆☆☆

﴿الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَتْلُونَهُ حَقَّ تِلَاوَتِهِ ۖ أُولَٰئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهِ ۖ وَمَنْ يَكْفُرْ بِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخٰسِرُونَ﴾ (۱۲۱)

(۱) جنہیں ہم نے کتاب دی ہے وہ جیسی چاہئے اس کی تلاوت کرتے ہیں وہی اس پر ایمان رکھتے ہیں، اور جو اس کے منکر ہیں تو وہی اس کے زیاں کار ہیں۔

(۲) وہ لوگ جنہیں ہم نے عطاء کی کتاب وہ اس کی تلاوت کرتے ہیں جیسا حق ہے اس کی تلاوت کرنا، وہی لوگ ایمان رکھتے ہیں اس کے ساتھ۔ اور جو اس سے کفر کرتے ہیں وہی ہیں خسارہ اٹھانے والے۔

الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ : (وہ لوگ جن کو دی ہم نے کتاب)
اس سے مراد کون سے لوگ ہیں؟

اس سے مراد نبی کریم ﷺ کی امت کے لوگ بھی ہیں۔ اور اس سے مراد نصرانیوں کے چند لوگ بھی ہیں۔ یعنی آیت کریمہ اپنے وسیع تر مفہوم کے لحاظ پر دونوں کو شامل ہے۔

علامہ رازی رحمہ اللہ کا مختار یہ ہے کہ اس سے مراد مومن ہیں۔ ماقبل سے رابطہ بھی موجود ہے، کیونکہ ﴿وَلَسِنِ اتَّبَعْتُ﴾ میں خطاب نبی کریم ﷺ کی امت کو ہے۔ اور اس آیت کریمہ میں بھی آپ کی امت ہی مراد ہے۔

”الذین“ سے مراد جب ایمان والے لوگ ہوں گے، تو ”الکتاب“ سے مراد قرآن پاک ہوگا۔ یہی قول بہتر ہے کیونکہ بعد میں ذکر ہو رہا ہے۔ ﴿يَتْلُونَهُ حَقَّ تِلَاوَتِهِ﴾ وہ لوگ اس کتاب کی تلاوت کرتے ہیں جیسا حق ہے اس کی تلاوت کرنا۔

اس جملہ میں قرآن پاک کی تلاوت کرنے کی رغبت دلائی گئی، اور قرآن پاک کی تلاوت پر براہیختہ کیا گیا، اور تلاوت کرنے کی مدح کی گئی۔ جس کتاب کی یہ شان ہے وہ قرآن پاک ہی ہے۔ یہ مقام توراۃ اور انجیل کو حاصل نہیں۔

اُولَئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهِ : (وہی اس پر ایمان رکھتے ہیں) اس جملہ میں حصر پائی گئی ہے کہ ”جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی وہ اس کی تلاوت کرتے ہیں جیسا کہ اس کی تلاوت کا حق ہے، وہی اس پر ایمان رکھتے ہیں۔“

ایمان کو ان لوگوں پر منحصر کر دیا ہے، یہ شان صرف ایمان والوں کی ہے، اہل کتاب کو یہ مقام حاصل نہیں۔ (از کبر)

فائدہ: ﴿يَتْلُونَهُ حَقَّ تِلَاوَتِهِ﴾ کا معنی حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے یہ کیا ”یتبعونه حق اتباعہ“ وہ تابعداری کرتے ہیں اس کتاب کی جیسے اس کی تابعداری کرنے کا حق ہے۔ یعنی قرآن پاک کے اوامر اور نواہی پر عمل کرتے ہیں۔ حلال کو حلال سمجھتے ہیں۔ اور حرام کو حرام سمجھتے ہیں۔ غرضیکہ قرآن پاک کے جمیع احکام کے مطابق عمل کرتے ہیں۔

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے اس پر دلیل اس آیت سے پیش کی کہ ﴿وَالْقَمَرَ إِذَا تَلَاهَا﴾ میں ”تلاھا“ کا معنی پیچھے آنا لیا گیا ہے۔ اس معنی پر ایک حدیث بھی پیش کی گئی ہے۔
”عن ابن عمر عن النبی ﷺ فی قوله تعالى ﴿يَتْلُونَهُ حَقَّ تِلَاوَتِهِ﴾ قال يتبعونه حق اتباعه“
حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ﴿يَتْلُونَهُ حَقَّ تِلَاوَتِهِ﴾ کے متعلق فرمایا وہ تابعداری کرتے ہیں اس کی جیسے اس کی تابعداری کرنے کا حق ہے۔

لیکن حدیث کے متعلق قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ ”فی اسنادہ غیر واحد من المجہولین فیما ذکر الخطیب ابو بکر احمد الا ان معناه صحیح“

اس حدیث کی اسناد کے متعلق خطیب ابو بکر احمد رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا کہ اس میں کئی مجہول راوی ہیں۔ تاہم حدیث میں جو معنی پیش کیا گیا ہے وہ صحیح ہے۔

☆ ”قال ابو موسیٰ الاشعری من يتبع القرآن يهبط به علی ریاض الجنة“

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے فرمایا جو شخص قرآن پاک کی تابعداری کرتا ہے وہ اس کے ذریعہ جنت کے باغات تک پہنچ جاتا ہے۔

☆ ”وعن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ هم الذين اذا مروا بآية رحمة سألوها من الله واذا

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس آیت کریمہ میں ﴿يَتْلُونَهُ حَقَّ تِلَاوَتِهِ﴾ سے مراد وہ لوگ ہیں، جو قرآن پاک کی تلاوت کرتے وقت جب رحمت کی آیت آئے تو وہ رحمت طلب کرتے ہیں۔ اور جب وہ عذاب والی کوئی آیت پڑھتے ہیں تو عذاب سے رب تعالیٰ کی پناہ پکڑتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ معنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل سے لیا، حدیث شریف میں آپ کی تلاوت کو اسی طرح بیان کیا گیا۔

”عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان اذا مر بآية رحمة سأل وذا مر بآية عذاب تعوذ“

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب رحمت کی آیت کی تلاوت فرماتے تو رب تعالیٰ سے رحمت کا سوال کرتے، اور جب عذاب والی آیت کی تلاوت کرتے تو عذاب سے رب تعالیٰ کی پناہ مانگتے۔

☆ ”وقال الحسن هم الذين يعملون بمحكمه ، ويؤمنون بمتشابهه ، ويكلون ما اشكل عليهم الى عالمه“

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ﴿يَتْلُونَهُ حَقَّ تِلَاوَتِهِ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ وہ محکم آیات پر عمل کرتے ہیں۔ اور متشابہات پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور مشکلات کو علماء کے سپرد کر دیتے ہیں۔

(ماخوذ از قرطبی)

☆ ”قال ابن مسعود والذي نفسي بيده ان حق تلاوته ان يحل حلاله ، ويحرم حرامه ويقراه كما انزل الله ، ولا يحرف الكلم عن مواضعه ولا يتأول منه شياً على غير تأويله“

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے کہ ”تلاوت کرنے کا حق“ یہ ہے کہ حلال کو حلال سمجھا جائے۔ اور حرام کو حرام سمجھا جائے۔ اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے قرآن کو نازل فرمایا اسی طرح اسے پڑھا جائے۔ کسی طرح بھی اس کے کلمات میں تحریف نہ کی جائے۔ اور کسی قسم کی غلط تاویل نہ کی جائے۔

دوسرا احتمال: ”الذين“ سے مراد اہل کتاب میں سے یہود ہوں۔ اور کتاب سے مراد توراۃ ہو۔ تو اس سے مراد ”ہم مؤمنو اہل کتاب مثل عبد اللہ بن سلام و اصحابہ“ اہل کتاب میں حضرت عبد اللہ بن سلام اور ان کے ساتھی ہیں۔ اب اس صورت میں ”کتاب“ سے مراد توراۃ ہوگی۔

اب مطلب یہ ہوگا کہ ”وہ لوگ جن کو ہم نے توراۃ عطاء کی وہ اس کی تلاوت کرتے ہیں جیسا کہ اس کے تلاوت کرنے کا حق ہے۔ اور وہ توراۃ پر ایمان رکھتے ہیں۔ یعنی اس میں نبی کریم ﷺ کے اوصاف پر کامل ایمان رکھتے ہیں، جس کی وجہ سے ان کو رب تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ اور قرآن پر ایمان لانے کی بھی توفیق عطاء فرمادی۔

تیسرا احتمال: ”الذین“ سے مراد نصاریٰ ہوں، اور ”کتاب“ سے مراد انجیل ہو، اس سورۃ میں آیۃ کریمہ کا تعلق اصحابہ سفینہ سے ہوگا، یعنی وہ لوگ جو حضرت جعفر بن ابی طالب کے ساتھ حبشہ سے کشتی میں سوار ہو کر آئے تھے۔ جن کی تعداد چالیس تھی، بتیس آدمی حبشہ سے اور آٹھ شام کے راہب حضرات تھے۔ جن میں بحیرا راہب بھی تھا۔ ان لوگوں نے نبی کریم ﷺ پر ایمان لایا۔

اب آیۃ کریمہ کا مفہوم یہ ہوگا، کہ وہ نصرانی لوگ جن کو ہم نے انجیل دی، انہوں نے انجیل کو پڑھا جیسا اس کے پڑھنے کا حق تھا، یعنی نبی کریم ﷺ کے اوصاف کو حق مانا، اور انجیل پر ایمان رکھا، ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے نبی کریم ﷺ پر ایمان لانے کی توفیق عطاء فرمادی۔ (ازغازن)
فائدہ: ”وقال الکلبی الضمیر راجع الی محمد ﷺ ای یصفونہ فی کتبہم حق صفته لمن سألہم من الناس“

کلبی رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے کہ جب ”الذین“ سے مراد اہل کتاب ہوں خواہ یہود ہوں یا نصاریٰ، تو ”یتلونہ“ کی ضمیر نبی کریم ﷺ کی طرف لوٹے گی، اب مطلب یہ ہوگا کہ لوگوں میں سے جب کوئی تم سے نبی کریم ﷺ کے اوصاف کے متعلق پوچھے تو وہ صحیح حق پر مبنی بیان کر دو۔ (مظہری)

وَمَنْ يَكْفُرْ بِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخٰسِرُونَ :

اور جو اس سے کفر کرتے ہیں وہی خسارہ اٹھانے والے ہیں۔

جب ”الذین“ سے مراد ایمان والے لوگ ہوں تو ”بہ“ ضمیر کا مرجع ”الکتاب“ ہوگا، اور مراد اس سے قرآن پاک ہوگا۔ اب مطلب یہ ہوگا کہ جو لوگ قرآن پاک سے کفر کرتے ہیں وہ خسارہ اٹھانے والے ہیں۔

اور جب ”الذین“ سے مراد ”اہل کتاب“ ہوں تو پھر بھی ”بہ“ سے مراد قرآن پاک ہی ہونا ہے لیکن بالواسطہ کیونکہ اصل میں اس طرح اسے بیان کیا جائے گا جس طرح خازن کی اس عبارت سے واضح ہے۔

” (ومن یكفر به) ای یجحد ما فیہ من فرائض اللہ و نبوة محمد ﷺ “

اور جو اس سے کفر کرتے ہیں، یعنی اہل کتاب کا فریق اپنی اپنی کتاب میں بیان کردہ اللہ تعالیٰ کے فرائض کا انکار کرتے ہیں اور نبی کریم ﷺ کی نبوت کا انکار کرتے ہیں وہ خسارہ اٹھانے والے ہیں اب اس سے واضح ہو گیا کہ یہود و نصاریٰ کا تورات و انجیل میں بیان کردہ نبی کریم ﷺ کے اوصاف اور آپ کی نبوت کو نہ تسلیم کرنا ہی دراصل قرآن پاک پر ایمان نہ لانے کا سبب تھا۔

تنبیہ: اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔ ﴿وَمَنْ يَكْفُرْ بِهِ مِنَ الْأَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهُ﴾ اور جس شخص نے ان گروہوں میں سے اس (قرآن) کے ساتھ کفر کیا، اس کا ٹھکانا آگ ہے۔ بخاری شریف میں ہے۔

”والذی نفسی بیدہ لایسمع بی احد من هذه الامة یهودی ولا نصرانی ثم لایؤمن بی الا دخل النار“

قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، اس امت (امت دعوت) میں سے جس نے بھی میرے متعلق سنا خواہ یہودی ہو یا نصرانی پھر مجھ پر ایمان نہ لایا وہ ضرور جہنم کی آگ میں داخل ہوگا۔

(از صابونی)

☆☆☆

﴿يَبْنِي إِسْرَآئِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ
وَإِنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ ☆ وَاتَّقُوا يَوْمًا لَا تَجْزِي نَفْسٌ
عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ
وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ﴾ (آیت ۱۲۲، ۱۲۳)

(۱) اے اولاد یعقوب یاد کرو میرا احسان جو میں نے تم پر کیا اور وہ جو میں نے اس
زمانہ کے سب لوگوں پر تمہیں بڑائی دی۔ اور ڈرو اس دن سے کہ کوئی جان دوسرے کا
بدلہ نہ ہوگی اور نہ اس کو کچھ لے کر چھوڑیں، اور نہ کافر کو کوئی سفارش نفع دے اور نہ ان
کی مدد ہو۔

(۲) اے آل یعقوب یاد کرو میری وہ نعمتیں جو میں نے انعام کیں تم پر، اور بے شک
میں نے فضیلت دی تمہیں (تمہارے زمانہ کے) تمام لوگوں پر؛ اور ڈرو اس دن سے
جس دن نہیں بدلہ دے گا کوئی نفس کسی نفس کی طرف سے، اور نہیں قبول کیا جائیگا اس
سے فدیہ، اور نہیں نفع دے گی کسی کو (بغیر اذن الہی کے) کوئی شفاعت، اور نہ ان کی
مدد کی جائے گی۔

ان دونوں آیتوں کی وضاحت کافی حد تک رکوع نمبر ۵، اور نمبر ۶، میں بیان ہو چکی ہے، تاہم
تفسیر عزیزی میں کچھ بحث ان آیات کی تفسیر میں بھی ذکر کی گئی ہے۔ لہذا اس سے ذکر کرنا یقیناً مفید ہے۔
تنبیہ: ﴿وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ﴾ میں جن لوگوں کی امداد کی نفی کی گئی ہے۔ اس سے مراد وہ
لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے احکام کی عدولی کی وجہ سے اس کی گرفت میں ہوں گے، عذاب کے جو مستحق ہو
چکے ہوں گے، اگر وہ کافر ہوئے تو ان کی مدد اور شفاعت نہ ہی کوئی کرے گا اور نہ ہی قبول کی جائے گی۔
اور گنہگار لوگوں کی مدد اور شفاعت اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت حاصل ہونے پر کی جائے گی
اور اسے قبول کیا جائے گا، کیونکہ رب تعالیٰ نے خود فرمایا ﴿إِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا فِي

الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُومُ الْاَشْهَادُ ﴿﴾ بے شک ہم امداد کریں گے اپنے رسولوں اور ایمان والوں کی دنیا کی زندگی میں اور قیامت کے دن۔

مکرر ذکر کیوں؟ جب ان آیات کو پہلے بھی ذکر کر دیا گیا تو پھر دوبارہ ذکر کرنے کا کیا فائدہ؟ تو اس کا جواب یہ دیا گیا کہ بنی اسرائیل پر نعمتوں کے ذکر سے پہلے ان آیات کے ذکر کرنے کا مطلب یہ تھا کہ ان کو نعمتیں یاد دلائی جائیں، وہ ان نعمتوں کا شکر کریں، کفران نعم (نعمتوں کے شکر سے انکار) نہ کریں۔ اور منعم حقیقی کے حق کو پہچانیں۔

* یہاں ان آیات کو ذکر کر کے ان کو بتایا گیا کہ تمہارا متبوع بننے کا خیال باطل ہے۔ جو تم چاہتے ہو کہ نبی کریم ﷺ اور ایمان والے حضرات تمہارے دین پر آجائیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تم نے تو خود اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا انکار کیا، ان پر طرح طرح کی کج رویاں کرتے رہے۔ تمہاری تو کوئی شفاعت بھی نہیں کر سکے گا۔ تم کسی کی شفاعت کرو یہ تو اور ہی ناممکن ہے۔

لیکن نبی کریم ﷺ کو تو اوروں کی شفاعت کرنے کا حق حاصل ہوگا۔ اور آپ کی امت کے صالحین کو دوسروں کی شفاعت کا حق حاصل ہوگا۔ لہذا تم ان کو اپنے تابع بنانے کے تصورات کو اپنے ذہنوں سے نکال دو۔

اور وجہ مکرر ذکر کرنے کی یہ بھی ہے کہ پہلے اجمالی طور پر نعمتوں کی یاد دلائی، پھر تفصیلی طور پر چند نعمتوں کی یاد دلائی، پھر تفصیلی طور پر چند نعمتوں کا ذکر کیا پھر ان آیات میں نعمتوں کی یاد دلا کر گویا کہ نتیجہ اور خلاصہ ذکر فرما دیا۔

چند الفاظ مبارکہ میں فرق:

(۱) پہلی آیت میں ذکر کیا گیا ﴿وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ﴾ اور اس آیت کریمہ میں ذکر کیا گیا ﴿وَلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ﴾

(۲) پہلی آیت میں ذکر ہوا ﴿لَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ﴾ اس آیت میں ذکر ہوا ﴿لَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ﴾

(۳) پہلی آیت میں شفاعت کو مقدم ذکر کیا گیا اور فدیہ کو مؤخر، اور اس آیت میں فدیہ کو مقدم ذکر کیا، اور شفاعت کو مؤخر ان میں وجہ فرق کیا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ کافی حد تک اس قسم کی بحثوں کو پہلے ذکر کر دیا گیا، تاہم قدرے مناسب یہاں بھی ذکر کیا جا رہا ہے۔ شفاعت نفع دینے والی چیز ہے نقصان دہ نہیں، لیکن کافروں کے حق میں شفاعت قبول نہیں ہوگی۔

اسی طرح شفاعت کرنے والا اس کے نزدیک مقبول ہوتا ہے جس کے پاس وہ شفاعت کرنے کے لئے گیا ہے۔

پہلی آیت میں ﴿وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ﴾ اس لئے ذکر فرمایا ہے کہ اس سے پہلے ﴿وَلَا تَكُونُوا أَوَّلَ كَافِرٍ بِهِ﴾ صراحت ذکر ہو چکا ہے۔

یعنی پہلے ان کو کفر سے منع کیا گیا، پھر ان کو بتایا گیا کہ اگر تم نے کفر کیا تو تمہارے حق میں کسی کی شفاعت قبول نہیں کی جائے گی، کیونکہ کافروں کے لئے کوئی شفاعت قبول نہیں۔

دوسری آیت سے پہلے مضمون یہ آ رہا تھا کہ یہود و نصاریٰ تو یہ چاہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام بھی ہمارے دین پر آ جائیں، تو ان کو بتایا گیا کہ نبی کریم ﷺ اور آپ کے ساتھ ایمان لانے والوں کی شفاعت لوگوں (گنہگاروں) کو نفع دے گی، لیکن تمہیں نفع نہیں دے گی، کیونکہ تم تو ان کو اپنا تابع بنانا چاہتے ہو، ان کی شفاعت تو ان لوگوں کو نفع دے گی جو ان کی تابعداری کرنے والے ہوں گے۔

اس سے واضح ہو گیا کہ کافروں کا کوئی فدیہ نفع نہیں دے گا۔ لیکن جہاں پہلے کافروں کا ذکر ہوا وہاں ﴿لَا يُؤْخَذُ﴾ ذکر کیا، کہ ان کے لئے فدیہ کسی سے لیا ہی نہیں جائے گا۔

اس وہم کو بھی رد کر دیا کہ کوئی شخص دنیا والوں پر اسے قیاس نہ کرے کہ بعض اوقات فدیہ لے کر تردد ہوتا ہے کہ اسے قبول کیا جائے یا نہ قبول کیا جائے۔

یہاں چونکہ پہلے صراحت ان کے کفر کا ذکر نہیں تھا لیکن اشارۃً ان کا کفر سمجھ میں آ رہا ہے اس لئے صرف ﴿لَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ﴾ پر اکتفاء کر لیا گیا کہ ان سے فدیہ قبول نہیں کیا جائے گا۔

راقم کے نزدیک دونوں آیات کا مجموعی مضمون مکمل مسئلہ بیان کر رہا ہے کہ ان کے لئے نہ شفاعت قبول کی جائے گی اور نہ ہی ان کو نفع دے گی۔ اور نہ ہی ان کے لئے فدیہ لیا جائے گا اور نہ ہی ان کی طرف سے فدیہ قبول کیا جائے گا۔

شفاعت اور فدیہ کی تقدیم و تاخیر کی وجہ یہ ہے کہ پہلی آیت میں ابتداء حادثہ کا ذکر تھا، ابتداء حادثہ میں شفاعت پہلے ہوتی ہے۔ فدیہ بعد میں، لہذا اسی انداز پر نفی بھی کر دی گئی۔ اور دوسری آیت میں انتہاء حادثہ کا ذکر کیا گیا، اور انتہاء حادثہ میں فدیہ پہلے دینے کی کوشش کی جاتی ہے، اس لئے اسی طرح نفی بھی کر دی گئی، واللہ اعلم بالصواب،
(ماخوذ از عزیزی)

خلاصہ کلام: بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کئی نعمتوں کی تفصیل کا ذکر کرنے کے بعد پھر اسی طرح کا خطاب کیا جیسا کہ ان نعمتوں کے ذکر کرنے سے پہلے خطاب فرمایا۔ ان کو فرمایا کہ اے بنی اسرائیل میری نعمتوں کو یاد کرو جو میں نے تمہیں عطاء کی ہیں۔ اور یہ بھی یاد کرو کہ میں نے تمہارے آباد و اجداد کو ان کے زمانے میں دوسروں پر فضیلت دی۔ جس کی وجہ سے لوگ تمہیں بھی عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور یہ بھی خیال رکھنا کہ رب تعالیٰ کی عدالت دنیا داروں کی نام نہاد عدالتوں کی طرح نہیں، دنیا دار تو بعض اوقات مجرم کی جگہ دوسرے کو بریغمال بنا کر مجرم کو چھوڑ دیتے ہیں۔ کبھی مجرم کے حق میں کسی کی سفارش مان کر مجرم کو چھوڑ دیتے ہیں۔

اور کبھی مال و دولت لے کر مجرم کو آزاد کر دیتے ہیں۔ اور کبھی اس مجرم کی دوسرے مدد کر کے اسے بزور بازو چھڑا لیتے ہیں۔ جیسا کہ ہم مشاہدہ کرتے ہی رہتے ہیں کہ ہمارے لٹھ بردار نو جوان اسی فیصد ملک کا مال و زر ہڑپ کرنے والے ہمیشہ اپنے مجرم، غاصب اور لیٹھے فرمانروا کی مدد کر کے شرفاء کی پگڑیوں کو اچھالتے ہیں، شرفاء کو مجرم ٹھہراتے ہیں، شرفاء کو اس ڈر سے ملک بدر کر دیتے ہیں کہ وہ کہیں ہمارے اندرونی راز نہ کھول دیں۔

لیکن رب قدوس کی پاک عدالت جو عدالت ہے نجالت نہیں، جو عدالت ہے ذلالت نہیں، جو عدالت ہے رذالت نہیں، اس عدالت عظمیٰ میں کسی مجرم کی جگہ غیر مجرم کو بریغمال نہیں بنایا جائے گا۔ کسی مجرم یعنی کسی کافر و مشرک کے حق میں کسی کی شفاعت کو نہ ہی قبول کیا جائے گا اور نہ ہی کسی کی شفاعت اسے نفع دے گی۔

اور رب کی عدالت میں فدیہ دے کر کسی کو چھڑانے کا تصور کرنا ہی باطل ہے۔ اور رب تعالیٰ سے کوئی زور آور نہیں، کوئی ڈنڈے والا کسی کو چھڑا لے یہ نہیں ہو سکے گا۔
(راقم)

وَإِذْ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ ۖ قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا ۖ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي ۖ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ ﴿١٢٣﴾

(آیت ۱۲۳)

(۱) اور جب ابراہیم کو اس کے رب نے کچھ باتوں سے آزمایا تو اس نے وہ پوری کر دکھائیں، فرمایا میں تمہیں لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں، عرض کی اور میری اولاد سے فرمایا میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچتا۔

(۲) اور جب آزمایا ابراہیم کو ان کے رب نے چند باتوں سے، تو انہوں نے پورا کیا ان کو، کہا (رب نے) بے شک میں بنانے والا ہوں تمہیں لوگوں کا امام۔ انہوں نے کہا اور میری اولاد میں سے، کہا نہیں پہنچتا میرا عہد ظالموں کو۔

جب پہلے قبلہ کا ذکر ہوا کہ قبلہ کے بدل جانے پر یہود و نصاریٰ اس بات سے مایوس ہو گئے کہ نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ ان کے دین کو قبول نہیں کریں گے، جبکہ پہلے وہ امید رکھتے تھے۔

اس کے بعد قبلہ یعنی کعبہ شریف کی تعمیر اور ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کیا۔ کہ کعبہ شریف ہی ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ تھا۔

(از قرطبی)

جب پہلے یہود اور نصاریٰ اور مشرکین کا ذکر کیا کہ وہ ایمان لانے سے انکار کر رہے تھے، ایمان لانے سے انکار میں کئی حیلے، بہانے بنا رہے تھے۔ ٹال مٹول سے کام لے رہے تھے۔

تو اس کے بعد ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کیا کیونکہ مشرکین بھی ان کا احترام کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم ان کی اولاد سے ہیں اور انہوں نے کعبہ تعمیر کیا۔

اور یہود و نصاریٰ بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اپنے آپ کو ان کی اولاد سے کہتے تھے تو رب تعالیٰ نے ان کا تذکرہ کر کے گویا کہ یہود و نصاریٰ اور مشرکین کو کہا کہ تم نبی کریم ﷺ

کے اقوال کو قبول کر لو، ان کے دین کا اعتراف کر لو، اور ان کی شریعت کے مطیع ہو جاؤ۔

(۱) ابراہیم علیہ السلام کے ذکر سے ان کو نبی کریم ﷺ کی اطاعت کا حکم کیسے دیا؟ اس میں چند وجوہ ہیں۔
اللہ تعالیٰ نے جب ابراہیم علیہ السلام کو بعض تکلیف والے کاموں کا حکم دیا تو آپ نے ان کو پورا کیا، اور ذمہ داری کو مکمل کیا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو منصب نبوت اور امامت پر فائز کر دیا، یعنی اعلان نبوت کا حکم دیا، کیونکہ نبی پیدائش سے پہلی ہی نبی ہوتا ہے۔

اس سے یہود اور نصاریٰ اور مشرکین کو متنبہ کیا کہ جب تم تمام ہی ابراہیم علیہ السلام کی بزرگی اور بلندی شان کو تسلیم کرتے ہو تو اس پر بھی غور کرو کہ ان کو رب تعالیٰ کے حضور جھکنے اور بخیر کرنے کی وجہ سے منازل رفیعہ حاصل ہوئے۔

تو تم بھی اگر دنیا اور آخرت میں بھلائی چاہتے ہو تو سرکشی اور عناد چھوڑ دو، اللہ تعالیٰ کے احکام کو دل و جان سے مان لو، اور رب تعالیٰ کی طرف سے تکالیف کو برداشت کرو، یہ تمام چیزیں اسی وقت حاصل کر سکو گے جب نبی کریم ﷺ پر ایمان لاؤ گے۔

(۲) رب تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو جب یہ فرمایا ﴿لَا يَنْتَهِ عَهْدِي الظَّالِمِينَ﴾ (نہیں پہنچتا میرا عہد ظالموں کو) تو اس سے واضح فرمادیا ”ان منصب الامامة والرياسة في الدين لا يصل الى الظالمين“ کہ بے شک منصب امامت اور دین میں منصب ریاست ظالموں کو نہیں مل سکتا۔

مشرکین اور یہود و نصاریٰ سب ہی یہ چاہتے تھے کہ یہ منصب ہمیں حاصل ہوتا، تو انہیں بتا دیا کہ جھگڑالو اور تعصب کی وجہ سے باطل راہ پر چلنے والے اس منصب کو کیسے حاصل کر سکتے ہیں۔ گویا کہ ان کو دعوت فکری کہ ذرا غور کرو، عقل سے کام لو کیا واقعی محمد (ﷺ) اس منصب کی قابل ہیں؟ جب یقیناً میں تو ان پر ایمان لے آؤ۔

(۳) ”وثالثها ان الحج من خصائص دين محمد ﷺ، فحكى الله تعالى ذلك عن ابراهيم ليكون ذلك كالحجة على اليهود والنصارى في وجوب الانقياد لذلك“
تیسری وجہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ شریف کی تعمیر فرمائی، اور حج کا اعلان فرمایا،

لیکن آپ کے بعد حج کی فرضیت نبی کریم ﷺ اور آپ کی امت پر ہوئی، یعنی باقاعدگی سے حج پر عمل نبی کریم ﷺ نے کرایا، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کر کے یہود و نصاریٰ کو بتایا کہ جب تم اسے تسلیم کرتے ہو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے مقرب اور جلیل القدر نبی تھے۔ جب تم یہ بھی مانتے ہو کہ کعبہ شریف انہوں نے ہی تعمیر کیا، جب تم یہ بھی مانتے ہو کہ حج کا اعلان انہوں نے ہی تعمیر کعبہ کے بعد فرمایا۔ جب تم یہ بھی تسلیم کرتے ہو کہ ابراہیم علیہ السلام نے حج کیا، اس کے بعد بطور فرض حج پر باقاعدگی سے عمل نہ ہو سکا۔

اب جب نبی کریم ﷺ کی شریعت میں فرض کر دیا گیا، باقاعدگی سے حج جاری ہو چکا ہے تو تمہیں خوش ہونا چاہئے کہ تمہارے جد امجد کی یاد دوبالا ہو رہی ہے۔ لہذا تمہیں نبی کریم ﷺ پر ایمان لانا چاہئے۔ (۴) جب کعبہ شریف کو قبلہ بنا دیا گیا تو یہود و نصاریٰ پر یہ شاق گذرا، تو رب تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کا ذکر فرمایا کہ اس کی تعمیر کرنے والے تو ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ ”الذی یعترفون بحظیمہ ووجوب الاقتداء بہ“ یہ تو وہی ذات ہے جن کی تعظیم کا تم لوگ اعتراف کرتے ہو، اور جن کی اقتداء کو واجب قرار دیتے ہو، تو تمہیں چاہئے کہ دلوں سے غصہ کو نکال کر خوش ہو جاؤ کہ قبلہ تو وہی ہے جس کو ہمارے جد امجد نے بنایا۔ جب یہ بات تمہیں سمجھ آ جائے تو نبی کریم ﷺ پر ایمان بھی لے آؤ۔

(۵) مشرکین بھی ابراہیم علیہ السلام کی تعظیم کرتے تھے، بلکہ ابراہیم علیہ السلام نے بطور نظافت جو کام کئے (جن کا ذکر ان شاء اللہ قریب ہی آرہا ہے) وہ مشرکین بھی کرتے تھے، اور باوجود اس کے کہ نبی کریم ﷺ کی صداقت و امانت کے بھی معترف تھے، اور یہ بھی جانتے تھے کہ آپ کی شریعت میں ملت ابراہیمی کے بہت سے احکام موجود ہیں۔

تو ابراہیم علیہ السلام اور تعمیر کعبہ کا ذکر فرما کر انہیں بھی فرمایا گیا کہ تم نبی کریم ﷺ پر ایمان لاؤ۔ بلکہ تمہیں تو سب سے زیادہ حق پہنچتا ہے کہ تم ایمان لے آؤ کیونکہ تم حرم شریف میں رہنے والے ہو۔

(ماخوذ از کبیر)

وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ :

اور جب آزمایا ابراہیم کو ان کے رب نے چند باتوں سے تو انہوں نے ان کو پورا کیا۔
قال الجوہری ”بلوہ بلوا جربتہ واختبرتہ“ یعنی ابتلاء کا معنی تکالیف شاقہ میں مبتلاء کرنا،
اور تجربہ کرنا اور کسی کی آزمائش کرنا۔

آیہ کریمہ میں ابتلاء کا کیا معنی ہے؟ یا تو معنی یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو رب تعالیٰ نے تکالیف
شاقہ میں مبتلاء فرمایا تو آپ نے ان کو پورا کیا، یعنی صبر و تحمل سے ان کو برداشت کیا۔

اور یا معنی ہوگا آزمانا۔ مترجمین حضرات نے تقریباً یہی معنی اختیار کیا ہے۔ لیکن یہ بھی خیال
رہے کہ ”اختبار“ آزمانا کا حقیقی معنی تو یہ ہے کہ جس کے انجام اور عواقب امور کا پتہ نہ ہو کہ یہ
اوامر و نواہی کو تسلیم کرے گا یا نہیں۔ مطیع ہوگا یا عاصی تو اس کو آزمایا جائے کہ پتہ چل جائے کہ یہ کیسا ہے؟
یہ معنی رب تعالیٰ کی شان کے لائق نہیں کہ وہ کسی کی آزمائش کر کے پتہ چلائے کہ یہ مطیع ہے یا عاصی،
رب تعالیٰ تو بندوں کی پیدائش سے پہلے ہی ان کو جانتا ہے۔

لہذا رب تعالیٰ کے آزمانے کا مطلب ”کما قال فی الوسیط ابتلاء اللہ تعالیٰ یعود
اعلامہ عبادہ لا الی استعلامہ“ اس طرح ہوگا جیسا کہ وسیط میں بیان کیا گیا کہ رب تعالیٰ نے
ابراہیم علیہ السلام کو آزما کر اپنے بندوں پر ان کا مرتبہ ظاہر فرمادیا۔

رب تعالیٰ نے آپ کو اس لئے نہیں آزمایا کہ پہلے رب تعالیٰ کو علم نہیں تھا تو آزمانے کے بعد علم
حاصل ہوا۔ (از شیخ زادہ)

تنبیہ: ابھی جو مسئلہ ذکر کیا کہ رب تعالیٰ کے آزمانے کا مطلب کیا ہے؟ جب تک وہ نہ سمجھا

جائے تو انسان اسی طرح بھٹکتا رہتا ہے جیسا کہ ہشام بن حکم بھٹکا، اس نے کہا
”انہ تعالیٰ کان فی الازل عالما بحقائق الاشیاء و ما ہیا تھا فقط، فاما حدوث تلک
الماہیات و دخولها فی الوجود فہو تعالیٰ لا یعلمها الا عند وقوعها“ (کبیر)

اللہ تعالیٰ ازل میں صرف اشیاء کی حقیقتوں اور ماہیوں کو جانتا ہے۔ لیکن ان ماہیات کا حدوث

اور معرض وجود میں آنا اس وقت رب تعالیٰ کو معلوم ہوتا ہے جب وہ چیزیں واقع میں موجود ہو جاتی ہیں علامہ رازی رحمۃ اللہ نے تو اس پر طویل بحث کی ہے۔ تاہم خلاصہ یہی ہے کہ وہ اسی قسم کی آیات کے ظاہری ترجمہ کو دیکھ کر بھٹکا ہے کہ رب تعالیٰ اس لئے تو آزماتا ہے کہ وہ پہلے نہیں جانتا۔

کاش اسے یہ پتہ ہوتا کہ ”اختبار“ کا کبھی معنی ”اعلامہ عبادہ“ ہوتا ہے کہ کسی کا امتحان لے کر اس کا مرتبہ دوسروں پر واضح کیا جاتا ہے کہ دوسروں کو اس کی شان کا پتہ چل جائے۔ رب تعالیٰ کے آزمانے کا یہی مطلب ہے۔ اور کبھی ”اختبار“ کا معنی ہوتا ہے ”استعلامہ“ یعنی پہلے پتہ نہیں ہوتا تو اس کا پتہ چلانے کے لئے آزمایا جاتا ہے یہ معنی رب تعالیٰ کی شان کے لائق ہی نہیں۔

مقام تعجب یہ ہے کہ علم والے لوگ بھی کبھی بھٹکتے ہیں تو عجیب طریقہ پر، یہ دونوں معنی ایسے ہیں کہ ہم روزمرہ ان کا مشاہدہ کر رہے، تجربہ کر رہے ہیں، کہ آزمانے کی یہ دو ہی وجہ ہیں۔

آج کل قرآن پاک کے تراجم کو دیکھ کر علم سے خالی لیکن علم کے دعویدار اسی طرح بھٹک رہے ہیں، اور تمام قوم کو بھٹکانے کے لئے علماء کو ختم کر رہے ہیں۔ کہ جو ہم کہیں اسی کو سب ماننے والے ہو جائیں، کوئی اسے غلط کہنے والا نظر نہ آئے۔

ابراہیم : یہ لفظ سریانی زبان کا ہے۔ جس کا معنی ہے ”اب راحم“ رحم کرنے والا باپ۔ آپ کے نام سے ہی پتہ چل رہا ہے کہ آپ بچوں پر رحم کرنے والے ہیں۔

”ولذلك جعل هو وسارة زوجته كافلين لاطفال المؤمنين الذين يموتون صغار الى يوم القيامة“

اسی وجہ سے آپ کو اور آپ کی زوجہ حضرت سارہ کو مومنوں کے فوت ہونے والے بچوں کا قیامت تک کفیل بنادیا گیا ہے۔

بخاری شریف کی حدیث میں اس مسئلہ کی تائید پائی گئی ہے۔ حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کے ایک طویل خواب کا ذکر فرمایا ہے۔ جس میں یہ مذکور ہے۔ ”ان النبی ﷺ رأى فی الروضة ابراهيم عليه السلام وحوله اولاد الناس“ بے شک نبی کریم ﷺ نے ابراہیم علیہ السلام کو ایک باغ میں دیکھا، آپ کے ارد گرد لوگوں کے بچے موجود تھے۔

(از قرطبی)

ابراہیم علیہ السلام کا نسب:

آپ تارخ ابن ناخور کے فرزند ہیں۔ آپ کا نام ابراہیم اور آپ کا لقب ابو الضیفان (بہت بڑے مہمان نواز) ہے۔ آپ کا نسب یہ ہے، ابراہیم ابن تارخ ابن ناخور ابن ساروغ ابن رعوان تاتع ابن عابر ابن شالح ابن ارغشذ ابن سام بن نوح (حقانی)

آپ کی پیدائش طوفان نوحی کے سترہ سو نو سال بعد ہوئی اور عیسیٰ علیہ السلام سے تقریباً دو ہزار تین سو سال پہلے شہر بابل کے قریب قصبہ کونی میں ہوئی۔

تفسیر خزائن العرفان میں ہے کہ آپ کی پیدائش اہواز کے علاقہ مقام سوس میں ہوئی۔

(حزائن العرفان)

تنبیہ: آزر ابراہیم علیہ السلام کے چچا کا نام ہے آپ کا باپ کا نام تارخ ہے۔

علامہ محمود آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”والذی عول علیہ الجہم الغفیر من اہل السنۃ ان آزر لم یکن والد ابراہیم علیہ السلام وادعوا انہ لیس فی آباء النبی ﷺ کافرا اصلا لقولہ علیہ الصلوۃ والسلام لم ازل انقل من اصلاب الطاہر الی ارحام الطاہرات“

اہل سنت کے کثیر اہل علم کا اسی پر اعتماد ہے کہ بے شک آزر ابراہیم علیہ السلام کا باپ نہیں تھا۔ اہل سنت کے جم غفیر کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے آباء و اجداد میں کوئی بھی کافر نہیں تھا۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ میں ہمیشہ پاک پشتوں سے پاک رحموں کی طرف منتقل ہوتا رہا۔

اور یہ بھی واضح ہے کہ کفار و مشرکین تو کبھی پاک نہیں ہو سکتے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿ اِنَّمَا

(از روح المعانی)

الْمُشْرِکُونَ نَجَسٌ ﴾ بے شک مشرک تو ناپاک لوگ ہیں۔

ابراہیم علیہ السلام کے چار بیٹے ہیں حضرت اسماعیل علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام، مدین اور مدائن۔

(از قرطبی)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تفصیلی واقعہ ایک جگہ ہی کوئی دیکھنا چاہے تو راقم کی کتاب تذکرۃ

الانبیاء کا مطالعہ کرے۔ یہاں تو آیۃ کریمہ کے مناسب ہی ذکر کیا جائے گا۔

بکلمات: کلمات جمع ہے کلمہ کی۔ مراد اس سے وہ چیزیں ہیں جن کی تکلیف ابراہیم علیہ السلام کو دی گئی۔ البتہ ان اشیاء کو کلمات اس لئے کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کلام سے ان کا حکم دیا گیا، اور آپ کو تکلیف دی گئی۔

جیسا کہ عیسیٰ علیہ السلام کو ”کلمہ“ کہا گیا ہے۔ کیونکہ وہ کلمہ ”کن“ سے پیدا ہوئے۔ (فرطی)

کلمات سے مراد اوامر و نواہی ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو اوامر و نواہی سے آزمایا، آپ نے ان کو پورا کیا۔ خیال رہے کہ اوامر و نواہی ارواح کے لئے فضل و احسان ہیں۔ لیکن ظاہر طور پر بدن کے لئے مشقت اور تھکاوٹ کا سبب بنتے ہیں۔ اس لئے ان سے انسان کی آزمائش کی جاتی ہے۔

(بیضاری و شیخ زادہ)

امتحان مطابق شان:

یہ ہر شخص کی عقل تسلیم کرتی ہے کہ امتحان شان کے مطابق ہوتا ہے۔ جتنی شان بڑھتی چلی جائے گی اسی کے مطابق امتحان بڑھتا چلا جائے گا۔ پہلی جماعت کے لڑکے سے امتحان اس کی شان کے مطابق ہوگا۔ اور پانچویں جماعت کے لڑکے سے اس کی شان کے مطابق ہوگا۔ جیسا تعلیمی درجہ بڑھتا چلا جائے گا، اسی طرح امتحان بھی بڑھتا چلا جائے گا۔ نبی کریم ﷺ چونکہ سید الکائنات اور سید الانبیاء ہیں اس لئے آپ پر سب سے بڑے امتحانات آئے اور زیادہ سے زیادہ آپ کو مصائب کا سامنا پڑا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام رفیع منصب رکھنے کی وجہ سے اور جلیل القدر نبی ہونے کی وجہ سے کئی امتحانات میں مبتلا ہوئے۔ یعنی کلمات سے مراد بہت سے امور ہیں۔

کلمات سے مراد ستارے، چاند اور سورج:

حضرت ابراہیم علیہ السلام جس قوم میں تشریف لائے وہ لوگ ستاروں کی پوجا کرنے والے اور چاند کی پوجا کرنے والے اور سورج کی پوجا کرنے والے تھے۔

ان لوگوں نے کوشش کی کہ ابراہیم بھی ہماری طرح ستاروں اور چاند اور سورج کی پوجا کریں۔ ان لوگوں کا آپ کو ان کی پرستش کی طرف مائل کرنا آپ کے لئے بہت بڑا امتحان تھا۔ جس میں آپ

نے عظیم کامیابی حاصل کی۔

جب ان لوگوں نے آپ کو ستاروں کی پوجا کرنے کے لئے کہا، تو آپ نے ان کے کہنے پر غور کیا، کہ ان لوگوں کا کہنا کیسے درست ہے؟

”فلما جن علیہ اللیل رأى کو کبا قال هذا ربی فلما اقل قال لا احب الا فلین“

پھر جب ان پر رات کا اندھیرا آیا ایک تارادیکھا، بولے اسے میرا رب ٹھہراتے ہو، پھر جب وہ ڈوب گیا، بولے مجھے خوش نہیں آتے ڈوبنے والے۔

یعنی آپ نے ستارہ پرستوں کو دو ٹوک جواب دے دیا کہ یہ ڈوب جانے والے خدا نہیں بن سکتے۔ اس امتحان میں آپ نے عظیم کامیابی حاصل کی۔

چاند کی پوجا کرنے والوں نے آپ کو چاند کی پوجا کرنے کی دعوت دی، آپ نے ان کی دعوت پر چاند کو دیکھ کر کہا۔

”فلما رأى القمر بازغا قال هذا ربی فلما اقل قال لنن لم یهدنی ربی لا کونن من القوم الضالین“

پھر جب چاند چمکتا دیکھا بولے اسے میرا رب بتاتے ہو، پھر جب وہ ڈوب گیا، کہا اگر مجھے میرا رب ہدایت نہ کرتا تو میں بھی انہیں گمراہوں میں ہوتا۔

آپ نے چاند پرستوں کو بھی مایوس کر دیا، کہ تم چاہتے ہو کہ میں چاند کی پوجا کروں، کیا تمہیں معلوم نہیں کہ میرے رب نے مجھے ہدایت دے رکھی ہے۔ جسے رب نے ہدایت دے رکھی ہو وہ چاند کی پوجا کرے یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ سبحان اللہ اس امتحان میں بھی آپ کامیاب ہوئے۔

سورج کی پوجا کرنے والوں نے چاہا کہ ابراہیم بھی سورج کی پوجا کریں۔ انہوں نے بھی کوشش کی، آپ کو دعوت دی کہ تم بھی ہماری طرح سورج کی پرستش کرو۔

”فلما رأى الشمس بازعة قال هذا ربی هذا اکبر فلما اقلت قال یقوم انی برئ مما تشرکون“

پھر سورج جگمگاتا دیکھا بولے اسے میرا رب کہتے ہو، یہ تو ان سب سے بڑا ہے۔ پھر جب وہ

ڈوب گیا، کہا اے قوم میں بے زار ہوں ان چیزوں سے جنہیں تم شریک ٹھہراتے ہوں۔

سورج کی پوجا کرنے والے بھی ناکام ہو گئے۔ آپ نے امتحان میں عظیم کامیابی حاصل کر لی۔

کلمات سے مراد ذبح و لد:

سات ذی الحج گذر جانے پر رات کو خواب دیکھا کہ کوئی کہنے والا کہہ رہا ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ تمہیں بیٹا ذبح کرنے کا حکم دیتا ہے، آپ نے صبح اس پر تفکر کیا اور کچھ تردد میں رہے کہ کیا یہ اللہ تعالیٰ کا ہی حکم ہے۔ یا خواب فقط خیال تو نہیں۔ اسی وجہ سے آٹھ ذی الحج کا نام یوم الترویہ رکھا گیا۔ (سوچ و بچار کا دن) آٹھ تاریخ کا دن گذر جانے پر رات پھر خواب دیکھا صبح یقین کر لیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی حکم ہے۔ اسی نو ذی الحج کو یوم عرفہ (پہچاننے کا دن) کہا جاتا ہے۔

اس کے بعد آنے والی رات کو پھر خواب دیکھنے پر صبح اس پر عمل کرنے کا مصمم ارادہ کر لینے پر ہی دس ذی الحج کو یوم النحر (ذبح کا دن) کہا جاتا ہے۔

(کبیر)

(کبیر)

”ان الله تعالى جعل رؤيا الانبياء عليهم السلام حقا“

بے شک اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کے خوابوں کو حق بنایا یعنی ان کے خوابات سچے ہوتے ہیں، ان کو اپنے خوابوں پر عمل کرنا لازم ہوتا ہے۔

مطلب واضح ہے کہ بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم دے کر عظیم امتحان لیا گیا۔ لیکن آپ نے اسے بھی

پورا کیا۔

تفصیلی واقعہ سورۃ ”والصافات“ میں ان شاء اللہ آئے گا۔

کلمات سے مراد آگ:

ابراہیم علیہ السلام نے جب کفار کے بناوٹی خداؤں کو تباہ و برباد کر دیا، اور دلائل میں بھی ان پر غلبہ حاصل کر لیا، تو انہوں نے آپ سے انتقام لینے کا فیصلہ کر لیا اور سب سزاؤں سے سخت سزا تجویز کی، یعنی یہ کہ آپ کو آگ میں جلا دیا جائے حالانکہ آگ کا عذاب صرف اللہ تعالیٰ دے سکتا ہے۔ بندے

کے لئے جائز نہیں کہ کسی کو آگ کا عذاب دے۔ لیکن نمرود اور اس کی قوم نے آپ کو جلانے کی سزا دی اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر فرمایا:

﴿قَالُوا ابْنُوا لَهُ بُيُوتًا فَأَلْقُوهُ فِي الْجَحِيمِ﴾ (پ ۲۳ ع ۷)

وہ کہنے لگے اس کے لئے ایک عمارت بناؤ پھر اسے بھڑکتی آگ میں ڈال دو۔

یعنی ارد گرد بہت بڑی دیوار بنا کر اس کے درمیان آگ جلاؤ، پھر ابراہیم کو اس میں ڈال دو، ﴿قَالُوا حَرِّقُوهُ وَانصُرُوا آلِهَتَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ فَاعِلِينَ﴾ (پ ۲۷ ع ۵) بولے اس کو جلا دو اور اپنے خداؤں کی مدد کرو اگر تمہیں کرنا ہے۔

مکمل واقعہ تو اپنی جگہ پر ہی آتا ہے۔ یہاں تو صرف اتنا سمجھا جائے کہ انہوں نے آگ جلا کر آپ کو آگ میں ڈال دیا۔

کتنا بڑا امتحان، لیکن عظیم کامیابی کو ذرا دیکھئے، آپ کے پاس ہواؤں کا فرشتہ آیا عرض کرنے لگا مجھے آپ حکم دیں تو میں آگ کو ختم کر دوں۔ آپ نے فرمایا مجھے تمہاری امداد کی کوئی ضرورت نہیں ﴿حَسْبِيَ اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ﴾ میرا اللہ مجھے کافی ہے اور وہی بہتر کارساز ہے۔

آپ کے پاس جبرائیل علیہ السلام آئے اور عرض کیا کہ آپ کو میری امداد کی ضرورت ہو تو میں آپ کی امداد کروں، آپ نے فرمایا مجھے تمہاری امداد کی ضرورت نہیں، جبرائیل نے کہا اچھا تو پھر اپنے رب تعالیٰ سے ہی سوال کرلو، تو آپ نے فرمایا ”حسبی من سوالی علمہ بحالی“ وہ میرے حال کو جانتا ہے سوال کے بغیر ہی مجھے کافی ہے۔

کلمات سے مراد ہجرت:

﴿وَقَالَ إِنِّي ذَاهِبٌ إِلَىٰ رَبِّي سَيَهْدِينِ﴾ (پ ۲۳)

اور ابراہیم علیہ السلام نے کہا میں جا رہا ہوں، جہاں میرے رب نے حکم دیا ہے وہی میری راہنمائی فرمائے گا۔

یعنی آپ کو ہجرت کا حکم دے کہ آزمایا گیا تو آپ نے ہجرت کر کے آزمائش میں کامیابی حاصل

کی، حالانکہ وطن کو چھوڑنا بہت مشکل کام ہے۔

ابتدائی طور پر آپ نمرودی قوم سے ہجرت کر کے اپنے چچا ہاران کے پاس حران میں آ گئے، ہاران نے ابراہیم علیہ السلام کی نیک بختی دیکھ کر اپنی بیٹی سارہ کا نکاح آپ سے کر دیا۔ سارہ بہت ہی خوبصورت لڑکی تھی، مردوں میں حضرت یوسف اور عورتوں میں حضرت سارہ بہت حسین ہوئے، بلکہ حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنی دادی حضرت سارہ کے حسن سے ہی حسن ملا تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے وہاں بھی اپنا سلسلہ تبلیغ جاری رکھا، اس لئے آپ کے چچا ہاران نے بھی آپ کو گھر سے نکال دیا۔ آپ ہجرت کر کے فلسطین میں تشریف لے گئے۔

کلمات سے مراد شرائع اسلام:

تیس شرائع اسلام سے آپ کو آزمایا گیا، آپ ان پر پورے اترے۔

ان میں سے دس کا ذکر سورۃ براءۃ میں ہے:

﴿التَّائِبُونَ الْعَبَدُونَ الْحَمِيدُونَ السَّائِحُونَ الرُّكَّعُونَ السَّجِدُونَ الْأَمْرُونَ بِالْمَعْرُوفِ
وَالنَّاهُونَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحَفِظُونَ لِحُدُودِ اللَّهِ ۖ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ﴾

توبہ والے، عبادت والے، حمد کرنے والے، روزے والے، رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے، اچھے کاموں کا حکم دینے والے، برے کاموں سے روکنے والے، اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والے، اور خوشخبری دو مومنوں کو۔

اور دس کا ذکر احزاب میں ہے:

﴿إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقَنَاتِ وَالْقَنَاتِ وَالصَّادِقِينَ
وَالصَّادِقَاتِ وَالصَّابِرِينَ وَالصَّابِرَاتِ وَالْخَاشِعِينَ وَالْخَاشِعَاتِ وَالْمُتَصَدِّقِينَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ
وَالصَّائِمِينَ وَالصَّائِمَاتِ وَالْحَفِظِينَ فُرُوجَهُمْ وَالْحَفِظَاتِ وَالذَّكِرِينَ اللَّهَ كَثِيرًا وَالذَّكِرَاتِ
أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا﴾

بے شک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں، اور ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں، اور فرمانبردار مرد اور فرمانبردار عورتیں، اور سچے مرد اور سچی عورتیں، اور صبر والے مرد اور صبر والی عورتیں، اور عاجزی کرنے والے مرد اور عاجزی کرنے والی عورتیں، اور خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں، اور روزے رکھنے والے مرد اور روزے رکھنے والی عورتیں۔ اور اپنی پارسائی نگاہ والے مرد، اور نگاہ رکھنے والی عورتیں، اور اللہ کو بہت یاد کرنے والے مرد اور یاد کرنے والی عورتیں۔ ان سب کے لئے اللہ نے بخشش اور بڑا ثواب تیار کر رکھا ہے۔

اور دس کا ذکر سورۃ مومنون اور معارج میں ہے:

﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ☆ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ ☆ وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ ☆ وَالَّذِينَ هُمْ لِلزَّكَاةِ فَاعِلُونَ ☆ وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ ☆ إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ ☆ فَمَنْ ابْتَغَىٰ وَرَاءَ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْعَادُونَ ☆ وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمْتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ ☆ وَالَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ ☆﴾

بے شک کامیاب ہوئے ایمان والے جو اپنی نماز میں گڑگڑاتے ہیں، اور وہ جو کسی بیہودہ بات کی طرف التفات نہیں کرتے۔ اور وہ کہ زکوٰۃ دینے کا کام کرتے ہیں۔ اور وہ جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ مگر اپنی بیبیوں یا شرعی باندیوں پر جو ان کے ہاتھ کی ملک ہیں کہ ان پر کوئی علامت نہیں، جو ان دو کے سوا کچھ اور چاہے وہی حد سے بڑھنے والے ہیں۔ اور وہ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کے رعایت کرتے ہیں۔ اور وہ جو اپنی نمازوں کی نگہبانی کرتے ہیں۔

یعنی ان تیس چیزوں کا حکم اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو دیا تو آپ نے ان کو پورا کر کے کامیابی حاصل کی۔

کلمات سے مراد مناسک حج:

”وَإِذَا كَلَفَ إِبْرَاهِيمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ رَبَّهُ بِمَنَاسِكَ الْحَجِّ أَيْ بِمَوَاضِعِ الْعِبَادَةِ الْمَتَعَلِّقَةِ بِالْحَجِّ وَإِقَامَةِ مَا يَلِيقُ بِكُلِّ مَوْضِعٍ مِنَ الْعِبَادَةِ كَالطَّوَافِ وَالسَّعْيِ وَرَمِي الْجِمَارِ وَالْأَحْرَامِ وَالْوُقُوفِ بِعَرَفَةَ وَمِزْدَلِفَةَ وَغَيْرِهِ ذَلِكَ فَادَاهُن تَامَات كَامَلَات مِنْ غَيْرِ نَقْصَانٍ“ (شیخ زادہ)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آپ کے رب نے مناسک حج کی تکلیف دی یعنی وہ عبادت جو حج سے متعلق ہے اس کے مقامات کے متعلق حکم دیا کہ ہر فعل کو اسی کے مناسب مقام میں ادا کیا جائے، طواف اور سعی اور خمرات کو کنکریاں مارنے، اور احرام اور مقام عرفات پر ٹھہرنے، اور مزدلفہ میں رات گزارنے، وغیرہا کا حکم دیا آپ نے ان تمام عبادات کو رب تعالیٰ کے حکم کے مطابق کامل طور پر ادا کیا۔ ہر ایک کو اپنے اپنے محل میں ادا کیا، ان میں کوئی نقص نہیں آنے دیا۔

یعنی ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ان کاموں کے مکمل طور پر ادا کرنے کا حکم دے کر آزمایا آپ اس آزمائش میں پورے اترے۔

کلمات سے مراد دس سنن:

یہی وہ چیزیں ہیں جن کو کہا جاتا ہے یہ سنت ابراہیمی ہیں۔

ان دس چیزوں میں پانچ کا تعلق سر سے ہے۔ مونچھوں کا کٹنا، کلی کرنا، ناک میں پانی ڈالنا، مسواک کرنا، اور سر کے بالوں میں مانگ نکالنا۔

اور پانچ کا تعلق باقی جسم سے ہے۔ ناخن کاٹنا، زیر ناف بال مونڈنا، ختنہ کرنا، بغل کے بال اکھیڑنا، اور پیشاب پاخانہ کے مقام کو دھونا، یعنی استنجاء کرنا، ان کی تفصیل ان شاء اللہ قریب ہی ذکر کی جائے گی۔

تنبیہ: علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا ”وبالعشر التي هي من سننه“ کہ کلمات

سے مراد یہ بھی ہے کہ آپ کو دس چیزوں سے آزمایا جو آپ کی سنتیں ہیں۔ اسی کے مطابق راقم نے عنوان قائم کر دیا ہے۔ ورنہ یہی دس چیزیں خود حضرت ابراہیم علیہ السلام پر فرض تھیں، البتہ ہمارے لئے سنت ہیں۔ یعنی نبی کریم ﷺ نے بھی ان پر عمل کیا، اس لئے ہمارے لئے سنت مصطفیٰ ﷺ بھی ہیں، اور سنت ابراہیمی بھی ہیں۔

اس کو یوں ہی سمجھیں جیسا کہ نبی کریم ﷺ کے لئے تہجد کی نماز واجب تھی اور ہمارے لئے مستحب ہے، ہم اسے اپنے حق میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ تہجد کی نماز نبی کریم ﷺ کی سنت (غیر مؤکدہ) ہے۔

شاندار تحقیق:

اسی مسئلہ کی غزالیؒ دوراں حضرت علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمہ اللہ نے شاندار تحقیق فرمائی ہے۔ اسی کو اپنی اس کاوش کا حصہ بنا رہا ہوں آئیے دیکھئے کیا خوب فرمایا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”دس چیزیں فطرت سے ہیں“ اسی حدیث کے ہم معنی حدیث حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ دس قسم کی طہارتوں سے اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی آزمائش فرمائی۔

اکثر علماء کا قول یہ ہے کہ یہ سب کام ابراہیم علیہ السلام پر فرض تھے ہمارے لئے سنت ہیں۔ تفسیر خازن میں ہے۔ علماء نے فرمایا ”فطرة“ کے معنی سنت ہیں یعنی یہ سب کام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی سنتوں میں سے ہیں۔

بعض نے کہا ”فطرة“ سے مراد ملت ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ ”فطرة“ سے طریقہ مراد ہے۔

(خازن ص ۷۹ ج ۱)

علامہ نووی نے شرح مسلم میں اسی حدیث کے تحت فرمایا کہ ”فطرة“ دین کو کہتے ہیں۔

(مسلم ص ۱۲۸ ج ۱)

تنبیہ ضروری: ”فطرة“ کے بیان میں جو چار قول ہم نے نقل کئے ہیں وہ سب متقارب المعنی (قریب معنی والے) ہیں۔

ان میں تعارض سمجھنا صحیح نہیں۔ البتہ یہ بات ضرور سمجھنے کے لائق ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو جن کاموں سے آزمایا گیا وہ سب ”فطرة“ سے ہیں۔ اور انبیاء کرام کو طبائع مقدسہ فطری امور سے مانوس رہتی ہیں۔ بالخصوص ایسے امور جن کا تعلق کمال طہارت و نظافت سے ہو اور حسن صورت و سیرت کا ان سے گہرا تعلق ہو۔

ایسی صورت میں یہ بات بعید از فہم ہو جاتی ہے کہ سب سے پہلے ابراہیم علیہ السلام نے یہ دس کام کئے یعنی ان سے پہلے کسی نبی یا رسول نے ان کاموں میں سے کوئی کام نہیں کیا، نہ لبس ترشوائیں، نہ پانی سے استنجاء کیا، نہ ناف کے نیچے بال صاف کئے، نہ کلی کی، نہ ناک میں پانی ڈالا، نہ ناخن کٹوائے، ایک

ادنی مسلمان بھی جانتا ہے کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام طاہری و باطنی پاکیزگی سے مصطف ہوئے ہیں۔ ان کی طبیعتیں عام لوگوں کے طبائع سے بالکل مختلف ہوتی ہیں۔ ان میں اعلیٰ درجہ کی طہارت و نظافت پائی جاتی ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ ان پاکیزہ خصلتوں سے محروم رہے ہوں؟

لہذا یوں کہنا چاہئے کہ ہر نبی ان خصال حمیدہ سے متصف تھا، اور اس نے اپنی طبیعت مقدسہ کے تقاضے کے مطابق طہارت و نظافت کے یہ سب کام کئے مگر ان خصال پر عمل کرنا ان میں سے کسی پر فرض نہ تھا، حکمت ابتلاء کے لئے ان امور خاصہ کی فرضیت سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ہوئی اور وہ ان فرائض پر اس خوبی کے ساتھ عمل پیرا رہے کہ آزمائش میں کامیاب ہو گئے ان سے پہلے کسی نبی کی آزمائش ان امور کے ساتھ نہ ہوئی تھی۔

یہ نہیں کہ ان سے کسی نبی کے عمل میں یہ پاکیزہ خصال نہ پائے گئے ہوں۔ خصال حمیدہ کے اعتبار سے ابراہیم علیہ السلام اور ان سے پہلے انبیاء کرام میں صرف اتنا فرق تھا کہ ابراہیم علیہ السلام ابتلاء کے بعد بطور فرض یہ کام کرتے تھے، اور ان سے پہلے انبیاء علیہم السلام محض اپنی طبیعت مقدسہ کے تقاضے سے ان پاکیزہ کاموں کو بجالاتے تھے۔

(النبیان مع الیاء للکاظمی)

ابراہیم علیہ السلام سے تمام امتحان لئے گئے:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے امتحان کے متعلق جتنے اقوال کلمات کے متعلق ذکر کئے گئے ہیں، وہ تمام امتحانات ہی آپ سے لئے گئے جن پر آپ پورے اترے۔

”کلمات“ کی تفسیر میں مختلف اقوال کو ذکر کرنے کے بعد علامہ قرطبی رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں

”وهذه الاقوال ليست بمتناقضة لان هذا كله مما ابتلى به ابراهيم عليه السلام“

(قرطبی)

ان تمام اقوال میں کوئی تعارض نہیں، کیونکہ ان تمام چیزوں سے ابراہیم علیہ السلام کو آزمایا گیا۔

ابراہیم علیہ السلام کے امتحانات قبل از نبوت ہوئے یا بعد از نبوت؟

”قيل كان قبل النبوة بدليل قوله في سياق الآية اني جاعلك للناس اماما“

بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہ امتحان نبوت سے پہلے تھے، اس لئے کہ بعد میں آ رہا ہے کہ ”بیشک میں بنانے والا ہوں تمہیں لوگوں کا امام“ جب امتحان سبب ہے آپ کو امامت کے عطاء کرنے کا تو سبب پہلے ہوگا۔ اور مسبب بعد میں ہوگا۔

”وقیل بل کان هذا الابتلاء بعد النبوة لان التكليف لا يعلم الا من جهة الوحي الالهي وذلك بعد النبوة“

اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ آپ کے یہ امتحان نبوت کے بعد تھے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آنے کے بعد ہی آپ کو ان امور کی تکلیف دی جاسکتی تھی، اور وحی کا آنا یقیناً نبوت کے بعد ہوتا ہے۔

شائد ارمحاکمہ:

”والصواب ان فسر الابتلاء بالکوکب والقمر والشمس کان ذلك قبل النبوة وان فسر بما وجب عليه من شرائع الدين کان ذلك بعد النبوة“

صحیح بات یہ ہے کہ ستارے اور چاند اور سورج کا امتحان نبوت سے پہلے تھا اور باقی امور شرعیہ جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ ان کا امتحان بعد از نبوت کے تھا۔

(حاجان)

راقم کا موقف:

راقم کا موقف یہ ہے کہ جب امتحان صرف اس لئے تھا کہ لوگوں کو آپ کی شان کا پتہ چل جائے کہ آپ کو منازل رفیعہ حاصل ہیں تو واقعی آپ اس قابل ہیں کہ آپ اتنی عظیم آزمائشوں میں پورے اترے ہیں۔

امتحان لینے کا یہ مقصد ہی نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ کو پتہ نہیں تھا تو امتحان لے کر آپ کی شان کا پتہ چلایا کہ اس قابل ہیں اور یہ بات بھی واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ منصب نبوت کے لئے امتحان نہیں لیا کرتا، بلکہ وہ بغیر امتحان کے ہی جانتا ہے کہ یہ منصب نبوت کے قابل ہے رب تعالیٰ کا اپنا ارشاد گرامی ہی اس پر واضح دلیل ہے۔ ”اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ“ اللہ تعالیٰ سب سے زیادہ جانتا ہے کہ منصب نبوت کے قابل کون ہے۔

پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ﴿وَإِذِ ابْتَلَىٰ﴾ پر مرتب ﴿فَاتَمَّهَنَّ﴾ ہے۔ یہی مقصد واضح ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام کو ان کے رب نے چند باتوں سے آزمایا، تو انہوں نے ان کو پورا کیا۔ امتحان کسی صورت میں بھی منصب نبوت عطاء کرنے کا سبب نہیں، اور بظاہر عربی کا کوئی لفظ بھی ایسا نہیں جو اس ترتب پر دلالت کرے۔

قَالَ أَنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا ط قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ
کہا بے شک میں بنانے والا ہوں تمہیں لوگوں کا امام، کہا اور میری اولاد سے، کہا نہیں پہنچتا میرا وعدہ ظالموں کو۔

امام لغوی معنی کے لحاظ سے عام ہے:

”والامام هو الذي يؤتم به“ امام وہ ہے جس کے اقتداء کی جائے۔ (خازن)
نیکی میں کسی کی اقتداء کی جائے یا برائی میں کسی کی اقتداء کی جائے وہ امام ہی ہے۔
رب تعالیٰ نے حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب اور حضرت لوط علیہم السلام کا پہلے ذکر کیا، اس کے بعد فرمایا۔
”وجعلناهم أئمة يهدون بأمرنا و أوحينا اليهم فعل الخيرات و اقام الصلوة و ايتاء الزكوة و كانوا لنا عابدين“

اور ہم نے انہیں امام بنایا کہ ہمارے حکم سے ہدایت دیتے ہیں۔ اور ہم نے وحی کی ان کی طرف اچھے کام کرنے کی اور نماز قائم کرنے کی اور زکوٰۃ دینے کی، اور وہ ہماری بندگی کرتے ہیں۔
یعنی اس مقام پر ”ائمۃ“ کا اطلاق انبیاء کرام پر ہے، اور امامت سے مراد نبوت ہے۔

☆ اور دوسرے مقام پر، پہلے فرعون اور ہامان کا ذکر کیا، اس کے بعد ارشاد فرمایا ﴿وَجَعَلْنَا هُمْ أَيْمَةً يَدْعُونَ إِلَى النَّارِ وَيَوْمَ الْقِيَمَةِ لَا يُنصَرُونَ﴾ اور ہم نے بنایا ہے ان کو امام جو آگ کی طرف بلا تے ہیں، اور قیامت کے دن ان کی امداد نہیں کی جائے گی۔ اس آیت میں

”ائمہ“ کا ذکر کفار پر ہے، اور امامت سے مراد کفر کی طرف راہنمائی ہے۔

☆ خلفاء کو بھی امام کہا گیا ہے۔ ”لأنهم رتبوا في المحل الذي يجب على الناس

اتباعهم وقبول قولهم واحكامهم“

اس لئے کہ وہ بھی جو احکام نافذ کرتے ہیں جب وہ شریعت کے مطابق ہوں تو لوگوں پر لازم ہوتا ہے کہ ان کے اقوال کو اور احکام کو قبول کریں۔

☆ والقضاة والفقهاء ايضا ائمة لهذا المعنى “ اسی معنی کے لحاظ پر قاضیوں اور فقہاء کرام

کو بھی امام کہا گیا ہے کہ ان کے اقوال اور احکام پر لوگوں کو عمل کرنا ضروری ہوتا ہے۔

☆ اسی وجہ سے جو شخص نماز پڑھائے اسی بھی امام کہا جاتا ہے کیونکہ جو شخص اس کی نماز میں داخل ہو اس پر لازم ہو جاتا ہے۔ کہ وہ اس کی اقتداء کرے۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔

”انما جعل الامام اماما ليؤتم به فاذا ركع فاركعوا واذا سجد فاسجدوا ولا تختلفوا على امامكم“

امام کو امام اس لئے بنایا جاتا ہے، کہ اس کی اقتداء کی جائے، جب وہ رکوع کرے تو تم بھی رکوع کرو، اور جب وہ سجدہ کرے تم بھی سجدہ کرو، اور اپنے امام کی مخالفت نہ کرو۔

ابھی تک جو بحث ذکر کی گئی ہے اس سے یہ واضح ہوا کہ امام عام ہے خواہ وہ سیدھی راہ کی ہدایت کرے اور لوگ اس کی اقتداء کریں، یا غلط راہ کی ہدایت کرے کہ لوگ اس کی اقتداء کریں، لیکن مطلقاً امام سے مراد سیدھی راہ کی ہدایت کرنے والا ہی ہے یہ اس طرح ہے جیسا کہ۔

”اسم الا له لا يتناول الا المعبود الحق فاما المعبود الباطل فانما يطلق عليه اسم الا له مع القيد“

”الہ“ کا لفظ معبود حق پر مطلقاً بولا جاتا ہے، لیکن اگر اس کے ساتھ کوئی قید بڑھادی جائے تو معبود باطل پر بولا جاتا ہے۔ جیسا کہ ”فانظر الى الهك الذي ظلمت عليه عاكفا“ اور دیکھ اپنے اس معبود کی طرف جس کے سامنے تو دن بھی آسن مار رہا ہے۔ اس آیت میں سامری کو خطاب ہے، اسی کے بنائے ہوئے پچھڑے معبود کا ذکر ہے، لیکن مطلقاً ”الہ“ ذکر نہیں، بلکہ مقید طور پر ذکر ہے۔ تو اپنے الہ کو دیکھ۔

زیر بحث آیت میں امام سے مراد کیا؟

جب ثابت ہو گیا کہ امام کا لفظ تو مطلقاً راہنمائی کرنے والوں کو شامل ہے جن کی اقتداء کی جائے، اور یہ بات بھی ثابت ہے کہ انبیاء کرام امامت کا اعلیٰ مرتبہ رکھتے ہیں۔

”وجب عمل اللفظ ههنا عليه“ تو واجب ہے کہ اس آیت میں ”امام“ سے مراد، نبی ہی ہے۔

اور وجہ یہ بھی واضح ہے کہ رب تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں امامت کا ذکر مقام احسان میں کیا ہے۔ اور احسان میں نعمت عظمیٰ کا ذکر ہی ضروری ہے، وہ عظیم نعمت نبوت ہے۔ ”فوجب حمل هذه الامامة على النبوة“ اس لئے ضروری ہے کہ اس آیت کریمہ میں امامت سے مراد نبوت ہی لی جائے۔

(ماخوذ از کبیر)

”والمراد بالامامة ههنا النبوة او ما هو اعم منه اعنى من يؤتم به ويجب اطاعته وليس المراد به السلطنة والامامة بالمعنى الذى اخترعه الامامية وليس له فى اللغة والشرع اصل“

اس آیت کریمہ میں امامت سے مراد نبوت ہے، یا اس سے عام معنی مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ امام سے مراد اس مقام میں وہ امام ہے جس کی اقتداء کی جائے۔

امامت سے مراد نہ سلطنت ہے، اور نہ ہی وہ خاص امامت کا معنی مراد ہے جو امامیہ (یعنی شیعہ حضرات) نے گھڑ لیا ہے اس معنی کا لغت اور شرع میں کوئی وجود نہیں۔ (مظہری)

ابراہیم علیہ السلام کی امامت عامہ کا تقاضا نبوت:

رب تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ ﴿لِلنَّاسِ اِمَامًا﴾ اس پر دلالت کرتا ہے کہ آپ کو تمام لوگوں کا امام بنایا گیا تھا۔ جس ذات کا یہ مقام اس کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مستقل رسول ہو، ”لانه لو كان تبعاً لرسول آخر لكان ماموماً لذلك الرسول لا اماماً له فحينئذ يبطل العموم“ اس لئے کہ اگر وہ کسی اور رسول کا تابع ہو تو یہ ماموم (مقتدی) ہوگا۔ امام وہ دوسرا ہوگا۔ اسکی امامت عامہ باطل ہوگی۔ لہذا واضح ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام کی امامت عامہ آپ کی نبوت کا تقاضا کرتی ہے۔

(کبیر)

نبی کا معصوم ہونا ضروری ہے:

رب تعالیٰ نے جب نبی کو امام کہا ہے اور یہ بھی واضح ہے کہ امام وہ ہوتا ہے جس کی اقتداء کی جائے تو اس سے واضح ہو گیا کہ نبی کا معصوم ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ اگر نبی گنہگار ہو جائے۔ "فیلزم ان یجب علینا فعل المعصیة" تو ضروری ہوگا کہ ہم بھی معصیت میں اس کی اقتداء کریں کیونکہ نبی تو امام ہے۔ لیکن معصیت میں اقتداء کرنا حرام اور محال ہے تو پتہ چلا کہ نبی کا معصوم ہونا ضروری ہے۔

قَالَ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِي : (کہا اور میری اولاد میں سے) رب تعالیٰ نے جب فرمایا کہ میں تمہیں امام بنانے والا ہوں، تو ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا ﴿وَمِنْ ذُرِّيَّتِي﴾ يدل علی انه علیہ السلام طلب ان یكون بعض ذریئته ائمة للناس

اور میری اولاد میں سے۔ یہاں "من" تبعیض کے لئے ہے، گویا کہ آپ نے دعاء ہی یہ کی کہ اے اللہ میری اولاد میں سے بھی بعض کو منصب نبوت عطاء کرنا، آپ کی اس دعاء کو کامل طور پر قبول کر لیا گیا کہ آپ کی اولاد میں سے مؤمنین جو نبوت کے لائق تھے ان کو نبی بنالیا گیا۔ ان میں سے جلیل القدر حضرات یہ ہیں۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب، حضرت یوسف، حضرت موسیٰ، حضرت ہارون، حضرت داؤد، حضرت سلیمان، حضرت ایوب، حضرت یونس، حضرت زکریا، حضرت یحییٰ، حضرت عیسیٰ، اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہم وسلم۔

نبی کریم ﷺ آپ کی اولاد میں سے ہیں۔ جو افضل الانبیاء، افضل الائمہ ہیں۔ (مکبر)

یہ بھی خیال رہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد آنے والے سارے انبیاء کرام ہی آپ کی اولاد سے ہیں۔

قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ : کہا نہیں پہنچتا میرا عہد ظالموں کو۔

جب ابراہیم علیہ السلام نے رب کے حضور عرض کیا کہ میری اولاد میں سے بھی بعض کو نبی بنانا تو رب تعالیٰ نے بھی آپ کی دعاء کو قبول کر لیا۔ اور ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ میرا یہ وعدہ ظالموں کو حاصل نہیں ہوگا۔
”لَا يَكُونُ جَوَابًا عَنْ ذَلِكَ السُّوَالِ إِلَّا إِذَا كَانَ الْمُرَادُ بِهَذَا الْعَهْدِ تِلْكَ الْأَمَامَةُ“

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب اولاد میں سے بعض کی نبوت کا سوال کیا تو آپ کو جواب جب یہ دیا گیا ﴿لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ﴾ تو اسی سے پتہ چل گیا کہ عہد سے مراد امامت یعنی نبوت ہے، تا کہ رب تعالیٰ کا جواب آپ کے سوال کے مطابق ہو۔ (کبیر)

نکتہ: ﴿لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ﴾ اس پر دلالت کر رہا ہے کہ رب تعالیٰ نے آپ کو یہ بتا دیا کہ آپ کی بعض اولاد کو نبی بنا دیا جائے گا، کیونکہ اگر یہ مطلب نہ ہوتا تو جواب صرف ”لا“ ہوتا یا جواب یہ ہوتا ”لَا يَنَالُ عَهْدِي ذَرِيَّتِكَ“ کہ میرا وعدہ تمہاری اولاد کو نہیں پہنچے گا۔

لیکن یہ جواب نہیں دیا گیا، بلکہ کہا گیا کہ ”میرا وعدہ ظالموں کو نہیں پہنچے گا“ تو واضح کر دیا کہ غیر ظالم جو منصب رسالت و نبوت کے اہل ہوں گے ان کو ضرور نبی بنا دوں گا۔ (کبیر)

فائدہ جلیلہ :

یہاں مقام توجہ یہ ہے۔ ”افما كان ابراهيم عليه السلام عالما بان النبوة لا تليق بالظالمين قلنا بلى“ کہ ابراہیم علیہ السلام کو کیا یہ معلوم تھا کہ نبوت ظالموں کو نہیں مل سکتی یا آپ کو علم نہیں تھا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ علم حاصل تھا، کہ نبوت ظالموں کو نہیں مل سکتی اور یہ عقل کا تقاضا ہے کہ جب عام آدمی کو یہ پتہ ہے کہ نبی ظالم نہیں ہو سکتا تو نبی کو یہ علم نہ ہو، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

اب اس پر بظاہر یہ سوال ہوتا ہے کہ آپ نے رب تعالیٰ سے مطلق اولاد کا سوال ہی کیوں کیا ہے۔ یہ سوال کیوں نہیں کیا کہ اے اللہ میری اولاد سے مومنوں کو نبوت عطاء کر۔

تو اس کا جواب یہ ہے۔ ”ولکن لم یعلم حال ذریعہ“ کہ آپ نے سوال ہی بعض اولاد کے متعلق کیا، لیکن آپ نے اس طرف توجہ نہ کی کہ میری اولاد میں سے بعض ظالم بھی ہوں گے۔
تو رب تعالیٰ نے بیان فرمادیا کہ آپ توجہ فرمائیں، آپ کی اولاد میں سے بعض ظالم بھی ہوں گے، ظالموں کو میرا وعدہ نبوت نہیں پہنچے گا۔
(از کبیر)

خیال رہے کہ ”لم یعلم“ کا معنی ہے ”لم یلتفت لیعلم“ آپ نے توجہ نہیں فرمائی کہ جانتے۔

شیعہ اور امامت:

شیعہ حضرات کا قول یہ ہے کہ کوئی امام اس وقت تک امام نہیں ہو سکتا جب اس کی امامت پر نص نہ آئے اللہ تعالیٰ بیان فرمائے کہ یہ امام ہے تو وہی امام ہو سکتا ہے۔ اس آیت کریمہ سے بھی یہی سمجھا آیا۔
اور ﴿إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً﴾ سے بھی یہی سمجھا آتا ہے کہ منصب خلافت بغیر نص کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ ہم کہتے ہیں یہ غلط ہے، کیونکہ اس آیت میں امامت سے مراد ہی نبوت ہے۔ شیعہ حضرات کی امامت مراد ہی نہیں۔ اگر ہم تسلیم کر ہی لیں کہ اس آیت میں امامت سے مراد مطلق امامت ہے تو ہم کہیں گے کہ آیت تو طریق امامت ثابت کر رہی ہے۔ اس میں تو کوئی نزاع نہیں۔

”انما النزاع فی انه هل تثبت الامامة بغیر النص و لیس فی هذه الآیة تعرض لهذه المسئلة لا بالنفی ولا بالاثبات“

نزاع اس بات میں ہے کہ نص کے بغیر امامت ہمارے نزدیک ثابت ہو سکتی ہے۔ شیعہ کے نزدیک نہیں۔ اس آیت میں اس مسئلہ کی نفی یا اثبات کو بیان ہی نہیں کیا گیا۔
(کبیر)

شیعہ حضرات کی طرف سے اعتراض:

حضرت ابو بکر صدیق و حضرت عمر فاروق و حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کی خلافتوں پر انکے اعتراض یہ ہیں کہ یہ لوگ کفر سے حالت ایمان کی طرف آئے ہیں۔ کافر ظالم ہوتا ہے، معصوم نہیں ہوتا۔ جب رب تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میرا وعدہ ظالموں کو نہیں پہنچتا تو واضح ہوا کہ یہ لوگ امامت کے مستحق نہیں تھے۔

جواب: جب پہلے واضح طور پر بیان کیا جا چکا ہے کہ اس آیت میں ”امامة“ سے مراد ”نبوة“ ہے تو ان حضرات کی خلافت پر اس آیت کریمہ سے اعتراض کا مقصد ہی اپنی جہالت کا اظہار کرنا ہے۔

یہ صرف نبی کے لئے ضروری ہے کہ وہ نبوت سے پہلے بھی گناہوں سے پاک ہو، خلیفہ کے لئے یہ حکم ثابت کرنا درست نہیں۔

دوسرا جواب: ”ان التائب عن الکفر لایسمی کافرا“ جو شخص کفر سے توبہ کر لے اسے پھر بھی کافر کہنا اور ظالم کہنا ہی ظلم ہے۔ مؤمن کو کافر کہنے والا اپنی جان پر ظلم کر رہا ہے اور اپنی عاقبت برباد کر رہا ہے۔

اسی طرح ”والتائب عن المعصية لایکون عاصیا“ گناہوں سے توبہ کرنے والا عاصی (گنہگار) نہیں رہتا۔ رب تعالیٰ نے جو ارشاد فرمایا ﴿وَلَا تَرْکُنُوا إِلَى الذِّینَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّکُمُ النَّارُ﴾ ظالموں کی طرف میلان نہ کرو تمہیں آگ مس کرے گی۔ اس آیت میں جو ظالموں کی طرف میلان کرنے سے منع کیا گیا، اور اگر اس میلان سے انسان باز نہ آئے تو وہ جہنم کے عذاب کا مستحق ہوگا، اس بیان کا مطلب بھی یہ ہے۔ ”فانه نهی عن الکرکون الیهم حال اقامتهم علی الظلم“ کہ مومنوں کو ظالموں کی طرف میلان کرنے سے روکا گیا ہے، کہ جب تک وہ ظلم پر قائم ہیں اس وقت تک ان کی طرف میلان نہ کرو۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی توبہ کے بعد بھی تم ان کی طرف میلان نہیں کر سکتے، اور توبہ کے بعد وہ ظالم ہی رہیں گے۔

اور رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿مَا عَلَی الْمُحْسِنِينَ مِنْ سَبِيلٍ﴾ (احسان کرنے والوں پر کوئی گرفت نہیں) اس کا مطلب بھی یہ ہے، ”ما اقاموا علی الاحسان“ جب تک وہ احسان پر قائم ہیں۔ اس کا بھی یہ مطلب نہیں کہ کوئی شخص بد قسمتی سے احسان کو چھوڑ دے، معصیت کا مرتکب ہو جائے تو پھر اس کی گرفت نہیں۔

غرضیکہ نیک لوگوں کیلئے جس اجر و ثواب کا ذکر ہے اس کا تعلق ان کا اس نیکی پر قائم رہنے سے

ہے، اگر وہ پہلی کو چھوڑ کر معصیت کے مرتکب ہو جائیں تو اس کے بعد ان کا وہ مرتبہ موجود نہیں رہے گا۔

اسی طرح ظالموں کے لئے بھی اللہ تعالیٰ نے انعام سے محرومیت کا جو وعدہ کر رکھا ہے اس کا تعلق بھی ان کے ظلم کے دور سے ہے۔ جو شخص توبہ کر لے جب اس کو ظالم کہنا ہی گناہ ہے وہ ظالم رہتا ہی نہیں تو اس کو رب تعالیٰ کے انعام سے محروم قرار دینا جہالت نہیں تو اور کیا ہے۔ حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔

(ماہود از کبیر)

مسئلہ: فاسق حالت فسق میں خلیفہ (مسلمانوں کا حاکم) بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا، البتہ بعد میں فاسق ہو جائے تو دیکھا جائے اگر اس کا فسق اس کی ذات تک محدود ہے دوسرے لوگوں کو شریعت سے دور نہیں کیا جا رہا تو وہ خود بخود معزول تو نہیں ہوا البتہ اسے خلافت کو چھوڑ دینے کے متعلق کہا جائے، اور اگر اس کا فسق دوسروں کو بھی غرق کر رہا ہے۔ ان کو بھی فاسق بنا رہا ہے۔ وہ شرعاً خود بخود معزول ہو جاتا ہے۔ اگر خود بخود اپنے عہدہ سے نہ ہٹے تو مسلمان اسے خود بخود ہٹا دیں۔

اس مسئلہ کی زیادہ تفصیل پہلے ﴿إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً﴾ کی وضاحت کے ضمن میں گزر چکی ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک:

بعض لوگوں نے یہ کہا تھا کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک یہ ہے۔

”انہ يجوز كون الفاسق اماما و خليفة ولا يجوز كون الفاسق قاضيا“

کہ فاسق کا امام اور خلیفہ ہونا جائز ہے۔ اور فاسق کا قاضی بننا جائز نہیں۔

”وهذا خطأ ولم يفرق ابوحنيفة بين الخليفة والحاكم في ان شرط كل واحد منهما العدالة وكيف يكون خليفة وروايته غير مقبولة واحكامه غير نافذة“

ابوبکر رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام صاحب کی طرف یہ منسوب کرنا اور یہ کہنا کہ ان کا یہ مسلک ہے۔ ”یہ غلط ہے“ امام صاحب رحمہ اللہ نے خلیفہ و حاکم اور قاضی کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا، بلکہ آپ کے نزدیک ہر ایک کا عادل ہونا مشروط ہے۔ جو شخص عادل نہیں وہ خلیفہ نہیں بن سکتا، اس کی

روایت مقبول نہیں اور اس کے احکام نافذ نہیں۔

اس مسئلہ پر ائمہ اور علماء کا اتفاق ہے:

”ثبت بدلالة الآية بطلان امامة الفاسق قال عليه السلام“ ”لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق“ ”ودل ايضا على ان الفاسق لا يكون حاكما، وان احكامه لا تنفذ اذا ولي الحكم، وكذلك لا تقبل شهادته ولا خبره اذا اخبره اذا اخبر عن النبي ﷺ، ولا فتياه اذا اُفتي، ولا يقدم للصلوة، وان كان هو بحيث لو اقتدى به فانه لا تفسد صلوته“

اس آیت کریمہ سے یہ ثابت ہوا کہ فاسق کی امامت (نبوت) باطل ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔
”خالق کی نافرمانی کر کے مخلوق کی طاعت و فرمانبرداری نہ کی جائے۔“

اسی آیت سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ فاسق حاکم نہیں بن سکتا، اور نہ ہی اس کا کوئی حکم جاری ہو سکتا ہے۔ مطلب واضح ہے کہ اگر کوئی فاسق زبردستی حاکم بن جائے تو اس کے احکام کو تسلیم نہ کیا جائے۔

اسی طرح فاسق کی گواہی قبول نہ کی جائے۔ اور اگر فاسق نبی کریم ﷺ کی طرف سے کوئی خبر دے تو اسے قبول نہ کیا جائے۔ اور فاسق اگر کوئی فتویٰ دے تو اس کے فتویٰ کو قبول نہ کیا جائے، اور فاسق کو نماز کیلئے امام بنا کر آگے نہ کیا جائے، ہاں اگر فاسق کی اقتداء میں نماز ادا کر لی تو فریضہ ادا ہو جائیگا، اگرچہ وہ نماز ناقص ہوگی اسے لوٹنا واجب ہے۔ یعنی مکروہ تحریمی ہے کہ فاسق کے پیچھے نماز پڑھی جائے۔

(ماخوذ از کبیر)

آیت کریمہ سے عصمت انبیاء ثابت ہے:

اگر آیت کریمہ میں امامت سے مراد عام امامت لیں تو پھر بھی واضح ہے کہ ہر نبی امام ہوتا ہے۔ امام کے لئے دوسروں سے اولیٰ (بہتر) ہونا ضروری ہے۔ اگر نبی گنہگار ہو تو دوسروں سے گھٹیا ہوگا تو وہ نبی بننے کے قابل نہیں ہوگا۔

اور آیت کریمہ میں امامت سے مراد نبوت ہو جیسا کہ مفسرین کرام کا اتفاق ہے تو اس سے بھی واضح ہے کہ نبوت ظالم اور فاسق کو نہیں مل سکتی، لہذا نبی کا معصوم ہونا ضروری ہے۔

(از کبیر)

فائدہ عظیمہ :

”عہد“ کے لفظ سے ایک عظیم فائدہ یہ حاصل ہوا کہ رب تعالیٰ کا اپنے بندوں سے وعدہ ہے اور بندوں کا رب تعالیٰ سے وعدہ ہے، اسی لئے رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَأَوْفُوا بِعَهْدِي أُوفِ بِعَهْدِكُمْ﴾ اور پورا کرو میرا وعدہ میں پورا کروں گا تمہارا وعدہ۔

بندوں کا رب تعالیٰ سے وعدہ ”لیس الا عہدا لخدمۃ والعبودیۃ“ صرف اسی کی ذات کی عبادت کرنا، اور اسی کی خدمت کو بجالانا ہے۔

اور رب تعالیٰ کا اپنے بندوں سے وعدہ ”لیس الا عہدا الرحمة والربوبیۃ“ اپنی کریمی کے پیش نظر بغیر لازم ہونے کے یہ ہے کہ اے میرے بندوں میں تم پر رحم کروں گا اور تم میری ربوبیت سے فائدہ حاصل کرو گے۔

اب کوئی عقلمند شخص جب معمولی فکر کرے تو اس پر یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جائے گی کہ بندوں نے اپنا وعدہ توڑ دیا (الا ما شاء اللہ) اور رب تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا فرما دیا۔

اس کو یوں سمجھیں ”کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کر کے، اسے زندگی عطاء کر کے، اور اسے عقل عطاء کر کے، اور اعضاء عطاء کر کے عظیم انعامات سے نوازا۔

اور تمام انعامات کا اصل مقصد یہ ہے کہ اے انسان تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت، خدمت اور عبادت میں مشغول ہو جا۔

رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ میں نے جنوں اور انسانوں کو نہیں پیدا فرمایا، سوائے اس کے کہ وہ میری عبادت کریں۔

اور رب تعالیٰ کا مخلوق کو پیدا کرنا بے مقصد نہیں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا﴾ اور ہم نے آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان چیزوں کو بے مقصد پیدا نہیں کیا۔

پھر مقصد واضح کر دیا کہ انسانوں اور جنوں کو پیدا کرنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ رب تعالیٰ کی

عبادت کریں۔

”فہو سبحانہ وفی بعہد الربوبیۃ حیث خلقک واحیاک وانعم علیک بوجوہ النعم وجعلک عاقلاً ممیزاً“

اے انسان رب تعالیٰ نے تجھے پیدا کر کے اور تجھے زندگی عطاء کر کے اور تجھے بے شمار نعمتیں عطاء کر کے، اور تجھے عقل و تمیز عطاء کر کے اپنی ربوبیت کا وعدہ پورا فرما دیا۔

”فاذا لم تشتغل بخدمتہ وطاعتہ وعبودیتہ فقد نقضت عہد عبودیتک“

جب اے انسان تو رب تعالیٰ کی خدمت بجا نہیں لائے گا، اس کی اطاعت نہیں کرے گا، اور اس کی عبادت نہیں کرے گا، تو تو نے اپنے مالک سے کئے ہوئے وعدہ عبودیت کو توڑ دیا ہے۔

ایک اور وجہ دیکھیں:

رب تعالیٰ کا اپنے بندوں سے وعدہ ہے کہ وہ توفیق اور ہدایت عطاء فرمائے گا۔ اور بندوں کا رب تعالیٰ سے یہ وعدہ ہے کہ وہ اس کی عبادت میں کوشش کریں گے۔ اور عمل میں اجتہاد کریں گے۔

رب تعالیٰ نے تو اپنا وعدہ پورا کر دیا کہ ہر ذرہ ذرہ کو اے انسان تیرے لئے ہادی بنا دیا۔ جو تجھے راہ حق کی ہدایت کر رہے ہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ﴿وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ﴾ کوئی چیز ایسی نہیں جو اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تحمید بیان نہ کرتی ہو۔ ”وانت ما وفیت البتۃ بعہد الطاعة والعبودیۃ“ لیکن اے انسان تو نے رب قدوس کے ساتھ طاعت و عبودیت کے وعدہ کو پورا نہیں کیا۔

ذرا اور توجہ: اے انسان اللہ تعالیٰ نے تجھے عظیم نعمت عطاء کی یعنی دولت ایمان سے مالا مال کیا

”لوفاتک هذه النعمة لکنت اشقی الاشقیاء ابد الابدین ودھر الدھرین“

اگر تم سے یہ نعمت ایمان (العیاذ باللہ) فوت ہو جائے تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سب بد بختوں سے

زیادہ بد بخت ہو جائے گا۔

پھر یہ نعمت اللہ تعالیٰ کی طرف سے حاصل ہے، کیونکہ رب تعالیٰ نے فرمایا: وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللَّهِ ﴿۱۰﴾ جو بھی نعمت تمہیں حاصل ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں پر شکر کرنے کا حکم دیا، اگر کسی کو شکر کرنے کی توفیق حاصل ہو گئی اور اس نے عبادت کی اور ذات باری تعالیٰ کی اطاعت کی تو اس نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ اس قسم کے لوگ بہت کم ہی ہوتے ہیں۔

لیکن اگر کفرانِ نعمت کیا، یعنی رب تعالیٰ کی عبادت نہ کی، اس کی اطاعت سے منہ موڑ لیا، تو اس نے رب تعالیٰ سے کئے ہوئے اپنے وعدہ کو توڑ دیا، اور اپنی عاقبت کو برباد کر لیا: ﴿قُتِلَ الْإِنْسَانُ مَا أَكْفَرَهُ﴾ ﴿۱۱﴾ انسان کفرانِ نعمت کی وجہ سے برباد ہو گیا۔

اسی مسئلہ پر اور دلیل: اے انسان تیرے ساتھ رب کا وعدہ یہ ہے کہ میں تمہیں نعمتیں عطا کروں گا۔ اس نے تمہیں ان گنت نعمتیں عطا کیں اور پھر تمہیں نعمتیں عطاء کئے جا رہا ہے۔ اس نے تم سے نعمتیں چھینیں نہیں، اور نہ ہی اس نے تم سے نعمتوں کو عطاء کرنا بند کیا۔

لیکن تم سے رب نے وعدہ یہ لیا کہ تم اس کی نعمتوں کو اسی کی راہ میں لگانا، پاؤں جب عظیم نعمت ہیں تو اسی کام کے لئے انسان چلے جس میں رب تعالیٰ کی رضا ہو، ہاتھ جب عظیم نعمت ہیں تو انسان ان ہاتھوں سے وہی کام کرے جس سے رب راضی ہو، غرضیکہ ہر نعمت کو رب تعالیٰ کی رضا مندی حاصل کرنے کے لئے اسی کی راہ میں لگائے۔

لیکن اے انسان اگر تو نے ایسا نہ کیا تو یقینی بات ہے کہ تو نے رب تعالیٰ سے کئے ہوئے وعدہ کو توڑ دیا ہے۔ انسان کے اسی نقص عہد کو رب تعالیٰ نے یوں بیان فرمایا: ﴿كَلَّا إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَإِطْفَافٌ﴾ ﴿۱۲﴾ اے انسان! تو اپنے رب سے کتنی کٹھن ہے، اس پر کہ اپنے آپ کو غنی سمجھ لیا اسی مسئلہ کو اس طرح سمجھیں: اللہ تعالیٰ نے انسان سے وعدہ کیا کہ میں تمہیں نعمتیں عطاء

کروں گا، اس نے ہمہ وقت بے شمار نعمتیں عطاء کر کے اپنا وعدہ پورا فرما دیا۔ لیکن انسان سے یہ وعدہ پورا فرما دیا۔ لیکن انسان سے یہ وعدہ لیا کہ میری نعمتوں سے فقراء کی امداد کرنا، اور ان پر احسان کرنا، رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَاحْسِنُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾ اور احسان کرو بے شک اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے، احسان کرنے والوں کو۔

”ثم انك توسلت به الى ايداء الناس وایحاشهم“ لیکن اے انسان تو نے ان نعمتوں کے ذریعے ہی لوگوں کو ستانا شروع کر دیا اور ان کو خوف زدہ کرنا شروع کر دیا۔ کاش کہ تو رب تعالیٰ کی نعمتوں کو فقراء پر خرچ کر کے معاشرہ میں ان کو ایک مقام عطاء کرتا اور تیری بھی نیک نامی ہوتی، اور اجر عظیم حاصل کرتا۔

لیکن اس وعدہ کو بھی اکثر انسانوں نے توڑ دیا، ان کے اس وعدہ کو توڑنے کی مذمت میں رب تعالیٰ نے فرمایا۔ ﴿الَّذِينَ يَبْخَلُونَ وَيَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ﴾ وہ لوگ بخل (کنجوسی) کرتے ہیں، اور لوگوں کو (بھی) بخل کا حکم دیتے ہیں۔

اسی مسئلہ پر توجہ فرمائیں:

”اعطاك النعم العظيمة لتكون مقبلا على حمده وانت تحمد غيره“

اے انسان اللہ تعالیٰ کا تیرے ساتھ نعمتیں عطاء کرنے کا وعدہ تھا، اس نے تو اتنی نعمتیں تمہیں عطاء کر رکھی ہیں جو تمہارے شمار سے بھی باہر ہیں، لیکن اس نے تم سے وعدہ لیا تھا کہ میری حمد کرنا، تم اس وعدہ کو پورا نہیں کر رہے ہو، بلکہ اور لوگوں کی تعریفیں کر رہے ہو۔

خیال رہے انبیاء کرام، اولیاء عظام، علماء کرام کی تعریف کرنے میں رب تعالیٰ کی رضا مندی پائی جاتی ہے۔ ان کی تعریف اسی لئے کی جاتی ہے کہ یہ رب تعالیٰ کے مقبول بندے ہیں۔ ان کی تعریف بالواسطہ اللہ تعالیٰ کی ہی تعریف ہے۔

غیروں کی تعریف اس وقت منع ہے جب دنیاوی منافع حاصل کرنے کے لئے بے دین لوگوں

کی تعریف کی جائے، پھر گویا کہ انسان رب تعالیٰ سے کئے ہوئے وعدہ کو توڑ دیا۔
اے اللہ تو کریم ہے ہم عاجز بندے:

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں، احسانات اور اس کی ربوبیت کو بیان کرنا ہی ہماری طاقت میں نہیں۔ پھر ہم اگر یہ جاننا چاہیں کہ ہم رب تعالیٰ کی کتنی نعمتوں کا شکر یہ ادا نہیں کر رہے۔ اور اس کی نعمتوں میں کسی طرح خلوص سے عبادت نہیں کر رہے تو یہ بھی ہماری وسعت سے خارج ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری ابتداء سے انتہاء تک رب تعالیٰ کی نعمتیں کثیر سے کثیر عظیم سے عظیم ہمیں حاصل ہو رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتیں ہمارے علم میں بھی نہیں آ سکتیں۔ حق یہ تھا کہ ہر نعمت کا علیحدہ شکر یہ ادا کیا جائے، اور ہر نعمت پر اس کی خدمت بجالائی جائے اور عبادت کی جائے، لیکن ہم یہ نہ تو کر رہے اور نہ ہی کر سکتے ہیں، کیونکہ ہمیں رب تعالیٰ کی تمام نعمتوں کا علم نہیں، اور نہ ہی ہمیں ان نعمتوں کی کیفیات کا علم ہے۔

پھر ہماری طرف سے غفلت اور کوتاہی بڑھتی رہتی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ ہماری تقصیرات کو نہیں دیکھتا بلکہ زیادہ سے زیادہ نعمتوں سے ہمیں نوازتا رہتا ہے۔

جب ہماری طرف سے کوتاہیوں کے باوجود رب تعالیٰ کا احسان اور لطف و کرم زیادہ سے زیادہ ہوتا رہتا ہے۔ تو ہم اس رحیم و کریم پروردگار کے حضور یہ عرض کرتے ہیں۔

”الہنا صدر منک ما یلیق بک من الکرم والعفو والرحمة والاحسان و صدر منا ما یلیق بنا من الجہل والعذر والتقصیر والکسل فنسألك بک وبفضلک العمیم ان تتجاوز عنا یا ارحم الراحمین“

اے اللہ جو تیری شان کے لائق ہے عفو و کرم اور رحمت و احسان تو وہی ہمارے ساتھ کر رہا ہے۔ اور ہم حقیر لوگوں کے جو لائق ہے ہم سے وہی جہالت و غدر اور کوتاہی اور سستی سرزد ہو رہی ہیں۔ یہ عرض کرتے ہیں کہ اے ارحم الراحمین ہماری غلطیوں کو معاف فرما، ہمارے گناہوں سے درگزر فرما

مطلب تقریباً یہی ہے کہ اے اللہ تو کریم ہے اور ہم تیرے عاجز بندے ہیں۔

(ماخوذ از کبیر)

سنن ابراہیمی پر قدرے تفصیل:

اجمالی طور پر پہلے یہ ذکر کیا جا چکا ہے، کہ دس چیزیں فطرت کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام پر فرض تھیں، اور وہی ہم پر سنت مصطفوی بھی ہیں اور سنت ابراہیمی بھی۔

اب ان کے متعلق کچھ تفصیل احادیث وغیرہ سے ذکر کی جا رہی ہے، تاکہ قارئین کے لئے زیادہ نفع مند ہو سکے۔

(۱) ختنہ کرنا: مسلم شریف میں اور مسند احمد میں یحییٰ کی روایت میں ہے۔ ”انہ اختن حين بلغ ثمانين سنة واختن بالقدم“ بے شک ابراہیم علیہ السلام نے اسی سال کی عمر میں ختنہ کیا اور آپ نے تیسہ سے ختنہ کیا۔

یعنی جب آپ پر ختنہ کے فرض ہونے کا حکم نافذ ہوا اس وقت آپ کی عمر اسی سال تھی، آپ نے لکڑی کا ٹٹے چھیلنے کا آلہ تیسہ لیا، اور اپنا ختنہ خود ہی کر دیا۔ سبحان اللہ یہ انبیاء کرام کے کام ہی ہیں جو مشکل مشکل امتحانات میں پورے اترے ورنہ عام انسان ایسے امتحان میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

خیال رہے ”قدم“ قاف پر فتح، دال مشد بہی استعمال ہے اور مخفف بھی، معنی اس کا تیسہ۔
”قال عكرمة اختن ابراهيم وهو ابن ثمانين سنة“ قال: ولم يطف بالبيت بعد على ملة ابراهيم الا مختون“

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ابراہیم علیہ السلام نے اسی سال کی عمر میں اپنا ختنہ کیا، اور حضرت عکرمہ نے کہا کہ اس کے بعد ملت ابراہیمی پر قائم کسی شخص نے بغیر ختنہ کے طواف نہیں کیا۔
مسئلہ: جمہور احناف اور مالکیہ کا مذہب یہ ہے۔

”ان ذلک من مؤکدات السنن ومن فطرة الاسلام التي لا يسهل تركها في الرجال“
کہ ختنہ کرنے کا فعل سنت مؤکدہ ہے اور فطرۃ اسلامیہ سے ہے۔ مردوں کا چھوڑنا سنت مؤکدہ

کی ترک لازم آئے گی۔

”عن ابی ہریرۃ ان رسول اللہ ﷺ قال الفطرۃ خمس الاختتان الخ“

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کا ارشاد بیان فرمایا کہ فطرت اسلامیہ پانچ چیزیں ہیں، ان میں آپ نے ختنہ کا بھی ذکر کیا۔

اس حدیث سے بھی ختنہ کا سنت ہونا واضح ہے۔ خیال رہے کہ ایک ضابطہ یہ ہے ذکر قلیل ذکر کثیر سے مانع نہیں لہذا کسی محل اور موقع کی مناسبت سے پانچ کا ذکر کرنا دوسری جگہ دس کے ذکر کے منافی نہیں۔

مسئلہ: اگر کوئی بچہ ختنہ شدہ پیدا ہوا تو وہ ختنہ کی مشقت سے بچ گیا ہے۔ اب اس کا ختنہ نہ ہو سکے گا اور نہ ہی ختنہ کرنے کی کوئی ضرورت ہوگی۔ کیونکہ اس کا ختنہ پہلے قدرتی طور پر ہو چکا ہے۔

حضرت میمونؓ کہتے ہیں، مجھے امام احمد رحمہ اللہ نے بتایا کہ ہمارے علاقہ میں ایک شخص تھا جس کا بچہ پیدا ہوا جس کا ختنہ قدرتی طور پر ہو چکا تھا۔ وہ شخص بہت غمناک تھا کہ میں بچے کا ختنہ کیسے کروں گا۔ تو آپ نے اس شخص کو فرمایا ”اذا کان اللہ قد کفاک المؤمنۃ فما غمک بهذا“ جب رب تعالیٰ تمہیں اس بچے کے ختنہ کی مشقت سے آزاد کر دیا ہے تو تمہیں اس کا کیا غم ہے۔

فائدہ جلیلہ:

”عن محمد بن حبیب الهاشمی خلق من الانبیاء اربعۃ عشر مختونین آدم و شیث و نوح و ہود و صالح و لوط و شعیب و یوسف و موسیٰ و سلیمان و زکریا و عیسیٰ و حنظلہ بن صفوان (نبی اصحاب الرس) و محمد ﷺ“

محمد بن حبیب ہاشمی کہتے ہیں کہ چودہ انبیاء کرام ختنہ شدہ پیدا ہوئے، حضرت آدم، حضرت شیث، حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت لوط، حضرت شعیب، حضرت یوسف، حضرت موسیٰ، حضرت سلیمان، حضرت زکریا، حضرت عیسیٰ، حضرت حنظلہ بن صفوان (اصحاب الرس کے نبی) اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم۔

لیکن یہ بھی خیال رہے کہ ملا علی قاری رحمہ اللہ نے تمام انبیاء کرام کے ختنہ شدہ ہونے کے قول کو ترجیح دی ہے۔ جیسا کہ راقم نے اپنی کتاب تذکرۃ الانبیاء میں ذکر کیا ہے۔

اعترض: حدیث سے ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ختنہ ہوا ہے۔ لہذا یہ کہنا کہ آپ ختنہ شدہ پیدا ہوئے کیسے صحیح ہے؟

”عن ابن عباس ان عبدالمطلب ختن النبی ﷺ یوم سابعه وجعل له مآدبة وسماه محمدا“

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ بے شک عبدالمطلب نے نبی کریم ﷺ کا ختنہ ساتویں دن کرایا، اور اسی دن احباب کی دعوت کی اور اسی دن آپ کا نام رکھا۔

جواب: یہ حدیث محمد بن ابی ہریرہ نے روایت کی ہے۔ اس حدیث کے متعلق یحییٰ بن ایوب فرماتے ہیں۔

”طلبت هذا الحديث فلم أجده عند احد من اهل الحديث ممن لقيته الا عند ابن ابي السري“

میں نے اس حدیث کو بہت تلاش کیا، لیکن حدیث بیان کرنے والے حضرات میں سے میں نے جس سے بھی ملاقات کی مجھی کسی کے پاس بھی یہ حدیث نہیں ملی سوائے ابن ابی السری کے۔

اس سے واضح ہوا کہ یہ حدیث دوسری معتبر احادیث کے مقابل قابل حجت نہیں، کیونکہ اس حدیث کے متعلق ابو عمرو نے فرمایا۔ ”هذا حديث مسند غريب“ یہ حدیث مسند غریب ہے۔ اس سے بھی اس کے قابل حجت نہ ہونے کا ذکر کیا گیا۔

یہ ذکر کرنے کے بعد ابو عمرو نے کہا۔ ”وقد قيل ان النبی ﷺ ولد مختونا“ تحقیق بیان یہی کیا گیا کہ نبی کریم ﷺ ختنہ شدہ پیدا ہوئے ہیں۔

فذکر ابو نعیم الحافظ فی ”کتاب الحلیة“ باسنادہ ان النبی ﷺ ولد مختونا

ابو نعیم رحمہ اللہ نے ”کتاب الحلیة“ میں ذکر فرمایا ہے اسناد صحیحہ سے کہ نبی کریم ﷺ ختنہ شدہ پیدا ہوئے۔

مسئلہ: ختنہ بالغ ہونے سے پہلے کر دیا جائے۔ بچہ سات دن کا ہو تو ختنہ کرنا بہتر ہے۔

اس مسئلہ پر مختلف روایات ہیں، ان تمام سے نتیجہ واضح ہے جو میں نے عرض کر دیا ہے۔

علماء کے اقوال سے یہ بھی ملتا ہے۔ ”ختن ابراہیم اسماعیل ثلاث عشر سنة“ کہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ختنہ جب کیا تو ان کی عمر تیرہ سال تھی۔

”وختن ابنہ اسحاق لسبعة ايام“ اور آپ نے اپنے بیٹے حضرت اسحاق علیہ السلام کا جب

ختنہ کیا تو وہ سات دن کے تھے۔

☆ ”وروی عن فاطمة انها كانت تختن ولدھا يوم السابع“ اور روایات میں آتا ہے

حضرت فاطمہ الزہرا رضی اللہ عنہا نے اپنے بچوں کا ختنہ ساتویں دن کرایا۔

”وقال الليث بن سعد“ یختن الصبی ما بین سبع سنین الی عشر“ لیث بن سعد رحمہ اللہ

فرماتے تھے کہ بچوں کا ختنہ سات اور دس سال کے درمیان کر دیا جائے۔

”وقال احمد“ لم اسمع فی ذلک شیاً“ حضرت امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ختنہ کے

متعلق معین مدت کے متعلق کوئی روایت سننے میں نہیں آئی۔

بخاری میں سعید بن جبیر کی روایت میں ہے۔

”سنل ابن عباس مثل من انت حين قبض رسول الله ﷺ قال انا يومئذ مختون“

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سوال کیا گیا کہ جب نبی کریم ﷺ کا وصال ہوا تو آپ کتنے

تھے۔ آپ نے فرمایا میں اس وقت مختون تھا، آپ نے مختون کا معنی قریب البلوغ لیا ہے۔

واضح ہوا کہ بالغ ہونے سے پہلے ضرور ختنہ کر دیا جائے، سات دنوں پر کرائیں یا بعد میں

کرائیں جائز ہے۔

بالغ ہونے کے بعد اسلام قبول کرنے کیلئے:

اگرچہ مالکی مذہب میں تو اس کے لئے مستحب ہے کہ وہ ختنہ کسی سے کرائے بعض حضرات نے

زیادہ ہی تاکید کی ہے۔

لیکن احناف کے نزدیک بلا وجہ کسی کے تنگیز کو دیکھنا حرام ہے، اس لئے سنت پر عمل کرنے کے لئے حرام کا ارتکاب تو جائز نہیں۔ البتہ وہ شخص کسی ایسی عورت سے نکاح کرے جو ختنہ کرنا جانتی ہو، تو وہ نکاح کے بعد اس کا ختنہ کر دے، کیونکہ زوجہ اپنے خاوند کے تنگیز کو دیکھ سکتی ہے، اس طرح نہ حرام کا ارتکاب ہوگا۔ اور نہ سنت کی ترک لازم آئے گی۔

(۲) زیر ناف بال مونڈنا:

حضرت ابراہیم علیہ السلام پر زیر ناف بال مونڈنا بھی فرض تھا، ہم پر سنت ہے۔ خیال رہے کہ زیر ناف بال دور کرنے کے لئے زیادہ طور پر احادیث میں ”استحذ“ کے الفاظ استعمال ہیں، یعنی نبی کریم ﷺ نے لوہے کے آلہ (استرہ وغیرہ) کو استعمال کیا۔

اور ایک حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں۔

”ان النبی ﷺ کان لا یتنور، وکان اذا اکثر الشعر علی عانته حلقه“

کہ بے شک نبی کریم ﷺ نے زیر ناف بالوں کو دور کرنے کے لئے چونہ (پاؤڈر وغیرہ) استعمال نہیں کیا، بلکہ جب بال دور کرنے کی ضرورت درپیش آتی تو آپ ان بالوں کو مونڈ کر دور کرتے لیکن ایک دوسری حدیث حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔

”ان النبی ﷺ کان اذا اطلی ولی عانته بیدہ“

کہ بے شک نبی کریم ﷺ زیر ناف بالوں پر چونہ (پاؤڈر وغیرہ) استعمال کر کے ہاتھوں سے بالوں کو صاف کر دیتے۔ خیال رہے کہ ”اطلی“ کا معنی یہ بیان کیا گیا ہے۔ ”اطلی“ یعنی بالنورۃ وہی حجر یتخذ منه طلاء لازالة الشعر من بواطن الجسد“ کہ آپ نے چونہ کا استعمال کیا، کیونکہ پتھر سے حاصل ہونے والے چونہ کو جسم کے اندرونی حصہ کے بال دور کرنے کے لئے جب استعمال کیا جائے تو اسے بھی بعض اوقات ”طلاء“ کہہ لیا جاتا ہے۔

دونوں حدیثوں میں تطبیق:

ابن خویز منداد کہتے ہیں۔

”وهذا يدل علی ان الاكثر من فعله كان الحلق وانما تنور نادرا ليصح الجمع بين الحديثين“

اس سے واضح ہوا کہ نبی کریم ﷺ نے اکثر طور پر زیر ناف بالوں کو مونڈا ہے لیکن بھی بھی چونہ وغیرہ سے بھی بالوں کو دور کیا ہے۔ اس طرح دونوں حدیثوں میں مطابقت ہو جائے گی۔
اصل مقصد تو بالوں کو دور کرنا ہے جس طرح بھی کرے خواہ مونڈا کر یا پاؤڈر استعمال کر کے۔
خیال رہے کہ زیر ناف بالوں کو دور کرنا مردوں اور عورتوں کے لئے برابر ہے۔ اور دور کرنے کے دونوں طریقے بھی مردوں اور عورتوں کے لئے برابر ہیں۔

(۳) بغلوں کے بال دور کرنا:

حضرت ابراہیم علیہ السلام پر بغلوں کے بال دور کرنا بھی فرض تھا ہم پر سنت ہے۔
تاہم بغلوں کے بال اکھیڑنا، نوچنا زیادہ بہتر ہے۔ اور زیر ناف بالوں کو مونڈنا بہتر ہے۔ تاہم اگر بغلوں کے بال مونڈے اور زیر ناف بال نوچے تو پھر بھی جائز ہے۔ کیونکہ مقصد صفائی کا حصول ہے، تاہم پہلی صورت زیادہ بہتر ہے۔

(۴) استنجاء کرنا:

پیشاب، پاخانہ کے مقامات کو پانی سے دھونا مستحب ہے۔ اہل قبائلیوں سے استنجاء کرنے کے بعد پانی سے استنجاء کرتے تھے، رب تعالیٰ نے ان کی تعریف فرمائی ﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوْبِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ تو بہ کرنے والوں اور پاکیزگی کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔
تنبیہ: استنجاء کرنا مستحب اس وقت ہے جب مخرج (نجاست کے نکلنے کا مقام) سے باہر نجاست نہ ہو، اور اگر مخرج سے باہر درہم سے کم نجاست ہو تو پانی سے استنجاء کرنا سنت ہے۔ اور اگر درہم کے برابر ہو تو واجب ہے اور اگر درہم سے زائد ہو تو فرض ہے۔
(مبہ المصلیٰ)

(۵) ناخن کاٹنا:

”عن عمر بن بلال الفزاری قال سمعت عبد الله بن بشر المازنی يقول قال رسول الله ﷺ
قصوا اظافيركم وادفنوا قلاماتكم ونقوا ابراجمكم ونظفوا لثاثكم من الطعام وتسنوا
ولا تدخلوا علی قحرا بخرا“

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنے ناخن کاٹو، ناخنوں کے تراشے دفن کر دو، اور اپنی انگلیوں کے

جوڑوں کی لکیروں (جھریوں) کو صاف ستھرا رکھو، کھانے کے بعد اپنے مسوڑھے صاف کرو، اور دانتوں کو صاف کرو، اور نہ داخل ہو مجھ پر ایسے حال میں کہ تمہارے دانت میلے کچلے ہوں اور تمہارے منہ سے بو آ رہی ہے۔

حل اللغات: قلامات جمع ہے قلامۃ (قاف پر ضمہ) کی، جس کا معنی ناخنوں کے تراشے، ان کو دفن کرنے کا حکم دیا کہ انسان کے اعضاء کے حصوں کی عزت پائی جائے، بے حرمتی نہ ہو۔

براجم: انگلیوں کے جوڑوں کے درمیان جھریاں۔ **لثاثة**: مسوڑھے، **تسننوا**: مسواک کرو دانت صاف کرو، فقرا بخرا: دانتوں کا میلہ کچیلہ اور بد بودار ہونا۔

ترمذی نے بیان کیا ہے ناخن کاٹنے کا حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ بڑے ناخن دوسرے لوگوں کے لئے نقصان دہ ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان سے کسی کو خراشیں آنے کا خطرہ ہوتا ہے۔ اور وجہ یہ ہے کہ بڑے ناخنوں میں میل جمع ہو جاتی ہے۔ اور جنابت کی حالت میں غسل کرتے ہوئے کبھی ناخنوں کے نیچے پانی نہیں پہنچ پاتا تو انسان حکم جنابت سے نہیں نکلتا۔

☆ "عن سلیمان بن فرج ابی واصل قال اتی ابا ایوب رضی اللہ عنہ فصافحتہ فرأی فی اظفارہ طولاً فقال جاء رجل الی النبی ﷺ یسأله عن خبر السماء فقال یجئ احدکم یسال عن خبر السماء و اظفارہ کا ظفیر الطیر حتی یجتمع فیہا الوسخ والتفت"۔

سلیمان بن فرج ابی واصل کہتے ہیں میں ابو ایوب رضی اللہ عنہ کے پاس آیا۔ میں نے ان سے مصافحہ کیا۔ انہوں نے میرے ناخن بڑھے ہوئے دیکھے، تو فرمانے لگے۔ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا، آپ سے آسمانوں کے متعلق خبر پوچھنے لگا، تو آپ نے فرمایا تم میں سے کوئی ایک آتا ہے آسمانوں کے متعلق پوچھتا ہے حالانکہ ناخن اس کے ایسے بڑھے ہوئے ہوتے ہیں جیسے پرندوں کے، یہاں تک کہ ان میں میل کچیل جمع ہو جاتی ہے۔

فائدہ: جو شخص جمعرات کے دن عصر وقت کے ناخن اس طرح کاٹے کہ دائیں ہاتھ کی شہادت انگلی سے شروع کر کے چھوٹی انگلی پر ختم کرے، پھر بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی سے شروع انگوٹھے تک کاٹے، پھر دائیں ہاتھ کے انگوٹھے کے ناخن کو کاٹے اس کے بعد دائیں پاؤں کی چھوٹی انگلی سے شروع کر کے

ترتیب وار بائیں پاؤں کی چھوٹی انگلی پر ختم کرے تو ان شاء اللہ تنگدستی و دینوی پریشانی اور آنکھ کی خرابی سے محفوظ رہے گا۔
(از روح البیان و شامی بحوالہ نعیمی)

۶) کلی کرنا: مسنون یہ ہے کہ کلی کرنے میں مبالغہ کرے، کیونکہ نبی کریم ﷺ کلی کرنے میں مبالغہ کرتے تھے مبالغہ کا طریقہ یہ ہے کہ پانی کو ایک طرف سے دوسری طرف پھیرے یا غرغره کرے، لیکن روزہ دار شخص کلی کرنے میں مبالغہ نہ کرے، بلکہ کلی کرتے وقت اعتدال رکھے۔

(کشاف الحقائق، حاشیہ کنز الدقائق)

۷) ناک میں پانی ڈالنا: وضوء کرتے وقت ناک میں پانی ڈالتے وقت بھی مبالغہ کرے، کہ پانی ناک کی ہڈی (منخرین) تک پہنچ جائے، یعنی پانی کو ذرا اوپر کھینچے تا کہ ناک کے نرم حصہ تک وہ گردش کرے، لیکن روزہ دار شخص ناک میں پانی ڈالتے وقت بھی مبالغہ نہ کرے۔

(کشاف الحقائق)

۸) مسواک کرنا: حضرت ابراہیم علیہ السلام پر یہ تمام چیزیں فرض تھیں جو ہمارے لئے مسنون ہیں۔ مسواک کو نبی کریم ﷺ پسند فرماتے تھے۔ اسی لئے آپ نے فرمایا ”لو لا ان اشق علی امتی لامرتہم (امرو لوجوب) بالسواک عند کل صلوٰۃ“ (مسلم)

اگر میں اپنی امت پر شاق نہ سمجھتا تو ہر نماز کے لئے مسواک کا حکم دیتا۔

مقام توجہ: وضوء کے وقت مسواک سنت مؤکدہ ہے۔ احناف کے نزدیک مسواک سنت وضوء ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک سنت نماز ہے۔ یعنی اگر ایک شخص نے ایک وضوء سے کئی نمازیں پڑھ لیں تو سب میں اسے مسواک کی سنت پر عمل کرنے کا ثواب حاصل ہو گیا۔ لیکن امام شافعی فرماتے ہیں۔ ہر نماز کے وقت مسواک کرے گا تو سنت پر عمل ہوگا۔

مسواک کے اوقات مستحبہ:

”و یستحب فی مواضع اصفرار السن و تغیر الرائحة والقیام من النوم والقیام الی الصلوٰۃ و دخول البیت ولا اجتماع والاجتماع بالناس وقراءة القرآن“

چند مقامات وہ ہیں جہاں مسواک مستحب ہے۔ دانتوں کا زرد ہونا، اور منہ میں بو آنی شروع ہو جائے۔ اور نیند سے جب اٹھے۔ اور نماز کے وقت، اور گھر داخل ہوتے وقت، اور لوگوں کی مجلس میں

جانے کیلئے، اور قرآن پاک پڑھنے کیلئے۔ خیال رہے نماز کے وضوء کیلئے مسواک کچھ حضرات کے نزدیک مستحب ہے لیکن امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک سنت مؤکدہ ہے۔ (کشاف الحقائق)

تنبیہ: اگر لکڑی کی مسواک پاس ہے تو صرف انگلی سے دانت صاف کرنے سے سنت پر عمل نہیں ہوگا۔ ہاں اگر لکڑی کی مسواک پاس نہیں تو انگلی سے دانتوں کو صاف کرنے سے سنت کا ثواب مل جائے گا۔ بہتر تو یہ ہی صورت ہے کہ اسے ہی مد نظر رکھے۔

البتہ بعض فقہاء کرام نے یہ بیان فرمایا ہے کہ لکڑی کی مسواک پاس ہو تو اس کا استعمال کرنا بہتر ہے۔ انگلی کا استعمال کرنا جائز ہے اور سنت پر عمل ہو جائے گا۔ (کشاف الحقائق)

مسواک کیسی ہو: مسواک نرم ہو، سیدھی ہو، کم از کم چھوٹی انگلی جتنی موٹی ہو، اور ایک بالشت لمبی ہو، بالشت سے چھوٹی نہ ہو، ہاں استعمال کرتے کرتے چھوٹی ہو جائے تو کوئی حرج نہیں۔ (کشاف الحقائق)

نبی کریم ﷺ کا پیلو درخت کی مسواک کرنا اسی لئے تھا کہ وہ نرم ہوتی ہے، اس کے ریشے دانتوں اور مسوڑھوں کو بہتر طریقہ سے صاف کرتے ہیں اور اس مسواک سے مسوڑھوں کو نقصان بھی نہیں ہوتا۔

☆ "عن ابن عباس قال قال رسول الله ﷺ استاكوا مالكم تدخلون على قلحا"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مسواک کیا کرو، میرے پاس میلے کپیلے بد بودار دانت لے کر نہ آیا کرو۔

(۹) مونچھوں کا کاٹنا:

"روى الترمذی عن ابن عباس قال كان رسول الله ﷺ يقص من شاربه ويقول ان ابراهيم

خليل الرحمن كان يفعله" قال هذا حديث حسن غريب .

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ اپنی مونچھوں کو کاٹتے تھے، اور فرماتے

کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی اسی طرح کرتے تھے۔

فائدہ:

"اذا نبتت للمرأة لحية فيستحب لها حلقها" (نورى شرح مسلم ج ۱ ص ۱۴۹ باب خصال الفطرة)

عورت کی جب داڑھی نکل آئے تو اس کے لئے منڈانا مستحب ہے۔

”اذنبت للمرأة لحية او شوارب فلا تحرم ازالها بل يستحب عندنا“

(نووی شرح مسلم ج ۲ ص ۲۱۳ باب تحريم فعل المواصله)

عورت کی جب داڑھی یا مونچھیں نکل آئیں تو ان کا زائل کرنا مستحب ہے۔

مقام توجہ:

مرد کو داڑھی بڑھانے اور مونچھیں کٹانے کا حکم دیا گیا ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نبی کریم ﷺ کے حکم کو بیان فرماتے ہیں کہ آپ نے فرمایا۔

”احفوا الشوارب واعفوا للحية“ مونچھوں کو کٹاؤ اور داڑھی کو بڑھاؤ۔

(مسلم ج ۱ باب حصال الفطرة ص ۱۰۹)

قاضی عیاض رحمہ اللہ نے فرمایا:

”یکره حلقها و قصها و تحریقها“ داڑھی کا منڈانا، کٹانا اور جلانا مکروہ تحریمی ہے۔
”واما الاخذ من طولها و عرضها فحسن و یکره الشهرة فی تعظیمها کما تکره فی قصها و جزها“

داڑھی کی لمبائی اور چوڑائی سے کانٹ چھانٹ بہتر ہے۔ اس لئے کہ داڑھی کو بڑھانے میں شہرت حاصل کرنا ایسے ہی مکروہ ہے جیسے داڑھی کا کٹانا مکروہ تحریمی ہے۔

”ومنهم من حد وبما زاد علی القبضۃ فیزال“ داڑھی کی حد ایک قبضہ (مٹھی برابر یعنی چار انگلیاں) ہے۔ جو اس سے بڑھ جائے اسے کاٹ دیا جائے۔ ”کرہ مالک طولها“ امام مالک رحمہ اللہ نے داڑھی کا زیادہ لمبا کرنا مکروہ قرار دیا ہے۔
(نووی شرح حدیث)

”واللحیۃ عندنا طولها بقدر القبضۃ (بضم القاف)“ ہمارے نزدیک داڑھی کی لمبائی ایک قبضہ (مٹھی بھر) کی مقدار ہے۔

”فان الطول المفرط یشوه الخلقۃ ویطلق السنۃ المغتابین بالنسبۃ الیہ فلا بأس للاحتراز عنه علی هذه النیۃ“

داڑھی جب اتنی لمبی ہو جائے جو بدنما نظر آئے شکل کو بگاڑ دے، اور طعنہ زن اور غیبت کرنے والے لوگوں کی زبانیں اس کے خلاف بدگوئی کریں، باعث تضحیک یعنی مزاح کا سبب بنے تو اس وقت داڑھی کو قبضہ سے جو زائد ہے اس کو کٹا دے، بلکہ ایسی صورت میں داڑھی کی زائد مقدار کو کٹانا واجب ہوگا ”وما وراء ذلك يجب قطعه روى عن رسول الله ﷺ انه كان يأخذ من اللحية من طولها وعرضها اورده ابو عيسى في جامعه وقال من سعادة الرجل خفة لحيته“

قبضہ سے زائدہ داڑھی کا کٹانا واجب ہے۔ اس لئے کہ نبی کریم ﷺ اپنی داڑھی کو لمبائی اور چوڑائی سے کانٹ چھانٹ فرماتے تھے۔ اس حدیث کو ابو عیسیٰ ترمذی نے اپنی جامع میں ذکر فرمایا اور ساتھ ہی کہا کہ مرد کو قبضہ کی مقدار ہی داڑھی پر اکتفاء کرنا چاہئے یہ اس کی نیک بختی کی علامت ہے۔ ”فجعلها بين اللحيين اى طويل و قصير فان التوسط من كل شئ احسن و منه قيل خير الامور اوسطها“

داڑھی درمیانی ہونی چاہئے قبضہ سے چھوٹی بھی نہ ہو اور بہت بڑی بھی نہ ہو، اس لئے کہ ہر چیز میں میانہ روی ہی بہتر ہے اس لئے کہ تمام امور میں میانہ روی بہتر ہے۔ ”ومن ثم قيل كلما طالت اللحية نقص العقل“

اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ جب داڑھی بہت لمبی ہو جائے تو وہ عقل کی کمی کی علامت ہے۔

(مرقاۃ ج ۸ ص ۲۹۸ باب الترجل)

داڑھی بھی ناف تک آرہی ہو پھر سکوتر پر سوار بھی ہو تو عجیب منظر ہوتا ہے۔ لوگ دیکھ کر نہ ہنسیں تو کیا کریں۔

اسلام کو باعث تضحیک نہ بنایا جائے بلکہ باعث تعریف بنایا جائے۔ بلاوجہ تکلف سے اپنی شکلوں کو نہ بگاڑیں۔

مونچھیں کٹائیں، منڈائیں نہیں:

مرد کے لئے مونچھوں کو کٹانا منڈانے سے افضل ہے۔ دونوں طرفوں میں مونچھیں لمبی کرنا جائز ہے، لیکن درمیان میں لمبی کرنا منع ہے۔

”ان السنة فی قص الشارب ان لا یبالغ فی احفائه بل یقتصر علی ماتظهر به حمرة الشفة و طرفها“

مونچھوں کو بہت زیادہ نہ کٹائے بلکہ اتنا کٹائے جس سے ہونٹوں اور اس کی طرفوں میں جسم کی سرخی نظر آجائے۔ احادیث میں کٹانے سے مراد اتنا ہی ہے۔

”وقیل الافضل حلقه لحديث والاكثر علی القص بل رأى مالک تادیب الحالق“

بعضوں نے کہا ہے کہ افضل حلق ہے۔ لیکن زیادہ حضرات اسی طرف ہیں کہ مونچھوں کو کٹایا جائے منڈایا نہ جائے، بلکہ امام مالک رحمہ اللہ تو مونچھوں کو منڈانے والے کو ادب سکھانے کے قائل ہیں۔

(مرقاۃ ج ۸ ص ۱۹۸ کتاب الاطعمۃ)

اعتراض: حدیث شریف میں تو ”احفوا الشوارب“ ذکر ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ مونچھوں کو منڈانا افضل ہے۔

جواب: ابو عمر رحمہ اللہ فرماتے ہیں، اس مسئلہ میں دو حدیثیں استعمال ہیں۔ ایک حدیث میں ”احفوا“ ذکر ہے ”وہو لفظ محتمل التاویل“ لیکن اس میں تاویل کا احتمال ہے، کیونکہ ”احفاء“ کا معنی کاٹنا بھی آتا ہے۔ مونڈنا بھی آتا رہتا ہے، اور نوچنا بھی آتا رہتا ہے۔

اور دوسری حدیث میں ”قصوا“ ذکر ہے، ”وہو مفسر والمفسر یقضى علی المجمل“ جس کا معنی واضح طور پر کاٹنا ہے۔ اس لئے یہ لفظ مفسر ہے، اور ”احفوا“ مجمل ہے۔ لہذا مفسر کو مجمل پر ترجیح دی جائے گی۔

خیال رہے کہ مسئلہ کا تعلق افضلیت سے ہے، یہ نہیں کہ منڈانے کو کوئی حرام کہنا شروع کر دے یا مکروہ۔ اس لئے کہ امام احمد رحمہ اللہ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما مونچھوں کو بہت شدید پست کرتے تھے یہاں تک کہ ان کا چہرہ نظر آنے لگتا۔

(فرطی)

ناخن اور بال وغیرہ کتنی مدت میں کاٹے جائیں؟

”عن انس قال وقت لنا فی قص الشارب و تقليم الاظفار و نتف الابط و حلق العانة الا“

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہمارے لئے ناخن کاٹنے، مونچھیں کاٹنے، بغلوں کے بال نوچنے، اور زیناف بال مونڈنے کا وقت مقرر کیا گیا تھا کہ ہم چالیس دنوں سے زائد انہیں نہ چھوڑیں

”قال علماؤنا هذا تحديد في اكثر المدة“ علماء کرام نے یہ بیان کیا ہے کہ یہ تو زیادہ مدت کی حد ہے، کہ اس سے بھی زیادہ دیر کرنا منع ہے، اور یقیناً شکل کا بگاڑ بھی لازم آئے گا۔

”والمستحب تفقد ذلك من الجمعة الى الجمعة“ مستحب یہی ہے کہ ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ تک ناخن اور بال وغیرہ چھوڑے جائیں، پھر ان کو کاٹ دیا جائے۔

تنبیہ: یہ بھی خیال رہے کہ چالیس دن والی حدیث پر کلام ہے۔ لہذا وہ قابل حجت بھی نہیں، اس حدیث کے متعلق کیا کہا گیا ہے؟

”وهذا الحديث يرويه جعفر بن سليمان قال العقيلي في حديثه نظر، وقال ابو عمر فيه ليس بحجة، لسوء حفظه وكثرة غلطه وهذا الحديث ليس بقوى من جهة النقل ولكنه قدل قال به قول، واكثر على ان لا توقيت في ذلك والله التوفيق“

چالیس دنوں والی حدیث کو جعفر بن سلیمان نے روایت کیا ہے۔ عقیلی نے کہا اس حدیث میں نظر ہے۔ ابو عمر نے کہا اس میں حجت نہیں کیونکہ راوی کا حافظہ درست نہیں تھا جس کی وجہ سے ان سے غلطیاں سرزد ہو جاتی تھیں۔ اور یہ حدیث نقل کے لحاظ سے قوی نہیں۔ البتہ کچھ حضرات نے اس کا قول بھی کیا ہے۔ اور کچھ حضرات نے کہا ہے کہ کوئی وقت مقرر نہیں۔

راقم کا موقف:

انسانی فطرت جن ناخنوں کو بڑا کہے کہ یہ تو کاٹنے چاہئیں۔ بغلوں کے یہ بال بڑے ہو گئے۔ مونچھیں بڑی ہیں۔ لبوں تک آرہی ہیں وغیرہ بس وہی حد ہے۔ اگرچہ کوئی وقت مقرر تو نہیں، لیکن عقل کا تقاضا یہی ہے۔ کہ ہر ہفتہ میں ان پر عمل ہو، کسی حد تک دو ہفتہ کی تاخیر کی گنجائش سمجھ آتی ہے۔ اس سے زائد انسانی فطرت اچھا نہیں سمجھتی، کسی کو انسانی فطرت ہی نہ حاصل ہو بندروں کی طرح ناخن بڑھائے

ہوئے ہوں تو ان کو دیکھ کر یہ دلیل نہ دی جائے کہ یہ بھی تو انسان ہے، وہ باندہی انسان ہوتی تو انسانوں والا کام کرتی۔

(۱۰) مانگ نکالنا:

• یعنی سیدھی مانگ نکالنا، ناک کی سیدھ سے سر کے بالوں کو دائیں، بائیں کرنا۔

☆ ”خرج النسائي عن ابن عباس ان رسول الله ﷺ كان يسدل شعره و كان المشركون يفرقون شعورهم“ و كان يحب موافقه اهل الكتاب فيما لم يؤمر فيه بشئ، ثم فرق رسول الله ﷺ بعد ذلك اخرج البخاري، و مسلم عن انس

نسائی نے حضرت ابن عباس اور بخاری و مسلم نے حضرت انس رضی اللہ عنہم سے روایت بیان کی کہ بے شک رسول اللہ ﷺ اپنے بالوں کو لٹکاتے تھے۔ (یعنی پیشانی پر سیدھا نیچے چھوڑتے تھے) کیونکہ مشرکین مانگ نکالتے تھے، اور نبی کریم ﷺ کو جن چیزوں کا حکم نہیں دیا جاتا تھا ان میں آپ اہل کتاب کی موافقت زیادہ پسند فرماتے تھے، لیکن بعد میں رسول اللہ ﷺ نے مانگ نکالنی شروع فرمائی۔

یقینی بات ہے کہ آپ نے مانگ وحی خفی کے ذریعے نکالنی شروع فرمائی، لہذا وہ پہلا عمل بالوں کو سیدھا پیشانی پر چھوڑنے والا منسوخ ہو گیا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام پر مانگ نکالنا فرض تھا، لیکن ہم پر ”والفروق فی الشعر سنة لانه الذي رجع اليه النبي ﷺ“ بالوں میں مانگ نکالنا سنت ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اس عمل کی طرف رجوع کیا۔ یعنی ہمارے لئے سنت ابراہیمی بھی ہے۔ اور سنت مصطفوی بھی ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ جمعہ کے دن مسجد کے دروازہ پر کھڑے ہوتے اگر کسی نے اپنے بالوں کو پیشانی پر لٹکایا ہوتا تو آپ اس کے بال کاٹ دیتے تھے۔

(تمام بحث ماخوذ از قرطبی و احکام القرآن للحصص)

ابراہیم علیہ السلام کے بالوں کا سفید ہونا:

”وفي الموطأ وغيره عن يحيى بن سعيد انه سمع سعيد بن المسيب يقول ابراهيم عليه السلام اول من اختتن و اول من اضاف الضيف و اول من استحد و اول من قلم الاظفار

واول من قص الشارب و اول من شاب ، فلما رأى الشيب قال ما هذا ؟ قال وقار ، قال
يارب زدنى وقارا“

حضرت سعید بن مسیب ؓ فرماتے ہیں ابراہیم علیہ السلام نے ہی پہلے پہلے ختنہ کیا، آپ نے ہی پہلے مہمان نوازی (سے بہت زیادہ محبت) کی۔ سب سے پہلے بطور فرض زیر ناف بال آپ نے ہی مونڈے، سب سے پہلے بطور فرض آپ نے ہی ناخن کاٹے، اور سب سے پہلے بطور فرض آپ نے ہی مونچھیں کاٹیں۔ اور سب سے پہلے آپ کے ہی بال سفید ہوئے، آپ نے جب سفید بالوں کو دیکھا تو رب تعالیٰ سے پوچھا، اے رب یہ کیا ہے؟ رب نے فرمایا وقار ہے۔ آپ نے کہا اے میرے رب میرا وقار اور زیادہ کر دے۔

☆ ”عن سعید بن ابراهيم عن ابيه قال اول من خطب على المنابر ابراهيم خليل الله قال غيره و اول من ثرو الشريد و اول من ضرب السيف ، و اول من استاك ، و اول من استنجى بالماء ، و اول من لبس السراويل ، و روى معاذ بن جبل قال قال النبي ﷺ ان اتخذ المنبر فقد اتخذه ابي ابراهيم و ان اتخذ العصا فقد اتخذها ابي ابراهيم“

سعید ابن مسیب اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ سب سے پہلے منبر ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے بنوایا کچھ اور حضرات کی روایات میں آتا ہے۔ سب سے پہلے ٹرید آپ نے تیار کیا۔ سب سے پہلے تلوار آپ نے چلائی۔ سب سے پہلے بطور فرض مسواک آپ نے استعمال کی۔ سب سے پہلے پانی سے استنجاء بطور فرض آپ نے ہی کیا۔ سب سے پہلے سلوار آپ نے استعمال کی۔

حضرت معاذ بن جبل ؓ نے فرمایا، نبی کریم ﷺ نے فرمایا میں منبر اس لئے بنوایا کہ میرے باپ ابراہیم علیہ السلام نے منبر بنوایا۔ اور میں نے عصا اس لئے بنوایا کہ میرے باپ ابراہیم علیہ السلام نے عصا بنوایا۔

مسئلہ: ”واما الشيب فنور ويكره نتفه“ سفید بال نور ہیں۔ ان کا نوچنا مکروہ ہے۔

نسائی اور ابوداؤد میں ہے کہ عمرو بن شعیب اپنے باپ، دادا سے روایت کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

” لا تتفروا الشيب ما من مسلم يشيب شيبة في الاسلام الا كانت له نورا يوم القيامة و كتب الله له حسنة و حط عنه خطيئة “

سفید بال نوچونہیں، کوئی مسلمان نہیں جس کے اسلام میں بال سفید ہو جائیں، مگر قیامت کے دن اس کے لئے نور بن جائیں گے۔ اور اللہ تعالیٰ اس کے لئے نیکیاں لکھے گا، اور خطا مٹائے گا۔
(از قرطبی)

مسئلہ خضاب: پہلے تو صرف اتنا سمجھنا چاہئے کہ اصل جنس خضاب میں ہی اختلاف ہے کہ خضاب بہتر ہے یا خضاب نہ لگانا بہتر ہے۔

بعض حضرات نے کہا کہ خضاب نہ لگانا بہتر ہے، ان حضرات نے دلیل کے طور پر یہ کہا ہے۔ ” لانہ ﷺ لم یغیر شیبہ “ کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے سفید بالوں پر خضاب نہیں لگایا، لہذا خضاب نہ لگانا ہی بہتر ہے۔

کچھ حضرات نے فرمایا ہے کہ خضاب لگانا بہتر ہے، کیونکہ ” خطب جماعۃ من الصحابة والتابعین ومن بعدهم للاحادیث التی ذکرھا مسلم وغیرہ “ صحابہ کرام اور تابعین اور ان کے بعد ایک ایک جماعت خضاب لگاتی رہی، کیونکہ مسلم وغیرہ میں ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے سفید بالوں کو خضاب کے ذریعے بدلنے کا حکم دیا۔

☆ ” عن جابر بن عبد الله قال اتی بابی قحافة يوم فتح مكة ورأسه ولحيته كالثغامة بیاضا فقال رسول الله ﷺ غیروا هذا بشی واجتنبوا السواد “ (مسلم ج ۲ باب استحباب الخضاب)

حضرت جابر بن عبد اللہ کہتے ہیں (حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے والد) ابو قحافہ کو فتح مکہ کے دن نبی کریم ﷺ کی خدمت میں لایا گیا، آپ کا سر اور داڑھی ثغامہ (ایک پودا جو نمک کی طرح سفید ہوتا ہے) کی طرح سفید تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس کو کسی چیز سے بدل دو اور سیاہ رنگ سے اجتناب کرو۔

☆ ” عن ابی ہریرۃ ان النبی ﷺ قال ان اليهود والنصارى لا یصبغون فخالفوهم “ (مسلم ج ۲ باب استحباب الخضاب)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بے شک نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ یہود اور نصاریٰ (اپنے

بالوں کو) نہیں رنگتے مگر ان کی مخالفت کرو۔

سیاہ خضاب کے متعلق:

”و مذهبنا استحباب خضاب الشیب للرجل والمرأة بصفرة او حمرة و يحرم خضابه بالسواد على الاصح وقيل يكره كراهة تنزيه والمختار التحريم لقوله ﷺ واجتنبوا السواد“ (نوی)

مرد اور عورت کے لئے سفید بالوں کو رنگنا ہمارے مذہب (قول نوی) میں مستحب ہے۔ وہ خضاب زرد رنگ کا ہو، یا سرخ ہو اصح مذہب یہ ہے کہ سیاہ رنگ سے رنگنا حرام ہے۔ اور بعض حضرات نے کہا کہ مکروہ ہے وہ بھی تنزیہی۔

مختار یہ ہے کہ سیاہ رنگ سے رنگنا حرام ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ”اجتنبوا السواد“ (سیاہ سے اجتناب کرو) بعض حضرات نے حرام کہا ہے۔ اس کی اصل وجہ اختلاف یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ”اجتنبوا“ امر کا صیغہ ذکر فرمایا ہے۔ کیا یہ وجوب کے لئے ہے، یا استحباب کے لئے۔ جن حضرات نے وجوب کے لئے کہا ہے انہوں نے اس کی مخالف جانب کو حرام کہا ہے۔ اور جن حضرات نے استحباب کیلئے کہا ہے۔ انہوں اسکی مقابل صورت کو مکروہ تنزیہی کہا ہے۔

(راقم)

”و خضب جماعة منهم بالحناء والکتم وبعضهم بالزعفران و خضب جماعة بالسواد روى ذلك عن عثمان والحسن والحسين ابني علي و عقبه بن عامر وابن سيرين و ابی بردة و آخرین“ (نوی حوالہ مذکور)

صحابہ کرام اور تابعین کی ایک جماعت نے مہندی اور کتم سیاہ رنگ (پینے والا پودہ) سے خضاب لگایا اور بعض نے زعفران سے اور ایک جماعت نے سیاہ رنگ کا خضاب استعمال کیا۔

یہ روایت حضرت عثمان، حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین اور عقبہ بن عامر اور ابن سیرین اور ابو بردہ اور کئی حضرات سے مروی ہے۔

”قال القاضي قال الطبرانی الصواب ان الآثار المروية عن النبي ﷺ بتغير الشيب و

بالنهی عنه کلها صحیحة و لیس فیها تناقض بل الامر بالتغییر لمن شبیه کشیب ابی قحافة
و النهی لمن له شمط فقط“

قاضی عیاض رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ طبرانی نے بیان کیا ہے کہ درست قول یہ ہے کہ احادیث
سفید بالوں کو بدلنے کے متعلق بھی وارد ہیں اور خضاب کی ممانعت کے متعلق بھی احادیث وارد ہیں۔ وہ
سب صحیح ہیں۔ اور ان میں کوئی تناقض بھی نہیں، بلکہ حکم یہ ہے کہ جب بال حضرت ابو قحافہ رضی اللہ عنہ کی طرح
خالص سفید ہو جائیں تو خضاب کو استعمال کرنے کا حکم دیا گیا، اور جب بال سیاہ و سفید ملے جلے ہوں تو
خضاب کی ممانعت ہے۔

”قال و اختلاف السلف فی فعل الامرین بحسب اختلاف احوالهم فی ذلک مع ان الامر
و النهی فی ذلک لیس للوجوب بالاجماع و لهذا لم ینکر بعضهم علی بعض خلافه فی
ذلک قال ولا يجوز ان يقال فیہما ناسخ و منسوخ“

قاضی عیاض رحمہ اللہ نے فرمایا کہ سلف صالحین کا اختلاف خضاب کے لگانے یا نہ لگانے میں
اختلاف احوال کی وجہ سے تھا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ احادیث میں امر یا نہی وجوب کے لئے نہیں، اسی پر
اجماع امت ہے۔ اسی لئے بعض حضرات نے دوسرے بعض کا انکار نہیں کیا، اور یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ
بعض احادیث ناسخ ہیں، اور بعض منسوخ ہیں۔

سبحان اللہ سلف صالحین کیسے ہی محققین تھے کہ مسئلہ کی تحقیق ان کو حاصل ہوتی بلا وجہ ایک
دوسرے کے خلاف کچھڑا چھاننا حرام کے فتوے لگانا ان کا طریقہ کار نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی عزت
کی جاتی تھی، آجکل کچھ بے سمجھ لوگوں نے تمام علماء کرام کی عزت کو خاک میں ملا دیا ہے، یہودیوں اور
نصرانیوں کے آلہ کار لوگوں کو موقع میسر آ گیا کہ وہ کل تک جن کو استعمال کرتے رہے آج ان کو ہی
دہشت گرد قرار دے دیا۔

”وقال غیره هو علی حالین فمن کان فی موضع عادة اہله الصبغ او ترکہ فخر و جہ عن
العادة شهرة و مکروه“

قاضی عیاض رحمہ اللہ کے بغیر دوسرے علماء کرام نے بیان فرمایا، خضاب لگانے یا نہ لگانے کا

دار و مدار عادت کے مطابق ہے۔ جہاں عام لوگ خضاب لگاتے ہوں وہاں خضاب لگانا بہتر ہے اور نہ لگانا بہتر نہیں۔ اگر لوگوں کی عادت اس کے خلاف ہو تو حکم بھی اسی طرح مختلف ہوگا۔

”والثانی انه یختلف باختلاف نظافة الشیب فمن كان شیبة تكون نقیة احسن منها مصبوغة والترک اولی ومن كانت شیبة تستبشع فالصبغ اولی هذا ما نقله القاضی والاصح اوفق للسنة ما قدمناه عن مذهبنا والله اعلم“

اور وجہ اختلاف اور اس میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ جس شخص کو سفید بال خوبصورت لگ رہے ہوں اسے خضاب نہ لگانا بہتر ہے۔ اور جس کے سفید بال صاف نہ ہوں، خوبصورت نہ لگ رہے ہوں، اسے خضاب لگانا بہتر ہے۔

(ماخوذ از نووی)

راقم کا موقف:

خضاب لگانے یا نہ لگانے میں انسان کو اختیار ہے، اگرچہ علامہ نووی رحمہ اللہ اور کئی اہل علم نے مستحب بھی قرار دیا ہے۔

خالص سیاہ رنگ کے خضاب میں بھی اگرچہ اختلاف ہے بعض نے مکروہ تنزیہی کہا ہے۔ اور بعض نے حرام، لیکن راقم کا موقف اس میں یہی ہے کہ خالص سیاہ رنگ سے اجتناب ضروری ہے۔

صحابہ کرام نے مہندی اور کتم (سیاہ رنگ دینے والا پودہ) کو ملا کر خضاب لگایا ہے۔ اس لئے ایسا ہی خضاب لگایا جائے جس میں سرخ اور سیاہ کو ملا کر استعمال کیا جائے، بلکہ اب یہ بھی ضروری نہیں کیونکہ اب جتنے خضاب استعمال ہو رہے ہیں۔ وہ تمام مختلف رنگوں میں مل رہے ہیں، ان رنگوں میں براؤن بھی مل رہا ہے، جو تیار ہی سرخ اور سیاہ سے ہے وہ استعمال کر لیا جائے۔

کسی چیز کی اصل کا شریعت میں ملنا ضروری ہے، یا ممانعت کا نہ ملنا ضروری ہے۔ جب حناء اور کتم کا استعمال صحابہ کرام سے ملتا ہے، تو اسی سے واضح ہو گیا کہ سرخ اور سیاہ خضاب کو ملا کر استعمال کرنا جائز ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ خضاب لگانے والے علماء کرام مسئلہ سے بخوبی واقف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علماء کرام کے بالوں میں جب خضاب کے رنگ کو مدہم دیکھتا ہوں تو وہ سرخی مائل نظر آتے ہیں۔

☆☆☆☆

﴿وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْنًا ۖ وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ
إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى ۖ وَعَهِدْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ أَنَّ طَهِّرَا
بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ﴾ (آیت ۱۲۵)

(۱) اور یاد کرو جب ہم نے اس گھر کو لوگوں کا مرجع اور امان بنایا اور ابراہیم کے کھڑے
ہونے کی جگہ کو نماز کا مقام بناؤ، اور ہم نے تاکید فرمائی ابراہیم و اسماعیل کو کہ میرا گھر
خوب ستھرا کرو طواف والوں اور اعتکاف والوں اور رکوع و سجود والوں کیلئے۔

(۲) اور یاد کرو جب بنایا ہم نے اس مقام کو لوٹنے کی جگہ لوگوں کے لئے۔ اور امن
والا، اور بناؤ تم ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کا مقام۔ اور ہم نے تاکید
فرمائی ابراہیم اور اسماعیل کو کہ ستھرا کریں میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور
اعتکاف والوں اور رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لئے۔

آیہ کریمہ کی وضاحت پیش کرنے سے پہلے راقم اپنی کتاب تسکین الجنان کا ایک ورق ذکر کر رہا
ہے۔ جس سے تراجم کا فرق سمجھ میں آجائے۔

(ب ۱۵ع)

﴿وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْنًا﴾

شاہ عبدالقادر	اور جب ٹھہرایا ہم نے یہ گھر کعبہ اجتماع کی جگہ لوگوں کی اور پناہ
محمود الحسن	اور جب ہم نے مقرر کیا خانہ کعبہ کو اجتماع کی جگہ لوگوں کے واسطے اور جگہ امن کی
مودودی	اور یہ کہ ہم نے اس گھر (کعبے) کو لوگوں کے لئے مرکز اور امن کی جگہ بنایا
فتح محمد	اور جب ہم نے خانہ کعبہ کو لوگوں کے لئے جمع ہونے اور امن پانے کی جگہ مقرر کیا
علیٰ حضرت احمد رضا خان	اور یاد کرو جب ہم نے اس گھر کو لوگوں کے لئے مرجع اور امان بنایا

اس مقام پر مشابہ کا ترجمہ اجتماع کی جگہ کیا گیا ہے، اور اعلیٰ حضرت نے مرجع یعنی جائے رجوع

کیا ہے۔ اور یہ ترجمہ لغت کے مطابق ہے اور مقصد بھی بیان کرنے کا یہی ہے کہ لوگ اس کی طرف بار بار لوٹتے ہیں اور دیکھنے کے لئے بے قرار ہوتے ہیں۔

اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی فوقیت پر جلالین کی عبارت ملاحظہ ہو۔ ”مرجعاً یثوبون الیہ من کل جانب“ یعنی مرجع بنایا کہ ہر جانب سے لوگ اس طرف لوٹتے ہیں۔

جلالین کے حاشیہ پر یہ ہے۔ ”یثوبون ای یوجعون“ ثوب گرد آمدن مردم (صریح) یہاں بھی معنی لوٹنا ہے۔ مدارک میں اس طرح ہے۔ ”صباة و مرجعاً للحجاج والعمار یفرقون عنہ ثم یثوبون الیہ“ حاجیوں اور عمرہ کرنے والوں کے لئے مرجع بنایا جو اس سے جدا ہوتے ہیں اور پھر اس کی طرف لوٹتے ہیں۔

بیضاوی میں ہے۔ ”مرجعاً یثوبون الیہ الزوار او امثالہم“ مرجع ہے کہ اس کی طرف زائرین لوٹتے ہیں۔

تفاسیر کی عبارات سے یہ خود بخود پتہ چلتا ہے کہ صرف ”اجتماع کی جگہ“ ترجمہ کرنے سے اس کا مرجع ہونا نہیں سمجھ آتا۔ کیونکہ اجتماع تو ایک مرتبہ بھی پایا جائے۔ اگرچہ یہ کہنا درست تو ہے کہ وہ اجتماع کی جگہ ہے، لیکن بیت اللہ شریف تو بار بار لوٹنے اور مجتمع ہونے کی جگہ ہے۔ البتہ مرجع ترجمہ کرنے سے اجتماع کی جگہ سمجھ میں آ جاتی ہے۔

کیونکہ حج کے لئے بار بار لوٹنا اجتماع کو بھی مستلزم ہے۔

(تسکین الجنان فی محاسن کنز الایمان ص ۳۵، ۳۶)

وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ: اس مقام پر ”البيت“ پر الف لام عہد خارجی ہے یا الف لام جنسی ہے۔ بعض حضرات نے الف لام عہد خارجی کہا ہے۔ اور اس کی خصوصیت کا اعتبار کرتے ہوئے۔ ”البيت“ سے مراد کعبہ شریف لیا ہے۔ اور بعض حضرات نے الف لام جنسی کہا ہے۔

علامہ رازی رحمہ اللہ کے نزدیک یہی قول معتبر ہے، آپ فرماتے ہیں، اس مقام پر فقط کعبہ شریف معتبر نہیں، کیونکہ آگے ”امنا“ آ رہا ہے۔ صرف کعبہ شریف کو امن والا نہیں بنایا گیا۔

”وهذا صفة جميع الحرم ، لا صفة الكعبة فقط“

کیونکہ یہ صفت تمام حرم شریف کی ہے۔ صرف کعبہ کی نہیں۔

اس پر دلیل بھی واضح طور پر قرآن پاک میں موجود ہے کہ ذکر ”الکعبہ“ ہے۔ اور مراد اس سے ”حرم“ ہے۔ جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿هَٰذَا بَالِغُ الْكَعْبَةِ﴾ اس مقام پر ”الکعبہ“ سے مراد ”حرم“ ہے، کیونکہ ”ہدی“ کعبہ میں ذبح نہیں ہوتی اور نہ ہی مسجد حرام میں ذبح ہوتی ہے۔ بلکہ اس سے مراد حرم ہے۔

اسی طرح رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿فَلَا يَقْرُبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هَٰذَا﴾ اس مقام پر مسجد حرام سے مراد، حج اور نسک حج کے مقامات ہیں۔

ابھی تک جو بحث ذکر کی ہے اس سے واضح ہو گیا کہ ”بیت کا وصف“ امن ”ذکر کر کے واضح کر دیا کہ البیت سے مراد حرم ہے۔ البتہ ”البیت“ ذکر کر کے مراد ”حرم“ لینا کسی وجہ سے ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے ”ان حرمة الحرم لما كانت معلقة بالبیت جاز ان يعبر عنه باسم البیت“ کہ بے شک حرم کی حرمت جب بیت اللہ شریف کی وجہ سے ہی ہے۔ تو اسی وجہ سے ”البیت“ ذکر کر کے مراد حرم شریف لے لیا ہے۔

مَثَابَةٌ لِّلنَّاسِ : یہ ماخوذ ہے ”ثاب يثوب مثابة و ثوبا“ سے، جس کا معنی ہے ”لوٹنا“ جس طرح کہا جاتا ہے ”ثاب الماء“ اس کا مطلب ہے۔ پانی انقطاع کے بعد نہر کی طرف لوٹ آیا۔

اسی طرح کہا جاتا ”ثاب الى فلان عقله و تفرق عنه الناس ثم تابوا“ فلاں آدمی کی بے عقلی کی وجہ سے لوگ اسے چھوڑ چکے تھے لیکن اس کی عقل لوٹ آئی، اور لوگ بھی اس کی طرف لوٹ آئے، یعنی اس عبادت میں ”ثاب“ اور ”تابوا“ کا معنی لوٹنا ہے۔ اب مقصد یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے فرمایا، مقام حرم کو ہم نے امن اور لوٹنے کی جگہ بنایا۔

”قال الحسن معناه انهم يثوبون اليه في كل عام“

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگ حرم شریف کی طرف ہر سال لوٹ کر آتے ہیں۔

اعتراس: تمام لوگ تو ہر سال لوٹ کر نہیں آتے، تو پھر لوٹنے کی جگہ بنانے کا کیا مطلب ہے۔

جواب: ”وعن ابن عباس و مجاہد انه لا ينصرف عنه احد الا هو يتمنى العود اليه“

حضرت ابن عباس اور مجاہد رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں، کہ بے شک ہر شخص اگرچہ ہر سال لوٹ کر آ تو نہیں سکتا، لیکن ہر آدمی کے دل میں تمنا پائی جاتی ہے کہ وہ لوٹ کر آئے۔

در اصل یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاء کا اثر ہے۔ آپ نے رب تعالیٰ سے دعاء فرمائی۔

”فاجعل افئدة من الناس تهوى اليهم“ تو تو لوگوں کے کچھ دل ان (مکہ میں رہنے

والوں) کی طرف مائل کر دے۔ ”مشابة“ کا ایک معنی ثواب دیا جانا بھی ہے۔ یعنی۔ ”يحجون اليه فيثابون عليه“ کہ وہ حج کریں گے تو ان کو ثواب عطاء کیا جائے گا۔

اسی سے ایک اور مسئلہ بھی واضح ہو گیا کہ تمام اعمال اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں۔ کیونکہ رب تعالیٰ نے

فرمایا ﴿وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ﴾ اور اللہ نے تمہیں اور تمہارے اعمال کو پیدا کیا۔

یعنی ان کا عمل چونکہ رب تعالیٰ کی توفیق سے ہوتا ہے۔ وہ اپنے نیک عمل کی وجہ سے رب تعالیٰ

کے فضل سے ثواب کے مستحق ہوں گے لیکن وہ ثواب ان کو مالک الملک کی عطاء سے ہی حاصل ہوگا۔

وَأَمْنًا : (اور امن والا بنایا) یعنی اللہ تعالیٰ نے ”جعل اهل الحرم آمين من القحط

والجذب“ حرم والوں کو قحط سالی اور خشک سالی سے امن والا بنایا۔

اور یہ آیت کریمہ امر کے معنی کو بھی مستلزم ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو حکم دیا ہے کہ تم حرم میں قتل و

غارت نہ کرو، تم اس مقام کا احترام کرو۔ ”فكان البيت محترما بحكم الله تعالى“ یعنی اللہ تعالیٰ

(از کبیر)

کے حکم سے بیت اللہ شریف اور حرم شریف محترم ہو گئے۔

☆ ”قال رسول الله ﷺ يوم فتح مكة ان هذا البلد حرمه الله يوم خلق السموات

والارض فهو حرام بحرمة الله الى يوم القيامة وانه لن يحل القتال فيه لاحد ولم

يحل لي الا ساعة من نهار فهو حرام بحرمة الله الى يوم القيامة لا يعضد شوكة

ولا ينفر صيده ولا يلتقط لقطته الا من عرفها ولا يختلي خلاها، فقال العباس يا

رسول الله الا الا ذخرفانه لقينهم وليوتهم فقال الا الا ذخرف“ (بخاری، مسلم، مظہری)

فتح مکہ کے دن نبی کریم ﷺ نے فرمایا، بے شک اس شہر کو اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کے پیدا کرنے کے دن سے ہی محترم بنایا، یہ قیامت تک اللہ تعالیٰ کے محترم کرنے سے محترم ہے۔ بے شک کسی کیلئے حلال نہیں کہ اس میں قتال کرے، میرے لئے بھی حرام ہے، صرف ایک گھڑی کیلئے میرے لئے حلال کیا گیا ہے، پھر قیامت تک اللہ تعالیٰ نے اس میں قتال کو حرام قرار دے دیا۔ اس کے پودے نہ کاٹے جائیں۔ اور اس کے شکار کو نہ بھگایا جائے، اور اس سے کسی گری ہوئی چیز کو نہ اٹھایا جائے، سوائے اس کے کہ اعلان کرنے کی غرض سے اٹھائے اور اس کا گھاس نہ کاٹا جائے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے اذخر گھاس کے مستثنیٰ کرنے کی درخواست کی، تو آپ نے اذخر کو مستثنیٰ فرما دیا۔ یہ گھاس ان کے گھروں کی چھتوں پر ڈالنے کیلئے، لوہار کی بھٹی میں جلانے کے لئے اور قبروں میں ڈالنے کے کام آتا تھا۔

مسئلہ: ہر وہ درخت جو عام طور پر خود اگتا ہے جس طرح جھاڑی، اور لیکرو وغیرہ، وہ خود ہی حرم میں اگ پڑے (پیدا ہو جائے) تو اس کا کاٹنا حرام ہے۔

اگر اسے ہی کسی نے لگایا تھا تو اس کا کاٹنا جائز ہے۔ ایسے ہی وہ درخت جن کو عام طور پر لوگ خود لگاتے ہیں جس طرح پھلدار درخت وغیرہ، ان کو کسی نے خود لگایا، یا وہ خود پیدا ہو گئے۔ دونوں صورتوں میں ان کا کاٹنا جائز ہے۔

(از شامی)

کیا خوب امن:

حرم شریف کو اللہ تعالیٰ نے کیا خوب امن والا بنایا کہ حرم میں اگر شکاری کتا اور ہرن جمع ہو جائیں تو کتے کو ہرن کے پکڑنے کے لئے برا بیچتے کرنا منع ہے۔ ہاں اگر ہرن حرم سے باہر نکل جائے تو پھر اس پر کتے کو چھوڑنا جائز ہوگا۔

(احکام القرآن للجصاص)

مفتی احمد یار خان رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ حرم شریف میں قدرتی طور پر کسی بھیڑیے کو طاقت ہی حاصل نہیں ہوتی کہ وہ کسی بھیڑ، بکری پر حملہ کرے۔

علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ”جب حرم کے باہر کتا ہرن پر حملہ کرنا چاہے، اور اس کا پیچھا کرے، وہ ہرن اس سے بھاگ پڑے، اور کتا بھی اس کے پیچھے پیچھے ہو، ”فاذا دخل الظبی الحرم لم يتبعه

الکلب“ تو وہ ہرن حرم میں داخل ہو جائے تو کتا اس کا پیچھا کرنا چھوڑ دیتا ہے۔

”وكانت الجاهلية متمسكين بتحريمه ، لا يهيجون على احد التجأ اليه“

زمانہ جاہلیت میں بھی لوگ حرم شریف کا احترام کرتے تھے، اگر کوئی شخص حرم کی پناہ لے لیتا، تو

دوسرے اس پر حملہ نہیں کرتے تھے۔

”وكانوا يسمعون قریشا اهل الله تعظيما له“ چونکہ قریش کعبہ شریف کے خدام، حرم

کے پاس بن تھے۔ اسی وجہ سے یعنی حرم کی تعظیم اور حرمت کی وجہ سے زمانہ جاہلیت میں بھی لوگ قریش کو

اہل اللہ (اللہ والے) کہتے۔

(از کبیر)

مسئلہ: اگر کوئی شخص قتل کر کے حرم میں آ جائے تو اس میں امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب

یہ ہے کہ اس کو حرم شریف میں قصاص کے طور پر قتل نہیں کیا جائے گا۔

”لكن يضيق على الجاني ولا يكلم ولا يطعم ولا يعامل حتى يخرج فيقتل“

البتہ اس پر تنگی کی جائے، اس سے کوئی کلام نہ کرے اور نہ اسے طعام دیا جائے۔ اور کسی طرح

بھی اس سے کوئی معاملہ نہ کیا جائے، یہاں تک کہ وہ حرم سے نکل جائے، پھر اسے قتل کیا جائے۔

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی پر حد یا قصاص لازم ہو تو وہ حرم میں پناہ پکڑ لے، تو امام

اس پر تنگی کرے تاکہ وہ حرم سے نکل جائے ”فاذا خرج اقيم عليه الحد في الحل فان لم

يخرج جاز قتله فيه“ جب وہ نکلے تو حرم سے باہر ”حل“ میں اسے قتل کیا جائے اور اس پر حد لگائی

جائے، اگر نہ نکلے تو حرم کے اندر ہی اسے قتل کر دیا جائے۔

امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ حرم کے اندر پناہ لینے والے سے کسی طرح بھی قصاص نہیں لیا

جائے گا۔ خواہ وہ قتل کا قصاص ہو، یا ہاتھ پاؤں وغیرہ کے کاٹنے کا قصاص ہو۔ ہاں البتہ حرم سے نکلنے پر

(از روح المعانی)

قصاص لیا جائے گا۔

امام مالک رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ بیت اللہ شریف میں تو کسی کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ البتہ حرم

میں قتل کرنے والے کو قتل کر دیا جائے گا، اور لڑائی کرنے والے سے لڑائی کی جائے گی۔ اور جو باہر سے

حرم میں پناہ لے اور اس پر حد لازم ہو تو اسے قید کر لیا جائے۔ (قرطبی)

امام اعظم رحمہ اللہ کا مذہب بھی یقیناً اعظم ہے کہ حرم کا بھی لحاظ کیا جائے۔ اور اس شخص پر کھانے، پینے کی اشیاء نہ پہنچنے دی جائیں۔ یقیناً وہ باہر نکلے گا۔ کوئی شخص اپنے کو بھوک سے قتل نہیں کرتا

لہذا علامہ قرطبی رحمہ اللہ کا یہ کہنا۔ ”فنحن نقتله بالسيف وهو يقتله بالجوع“ (ہم تلوار سے قتل کرتے ہیں اور امام اعظم رحمہ اللہ بھوک سے قتل کرتے ہیں) بے حقیقت ہو کر رہ گیا۔

مسئلہ: جو شخص حرم کے اندر قتل کرتا ہے۔ یا باعث حد کام کرتا ہے، تو اس سے قصاص لے لیا جائے گا، اور اس پر حد نافذ کر دی جائے گی۔ اسے حرم کی سر زمین امن نہیں دے گی۔ (قرطبی)

وَ اتَّخِذُوا مِنْ مَّقَامِ اِبْرَاهِيمَ : اور بناؤ تم ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کا مقام اس کی وجہ نزول کا ذکر اس حدیث میں ہے جو ابو نعیم نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے بیان کی۔

”ان النبی ﷺ اخذ بيد عمر ﷺ فقال يا عمر هذا مقام ابراهيم فقال عمر افلا نتخذه مصلی فقال لم او مر بذلك فلم تغب الشمس حتى نزلت هذه الایة“

بے شک نبی کریم ﷺ نے حضرت عمر ﷺ کا ہاتھ پکڑا، اور فرمایا اے عمر یہ مقام ابراہیم ہے۔ حضرت عمر ﷺ نے عرض کیا، کیا ہم اس کو نماز کا مقام نہ بنالیں؟ تو حضور نے فرمایا ابھی مجھے اس کا حکم نہیں دیا گیا اسی دن غروب شمس (سورج غروب ہونے) سے پہلے اس آیت کریمہ کا نزول ہو گیا۔ خیال رہے کہ یہ حکم استحباً ہی ہے، کہ طواف کے بعد دو رکعت مقام ابراہیم کے پاس پڑھے، اگر وہاں جگہ نہ ملے تو مسجد حرام میں جہاں چاہے پڑھ لے۔

☆ عن انس بن مالک قال قال عمر وافقت ربي في اربع ، قلت يا رسول الله لو صليت خلف المقام فنزلت هذه الایة ﴿ وَ اتَّخِذُوا مِنْ مَّقَامِ اِبْرَاهِيمَ مُصَلًى ﴾ و قلت يا رسول الله لو ضربت على نساك الحجاب فانه يدخل عليهن البر والفاجر فانزل الله ﴿ وَاِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا فَسَأَلُوهُنَّ مِنْ وَرَآءِ حِجَابٍ ﴾ ونزلت هذه الایة ﴿ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِّنْ طِينٍ ﴾ فلما نزلت قلت انا تبارك الله احسن الخالقين ، فنزلت

﴿فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ﴾ و دخلت علی ازواج النبی ﷺ فقلت لنتهن اولیبدلنه الله بازواج خیر منکن فنزلت الآیة ﴿عَسَى رَبُّهُ أَنْ طَلَقُكُنَّ﴾ (مسند ابی داؤد الطیالسی)

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد یہ ہے کہ چار آیات کے نزول میں (میرے رب نے میری موافقت فرمائی یا) میں نے اپنے رب کی موافقت کی۔

میں نے کہا یا رسول اللہ کاش کہ مقام ابراہیم کے پیچھے نماز پڑھتے، تو یہ آیہ نازل ہوئی۔ ﴿وَاتَّخِذُوا مِنْ مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى﴾ اور آپ فرماتے ہیں۔ میں نے کہا یا رسول اللہ کاش کہ آپ کی ازواج مطہرات پردہ کریں، کیونکہ کئی نیک لوگ اور کئی برے لوگ ان کے سامنے آتے ہیں۔ تو رب تعالیٰ نے پردہ کا حکم اس آیہ میں نازل فرمادیا۔

﴿وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا فَسَأَلُوهُنَّ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ﴾

اور جب یہ آیہ نازل ہوئی ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِّنْ طِينٍ﴾ تو میں نے رب تعالیٰ کی توصیف میں یہ پڑھا ﴿فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ﴾ تو اللہ تعالیٰ نے یہ الفاظ مبارکہ نازل فرمائے ﴿فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ﴾ اور آپ فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کی ازواج کے پاس گیا اور میں نے کہا یا تو تم نبی کریم ﷺ سے ناراضگی کا کام چھوڑ دو، یا وہ تمہیں طلاق دے دیں اور رب تعالیٰ تم سے بہتر ازواج ان کو عطاء کر دے، تو رب تعالیٰ نے میری تائید میں آیہ نازل فرمادی۔ ﴿عَسَى رَبُّهُ أَنْ طَلَقُكُنَّ..... الخ﴾

علامہ قرطبی فرماتے ہیں۔ بدر کے قیدیوں کے متعلق بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے کے مطابق آیہ نازل ہوئی، اس طرح پانچ مقام ہو گئے۔

تاہم علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے تاریخ الخلفاء میں اور مقامات کا بھی تذکرہ کیا، ایک قول کے مطابق اٹھارہ آیات آپ کی رائے کے مطابق نازل ہوئیں۔

مقام ابراہیم کیا ہے؟

مقام ابراہیم وہ پتھر ہے جس پر ابراہیم علیہ السلام نے اپنے پاؤں رکھے اور آپ کی بہو یعنی

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی زوجہ نے آپ کے پاؤں کو دھویا۔

اور اسی پتھر پر آپ نے کھڑے ہو کر کعبہ شریف کی تعمیر کی۔ اور اسی پتھر پر کھڑے ہو کر تعمیر کعبہ کے بعد آپ نے لوگوں کو حج کے لئے دعوت دی۔
اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے تفصیلی واقعہ بخاری شریف سے پیش کیا جاتا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا، کہ حضرت سارہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کی کچھ چیقلش اور نوک جھوک کی وجہ سے رب تعالیٰ نے اپنے نبی کا امتحان لینے اور کعبہ شریف کی تعمیر اور مکہ شریف کو بسانے کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ اپنی زوجہ ہاجرہ اور اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو وہاں چھوڑ دو جہاں آجکل کعبہ شریف اور مسجد حرام آباد ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام رب تعالیٰ کے حکم سے اپنی زوجہ اور اپنے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کو لائے کعبہ شریف کے پاس مسجد میں زمزم کے مقام پر ان کو چھوڑا، اس وقت اسماعیل علیہ السلام شیر خوار (دودھ پیتے) بچے تھے، اس وقت نہ مکہ شریف تھا اور نہ ہی وہاں کوئی پانی تھا۔

ابراہیم علیہ السلام نے اپنی زوجہ اور اپنے بیٹے کو چھوڑتے وقت ان کے پاس ایک تھیلا رکھا، اس میں کچھ کھجوریں تھیں، اور ایک چھوٹا سا مشکیزہ رکھا اس میں پانی تھا، اور آپ پیچھے کی جانب لوٹے، تو حضرت ہاجرہ نے آپ کا پیچھا کیا اور آپ کو کہا اے ابراہیم آپ ہمیں اس وادی میں کیوں چھوڑ کر جا رہے ہو جہاں کوئی مونس و غمخوار نہیں، اور کوئی چیز نہیں۔ کئی مرتبہ حضرت ہاجرہ نے یہ سوال کیا، لیکن آپ نے ان کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔

”فَقَالَتْ لَهُ اللَّهُ امْرُكْ بِهَذَا قَالَ نَعَمْ قَالَتْ اِذْ لَا يَضِيعُنَا“

تو حضرت ہاجرہ نے پھر آپ سے یہ پوچھا، کیا آپ ہمیں اللہ تعالیٰ کے حکم سے یہاں چھوڑ کر جا رہے ہو؟ آپ نے فرمایا ہاں، یعنی اللہ کے حکم سے چھوڑ کر جا رہا ہوں، تو حضرت ہاجرہ نے کہا ٹھیک ہے ہمیں اللہ تعالیٰ ضائع نہیں کرے گا۔ یعنی ہماری حفاظت فرمائے گا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کام کو سن کر حضرت ہاجرہ اپنی جگہ پر چلی گئیں۔ حضرت ابراہیم علیہ

السلام بھی وہاں سے چلے گئے اور جب آپ وادی میں پہنچے جہاں سے آپ کو وہ جگہ نظر نہیں آ رہی تھی، تو آپ نے بیت اللہ شریف کی طرف متوجہ ہو کر ہاتھ اٹھا کر دعاء کی۔

﴿رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ فَاجْعَلْ أَفْنَدَةً مِنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ﴾

(سورۃ ابراہیم ۳۷)

اے میرے رب میں نے اپنی کچھ اولاد ایک نالے میں بسائی، جس میں کھیتی نہیں ہوتی، تیرے حرمت والے گھر کے پاس، اے ہمارے رب اس لئے کہ وہ نماز قائم رکھیں تو تو لوگوں کے کچھ دل ان کی طرف مائل کر دے، اور انہیں کچھ پھل کھانے کو دے شاید وہ احسان مانیں۔

حضرت ہاجرہ اپنے بیٹے کو دودھ پلانے لگیں، اور آپ کے پاس جو تھوڑا سا پانی تھا وہ ختم ہو گیا۔ آپ کو بھی پیاس شدید لگ گئی۔ آپ کا بیٹا بھی بھوکا اور پیاسا ہو گیا۔

آپ ادھر ادھر دیکھنے لگیں کہ کوئی شخص نظر آئے، یا پانی کا کوئی اتہ پتہ چلے، آپ اسی بے قراری میں قریب ہی صفا پہاڑی پر چڑھ کر دیکھنے لگیں، کچھ پتہ نہ چلنے پر مروہ پہاڑی پر آ گئیں، درمیان میں جب وادی (نشیبی جگہ) میں پہنچیں جہاں بچہ نظر نہیں آ رہا تھا وہاں سے آپ تیز چلیں، جب بچہ نظر آنے لگا، آہستہ چلنے لگیں۔

مروہ پر بھی کچھ نظر نہ آیا، اسی بے قراری میں صفا سے مروہ اور مروہ سے صفا پر آپ نے سات چکر لگا ڈالے۔

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں۔ ”قال النبی ﷺ فلذلك سعى الناس بينهما“

نبی کریم ﷺ نے فرمایا اسی لئے لوگ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرتے ہیں۔

جب آپ کا ساتواں چکر مروہ پر مکمل ہوا تو آپ نے ایک آواز سنی، آپ نے اپنے آپ کو خطاب کرتے ہوئی کہا، ذرا رکو، سنو، یہ آواز کہاں سے آئی، دوسری مرتبہ پھر آواز آئی، تیسری مرتبہ پھر آواز آئی۔ آپ نے کہا اگر یہ فریاد رس کی آواز ہے تو وہ کوئی فرشتہ ہی ہو سکتا ہے۔

”فبحث بعقبه او قال بجناحه حتى ظهر الماء“

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ایڑی کی رگڑ سے، یا (حضرت ابن عباس فرماتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے) فرمایا کہ فرشتے کے پر سے وہاں پانی نکل آیا۔

خیال رہے کہ راقم نے اس کا حسین امتزاج کیا ہے کہ ادھر حضرت اسماعیل علیہ السلام ایڑی رگڑ رہے تھے، اسی ایڑی رگڑنے کی جگہ فرشتے کو پر مارنے کے لئے حکم دیا گیا، تاکہ زمین نرم ہو جائے، دراصل حضرت اسماعیل علیہ السلام کا اعجاز ہی ہے آپ کے ایڑی رگڑنے سے ہی پانی نکلا۔

حضرت ہاجرہ پانی کا چلو بھرتیں تو نیچے سے پانی اور جوش مارتا آپ نے پانی کو روکنے کے لئے ارد گرد مٹی کا بند باندھ دیا۔ اور پانی کو کہا ”زم زم“ رک جائزک جا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں، نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔

”یرحم الله ام اسماعيل لو تركت زمزم او قال لو لم تغرف من الماء لكانت زمزم عينا معينا“

اللہ تعالیٰ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ پر رحم فرمائے، اگر آپ پانی کے لئے ”زم زم“ کے لفظ نہ استعمال فرماتیں۔ یا حضور نے فرمایا، اگر آپ اس پانی سے (جلدی سے) چلو نہ بھرتیں تو وہ پانی بہت بڑا چشمہ ہوتا۔

یعنی وہ عظیم نہر کی شکل اختیار کر کے روئے زمین والے لوگوں کو سیراب کرتا۔

اس فرشتہ نے حضرت ہاجرہ کو کہا، تم ضائع ہونے (ہلاک ہونے) کا کوئی خوف نہ رکھو، بے شک یہاں بیت اللہ ہے۔

”ينيه هذا الغلام وابوه وان الله لا يضيع اهله“

جس کی تعمیر یہ بچہ اور اس کا باپ کریں گے، اللہ تعالیٰ اپنے مقربین کو ضائع نہیں کرتا۔

یہ بھی خیال رہے کہ بیت اللہ تو حضرت آدم علیہ السلام کے وقت سے تھا، جس کی تفصیل انشاء اللہ بعد میں ذکر کی جائے گی۔ لیکن اس وقت ایک ٹیلے کی شکل میں نظر آتا تھا، وادیوں کا بارش پانی اس کے دائیں بائیں گزر جاتا تھا۔

وہاں سے جرہم (جیم پر ضمہ) قبیلہ کا گذر ہوا۔ وہ بھی بیابان جنگل میں پانی کو تلاش کر رہے تھے،

کہیں کچھ دور فاصلہ سے پرندوں کو ایک جگہ کے اوپر اڑتے ہوئے دیکھا تو انہوں نے سمجھ لیا کہ وہاں کوئی پانی ہوگا جہاں پرندے اڑ رہے ہیں، ان میں کچھ آدمی آئے تو دیکھا کہ پانی کا ایک چشمہ ہے۔ اس کے قریب ایک عورت اور ایک بچہ ہے۔

وہ لوگ واپس گئے اپنے قبیلے والے لوگوں کو بتایا کہ وہاں پانی ہے، اور پانی کے پاس ایک عورت اور ایک بچہ ہے، وہ تمام لوگ وہاں آ گئے۔ حضرت ہاجرہ کو کہا۔

”اتاذنین لنا ان ننزل عندک نعم ولكن لاحق لکم فی الماء قالوا نعم“

کیا تم ہمیں اجازت دیتی ہو کہ ہم تمہارے پاس ہی یہاں ٹھہر جائیں۔ آپ نے فرمایا ٹھیک ہے۔ تم رہ جاؤ۔ لیکن پانی پر تمہارا حق نہیں ہوگا۔ انہوں نے کہا ٹھیک ہے۔

حضرت ہاجرہ بھی چاہتی تھیں کہ یہاں انسان رہیں۔ تاکہ ان سے انس ہو۔ اس طرح وہ تمام قبیلہ مرد، عورتیں، چھوٹے، بڑے وہاں آباد ہو گئے۔ یہی مکہ شہر کی گویا کہ ابتداء ہے۔ اور بعد میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے کعبہ شریف کی بھی تعمیر کر دی۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی پہلے عبرانی زبانی تھی، لیکن بنی جرہم کی زبان عربی تھی، جب سے وہ لوگ وہاں آباد ہوئے تو آپ کا ان سے میل جول اکثر اوقات رہتا تو آپ نے بھی عربی زبان بولنی شروع فرمادی۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام جب جوان ہو گئے تو بنی جرہم نے ہی اپنے خاندان کی ایک لڑکی سے آپ کی شادی کر دی حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کا وصال ہو گیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل میں تمنا واقع ہوئی کہ میں اپنی زوجہ اور بیٹے کو مل کر آؤں۔ (یقینی بات ہے کہ وہاں چھوڑا بھی رب تعالیٰ کے حکم سے تھا، اور ملنا بھی اسی کی اجازت سے تھا، اس سے پہلے اجازت ہی نہیں ملی، اب اجازت ملی) آپ آئے تو آپ کو پتہ چلا کہ حضرت اسماعیل کی شادی ہو چکی ہے۔ آپ ان کی زوجہ کو ملے اس سے اسماعیل علیہ السلام کے متعلق پوچھا، تو اس نے بتایا۔ ”خروج یتغی لنا، وفی رواۃ ذہب یصید لنا“ کہ وہ باہر کہیں گئے ہیں کہ ہمارے لئے کوئی رزق تلاش

کر کے لائیں۔ اور ایک روایت میں ہے کہ وہ ہمارے لئے شکار کرنے گئے ہیں۔

آپ نے اس عورت سے ان کے گزراوقات کے متعلق سوال کیا، تو اس نے بتایا ”نحن فی ضیق وشدة“ ہم تنگ حالی اور شدید پریشانی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ یعنی ہماری گزراوقات تنگی سے ہو رہی ہے۔

اس کی اس شکایت کو اور رب تعالیٰ کی ناشکری کو ابراہیم علیہ السلام نے پسند نہ فرمایا۔ کہ نبی کی زوجہ کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ رب تعالیٰ کے فیصلہ کے خلاف شکایت کرے۔
”فقال اذا جاء زوجك اقرئني عليه السلام وقلی له یغیر عتبه بابه“

تو آپ نے فرمایا جب تمہارے خاوند آئیں تو ان کو میرا سلام کہنا، اور ان کو کہنا کہ تم اپنے دروازہ کی دہلیز بدل دو۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام جب واپس آئے تو آپ کو محسوس ہوا کہ آج کوئی بزرگ شخصیت ہمارے گھر آئی۔ تو آپ نے پوچھا کیا کوئی شخص آج آیا تھا۔ آپ کی زوجہ نے بتایا کہ ہاں ایک شخص بزرگ قسم کے تشریف لائے تھے، انہوں نے تمہارے متعلق پوچھا، تو میں نے ان کو بتایا کہ وہ شکار کے لئے گئے ہیں۔ پھر انہوں نے ہماری گزراوقات کے متعلق پوچھا تو میں نے ان کو بتایا کہ ہم تنگ حالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام نے پوچھا کیا وہ تمہیں کوئی وصیت بھی کر کے گئے ہیں؟ اس نے کہا ہاں وہ مجھے کہہ گئے تھے کہ میں ان کا سلام تمہیں پہنچاؤں، اور یہ بھی کہہ گئے تھے کہ گھر کے دروازہ کی دہلیز بدل دو
حضرت اسماعیل علیہ السلام نے بتایا۔ ”ذلک ابی وقد امرنی ان افارقک الحقی باہلک فطلقها“ کہ وہ میرے باپ تھے وہ مجھے حکم دے گئے کہ میں تمہیں جدا کر دوں، آپ نے اسے طلاق دے دی اور کہا تم اپنے قبیلہ والوں سے مل جاؤ۔

آپ نے اسی قبیلہ کی ایک اور عورت سے شادی کر لی، کچھ عرصہ کے بعد حضرت ابراہیم علی علیہ السلام پھر تشریف لائے، اتفاقی طور پر پھر حضرت اسماعیل علیہ السلام سے ملاقات نہ ہو سکی۔ ان کی زوجہ

سے ملکر ان کے متعلق پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ روزی کی تلاش کے لئے باہر تشریف لے گئے۔ آپ نے اس سے گذراوقات کے متعلق پوچھا تو اس نے کہا۔ ”نحن بخیر وسعة وارت علی اللہ عزوجل“ ہم بہتر حال میں ہیں اللہ تعالیٰ کی رحمت ہم پر ہے۔ ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس سے پوچھا تمہارا طعام کیا ہے، تو اس نے بتایا کہ ہمارا طعام (شکار کا) گوشت اور زمزم کا پانی، تو آپ نے دعاء فرمائی۔ ”اللہم بارک لہم فی طعامہم وشرابہم“ اے اللہ ان کو طعام اور پانی میں برکت عطاء فرما۔

ابراہیم علیہ السلام نے اسے کہا جب تمہارے خاوند آئیں ان کو میرا سلام کہنا، اور کہنا کہ تمہارے گھر کے دروازہ کی چوکت اچھی ہے، اسے قائم رکھنا۔

اسماعیل علیہ السلام واپس آئے تو آپ نے محسوس کیا کہ کوئی بزرگ آئے تھے۔ آپ نے اپنی زوجہ سے پوچھا کیا کوئی بزرگ آئے تھے۔ اس نے بتایا ہاں ایک خوبصورت چہرے والے بزرگ تشریف لائے تھے۔

آپ نے پوچھا، کیا وہ کوئی پیغام بھی دے کر گئے ہیں۔ تو آپ کی زوجہ نے انہیں بتایا کہ وہ تمہیں سلام کہنے کے متعلق ارشاد فرما کر گئے، اور یہ کہہ گئے کہ تمہارے گھر کے دروازہ کی دہلیز (نیچے والی چوکت) اچھی ہے اسے قائم رکھنا۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام نے فرمایا کہ وہ میرے باپ ہیں جو تمہارے متعلق وصیت فرما گئے ہیں کہ میں تمہیں اپنے پاس ہی رکھوں۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اس دوسری زوجہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ملاقات کے دوران کہا کہ آپ سواری سے نیچے اتریں، لیکن آپ سواری سے نیچے نہ اترے، آپ کی نیک پارسا بہو نے ایک پتھر لا کر آپ کے دائیں پاؤں کے نیچے رکھ کر دھویا، پھر وہی پتھر دوسرے پاؤں کے نیچے رکھ کر دھویا۔

یہ پہلی مرتبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقام ابراہیم پر کھڑا ہونا تھا۔ کہ آپ نے اس پر یکے بعد دیگرے کھڑے ہو کر پاؤں کو دھلوا دیا۔

پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام تیسری مرتبہ تشریف لائے، اس مرتبہ آپ نے خیال کیا اب اسماعیل علیہ السلام کو مل کر رہی جاؤں گا۔ آپ کعبہ شریف کے پاس ہی رک گئے۔ کچھ دیر بعد اسماعیل علیہ السلام آ گئے۔ زمزم کے قریب تیر درست کرنے لگے، باپ بیٹے نے ایک دوسرے کو دیکھا، گلے لگ کر ملے۔

دوسری مرتبہ مقام ابراہیم پر کھڑا ہونا اس وقت ثابت ہے جب کہ آپ کعبہ شریف کی تعمیر کر رہے تھے، آپ اس پتھر پر کھڑے ہوتے تو وہ نرم ہو جاتا، تاکہ آپ کے پاؤں کو تکلیف نہ ہو، اس پتھر پر آپ کے قدموں کے نشان پڑ گئے۔

(ماخوذ از خازن)

☆ "عن انس قال رأيت في المقام اثر اصابعه وعقبه و اخمص قدميه غير انه اذهب مسح الناس بايديهم"

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے مقام ابراہیم میں ابراہیم علیہ السلام کے پاؤں مبارک کی انگلیوں اور ایڑیوں اور قدم کے تلوے اور ایڑی کے درمیان والے حصہ کے نشانات کو دیکھا، لیکن لوگوں کے اسے ہاتھ لگانے (اور چومنے) سے اس سے نشانات مٹ گئے ہیں۔

(فرطی)

تیسری مرتبہ آپ مقام ابراہیم پر اس وقت کھڑے ہوئے جب آپ کعبہ شریف کی تعمیر سے فارغ ہوئے، تو آپ مقام ابراہیم کو ساتھ لے گئے، جبل ابی قیس پر کھڑے ہو کر۔ "نادی ایہا الناس حجوا بیت ربکم" نداء دی اے لوگو اپنے رب کے گھر کا حج کرو۔

یہ بھی خیال رہے کہ آپ جب اس پتھر پر کھڑے ہو کر کعبہ شریف کی تعمیر کرتے تو فارغ ہونے پر پتھر کو ایک طرف رکھ دیتے تھے۔ اس پتھر کو رکھنے کی کوئی معین جگہ نہ تھی، ابراہیم علیہ السلام کے بعد یہ کعبہ شریف کے اندر بھی رہا۔

البتہ بعد میں "وضع بعیدا من الحجر الاسود بسبعة وعشرين ذراعا" اس کو حجر اسود سے ستائیس ذراع دور رکھ دیا گیا۔

(روح المعانی)

اب بھی تقریباً وہیں ہے۔ چار پانچ فٹ بلند گول خول میں بند ہے، جسے شیشہ لگا ہوا ہے۔ چلتے چلتے کچھ نظر آ جاتا ہے۔ لیکن اسکے پاس کھڑے ہو کر غور سے دیکھنے کی سعودیہ کے خدام اجازت نہیں دیتے۔

حجر اسود اور مقام ابراہیمؑ کی یاقوت ہیں:

”عن عبد اللہ بن عمرو بن العاص قال سمعت رسول اللہ ﷺ يقول ان الركن والمقام ياقوتان من ياقوت الجنة طمس الله نورهما ولو لم يطمس نورهما لضاء ما بين المشرق والمغرب“

(اخرجه الترمذی)

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے میں نے سنا کہ بے شک حجر اسود اور مقام ابراہیمؑ جنت کے یاقوتوں میں سے یاقوت ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کے نور کو مٹا دیا ہے۔ اگر ان کا نور مجھونہ کیا جاتا تو یہ مشرق و مغرب کے درمیان روشنی پھیلاتے۔

ترمذی نے بیان کیا ہے کہ یہی حدیث حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے موقوف طریقہ سے بھی

(خازن)

ثابت ہے۔

تعمیر کعبہ:

آدم علیہ السلام کی تعمیر: ابن عساکر وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام جب جنت سے تشریف لائے تو بارگاہ الہی میں عرض کیا کہ خدایا میں یہاں نہ تو ملائکہ کی تسبیح و تکبیر سنتا ہوں اور نہ کوئی عبادت گاہ دیکھتا ہوں، جیسے کہ آسمان میں بیت المعمور دیکھتا تھا۔ جس کے ارد گرد ملائکہ طواف کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا جاؤ جہاں ہم نشان بتاتے ہیں وہاں کعبہ بنا کر اس کے ارد گرد طواف بھی کر لو اور اس کی طرف نماز بھی ادا کرو۔ حضرت جبرائیل آدم علیہ السلام کی رہبری کے لئے ان کے ساتھ چلے اور انہیں وہاں لائے جہاں سے زمین بنی تھی یعنی کعبہ کی جگہ سے ہی سب سے پہلے پانی پر جھاگ، پھر جھاگ سے زمین کی ابتداء ہوئی۔

جبرائیل نے وہاں اپنا پر مار کر ساتویں زمین تک بنیاد ڈال دی جس کو ملائکہ نے پانچ پہاڑوں کے پتھروں سے بھرا، وہ یہ ہیں۔ کوہ لبنان، کوہ طور، جودی، حرا اور طور زیتا۔

بنیاد بھر کر نشان کے لئے ہر چار طرف کو دیوار اٹھادی، اس طرف منہ کر کے آدم علیہ السلام نماز پڑھتے رہے، اور اس کا طواف بھی کرتے رہے۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ بیت المعمور کو اس بنیاد پر

طوفان نوح میں بیت المعمور کو اٹھالیا گیا اور کعبہ کی جگہ اونچے ٹیلے کی طرح رہ گئی، لوگ یہاں آتے رہے، اور برکت کی دعاء کرتے رہے۔ (از عزیزی)

☆ "عن ابن عباس رضی اللہ عنہما قال علیہ السلام اول بقعة وضعت فی الارض موضع البيت ثم مدت منها الارض وان اول جبل وضعه الله تعالى علی وجه الارض ابوقبیس ثم مدت منه الجبال"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سب سے پہلے زمین کا وہ حصہ بنایا گیا جو کعبہ شریف کا مقام ہے پھر اسی سے اور زمین کو پھیلا یا گیا۔ اور بے شک سب سے پہلے پہاڑ جس کو زمین پر رکھا گیا وہ ابوقبیس ہے۔ اور اسی سے پھر اور پہاڑ پھیلانے گئے۔ (از کبیر)

روایت میں ذکر ہے۔ "فحج آدم البيت من الهند اربعین سنة" آدم علیہ السلام سے ہند سے بیت اللہ شریف کے چالیس حج کئے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کعب سے سوال کیا یہ بیت اللہ کس طرح کا تھا؟ مطلب سوال کا یہ تھا کہ جب مشہور یہ ہے کہ بیت اللہ شریف کی تعمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کی تو اس وقت کیا صورت ہوگی۔

تو انہوں نے جواب دیا "ان هذا البيت انزلہ الله من السماء یا قوتہ مجوفة" بیشک اس وقت بیت اللہ شریف کی یہ موجودہ حالت نہیں تھی بلکہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں سے یا قوت کا خول جو بیت کی طرح تھا اتار کر ان بنیادوں پر رکھ دیا تھا جو فرشتوں نے کھودی تھیں۔

خیال رہے کہ اس روایت کے مطابق بیت المعمور کو آسمانوں سے زمین پر نازل نہیں کیا گیا۔ بلکہ آسمانوں سے یا قوت جو بیت کی طرح تھا اسے نازل کیا گیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

☆ "وعن علی رضی اللہ عنہ قال البيت المعمور بیت فی السماء وهو بحیال الکعبة من فوقها حرمتہ فی السماء کحرمة البيت فی الارض یصلی فیہ کل یوم سبعون من الملائكة لا یعودون فیہ ابدًا"

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا "البيت المعمور" آسمانوں میں ایک گھر ہے، وہ کعبہ شریف کی بالکل

سیدھ پر آسمانوں پر واقع ہے۔ اس کی عزت آسمانوں میں ایسے ہی ہے جیسے زمین میں بیت اللہ شریف کی ہے۔ اس میں ہر دن ستر ہزار فرشتے نماز پڑھتے ہیں۔ جو ایک دفعہ نماز ادا کر لیتے ہیں۔ پھر ان کو کبھی دوبارہ نماز ادا کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔ یعنی فرشتوں کی بہت زیادہ تعداد کی وجہ سے ان کو دوبارہ موقع نہیں ملے گا۔

(از کبیر)

ابراہیم علیہ السلام کی تعمیر:

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب حضرت ہاجرہ اور اپنے بیٹے اسماعیل کو یہاں چھوڑا اور یہاں آبادی ہو گئی تو ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ اسماعیل کو ساتھ لے کر کعبہ تعمیر کرو، ایک بادل کا ٹکڑا بھیج کر کعبہ کی حد کو واضح کیا گیا۔ اور جبرائیل نے خط کھینچ دیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آدم علیہ السلام کے زمانہ کی بنیادوں پر ہی عمارت تعمیر فرمائی۔ کعبہ شریف کی بلندی نو ہاتھ۔ رکن اسود سے رکن شامی تک ۳۳ ہاتھ۔ رکن غربی سے رکن یمانی تک ۳۱ ہاتھ، رکن یمانی سے رکن اسود تک ۲۰ ہاتھ۔ رکن شامی سے رکن غربی تک ۲۲ ہاتھ۔

یعنی کعبہ اس وقت مستطیل تھا۔ لیکن طول اور عرض کی ایک ایک دیوار معمولی چھوٹی تھی۔ دروازے دو بنائے گئے، جو زمین کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔ کواڑ، زنجیر وغیرہ نہیں تھے۔ بعد میں تبع حمیری کے زمانہ میں کواڑ زنجیر وغیرہ لگائے گئے۔

ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ شریف کو تعمیر فرمایا اور اسماعیل علیہ السلام پتھر اور گارہ وغیرہ دیتے تھے۔ سبحان اللہ کس شان سے اللہ کا گھر تعمیر ہوا۔ اللہ کا نبی ہی معمار اور اللہ کا نبی ہی معاون۔

(از عزیز، نعیمی)

خیال رہے کہ اوپر جو رکن کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس سے مراد کونہ، رکن اسود سے مراد وہ کونہ ہے دیوار کا جس میں حجر اسود نصب ہے۔ اسی طرح ہاتھ سے مراد انگلیوں سے لے کر کہنیوں تک لمبائی یعنی تقریباً ڈیڑھ فٹ، ۲۰ ہاتھ کا مطلب تیس فٹ۔

ابراہیم علیہ السلام کی تعمیر کے بعد:

آپ کی تعمیر کے بعد جزوی طور پر مختلف اوقات میں تعمیر ہوتی رہی۔ ایک مرتبہ عمالقہ اور جرہم نے اسے تعمیر کیا۔ اس کے بعد قصی بن کلاب نے اس کی تعمیر کی جس میں چھت درخت مقل کی لکڑی کی بنائی جس پر بجائے تختوں کے خرے کی لکڑی ڈالی۔

قریش کی تعمیر:

ایک عورت کعبہ شریف میں خوشبو سلگاتی تھی، ایک بار اچانک اس سے شعلہ اٹھا اور چھت جل گئی۔ اور دیواریں پہلے بوسیدہ ہو چکی تھیں۔ اس لئے قریش نے فیصلہ کیا کہ مکمل طور پر نئی تعمیر کی جائے۔

ولید بن مغیرہ کو عمارت کا امیر مقرر کیا گیا اور یہ طے ہوا کہ اس میں حلال مال خرچ ہوگا۔ اس وقت کے امیر لوگوں کے پاس زیادہ سود کے مال سے حاصل کردہ مال ہوتا تھا۔ اس لئے حلال مال کم مقدار میں جمع ہوا۔ قریش نے مال کی کمی اور کچھ اپنے مقاصد کے پیش نظر چند فرقہ کر دئے۔

(۱) کعبہ کی کچھ زمین باہر نکال دی یعنی عمارت کو چھوٹا کر دیا۔ کعبہ سے باہر نکالی ہوئی زمین کو عظیم کہا جاتا ہے اسی میں میزاب رحمت (پرنا لہ) گرتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی دیوار سے آج بھی اسے علیحدہ نمایاں کیا ہوا ہے۔ طواف اس کے باہر سے ہی ہوتا ہے۔

(۲) قریش نے دو دروازوں کے بجائے ایک کر دیا۔ وہ بھی بہت بلند تھا کہ جسے چاہیں اندر جانے دیں۔ اور جسے چاہیں نہ جانے دیں۔ اب بھی اس پر عمل ہو رہا ہے۔ بادشاہوں کے لئے دروازہ کھلتا ہے خواہ وہ کتنے ہی بدکار کیوں نہ ہوں، صلحاء اتقیا کے لئے کبھی دروازہ کھلنے کی خبر نہیں سنی گئی۔

(۳) خانہ کعبہ کے اندر لکڑی کے ستونوں کی دو صفیں بنائی گئیں۔ ہر صف میں تین ستون بنائے گئے

(۴) کعبہ شریف کی بلندی پہلے سے دو گنا کر دی گئی۔ پہلے بلندی نو ہاتھ تھی، انہوں نے اٹھارہ

ہاتھ کر دی۔

حضرت عبداللہ بن زبیر کی تعمیر:

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے کعبہ کے متصل بنیاد ابراہیمی (یعنی حطیم) کے پتھر مجھے دکھائے اور فرمایا کہ قریش نے اس میں کمی کر دی تھی، لوگ اگر نئے نئے مسلمان نہ ہوتے اور ان کے جذبات بھڑکنے کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں ابراہیمی بنیادوں پر کعبہ دوبارہ تعمیر کر دیتا۔

اسی روایت کی بنیاد پر حضرت عبداللہ بن زبیر نے کعبہ شریف کو منہدم کر کے دوبارہ تعمیر کیا، حطیم کو کعبہ میں داخل کیا، دروازے دو بنائے جو زمین کے متصل تھے، خوشبودار مٹی چونہ میں ملا کر گارا لگایا گیا، دروازوں پر اندر باہر عنبر لگا کر خوشبودار کیا گیا، نہایت قیمتی ریشمی غلاف چڑھایا گیا۔ خیال رہے کہ سب سے پہلے کعبہ شریف کو غلاف چڑھانے والے کا نام اسعد ہے جو شاہ یمن تھا اور تبع کے لقب سے مشہور تھا۔ مدینہ طیبہ کی شہری بنیاد رکھنے والا یہی ہے۔

عبداللہ بن زبیر کی تعمیر ۲۷ رجب ۶۲ھ کو مکمل ہوئی۔ پھر حجاج بن یوسف (جو عبدالملک بن مروان کا نائب تھا) نے ۷۷ھ میں عمارت کو منہدم کر کے پھر اسی طرح بنا دیا جیسے قریش نے بنایا تھا۔ پھر ہارون الرشید نے چاہا کہ کعبہ اس طرح بنا دیا جائے جیسے عبداللہ بن زبیر نے تعمیر کیا تھا، یعنی دراصل وہی ابراہیمی تعمیر بھی تھی۔ لیکن اس وقت کے اہل علم نے اس سے منع کیا کہ کوئی تمہارا مخالف آئے گا۔ وہ پھر تبدیل کر دے گا۔ اس طرح گرانا اور بنانا ایک کھیل بن جائے گا۔ اس کے بعد کئی مرتبہ مرمت ہوتی رہی۔ لیکن مکمل طور پر پوری عمارت کو دوبارہ نہیں بنایا گیا۔

کعبہ کی موجودہ تعمیر:

۱۰۲۰ھ میں سلطان مراد بن احمد خان شاہ قسطنطنیہ نے جب دیکھا کہ اس کی عمارت بہت پرانی ہو گئی ہے۔ تو اس نے سوائے رکن حجر اسود (وہ کونہ جس میں حجر اسود نصب ہے) کے تمام عمارت منہدم کر

لیکن انہی بنیادوں اور اسی طرز پر جو حجاج بن یوسف نے بنائی تھی، اندر سنگ مرمر کا فرش بچھایا، اور اندر چھت پر نہایت نفیس مخملی چھت گیری لگائی۔ اور باہر کی دیواریں سنگ خارا سے چونہ میں چنیں۔ نہایت نفیس ریشمی سیاہ پردہ تمام خانہ کعبہ پر ڈالا جس پر کلمہ ”لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ﷺ“ لکھا ہوا تھا۔ اور سنہری حاشیہ پر سلطان کا نام تھا۔

موجودہ کعبہ سلطان مراد کا بنا ہوا ہے، یعنی مکمل عمارت کو منہدم کر کے اس کے بعد نئے سرے سے تعمیر نہیں کیا گیا۔ یعنی اب کعبہ ان بنیادوں پر ہی ہے جو نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں تھیں۔

(ماخوذ از عزیزی و نعیمی)

تنبیہ: شیخ احمد بیہقی رحمہ اللہ نے کتاب شعب الایمان میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ذکر کی، وہ کہتے ہیں میں نے کہا یا رسول اللہ سب سے پہلے زمین میں کون سی مسجد بنائی گئی؟

”قال المسجد الحرام قال قلت ثم ای؟ قال ثم المسجد الاقصی قلت کم بینہما؟ قال اربعون سنة فاینما ادرکتک الصلوة فصل فهو مسجد“

آپ نے فرمایا مسجد حرام، انہوں نے پھر پوچھا اس کے بعد تو آپ نے فرمایا مسجد اقصیٰ، یہ کہتے ہیں، میں نے پھر پوچھا ان دونوں میں کتنا فاصلہ ہے؟ تو آپ نے فرمایا چالیس سال، پھر آپ نے فرمایا جہاں بھی تمہیں نماز کا وقت آجائے وہاں ہی نماز ادا کر لیا کرو وہی مسجد ہے۔

اس حدیث پاک سے مراد سب سے پہلے انسانوں کی طرف سے تعمیر ہونے والی مسجد کے لئے آپ نے بیان فرمایا۔ کیونکہ آدم علیہ السلام کے دور میں تو جنتی یا قوت یا بیت المعمور کو بنیادوں پر رکھ دیا گیا تھا۔ اس کے بعد سب سے پہلے بننے والی مسجد حرام ہے۔ جو ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر فرمائی۔ اور مسجد اقصیٰ سب سے پہلے حضرت اسحاق علیہ السلام نے تعمیر فرمائی۔ سلیمان علیہ السلام نے بہت دیر بعد اس کی نئی تعمیر کی۔

اس لئے چالیس سال کا وقفہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسحاق علیہ السلام کی تعمیروں کے

درمیان ہے۔

﴿ وَعَهْدُنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ أَنَّ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ
وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ ﴾

اور ہم نے تاکید فرمائی ابراہیم اور اسماعیل کو کہ سہرا کریں میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور
اعتکاف والوں اور رکوع کرنے والوں، سجدہ کرنے والوں کے لئے۔

وَعَهْدُنَا: ”الزمننا ہما ذلک، و امرنا ہما امرًا، وثقنا علیہما فیہ“ ہم نے لازم کیا
ہے ابراہیم اور اسماعیل پر اور ہم نے حکم دیا ان دونوں کو، اور پختہ وعدہ لیا ان دونوں سے اس کا، یعنی ان
دونوں کو تاکید فرمائی۔ ”وقیل اوحینا“ بعض حضرات نے یہ معنی بھی یہاں کیا کہ ہم نے وحی کی ابراہیم
اور اسماعیل کی طرف۔

(کبیر)

مطلب تمام معانی کا ایک ہی ہے، کہ ہم نے بذریعہ وحی ان کو تاکید کی حکم دے کر ان پر لازم کر دیا۔
أَنَّ طَهِّرَا بَيْتِيَ: (سہرا رکھیں میرے گھر کو)
”فیجب ان یراد بہ التطہیر من کل امر لایلیق بالبت“

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام کو رب تعالیٰ نے جو تاکید کی حکم فرمایا کہ میرے
گھر کو پاک اور صاف سہرا رکھو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو اللہ کے گھر کے لائق نہیں اس سے
اللہ کے گھر کو پاک رکھو۔ جب بیت اللہ شریف کا مقام اور اس کا ارد گرد نماز ادا کرنے کے لئے ہے۔

”وجب تطہیرہ من الانجاس والاقذار“ تو ضروری ہے کہ اسے نجاست اور ہر قسم کی
گندگی سے پاک رکھا جائے یہی حکم ہر مسجد کا ہے تاکہ اللہ کے گھر کا تقدس قائم رہے۔

”واذا کان موضع العبادة والاخلاص لله تعالیٰ وجب تطہیرہ من الشرک وعبادة غیر الله تعالیٰ“
اور جب عبادت اور اخلاص اللہ تعالیٰ کے لئے ہے تو ضروری ہے کہ اللہ کے گھر کو شرک اور غیر
اللہ کی عبادت سے پاک رکھا جائے۔ یعنی اللہ کا گھر ظاہری اور باطنی گندگی سے پاک ہو، نہ اس میں
شرک ہو، اور نہ اس میں گندگی کے ڈھیر لگے ہوں، ہر قسم کے خس و خاشاک سے پاک رکھنا ضروری ہے

(از کبیر)

”(أَنَّ طَهِّرَا بَيْتِيَ) اى من الاوثان والرفث وقول الزور والرجس“

ہم نے ابراہیم اور اسماعیل کو تاکید فرمائی کہ میرے کھر کو بت پرستی اور بے حیائی، اور جھوٹے کلام

اور نجاست سے پاک رکھنا۔

”قال مجاهد وعطاء وقتادة (أَنْ طَهَّرَ آيَتِي) بلا اله الا الله من الشرك“

حضرت مجاہد اور عطاء اور قتادہ رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ رب تعالیٰ نے ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کو جو اپنا گھریا کیزہ رکھنے کا حکم دیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ”لا الہ الا اللہ“ اس گھر میں پڑھ کر شرک سے پاک رکھو۔

سبحان اللہ کیا خوب مسئلہ حل ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر اس کے گھر میں کرنے سے رب کا گھر پاک رہتا ہے، رب کے ذکر سے روکنے والے کیا شرک سے آلودہ ہی رکھنا چاہتے ہیں۔

آئیے معتبر تفاسیر کے بعد مودودی صاحب کے زہر آلود کلام کو بھی دیکھئے کہ اصل مقصد سے ہٹ کر وہ انبیاء کرام اور اولیاء کرام پر کیسے خفیہ تیر چلاتے ہیں۔

مودودی صاحب فرماتے ہیں: ”پاک رکھنے سے مراد صرف یہی نہیں ہے کہ کوڑے کرکٹ سے اسے پاک رکھا جائے، خدا کے گھر کی اصل پاکی یہ ہے کہ اس میں خدا کے سوا کسی کا نام بلند نہ ہو۔ جس نے خانہ خدا کے سوا کسی دوسرے کو مالک، معبود۔ حاجت روا اور فریادرس کی حیثیت سے پکارا، اس نے حقیقت میں اسے گندا کر دیا۔

(تفہیم)

راقم کی ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ کی وضاحت میں ابحاث کو دیکھیں تو آپ کو پتہ چل جائے گا کہ مسلمان بہت کس طرح انبیاء کرام اور اولیاء کرام کو حاجت روا اور فریادرس مانتے ہیں۔

تیری انکے تو وکیلوں سے کرے استمداد

یا محمد سے بگڑتی ہے طبیعت تیری

اعتراض : بیت اللہ شریف کو پاک اور صاف ستھرا کرنے کا حکم دینے کا کیا مطلب ہے؟ کیا اس سے پہلے بیت اللہ شریف میں بت پرستی تھی یا وہاں گندگی ڈالی جاتی تھی۔

جواب: یہ کلام اس طرح ہے جیسا کہ کوئی شخص کنواں کھودنے لگے تو اسے کہا جائے۔ ”ضیق فم الرکیة“ کنویں کا منہ تنگ رکھنا اس کا مطلب یہ ہے کہ ابتدائی طور پر ہی منہ تنگ رکھنا، اس کا یہ مطلب

نہیں، کہ پہلے منہ کھلا رکھنا پھر تنگ کرنا۔

اسی طرح یہاں حکم دیا گیا کہ تم تعمیر کے وقت ہی اسے پاک اور صاف ستھرا بنانا، اعلان فرمانا کہ نوح علیہ السلام کی قوم کی طرح بت پرستی نہ کرنا، اور جیسے وہ عبادت خانوں میں بت رکھ دیتے تھے اے قوم تم ایسا نہ کرنا۔

اور ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام کو آنے والے لوگوں کی تعلیم کیلئے حکم دیا گیا کہ تم بیت اللہ کو طہارت قلبی یعنی تقویٰ کے طور پر تعمیر کرنا۔ اللہ تعالیٰ کے انبیاء کرام کے افعال میں تقویٰ کے خلاف کا تصور تو ممکن ہی نہیں۔ البتہ بعد میں آنے والوں لوگوں کی تعلیم کیلئے ان حضرات کو یہ حکم دیا گیا۔

(ماخوذ از شیخ زادہ و کبیر)

لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ :

طواف کرنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لئے۔

طواف کرنے والوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو بیت اللہ شریف میں حج اور عمرہ کی غرض سے آتے ہیں اور طواف کرتے ہیں۔ یہ بھی خیال رہے کہ مکہ والے حضرات اکثر طور پر نمازوں کے اوقات میں طواف کرتے رہتے ہیں، اسلئے مراد مطلق طواف بھی ہو سکتا ہے۔ ضروری نہیں کہ حج اور عمرہ کا طواف ہی ہو۔

(الْعَاكِفِينَ) سے مراد مسجد حرام یا بیت اللہ شریف کے اندر اعتکاف کرنے والے لوگ ہیں۔ یہ خیال رہے کہ ”عکف“ ضرب اور نصر دونوں بابوں پر آتا رہتا ہے۔ معنی اس کا ”لزم الشئ“ و اقام علیہ“ کسی چیز کو لازم پکڑنا اور اس پر قائم رہنا ہے۔

(وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ) سے مراد وہاں نماز پڑھنے والے لوگ ہیں۔ (از کبیر بزیادة)

مسئلہ : ”ان الطواف للغرباء افضل من الصلوة“ باہر سے آنے والے لوگوں کے لئے طواف کرنا افضل ہے نماز سے۔

(کبیر)

وجہ اس کی واضح ہے کہ باہر سے آنے والوں کو روز روز آنا تو نصیب نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ اس وقت کو غنیمت سمجھتے ہوئے جتنا ممکن ہو سکے طواف ہی کریں۔ شامی نے بھی یہی بیان کیا ہے جو راقم نے

نور الايضاح کے حاشیہ ذریعۃ النجاح میں بیان کیا ہے۔

مسئلہ : ”تدل الآية على جواز الصلوة في البيت فرضا كان او نفلا“ آیت

کریمہ سے یہ بھی واضح ہو رہا ہے کہ بیت اللہ شریف میں اعتکاف بیٹھنا جائز ہے۔ (کبیر)

مسئلہ : ”تدل الآية على جواز الاعتكاف في البيت“ آیت کریمہ سے یہ بھی واضح

ہو رہا ہے کہ بیت اللہ شریف میں نماز جائز ہے خواہ فرض ہو یا نفل۔ (کبیر)

”عن ابن عمر قال دخل رسول الله ﷺ هو واسامة بن زيد و بلال و عثمان بن طلحة الحنظلي البيت فاعلقوا عليهم الباب فلما فتحو اكدت اول من ولج فلقيت بلالا فسأله هل صلى فيه رسول الله ﷺ قال نعم بين العمودين اليمانيين“ (بخاری، مسلم)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ اور اسامہ بن زید اور بلال اور عثمان بن طلحہ حنظلی رضی اللہ عنہم بیت اللہ شریف میں داخل ہوئے، دروازہ بند کر دیا گیا۔ جب ان حضرات نے دروازہ کھولا تو سب سے پہلے میں داخل ہوا، اور حضرت بلال کو ملا، ان سے پوچھا کیا رسول اللہ ﷺ نے بیت اللہ شریف کے اندر نماز پڑھی ہے؟ انہوں نے کہا ہاں آپ نے دو یمنی ستونوں کے درمیان نماز پڑھی۔ مسلم میں یہ الفاظ مبارکہ زائد ہیں۔

”جعل عمودين عن يساره و عمودا عن يمينه و ثلاثة اعمدة وراءه و كان البيت يومئذ على ستة اعمدة“

ایک ستون آپ کے دائیں جانب تھا اور دوسری جانب اور تین آپ کے پیچھے تھے۔ اس وقت بیت اللہ شریف کے چھ ستون تھے۔

فائدہ :

”لما قال الله تعالى ﴿أَنْ طَهَّرَ بَيْتِي﴾ دخل فيه بالمعنى جميع بيوته تعالى ، فيكون حكمها حكمه في التطهير والنظافة“

اسی آیت کریمہ سے یہ مسئلہ بھی سمجھ آ گیا کہ کعبہ شریف کی طرح ہی تمام مساجد کو پاک اور صاف ستھرا رکھنے کا حکم ہے۔ البتہ کعبہ شریف کا خصوصی حکم اس کی عظمت اور اس وقت دوسری مسجد کے نہ ہونے

کی وجہ سے تھا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔

﴿فِي بُيُوتٍ أُذِنَ لِلَّهِ أَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ يُسَبِّحُ لَهُ فِيهَا بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ﴾

(النور، آیت ۲۶)

ان گھروں میں جنہیں بلند کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ اور ان میں اس کا نام لیا جاتا ہے اللہ کی تسبیح کرتے ہیں ان میں صبح اور شام۔

☆ ”وروی عن عمر بن الخطاب ؓ انه سمع صوت رجل في المسجد فقال ما هذا اتدري اين انت“

حضرت عمر بن خطاب ؓ نے ایک شخص کو زور زور سے مسجد میں چلاتے ہوئے سنا، تو آپ نے فرمایا، یہ کیا ہے؟ کیا تمہیں معلوم نہیں تم کہاں ہو۔

یعنی مسجد کا احترام ضروری ہے۔ مسجد میں شور و غل، اور دنیاوی باتوں میں بلا مقصد مشغول رہنا مسجد کے وقار کے منافی ہے۔

مسئلہ: ﴿أَنْ طَهَّرَ ابَيْتِي﴾ سے ہی سمجھ آیا کہ مسجد میں کسی جنبی شخص کا داخل ہونا، یا حیض یا نفاس والی عورت کا مسجد میں داخل ہونا جائز نہیں۔

(از روح المعانی)

طواف کی اقسام:

طواف کی تین قسمیں ہیں۔ یہ آیت ان تمام قسموں کو شامل ہے۔

(۱) فرض: یہ طواف زیارۃ ہے۔ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ﴾ (سب سے پہلے مکرم گھر کا طواف کرو) یہ طواف زیارۃ دس ذی الحج کو ہوتا ہے۔ البتہ گیارہ اور بارہ کو کرنے کی بھی اجازت ہے۔

(۲) واجب: یہ طواف صدر ہے۔ جسے طواف الوداع بھی کہا جاتا ہے۔ یہ حج سے فارغ ہونے پر لوٹتے وقت کیا جاتا ہے۔ اس کا وجوب حدیث پاک سے ثابت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

”من حج البيت فليكن آخر عهده بالبیت الطواف“ جو شخص بیت اللہ شریف میں
کرے اس کا آخری کام طواف ہو۔

(۳) سنت اور مستحب: یہ طواف قدوم ہے، جو مکہ میں پہنچنے پر سب سے پہلے طواف کیا جاتا ہے۔
یہ سنت ہے واجب نہیں۔ مسنون اس لئے ہے کہ نبی کریم ﷺ نے یہ طواف کیا ہے۔

حکماء نظر

مسئلہ: طواف زیارۃ کے قائم مقام کوئی چیز نہیں۔ جب تک طواف زیارۃ نہ کی جائے تا کہ محرم میں
رہتا ہے۔ جب یہ طواف کر لے گا تو اس کی زوجہ اس کے لئے حلال ہوگی۔

طواف صدر رہ جائے تو اس کا قائم مقام دم ہے۔ یعنی جانور ذبح کر کے اس کا جبیرہ بنائے
(بدل ادا کرے) طواف قدوم کی ترک سے اگرچہ سنت کی ترک تو لازم آتی ہے۔ لیکن دم وغیرہ لازم
نہیں آتا۔ (احکام القرآن للخصاص)

مسئلہ: ہر طواف جس کے بعد سعی ہو اس میں رمل ہے پہلے تین چکروں میں، رمل کا مطلب
یہ ہے کہ کندھے ہلا ہلا کر مجاہدوں کی طرح چلنا جس طرح میدان جنگ کی صفوں میں مجاہدین چلتے
ہیں اور ہر وہ طواف جس کے بعد صفا اور مروہ کے درمیان سعی نہیں اس میں رمل نہیں۔

یعنی طواف قدوم (جو سب سے پہلے آتے ہوئے طواف کیا جاتا ہے) کے بعد چونکہ صفا اور
مروہ کے درمیان سعی ہے۔ اس لئے اس میں پہلے تین چکروں میں سعی ہے۔

اگر دیر سے پہنچا طواف قدوم نہیں کر سکا۔ یا اس کے بعد سعی نہیں کر سکا تو اب سعی طواف زیارۃ
کے بعد کرے گا۔ اور اسی کے پہلے تین چکروں میں رمل کرے گا۔ لیکن اگر طواف قدوم اور سعی پہلے کر چکا
ہے تو صرف طواف قدوم والا رمل ہی ہوگا۔ بعد میں طواف زیارۃ اور طواف صدر میں رمل نہیں۔

عمرہ کے طواف میں رمل کرے گا۔ کیونکہ اس کے بعد صفا اور مروہ کے درمیان سعی ہے۔

☆ ”روی ابن عمر ان النبی ﷺ رمل فی الثلاثة الاشواط من الحجر الی الحجر“

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ (طواف کے) پہلے تین چکروں میں حجر اسود سے
حجر اسود تک رمل کیا۔

رمل کے سنت ہونے کی وجہ:

”انما کان ذلک سنة حین فعلہ النبی ﷺ مرانیا بہ للمشرکین اظہارا للتجلد والقوة فی عمرة القضاء لانہم قالوا قد اوہنتہم حمی یثرب فامرہم باظہار الجلد لئلا یطمع فیہم“

نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام جب عمرہ کی قضاء کے لئے تشریف لائے، تو مشرکین نے کہا کہ ان لوگوں کو تو یثرب کے بخار نے کمزور کر دیا ہے تو نبی کریم ﷺ نے رمل کیا اور صحابہ کرام کو بھی رمل کا حکم دیا تا کہ ان پر مسلمانوں کی بہادری اور قوت واضح ہو جائے۔ یہی وجہ ہے رمل کے سنت ہونے کی۔

(از احکام القرآن للجصاص)

﴿وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَذَا بَلَدًا آمِنًا وَارْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرَاتِ مَنْ آمَنَ مِنْهُمْ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ط قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَأُمَتِّعُهُ قَلِيلًا ثُمَّ أَضْطَرُّهُ إِلَىٰ عَذَابِ النَّارِ ط وَبِئْسَ الْمَصِيرُ﴾

(۱) اور جب عرض کی ابراہیم نے کہ میرے رب اس شہر کو امان والا کر دے، اور اس کے رہنے والوں کو طرح طرح کے پھلوں سے روزی دے، جو ان میں اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائیں۔ فرمایا اور جو کافر ہو تھوڑا برتنے کو اسے بھی دوں گا، پھر اسے عذاب دوزخ کی طرف مجبور کر دوں گا، اور وہ بہت بری جگہ ہے بیٹھنے کی۔

(۲) اور (یاد کرو) جب کہا ابراہیم نے اے میرے رب کر دے اس جگہ کو شہر امن والا، اور روزی دے اس کے رہنے والوں کو پھلوں سے جو ایمان لائے ان میں سے اللہ پر اور آخرت کے دن پر، فرمایا جس نے کفر کیا تو میں فائدہ پہنچاؤں گا اسے تھوڑا، پھر میں اسے مجبور کر دوں گا آگ کے عذاب کی طرف، اور وہ بہت برا ٹھکانا۔

(آیت نمبر ۱۲۶)

ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعاء اس وقت کی ہے جب آپ نے اپنی زوجہ حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل کو مکہ کی زمین میں چھوڑا جب وہاں کوئی شہر نہیں تھا، کوئی آبادی نہیں تھی، آپ کی اس دعاء کا

مطلب یہ تھا کہ اے اللہ اس غیر آباد جگہ کو امن والا شہر بنادے۔

”فَكَانَ هَهُنَا رَبِّ اجْعَلْ هَذَا الْوَادِي الْقَفْرَ بَلَدًا ذَا أَمْنٍ وَ سَلَامَةٍ“ یعنی اس آیت

کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ اے میرے رب اس خالی، غیر آباد جگہ کو شہر بنادے جو امن والا اور سلامتی والا ہو۔

”فيجوز ان يكون البلد ايضا داخلا تحت الطلب“ اس معنی کے لحاظ پر دعاء میں شہر

کی طلب پائی گئی ہے۔ یعنی ایک مطالبہ یہ تھا کہ اے اللہ اس جگہ کو شہر بنادے، اور دوسرا مطالبہ یہ تھا کہ

اے اللہ اسے امن اور سلامتی والا بنادے۔

”وقال في هذه السورة ﴿رَبِّ اجْعَلْ هَذَا بَلَدًا آمِنًا﴾ ای اجعل هذه البقعة بلدا آمنا و

ناسب هذا لانه قبل بناء الكعبة“

اور اس سورۃ میں ”بلدا“ کو نکرہ ذکر کیا گیا ہے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ اس جگہ کو

امن والا شہر بنا۔ چونکہ یہ دعاء کعبہ شریف کی تعمیر سے پہلے کی ہے۔

اور سورۃ ابراہیم میں ذکر ہے۔ ﴿وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَذَا الْبَلَدَ آمِنًا﴾ اس

میں ”البلد“ معرفہ ذکر ہے کیونکہ یہ دعاء کعبہ شریف کی تعمیر کے بعد کی ہے جب وہاں لوگوں کی آبادی

ہو چکی تھی، اور اسحاق علیہ السلام بھی پیدا ہو چکے تھے اور آپ چھوٹی عمر کے تھے۔

یہ بھی خیال رہے کہ حضرت اسحاق علیہ السلام عمر میں حضرت اسماعیل علیہ السلام سے تیرہ سال

چھوٹے ہیں۔ (از ابن کثیر)

علامہ رازی رحمہ اللہ نے بھی اس آیت میں ”بلدا“ کو نکرہ اور سورۃ ابراہیم میں ”البلد“

معرفہ ذکر کرنے کی ایک وجہ یہی بیان کی، الفاظ کچھ ابن کثیر سے مختلف ہیں۔ عبارت ملاحظہ ہو۔

”ان الدعوة الاولى وقعت ولم يكن المكان قد جعل بلدا كانه قال ، اجعل هذا الوادي

بلدا آمنا لانه تعالى حكى عنه انه قال ﴿رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ﴾

فقال ههنا اجعل هذا الوادي بلدا آمنا ، والدعوة الثانية وقعت وقد جعل بلدا ، فكانه قال

اجعل هذا المكان الذي صيرته بلدا ذا امن و سلامة“ (کبیر)

اس آیت کریمہ میں جو دعاء کی گئی ہے یہ اس وقت تھی جب کہ وہاں کوئی شہر نہیں تھا۔ گویا کہ آپ

کی دعاء کا یہ مطلب ہے کہ اے اللہ تعالیٰ اس وادی کو شہر بنا جس طرح آپ کی یہ دعاء ہے۔ ”اے ہمارے رب بے شک میں نے اپنی اولاد کو ایک وادی میں ٹھہرایا ہے جس میں کھیتی باڑی نہیں ہوتی۔

لیکن آپ کی دوسری دعاء جو سورۃ ابراہیم میں ہے، اس کا یہ مطلب ہے کہ اے اللہ اس جگہ کو تو نے شہر بنا دیا ہے اب اسے امن اور سلامتی والا بنادے۔ یہ دعاء کعبہ شریف کی تعمیر اور مکہ کے آباد ہونے کے بعد کی ہے۔

تنبیہ: ابھی تک جو بحث کی گئی ہے، اسی کے مطابق راقم کا ترجمہ ہے جو دراصل علامہ کاظمی رحمہ اللہ کے ترجمہ سے منقول ہے۔

لیکن علامہ رازی رحمہ اللہ نے دوسری توجیہ یہ ذکر فرمائی۔

”الثانی ان تكون الدعوتان وقعتا بعد ما صار المكان بلدا فقله ﴿اجْعَلْ هَذَا بَلَدًا آمِنًا﴾ تقدیره، ﴿اجْعَلْ هَذَا الْبَلَدَ بَلَدًا آمِنًا﴾ (کبیر)

دوسری وجہ یہ ہے کہ ہو سکتا ہے دونوں دعائیں کعبہ شریف کی تعمیر کے بعد کی گئی ہوں۔ جب کہ وہاں شہر بن چکا تھا۔ اب اس آیت میں ﴿اجْعَلْ هَذَا بَلَدًا آمِنًا﴾ کا مطلب یہ ہوگا، اے میرے رب کر دے اس شہر کو امن والا، یہی ترجمہ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ کا ہے۔

راقم نے دونوں وجہ ذکر کر دی ہیں، تاکہ طلباء کرام کو دونوں ذہن نشین ہو جائیں۔

آمینا: ابراہیم علیہ السلام نے دعاء فرمائی کہ اے اللہ اس جگہ کو امن والا شہر بنا۔ اس امن سے مراد کیا ہے؟ اس میں چند وجوہ ہیں۔ ایک یہ ہے کہ آپ کی دعاء کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ اس جگہ کو قحط اور خشک سالی سے امن میں رکھنا، کیونکہ میں اپنی اولاد کو بیابان جنگل میں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ جہاں نہ تو کھیتی باڑی ہوتی ہے۔ اور نہ ہی کوئی مال مویشی پائے گئے ہیں۔

بظاہر اس پر اعتراض ہے کہ اگر ”امن“ کا یہ ہی معنی مراد لیا جائے تو ابراہیم علیہ السلام کی دعاء میں تکرار ہوگا۔ کیونکہ اس کے بعد اس کے اہل کے لئے پھلوں کی روزی دینے کی دعاء فرمائی۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں تکرار نہیں۔ ”فہو علیہ السلام بالسؤال الاول طلب

ازالة القحط و بالسؤال الثاني التوسعة العظيمة “ کیونکہ آپ کی پہلی دعاء کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ اس مقام سے قحط کو دور رکھنا، اور دوسری دعاء کا مطلب ہے کہ اللہ اس مقام کے باشندوں کی روزی میں وسعت عظیمہ عطاء فرماتا۔

دوسری وجہ امن سے مراد کی یہ ہے۔

”والثاني انه الامن من الخسف والمسح والزلزل والغارات والجنون والجذام والبرص ونحو ذلك من البلايا التي تحل بالبلد“

یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی امن کی دعاء کا یہ مطلب ہے کہ اے اللہ اس جگہ کو خسف و مسح (زمین میں دھنسا دینا اور شکلوں کو تبدیل کر دینا) اور زلزلوں اور لوٹ مار اور جنون (پاگل پن) اور جذام (کوڑھ) اور برص (سفید داغ پڑنا) اور ہر قسم کی مصیبتوں کے واقع ہونے سے اس جگہ کو محفوظ رکھ۔
والثالث الامن من القتل وهو قولابی بکر الرازی حضرت ابو بکر رازی رحمہ اللہ کے ارشاد کے مطابق امتی کی دعاء کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ اسے قتل سے امن والا بنا۔ (خیال رہے کہ جرم کے احکام پہلے بیان ہو چکے ہیں۔)

امام واحدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں۔
”یرید بلدا محرما لا یصاد طیره ولا یقطع شجره ولا یختلی خلاه“

کہ ابراہیم علیہ السلام کی دعاء کا یہ مطلب ہے۔ کہ اے اللہ اس جگہ کو شہر حرم بنا دے۔ اس کے پرندوں کا شکار نہ کیا جائے، اس کے درخت نہ کاٹے جائیں، اور اس کا (سبز) گھاس نہ کاٹا جائے، کیونکہ مکہ مکرمہ یعنی حرم کے شکار کے درپے ہونا، اور شکار کو بھگانا، اور شکار کو اذیت پہنچانا حرام ہے۔

”ومن قتل صید مکة فعليه جزاؤه“ جس شخص نے حرم کے شکار کو قتل کیا اس پر اس کا بدلہ لازم ہے۔ یعنی اس جانور کی قیمت صدقہ کرنا لازم ہے۔

خیال رہے کہ راقم کے نزدیک یہ تمام مطالب مجتمع ہیں۔ یعنی ابراہیم علیہ السلام نے ایک لفظ ”آمنا“ ذکر کر کے اتنی بڑی دعائیں فرمادیں۔

محمد بن صالح الدین شیخ زادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں، کہ میں نے متعدد تفاسیر کی کتب میں دیکھا ہے کہ

حرم کے جانور درندوں سے امن میں ہیں، قدرتی طور پر ان کو رب تعالیٰ کی طرف سے حفاظت حاصل ہے
 "فان الاسد ربما يتبع الظبي خارج الحرم فيفر الظبي منه ويدخل الحرم فيرجع الاسد عنه
 ولا يتبعه في الحرم وان اجتمعا فيه لا يهيج السبع عليه ولا ينفر الصيد منه حتى اذا خرجا
 من الحرم عدا السبع عليه"

بسا اوقات حرم کے باہر شیر پیچھا کرتا ہے ہرن کا، لیکن وہ ہرن جب بھاگ کر حرم میں پہنچ جائے،
 تو شیر پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ اور حرم میں اس کے پیچھے نہیں دوڑتا، اور حرم میں اگر دونوں جمع بھی ہو جائیں تو
 شیر اس پر حملہ نہیں کرتا، ہاں اگر وہ حرم کی حدود سے باہر نکل جائے تو شیر اس پر حملہ کر دیتا ہے

(شیخ زادہ)

سبحان اللہ رب تعالیٰ کی قدرت کتنی عظیم ہے، اور مقام حرم کا کیا خوب مقام ہے، اسی سے یہ
 فائدہ بھی حاصل ہو گیا کہ جانور رب تعالیٰ کے حکم کو مانتے ہیں، تو اے انسان تو اشرف المخلوقات جب
 ہے تو تجھے زیادہ ہی رب تعالیٰ کے احکام کو ماننے کی طرف متوجہ ہونا چاہئے۔

فائدہ:

"فاجاب الله تعالى دعاء ابراهيم وجعله بلدا آمنا فما قصد جبار الاقصمه الله تعالى كما
 فعل باصحاب الفيل وغيرهم"

اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی دعاء کو قبول فرمایا، اور اس جگہ کو امن والا شہر بنایا، جب بھی کسی
 جابر اور ظالم نے کعبہ شریف کو خراب کرنے کی کوشش کی تو رب تعالیٰ نے اسے ذلیل کیا اور برباد کیا، جیسا
 کہ اصحاب فیل (ہاتھی والے لوگ ابرہہ اور اس کے لشکر) وغیرہ کو تباہ و برباد کیا۔

اعتراض:

حجاج بن یوسف نے مکہ پر حملہ کیا، کعبہ شریف کو نقصان پہنچا، تو کس طرح کہا جاسکتا ہے کہ کعبہ کو
 جابروں سے محفوظ رکھا گیا ہے۔

جواب:

"لم يكن قصده بذلك مكة ولا اهلها ولا اضراب الكعبة وانما كان قصده خلع ابن
 الزبير من الخلافة"

حجاج کا مقصد مکہ مکرمہ کو برباد کرنا، یا مکہ والے لوگوں کو تباہ کرنا، یا کعبہ شریف کو خراب کرنا نہ تھا، بلکہ اس کا مقصد حضرت عبداللہ بن زبیر کو خلافت سے معزول کرنا تھا۔ وہ مکہ میں تھے اس لئے حجاج کے حملہ سے کعبہ شریف کو نقصان ہوا۔ لیکن حجاج نے بعد میں کعبہ شریف کو تعمیر بھی کرا دیا۔ اگر حجاج کعبہ شریف کو نقصان پہنچانے کی غرض سے حملہ کراتا تو اسے بھی ایسی ہی ذلت کا سامنا کرنا پڑتا جیسا کہ ابرہہ اور اس کے لشکر کو کرنا پڑا۔

(ارحارن)

وَارْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرَاتِ مَنْ آمَنَ مِنْهُمْ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ :

اور روزی دے اس کے رہنے والوں کو پھلوں سے جو ایمان لائے ان میں سے اللہ پر اور آخرت کے دن پر جب یہ پہلے واضح کیا جا چکا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ تو معلوم تھا کہ امامت یعنی منصب نبوت کے لائق ظالم، کافر نہیں ہو سکتے، لیکن آپ نے ﴿وَمِنْ ذُرِّيَّتِي﴾ کہہ کر رب تعالیٰ سے مطلقاً دعاء فرمادی کہ میری اولاد میں سے بھی بعض کو منصب نبوت عطاء فرمانا۔ اس دعاء میں آپ نے مومنوں کا ذکر نہیں فرمایا، کیونکہ آپ کی توجہ اس طرف نہیں تھی کہ میری اولاد میں کوئی ظالم بھی ہوں گے۔ رب تعالیٰ نے جب ﴿لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ﴾ کہہ کر آپ کی توجہ دلادی کہ ”ظالموں کو میرا وعدہ حاصل نہیں ہوگا۔“ تو اب آپ کی توجہ اس طرف کامل تھی کہ میری اولاد میں کچھ ظالم کافر بھی ہوتے ہیں اس لئے آپ نے جب رزق کی دعاء کی تو صرف مومنوں کا ذکر کیا وجہ صرف یہ تھی کہ مومن کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کافر کی خوشحالی کے لئے اور کافر کے نفع کی دعاء کرے۔

ورنہ کون نہیں جانتا کہ رب تعالیٰ مومنوں کو رزق دیتا ہے۔ اور کافروں کو بھی وہی رزق دیتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی اس مسئلہ سے بخوبی واقف تھے۔ مطلب صرف یہ تھا کہ اے اللہ میں جانتا تو ہوں کہ تو نے کافروں کو بھی رزق دینا ہے لیکن میں تو دعاء صرف مومنوں کے لئے کروں گا۔ علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

”واعلم انه تعالى لما علمه ان منهم قوما كفارا بقوله ﴿لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ﴾ لا جرم خصص دعاءه بالمؤمنين دون الكافرين“

(کبیر)

جان لو کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے جب آپ کو ﴿لَا يَسْأَلُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ﴾ کہہ کر اس
صرف متوجہ کر دیا کہ آپ کی اولاد میں کافر بھی ہوں گے۔ تو یقیناً آپ نے دعاء صرف مومنوں کے لئے
کی، کافروں کے لئے نہیں کی۔

چونکہ رب تعالیٰ نے کافروں پر مہربانی کرنے اور ان پر غم کھانے سے ان الفاظ مبارکہ ﴿فَلَا
تُسْ عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ﴾ سے منع فرمایا ہے۔

”دَعَا لِمُؤْمِنِهِمْ بِالْأَمْنِ وَالْخَصَالِ لَا تَكْفُرْ لَا يَدْعِي لَهُ بِذَلِكَ إِلَّا تَرَىٰ أَنَّ قَرِيشًا لَمَّا طَغَتْ دَعَا
عَلَيْهَا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ اللَّهُمَّ إِنَّا نَدْعُكَ عَلَىٰ مَضْرٍ وَاجْعَلْهَا عَلَيْهِمْ سَنِينَ كَسَنِي يُوسُفَ“

(البحر المحیط)

یعنی ابراہیم علیہ السلام نے اہل مکہ کے صرف مومنوں کے لئے امن اور خوشحالی کی دعاء کی، کیونکہ
کافر کے لئے دعاء نہیں کی جاتی۔ البتہ کافر کے خلاف دعاء کی جاسکتی ہے جس طرح نبی کریم ﷺ نے
قریش کے خلاف دعاء کی جب وہ دین حق کی زیادہ ہی مخالفت کرنے لگے اور سرکش ہو گئے، آپ نے
رب کے حضور یہ عرض کیا۔

اے اللہ مضر قبیلہ پر اپنی گرفت سخت کر دے، اور ان کو اس طرح قحط سالی میں مبتلا کر دے جیسا
کہ یوسف علیہ السلام کے زمانہ کے لوگوں کو قحط سالی میں مبتلا کیا تھا۔

قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَأُمَتِّعُهُ قَلِيلًا : فرمایا جس نے کفر کیا تو میں فائدہ پہنچاؤں گا اسے تھوڑا

یعنی رب تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی دعاء کے بعد فرمایا کہ تم نے اپنی دعاء میں اگرچہ مومنوں
کو خاص کیا ہے۔ اور حق بھی یہی تھا کہ مومنوں کے لئے ہی دعاء کی جائے، لیکن رزق اور پھل میں
کافروں کو بھی عطا کر دوں گا، کیونکہ یعنی دنیاوی نفع ہے جو مومنوں اور کافروں سب کو میں پہنچاتا ہوں۔

نبوت اور رزق دنیا میں فرق:

منصب نبوت اور امامت فاسقوں کے لائق نہیں۔ کیونکہ امامت و نبوت کے لئے ضروری ہے کہ
قوی عزم پایا جائے۔ اور مصائب و آلام پر بہت زیادہ صبر کیا جائے، تاکہ اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی

لوگوں تک کامل طریقہ سے پہنچائے جائیں، دین کے کام میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی کوئی فکر نہ کی جائے۔ کسی جابر و ظالم کے ظلم اور دبدبہ کی کوئی پرواہ نہ کی جائے۔

لیکن دنیا میں رزق کافر اور مومن، مطیع اور عاصی، صادق اور منافق سب کو رب تعالیٰ عطاء فرماتا ہے۔ اس میں کوئی قباحیت نہیں۔ اصل دار و مدار اس پر ہے۔ ”فمن آمن فآلجنة مسكنه و مأواه، ومن كفر فآلنار مستقره و مأواه“ جس شخص نے ایمان لایا جنت اس کا مقام ہے۔ اور جس نے کفر کیا اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔

قلیل نفع کا مطلب:

رب تعالیٰ کے اس ارشاد کا مطلب ”کہ میں کافروں کو تھوڑا نفع پہنچاؤں گا“ یہ ہے کہ ان کو نفع فقط دنیا میں ہی حاصل ہونا ہے۔ اخروی نفع سے وہ محروم ہوں گے۔

”فان الدنيا بکلیتها قليل قال الله تعالى قل متاع الدنيا قليل“ بے شک کسی انسان کو ساری دنیا کا مال و دولت دے دیا جائے تو پھر بھی وہ قلیل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب پاک ﷺ کو فرمایا کہ آپ فرمادیں دنیا کا مال نفع قلیل ہے۔

یہی وجہ ہے کہ رب تعالیٰ نے فرمایا کہ جو کفر کرے گا اسے میں تھوڑا نفع پہنچاؤں گا۔ حالانکہ بظاہر کافروں کے پاس دنیا کا مال و دولت کثیر ہوتا ہے کیونکہ وہ حرام اور حلال میں تمیز نہیں کرتے۔

”وان كانت كثيرة باضافة بعضها الى بعض فانها قليل باضافتها الى نعمة الآخرة“ اگرچہ کافروں کا مال کئی دوسرے لوگوں کی نسبت زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن وہ اخروی نعمتوں کے مقابل قلیل ہوتا ہے، وجہ اس کی یہ ہے۔ ”کیف لا یقل فی الدنيا ما یتناهی بالاضافة الى ما یتناهی“ کہ دنیا کا ختم ہونے والا مال یقیناً قلیل ہی ہے، کیونکہ اس کے مقابل اخروی نعمتیں ہیں جو نہ ختم ہونے والی ہیں۔ جو ختم نہ ہوں حقیقت میں وہی کثیر ہیں۔ (از بیضاوی و شیخ زادہ)

(امتہ قلیلا) ایک مطلب اس کا یہ ہے۔ ”امتہ بالرزق الی وقت مماتہ“ کہ میں کافروں کو ان کی موت تک رزق دیتا رہوں گا۔ یعنی دنیاوی رزق دینے سے وہ کوئی مکرم نہیں بن جائیں گے۔

اور دوسرا مطلب یہ ہے۔ ”امتعه بالبقاء فی الدنیا“ میں ان کو دنیا میں زندگی عطاء کر کے ان کو دنیا میں باقی رکھ کر نفع پہنچاؤں گا۔

اور تیسرا مطلب یہ ہے۔

”وقال الحسن امتعه بالرزق والامن الی خروج محمد ﷺ فیقتله ان اقام علی کفره او یجلیه عنها“

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ میں ان کو رزق اور امن اس وقت تک عطاء کروں گا جب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی تشریف آوری نہیں ہوتی۔ اب جب تشریف لے آئیں گے۔ تو جو لوگ کفر پر قائم رہیں یا ان کو قتل کر دیں گے یا ان کو جلاء وطن کر دیں گے۔ چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاء اہل مکہ کے لئے تھی، اس کے مقابل وہاں کے ہی کافروں کے متعلق ارشاد ہو رہا ہے۔

راقم کے نزدیک تمام مطالب جمع ہیں کہ رب تعالیٰ کے ارشاد کا مطلب ہے کہ میں مکہ کے کافروں کو دنیا کا رزق دوں گا۔ دنیا میں زندگی بھی دوں گا، ہاں میرے محبوب ﷺ آ کر ان کو یا تو قتل کر دیں گے، یا جلاء وطن کر دیں گے۔ یہ نفع بہت قلیل ہے۔ جس کی میرے نزدیک کوئی قدر و منزلت نہیں۔ ”فتضمنت الآیة حظر قتل من لجأ الیہ من وجهین احدهما قوله ﴿رَبِّ اجْعَلْ هَذَا بَلَدًا آمِنًا﴾ مع وقوع الاستجابة له والثانی قوله ﴿وَمَنْ كَفَرَ فَأُمَتِّعُهُ قَلِيلًا﴾ لانه قد نفی قتله بذکر المتعة الی وقت الوفاة“

اس آیت کریمہ سے سمجھ آ یا کہ جو شخص حرم شریف میں پناہ لے لے، اسے حرم میں قتل نہ کیا جائے، کیونکہ ایک تو ﴿رَبِّ اجْعَلْ هَذَا بَلَدًا آمِنًا﴾ اس پر دلالت کر رہا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اس مقام کو امن والا شہر بنانے کی دعاء کی اور آپ کی دعاء کو قبول کر لیا گیا۔

اور دوسرا رب تعالیٰ کا ارشاد ﴿وَمَنْ كَفَرَ فَأُمَتِّعُهُ قَلِيلًا﴾ اس پر دلالت کر رہا ہے کہ میں موت تک ان کو نفع پہنچاؤں گا۔ جس سے واضح ہوا کہ باہر سے کوئی قتل کر کے آئے اور حرم میں پناہ لے لے تو اسے حرم میں قتل نہ کیا جائے۔

(احکام القرآن للجصاص)

ثُمَّ اضْطَرُّهُ إِلَىٰ عَذَابِ النَّارِ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ :

(پھر میں اسے مجبور کر دوں گا آگ کے عذاب کی طرف اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے)

یعنی دنیا میں کافر کو نفع پہنچانے کے بعد اسے جہنم کی آگ کی طرف مجبور کر کے بھیج دیا جائے گا "اضطرار" ضد ہے اختیار کی، اس کا حقیقی معنی یہ ہے کہ کسی شخص سے کسی فعل کا اس کے اختیار کے بغیر صادر ہونا جیسا کہ کسی کو چھت سے نیچے گرا دیا جائے اس کا چھت سے نیچے گرنا اسکے اختیار کے بغیر تھا۔

اور اس کا مجازی معنی یہ ہے کہ کام تو انسان اپنے اختیار سے کرے لیکن اس سے رکنے میں وہ مختار نہ رہے۔ جیسا کہ کوئی ایسا عارضہ درپیش آ جائے جو اسے مجبور کر دے، اور اس کے اختیار کو ختم کر دے، مثال کے طور پر ایک شخص بھوک کے اس درجہ پر پہنچ جائے کہ مجبور ہو کر مردہ جانور کا گوشت کھالے۔

پہلے معنی پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی دلالت کر رہا ہے۔ ﴿يَوْمَ يُدْعَوْنَ إِلَىٰ نَارِ جَهَنَّمَ دُعًا﴾ (طور، آیہ ۱۳) جس دن جہنم کی طرف دھکا دے کر دھکیلا جائے گا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی۔

﴿يَوْمَ يُسْحَبُونَ فِي النَّارِ عَلَىٰ وُجُوهِهِمْ ذُوقُوا مَسَّ سَقَرَ﴾ (القمر، آیہ ۴۸)

جس دن آگ میں اپنے مونہوں پر گھسیٹے جائیں گے، اور فرمایا جائے گا چکھو دوزخ کی آنج،

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

﴿فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِي وَالْأَقْدَامِ﴾ (الرحمن آیہ ۴۱)

تو ماتھا اور پاؤں پکڑ کر جہنم میں ڈالے جائیں گے۔

دوسرے معنی کو اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی سے تائید حاصل ہے۔

﴿وَسِيقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ جَهَنَّمَ زُمَرًا حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوا هَا فَتُفْتِحُ أَبْوَابُهَا﴾ (الزمر، آیہ ۷۰)

اور کافر جہنم کی طرف ہانکے جائیں گے گروہ گروہ، یہاں تک کہ جب وہاں پہنچیں گے اس کے دروازے کھولے جائیں گے۔

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ﴿وَإِنْ مِنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا﴾ (مریم آیہ ۷۱) اور تم میں کوئی ایسا نہیں

جس کا گزر دروزخ پر نہ ہو۔

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ﴿اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصْبُ جَهَنَّمَ اَنْتُمْ لَهَا وَارِدُوْنَ﴾ (الانبياء، آیہ ۹۸) بے شک تم اور اللہ کے سوا جنہیں تم پوجتے ہو سب جہنم کے ایندھن ہو تمہیں اس میں جانا ہے۔

تحقیق یہ ہے کہ کفار کے احوال قیامت کے دن آگ میں داخل کرنے کے لحاظ سے مختلف ہوں گے۔ اس لئے آیات کریمہ میں ان کے مختلف حالات کو ذکر کر دیا گیا۔

”وان الاضطرار مجاز عن كون العذاب واقعا به وقوعا محققا حتى كأنه مربوط به“

اس آیت کریمہ میں ”اضطرہ“ کا مطلب یہ ہے کہ کافر کو عذاب یقینی طور پر دیا جائے گا، گویا کہ وہ عذاب اس کے ساتھ چمٹا ہوگا۔ اسے جبری طور پر عذاب میں دھکیل دیا جائے گا۔ اگرچہ وہ عذاب کو پسند نہیں کر رہا ہوگا۔

(از روح المعانی)

وَبِئْسَ الْمَصِيرُ: ”ای و بنس المكان الذی یصیر الیہ الکافر وهو العذاب“ یعنی وہ مکان بہت برا ہوگا جس کی طرف کافر کو پھیرا جائے گا۔ وہ مکان ہی عذاب اور آگ والا ہوگا۔

اب مفہوم واضح ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص کفر کرے گا، اسے میں تھوڑا نفع پہنچاؤں گا، یعنی دنیا کی زندگی عطاء کر کے دنیا میں رزق دے کر اسے نفع پہنچاؤں گا۔ لیکن یہ بھی اپنے حبیب ﷺ کی تشریف آوری تک پھر ایمان نہ لانے والوں کو دنیا میں قتل کر دیا جائے گا یا جلاء وطن کر دیا جائے گا۔ پھر اس کے بعد ان کو مجبور کر کے جہنم کی آگ میں دھکیل دیا جائے گا۔ یہی ان کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ٹھکانا ہوگا۔ جو شدت عذاب کی وجہ سے ان کے لئے بہت برا ٹھکانا ہوگا۔ (از خازن)

گذشتہ سے پیوستہ:

”قال رسول الله ﷺ لو كانت الدنيا تعدل عند الله جناح بعوضة ما سقى كافرا منها شربة ماء“ (رواه الترمذی وصححه)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اگر دنیا اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو کسی کافر کو اللہ تعالیٰ پانی کا ایک گھونٹ بھی پینے کے لئے نہ دیتا۔

واضح ہوا کہ دنیا کا مال و دولت گھٹیا چیز کا نام ہے، جس کی قدر و منزلت رب تعالیٰ کے ہاں کچھ بھی نہیں۔

(از مظہری)

”ان الطائف كان من مدائن الشام باردن فلما دعا ابراهيم عليه السلام امر الله جبريل حتى اقتلعها من اصلها وادارها حول البيت سبعا ثم وضعها ههنا ومنها اكثر ثمرات مكة“
بے شک طائف کی زمین شام کے شہروں میں سے ایک شہر میں اردن کے علاقہ میں تھی (یہ آج کی شام اور اردن کی حد بندی مراد نہیں اس وقت اردن کا ہی علاقہ شام تھا) جب ابراہیم علیہ السلام نے دعاء فرمائی تو اللہ تعالیٰ نے جبرائیل کو حکم فرمایا، انہوں نے اس زمین کو وہاں سے اٹھایا، پھر کعبہ کے ارد گرد سات چکر لگوائے، پھر اسے طائف میں رکھ دیا گیا۔ وہاں کی زمین اسی لئے بہت زرخیز ہے۔ اور مکہ شریف میں اکثر پھل اور سبزیاں وہاں سے ہی آتی ہیں۔
(از مظہری)

فائدہ جلیلہ :

ابراہیم علیہ السلام نے جب دعاء فرمائی کہ اے اللہ اس جگہ کو امن والا شہر بنا اور اس کے رہنے والوں کو پھلوں کی روزی دے۔ ”فاستجاب الله تعالى له فصارت مكة يجبي اليها ثمرات كل شئ“ تو اللہ تعالیٰ اللہ نے ان کی دعاء کو قبول فرمایا، مکہ میں مختلف مقامات سے ہر قسم کے پھل اچھے سے اچھے، صاف ستھرے آ جاتے ہیں۔ حج پر جانے والے حضرات آج تک حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاء کی قبولیت کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہے ہیں۔
(ماخوذ از کبیر)

اللہ تعالیٰ نے حرم کے متعلق فرمایا ﴿يُجْبَىٰ إِلَيْهِ ثَمَرَاتُ كُلِّ شَيْءٍ﴾ جس کی طرف ہر چیز کے پھل لائے جاتے ہیں۔ یہ بھی خیال رہے کہ جس طرح ”ثمره“ کا معنی پھل مشہور و معروف ہے، اسی طرح ”ثمره“ مجازی طور پر یہ معنی بھی لیا جاتا ہے۔ ”ويقال لكل نفع يصدر عن شئ ثمره“ ہر چیز سے جو نفع صادر ہوا اسے ”ثمره“ کہا جاتا ہے۔
(مفردات راغب)

اس معنی کے مطابق ابراہیم علیہ السلام کی دعاء کا یہ معنی بھی لینا بعید نہیں، کہ اللہ یہاں کے رہنے والوں کو ہر نفع مند چیز عطا فرما۔ اگر دعاء کا یہ مطلب لیا جائے تو اس کی قبولیت کو جگمگاتا ہوئے آپ دیکھ سکتے ہیں کہ ہر نفع مند چیز مکہ مکرمہ میں وافر مقدار میں موجود ہے۔ جب حج کے دنوں میں کثیر لوگوں کے مجتمع ہونے کے باوجود کسی چیز کی کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی، تو عام دنوں میں تو کمی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

﴿وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ ط رَبَّنَا

(آیت ۱۲۷)

تَقَبَّلْ مِنَّا ط إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿﴾

(۱) اور جب اٹھاتا تھا ابراہیم اس گھر کی نیویں اور اسماعیل، یہ کہتے ہوئے اے رب ہمارے ہم سے قبول فرما بے شک تو ہی سنتا جانتا۔

(۲) اور (یاد کیجئے) جب اٹھاتے تھے ابراہیم بنیادیں کعبہ کی، اور اسماعیل (بھی) یہ کہتے ہوئے کہ اے ہمارے رب قبول فرما ہم سے بے شک تو ہی بہت سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔

الْقَوَاعِدُ : جمع ہے قاعدہ کی، ”وہی اس البیت وقیل جدرۃ من البیت“ قاعدہ کا معنی مکان کی بنیاد، اور مکان کی دیواروں کو بھی قاعدہ کہا جاتا ہے۔

(خازن)

”ویحتمل ان یراد بها سافات البناء فان کل ساف قاعدة ما یوضع فوقہ ویرفعها بناؤھا“ اور یہ بھی احتمال ہے کہ قاعدہ کا معنی ردہ ہو، کیونکہ ایک ردے کے اوپر دوسرا ردہ رکھا جاتا ہے، جس سے بناء کو بلند کیا جاتا ہے۔

(بیضاوی)

وَإِذْ يَرْفَعُ : ماضی کی حکایت بیان کی گئی ہے۔ اسی وجہ سے معنی کیا گیا، ”جب وہ اٹھاتے تھے“

الْبَيْتُ : پرف لام عہد خارجی ہے، یعنی مراد بیت اللہ شریف ہے۔

اب مفہوم تقریباً واضح ہو گیا کہ یاد کرو اس وقت کو جب ابراہیم اور اسماعیل بیت اللہ شریف کی بنیادوں کو بلند کر رہے تھے۔

اعتراض : بنیاد تو اپنی جگہ پر رہتی ہے، بلند نہیں ہوتی، بنیاد کے بلند کرنے کا کیا مطلب ہے؟

جواب : ”رفع الاساس ای البناء علیہا لانہا اذا بنی علیہا نقلت عن ہیئۃ الانحفاض الی ہیئۃ الارتفاع“ بنیاد کے بلند کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس پر عمارت قائم کرنا، اس لئے کہ جب بنیادوں پر عمارت تعمیر کی جاتی ہے تو وہ پستی سے بلندی کی طرف اٹھتی ہے۔ تو بناء کے

بلند کرنے کو بنیادوں کے بلند کرنے سے تعبیر کر دیا گیا۔

اور چونکہ قواعد کا معنی بعض حضرات نے دیواریں بھی کیا ہے، اس معنی کے لحاظ سے مطلب ہوگا۔ ”یاد کرو اس وقت کو جب ابراہیم اور اسماعیل دیواروں کو بلند کر رہے تھے۔

اور یہ بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ قواعد کا معنی ردے بھی ہے۔ یعنی جب ابراہیم اور اسماعیل بنیادوں پر ردے لگا کر ان کو بلند کر رہے تھے۔ (از کبیر و خازن)

علمی نکتہ : ”القواعد من البيت“ کہا ہے، ”یرفع قواعد البيت“ نہیں کہا، حالانکہ بظاہر یہ مختصر تھا معنی اس کا بھی یہی تھا۔ ”بيت اللہ کی دیواروں کو بلند کر رہے تھے۔“

اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے ”القواعد“ کو مبہم ذکر فرمایا کہ ابراہیم بنیادوں کو بلند کر رہے تھے۔ اس کے بعد من بیان سے اس کی وضاحت فرمادی۔ ”من البيت“ وہ بنیادیں بیت اللہ کی تھیں۔ ”وتبينها بعد الابهام من تفخيم الشان ما ليس في العبارة الاخرى“ ابہام کے بعد بیان کرنا بلندی شان پر دلالت کرتا ہے۔ جب کہ ”قواعد البيت“ میں یہ صورت نہیں پائی گئی۔

(کبیر) **وَاسْمِعِيلُ :** سریانی زبان میں ”ايل“ کا معنی ہے ”اللہ“، مکمل لفظ کا معنی ہے۔ ”اسمع يا الله“ اے اللہ سن، ابراہیم علیہ السلام نے ان الفاظ سے رب تعالیٰ کے حضور بچے کے لئے دعاء کی، بچے کی پیدائش کے بعد یہی نام بچے کا رکھ دیا گیا۔ (قرط)

اسماعیل علیہ السلام تعمیر میں کیسے شریک تھے؟

اس میں دو احتمال ہیں، بظاہر حقیقی معنی کے لحاظ پر دونوں ہی یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام مل کر دیواروں کی تعمیر کر رہے تھے، یعنی دونوں ہی معمار کا کام کر رہے تھے، چونکہ ”اسمعيل“ کا عطف ہے۔ ”ابراہیم“ پر، عطف فعل میں مشارکت کو چاہتا ہے۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ دونوں میں سے ایک تعمیر کر رہے تھے۔ اور دوسرے پتھر اور گارادے رہے تھے۔

”وعلى الوجهين تصح اضافة الرفع اليهما“ دونوں صورتوں میں بنیادوں کو بلند کرنے

کی نسبت دونوں حضرات کی طرف صحیح ہے اگرچہ پہلا معنی حقیقی ہے۔ دوسرا معنی مجازی ہے۔ (از کبیر)
لیکن خیال رہے کہ زیادہ شہور مجازی معنی ہی ہے کہ ابراہیم علیہ السلام دیواروں کی تعمیر کر رہے تھے۔ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام آپ کو پتھر اور گارادے رہے تھے۔

لیکن قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے ایک اور وجہ بھی بیان کی ہے۔ ”وقیل کانا بینان فی طرفین او علی التناوب“ کہ یہ احتمال بھی کہ ایک طرف کی دیوار ابراہیم علیہ السلام اور دوسری طرف کی دیوار اسماعیل علیہ السلام بنا رہے ہوں۔ لیکن یہ خیال رہے کہ یہ صورت اسی وقت صحیح ہو سکتی ہے کہ جب یہ کہا جائے کہ دونوں حضرات خود ہی پتھر اٹھا رہے تھے۔ اور خود ہی گارالے رہے تھے اور ساتھ ساتھ تعمیر بھی کر رہے تھے۔ کیونکہ کعبہ شریف کی تعمیر میں کسی اور کا ذکر نہیں۔ اور ایک احتمال یہ ہے کہ باری باری پر تعمیر کر رہے ہوں۔ یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام تعمیر کر رہے تھے اور اسماعیل علیہ السلام پتھر اور گارادے رہے تھے، اور کسی وقت اسماعیل علیہ السلام تعمیر کرتے اور ابراہیم علیہ السلام پتھر اور گارادے دیتے۔

کعبہ شریف کی تعمیر:

کعبہ شریف کی تعمیر کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ ”الا کثرون من اهل الاخبار علی ان هذا البیت کان موجودا قبل ابرہیم علیہ السلام علی ما روینا من الاحادیث فیہ“ (کبیر)
اکثر حضرات اس طرف ہیں کہ بیت اللہ شریف کی بنیادیں پہلے موجود تھیں، ان پر ہی ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ شریف کو تعمیر کیا، جیسا کہ ہم نے احادیث سے ثابت کر دیا ہے۔

اعتراض: کئی حضرات نے ابراہیم علیہ السلام سے پہلے کعبہ شریف کی تعمیر کو ثابت نہیں کیا، بلکہ رد کیا ہے۔ ”تو کس طرح کہا جاسکتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام سے پہلے بھی کعبہ موجود تھا۔“

جواب: یہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام سے پہلے کعبہ شریف موجود مکان کی شکل میں نہیں تھا۔ کیونکہ آدم علیہ السلام کے زمانہ میں صرف بنیادوں کو قائم کیا گیا اور ان کے اوپر بیت المعمور کو یا جنتی یا قوت کے خیرہ کو اتار کر رکھ دیا گیا، جن حضرات نے انکار کیا انہوں نے بیت اللہ شریف کی موجودہ مکان کی شکل ابراہیم علیہ السلام سے پہلے ہونے کا انکار کیا ہے۔ لہذا راقم کو اختلاف نظر نہیں آتا۔

فائدہ جلیلہ :

”عن الزهري انهم بنوها حتى اذا بلغوا موضع الركن اختصمت قريش في الركن اى القبائل تلى رفعه حتى شجربينهم فقالوا تعالوا حتى نحكم اول من يطلع علينا من هذه السكة فاصطلحوا على ذلك فاطلع الله عليهم رسول الله ﷺ فحكموه فامر بالركن فوضع في ثوب ثم امر سيد كل قبيلة فاعطاه ناحية من الثوب ثم ارتقى هو على البناء فرفعوا اليه الركن فاخذوه من الثوب فوضعه في مكانه“ (مسح رادہ)

کعبہ شریف کی تعمیر کی بحث میں جو پہلے بیان کیا گیا ہے کہ ایک مرتبہ قریش نے تعمیر کیا، اسی تعمیر میں زہری رحمہ اللہ نے بیان فرمایا کہ جب وہ حجر اسود کے مقام پر پہنچے تو قریش کا جھگڑا ہو گیا، ہر قبیلہ کے لوگ چاہتے تھے کہ ہمارا سردار اسے کعبہ شریف کی دیوار میں نصب کرے، بالآخر ان کا اس پر اتفاق ہو گیا کہ صبح جو شخص پہلے آئے گا اسے حکم (فیصل) بنالیں وہ جو فیصلہ کرے اس پر سب رضا مند ہو جائیں۔

صبح سب سے پہلے آنے والے رسول اللہ ﷺ تھے، یہاں تک کہ ان لوگوں نے آپ کو فیصل مان لیا۔ آپ نے ایک کپڑا بچھایا جس کے اوپر حجر اسود کو رکھا، پھر ہر ایک قبیلہ کے سردار کو حکم دیا کہ تمام مل کر اس چادر کو اٹھاؤ، سب نے مل کر اٹھایا، آپ نے کپڑے سے پتھر اٹھا کر کعبہ شریف کی دیوار میں نصب کر دیا۔ سبحان اللہ کیا خوب حکمت عملی سے کام حضور ﷺ نے کیا کہ ان کو شدید نزاع اور شدید خطرہ سے بچالیا

غزالی دوران علامہ کاظمی رحمہ اللہ کی تفسیر سے اقتباس :

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ قریش نے جب کعبہ تعمیر کیا تو حضور ﷺ اور حضور کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہما کے لئے پتھر اٹھا کر لارہے تھے کہ حضرت عباس نے حضور ﷺ سے کہا کہ آپ اپنی ازار شریف (چادر مبارک) اپنے مبارک کاندھے پر رکھ لیجئے، پتھر کی تکلیف سے آپ محفوظ رہیں گے، آپ نے حضرت عباس کا کہنا مان لیا۔ اسی وقت حضور ﷺ بے ہوش ہو گئے اور آپ کی مبارک آنکھیں آسمان کی طرف کھلی رہ گئیں۔ افاقہ ہوتے ہی حضور نے فرمایا، میری ازار، میری ازار، حضرت عباس نے فوراً ازار مبارک حضور پر باندھ دی۔

(بخاری جلد اول ص ۵۲، ۵۳، ۵۴)

سوال : یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ازار (چادر) کھول کر کاندھے پر رکھ لینا شرم و حیا کے خلاف اور معیوب و قبیح ہے۔

حضرت عباس نے ایسا کام کرنے کے لئے حضور ﷺ سے کیوں کہا، اور حضور ﷺ نے ان کا کہنا کیسے مان لیا جب کہ حضور تو کنواری لڑکیوں سے بھی زیادہ حیا دار تھے، اور معیوب و قبیح امور سے حضور ﷺ کو طبعاً نفرت تھی۔

جواب : اس کا جواب یہ ہے کہ یہ واقعہ حضور ﷺ کی ایسی نوعمری کے زمانہ میں پیش آیا جب اس عمر میں ایسا کرنا نہ حیا کے خلاف سمجھا جاتا تھا نہ کسی کی نظر میں معیوب و قبیح تھا۔

اور فحوائے ”عم الرجل صنواہ“ حضرت عباس حضور کے چچا ہونے کی وجہ سے بمنزلہ شفیق باپ کے تھے، جن کا کہنا نہ ماننا سعادت مندی کے خلاف تھا۔ حضور ﷺ طبعاً سعادت مند تھے، اس لئے ان کا کہنا مان لیا، لیکن ان کے کہنے پر عمل کرتے ہی حضور ﷺ بے ہوش ہو گئے، اور حضور ﷺ کی مبارک آنکھیں آسمان کی طرف کھلی رہ گئیں۔

افاقہ ہوتے ہی فرمایا ”میری ازار، میری ازار“

حضرت عباس نے فوراً ازار مبارک باندھ دی، یہ حضور ﷺ کے کمال حیا کا ظہور تھا، معلوم ہوا کہ یہ واقعہ حضور ﷺ کی طبعی سعادت مندی اور فطری حیا کی دلیل ہے، کسی عیب یا قبیح سے اس کا دور کا بھی تعلق نہیں۔

آپ کی عمر کتنی تھی ؟ اس میں صحیح قول زہری رحمہ اللہ کا ملتا ہے کہ قریش کی بناء کعبہ کے وقت حضور ﷺ حد بلوغ کو نہ پہنچے تھے۔

امام زہری کا قول اس لئے رائج ہے کہ اس کی بناء پر حضور ﷺ کی طرف کسی عیب اور قبیح کی نسبت نہیں ہوئی۔ اور نہ ہی حضور کے کمال حیا کی نفی لازم آئی ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں

علامہ عینی نے بھی اسی قول کے تحت حسب ذیل کلام کر کے ہمارے موقف کی تائید فرمائی، وہ فرماتے ہیں۔

” ذکر ما فیہ من الفوائد منها ان النبی ﷺ کان فی صغره محمیا عن القبايح و اخلاق الجاهلیة منزها عن الرذائل والمعائب قبل النبوة و بعدها ، ومنها انه کان ﷺ جبلة الله

تعالیٰ علی احسن الاخلاق والحياء الكامل حتی کان اشد حياء من العذراء فی خدرها
(عمدة القاری جلد ۲ ص ۲۰ طبع مصر)

یعنی اس حدیث میں حسب ذیل فوائد پائے جاتے ہیں۔

(۱) نبی کریم ﷺ اپنے بچپن میں سب قباحتوں اور اخلاق جاہلیت سے محفوظ تھے، نبوت سے پہلے اور نبوت کے بعد تمام رذائل اور معائب (عیوب) سے منزہ تھے۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو احسن اخلاق اور حياء کامل پر مخلوق فرمایا تھا، حتیٰ کہ حضور ﷺ ان کنواری، لڑکیوں سے زیادہ حیا دار تھے جو اپنے پردے کے اندر چھپی ہوئی ہوں، اس لئے چادر شریف اتارتے ہی حضور ﷺ پر بے ہوشی طاری ہو گئی، اس کے بعد حضور ﷺ کبھی عریاں نہ دیکھے گئے۔

تنبیہ :

اس وقت بھی حضور ﷺ کو عریاں دیکھے جانے کا یہ مفہوم نہیں کہ حضور ﷺ کی شرمگاہ مبارک پر کسی کی نظر پڑی ہو، کیونکہ قیامت کے دن ”انکم محشورون حفاة عراة غرلا“ کے متعلق ارشاد مصطفویٰ ہے کہ تمہارا حشر اس حال میں ہوگا کہ تمہارے پاؤں میں جوتا نہیں ہوگا۔ اور نہ ہی بدن پر کپڑا، نہ تم ختنہ شدہ ہو گے۔ لیکن کوئی کسی کی شرمگاہ کو نہیں دیکھ رہا ہوگا۔ (ماخوذ از البیان للکاظمی)

راقم کا موقف :

اس مسئلہ میں آسان ہے کہ نبی کریم ﷺ کی قمیص مبارک پاؤں تک تھی، ابھی آپ بالغ نہیں تھے، پتھر اٹھانے میں تیز چلنے میں چادر رکاوٹ بن رہی تھی، حضرت عباس نے اتارنے کا حکم دیا، چچا کا حکم مان بھی لیا، لیکن حضور برداشت نہ کر سکے بے ہوش ہو گئے۔ آپ کو اسی وقت چادر بندھادی گئی، لہذا جب قمیص پاؤں تک ہو، چادر اتارنے سے شرمگاہ کا ننگا ہونا نہیں پایا جاتا۔ واللہ اعلم بالصواب

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ :

یہ کہتے ہوئے اے ہمارے رب قبول فرما ہم سے بے شک تو ہی بہت سننے والا خوب جاننے والا ہے۔

علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے ”ہما یقولان“ کے الفاظ محذوف نکالے ہیں، اور جملہ کو حال کہا ہے، جس کے مطابق وہی ترجمہ ہے جو بیان کر دیا گیا ہے۔

”تقبل“ کی تفسیر میں متکلمین نے یہ ذکر کیا ہے کہ ہر عمل جسے اللہ تعالیٰ قبول کر لے تو عمل کرنے والے کو وہ ثواب عطاء فرماتا ہے اور اس سے راضی ہوتا ہے۔ اور جس عمل پر رب تعالیٰ کی طرف سے ثواب نہ دیا جائے، اور اس کی رضا مندی نہ پائی جائے وہ مردود ہے۔

قبولیت اور ثواب و رضا میں تلازم ہے، ذکر یہ ہے کہ ”اے ہمارے رب قبول فرما ہم سے“ اور مراد یہ ہے کہ اے ہمارے رب تو ہم سے راضی رہے، تو ہی ہمیں اس پر اجر عطاء فرما۔ دنیا کے لحاظ پر بندے کا کسی کو عطیہ دینا اور دوسرے کا وہ عطیہ قبول کر لینا تقبل کہلاتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ سے تقبل کی دعا کا یہی مطلب ہے کہ تو راضی ہو جا۔

عارفین حضرات کے نزدیک قبول اور تقبل میں فرق ہے۔ جب کوئی چیز اعلیٰ ہو اور اسے خوشی سے قبول کیا جائے تو اس کے لئے ”قبول“ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اور جب کسی چیز کو تکلف سے قبول کیا جائے، اس میں خوشی نہ پائی جائے تو اس کے لئے لفظ ”تقبل“ استعمال ہوتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے رب تعالیٰ کے حضور لفظ ”تقبل“ استعمال کیا ہے، جس سے اپنے عجز اور انکسار کا اعتراف کیا ہے۔ اپنے عمل کو مالک الملک کے سامنے پیش کرنے میں گھٹیا سمجھا۔

”وایضا فلم یکن المقصود اعطاء الثواب علیہ“

اور اس پر ثواب عطاء کرنے کا قصد نہیں کیا۔

”لان کون الفعل واقعا موقع القبول من المخدم الذ عند الخادم العاقل من اعطاء الثواب الیہ“

اس لئے کہ عقل مند خادم اس میں زیادہ لذت محسوس کرتا ہے کہ میرا فعل میرے مخدم (مالک)

نے مجھ سے قبول کر لیا ہے۔ اسے یہ پرواہ نہیں ہوتی کہ اس پر کوئی اجر ملتا ہے یا نہیں۔ (اربع)

”عن وہیب بن الورد انه قرا ﴿وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا﴾ ثم یبکی ویقول یا خلیل الرحمن ترفع قوائم بیت الرحمن وانت مشفق

وہیب ابن ورد نے اس آیت کریمہ کو پڑھا، یعنی ﴿وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا﴾ پڑھا پھر آپ نے رونا شروع کر دیا۔ روتے ہوئے کہتے ہیں۔ اے اللہ کے خلیل تم رب تعالیٰ کے گھر کی بنیادوں کو بلند کر رہے تھے اور ڈر رہے تھے کہ ہو سکتا ہے یہ عمل قبول نہ ہو۔ یعنی کامل عجز و انکسار آپ میں پایا گیا، کیونکہ اگر عام دنیا دار ہوتا تو اپنے کام پر اتراتا کہ میں نے اللہ کا گھر بنایا، لیکن اللہ کا خلیل اللہ کا گھر بنا کر بھی سر اپا عجز و انکسار بن کر رہا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے مخلصین مؤمنین بندوں کی شان میں بیان کیا ہے۔ ”وَالَّذِينَ يُؤْتُونَ مَا اتُّوا وَقُلُوبُهُمْ وَجِلَةٌ“ اور وہ جو دیتے ہیں جو کچھ دیں اور ان کے دل ڈر رہے ہیں۔ یعنی وہ اللہ کے حضور زکوٰۃ و صدقات اور اعمال صالحہ پیش کرتے ہیں، لیکن پھر بھی ان کے دل ڈر رہے ہوتے ہیں کہ کیا معلوم کہ یہ اللہ تعالیٰ کے حضور شرف قبولیت حاصل کرتے ہیں یا نہیں۔

(اس کثیر)

إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ : آپ نے یہ دعاء کر کے رب کے حضور عرض کیا۔ ”تسمع دعاءنا وتضرعنا وتعلم ما في قلبنا من الاخلاص وترك الالتفات الى احد سواك“ اے اللہ تو ہماری دعاء اور عاجزی کو سنتا ہے، تو ہمارے دلوں کے اخلاص کو جانتا ہے۔ اور تو جانتا ہے کہ ہم تیرے سوا کسی اور کی طرف توجہ نہیں کرتے۔

اس دعاء میں ایک لطیف اشارہ:

اس سے پہلے عارفین کا قول نقل کیا جا چکا ہے کہ آپ نے رب تعالیٰ کے حضور ”تقبل“ کہہ کر اپنے عجز کا اعتراف کیا، اور اپنے عمل کو کمتر سمجھا۔

لیکن اس دعاء میں لطیف اشارہ یہ پایا گیا کہ ہمارے عجز کو کوئی جاہل حقیقت نہ سمجھ بیٹھے۔

”قولهما إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ“ يدل على انه لم يقع منهما تقصير بوجه ما في اتيان المأمور به بل بذلا في ذلك غاية ما في وسعهما فان المقصر المتساهل كيف

یتجاسر علی ان یقول باطلق لسان وارق جنان ﴿ إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ ﴾ لدعائنا وتضرعنا
﴿ الْعَلِیمُ ﴾ بما فی قصدنا وصبرنا فی اتباع امرک ودل ذلک علی ان القبول والرد الیه
تعالی وانه لایجب علیہ شیء

حضرت ابراہیم واسماعیل علیہما السلام کا رب تعالیٰ کے حضور یہ عرض کرنا ﴿ إِنَّكَ أَنْتَ
السَّمِيعُ الْعَلِیمُ ﴾ یہ اس پر دلالت کر رہا ہے کہ ان دونوں سے رب تعالیٰ کے حکم بجالانے میں کوئی
کوتاہی نہیں ہوئی، بلکہ انہوں نے اپنی پوری کوشش صرف کر دی، اس لئے کہ اگر کوئی شخص کوتاہی کرتا ہے
سستی کرتا ہے وہ کیسے جسارت کر سکتا ہے کہ برملا طور پر یہ کہے، دل کی گہرائیوں سے یہ کہے کہ اے اللہ تو
ہماری دعاؤں اور عاجزی کو خوب سننے والا ہے۔ اور تو ہمارے ارادہ کو جانتا ہے، تو جانتا ہے کہ ہم نے
تیرے حکم کی اتباع میں صبر سے کام لیا ہے۔

اسی سے یہ مسئلہ بھی سمجھ آ گیا کہ کسی کا عمل قبول کرنا رب تعالیٰ پر لازم نہیں، البتہ چاہے تو قبول
فرمائے، چاہے تو رد کرے۔ ہاں البتہ اللہ تعالیٰ اپنی وسیع رحمت کی وجہ سے کسی کے عمل کو ضائع نہیں فرماتا۔
(از شیخ زادہ)

اعتراض: ﴿ إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِیمُ ﴾ میں حصر پائی گئی ہے، جس کا معنی ہے کہ بیشک
تو ہی سننے والا جاننے والا ہے۔ یہ حصر کس طرح درست ہے جب کہ مخلوق بھی سنتی اور جانتی ہے۔

جواب: ”انہ سبحانہ لکمالہ فی ہذہ الصفة یکون کأنہ هو المختص بہا دون غیرہ“
اللہ تعالیٰ کو یہ صفات کامل طور پر کما حقہ حاصل ہیں، اس لئے کہ وہی حقیقت میں، ذاتی طور پر
سننے والا جاننے والا ہے۔ اور مخلوق کو سننا اور جاننا رب تعالیٰ کی طرف سے ہی حاصل ہے۔ لہذا حصر
درست ہے۔
(از کبیر)

☆☆☆

﴿رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمِينَ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۖ

وَارِنَا مَنَاسِكَنا وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ﴾ (۱۲۸)

(۱) اے رب ہمارے اور کر ہمیں تیرے حضور گردن رکھنے والا، اور ہماری اولاد میں سے ایک امت تیری فرمانبردار اور ہمیں عبادت کے قاعدے بتا اور ہم پر اپنی رحمت سے رجوع فرما، بیشک تو ہی ہے بہت توبہ قبول کرنے والا مہربان۔

(۲) اے ہمارے رب اور رکھ ہم دونوں کو فرمانبردار اپنا، اور کر ہماری اولاد میں سے ایک امت کو فرمانبردار اپنا، اور دکھا ہمیں ہماری عبادت کے طریقے، اور رجوع فرما ہماری طرف، بے شک تو توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمِينَ لَكَ : یہ ابراہیم علیہ السلام کی دوسری دعاء ہے۔ پہلی دعاء

کا ذکر پہلی آیت میں ہو چکا ہے۔ اسی وجہ سے ”واؤ“ ذکر ہے۔

”مسلمین“ یا تو لیا ہوا ہے۔ ”اسلم وجہہ“ سے، جس کا معنی ہے، اخلاص، اس صورت میں معنی ہوگا۔ اے ہمارے رب اور ہم دونوں کو اپنا مخلص بنا۔

اور یا یہ لفظ ماخوذ ہے۔ ”اسلم“ سے لیکن اس کا معنی ہے۔ ”استسلم“ مطیع ہونا، فرمانبردار ہونا، گردن رکھنا یعنی گردن جھکانا، اس صورت میں معنی ہوگا۔ اے ہمارے رب اور بنا ہمیں اپنا فرمانبردار لیکن ان دونوں صورتوں میں مطلب یہ ہوگا۔ ”والممراد طلب الزیادة فی الاخلاص والاذعان“ کہ اے ہمارے رب اور ہمیں خلوص اور اطاعت میں زیادہ مرتبہ عطا فرما۔

اور ایک معنی یہ ہے۔ ”والممراد الثبات علیہ“ اے ہمارے رب اور ہم دونوں کو اسلام اور اطاعت پر قائم و دائم رکھ۔

راقم نے اسی کے مطابق ترجمہ ذکر کیا ہے۔ ”اور رکھ ہم دونوں کو اپنا فرمانبردار“

وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ : اور ہماری اولاد میں سے ایک امت کو اپنا

فرمانبردار رکھ بظاہر طور پر یہاں یہ وہم ہے کہ اصحاب ہمت یعنی اولیاء کرام، بزرگان دین اور پھر خاص کر کے انبیاء کرام تو عام لوگوں کے لئے دعاء کرتے ہیں۔ صرف اولاد کے لئے دعاء نہیں کرتے، تو

حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کا اولاد کے لئے دعاء کرنے کا کیا مطلب؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی دو وجہ ہیں ایک یہ ہے کہ اولاد زیادہ حق رکھتی ہے کہ اس پر شفقت کی جائے، جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ﴾ (اے محبوب) آپ اپنے قبیلے والوں کو ڈرائیں۔ اور ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿قُومُوا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا﴾ (اے ایمان والو) تم اپنے آپ کو اور اپنی اہل کو آگ سے بچاؤ۔

دوسری وجہ اولاد کیلئے دعاء کرنے کی یہ ہے کہ اگرچہ بظاہر دعاء میں تخصیص ہے، لیکن درحقیقت دعاء میں عموم پایا گیا ہے۔ کیونکہ انبیاء کرام کی اولاد کی اصلاح سے دوسرے لوگوں کی اصلاح ہوتی ہے۔

”فكأنهما قالا واصلح عامة عبادك باصلاح بعض ذريتنا“ گویا کہ ان دونوں ہستیوں نے رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا کہ اے ہمارے رب ہماری بعض اولاد کو اپنی فرمانبرداری پر قائم رکھ کر عام لوگوں کی اصلاح فرما۔

بعض اولاد کے لئے دعاء کیوں؟

جب ان دونوں حضرات کو یہ علم حاصل ہو گیا کہ ہماری اولاد میں سے کوئی نیک لوگ ہوں گے، اور کوئی ظالم ہوں گے۔ اور جب یہ بھی ان کو معلوم تھا کہ دعاء ظالموں، کافروں کے لئے نہیں کی جاتی، اس لئے انہوں نے اپنی بعض اولاد کے لئے دعاء کی، ان کی دعاء کا مطلب ہی یہ ہے کہ اے اللہ ہماری اولاد میں سے جو لوگ مومن ہوں گے، ان کو ایمان پر قائم و دائم رکھ۔

اور ظالموں، جاہلوں کے لئے دعاء نہ کرنے کی یہ وجہ تھی تاکہ نظام دنیا قائم رہے۔ اس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔

اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ جہاں افاضل اور اواسط اور اراذل سے خالی نہ رہے۔

”فالا فاضل هم اهل الله الذين اخلصوا انفسهم لله بالاقبال الكلى عليه“

افاضل وہ اللہ والے ہیں جو خالص اور کامل طور پر اپنے آپ کو رب تعالیٰ کی طرف متوجہ رکھیں

”والا واسط هم اهل الآخرة الذين يجتنبون المنكرات ويواظبون على الطاعات رغبة في

نيل المثوبات“

اور اواسط یعنی درمیانے لوگ وہ ہیں جن کی توجہ آخرت کی طرف ہوتی ہے۔ اور گناہوں سے

بچتے ہیں۔ اور نیکیوں پر ہمیشہ قائم رہتے ہیں اور ثواب حاصل کرنے کی رغبت رکھتے ہیں۔

”والاراذل هم اهل الدنيا الذين يعلمون ظاهرا من الحياة وهم عن الآخرة هم غافلون جعلوا همتهم عمارة الدنيا وتهينة اسبابها“

رذیل لوگ یعنی گھٹیا لوگ وہ ہیں جو صرف دنیا کی زندگی سے ہی تعلق رکھتے ہیں، اور آخرت سے وہ غافل رہتے ہیں وہ دنیا کو آباد کرنے اور اسی کے اسباب کی تیاری میں رہتے ہیں۔

دنیا کا آباد کرنا تین چیزوں پر ہے۔ (۱) کھیتی باڑی اور شجر کاری (درخت لگانے) (۲) خاندانی رقابت اور طبیعت میں جوشیلا پن اور جنگ کرنا۔ (۳) اشیاء کو ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف لانا۔

”ومن اكبر على هذه الاشياء نسي الموت والبعث والحساب“

جو شخص ان چیزوں کی طرف ہی کامل متوجہ رہا، گویا کہ ان پر اوندھا ہو کر گر پڑا تو اسے موت بھول گئی، قیامت اور حساب کو وہ بھول گیا۔

اگر کسی شخص نے کامل طور پر فقط دنیا کو آباد کرنے کی کوشش کی، اور اپنے فکر کو صرف دنیا داری کی طرف ہی لگائے رکھا۔ ”فهو متوغل في الجهل والحمافة“ وہ جہالت اور حماقت میں کامل طور گھر گیا۔

”ونهذا قيل لولا الحمقى لخربت الدنيا“ اسی وجہ سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ اگر بیوقوف نہ ہوتے تو دنیا خراب ہو جاتی۔ واضح ہوا کہ آپ نے ظالموں کے لئے دعاء اسی لئے نہیں کی تا کہ نظام دنیا بھی آباد رہے اور جہنم کے لئے بھی مخلوق قائم رہے۔ (از بیضاوی و شیخ زادہ)

”وقيل اراد بالامة المسلمة امة محمد ﷺ“ اور بعض حضرات نے بیان فرمایا کہ ابراہیم علیہ السلام نے جو دعاء امت مسلمہ کے لئے کی اس سے آپ کی مراد امت محمد مصطفیٰ ﷺ ہے۔ (ابو السعد) تاہم راقم کے نزدیک تعمیم ہی بہتر ہے کہ آپ نے دعاء اپنی اولاد میں سے تمام مسلمانوں کے حق میں کی، خواہ وہ اس وقت موجود تھے، یا بعد میں آنے والے ہوں۔ اس طرح آپ کی دعاء میں خود بخود امت محمد مصطفیٰ ﷺ بھی آگئی۔

وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا : اس مقام میں ”ارنا“ یا تو رؤیہ بصریہ سے لیا ہوا ہے، باب افعال پر آنے کی وجہ سے متعدی بدو مفعول ہو گیا اس صورت میں معنی ہوگا ”اور ہمیں دکھا“

اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ ”رؤیہ قلبیہ“ سے ماخوذ ہو، لیکن معرفت کے معنی میں ہوگا۔ اسی

لئے دو مفعول ہیں۔ اگر علم کے معنی میں ہو تو باب افعال پر آنے سے اس کے مین مفعول ہوتے ہیں۔

آیہ کریمہ میں دو مفعول ہی ذکر ہیں۔ اس صورت میں معنی ہوگا اور ہمیں پہچان کرا، ہمیں بتا۔

اعتراض: ابن حاسب اور اس کے تبعین ابو حیان وغیرہ نے ”رأی“ کو ”عرف“ کے معنی

میں استعمال کرنے سے انکار کیا ہے کہ اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ تو معرفت کے معنی میں لینا کیسے صحیح ہے؟

جواب: علامہ زمخشری نے مفصل میں، اور راغب نے اپنی مفردات میں ذکر کیا ہے کہ ”

رؤية“ بمعنی معرفت آتا رہتا ہے۔ ”وهما من الثقات فلا عبرة بانكارهما“ یہ دونوں علم نحو

میں مضبوط مقام رکھتے ہیں۔ اس لئے اس کا انکار ممکن نہیں۔ (از روح المعانی)

مناسکنا: نسک کا معنی عبادت کرنا، عبادت کرنے والے کو ”ناسک“ کہا جاتا ہے۔

اور ذبح کرنے کو بھی ”نسک“ کہا جاتا ہے۔ اور ذبیحہ کو ”نسیک“ اور اسی طرح اعمال حج کو

”مناسک“ کہا جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ”خذوا عني مناسککم لعلي لا الفاکم بعد عامی

هذا“ مجھ سے افعال حج کے طریقے حاصل کر لو، ہو سکتا ہے اس سال کے بعد میری ملاقات تم سے نہ ہو۔

اور وہ مقامات جہاں حج کے احکام ادا ہوتے ہیں ان کو بھی مناسک کہا جاتا ہے۔ اور کبھی فرق بھی

کر لیا جاتا ہے کہ جب ”منسک“ کے سین پر فتح ہو تو معنی ہوگا۔ ”فعل حج“ اور جب کسرہ ہو یعنی

مسجد، مشرق اور مغرب کے وزن پر ہو تو معنی ہوگا۔ ”جگہ“

آیہ کریمہ میں ”مناسک“ کا معنی ذبیحہ تو درست نہیں، البتہ حج کے احکام اور مقامات مراد

ہو سکتے ہیں اور اگر عام عبادات مراد لے لی جائیں تو زیادہ بہتر ہے۔

اب ان الفاظ مبارکہ کے یہ معانی ہو گئے (۱) اور دکھا ہمیں احکام حج (۲) اور دکھا ہمیں مقامات

حج۔ (۳) اور بتا ہمیں احکام حج۔ (۴) اور بتا ہمیں مقامات حج (۵) اور دکھا ہمیں عبادات کے طریقے۔

(۶) اور بتا ہمیں عبادت کے طریقے۔

اعلیٰ حضرت کا یہی آخری ترجمہ ہے جو آپ نے کبیر کے ان الفاظ سے لیا ہے۔

”علمنا کیف نعبدک وابن نعبدک وبما ذا نتقرب الیک حتی نخلمک به کما یخلم العبد مولاه“

ہمیں بتا ہم تیری عبادت کیسے کریں۔ اور کہاں تیری عبادت کریں۔ اور کن چیزوں سے تیرا تقرب

حاصل کریں، یہاں تک کہ تیری خدمت ایسے کریں جیسے غلام اپنے مالک کی خدمت کرتا ہے۔ (از کبیر)

راہ کا ترجمہ خازن کی اس عبارت سے ماخوذ ہے۔ ”فاجاب اللہ دعاء ہما وبعث جبریل فارہما المناسک“ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں حضرات کی دعاء کو قبول فرمایا اور جبریل کو بھیجا، انہوں نے ان دونوں حضرات کو عبادات کے طور طریقے دکھادیے۔ جب عرفات پر پہنچے تو پوچھا ”عرفت یا ابراہیم“ اے ابراہیم کیا تم نے پہچان لیا؟ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا ہاں، فسمیٰ ذلک الوقت عرفة والموضع عرفات“ اس وقت کو عرفہ کہ لیا گیا اور جگہ کو عرفات کہ لیا گیا۔

(از حارون)

وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ : اور رجوع فرما ہماری طرف، بے شک تو توبہ قبول فرمانے والا، رحم کرنے والا ہے۔ انبیاء کرام رب تعالیٰ سے اپنے مدارج کی بلندی کی دعاء کرتے رہتے ہیں۔ اور جب وہ دنیاوی کاموں میں مشغول ہوں، اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ میں بظاہر کمی محسوس کریں تو وہ رب تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یہی ان کی توبہ ہوتی ہے۔ اور مالک الملک کا ان کی طرف کامل رحمت سے توجہ کرنا ان کی توبہ کو قبول کرنا ہوتا ہے۔

اسی وجہ سے اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ نے ”وتب علینا“ کا ترجمہ کیا ہے۔ ”اور ہم پر اپنی رحمت سے رجوع فرما۔ ابراہیم علیہ السلام کے توبہ کرنے کا بھی یہی مطلب ہے۔ اور وجہ یہ بھی ہے۔

”والمعنى ﴿وَتُبْ﴾ على الظلمة من اولادنا حتى يرجعوا الى طاعتك فيكون ظاهر الكلام الدعاء لانفسهما والمراد به ذريتہما“

کہ آپ دونوں حضرات کی دعاء اگرچہ بظاہر اپنے لئے تھی، لیکن حقیقت میں وہ دعاء اپنی اولاد میں سے ظالموں کے لئے تھی، اے اللہ جو لوگ ہماری اولاد میں سے ظالم ہوں گے ان کو توبہ کی توفیق عطا فرمانا اور ان کی توبہ کو قبول فرمانا۔

اسی وجہ پر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت تائید بھی کر رہی ہے۔ ”وقرأ ابن مسعود وارہم مناسکہم“ جس کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ ہماری اولاد کو عبادت کے طریقے دکھا، اس کے مناسب توبہ کی قبولیت کی دعاء بھی اولاد کے لئے ہوگی۔

(از روح المعانی)

فائدہ: توبہ کے مختلف مدارج ہیں، کیونکہ توبہ کرنے والوں کے مدارج مختلف ہیں۔

”توبة سائر المسلمين الندم والعزم على عدم العود وردا لمظالم اذا امکن، ونية الرد اذا لم یمكن“

عام مسلمانوں کی توبہ یہ ہے کہ وہ گناہوں پر نادم ہو جائیں، اور آئندہ گناہ نہ کرنے کا پختہ ارادہ کر لیں۔ اور مظالم (یعنی ظلم سے حاصل کئے ہوئے منافع) واپس کرے جہاں تک ممکن ہو۔ اگر ممکن نہ ہو تو نیت کر لے کہ جب مجھے طاقت حاصل ہوگی، تو لوگوں کے حقوق میں ادا کروں گا۔

”وتوبة الخواص الرجوع عن المكروهات من خواطر السوء والفتور في الاعمال والاتیان بالعبادة على وجه غير الكمال“

خواص کی توبہ یہ ہے کہ دل میں برے خیالات کے آنے کی وجہ سے جو مکروہ حالت پیدا ہوتی ہے وہ اس سے بھی توبہ کرتے ہیں اور اعمال میں ذرا بھر کی محسوس کریں تو توبہ کرتے ہیں۔ اور عبادت کو کامل طریقہ سے نہ ادا کر سکتے پر بھی وہ توبہ کرتے ہیں۔

”وتوبة خواص الخواص لرفع الدرجات والترقی فی المقامات“
خواص الخواص کی توبہ درجات کی بلندی اور مقامات کی ترقی کے لئے ہوتی ہے۔ (از روح المعانی)

اسی بحث سے گمراہوں کا رد ہو گیا:

بعض لوگ قرآن پاک اور احادیث مبارکہ کے مطالب کو سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ ظاہر الفاظ کو دیکھ کر ظاہری معانی سے خود بھی بھٹک جاتے ہیں۔ اور دوسروں کو بھی بھٹکاتے رہتے ہیں۔ اس آیت کریمہ میں بھی ان لوگوں نے ﴿وَتُبْ عَلَيْنَا﴾ سے گمراہی حاصل کی۔ اور یوں کہا۔
”ان التوبة لا تطلب من الله الا بعد تقدم الذنب فلو لا تقدم الذنب لم يكن لطلب التوبة وجه“

(خارج)
بے شک توبہ اللہ سے اس وقت تک نہیں طلب کی جاتی جب تک پہلے گناہ نہ پائے جائیں، گناہوں کے بعد ہی توبہ کی جاتی ہے اگر گناہ نہ پائے جائیں تو توبہ کرنے کا مقصد ہی کیا ہے۔ لہذا معلوم ہوا کہ انبیاء گنہگار ہوتے ہیں۔

اس کا جواب پہلے آچکا ہے کہ انبیاء کرام کی توبہ مدارج کی بلندی کے لئے ہوتی ہے۔ اور اپنی امت کے گنہگار لوگوں کے لئے ہوتی ہے۔ انبیاء کرام کو گنہگار کہنے والے خود بھی بھٹک جاتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔

راقم نے اسی پارہ کی چوتھے رکوع میں انبیاء کرام کے گناہوں سے پاک ہونے کا تذکرہ تفصیل سے کر دیا ہے۔ وہاں دیکھا جائے۔

﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ
وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنْتَ
الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ (آیت ۱۲۹)

(۱) اے رب ہمارے اور بھیج ان میں ایک رسول انہیں میں سے کہ ان پر تیری آیتیں تلاوت فرمائے، اور انہیں تیری کتاب اور پختہ علم سکھائے، اور انہیں خوب ستھرا فرما دے اور بے شک تو ہی ہے غالب حکمت والا۔

(۲) اے ہمارے رب، اور بھیج ان میں ایک رسول جو ان میں سے ہی ہو، تلاوت کرے ان پر تیری آیتیں، اور سکھائے ان کو کتاب اور حکمت، اور ان کو پاکیزہ کرے۔ بے شک تو ہی غالب، حکمت والا ہے۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ :

اے ہمارے رب، اور بھیج ان میں ایک رسول جو ان میں سے ہی ہو۔

ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام کی یہ دعاء نبی کریم ﷺ کے حق میں قبول ہوئی۔ رب تعالیٰ نے دوسرے مقام پر ذکر فرمایا ﴿هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا﴾ (سورۃ جعد) وہ ذات جس نے امیوں میں رسول بھیجا۔

اس آیت میں بھی رسول سے مراد حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہی ہیں۔

اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاء کی قبولیت کا آپ کے الفاظ کے مطابق ہی رب تعالیٰ نے ذکر فرمایا، جس سے مراد بالاتفاق نبی کریم ﷺ ہیں۔

﴿لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ﴾ (آل عمران ۱۰۳)

بے شک اللہ کا بڑا احسان ہوا مسلمانوں پر کہ ان میں انہیں میں سے ایک رسول بھیجا جو ان پر اس

کی آیتیں پڑھتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت سکھاتا ہے، اور وہ ضرور اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

اس آیت کریمہ کی وضاحت تو اپنے مقام پر آئے گی۔ اتنا واضح ہو کہ رسول سے مراد اس آیت میں ”سید عالم خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰ ﷺ“ ہیں۔ (خزان العرفان)

اس کی تائید حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی قراءت سے بھی ملتی ہے۔ ﴿وَابْعَثْ فِيهِمْ فِي آخِرِهِمْ رَسُولًا﴾ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی دعاء کا مطلب ہی یہ تھا کہ اے اللہ اس سرزمین حرم کے باشندوں کے لئے اپنے آخری رسول کو مبعوث فرما۔ اس قراءت کی تائید آثار سے ملتی ہے۔

”انه لما دعا ابراهيم قيل له قد استجيب لك وهو يكون في آخر الزمان“ اس لئے کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے دعاء فرمائی تو آپ کو جواب دیا گیا کہ آپ کی دعاء کو قبول کر لیا گیا۔ وہ نبی جن کے لئے تم نے دعاء کی وہ آخر زمانہ میں تشریف لائیں گے (جن کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا)

اس مقام پر علامہ ابو حیان رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ ”ولا خلاف انه رسول الله محمد ﷺ“ اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ بے شک وہ اللہ کے رسول جن کے لئے ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام نے دعاء کی اس سے مراد حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں۔ (البحر المحيط)

”واما ان الرسول هو محمد ﷺ فيدل عليه وجوه“ احدها اجماع المفسرين وهو حجة“ بے شک اس دعاء میں رسول سے مراد حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں، اس پر چند طرح کے دلائل پائے جاتے ہیں۔ ان میں ایک دلیل یہ ہے کہ اس پر مفسرین کرام کا اجماع ہے۔ جو بہت بڑی قوی دلیل ہے۔

”وثانيهما ان ابراهيم عليه السلام انما دعا بهذا الدعاء بمكة لذريته الذين يكونون بها وبما حولها، ولم يبعث الله تعالى الى من بمكة وما حولها الا محمدا ﷺ“ ان میں سے دوسری دلیل یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعاء مکہ میں کی، اور یہ دعاء مکہ اور اس کے ارد گرد رہنے والوں کے لئے تھی کہ اے اللہ ”ان میں رسول بھیج جو ان میں سے ہی ہو۔“

اللہ تعالیٰ نے مکہ والے لوگوں کے لئے اور اس کے ارد گرد والے لوگوں کے لئے کوئی اور رسول سوائے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے مبعوث فرمایا ہی نہیں۔

ان دلائل میں تیسری دلیل یہ ہے کہ خود نبی کریم ﷺ نے فرمایا ”انا دعوة ابراهيم“ میں ابراهيم کی دعاء ہوں۔ یعنی میں ابراهيم علیہ السلام کی دعاء کا اثر ہوں، میں ان کا طلب کیا ہوا ہوں۔ (ارکب)

حدیث اور اس کی وضاحت:

ابھی کبیر کے حوالہ سے حدیث شریف کا ایک جملہ نقل کیا۔ وہ حدیث مکمل اس طرح ہے۔ حضرت عرباض بن ساریہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

”انی عند الله مکتوب خاتم النبیین وان آدم لمنجدل فی طینته وسأخبرکم بأول امری دعوة ابراهيم و بشارة عیسی و رؤیا امی التي رأت حین وضعتنی وقد خرج لها نور اضاء لها منها قصور الشام“ (شرح السنة، مسند احمد از ساخبر کم تا آخر، مشکوة باب فضائل سید المرسلین ص ۵۱۳)

میں اللہ تعالیٰ کے ہاں اس وقت بھی خاتم النبیین لکھا ہوا تھا جب کہ آدم علیہ السلام ابھی کیچڑ میں تھے، یعنی آپ کا خمیر تیار کیا جا رہا تھا۔ میں تمہیں اپنے اول امور کی خبر دے رہا ہوں کہ میں ابراهيم کی دعاء ہوں، اور عیسیٰ کی بشارت ہوں، اور اپنی ماں کی رؤیا ہوں، جو آپ نے اس وقت دیکھا جب مجھے جنا کہ آپ سے ایک نور ظاہر ہوا جس سے شام کے محلات روشن ہو گئے۔

”دعوة ابراهيم“ سے اسی دعاء کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر اس زیر بحث آیت کریمہ میں ہے، یعنی حضور ﷺ نے وضاحت فرمادی کہ ابراهيم علیہ السلام نے میرے آنے کی دعاء کی۔

”بشارة عیسی“ سے مراد جو عیسیٰ علیہ السلام نے کہا، رب تعالیٰ نے اسے ان الفاظ مبارکہ سے ذکر فرمایا۔ ﴿وَمُبَشِّرًا بِرُسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ﴾ آپ نے بشارت دی کہ میرے بعد ایک رسول تشریف لائیں گے جن کا نام احمد ہوگا۔

”رؤیا امی“ سے مراد کیا خواب کا واقعہ ہے یا ظاہر طور پر دیکھنا مراد ہے؟ اس پر شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

”ظاهر هذا الكلام ان رؤية نور اضاء به قصور الشام كانت في المنام وقد جاءت للاخبار

انہا كانت فی الیفة واما الذی فی المنام فهو انہا رأت انہ اتاہا آت فقال لها شعرت انک قد حملت بسید هذه الامة و نبیہا فینبغی ان یحمل الرؤیا علی الرؤیة بالعين واللہ اعلم

(لمعات)

اگر چہ ظاہر طور پر تو سمجھ آتا ہے کہ آپ کی والدہ کا نور کو دیکھنا، جس سے شام کے محلات روشن ہوئے، خواب کا واقعہ ہو۔ لیکن احادیث میں یہی واقعہ جاگتے ہوئے درپیش آنے کا ذکر بھی ہے، خواب کا واقعہ اس طرح بیان کیا گیا ہے۔ کہ آپ کی والدہ نے خواب دیکھا کہ کوئی شخص میرے پاس آ کر مجھے کہہ رہا ہے کیا تمہیں معلوم ہے کہ تم اس امت کے سردار اور نبی حاملہ ہو چکی ہو، مناسب یہی ہے کہ اس حدیث میں رؤیا سے آنکھ سے دیکھنا جاگتے ہوئے مراد لیا جائے۔

راقم کے نزدیک اس حدیث میں خواب کا معنی لینا ہی حقیقت سے دوری کی علامت ہے۔ اس لئے کہ ”حین وضعتنی“ ظرف ہے۔ ”رأت“ کی (جس وقت میری والدہ نے مجھے جنا اس وقت دیکھا) پیدائش کے وقت خواب کا دیکھنا ناممکن ہے۔

اس حدیث میں ظاہری طور پر دیکھنا مراد لیا جائے تو یہ معنی ظاہری ترکیب کے بالکل مطابق ہے، خواب والا معنی لینا تکلفات اور تاویلات سے خالی نہیں۔

اصل میں بنیادی طور پر غلطی کی وجہ یہ ہے کہ ”رؤیا“ کا معنی خواب مشہور و معروف ہے۔ لیکن رؤیا کا معنی ”الرؤیة بالعين“ (آنکھ سے دیکھنا) کم مشہور ہے، اس لئے اس حدیث میں بھی محققین حضرات نے معنی خواب کر دیا ہے جسے راقم کے ذہن نے قبول نہیں کیا۔

ایک شبہ کا ازالہ:

ظاہر ترجمہ کرنے والوں نے اس حدیث سے بھی غلطی کھائی، وہ کہتے ہیں، کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ”انا دعوة ابراہیم“ (میں ابراہیم کی دعاء ہوں) اس سے پتہ چلا کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی دعاء قبول نہیں ہوئی، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاء قبول ہوئی۔

اس قول کا رد علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ ان کا کہنا باطل ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے۔

”ولما کان اسمعیل علیہ السلام شریکاً فی الدعوة کان رسول اللہ ﷺ دعوة اسمعیل ایضاً الا انہ خص ابراہیم لشرافتہ و کونہ اصلاً فی الدعاء“

جب حضرت اسماعیل علیہ السلام بھی دعاء میں شریک تھے تو نبی کریم ﷺ ان کی دعاء کا بھی اثر ہیں، البتہ صرف ابراہیم علیہ السلام کا ذکر ان کی بزرگی کے پیش نظر تھا، پھر وہ باپ ہونے کے لحاظ پر اصل بھی ہیں۔ لہذا نبی کریم ﷺ نے با محاورہ کلام فرمایا، کیونکہ عام طور پر محاورہ یہی ہے کہ کسی گھر کے افراد مل کر بھی کلام کریں، تو عام طور پر گھر کے سربراہ کا نام ہی ذکر ہوتا ہے۔ کہ فلاں شخص نے یہ کام کیا۔

(ماخوذ از روح المعانی)

عجیب حکمت:

نماز میں درود شریف پڑھا جاتا ہے اس میں نبی کریم ﷺ کے اسم گرامی کے ساتھ ابراہیم علیہ السلام کا اسم گرامی ملا کر پڑھا جاتا ہے۔

”اللہم صل علی محمد وعلی آل محمد کما صلیت علی ابراہیم وعلی آل ابراہیم انک حمید مجید“ اس میں کیا حکمت ہے؟

اس میں چند وجوہ پائی گئی ہیں:

(۱) جب ابراہیم علیہ السلام نے حضرت محمد ﷺ کے لئے دعاء فرمائی، یعنی عرض کیا: رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ (اے ہمارے رب اور بھیج ان میں رسول جو ان میں سے ہی ہو، ان پر تیری آیات کی تلاوت کرے) تو اب اللہ کے حبیب پر بھی لازم ہو گیا کہ وہ بھی حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے لئے دعاء فرمائیں۔

”قضى الله تعالى عنه حقه بان اجري ذكره على السنة امته الى يوم القيامة“

اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کی طرف سے اپنے خلیل کا حق اس طرح ادا کر دیا کہ نبی کریم ﷺ کی امت کی زبانوں پر قیامت تک جاری فرما دیا۔

(۲) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے رب تعالیٰ کے حضور دعاء کی: وَاجْعَلْ لِّي لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْآخِرِينَ (اشعراء ۸۳) اور کر دے میرا اچھا ذکر آنے والوں میں۔

”یعنی ابق لی ثناء حسنا فی امة محمد ﷺ“ یعنی آپ کی اس دعاء کا مطلب یہ ہے

کہ آپ نے رب تعالیٰ کے حضور عرض کیا ”میری طرف امت محمد مصطفیٰ ﷺ میں باقی رکھنا۔“

”فاجابه الله تعالى وقرن ذكره بذكر حبيبه ابقاء للثناء الحسن اليه في امته“

تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعاء کو قبول فرمایا، آپ کے ذکر کو اپنے حبیب ﷺ کے ذکر کے ساتھ ملا لیا، تاکہ آپ کا اچھا ذکر نبی کریم ﷺ کی امت کی زبانوں پر تاقیامت باقی رہے۔

(۳) حضرت ابراہیم علیہ السلام ”اب المصلة“ ہیں۔ جس پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿مِثْلَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ﴾ دلالت کر رہا ہے۔ اور نبی کریم ﷺ ”اب الرحمة“ ہیں۔ رب تعالیٰ نے فرمایا: ﴿بِالْمُؤْمِنِينَ رَؤُفٌ رَّحِيمٌ﴾ آپ مومنوں پر مہربان رحم کرنے والے ہیں۔ اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا ”انما انا لکم مثل الوالد“ یعنی فی الرافۃ والرحمة ”بیشک میں تمہارے لئے تمہارے باپ کی طرح ہوں۔ یعنی باپ کی طرح تم پر مہربان اور رحم کرنے والا ہوں“ فلما وجب لكل واحد منهما حق الابوة من وجه قرن بین ذکرهما فی باب الثناء والصلوة“

جب دونوں حضرات یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام اور نبی کریم ﷺ کو امت پر مہربانی کی وجہ سے باپ ہونے کا حق حاصل ہے، تو اس وصف کے ظاہری اشتراک کی وجہ سے ان دونوں حضرات کے ذکر کو درود شریف میں ملا دیا۔

(۴) حضرت ابراہیم علیہ السلام شریعت میں حج کا اعلان کرنے والے وصف سے متصف ہیں۔ رب تعالیٰ فرمایا: ﴿وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ فِي الْحَجِّ﴾ اور لوگوں میں حج کی عام ندا کر دے۔ (الحج ۲۷) اور نبی کریم ﷺ دین کی ندا دینے والے ہیں، رب تعالیٰ نے فرمایا: ﴿رَبَّنَا إِنَّا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُنَادِي لِلْإِيمَانِ﴾ اے ہمارے رب ہم نے ایک ندا فرمانے والے کو سنا جو ایمان کی ندا فرماتا ہے۔ (آل عمران ۹۳)

جب دونوں حضرات منادی ہونے کے وصف میں شریک ہیں۔ ”فجمع اللہ تعالیٰ بینہما فی الذکر الجمیل“ تو اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو ذکر جمیل میں ایک جگہ جمع کر دیا۔

(ماخوذ از کبیر)

يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ:

تلاوت کرے ان پر تیری آیات اور سکھائے ان کو کتاب و حکمت۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب اللہ تعالیٰ سے دعاء کی کہ اے ہمارے رب اور بھیج ان میں رسول جو ان سے ہی ہو، تو ساتھ ہی رب کے حضور اس رسول کی تین صفات کا بھی ذکر کیا۔

(۱) ان پر تیری آیات تلاوت کرے، (۲) ان کو کتاب سکھائے۔ (۳) اور ان کو حکمت سکھائے پہلی صفت ﴿يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ﴾ میں دو وجہ ہیں۔ ایک یہ کہ اس سے مراد ”انہا الفرقان الذی انزل علی محمد ﷺ“ قرآن پاک ہے جو حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر نازل ہوا، اس وجہ سے کہ آپ جو قوم پر تلاوت فرماتے وہ قرآن پاک ہی تو ہے۔ لہذا یہی معنی لیا جائے۔ دوسری وجہ یہ ہے۔

”يجوز ان تكون الآيات هي الاعلام الدالة على وجود الصانع وصفاته سبحانه وتعالى ومعنى تلاوته اياها عليهم انه كان يذكروهم بها ويدعوهم اليها ويحملهم على الايمان بها“ کہ آیات سے مراد وہ علامات ہوں جو وجود صانع (رب تعالیٰ کی خالق ذات کے وجود) اور اس کی صفات پر دلالت کریں اور تلاوت کا مطلب یہ ہو جائے کہ وہ ان کے ذریعے ان کو نصیحت کریں۔ اور ان لوگوں کو ان کی طرف آنے کی دعوت دیں اور ان کو ان علامات و آیات پر ایمان لانے پر براہیجئے کریں۔ دوسری صفت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے مطلوب رسول کی یہ بیان کی ﴿وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ﴾ (اور ان کو کتاب سکھائے) اور مراد اس سے یہ ہے کہ ان کو کتاب کی تلاوت کا حکم دیں اور ان کو کتاب کے معانی اور حقائق سکھائیں۔

تلاوت چند وجہ سے مطلوب ہے:

”منها بقاء لفظها على السنة اهل التواتر فيبقى مصونا عن التحريف والتصحيف“ ان وجہ میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ قرآن پاک کے الفاظ کی لگاتار تلاوت ہوتی رہے، جب تواتر سے قرآن پاک کی تلاوت ہوتی رہے گی تو اس کے الفاظ مبارکہ میں کسی قسم کی تحریف نہیں ہو سکے گی۔ نہ الفاظ کو توڑ موڑ کر پیش کرنے کی کوئی جسارت کر سکے اور نہ ہی ان میں کوئی کمی اور زیادتی کر سکے۔

”ومنہا ان يكون لفظه ونظمه معجزا لمحمد ﷺ“ اور تلاوت کا یہ فائدہ ہے کہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن پاک نبی کریم ﷺ کا معجزہ ہے۔

اگر معجزہ نہ ہوتا تو یہود و نصاریٰ قرآن پاک میں تحریف کر چکے ہوتے، اس قرآن جیسا قرآن بنا چکے ہوتے، لیکن قیامت تک اپنے سر دھستے رہیں، ان شاء اللہ دین اسلام کو نہیں مٹا سکیں گے۔ ایک وقت آئے گا جب یہودیوں کا یار، فریبی و مکار ذلیل ہو کر جائے گا۔

”و منها ان یکون فی تلاوته نوع عبادۃ و طاعة“ تلاوت کرنے کا اور فائدہ یہ ہے کہ تلاوت کرنا عبادت ہے۔ اور تلاوت کرنا طاعت ہے۔ یقیناً عبادت و طاعت پر عظیم ثواب مرتب ہوتا ہے۔ لہذا تلاوت کرنا باعث اجر و ثواب ہے۔

علامہ رازی رحمہ اللہ کے اسی قول سے جہلاء کا موقف مردود ہو گیا جو یہ کہتے ہیں کہ قرآن سمجھنے کے بغیر پڑھنا کوئی فائدہ نہیں دیتا۔ وہ دراصل لوگوں کو عبادت سے منع کر رہے ہیں یہود کے ہمنوا ہیں کہ قرآن کی تلاوت نہ ہو۔ تاکہ یہود کو موقع مل سکے وہ اپنی مرضی سے اس میں کچھ نئی سورتیں داخل کر سکیں۔ لیکن ان جہلاء کو معلوم نہیں کہ قرآن پاک کا محافظ رب تعالیٰ ہے۔ کوئی بندہ نہیں کہ وہ حفاظت سے عاجز آ جائے۔

”و منها ان تكون قراءته فی الصلوات و سائر العبادات نوع عبادۃ“ اور فائدہ یہ ہے کہ قرآن پاک کی تلاوت تمام نمازوں میں ہوتی ہے۔ اس لئے قرآن پاک کی تلاوت عبادت ہے یہاں تک جو حکم بیان کیا گیا ہے۔ اس کا تعلق تلاوت سے ہے۔ لیکن ”ان الحکمة العظمیٰ و المقصود الاشراف تعلیم ما فیہ من الدلائل و الاحکام“ عظیم حکمت اور مقصود اشرف قرآن پاک میں جو دلائل اور احکام ہیں ان کی تعلیم دینا ہے۔ اسی لئے رب تعالیٰ نے قرآن پاک کا وصف ﴿هُدًی و نُورٌ﴾ ذکر فرمایا، کہ یہ ہدایت دینے والی کتاب ہے، اور نور بکھیرنے والی عظیم کتاب ہے۔

اسی وجہ سے اس زیر بحث آیہ کریمہ میں بھی رب تعالیٰ نے پہلے تلاوت کا ذکر فرمایا، پھر اس کے حقائق اور اسرار کی تعلیم کا ذکر فرماتے ہوئے۔ ﴿و یُعَلِّمُهُمُ الْکِتَابَ﴾ ذکر فرمایا۔

واضح ہوا کہ قرآن پاک کا صرف تلاوت کرنا عبادت باعث اجر و ثواب ہے، ہاں البتہ اللہ تعالیٰ سمجھنے کی بھی توفیق عطاء فرمائے تو اور ہی زیادہ نفع مند ہے۔

فائدہ: حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاء ﴿و یُعَلِّمُهُمُ الْکِتَابَ﴾ سے اور فائدہ یہ حاصل ہوا کہ

قرآن پاک کی سمجھ کامل اور مکمل اس وقت حاصل ہو سکتی ہے جب وہ نبی کریم ﷺ کی تعلیمات سے سمجھے، ورنہ کفار، مشرکین، منافقین، یہود و نصاریٰ عربی زبان کے ماہر تھے لیکن وہ قرآن پاک کو نہ سمجھ سکے، چونکہ فقط عربی زبان کی مہارت سے قرآن پاک سمجھ میں نہیں آ سکتا، صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین اور جلیل القدر مفسرین کرام (جن کی تفاسیر سے اقتباس لئے جا رہے ہیں) نے قرآن پاک کو مکمل حقہ تعلیمات مصطفویہ کی روشنی سے ہی سمجھا۔

وَالْحِكْمَةُ : حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جس رسول کے بھیجنے کے لئے رب کے حضور عرض کیا، اس کی تیسری صفت کا بھی ساتھ ہی مطالبہ کیا ”کہ وہ ان کو حکمت سکھائے۔“

حکمت کیا ہے؟

”واعلم ان الحکمة هی الاصابة فی القول والعمل“ قول اور عمل کا درست ہونا حکمت ہے۔ لہذا واضح ہوا کہ حکیم وہی ہوگا جس میں یہ دونوں چیزیں پائی جائیں گی، کہ اس کا قول اور اس کا عمل درست ہو۔ اگر کوئی ایک چیز درست نہیں ہوگی تو وہ حکیم نہیں ہوگا۔

☆ حکمت کا اور معنی ہے۔ ”رد کرنا“ (لوٹانا) جس طرح کہا جاتا ہے۔ ”احکمت الشی ای رد دتہ“ میں نے یہ چیز لوٹادی۔ اس معنی کے لحاظ پر حکمت کو حکمت کہنے کی وجہ یہ ہے۔ ”ہی التی ترد عن الجہل والخطأ“ کہ یہ انسان کو جہالت اور خطا سے پھیر دیتی ہے۔ لہذا اسی سے پتہ چلا کہ قول و فعل کے مطابق بھی وہی ہے، جو انسان کو جہالت اور خطا سے پھیر دے۔ یعنی حکمت کا مطلب ہوا۔ ”وضع کل شیء موضعہ“ ہر چیز کو اپنی جگہ میں رکھنا۔ اور بعض فلاسفہ نے یہ معنی بیان کیا ہے۔ ”الحکمة هی التشبه بالالہ بقدر الطاقة البشرية“ حکمت کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی طاقت بشریہ کے مطابق جتنا ہو سکے اپنے آپ کو رب تعالیٰ کی صفات کا مظہر بنائے۔

☆ حضرت ابن وہب کہتے ہیں میں نے امام مالک رحمہ اللہ سے پوچھا اس آیت کریمہ میں حکمت سے مراد کیا ہے؟ آپ نے فرمایا ”معرفة الدین والفقہ فیہ والاتباع لہ“ ”یعنی معرفت، دین میں تفقہ حاصل کرنا اور دین کی تابعداری کرنا،

☆ امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا ”الحکمة سنة رسول الله ﷺ“ حکمت رسول اللہ ﷺ کی سنت کو کہا گیا۔

☆ حکمت کا اور معنی یہ بیان کیا گیا ہے۔ ”الحکمة هي الفصل بين الحق والباطل“ حکمت اس چیز کو کہا جاتا ہے جو حق اور باطل میں فرق کرے۔

اب اس معنی کے لحاظ پر ابراہیم علیہ السلام کی دعاء کا یہ مطلب ہو گیا کہ ”وہ ان کو تیری کتاب سکھائے جو تو نے اس ذات پر نازل کرئی ہے۔ اور تیرے فیصلے اور احکام ان کو سکھائے۔“

☆ ﴿وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ﴾ ارادہ آیات المحکمة ﴿وَالْحِكْمَةَ﴾ ارادہا آیات المتشابهات

یعنی آپ کی یہ دعاء کہ ان کو کتاب سکھائے، اس سے مراد یہ ہے کہ کتاب میں جو آیات حکمت ہیں ان کی تعلیم دے، اور حکمت سے مراد آیات متشابہات ہیں۔ کہ ان کو یہ بتائے کہ یہ آیات متشابہات ہیں ان کے درپے نہ ہو۔

☆ ﴿وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ﴾ ای يعلمہم ما فیہ من الاحکام ﴿وَالْحِكْمَةَ﴾ ارادہا انہ يعلمہم حکمة تلك الشرائع وما فیہا من وجوه المصالح والمنافع

آپ کا یہ عرض کرنا کہ ”انکو کتاب سکھائے“ اس کا مطلب یہ ہے کہ انکو احکام سکھائے۔ اور حکمت کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کو ان احکام شرعیہ میں موجود مصلحتوں اور منفعتوں کی تعلیم دے۔ (از کبیر)

حکمت کے معانی جو بیان کئے گئے ہیں ان میں سے کچھ اور علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے بیان فرمائے۔

☆ ”والحکمة ما یزیل من القلوب وهج حب الدنيا“ حکمت سے مراد وہ چیز ہے جو انسانوں کے دلوں میں دنیا کی محبت کی بھڑکتی آگ کو زائل کر دے۔ یعنی دنیا کی شدید محبت کو دلوں سے نکال دے۔

☆ ”وقد یقال المراد به حقائق الكتاب و دقائقه وسائر ما اودع فیہ“ حکمت کا اور معنی یہ ہے، کتاب کے حقائق اور دقائق اور اس میں جو راز ودیعت ہیں۔

اب کتاب سکھانے کی دعاء کا یہ مطلب ہے کہ الفاظ سمجھائے۔ اور الفاظ کے اداء کرنے کی کیفیت سمجھائے، اور حکمت کی تعلیم دینے کا مطلب یہ ہے کہ اس میں جو راز ودیعت ہیں ان پر مطلع کرنا۔

☆ ”وفسرها بعضهم بما تكمل به النفوس من المعارف والاحكام“ اور مطلب یہ ہے کہ وہ ان کو حکمت سکھائے۔ یعنی ان کو معرفت کی باتیں اور احکام سکھائیں تاکہ ان کے نفوس کی تکمیل ہو سکے۔

(ار روح المعانی)

خازن نے بھی حکمت کے کئی معانی ذکر کئے ہیں۔ جو کو کبیر جن اور روح المعانی سے نقل کر دیا گیا۔ اور یہ معنی بھی بیان کیا ہے۔

”وقيل كل كلمة وعظمتك او دعتك الى مكرمة او نهتك عن قبيح فهي حكمة“ اور یہ بیان کیا گیا ہے کہ ہر وہ کلمہ جس میں نصیحت پائی جائے، انسان کو عزت والے مقام پر پہنچائے اور قبیح کاموں سے روکے وہ حکمت ہے۔

اور کتاب سکھانے کا مطلب یہ ہے کہ ان کو ظاہری علوم عطاء کریں، اور حکمت سکھانے کا مطلب یہ ہے کہ ان کو باطنی علوم سکھائیں جنکی وجہ سے وہ حج کے اسرار پر مطلع ہو سکیں اور نماز کی طرف کامل توجہ کر سکیں۔

(تفسیر الرحمن)

راقم کے نزدیک حکمت کے تمام معانی مجتمع ہیں، ان میں کوئی تضاد نہیں۔

وَيُزَكِّيهِمْ : (اور ان کو پاکیزہ کرے) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جس رسول کے لئے دعاء فرمائی، ان کے لئے اور عرض یہ کی کہ وہ ان کو پاکیزہ کریں۔

پاکیزہ کرنے کے معنی میں بھی وسعت پائی گئی ہے۔ ان کو پاکیزہ کرے شرک سے، اور ان کو پاکیزہ کرے بت پرستی سے اور ان کو پاکیزہ کرے ہر نجس چیز سے، اور ان کو پاکیزہ کرے ہر ذیل کام سے، ان کو پاکیزہ کرے ہر نقص سے۔

اور یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب نبی کریم ﷺ کی امت انبیاء کرام کے حق میں قیامت کے دن گواہی دے گی کہ انہوں نے تیرے احکام اپنی امتوں کو پہنچائے تھے۔

جب کفار یہ کہیں گے کہ یہ تو بعد میں آئے ہیں یہ کیسے گواہی دے رہے ہیں۔ تو یہ کہیں گے ہمیں نبی کریم ﷺ نے بتایا، تو نبی کریم ﷺ اپنی امت کی عدالت کی گواہی دیں گے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاء کا یہی مطلب ہے کہ وہ رسول ان کا تزکیہ کریں، ان کے عادل ہونے کی گواہی دیں۔

پاکیزہ کرنے کی دعاء میں حکمت:

انسان کے کمال کا حال دو چیزوں پر مبنی ہے۔

”احدهما ان يعرف الحق لذاته“ ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ حق کو لذاتہ پہنچانے۔

”والثانی ان يعرف الخیر لاجل العمل“

اور دوسری چیز یہ ہے کہ انسان نیکی کو پہچانے تاکہ اس پر عمل کر سکے۔

اگر ان دونوں چیزوں میں سے کسی ایک میں خلل واقع ہو تو وہ شخص رذیل کاموں اور نقائص سے پاک نہیں ہو سکتا۔ جب اللہ تعالیٰ کے حضور فضل و کمال والی صفات کی دعاء کی تو بعد میں یہ دعاء کی کہ وہ ان کو رذیل اور نقص والے کاموں سے پاک کریں۔

(از کبیر)

عقیدہ: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعاء فرمائی کہ وہ رسول ان کا ترکیہ فرمائیں، اس سے مراد یہ ہے کہ اے اللہ تو ان کو ان تصرفات کی قدرت بھی دینا کیونکہ رسولوں کو مکلفین کے باطن میں تصرف کی ذاتی طور پر قدرت حاصل نہیں۔

(از کبیر)

فائدہ: اتنا واضح ہوا کہ انسان کو ظاہری اور باطنی پاکیزگی اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے، جب نبی کریم ﷺ کا اس میں وسیلہ اور واسطہ پایا جائے، آپ کے بغیر انسان کب مسلمان ہو سکتا تھا۔ یہ تو آپ کا ہی احسان عظیم ہے کہ انسان کو اسلام قبول کر کے شرف انسانیت حاصل ہو گیا۔

نبی کریم ﷺ کا پاکیزہ کرنا:

آپ نے وعد اور وعید، وعظ و نصیحت سے لوگوں کو پاکیزہ فرمایا، پھر بار بار ان کو ان چیزوں کی یاد دلاتے رہے۔ پھر نبی کریم ﷺ نے اپنے اخلاق کریمانہ اور اپنے اعمال صالحہ سے لوگوں کو پاک فرمایا کہ انہوں نے آپ کے نیک اعمال کو دیکھ کر وہی عمل کیے اور آپ کے اچھے اخلاق کی وجہ سے آپ کے قریب ہوئے۔

(از کبیر)

اَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ: (بیشک تو ہی عزیز و حکیم ہے) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب اپنی دعاؤں کو اللہ تعالیٰ کے ذکر (ربنا) سے شروع فرمایا تو ختم بھی اللہ کے ذکر سے فرمایا۔

”العزیز هو القادر الذی لا یغلب“

عزیز کا مطلب یہ ہے کہ وہ قادر ہے کوئی اس پر غالب نہیں۔

”والحکیم هو العالم الذی لا یجھل شیئاً“ حکیم کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے کوئی چیز اس کے علم سے باہر نہیں۔ جب اللہ تعالیٰ عالم و قادر ہے تو اس کا ہر فعل درست ہے اور اس کے کام عبث اور سفاہت سے دور ہیں۔

اگر اللہ تعالیٰ کو یہ صفات علم و قدرت کی نہ حاصل ہوتیں تو دعاؤں کا قبول کرنا، رسول کا بھیجنا اور کتابوں کا نازل کرنا بھی ممکن نہ ہوتا۔

عزیز ہونا اللہ تعالیٰ کی صفات ذاتیہ سے ایک صفت ہے، جب اس کا قادر ہونا معلوم ہو گیا تو اسی سے یہ خود بخود ثابت ہو گیا کہ وہ ذلت و رسوائی سے پاک ہے۔

”لأنه اذا كان منزها عن الحاجات لم تلحقه ذلة المحتاج“ جب اللہ تعالیٰ حاجات سے پاک ہے تو اس ذات کو محتاج ہونے کی ذلت حاصل نہیں ہو سکتی۔

”ولا یجوز ان یمنع من مراده حتی یدلحقه اهتضام، فهو عزیز لا محالة“ اور یہ جائز نہیں کہ اس کو مراد سے روکا جائے کہ اسے اپنی مراد سے ناکام ہونے کی رسوائی لاحق ہو۔ لہذا وہ یقینی طور پر عزیز ہے۔

”الحکیم“ بھی جب ”علیم“ ہونے کے معنی میں استعمال ہو تو یہ بھی صفات ذات سے ہے، یعنی اس کی ضد کی خود بخود نفی پائی جاتی ہے کہ وہ جہالت سے پاک ہے۔

فائدہ: اگر عزت سے مراد ”کمال عزت“ ہو۔ اور حکمت سے مراد ”افعال حکمت“ ہو، تو عزیز ہونا اور حکیم ہونا صفات فعل سے ہیں۔

صفات ذات اور صفات فعل میں فرق یہ ہے۔ صفات ذات ازلیہ ہیں اور صفات فعل اس طرح نہیں صفات ذات کی نقیضوں کا سچا آنا کسی وقت میں بھی ممکن نہیں، لیکن صفات فعل کو یہ کیفیت حاصل نہیں۔

صفات فعل امور نسبیہ سے ہیں جن کے تحقق میں اعتبار فاعل سے آثار کا صادر ہونا ہے۔ اور صفات ذات اسی طرح نہیں۔

(از کبیر)

﴿وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ إِبْرَاهِيمَ إِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهُ﴾

﴿وَلَقَدْ اصْطَفَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ﴾

(۱) اور ابراہیم کے دین سے کون منہ پھیرے، سوا اس کے جو دل کا احمق ہے، اور بیشک ضرور ہم نے دنیا میں اسے چن لیا اور بیشک وہ آخرت میں ہمارے خاص قرب کی قابلیت والوں میں ہے۔

(۲) اور کون ہے جو منہ پھیرے ابراہیم کے دین سے، سوائے اس کے جو دل کا احمق ہے۔ اور تحقیق ہم نے اسے چن لیا دنیا میں، اور بے شک وہ آخرت میں ہمارے خاص قرب کی قابلیت والوں میں ہے۔
(آیت نمبر ۱۳۰)

جب اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو آزمانے اور ان کے کامیاب ہونے کا ذکر فرمایا، اور کعبہ شریف کی تعمیر، اور آپ کی دعاؤں اور آپ کا لوگوں کی بہتری حاصل کرنے پر حریص ہونے کا ذکر فرمادیا۔ تو اس کے بعد اس آیت کریمہ میں ان لوگوں پر تعجب کیا گیا جو ابراہیم علیہ السلام کے دین سے اعراض کرنے والے ہیں۔

شان نزول:

(۱) حضرت عبد اللہ بن سلام رحمہ اللہ نے جب اسلام قبول کیا تو اس کے بعد انہوں نے اپنے بھائی کے دو بیٹوں سلمہ اور مہاجر کو بھی دعوت اسلام دی۔ اور ساتھ ہی یہ فرمایا کہ تمہیں معلوم ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے توارۃ میں فرمایا: ”انی باعث من ولد اسمعیل نبیا اسمہ احمد فمن آمن به فقد اهتدی ومن لم یؤمن به فهو ملعون“ کہ میں اسماعیل کی اولاد سے نبی بھیجے والا ہوں جس کا نام احمد ہوگا۔ جس شخص نے آپ پر ایمان لایا وہ ہدایت پا گیا، اور جس نے ایمان قبول نہ کیا وہ ملعون ہے۔ سلمہ نے آپ کے اس ارشاد پر ایمان قبول کر لیا، اور مہاجر نے ایمان قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ کو نازل کیا۔
(خازن)

(۲) دوسری وجہ شان نزول کی یہ ہے کہ کفار نے جب اللہ تعالیٰ سے شریک ٹھہرانا، اور ابراہیم علیہ السلام

کے دین کی مخالفت کو ایجاد کر لیا، اور اپنے مذہب کا حصہ سمجھ لیا تو رب تعالیٰ نے ان کی مذمت میں اس آیت کریمہ کو نازل کیا۔
(صابونی)

(۳) تیسری وجہ شان نزول کی یہ ہے کہ حضرت قتادہ فرماتے ہیں، جب یہود و نصاریٰ نے ابراہیم علیہ السلام کے دین سے اعراض کیا، اور یہودیت و نصرانیت میں ان چیزوں کو ایجاد کیا جو اللہ تعالیٰ کا حکم نہیں تھا تو ان لوگوں کی مذمت میں اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ کو نازل کیا۔

راقم کے نزدیک تمام وجوہ کے بعد آیت کریمہ کا نزول ہوا جو سب وجوہ کا شان نزول ہے۔ ان میں اجتماع جائز ہے، کوئی تعارض نہیں۔

وَمَنْ يَرْغَبُ عَنْ مِلَّةِ إِبْرَاهِيمَ إِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهُ :

اور کون ہے جو منہ پھیرے ابراہیم کے دین سے سوائے اس کے جو دل کا احمق ہے۔
یعنی ابراہیم علیہ السلام کے دین سے سوائے دل کے احمق کے کوئی اور اعراض نہیں کر سکتا۔
”من“ استفہام انکاری کے لئے ہے، یعنی کون ہے جو اعراض کرے، مطلب یہ ہے کہ کوئی عقل مند اعراض نہیں کر سکتا۔ اور یا استفہام استبعادی ہے۔ یعنی ابراہیم علیہ السلام کے دین سے اعراض کرنا عقلمند شخص کے لئے تو عقلاً بہت بعید ہے۔
(مظہری)

اور یا استفہام تعجب کے لئے ہے۔ یعنی ابراہیم علیہ السلام کے دین سے منہ پھیرنے والوں پر بہت تعجب ہے۔
(قرطبی)

”رغبة“ کے بعد جب صلہ ”الی“ آئے تو اس وقت اس کا معنی میلان کرنا ہوتا ہے۔ اسی طرح بعد میں ”فی“ آئے تو پھر بھی معنی یہی ہوتا ہے۔ جیسا کہ ”انا الی اللہ راغبون“ بیشک ہم اللہ کی طرف رغبت کرنے والے ہیں۔ اور کہا جاتا ہے ”انی رغبت فی هذه المسئلة“ بیشک میں اس مسئلہ میں رغبت رکھتا ہوں۔

اور جب اس کے بعد ”عن“ آئے تو معنی ہوتا ہے ”اعراض کرنا، نفرت کرنا، مکروہ سمجھنا۔ اس آیت کریمہ میں یہی معنی ہے یعنی ”منہ پھیرنا“
(مظہری)

﴿إِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهُ﴾ ای جعلها مهانة ذليلة ”سوائے اس کے جس نے اپنے نفس کو ذلیل و رسوا کیا۔“ ”السفه“ کا معنی خفت۔ کہا جاتا ہے۔ ”زمام سفیه“ خفیف باگ ڈوری۔

اس آیت کریمہ میں ”سفہ“ متعدی استعمال ہے۔ ”نفسہ“ مفعول ہے۔ نفس کا معنی جان، دل روح وغیرہ ہے۔ اعلیٰ حضرت نے اس کا معنی دل کیا ہے۔ اسی لئے ترجمہ کیا ہے۔ ”جو دل کا احمق ہے۔“ ابن کیسان اور زجاج نے ”سفہ نفسہ“ کا معنی کیا ہے۔ ”جہل نفسہ“ جس نے اپنے آپ کو نہ پہچانا۔ ”من عبد غیر اللہ فقد جہل نفسہ لانه لم يعرف اللہ خالقہا“ جس شخص نے غیر اللہ کی عبادت کی وہ اپنے آپ سے جاہل ہے۔ اس لئے کہ اس نے نہ پہچانا کہ اللہ اس کے نفس کا خالق ہے۔

عارف کامل حضرت یحییٰ بن معاذ متوفی ۲۵۸ھ کا مشہور مقولہ ہے۔ ”من عرف نفسہ فقد عرف ربہ“ یعنی جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔ اپنے آپ کو پہچاننے کا مطلب یہ ہے کہ اسے معلوم ہو کہ میں ممکن ہوں، اپنے وجود میں رب تعالیٰ کا محتاج ہوں وہی میرا خالق ہے، جب یہ اسے سمجھ آئے گی۔ تو اسے خود بخود سمجھ آ جائے گی کہ رب تعالیٰ واجب الوجود ہے، وہ کسی کا محتاج نہیں۔ وہ خالق ہے۔ وہ قیوم ہے، وہ نور مبین ہے۔

(از النبیان للکاطمی رحمہ اللہ)

☆ روایات میں ہے کہ رب تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف وحی کی اور ارشاد فرمایا۔ ”اعرف نفسک واعرفنی فقال یا رب کیف اعرف نفسی و کیف اعرفک، فاحی اللہ الیہ اعرف نفسک بالضعف والعجز والفناء واعرفنی بالقوة والقدرة والبقاء“ تم اپنے آپ کو پہچانو، اور مجھے پہچانو، آپ نے عرض کی اے میرے رب میں اپنے کو کیسے پہچانوں، اور تمہیں کیسے پہچانوں؟ رب تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی کی تم اپنے آپ کو ضعف، عجز اور فنا سے پہچانو، اور مجھے قوت و قدرت و بقاء سے پہچانو۔

(از مظہری)

وَلَقَدْ اصْطَفَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا : (اور تحقیق ہم نے اس کو چن لیا دنیا میں)

یعنی ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو رسالت کے لئے پسند کر لیا ہے۔ اور ان کو ہر قسم کے گناہوں کی میل کچیل سے پاک رکھا ہے۔

(فرطی)

﴿اصْطَفَيْنَاهُ﴾ ای اخترناہ للرسالة والنبوة والخلة لعلنا بانه صفوة العباد في الدنيا ہم نے اسے پسند کر لیا ہے رسالت اور نبوت کے لئے اور خلیل بنانے کے لئے، کیونکہ ہمیں

معلوم ہے کہ بیشک آپ دنیا میں ہمارے بندوں میں سے برگزیدہ بندے ہیں۔ (شیخ زادہ)

وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ :

اور بیشک وہ آخرت میں ہمارے خاص قرب کی قابلیت والوں میں ہے۔

یعنی جس شخص کو رب نے چن لیا اور وہ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں میں سے ہے۔ جس کی نبوت اور خلعت کی رب تعالیٰ نے شہادت دی ہے۔ وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے خاص مقرب ہوں گے۔
”كان حقيقا بالاتباع له لا يرغب عنه الا سفيه او متسفه اذل نفسه بالجهل والاعراض عن النظر“

لہذا حق یہ ہے کہ ان کی تابعداری کی جائے، ان کے دین سے کوئی اعراض نہیں کرتا سوائے اس کے جو بے وقوف ہے، یا اس نے اپنے آپ کو بے وقوف بنا رکھا ہے۔ جہالت اور نظر و فکر نہ کر کے اپنے آپ کو ذلیل کر لیا ہے۔

(بیضاوی)

تراجم کا تقابلی جائزہ:

﴿وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ﴾

محمود الحسن صاحب	اور وہ آخرت میں نیکوں میں ہے۔
شاہ عبدالقادر صاحب	اور آخرت میں نیک ہے۔
اشرف علی صاحب	اور وہ آخرت میں بڑے لائق لوگوں میں شمار کئے جاتے ہیں
علی حضرت مولانا احمد رضا خان	اور بے شک وہ آخرت میں ہمارے خاص قرب کی قابلیت والوں میں ہیں۔

یہ تو واضح ہو چکا ہے کہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر ہے۔ تراجم میں فرق یہ ہے۔ کہ صرف نیکوں میں ہونا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شان کو واضح نہیں کرتا، اس لئے کہ نیک تو غیر انبیاء بھی ہوں گے۔ حالانکہ مقام انبیاء اور غیر انبیاء میں بہت بڑا فرق ہے۔

لیکن اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اس مقصد کو شامل ہے کیونکہ آپ نے ”خاص قرب کی قابلیت والوں میں ہے۔“ ترجمہ کیا ہے جس سے واضح ہو گیا خاص قرب کی قابلیت صرف انبیاء کرام کو ہی حاصل ہوگی عام نیکوں کو وہ مقام حاصل نہیں ہوگا۔

لہذا صحیح مقصد اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے ہی حاصل ہوا۔ اسی پر جلالین کی عبارت دیکھیں۔

صالحین کی تفسیر آپ نے ان الفاظ سے کی ”الذین لهم الدرجات العلی“ کہ وہ لوگ جن کو بلند درجات حاصل ہوں گے آپ ان ہی میں ہوں گے۔

اسی طرح شیخ زادہ بریضاوی میں ہے۔

”قيل المراد بالصالحين الانبياء عليهم الصلوة والسلام لقوله تعالى ومن ذريته داود وسليمان وايوب (الى قوله) كل من الصالحين. (وان ابراهيم عليه السلام دعا ربه وقوله ”والحقني بالصالحين“ (اي الانبياء الماضين فاجاب الله دعوته وبين انه معهم في الجنة)

یہاں بھی مقصد یہ بیان کیا گیا ہے کہ صالحین سے مراد انبیاء ہیں، کیونکہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔ آپ کی اولاد میں سے داؤد اور سلیمان اور ایوب، یوسف، موسیٰ، ہارون، زکریا، یحییٰ، عیسیٰ، الیاس علیہم السلام تمام ہی صالحین سے ہیں۔ اور ابراہیم علیہ السلام نے اپنے رب سے دعاء کی کہ اے میرے رب مجھے صالحین سے، یعنی پہلے انبیاء سے لاحق فرما، رب تعالیٰ نے آپ کی اس دعاء کو قبول فرمایا، اور آپ کو بتایا کہ تم جنت میں ان کے ساتھ ہو گے۔

اس آیت کریمہ میں اسی خبر کا بیان ہے کہ آپ آخرت میں انبیاء کے ساتھ ہی ہوں گے، جو خاص قرب کی قابلیت والے ہیں۔

(نسکین الجنان)

﴿وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنْ﴾ الانبياء ﴿الصّٰلِحِيْنَ﴾ ﴿فِي مَرَاتِبِ الْقَرَبِ﴾

بیشک وہ آخرت میں انبیاء کرام کے ساتھ ہوں گے جو خاص قرب کے مراتب والے ہوں گے

(مظہری)

تنبیہ: نبی کریم ﷺ کی شریعت پہلی تمام شریعتوں کے لئے ناسخ ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کے دین کی پیروی کا کیا مطلب؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری کے لئے دعاء کی، تو جن لوگوں نے نبی کریم ﷺ پر ایمان لایا وہ ملت ابراہیمی کے متبع ہوئے۔ جنہوں نے ایمان نہ لایا وہ ملت ابراہیمی سے اعراض کرنے والے ہوئے۔

مزید تفصیل ان شاء اللہ ﴿فَاتَّبِعُوا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيفًا﴾ کے تحت آئے گی۔

﴿ اِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِربِّ الْعَلَمِينَ ﴾

(۱) جب اس سے اس کے رب نے فرمایا گردن رکھ، عرض کی میں نے گردن رکھی اس کے لئے جو رب ہے سارے جہانوں کا۔

(۲) یاد کرو جب کہا ان کو ان کے رب نے کہا تمام امور میرے سپرد کردو، آپ نے کہا میں نے تمام امور سپرد کردئے اس کے لئے جو تمام جہانوں کا رب ہے۔

﴿ اَسْلِمَ ﴾ یعنی نفسک الی اللہ عزوجل و فوض امورک الیہ (مطہری)

اپنے آپ کو رب تعالیٰ کے سپرد کردو اور اپنے تمام امور اسی کے سپرد کردو۔

اللہ تعالیٰ کے تمام قضاء و قدر کے تسلیم کرنے کو بھی اسلام کہا جاتا ہے، یہی معنی اس آیت کریمہ میں معتبر ہے۔ (از مفردات راغب)

تنبیہ: اسلام کا ایک معنی اسلام لانا بھی ہے۔ لیکن وہ معنی یہاں اس لئے ممکن نہیں کہ انبیاء کرام تو پیدا ہی اسلام اور توحید پر ہوتے ہیں۔ ہاں البتہ یہ معنی مراد لینا ممکن ہے۔

”استقم علی الاسلام واثبت علیہ“ اسلام پر قائم رہو اور اسی پر ثابت رہو۔ (خازن)

﴿ قَالَ اَسْلَمْتُ لِربِّ الْعَلَمِينَ ﴾ : آپ نے کہا میں نے تمام امور سپرد کردئے اس لئے جو تمام جہانوں کا رب ہے۔

اور مطلب یہ بھی ہے کہ میں نے طاعت کی وجہ سے خضوع کیا، اور اپنی عبادت خالص مخلوق کے مالک اور مدبر اور خالق کے لئے ہے۔ (خازن)

اپنے آپ کو ابراہیم علیہ السلام نے رب تعالیٰ کے سپرد یہاں تک کر دیا کہ جب آپ کو باندھ کر منہ خنق کے ذریعے نمرود کی آگ میں ڈال دیا گیا، تو آپ کے پاس جبریل آئے انہوں نے کہا۔ ”ہل لک حاجة“ کیا تمہیں کوئی حاجت ہے؟

تو آپ نے فرمایا ”اما الیک فلا“ مجھے تم سے تو کوئی حاجت نہیں۔

جبرائیل نے کہا ”فاسئل ربک“ آپ اپنے رب سے ہی سوال کرلو، آپ نے فرمایا

”حسبی من سوالی علمہ بحالی“ جب وہ میرے حال کو جانتا ہے تو اس کا علم ہی مجھے کافی ہے، سوال کی ضرورت نہیں۔

”فجعل اللہ تعالیٰ ببرکۃ تفویض امورہ الی اللہ تعالیٰ حظیرۃ النار روضة ولم یحترق منه الا وثاقہ“

جب آپ نے اپنے تمام امور اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دئے تو اس کی برکت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آگ کے گڑھے کو باغ بنا دیا، آپ کو ذرا بھر کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ صرف جس رسی سے آپ کو باندھا گیا تھا وہی جلی۔

آیہ کریمہ کا مطلب واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ آپ اپنے تمام معاملات میرے سپرد کر دو۔

اور میری طاعت پر قائم رہو، تو آپ نے اپنے تمام معاملات رب تعالیٰ کے سپرد کر دئے۔

﴿وَوَصَّىٰ بِهَا إِبْرَاهِيمُ بَنِيهِ وَيَعْقُوبُ ۖ يٰٓبَنِيَّ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفٰی لَكُمُ الدِّينَ فَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُمْ مُسْلِمُونَ﴾ (آیت ۱۳۲)

(۱) اور اسی دین کی وصیت کی ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو اور یعقوب نے کہ اے میرے بیٹو، بے شک اللہ نے یہ دین تمہارے لئے چن لیا تو نہ مرنا مگر مسلمان۔

(۲) اور وصیت کی اسی ملت (دین) کی ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو اور یعقوب نے (بھی) کہ اے میرے بیٹو بے شک اللہ نے چن لیا ہے تمہارے لئے یہ دین، پس تم ہرگز نہ مرنا مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو۔

یعنی ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی، اور یعقوب علیہ السلام نے بھی اپنے بیٹوں کو وصیت کی کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے دین اسلام کو پسند کر لیا ہے۔ اس لئے تم اسی پر قائم رہنا یہاں تک کہ تمہاری موت اسلام پر آئے، اور تم خالص مومن بن کر رہنا، اور اپنے تمام امور اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دینا۔

وَصَّى : توصیہ سے لیا ہوا ہے، جس کا معنی ہے۔ ”اچھے کام اور قربت والے کام کی کسی کو نصیحت کرنا۔

یہ بھی خیال رہے کہ وصیت کا مشہور مطلب یہ ہے کہ موت کے بعد کسی کام کے جاری کرنے کے متعلق کہا جائے۔ لیکن کبھی فقط نصیحت کرنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

وصیۃ کا معنی اصل میں ”وصلۃ“ (ملنا، ملانا) ہے۔ جس طرح کہا جاتا ہے ”وصّاه“ وہ فلاں سے متصل ہوا۔ اور ”فصّاه“ کا معنی ہے ”فصلہ“ جدا کرنا۔

وصیت میں بھی وصیت کرنے والا اپنی وصیت کو اس سے ملاتا ہے جسے وصیت کی جائے۔

بہا : ضمیر یا تو ”ملۃ“ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور یا ﴿أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ کی طرف لوٹ رہی ہے۔

(از مظہری)

بَنِيهِ : (اپنے بیٹوں کو) ابراہیم علیہ السلام کے چار بیٹے تھے، اسماعیل علیہ السلام، اسحاق علیہ السلام، اور مدین اور مدان، بعض نے کہا ہے کہ آپ کے آٹھ بیٹے تھے۔ واللہ اعلم۔

(بیضاوی)

وَيَعْقُوبُ : اس کا عطف ہے ”ابراہیم“ پر۔ ”ای وصی ہو ایضا بہا بنیہ“ یعنی یعقوب علیہ السلام نے بھی اپنے بیٹوں کو وہی وصیت کی جو آپ کے جد امجد ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی تھی۔

إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ لَكُمْ الدِّينَ : بے شک اللہ نے جن لیا تمہارے لئے دین۔

دین سے مراد دین اسلام ہے۔ ”الذی ہو صفوة الادیان“ جو تمام دینوں سے برگزیدہ دین ہے۔

علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے ”الدین“ کے بعد ”دین الاسلام“ کے الفاظ ذکر فرمائے ہیں۔

اس پر شیخ زادہ نے لکھا کہ اشارہ ہے اس طرف کہ ”الدین“ پر الف لام عہد خارجی ہے، اور

معبود وہ دین ابراہیم علیہ السلام ہے۔ وہ دین اسلام ہے۔ کیونکہ الف لام جنسی ہو تو مراد جنس دین ہوگا۔

حالانکہ تمام دین برگزیدہ نہیں دینوں میں شان کے لحاظ سے اسی طرح فرق ہے، جیسا کہ انبیاء کرام میں

شان کے لحاظ سے فرق ہے کہ بعض کو بعض پر فضیلت حاصل ہے۔

تنبیہ :

”فما وقع من تخصيص دين الاسلام بدين نبينا ﷺ ليس قصرا حقيقيا بل الاضافة الى دين اليهود والنصارى وسائر اهل الشرك والضلال“

دین اسلام کی تخصیص جو ہمارے نبی کریم ﷺ کے دین کے ساتھ ہے اس میں قصر حقیقی نہیں، بلکہ قصر اضافی ہے۔ یعنی اس سے مراد یہ ہے کہ یہودی اور نصرانی دین اور مشرکوں کا دین، اسلام نہیں

(شیخ زادہ)

فَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ: پس ہرگز نہ مرنا مگر تم اس حال میں کہ تم مسلمان ہو۔

اگرچہ بظاہر اسلام کے خلاف حال میں مرنے سے نہی پائی گئی ہے۔ لیکن ظاہری معنی لینا درست نہیں۔ اس لئے کہ موت انسان کے اختیار میں نہیں کہ جب تک وہ اسلام نہ لائے اس پر موت ہی نہ آئے۔ یہ تو ممکن نہیں۔

البتہ مقصود یہ ہے کہ تمہاری موت کے وقت تم حالت اسلام سے دور نہ ہو۔ چونکہ اسلام قبول کرنا یا نہ کرنا انسان کی طاقت میں ہے۔

(از بیضاوی)

فائدہ : اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا ”وامر ابراہیم بنیہ“ کہ ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو حکم

دیا۔ بلکہ یہ فرمایا، ﴿وَوَصَّىٰ بِهَا إِبْرَاهِيمُ بَنِيهِ﴾ ابراہیم نے اس کی اپنے بیٹوں کو وصیت کی، اس کی وجہ یہ ہے کہ وصیت نسبت امر کے زیادہ مؤکد ہے، کیونکہ وصیت کا زیادہ طور پر تعلق موت کے خوف کے وقت سے ہے۔

”وفي ذلك الوقت يكون احتياط الانسان لدينه اشد واتم“ اس وقت میں

انسان دین کے معاملات میں بہت زیادہ اور کامل طور پر احتیاط سے کام لیتا ہے۔

جب یہ معلوم ہو گیا تو یہ بھی خود بخود واضح ہو جاتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اس وصیت میں بہت زیادہ اہتمام سے کام لیا۔ ”كان القوم الى قبوله اقرب“ اسی وجہ سے آپ کی قوم نے بھی اسے جلدی ہی قبول کر لیا۔

اور وجہ یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو خاص کر کے وصیت کی، اور یہ بھی واضح ہے کہ

انسان اپنی اولاد سے جتنی زیادہ شفقت کرتا ہے اتنی کسی اور سے نہیں کرتا، آپ نے جب اپنی اولاد کو آخری عمر میں یہ وصیت کی۔ ”علمنا ان اهتمامہ بذلک کان اشد من اهتمامہ بغيره“ تو معلوم ہو گیا کہ آپ نے اس وصیت میں بہت زیادہ اہتمام کیا اتنا اہتمام اور لوگوں کو وصیت کرنے میں نہ ہوتا۔

اور وجہ یہ ہے کہ آپ نے وصیت اپنے تمام بیٹوں کو کی کسی کو وصیت میں خاص نہیں کیا۔ ”وذلك ايضا يدل على شدة الاهتمام“ یہ بھی اس پر دلالت کر رہا ہے کہ آپ نے اپنی وصیت شدید اہتمام کیا۔ اور وجہ اس میں یہ ہے کہ آپ نے وصیت مطلق کی جو کسی زمان پر معین اور مکان معین سے مقید نہیں ”وذلك ايضا يدل على شدة الاهتمام“ اور یہ بھی دلالت کرتا ہے کہ آپ نے اس میں شدید اہتمام کیا اور وجہ یہ ہے کہ آپ نے اس وصیت کے ساتھ کوئی اور وصیت نہیں ملائی تو اس سے بھی پتہ چلا کہ آپ نے اس معاملہ میں شدید اہتمام کیا۔

جب یہ معلوم ہو گیا کہ ابراہیم علیہ السلام کو رب تعالیٰ نے بہت زیادہ فضیلت عطاء فرمائی، اور حسن طریقت اور کمال سیرت آپ کو عطاء کی گئی۔ پھر آپ نے وصیت میں شدید اہتمام فرمایا، اور وصیت بھی دین پر قائم رہنے کی جو عظیم نصیحت ہے۔ ان وجوہ کے پیش نظر ہی آپ نے اپنے بیٹوں کو خاص کیا۔

”والا فمعلوم من حال ابراهيم عليه السلام انه كان يدعو الكل ابدًا إلى الاسلام والدين“
ورنہ یہ معلوم ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے ہمیشہ دین اسلام کی دعوت سب لوگوں کو دی، یعنی بیٹوں کو وصیت کرنے سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ آپ کی دعوت الی الحق گھرتک محدود تھی۔ (ارکیر)

☆☆☆

﴿أَمْ كُنْتُمْ شُهَدَاءَ إِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتُ ۖ إِذْ قَالَ لِبَنِيهِ مَا تَعْبُدُونَ مِنْ بَعْدِي ۖ قَالُوا نَعْبُدُ إِلَهَكَ وَإِلَهَ آبَائِكَ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ إِلَهًا وَاحِدًا ۖ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ﴾ (آیت ۱۳۳)

- (۱) بلکہ تم خود موجود تھے جب یعقوب کو موت آئی جب کہ اس نے اپنے بیٹوں سے فرمایا میرے بعد کس کی پوجا کرو گے بولے ہم پوجیں گے اسے جو خدا ہے آپ کا اور آپ کے آباء ابراہیم و اسماعیل و اسحاق کا ایک خدا اور ہم اسکے حضور گردن رکھے ہیں۔
- (۲) کیا تم حاضر تھے؟ جب آئی یعقوب کو موت، جب آپ نے کہا اپنے بیٹوں کو، تم کس کی عبادت کرو گے میرے بعد؟ انہوں نے کہا ہم عبادت کریں گے تمہارے معبود کی، اور تمہارے آباء ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق کے معبود کی، ایک معبود کی، اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں۔

شان نزول:

یہ آیت کریمہ یہود کے باطل دعویٰ کے رد میں نازل ہوئی، انہوں نے نبی کریم ﷺ کو کہا کہ جب حضرت یعقوب فوت ہونے لگے تو انہوں نے اپنے بیٹوں کو یہودیت کی وصیت کی، رب تعالیٰ نے ان کی تکذیب فرمائی۔ اور یہود کو اس آیت میں خطاب کیا گیا، جس کا مطلب یہ ہے۔ ”انکم لم تحضروا ذلک فلا تدعوا علی انبیائی ورسلی الا باطیل وتنسبوا الی الیہودۃ“ کہ تم تو حضرت یعقوب کی موت کے وقت حاضر ہی نہیں تھے۔ لہذا تم میرے انبیاء اور رسل کی طرف باطل دعوے منسوب نہ کرو، اور نہ ہی ان کو یہودیت کی طرف منسوب کرو۔

رب تعالیٰ نے اپنے خلیل کو اور ان کے بیٹوں کو اور بیٹوں کے بیٹوں کو دین اسلام پر قائم رکھا، انہوں نے بھی اپنے بیٹوں کو دین اسلام کی ہی وصیت کی۔

(خازن)

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَاءَ اِذَا حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتُ : اس مقام میں ”ام منقطعة

و معنی الهمزة فیہا الانکاری ما کنتم حاضرین اذ حضر یعقوب الموت “ام منقطعة ہے، اور ہمزہ استفہام کے معنی میں ہے۔ اور استفہام بھی انکاری ہے، کیا تم حاضر تھے؟ یعنی تم تو اس وقت حاضر ہی نہیں تھے جب یعقوب پر موت آئی، تمہیں کیا معلوم کہ آپ نے بیٹوں کو کیا کہا تم ان پر یہ دعویٰ کیوں کرتے ہو کہ انہوں نے اپنے بیٹوں کو یہودیت کی وصیت کی۔ (راقم کا ترجمہ اسی کے مطابق ہے) ”او متصلة بمحذوف تقدیرہ اکنتم غائبین ام کنتم شهداء “یا ”ام “متصلہ ہو، اور اس کا تعلق محذوف سے ہو، تو اس صورت میں معنی یہ ہوگا، کیا تم غائب تھے یا تم حاضر تھے، جب یعقوب نے اپنے بیٹوں کو اپنی موت کے وقت وصیت کی۔

”وقیل الخطاب للمؤمنین والمعنی ما شہدتم ذلک وانما علمتموه بالوحی“

ایک قول یہ ہے کہ یہ خطاب مومنوں کو ہے اور معنی یہ ہے کہ تم اس وقت حاضر نہیں تھے، تمہیں تو علم وحی کے ذریعے حاصل ہوا۔

”ولک ان تجعل الاستفہام للتقریر ای کانت او ائلكم حاضرین حین وصی بنیہ علیہ السلام بالاسلام والتوحید وانتم عالمون بذلک فمالکم تدعون علیہ خلاف ما تعلمون“ جائز ہے کہ ”ام“ ہمزہ استفہام کے معنی میں ہو، اور استفہام تقریری ہو، اور معنی یہ ہو کہ تمہارے پہلے کچھ لوگ حاضر تھے جب یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو اسلام اور توحید کی وصیت کی اور تمہیں بھی اس کا علم ہے تم اپنے علم کے خلاف ان پر دعویٰ کیوں کرتے ہو۔ (روح المعانی)

اعلیٰ حضرت کا ترجمہ روح المعانی کے اسی قول کے مطابق ہے۔

”شهداء“ جمع ہے ”شہید“ کی، یا ”شاهد“ کی، معنی اس کا حاضر ہونا۔

مَا تَعْبُدُونَ مِنْۢ بَعْدِی : ای ای شئ تعبدونہ بعد موتی ”تم کس چیز کی میرے بعد عبادت کرو گے۔

خیال رہے کہ بظاہر استفہام ہے (سوالیہ فقرہ ہے) لیکن یہ استفہام حقیقی نہیں، بلکہ غرض ان کو توحید اور اسلام پر قائم رہنے کے لئے براہِ نیجۃ کرنا مقصود تھا۔

قَالُوا نَعْبُدُ إِلَهَكَ وَالِاهَ آبَاءِكَ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ إِلَهاً وَاحِداً :

انہوں نے کہا ہم ایک ہی معبود کی عبادت کریں گے جو تمہارا بھی معبود ہے اور تمہارے آباؤ اجداد یعنی ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق علیہم السلام کا بھی معبود ہے۔

”الہ“ کہ اضافت متعدد کی طرف کر کے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وجود اور الوہیت پر اتفاق ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر پہلے کیا کیونکہ وہ آپ کے جدا مجد تھے، بزرگی اور عمر کے لحاظ سے ان کا ہی پہلے ذکر کرنا مناسب تھا۔ پھر اسماعیل علیہ السلام کا ذکر اسحاق علیہ السلام سے پہلے کیا ”لکونہ اسن منہ“ کیونکہ وہ عمر میں اسحاق علیہ السلام سے چودہ سال بڑے ہیں۔

اور حضرت یعقوب علیہ السلام کا اپنے چچا (تایا) حضرت اسماعیل علیہ السلام کو اپنے آباء میں شامل کرنا ”تغلیبا للاکثر علی الاقل“ تغلب کے طور پر تھا، کہ اکثر و اقل پر غالب سمجھا۔

لیکن سب سے عظیم وجہ یہ تھی ”لانہ شہ العم بالاب“ کہ چچا باپ کے مشابہ ہوتا ہے، کیونکہ دونوں ہی ایک دھاگہ کے موتی ہوتے ہیں۔ یعنی دونوں بھائی ایک باپ یا ایک ماں یا ایک ہی باپ اور ماں کی اولاد ہوتے ہیں۔

بخاری اور مسلم نے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ذکر فرمایا ”عم الرجل صنو ابیه“ انسان کا چچا اس کے باپ کے مشابہ ہے۔ یہی وجہ اس لئے بھی مناسب ہے کہ ایک لفظ میں حقیقت و مجاز کا اجتماع لازم نہیں آئے گا۔

اور اسی قول کو ابن ابی شیبہ کی روایت سے تائید بھی ملتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ”احفظونی فی العباس فانہ بقیۃ آبائی“ عباس کی میری وجہ سے حفاظت کرو کیونکہ وہ میرے بقیہ آباء سے ہے **إِلَهاً وَاحِداً** : یہ بدل ہے ”الہ آباء ک“ سے، مبدل منہ چونکہ معرفہ ہے، اور بدل نکرہ ہے، اسی وجہ سے اس کے ساتھ صفت کو ذکر کیا تا کہ اس میں تخصیص آجائے۔

وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ : ”ای مدعونون مقرون بالعبودية وقيل خاضعون منقادون مستسلمون لنهیہ وامره قولاً وعقداً وقيل داخلون فی الاسلام ثابتون علیہ“ اس مقام میں مسلمون کے کئی معانی ہیں، مطالب تقریباً سب کے قریب ہی ہیں۔

(۱) ہم اس کی عبودیت پر یقین رکھتے ہیں۔ اور اسی کا اقرار کرتے ہیں۔

(۲) ہم اسی کے سامنے اظہارِ عجز کرتے ہیں۔ (۳) ہم اسی کے فرمانبردار ہیں۔

(۴) ہم اسی کے اوامر و نواہی کو قولا اور عقیدہ تسلیم کرتے ہیں۔

(۵) اور ہم اسلام میں داخل ہیں اسی پر قائم رہیں گے۔ (از روح السعاسی)

اعتراض: تم نے ﴿اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَاءَ﴾ میں ”ام“ کو استفہام انکاری بنایا ہے، حالانکہ

استفہام انکاری ”انما يتوجه على كلام باطل“ تو باطل کلام کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ جب

حضرت یعقوب علیہ السلام کے کلام کی حکایت بیان ہو رہی ہے تو وہ کلام تو حق ہے، باطل نہیں تو استفہام

انکاری کیسے؟

جواب: ”الاستفهام على سبيل الانكار متعلق بمجرد ادعائهم الحضور عند

وفاته فهذا هو الذي انكره الله تعالى“

استفہام انکاری کا تعلق انکے اس دعویٰ سے ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو

یہودیت کی وصیت فرمائی یعنی انکے اس دعویٰ کا مطلب یہ تھا کہ وہ اس وقت موجود تھے، رب تعالیٰ نے

اس کار فرمایا، کہ تم موجود نہیں تھے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے کلام میں انکار نہیں پایا گیا۔ (ارکیر)

اعتراض: ”ما“ غیر ذوی العقول کے لئے آتا ہے، اس کا اطلاق معبود حقیقی پر ﴿مَا تَعْبُدُونَ﴾

میں کیسے صحیح ہے؟

جواب اول: ”ما“ عام ہے ہر چیز میں، اس لئے معنی یہ ہے ”ای شئی تعبدون“ تم کس

چیز کی عبادت کرو گے۔

جواب دوم: جب کسی چیز کی حد یا رسم (تعریف) کا سوال ہو تو ”ما“ سے ہوتا ہے۔ اس وقت

ذوی العقول کیلئے بھی ”ما“ استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ کہا جائے۔ ”ما الانسان“

(ارکیر)

انسان کیا ہے؟

آیت کریمہ سے حاصل ہونے والے مسائل:

(۱) اصول دین میں تقلید نہیں، ورنہ حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے بیٹوں سے سوال نہ کرتے

بلکہ یہ سمجھتے کہ وہ میرے مقلد ہی ہوں گے۔

علامہ رازی رحمہ اللہ جہاں بھی تقلید کی نفی کرتے ہیں، وہاں اصول دین میں تقلید کی نفی کرتے ہیں۔ یہی ہمارا بھی عقیدہ ہے۔

(۲) آیہ اس پر دلالت کرتی ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنی اولاد کو ایمان لانے کی ترغیب دی اور نبی کریم ﷺ کی اتباع کا حکم دیا، اور آپ کی مخالفت کرنے سے منع فرمایا۔ کیونکہ ایمان پر ثابت رہنے کی تلقین کا یہی تقاضا ہے کہ جب نبی کریم ﷺ تشریف لائیں تو ان پر ایمان لانا اور نہ تم ایمان پر ثابت نہیں رہ سکو گے۔

(۳) اولاد پر شفقت اور ان کی اچھی تربیت (تاکہ وہ عذاب سے بچ سکیں۔ اور اعلیٰ قسم کی اخروی کامیابی حاصل کر سکیں، اور دنیاوی زندگی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کے مطابق گزار سکیں) سنت انبیاء کا نام ہے۔

(۴) انبیاء کرام کی اولاد سے شفقت فقط دین کے لئے تھی، ان کی بلند ہمتیں فقط دینی کاموں میں مصروف رہتی تھیں۔ (ماخوذ از کبیر)

﴿تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۖ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾
(آیت ۱۳۴)

(۱) یہ ایک امت ہے کہ گزر چکی، ان کے لئے ہے جو انہوں نے کمایا اور تمہارے لئے ہے جو تم کماد اور ان کے کاموں کی تم سے پرسش نہ ہوگی۔

(۲) وہ ایک جماعت ہے جو گزر چکی ہے۔ اس کے لئے وہ ہے جو اس نے کسب کیا، اور تمہارے لئے وہ ہے جو تم نے کسب کیا۔ اور تم سے سوال نہیں کیا جائے گا اس کے متعلق جو وہ عمل کرتے رہے۔

اس آیہ کریمہ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام اور ان کی اولاد ایک جماعت تھی جو دنیا سے چلے گئے، ان کے اعمال ان کے لئے اور تمہارے اعمال تمہارے لئے ہیں،

تم سے ان کے اعمال کے متعلق سوال نہیں کیا جائے گا۔ کہ وہ کیا عمل کرتے رہے۔ بلکہ ہر ایک سے اس کے اپنے اعمال کے متعلق سوال ہوگا۔

شانِ نزول:

جب یہود نے کہا کہ ہمارے آباء واجداد حضرت ابراہیم اور حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہم السلام ہیں، ہمارا نسب ان بزرگ ہستیوں کی طرف پہنچتا ہے۔

”فلا جرم نستفع بصلاحهم و منزلتهم عند الله تعالى قالوا ذلک مفتخرین باوائلهم“

لہذا یقیناً ان کی نیکیوں اور اللہ کے ہاں ان کے مرتبے کا فائدہ ہمیں بھی حاصل ہوگا۔ انہوں نے اپنے پہلے آباء واجداد پر فخر کرتے ہوئے یہ کہا، تو اللہ تعالیٰ نے ان کے رد میں یہ آیت کریمہ نازل فرمائی

(از شیخ زادہ)

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ: تلک، کا اشارہ ہے ابراہیم اور یعقوب اور ان کے بیٹوں کی طرف ہے، جن کا ذکر پہلی آیت میں ہو چکا ہے۔

”امۃ“ کا اصل معنی ہے مقصود، ام“ کا معنی قصد کرنا، جماعت کو امت اس لئے کہا جاتا ہے کہ مختلف فرقے جمع ہونے کا قصد کرتے ہیں۔

(بیضاوی)

”قد خلت“ ای مضت، نعت لامۃ، اس مقام میں قد خلت نعت ہے امت کی، جس کا معنی ہے۔ ”گذر گئی“

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ: اس جماعت کے لئے وہ جو اس نے کیا اور تمہارے لئے وہ ہے جو تم نے کیا۔ ”وحاصلہ ان احدا لا ینفعہ کسب غیرہ“ حاصل کلام یہ ہے کہ کسی شخص کو دوسرے کے عمل کا کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا کہ اس کا عمل اس کا عمل بن جائے، جہاں تک ایصالِ ثواب کا مسئلہ ہے وہ راقم نے پہلے رکوع میں تفصیلی طور پر ذکر کر دیا ہے۔

☆ ”قال رسول الله ﷺ يا صفية عمة محمد، يا فاطمة بنت محمد انتونی يوم القيامة باعمالکم لانسابکم فانی لا اغنی عنکم من الله شيئاً“

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے صفیہ محمد کی پھوپھی، اے فاطمہ محمد کی بیٹی قیامت کے دن اپنے

اعمال لانا اپنا نسب نہ لانا، میں اللہ تعالیٰ سے کسی چیز کی بارے میں بے پرواہ نہیں کر سکوں گا۔

اس حدیث شریف میں وعید پائی گئی ہے، ڈرایا گیا ہے کہ اعمال کو چھوڑ کر صرف نسب پر بھروسہ نہ کرنا، ورنہ عمل بھی نیک ہوں اور نسب بھی اعلیٰ ہو تو یقیناً وہ نسب فائدہ دے گا۔ راقم کی کتاب تذکرۃ الانبیاء کا مطالعہ کریں۔

☆ "وقال عليه الصلوة والسلام من ابطأ به عمله لم يسرع به نسبه"

نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس نے عمل میں دیر کی اسے نسب جلدی کوئی فائدہ نہیں دے گا۔
☆ "قال عليه الصلوة والسلام يا بني هاشم لا ياتيني الناس باعمالهم وتاتوني بانسابكم"

نبی کریم ﷺ نے فرمایا اے بنی ہاشم ایسا نہ ہو کہ لوگ میرے پاس اپنے اعمال لائیں اور تم اپنے نسب لے کر آ جاؤ۔

وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ :

اور تم سے نہیں سوال کیا جائے گا اس چیز سے جو وہ عمل کرتے رہے۔

﴿وَلَا تُؤْخَذُونَ بِسَيِّئَاتِهِمْ كَمَا لَا تُؤْخَذُونَ بِحَسَنَاتِهِمْ﴾

یعنی تم سے ان کے گناہوں کے متعلق سوال نہیں کیا جائے گا، جیسا کہ ان کی نیکیوں کا تمہیں ثواب حاصل نہیں ہوگا۔

اس آیت کریمہ سے یہود کے دونوں دعووں کو رد کر دیا گیا، ایک ان کا دعویٰ یہ تھا کہ ہم جو عمل بھی کرتے رہیں، ہمیں کوئی نقصان نہیں، ہمیں اپنے آباء و اجداد کی نیکیاں نفع دیں گے، ہماری بخشش ہو جائیگی دوسرا ان کا دعویٰ یہ تھا کہ ہمیں عذاب نہیں ہوگا، ہاں البتہ اتنے دن عذاب ہوگا جتنے دن (چالیس دن) ہمارے آباء و اجداد نے بچھڑے کی پوجا کی تھی۔

اس آیت کریمہ سے واضح کر دیا کہ آباء و اجداد کی نیکیوں کی وجہ سے اپنے دل سے خوف نکال دینا اور گناہوں پر دلبہ ہو جانا اور نیکی کا کوئی کام نہ کرنا، اور پھر یہ کہنا کہ ہمیں تو صرف اتنے دن عذاب ہوگا۔

جتنے دن ہمارے آباء و اجداد کا گناہ تھا یہ سب تمہارے لغویات ہیں۔ (یہودہ کلام ہے)۔

(ماخوذ از یسناوی و شیع زادہ)

خیال رہے کہ معتزلہ اور ان کے ہمنا الوگوں کو یہود و نصاریٰ کے حق میں نازل ہونے والی آیات اور کفار و مشرکین کے حق میں نازل ہونے والی آیات کا مسلمانوں پر چسپاں کرنا بہت خوب آتا ہے۔ تاہم اپنی عاقبت ہی خراب کر رہے ہیں۔

﴿وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصْرًا تَهْتَدُوا قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ﴾ (آیت ۱۳۵)

(۱) اور کتابی بولے یہودی یا نصرانی ہو جاؤ راہ پاؤ گے، تم فرماؤ بلکہ ہم تو ابراہیم کا دین لیتے ہیں، جو ہر باطل سے جدا تھے اور مشرکوں سے نہ تھے۔

(۲) اور (اہل کتاب نے) کہا یہودی یا نصرانی ہو جاؤ ہدایت پا جاؤ گے۔ تم فرماؤ، بلکہ ہم تو ابراہیم کے دین پر ہیں، جو ہر باطل سے جدا (ہو کر حق پر قائم) تھے، اور مشرکوں سے نہیں تھے۔

شان نزول:

(۱) یہود نے مومنوں کو کہا ”کونوا ہودا تہتدوا“ تم یہودی ہو جاؤ تو ہدایت پا جاؤ گے۔ اور نصاریٰ نے کہا ”کونوا نصاری تہتدوا“ تم نصرانی ہو جاؤ تو ہدایت پا جاؤ گے۔ رب تعالیٰ نے ان کے رد میں اس آیت کریمہ کو نازل کیا۔

(۲) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ یہود کے رئیس کعب بن اشرف اور مالک بن صیف اور وہب بن یہود، اور ابویاسر بن اخطب اور نجران کے نصاریٰ کے متعلق یہ آیت کریمہ نازل ہوئی، جب کہ انہوں نے مومنوں سے دین کے متعلق جھگڑا کیا، ان میں سے ہر فرقہ اپنے آپ کو حق راہ پر چلنے والا سمجھ رہا تھا اور دوسرے کو باطل۔

یہودی کہہ رہے تھے ہمارے نبی موسیٰ افضل الانبیاء ہیں، اور ہماری کتاب توراۃ افضل الکتاب

ہے (تمام کتابوں سے افضل ہے) اور ہمارا دین تمام دینوں سے افضل ہے۔ اور انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل اور نبی کریم ﷺ اور قرآن پاک سے کفر کیا۔

اور نصاریٰ نے کہا ہمارے نبی عیسیٰ افضل الانبیاء ہیں، اور ہماری کتاب انجیل تمام کتابوں سے افضل ہے اور ہمارا دین تمام دینوں سے افضل ہے۔ اور انہوں نے موسیٰ علیہ السلام اور نبی کریم ﷺ اور توراۃ اور قرآن پاک سے کفر کیا۔

وہ دونوں فریق مومنوں کو کہہ رہے تھے ”کونوا علی دیننا فلا دین الا ذلک“ تم ہمارے دین پر آ جاؤ کیونکہ اس دین کے بغیر کوئی اور دین سچا نہیں، تو ان لوگوں کے رد میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔
(۳) ابن اسحاق اور ابن جریر وغیرہما نے ذکر فرمایا کہ ایک مرتبہ عبداللہ بن صوریہ عور نے نبی کریم ﷺ کو کہا۔

”ما الہدی الا ما نحن علیہ فاتبعنا یا محمد تهتد وقالت النصاری مثل ذلک فانزل اللہ تعالیٰ فیہم الآیۃ“

نہیں ہدایت سوائے ہمارے راستہ کے، اس لئے اے محمد تم بھی ہماری تابعداری کر لو تو ہدایت پا جاؤ گے، اور نصاریٰ نے بھی اسی طرح کی گفتگو کی تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ کو نازل کیا۔
مطلب واضح ہے کہ یہ تمام وجوہ پہلے واقع ہوئیں تو آیت کریمہ کا نزول بعد میں ہوا، اس لئے تمام ہی شان نزول ہیں۔

”قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ :“ ”قل“ خطاب ہے نبی کریم ﷺ کو، یعنی آپ ان لوگوں کا رد کرتے ہوئے ان سے فرمادیں، ان کے سامنے واضح طور پر حق بیان کر دیں، اور ان کی راہنمائی کریں، ان کو دو ٹوک الفاظ میں یہ کہہ دو۔

”لانکون کما تقولون ﴿بَلْ﴾ تکون ﴿مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ﴾ ای اہل ملتہ او ﴿بَلْ﴾ نتبع ملۃ ابراہیم“

کہ ہم تمہارے کہنے پر یہودیت و نصرانیت کو بھی اختیار نہیں کر سکتے، بلکہ ہم تو دین ابراہیمی والے ہیں۔ ہم تو ابراہیم علیہ السلام کے دین کی تابعداری کرتے ہیں۔

حَنِيفًا : ”ای مستقیماً او مائلاً عن الباطل الى الحق“ وہ ابراہیم علیہ السلام جو دین مستقیم پر قائم ہیں۔ باطل سے ہٹ کر حق دین پر قائم ہیں۔

تنبیہ : حنیف کا معنی مستقیم ہے۔ لنگڑے شخص کو نیک شگونی کے طور پر کہا جاتا ہے ”احنف“

اللہ کرے کہ یہ درست ہو جائے، جیسا کہ لدیغ (سانپ بچھو کا ڈسا ہوا) کو ”سلیم“ کہا جاتا ہے اور ”مہلکہ“ (ہلاکت کے قرب) کو مفازة (کامیاب) نیک شگونی کے طور پر کہا جاتا ہے۔

اور حنیف کا معنی ہوتا ہے پھرنا، ہٹنا، اس معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ ابراہیم علیہ السلام یہودیت و نصرانیت سے ہٹ کر دین اسلام کی طرف مائل تھے۔

فائدہ : حنیفیۃ سے مراد بیت اللہ شریف کا حج کرنا، اور حق کی تابعداری کرنا، اور ابراہیم علیہ السلام کا شرائع اسلام کی تابعداری کرنا، اور عمل میں اخلاص۔

یعنی ان تمام معانی کے لحاظ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام حنیف تھے۔ اور یہ بھی خیال رہے کہ ”حنیفا“ پر نصب اس لئے ہے کہ یہ ”ابراہیم“ سے حال واقع ہے۔ (از کبیر)

وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ : (اور وہ نہیں تھے مشرکوں سے)

اس میں یہود و نصاریٰ اور مشرکین کا رد پایا گیا ہے۔ وہ تمام حضرت ابراہیم علیہ السلام کی فضیلت کے معترف تھے لیکن یہود نے حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہا، اور نصاریٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہا اور مشرکین نے بت پرستی کی۔

رب تعالیٰ نے گویا کہ ان کا رد کیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تو مشرک نہیں تھے، تم ان کی فضیلت کا اعتراف کرنے کے باوجود مشرک کیوں ہو۔ (از کبیر)

☆☆☆

﴿قُولُوا آمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ إِلَىٰ إِبْرٰهٖمَ
وَإِسْمٰعِیلَ وَإِسْحٰقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسٰی
وَعِيسٰی وَمَا أُوتِيَ النَّبِیُّوْنَ مِنْ رَبِّهِمْ لَا نَفَرَقْ بَیْنَ أَحَدٍ
مِّنْهُمْ وَلَهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ﴾

(آیت ۱۳۶)

(۱) یوں کہو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس پر جو ہماری طرف اترا اور جو اتارا گیا
ابراہیم و اسماعیل و اسحاق و یعقوب اور ان کی اولاد پر اور جو عطاء کئے گئے موسیٰ و عیسیٰ
اور جو عطاء کئے گئے باقی انبیاء اپنے رب کے پاس سے، ہم ان میں کسی پر ایمان
میں فرق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے حضور گردن رکھے ہیں۔

(۲) کہو ہم ایمان لائے اللہ پر، اور اس پر جو اتارا گیا ہماری طرف، اور جو اتارا گیا
ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور ان کی اولاد پر، اور جو عطاء کئے گئے
موسیٰ اور عیسیٰ اور جو عطاء کئے گئے باقی انبیاء اپنے رب کی طرف سے، ہم فرق نہیں
کرتے ان میں کسی پر ایمان میں، اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں۔

پہلی آیت کریمہ میں خطاب نبی کریم ﷺ کو تھا، اور اس آیت کریمہ میں خطاب آپ کی امت کو ہے۔
اسی طرح پہلی آیت میں یہود و نصاریٰ کو جدلی جواب دیا گیا اور اس آیت میں ان کو تحقیقی جواب
دیا گیا ہے۔

شان نزول:

☆ "عن ابی ہریرۃؓ قال کان اهل الکتاب یقرءون التوراة بالعبرانیۃ
ویفسرونها بالعربیۃ لاهل الاسلام فقال رسول اللہ ﷺ لا تصدقوا اهل الکتاب
ولا تکذبوہم و ﴿قُولُوا آمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا أُنْزِلَ﴾ الخ۔ "رواہ البخاری"

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اہل کتاب توراۃ عبرانی زبان میں پڑھتے تھے اور اس کی عربی زبان میں مسلمانوں کے سامنے تفسیر بیان کرتے، رسول اللہ ﷺ نے مؤمنین کو کہا تم ان کی نہ تصدیق کرو اور نہ تکذیب، اور کہو ہمارا ایمان ہے اللہ پر اور جو اس نے نازل فرمایا الخ۔ اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

(قرطبی)

(۲) یہود و نصاریٰ نے مؤمنین کو جب کہا ﴿كُونُوا هُودًا أَوْ نَصْرَى﴾ تو رب تعالیٰ نے ان کے رد میں اس آیت کریمہ کو نازل فرمایا، پہلی آیت کریمہ میں ان کو جواب نبی کریم ﷺ کے ذریعے دیا گیا، اور اس آیت کریمہ میں ان کو جواب مؤمنین کے ذریعے دیا۔

یعنی مومنوں کو کہا گیا کہ تم ان کو صاف صاف بتا دو کہ ہم تو اللہ تعالیٰ پر اور قرآن پاک پر ایمان رکھتے ہیں، ہم تو ان صحیفوں پر ایمان رکھتے ہیں جو ابراہیم علیہ السلام پر نازل کئے گئے اور ان پر ہی ان کی اولاد یعنی حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد عمل پیرا ہے۔ اور ہم تو ایمان توراۃ و انجیل پر رکھتے ہیں۔ اور دوسرے انبیاء کرام پر جو صحیفے نازل ہوئے ہمارا تو ان پر ایمان ہے۔ ہم تمام انبیاء پر ایمان رکھتے ہیں، ایسا نہیں کہ بعض انبیاء کو تو نبی تسلیم کریں اور بعض پر ایمان ہی نہ رکھیں، ہم تو اللہ تعالیٰ کے ہی فرمانبردار ہیں۔

عقیدہ : اگر کوئی شخص کسی نبی کے نام سے بے خبر ہے تو اس سے پوچھا جائے کہ فلاں شخص نبی تھا یا نہیں تھا۔ تو یہ جواب ہاں یا نہ سے نہ دے، کیونکہ اسے تو اس شخص کے نبی ہونے یا نہ ہونے کا علم نہیں۔ بلکہ یہ جواب اسی آیت کے مطابق دے کہ اللہ تعالیٰ کے جتنے نبی ہیں میں تمام کو نبی مانتا ہوں میرا ان پر ایمان ہے۔

جس کے متعلق تم پوچھ رہے ہو مجھے تو اس کے نبی ہونے یا نہ ہونے کا علم نہیں۔ اگر وہ اللہ کا نبی ہے تو یقینی طور پر میرا اس پر ایمان ہے۔

(ماخوذ از قرطبی)

قُولُوا آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا : اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کی راہنمائی کی کہ تم کہو ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں اور اس چیز پر ایمان رکھتے ہیں جو ہم پر نازل کیا گیا، اس سے مراد قرآن پاک ہے۔

ہماری طرف نازل کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے عمل کرنے کے لئے جو کتاب ہم پر ہمارے نبی کریم ﷺ پر نازل ہوئی، ہمارا اس پر تفصیلی ایمان ہے۔ ہم اس کے تمام احکام پر عمل کرنے کے لئے ایمان رکھتے ہیں۔

لیکن باقی انبیاء کرام پر نازل ہونے والی کتب اور صحیفوں پر ہمارا اجمالی ایمان ہے، کہ وہ اللہ کی کتابیں، ان پر تفصیلی ایمان نہ ہونے کی وجہ واضح ہے کہ پہلی شریعتیں منسوخ ہو چکی ہیں۔ (از صابونی)

وَمَا أَنْزَلْ إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ الْخَبْرَ: ”وہ عشر صحف انزلت علی ابراہیم فتعبد بها هو وبنوه واحفاده ولذا نسب انزالها اليهم كما نسب انزال القرآن الينا بمتابعة محمد ﷺ“

حضرت ابراہیم علیہ السلام پر دس صحیفے نازل کئے گئے، ان کے مطابق ہی آپ نے اور آپ کے بیٹوں اور پوتوں نے عمل کیا، اور عبادت کی، تو نازل کرنے کی نسبت حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد کی طرف کر دی حالانکہ اور حضرات پر صحیفے نازل نہیں، صرف ابراہیم علیہ السلام پر نازل کئے گئے۔

یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ قرآن پاک ہمارے عمل اور ہماری عبادت کے لئے نازل نبی کریم ﷺ پر کیا گیا اور منسوب ہماری طرف بھی کر دیا گیا۔

وَالْأَسْبَاطُ: جمع ہے سبط کی، جیسے حمل کی جمع احمال ہے۔ مراد اس سے بنی اسرائیل کی جماعتیں جیسا کہ عرب کی جماعتوں کو قبائل اور عجم کی جماعتوں کو شعوب کہا جاتا ہے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے تھے وہ تمام حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسحاق علیہ السلام کے اسباط ہی تھے، کیونکہ پوتے اور نواسے پر بھی سبط بولا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہما کو ”سبط رسول اللہ ﷺ“ کہا گیا ہے۔

سبط چونکہ زیادہ شاخوں والے درخت کو بھی کہا جاتا ہے، اس لئے یعقوب علیہ السلام کی اولاد کو کثرت کی وجہ سے اسباط کہا گیا ہے۔

﴿وَمَا أُوتِيَ مُوسَىٰ وَعِيسَىٰ﴾ (اور جو عطا کئے گئے موسیٰ اور عیسیٰ) یعنی ہمارا ایمان توراۃ اور انجیل پر ہے۔ ان دونوں کتابوں کو علیحدہ ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اہل کتاب نے ان میں تحریف کر

دی تھی، کئی چیزوں کو نکال دیا اور کئی کو اس میں شامل کر لیا اور دعویٰ یہ کیا کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ تو مومنوں سے کہا گیا کہ تم کہو ہمارا ایمان اس چیز پر جو موسیٰ علیہ السلام کو عطاء کی گئی۔ یعنی ہمارا ایمان توارۃ پر ہے۔ اور ہمارا اس چیز پر ہے جو عیسیٰ علیہ السلام کو عطاء کی گئی یعنی انجیل پر ہمارا ایمان ہے۔

اس سے یہ واضح کر دیا کہ ہمارا ایمان اصل کتب پر ہے نہ کہ تحریف کی ہوئیں پر۔ اور ان پر ایمان بھی اجمالی ہے تفصیلی ایمان صرف قرآن پاک پر ہے۔

وَمَا أُوتِيَ النَّبِيُّونَ مِنْ رَبِّهِمْ : (اور جو باقی انبیاء دئے گئے اپنے رب کی طرف سے)

اس سے مراد صحیفے بھی ہیں اور ”ما يشمل ذلك والمعجزات“ انبیاء کرام کے معجزات اور احکام ان کو جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطاء کئے گئے ہیں، ان سب پر ہمارا ایمان ہے۔ ”وہو تعمیم بعد التخصیص کیلئے خارج من الاعان احد من الانبياء“ پہلے خاص انبیاء کرام کا ذکر کر کے پھر مجموعی طور پر تمام انبیاء کرام کا ذکر کر دیا کہ اے مومنوں تم یہ کہو کہ ہمارا ایمان باقی تمام انبیاء کرام کے احکام، ان کے معجزات ان کے صحائف پر ہے، کہ تمام انبیاء کرام کو رب تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ عطاء کیا گیا اس پر ہمارا ایمان ہے، تاکہ کوئی ایک نبی بھی ایمان سے خارج نہ ہو سکے۔

(از روح المعانی)

لَا تَفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ : ہم ان میں کسی پر ایمان میں فرق نہیں کرتے۔

’ای کما فرق اهل الكتاب فآمنوا ببعض وكفروا ببعض بل نؤمن بهم جميعا‘ ہم ان میں سے کسی ایک میں اس طرح فرق نہیں کرتے جیسا کہ اہل کتاب نے کہا ہے۔ بعض پر ایمان لائے اور بعض پر ایمان نہ لا کر کفر کیا بلکہ ہم تمام پر ایمان رکھتے ہیں۔

(روح المعانی)

”فنؤمن ببعض ونكفر بعض كالیهود والنصارى“ یعنی ہم ان میں ایسا فرق نہیں کرتے کہ بعض پر ایمان لائیں اور بعض سے کفر کریں جیسا کہ یہود اور نصاریٰ کرتے تھے (بعض پر ایمان لاتے تھے اور بعض سے کفر۔

(جلالین)

ای لانؤمن ببعض ونكفر بعض كما فعلت الیهود والنصارى“

یعنی ہم ایسا نہیں کرتے کہ بعض انبیاء پر ایمان نہ لائیں اور کفر کریں، جیسا کہ یہود و نصاریٰ نے کیا۔

(مدارک)

”لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ“ میں دو وجہ ہیں ایک یہ ہے۔ ”انا لانؤمن ببعض و نکفر بعض“ ہم انبیاء کرام میں اس طرح کا کوئی فرق نہیں کرتے کہ بعض پر ایمان لائیں اور بعض پر ایمان نہ لائیں اور ان سے کفر کریں۔

اور اس میں دوسری وجہ یہ ہے۔

”لَانَقُولُ ، اَنَّهُمْ مُتَفَرِّقُونَ فِيْ اَصْوَالِ الدِّيَانَاتِ بَلْ هُمْ مُجْتَمِعُونَ عَلَى الْاَصْوَالِ الَّتِي هِيَ الْاِسْلَامُ كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی“ (شرع لكم من الدين ما وصى به نوحا والذي اوحينا اليك وما وصينا به ابراهيم وموسى وعيسى ان اقيموا الدين ولا تتفرقوا فيه) (الشورى ۱۳)

تمہارے لئے دین کی وہ راہ ڈالی جس کا حکم اس نے نوح کو دیا اور جو ہم نے تمہاری طرف وحی کی اور جس کا حکم ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا کہ دین پر قائم رہو اور اس میں پھوٹ نہ ڈالو۔ (از کبیر)

☆ ”عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ انا اولی الناس بعیسی بن مریم فی الاولی والآخرۃ الانبیاء اخوة من علات وامہاتہم شتی و دینہم واحد ولیس بیننا نبی“

(بخاری و مسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک لوگوں میں سے میں عیسیٰ بن مریم کے زیادہ قریب ہوں دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، انبیاء کرام علاقی بھائی ہیں (باپ شریکے) اور ان کی مائیں مختلف ہیں۔ اور ان کا دین ایک ہے۔ اور ہمارے (میرے اور عیسیٰ علیہ السلام کے) درمیان کوئی اور نبی نہیں۔

وضاحت حدیث: نبی کریم ﷺ کا یہ فرمانا ”الانبیاء اخوة من علات وامہاتہم شتی و دینہم واحد“

اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام انبیاء کرام کی اصل ایک ہے کیونکہ تمام کی طرف اللہ تعالیٰ کی جانب سے وحی آتی ہے۔ اور ان کی استعداد مختلف ہے۔ استعدادات کے مختلف ہونے کو اور شرائع کے فروغ میں اختلاف کی وجہ سے تشبیہ دی گئی کہ مائیں مختلف ہیں۔

اصول دین سب کے ایک ہیں، اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات پر ایمان لانا، مبدأ و معاد (ابتداء تخلیق اور قیامت) پر ایمان لانا اور اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی پر ایمان لانے میں سب برابر ہیں۔

(از مطہری)

اس لحاظ پر ان کو علاتی بھائی ہونے سے تشبیہ دی گئی۔
تراجم کا فرق: اس بحث کے بعد دیکھیں اعلیٰ حضرت کا ترجمہ مقصد کو سمجھانے میں کتنا واضح اور قریب ہے۔

﴿لَا تَفْرُق بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ﴾

(شاہ رفیع الدین صاحب)	☆ نہیں جدائی ڈالتے ہم درمیان کسی ان میں سے۔
(شاہ عبدالقادر صاحب)	☆ ہم فرق نہیں کرتے ایک میں ان سب سے۔
(عبدالماجد صاحب)	☆ ہم ان پیغمبروں میں سے کسی میں کچھ فرق نہیں کرتے۔
(محمود الحسن)	☆ ہم فرق نہیں کرتے سب میں سے
(اشرف علی صاحب)	☆ ہم ان میں سے کسی ایک میں بھی تفریق نہیں کرتے۔
(مورودی صاحب)	☆ ہم ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے۔
المحضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی	☆ ہم ان میں کسی پر ایمان میں فرق نہیں کرتے۔

اس آیت کریمہ کی جو وضاحت ذکر کر دی گئی، اس سے واضح ہو گیا کہ اتنا کہنا کافی نہیں کہ ”ہم ان میں فرق نہیں کرتے“ کیونکہ ہم مدارج اور مراتب کا فرق تو کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو افضل الانبیاء اور قرآن پاک کو افضل الکتاب مانتے ہیں۔

لہذا یہاں ضروری ہے کہ ترجمہ سے ہی یہ واضح ہو جائے کہ ہم کون سا فرق نہیں کرتے، وہ یہی ہے کہ ہم ایسا فرق نہیں کرتے کہ بعض انبیاء پر ایمان ہو اور بعض سے کفر، اسی طرح بعض آسمانی کتب کو تسلیم کیا جائے اور بعض کا انکار۔

اب اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو ایک نظر پھر دیکھیں (ہم ان میں کسی پر ایمان میں فرق نہیں کرتے) تو واضح ہو جائے کہ کتنا خوب اور کتنا عظیم ترجمہ ہے۔

وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ : (اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں)

”ای خاصعون للہ تعالیٰ بالطاعة“ یعنی ہم طاعت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے سامنے عجز کا اظہار کرنے والے ہیں۔

”مذعنون بالعبودية“ ہم اللہ تعالیٰ کی عبودیت پر یقین رکھتے ہیں۔

”منقادون لامره ونهيه“ ہم اس کے اوامر و نواہی کو تسلیم کرنے والے ہیں، یعنی ہم اسی

(روح المعانی)

کے فرمانبردار ہیں۔

(فائدہ : ﴿وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ﴾ سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ ”ان اسلا منا لاجل

طاعة الله لا لاجل الهوى“

بے شک ہمارا اسلام صرف اللہ تعالیٰ کی طاعت کی وجہ سے ہے، اس میں ہماری خواہشات کا

کوئی دخل نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ معجزات کے ظاہر ہونے پر ایمان واجب تھا، کیونکہ انکار جن لوگوں نے کیا ان کی

خواہشات کا اس میں دخل تھا۔

(ماخوذ از کبیر)

﴿فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدْ اهْتَدَوْا ۖ وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا

هُمْ فِي شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ﴾

(۱) پھر اگر وہ بھی یوں ہی ایمان لائے جیسا تم لائے جب تو وہ ہدایت پا گئے اور اگر منہ

پھیریں تو وہ زری ضد میں ہیں تو اے محبوب عنقریب اللہ ان کی طرف سے تمہیں

کفایت کرے گا۔

(آیت نمبر ۱۳)

(۲) پس اگر وہ ایمان لائیں جیسا تم نے ایمان لایا اس کے ساتھ تو وہ ہدایت پا گئے۔

اور وہ منہ پھیریں تو بیشک وہ صرف مخالفت میں ہیں۔ تو عنقریب کافی ہوگا آپ کو

ان کی طرف سے اللہ، اور وہ بہت خوب سننے والا اور خوب جاننے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جب پہلی آیت کریمہ میں دین کا واضح طریقہ بیان کر دیا تو اس آیت میں گویا کہ یہ

بیان کیا جا رہا ہے انسان کو چاہئے کہ جب کسی ذات کی نبوت پر دلائل قائم ہو جائیں تو اس کی نبوت کو تسلیم

کر لیا جائے، اس کی مخالفت نہ کی جائے۔

مختصر مفہوم : اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو ارشاد فرمایا کہ جس نے

اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور نبی کریم ﷺ کی نبوت اور تمام عقائد صحیحہ پر خلوص نیت سے ایمان لایا اگر اہل کتاب نے بھی اسی طرح ایمان لایا تو وہ ہدایت پا جائیں گے، اگر انہوں نے اس طرح ایمان نہ لایا، بلکہ ضد اور مخالفت پر قائم رہے تو نبی کریم ﷺ کا کچھ نقصان نہیں کر سکیں گے، اپنے آپ کو ہی نقصان پہنچائیں گے، کیونکہ رب تعالیٰ نبی کریم ﷺ کو ان کی طرف سے کافی ہے اور وہ خوب سننے اور جاننے والا ہے۔

اعتراض : مومنین کا ایمان جب اللہ تعالیٰ پر اور نبی کریم ﷺ پر اور قرآن پاک پر ہے، تو یہود و نصاریٰ ان کے مثل پر کیسے ایمان لائیں گے جب کہ رب تعالیٰ اور اس کے رسول اور قرآن کی مثل کوئی چیز نہیں۔

جواب : یہاں یہ مراد نہیں کہ وہ ان چیزوں پر ایمان لائیں جو ان کے مثل ہوں جن پر ایمان والوں نے ایمان لایا۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ اے ایمان والو تم نے قرآن پاک پر ایمان لایا، اس میں کسی قسم کی تحریف نہیں کی، اگر وہ بھی توراۃ پر اسی طرح ایمان لاتے اس میں تحریف نہ کرتے تو یقیناً ان کو قرآن پر بھی ایمان لانا ضروری ہو جاتا جو ان کی نجات اور ہدایت کا ذریعہ بن جاتا۔

یعنی یہاں مثلیت ایمان اور تصدیق میں ہے، ان چیزوں میں مثلیت بیان کرنا مقصود نہیں جن پر ایمان لانا ہے۔

اسی وجہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ”لاتقولوا فان آمنوا بمثل ما آمنتم به فليس لله مثل“ تم یہ نہ کہو کہ ”اگر وہ ایمان لے آئیں اس چیز پر جو مثل ہو اس چیز کے جس پر تم نے ایمان لایا“ اس لئے کہ رب تعالیٰ کے مثل کوئی چیز نہیں۔

”ولكن قولوا فان آمنوا بالذي آمنتم به“ لیکن یہ کہو کہ ”اگر وہ ایمان لائیں اس ذات پر جس پر تم نے ایمان لایا“

البتہ ان کا ایمان تمہارے ایمان کی طرح خلوص پر مبنی ہو تو وہ ہدایت پا جائیں گے۔
ضمناً اس سے ایک اور مسئلہ حل ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کی مثل کوئی چیز نہیں، اگر مثل کوئی چیز ہوتی تو اس پر ایمان لانے سے بھی ہدایت حاصل ہوتی، اس لئے ضروری ہے کہ وہ ذات، باری تعالیٰ پر ہی مومنین کی طرح خلوص اعتقاد سے ایمان لائیں تاکہ ان کو ہدایت حاصل ہو جائے۔ (ماخوذ از کبیر)

”ومن هذا حاله يكون وليا لله داخلا في اهل رضوانه“ اور اسی سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ وہ شخص اللہ کا ولی ہوگا جس کو اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہوگی، یہ بہت ہی واضح بات ہے کہ رب تعالیٰ کی رضامندی کے لئے عمل کرنا رب تعالیٰ کی رضامندی کے حصول کا سبب ہے۔

وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ : اگر وہ منہ پھیریں تو بیشک وہ صرف مخالفت میں ہیں

”شفاق“ ماخوذ ہے ”شق“ سے۔ گویا کہ ایک شخص دوسرے کی عداوت کی وجہ سے اس کی شق (طرف) سے دوسری شق اختیار کر لے۔

اسی طرح لفظ ”محاذیہ“ اس معنی میں استعمال ہوتا کہ وہ اس حد (طرف) میں ہے، اور دوسرا اس حد میں، اسی طرح ”تعاذی“ کا معنی ایک دوسرے سے دشمنی کرنا۔

ن الساظ مبارک کا مطلب واضح ہو گیا کہ اگر وہ ایمان والوں کی طرح خلوص قلب سے ایمان لانا چھوڑ دیں تو وہ منافق۔ (مخالف)۔ اور لازم پکڑیں گے۔ حائلہ عظمند آدمی کا یہ کام نہیں کہ وہ کسی کی مخالفت کی وجہ سے حق چھوڑ دے۔

جب انہوں نے مخالفت کو لازم پکڑ ہی لیا تو ہمیں معلوم ہو گیا "لیس غرضہم طلب الدین

والانقياد للحق وانما غرضهم المنازعة و اظهار العداوة “ کہ بے شک ان کی غرض دین کو طلب کرنا اور حق کی فرمانبرداری نہیں، بلکہ ان کی غرض صرف جھگڑا کرنا اور دشمنی کا اظہار کرنا ہے۔

”فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ“ میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں، سب کا مطلب یہی ہے (کہ اگر وہ منہ پھیر لیں) تو وہ صرف مخالفت اور خالص ضد کی وجہ سے اعراض کرنے والے ہوں گے۔

ایک معنی لیا گیا ہے۔ مخالفت، اور معنی لیا گیا ہے ”گمراہی“ اور معنی لیا گیا ہے۔ ”منازعت و محاربت“ (لڑائی جھگڑا) اور معنی لیا گیا ہے ”عداوت“ سب کا مطلب وہی ہے جو بیان کر دیا گیا ہے۔
فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ : تو عنقریب کافی ہوگا آپ کو ان کی طرف سے اللہ۔

رب تعالیٰ کے اس ارشاد گرمی میں نبی کریم ﷺ اور مومنین کو تسلی دی گئی، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی کا محافظ ہوگا تو اسے وثوق حاصل ہوگا۔

”قال المنكلمون هذا اخبار عن الغيب فيكون معجزا دالا على صدقه“
متکلمین حضرات نے بیان فرمایا ہے کہ یہ غیبی خبر ہے جو نبی کریم ﷺ کی صداقت پر دلالت کرنے والا آپ کا معجزہ ہے۔

غیبی خبر اس لئے ہے کہ آپ نے رب تعالیٰ کی عطاء سے یہ خبر دی کہ رب تعالیٰ آپ کی کفایت کرے گا، آپ کو یہود و نصاریٰ کے شر سے محفوظ رکھے گا۔ اور ان کے خلاف آپ کی امداد فرمائے گا۔
تو ایسا ہی ہوا کہ مسلمان ان پر غالب آ گئے، ان کے شہروں کو فتح کر لیا، ان کے مال اپنے قبضہ میں لے لئے۔

مسلمانوں کے ہاتھوں وہ ذلیل ہوئے، خراج اور جزیہ ان کو ادا کرنا لازم ہوا۔ وہ اپنے آپ کو مسلمانوں کے ہاتھوں سے چھڑانے پر قادر نہ ہوئے۔

اس خبر کو نبی کریم ﷺ کا معجزہ قرار دیا گیا کہ آپ نے تفصیل بیان فرمادی وہ حرف بحرف حق ثابت ہوئی۔

”لان المتبحر ص لا يصيب في مثل ذلك على التفصيل“ کیونکہ تخمینے سے بات

کرنے والا بھی اس قسم کی تفصیل نہیں بیان کر سکتا۔

تسکین الجنان سے اقتباس: راقم نے تراجم کے تقابلی جائزہ میں ﴿فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ﴾ کو بھی ذکر کیا ہے اس پر بھی ایک نظر کرتے چلے جائیں۔

﴿فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ﴾

☆ تو تمہاری طرف سے عنقریب ہی نمٹ لیں گے۔	(اشرف علی صاحب)
☆ سواب کفایت ہے تیری طرف سے ان کو اللہ۔	• (شاہ عبدالقادر صاحب)
☆ سواب کافی ہے تیری طرف سے اللہ۔	(محمود الحسن صاحب)
☆ سواب اللہ آپ کی طرف سے ان کے مقابلہ میں ہے۔	(عبدالماجد صاحب)
☆ تو اے محبوب عنقریب اللہ ان کی طرف سے تمہیں کفایت کرے گا۔	(آلی حضرت سلطان احمد رضا خان دہلوی)

یہاں لفظ ”اللہ“ فاعل ہے۔ اور ”ک“ ضمیر، اور ”ہم“ ضمیر مفعول ہیں۔

بظاہر دونوں معنوں کو عقل تسلیم کرتی ہے کہ یہ مطلب ہو کہ اللہ تعالیٰ نبی کریم ﷺ کی طرف سے ان کو کافی ہو یعنی عذاب دے۔

یا یہ معنی ہو کہ اللہ ان کی طرف سے نبی کریم ﷺ کو کافی ہو کہ وہ آپ کو کوئی تکلیف نہ پہنچا سکیں، بلکہ خود ہی گرفت میں آجائیں۔

اعلیٰ حضرت کا ترجمہ تفاسیر کے عین مطابق ہے۔ مدارک میں ہے۔ ”ضمنان من اللہ لاظهار رسولہ علیہم قد انجز وعدہ بقتل بعضهم واجلاء بعض“ یعنی اللہ تعالیٰ نے ذمہ داری اٹھائی ہے کہ نبی کریم ﷺ کو غالب کرے گا۔

ان پر یعنی اللہ ان کی طرف سے تمہیں کفایت کرے گا، اسی وعدہ کو اللہ نے اس طرح پورا فرمایا کہ بعض ان میں سے قتل ہو گئے، اور بعض جلاء وطن۔

ایسے ہی جلالین میں ”یا محمد شفاقہم“ سے تفسیر کی گئی، جس کا مطلب ہے کہ اے نبی کریم آپ کو اللہ کافی ہے ان کی مخالفت کے باوجود کیونکہ ”شفاق“ کا ترجمہ خود مفسر رحمہ اللہ نے پہلے

خلاف“ کر دیا ہے۔ اس آیت کریمہ کے اختتام پر بھی جلالین میں مدارک کے مطابق ہی عبارت ہے۔“

وقد كفاه الله اياهم بقتل قريظة ونفى النصير وضرب الجزية عليهم“

اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی ان کی طرف سے کفایت کی تو قریظہ قتل ہو گئے، اور نصیر جلا وطن ہوئے، اور ان پر جزیہ مقرر ہوا، شیخ زادہ حاشیہ بیضاوی میں بھی اسی قسم کا مضمون ہے۔

”فسيكفى الله اياك امر اليهود والنصارى بحفظك من شوء مهم ونصرک عليهم“

یعنی اللہ تعالیٰ آپ کی یہود نصاریٰ کی طرف سے کفایت کرے گا، ان کے ناپاک ارادوں کو ختم کر کے آپ کی حفاظت فرمائے گا اور آپ کو ان پر غالب فرمائے گا۔

تفاسیر کے بیان کے بعد اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر نظر کریں تو آپ کی وسعت علمیت کا اعتراف کرنے کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں رہے گا۔ (تسکین الجنان فی محاسن کنز الایمان ص ۵۰، ۴۹)

وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ : اور وہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔

نبی کریم ﷺ سے امداد کرنے کا جو وعدہ فرمایا گیا، ان الفاظ مبارکہ سے اس کی تائید کی گئی۔

کہ جو تم دعاء کرو وہ اسے خوب سننے والا ہے۔ جو تمہاری نیت میں اظہار دین ہے۔ اللہ تعالیٰ سے خوب جاننے والا ہے تمہاری دعا تمہارے اعمال اور دین کے اظہار دین ہے اللہ تعالیٰ اسے خوب جاننے والا ہے۔ تمہاری دعا تمہارے اعمال اور دین کے اظہار کے لئے کوشش کو قبول کرنے والا ہے۔ اور تمہیں مراد تک پہنچانے والا ہے۔

اور ایک احتمال یہ ہے کہ ان الفاظ مبارکہ میں کافروں کے لئے وعید پائی گئی ہے۔ کہ کافر لوگ جو ظاہر کرتے ہیں رب تعالیٰ اسے خوب سننے والا ہے۔ اور جسے وہ چھپاتے ہیں، جس میں کوئی بھلائی نہیں اسے وہ خوب جاننے والا ہے۔

اور یہ بھی خیال رہے کہ اسی میں پہلے وعدہ کی تاکید بھی موجود ہے۔

”فان وعيد الكفرة وعد للمؤمنين“

اس لئے کہ کافروں کے لئے جب وعید پائی جائے یعنی ان کو عذاب سے ڈرایا جائے تو اس میں

مومنوں کے لئے نجات اور رحمت اور نعمتوں کا وعدہ بھی پایا جاتا ہے۔ (از روح المعانی)

تنبیہ : انسان جتنا اللہ تعالیٰ کا مقرب ہوتا ہے اتنے ہی اس پر امتحان زیادہ آتے ہیں، اس لئے تکالیف نبی کریم ﷺ پر بہت آئی ہیں۔ تاہم اس آیت کریمہ اور دوسری کئی آیات کریمہ میں رب تعالیٰ نے آپ سے امداد کا جو وعدہ فرمایا، اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ پر کوئی غالب نہ آ سکے گا۔ یعنی آپ کو کوئی قتل نہیں کر سکے گا۔ دوسری تکالیف کا آنا اس وعدہ کے مخالف نہیں، بلکہ مدارج کی بلندی کی علامت ہے۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے خون کا پہلا قطرہ:

رب تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی ﴿فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ﴾ پر گرا، یعنی آپ قرآن پاک کی تلاوت فرما رہے تھے جب آپ پر حملہ کیا گیا، اور آپ کے خون کا پہلا قطرہ قرآن پاک پر واقع ہوا۔ آپ کی شہادت کی خبر نبی کریم ﷺ نے پہلے سے ہی دے رکھی تھی۔

طلباء کرام قرطب کے یہ الفاظ یاد کر لیں۔ ”وہذا الحرف ﴿فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ﴾ هو الذى وقع عليه دم عثمان حين قتل باخبار النبى ﷺ اياه بذلك“

حق گوئی کی درخشاں مثال:

ابودلامہ ایک مرتبہ مسلمانوں کے حاکم منصور کے پاس گیا، دیکھا کہ ”وعليه قلنسوة طويلة وذراعه (جبة مشقوقة المقدم) مكتوب بين كتفيها ﴿فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ﴾ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ“ وسيف معلق في وسطه“

اس نے ایک لمبی ٹوپی پہنی ہوئی ہے۔ اور ایک جبہ آگے سے کھلا پہنا ہوا ہے، جس کے کندھے کے مقام پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ﴿فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ﴾ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ لکھا ہوا ہے اور درمیان میں تلوار لٹکی ہوئی ہے۔

منصور نے ابودلامہ سے پوچھا تمہارا کیا حال ہے؟ ابودلامہ نے کہا اے امیر المؤمنین آپ کو بشارت ہو، اس نے پوچھا کس طرح کی بشارت؟ ابودلامہ نے کہا۔

”ما ظنک برجل وجهه فی وسطه وسیفه فی استه وقد نبذ کتاب اللہ وراکما ظہرہ“

اس شخص کے متعلق تمہارا کیا خیال جس کا چہرہ اوسط میں ہو، تلوار پیچھے، اور اللہ کی کتاب کو اس نے پیٹھ کے پیچھے ڈال دیا ہو۔

اشارہ تھا کہ تمہاری وردی پر آیت کریمہ کا پیچھے لکھنا، اور تلوار کو درمیان میں لٹکانا سب غلط ہیں۔ منصور نے اپنی تمام فوج کو اسی قسم کی وردی کا حکم دے رکھا تھا، لیکن ابودلامہ کے کہنے پر، حق بات بتانے پر اس نے اپنا فیصلہ واپس لے لیا، اور وردی کا ڈیزائن تبدیل کرنے کا حکم دے دیا۔ (از قرطبی)

تنبیہ: ایمان وہی معتبر ہوگا جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے بیان فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ وحدہ لا شریک لہ ہے۔ تمام انبیاء کرام اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ ہیں، گناہوں سے پاک ہیں۔ نبی کریم ﷺ خاتم الانبیاء ہیں۔

اگر کوئی شخص کسی نبی کو خدا کہے یا خدا کی مثل کہے یا خدا کا بیٹا کہے وہ بے ایمان ہے۔ رب تعالیٰ کا شریک ماننا کفر و شرک ہے، اور وہ شخص بے ایمان ہے۔

انبیاء کرام کو اپنے جیسا سمجھنے والا بھی ایمان سے خارج ہے۔ اور نبی کریم ﷺ کو آخری نبی نہ ماننا بھی کفر ہے۔ یہ سب لوگ ﴿وَإِنْ تَوَلَّوْا﴾ میں آتے ہیں، کیونکہ یہ ایمان سے پھر جانے والے ہیں۔

﴿صِبْغَةَ اللَّهِ ۖ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ صِبْغَةً وَنَحْنُ لَهُ عِبْدُونَ﴾

- (۱) ہم نے اللہ کی ربی نی لی، اور اللہ سے بہتر کسی کی ربی اور ہم اسی کو پوجتے ہیں۔
- (۲) اللہ کا رنگ، اور کس شخص کا رنگ بہتر ہے اللہ کے رنگ سے، اور ہم اسی کی عبادت کرنے والے ہیں۔

(آیت نمبر ۱۳۸)

شان نزول:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ نصرانیوں کا جب کوئی بچہ پیدا ہوتا تو وہ اسے ساتویں دن زرد رنگ سے رنگتے، اس پانی کو وہ معمود یہ کہتے تھے۔ (آجکل اردو میں اسے بسمہ کہا جاتا ہے) ان

کے رنگنے کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ جس طرح ختنہ پاکیزگی کا سبب ہے۔ یہ رنگ بھی اسے تمام آلائشوں سے پاک کر دیتا ہے۔ ”فاذا فعلوا ذلک قالوا الان صار نصرانیا حقا“ جب وہ رنگ سے رنگتے تو کہتے کہ اب یہ پکا نصرانی بن گیا ہے۔

رب تعالیٰ نے ان کے رد میں اس آیت کریمہ کو نازل کیا۔ ﴿صِبْغَةَ اللّٰهِ﴾ کا مطلب یہ ہے۔ ﴿صِبْغَةَ اللّٰهِ﴾ احسن صبغة وہی الاسلام یعنی اللہ تعالیٰ کا رنگ تمام رنگوں سے اچھا ہے کہ تم اسلام قبول کر لو اسلام کو مجازی طور پر رنگ سے تعبیر کر دیا کہ جس طرح رنگ ظاہر ہوتا ہے اسی طرح دیندار شخص پر اعمال صالحہ اور علامات دین کا ظہور ہوتا ہے۔ (از قرطبی)

اسی طرح یہودی اپنے بیٹوں کو رنگتے اور کہتے ہم نے اسے یہودیت کا رنگ چڑھا دیا۔ اور نصرانی اپنے بیٹوں کو رنگ کر کہتے ہم نے اسے نصرانیت کے رنگ میں رنگ دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے رد میں اس آیت کریمہ کو نازل فرمایا۔

صِبْغَةَ اللّٰهِ : پر نصب اس وجہ سے ہے کہ اس کا عطف ﴿اٰمِنًا﴾ پر ہے۔ اب مطلب یہ ہوگا ”قولوا صبغة اللہ“ تم کہو ہم اللہ کے رنگ (یعنی دین اسلام) سے رنگے ہوئے ہیں۔

یا نصب ہے ”اغسواء“ کے طور پر کہ تم یہ ظاہری رنگ سے اپنے بچوں کو رنگتے ہو یہ بیکار ہے، دین اسلام کو قبول کر کے اللہ تعالیٰ کے تقرب کا رنگ حاصل کرو۔ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً : میں استفہام انکاری ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رنگ سے بہتر کوئی اور رنگ نہیں۔

وَنَحْنُ لَهُ عِبْدُونَ : اور ہم اسی کی عبادت کرنے والے ہیں۔ ہم اسی کی وحدانیت کے قائل ہیں ہم اسی کے مطیع ہیں۔ ہم ملت ابراہیمی کی تابعداری کرنے والے ہیں۔ ہم اسی ذات کے سامنے اپنے آپ کو عاجز تصور کرتے ہیں ہمیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین کی تابعداری میں سکون حاصل ہے۔

(از روح المعانی)

فائدہ جلیلہ : صوفیاء کرام اولیاء عظام رنگ چڑھانے کے بیان کو خوب انداز میں بیان کر کے خوب رنگ چڑھاتے ہیں۔

حضرت مفتی احمد یار خان رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں۔

رنگ کیلئے چند چیزیں چاہئیں، رنگ بنانے والا، رنگ جمانے والا، رنگ قبول کرنے والا، دین اسلام رنگ ہے جو کارخانہ قدرت میں تیار ہوا، رب نے تیار کیا، حضور ﷺ نے وہ رنگ جمایا، مسلمانوں کے دل و دماغ اور ظاہر و باطن نے قبول کیا، اور عبادت اور ریاضت نے اس میں چلا دی اور پالش کی۔

اللہ کا رنگ پہلے بندوں کے دل پر چڑھتا ہے۔ اور پھر اس کا اثر ہر ادا پر ظاہر ہوتا ہے، اور یہ میخانہ طیبہ سے بنتا ہے، اسی رنگ نے نہ معلوم کسے کسے کیا کیا کر دیا۔
مولانا رومی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

رنگہائے نیک از خم صفا است رنگ زشتان از سیاہ آب جفا است
صبغة الله نام آن رنگ لطیف لعنة الله بوئے آن رنگ کثیف
اچھے رنگ صاف مکے سے حاصل ہوتے ہیں برے رنگ جفا کے سیاہ پانی سے حاصل ہوتے ہیں
اسی لطیف رنگ کا نام صبغة الله ہے، کثیف رنگ کی بو کا نام لعنة الله ہے

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور کی صحبت پاک سے بعض حضرات کے ظاہری رنگ بھی بدل گئے۔ کالے تھے گورے ہو گئے، جھشی تھے رومی ہو گئے۔

حکایت: مثنوی شریف میں ہے کہ ایک جنگل میں لشکر اسلام پیسا تھا، کسی کافر کا غلام پانی کے مشکیزے اونٹ پر لادے ہوئے اپنے مولیٰ کے پاس جا رہا تھا۔

نبی کریم ﷺ کے حکم سے اسے روک کر اس کے مشکیزوں سے سارے لشکر کو پانی پلا دیا گیا، اور لشکر کے مشکیزے بھر دئے گئے، لیکن غلام کا پانی اتنا ہی رہا۔ حضور علیہ السلام نے اس کا لے غلام کو سینہ سے لگا کر فرمایا کہ جا۔

اللہ جانے اسے ایک آن (لحمہ) میں کیا دے دیا وہ نہایت حسین و جمیل خوبصورت جوان ہو گیا۔ جب وہ اپنے مولیٰ کے پاس پہنچا تو وہ اسے نہ پہچان سکا اور کہنے لگا تو کون ہے؟ اور میرا غلام کہاں گیا؟ وہ بولا کہ میں ہی تیرا غلام ہوں۔ مولیٰ نے کہا وہ کالا تو گورا وہ جھشی تو رومی۔ اس نے جواب دیا۔

صاحب فضلے و قدرے گشتہ ام
ہشتہا یک رنگ گردد اندر او

صدر را دیدم و بدرے گشتہ ام
صبغة الله ہست رنگ ختم او

یعنی میں تھا تو جیسی ہی مگر کچھ دیر صدر نبوت کے پاس بیٹھ کر بدر (چودھویں کا چاند) بن گیا، اور میری عزت و قدر بڑھ گئی۔ اس کے پاس اللہ کے رنگ کی ایک ماٹ تھی، جس میں غوطہ دے کر رنگ برنگوں کو یک رنگ بناتا تھا، اور بے رنگوں کو رنگ برنگ، اس ماٹ کے رنگ سے کوئی صدیق بن گیا، کوئی فاروق، کوئی ذوالنورین، کوئی حیدر کرار۔

اس غلام کے طفیل اللہ ہم پر بھی وہ رنگ چڑھا دے، جو ذریعہ بخشش بن جائے۔ (نعیمی)

﴿قُلْ أَتَحَاجُّونَنَا فِي اللَّهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ؕ وَلَنَا أَعْمَالُنَا
وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ ؕ وَنَحْنُ لَهُ مُخْلِصُونَ﴾ (آیت ۱۳۹)

- (۱) تم فرماؤ کیا اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہو، حالانکہ وہ ہمارا بھی مالک اور تمہارا بھی اور ہماری کرنی ہمارے ساتھ اور تمہاری کرنی تمہارے ساتھ اور ہم نرے اسکے ہیں۔
- (۲) تم فرماؤ کیا تم جھگڑا کرتے ہو ہمارے ساتھ اللہ کے بارے میں، حالانکہ وہی ہمارا رب ہے اور تمہارا رب ہے اور ہمارے لئے ہمارے عمل ہیں، اور تمہارے لئے تمہارے عمل ہیں، اور ہم اسی کے لئے مخلص ہیں۔

شان نزول:

- (۱) نبی کریم ﷺ کی نبوت کو اہل کتاب نے تسلیم نہ کیا بلکہ حسد سے جل گئے، اور کہنے لگے۔ "الانبياء كلهم منا فلو كنت نبيا لكنت منا فنزلت" کہ تمام انبیاء کرام ہم میں سے تشریف لائے یعنی تمام انبیاء کرام حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد سے آئے، لیکن تم اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے آئے ہو، لہذا تم نبی نہیں ہو سکتے اگر تم نبی ہوتے تو تم بھی اسحاق علیہ السلام کی اولاد سے ہوتے۔

انکی اس حجت بازی اور جاننے کے باوجود انکار کرنے پر رب تعالیٰ نے اس آیہ کریمہ کو نازل فرمایا۔
(۲) یہود و نصاریٰ یہ دعویٰ کرتے تھے کہ دین حق یہودیت اور نصرانیت ہے۔ اور ہمیں ہی جنت میں داخل کرنے کی لئے خاص کیا گیا ہے اور ہدایت پر صرف ہم ہی ہیں۔

تو یہ آیہ کریمہ نازل ہوئی کہ صرف تمہارا دعویٰ تو کافی نہیں اگر اللہ نے فرمایا ہوتا کہ جنت کا حقدار صرف میں نے ان لوگوں کو بنایا ہے۔ اور حق راہ پر صرف یہی ہیں۔ تو کسی حد تک تمہارا دعویٰ سچا ہو سکتا تھا، لیکن یہاں تو معاملہ الٹ ہے۔ تمہاری شریعتیں منسوخ ہو چکی ہیں۔ اب تو صرف نبی کریم ﷺ کی شریعت کی تابعداری کی جاسکتی ہے۔ اس کی تابعداری حق راہ ہے۔
(از روح المعانی)

﴿قُلْ أَتَحَاجُّونَنَا فِي اللَّهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۖ وَلَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ﴾

فرمادیجئے کیا تم جھگڑا کرتے ہو ہمارے ساتھ اللہ کے بارے میں حالانکہ وہی ہمارا رب ہے اور تمہارا رب ہے، اور ہمارے عمل ہمارے لئے ہیں اور تمہارے عمل تمہارے لئے ہیں۔

”فمعنى الآية قل لهم يا محمد“ قل ”سے خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے کہ تم فرمادو اے محمد کیا تم دعویٰ کرتے ہو کہ تم اللہ کی اولاد ہو! کیا تم دعویٰ کرتے ہو کہ تم اللہ کے محبوب ہو! کیا تم دعویٰ کرتے ہو کہ تم پہلے دین پر قائم ہو، تمہارے یہ دعوے کہ حق پر تم ہی ہو سب باطل ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ہمارا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے۔ اسی نے اسحاق علیہ السلام کی اولاد سے نبی بنائے، اسی نے حضرت محمد ﷺ کو اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے نبی بنایا، اسی نے نبی کریم ﷺ کی امت کو تمام امتوں سے افضل بنایا۔

لہذا تمہیں ہمارے ساتھ جھگڑا کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اگر تمہیں کوئی طاقت ہے تو رب تعالیٰ سے پوچھ لو کہ اے اللہ تو نے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے ہونے کے باوجود نبی کیوں بنایا۔ اور رب تعالیٰ سے یہ پوچھ لو کہ ہمارے ہوتے ہوئے حضرت محمد ﷺ کی امت کا مرتبہ بلند کیوں کیا، لیکن افسوس تمہیں معلوم نہیں کہ وہ ”هو يفعل ما يريد“ (وہ جو ارادہ کرتا ہے وہی کرتا ہے) ذات ہے۔
(ماخوذ از قرطبی)

وَنَحْنُ لَهُ مُخْلِصُونَ : (اور ہم اسی کے مخلص ہیں) یعنی ہم صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت خلوص سے کرتے ہیں، ہم کسی اور کو معبود ہی نہیں مانتے، جب کسی کو معبود ہی نہیں مانتے تو کسی اور کی عبادت کرنے یا کسی اور کی عبادت کرنے میں خلوص رکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اسی سے یہود و نصاریٰ کا رد بھی ہو گیا ”وَلَمْ تَخْلَصُوا انْتُمْ فَيَكْفِ تَدْعُونَ مَا نَحْنُ اُولٰٓئِہِ مِنْكُمْ“ کہ تم رب تعالیٰ کی عبادت میں خلوص تو رکھتے نہیں، عزیر علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا مانتے ہو۔ پھر تمہارا یہ دعویٰ کیسے صحیح ہے کہ تم ہم سے بہتر ہو، اور اللہ کے محبوب ہو، ہم تم سے بہتر نہیں ہو سکتے تمہارے یہ سب دعوے باطل ہیں۔

”والا خلاص حقیقتہ تصفیہ الفعل عن ملاحظۃ المخلوقین“ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے کوئی کام کرنا جس میں مخلوق کو دکھانا مقصود نہ ہو، خالق کی مرضی کے خلاف مخلوق کو راضی کرنا مقصود نہ ہو، اسی کو اخلاص کہا جاتا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا ”یا ایہا الناس اخلصوا اعمالکم للہ تعالیٰ فان اللہ تعالیٰ لا یقبل الا ما خالص لہ“ اے لوگو اپنے اعمال صرف اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کے لئے خلوص سے کرو، بے شک اللہ تعالیٰ ان کو اعمال قبول نہیں فرماتا جن میں خلوص نہ پایا جائے۔

ایک اور روایت میں ذکر ہے کہ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں۔
”سألت جبریل عن الاخلاص ما هو؟ فقال سألت رب العزة عنه فقال سر من اسراری استودعته قلب من احبته من عبادی“

میں نے جبریل سے اخلاص کے متعلق پوچھا کہ اخلاص کیا ہے؟ انہوں نے کہا میں نے رب تعالیٰ سے اخلاص کے متعلق پوچھا تو رب تعالیٰ نے فرمایا وہ میرے رازوں میں سے ایک راز ہے، اپنے بندوں میں سے جسے میں پسند کرتا ہوں اس کے دل میں وہ راز ودیعت (امانت) رکھتا ہوں۔
حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

”الاخلاص ان لا تشرك فی دینہ ولا تراہ احدا فی عملہ“

اخلاص یہ ہے کہ رب تعالیٰ کے دین میں اس کا کوئی شریک نہ ٹھہرایا جائے اور اپنے اعمال تم کسی

کو نہ دکھائے۔

حضرت فضیل رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

”ترک العمل من اجل الناس رياء او العمل من اجل الناس شرک والاخلاص ان يعافیک الله تعالى منهما“

عمل کو لوگوں کے لئے رياء کاری کے طور پر چھوڑنا، یا کوئی کام لوگوں کے لئے کرنا شرک ہے۔ اور ان دونوں سے رب تمہیں بچائے تو یہ اخلاص ہے۔ یعنی صرف لوگوں کے دکھلاوے کیلئے برے اعمال سے بچنا اور اچھے اعمال کرنا شرک ہے، کیونکہ رب تعالیٰ کے اوامر و نواہی میں لوگوں کی رضا مندی یا ان کی ناراضگی کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ اخلاص تو یہ ہے کہ ہر کام میں صرف رب تعالیٰ کی رضا پائی جاتے۔ حضرت حذیفہ مرثی کہتے ہیں۔

”ان تستوی افعال العبد فی الباطن والظاهر“ اخلاص یہ ہے کہ انسان کے ظاہری اور باطنی عمل ایک جیسے ہوں۔ یعنی جس طرح ظاہر عمل میں خلوص ہو اسی طرح باطن میں بھی خلوص ہو۔ سہل نے کہا ”هو الافلاس ومعناه احتقار العمل وهو معنى قول روم، ارتفاع عملک عن الرؤیة“

کہ اخلاص درحقیقت افلاس ہے، یعنی انسان اپنے اعمال کو کم سمجھے، اور اپنے آپ کو اعمال کی کمی کی وجہ سے مفلس سمجھے۔ یہی معنی روم کے قول کا ہے کہ اخلاص یہ ہے کہ تمہارے اعمال دکھائی کم دیں، لیکن حقیقت میں وہ زیادہ ہوں، بلند مرتبہ رکھتے ہوں۔

اخلاص کے مقابل رياء ہے۔ سلیمان دارانی بیان فرماتے ہیں کہ رياء کی تین علامتیں ہیں۔

”الکسل عند العبادۃ فی الوحده، والنشاط فی الکثرة، وحب الشاء علی العمل“ جب اکیلے عبادت کرے تو سستی سے کام لے، اور جب بہت لوگوں کے سامنے عبادت کرے تو چستی دکھائے، اور یہ خواہش رکھے کہ لوگ میرے اعمال کی تعریف کریں۔

(ماخوذ از قرطبی و روح المعانی)

عظمت قرآن : جہاں آیہ کریمہ کی ابتداء میں ﴿قُولُوا آمَنَّا بِاللّٰهِ﴾ الخ، کہا ہے، اس آیہ

کے اختتام میں ﴿وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ﴾ ذکر کیا ہے۔ یعنی رب تعالیٰ کی طرف سے گویا کہا گیا ہے کہ تم کہو، ہم اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، اور جو انبیاء کرام پر نازل ہوا اس پر ایمان رکھتے ہیں، اور ہم رب تعالیٰ کے فرمانبردار ہیں۔ اسی کے اوامر و نواہی کو تسلیم کرنے والے اور اسی کے سامنے گردن جھکانے والے ہیں۔

اور جہاں ﴿صِبْغَةَ اللّٰهِ﴾ کہا ہے۔ وہاں، ﴿وَنَحْنُ لَهُ عِبْدُونَ﴾ ذکر فرمایا ہے، کہ ہم نے تو اللہ کے دین کے رنگ میں اپنے آپ کو رنگ لیا ہے۔ اس رنگ سے بہتر اور کوئی رنگ نہیں اور ہم اللہ تعالیٰ کی ہی عبادت کرنے والے ہیں یعنی جہاں کوئی لفظ مناسب ہو اسی مقام پر اسے رکھا۔

اور اس آیہ کریمہ میں ذکر فرمایا ﴿وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ﴾ اور وہ ہمارا رب ہے اور تمہارا رب ہے۔ اور فرمایا ﴿وَلَنَا اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ﴾ اور ہمارے عمل ہمارے لئے ہیں اور تمہارے عمل تمہارے لئے ہیں۔

یعنی کوئی شخص یہ دعویٰ نہ کرے کہ رب تعالیٰ کی رحمت میرے لئے ہی خاص ہے۔ رب تعالیٰ جسے چاہے اپنی رحمت سے نواز دے بلکہ اے یہود و نصاریٰ ہمارے اعمال رب تعالیٰ کے اوامر و نواہی کے مطابق ہیں۔ جو اعمال صالحہ اور اعمال حسنہ ہیں، لیکن تمہارے اعمال رب تعالیٰ کے حکم کے خلاف ہیں، اس لئے وہ ہمیں ہمارے اچھے اعمال کے مطابق اپنی رحمت سے اجر عظیم عطا فرمائے گا، اور تمہیں تمہارے اعمال کے مطابق عذاب دے گا۔

اور اس کی وجہ اس لئے بھی واضح ہے کہ ﴿وَنَحْنُ لَهُ مُخْلِصُونَ﴾ ہم اس کے لئے مخلص ہیں۔

(از روح المعانی)

قرآن پاک کی یہی عظمت اور یہی اعجاز ہے، اسی لئے کوئی شخص قرآن پاک کی مثل کوئی نہ لاسکا۔

☆☆☆

﴿أَمْ تَقُولُونَ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ
وَالْأَسْبَاطَ كَانُوا هُودًا أَوْ نَصْرَىٰ ۖ قُلْ ءَأَنْتُمْ أَعْلَمُ أَمِ اللَّهُ ۚ
وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهُ مِنَ اللَّهِ ۚ وَمَا اللَّهُ
بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ﴾ (آیت ۱۳۰)

(۱) بلکہ تم یوں کہتے ہو کہ ابراہیم و اسماعیل و اسحاق و یعقوب اور ان کے بیٹے یہودی یا نصرانی تھے، تم فرماؤ کیا تمہیں۔ علم زیادہ ہے یا اللہ کو اور اس سے بڑھ کر ظالم کون جس کے پاس اللہ کی طرف کی گواہی ہو وہ اسے چھپائے اور خدا تمہارے کو تکوں سے بے خبر نہیں۔

(۲) کیا تم کہتے ہو کہ بیشک ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور ان کے بیٹے یہودی تھے یا نصرانی (اے محبوب) تم فرما دو کیا تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ، اور اس سے بڑا ظالم کون ہے جو چھپاتا ہے اس گواہی کو جو اس کے پاس ہے اللہ کی طرف سے اور نہیں ہے اللہ غافل اس چیز سے جو تم عمل کرتے ہو۔

شان نزول:

یہود نے کہا حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب اور ان کے بیٹے یہودی تھے۔ اور نصرانیوں نے کہا یہ سب نصرانی تھے۔ یہ یہود و نصاریٰ اپنے دعویٰ میں جھوٹے تھے، کیونکہ ”انما حدثت اليهودية والنصرانية بعدهم“ یہودیت اور نصرانیت تو ان کے بعد ایجاد ہوئی۔

﴿وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ وَقَالَتِ النَّصْرَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ﴾ (التوبة ۳۰)

اور یہودی بولے عزیر اللہ کا بیٹا ہے، اور نصرانی بولے مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔

یہ ان کی من کھرت یہودیت اور نصرانیت تھی، جو بعد کی ایجاد تھی، جس سے ان بزرگ ہستیوں کو دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

﴿مَا كَانَ إِبْرَاهِيمُ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا وَلَكِنْ كَانَ حَنِيفًا مُسْلِمًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ﴾
(آل عمران ۶۷)

ابراہیم نہ یہودی تھے اور نہ نصرانی بلکہ ہر باطل سے جدا مسلمان تھے، اور مشرکوں سے نہ تھے۔ اور رب تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَمَا أُنْزِلَتِ التَّوْرَةُ وَالْإِنْجِيلُ إِلَّا مِنْ بَعْدِهِ﴾ (آل عمران ۶۵) توراۃ اور انجیل نہ اتری مگر ان کے بعد۔

تو اللہ تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ کے باطل دعویٰ کو رد کرنے کے لئے اس آیت کریمہ کو نازل کیا کہ اے محبوب آپ ان سے فرما دو کیا تم زیادہ علم رکھتے ہو یا کہ اللہ تعالیٰ۔

جب اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نہ یہودی تھے نہ نصرانی تھے۔ تو یقیناً اسی ذات کبریاء کا فرمان سچا ہے تم جھوٹے ہو۔ ام تقولون، میں اُم متصلہ ہے اور ہمزہ استفہام کا ہم معنی ہے اور استفہام انکار کے لئے ہے اس صورت میں معنی ہوگا کیا تم کہتے ہو۔ یعنی تمہیں نہیں کہنا چاہئے۔ (راقم کا ترجمہ اس کے مطابق ہے) یا ام منقطعہ ہو یعنی بل کے معنی میں ہو اس صورت میں معنی ہوگا بلکہ تم کہتے ہو۔ (اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اس کے مطابق ہے)

(از خازن و روح المعانی)

استفہام انکاری سے غرض زجر و تنبیح ہے:

نبی کریم ﷺ کی نبوت جب کثیر اور عظیم معجزات سے ثابت ہے اور آپ نے یہود و نصاریٰ کے جھوٹے ہونے کی خبر دی ”فثبت لا محالة كذبهم“ تو جب اصدق الصادقین نے ان کے جھوٹے ہونے کی خبر دی تو ان کا جھوٹا ہونا یقیناً ثابت ہو گیا۔

اور توراۃ و انجیل نے بھی خبر دی کہ ”ان الانبياء على التوحيد والحنيفية“ انبیاء کرام توحید اور دین حنیف پر قائم تھے۔ توراۃ و انجیل کی اس خبر سے بھی ان کا جھوٹا ہونا ثابت ہو گیا۔

توراة اور انجیل جب نازل ہی ان انبیاء کرام کے بعد ہوئیں، تو ان کا یہودی اور نصرانی ہونا کیسے ثابت ہو سکتا ہے؟ جبکہ یہودیت اور نصرانیت کی موجودہ صورت تو توراة اور انجیل کی تحریف کے بعد ہوئی۔

اور ان لوگوں کا دعویٰ بغیر دلیل کے تھا۔ لہذا ”وبخہم اللہ علی ذلک بہذہ الوجوہ“ ان وجوہ کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے ان کو توبیخ (ڈانٹ، ڈپٹ) کی اسی وجہ سے استفہام انکاری ذکر کیا جس سے غرض ان کو زجر و توبیخ کرنا تھا۔

قُلْ ءَانتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ : ”فمعناہ ان اللہ اعلم وخبرہ“ اصدق ”مطلب یہ ہے

کہ اللہ تعالیٰ زیادہ جانتا ہے اور اس کی خبر سچی ہے۔ اس نے توراة اور انجیل میں ذکر فرمادیا اور قرآن پاک میں ذکر فرمایا نبی کریم ﷺ کے ذریعے ان کو بتادیا ”انہم کانوا مسلمین مبرئین عن الیہودیۃ والنصرانیۃ“ کہ بے شک یہ انبیاء کرام رب تعالیٰ کے مطیع و فرمانبردار تھے۔ اسلام پر قائم تھے۔ رب تعالیٰ کی وحدانیت کو تسلیم کرنے والے تھے۔ یہودیت اور نصرانیت سے پاک تھے۔ (از کبیر)

﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَہَادَۃً عِنْدَہٗ مِنْ اللّٰہِ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے جس شخص کے پاس گواہی ہو۔ وہ اسے چھپا دے تو اس سے بڑھ کر اور کوئی شخص ظالم نہیں ہو سکتا۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کا اللہ تعالیٰ کی توحید اور دین حنیف پر قائم رہنے، اور یہودیت اور نصرانیت سے بری ہونے کی خبر دی، رب تعالیٰ کی اس شہادت کو چھپانے والے اہل کتاب بہت بڑے ظالم ہیں۔ ”او منالو کتماننا ہذہ الشہادۃ“ اگر بالفرض ہم بھی اس شہادت کو چھپائیں تو ہم سے بھی بڑھ کر کوئی شخص ظالم نہیں ہو سکے گا۔

یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم کی عدولی کرنے والا ہر شخص ظالم ہے خواہ اہل کتاب سے ہو، یا مؤمنین سے ہو۔ ”وفیہ تعریض بکتمانہم شہادۃ اللہ لمحمد ﷺ بالنبوۃ فی کتبہم“

اس میں اشارۃ یہ بھی بتادیا کہ اہل کتاب اس لئے بھی بہت بڑے ظالم تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی کتب میں نبی کریم ﷺ کی نبوت کو بیان فرمایا، اور آپ کے اوصاف بیان فرمائے، لیکن ان ظالموں نے مالک الملک کی اس شہادت کو بھی چھپا دیا۔

(از بیضاوی)

وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ : اور نہیں ہے اللہ غافل اس سے جو تم عمل کرتے ہو۔
اس میں کامل طور پر وعید پائی گئی ہے۔ کیونکہ جس شخص کو یہ معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ ہر ظاہر اور ہر چھپی ہوئی چیز کو جانتا ہے۔ اس پر کوئی چیز مخفی نہیں، اور اس نے ہر کام پر جزا دینی ہے۔

”ان خیرا فخیروا و ان شرا فشر“ اگر اچھا عمل ہوا تو اچھی جزا عطا فرمائے گا۔ اور اگر برا عمل ہوا تو اس کے مطابق عذاب عطا کرے گا۔

جب یہ کسی کو علم ہو جائے تو وہ ایک آنکھ جھپکنے کے برابر بھی اللہ تعالیٰ کے خوف سے اپنے آپ کو دور نہیں کر سکتا۔ جب ہم دنیا میں دیکھتے ہیں کہ بادشاہ کی طرف سے جو لوگ کسی کام پر مقرر ہوں جب انہیں معلوم ہوا کہ بادشاہ ہمیں دیکھ رہا ہے تو وہ حکم بجالانے میں کوتاہی نہیں کرتے، انکے دل میں ہر وقت خوف طاری رہتا ہے۔ تو یقیناً انسان کو اگر عقل حاصل ہو تو وہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے بے خوف نہیں ہو سکتا۔

(از کبیر)

﴿تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۖ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ ۚ

وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾ (آیت ۱۴۱)

(۱) وہ ایک گروہ ہے کہ گزر گیا، ان کے لئے ان کی کمائی اور تمہارے لئے تمہاری کمائی اور ان کے کاموں کی تم سے پرسش نہیں ہوگی۔

(۲) وہ ایک گروہ ہے جو گزر گیا، ان کے لئے جو انہوں نے کسب کیا، اور تمہارے لئے جو تم نے کسب کیا، اور تم سے نہیں پوچھا جائے گا، جو وہ عمل کرتے ہیں۔

”تِلْكَ“ کا اشارہ، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اس کے بعد مذکور آپ کے بیٹوں کی طرف ہے، یعنی حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق علیہم السلام اور حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کے بیٹے دنیا سے تشریف لے گئے ہیں ان کے اعمال کی جزاء ان کو حاصل ہوگی، اور تمہارے اعمال کی جزاء تم کو حاصل ہوگی، تم سے ان کی اعمال کے متعلق سوال نہیں کیا جائے گا۔

یعنی ہر انسان کو اس کے اعمال کی جزا دی جائے گی، قیامت کے دن ہر انسان سے اس کے

اعمال کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ کسی دوسرے کے اعمال کے متعلق سوال نہیں ہوگا۔

اس آیت کریمہ میں یہود کے لئے وعظ بھی ہے اور زجر بھی ہے اور ہر اس شخص کو نصیحت اور زجر ہے جو خود کوئی نیکی کے عمل نہ کرے اور یہ کہے مجھے نماز اور روزہ کی کوئی ضرورت نہیں، بلکہ مجھے ایمان کی بھی ضرورت نہیں، کیونکہ میرے آباء واجداد بہت بڑی فضیلت کے مالک تھے، ان کے نیک اعمال کی وجہ سے مجھے بخش دیا جائے گا اور مجھے عذاب نہیں دیا جائے گا۔

ایسے لوگ جو صرف اپنے آباء کے اعمال پر بھروسہ کرتے ہوئے جان بوجھ کر فرائض کے تارک ہوتے ہیں، اور حرمت کے مرتکب ہوتے ہیں ان کو سمجھایا گیا ہے۔ ”لا تتكلموا علی فضل الآباء فكل یؤخذ بعمله“ اپنے آباء کی فضیلت پر بھروسہ نہ کرو، ہر شخص کو اس کے اعمال کے مطابق مواخذہ ہوگا۔

یہ آیت کریمہ قریب ہی پہلے گزر چکی ہے، لیکن جب حجت کے مقامات مختلف ہوں، مجادلہ مختلف ہو تو دلائل کو دوبارہ ذکر کرنے میں تاکید پائی جاتی ہے۔ اور نصیحت کو دوبارہ ذکر کرنا مفید اور مستحسن ہوتا ہے۔

خصوصاً یہود کو پھر سے متنبہ کیا گیا، کہ نبی کریم ﷺ پر ایمان نہ لا کر اس گھمنڈ میں نہ رہو کہ ہمارے آباء واجداد انبیاء کرام تھے جو بڑی فضیلت والے تھے وہ ہمیں رب سے بخشوالیں گے۔

یہ دعویٰ تمہارا غلط ہے مصطفیٰ کریم ﷺ سے پھرنے والے کو کسی نبی کے دامن میں پناہ نہیں ملے گی۔

(ماخوذ از حازن بزیادة)

اور احتمال یہ بھی ہے کہ آیت کریمہ میں مضمون کے لحاظ پر تکرار نہ ہو، بلکہ پہلی آیت میں خطاب یہود کو ہوا اور اس میں خطاب ہمیں ہو کہ ہمیں ان کی اقتداء سے ڈرایا گیا ہو۔

اور ایک احتمال یہ ہے کہ پہلی آیت میں ”امۃ“ مراد انبیاء کرام ہوں، اور اس آیت میں مراد یہود کے اسلاف ہوں کہ انہوں نے ”حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے بیٹوں کو یہودی کہا تھا“ یعنی انہوں نے کہا کہ وہ ہمارے طریقہ پر تھے تو رب تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ یہود کے اسلاف گزر گئے ان کے اعمال ان کے لئے تھے اور اے موجودہ یہود یو تمہارے عمل تمہارے لئے ہیں، تم ایمان لے آؤ، اپنے آباء واجداد کی طرح کجروی (ٹیزھی چال) اختیار نہ کرو۔

(از روح المعانی)

تنبیہ : قرآن وحدیث سے واضح ہو چکا ہے کہ کسی کو دوسرے کے عمل میں سے حصہ نہیں دیا

جائے گا، ہاں یہ بات ممکن ہے کہ ایک کے عمل سے دوسرے کو فائدہ یا نقصان پہنچ جائے، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے۔

﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِإِيمَانٍ أَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَا أَلَتْنَاهُمْ مِنْ عَمَلِهِمْ مِنْ شَيْءٍ﴾
اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور ان کی اولاد نے ایمان میں ان کی پیروی کی ان کی اولاد کو ہم ان کے ساتھ تو ملا دیں گے اور ان کے عمل میں سے کوئی کمی بھی نہیں کریں گے۔

مذکورہ آیت میں ایمان والوں کے عمل سے ان کی مؤمن اولاد کو فائدہ پہنچنے کا بیان ہے۔
نیز ﴿وَمَا أَلَتْنَاهُمْ مِنْ عَمَلِهِمْ مِنْ شَيْءٍ﴾ (اور ان کے عمل میں کوئی کمی نہیں کریں گے)
سے یہ بات واضح ہو گئی کہ مؤمن اولاد اپنے والدین کے عمل میں حصہ دار نہیں ہوگی ہاں اسے ان کے عمل کا فائدہ ضرور پہنچے گا۔

حدیث مبارک ہے۔

”قال رسول الله ﷺ من سن في الاسلام سنة حسنة فله اجرها واجر من عمل بها من بعده من غير ان ينقص من اجورهم شيء ومن سن في الاسلام سنة سيئة كان عليه وزرها ووزر من عمل بها من بعده من غير ان ينقص من اوزارهم شيء“

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے اسلام میں کوئی اچھا طریقہ نکالا اسے اس کا اجر ملے گا، اور اس شخص کا اجر بھی اسے ملے گا جس نے بعد میں اس پر عمل کیا بغیر اس کے کہ دوسرے شخص کے اجر میں کمی کی جائے۔ اور جس نے اسلام میں کوئی برا طریقہ نکالا تو اس پر اس کا گناہ ہوگا اور اس شخص کا گناہ بھی اسے ملے گا جس نے بعد میں وہ برا کام کیا، ہاں دوسرے شخص کے گناہ میں کچھ کمی نہ آئے گی۔

اس حدیث مبارک میں بھی کسی کے عمل سے دوسرے کو فائدہ یا نقصان پہنچنے کا ذکر ہے۔ یہ نہیں کہ کوئی شخص کسی کے عمل میں سے حصہ پائے گا۔

(وما علينا الا البلاغ المبين)

(از تبیان للعلامہ السید احمد سعید کاظمی رحمہ اللہ کثیرہ)

